صرف ایک جھٹکے سے
رسّی کے بل ٹوٹ جاتے ہیں
اور سب کچھ پیچھے گر جاتا ہے

رسّی کے بل
ڈھیلے ہوں تو
اس سے بندھی چیزیں
بھی کھل کھل جاتی ہیں
پورا وزن بیٹھ جاتا ہے
ترقی رک جاتی ہے
متحدہ قوت ہی سے آگے
بڑھ سکتے ہیں

ایک ملک صرف ایک
جغرافیائی وحدت کا نام
نہیں ہے بلکہ ایسے مردوں اور
عورتوں کے مجموعہ کا نام ہے
جن کے اندر مساوات ہو
یکجہتی کا زبردست جذبہ
ہو اور ایسے ہی لوگ ملک کو
مضبوط بناتے ہیں

ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر

آفتابِ تازہ
کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
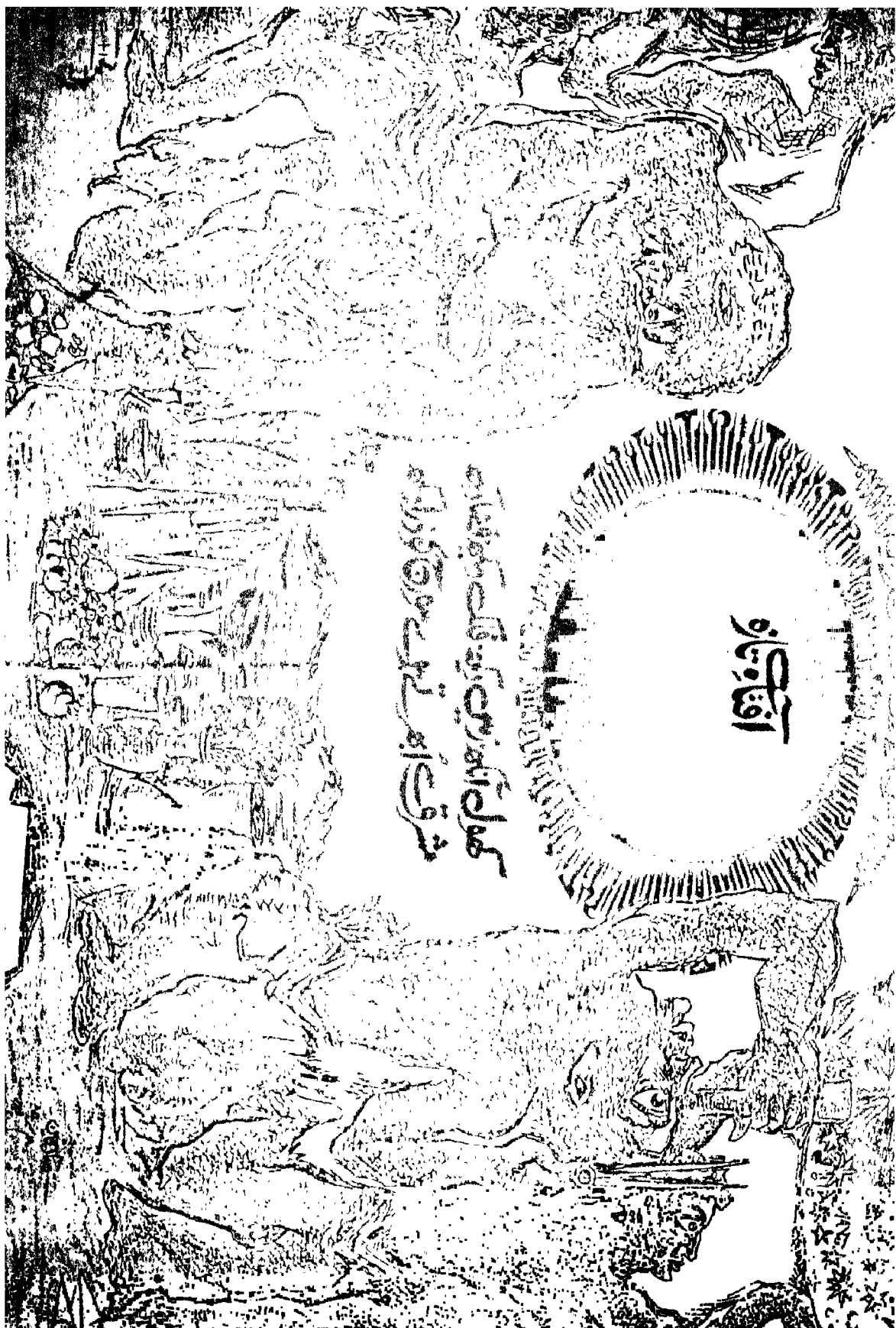
Summer, Autumn, Winter, Spring

Kashmir is never out of season

At the head of such a picturesque and diverse land, you'd expect nothing less from it: a natural share of the Himalayas — the grandest mountain range in the world. Yours for trekking, mountaineering, camping, meditating, dreaming. Or a taste of lunar landscapes on the craggy moonland of Ladakh. In the valley, mirrored lakes offer rides on Shikaras — the water taxis of Kashmir. You can float in idyllic settings on luxury houseboats,

Undul... golfba... on ... course ... full of tempting... Horses to trot... And when the ... the thrill of winter ... a very well-equipped convention centre ... people can confer ... business over pleasant interludes.

Enjoy India from its ... Come to Kashmir

For details contact:
The Director of Tourism,
J&K Government, Srinagar
Tel: 72449, 73648, 77...
Grams: JAKTOURISM
Telex: 375-207 TSM-IN

Kashmir

You can't have enough of it

شاعر کا یہ ضخیم اقبال نمبر
اُردو شعروادب کی دو عظیم شخصیتوں
علامہ سیماب اکبرآبادی
اور قبلہ اعجاز صدیقی
کی روشن اور خوب سیرت علمی و
ادبی روایت کی
نذر ہے
ایک عظیم زبان ـــ اُردو
ایک عظیم شاعر ـــ اقبال
ایک عظیم رسالہ ـــ شاعر
امنِ عالم کے
حامی و نقیب ہیں
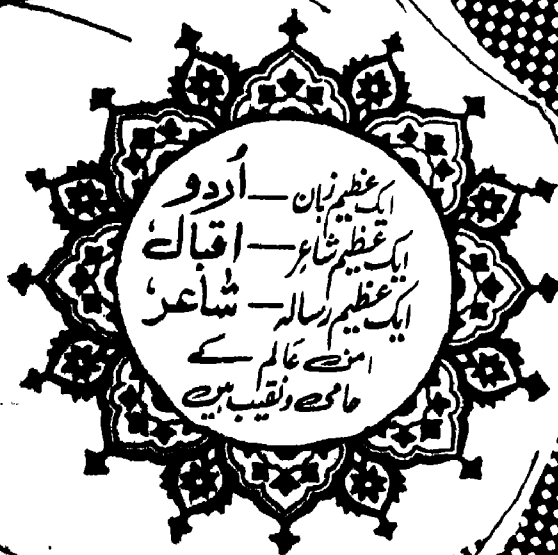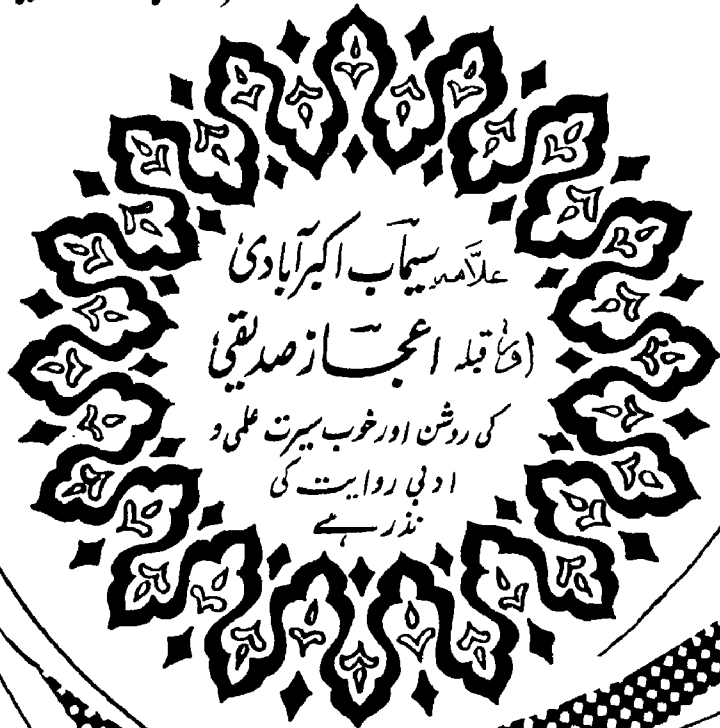
Tourist Hut in Hotel Wildflower Hall Complex
13 kms from Shimla

The snowfall in the upper mountain reaches secluded valleys, populated hamlets, as well as in the less bustling hill – towns of Himachal, is a phenomenon with a touch of fantasy. It turns the valley into a wonderland in winter. The silvery snowladen slopes of Kufri, Narkanda, Chail, Manali and Solang invite you to have a go at thrilling skiing.

Come spend some magical moments in Himachal. The HPTDC will take good care with impeccable hospitality.

Avail of HPTDC conducted tours in Himachal Tourism Luxury Coaches/AC Cars

HPTDC are also the Handling and Booking Agents for Vayudoot (at Shimla only)

HIMACHAL
The Land of Eternal Enchantments

For information please contact H.P. Tourist Offices at
- New Delhi: Chandralok Bldg., 36, Janpath, Tel 345320, 344764
  Tourist Information Office, Himachal Bhawan, 27, Sikandra Road, Tel 387473
- Bombay: 36, World Trade Centre, Cuffe Parade, Tel 219191/284
- Calcutta: 25 Camac Street, Tel 446867
- Madras: 28, Commander-in-Chief Road, Tel 472966
- Chandigarh: S.C.O. 1048-49, Sector 22 B, Tel. 26494
- Shimla: The Mall, Tel: 3311; Panchayat Bhawan, Cart Road, Tel 4589
- Bangalore: The Manager, Himachal Emporium, Ganesh Complex, 13, Subedar Chatram Road, Tel: 76591

HIMACHAL PRADESH TOURISM
DEVELOPMENT CORPORATION LIMITED
RITZ ANNEXE SHIMLA-171 001 PHONES 4472, 3977, 5071

Compesta

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء
بانی، علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
بہ یادگار۔ اعجاز صدیقی مرحوم

اُردو کا اُنسٹھ سالہ علمی، اَدبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

جلد * ۵۹ شمارہ * ۱ تا ۶
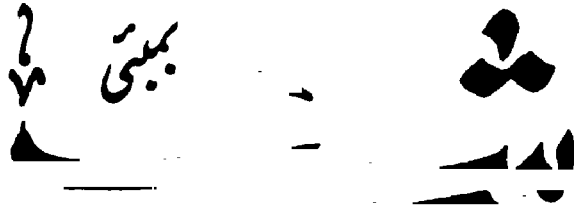
جنوری تا جون

اقبال نمبر (جلد اول)

۱۹۸۸

مُدیر

افتخار امام صدیقی

*

مُعاون

ناظر نعمان صدیقی

سالانہ * ۵۰ روپے | لائبریریوں سے * ۶۰ روپے | تاعمر خریداری * ۱۰۰۰ روپے | مُعاونین سے * ۱۰۰ روپے | ممالک غیر سے * ۳۵۰ روپے

قیمت : اقبال نمبر * پچاس روپے

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سنٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

ترتیب

باب ۱
آفتاب تازہ

باب ۲
معجزۂ فن

باب ۳
ادبی فیچر

باب ۴
سفرنامہ

باب ۵
اقبال کے شاہین

باب (۶)
چار کتابیں

(۱)

(۲)

(۳)

(۴)

تصاویر

باب (۷)
تصانیف اقبال

مکاتیب کے مجموعے

نثری مجموعے

ملفوظات کے مجموعے

تصانیفِ اقبال

تصانیفِ اقبال کے اولین نسخوں کے عکس

باب (۸)

نوادراتِ اقبال

علامہ اقبال اور اُن کے اہل و عیال

دستاویزی مجموعہ ○ ایک مکمل کتاب

جمع و ترتیب ○ اکبر علی خان عرشی زادہ

تصاویر

سرورق
اقبال پورٹریٹ — اقبال مہدی

ابواب و اشعار کی خطاطی
صادقین مرحوم

خوشنویسی
محمد فضیل ❋ خوشنود سلطانپوری ❋ احمد علوی

باب ۱

بہترین کھانوں کیلئے
ایک ہی نام
دہلی دربار
Delhi Darbar
AIRCONDITIONED
RESTAURANT

اقبال
البم
اقبال ● لاہور ۱۸۹۹ء
اقبال ● لندن ۱۹۰۷ء
اقبال ● لندن ۱۹۰۷ء
اقبال ● شملہ ۱۹۲۲ء
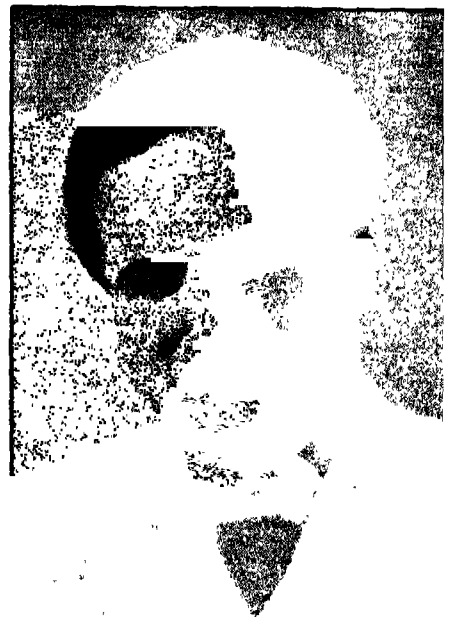
اقبال ● اپنی لائبریری ، لاہور ۱۹۲۲ء

اقبال ● لاہور ۱۹۲۲ء

اقبال ● پیرس ۱۹۳۱ء

اقبال ● لاہور ۱۹۳۱ء

اقبال ● پیرس ۱۹۳۱ء

اقبال کا ایک روپ
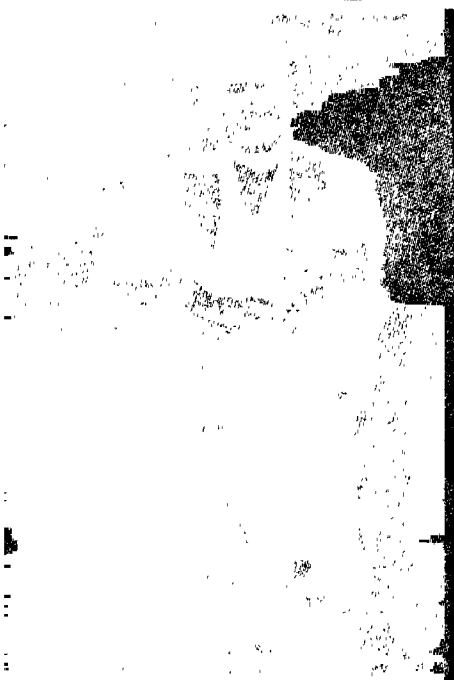
پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۱۹۳۲ء میں اقبال کو ڈی لٹ کی
اعزازی ڈگری عطا کی۔ اس موقع کی دو تصویریں۔
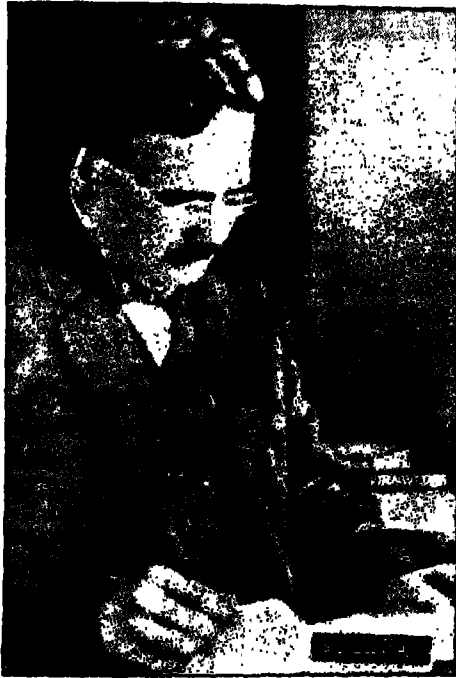
اقبال محوِ مطالعہ
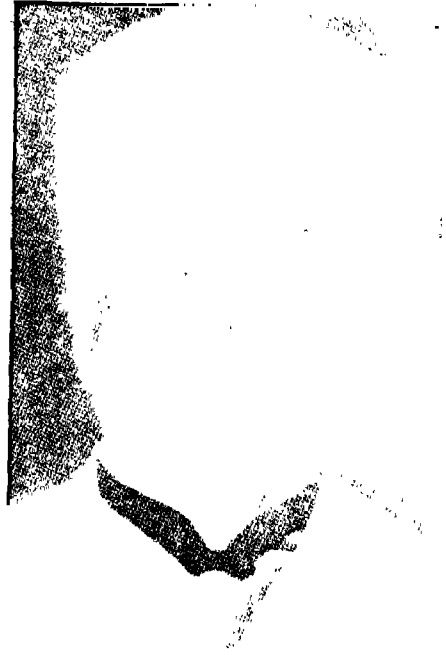
اقبال ● لاہور ۱۹۳۲ء

اقبال ● لاہور ۱۹۳۵ء

اقبال ● لاہور ۱۹۳۴ء

اس تصویر میں اقبال جس شیروانی میں ملبوس ہیں اس کا کپڑا ان کے عزیز دوست مہاراجہ سرکشن پرشاد نے حیدرآباد سے بطور تحفہ بھجوایا تھا۔

اقبال ● لاہور ۱۹۳۳ء
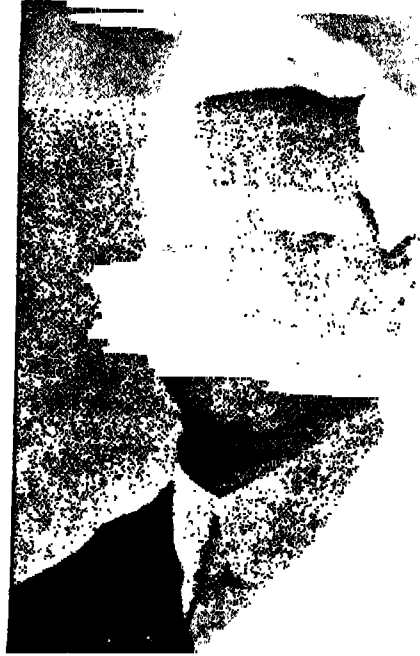
اقبال ● ۱۹۰۰ء کے بعد

اقبال ● عالم پیری میں

اسکول اور کالج کی اسناد

DUPLICATE

The University of the Panjab.

Session 1891

This is to certify that Mohammad Iqbal of the Sialkot Scotch Mission High School, Sialkot passed the Anglo-Vernacular Middle School Examination 1891.

Arabic and Persian

3rd February 1907.

مڈل کا سرٹیفکٹ ● ۱۸۹۱ء

THE UNIVERSITY OF THE PANJAB.

ARTS

SESSION 1899.

This is to certify that Mohammad Iqbal son of Shaikh Nur Muhammad of the Government College Lahore has obtained the Degree of MASTER OF ARTS in this University at the Examination in the year 1899 and that he was placed in the Class, the Subject of Examination being Philosophy

Registrar.

Countersigned.

REGISTRAR'S OFFICE LAHORE

The 189

Chancellor of the University of the Panjab.

ایم۔ اے کی ڈگری ● ۱۸۹۹ء

THE UNIVERSITY OF THE PANJAB.

ARTS

SESSION 1897.

This is to certify that Shaikh Muhammad Iqbal son of Shaikh Nur Muhammad of the Government College Lahore has obtained the Degree of BACHELOR OF ARTS in this University at the Examination in the year 1897 and that he was placed in the Second Division.

Registrar

REGISTRAR'S OFFICE. LAHORE.

The 189

Countersigned

Chancellor of the University of the Panjab.

بی۔ اے کی ڈگری ● ۱۸۹۷ء

University of Cambridge

CERTIFICATE OF RESEARCH

This is to certify that Sheikh Muhammad Iqbal of Trinity College admitted as Advanced Student of the University of Cambridge has submitted to the Degree Committee of the Special Board for Moral Science a Dissertation entitled

Development of Metaphysics in Persia

embodying the results of his own investigations. And that in the opinion of the said Committee the work so submitted is of Distinction as an original contribution to learning.

Ernest Stewart Roberts, Vice-Chancellor

J. N. Keynes, Chairman of the Special Board

John Willis Clark, Registrary

Cambridge 7 May 1907

کیمبرج یونیورسٹی سے ریسرچ سرٹیفکٹ ● ۱۹۰۷ء

SUB AUSPICIIS GLORIOSISSIMIS

AUGUSTISSIMI AC POTENTISSIMI DOMINI DOMINI

OTTONIS

BAVARIAE REGIS

COMITIS PALATINI AD RHENUM BAVARIAE FRANCONIAE ET IN SUEVIA DUCIS CET

IN INCLYTA UNIVERSITATE LUDOVICO-MAXIMILIANEA MONACENSI

RECTORE MAGNIFICO

PLURIMUM REVERENDO AC DOCTISSIMO ET ILLUSTRISSIMO VIRO

MAXIMILIANO ENDRES

PROMOTOR LEGITIME CONSTITUTUS

EXPERIENTISSIMUS ET SPECTATISSIMUS VIR

HERMANNUS WILHELMUS BREYMANN

FACULTATIS PHILOSOPHICAE SECT I P T DECANUS ET PROMOTOR LEGITIME CONSTITUTUS

PRAECLARO ET PERDOCTO VIRO AC DOMINO

SHEIKH MUHAMMAD IQBAL

EX OPPIDO SIALKOT

EXAMINIBUS RIGOROSIS MAGNA CUM LAUDE SUPERATIS

DISSERTATIONE INAUGURALI SCRIPTA TYPISQUE MANDATA

„THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA"

DOCTORIS PHILOSOPHIAE GRADUM

CUM OMNIBUS PRIVILEGIIS ATQUE IMMUNITATIBUS HUIC ADNEXIS

DIE IV MENSIS NOVEMBRIS MDCCCCVII

EX UNANIMI ORDINIS PHILOSOPHORUM SECT I DECRETO CONTULIT

(L.S.) (L.S.)

میونخ یونیورسٹی کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند ● ۱۹۰۷ء

شجرہ نسب خاندانِ اقبال

علامہ اقبال کا یہ شجرہ عام طور پر اقبال سے متعلق رسائل و کتب میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ شاعر کے اقبال نمبر میں بھی یہی شجرہ دیا جا رہا ہے اس میں صرف دو اضافے درج کیے جاتے ہیں۔ شیخ اعجاز احمد [برادر زادۂ اقبال] نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں مذکورہ شجرے کو شامل کرتے ہوئے شیخ نور محمد کی صاحبزادی فاطمہ بیگم کے صاحبزادے فضل الٰہی

کی بیوی کا نام اکبری بیگم حاشیے میں درج کیا ہے۔ دوسرا تحقیق طلب اضافہ یہ کہ آفتاب اقبال نے اکبر علی خاں عرشی زادہ کو اپنی تحریر میں جو شجرۂ اقبال ارسال کیا تھا اس میں فاطمہ بیگم کے نام کی جگہ جنوں بی بی تحریر کیا ہے۔ اب یا تو شیخ نور محمد کی اولادوں میں اس نام کی کوئی صاحب زادی رہی ہوں گی یا پھر فاطمہ بیگم ہی کا گھریلو نام جنوں بی بی رہا ہوگا۔ [ادارہ]

- بابا لول حاج (پندرھویں صدی میں مشرف بہ اسلام ہوئے)
  - نامعلوم پشتوں کے بعد
  - شیخ اکبر
  - دو یا تین پشتوں کے بعد
  - جمال الدین
    - عبدالرحمٰن
      - محمد حیات
        - اللہ دتہ (لاولد)
        - تین لڑکیاں
      - احمد
        - سراج دین (ص) ، تاج دین (ص) ، حاکم بی (ص) ، حسن بی (ص) ، زینب (ص) ، احمد دین (ص) ، حیات (ص)
    - محمد رمضان
      - عائشہ بی
      - بیگم (ص)
    - محمد رفیق
      - نور محمد
        - عطا محمد
          - اکبری بیگم
          - اعجاز احمد
            - تحسین احمد (ص) ، عاصم (ص) ، نائلہ (فوت شدہ) ، خلیل احمد (فوت شدہ) ، نادرہ (ص) ، آنسہ (ص) ، نسیم احمد (ص)
          - امتیاز احمد
            - انتظار احمد (ص)
          - مختار احمد
            - نصیر احمد (ص) ، بشیر احمد (ص) ، محمود (ص) ، ستارہ (ص) ، قدسیہ (ص)
          - حمیدہ بیگم
            - فاروق (ص) ، محمود (ص) ، ضیا (ص) ، ناہید (ص)
          - وسیمہ بیگم
            - خالد (ص) ، طارق (ص) ، بشریٰ (ص)
        - فاطمہ بی
          - فضل الٰہی
          - فضل حق (ص)
        - طالع بی
          - نور احمد (ص) ، خورشید احمد (ص) ، ظہور احمد (ص) ، منظور احمد (ص)
        - محمد اقبال
          - آفتاب اقبال
            - آزاد اقبال ، وقار اقبال ، نوید اقبال
          - معراج بیگم (فوت شدہ)
          - جاوید اقبال
            - منیب اقبال ، ولید اقبال
          - منیرہ بیگم
            - اسد ، یوسف (ص) ، اقبال
        - کریم بی
          - شفیع الحق (ص) ، محمد سرور (ص) ، محمد صفدر (لاولد)
        - زینب بی (لاولد)
      - غلام محمد
        - عنایت بی
          - محمد حیات
          - برکت
        - محبوب بی
          - مہراں
            - فاطمہ (ص) ، رضیہ (ص) ، اصغری (ص) ، انعام اللہ (ص)
    - عبداللہ
      - فتح محمد
        - محمد دین
          - عزیز دین
            - بشیر احمد
          - اسمٰعیل
            - احمد حسین ، اکرام حسین
          - ابراہیم
            - فرہاد حسین ، اعجاز حسین
        - تاج دین
          - غلام حیدر (ص) ، غلام حسین (ص)
        - چراغ دین
          - الطاف حسین (ص) ، تراب حسین (ص) ، نیاز حسین (ص)

(ص) اولاد کی تفصیل درج نہیں کی گئی۔

توقیتِ اقبال

علامہ اقبال کے سلسلۂ نسب وحسب کے تعین میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بابا لول حج سے جمال الدین [اقبال کے پردادا] تک کوئی حتمی تحقیق تفصیل نہیں ملتی۔ محمد دین فوق سے تاحال بشمول ڈاکٹر محمد اقبال [مکتوب بنام شیخ عطا محمد، محررہ ۵ راکتوبر ۱۹۲۵ء] کچھ بھی طے نہیں ہو سکا ہے۔ ہند و پاک کے ادبی رسائل وکتب کو اشاعت کے لیے جو "شجرۂ نسب" فراہم کیا گیا ہے اس میں بابا لول حج، شیخ اکبر اور جمال الدین کے درمیان کئی پشتیں نامعلوم بتائی گئی ہیں۔ شیخ جمال الدین کے چار لڑکے تھے: عبدالرحمان، محمد رمضان، محمد رفیق اور عبداللہ۔ ان چاروں بھائیوں میں سے شیخ محمد رفیق کی اولادوں میں شیخ نور محمد عرف نتھو [اقبال کے والد، ان سے قبل محمد رفیق کے دس بچے عالم شیرخواری ہی میں فوت ہو چکے تھے] اور غلام محمد ہوئے۔ شیخ نور محمد کی اولادوں میں عطا محمد، فاطمہ بی، طالع بی، محمد اقبال، کریم بی اور زینب بی شامل ہیں۔

اقبال کی سنہ ولادت کا اختلاف مفروضہ سنین کے اپنے اپنے تحقیقی شواہد کے باوجود طے نہیں ہو سکا ہے۔ پاکستان میں ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء کو حتمی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دیگر تاریخوں میں ۱۸۷۰ء، ۱۸۷۲ء، ۱۸۷۳ء، ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۶ء بھی موجود ہیں۔ ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۷ء پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور خاصی بحثیں موجود ہیں۔ تمام اختلافات کی موجودگی میں ۱۸۷۷ء ہی کو بنیاد مان کر اس توقیت کی تشکیل کی گئی ہے کیوں کہ پاکستان میں اب اقبال پر جو بھی کام ہو رہا ہے اسی سنہ پیدائش کے اندراج کے ساتھ ہو رہا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اقبال کے سوانح میں اختلافی امور میں جمہور کے اجماع کو حکم تسلیم کیا جائے۔

توقیتِ اقبال کی ترتیب میں کوشش یہی رہی کہ تقریباً تمام ہی اہم تاریخیں درج کر دی جائیں تاہم ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ ابھی اس میں بہت سی گنجائش موجود ہیں، کئی ایک واقعات اور تاریخیں تحقیق طلب ہیں۔ اقبال کے توقیت نگاروں کے یہاں اختلافات کی کمی نہیں۔ اقبال کے سوانح پر خاصہ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے پاکستان میں کئی کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں جن تک رسائی نہیں ہو سکی۔ کوئی ایسی مکمل توقیت بھی سامنے نہیں آ سکی جسے معیاری و مستند کہا جا سکے یا جس سے استفادہ کیا جا سکے۔ عام طور پر جو توقیت کتب و رسائل میں نظر آتی ہے وہ خود تحقیق طلب ہے۔ توقیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ ایک ایسا تاریخ نامہ تیار کیا جائے جو پوری زندگی کو تصویر کر دے۔

"توقیتِ اقبال" کی ترتیب میں درج ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے۔

(۱) روزگارِ فقیر۔ فقیر سید وحید الدین، ۱۹۵۰ء۔ ۱۹۸۷ء (۲) کتابیاتِ اقبال۔ رفیع الدین ہاشمی، ۱۹۷۷ء (۳) توقیتِ اقبال مرتبہ: جگن ناتھ آزاد، ۷۷ (۴) اقبال۔ دانائے راز، عبداللطیف اعظمی، ۱۹۷۸ء (۵) دانائے راز۔ سید نذیر نیازی، ۱۹۷۹ء (۶) زندہ رود۔ جاوید اقبال، ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۴ء (۷) تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ رفیع الدین ہاشمی، ۱۹۸۲ء (۸) مظلوم اقبال۔ اعجاز احمد، ۱۹۸۵ء (۹) اقبال یورپ میں۔ سعید اختر درانی، ۱۹۸۵ء (۱۰) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے۔ محمد حمزہ فاروقی، ۱۹۸۸ء۔

1877ء

جمعہ 9 نومبر

1294ھ

3 ذیقعد ○ سیالکوٹ [پنجاب] میں پیدائش۔

1882ء

○ مکتبہ عرشاہ۔ محلہ شوالہ سیالکوٹ کی مسجد میں ابو عبداللہ مولانا غلام حسن [م : 18 جنوری 1925ء] کے مکتب میں۔ کوچہ میر حسام الدین میں مولانا میر حسن کے مکتب میں۔ اردو، عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی قرآن مجید کا درس لیا۔

1882ء

○ شعری شخصیت کی تشکیل میں سید میر حسن کا فیضان۔

1883ء

○ اسکاچ مشن اسکول [سیالکوٹ] میں داخلہ۔

1888ء

○ پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ اس دور میں تعلیمی درجہ بندی یوں تھی : پرائمری اول دو سال۔ پرائمری دوم، 3 سال

1891ء

○ مڈل کا امتحان پاس کیا۔ شعر بھی موزوں کرنے لگے تھے۔

1893ء

4 مئی ○ میٹرک اول درجہ میں پاس کیا۔ اسی تاریخ کو اقبال کی شادی گجرات [پنجاب] کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی [م : 30 نومبر 1946ء] سے ہوئی۔

5 مئی ○ اسکاچ مشن کالج [مرے کالج] میں داخلہ۔

○ استاد داغ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا

نومبر ○ ماہنامہ زبان دہلی میں غزل شائع ہوئی۔

1894ء

○ تعلیمی سلسلہ جاری رہا اور شاعری بھی ادبی رسائل میں کلام شائع ہونے لگا تھا۔

فروری ○ ماہنامہ زبان [دہلی] میں غزل شائع ہوئی۔

1895ء

○ انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے سیالکوٹ سے لاہور ہجرت کی۔

ستمبر ○ گورنمنٹ کالج [لاہور] میں بی اے، میں داخلہ لیا۔ سیالکوٹ سے آنے کے بعد چند روز اپنے دوست شیخ گلاب دین کے ساتھ قیام کرنے کے بعد کواڈرینگل ہوسٹل کے کمرہ نمبر 1، میں فروکش ہوئے۔

1896ء

فروری ○ انجمن کشمیری مسلمان کا قیام اور مشاعروں کا آغاز۔ مشاعروں میں اقبال کی شرکت 25 اشعار پر مشتمل نظم "گلزارِ قوم" سنائی۔ 4 سال تک اسی ہوسٹل میں رہے۔ اقبال کے یہاں پہلی بیوی سے لڑکی معراج بیگم کی پیدائش۔

30 نومبر ○ سیالکوٹ سے لاہور آنے کے بعد حکیم امین الدین بیرسٹر کے عالیشان مکان پر منعقد ایک مشاعرے میں شرکت کی۔

دسمبر ○ بازارِ حکیماں بر مکان حکیم شجاع الدین محمد دوسرے اردو "بزمِ مشاعرہ" میں شرکت کی۔

1897ء

○ بی اے کا امتحان سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ ایم اے۔ [فلسفہ] میں داخلہ لیا۔

1898ء

11 فروری ○ طامس آرنلڈ علی گڈھ سے لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اقبال سے یہیں تعلق ہوا۔ استادی اور شاگردی کا یہی تعلق اقبال کی فکر اور شاعری پر اثر انداز ہوا۔

○ آفتاب احمد اقبال [م : 1979ء] کی پیدائش۔

○ ایم۔ اے کی کلاسوں کے ساتھ لاہور لا، اسکول کی جماعتوں میں قانون کے طالب علم کی حیثیت سے شرکت۔ دسمبر میں ہوئے قانون کے ابتدائی امتحان میں اصولِ قانون کے پرچے میں ناکام رہے۔

1899ء

مارچ ○ ایم۔ اے کا امتحان تیسرے درجے میں پاس کیا یونیورسٹی بھر میں فلسفے کے واحد کامیاب طالب علم تھے۔ انعام سے نوازے گئے۔

اپریل ○ آرنلڈ نے اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔

13 مئی ○ اورینٹل کالج کے میکوڈ عربک ریڈر کے طور پر اقبال کا تقرر ہوا۔ ریڈر سے مراد ہے ریسرچ اسکالر جس میں :

1۔ عربی کتب نصاب کی طباعت کی نگرانی

2۔ عربی انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ

3۔ درس و تدریس

72 روپے 13 آنے ماہانہ مشاہرے پر انھیں یہ نوکری ملی

12 نومبر ○ انجمن حمایت اسلام لاہور [قیام : 1884ء] کے رکن بنائے گئے۔

1900ء

14 فروری ○ انجمن حمایت اسلام کے 15 ویں سالانہ جلسے میں پہلی بار نظم "نالۂ یتیم" ترنم سے سنائی۔

چیف کورٹ [لاہور] میں درخواست دی کہ دسمبر میں ہونے والے امتحان [پی۔ ای۔ ایل] میں لکچروں سے مستثنیٰ رعایت کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دی جائے، مگر یہ رعایت تسلیم نہیں کی گئی۔

گورنمنٹ کالج میں تعلیم کے خاتمے کے بعد ا[...] کواڈرینگل ہوسٹل سے بھاٹی دروازہ [...] ایک کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ کئ[ی] کے مکانات تبدیل کرتے ہوئے کوچہ جلوٹیاں مکان نمبر: "ے 592۔ بی" میں منتقل ہو گئے جہ[اں] ان کا قیام وسط 1905ء تک رہا۔

اسی مکان میں وفادار علی بخش [م : 1969ء] نے اقبال کی ملازمت کی۔

ستمبر ○ عبدالکریم الجیلی کی کتاب "نظریۂ توحیدِ مطلق" انگریزی میں ایک مضمون "انڈین انٹی کیو[ری]" کے 29 ویں شمارے میں شائع ہوا۔

1901ء

یکم جنوری ○ اورینٹل کالج کی ملازمت کے دوران ہی 6 ما[ہ] رخصت بلا تنخواہ، گورنمنٹ کالج لاہور میں انگ[ریزی] اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔

4 جنوری ○ لالہ جیا رام کی جگہ گورنمنٹ کالج لاہور میں اسس[ٹنٹ] پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ 28 دن اس پر کام کیا۔

شیخ عبدالقادر [پ : 1874ء۔ م : 1950ء] کی اسلامیہ کالج سے کچھ عرصے کے لیے رخصت کی جگہ انگریزی ادب پڑھایا۔

ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان [ای۔ سی] میں کامیاب ہوئے لیکن دائیں آنکھ کمزور ہونے کے سبب میڈیکل میں ان فٹ دوسری لڑکی پیدا ہوئی اور فوت ہو گئی۔

24 فروری ○ انجمن حمایت اسلام کے 16 ویں سالانہ جلسے [میں] دوسری مشہور نظم "دیدِ دل یا یتیم کا خطاب ہلال عید سے" پڑھی۔ یہ نظم 151 اشعار پر مشتمل ہ[ے] بانگِ درا میں شامل نہیں

اپریل ○ "مخزن" [لاہور] کے پہلے شمارے میں "کوہستا[نِ ہمالہ]" کے عنوان سے نظم شائع ہوئی۔ یہ نظم کا اولین [روپ] تھا۔ "بانگِ درا" میں "ہمالہ" کے عنوان سے [...]

انجمن "کشمیری مسلمان" کے سکریٹری بنائے گئے۔ [...] میں اس انجمن کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اقبال شرو[ع] سے اس کی سرگرمیوں میں شامل رہے تھے۔ [...] کچھ مدت بعد یہ انجمن ختم ہو گئی تھی اور 1901ء دوبارہ اس کو جاری کیا گیا۔

1902ء

جنوری ○ بچوں کی تعلیم و تربیت کے موضوع پر ماہ[نامہ] مخزن میں ایک مضمون شائع ہوا۔

23 فروری ○ انجمن حمایت اسلام کے 17 ویں سالانہ جلسے [میں] صدرِ جلسہ میاں نظام الدین [سپھنگ والا] نے اقبال کو "ملک الشعراء" کا خطاب دیا۔

یکم جون ○ دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء تک۔

۱۹۰۴ء

۱۷ مئی ○ اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی مدت ملازمت ختم ہوئی۔

۳ جون ○ گورنمنٹ کالج میں دوبارہ بہ حیثیت اسسٹنٹ پروفیسر [انگریزی] تقرر ہوا۔

۳ دسمبر ○ گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی مدت ختم ہوئی، اسی ملازمت میں ۶ ماہ کی توسیع کی گئی۔

۱۹۰۴ء

۲۶ فروری ○ طامس آرنلڈ گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر [ابتدا: ۱۱ فروری ۱۸۹۸ء] لندن چلے گئے۔ اقبال نے اپنے شفیق استاد کی جدائی میں "نالۂ فراق" کے عنوان سے ۲۴ اشعار کی ایک پراثر نظم تخلیق کی۔

۳۱ مارچ ○ اسسٹنٹ پروفیسری کی ملازمت ختم ہوئی لیکن اس مدت میں مزید توسیع کی گئی اور فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوئے تنخواہ دو سو روپیہ سے ۲ سو پچاس ہوگئی۔ یورپ جانے تک اسی منصب پر فائز رہے

مئی ○ "مخزن" میں نظم "نالۂ فراق" شائع ہوئی۔

اگست ○ اپنے بڑے بھائی عطا محمد [پ: ۱۸۵۹ء۔ م: ۲۶ دسمبر ۱۹۴۰ء] کے پاس چند روز کے لیے ایبٹ روڈ گئے جہاں "قومی زندگی" کے موضوع پر ایک لکچر دیا۔

اکتوبر ○ مقالہ "قومی زندگی" رسالہ "مخزن" میں شائع ہوا۔ اقبال کی پہلی اردو تصنیف "علم الاقتصاد" لاہور سے شائع ہوئی۔ معاشیات کے موضوع پر یہ کتاب لکھی گئی تھی۔

۱۹۰۵ء

۱۷ فروری ○ اقبال کے استاد حضرت داغ دہلوی [پ: ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء] کا انتقال ہوا۔ اقبال نے داغ پر ۲۷ اشعار کا ایک مرثیہ تخلیق کیا۔

۱ ستمبر ○ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لاہور سے یورپ روانہ ہوئے۔

۳ ستمبر ○ دہلی پہنچے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پہ حاضری دی۔ اور ۳۶ اشعار پر مشتمل اپنی نظم "التجائے مسافر" سنائی۔

○ یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۳ سال کے لیے بلا تنخواہ رخصت لی۔

۱ اکتوبر ○ ٹرنٹی کالج کیمبرج کے رجسٹر داخلہ [۱۸۸۲ء۔ ۱۹۱۳ء] پر دستخط کیے اور اپنے مختصر کوائف اس میں درج کیے۔

۶ نومبر ○ "لنکزان" میں بیرسٹری کے لیے داخلہ لیا۔ [محمد علی جناح نے بھی یہیں سے بیرسٹری کی ڈگری لی تھی]

۱۹۰۶ء

۷ مارچ ○ بی اے کی ڈگری کے لیے فلسفہ اخلاقیات کے شعبہ میں ایک مقالہ داخل کیا۔

اپریل ○ کیمبرج میں قیام کے دوران مقالے کی تیاری کے ساتھ ساتھ شعرگوئی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ہندوستان میں سودیشی تحریک کے متعلق چند سوالات کا جواب ایک مضمون کی صورت میں "زمانہ" کانپور میں شائع ہوا۔

۱۹۰۷ء

اپریل ○ لندن میں پہلی بار عطیہ فیضی [پ: یکم اگست ۱۸۷۷ء۔ م: جنوری ۱۹۶۷ء] سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔

۱۳ جون ○ کیمبرج یونیورسٹی نے بی۔ اے کی ڈگری عطا کی۔

۲۰ جولائی ○ جرمنی پہنچے۔

۴ نومبر ○ میونخ یونیورسٹی [جرمنی] میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے اپنا انگریزی مقالہ "ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء" کے موضوع پر داخل کیا۔ میونخ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ موضوع وہی "ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء" تھا۔

۱۹۰۸ء

○ سر طامس آرنلڈ ۶ ماہ کی رخصت پر مصر گئے تو اقبال کو اپنی جگہ عربی میں لکچر دینے کے لیے مقرر کر گئے۔

بی۔ اے اور پی ایچ ڈی کا مقالہ انگریزی میں "ڈولپمنٹ آف میٹافزکس ان پرشیا" کے عنوان سے شائع ہوا۔

یکم جولائی ○ لنکزان سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔

۲۶ جولائی ○ لندن سے دہلی پہنچے اور محبوب الٰہی کے مزار پر حاضری دی۔

۲۷ جولائی ○ دہلی سے لاہور پہنچے اور اسٹیشن پر شاندار استقبال کیا گیا۔

اگست ○ سیالکوٹ پہنچنے پر پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔

○ یورپ سے آنے کے بعد قانون کی پریکٹس پنجاب کی عدالتوں سے شروع کی۔

۲۰ اکتوبر ○ بہ حیثیت ایڈوکیٹ انرولمنٹ ہوئی۔

۱۹۰۹ء

۲۲ جنوری ○ انجمن کشمیری مسلمان لاہور کا قیام عمل میں آیا۔

۶ فروری ○ انجمن کشمیری مسلمان لاہور کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔

۲۴ فروری ○ انجمن حمایت اسلام کی مجلس انتظامیہ کے ۳ سال کے لیے رکن منتخب ہوئے۔

۱۰ مئی ○ گورنمنٹ کالج میں عارضی طور پر فلسفے کی تدریس کے لیے مدعو کیے گئے۔

○ لا پبلشنگ ہاؤس لاہور کے ایک جریدے "انڈین کیسز لاء رپورٹس" کے حلقۂ ادارت میں بطور جائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے

۱۹۱۰ء

۲ فروری ○ انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔

○ سردار بیگم [دوسری بیوی] سے نکاح ہوا لیکن رخصتی نہیں ہوئی۔

۴ مارچ ○ پنجاب یونیورسٹی کا فیلو نامزد کیا گیا۔

۱۸ مارچ ○ کالج سے دس دن کی رخصت لے کر حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے اور سر اکبر حیدری [۱۸۸۹ء۔ ۱۹۴۲ء] کے یہاں قیام کیا۔

۲۸ مارچ ○ حیدرآباد سے لاہور واپس ہوئے۔

۲۶ جولائی ○ انجمن حمایت اسلام کی کالج کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

۳۱ دسمبر ○ گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ کالج کی طرف سے الوداعی پارٹی میں طلباء کو رابرٹ براؤننگ کی شاعری کے موضوع پر اپنا آخری لکچر دیا۔

۱۹۱۱ء

○ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے تیسرے اجلاس کی صدارت کی۔

۱۵ اپریل ○ پنجاب پراونشل ایجوکیشنل لاہور کی داغ بیل پڑی اور ڈاکٹر اقبال اس کی ایگزیکیٹو کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

۱۹۱۲ء

۱ فروری ○ باغ بیرون موچی دروازہ مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔

○ برصغیر کے لیے لازمی تعلیم کا بل امپریل قانون ساز کونسل میں پیش ہوا اس کی حمایت میں لاہور میں منعقد ہوئے جلسے کی صدارت کی۔

۱۹۱۳ء

○ لالہ رام پرشاد [پروفیسر تاریخ، گورنمنٹ کالج] کے اشتراک سے نصابی کتاب "تاریخ ہند" مرتب کی۔

○ مختار بیگم [تیسری بیوی] سے نکاح ہوا اسی سال سردار بیگم سے تجدید نکاح کیا۔ کیوں کہ ۱۹۱۰ء میں شادی کے بعد رخصتی نہیں ہوئی تھی اور بعض گمنام خطوط کے سبب نہ صرف یہ کہ معاملہ التوا میں پڑگیا تھا بلکہ اقبال نے دل میں طلاق دینے کے متعلق سوچ لیا تھا۔

۷ ستمبر ○ کانپور ایک مقدمے کے سلسلے میں پہنچے۔

۹ ستمبر ○ الہ آباد میں اکبر الہ آبادی سے ملاقات کی۔

۱۰ر ستمبر ○ الٰہ آباد سے لاہور جاتے ہوئے دہلی میں حکیم اجمل خاں سے ملاقات کی۔

۱۹۱۴ء

۱۸ر جنوری ○ مولانا گرامی کو تحریر کیا کہ: "اردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہوتا جاتا ہوں، فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ دل کا بخار اردو میں نکال نہیں سکتا۔"

۱۲ر ستمبر ○ فارسی شاعری کا مجموعہ "اسرارِ خودی" شائع ہوا۔

۹ر نومبر ○ والدۂ اقبال امام بی بی کا انتقال ہوا۔ اقبال نے ایک طویل مرثیہ تخلیق کیا جس کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

۱۷ر نومبر ○ پہلی بیٹی معراج بانو کا انتقال ہوا۔

۱۹۱۶ء

۲۰ر جنوری ○ انجمن حمایت اسلام کی جنرل کاؤنسل کے رکن منتخب ہوئے۔

۸ر جولائی ○ دردِ گردہ کی پہلی شکایت۔

۱۹۱۷ء

جولائی ○ رسالہ "مخزن" میں قومی زندگی کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا۔

اکتوبر ○ بچوں کی تعلیم و تربیت کے موضوع پر "مخزن" میں ایک مقالہ شائع ہوا۔

۱۹۱۸ء

اپریل ○ "رموزِ بے خودی" کی اشاعت عمل میں آئی۔

جون ○ "اسرارِ خودی" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

۱۵ر دسمبر ○ پہلی جنگِ عظیم کی فتح [۱۱ر نومبر] کی خوشی میں جلسہ عام ہوا تو گورنر پنجاب سر مائیکل اوڈوائر کی فرمائش پر اقبال نے چند نظمیں سنائیں۔

۱۹۱۹ء

○ اورینٹل فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔

دسمبر ○ امرتسر میں حکیم اجمل خاں کی صدارت میں مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں علی برادران نے بھی شرکت کی۔ اقبال نے علی برادران کی رہائی کی خوشی میں اپنی نظم "اسیری" سنائی۔

۲۴ر دسمبر ○ انجمن حمایت اسلام کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔

۳۰ر دسمبر ○ میاں فضل حسین کی صدارت میں منعقد ہوئے ایک جلسۂ عام میں ترکوں کی حمایت میں تقریر کی۔ یہ جلسہ بیرون موچی دروازہ لاہور میں منعقد ہوا تھا۔

۱۹۲۰ء

○ مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن [۱۸۶۸ء-۱۹۴۵ء] نے کیا جسے مشہور میکملن کمپنی لیمٹڈ نے شائع کیا۔

۲۰ر دسمبر ○ نیاز الدین خاں نیازی کو لکھا کہ "انجمن حمایت اسلام کی سکریٹری شپ سے استعفا منظور دیا تھا مگر کام اب تک کر رہا ہوں اور جب تک استعفا منظور نہ ہو، کام کرتا رہوں گا۔"

۱۹۲۱ء

جون ○ مولوی احمد دین وکیل اور اپنے منشی طاہر دین کے ہمراہ ایک مقدمے کی پیروی میں پہلی مرتبہ کشمیر گئے۔ تقریباً دو ہفتے قیام کیا اور جولائی کے پہلے ہفتے میں لاہور واپس آئے۔

۱۳ر نومبر ○ روزنامہ زمیندار [لاہور] میں گاندھی جی کی تعریف میں اقبال کے پانچ شعر شائع ہوئے۔

۱۹۲۲ء

۳۱ر جولائی ○ انجمن حمایت اسلام کی جنرل سکریٹری سے مستعفی ہو گئے۔

۱۴ر اکتوبر ○ انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۲۳ء

۱ر جنوری ○ سر کا خطاب عطا ہوا

۱۷ر جنوری ○ سر کے خطاب پر معززینِ لاہور کی طرف سے مقبرۂ جہانگیر میں استقبالیہ دیا گیا۔

پنجاب یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے رکن۔

پروفیسر شپ کمیٹی کے رکن۔

۱ر مئی ○ "پیامِ مشرق" کی اشاعتِ اوّل۔

"اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کو ملا کر "اسرار و رموز" [یکجا] کے نام سے شائع کیا گیا۔

۱۹۲۴ء

مارچ ○ پیامِ مشرق کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

ستمبر ○ اردو نظموں غزلوں کا اوّلین مجموعہ "بانگِ درا" شائع ہوا۔

۵ر اکتوبر ○ جاوید اقبال کی پیدائش۔

۱۲ر اکتوبر ○ مختار بیگم [والدۂ آفتاب اقبال] کا لدھیانہ میں انتقال ہوا۔

○ پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ، مشاورتی کمیٹیوں اور امتحانات وغیرہ کی کارگزاری کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز کمیٹی کے ممبر۔ پنجاب یونیورسٹی سے اقبال کا عملی تعلق ۱۹۳۲ء تک رہا۔

○ حکیم احمد شجاع کے تعاون سے اسکول کے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں درجے کے طلباء کے لیے تعلیمی نصاب [اردو کورس] مرتب کیا۔

۱۹۲۵ء ○ اسلامیہ کالج لاہور میں "اسلام اور اجتہاد" کے عنوان سے ایک لکچر دیا۔ لکچر کے دوران اقبال نے بڑے جوش کے ساتھ ترکی شاعر ضیا، کا کلام سنایا۔

۱۹۲۶ء

ستمبر ○ "بانگِ درا" کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت۔

۶ر دسمبر ○ پنجاب مجلس قانون ساز کے انتخابات میں اقبال کی کامیابی کا اعلان ہوا۔

۱۹۲۷ء

۱۰ر مارچ ○ پنجاب مجلس قانون ساز کے بجٹ سیشن میں تعلیم کے مسئلے پر پہلی مرتبہ اقبال نے تقریر کی۔

۱۶ر اپریل ○ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں "نیچر آف اسلامک کلچر" کے موضوع پر انگریزی میں تقریر کی۔

۲۶ر مئی ○ اقبال کے مخلص دوست اور صلاح کار مولانا قادر گرامی [پ: ۱۸۵۶ء] کا انتقال ہوا۔

جون ○ زبورِ عجم کی اشاعت۔

پنجاب لیجسلیٹو کاؤنسل کے رکن منتخب ہوئے تھے ۱۹۳۰ء تک اس سے وابستہ رہے۔

نومبر ○ مسلم لیگ مخلوط انتخاب کے مسئلے پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی جو عرفِ عام میں جناح لیگ اور سر شفیع لیگ کہلائیں۔ اقبال نے سر شفیع لیگ کا ساتھ دیا اور اس کی حمایت میں متعدد بیانات دیے جو ۱۸ر نومبر اور ۸ر دسمبر کے انقلاب [لاہور] میں شائع ہوئے۔

۱۹۲۸ء

۲۳ر فروری ○ پنجاب کونسل میں مالیۂ اراضی پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "مالیہ وصول کرنے کا موجودہ طریقہ سراسر غیر منصفانہ ہے۔"

۱۸ر اپریل ○ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں فلسفۂ اسلام پر انگریزی میں تقریر کی۔

○ اسرار و رموز [یکجا] کی اشاعت دوم

۱۸ر مئی ○ دردِ گردہ کا حملہ اور علالت کی ابتدا۔ حکیم نابینا سے علاج کے لیے دہلی کا سفر کیا۔

۳۱ر دسمبر ○ بذریعہ فرنٹیئر میل لاہور سے دہلی کے لیے روانگی، سفر مدراس و دکن کے لیے۔

۱۹۲۹ء

۱ر جنوری ○ دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کی۔

۲ر جنوری ○ دہلی سے مدراس کے لیے روانگی۔ اقبال کے ہمراہ چودھری محمد حسین اور مولوی محمد عبداللہ چغتائی بھی ساتھ تھے۔

۳ر جنوری ○ فرنٹیئر میل سے بمبئی پہنچے اور ایک دن قیام کیا۔

۵ر جنوری ○ مدراس میں اقبال کا پرتپاک خیر مقدم۔ مسلمانانِ شہر نے سپاس نامہ پیش کیا۔

○ اسی دن شام میں گوکھلے ہال میں انگریزی میں اپنا پہلا خطبہ دیا۔

۶ر جنوری ○ بروز اتوار شام ۶ بج کر ۵ منٹ پر خطبات مدراس کے سلسلے کا دوسرا خطبہ دیا۔

۷ر جنوری ○ انجمن ترقی اردو مدراس کی جانب سے ایک پر تکلف دعوتِ اقبال کا اہتمام کیا گیا۔

۸ر جنوری ○ شام میں اپنا تیسرا خطبہ دیا۔

۹ر جنوری ○ مدراس سے بنگلور صبح سوا چھ بجے وارد ہوئے اور اہلِ بنگلور نے مثالی خیر مقدم کیا۔ اسی دن صبح دس بجے مسلم لائبریری اور انجمن ترقی اردو بنگلور نے سپاس نامہ پیش کیا، شام ۶ بجے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج میں انگریزی میں خطبہ

۱۰ر جنوری ○ سرنگا پٹنم روانہ ہوئے سلطان شہید کے مزار پر حاضری دی۔

۱۱ر جنوری ○ بروز جمعہ میسور ٹاؤن ہال میں بوقتِ عصر ٹھیک ۵ بجے مسلمانانِ شہر میسور اور یتیم خانۂ اسلامیہ کی طرف سے اقبال کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

۱۲ر جنوری ○ میسور یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات عمل کی دعوت پر تشریف لے گئے۔

○ بنگلور کے لیے روانگی۔

۱۳ر جنوری ○ صبح ساڑھے آٹھ بجے حیدرآباد اسٹیشن پر پرتپاک استقبال کیا گیا۔

۱۴ر جنوری ○ حیدرآباد میں مختلف اکابرینِ شہر سے ملاقاتیں۔

۱۵ر جنوری ○ خطباتِ مدراس میں سے ایک انگریزی لیکچر دیا۔

۱۶ر جنوری ○ اعلیٰ حضرت شہریارِ دکن نظام سے صبح ۱۱ بجے ملاقات کی۔ اسی دن لاہور کے لیے روانگی۔

۱۳ر اپریل ○ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں قرآن کا مطالعہ کے عنوان پر تقریر کی۔

مئی ○ پنجاب ہائی کورٹ کے جج کے عہدے کے لیے اقبال کا نام تجویز کیا گیا مگر تقرر نہ ہو سکا۔

جولائی ○ پیامِ مشرق کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا

۲۵ر ستمبر ○ مولوی میر حسن [پ ۱۸ر اپریل ۱۸۴۴ء] کا سیالکوٹ میں انتقال ہوا۔

۱۷ر نومبر ○ لاہور سے علی گڑھ کے لیے روانگی

۱۸ر نومبر ○ علی گڑھ کے اکابرین اور طلبہ سے ملاقاتیں۔

۱۹ر نومبر ○ علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں خطبہ دیا۔

۲۳ر نومبر ○ علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج یونین کے اعزازی لائف ممبر مقرر ہوئے۔

○ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔

۱۹۳۰ء

○ منیرہ بانو کی پیدائش۔

مارچ ○ "بانگِ درا" کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت۔

مئی ○ "خطباتِ مدراس" [انگریزی] کی اشاعت۔

۱۰ر جون ○ سر طامس آرنلڈ [پ ۱۹ر اپریل ۱۸۶۴ء] کا انتقال۔

۱۷ر اگست ○ اقبال کے والد شیخ نور محمد [پ ۱۸۳۷ء] کا انتقال ہوا۔

۲۹ر دسمبر ○ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسۂ الٰہ آباد کی صدارت کی۔

۱۹۳۱ء

اپریل ○ آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی میں شرکت کی۔

۲ر مئی ○ لاہور کے ایک جلسۂ عام کی صدارت کی جس میں جداگانہ طریقِ انتخاب کی حمایت کی گئی۔

۱۰ر مئی ○ مسلم عمائدین کے ایک جلسے منعقدہ بھوپال شرکت کی۔

۸ر ستمبر ○ دوسری گول میز کانفرنس کے لیے لاہور سے دہلی کے لیے روانگی۔

۹ر ستمبر ○ دہلی اسٹیشن پر پرتپاک استقبال والوداع کے لیے ہزاروں لوگوں کا ہجوم۔

۱۰ر ستمبر ○ بمبئی پہنچے اور تاج محل ہوٹل میں قیام کیا۔ اسی شام عطیہ بیگم فیضی کے مکان "ایوانِ رفعت" کی ایک شاندار دعوت میں شرکت کی۔

۱۱ر ستمبر ○ خلافت ہاؤس کے عصرانے میں شرکت کی۔

۱۲ر ستمبر ○ بحری جہاز سلوجا سے لندن کے لیے روانگی۔

۲۱ر نومبر ○ دوسری گول میز کانفرنس کے دوران ہی لندن سے بذریعہ ٹرین اٹلی کے لیے روانگی غلام رسول مہر شریکِ سفر تھے۔

۲۲ر نومبر ○ اٹلی سے روم پہنچے۔

۲۵ر نومبر ○ شاہ امان اللہ خاں سے روم میں ملاقات کی۔

۲۶ر نومبر ○ رائل اکاڈمی میں لیکچر دیا۔

۲۷ر نومبر ○ قصرِ وینس میں مسولینی سے ملاقات کی۔

۲۹ر نومبر ○ بذریعہ بحری جہاز مصر کے لیے روانگی۔

۱ر دسمبر ○ مصر سے اسکندریہ بذریعہ بحری جہاز روانگی۔ اسکندریہ سے قاہرہ روانگی۔

۵ر دسمبر ○ اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے بذریعہ ٹرین فلسطین پہنچے۔

۶ر دسمبر ○ بیت المقدس تشریف لے گئے۔

۷ر دسمبر ○ باقاعدہ اجلاس شروع ہوا۔ عہدے داروں کا انتخاب ہوا۔ چار نائب صدور میں سے ایک اقبال بھی منتخب ہوئے۔

۱۴ر دسمبر ○ انگریزی میں تقریر کی۔

۱۵ر دسمبر ○ فلسطین سے روانگی۔ جہاز کے انتظار میں دو روز تک پورٹ سعید میں رکنا پڑا۔ ۱۷ کو جہاز آیا تو اس میں سوار ہوئے۔

۲۸ر دسمبر ○ بمبئی آمد اور خلافت ہاؤس میں قیام۔ عطیہ فیضی سے ملاقات۔ اسی روز فرنٹیئر میل سے روانگی۔

○ ۲۹ر کو دہلی پہنچے۔

۳۰ر دسمبر ○ لاہور آمد۔

۱۹۳۲ء

فروری ○ "جاوید نامہ" کی اشاعت۔

۹ر مارچ ○ پہلا یومِ اقبال منایا گیا جس کا انتظام اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور نے کیا تھا۔

۲۱ر مارچ ○ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور کی صدارت کی۔

۲۰ر جون ○ آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفا دیا۔

۱۷ر اکتوبر ○ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور سے روانگی۔

۱۹ر اکتوبر ○ بمبئی آمد اور دو روزہ قیام۔

۲۲ر اکتوبر ○ بذریعہ بحری جہاز بمبئی سے یورپ کے مختلف شہروں کے لیے روانگی۔

۱۲ر نومبر ○ لندن میں آمد۔

۱۷ر نومبر ○ گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس۔

۲۴ر نومبر ○ نیشنل لیگ [لندن] کی طرف سے اقبال کا استقبال۔ اپنی مختصر سی تقریر میں اقبال نے تیسری گول میز کانفرنس سے متعلق اپنے امید افزا خیالات کا اظہار کیا۔

۱۹ر دسمبر ○ دار العلوم کمیٹی روم میں ایک تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں اقبال نے تقریر کی۔

۲۰ر دسمبر ○ لندن سے پیرس کے لیے روانگی۔

جنوری ○ اوائل میں اسپین پہنچے۔

۱۲ر جنوری ○ جنوبی ہسپانیہ سے میڈرڈ واپسی۔

۲۴ر جنوری ○ میڈرڈ یونیورسٹی میں لیکچر دیا۔

۲۶ر جنوری ○ پیرس آمد اور جنوری کے آخر تک قیام۔

۱۰ر فروری ○ وینس سے بذریعہ بحری جہاز ہندوستان کے لیے روانگی۔

۲۲ر فروری ○ صبح کو بمبئی آمد۔

۲۴ر فروری ○ بمبئی سے لاہور آمد اور عظیم الشان استقبال۔

۱۹۳۳ء

۱۸ر مارچ ○ جامعہ ملیہ میں غازی رؤف پاشا کے توسیعی خطبات کی صدارت کی۔

۲۰ر اکتوبر ○ افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ غازی کی دعوت پر سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے ہمراہ افغانستان کے لیے روانگی۔

۲۴ر اکتوبر ○ باغِ بابر میں گارڈن پارٹی۔

۲۶ر اکتوبر ○ نادر شاہ سے ملاقات۔

۲۸ر اکتوبر ○ انجمن ادبی کابل کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا۔

۱ر نومبر ○ کابل سے قندھار پہنچے۔

۲ر نومبر ○ چمن کے لیے روانگی۔

۳ر نومبر ○ کوئٹہ سے بذریعہ کراچی میل لاہور کے لیے روانگی۔

۴ر نومبر ○ لاہور آمد۔

۴ر دسمبر ○ پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

۱۹۳۴ء

۱۰ر جنوری ○ عید کا دن تھا، شدید سردی تھی، گرم سویوں پر دہی ڈال کر کھایا، نزلہ ہوا، گلا بیٹھ گیا، یہیں سے علالت کا آغاز ہوا۔

مئی ○ خطباتِ مدراس [انگریزی] کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت۔

۲۹ر جون ○ جاوید اقبال کے ساتھ سرہند شریف کی زیارت کا

۱ر جولائی ○ انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔
۱۷ر نومبر ○ لاہور سے شب میں علی گڑھ کے لیے روانگی محمد عبداللہ چغتائی ہمراہ تھے۔
۱۸ر نومبر ○ صبح علی گڑھ میں آمد۔
۲۰ر نومبر ○ اسٹریچی ہال علی گڑھ میں خطبہ دیا۔
۲۵ر نومبر ○ علی گڑھ سے لاہور آمد۔
نومبر ○ مثنوی مسافر [سیاحت افغانستان] کی اشاعت
نومبر ○ جاوید منزل کی تعمیر کی ابتدار۔

۱۹۳۵ء

جنوری ○ "بالِ جبریل" کی اشاعت۔
۳۱ر جنوری ○ بغرضِ علاج بھوپال کا سفر کیا۔
۵ر فروری ○ بھوپال کے حمیدیہ ہسپتال میں برقی شعاعوں کے علاج کی ابتدا۔
۷ر مارچ ○ بھوپال سے دہلی کے لیے روانگی۔
۸ر مارچ ○ دہلی پہنچے اور حکیم نابینا کو اپنی نبض دکھائی۔ سردار بیگم کی علالت سے متعلق مشورے کیے۔
۹ر مارچ ○ لاہور کے لیے روانگی۔
۱۰ر مارچ ○ لاہور پہنچے۔
اپریل ○ جاوید منزل کی تعمیر مکمل ہوئی۔
۲۰ر مئی ○ جاوید منزل میں منتقل ہوئے۔
۲۴ر مئی ○ سردار بیگم [والدۂ جاوید و منیرہ] کا لاہور میں انتقال ہوا۔
۱ر جون ○ نواب حمید اللہ خاں والئ بھوپال نے پانچسو روپے ماہانہ وظیفہ جاری کیا۔
۱۵ر جولائی ○ برقی علاج کے لیے بھوپال کا دوسرا سفر کیا۔
۲۸ر اگست ○ برقی علاج کا دوسرا دور ختم ہوا اور اقبال دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ ۳۰ر اگست کو لاہور پہنچے۔
۲۵ر اکتوبر ○ جشن صد سالہ حالی میں شرکت کے لیے پانی پت کا سفر کیا۔

۱۹۳۶ء

اپریل ○ قائدِ اعظم نے لاہور میں ملاقات کی۔ اقبال، پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔
۱۳ر اپریل ○ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم "نغمۂ سرمدی" پڑھی۔ یہ آخری شرکت تھی۔
مئی ○ مثنوی "مسافر" کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت۔
جولائی ○ "ضربِ کلیم" کی اشاعت۔
اکتوبر ○ "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی اشاعت۔
دسمبر ○ "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر" کی اشاعت۔
۲۹ر جولائی ○ ڈھاکہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

۱۹۳۷ء

○ موتیا بند کی شدت
اپریل ○ حکیم نابینا کا علاج
○ دردِ نقرس کی ابتدا
۱۴ر دسمبر ○ الٰہ آباد یونیورسٹی نے اپنی جوبلی کے موقع پر ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

۱۹۳۸ء

۱ر مارچ ○ عثمانیہ یونیورسٹی [حیدرآباد] نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔
۲۱ر اپریل ○ صبح پانچ بج کر ۱۵ منٹ پر علامہ اقبال کا انتقال شام ۵ بجے جاوید منزل سے جنازہ اٹھا۔ اسلامیہ کالج لاہور کے وسیع و عریض گراونڈ میں تقریباً بیس ہزار نفوس نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ شاہی مسجد کے صحن میں مولانا غلام مرشد نے ایک بار پھر نمازِ جنازہ ادا کی۔
○ رات ۹ بج کر ۴۵ منٹ پر تدفین عمل میں آئی۔
نومبر ○ اقبال کے انتقال کے بعد "ارمغانِ حجاز" کی اشاعت عمل میں آئی۔

نظم اقبال بخط سیماب

علامہ سیماب اکبرآبادی کی یہ نظم نوادراتِ سیماب کے ذخیرے سے دستیاب ہوئی ہے۔ یہ نظم ان کے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں۔ نظم میں ترمیم و اصلاح کے باوجود غالباً علامہ اس کو صاف نہیں کر سکے تھے اسی لیے یہ اشاعت پذیر نہ ہو سکی۔

نذرِ اقبال

اقبال ہے خودی کا پیامی خدا شناس — حق کا نوا شناس ہیں تیرے نوا شناس

ہے فلسفیٔ مشرقِ ہستی حکیمِ ہند — ہے رازدارِ سرِّ حقیقت کلیمِ ہند

ہے آبروئے ملتِ اسلام جانِ قوم — قائم دلوں میں تیری بدولت ہے شانِ قوم

انسانیت کو تو نے دیا درسِ آگہی — تاریکیوں میں روح کی پھیلائی روشنی

تیری نظر سے تیز ہوئی نبضِ مضمحل — بخشا ہے تو نے قوم کو اک سوزِ مستقل

اک ضربِ لا سے توڑ دیا [illegible] — انفاسِ آتشیں سے [illegible]

ملت کو استوار کیا دل کی آگ سے — بخشی حیات ضربِ کلیمی کی لاگ سے

مینائے الست سے لبریز ہے خودی — [illegible] نظر سے شعر کے سانچے میں ڈھال دی

پھر ناخنِ خرد کو کیا تو نے بخیہ گر — سیتی رہی جراحتِ دل کو تری نظر

عرفانِ خود شناسیٔ انساں ترا پیام — دکھتے ہوئے دلوں کا سہارا ترا کلام

پرواز تیری فکر کی تھی اس قدر بلند — [illegible] شہپرِ جبریل کو گزند

تیرے سخن کا رنگ ہی پیغمبرانہ تھا — ہندی تھی لے مگر وہ حجازی ترانہ تھا

جب قوم کا عروج کا ارمان ہوگا عام
لکھا ہوا خطِ جلی ہوگا تیرا نام

[illegible]
[illegible]

باب ۲

اقبال

قطعہ

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبالؒ

محمد عظیم فیروزآبادی
ناور بخش اینڈ کمپنی فیروزآباد (یوپی)

اِقبال کی تاریخ ولادت

اُردو اکادمی مغربی بنگال کے سہ ماہی جریدے "روحِ ادب" شمارہ اپریل تا ستمبر ۱۹۸۶ء میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا بعنوان بالا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس کا ناقدانہ تجزیہ کرنے سے پہلے میں چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آج اقبال پرستی یا اقبال فروشی کا دَور ہے۔ اقبال کے نام پر ہندوپاکستان میں متعدد انجمنیں، مجلسیں اور اکادمیاں قائم ہیں جن میں ملک کے ممتاز اور سربرآوردہ ادیبوں اور دانش وروں کی سرپرستی اور خدمات حاصل ہیں۔ یہ اکادمیاں ہر سال علامہ اقبال پر کتابیں شائع کرتیں اور سیمینار منعقد کراتی ہیں۔ ان سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالوں یا ان اداروں سے شائع ہونے والی کتابوں کا منشا اقبال کی بصیرت اور ان کے ادبی قدو قامت کو صحیح طور سے متعین کرنا نہیں بلکہ انھیں ایک نابغہ عصر، ایک فوق الانسان بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ اقبال کی شخصیت اور خصوصاً ان کے فکروفن پر ہزاروں مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان کی عظمت کو نمایاں کرنے کے لیے مبالغے سے کام لے کر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندستان یا دنیائے اسلام میں اتنا بڑا شاعر، اتنا بڑا مفکر، ایسا مخلص اور مستقل مزاج سیاست داں، ایسا عظیم رمز شناسِ سنّت و قرآن آج تک پیدا نہیں ہوا۔ جب مشرقی اور مغربی فلسفہ کا ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایسا ماہر 'فکرِ اقبال' کی تمہید میں ان کی حکمت و بصیرت کی اتنے مبالغہ آمیز پیرایے میں تعریف کرے کہ محمد حسین آزاد اگر آج زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ اپنے ممدوح کے سر پہ بقائے دوام کا تاج اس طرح رکھا جاتا ہے۔ یہ کتاب عیب کو ہنر میں تبدیل کرنے کا ایک شاہکار ہے۔ اس میں اقبال کے والد کی ناخواندگی کی اس طرح تعبیر کی گئی ہے کہ "وہ نبیٔ امّی کی طرح امّی تھے" (نعوذ باللہ، یہ سرورِ کائنات کی کھلی ہوئی توہین ہے) اس طرح پاکستان کے چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے 'زندہ رود' میں ہندستان کی آزادی اور پاکستان کی تخلیق کا شرف "صرف دو پنڈتوں کے آپس کے جھگڑے" تک[1] محدود کر دیا ہے۔ ہندستان کی آزادی کا طرۂ امتیاز اگر ایک ہی شخص کے سر پر باندھا ہو (جو یکسر غلط نقطۂ نگاہ اور تحریک آزادی کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے) تو اس اعزاز کا مستحق ایک پنڈت نہیں، ایک بنیا [مہاتما گاندھی] ہے اور پھر اقبال کی پنڈت نہرو سے کیا مناسبت۔ ایک تحریک آزادی کا سچا علم بردار دوسرا انگریزوں کا مستقل آلۂ کار۔ اس کے علاوہ اقبال کا برہمن زادہ ہونا خود ثبوت کا محتاج ہے ان انجمنوں کے تحت لکھی جانے والی دیگر تمام سوانح عمریوں اور تنقیدی مضامین کا یہی حال ہے۔

ایک دشواری اور ہے۔ ان انجمنوں اور اداروں کے با اقتدار ڈائریکٹروں نے تہدید و تحریص کی ایک ایسی آمرانہ فضا پیدا کر دی ہے کہ اقبال کے متعلق اپنی صحیح رائے ظاہر کرنے یا ان کے پوست کندہ حالات کو بے نقاب کرنے میں ہر محقق یا ناقد کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ اردو کے بیشتر ادیب و دانشور کسی تعلیمی ادارے میں لیکچرر یا پروفیسر ہیں، کسی رسالے کے اڈیٹر یا کسی ادبی اکادمی کے وظیفہ خوار ہیں۔ ایک طرف انعام و اکرام کا لالچ، دوسری طرف ادبی سوشل بائیکاٹ اور مالی خسارے کا خطرہ، ہر عاقبت اندیش دانشور کو کافر کے بجائے مسلم بنتے ہی میں عافیت نظر آتی ہے۔ کیا دم گھٹنے والا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ امین زبیری کو اپنی کتاب کے لیے کوئی پبلشر نہیں مل سکا اور وہ اس کی اشاعت کی حسرت کے لیے اس دنیا سے چل بسے۔ زبیری صاحب

---

[1] اگر جسٹس جاوید اقبال کے بیان میں کچھ بھی صداقت ہے تو تقسیم ہند کے دوران تقریباً ایک کروڑ انسانوں کا خونِ ناحق ان دونوں پنڈتوں کے سر ہے۔
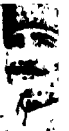
اقبال کے بدخواہ نہیں تھے۔ ان کا جرم صرف اس قدر تھا کہ وہ اقبال کے صحیح خدوخال پیش کرنا چاہتے تھے جو ہر اچھی بائیوگرافی کا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ ان حالات میں اور ایسی فضا میں پروفیسر آزاد سے پاکستان کی مرکزی تاریخ ولادت کمیٹی کے فیصلے سے انحراف کی توقع رکھنا یا تحقیق و روایت سے کام لے کر اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش متعین کرانا، انہیں برتتے ہوئے اوکھلی میں سر منڈانے کی دعوت دینا ہے خصوصاً جب کہ ماضی میں ایوان اقبال سے انھیں وفاداری کی سند اور تحفہ مل چکا ہو۔

ان نامساعد اور حوصلہ شکن مزاحم سے صرف نظر کر کے، اگر خود پروفیسر موصوف کی ادبی شعور اور محققانہ صلاحیت کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کا مزاج محققانہ نہیں ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر اور کسی کتاب کے معقول تقریظ نگار تو ہو سکتے ہیں لیکن سچائی کو تلاش کرنے کی مخلصانہ لگن اور دریافت شدہ حقیقت کو بے محابا اجاگر کرنے کی وہ اخلاقی جرأت ان میں نہیں ہے جو بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہوتا نہیں جانتی تحقیق و تاریخ نگاری کے منصب FUNCTION سے واقف ہونے کے باوجود، وہ اپنی دریافت یا معلومات کو بغیر ثبوت یا حوالے کے اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے یہ ایسی بدیہی حقیقت ہو جس کی نمود و اظہار کے لیے کسی ثبوت یا حوالے کی ضرورت نہ ہو۔ اگر کسی حوالے یا ماخذ کی وہ کبھی نشان دہی کرتے بھی ہیں تو اس طرح کہ آپ کی صحت یا عدم صحت کی تصدیق کرنا ناممکن ہو جائے۔ مثلاً وزیر مالیات غلام محمد کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ مولانا حسرت موہانی کے پارلیمنٹری بھتہ قبول نہ کرنے کا ذکر پنڈت نہرو نے وزیر موصوف سے کیا تھا۔ اس واقعہ کی تصدیق یا تکذیب کرنا اب ہمارے لیے ممکن نہیں۔ اس طرح مسجد قرطبہ میں اقبال کے نماز پڑھتے کا فوٹو وہ خود اسپین سے لانے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ وہاں یہ فوٹو انہیں کہاں سے دستیاب ہوا۔ یا زار میں بک رہا تھا۔ گرجا گھر کی کسی دیوار پر آویزاں تھا یا وہاں ہندوستانی سفارت خانے یا کسی بزم اقبال نے انہیں فراہم کیا تھا۔ اقبال کی کامیاب وکالت یا دولت سے بے نیازی کے سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں کہ پٹنہ میں سی آر داس نے صرف ایک لفظ کی قانونی تشریح کے لیے ایک ہزار روپیہ یومیہ پر اقبال کو وہاں بلایا تھا اور اقبال کو اطمینان دلا دیا گیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو دو مہینے تک پٹنے میں قیام کر کے عدالت کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیں۔ لیکن بیرسٹر اقبال نے ایک ہی دن میں عدالت کو اپنی تفتیش سے آگاہ کر دیا اور سی آر داس اور موتی لال نہرو کے اصرار کے باوجود دوسرے ہی دن وہاں سے چلے آئے۔ آزاد صاحب نے یہ انکشاف نہیں کیا کہ وہ انگریزی یا فارسی کا کون سا متنازعہ فیہ لفظ تھا جس کی تشریح موتی لال نہرو جیسا بلند پایہ محقق نہیں کر سکا اور جس کی تفتیش کے لیے سرکار ایمن ساٹھ ہزار روپیہ دینے پر آمادہ تھی۔

پروفیسر موصوف کے مزاج میں غیر ذمہ داری اور تساہل کو بھی دخل ہے۔ ہمارے اقبال صدی نمبر میں، اقبال کے شجرہ نسب میں ان کی پہلی بیٹی کا نام معراج بیگم لکھا ہے۔ لیکن بعد میں اپنی کتاب "محمد اقبال" میں اسی بیٹی کا نام سہواً یا بربنائے سہل انگاری مریم بیگم لکھ دیا ہے۔ اسی طرح شجرۂ مذکور میں آفتاب اقبال اور معراج بیگم کی تاریخ پیدائش نہیں لکھی۔ ادنا تلاش سے ان کی تاریخ ولادت معلوم ہو سکتی تھی۔ معراج بیگم کی ولادت ۱۸۹۵ء میں اور وفات ۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں ہوئی جس کے لیے آزاد صاحب نے اس شجرہ میں انکشاف کیا ہے کہ وہ پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ آفتاب اقبال کی پیدائش ۱۸۹۹ء میں ہوئی تھی۔ اسی ہما نمبر میں "حیات اقبال ایک نظر میں" جو انھوں نے مرتب کی ہے اس میں سنین کی، واقعات کی، اور اقبال کی بیگمات کے غلط نام اور تشخص کی جو درجنوں غلطیاں ان سے سرزد ہوئی ہیں، انہیں گننا لاحاصل ہے۔ خود مضمون ہذا میں صفحہ ۲۹ پر اقبال کے محققین میں حفیظ جالندھری کو بھی شامل کر لیا گیا ہے حالانکہ یہ حفیظ جالندھری نہیں، حفیظ ہوشیارپوری ہیں جن کا مضمون بعنوان "عمر عزیز کے بہترین لمحے" ملفوظات نظامی میں شامل ہے۔ یہاں آزاد صاحب کے تحقیقی تسامحات یا غیر ذمہ دارانہ لاپروائی کو نمایاں کرنا میرا مقصد نہیں، صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ تحقیق کے پتہ مار اور غیر دلچسپ کام سے عہدہ برا ہونا ان کے بس کی بات نہیں۔

مضمون کے آغاز میں آزاد صاحب نے اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو عام طور سے تسلیم کیے جانے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس وقت تک عبداللہ انور بیگ کی انگریزی تصنیف THE POET OF THE EAST 1939 اور عبدالمجید سالک کی کتاب ذکر اقبال (۱۹۵۵) دونوں ہی میں یہ تاریخ درج تھی۔ ذکر اقبال تو خیر ۱۹۵۵ء میں چھپی اس سے پہلے عنایت اللہ کی حیات اقبال اور پروفیسر محمد طاہر فاروقی کی سیرت اقبال ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکی تھیں اس کے علاوہ مختلف سنین میں طبع ہونے والی پندرہ کتابوں کے نام ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود صفحہ ۳۴ پر دیے ہیں جن میں اقبال کا سال پیدائش ۱۸۷۳ء دکھایا گیا ہے۔ ان سب کے نام یہاں دہرانا خالی از طوالت نہیں۔ ظاہر ہے ان سب نے ۱۸۷۳ء کے سال پیدائش کو مسلمہ

بنانے کے لئے فضا ہموار کی تھی۔

زندہ رود کے صفحہ ۱۳ پر چھ ایسی کتابوں کی بھی فہرست دی گئی ہے جن میں سن پیدائش ۱۸۷۶ء دکھایا گیا ہے۔ ان میں براہ راست اقبال پر لکھی ہوئی دو کتابوں اور باقی چار دوسرے موضوعات پر لکھی ہوئی کتابوں سے ۱۸۷۶ء اخذ کیا گیا ہے۔ آزاد صاحب نے بھی اپنے اس مضمون میں ایسی ساٹھ کتابوں اور جریدوں کے نام درج کئے ہیں جن میں اقبال کا سن پیدائش ملتا ہے۔ ان میں سید عبدالواحد حسینی کا نام سہواً دوبارہ درج ہو گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت اور ان سے متعلق تصاویر اور یادگاری دستاویزات فراہم کرنے اور ان کی نمائش کی ترتیب کے سلسلے میں انھیں جو کھکھیڑ اٹھانی پڑی، اس کی مفصل روداد بیان کی ہے نیز صد سالہ تقریب سے متعلق ہند و پاکستان کی مختلف کمیٹیوں اور اخبارات نے جو کچھ کیا اور لکھا، اس پر بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی بے احتیاطی اور پروفیسر آل احمد سرور کی محتاط روش کو بطور خاص اجاگر کیا ہے۔ بحیثیت ناقدین ان دونوں حضرات کا مقام سب پر ظاہر ہے، لیکن ان کو محققین کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد صاحب کا یہ خیال کہ پروفیسر سرور کا فروری کی بجائے مارچ ۱۹۷۳ء میں اقبال سیمینار منعقد کرنا، ان کی احتیاط پسندی کا مظہر ہے، صحیح نہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ التوا سرور صاحب میں خود اعتمادانہ فیصلہ کی کمی اور ان کے رفقائے کار کے تساہل کی بنا پر ہوا تھا اور اس صدی تقریب کو بھی بعد میں، ان کا اقبال سیمینار سے تعبیر کرنا، ان کے نظریاتی تذبذب کا غماز ہے۔ بہر کیف علی گڑھ یونیورسٹی کے اس سیمینار میں ہندوستان ٹائمس (نئی دہلی)، کے مقالے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے، سردار جعفری نے ۱۹۷۳ء میں اقبال صدی تقریب منانے کا ریزولیوشن پیش کیا۔ اس کی تائید میں پروفیسر سرور، ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ نے تقریریں کیں اور قرارداد پر عمل کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل ہوئی جس کا پہلا جلسہ ۲۹ دسمبر ۱۹۷۳ء کو دہلی میں ہوا۔

اقبال صدی تقریبات پر آزاد صاحب نے اتنی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ وہ اپنے اصل موضوع ـــــ اقبال کی تاریخ ولادت سے دور جا پڑے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات ہو کہ کمیٹی کی ۱۹۷۳ء میں صدی تقریب منانے سے اقبال کا سال پیدائش حتمی طور سے متعین ہو جاتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ حکومت کی سرپرستی میں جو کمیٹیاں قائم ہوتی ہیں ان کی مصالح ادبی نہیں، سیاسی ہوتی ہیں چنانچہ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے نقوش (اقبال نمبر حصہ دوم) میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شکست یاب ہونے اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش میں مبدل ہو جانے سے پاکستان اتنا بدحواس ہوا کہ اسے اپنے اس بلند مرتبت شاعر اور مفکر عظیم کی صد سالہ تقریب منانے کا ہوش نہیں رہا۔ جب قدرے حواس بحال ہوئے اور اس نے ۱۹۷۳ء میں ہندوستان میں جشن منانے کا غلغلہ سنا تو اس کی غیرت بھی جوش میں آئی لیکن اپنے اندرونی خلفشار میں پاکستان اتنا الجھا ہوا تھا کہ اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش متعین کرنے کے لیے، ایک مرکزی تاریخ ولادت کمیٹی کی تشکیل سے آگے قدم نہیں بڑھا سکا اور جیسا کہ "مظلوم اقبال" میں اعجاز احمد نے انکشاف کیا ہے کہ اس کا پہلا اجلاس جنوری ۱۹۷۴ء میں اور تیسرا اجلاس فروری ۱۹۷۴ء میں ہوا (صفحہ ۸۴)، اس وقت اصل ۱۹۷۳ء نکل چکا تھا لہٰذا کمیٹی کے ذہن میں اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ آئندہ سالوں میں کوئی ایسی تاریخ ہاتھ آ جائے جسے اقبال کی تاریخ پیدائش قرار دے سکیں۔ جوئندہ یابندہ۔ اس کمیٹی میں ریٹائرڈ جسٹس ایس اے رحمان کے علاوہ دس اراکین اور بھی تھے جس میں علامہ کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال اور ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد بھی شامل تھے۔ "یہ کمیٹی متعلقہ شواہد و قرائن کی چھان بین کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ علامہ اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے پیش لفظ میں جو تاریخ ولادت درج فرمائی ہے اسے تسلیم کر لیا جائے۔ علامہ اقبال نے اپنی تاریخ ولادت ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ تحریر فرمائی ہے جو عیسوی سن کے اعتبار سے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہوتی ہے ..... حکومت پاکستان نے کمیٹی کی اس متفقہ رپورٹ کی بنا پر ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو علامہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت قرار دے دیا اور اس تاریخ کے مطابق ولادت کی صد سالہ تقریبات منائی گئیں (صفحہ ۸۸)

کمیٹی کے فیصلے پر دستخط کرنے والوں میں ڈاکٹر وحید قریشی بھی تھے۔ لیکن وہ اس فیصلے سے متفق نہیں تھے ان کی نظر میں خالد نظیر صوفی کی دریافت کردہ تاریخ زیادہ معتبر تھی۔ چنانچہ نقوش (اقبال نمبر حصہ دوم) میں انھوں نے اپنے مضمون میں اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر قرار دی ہے۔ یہی تاریخ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری اور علامہ اقبال کے نواسے اور ان کے والد کی نظر میں مستند ہے۔ اپنے مضمون میں پروفیسر آزاد نے لکھا ہے کہ اعجاز احمد نے مالک رام کو اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء بتائی تھی اور مالک رام کی نظر میں، خالد نظیر صوفی کی تعین کردہ تاریخ ہی مصدقہ ہے۔

جہاں تک جسٹس جاوید اقبال کا تعلق ہے ان کی نظر میں اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۳ء ہی تھا۔ علامہ اقبال کی ڈائری افکار پریشاں

جاوید اقبال نے ۱۹۶۱ء میں مرتب کیا تھا، اس کے دیباچے میں تین جگہ اقبال کی عمر کا ذکر آیا ہے تینوں جگہ کی عبارت
ے اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۳ء ہی نکلتا ہے ڈاکٹر جاوید اقبال کے الفاظ یہ ہیں:

1. IN 1910 IQBAL WAS THIRTY SEVEN YEARS OLD. PAGE - VI.

۱۹۱۰ء میں اقبال کی عمر سینتیس سال تھی (اس حساب سے سال پیدائش ۱۸۷۳ء ہوا)

2. THE INDIAN NATIONAL CONGRESS WAS FOUNDED IN 1885 WHEN IQBAL WAS TWELVE YEARS OLD - XI.

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی تو اقبال کی عمر بارہ سال تھی (اس حساب سے بھی سال پیدائش ۱۸۷۳ء نکلتا ہے۔)

3. IQBAL LEFT SIALKOT AND CAME TO STUDY IN LAHORE AT THE AGE OF TWENTY TWO - XV.

اقبال بائیس سال کی عمر میں سیالکوٹ چھوڑ کر تعلیم کیلئے لاہور آئے (۱۸۹۵ء میں اقبال نے لاہور آکر بی اے میں داخلہ لیا تھا)

اوپر کی تینوں مذکورہ عبارتوں میں جاوید اقبال کی تحریر کے مطابق اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۳ء ہی نکلتا ہے پھر سوال یہ ہے کہ کمیٹی کی مجوزہ تاریخ پیدائش کو انہوں نے کیوں منظور کر لیا۔ اعجاز احمد نے "مظلوم اقبال" میں لکھا ہے کہ جسٹس جاوید اقبال کمیٹی کے اجلاسوں میں شامل نہیں ہوئے (صفحہ ۸۸) وہ شامل بھی ہوتے اور ان کی رائے کمیٹی کی رائے سے مختلف بھی ہوتی تو بھی تنظیمی ضابطہ DISCIPLINE کی بنا پر وہ کمیٹی کی رائے کے پابند ہوتے کیوں کہ یہ کمیٹی حکومت کے ایما پر قائم کی گئی تھی جس کا کام دو تین سال کے بعد، جب تک پاکستان کے حالات اعتدال پر آجائیں، صد سالہ تقریب منانے کے لیے ایک ایسا سال پیدائش تلاش کرنا تھا جس کے استناد کے لئے ایک معقول جواز پیش کیا جاسکے۔
جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کمیٹی کی مجوزہ تاریخ پیدائش اقبال کے میونخ یونیورسٹی کے خاکہ کے مطابق تیار کی گئی ہے۔ اس کے لئے اعجاز احمد نے لکھا ہے:

چونکہ یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے لکھا گیا تھا اس لیے اس کے تعارفی نوٹ میں پیدائش کی تاریخ اور سن بھی لکھنا تھا جو انہیں معلوم نہ تھا۔ ظاہر ہے اس کے لئے اپنے والد کو لکھا ہوگا۔" لکھا ہوگا" کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اعجاز احمد تحقیق سے نہیں بتا سکتے کہ واقعی اقبال نے اپنے والد کو لکھا تھا کہ نہیں۔ اگر لکھا ہوتا تو اس کا امکان تھا کہ علامہ کے دوسرے خطوط کے ساتھ یہ خط بھی محفوظ ہوتا۔ پھر بھی وہ لکھتے ہیں کہ "میاں جی کو تو ان کی تاریخ ولادت ہجری تقویم کے حساب سے ہی معلوم تھی یعنی ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ" (مظلوم اقبال صفحہ ۸۱)

جاوید اقبال لکھتے ہیں:

اقبال کے بیان کردہ ہجری سن میں اپنی تاریخ ولادت کے بارے میں معلومات کا ذریعہ ان کے والدین ہوں گے اور یہ قیاس کرنا ممکن نہیں کہ متذکرہ تاریخ ولادت ان کی خود ساختہ تھی (زندہ رود صفحہ ۵۴)

لطف کی بات یہ ہے کہ اعجاز احمد کے مطابق "اقبال نے تاریخ پیدائش کے متعلق اپنے باپ کو لکھا ہوگا، لیکن جسٹس جاوید اس میں اقبال کی والدہ کو بھی شریک کر لیتے ہیں"۔ دونوں حضرات کا یہ بیان محض قیاس پر مبنی ہے۔ اگر اقبال نے حقیقتاً اپنے والد یا والدین کو لکھا تھا تو اعجاز احمد نے علامہ کے ۱۰۲ خطوط کے ساتھ اسے بھی "مظلوم اقبال" کی زینت بنایا ہوتا پھر بھی جسٹس جاوید اصرار کرتے ہیں کہ متذکرہ تاریخ ان کی خود ساختہ نہیں تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ اقبال کے والدین ناخواندہ تھے ۱۲۹۴ء کا ہجری سن اور مہینے کا عربی نام ذیقعد انھیں یاد رہنا تو ایک طرف، ہوسکتا ہے ان کے کان اور زبان بھی اس سے ناآشنا رہے ہوں جسٹس جاوید کی اطلاع کے مطابق ان کے گھر میں کوئی خاندانی ریکارڈ از قسم جنم پتری نہیں تھا جسے دیکھ کر یا پڑھوا کر اقبال کے والدین انہیں صحیح تاریخ پیدائش سے مطلع کر دیتے۔ آج سے سوا سو سال کا ذکر ہی کیا جب مسلمانوں کی تعلیم کا اوسط مشکل سے تین چار فیصدی ہوگا، آج بھی تعلیم یافتہ مسلمان ہجری سنہ سے واقف نہیں ہیں۔ مسلمان عورتیں زیادہ سے زیادہ چاند کی تاریخ جانتی ہیں لیکن ذی قعد اور ذی الحج کے الفاظ ان کی زبان پر کبھی نہیں آتے۔ ایسی صورت میں ہجری کی تاریخ ولادت، خود اقبال کی دریافت کردہ معلوم ہوتی ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ پیدائش کے متعلق اقبال کے ذہن میں ۱۸۷۶ء محفوظ تھا اور جب انہوں

نے اسے سن ہجری میں تبدیل کرنا چاہا تو ۱۲۹۳ھ کی بجائے ۱۲۹۴ھ نکال بیٹھے ، ہر حال اقبال میں اقبال کے مڈل کلاس کے سرٹیفکیٹ کا جو فوٹو ملا
اس کے نیچے یہ صراحت ہے کہ یہ اقبال کے مڈل کلاس کے سرٹیفکیٹ کا مثنیٰ ہے جو ۱۹۰۷ء میں دوبارہ جاری کیا گیا۔ اس سرٹیفکیٹ کے ۱۹۰۷ء میں
دوبارہ مثنیٰ اشو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اقبال نے تاریخ معلوم کرنے کے لیے اپنی ماں یا باپ کو نہیں لکھا تھا بلکہ اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو لکھا تھا جس نے
یونیورسٹی جا کر یہ نقل حاصل کر کے جرمنی بھجوا دی اور اس کی بنیاد پر مقالے میں انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش ۱۸۷۶ء لکھ دی ۔ علامہ اقبال اپنے خطوط او
روزمرہ کی تحریروں میں انگریزی سنوں اور تاریخوں سے کام چلاتے تھے ـــــ ان کا ایک خط بھی ایسا نہیں ملتا جس میں سنہ ہجری کی تاریخ لکھی ہو ۔ اس
بھی امکان ہے کہ وہ ہجری کے سنوں سے واقف نہ ہوں ۔ اس لیے ہجری کا سنہ نکالتے وقت ان سے یہ غلطی سرزد ہو گئی۔

یہاں ایک خاص نکتہ کی طرف قارئین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں ۔ زندہ رود میں صفحہ ۴۰ پر جسٹس جاوید لکھتے ہیں "اقبال کے تعلیمی ریکارڈ میں سب
پرانا مسودہ وہ سرٹیفکیٹ ہے جسے پنجاب یونیورسٹی نے ۱۸۹۱ء میں ان کے مڈل اسکول کا امتحان پاس کرنے پر جاری کیا تھا۔ اس کی ۱۹۰۷ء میں جا
کردہ نقل شیخ اعجاز احمد کے پاس محفوظ ہے ۔ اس سرٹیفکیٹ میں اقبال عمر پندرہ سال درج ہے"۔ اسی سرٹیفکیٹ کے بارے میں اعجاز احمد "مظلوم اقب
میں رقمطراز ہیں "پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۹۱ء میں مڈل کلاس پاس کرنے کی جو سند انہیں ملی اس میں مڈل پاس کرنے کے سال ان کی عمر پندرہ سال لک
ہے"۔ آگے چل کر صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے۔ سند کی پشت پر DESCRIPTIVE ROLL کے عنوان کے تحت امتحان پاس کرنے کے سال میں عمر کے خانے میں عمر پندرہ
ہے ہماری نظر سے آج تک کوئی سرٹیفکیٹ ایسا نہیں گذرا جس کی پشت پر بھی کوئی کالم ہوتا ہو اور اس کی خانہ پوری کی جاتی ہو۔ اس لیے جسٹس جاوید نے
سرٹیفکیٹ کی پشت پر عبارت کا ذکر نہیں کیا اقبال کی سوانح عمریوں میں اس قسم کے عجوبے اور بھی ملتے ہیں "مظلوم اقبال" میں اعجاز احمد لکھتے ہیں :

> چچا جان کو ۱۹۰۸ء میں جو بیرسٹری کی سند دی گئی اس میں ان کے والد گرامی کا نام انگریزی میں NOOR MOHAMMED
> کی بجائے MIR MOHD لکھا ہے جو درست نہیں سند تیار کرنے والے انگریز کارکن نے اسلامی ناموں سے ناواقفیت
> کی وجہ سے NOOR کی بجائے MIR پڑھا اور وہی لکھ دیا۔ پھر اس سند کی بنا پر چچا جان نے چیف کورٹ لاہور
> میں بطور بیرسٹر رجسٹر کئے جانے کی درخواست کی تو سند کے مطابق وہاں بھی ولدیت میر محمد درج ہو گئی۔ نام کی یہ
> غلطی چچا جان کے علم میں تو آئی ہو گی معلوم نہیں انھوں نے اس میں کیوں تساہل سے کام لیا اور غلطی کی اصلاح نہیں
> کرائی"۔ (صفحہ ۳۵)

موٹی سے موٹی عقل کا آدمی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہو گا کہ کسی اہم ریکارڈ میں ولدیت کی غلطی ہو جائے تو ایک ذمہ دار آدمی اور وہ بھی ایک بیر
محض تساہل کی بنا پر اس کی تصحیح نہ کرائے ۔ یہ غلطی اگر انگریز کارکن کی ہوتی تو بیرسٹر اقبال نے اس کی تصحیح کرائے بغیر چین کا سانس نہ لیا ہوتا۔ اقبال کی ایک
معمولی غزل بھی اگر ان کی اجازت یا علم کے بغیر کسی رسالے میں شائع ہو جاتی تھی تو فوراً اسے نوٹس دے دیا کرتے تھے [رسالہ صوفی کو اپنی نظم "والدہ مرح
کی یاد میں" شائع کرنے پر نوٹس دے دیا تھا ۔ روزگار فقیر جلد دوم صفحہ ۱۲۷] صاف ظاہر ہے ولدیت کی یہ غلطی انگریز کارکن کی نہیں ، اقبال نے دانس
اپنی ولدیت بدل کر لکھوائی تھی ، اس کا محرک وہی نقطو کا گلے سے نہ اترنا رہا ہو گا۔

تذکرہ میں مولوی فضل الدین نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اقبال کی بعض مثنویاں الہلال کی آواز بازگشت ہیں ۔ یہ پڑھ کر اقبال سخت برہم اور آزردہ ہ
اور شکایتاً سید سلیمان ندوی کو لکھا "البتہ اس بات سے مجھے سخت رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال ، تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔ تحریک الہلا
نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے ، ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو" ظاہر ہے فضل الدین کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا لیکن اقبال نے
زیادتی کی بنا پر یہ نتیجہ نکال لیا کہ فضل الدین ، تحریک الہلال سے پہلے ادھ کچرا مسلمان سمجھتے ہیں۔ اگر ولدیت کی غلطی انگریز کارکن کی ہوتی تو اقبال اسے اپنے
کیریر پر حملہ تصور کرتے اور تصحیح کرائے بغیر چین سے نہ بیٹھتے۔

تاریخ ولادت کی تعیین کے سلسلے میں سب سے زیادہ طویل اور جامع مضمون جسٹس جاوید اقبال کا ہے انھوں نے ہر ممکن ذریعہ سے علامہ کی پیدائش
۱۸۷۷ء متعین کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے اقبال کی تعلیمی ریکارڈ سے بھی اپنی رائے کو معتبر بنانے کا کام لیا ہے ۔ زندہ رود جلد
اول صفحہ ۴۱ پر رقم طراز ہیں :

"اقبال کے معاملے میں اسکول کا ریکارڈ ان کی پیدائش، داخلے یا عمر کے متعلق کوئی مدد نہیں کرتا اگر تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اسکول میں دیر سے داخل ہوئے تو ان کے تعلیمی ریکارڈ سے ظاہر ہے کہ وہ ذہانت اور فطانت میں دوسرے بچوں سے بہت آگے تھے.... بہت ممکن ہے ذہین اور ہونہار ہونے کی وجہ سے میر حسن نے انہیں اسکول کی پہلی جماعت کی بجائے دوسری یا تیسری جماعت میں داخل کرایا ہو۔ بہر حال ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مکتبی تعلیم سے فراغت کے بعد، اقبال نے اسکول کی پہلی جماعت میں داخلہ لیا بلکہ اقبال کی ذہانت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔"

جسٹس جاوید کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اقبال کا اسکول کا ریکارڈ اقبال کی عمر کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتا۔ ان کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ اقبال کی ذہانت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ مکتبی تعلیم کے بعد انھوں نے اسکول میں دیر سے داخلہ لینے پر بھی پہلی جماعت کی بجائے دوسری یا تیسری جماعت میں داخلہ لیا ہوگا۔" یہ جسٹس جاوید کا محض قیاس ہے اور قیاس کا ہمیشہ درست ہونا ضروری نہیں۔ پھر ایک جج کو اتنی فرصت کہاں، کہ وہ کسی طالب علم کے داخلے کے بارے میں، خواہ وہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو، کسی اسکول کے رجسٹروں کی چھان بین کرتا پھرے۔ اگر انہیں اس کی توفیق ہوئی ہوتی تو پتہ چلتا کہ مکتبی تعلیم کے باوجود، اسکول میں دیر سے داخلہ لینے پر بھی، ان کا داخلہ دوسری یا تیسری جماعت میں نہیں، بلکہ پہلی جماعت میں ہوا تھا۔ اقبال ریویو جولائی ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر سید مسعود حسین کا ایک مقالہ بعنوان "اقبال کی پہلی جماعت کا نتیجہ" شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے دریافت کیا ہے کہ سب انسپکٹر آف اسکول، رائے گوپال سنگھ نے اسکاچ مشن سیالکوٹ کے پرائمری حصہ کا اپریل ۱۸۸۵ء میں امتحان لیا تھا" اسی کی رپورٹ مطابق ۱۸۸۴ء میں اقبال نے اسکاچ مشن اسکول کی پہلی جماعت میں داخلہ لیا اور ۱۸۸۵ء میں پہلی جماعت کا امتحان پاس کیا" (صفحہ ۱۳۴)

اگر جسٹس جاوید اقبال کے اس خیال کو صحیح مان لیا جائے کہ پانچ سال کی مکتب نشینی کے بعد، اقبال نے اسکاچ مشن اسکول میں داخلہ لیا اور مکتبی تعلیم کا آغاز ان کے قیاس کی بنا پر چار سال چار مہینے کی عمر میں ہوا ہوگا تو بھی ۱۸۸۳ء میں ان کی عمر دس، ساڑھے دس سال ہونی چاہئے یعنی اس حساب سے اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۳ء ہی صحیح ٹھہرتا ہے۔

اس رسالے کے صفحہ ۱۲۰ پر ڈاکٹر حسن اختر کا "طالب علم اقبال" کے عنوان سے جو مقالہ شائع ہوا ہے اس میں تحقیق کرکے ڈاکٹر موصوف نے بتایا ہے کہ "میٹرک کے امتحان کے داخلہ فارم میں علامہ اقبال نے اپنی عمر سترہ برس لکھی تھی" اس زمانے میں اور آج بھی عموماً ہائی اسکول کا فارم بھرتے وقت طالب علم اپنی عمر دو تین سال کم لکھتے ہیں۔ اقبال نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ اسی مضمون میں ڈاکٹر حسن اختر نے لکھا ہے۔" مولانا سالک نے سید ذکی شاہ کی روایت سے اس وقت ان کی عمر بیس سال تحریر کی ہے۔ اگر ان کا سن پیدائش ۱۸۷۳ء تسلیم کر لیا جائے تو ان کی عمر بیس سال بنتی ہے۔ مگر حکومت پاکستان نے سرکاری طور پر ان کا سال پیدائش ۱۸۷۷ء قرار دیا ہے۔"

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ اقبال کے سلسلے میں پاکستان میں جو آمرانہ فضا ملتی ہے اس کی وجہ سے کوئی محقق زور دے کر صحیح بات کہنے سے گریز کرتا ہے۔ سطور بالا میں سید محمود حسین اور یہاں ڈاکٹر حسن اختر کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ کھل کر حکومت کی متعین کردہ تاریخ ولادت کو غلط قرار دیں۔

اقبال کی مکتبی تعلیم یا اسکاچ مشن اسکول میں داخلے کے وقت ان کی عمر کے تعین میں پروفیسر منظور احمد ایم اے ہمشیرزادہ علامہ اقبال کا انٹرویو بہت چشم کشا ثابت ہوگا۔ یہ انٹرویو "روایات اقبال" مرتبہ محمد عبد اللہ چغتائی میں شامل ہے۔

> شیخ منظور محمد نے بتایا کہ میرے ایک ہم جماعت اکرام نامی ہیں۔ ان کے والد اور چچا صحاف تھے اور کاغذ بناتے تھے۔ اب وہ فوت ہو چکے ہیں، اکرام کا بیان ہے کہ علامہ مرحوم اور شیخ عطا محمد اکرام کے گھر کا کاغذ کوٹا کرتے تھے اور وہاں سے روٹی کھانے کو مل جاتی تھی۔ یہ اس خاندان کی انتہائی غربت کا زمانہ تھا پھر شیخ عطا محمد ملازم ہو گئے اور زندگی کا سہارا پیدا ہوا۔ اس زمانے میں علامہ اقبال کی تعلیم بھی رک گئی تھی مگر شیخ عطا محمد کی ملازمت نے ایک اچھی صورت پیدا کر دی۔ (صفحہ ۱۸۰)

روایات اقبال کے مرتب عبد اللہ چغتائی علامہ کے ان چند مخصوص ہم نشینوں میں ہیں جنھیں سفر و حضر میں، حتیٰ کہ علامہ کے مرتے دم تک ان کی رفاقت حاصل رہی۔ پروفیسر منظور احمد علامہ کے سگے بھانجے ہیں۔ یہ دونوں حضرات علامہ کے متعلق کیوں غلط بیانی کرنے لگے۔ اعجاز احمد کی اطلاع کے بموجب ان کے والد عطا محمد ۱۸۸۰ء میں فوج میں ملازم ہو گئے تھے۔ علامہ کی پیدائش ۱۸۵۹ء میں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۸۸۰ء سے پہلے وہ اور اقبال، اکرام کے چچا

ے یہاں کاغذ کوٹنے جایا کرتے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں یا اس سے چار چھ مہینے پہلے جب اقبال اپنے بڑے بھائی کے ساتھ لگدی کوٹنے جاتے تھے تو ان کی عمر سات سا
سے کیا کم ہوگی۔ ایسی صورت میں جب اقبال نے ۱۸۸۳ء میں اسکاچ مشن اسکول کی پہلی جماعت میں داخلہ لیا تو ان کی عمر دس گیارہ سال سے کم نہیں ہونی چ
اس حساب سے ان کا سن ولادت ۱۸۷۳ء نکلتا ہے۔ اگر اقبال کی پیدائش ۱۸۷۷ء کی مان لی جائے تو ۱۸۸۰ء میں ان کی عمر محض تین سال رہ جاتی ہے۔ ظا
ہے اتنی چھوٹی عمر میں کوئی بچہ کاغذ کو کوٹنے نہیں جا سکتا۔

جسٹس جاوید اور دوسرے ۱۸۷۷ء کی تائید کرنے والے مقالہ نگار اقبال کو ذہین فرض کر کے ۱۸۷۷ء کو ان کا سال پیدائش ثابت کرنا چاہتے ہ
ان کے نزدیک اقبال ایسے ذہین و فطین طالب علم نے بیس سال کی عمر میں میٹرک پاس کیا ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ اقبال ایک اوسط درجے کے طا
تھے۔ مڈل اور میٹرک میں ان کی فرسٹ ڈویژن اپنے ہم جماعت طلبا سے عمر میں زیادہ ہونے کی وجہ سے آئی تھی۔ اس کے بعد ایف اے، بی اے اور ا
میں تو پہلے سال فیل ہی ہو گئے، دوسرے سال پاس ہوئے بھی تو تھرڈ ڈویژن میں۔

زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبال نے لکھا ہے "شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ ان کے دادا شیخ نور محمد نے انھیں چار سال چار ماہ کی عمر میں سید میر حس
کے یہاں پڑھنے کے لئے بٹھایا تھا۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے والد نے انھیں بھی اسی عمر میں قرآن مجید پڑھنے کے لیے بٹھایا ہو گا (صفحہ
جسٹس جاوید یہ بھول جاتے ہیں کہ اقبال کے بچپن اور اعجاز احمد کے بچپن کے حالات میں، اقبال کے خاندان میں بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ اقبال کے بچ
میں یہ خاندان نان شبینہ کا محتاج تھا، والد تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ اعجاز احمد کی طفولیت کے زمانے میں اللہ نے نور محمد کو سب کچھ دے رکھا تھا۔ عطا محمد ڈپی
او تھے، اقبال ایم اے کرنے کے بعد کالج میں لکچرر ہو گئے تھے ایسی صورت میں اعجاز کی تعلیم کا چار سال چار ماہ کی عمر میں آغاز ہونا تعجب کی بات نہیں لیکن اس کی
پر یہ قیاس کرنا کہ اقبال کی تعلیم بھی چار سال چار ماہ کی عمر میں شروع ہوئی ہو گی، ایسا ہی قیاس ہے جیسا ڈاکٹر عبد السلام خورشید کا اقبال کی میٹرک اور ال
اے کی تعلیمی قابلیت کے بارے میں تھا۔ سرگزشت اقبال میں ڈاکٹر خورشید لکھتے ہیں ـــــ "انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ وظیفہ حاصل کی
اور تمغہ بھی ظاہر ہے یہی رنگ ایف اے میں بھی رہا ہو گا (صفحہ ۱۸)
دنیا جانتی ہے ایف اے میں اقبال کی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی۔

"مظلوم اقبال" میں صفحہ ۹۰ پر اعجاز احمد نے لکھا ہے۔ "علامہ نے یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان ۱۸۹۶ء میں پاس کیا۔ اس کے متعلق یونیورسٹی کے کیلنڈ
میں جو اندراج ہے اس میں درخواست داخلہ میں دی گئی عمر کے خانے میں ۱۹ سال لکھا ہے۔" اعجاز احمد کی یہ اطلاع کہ اقبال نے یونیورسٹی سے بی اے ۱۸۹۶ء
میں پاس کیا تھا، غلط ہے۔ انھوں نے بی اے ۱۸۹۷ء میں کیا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ اقبال نے ۱۸۹۵ء میں بی اے میں داخلہ لیا تھا، اس لئے بی اے فر
ایر میں داخلہ فارم میں ان کی عمر ۱۹ سال درج ہے۔

اس سلسلے میں جسٹس جاوید اقبال "زندہ رود" میں صفحہ ۴۱-۴۰ پر لکھتے ہیں: اقبال نے ۱۸۹۷ء میں بی اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پنجا
یونیورسٹی کے کیلنڈر سال ۹۸-۱۸۹۷ء میں ان کی عمر کے متعلق جیسا کہ داخلہ فارم میں ظاہر کی گئی ہے، اندراج ہے انیس برس۔ داخلہ کا فارم بمطابق دستو
ایک سال قبل ۱۸۹۶ء میں دیا گیا ہو گا۔ اس حساب سے ان کا سن ولادت ۱۸۷۷ء بنتا ہے" جسٹس جاوید دانستہ یا نادانستہ یہ بھول گئے کہ بی اے کا امتح
دو سال میں پاس کیا جاتا ہے۔ جب اقبال نے بی اے ۱۸۹۷ء میں پاس کیا تو بی اے فرسٹ پارٹ کے لیے داخلہ فارم انھوں نے ۱۸۹۵ء میں بھرا تھا ن
۱۸۹۶ء میں، اس حساب سے اُن کا سال ولادت ۱۸۷۶ء بنتا ہے۔

ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ جرمنی کے مقالے کے پیش لفظ میں انھوں نے اپنی عمر سن عیسوی کی بجائے ہجری سن میں کیوں بھری تھی۔ اس کا سبب یہی معلوم ہو
ہے کہ ۱۹۰۷ء میں جب انھوں نے مڈل کلاس کا سرٹیفکیٹ جرمنی میں منگوایا تو اس میں تاریخ پیدائش کا اندراج نہیں تھا۔ ایسی صورت میں سرٹیفکیٹ کے حوا
سے اگر وہ عیسوی سنہ میں اپنی تاریخ پیدائش کا اندراج کرتے تو یونیورسٹی کے ارباب اقتدار کو اس کے مستند ہونے پر شبہہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے اقبال نے
۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ لکھ کر ہجری سن کے ذریعہ اپنی تاریخ پیدائش کو متعین کی نظر میں شبہ سے بالاتر بنا دیا جو ان کے لئے بالکل اجنبی اور غیر مانوس ہونے کی
وجہ سے زیادہ قابل قبول تھا۔

تعلیمی ریکارڈ کا جائزہ لینے کے بعد، جسٹس جاوید نے اقبال کے بزرگوں اور رشتہ داروں کے بیانات سے اقبال کی تاریخ پیدائش متعین کرنے ک

کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں، اقبال کی عمر کا تخمینہ کرنے کے سلسلے میں، ان کے والد، والدہ اور بھائی بہن کے مقابلہ میں سید ذکی شاہ کا اندازہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو اقبال سے عمر میں دو سال بڑے تھے اور بچپن سے لے کر جوانی تک جب تک اقبال سیالکوٹ میں رہے، ان کا شب و روز کا ساتھ رہا۔ ذکی شاہ اقبال کے استاد میر حسن کے صاحبزادے تھے۔ ذکی شاہ کے حوالے سے ہی عبدالمجید سالک نے اقبال کے والد کا حلیہ پیش کیا اور اقبال کی تاریخ ولادت متعین کی ہے۔ ذکی شاہ کا بیان ہے:

> ۱۸۹۳ء میں بعمر بیس سال ڈاکٹر صاحب نے انٹرنس کا امتحان دیا۔ نتیجہ ابھی نہیں نکلا تھا کہ شادی ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ بارات گجرات جا رہی تھی کہ تار آیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو تار دکھایا اس میں پاس ہونے کی خوش خبری تھی۔ (روایات اقبال صفحہ ۲۶)

خالد نظیر صوفی جنھوں نے اقبال درون خانہ میں میونسپل بورڈ سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش کے اندراجات کی بنا پر علامہ کی پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء متعین کی ہے[1] اور اسی کو مصدقہ مانتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری اور مالک رام وغیرہ نے اسی تاریخ کی تائید کی ہے۔ جذبات سے بلند ہو کر، غیر جانب داری سے جو بھی محقق علامہ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں تحقیق کرے گا اسے اس تاریخ کی تصدیق کرنی ہو گی۔ سید وحید الدین علامہ کی تھیسس کے پیش لفظ پر بھروسہ کرتے ہوئے ۱۸۷۶ء کو معتبر گردانتے ہیں۔ اس کے مقابل میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کا رجسٹر ہے جس میں نتھو کی کئی اولادوں کی تاریخ ولادت درج ہے۔ ۱۸۷۷ء کو مصدقہ سال ولادت ثابت کرنے کے لئے ۱۸۷۳ء کا بطلان بہت ضروری ہے، اس لئے جسٹس جاوید اقبال اور اعجاز احمد نے ۱۸۷۳ء کی تردید میں پورا زور قلم صرف کر دیا ہے لیکن ان حضرات نے جو دلائل دیئے ہیں، وہ بحث برائے بحث کی ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً رجسٹر میں ۴ ستمبر ۱۸۷۶ء کی تاریخ میں جس لڑکی کی پیدائش کا ذکر ہے، بس وہی اندراج صحیح ہے کیونکہ اس میں لڑکی کے والد کا نام نتھو ہے ذات کشمیری ہے اور اطلاع کنندہ کا نام رفیق ہے۔ جسٹس جاوید کے نزدیک رفیق نتھو کے والد کا نام ہے جو مخصوص طور سے اس کا اہتمام کرتے تھے کہ وہ نومولود کی پیدائش کا اندراج میونسپلٹی جا کر خود کراتے تھے اور سیالکوٹ اور اس کی طرح دوسرے بڑے شہروں میں ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ گھر کا کوئی بزرگ یا رشتہ دار ہی اندراج کرانے میونسپلٹی جاتا ہے۔ بھنگی یا غیر رشتہ دار اطلاع کرنے چنگی نہیں جاتا۔ جسٹس اقبال کا یہ استدلال کوئی معقول آدمی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ محلہ کشمیریاں اور چوڑیگراں دونوں ملے ہوئے ہیں اس کے باوجود رجسٹر میں کشمیریاں میں رہنے والے جس باشندے کا ذکر ہے، وہ یقینی طور پر اقبال کے والد نتھو کے علاوہ کوئی اور نتھو تھا، جس کی برادری درزی تھی۔ پھر ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء میں مندرج جس نومولود کے والد کا نام نتھو ہے اور اگرچہ وہ محلہ چوڑیگراں ہی کا رہنے والا ہے تاہم چونکہ اسے درزی برادری کا فرد دکھایا گیا ہے اس لئے نہ یہ نومولود اقبال ہے اور نہ اس کی ولدیت کے خانے میں جس نتھو کا اندراج ہے وہ اقبال کا باپ ہے حالانکہ اس خانے میں پیشہ، قوم اور مذہب کی بھی تفصیل دی جا سکتی ہے مجھے تو اس کالم میں نتھو کے خیاط لکھے جانے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۷۳ء یعنی اقبال کی پیدائش تک نتھو ڈپٹی وزیر علی کے یہاں خیاطی کا کام کر رہے تھے اور اگر اس وقت تک وہ کام بھی چھوڑ آئے ہوں اور گھر پر ہی خیاطی کا کام کرنے لگے ہوں، تو بھی اس خانے میں خیاط کے اندراج سے کسی اور نتھو کے مقابلے میں اقبال کے باپ نتھو ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ اس میں اطلاع کنندہ کا نام محمد علی لکھا ہوا ہے، جو اعجاز احمد کے بقول ان کا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں تھا اس لئے جس لڑکے کی پیدائش اس تاریخ میں درج ہے وہ اقبال نہیں ہے۔ ۱۸۷۳ء کی تردید میں یہ دلائل راقم الحروف کی نظر میں بہت بودے ہیں اور پورے پس منظر کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد راقم کے نزدیک ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ہی علامہ اقبال کی مصدقہ تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے۔ ❁

---

[1] میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش کو دیکھ کر صحیح صورت حال سامنے منتج ہو جاتی ہے۔ اس کی نقل کو یہاں طوالت کے خوف سے پیش نہیں کیا جا رہا ہے جن حضرات کو دلچسپی ہو وہ "اقبال درون خانہ" میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔
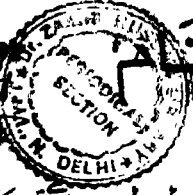
اقبال کے والد کا نام

گزشتہ سال (۱۹۸۵ء میں) مظلوم اقبال کے نام سے علامہ اقبال کی سوانح حیات کراچی سے شائع ہوئی ہے جو علامہ کے متعلق شیخ اعجاز احمد کے تاثرات اور یادوں پر مشتمل ہے۔ علامہ کے متعلقین میں اعجاز احمد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ علامہ کے بڑے بھائی عطا محمد کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ۱۴ جنوری ۱۸۹۹ء میں وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی تعلیم و تربیت علامہ اقبال کے زیر سایہ ہوئی۔ حتیٰ کہ ان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم کا بار بھی زیادہ تر علامہ ہی نے اُٹھایا۔ انہیں یہ بھی شرف حاصل ہے کہ علامہ کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کے مقابلے میں اُنہیں علامہ کی محبت اور شفقت زیادہ حاصل رہی۔ اپنے رجحان کے خلاف اور علامہ کی رہنمائی کے مطابق انہوں نے وکالت کی تعلیم اور پیشہ اختیار کیا۔ علامہ کی کوششوں اور سفارش سے ہی اُنہیں سرکاری ملازمت ملی۔ ۱۹۳۷ء میں جب دہلی میں وہ سب جج تھے، تو حکیم عبدالوہاب نابینا کی تجویزہ دوائیں، سید نذیر نیازی کے علاوہ وہ بھی بھجوانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ حکومت کے مختلف شعبہ جات سے منسلک رہے۔ اُنہوں نے علامہ کی منظومات، غزلیات، خطوط، دستاویزات اور اُنہیں ملنے والے مختلف انعامات، تمغہ جات اور اُن کے عکسی فوٹو بکمال احتیاط محفوظ رکھے اور علامہ سے متعلق اُن کے خاندانی حالات و روایات سے اقبال کے سوانح نگاروں کو متعارف کرایا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روزگارِ فقیر حصہ اوّل و دوم مرتبہ سید وحیدالدین فقیر کا معتد بہ حصہ اعجاز صاحب کی فراہم کردہ معلومات پر مبنی ہے۔

علامہ اقبال پر یوں تو ہزارہا مضامین اور اُن کی سیرت پر درجنوں کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کا سلسلہ مولوی محمد طاہر فاروقی کی سیرت اقبال (اکتوبر ۱۹۳۸ء) سے شروع ہو کر علامہ اقبال کے لائق فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب زندہ رود کی تیسری جلد پر مختتم ہوتا ہے۔ زندہ رود کے ناشر کا دعویٰ ہے کہ اس سے پیشتر علامہ کی زندگی پر اتنی مبسوط اور مکمل کتاب آج تک معرض وجود میں نہیں آئی۔ علامہ کی حیات کا کوئی پہلو یا انکا کارنامہ ایسا نہیں جس پر اس کتاب میں سیر حاصل روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ اس کتاب سے علامہ کی حیات کے بعض ایسے پہلو پہلی بار منظرِ عام پر آئے ہیں جو ابھی تک ہماری نظروں سے مخفی تھے لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ کتاب حیات اقبال کا دیانت دارانہ اور بے لاگ تجزیہ نہیں۔ یہ ایک وکیل کی صفائی کی، اپنے موکل کے حق میں ایک ایسی جامع اور مدلل بحث ہے جو اسے تمام لغزشوں اور الزامات سے باعزت بری کرانے کے لیے بڑی جانفشانی اور قابلیت سے تیار کی گئی ہے یا یہ وہ صاف ستھرا دُھلا ہوا کپڑا ہے جسے دھوبی نے محنت سے دھو کر اس کے داغ دھبے دور کر کے، اس کی شکنوں اور سلوٹوں کو استری کے ذریعہ مٹا کر، نئے کپڑے کی مانند بے داغ بنا دیا ہے۔ ایک چیف جج جاوید اقبال (ان کے لائق فرزند) نے جہاں علامہ کو ایک معصوم انسان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہیں ایک دوسرے سب جج (علامہ کے سگے بھتیجے) اعجاز احمد نے اُنہیں معصوم ہی نہیں مظلوم اقبال بنا کر حق قرابت داری ادا کیا ہے۔

یوں تو پاکستان بننے کے بعد ہی اور خصوصاً ۱۹۷۷ء میں علامہ کے صد سالہ جشن کے بعد سے پاکستان میں ایک ایسی تنگ نظر آمرانہ فضا پیدا ہو گئی ہے جو علامہ کے متعلق سچی بات اور واقعی حالات کو سننا گوارہ نہیں کرتی اور چند مضامین کو چھوڑ کر جو سچی اسپرٹ اور محققانہ تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں ابھی تک کوئی ایسی مکمل بائیوگرافی وجود میں نہیں آئی جس میں علامہ کی زندگی کے واقعات کو پوری غیر جانب داری اور صداقت سے پیش کیا گیا ہو یا انہیں ایک معصوم فرشتہ، غیر معمولی مفکر یا فوق البشر بنا کر پیش کیا گیا ہو۔

حد ہو گئی ہے کہ اس مظلوم اقبال کے ظالم اقبال پرستوں نے پاکستان میں ایسا گلا گھونٹنے والا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ وہاں اس عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے رنگین مزاج انسان اور شعلہ نوا شاعر کو ایک زاہد خشک کٹھ ملّا اور ایک تنگ نظر بانیٔ پاکستان قرار دے دیا گیا ہے۔ جس کے متعلق وہ انسانی کوتاہیاں اور کمزوریاں جو لازمہ بشریت ہوتی ہیں۔ سننے کیلئے آج کوئی تیار نہیں۔ "خدوخال اقبال" کے عنوان سے محمد امین زبیری نے ۱۹۵۵ء میں اقبال کی زندگی کے چند نادر پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ۱۹۵۹ء تک جب چھیاسی سال کی عمر میں اُن کی ہستی کا چراغ گل ہو گیا۔ کوئی پبلشر اُن کی کتاب کی اشاعت کے لئے آمادہ نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب جن سے ان کے ستر سال تک

دوستانہ مراسم رہے تھے، وہ بھی اس کتاب کو شائع کرنے کی جرأت نہیں کر سکے اور یہ اب ۱۹۷۶ء میں ان کے ارادتمندوں اور فرزند کی مشقّ
اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ آج اقبال کے بارے میں بہت سی باتیں ہمارے علم میں آچکی ہیں جن پر امین زبیری یا ان کے معاصرین کے زمانے میں پردہ پ
پھر اس کتاب کو لکھے ہوئے تیس سال کا عرصہ گزر گیا اگر ۱۹۵۵ء میں ہی یہ کتاب منظر عام پر آگئی ہوتی تو کہیں زیادہ ہنگامہ آفریں ہوتی۔ پھر بھی بعض
اپنے اس اندیشہ میں حق بجانب ہیں کہ جس طرح جوش ملسیانی کی "اقبال کی لسانی غلطیاں" ، سیّد حامد جلالی کتاب 'علامہ اقبال اور اُن کی ب
اور شیخ عطا محمد کے خطوط" آج دیکھنے کو نہیں ملتے، اس کتاب کو بھی بازار سے غائب نہ کر دیا جائے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں بائیوگرافی کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ یہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں کسی فرد کی زندگی کی تاریخ پیش کی جاتی ہے۔ میر
اردو ادب میں آج تک کوئی ایسی بائیوگرافی لکھی گئی ہے جس میں تاریخی صداقت کو بطور خاص ملحوظ رکھا گیا ہو۔ حیات جاوید سے لیکر زندہ رود
اقبال تک تمام سوانحی عمریاں مدلل مداحی کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں سوانح نگاری کا مقصد اپنے ممدوح کی عظمت کو نمایاں کرنا
کو مثالی بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے اس میں جو کوتاہیاں یا نقائص ملتے ہیں اوّل تو ہم انہیں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔
کا ذکر ناگزیر ہی ہوتا ہے تو اس کی ایسی تاویل کرتے بلکہ اس میں اتنی تحریف کر دیتے ہیں کہ اصل حقائق پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہ ستم ظریفی
اقبال کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے اردو ادب تو کیا، پوری ادبی دنیا کی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اقبال کی پیدائش
ان کی وفات تک، بلکہ ان کی پیدائش سے پہلے اس کے نسب اور خاندانی حالات و روایات کے بارے میں بھی، ایسے من گھڑت قصے بیان کئے
اور انہیں مسلسل اور منظم طور پر اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ اصل حقیقت جھوٹ اور جھوٹ سچ نظر آنے لگا ہے۔ اس مختصر مضمون میں اقبال کی ز
تمام اصل واقعات کا تجزیہ اور استقصا کرنا ممکن نہیں، اس کے لئے ایک دفتر بے پایاں چاہئیے۔ میں یہاں صرف اقبال کے والد کے اصل نام کر
کی کوشش کروں گا جو اس مضمون کا عنوان ہے۔

روزگار فقیر حصّہ اوّل (صفحہ ۱۴۵) میں سیّد وحیدالدین فقیر نے لکھا ہے!

> شیخ نور محمد کی پیدائش سے قبل چوں کہ ان کے والدین کے یہاں دس لڑکے یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے
> اس لیے شیخ نور محمد کے پیدا ہونے سے پہلے اور بعد میں ان کے والدین نے وہ تمام رسوم ادا کیں جن کو
> عرف جہالت اور ضعیف الاعتقادی اور بے اولاد والدین کی ایک خاص اضطرابی کیفیت سے تعبیر کیا جا
> سکتا ہے۔ شیخ نور محمد کی پیدائش پر ان کی ناک چھید دی گئی[1] اور اس میں ایک چھوٹی سی نتھ پہنا
> دی گئی گویا اپنے زعم میں قدرت کے سامنے لڑکے کو لڑکی بنا کر پیش کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لڑکپن میں
> کئی سال تک شیخ نور محمد اس نتھ کو پہنے پھرتے رہے۔ اسی رعایت سے ان کا عرف نام نتھو پڑ گیا۔

وحیدالدین صاحب نے لکھا ہے کہ لڑکپن میں شیخ نور محمد کئی سال تک اس نتھ کو پہنے پھرتے رہے۔ اس رعایت سے ان کا عرف نتھو پڑ
کئی سال تک تو وحید صاحب نے علامہ اقبال کا احترام ملحوظ رکھ کر لکھا ہے۔ ہو سکتا ہے بالغ ہو جانے پر بھی وہ اس نتھ کو پہنے پھرتے رہے ہو
توہم پرستی کا شکار تھا، غریب تھا۔ پھر جس شخص کی یکے بعد دیگرے دس اولادیں داغ مفارقت دے گئی ہوں اور جس کی ضعیف الاعتقادی اپنے
کی زندگی اور اس کی ازدیاد عمر کو نتھ کا کرشمہ سمجھتی ہو، ہو سکتا ہے اس نے جیتے جی اپنے لڑکے کو نتھ اتارنے کی اجازت نہ دی ہو۔ اس خاند
کا اندازہ روایات اقبال مرتبہ عبداللہ چغتائی سے لگایا جا سکتا ہے۔

> شیخ منظور احمد (علامہ اقبال کے بھانجے) نے بتایا کہ میرے ایک ہم جماعت اکرام خاں تھیں۔ ان کے
> والد اور چچا صحاف تھے، وہ کاغذ بناتے تھے۔ اب وہ فوت ہو چکے ہیں۔ اکرام کا بیان ہے کہ حضرت علامہ
> مرحوم اور شیخ عطا محمد، اکرام کے گھر کاغذ کوٹا کرتے تھے اور وہاں سے روٹی کھانے کو مل جاتی تھی۔ یہ

---

[1] اقبال درون خانہ میں لکھا ہے کہ نتھو کے ناک اور کان دونوں چھید دئے گئے۔ صفحہ ۱۵۴

اُس خاندان کی انتہائی غربت کا زمانہ تھا۔ پھر شیخ عطا محمد رسالے میں ملازم ہوگئے تو آمدنی کا سہارا ہوا۔
اس زمانے میں حضرت علامہ کی تعلیم بھی رک گئی تھی۔ (صفحہ ۱۸۰)

عطا محمد کی شادی ہوجانے کے بعد بھی غربت نے اس خاندان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اقبال کی بھاوج یعنی عطا محمد اہلیہ محترمہ کا بیان ہے کہ "اقبال بہت چھوٹی سی ہی عمر میں بے حد ذہین تھے اور شعر و شاعری سے ان کی طبیعت کو مناسبت تھی۔ بار ہا ایسا ہوا کہ میں بعض دوسری عورتوں کے ساتھ رات کو آزار بند بنا کرتی تھی۔ [ذکر اقبال صفحہ ۱۱]

قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ازار بند بننے سے روزی کمانے کا ذریعہ ۱۸۸۶ء سے پہلے ختم نہیں ہوا۔ اور غربت کا سایا اس خاندان پر اُس وقت تک منڈلاتا رہا جب تک عطا محمد ۱۸۸۴ء میں اوورسیر نہیں ہوگئے۔ اندازہ یہ ہے کہ اوورسیر ہونے کے بعد دو تین سال میں خوش حالی کا دور آگیا ہوگا۔ اور اس طویل عرصے تک علامہ اقبال کے غریب والد کا نام نتھو ہی رہا ہوگا۔

سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش میں ۴ نومبر ۱۸۷۶ء کو جو اقبال کی بہن پیدا ہوئی تو اس کی ولدیت کے خانے میں اس کے والد کا نام نتھو ولد محمد رفیع لکھا ہوا ہے۔ اس نقشہ سے ایک چیز اور سامنے آتی ہے ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو نتھو کے یہاں جو لڑکا پیدا ہوا ہے اور جسے خالد نظیر صوفی اور نظیر صوفی اپنی تحقیق کے مطابق اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش قرار دیتے ہیں۔ اس لڑکے کے والد کے نام آگے مسلمان خیاط لکھا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۳ء تک اقبال کے والد ڈپٹی وزیر سنگھ کے یہاں خیاطی پر ملازم رہے ہوں گے۔ حقائق کچھ بھی ہوں، ایک بات طے شدہ ہے کہ ۱۸۷۳ء تک اقبال کا خاندان غربت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو چنگی کے رجسٹر میں اقبال کے والد کا نام صرف نتھو نہ لکھا ہوتا۔ اگر وہ ذرا بھی خوش حال یا متمول ہوتے تو نور محمد نہ سہی ان کا نام شیخ نتھو تو ضرور لکھا ہوتا۔ پھر رجسٹر میں ایک جگہ نہیں، اُن کی چاروں اولادوں کے سامنے والد کا نام نتھو درج ہے۔ اگر اصل نام نور محمد تھا تو ایک آدھ جگہ تو نور محمد یا نور محمد عرف نتھو درج ہوتا۔

لیکن ستم ظریفی تو دیکھئے کہ یہی خالد نظیر صوفی جو اپنے والد نظیر صوفی سے اس تحقیق میں متفق ہیں کہ پاکستان اقبال کمیٹی نے 'اقبال کی تاریخ ولادت ۱۸۷۷ء متعین کر کے غلطی کی ہے اور اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ہی ہے۔ یہی خالد نظیر صوفی اس رجسٹر کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں

> اور ۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۱ء تک کے رجسٹر پیدائش کی ذاتی طور سے کئی دن تک چھان بین کی اور ایک ایک اندراج کو بنظر غور دیکھا۔ اُن آٹھ برسوں میں شیخ نور محمد عرف نتھو کے چار بچوں کے اندراج دستیاب ہوئے۔ [اقبال درون خانہ صفحہ ۱۵۳ تا ۱۵۴]

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا چنگی کے رجسٹر میں سرے سے نور محمد کا نام ہی نہیں ہے لیکن خالد نظیر صوفی اس میں شیخ نور محمد عرف نتھو پڑھ لیتے ہیں۔

اس قسم کی عجوبہ آفریں حرکت سید وحید الدین فقیر نے اس بیعنامہ کا تعارف کراتے ہوئے کی ہے، جس کے ذریعہ علامہ کے والد نے ۱۸۹۵ء میں بازار چوڑی گراں میں دو دکانیں شیخ جہانگیری ولد دیداز بخش سے مبلغ چھ سو روپے میں خریدی تھیں۔ قارئین کی سہولت اور سید وحید الدین کی کارفرمائی کو نمایاں کرنے کے لئے اس بیعنامہ کا عکس مضمون کے آخر میں ANNEX -I کے تحت دیا جارہا ہے۔ یہ بیعنامہ خط شکست میں لکھا ہوا ہے۔ جسے بسہولت پڑھنے کے لئے ذیل میں نستعلیق خط میں دیا جارہا ہے

> منکہ شیخ جہانگیری ولد شیخ دیداز بخش قوم ڈیرہ ساکن سیالکوٹ کا ہوں، جو کہ ایک دوکان دو منزلہ بعمارت پختہ متضمن ایک کوٹھری معہ برآمدہ معہ زینہ منزلہ زیریں و ایک کوٹھری و برآمدہ مع زینہ منزل بالا و ایک دوکان ایک منزل پختہ مسقف بچوب و کڑی و بالائے متضمن ایک کوٹھری معہ برآمدہ محدودہ حسب ذیل شمال مکان شیخ نتھو مستری جنوب دوکان شیخ میراں بخش مشرق در دروازہ بازار مغرب مکان شیخ نتھو مستری واقعہ بازار چوڑیگراں شہر سیالکوٹ مملکت میری بلا شرکت غیرے ہے۔ الحال

؎ کتاب ہذا صفحہ

بحالت صحت بدن و اثبات عقل برضامندی خود دو دکانات مذکورہ معہ جملہ حقوق متعلقہ دکانات بمقابلہ مبلغ چھ سو روپے ضرب چہرہ شاہی نصف جس کے تین سو روپے ہوتے ہیں بدست شیخ نتھو ولد شیخ محمد رفیق قوم شیخ ساکن سیالکوٹ بیع و فروخت کر کے زر ثمن روبرو بدست رجسٹرار صاحب لونگا۔ قبضہ و دخل دو دکانات مذکور بہ مشتری کو دیدیا گیا ہے۔

گواہ	گواہ
شیخ جہانگیری ولد شیخ دیداز بخش شیخ، ساکن سیالکوٹ گندم رنگ، درمیانہ قد عمر تخمیناً سو سال داغ ہو کہ سیاہ بر کلائی چپ، شیخ جہانگیری بقلم خود	محمد دین ولد مولا نا بخش بقلم خود ساکن سیالکوٹ

اس دستاویز کا تعارف کراتے ہوئے فقیر صاحب رقم طراز ہیں۔

راقم الحروف نے اعجاز صاحب کے پاس رجسٹری شدہ دستاویزات دیکھی ہیں جن میں شیخ نور محمد صاحب کی ولدیت شیخ محمد رفیق درج ہے۔ اِن میں سے ایک دستاویز کا عکس بیان شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ غور طلب ہے کہ یہ بیع نامہ ۱۸۹۵ء میں کرایا گیا تھا جب کہ عطا محمد کے ایس ڈی او رملٹری ہو جانے کی وجہ سے گھر میں روپے کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ اقبال کے والد کی صحیح تاریخ پیدائش کسی کو نہیں معلوم مختلف قیاسات کے مطابق ۱۹۳۰ء میں اُن کی وفات تیرانوے ۹۳ سال سے لے کر ایک سو دس ۱۱۰ سال تک کی عمر میں ہوئی تھی ہم احتیاطاً اگر یہ بھی مان لیں کہ ۱۸۹۵ء میں اُن کی عمر ساٹھ سال تھی۔ تو اتنی پختہ عمر میں اور وہ بھی متمول ہو جانے کے بعد بیع نامہ جیسی عمارت سند دستاویز میں اِن کا نام شیخ نور محمد عرف شیخ نتھو لازماً درج ہونا چاہیے تھا۔ بیع نامہ میں صرف شیخ نتھو کا اندراج ضمنی ثبوت ہے اس امر کا کہ ان کا نام نور محمد نہیں۔ صرف نتھو تھا۔

گمان یہ ہوتا ہے کہ اقبال جب ڈاکٹر اور بیرسٹر ہو گئے اور شاعر کی حیثیت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ چار دانگ عالم میں اُن کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا وہ اِس بات میں اپنی سبکی محسوس کرنے لگے کہ ان کے والد کا نام نتھو ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، بیرسٹر ایٹ لا اور ان کے والد محض نتھو ایسا داغ تھا جس کی بنا پر وہ اعلا سوسائٹی میں اپنی کج کلاہی قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس داغ کو کیسے دور کیا جائے، ہو سکتا ہے یہ خلش ہائی اسکول یا ایف، اے (۱۸۹۵ء) کرنے کے بعد ہی اِن کے دل میں پیدا ہو گئی ہو جو انگلینڈ اور جرمنی جا کر اور بھی شدید ہو گئی۔ اور جب وہاں سے بیرسٹر بن کر لاہور آ گئے تو انہوں نے اس کانٹے کو نکالنے کا تہیہ کر لیا۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو بیرسٹری کے رجسٹریشن کے لیے اُنہوں نے بار کاؤنسل میں جو پہ وفارما (فارم) بھر کر بھیجا تو اس میں نتھو کی بجائے اپنی ولدیت میر محمد لکھ دی۔ سوچا ہو گا جب نام ہی بدلنا ہے تو نور محمد پر ہی کیوں اکتفا کیا جائے کیوں نا والد کا نام میر محمد کر کے سیادت کا طرّہ دستار سر پر باندھ لیا جائے، مظلوم اقبال کے مصنف اعجاز احمد نے اس سلسلے میں یہ تاویل پیش کی ہے۔

میاں جی کے ذکر میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے، چچا جان کو ۱۹۰۸ء میں جو بیرسٹری کی سند دی گئی اس میں اِن کے والد گرامی کا نام انگریزی میں نور محمد NOOR MOHAMMED کی بجائے MIR MOHAMMED لکھا ہے۔ جو درست نہیں۔ سند تیار کرنے والے انگریز کارکن نے اسلامی ناموں کی ناواقفیت کی وجہ سے NOOR کو MIR پڑھ لیا اور وہی لکھ دیا۔ جب اس سند کی بنا پر چچا جان نے چیف کورٹ لاہور میں بطور بیرسٹر رجسٹر کیے جانے کی درخواست دی تو سند کے مطابق وہاں بھی ولدیت میر محمد درج ہو گئی۔ نام کی یہ غلطی چچا جان کے علم میں آئی تو ہو گی معلوم نہیں کیوں انہوں نے اس قدر تساہل سے کام لیا اور غلطی کی اصلاح نہیں کرائی۔

(مظلوم اقبال صفحہ ۳۵)

اس سنگین فروگذاشت کو فاضل جج صاحب نے یوں سرسری بیان کیا ہے جیسے باپ کے نام کی تبدیلی کوئی اہم بات نہ ہو۔ ایک معمولی فہم

کا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ باپ کے نام کی یہ تبدیلی اقبال جیسا بیرسٹر کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ باپ کا نام بدلنے سے انسان کا تشخص بدل جاتا ہے، آدمی بدل جاتا ہے۔ ایسی سنگین غلطی کی تصحیح نہ کرانے میں ایک بیرسٹر تساہل برتے یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ دنیا میں سو دوست، سو دشمن ہوتے ہیں، اگر انگریز کارکن کی غلطی سے والد کا نام غلط درج ہو گیا تھا تو اقبال کو اندیشہ ہونا چاہئے تھا کہ کسی نے شکایت کر دی تو اس کا رجسٹریشن خارج ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے بات بڑھنے پر بدنیتی کا شبہ ہو جانے پر ان کے خلاف آئی پی سی کی کارروائی شروع ہو جائے اس لئے گمان ہوتا ہے کہ یہ فرنگی شیشہ گر کی فن کاری نہیں تھی۔ اقبال کا اپنا کارنامہ تھا۔

اگر ہم رجسٹریشن حاصل کرنے کے ضابطے PROCEDURE کو سمجھ لیں تو ہم کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ غلطی رجسٹریشن سکریٹری کی نہیں ہو سکتی۔ جب کوئی ایڈوکیٹ یا بیرسٹر رجسٹریشن کے لئے درخواست دیتا ہے تو اسے بار کاؤنسل کے سکریٹری سے رجسٹریشن پروفارما قیمتاً حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس فارم پر وہ اپنا نام مع ولدیت اور پورے پتے کے جلی حرفوں میں الگ الگ BLOCK LETTERS میں لکھتا ہے، اس صورت میں NOOR کو MIR پڑھا ہی نہیں جا سکتا۔ اسی فارم کے ساتھ ایک بیان حلفی منسلک کرنا ہوتا ہے جس میں مفصل حالات PARTICULARS لکھنے ہوتے ہے۔ ہائی اسکول کے سرٹی فکیٹ کے ساتھ آخری تعلیمی امتحان بی اے یا ایم اے کے ساتھ وکالت پاس کرنے کی سند بھی اس پروفارما کے ساتھ لگائی جاتی ہے بی اے اور ایم اے کی اسناد میں ولدیت مذکور نہیں ہوتی۔ اس طرح پی ایچ ڈی وکالت اور بیرسٹری کی اسناد میں ولدیت کا اندراج نہیں ہوتا۔ ہائی اسکول کے سرٹی فیکٹ میں ولدیت کے ساتھ تاریخ پیدائش بھی درج ہوتی ہے۔ بیرسٹر اقبال نے پروفارما بھرتے وقت اپنے والد کا نام میر محمد ہی لکھا ہوگا۔ ہائی اسکول کی سند ہو سکتا ہے نہ لگائی ہو یا بیان حلفی میں کہہ دیا ہو کہ فی الحال دستیاب نہیں ہے، یونیورسٹی سے حاصل کر کے بھیج دی جائے گی۔ اس کے ساتھ آجکل ڈھائی ڈھائی سو روپے کے دو اسٹامپ بھیجے جاتے ہیں جن کی پشت پر اوپر کی جانب امیدوار کا نام مع ولدیت اور پتے کے لکھا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں اسٹامپ اتنی قیمت کے یقیناً نہیں لگتے ہوں گے۔ اس ضابطے کی خانہ پوری میں کہیں بھی کمی رہ جائے، تو فارم واپس آجاتا ہے اور غلطی کی تصحیح کرنی پڑتی ہے امیدوار کا نام، اور اس کی ولدیت اتنی متعدد جگہ لکھنے کے بعد اور وہ بھی جلی حرفوں میں، BLOCK LETTERS بار کاؤنسل کے سکریٹری کے لئے غلطی کرنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ماحصل یہ ہے کہ بغیر ذاتی اہتمام کے رجسٹریشن میں والد کے نام کی تبدیلی ممکن نہیں تھی۔

اقبال کے متعلق اتنے وثوق سے بدگمانی ظاہر کرتے وقت احتمال ہوتا ہے کہ اس کا قوی امکان ہے کہ اس زمانے میں رجسٹریشن کے بارے میں اتنی سختی نہ برتی جاتی ہو اور ایل ایل بی یا بیرسٹری کی سند میں ولدیت کا بھی اندراج ہوتا ہو اور جیسا کہ اعجاز احمد نے ظاہر کیا ہے، مسلمانوں کے ناموں سے ناواقفیت کی بنا پر واقعی انگریز کارکن نے نور محمد کو میر محمد سمجھ لیا ہو اور اسی بنیاد پر متعلقہ کورٹ سے رجسٹریشن اشو کر دیا گیا ہو۔ لیکن یہاں اس اہم اعتراض سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں کہ ولدیت کے نام کی تبدیلی ایسی غلطی ہے جس کی موجودگی، کوئی وکیل یا بیرسٹر کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے یہ کہنا کہ اقبال نے تساہل کی بنا پر ترمیم نہیں کرائی، سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

دقیقہ رسی یا سنجیدہ SINCERE تحقیق کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح صورت جاننے کے لئے لاہور کی چیف کورٹ میں اقبال کی اصل رجسٹریشن فائل یا اس درخواست کو تلاش کیا جائے جو اقبال نے اس ضمن میں کورٹ میں پیش کی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑا احتمال یہ ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ یہ فائل دستیاب ہو جائے یا ابھی تک محفوظ رہی ہو۔ اور اگر اقبال نے واقعی کسی احساس کمتری کی بنا پر یہ تبدیلی کی تھی تو یہ بالکل ممکن ہے کہ اقبال نامہ کے بعض خطوط کی طرح کسی چودھری محمد حسین نے اسے ضرور تلف کر دیا ہوگا۔ یا اس میں تحریف کر دی ہوگی۔ جہاں تک تحریف یا اخفا CONCEALMENT کا تعلق ہے، اقبال کے خطوط کے مرتبین اعلانیہ طور پر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مصلحتاً خطوط کی کچھ عبارتوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اب یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ اقبال کی متعلقہ فائل اس مصلحت کی کار فرمائی سے محفوظ رہی ہوگی اور اگر وہ واقعی آج بھی محفوظ ہے۔ اقبالیین کی جارحانہ تحریف یا اخفائے حال کی کاوش کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال نامہ حصہ اول کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۴ء میں نکلا تھا لیکن صرف اتنی سی بات کو چھپانے کے لئے نواب بھوپال سے وظیفہ حاصل کرنے کے لئے خود اقبال نے درخواست دی تھی۔ اس ایڈیشن کو صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹا دیا گیا اور اس کی جگہ ۱۹۴۵ء کے ایڈیشن کو رائج کیا گیا کہ ۱۹۴۴ء کی اولین اشاعت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی اور کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ ۱۹۴۵ء سے پہلے بھی اس کا کوئی ایڈیشن نکلا ہوگا۔ وہ تو شکر ادا کیجئے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ان کی کتاب (تصانیف اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ) کا کہ اس نے ثابت کیا ہے کہ "یہ مجموعہ اولاً ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس کا ایک نسخہ پشاور یونیورسٹی لائبریری میں آج بھی موجود ہے۔ (کتاب مذکرہ صفحہ ۲۱۶)

مرقعِ اقبال" میں صفحہ ۲۵ پر ایم اے کی ڈگری میں ڈویژن کے ساتھ لفظ THIRD نہیں لکھا ہوا ہے۔ یہ سوچنا کہ یہ لفظ سہواً یا اتفاق سے چھوٹ گیا ہے۔ اس سے کوئی تعلیم یافتہ شخص اتفاق نہیں کر سکتا۔ ڈویژن کی وضاحت کے بغیر ڈگری، ڈگری نہیں رہتی بغیر اس کے ساتھ شیخ محمد اقبال کے نام کے آگے بی اے لکھا ہوا ہے۔ جو ایم اے کی ڈگری میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ولدیت بھی لکھی ہوتی ہے۔ جو بی۔اے، ایم اے، اور اس کے بعد پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ وغیرہ کی ڈگریوں میں سند درج نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ڈگریوں کے یہ عکس کہاں سے اخذ کیے ہیں۔ سید وحید الدین کی کتاب IQBAL IN PICTURES میرے پاس نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہیں سے لیے ہوں۔ اس ڈگری کے جعلی یا مشتبہ ہو جانے سے دوسری ڈگریاں بھی قاری کی نظر میں ساقط الاعتبار ہو جاتی ہیں۔ مڈل کی ڈگری میں ولدیت درج ہے اور نہ تاریخ پیدائش۔ مڈل کا امتحان اقبال نے ۱۸۹۱ء میں پاس کیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اوریجنل کھو گئی۔ ۱۹۰۰ء میں دوبارہ اس کی نقل حاصل کی گئی۔ ان ڈگریوں کو مستند سمجھنے کے لیے قاری کے ذہن میں ایک ہی دلیل آ سکتی ہے اور وہ یہ کہ اس زمانے میں اس قسم کی تفصیلات ڈگریوں میں دی نہ جاتی ہوں گی۔ بین الاقوامی شہرت کے ہندی ادیب پنڈت بنارسی داس چترویدی کی مڈل کلاس کی سند تلاش کرنے سے ہاتھ آ گئی ہے۔ چترویدی جی نے ۱۹۰۶ء میں مڈل کیا تھا۔ اس سند میں چترویدی کی تاریخ پیدائش اور ولدیت دونوں لکھی ہیں ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال کی مڈل کی سند بھی فرضی ہے۔ اس طرح اقبال کی مڈل کی، بی اے اور ایم اے کی تینوں اسناد جن کے عکس اس البم میں دیے ہیں، جعلی اور مصنوعی ٹھہرتی ہیں۔ سوال کیا جا سکتا ہے اس جعل اور فریب کا مقصد کیا تھا۔ ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ مڈل کی سند کے ذریعہ اقبال کی ولدیت نتھو کو چھپانا اور بی اے اور ایم اے اسناد کے ذریعہ اس کی ولدیت نور محمد ثابت کرنا۔

یہاں ایک اور اہم سوال اٹھتا ہے اور وہ یہ کہ اقبال کے ذہن میں ایسی کون سی گرہ (COMPLEX) تھی جو ولدیت کے سلسلے میں انھیں یہ قلابازیاں کھانے پر مجبور کرتی رہی۔ بات یہ ہے کہ اقبال کا تعلق ایک پسماندہ برادری (منہار) سے تھا اور ان کے والد کا نام نتھو ہونا، ان کے اس پسماندہ برادری کے فرد ہونے کا ثبوت فراہم کرتا تھا۔ یہ انتساب یاسبکی اقبال ایسے عظیم المرتبت انسان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس لیے انہوں نے نتھو کے بدلے اپنے والد کا نام نور محمد اور میر محمد رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے مضمون ——— "کیا اقبال کشمیری پنڈت تھے" (مشمولہ اردو ادب ۱۹۸۹ء شمارہ ۲، صفحہ ۱۹) میں لکھا تھا کہ اقبال کے ایک رشتہ دار، چراغ دین تقسیم ہند سے پہلے چوڑیاں خریدنے سیالکوٹ سے فیروز آباد آیا کرتے تھے۔ یہ منہار برادری کے فرد تھے۔ اب زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے جو اپنے خاندان کا شجرہ نسب پیش کیا ہے، اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چراغ دین علامہ اقبال کے چچیرے بھائی تھے۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ اقبال کا کبھی اپنے آپ کو برہمن زادہ اور کبھی میر محمد کی اولاد بتانا، ان کے احساس کمتری یا نسبی دنایت کی بنا پر تھا۔ ❀

مخدومی السلام علیکم

آپ کی نظم موصول ہو گئی ہے شکریہ قبول فرمائیے۔ اسرار خودی ابھی ختم نہیں ہوئی اگر ممکن ہے آپ
حاضر ہو اگر ایسا ہو تو میرے لیے دعا فرمائیے۔

محمد اقبال ۲۶ فروری ۱۶ء

بنام سید شوکت حسین

یہ مختصر ساخط اقبال نے سید شوکت حسین [۱۹۴۹ء — ۱۸۹۹ء] کو تحریر کیا تھا۔ جو اقبال کے مدّاح اور عقیدت مند تھے۔ انھوں نے ۵۲ اشعار پر مشتمل ایک فارسی نظم بہ عنوان "خطاب بہ اقبال" تحریر کی تھی۔ پہلی بار خط کا متن شیخ عطاء اللہ نے "اقبال نامہ" [حصہ دوم] مطبوعہ ۱۹۵۱ء میں صفحہ ۲۵۵ پر شائع کیا۔ اس خط کا عکس پہلی بار "ضیائے حرم" شمارہ اپریل ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔

سردار جعفری

سیتا محل، سکنڈ فلور، بومن جی پیٹٹ روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۲۶

بڑی شاعری

بڑی شاعری اکثر و بیشتر بے جا آرائش سے پاک ہوتی ہے اس کا استعارہ بلیغ ہوتا ہے۔ الفاظ حسن معنی سے جگمگا اٹھتے ہیں اور ان میں ایک پرجوش غنائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور آہنگ ایک انفرادیت اختیار کر لیتا ہے۔ معنوی اعتبار سے وہ شاعری اپنی قوم کے تہذیبی مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ تہذیبی مزاج کی تشکیل میں عقائد کے علاوہ تاریخی عوامل کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے اور جغرافیائی رنگ بھی شامل ہوتے ہیں، اس لیے شاعر جب اس تہذیبی مزاج کو شعر میں ڈھال دیتا ہے تو قومی مزاج کے سارے تار گنگنانے لگتے ہیں، یہ بات اہم نہیں ہے کہ آہنگ نغمۂ زیرِ لب ہے یا نعرۂ مستانہ۔ اس کا تعین در اصل معنی کا خزانہ کرتا ہے لیکن اس خزانے کے جواہرات ہر انتخاب میں شاعر کی افتادِ طبع کا بھی دخل ہوتا ہے۔ غالب اور اقبال دونوں میر تقی میر کے مقابلے میں اونچے سُروں کے شاعر ہیں۔ اقبال کا سُر غالب کے سُر سے بھی زیادہ بلند ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کی موت پر اقبال نے فارسی میں تین شعر کہے جنھیں ہم مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ مرثیہ دردانگیز نہیں ہے۔ اس کی تاثیر پرکیف ہے۔ ان اشعار میں اشک باری اور سینہ کوبی نہیں ہے صرف بیانِ واقعہ ہے لیکن پرشکوہ انداز میں۔

پہلا شعر ہے ؎

یک نفس جانِ نزار او تپید اندر فرنگ

تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں درگذشت

اس شعر کے پس منظر میں یہ تاریخی واقعہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر نے گول میز کانفرنس میں نہایت پرجوش الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ میں غلام ہندوستان میں مرنے کے لیے تیار نہیں یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا انگلستان میں جان دے دوں گا۔ یہ زورِ خطابت سوزِ یقین کا اظہار تھا اور انہوں نے جو کہا تھا کر دکھایا۔

اس شعر میں دل کے شدید دورے کو جان نزار کے لمحہ بھر تڑپنے سے تعبیر کرنا شاعری کا جوہر ہے۔ یہاں جان کے ساتھ نزار کا لفظ روایتی غزل کے انداز میں استعمال نہیں ہوا ہے جہاں کیفیت پیدا کرنے کے لیے دل کو بلاوجہ دلِ زار کہہ دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں اس طرح کا دلِ زار نہیں ہے۔ اس مخصوص شعر میں جان نزار ایک دل کے مریض کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بلیغ استعمال ہے۔ وہ جانِ نزار دیارِ فرنگ میں ایک لمحہ تڑپ کر پرواز کر گئی اور ماہ و پرویں کی حدوں سے گذر گئی اور وہ بھی پلک جھپکتے۔ اس سرعت پرواز کا لطف تیسرے شعر میں بڑھ جاتا ہے۔ جس میں مولانا کی تدفین کے ساتھ معراج کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا شعر ؎

اے خوشا مشتِ غبار او کہ در جذبِ حرم

از کنارِ اندلس واز ساحلِ بربر گذشت

اس شعر میں حرم سے مراد بیت المقدس ہے۔ اسلام کا قبلۂ اول۔ جس کی کشش مولانا کے جسدِ خاکی (مشت غبار) کو اپنی طرف

بلا رہی ہے۔ بیت المقدس کی خاک کے مقابلے میں وہ ساری شان و شوکت کم تر ہے جو لفظ اُندلس سے ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہ مولانا محمد علی جوہر کی مشتِ غبار اس کو نظر انداز کر کے بیت المقدس کی طرف جا رہی ہے۔ اس مقام پر بے ساختہ رموزِ بے خودی کے آخری اشعار یاد آجاتے ہیں جو معنی حریتِ اسلامیہ و سرِ حادثۂ کربلا کے عنوان سے لکھے گئے ہیں ؎

رمزِ قرآں از حُسین آموختیم
ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں
اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں

صاف ظاہر ہے کہ شہادت، شہنشاہیت سے عظیم تر ہے۔ اور محمد علی جوہر کا مشتِ غبار شوکتِ رفتہ کے مزار پر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

شعر کا دوسرا مصرعہ "از کنارِ اندلس واز ساحلِ بربر گذشت" پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تخیّل کی آنکھوں کے سامنے سے وہ جہاز گذر رہا ہے جس میں مولانا کی مشتِ غبار اُندلس کے بعد شمالی افریقہ کے ساحل کو چھوڑ کر خاکِ قدسی [بیت المقدس] کی آغوش میں جا رہی ہے اس ساحل پر بھی مسلم حکومتوں کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

یہاں ذہن قرآن کی اس آیت کی طرف چلا جاتا ہے جس میں معراج کا ذکر ہے۔ بیت الحرام سے مسجد الاقصیٰ اور مسجد الاقصیٰ سے عرشِ معلّیٰ کی طرف۔ تیسرا شعر اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے ؎

خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنّا در کشید
سوئے گردوں رفتہ زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

بیت المقدس [جہاں مولانا دفن ہیں] کہ خاک نے اِسے اپنی آغوشِ تمنا میں کھینچ لیا اور آسمان کی طرف آخری سفر اس راستے سے کیا جس سے پیغمبر گذرے تھے۔

یہ ایک شہیدِ آزادی کی آخری معراج ہے۔

آخر میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ تجزیہ ایسے اشعار کا ہے جس میں آزادی کے ساتھ مذہبی حوالے بھی شامل ہیں۔ اقبال کی دوسری نظمیں اور اشعار بھی جن میں اس طرح کے مذہبی حوالے نہیں ہیں اس تجزیے کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ ❁

بنام فقیر سید سراج الدین

لاہور کے مشہور فقیر خاندان کے ایک فرد افتخار الدین کے صاحبزادے تھے۔ اس خاندان کا اقبال سے بے حد قریبی تعلق رہا ہے۔ سید سراج الدین نے پی سی ایس میں منتخب ہو کر جب ملازمت کا آغاز کیا تو اس کی اطلاع اقبال کو دی جس کے جواب میں اقبال نے یہ خط تحریر کیا۔ اس خط کا عکس "روزگارِ فقیر" [حصہ اول مطبوعہ ۱۹۵۰ء] کے صفحہ نمبر ۵۹ پر دیا گیا ہے۔

[illegible]

عزیز من سلمہ — آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ بہت خوشی ہوئی
مجھے یقین ہے کہ خدمت جو تم اب کرو گے والدین کے نقش قدم پر ہوگی
اور اپنے فرائض منصبی دیانت سے ادا کرو گے۔ محنت اور
دیانت ہی ترقی کا راز ہے [illegible] زیادہ کیا

محمد اقبال

محمد حسن

ڈی ۔ ۷ ، موڈل ٹاؤن ۔ نئی دہلی ۔ ۹

اقبالؔ کے تہذیبی رویّے

نئی تہذیب کی طرف اقبال کا رویّہ بانگِ درا کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی   جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

یا پھر مزاحیہ کلام والے حصّے میں یہ شعر ؎

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے   اٹھا کر پھینک دو ان کو گلی میں

نئی تہذیب یعنی مغربی تہذیب کی طرف ان کا رویّہ بعد کے مجموعوں میں اور زیادہ سخت ہوگیا۔ ضربِ کلیم کے سرِ ورق پر کتاب کے نام کے ساتھ ہی یہ بھی درج ہے یعنی اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف "مغربی تہذیب" کے عنوان سے قطعہ درج ہے :

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب   کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید   ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

تہذیب نام ہے اقدار و تصوّرات کا، سماجی اداروں کا، معاشرے رہن سہن اور رسم و رواج کا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی محض معاشرت کو تہذیب سمجھ لیا جاتا ہے کبھی محض رہن سہن اور نشست و برخاست کو تہذیب سمجھ لیا جاتا ہے۔ تہذیب کی تعریفیں بہت ہوتی رہی ہیں انسان کے لیے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ تہذیب انسان کے گرد و پیش کو زندگی گزارنے کے لیے اپنے سانچے میں ڈھالتی ہے اور اصول و ضوابط بناتی ہے اور ادارے قائم کرتی ہے جو اقدارِ حیات کا پیکر ہوتے ہیں گویا تہذیب نام ہے زندگی کرنے کی جد و جہد کے عمل کے دوران ڈھلنے والے افکار و اقدار و اعمال کا۔

تہذیب اس لحاظ سے ایک مسلسل عمل ہے یہ ترقی ہو یا اُسے ترقیٔ معکوس قرار دیا جائے یہ الگ مسئلہ ہے مگر تہذیب بہرحال ایک عالمی اکائی ہے خواہ اس کا ارتقا کسی علاقے میں ہو یا کسی زمانے میں ہو بہرحال ایک مسلسل عمل ہے جس میں تغیّر کا عمل برابر جاری رہتا ہے اور ہر تہذیب طول اور تہہ دار ہوتی ہے۔ جسے نئی تہذیب یا مغربی تہذیب کہہ کر یورپ سے منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی انسانی تہذیب کا ایک ایسا مرحلہ ہے جو انسانیت کی صدیوں کی کمائی ہے۔

تہذیب کے بارے میں یہی تین باتیں شاید بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ تہذیب ایک مسلسل عمل ہے جسے کسی ایک مرحلے پر روکا نہیں جا سکتا۔ تہذیب مکمل اکائی ہے جسے قومیت، مذہب، علاقے یا دور میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور اس لحاظ سے کوئی تہذیب خالص نہیں ہو سکتی وہ اصلاً طول ہی ہوتا ہے اور تہذیب نہ تو محض معاشرت کا نام ہے نہ محض اداروں کا نہ محض تصوّرات کا بلکہ ان تینوں اجزا سے مل کر تشکیل پانے والے جہدِ حیات میں کام آنے والے عمل کا نام ہے جو مختلف ادوار میں زندگی کرنے کا ہنر سکھاتا ہے اور جسے میرؔ نے سلیقے سے تعبیر کیا تھا۔

بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت میں   تمام عمر ہی ناکامیوں سے کام لیا

جس عالمی تہذیب سے آج ہمارا سابقہ ہے اس کا چلن اقبالؔ کے زمانے میں ہو چکا تھا اسے بعض جگہ اقبالؔ نے نئی تہذیب کہا ہے بعض جگہ مغربی تہذیب کہا ہے اور اس کی تصویرکشی ابتدا ہی سے کچھ اس انداز سے کی ہے جیسے وہ ایک طوفان یا طغیانی ہے جو سب کچھ بہا لے جائے گی

یا انسانیت کے لیے کوئی بڑا خطرہ ہے۔

عہدِ نو برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے　　ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے　　ملتِ ختمِ رسل شعلہ بہ پیراہن ہے

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا　　لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

جسے مغربی یا یورپی تہذیب کہا گیا ہے اقبال نے صرف معاشرت کے تصور تک محدود نہیں کیا تھا جسے مغربی یا یورپی تہذیب کہا گیا ہے، اقبال نے اسے صرف معاشرت کے تصور تک محدود نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس سے قبل سر سید احمد خاں کے دور سے لیکر اکبر الہ آبادی تک مغربی تہذیب کے محض معاشرتی پہلو پر ہی بحث ہوتی رہی تھی مثلاً کوٹ پتلون پہننا، میز کرسی پر کانٹے چھری سے کھانا کھانا یا انگریزی پڑھنا۔ سر سید احمد خاں تنہا دانشور تھے جو مغربی تہذیب کی عقلیت پسندی اور سماجی اصلاح کے پہلو پر توجہ دلاتے تھے مگر ان کے مخالفین میں سے اکثر ان مسائل کے بجائے فروعی مباحث اور حلال و حرام کے مذہبی مسائل کی طرف ہی زیادہ رُخ کرتے تھے۔

اقبال کا جس مغربی تہذیب سے سابقہ تھا وہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ۔ اصلاحِ دین کی تحریک، انقلابِ فرانس اور صنعتی انقلاب کی پیدا کردہ تھی جس نے اسے منقولات کے بجائے معقولات کی عقیدے کے بجائے حسی استدلال کی، اور مذہب کے بجائے سائنس کی بنیاد عطا کی تھی۔ اقبال نے ان سبھی بنیادوں کی مخالفت کی۔

شیدائی غائب نہ رہ دیوانۂ موجود ہو
غالب ہے اب اقوام پر معبودِ حاضر کا اثر
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عقل تمام بولہب عشق تمام مصطفیٰ

یورپ کی اس نئی تہذیب نے عقل اور استدلال کی بنیاد پر سائنس اور ٹکنالوجی کی پوری کائنات دریافت کی، مشینیں ایجاد ہوئیں بڑے بڑے کارخانے کھلے ان کارخانوں کے لیے نئی منڈیوں کی کھوج ہوئی نئے براعظموں تک رسائی ہوئی شہروں کا فروغ ہوا اور نئے معاشرے وجود میں آئے اس صنعتی ترقی نے بینک کی عمارات اور نئی معیشت کی بنیاد رکھی اور زرعی وحدتوں اور پرانی خود کفالتی اکائیاں ٹوٹ کر نئے صنعتی مرکزوں اور مدنی COSMOPOLITANISM بین الاقوامیت میں ضم ہونے لگیں۔ یہ اس تہذیب کا صنعتی اور تمدنی پہلو تھا جس نے مشترکہ خاندان اور جاگیردارانہ یکجائیوں کی جگہ خرد کی انفرادیت (یا تنہائی) کو پیدا کیا۔ اقبال اس پورے نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔

گرجا سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات　　سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

یا پرانے رشتوں کے ٹوٹنے پر ان کا یہ طنز

اک دن وہ تھا کہ خدمتِ استاد کے عوض　　جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
آیا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق　　کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

نئی مغربی تہذیب کا تیسرا پہلو تھا سیاسی ادارہ جسے آسانی کے لیے جمہوریت کے لفظ سے ظاہر کر سکتے ہیں بنیاد اس کی قائم تھی مساوات پر اور یہ مساوات مذہب یا پیشے یا جنس کے تصورات سے مکمل طور پر آزاد تھی اور اسی کی ایک شکل قانون کے سامنے سب کی برابری، آزاد عدلیہ اور عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کی شکل میں اور آزادیٔ تحریر و تقریر کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جمہوریت نے مذہبی ریاست کے تصور کو ختم کر دیا اور وراثت کی بنیاد پر بادشاہت کے یا کسی قسم کی افضلیت رکھنے والے امرا یا فضلا کی سرکردگی کے تصور پر بھی ضربِ کاری لگائی گویا شہنشاہیت ہی نہیں OLIGARCHY بھی ختم ہو گئی اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر دیا گیا اور زمانۂ سابق کے پاپائے روم کی مرکزیت کو ختم کر دیا۔ اسی کا ایک اور پہلو عورت اور مرد کے مساوی حقوق کو تسلیم کرنا بھی تھا اب تک صنفِ نازک چراغِ خانہ بنی ہوئی تھی اب اس کو برابری کا درجہ ملا۔

اسی طرزِ فکر کا نتیجہ تھا مذہبی یک جائی کے بجائے علاقائی یک جائی کا تصور جو دراصل تجارت اور صنعت کی نئی ضرورتوں کا پروردہ تھا اس طرح
قومی ریاستوں NATION STATES کا تصور رائج ہوا جس کی بنیاد مذہبی یا نسلی نہیں تھی بلکہ علاقائی اور نامذہبی یا سیکولر تھی۔ یہ 'وطن' کا
نیا تصور تھا۔

اقبال ان سبھی معاملات کے سلسلے میں مغربی تہذیب کے سخت نکتہ چیں ہیں۔

جمہوریت ان کے نزدیک وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے خود ان کا مردِ کامل کا تصور بھی فردِ واحد
کے کسی نہ کسی حیثیت سے دوسرے سبھی افراد پر برتری کو تسلیم کرتا ہے مذہب اور سیاست کو الگ کرنا ان کے نزدیک درست نہیں کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مرد اور عورت کے مساویانہ حقوق کے بارے میں بھی ان کی خیالات یکسر مختلف ہیں۔ ۱۹۱۰ء کی اپنی ڈائری FRAGMENTS
میں وہ عورت کو پردے میں رکھنے کا شاعرانہ جواز یوں پیش کیا کرتے ہیں کہ فطرت نے ہر حسین شئے کو پردے میں رکھا ہے اور عورت چونکہ سماج
کا سب سے حسین شے ہے اس لیے اسے بھی پردے میں رہنا چاہئے۔ ضربِ کلیم میں عورت کے بارے میں یہ رویّہ ہے۔:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانے   نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن   اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اور عورت کے لیے آزادیٔ نسواں سے کہیں بڑھ کر زمرد کا گلوبند اہم ہے اور جب کہ مرد کا المیہ بے کاری ہے عورت کا المیہ ہے تو تہی آغوش
ہونا ہی ہے کیونکہ

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر   غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

وطن اور نئے تصورِ وطنیت کے بارے میں ان کے خیالات بہت واضح ہیں وہ وطن پرستی کو صاف صاف بت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں:

تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور   ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور اس کی لعنتوں کو گنواتے ہوئے کہتے ہیں:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے   تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے   کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے   قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اسی تہذیب کا ایک اور دین ہے ذرایع ترسیلِ عامہ: یوں تو فنونِ لطیفہ کی مختلف اسالیب پہلے سے رائج تھیں ڈراما اور تھیٹر سینما
یونانی تہذیب کا شاید سب سے مکمل پیرایۂ اظہار رہے لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کی نئی ایجادات نے ذرایع ترسیلِ عامہ میں زبردست توسیع کی اور
سینما پھر ٹیلی ویژن نے ایک نئے کلچرل رویے کو گھر گھر پہنچا دیا۔ یہ تمام ذرایع ترسیل اظہار جلد ہی تجارت کا وسیلہ بن گئے اور بازار کے سبھی
ضوابط و ضروریات کے تابع ہو گئے اقبال ان کی بھی سخت تنقید کرتے ہیں۔ سینما ان کے نزدیک بت گری اور بت تراشی ہے تیاتر یا تھیٹر کے
وہ اس لیے مخالف ہیں کہ:

حریم تیرا خودی غیر کی، معاذ اللہ   دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے   رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

مختصر یہ کہ نئی مغربی تہذیب کے تقریباً سبھی مرکزی تصورات اور اداروں سے اقبال کا تعلق مخالفانہ اور معاندانہ ہے البتہ رہن سہن
اور پہناوے میں اقبال نے اپنے پیش روؤں کے برعکس مغربی معاشرت کو قبول کر لیا تھا وہ داڑھی منڈواتے تھے کوٹ پتلون پہنتے تھے اور میز
کرسی پر کھانا کھاتے تھے۔ یورپ میں اس دور کے جدید یورپی باشندوں کی طرح زندگی گزار چکے تھے۔

اقبال کے مغربی تہذیب سے اس حلیفانہ اور حریفانہ تعلق کا راز کیا تھا؟ اسے سمجھنا محض ہماری تاریخی ضرورت نہیں ہے کہ یہ تہذیب ابھی زندہ ہے اور اس سے ہمارا سابقہ روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے کیا اقبال کی یہ تنقید دورِ حاضر کے لیے کسی قسم کا جواز یا RELEVANCE رکھتی ہے؟

ہندوستان میں مغربی تہذیب آئی بھی نرالے ڈھنگ سے۔ یہ تہذیب بھی دوسری تمام تہذیبوں کی طرح پوری انسانیت کا ورثہ تھی اور پوری انسانیت کے لیے ارتقا کا اگلا مرحلہ تھی اور اس لحاظ سے اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود نئی توانائیوں اور نئی برکتوں سے یکسر خالی نہ تھی خاص طور پر اس لیے کہ یہ زبردست فکری، صنعتی اور سماجی تجربوں کے بعد وجود میں آئی تھی۔ مگر ہندوستان میں اس کی آمد سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں کی حیثیت سے اور بعد کو ملکہ وکٹوریا کے عمال کی حیثیت سے ایک ہاتھ میں غلامی کا زہر اور دوسرے ہاتھ میں نئی تہذیب کا امرت لے کر آئے تھے جو قدیم معتقدات کے بجائے سائنسی تعقل پسندی، تجارت نسبی کے تصورات کے بجائے سماجی مساوات کا تصور امارت کے بجائے تجارت اور کارکردگی پر مبنی افادیت اور اسی کے ساتھ ساتھ برق و تجارات۔ رسائل و اخبارات۔ پوسٹ آفس اور ریل گاڑی جیسی ایجادات بھی تھیں عدلیہ نے ایک مشترک قانون کا تصور اختیار کر لیا تھا اور انگریزی کی تعلیم نے سماجی علوم کے آزادیٔ تحریر و تقریر، سماجی انصاف اور مساوات جیسے تصورات کو عام کر دیا تھا۔

ہندوستانی دانشوروں کا ردِ عمل ملا جلا تھا۔ کچھ نے سیاسی غلامی کو بھی رد کیا اور مغربی تعلیم کو بھی کچھ نے دونوں کو اپنا لیا اور کچھ نے مغربی تہذیب سے محدود انداز میں سمجھوتا کیا، اس میں شبلی سے لے کر اقبال تک کسی نہ کسی حد تک شامل ہیں۔

اس لحاظ سے مغرب کی غلامی محض سیاسی نہیں تھی فکری اور تہذیبی بھی تھی ایک طرز لارڈ میکالے تھے جو تمام مشرقی علوم و فنون کو بحرِ ہند میں غرقاب کرنے کی صلاح دے رہے تھے کہ ان کے نزدیک یہ پورا سرمایہ محض تاریخی حیثیت کا تھا اور سائنسی کے بجائے منقولات اور معتقدات کا درجہ رکھتا تھا دوسری طرف ولیم جونس گریرسن اور گل کرسٹ جیسے مستشرق مشرق کے اسی "سرمائے" کی مدح و ثنا کر رہے تھے کہ اس میں تاریخی قدامت، غیر سائنسی روحانیت اور مابعد الطبیعاتی سریت اور ماورائیت کا خزانہ یہیں دستیاب ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ مسلم تہذیبی افکار کا سامنا کرنے کے لیے اپنے ماضی کے عظیم الشان کارناموں کی نئی توجیہہ اور تفسیر لازم تھی لہٰذا ہندوستان میں رہنے بسنے والے سبھی گروہ اپنے اپنے طور پر اپنے ماضی کی تعبیرِ نو اور تشکیلِ نو میں لگ گئے تاکہ اپنے قدیم سرمایے کو جس میں عقائد و ایمان سے لے کر تہذیب، تاریخ تک شامل تھے مغرب سے آنے والی نئی معقولاتی کسوٹیوں پر کھرا ثابت کر سکیں اور یہ سلسلہ راجہ رام موہن رائے اور سرسید احمد خاں سے تلک، گاندھی اور اقبال تک جاری رہا اور اقبال کی کتاب RECONSTRUCTION OF ISLAMIC THOUGHT اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

اس لیے اقبال کے غیر سیکولر اندازِ کلام پر گفتگو کرنے سے پہلے اس تاریخی سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جس کے تحت تلک نے گیتا کی نئی تفسیر لکھی، ویویکا نند نے سناتن دھرم کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی اروبندو گھوش نے اپنے طور پر روحانیت کو مشرقی تصورِ حیات کی شکل میں ڈھالا اور گاندھی جی نے اہنسا پرمو دھرم کے تصور کو گیتا اور ویدانت سے جوڑ کر آزادی کی سیاسی لڑائی کا رشتہ رام راجیہ کی قدیم روحانیت سے جوڑ دیا۔

اقبال کے مردِ کامل کا مطالعہ بھی نطشے اور رومی کے بجائے ہندوستانی فکر و ادب میں ابھرنے والے فرد کی اسی انفرادیت سے کیا جانا چاہیے زمانہ وہ ہے جب اجتماعی تحریکوں کے ذریعے آزادی یا ہوم رول تک کا حصول تقریباً ناممکن نظر آنے لگا تھا ایسے مرحلے پر ہندوستانی سیاست میں دہشت پسندی یا TERRORISM کا فروغ ہوا جس کا سلسلہ ۱۹۰۵ کی تقسیمِ بنگال کی تحریک سے لے کر بھگت سنگھ تک پھیلا ہوا ہے۔ دہشت پسندوں نے فرد کی انقلاب آفریں توانائی کا احساس دلایا کہ ایک شخص کی جانبازانہ کاوشیں سے تاریخ ساز قوتوں کو حرکت میں لا سکتی ہیں وہی تصور ہے جسے ماؤ نے ایک چنگاری کے آتش خیز ہونے سے تعبیر کیا تھا۔ اسی طرح اقبال کا مردِ کامل بھی ہندوستان کے ان تاریخی حالات سے پیدا ہوا جس نے پریم چند کے ناول "میدانِ عمل" میں سور داس کو اور ایک معکوس شکل میں سرت چندر کے دیو داس۔ اور بہت بعد میں منٹو کے ٹیڑھے میڑھے سماجی باغی مگر منفرد کرداروں کو پیدا کیا تھا۔

یہی تہذیبی صورتِ حال دراصل کلید ہے اقبال کے تصوّرِ خودی کی اور ان کے تصوّرِ جبرئیل و ابلیس کی۔ اسی تہذیبی ردِعمل کو مغرب کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ اندازِ فکر جارحانہ ہے اور دوسری قوموں اور ملتوں کو زیرنگیں کرنے اور ان کے تابع فرماں بنانے کے فاشزم یا نازی ازم کے فلسفے سے ماخوذ ہے اس غلط فہمی میں اضافہ ہو گیا مسولینی پر اقبال کی نظم لکھنے سے اور اپنے بعض مکاتیب کی (مثلاً ۱۱ ستمبر ۱۹۳۴ء کے ایک خط میں مولانا راغب احسن کے نام ایک خط کی اس عبارت سے :

"میری رائے میں اگر کوئی مسلمان اپنی پرائیویٹ زمین وغیرہ کا غلط استعمال کرے تو حاکمیت اسلامیہ کا حق ہے کہ اس سے باز پرس کرے۔ یہی وہ نکتہ ہے اسلام کا جس کو یورپ میں مسولینی نے خوب سمجھا۔"

[بحوالہ اقبال جہانِ دیگر مرتبہ محمد فرید الحق گردیزی پبلشرز کراچی ۱۹۸۳ء]

مسولینی اور اس قسم کے دیگر اثرات کی بحث آگے آئے گی یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہے کہ مسولینی یا اس قسم کے دیگر جارحانہ فلسفے والوں سے دلچسپی سیاسی طور پر غلام نوآبادیوں کے دانش وروں کا محض مدافعاتی ردِعمل یا ایک طرح کا انتقامی جذبہ ہے اور اقبال کی مسولینی پر نظم کچھ اسی قماش کی ہے جس طرز کی نظم جوش ملیح آبادی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام لکھی اور ہٹلر سے اپنی جذباتی وابستگی کا محض انتقاماً تذکرہ کر دیا۔

اقبال کا تصوّرِ خودی بھی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے غلاموں کے لہو کو گرمانے اور کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑانے ہی کا وسیلہ ہے اس سے مراد مدافعت کا سماجی انصاف اور جائز سربلندی ہے نہ کہ جارحانہ غلبہ اور قبضۂ مخالفانہ اور یہ تصوّرِ خودی بھی اس دور کے ہندوستان کے حالات کے سرچشمے ہی سے ابھرا ہے۔ گاندھی جی کی اہمسا یا تلاشِ حق کا محض ایک INVERTED روپ ہی ہے اور بعد کو قاضی نذرالاسلام و دروہی اس کا نعرۂ انقلاب۔ اس سلسلے میں IQBAL, ART & THOUGHT میں ایس اے واحد نے ARYAN PATH کے بعض مضامین سے بھی بعض اہم حوالے دیے ہیں اور آروبندو کی فکر میں اس کے نشانات تلاش کیے جا سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ جس طرح آروبندو اور گاندھی نے اپنے تصوّرِ خودی کے رشتے قدیم ہند روایات و عقاید کی تعبیرِ نو میں ڈھونڈھ لیے اسی طرح اقبال نے اپنے تصوّرِ خودی کے رشتے قرآن کی تعلیمات اور اسلام کی تشکیل و تعبیرِ نو میں تلاش کر لیے۔ اس دور کے ہندوستان کے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ مختلف فرقے، مذہبی گروہ اور علاقائی وحدتیں اپنے اپنے تشخص کے ساتھ قومی آزادی کے جہاد میں شامل تھے اور قوم کا تصوّر اگر ابھر رہا تھا تو انہی متنوع گروہوں کے مشترکہ احساس کے طور پر ابھر رہا تھا جس کی دشواریوں کی طرف خود اقبال نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں اشارہ کیا ہے۔

ایک نظر پھر ہم مغربی تہذیب کا جائزہ لیں تو یہاں سائنس اور عقل ایسی بے پناہ قوتیں بن کر ابھر رہی ہیں جن سے پوری کائنات کی تسخیر قرینِ قیاس لگتی ہے۔ ایسی صورت میں غلام نوآبادیوں کے مجاہدوں کے لیے امید کی کرن تھی تو فقط جذبۂ بے اختیار کی جو عقل کی ساری دلیلیں توڑ کر سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے ٹکرا جاتا ہے اور بقول اقبال تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے اگر ایسی پسماندہ ملتوں کو جن کا ماضی کبھی قابلِ فخر حد تک شاندار تھا پھر سے دنیا میں ابھرنا ہے تو وہ اپنے مقابل صف آرا ہونے والے ہمت شکن عناصر کی گنتی کر کے ان پر فتح یاب ہونے کا شاید ہی کبھی خواب دیکھ سکیں راستہ ہے تو فقط جذب و جنون کا جو دشواریوں اور رکاوٹوں کو عقل کی میزان میں نہیں تولتا اور ماؤ کے الفاظ میں ایٹمی جنگ کے خطروں کو بھی کاغذ کا شیر کہہ کر نظر انداز کر دیتا ہے اور بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے کہ

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں

اور اس کی پرواز کی حد یہ ہے ــــ یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اقبال عقل کو رد نہیں کرتے ایک مخصوص صورتِ حال میں اسے قناعت پسندی، بزدلی، اور مصلحت پرستی کے جواز کی حیثیت سے رد کرتے ہیں۔

ان معروضات کے ساتھ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ ہر تہذیب تغیر کے عمل سے گزرتی ہے اور تغیر کا یہ عمل جدلیاتی ہوتا ہے۔ نئی آویزشیں اور نئے ٹکراؤ پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کا مغرب کی جس صنعتی سرمایہ دارانہ تہذیب سے سابقہ تھا ان کے یورپ کے قیام کے دوران ہی میں اس پر دائیں اور بائیں سے حملے ہونے لگے تھے ۱۹۰۵ء میں روس کا پہلا انقلاب ناکام ہو چکا تھا اور پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے تک یورپ کی پوری صنعتی تہذیب اور اس کے پیچھے

تصورات و اقدار سبھی ادارے تنقید اور سخت تنقید کی زد میں آچکے تھے۔ سرمایہ داری جو ابتدا میں نئے دور کی مسیحا بن کے ابھری تھی دھیرے دھیرے مایوس کرنے لگی تھی۔ سرمایہ دار ممالک کی راجدھانیوں میں غیر مطمئن نوجوانوں کے ہجوم منڈلانے لگے تھے اور صنعتی نظام کے تشنج نے فرد کو بے در اور بے گھر ہی نہیں کر دیا تھا اعصاب زدہ اور نیم مجنوں بنا ڈالا تھا جس کی نشانیاں یورپ کے REALIST حقیقت پسند ناول نگاروں کے ہاں ملتی ہیں۔

مغرب کی اس صنعتی تہذیب کی تنقید کے دو محور تھے اور دونوں نہ صرف اس تہذیب سے بلکہ ایک دوسرے سے بھی مخالفانہ رویہ رکھتے تھے ایک تھی اس کی تنقید بائیں بازو سے جس کی سرکردگی مارکس اور لینن کر رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ اس تہذیب کے سبھی تصورات اور ادارے محض ارباب اقتدار سرمایہ داروں کا ایک فریب ہے اس میں جمہوریت محض ان متمول لوگوں یا ان کے سیاسی پارٹیوں کے لیے ہے جو پیسے والے ہوں یا ان کے مفاد کی حفاظت کرتے ہوں عام انسان تو نہ انتخاب لڑ سکتا ہے نہ انتخاب جیت کر اپنے مفاد کی کوئی بات طے کرا سکتا ہے۔ اس تہذیب میں مساوات کا تصور بھی محض فرضی ہے کہ نچلے طبقے والوں کو زندگی کی عام اور لازمی ضروریات بھی حاصل نہیں ہیں۔

یہی حال قانون کے سامنے برابری کا ہے کہ دراصل سارے قانون محض جائداد والوں نے اپنی لوٹ کھسوٹ سے حاصل کی ہوئی ملکیت کی حفاظت کے لیے بنائے ہیں اور فوج ہو پولیس ہو یا عدالتیں۔ یہ سب محض اس لیے ان کے طبقاتی مفاد کی محافظ ہیں کہ غریبوں کی بہت بڑی تعداد سے مٹھی بھر استحصال کار مالدار اور متمول لوگ انصاف اور عدل کے خوبصورت ہتھیاروں کے ذریعے سے محفوظ رہ سکیں عدلیہ کی آزادی ہو یا مقننہ سے اور انتظامیہ سے اس کی علیحدگی کا فریب یہ بھی محض اہل ثروت کی اسی حیلہ جوئی اور بہانہ بازی کے کرشمے ہیں:

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق   طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمئ گفتار اعضائے مجالس الاماں   یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

یہی صورت عقل، سائنس اور علاقائی یکجائی کے تصورات کی ہے۔ بلاشبہ معقولات انسان کو ارتقا کی راہ دکھاتے ہیں اور حواس کی گواہی، استدلال اور علم کی بنیاد ہے مگر معقولات کے سارے سلسلے کو تمام انسانی برادری کے لیے سہولت اور خیر و برکت کا سامان بنانے کے بجائے صنعتی نظام نے اسے سامان تجارت اور وسیلۂ استحصال بنا لیا اور اس سے منافع کمانا شروع کر دیا جس سے نئی منڈیوں کی دوڑ، نئی نو آبادیوں پر قبضہ کرنے کی ہوس، اور نسل اور قوم کی آویزشیں شروع ہوئیں اور انہی تجارتی مفادات نے NATION STATES یا وطن کا تصور پیدا کیا جسے تقریباً مذہبی تقدس کا درجہ دے دیا گیا اور اس کی خاطر جنگیں لڑی جانے لگیں اور نئی منڈیوں اور نئی نو آبادیوں پر تصرف کا جواز تلاش کیا جانے لگا۔ یہ نہ وطنیت تھی نہ وطن دوستی محض اس کا سیاسی اور کاروباری استعمال تھا۔ اب ذرا ان مصرعوں کو پڑھیے!

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے   تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے   اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اسی سے
کٹ مرا نادان خیالی دیوتاؤں کیلئے   سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات

تجارتی اجارہ داری اور منافع کی خاطر استحصال سے پیدا ہونے والے وطنیت کے تصور کے مقابلے میں اشتراکی مفکرین نے مزدوروں اور محنت کشوں کے طبقوں کی عالمگیر اور بین الاقوامی وحدت پر زور دیا اور اس لیے وطن کی محدود قومی وفاداری کے بجائے بین الاقوامی طبقاتی وفاداری کو متبادل کے طور پر پیش کیا اور یہی تصور عالمی انقلاب کی بنیاد بنا۔ اقبال نے بھی وطنیت کے تصور کو محدود قرار دے کر اس سے نجات حاصل کی یہ اور بات ہے کہ وہ اس کے متبادل کے طور پر محنت کشوں کے عالمی انقلاب کے فلسفے کو چند ہی نظموں میں اپنا سکے (مثلاً خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب ـــــ از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب۔ انقلاب)

اور بعد کو اسلامی فکر کی بنیاد پر عالمی برادری کے تصور کی طرف بڑھ گئے۔

یہی صورت سائنس و ٹکنالوجی کے سلسلے میں پیش آئی سائنس نے انسان کی بہبودی اور آسودگی کے سامان فراہم کرنے کے بجائے استحصال کے نئے طریقے ایجاد کیے مشین آئی مگر مشین نے انسانی یک جائیوں کو درہم برہم کر کے پرانے قریوں اور دیاروں کو اجاڑ دیا مشترکہ خاندان منتشر

کر دیئے اور پرانی مروتوں اور وفاداریوں کو ضرورت اور زرگری کی میزان پر تولا اور پرکھا۔ صنعتی ترقی کی اس بے دردی پر مشین اور کارخانوں کے بارے میں اقبال نے لینن کی زبانی کہا ہے :

احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

بائیں بازو کی تنقید یہ تھی کہ احساس مروّت کو کچلنے اور انسان کو مشین کا پرزہ بنانے کی ذمّہ داری مشین کی نہیں مشین کو منافع خوری اور استحصال کے لیے کام میں لانے والے سرمایہ دار طبقے کی ہے ورنہ مشین تو انسانی محنت کو کم کرکے زیادہ فرصت اور زیادہ آسودگی لا سکتی تھی۔

سائنس اور تعقل پسندی پر بھی بائیں بازو کی تنقید یہی تھی کہ استحصالی نظام نے اسے ٹکنالوجی کی شکل دے کر انسانیت کے مفاد میں برتنے کے بجائے انھیں انسان کا شکار کرنے کے لیے استعمال کیا تصوّر یہاں بھی سائنس اور ٹکنالوجی یا عقل وحکمت کا نہیں ہے اسے برتنے والے طبقے کا ہے بائیں بازو کی تنقید سائنس اور ٹکنالوجی پر ہی رہی ہے کہ جب تک سائنس اور ٹکنالوجی کی بے پناہ توانائی اور طاقت پر انسانیت کے دبے کچلے طبقوں کے بہی خواہوں کا قبضہ نہ ہو یہ قوتیں انسانیت کے خلاف استعمال کی جاتی رہیں گی اقبال کے زمانے میں تو ایٹمی توانائی کا چرچا نہ ہوا تھا نہ ایٹم بم گرایا گیا تھا نہ ہائیڈروجن بم اور STAR WARS کا ذکر تھا مگر اقبال نے اس بے زمام طاقت اور توانائی کو بھٹکی ہوئی خودی کی شکل میں دیکھ لیا تھا اور اس پر کسی نہ کسی قسم کے تئی کنٹرول یا ضابطے کی گرفت ضروری قرار دی تھی اور اپنی اصطلاح میں اسے رموزِ بے خودی سے تعبیر کیا تھا۔

اقبال کا ابلیس سائنس ہے اور جبریل مذہب ہے ابلیس کے پاس طاقت ہے مگر بے قابو، خودی ہے مگر بھٹکی ہوئی وہ عقل، طاقت اور مسلسل حرکت اور تڑپ کا مظہر ہے۔ پورا ساقی نامہ، اس کا رجز ہے سائنس کے جگائے ہوئے اس دیوزاد کے لیے پوری کائنات تسخیر کے لیے آغوش کھولے ہوئے ہے اور اس پر ابلیس کی طرح نہ انسانی مفاد کی کوئی قدغن ہے نہ تئی، اخلاقی یا قومی اور مذہبی قسم کا کوئی دباؤ ہے۔ آج کے سیاق وسباق میں یہ وہی ابلیس ہے جو ایٹم بم کے اسلحہ خانے سجاتا ہے اور پوری کائنات کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے اس کے مقابلے میں اقبال کا جبریل ہے جو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو کے اخلاقیات کا اعلیٰ معیار، اور خدمت اور ایثار کے اعلیٰ ترین تصورات تو رکھتا ہے مگر قوّتِ عمل سے محروم ہے اور سائنس کے بجائے منقولات کی نذر ہو کر یہ "ملت خرافات میں کھو گئی" کا مترادف ہے۔

آزادیٔ نسواں کے مسئلے پر بھی مغرب کی سرمایہ دارانہ تہذیب پر بائیں بازو کی یہی تنقید تھی کہ یہ آزادی اور مساوات محض نام کی ہے ورنہ دراصل عورت سرمایہ دارانہ نظام میں جوے خانے، قحبہ خانے، اور کارنیوال کی زینت بن چکی ہے اور کنزیومر سوسائٹی عورت کو مالِ تجارت کے طور پر نہایت بے شرمی اور بے دردی سے استعمال کر رہی ہے۔

یہی صورت آزادیٔ تحریر و تقریر کی بھی تھی جسے سرمایہ دارانہ تہذیب نے اپنی اہم ترین نعمتوں میں شمار کیا ہے اور آج بھی اس کا پرچار بڑی دھوم دھام سے کیا جاتا ہے اس کا رشتہ براہِ راست MASS MEDIA سے ہے جس کی اجارہ داری اقبال کے زمانے سے آج کہیں زیادہ ہے اقبال نے صرف سینما کو بت گری بتایا تھا اور تھیٹر کو غیر کے حرم سے تعبیر کیا تھا عوامی ذرائع ترسیل پر تجارتی اداروں کی اجارہ داری نے سرمایہ دارانہ تہذیب میں یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ کوئی فن کار اپنی تخلیق کو ذرائع ترسیل کے اجارہ داروں کی مرضی کے بغیر عوام تک نہیں پہنچا سکتا فلم ہو یا تھیٹر۔ اخبارات ہوں یا رسالے بڑی ادبی محفلیں ہوں یا مذاکرے ان پر یا تو حکومت کا قبضہ ہے یا کاروباریوں کا اور دونوں صورتوں میں فن کار کا رشتہ فن سے ٹوٹتا جا رہا ہے اور فن اور فن کار کے درمیان بیگانگی یا ABERRATION کا پردہ حایل ہے۔

اس کی وجہ سے سستی اور گھٹیا عریاں جاسوسی اور مریضانہ تحریروں ہی کا فروغ نہیں ہو رہا ہے بلکہ عوامی ذرائع ترسیل کے ساحرانہ استعمال سے عوام کی ذہنیت، ان کا ذوقِ سلیم اور ان کی پسند اور ناپسند کمرشیل سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے کنزیومر سوسائٹی پہلے عوامی ذرائع ترسیل کے ذریعہ کسی شے کی طلب پیدا کرتی ہے پھر اسے بازار میں اچھے داموں بیچنے کے لیے لاتی ہے اس طرح آزادیٔ تحریر و تقریر محض فریب ہے جب کہ عوامی ذرائع ترسیل عوام کو خودی سے بے نیاز کرنے کے لیے برتے جاتے ہیں۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا مگر مغرب کی سرمایہ داری تہذیب کا جب بحران بڑھا تو اس پر دائیں بازو سے بھی نکتہ چینی ہوئی پہلا وار جمہوریت ہی پر ہوا اور مساوات کے سطحی اور ظاہری تصوّر کو بھی رد کرکے ایک مردِ کامل کی تقلید یا بے چون وچرا بے دلیل واستدلال اطاعت کی بنیاد پر آمریت کا نظام

قایم کیا گیا جو مسولینی کے فاشزم اور ہٹلر کے نازی ازم کی شکل میں ابھرا ۔ جمہوریت کے سبھی اداروں پر تنقید محض، اطاعت مطلق اور جبر کامل نے خط تنسیخ کھینچ دیا اور بندوں کو گننے کے بجائے ان کو تولنے پر زور دیا جانے لگا۔ دائیں بازو کی تنقید نے ایک طبقہ اعلیٰ کا تصور پیش کیا جو حکومت بلکہ تہذیب کی سربراہی کے لیے پیدا ہوا ہے اور اسی فضیلت کا نسلی جواز ڈھونڈ لیا گیا جرمن آریا ہونے کی وجہ سے نسلی طور پر دیگر سبھی اقوام سے خاص طور پر سامی اور افریقی اقوام سے برتر ہیں اور ان پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اطالوی سیزر اعظم کی اولاد ہیں اور روما کی عظیم الشان روایتوں کے وارث ہونے کے لحاظ سے فرمانروائی کے مستحق ہیں جاپان کے ہیرو ہٹو نیر اعظم کے سپوت ہونے کی حیثیت سے سربراہی کے سزاوار۔

دائیں بازو کی تنقید نے وطن پرستی کو رد نہیں کیا لیکن اس کی بنیاد نسلی امتیازات پر قایم کر دی۔ [یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذہب اور مخصوص مذہبی گروہ کی برتری کے سلسلے میں اقبال کا کلام تضاد سے خالی نہیں شکوہ اور جواب شکوہ میں مسلمان سے وہ لوگ مراد ہیں۔ جو مسلمان سے خاندانوں میں پیدا ہوئے اور روایتی طور پر مسلمان ہیں جب کہ بعد کی نظموں میں مرد مومن سے روایتی مسلمان مراد نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن کے اندر چند مخصوص خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ جواب شکوہ میں تو خدا کی زبان سے یہاں تک کہلوا دیا گیا ہے ۔

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

لیکن غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہو کر اسلام قبول نہ کرنے والے بھی مسلم آئیں ہو سکتے ہیں اور دنیا میں سرفرازی کے مستحق ہو سکتے ہیں]

اور وطن پرستی کو اور زیادہ جارحانہ شکل دے دی اسی بنا پر ہٹلر نے اپنے فلسفے کو نیشنل سوشلزم سے تعبیر کیا تھا کیوں کہ اس کے نزدیک یہودی اپنے تشخص کو برقرار رکھ کر اور محنت کش اپنے حقوق کے لیے ہڑتال کر کے قومی وحدت سے غداری کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ اقبال نسلی برتری کے قایل نہیں لیکن بین الاقوامی طور پر ایک مذہبی گروہ کی افضلیت کے ضرور قایل ہیں ۔

ظاہر ہے کہ عقل، منطق اور استدلال اس قسم کی برتری کا ثبوت فراہم نہیں کرتے اس لیے بار بار دائیں بازو کے نظریہ ساز عقل اور منطق کو رد کر کے عقیدے، جذبے، جوش، جنون اور وجدان پر زور دیتے ہیں نطشے کی بیٹی نے نازی جرمنی میں اپنے والد محترم کے فلسفے کی جس طرح سیاسی توجیہہ کی اس سے آمریت کو بڑی تقویت ملی اور ظاہر ہے سائنس اور منطق کے سبھی دلایل براہین کو رد کرنے کے لیے عقیدے اور مذہبی یا نسلی عقیدے سے زیادہ موثر اور کوئی حربہ نہیں ہو سکتا ۔

مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ کرنے کے سلسلے میں بھی دائیں بازو کی تنقید واضح تھی وہ ان قانونی موشگافیوں اور آئینی نزاکتوں میں پڑے بغیر طاقت، جبر اور تشدد کو قومی مفاد کے حق میں استعمال کرنے کو جائز بلکہ ضروری سمجھتی تھی اور اسی لیے فوج اور مختلف فوجی ادارے ان کے یہے مرکزی حیثیت رکھتے تھے اور علم فلسفہ اور کلچر کے الفاظ ان کے لیے پریشان کن تھے ۔ طاقت کی اس اندھی پرستش کا صرف ایک ہی فتویٰ ہو سکتا تھا :

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

اس لیے اس طرز فکر کا سارا زور قومی سطح پر توانائی اور قوت کی فراہمی اور ارتکاز پر ہے مشین اور کارخانے اس کے لیے مالی قوت اور عالمی اجارہ داری کا وسیلہ ہیں اس لیے انہیں وہ کاروباری اصول اور تجارتی ضابطے کے مطابق چلانے کے لیے دور قدیم کی عسکری جبر کے تحت چلانا چاہتا ہے اور ایک جبری یکسانیت پیدا کرنے کے حق میں ہے اور یہ عمل تو میانے کا نہیں طبقۂ اعلیٰ کی اجارہ داری کا ہے ۔

آزادیٔ تحریر و تقریر سے اس طرز فکر کو دلچسپی ہے تو اس قدر کہ اس کے ذریعے فکری جذباتی اور حسی علیہ حاصل کیا جا سکے اور بزعم خود نئے انسان کی تشکیل کی جا سکے یہ نیا انسان معقولیت کے بجائے قوت کا پیکر ہوگا اور تعلیم بھی اسی نہج کی پائے گا عوامی ذرایع ترسیل اسی نئے نظام کی ضروریات پوری کریں گے اور قومی احتساب کے پابند ہوں گے ۔ اس طرح عورت کا درجہ مساوی قرار دینے کے لیے ذیلی اور ثانوی مانا گیا اور اسے بہتر نسل پیدا کرنے کا وسیلہ سمجھا گیا اور اس کا دائرۂ کار گھر کی چار دیواری بتائی گئی ۔

غرض مغربی تہذیب کا ایک دوسرا متبادل پہلو اس طرز تنقید سے سامنے آیا اقبال ان میں سے بعض پہلوؤں سے خطرناک حد تک قریب ہیں مثلاً تعلیم اور فنون لطیفہ کے ضمن میں یا عورت کو خاتون خانہ سمجھنے کے معاملے میں یا پھر مساوات کے بجائے ایک افضل طبقے کے وجود کو تسلیم کرنے

ہیں لیکن وہ اس کی بنیاد قوم کے بجائے مذہب کو قرار دیتے ہیں۔
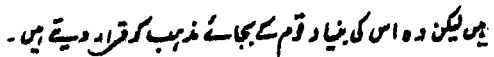
آج بھی مغربی تہذیب اسی بحران کا شکار ہے اس بحران میں ایک نئی جہت کا سارتر کی وجودیت نے اضافہ کر دیا ہے اور مختلف قسم کی عقلیت دشمنی ANTI RATIONAL یا ماورائے عقل SUPER RATIONAL تصورات کا دور دورہ ہے لیکن اقبال اس عالمی تہذیب کی تنقید میں جن پہلوؤں پر سوالیہ نشان لگا گئے ہیں آج بھی کم سے کم وہ خیال افروز فرور ہیں اقبال ہر سوال کا جواب نہیں دے سکے اور جو کچھ انہوں نے جوابات دیئے ان میں بھی ان کے زمانے اور ان کے علاقے کی حدبندیاں اور نارسائیاں شامل ہیں لیکن اس نئی مغربی تہذیب یا دورِ حاضر کے سرمایہ دارانہ تہذیب کے بحران کے سلسلے میں ان کے تجویز کردہ حل نہ سہی ان کے اٹھائے ہوئے سوال یقیناً آج بھی اہمیت اور معنویت رکھتے ہیں۔ ان کے تصورات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے یہاں نئی تہذیب کا ردعمل کس حد تک ہوا اور فکر و فن کی سطح پر نئے تہذیبی تقاضوں کو کس حد تک پورا کر سکتے ہیں۔ گوئٹے کا قول ہے۔ افراد کی خوبیاں ان کی اپنی ہوتی ہیں، برائیاں ان کے دور کی۔ اقبال کے بارے میں یہ قول ذرا ترمیم کے ساتھ یوں دہرایا جاسکتا ہے کہ اقبال کی توانائیاں ان کی اپنی ہیں اور ان کی کمزوریاں ان کے دور کی ہیں۔ ❁

بنام شیخ نور محمد

اقبال نے اپنے والدِ گرامی [۱۹۲۰ء - ۱۸۳۰ء] کے نام یہ خط تحریر کیا تھا۔ یہ خط اقبال نے اپنے بھتیجے اعجاز احمد کو امتحان میں کامیابی پر تحریر کیا تھا۔ اس خط کا عکس پہلی بار "ماہِ نو" [لاہور] کے "اقبال نمبر" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

[illegible]

محمد اقبال

جگن ناتھ آزاد

ے - ۲۵ ، گورنمنٹ کوارٹرس ، گاندھی نگر ، جموں توی ۱۸۰۰۰۴

اقبال
خطابت اور شاعری

خطابت اور شاعری کی بحث بہت پُرانی ہے۔ یوں تو خطابت کے لفظی معنی ہیں خطاب کرنا، مخاطب ہونا، تقریر کرنا، خطبہ دینا لیکن جب ہم اس لفظ کو وسیع تر معنی میں استعمال کرتے ہیں اور خطابت اور شاعری کے موضوع پر بحث کرتے ہیں تو خطابت والی شاعری سے مراد ہم سپاٹ شاعری لیتے ہیں یعنی POETRY OF STATEMENT جسے کلامِ موزوں تو کہا جا سکتا ہے شاعری نہیں کہا جا سکتا —— اس لیے کہ اس طرح کی شاعری شاعرانہ عناصر سے خالی ہوتی ہے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بحث بہت پُرانی ہے تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ جب سے شاعری کا رواج ہُوا ہوگا اور جس جس زبان میں ایک نئے شاعر نے کسی کہنہ مشق شاعر سے اپنے کلام پر مشورہ لیا ہوگا تو اُستاد کی کوشش یہی رہی ہوگی کہ اگر نئے شاعر کا شعر غیر شاعرانہ اندازِ بیان کا حامل ہے تو اُسے شاعرانہ بنا دیا جائے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ جب نویں اور دسویں درجے میں ہمارے فارسی کے اُستاد لالہ ٹیک چند نے ہمیں شعر اور غیر شعر کا فرق سمجھایا تو غیر شعر کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے یہ شعر ہمارے سامنے رکھا۔

دندانِ تو جملہ در دہانند چشمانِ تو زیرِ ابرو انند

یہ شعر تو قطعی طور پر خطابت کی ذیل میں آتا ہے لیکن ایسے اشعار کی مثالیں بھی کم نہیں ہیں جو بلا واسطہ طور پر خطابت نہ سہی بالواسطہ طور پر خطابت ہی کے زمرے میں آتے ہیں اس لیے کہ شاعری میں خطابت اور براہِ راست شاعری کی حدیں بعض دفعہ ایک دوسرے کے اس قدر قریب آجاتی ہیں کہ دونوں کے لیے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونا ضروری ہو جاتا ہے مثلاً جوش ملیح آبادی کا یہ شعر ؎

مال کا وہ درجہ جس میں ریل کے مزدور تھے آ کے ٹھہرا دوسرے درجے کے بالکل سامنے

شعر کی حقیقت کے بیان میں شبلی نعمانی مرحوم نے اپنا یہ نکتہ واضح کرنے کے لیے کہ "شعر صرف وزن اور قافیہ کا نام نہیں" حسان بن ثابت کے دور کا ایک واقعہ درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "ایک دفعہ حسان بن ثابت کے صغیر سن بچے کو بھڑ نے کاٹ کھایا۔ وہ حسانؓ کے سامنے روتا ہوا آیا کہ مجھ کو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ حسان نے جانور کا نام پوچھا۔ وہ نام سے واقف نہ تھا۔ حسان نے کہا اچھا اس کی صورت بیان کی۔ بچے نے کہا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخطوط چادروں میں لپٹا ہوا ہے۔ چونکہ بھڑ کے پروں پر رنگین دھاریاں ہوتی ہیں اس لیے اس نے مخطوط چادر سے تشبیہ دی۔ حسان اچھل پڑے اور خوشی کے جوش میں کہا خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہوگا" اس کے ساتھ ہی مولانا شبلی لکھتے ہیں "یہ فقرہ موزوں نہ تھا لیکن چونکہ نہایت عمدہ تشبیہ حسان نے سمجھا کہ بچے میں شاعری کی قابلیت موجود ہے۔" گویا شبلی نے شعر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اس نکتے پر زور دیا کہ شعر براہِ راست اندازِ بیان میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ رمز و ایما کے لباس میں اسے پیش کیا جائے۔

جس زمانے میں ادب کی ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی یہ بحث اور زیادہ کھل کر سامنے آئی کہ شعر میں براہِ راست اندازِ بیان کی کیا حیثیت ہے۔ کیفی اعظمی اور نیاز حیدر پر تو زیادہ تر اعتراض یہی رہا کہ ان کی شاعری براہِ راست اندازِ بیان کی حامل ہے اور یہ خطابت ہے شاعری نہیں ہے۔ یہی اعتراض ایک زمانے میں سردار جعفری پر بھی ہوا لیکن ۱۹۶۲ء کے لگ بھگ جعفری کی شاعری نے ایک نیا رنگ اختیار کیا اور اُن کی شاعری نے براہِ راست اندازِ بیان سے دامن چھڑا کے علامتی رنگ کو اپنا پیرایۂ اظہار بنایا۔ ہاں فیض کی شاعری شروع ہی سے علامتی شاعری کے قریب تھی اور وہ وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ زیادہ سے زیادہ علامتی ہوتی گئی۔ ہاں یہ ایک الگ سوال ہے کہ جتنا بڑا فیض کا نام ہے اُتنی بڑی ان کی شاعری ہے یا نہیں لیکن یہاں اس سوال پر بحث کرنے کا موقع

نہیں ہے۔

اقبال جس اٹھان کے ساتھ اُردو شاعری میں نمودار ہوئے اس کی دوسری مثال شاید ہماری شاعری میں نہ مل سکے۔ شاعرانہ اعتبار سے وہ شروع ہی میں ایک متنازعہ فیہ شخصیت بن گئے۔ پیارے صاحب رشید کو تو اُن کی اُردو عجیب و غریب اُردو بلکہ فارسی نظر آئی۔ دہلی اور لکھنؤ کے بعض اہلِ زبان نے انہیں زبان سے ناآشنا قرار دیا۔ مجنوں صاحب اور فراق صاحب کو اُن میں ہیجان کے قابلِ اعتراض حد تک بلند نظر آئی لیکن یہ کہ اقبال کی شاعری شاعری نہیں ہے خطابت ہے اس بات کو غیر منطقی حدوں تک لے جانے کا سہرا پروفیسر کلیم الدین احمد کے سر ہے۔

ویسے تو اقبال کی شاعری کے متعلق جو رویہ اُن کے WORSHIPPING ADMIRERS نے اختیار کیا اُس کے خلاف آواز ۱۹۴۳ء ہی میں بلند ہونا شروع ہو گئی تھی جب کہ سعادت علی خاں نے لندن کے ایک انگریزی جریدے INDIAN ARTS AND LITERATURE میں لکھا۔

SOON AFTER HIS (IQBAL'S) DEATH HIS POETRY BECAME THE SUBJECT OF UNCRITICAL APPRECIATION BY A HOST OF WORSHIPPING ADMIRERS.

علامہ اقبال کے انتقال سے کچھ مدت بعد کی بات ہے، میں احسان دانش کے یہاں بیٹھا تھا، اُن کی دُکان پر۔ اقبال کی شاعری کا ذکر چل نکلا۔ احسان نے کہا اقبال شاعر نہیں ہے ناظم ہے۔ میں نے اس موضوع پر احسان کے ساتھ بحث نہ کی کیونکہ اس معاملے میرے اور احسان کے درمیان بعد المشرقین تھا۔ جوش صاحب کی رائے بھی اقبال کے بارے میں قریب قریب یہی ہے۔ احسان اور جوش کی اقبال کی شاعری کے متعلق اس طرح کی آراء تحریری صورت میں تو موجود نہیں ہیں لیکن اُردو کے اکثر اہلِ قلم اس قسم کی آرا سے متاثر ضرور ہوئے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اقبال کی شاعری محض واقعات کا بیان ہے اور شاعرانہ تڑپ سے خالی ہے۔ اقبال کی ڈکشن اور امیجری پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد صادق اپنی کتاب HISTORY OF URDU LITERATURE میں لکھتے ہیں

IQBAL'S POETRY, AS IS WELLKNOWN, IS HEAVILY CHARGED WITH THE EROTIC DICTION AND AMAGERY OF GHAZAL. THE QUESTION BEFORE US IS THIS ; HOW DOES IQBAL USE THE LANGUAGE INHERITED FROM THE PAST ? DOES HE TRY TO TAME IT TO HIS INDIVIDUAL REQUIREMENT OR DOES HE COME UNDER THE CATEGORY OF POETS OF LOW VITALITY WHO IN THE WORDS OF PROFESSOR LOWES, ENSCONCE THEMSELVES LIKE HERMIT CRABS, GENERATION AFTER GENERATION, IN THE CAST OFF SHELLS OF THEIR PREDECESSORS ?

IQBAL DOES NOT TRY TO WINNOW AND PURIFY THE DICTION THAT HAS COME DOWN TO HIM. HE TAKES IT AS HE FOUND IT, AND USES IT WITHOUT MUCH CONSIDERATION OF ITS PROPRIETY. HIS MIND RUNS IN GROOVES. HIS MEMORY IS STOCKED WITH A LIMITED NUMBER OF WORDS, METAPHORS AND SIMILES, BORROWED FROM HIS PREDECESSORS AND HE EMPLOYES THEM AGAIN AND AGAIN. THE PROBLEM OF STYLE, WRITES POTAR, IS TO FIND THE UNIQUE WORD, PHRASE, SENTENCE, PARAGRAPH, ESSAY OR SONG, ABSOLUTELY PROPER TO THE SINGLE MENTAL PREPARATION OR VISION WITHIN. IQBAL DOES NOT USUALLY MOULD HIS LANGUAGE TO HIS INDIVIDUAL USE. HE FOLLOWS THE LINE OF BEST RESISTANCE, ABOUNDING CLICHES, FADED WORDS AND DEAD METAPHORS.

جنوری ۱۹۴۷ء میں سچدا نند سنہا کی انگریزی کتاب "اقبال" شائع ہوئی جس میں انہوں نے اقبال کی شاعری کے متعلق لکھا کہ یہ شاعری غیر مردود آہنگیں ہے اور متناسب ترنم سے عاری ہے۔ پروفیسر ایم ایم شریف نے اس کا جواب لکھا اور یہ جواب ان کی کتاب PAPERS ON IQBAL میں AN UNFINISHED LETTER کے عنوان سے شامل ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ "اقبال کی سینکڑوں نظمیں اور اشعار نغمگی اور موسیقی کا شاہکار ہیں۔ کوئی ایک

اردو نظم کی بات ہوتی تو میں مثال بھی دیتا"۔ اس سے بھی بہت پہلے سید عبداللطیف کی کتاب THE INFLUENCE OF ENGLISH LITERATURE ON URDU LITERATURE سنہ ۱۹۲۴ء میں FOSTER GROOM & CO. LONDON. نے شائع کی تھی۔ اس میں سید عبداللطیف نے حالی کو اقبال سے بہتر شاعر قرار دیا تھا اور اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ جہاں تک سادگی، صفائی بیان، دلربائی اور رعنائی، انتخاب الفاظ اور بندش کے حسن کا تعلق ہے اقبال کی شاعری حالی کی شاعری کے معیار تک نہیں پہنچ سکتی۔ سید عبداللطیف "شکوہ" کے مقابلے میں "مدوجزرِ اسلام" کو بہتر فن پارہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نظم "شکوہ" رسمی انداز سے شروع ہوتی ہے اور اس میں رسمی زبان استعمال کی گئی ہے جب کہ مدوجزرِ اسلام حُسنِ بیان کا ایک شاہکار ہے۔

اقبال کی شاعری کے متعلق اس انداز سے سوچنے اور لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ میں یہاں پروفیسر کلیم الدین احمد کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جن کی کتاب "اقبال" اس گردان سے لبریز ہے کہ اقبال کا کلام خطابت ہے، پیغام ہے، شاعری نہیں ہے۔ باقر مہدی اگرچہ پروفیسر کلیم الدین احمد کے بعد آتے ہیں لیکن اقبال کے کلام کو شاعرانہ مرتبہ نہ دینے کے معاملے میں وہ کلیم الدین احمد سے پیچھے نہیں ہیں۔ مثلاً اپنے مقالے میں جو چند برس ہوئے TIMES OF INDIA میں شائع ہوا تھا وہ لکھتے ہیں:

> I FOR ONE ALWAYS FEEL LET DOWN WHEN I GO TO HIM. I AM PUT OFF BY HIS DECLAMATORY VOICE ----- HE CAN NEVER SPEAK IN WHISPER-- AND BY HIS SIMPLISTIC ANSWERS ----- THERE IS A PLACE OF IDEAS IN POETRY BUT ONLY IF THEY ARE DEEPLY FELT AND HAVE TURNED INTO BLOOD AND NERVE AND BONE. IQBAL'S IDEAS DO NOT DISSOLVE INTO HIS VERSE. THEY STAND OUT VERY OFTEN LIKE A SORE THUMB. THEY LOOK LIKE AN IMPOSITION ----- THERE IS ALSO A PLACE FOR RELIGIOUS BELIEF IN POETRY, BUT TO MORE, TO ANY CONVICTION. SUCH BELIEF HAS TO HAVE ITS ROOT IN DOUBT, IN UNCERTAINTY, IN THE KIND OF QUESTIONING WHICH AIMS AT A MAN'S SOUL. IQBAL IS NEVER WRECKED BY DOUBT OR UNCERTAINTY ----- THERE IS NO SENSE OF MYSTERY IN HIM. THERE ARE NO SHADOWS AND NO DARK SIDES TO THINGS ----- MORE OFTEN THAN NOT TO SOUND MORE LIKE A PREACHER THAN A POET ----- AGAIN BE IT THE MEANING OF LIFE, THE PLACE OF WOMEN IN SOCIETY, THE PHILOSOPHY OF THE SELF EDUCATION, DEMOCRACY OR THE CINEMAS ----- HE IS ONLY TOO READY TO TURN OUT AN EDITORIAL IN VERSE.

اب یہاں میں یہ بحث شروع نہیں کروں گا کہ یہ صورتِ حال کیوں پیدا ہوئی اور اس کے اسباب کیا ہیں اس لیے کہ اس موضوع پر میں کئی مضامین میں اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ مختصر آیہ کہ اقبال کے WORSHIPPING CRITICS میں زیادہ تعداد ایسے دانشوروں کی ہے جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں جب یوسف سلیم چشتی "جاوید نامہ" کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھیں گے کہ "جاوید نامہ" میں اقبال نے "شاعرانہ استعداد سے زیادہ اپنی حکیمانہ قابلیت کے شواہد پیش کیے ہیں" تو پروفیسر کلیم الدین احمد کو اس جملے کا سہارا لینے سے کون روک سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی بحث کا آغاز یوسف سلیم چشتی کی اسی رائے سے کرتے ہیں کہ

یہ جملہ "شاعرانہ استعداد سے زیادہ اپنی حکیمانہ قابلیت کے شواہد پیش کیے ہیں"، قابلِ غور ہے۔

اس کے فوراً بعد پروفیسر کلیم الدین احمد اپنی توجہ "جاوید نامہ" کے بعض حصوں پر مبذول کرتے ہیں اور فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ اور فلک مشتری میں منظر نگاری والے جزو تلاش کرتے ہیں، ان کا اردو نظم میں بھونڈا ترجمہ کرتے ہیں اور پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دانتے کی منظر نگاری میں وہ واقفیت وہ جزئیات نگاری ہے جو اقبال کے بس کی بات نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اقبال کی منظر نگاری کے نمونے اتنے ہی معمولی اور غیر اہم ہیں تو آپ نے اُن کا اردو نظم میں ترجمہ کرنے کی زحمت ہی کیوں گوارا فرمائی اور پھر غالباً کلیم الدین صاحب نے اس منظر نگاری کے متعلق جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ اپنے کیے ہوئے ترجموں کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ حالانکہ کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ جب کلیم الدین صاحب اقبال کے فارسی اشعار کا اردو اشعار میں ترجمہ کریں گے تو ان اشعار میں کیا باقی رہ جائے گا۔ یہ ترجمے کر کے تو کلیم الدین صاحب نے اقبال کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو ساغر نظامی نے شکنتلا کا ترجمہ کر کے کالی داس کے ساتھ کیا ہے۔ ان ترجموں کو دیکھ کے مجھے فراق صاحب کا وہ جملہ یاد آ رہا ہے جو انہوں نے مذکورہ ترجمۂ شکنتلا کے چند صفحے دیکھ کر کہا تھا اور وہ جملہ یہ تھا:

HE HAS BROUGHT KALIDAS DOWN TO THE POOR LEVEL OF HIS OWN MIND.

اپنی کتاب "اقبال" میں خضرِ راہ ، طلوعِ اسلام ، ذوق و شوق ، مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ کا ذکر کرتے ہوئے کلیم الدین صاحب کہتے ہیں
پڑھے لکھے قارئین بھی نظم کیا ہے ؟ اس کی کیا خصوصیتیں ہیں ؟ وہ کیا چیز ہے جو نظم کو خطابات ، ترسیلِ پیغام ، غیر شعر
اور نثر سے ممیز کرتی ہے ، ان چیزوں سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے لیکن تنقید کی دشوار گزار راہ میں جہاں فرشتوں
کے پَر جلتے ہیں بے دھڑک گامزن ہوتے ہیں۔ [1]

ظاہر ہے کہ کلیم الدین صاحب یہ تمہید اقبال پر بات چیت کرنے کے لیے باندھ رہے ہیں۔ اس سے قبل وہ اقبال کے متعلق یہ بھی لکھ چکے تھے اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں، یہ مقام ہمارے آپ کے کہنے سے نہیں ملتا ..... لیکن جب اپنی تعریف اپنی زبان سے کرنے کا وقت آیا تو وہ اپنے قائم کیے ہوئے اصول کو فراموش کر گئے اور بے اختیار ان کے قلم سے نکلا :۔

جو باتیں میں نے کہی تھیں ان کا اثر ضرور ہوا لیکن ایک عرصۂ دراز کے بعد۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں ہے میں یہاں یہ نہیں کہوں گا کہ نقد و نظر کی دنیا میں بھی اونچا مقام اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے نہیں ملتا بلکہ یہ کہوں گا کہ ادبی تنقید کسی فارمولے کا نام نہیں ہے کہ آپ خاردار تاروں کا ایک فریم ورک بنا لیں اور شاعری ایسی نازک اور لطیف تخلیق کو اس فولادی پنجے کے حوالے کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فولادی پنجہ تو ان نرم و نازک شگوفوں اور کلیوں کو مجروح کر دے گا۔

تفنیت
پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ طے کر کے اپنی بات شروع کرنا کہ خطابت اور شاعری میں بیر ہے اور خطابت شاعری نہیں ہو سکتی دنیا بھر کی عظیم شاعری سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کرنے کے مترادف ہے۔ اچھی اور قابلِ قدر شاعری بلکہ بڑی شاعری بھی ، براہِ راست انداز میں بھی ہمارے سامنے ہے۔ خطابت کے انداز میں بھی اور علامتی انداز میں بھی۔ میں یہاں اس طرح کی زیادہ مثالوں سے اپنی بات چیت کو بھاری بھرکم بنانے کی کوشش نہیں کروں گا صرف یہ کہوں گا کہ فردوسی کا شاہنامہ ، رومی کی مثنوی ، بوستانِ سعدی ، تلسی داس کی رامائن ، شیکسپیر اور ملٹن کی شاعری میں بیسیوں نہیں سینکڑوں نمونے مسلسل اشعار پر مشتمل ایسے مل جائیں گے جو براہِ راست شاعری یا خطابت کی ذیل میں آئیں گے لیکن ساتھ ہی وہ بڑی شاعری کے نمونے بھی ہوں گے۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم نہ بھی کریں کہ شاعری کے ساتھ ترسیل یا ابلاغ کا مقصد بھی وابستہ ہے تو بھی اس بات سے انکار نہ ہو سکے گا کہ اگر شاعر اپنے آپ سے بھی بات کرتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی خطابت ہے۔ اور خطابت اگر شاعری میں ڈھل جاتی ہے تو خطابت اور شاعری میں کوئی بیر نہیں رہتا۔

ابھی میں نے فردوسی اور سعدی کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی ضمن میں سحر البیان اور گلزارِ نسیم کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ ہماری عظیم شاعری نہ سہی لیکن معمولی مثنویاں بھی نہیں ہیں اور ان کے اکثر حصے خطابیہ انداز سے لبریز ہیں۔ اب بڑی شاعری کی مثال شاہنامے ہی کو لیجیے۔ جب منیژہ یہ خبر سن کر کہ ایران سے ایک سوداگر آیا ہے رستم کے پاس آتی ہے اور رستم سے پوچھتی ہے کہ ایران میں کسی کو یہ خبر بھی ہے کہ بیژن کنوئیں میں پڑا زندگی کی گھڑیاں گن رہا ہے اور رستم محض اس خیال سے کہ کہیں منیژہ کو میری اصلیت کا پتا نہ چل جائے اُسے ڈانٹ دیتا ہے تو منیژہ جو فریاد کرتی ہے وہ دراصل رستم ہی سے خطاب ہے اور اسے خطاب ہی کے ذیل میں آنا چاہیے لیکن جب ان اشعار کے مرتبے کا آپ تعین کریں گے تو اُسے صرف اچھی شاعری ہی میں نہیں بلکہ بڑی شاعری میں جگہ دیں گے۔ منیژہ کہتی ہے۔

منیژہ منم دُختِ افراسیاب   برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب
برائے یکے بیژنِ شور بخت   فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

اور اقبال کے یہاں تو مکالماتی شاعری جسے اصولاً خطابت کے زیرِ عنوان آنا چاہیے ان کی نہایت بلند پایہ شاعری ہے۔ اس ضمن میں آپ کوئی بھی نظم دیکھ لیں اردو کی یا فارسی کی ، مثنویوں کے حصے دیکھ لیں یا سارا جاوید نامہ ، مثالیں کیسے دی جائیں۔ مثنوی اسرار و رموز سے شروع کریں تو اس میں "گنگا کا خطاب ہمالہ سے" دیکھ لیا جائے یا پیش کش بہ حضورِ ملتِ اسلامیہ دیکھ لیں۔ "بانگِ درا" کے پہلے حصے پر اس مضمون کے عنوان کی روشنی میں نظر ڈالی تو دیکھا کہ ۹ نظموں

---

[1] یہ دراصل ایک ہی فقرہ ہے۔ قارئینِ کرام ذرا اس کی ساخت ملاحظہ کریں ، اس لیے کہ یہ اُردو ادبیات کے ایک نقاد کا جملہ ہے۔

میں سے ہم کو ایسی ہیں جو خطابیہ یا مکالماتی عنوان کے تحت آتی ہیں اور ان میں ایسی نظمیں بھی ہیں۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا — بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا

اور

اے درد عشق ہے گہر آب دار تو — نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو

"بال جبریل" کی نظموں کو چھوڑیے۔ ان نظموں کی خطابیہ شاعری تو دنیا کی بلند ترین شاعری کے معیار تک پہنچتی ہے مثلاً

اے حرم قرطبہ، عشق سے تیرا وجود — تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں — پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی؟

ہے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات — آیۂ کائنات کا معنی دیر یاب تو

روح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب — تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب

مرے قافلے میں لٹا دے اسے — سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی

اس کی غزلوں کو دیکھ لیجئے، اگر خطابت شاعری نہیں بن سکتی تو یہ غزلیں ہم کس کھاتے میں رکھیں گے۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا — اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

پھر ذوق و شوق دیکھ دل بے قرار کا — دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ — تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ

یہ تو صرف چند غزلوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ "زبور عجم" کو دیکھ لیجئے اس کی تمام غزلیں خطابیہ ہیں۔ پہلے حصّے کی غزلوں میں خطاب خدا سے ہے اور دوسرے حصے کی غزلوں میں خطاب انسان سے ہے۔ "جاوید نامہ" مکالماتی شاعری سے لبریز ہے اور اگر الزام ہی دینا ہے تو مکالمہ بھی اُتنا ہی بڑا ملزم ہے جتنا خطابت۔ "پیام مشرق" کا پیش کش دیکھئے، اکثر رباعیات دیکھئے۔ "نقش فرنگ" کی پہلی نظم "پیام" دیکھئے اسے تو اقبال نے خود ہی پیام کہا ہے لیکن یہ پیام کس طرح شاعری میں ڈھل گیا ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے۔

چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ — آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تراست

عجب آنیست کہ اعجاز مسیحا داری — عجب این است کہ بیمار تو بیمار تراست

دشت و کہسار نوردید و غزالے نگرفت — طوف گلشن زد و یک گل بہ گریبانش نیست

شعلہ بودیم، شکستیم و شرر گردیدیم — صاحب ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود — این مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

اس نظم کے پہلے بند کو کلیم الدین صاحب نے نظم کہا ہے باقی ساری نظم اُن کے نزدیک درخور اعتنا نہیں ہے۔ "مثنوی اسرار خودی" پر تنقید کرتے ہوئے [دراصل مجھے یہاں تنقید کے عوض کوئی اور لفظ استعمال کرنا چاہیئے مثلاً جارحانہ یا جراحانہ یا معاندانہ تنقید] کلیم الدین صاحب پہلے تو اقبال کے اس مصرعے کا سہارا لیتے ہیں۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست

اور پھر فرماتے ہیں" ان دونوں نظموں" اسرار خودی اور رموز بے خودی میں پیغمبری ہو، شاعری نہیں، خیالات ہیں، ممکن ہے کام کے خیالات ہوں لیکن ان کا بیان نثر میں زیادہ وضاحت، تعین اور منطق کے ساتھ ممکن تھا۔ لیکن جہاں شاعری سے بہت سے ناجائز مصرف لیے گئے وہاں ایک یہ بھی سہی"۔ میں کلیم الدین احمد صاحب کے ان نثری اقتباس کے متعلق یہ تو نہیں کہوں گا کہ ایسی اردو نثر لکھنے والے کو اردو یا فارسی شاعری کے قریب نہیں پھٹکنا چاہئے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست۔ اگر مثنوی اسرار و رموز کا صوتی آہنگ پروفیسر کلیم الدین احمد کو متاثر نہیں کر سکتا تو میں

سمجھتا ہوں کہ نغمگی میں ڈوبی ہوئی فارسی شاعری کے ساتھ انہیں کوئی تعلق خاطر نہیں"۔ "اسرار و رموز" میں فکر و خیال کی فولادی چٹانیں پگھل کر جذبے میں تبدیل ہوگئی ہیں اور یہ جذبہ خالص شاعری بن کے صفحۂ قرطاس پر آگیا ہے۔ یہاں ہیئت اور مواد نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جس طرح اکائی کی صورت اختیار کی ہے اُس کی مثالیں "اسرار و رموز" سے پہلے اُردو یا فارسی شاعری میں قریب قریب نایاب تھیں۔ کلیم الدین احمد صاحب نے نظم کے اس حصے کو بالخصوص ہدفِ تنقید بنایا ہے جس کا عنوان ہے "درحقیقت اطلاعِ اسلامیہ و اصلاحِ ادبیات" اور اس پر یہ فقرہ چست کیا ہے کہ اگر "درحقیقت شعر" تک بات رہتی تو مضائقہ نہ تھا لیکن ابتدا ہی سے اقبال اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ کی بات کو اُٹھاتے ہیں" لیکن پروفیسر کلیم الدین اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ "اسرارِ خودی" کا یہ حصہ محض اصلاح پسندی کی خواہش کی بدولت ایک شعری شاہکار نہیں بنا ہے بلکہ اس میں ساری چمک دمک، تابانی، دلاویزی اور رعنائی اس لیے آئی ہے کہ اقبال کا خیال اوّل سے آخر تک شعریت میں ڈھل گیا ہے اور قاری جب اس حصے کے یہ اشعار دیکھتا ہے

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن خیزد از سینائے او انوارِ حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر فطرت از افسونِ او محبوب تر
سوزِ او اندر دلِ پروانہ ہا عشق را رنگیں از و افسانہ ہا
بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش صد جہانِ تازہ مضمر در دلش
درد ماغش نادمیدہ لالہ ہا ناشنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا
فکرِ او با ماہ و انجم ہمنشیں زشت را ناآشنا خوب آفریں

تو وہ اس بات سے متاثر اور مسحور نہیں ہوتا کہ اقبال اُسے اصلاحِ ادبیات کے موضوع پر لیکچر دے رہے ہیں اور اس لیکچر کے دوران میں اسے اچھی اچھی باتیں بتا رہے ہیں بلکہ وہ اس کیفیت میں گم ہو جاتا ہے جو ان اشعار کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ نغمگی کے اس زیر و بم سے لذت اندوز ہوتا ہے جو ان اشعار میں پنہاں ہے اور "چو از دل خیزد و بر دل ریزد" کے مصداق قاری کے دل پر اثر کرتی ہے۔ جب وہ یہ شعر پڑھتا ہے

درد ماغش نادمیدہ لالہ ہا ناشنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا

تو بیک وقت اس کے سامنے غالب کا یہ مصرع بھی چمک اٹھتا ہے۔

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

اور اقبال کا ایک اور مصرع بھی

من نوائے شاعرِ فرداستم

اور قاری خالص شعریت کی اُس دنیا میں گم ہو جاتا ہے جو جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش کی خالق بھی ہے اور تخلیق بھی۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قاری کا دل و دماغ اس قابل ہو کہ اچھا شعر اس پر اثر کر سکے کیوں کہ

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کشمیر کی سرزمین پر بارش کا ایک قطرہ گرتا ہے تو سرزمین لالے کے پھولوں سے پٹ جاتی ہے۔ چراپونجی میں سینکڑوں انچ بارش ہوتی ہے لیکن اس سرزمین پر کچھ پیدا نہیں ہوتا۔

اس بات چیت سے یاد آیا کہ جیسے کلیم الدین صاحب نے اقبال کے اس مصرع کو "شاعری زیں مثنوی مقصود نیست" کو اپنی جارحانہ تنقید کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح فراق صاحب بھی کیا کرتے تھے کہ دیکھیے وہ تو خود کہتا ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

اور آپ لوگ ہیں کہ اسے خواہ مخواہ شاعر بنائے پھرتے ہیں۔ اب کلیم الدین صاحب بھی یونیورسٹی کی سطح پر طلبہ کو انگریزی ادبیات پڑھاتے تھے اور فراق صاحب بھی اس لیے کچھ ایسا کم پڑھا لکھا شخص یہ کیسے کہے کہ دونوں اساتذۂ کرام شاعرانہ اسلوبِ بیان کے رموز سے آشنا تھے اس لیے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس طرح کی معاندانہ تنقید کے پس پردہ کچھ اور عوامل کارفرما رہے ہوں گے مثلاً خود نمائی، جذبۂ حسد یا

بچے بچی کا شوق جن کا تنقید کے علم یا تنقید کے فن سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

خود ستائی کے جوش میں یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ "میں نے آج سے ۴۰ سال پہلے یہ لکھا تھا اور وہ لکھا تھا...... اور جو باتیں میں نے لکھی تھیں ان کا اثر ضرور ہوا لیکن ایک عرصۂ دراز کے بعد۔ جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے"۔ لیکن سنجیدہ تنقید نگاری کے وقت سیاق و سباق کو پیش نظر رکھنا بہت مشکل کام ہے ورنہ اقبال کی نظم "جبریل و ابلیس" کے متعلق کلیم الدین صاحب متضاد قسم کی آرا پیش نہ کرتے۔ کلیم الدین صاحب بحث کے آغاز میں نظم "تقدیر" (اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر) پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے پہلے تو اقبال کے مصرعوں میں اصلاح فرماتے ہیں اور کہتے ہیں

..... پھر یہ نظم کچھ بہت اچھی بھی نہیں مثلاً ابلیس کی تقریر کے پہلے حصے میں چار سطروں کی ضرورت نہیں، دو سطروں سے کام چل سکتا تھا

اب دیکھئے کلیم الدین صاحب اقبال کے مصرعوں کو سطریں کہہ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے ذہن میں انگریزی کا لفظ LINE ہو لیکن اردو کا کوئی نقاد مصرعے کو سطر نہیں کہے گا۔ کچھ بھی ہو یہ اظہارِ خیال کلیم الدین صاحب کے دیانت دارانہ رویّے کی چغلی کھا رہا ہے۔ چھوٹے نقاد بالعموم کسی کی شاعری پر تنقید کرتے وقت اُس کے مصرعوں میں اصلاح کر دیتے ہیں۔ بڑے نقاد ایسا نہیں کرتے۔ اسی بحث میں اس نظم کے ساتھ کلیم الدین صاحب "جبریل و ابلیس" کا موازنہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

اب "جبریل و ابلیس" کو لیجئے جو اس نظم سے کچھ بہتر ہے۔ نظم یہ ہے۔

اور پھر پوری نظم نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں

یہ شاعری ہے اور اچھی شاعری ہے کیوں کہ جس طرح ملٹن کو شیطان سے ہمدردی ہے اسی طرح اقبال کو بھی ابلیس سے ہمدردی ہے اور یہی ایک نقطہ ہے جہاں اقبال کی شخصیت ملٹن کی شخصیت کو ایک لمحے کے لیے چھوتی ہے۔

اب ان دونوں آرا سے کیا سمجھا جائے کہ کلیم الدین صاحب کون سی بات دیانت داری کے ساتھ کہہ رہے ہیں — اور یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ انہوں نے اپنی دوسری رائے میں اقبال کا ملٹن کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرنے کے عوض ملٹن کے تعلق سے اقبال کی جانب جاحدانہ مربیانہ رویّہ اختیار کرنے کی کوشش کی جیسے امتحان میں اپنے کسی کسی طالب علم کو رعائتی نمبر دے رہے ہوں۔ یہ رویّہ اقبال پر اُن کی کتاب میں اور بھی کئی جگہوں پر نظر آتا ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب "دانتے اور اقبال" میں وہ دانتے اور اقبال کا بظاہر تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے دراصل اقبال کی شاعری کو خطابت اور سپاٹ شاعری ثابت کرنے پر سارا زور صرف کرتے ہیں اور اس قسم کے فقرے لکھتے ہیں

جو فنی حُسن کاری MATILDA اور BEATRICE کی تصویروں میں ہے وہ زروان اور سروش میں نہیں اور ... میں جو وقار ہے وہ حکیم مریخی میں نہیں ......

ایک نبیۂ مریخی ہے جو اتفاقی ہے کیوں کہ اقبال کو اس سے اور اس کے نظریے سے کوئی ہمدردی نہ تھی [1] ....

دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کے مقابلے میں "جاوید نامہ" ایک مفلس کا چراغ معلوم ہوتا ہے [2]

اور میں تو اسے بھی کوئی تقابلی مطالعہ نہیں سمجھتا کہ "جو فنی حسن کاری MATILDA اور BEATRICE کی تصویروں میں ہے وہ زروان اور سروش میں نہیں ہے اور ULYSSES میں جو وقار ہے وہ حکیم مریخی میں نہیں ہے"۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ "جاوید نامہ" میں MATILDA اور BEATRICE کے کردار نہیں ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اقبال نے "جاوید نامہ" "ڈیوائن کامیڈی" کے جواب میں نہیں لکھا اگر اپنے ایک خط میں انہوں

---

[1] غالباً پروفیسر کلیم الدین احمد سیاق و سباق پر نظر کیے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگر وہ تذکیر نبیۂ مریخ سے پہلے کا "بند احوال دوشیزۂ مریخ دعویٰ رسالت کردن" دیکھ لیتے تو انہیں پتہ چل جاتا کہ فرزمرض اس دوشیزہ کو فرنگستان سے خرید کر لایا تھا۔ اور اسے نبوت کے کام میں پختہ کر دیا گیا تھا چنانچہ وہ کہنے لگی کہ میں آسمان سے نازل ہوئی ہوں۔

[2] کلیم الدین صاحب اسے تنقید کی زبان سمجھتے ہوں گے۔

نے یہ تحریر کیا ہے کہ میں ڈیوائن کامیڈی کی طرز پہ ایک نظم کہہ رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ڈیوائن کامیڈی کا جواب لکھ رہے ہیں یا اس کا چربہ فارسی میں پیش کر رہے ہیں۔ کلیم الدین صاحب پر شاید یہ راز افشا نہیں ہو سکا کہ

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو این جاست ۔۔۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

اور غالباً "جاوید نامہ" اور "ڈیوائن کامیڈی" کے بنیادی فرق پر بھی ان کی نظر نہیں گئی۔ یا تو وہ "جاوید نامہ" کے مطالب صحیح طور پر سمجھ نہ سکے اور انہوں نے کسی سے اس کے متعلق پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی یا جان بوجھ کے غلط مبحث سے کام لے رہے ہیں۔ ان دونوں عظیم شاہکار نظموں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ "ڈیوائن کامیڈی" کا موضوع صداقت کی تلاش ہے اور اسی پر نظم ختم ہوتی ہے۔ "جاوید نامہ" یہاں سے یعنی صداقت کی تلاش سے شروع ہوتا ہے اور تسخیرِ کائنات کے موضوع پر جا کے ختم ہوتا ہے اور یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

اپنی کتاب میں جا بجا یہ لکھنے کے بعد کہ اقبال کا کلام خطابت ہے، پیغام ہے، کلیم الدین صاحب کا یہ کہنا کہ اقبال اگر یوں لکھتے اور یہ کرتے، وہ کرتے تو بہتر شاعر ہو سکتے تھے بالکل مہمل باتیں ہیں۔ اقبال کی نظموں کے متعلق جہاں وہ یہ لکھتے ہیں کہ یہ پیغام ہے شاعری نہیں، خطابت ہے شاعری نہیں وہاں وہ ان نظموں کے مختلف حصوں میں ربط کی کمی یا فقدان کا ذکر بھی جا بجا چھیڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کمی نہ ہوتی تو یہ نظم بہتر ہوتی اور اقبال بہتر شاعر ہوتے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے لغو مشورے تو ہر شاعر کو دیے جا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں نثری قسم کے ربط اور شاعری میں ابہام کے متعلق اقبال نے جو کچھ لکھا ہے کلیم الدین احمد صاحب وہ پڑھ لیتے اور اگر وہ یہ سب نہیں پڑھ سکے تو شاعری میں ابہام کی اہمیت کے متعلق اقبال کا جو نظریہ ہے اس کے بارے ارتھر آربیری کا مضمون ہی پڑھ لیتے تو یقیناً بہتر نقاد ہوتے لیکن اگر پڑھنے سے زیادہ لکھنے کا شوق ہو تو نقاد کا اس منزل سے آگے بڑھنا دشوار ہے جس منزل تک کلیم الدین صاحب پہنچے ہیں۔

اقبال پر کلیم الدین صاحب کی کتاب میں نے ایک بار پہلے پڑھی تھی اور اس وقت بھی میری رائے یہ تھی کہ اس میں صرف ایک ہی بات کو کہ اقبال کے یہاں خطابت زیادہ ہے اور شاعری کم گھما پھرا کر بیسیوں بار کہا گیا ہے اور کچھ بھی نہیں کہا گیا ہے۔ اور اب جو اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے عنوان بھی یہی ملا "کلام اقبال میں خطابت اور شاعری" تو میرا خیال لامحالہ پھر کلیم الدین صاحب کی تحریروں کی طرف گیا اور میں نے پھر اس کتاب کو اوّل سے آخر تک یہ پڑھا اور ایک بار پھر کوہ کندن و کاہ بر آوردن کے مصداق مجھے اس کتاب میں اس ایک نکتے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا کہ اقبال کے کلام میں پیغام زیادہ ہے اور شاعری کم۔ اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ میں یہ مقالہ لکھتے وقت اس کتاب کو پیش نظر رکھوں تو موضوع کے ساتھ بہتر طرح سے انصاف کر سکوں گا۔ یہ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ ممکن ہے کوئی صاحب میرا یہ مضمون پڑھنے کے بعد یہ سوال کریں کہ یہ مضمون علامہ اقبال کے متعلق ہے یا کلیم الدین احمد صاحب کے متعلق۔

بہر طور اب بات چیت ختم کرنے سے پہلے میں اقبال کی ایک نظم "خضر راہ" کا خاص طور سے ذکر کروں گا کیوں کہ اس نظم کو کلیم الدین صاحب نے بالخصوص اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی چار اشعار کا ذکر تو وہ تعریفی الفاظ میں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک حسین شاعرانہ تصور ہے اور ان شعروں میں اقبال ایک حسین، معصوم، سکوت افزا فضا کی تخلیق کرتے ہیں جو شعریت سے لبریز ہے لیکن آگے چل کے کلیم الدین صاحب کہتے ہیں کہ "اس طلسمی فضا میں یک بیک جہاں بیں خضر نمودار ہوتے ہیں اور یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے کیوں کہ اقبال سوالات کی بوچھار کر دیتے ہیں۔"

دراصل کلیم الدین صاحب یہاں اس نکتے کو فراموش کر جاتے ہیں کہ اقبال کے لیے شاعری کسی فارمولے کا نام نہیں اس لیے اقبال کی شاعری پر کوئی لیبل نہیں لگ سکا۔ لیبل سے بے نیاز شاعری ہمیشہ آزاد فضا میں پرواز کرے گی اور رسمی تنقید کا جال ہاتھ میں لیے نقاد ساری عمر یہ مصرع پڑھتا رہے گا "در انتظارِ ہما دام چیدنم میکند"۔ پہلے تنقید کا زنداں تیار کر کے پھر اس میں شاعری کو مقید کرنے کی کوشش کرنا تنقید نہیں ہے، تنقید اور شاعری دونوں کے ساتھ مذاق ہے۔ اگر "خضر راہ" ایسی نظم جسے پروفیسر آل احمد سرور نے اردو شاعری کا نیا عہد نامہ کہا ہے اس سے پہلے اردو شاعری میں موجود نہیں تھی اور یہ اپنے انداز کی پہلی نظم ہے تو ہمیں اس نظم کی ساخت کو، اس کی ہیئت کو، اس کے سیاق و سباق کو اور اس کے اسلوب کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے نہ کہ ہم اس پہ پتھر پھینکنا شروع کر دیں۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور، سلیمان ندوی مرحوم نے یہ نظم پڑھ کر اقبال کو لکھا تھا کہ اس کے بعض حصوں میں وہ بات نہیں ہے جو "شمع و شاعر" میں ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس کے بعض حصوں میں بالخصوص خضر کے جواب میں وہ رعنائی اور دلکشی نہیں ہے جو

آپ کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اگر مجھے اس کا جواب دینا ہوتا تو میں یہ کہتا کہ اس میں "شمع و شاعر" والی بات اس لیے نہیں ہے کہ "یہ شمع و شاعر نہیں ہے"۔ "خضر راہ" ہے اور "شمع و شاعر" میں بھی تو "خضر راہ" والی بات نہیں ہے۔ شاعری ایک جلوۂ ہزار رنگ ہے۔ جلوۂ یک رنگ نہیں ہے۔ نہ وہ شمع و شاعر میں مقید ہو سکتی ہے نہ خضر راہ نہ طلوع اسلام میں نہ مسجد قرطبہ میں نہ ساقی نامہ میں اور نہ ذوق و شوق میں۔ لیکن علامہ نے اپنی بات کو واضح کرتے ہوئے یہ جواب دیا کہ خضر علیہ السلام نے چونکہ سیاسی سماجی اور معاشی مسائل کے متعلق اظہار خیال کیا ہے اور ان کی بزرگی اور عظمت بھی میرے پیش نظر تھی اس لیے میں نے ان حصوں کو جن میں ان کا جواب ہے خیال آرائی سے رنگین بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ جواب بھی تنقید کے اصولوں پر پورا اُترتا ہے لیکن کلیم الدین صاحب کا یہ کہنا کہ یہ سوالات نثر میں بھی پوچھے جا سکتے تھے تنقید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ یہ سوالات الگ نہیں ہیں بلکہ نظم کے دوسرے بند کا حصہ ہیں اور یہ بند یوں شروع ہوتا ہے

اے تری چشم جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار   جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش

"کشتی مسکین" و "جان پاک" و "دیوار یتیم"   علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد   زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے سلطنت کیا چیز ہے   اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک   نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی   فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ و نوش

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ   خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے   کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

اب کلیم الدین صاحب ان اشعار کی نثر بنا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا ان کا سارا اثاثہ، ساری دلکشی، ساری دلآویزی اور ساری رعنائی ختم ہو گئی شاعری شاعری ہے اور نثر نثر ہے اکلیم الدین صاحب کو اس کا علم اور احساس ہو یا نہ ہو اقبال کو ہے —— سہل شاعری کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ کہنا تو آسان ہے کہ یہ بات نثر میں بھی کہی جا سکتی تھی یا یہ شاعری نہیں ہے، نثر ہے، لیکن سہل ممتنع میں شعر کہنا ایک بہت ہی مشکل بات ہے۔ ملٹن کا ایک مصرع ہے اور وہ بھی خطابت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یوسی فر کہتا ہے —— THE SUN OF GOD I ALSO AM

اب بظاہر خیال ہوتا ہے کہ اس مصرعے میں کون سی خاص بات ہے۔ یہ تو ہر کوئی کہہ سکتا ہے لیکن ایسا مصرع کہنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں میں تو جب یہ مصرع سیاق و سباق کے ساتھ پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی بات مجھے اقبال کے اس کلام کے بارے میں کہنی ہے جسے بعض نقاد خطابت کہہ کے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کلیم الدین صاحب نے اس نظم کے پہلے چار اشعار کی تعریف کی ہے۔ نہ جانے یہ بات ان کے سامنے کیوں نہ رہی کہ ان اشعار میں اقبال دریا اور اس کے بہاؤ کو منظر نگاری میں ڈھال رہے ہیں۔ یہ شعرا کا ایک محبوب موضوع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس منظر کشی میں اقبال نے جو کچھ کہہ دیا اس سے پہلے اور کوئی نہیں کہہ سکا۔ لیکن سیاسی مسائل کو شاعری میں ڈھالنا دریا کی منظر کشی سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ دریا کی منظر کشی کے وقت دریا خود شاعر کے مزاج کے مطابق تصویر کشی میں اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس وقت نیکر کا خرام سکون بن جاتا ہے اور خضر راہ کا دریا دریا نہیں رہتا۔ تصویر آب کی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن جب یہ مسائل سامنے آتے ہیں کہ یورپ کی حریص اقوام اپنے حرص کی تسکین کے لیے کیا کچھ کر رہی ہیں یا کیا کچھ نہیں کر رہی ہیں اور روس میں سرمایہ و محنت کی آویزش کا کیا نتیجہ بنی نوع انسان کے سامنے آنے والا ہے یا شریف حسین کے دور میں انگریزوں نے خانہ کعبہ کے ساتھ کیا سلوک کیا تو شاعر کو کہیں زیادہ مشکل منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل کو صحیح طور پر جذبے کا رنگ دینا اور انہیں شاعری کی زبان عطا کرنا کسی بڑے شاعر کا کام ہے۔ یہ آکسیجن بھرے غبارے کو ہوا میں اُڑا دینے کا عمل نہیں ہے بلکہ بھاری پتھروں کو ہوا میں اُڑانے کا عمل ہے۔ یہ فن کاری کی بہت اونچی معراج ہے جس سے محض اقبال ہی واقف تھے اور اسی سطح کے شعرا ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اور اقبال اس سارے بند میں اور بعد کے بندوں میں جن میں انہوں نے سیاست کے فولادی ٹکڑوں کو شاعری کے پھولوں میں تبدیل کرنے کا معجزہ دکھایا ہے اردو شاعری کو اس معراج پر لے گئے ہیں جس پر یہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

اب اس بات کو ذرا وضاحت سے بیان کروں۔ پہلے تو اس بند کے اشعار میں جو ربط ہے اُسے پیش نظر رکھیے اور پھر یہ دیکھیے کہ اقبال نے اپنی بات

کہنے میں کس قدر اختصار سے کام لیا ہے۔ اشاروں میں کتنی باتیں کہہ گئے ہیں اور اس انداز سے کہ ہر بات سچی اور کھری شاعری میں ڈھل گئی ہے۔ جنابِ خضر سے یہ کہہ کر خطاب کرنا

"کشتیِ مسکین" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"

صرف شاعری ہی نہیں ہے شاعرانہ طلسم کاری ہے۔ یہ مصرعہ کہہ کے اقبال نے مذہبی روایات کی تلمیحات کو جس طرح شاعری بنا کے پیش کیا ہے اس کی قدر کلیم الدین صاحب نہیں کر سکے۔ اس شعر کو نثر میں اقبال کیسے کہتے

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک — نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

نثر میں جب ہم ان اشعار کا مفہوم بیان کرتے ہیں تو ورق کے ورق سیاہ ہو جاتے ہیں۔ کلیم الدین صاحب انگریزی ادبیات کے پروفیسر رہے ہیں راقم التحریر نے یہ نظم کئی برس تک ایم۔ اے اردو کے طلبہ کو پڑھائی ہے۔ اس بند کے ایک ایک شعر پر بلا مبالغہ ایک ایک پیریڈ صرف ہوا ہے۔ صرف اسی شعر کو لیجیے

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفٰے — خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

کلیم الدین صاحب کو یہ شعر سپاٹ اور غیر شاعرانہ نظر آئے تو آئے کسی ایسے نقاد کو جسے اردو شاعری سے ذرا بھی لگاؤ ہے اس شعر میں جہانِ حسن اور جہانِ معنی نظر آئے گا۔ اسے نثر میں بیان کرنے کے لیے بیان کرنے والے کو پہلی جنگِ عظیم کی ساری تاریخ بیان کرنا ہوگی۔ مکہ کے شریف حسین کا کردار بیان کرنا ہوگا۔ ترکوں کی جانبازی پر روشنی ڈالنا ہوگی۔ یہی شعر اقبال نے "طلوعِ اسلام" میں ایک اور انداز سے کہا ہے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے — جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

"طلوعِ اسلام" کے جس بند میں یہ شعر آیا ہے وہ بند بھی کلیم الدین صاحب کے نشترِ غمزہ سے نہیں بچ سکا۔ پہلے یہ سارا بند دیکھیے

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے — ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے — طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے
غبارِ رہگزر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو — جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا — خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے — جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے — یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں — اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اس کے متعلق لکھتے ہیں یہاں بھی "شعروں میں حسبِ معمول ربطِ کامل نہیں"۔ معلوم نہیں حضرت ربطِ کامل سے کیا مراد لیتے ہیں اور ان اشعار میں پہلی جنگِ عظیم کے بعض واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ جو ربط سیاسی اور تاریخی اعتبار سے ان واقعات میں ہے وہی ربط ان اشعار میں ہے پہلے شعر میں جرمنوں کی طرف اشارہ ہے جن کا جنگی نشان عقاب تھا۔ دوسرے میں اشارہ لارڈ کچنر کی طرف ہے۔ تیسرے میں جرمنوں کی سائنس اور ٹیکنالوجی اور مسلمانوں کے اپنے مذہب میں پختہ اعتقادی کا ذکر ہے۔ چوتھے شعر میں مصطفٰے کمال کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔ پانچویں میں شریف حسین کی کم نگاہی کا مذکور ہے کہ اسی کے دور میں انگریز نے خانۂ کعبہ پر گولیاں چلوا دی تھیں۔ ساتویں میں ترکوں کی اس MILITARY STRATEGY کا ذکر ہے جس کے تحت انھوں نے DARDANELLES میں انگریزوں کے جہازوں کی موجودگی کے خطرناک نتائج کو دیکھتے ہوئے DARDANELLES کا جنوبی علاقہ خالی کر دیا تھا اور MAINLAND پر اپنی قلعہ بندی مضبوط کر لی تھی۔ اور انجامِ کار اپنے ملک کو بچا لیا تھا۔ معلوم نہیں معترض کو ان تاریخی واقعات میں ربط نظر آتا ہے یا نہیں کیونکہ مذکورہ اشعار میں وہی ربط ہے جو ان واقعات میں ہے لیکن بڑی بات یہ نہیں ہے کہ تاریخی واقعات میں جو ربط ہے وہی ربط ان اشعار میں ہے بلکہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اقبال نے سیاست اور تاریخ کو اس طرح شاعری میں ڈھال دیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

کلیم الدین صاحب اقبال کے بعض اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے جو انہیں خطابیہ انداز کے نظر آتے ہیں لکھتے ہیں

یہاں باتیں ہیں بشاید کام کی باتیں ہیں لیکن ان میں شعریت نہیں۔ یہ نثر میں زیادہ وضاحت، زیادہ تعین، زیادہ زور کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے اقبال اپنے نثری خیالات کو وزن کا جامہ پہناتے ہیں جس طرح اپنی نظموں میں ترقی پسند شعرا پروپیگنڈہ کا کام لیا کرتے تھے اقبال بھی اپنی نظموں سے اپنے خیالات کی تشہیر کرتے ہیں یعنی ان کی نظمیں بھی ایک طرح کا پروپیگنڈہ ہیں اور وہ بھی اپنے اچھے شعروں اور پروپیگنڈا بازی میں فرق نہیں کر پاتے

ملاحظہ فرمائیے، کلیم الدین صاحب اپنی ایک ہی بات کو قریب قریب ایک ہی طرح کے لفظوں میں دہراتے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں نہ تو نئے الفاظ مل رہے ہیں اور نہ نئے خیالات اور نہ ہی نیا اسلوب۔ اقبال کی بارہ تیرہ کتابوں میں سے انھوں نے اپنی مرضی کے اشعار نکال کے بار بار ایک ہی اعتراض کو دہرایا ہے اور چار سو سولہ صفحات کی کتاب تیار کر لی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کے مجھے وہ کہانی یاد آ گئی جس میں بادشاہ ہر جواب کے بعد پوچھتا ہے" پھر کیا ہوا"؟ اور کہانی سنانے والا کہتا ہے" پھر ایک چڑیا آئی اور گندم کا ایک دانہ اٹھا کر لے گئی"۔

بہر طور معترض کے اس نظریے پر تو میں اسی مقالے میں بحث کر چکا ہوں۔ یہاں صرف اتنا ہی کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ اقبال کی شاعری پر قلم اٹھانے والے ناقد کو لفظ" تشہیر" کے معنی بھی معلوم نہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کلیم الدین صاحب نے ایک ضد پکڑ لی ہے۔ ورنہ وہ بھی یہ بات جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اقبال کے یہاں شاعری خطابت نہیں بنی، خطابت شاعری بنی ہے اس لیے ساری کتاب میں خطابت خطابت کی گردان کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خواجۂ اہلِ فراق، "جاوید نامہ" میں کہتا ہے

من بے در پردہ لا گفتہ ام

اسی طرح خطابت خطابت کی رٹ لگانے کے باوجود کلیم الدین صاحب کے قلم سے اقبال کی شاعری کے بارے میں یہ جملے نکل ہی گئے ہیں

ان نظموں میں پیغام، ترنم اور جذبات سب ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ان میں فرق کرنا ناممکن ہے اور ان کی کامیابی کا یہی راز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک جوئے شعریت ہے جو مستانہ وار رواں اور دواں ہے .....

یہاں بھی پیام شعر بن گیا ہے۔ خطاب غنچہ خوابیدہ سے ہے..... دراصل اس نظم میں خطاب انسان سے ہے۔ [آزاد]

ان دو بندوں میں پیام صاف ہے۔ بیرونِ پردہ ہے بلا واسطہ ہے لیکن اس میں استعاروں کی رنگ آمیزی ہے جذبات کی گرمی ہے، ترنم کی گھلاوٹ ہے جس کی وجہ سے پیام برونِ پردہ ہوتے ہوئے بھی گوارا ہو جاتا ہے اور REFRAIN کی تکرار سے ایک اثر پیدا ہوتا ہے.......

اور ان دو شعروں میں جو فطرت کی شعری دروں بینی ہے، ان میں جو لطافت ہے، جو دلاویزی ہے اس پر اقبال کے پیغام کو نچھاور کیا جا سکتا ہے

اب آپ اسے کلیم الدین صاحب کی تضاد بیانی سمجھیں یا PATRONISING ALTITUDES یا نیچے دروں نیچے بروں ہونے کی کوشش، میں انہی جملوں پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

وزیر آغا

۵۸ ۔سول لائنز، سرگودھا (پاکستان)

اقبال اور شپنگلر

ابن خلدون کی استثنائی مثال سے قطع نظر جدید دور سے قبل تاریخ کو تہذیبی عوامل کے حوالے سے جانچنے اور سمجھنے کا عمل ناپید رہا ہے۔ البتہ پچھلے دو سو برس میں متعدد زاویہ ہائے نگاہ وجود میں آئے ہیں اور اب تہذیبوں کے عروج و زوال بلکہ ان کی پیدائش سے موت تک کے مراحل کو سمجھنا خاصا آسان ہو گیا ہے۔ تاریخ کو جانچنے کا ایک مقبول زاویہ تو یہ ہے کہ اسے بادشاہوں یا بادشاہوں کے خاندانوں کی تاریخ قرار دیا جائے۔ تعلیم کے ابتدائی درجوں میں یہی زاویہ مستعمل ہے۔ ایک اور زاویہ یہ ہے کہ تاریخ کو زمینی اور ثقافتی عوامل کی کارکردگی کا ثمر شیریں (یا تلخ) متصور کیا جائے۔ ایک زاویہ مارکسی ہے جو تاریخ کو پیداواری ذرائع کی تبدیلی کا شاخسانہ قرار دیتا ہے اور ایک نفسیاتی جس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کے جبلی میلانات کو جب دبا دیا جاتا ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح یا تو معاشرتی لبادے کو پھاڑ کر اودھم مچانے لگتے ہیں اور پھر ھن، منگول، تاتار، وائکنگ، ونڈل یا ہکسو کی طرح پورے خطوں کو روند ڈالتے ہیں یا پھر قلب ماہیت کے ذریعے ایک بہتر اور برتر تہذیب کو وجود میں لانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ تاریخ کو جانچنے کا ایک اور زاویہ یہ ہے کہ اسے بڑی بڑی شخصیتوں کے اعمال کا نتیجہ قرار دیا جائے مثلاً سکندر اعظم، ہنی بال، نپولین یا ہٹلر وغیرہ کے بارے میں کہا جائے کہ ان میں سے ہر ایک نے تاریخ کے ایک پورے دور کو جنم دے ڈالا تھا۔ ایک زاویہ اصلاً مذہبی اور روحانی ہے اور تاریخ کو خیر اور شر کی قوتوں کے باہمی تصادم کا نتیجہ سمجھتا ہے، مگر اس سلسلے میں سب سے مقبول نظریہ وہ ہے جسے فلسفۂ تاریخ کا نام ملا ہے اور جس کے ساتھ ہیگل، شپنگلر، ٹائن بی اور سوروکن کے نام وابستہ ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب علامہ اقبال یورپ گئے تو اس زمانے میں شپنگلر کے نظریات کی بڑی دھوم تھی۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کو بھی ان نظریات کو جاننے کے مواقع ملے مگر عام لوگوں کی طرح علامہ نے شپنگلر کو کلیتاً قبول یا کلیتاً رد نہیں کیا بلکہ اس کے بعض نتائج سے اختلاف اور بعض سے اتفاق کیا۔ تاہم شپنگلر کے نظریات کو زیر بحث لا کر دراصل اپنے نظریہ ثقافت کے سارے خد و خال واضح کر دئے۔ لہٰذا ثقافت کے بارے میں علامہ اقبال کے موقف کو سمجھنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ پہلے شپنگلر کے موقف سے تعارف حاصل کر لیا جائے۔

شپنگلر نے اپنی کتاب "زوالِ مغرب" میں تین ثقافتوں کے خد و خال کو واضح کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے انھیں ایک دوسری سے متمیز کر دیا ہے۔ ان میں ایک ثقافت تو قدیم ہے جس کے نمائندوں میں قدیم یونان اور ہندوستان شامل ہیں اور جسے شپنگلر نے کلاسیکی کلچر کا نام دیا ہے۔ دوسری ثقافت یورپی ہے جس کا نمائندہ فاوسٹ FAUST ایسا بے قرار فرد ہے۔ لہٰذا شپنگلر نے اسے FAUSTIAN CULTURE کا نام دیا ہے۔ تیسری ثقافت مشرق وسطیٰ اور اس کے مذاہب سے منسلک ہے اور اس کو شپنگلر نے MAGIAN CULTURE کہہ کر پکارا ہے۔

کلاسیکی کلچر مزاجاً تاریخ سے بے بہرہ اور "یادداشت" سے محروم ہوتا ہے۔ گویا کلاسیکی آدمی کی زندگی میں ماضی اور مستقبل کے بجائے صرف زمانۂ حال موجود ہوتا ہے۔ کلاسیکی کلچر میں زندگی کے بے ثباتی کا تصور اس قدر مضبوط ہے کہ اس کے سحر میں جکڑے ہوئے لوگ اپنے مُردوں کو بھی زمین میں دفن نہیں کرتے، گویا زندگی بعد از موت کے قائل نہیں۔ چنانچہ قدیم ہندوستان اور ہومر HOMER کے یونان میں مُردوں کو جلانے کی رسم کو فروغ ملا جب کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک بالخصوص مصر میں موت کی نفی کا رویہ اہرام مصر کی صورت میں سامنے آیا۔ اسی طرح کلاسیکی ریاضی میں اشیا کو وقت سے ماورا حاضر و ناظر جاننے کا رجحان ابھرا جو بالآخر اقلیدس کے فروغ پر منتج ہوا، جب کہ جدید دور والوں کی ساری توجہ اشیا کی غیر متغیر حالت کے بجائے ان کے متغیر ہونے کے عمل پر مرتکز ہوئی ہے۔ لہٰذا تجزیاتی جیومیٹری وغیرہ کو فروغ ملا ہے کلاسیکی دنیا بقول شپنگلر، فطرت سے یکسر ہم آہنگ ہونے کی صورت ہے بعینہٖ جیسے پودا زمین سے چمٹا ہوتا ہے۔ کلاسیکی عبادت گاہیں مثلاً "مندر" گہرائی سے ناآشنا ہر قدم پر دائرے کے انداز میں مڑی ہوئی عمارتیں ہیں۔ گویا ہر شے ایک "مرکز" کے گرد طواف کر رہی ہے یوں سمت اور اس کی گہرائی کی یکسر نفی ہو گئی ہے۔ شپنگلر

نے کلاسیکی کلچر کی روح کو مزاجاً اپالو APOLLA کے اوصاف کا حامل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ کلاسیکی انسان باہر کے بجائے اندر کی طرف جھانکتا ہے۔ کلاسیکی کلچر پس منظر کو محض ایک تصویر قرار دے کر مسترد کر دیتا ہے اور کلاسیکی بت ایسے ہی ہے جیسے موجود فطرت کی ایک قاش ہو۔ وہ سرتاپا ایک اقلیدسی جسم ہے جو نہ دیکھتا ہے اور نہ بولتا ہے اور ناظر کے وجود سے تو وہ قطعاً بے نیاز رہتا ہے۔ کلاسیکی کلچر میں کولمبس COLUMBUS کی طرح سیاحت کرنے کے میلان کا فقدان ہے۔ وہاں تو سمادھی لگا کر چپ چاپ بیٹھنا اور غور و فکر کرنا ہی اصلِ حیات ہے۔

اقبال ذہنی اور جذباتی طور پر کلاسیکی کلچر اور اس کے سریانی تصورات کو ناپسند کرتے تھے، اس لئے بھی کہ ان کے نزدیک اسلامی کلچر کلاسیکی کلچر سے مزاجاً ایک مختلف شے تھا چنانچہ اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ قرآن کی روح بنیادی طور پر کلاسیکی اندازِ فکر کی ضد ہے۔

کلاسیکی کلچر کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے کلچر کا ذکر ہونا چاہئے۔ جسے شپنگلر نے مجوسی کلچر MAGIAN CULTURE کا نام دیا ہے۔ شپنگلر کے مطابق مجوسی کلچر کے ممالک کی فضا پُراسرار ہے۔ جس طرح صحرا میں رات اور دن کی حدود بہت واضح ہوتی ہیں، اسی طرح وہاں خیر اور شر بھی بالکل الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ بد روحیں انسان کو زک پہنچاتی ہیں مگر پریاں اور فرشتے اُسے خطرات سے بچاتے ہیں۔ اس فضا میں پراسرار علاقے، شہر اور عمارات ہیں، تعویذ ہیں، آبِ حیات اور سلیمانؑ کی انگشتری ہے اور پھر کارواں کی وہ لرزتی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہے جسے بے پایاں تاریکی نگل جانے کے لئے ہمہ وقت مستعد نظر آتی ہے۔ اس کلچر میں روشنی تاریکی کے خلاف جہادِ اکبر میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ تمام کائنات کے پس پشت صرف ایک ہی علتِ اولیٰ ہے اور یہ علتِ اولیٰ کسی اور سبب کے تابع نہیں شپنگلر کے مطابق مجوسی سوسائٹی میں اجماع تو ہے مگر فرد کی خودی موجود نہیں۔ تمام افراد زندوں کے علاوہ مُردوں سے بھی ہم رشتہ اور منسلک ہیں۔ اس کلچر کا فرد رات کی گہری تاریکی سے نبرد آزما ہے اور چاہتا ہے کہ روشنی آئے تاکہ تاریکی کا عفریت کچل دیا جائے۔ چنانچہ تاریکی کو روشنی میں اور پارے کو سونے میں تبدیل کرنے کی خواہش پروان چڑھتی ہے۔ چاند رات پارے کی طرح سیمیں اور تغیر آشنا ہے جب کہ دن سونے کی طرح چمکدار، زردی مائل اور ثابت و سالم ہے۔ جب اس کلچر کا فرد کیمیاگری کے فن کو اختیار کرتا ہے اور پارے کو سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو در اصل رات کو دن بنا دینے اور شر کی تاریکی کو خیر کی روشنی سے دور کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس کلچر میں تقدیر کا عمل دخل بہت زیادہ اور تقدیر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا میلان قوی ہے۔ قانون اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو اس کے برگزیدہ بندوں کے ذریعے خلقِ خدا تک پہنچتا ہے۔ شے کے مخفی اوصاف کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لہٰذا مجوسی کلچر کیمیاگری کے پُراسرار علم کا محافظ اور اس لئے خود بھی پراسرار ہے۔ بقول شپنگلر یہ کلچر ایک ایسی رُوح کا کلچر ہے جو بڑی جلدی میں ہے، جسے اپنے اندر جوان ہونے سے پہلے ہی عہدِ پیری کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی مجوسی کلچر کے بارے میں یہ تصویر ابھرتی ہے کہ اس کا فرد نہ صرف پوری کائنات میں متصادم قوتوں (مثلاً خیر اور شر، روشنی اور تاریکی، اہرمن اور اہرمز) کے ڈراما کو ہر دم دیکھتا ہے بلکہ ایک اسمِ اعظم کے ذریعے خیر اور روشنی کو غالب آنے میں مدد بھی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ دیوتاؤں کی کثرت کے تصور کو مسترد کر کے ایک ہی الوہی قوت پر ایمان لاتا ہے اور اجماع کے ذریعے رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

تیسرا کلچر جس کا ذکر شپنگلر نے کیا ہے "یورپی کلچر" ہے جس کے لئے اس نے فاؤسٹ کے حوالے سے FAUSTIAN CULTURE کا نام تجویز کیا ہے۔ فاؤسٹ ایک بے قرار روح ہے جو ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اور ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں ہے اور یہی شپنگلر کی نظروں میں یورپی کلچر کے بنیادی اوصاف ہیں۔ مجوسی کلچر میں تکیوں اور کتب کو اہمیت حاصل تھی مگر فاؤسٹین کلچر میں کیا اور کیسے کو اہمیت ملی ہے اور یہ بنیادی طور پر ایک استقرائی اور سائنسی اندازِ نظر ہے۔ یونانی ڈراما اصلاً واقعات کا ڈراما تھا لیکن یورپی ڈراما کردار کا ڈراما ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یورپی کلچر میں فرد کی انفرادیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان اور یونان میں کردار کے بجائے مثالی نمونے ابھرے لیکن یورپ کرداروں کا ذخیرہ ہے اور ان میں سے ہر کردار کولمبس کی طرح اپنی دھرتی سے منقطع ہو کر سفر کرتا اور نئی نئی دنیاؤں کو دریافت کرتا ہے۔ گویا یورپی کلچر کے فرد میں ایک بے قرار رُوح موجود ہے جو خواہش کی بے قراری کے لئے ایک علامت ہے۔ مثالی نمونے اس کلچر میں نمودار ہوتے ہیں جو فرد کو معاشرے کا تابع محض بنا دیتا ہے جب کہ کردار اپنے معاشرے سے ہر دم متصادم رہتا ہے۔ ہندوستانی فضا میں لنگ کی پوجا کا تصورِ عام تھا اور انسان خود کو فطرت سے منسلک محسوس کرتا تھا۔ بعینہٖ جیسے پودا دھرتی سے جُڑا ہوتا ہے۔ لیکن یورپی کلچر میں "ماں اور بچے" کا رشتہ ابھرا ہے جو در اصل کلچر میں "مستقبل" کے عنصر کی پیدائش پر دال ہے۔ بقول شپنگلر مغربی کلچر کی روح ایک بے پایاں احساس تنہائی میں مبتلا ہے فرد اور معاشرے کے درمیان ہی نہیں، فرد اور فرد بلکہ فرد کی داخلی اور خارجی دنیا کے درمیان بھی بڑا فاصلہ ہے۔ اس کلچر میں "کھڑکی" کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ کھڑکی تجربے کی گہرائی کی علامت ہے اور انسان کی اس خواہش کا اظہاریہ ہے کہ وہ زندان سے باہر نکل کر لامحدود کا نظارہ کرے۔ یورپی کلچر کا ایک اور وصف اس کا تحرک اور رجعت ہے۔ یہ بات مغربی موسیقی

میں بہت نمایاں ہے جہاں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک پوری فوج بینڈ کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر کسی منزل کی طرف ایک ساتھ قدم بڑھا رہی ہو۔ اسی طرح مصوّری میں تناظر کا شدید احساس نمایاں ہے جو فاصلے کے عنصر کو اور بھی گہرا کر دیتا ہے۔ ادب میں صورت یہ ہے کہ مغربی کلچر میں پیدا ہونے والا "المیہ" بنیادی طور پر ایک فرد کی داستانِ عروج و زوال ہے جب کہ کلاسیکی "المیہ" واقعات کی اساس پر استوار ہوتا ہے۔ یورپی ڈراما حرکت ہی حرکت ہے جب کہ مشرقی ڈراما انفعالیت ہی انفعالیت! ایک گہرا احساسِ تنہائی اور فاصلے کا شعور کلاسیکی کلچر سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے کیونکہ وہاں ہر شے قریب ہے اور درخت زمین کا اور فرد معاشرے کا سہارا لیتا ہے جب کہ یورپی کلچر میں ایک داخلی تشنج ہے، فاصلہ ہے، ایک گہرا احساسِ تنہائی ہے، تحرک کا احساس اور سمت کا شعور ہے اور یہ یقین بھی ہے کہ مراجعت ممکن نہیں بحیثیت مجموعی مغربی کلچر کا فرد سوچ کے آشوب میں مبتلا ہے اور تغیّر اور حرکت کو سمجھ نہیں پاتا۔ وہ بجائے خود قوت کی ایک قاش ہے، خواہش کا ایک ٹکڑا ہے اور یہ قوت، یہ خواہش کسی مقصد کی ڈور سے بندھی ہوئی ایک خاص سمت میں اُسے لے جا رہی۔ فاوسٹن کلچر کا فرد "میں" کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک بے قرار، متحرک، خواہشات کی ندمیں آئی ہوئی "میں" اور جس بڑی "میں" سے اس کا سامنا ہے وہ بھی منفعل نہیں بلکہ فرد ہی کی طرح فعّال ہے! لہٰذا یہ فرد اپنے طور پر لامحدود کے بارے میں نتائج کا استخراج کرتا ہے اور اپنی "خودی" پر انحصار کر کے پوری کائنات کے روبرو سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

اپنے خطبات میں علّامہ اقبال نے شپنگلر کے اس نظریے کو تو مان لیا کہ مغربی کلچر اصلاً کلاسیکی کلچر کی ضد تھا تاہم انھوں نے شپنگلر کی اس بات کو نہیں مانا کہ ہر کلچر ایک جزیرے کی طرح باقی کلچروں سے کٹا ہوتا ہے اس سے علّامہ اقبال کا مقصود فقط اس بات کا اظہار تھا کہ اسلامی کلچر ہی نے مغربی کلچر کو کروٹ دی ہے اور شپنگلر کو مغربی کلچر کلاسیکی کلچر کی ضد نظر آیا ہے تو مغربی کلچر کا یہ وصف بھی دراصل اس بغاوت ہی کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں نے یونانی افکار کے خلاف کی تھی۔ مراد یہ کہ مغربی تہذیب اور اس کی جُہت مغربی علوم اور ان کا پھیلا ہوا افق، مغربی اندازِ نظر اور اس کا استقرائی اور تجزیاتی انداز ——— یہ سب کچھ مغربی تہذیب کے فروغ سے پہلے اسلامی تہذیب میں موجود تھا اور وہیں سے سلطنت کی طرح دست بدست ہوتا ہوا مغرب کے ہاتھوں میں آیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ بات شپنگلر کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اگر وہ اس بات کو مان لیتا تو اس کا وہ سارا نظریہ ہی باطل قرار پاتا جو نہ صرف مختلف ثقافتوں کے درمیان ایک مستقل خلیج قائم رکھنے کا داعی ہے بلکہ ثقافتوں کے ایک دوسری پر اثرات مرتسم کرنے کی حقیقت کو بھی نہیں مانتا۔ مگر اقبال اصولی طور پر اس بات کے حق میں تھے اور یہی حقیقت پسندانہ رویّہ بھی ہے بے شک اقبال نے دبی زبان میں اسلامی کلچر پر مجوسی کلچر کے چھلکے کا وجود تسلیم کیا مگر وہ کہتے تھے کہ یہ چھلکا اس اسلامی کلچر سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا جو اس کے نیچے ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ یوں دیکھئے تو اقبال نے مجوسی کلچر اور یورپی کلچر کے فرق کو تسلیم کیا مگر اسلامی کلچر اور یورپی کلچر کو ایک ہی تہذیبی تسلسل کی مختلف کروٹیں قرار دیا۔ مگر کیا واقعی مجوسی کلچر یورپی کلچر سے کوئی مختلف شے تھا اور کیا یہ بات واقعتاً درست ہے کہ اسلامی کلچر نے اس مجوسی کلچر کو جھٹک کر اپنے اوپر سے الگ کیا تو وہ اپنے اصل روپ میں دکھائی دیا؟

واضح رہے کہ مجوسی کلچر سے شپنگلر کی مراد وہ مشترکہ کلچر تھا جو مشرقِ وسطیٰ کے مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت، زرتشتی مذہب اور اسلام سے منسلک تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ مجوسی کلچر کا علاقہ ایران، شام، فلسطین اور جزیرہ نما عرب سے لے کر مصر تک پھیلا ہوا تھا۔ مگر جب اس سارے علاقے کے کلچر کے خدوخال کو دیکھا جائے تو اس کے اوصاف قریب قریب وہی نظر آتے ہیں جو اسلامی کلچر سے خاص تھے اور جو بعد ازاں اسلامی کلچر کی وساطت سے مغربی کلچر میں نمودار ہوئے۔ لہٰذا مغربی کلچر مجوسی کلچر کی ضد نہیں بلکہ اسی کی توسیع ہے۔ اقبال نے یہ کیا کہ ایک طرف تو مجوسی کلچر اور اسلامی کلچر میں حدِ فاصل قائم کی دوسری طرف اسلامی کلچر اور مغربی کلچر میں مماثلت دریافت کی۔ زیرِ نظر مطالعہ کے لئے اقبال کا یہ نظریہ کہ اسلامی کلچر کے اثرات ہی مغربی کلچر تک پہنچے ہیں اور اس لئے مغرب کے تجزیاتی، استقرائی اور عقلی رویّے اسلامی تہذیب کی روح سے متصادم نہیں، بے حد خیال انگیز ہے کہ اس سے اقبال پر خرد دشمنی کا الزام باطل ہو جاتا ہے۔ تاہم اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ اسلامی کلچر نے مجوسی کلچر کی بعض رسوم اور ظواہر کو تو مسترد کیا مگر اس کی ذہنی اور فکری جہات سے قطع تعلق نہ کیا۔ وجہ یہ کہ مجوسی روح اپنے مرزبوم کا ثمر تھی اور یہی مرزبوم اسلامی کلچر کو بھی ورثے میں ملا تھا۔

مرزبوم کا ذکر آیا ہے تو اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مجوسی کلچر کو ان علاقوں میں فروغ ملا جن میں زیادہ تر صحرا تھے یا پھر سطح مرتفع جو ایک بے سنگِ میل منطقے کی صورت میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بے شک اس خطۂ ارضی میں "زرخیز ہلال" FERTILE CRESCENT کا ایک علاقہ بھی تھا، مگر پورے پورے علاقے کے تناظر کو ملحوظ رکھیں تو یہ "زرخیز ہلال" محض ایک نخلستان ہی کی صورت میں نظر آئے گا۔ صحرا کی صورت یہ ہے کہ اس میں تمام سمتیں یکسر ناپید ہو جاتی ہیں اور صحرا میں سفر کرنے والے کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے مقام کا تعیّن آسمان کے حوالے سے کرے۔ اسی لئے مجوسی کلچر میں آسمان ڈراما

ر آسمانی مظاہر کو اس قدر اہمیت ملی ہے۔ صحرا بھی سمندر ہی کی طرح ہوتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ سمندر میں پانی کی لہریں ہوتی ہیں اور صحرا میں ریت کی موجیں۔ ورنہ س طرح سمندر میں سمت باقی نہیں رہتی اور مسافر کو قطب ستارے کی مدد سے اپنے مقام کا تعین کرنا پڑتا ہے بالکل اسی طرح صحرا کا باسی بھی زمینی نشانات سے اپنے قام کا تعین نہیں کر سکتا اور آسمانی مظاہر مثلاً سورج اور چاند کے طلوع و غروب یا ستاروں کے حوالے سے سمت دریافت کرتا ہے پھر جس طرح سمندر میں کشتی یا جہاز کے سوا سفر ممکن نہیں اسی طرح صحرا میں اونٹ کے بغیر سفر محال ہے۔ چنانچہ اسی لئے اونٹ کو "سفینۃ الصحرا" کا لقب ملا ہے کہ اونٹ بھی کشتی ہی کی ایک صورت ہے مجوسی لچر کے باشندوں کو ایک تو پانی کے سمندر تک رسائی حاصل تھی، دوسرے وہ ریت کے سمندر میں مصروف خرام رہتے تھے اور بقول غالب بحر اگر بحر نہ ہو تو بیابان ہے۔ لہٰذا نھوں نے ایک طرف بادبانی کشتی اور دوسری طرف صحرائی اونٹنی کا سہارا لیا اور ایک مسلسل سفر یا سیاحت کی عادت ڈال لی یہی سیاحت پسندی اسلامی کلچر کا بھی امتیازی وصف ہے اور یورپی کلچر کا بھی۔ لہٰذا جہاں یورپ والوں نے کئی امریکہ دریافت کئے وہاں مجوسی کلچر اور پھر اسلامی کلچر سے وابستہ لوگوں نے بھی ایک مستقل سفر ہمیشہ اختیار کیا۔ عرب جہاز راں کہاں کہاں نہیں گئے۔ فونیشیا والوں نے پورے بحیرۂ روم کو تختۂ مشق بنایا مصر کے ڈیلٹا والوں نے مینیز MENES کے زمانے ہی میں سمندر کو عبور کر کے کریٹ یا منوان تہذیب کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اسی طرح سمیریا کے باشندوں نے مصر سے لے کر ہندوستان کے سارے علاقے میں تجارت کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کوئی کلچر زمین سے پوری طرح وابستہ ہوتا ہے تو اس سے متعلق لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور اُن کے ہاں زرعی کلچر کا پورا نظام ابھر آتا ہے لیکن جب کوئی کلچر اپنے اندر تحرک اور جہت پیدا کرتا ہے تو تجارت کو فروغ ملتا ہے۔ تجارت کے لئے ذہن کی چمک دمک، نفع نقصان کا شعور انفرادیت کا احساس اور موجود کو واقعی سمجھنے کا رجحان بہت ضروری ہے ورنہ سفر محض سنیاس کی صورت اختیار کر لے گا۔ چنانچہ مجوسی کلچر اور اس کے بعد اسلامی کلچر میں زمین کے اشمار کو اہمیت ملی ہے موجود کو واقعی متصور کیا گیا ہے اور سمت کا تعین اس لئے کیا گیا ہے کہ شخصی اور قومی سطحوں پر ذات کا تشخص ہو سکے۔ زرعی معاشرے میں رہنے والا شخص اپنے معاشرے سے پوری طرح وابستہ ہوتا ہے۔ ذات، پات، پیشہ، مذہب اور دنیاوی مقام کے اعتبار سے اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ لیکن صحرا کے متحرک معاشرے میں اس شخص کے لئے معاشرے کا تابع مہمل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہاں "فرد" جنم لیتا ہے۔ فرد اس لئے بھی جنم لیتا ہے کہ سفر کرنے والے گروہ کو ایک رہبر یا لیڈر کی ضرورت ہمیشہ محسوس ہوتی ہے، بعینہٖ جیسے آسمان پر اُسے سورج یا قطب ستارے ایسے رہبروں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ صحرا کے تناظر میں اپنے "مقام" کا تعین کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مجوسی کلچر اور اس کے بعد اسلامی کلچر میں "فرد" پیدا ہوا جو معاشرے سے وابستہ بھی تھا اور آزاد بھی!
غزل کے اس شعر کی طرح جو پوری غزل سے وابستہ ہونے کے باوصف اپنی منفرد حیثیت میں ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی آئینہ ہو جاتی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں غزل ایسی صنفِ شعر کو کیوں فروغ ملا۔ بہر کیف فرد کی انفرادیت کی نمود مجوسی کلچر اور پھر اسلامی کلچر کا طرۂ امتیاز ہے (عرب کا باشندہ بنیادی طور پر انفرادیت پسند تھا اور ہے) اور یہی وصف مغربی کلچر کو بھی حاصل ہے کہ وہاں بھی فرد نے ہمیشہ اپنی انفرادیت کا تحفظ کیا ہے۔

مجوسی کلچر میں آسمان ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا اور اس میں جابجا "نشانیاں" تھیں مگر زمین پر ریت کے ٹیلوں کا لامتناہی سلسلہ سدا اپنی صورت بدلتا رہتا تھا۔ تاہم زمین پر دو "نشانیاں" مستقل نوعیت کی ہو گئیں۔ ایک کھجور، دوسرا اونٹ! اور ان دونوں نے مجوسی کلچر کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کیا مثلاً کھجور کی ہئیت کو مینار دسا نیز عربوں کے لباس کی مخصوص تراش خراش میں بآسانی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اونٹوں کی پوری قطار گزرتے ہوئے لمحات کے تسلسل کو سامنے لاتی ہے۔ چنانچہ مجوسی کلچر میں اگر زماں کا ایک حرکی تصور پیدا ہوا ہے تو اس کا نہایت گہرا تعلق کارواں کے سفر سے بھی ہے۔ کلاسیکی کلچر میں زماں کا تصور "اب" کے مرکزی نقطے کو عبور کرنے پر قادر نہیں تھا لیکن مجوسی کلچر میں پورے قبیلے کے مسلسل سفر نے زماں کے تینوں منطقوں کا احساس دلایا۔ چنانچہ حال کے علاوہ ماضی اور مستقبل سے بھی وابستگی پیدا ہوئی اور ان تینوں کے ازلی و ابدی تسلسل کا ادراک کیا گیا۔ جیسا کہ سب کو علم ہے، مجوسی کلچر میں شجرۂ نسب کی روایت نے جنم لیا جو ماضی سے رشتہ استوار کرنے ہی کی ایک کاوش تھی۔ (اونٹوں کی قطار سے اس کی مماثلت بھی قابلِ غور ہے) اس طرح اس کلچر کے تحت "قیامت" کے تصور کو رواج ملا جو تاریخ کی مستقبل بعید تک توسیع کا اعلامیہ تھا۔ واضح رہے کہ خود مجوسی کلچر اس قدیم ارضی تہذیب سے پھوٹا تھا جو کسی زمانے میں پورے افریشیا کی تہذیب تھی، مگر پھر جب موسمی تبدیلیوں کے باعث بڑے بڑے صحرا وجود میں آ گئے تو اس کے اثرات "زرخیز ہلال" کی تہذیبوں مثلاً سمیریا اور مصر وغیرہ میں تو برقرار رہے مگر باقی سارے خطے پر آوارہ خرام قبائل کا کلچر مسلط ہوتا چلا گیا۔ یہ نیا کلچر مجوسی تاریخ کے حرکی تصور سے فیض یاب اور فرد کی انفرادیت کے ظہور سے عبارت تھا۔

بحیثیت مجموعی مجوسی کلچر کی سطح تخلیقی تھی۔ وہ اس طرح کہ جو کلچر پوری طرح زمین سے وابستہ ہو جائے اس پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور ایک مادّی نقطۂ نظر اس قدر غالب آ جاتا ہے کہ وہ تخلیقی طور پر فعال نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہر وہ کلچر جو زمین سے خود کو پوری طرح منقطع کر لیتا ہے محض ہوا میں معلق ہونے کے باعث

یقی طور پر بانجھ ہو جاتا ہے۔ مجوسی کلچر کا امتیازی وصف یہ تھا کہ اس نے زمین اور جسم کی تطہیر پر زور دیا یعنی ارض کو آسمان سے ہم رشتہ کر دیا یہی فن کا طریق بھی
کہ وہ جسم کو اس کے بوجھ سے آزاد کر کے ارفع اور سبک اندام بنا دیتا ہے۔ مجوسی کلچر میں سے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کی نمود اس کے تخلیقی رُخ ہی کا کرشمہ تھا
رہی تخلیقی رُخ اسلامی کلچر میں بھی نمودار ہوا کیونکہ دونوں کی مرز بوم ایک ہی تھی۔ شپنگلر نے مجوسی کلچر کی اصل روح کو پیش نہیں کیا۔ یہ کام اقبال نے سرانجام دیا
ب انھوں نے مجوسی کلچر کے چھلکے کو تو مسترد کر دیا مگر اس کے مغز کو قبول کر لیا اور پھر دیکھا کہ یہی مغز اسلامی کلچر میں بھی موجود تھا۔ تب انھوں نے اس بات کا اظہا
یا کہ یورپی کلچر نے جس رُوح اور اس کی جہت کا مظاہرہ کیا تھا وہ اصلاً اسلامی کلچر ہی کی روح تھی۔ اس حوالے سے اقبال نے عقلی اور استقرائی رویے کو بھی
سلامی کلچر ہی کا ثمر قرار دیا اور کہا کہ یہی ثمر مسلمان مفکرین کے ذریعے یورپ تک پہنچا تھا اور پھر نشاۃ الثانیہ کے سلسلے میں ایک بہت بڑا محرک بن گیا تھا۔

بنام میجر شمس الدّین قریشی

میجر قریشی ریاست بہاولپور میں وزیر تعلیم تھے۔ اقبال نے یہ خط جامعہ ازہر سے آئے ہوئے مصری علماء کے ایک وفد کا ریاست کے لیے دورہ کرنے کی غرض سے وزیر تعلیم کو تحریر کیا تھا تاکہ تعلیمی معاملات کے لیے یہ وفد مفید ثابت ہو سکے۔
اس خط کا عکس پہلی بار روزگارِ فقیر حصہ دوم مطبوعہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔

لاہور ۲۱ فروری ۳۶ء

ڈیئر میجر صاحب ۔ علماے مصر (جامعہ ازہر) کا جو وفد بہاولپور آ رہا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

Egyptian Delegation
[illegible]

[illegible]

محمد اقبال

تارا چرن رستوگی
بیرباری، کوژلی ۱۶-۱۰۸۱ (آسام)

اقبال اور قادیانیت

یہ موضوع خاصا متنازعہ فقط اس لیے سمجھا جا رہا ہے کہ جناب اعجاز احمد نے جو اقبال کے بڑے بھائی کے فرزند رشید ہیں اپنی تصنیف مظلوم اقبال میں ایسے شواہد پیش کیے ہیں کہ بہتیرے مذہب زدگان جوابات باصواب نہیں دے سکے۔ میرے پیش نظر مظلوم اقبال نہیں ہے، حیدر آباد سمینار کے دوران (اپریل ۱۹۸۶ء) کتاب ہذا کی صرف ورق گردانی ہی کر سکا۔ لہٰذا میرے دماغ میں فقط ایک دھندلا دھندلا خاکہ ہی رہ گیا ہے۔ مزید برآں ایک کتاب اور اس موضوع سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کتاب ہے خدوخال اقبال جس کو امین زبیری نے ۱۹۵۵ء - ۱۹۶۲ء میں سپرد قلم کیا تھا، حسنِ اتفاق کہیے یا سوءِ اتفاق کتاب ھٰذا کا مسوّدہ مجھے دہلی میں دیکھنے کو مل گیا تھا۔ خدوخال اقبال کو ناشر کی تلاش تھی۔ امین زبیری صاحب ۸۶ سال کی عمر میں ۱۹۸۴ء کو انتقال فرما گئے۔ انیس جیلانی اور دیگر احباب کی مساعی جمیلہ سے یہ کتاب امین زبیری صاحب کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ یہ کتاب قابل اجتناب و تحقیر کیوں سمجھی جاتی ہے۔ عقل سلیم چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی مدعا کی منزل پر نہیں پہنچ سکتی۔ بہر کیف، کتاب مرحوم کے بعد شائع ہو گئی اور پاکستان میں شائع ہوئی حالاں کہ کتاب تک رسائی نہ ہو سکی مگر مجھے محتویات کا علم ہے۔

مذکورہ کتب رجال الاقبال میں خاصی قابل تکفیر سمجھی جاتی ہیں، رجال الاقبال سے میری مراد ان لوگوں سے ہے جو اقبال کے شعر و افکار کو مخصوص زاویہ دینے کے لیے بوجوہ سرگرم کار رہے ہیں۔ اردو تنقید کو فروغ پذیر ہونے ہی نہیں دیتے۔ انگریزی ادبیات جو بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے اور انگریزی زبان دنیا بھر میں رواں دواں بولی سمجھی جاتی ہے، اس کی تنقید میں منفی و مثبت ایسے مصطلحات کبھی تنقید کے ساتھ دیکھنے میں نہیں آتے مگر اردو میں اگر آپ تعریف و توصیف کرتے ہیں تو آپ کی تنقید مثبت قرار دی جائے گی ورنہ منفی دلائل کا اثر صرف ایسے لوگوں پر نہیں ہوتا جو افہام و تفہیم کو ضروری نہیں سمجھتے، ان کی بات پر ایمان بالغیب لانے ہی پر آپ اچھے تنقید نگار سمجھے جا سکتے ہیں۔

مظلوم اقبال اور خدوخال اقبال دراں حالاں کہ یہ دونوں کتابیں اقبالیات کے مطالعہ میں اہم کردار کی حامل نظر آتی ہیں اور ان سے کسی نہ کسی سطح پر رجوع کرنا ضروری سمجھتا ہوں بایں ہمہ اس مضمون میں ان دونوں تصنیفات سے صرف نظر کرتا ہوا میں درج ذیل چند باتوں پر توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔

پنجاب کے ایک صاحب جناب کنہیا لال گابا جو معروف بیرسٹر اور انگریزی مصنف تھے مشرف بہ اسلام کیے گئے اور ان کا اسلامی نام خالد لطیف گابا رکھا گیا۔ MOTHER INDIA کے جواب میں گابا صاحب کی تصنیف UNCLE SAM جواب باصواب قرار دی جا سکتی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد گابا صاحب دہلی آ گئے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں ان کی خود نوشت سوانح عمری FRIENDS & FOES کو انڈین بک کمپنی نے شائع کیا۔ نہ جانے کیوں میرے دماغ میں یہ خیال کئی بار ابھرا تھا کہ ہو نہ ہو کنہیا لال کو خالد لطیف کے نام نامی سے اقبال ہی نے نوازا ہوگا۔ سوانح عمری پڑھی، میرا خیال درست ثابت ہوا۔*

* ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۵، اسلامی نام اقبال ہی نے تجویز کیا تھا اور انہوں نے اقبال کی موجودگی ہی میں مذہب اسلام قبول کیا تھا

یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو (ص ۱۰۴) - گابا صاحب K.L.GABA - تھے اور یہیں رہے بھی - صفحہ ۲۲۱ پر گابا صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ اقبال نے اپنی وفات سے چند دن پیشتر یہ کہا تھا کہ قیام پاکستان مسلمانوں کو غیر مخلوط برکت ثابت نہ ہوگا - اقبال کی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں کا شکار تھی - انہوں نے ایک بہت نو عمر لڑکی سے شادی کر لی تھی - لہٰذا کچھ ازدواجی مسائل پیدا ہو گئے تھے ، نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اپنے بڑے ذہین لڑکے آفتاب اقبال سے نفرت کرنے لگے - آخر کار آفتاب اقبال کو عاق کر دیا - [ص: ۱۲۴]

آفتاب اقبال سے میرے کچھ تعلقات تھے - آفتاب نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے والد ماجد کو اپنی نئی بیوی پر شک پیدا ہو گیا تھا اور اسی شک سے مجبور ہو کر آفتاب کو گھر بدر کر دیا گیا - آفتاب کی تعلیم ہائی اسکول سطح تک قادیان ہی میں ہوئی تھی اور وہ آخر دم تک قادیانی خیالات ہی کا حامی اور علم بردار رہا - اقبال کے بڑے بھائی کے خاندان والے جو ہنوز قادیانی ہی ہیں آفتاب کی مدد کرتے رہے ، مزید براں دیگر سرگردہ قادیانیوں نے بھی استعانت سے گریز نہیں کیا - یہ بات اقبال کو بقول آفتاب گراں گذری اور وہ قادیانیوں سے بھی برہم ہو گئے - ملحوظ رہے ، علامہ اقبال کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد مثلاً علامہ کے بڑے بھائی کے خاندان کے افراد اور علامہ کا عاق شدہ لڑکا آفتاب اقبال بھی قادیانیت عقائد پر قائم رہے اور قائم ہیں - آفتاب اقبال نے یو - این - او سے ایک خط مجھے لکھا تھا جو میرے اس استفسار سے متعلق تھا کہ علامہ اقبال سے متعلق اچھی رائے نہ رکھنے کے باوجود نام کے ساتھ اقبال کیوں لکھتے ہو ، اور آفتاب کا جواب تھا گہرا طنز "اقبال ہی سے ابھرتا ہے ، اور میرے ساتھ روا رکھا گیا ناروا سلوک ہمیشہ اقبال کے پس منظر میں رہے گا" خط انگریزی میں تھا -

واقعات کی روشنی میں علامہ اقبال اسی زمانے سے قادیانیوں سے بدظن ہو گئے تھے یہ بات صاف طور پر واضح معلوم ہونے لگتی ہے -

اقبالیات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ علامہ کی ذہنی تربیت شمس العلماء سید میر حسن مرحوم کی رہین منت تھی - علامہ نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے ۔

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی ۔۔۔ رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی ۔۔۔ بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

سید میر حسن مرحوم ایک طرف سر سید کی تحریک کے روح رواں تھے تو دوسری طرف حضرت مرزا صاحب کے مداحوں میں تھے - علامہ اقبال کے نگارشات ملاحظہ ہوں -

" AMONGST THE PRESENT MUSLIMS OF THE SUB CONTINENT, MIRZA GHULAM AHMED QADIANI IS THE GREATEST RELIGIOUS THINKER" -------(INDIAN ANTIQUARY SEPT. 1900)

علیگڈھ کالج میں اقبال نے ۱۹۱۱ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

"میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالم گیر ذات نے ڈالا ہے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت پیش نظر رکھیں ۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں "

[ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، مطبوعہ ۱۹۱۹ء]

"مرزائیوں کا یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک فانی انسان کی مانند جام مرگ نوش فرما چکے ہیں ، نیز یہ کہ ان کے دوبارہ ظہور کا مقصد یہ ہے کہ روحانی اعتبار سے ان کا ایک مثیل پیدا ہو گا کسی حد تک معقولیت کا پہلو لیے ہوئے ہے "

[اخبار مجاہد، لاہور ۱۳ر فروری ۱۹۳۵ء]

جہاں تک میں نے اس تحریک کے منشاء کو سمجھا ہے احمدیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح کی موت ایک عام فانی انسان کی موت تھی اور رجعت مسیح گویا ایسے شخص کی آمد ہے جو روحانی حیثیت سے اس کا مشابہ ہے اس خیال سے اس تحریک پر ایک طرح کا عقلی رنگ چڑھ جاتا ہے۔"

[رسالہ علامہ اقبال کا پیغام ملت اسلامیہ کے نام ص ۲۲-۲۳]

جماعت احمدیہ عقائد میں ایک مرکزی عقیدہ یہ بھی ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ زندہ نبی ہیں اور ان کی روحانی تجلیات سے دنیا ہمیشہ منور ہوتی رہے گی۔ مسیح موعود کی بعثت مسیح کی ذاتی بعثت نہ ہوتی، بلکہ وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت ثانیہ بشکل بُروز ہوگی۔ علامہ اقبال کو یہ عقیدہ معقول نظر آتا تھا اور انہوں نے اس سلسلے میں ایک مکتوب مورخہ ۱۹ر جون ۱۹۱۶ء میں لکھا:

"کاش کہ مولانا نظامی کی دعا اس زمانہ میں مقبول ہو اور رسول اللہ ﷺ پھر تشریف لائیں اور ہندی مسلمانوں پر اپنا دین بے نقاب کریں۔" [مکاتیب اقبال حصہ اوّل ص ۴۱]

اسی سلسلے میں علامہ کا مکتوب مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۲۲ء توجہ طلب ہے:

"حال کے ہیئت داں کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے۔ اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بُروز لازم آتا ہے۔"

[مکاتیب اقبال حصہ اوّل ص ۱۱۷]

لاہور کے مولانا محمد علی کی تصنیف THE RELIGION OF ISLAM, بہت مقبول ہوئی۔ محمد مرماڈوک پکتھال، جسٹس عبدالرشید، شیخ عبدالقادر، علامہ اقبال نیز دیگر صدہا دانش وروں نے مولانا محمد علی کی کاوش کو سراہا۔ ملاحظہ ہوں ڈاکٹر محمد اقبال کے الفاظ:

I HAVE GLANCED THROUGH PARTS OF IT AND FIND IT AN EXTREMELY USEFULL WORK, ALMOST INDISPENSABLE TO THE STUDENTS OF ISLAM (LETTER DT. FEB. 2, 1936)

جب سعد اللہ لدھیانوی نے حضرت مرزا غلام احمدؑ کے خلاف ایک دشنام آگیں نظم کہی تو علامہ اقبال نے ایک طویل نظم کہی جو آئینہ حق نما [ص ۱۰۷] میں مشمول ہے، چند اشعار یہ تھے

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی	خوب ہوگی شہروں میں قدر دانی آپ کی
آفتابِ صدق کی گرمی سے گھبراؤ نہیں	حضرتِ شیطاں کریں گے سائبانی آپ کی
بات رہ جاتی ہے دنیا میں نہیں رہتا ہے وقت	آپ کو نادم کرے گی بدزبانی آپ کی
قوم عیسائی کے بھائی بن گئے پگڑی بدل	واہ کیا اسلام پر ہے مہربانی آپ کی

ملحوظ رہے، علامہ ایف، اے کلاس کے طالب علم تھے۔

روزنامہ نوائے وقت، ۱۵ر نومبر ۱۹۵۳ء کے مطابق منیر ٹریبونل کے سامنے شہادت دیتے ہوئے مولوی غلام محی الدین خاں قصوری نے کہا: "مسٹر محمد اقبال نے بھی پانچ سال بعد ۱۸۹۷ء میں حضرت مسیح موعود کی بیعت کر لی تھی۔" ملحوظ رہے علامہ کے والد مرحوم اور علامہ کے برادر اکبر پہلے ہی بیعت کر چکے تھے۔

ڈاکٹر محمد حسین لاہور کے مشہور معالج اقبال کے دوست، ڈاکٹر صاحب احمدیہ تھے اور انہوں نے ہزاروں روپے جماعت احمدیہ لاہور کو دیے۔ ڈاکٹر صاحب احمدیہ جماعت کے سرگرم معاون رہے تھے۔

۱۹۳۲ء میں چودھری محمد احسن صاحب کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبال نے منجملہ دیگر امور تحریک احمدیت پر قدرے روشنی ڈالنے کی غرض سے لکھا کہ:

باقی رہی تحریک احمدیت، سو میرے نزدیک لاہور کی جماعت میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کو میں غیرت مند مسلمان جانتا ہوں اور ان کی مساعی میں ان کا ہمدرد ہوں ۔۔۔ اشاعتِ اسلام کا جوش جوان کی جماعت کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے قابلِ قدر ہے ۔۔۔۔"

[ص ۲۳۰ مکاتیب اقبال حصہ دوم، مکتوب بنام چودھری محمد احسن]
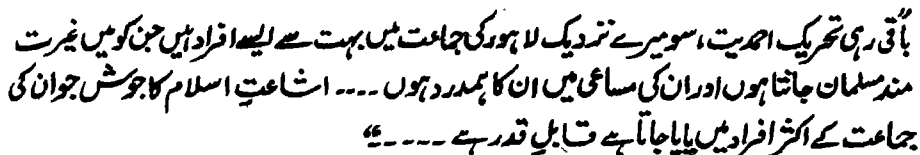
ذکر اقبال، مظلوم اقبال، خدوخال اقبال وغیرہ تصانیف میں احمدیہ فرقہ سے اقبال کے نزدیکی تعلقات اور متعدد بار علامہ اقبال نے ان کے سرکردہ اراکین سے رجوع کرنے کے متعلقات کو اس مضمون میں شامل نہیں کیا گیا ہے ۔ آخری تجزیہ پیش کرنے کے پیشتر علامہ مرحوم کے وصیت نامہ پر ایک نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

اپنی گرتی صحت کے پیش نظر علامہ اقبال نے ایک دستاویز ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو تیار کی، جس میں علامہ نے اپنے فرزند جاوید اقبال کو بھی وصیت کی، جو درج ذیل ہے :

"جاوید کو میری عام وصیت یہی ہے کہ وہ ۔۔۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ہمیشہ خوش گوار تعلقات رکھے میرے بڑے بھائی کی اولاد سب اس سے بڑی ہے ان کا احترام کرے ۔۔۔ مدد کی ضرورت ہو اور اس میں مدد کی توفیق ہو تو اس سے کبھی دریغ نہ کرے ۔۔۔ ان کا ہمیشہ احترام ملحوظ رکھے اور ان سے اپنے معاملات میں مشورہ لیا کرے ۔۔۔۔۔۔"

[ص ص ۵۶ - ۵۹ فقیر سید وحید الدین : روزگارِ فقیر]

ملحوظ رہے، علامہ اپنے برادرِ اکبر کے فرزند رشید اعجاز احمد [جو ابھی حیات ہیں] سے محبت و شفقت سے پیش آتے تھے ۔ علامہ اقبال کی معتدبہ نگارشات اعجاز صاحب ہی کی مہربانی سے دستیاب ہوئی ہیں ۔ اعجاز صاحب احمدیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور علامہ کو اس حقیقت کا علم تھا ہی لہٰذا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ علامہ اقبال احمدیہ لاہوری جماعت کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے ۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے بیان کے جواب میں جو کچھ اقبال نے لکھا اس کو مطالعہ میں لانا بیکار محض ہے۔ علامہ کی ہمدردیاں مضمرات ذہنی سے بالاتر تھیں تاویلات کے دروازے البتہ کبھی بند نہیں ہوتے ۔ ❁

بنام شیخ اکرام الحق سلیم

شیخ سلیم ملتان کے رہنے والے تھے انھوں نے اقبال کے ایک انگریزی مقالے SELF IN THE LIGHT OF RELATIVITY [مطبوعہ کریسنٹ، اسلامیہ کالج لاہور ۱۹۲۵ء] کا اردو ترجمہ کیا اور ماہنامہ "معارف" کو اشاعت کے لیے ارسال کیا تھا ۔ "معارف" کے مدیر سید سلیمان ندوی نے اس مضمون کو اقبال کے ملاحظے کے لیے بھیج دیا ۔ مضمون کی اشاعت میں تاخیر کے سبب مترجم نے بطور استفسار اقبال کو خط لکھا تھا جس کے جواب میں اقبال نے یہ خط تحریر کیا ۔

اس خط کا عکس اور متن بشیر احمد ڈار نے اپنے مقالے "اقبال پر نیا مواد" مطبوعہ "اقبال ریویو" جنوری ۱۹۷۰ء میں شائع کیا ۔

مخلص محمد اقبال ۔ لاہور

اعجاز احمد

*

علامہ اقبالؒ اور احمدیت

اپنی حیات کے آخری تین چار سالوں میں چچا جان نے احمدیت کے خلاف جو محاذ کھڑا کیا اس کی ابتدا مئی ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب احمدیت کے متعلق ان کا ایک بیان پہلے اردو روزناموں "زمیندار" اور "احسان" میں اور پھر انگریزی روزنامہ سٹیٹسمین میں ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو شائع ہوا (۱) بیان کا ماحصل یہ تھا کہ چونکہ احمدی سرکارِ دوعالمؐ کے بعد ختمِ نبوت کے قائل نہیں اس لئے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس جماعت کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ یہ مطالبہ عجیب تھا کہ سٹیٹسمین کے ایڈیٹر نے اپنے اداریے میں اس پر تنقید کی۔ بعد ازاں پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس پر تین تنقیدی مضامین رسالہ ماڈرن ریویو کلکتہ میں شائع کئے۔ معلوم ہوتا ہے ان مضامین سے علامہ اور برافروختہ ہوئے۔ نہرو کی تنقید سے انہیں احمدی کانگرسی سیاسی گٹھ جوڑ کا شبہ ہوا جو بے بنیاد تھا۔ انہوں نے پہلے سٹیٹسمین کے اداریے کے جواب میں ان کو ایک خط لکھا (۲) اور پنڈت نہرو کے جواب میں بھی ایک مفصل وضاحتی بیان میں اپنے پہلے بیان کا اعادہ کیا (۳) ان سب تحریروں کا لب لباب وہی تھا جو پہلے بیان کیا گیا ہے۔

احمدیوں کے متعلق ان کے تکفیری بیانات کو مسلمانوں کے سنجیدہ حلقوں میں بھی تعجب سے پڑھا گیا۔ اول اس لئے کہ چچا جان تو علماؤں کے شغل تکفیر بازی کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ خود بھی اس اوچھے اور کثرتِ استعمال سے کند شدہ ہتھیار سے گھائل ہو چکے تھے۔ دوسرے اس لئے کہ احمدیوں کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے اختلاف کے باوجود علامہ عمر بھر اپنے قول و فعل سے احمدیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کرتے رہے تھے اور مئی ۱۹۳۵ء سے قبل انہوں نے کبھی احمدیت کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس وقت تک بانی سلسلہ احمدیہ اور ان کے دو جانشینوں کے متعلق ان کی رائے عقیدت مندانہ رہی تھی۔ اس دعوے کی تائید حسب ذیل باتوں سے ہوتی ہے۔

(۱) ۱۹۰۰ء میں جب وہ اورینٹل کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ ان کا ایک مضمون بمبئی کے انگریزی زبان کے رسالہ انڈین اینٹی کوئری میں شائع ہوا جس میں انہوں نے بانی سلسلہ احمدیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا (۴)

"M GHULAM AHMED OF QADIAN, PROBABLY THE PROFOUNDEST THEOLOGIAN AMONG MODERN INDIAN MUHAMMADENS"

(مرزا غلام احمد قادیانی موجودہ دور کے ہندی مسلمانوں میں غالباً سب سے بڑے دینی مفکر)

(۲) ۱۹۰۲ء میں جب ان کو بعض فقہی مسائل پر رائے درکار ہوئی شہر کے علما و فقہا کو چھوڑ کر بانی سلسلہ احمدیہ کے پہلے جانشین حضرت (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) سے رجوع کیا۔ علامہ کو جن سوالات پر رائے ... اور حضرت مولانا کے جوابات انہیں دنوں سلسلہ احمدیہ کے اخبارات میں ش...

(۳) ۱۹۱۰ء کے آغاز میں انہوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا جو "ملّت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے "خوب ایجنسی لاہور" نے ایک دیدہ زیب ... کیا۔ اس تقریر کا یہ اردو ترجمہ مئی ۱۹۱۱ء میں مولانا ظفر علی خاں نے ... ہال لاہور میں ایک جلسہ عام میں پڑھ کر سنایا جس میں علامہ اقبال ... تقریر میں علامہ نے جماعت احمدیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔" (۵)

(۴) یہ اسی رائے کا نتیجہ ہوگا کہ انہی دنوں علامہ نے اپنے بڑے ... مرحوم کو جو سیالکوٹ کے ایک مشن سکول میں تعلیم پا رہے تھے قادیان کے تعلیم الاسلام سکول میں داخل کرایا۔

(۵) ۱۹۰۹ء میں چچا جان کو ایک ذاتی معاملہ میں شرعی فتوے کی ضرورت ... دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر کو قادیان بھیجا کہ بانی سلسلہ احمدیہ کے ... حکیم نورالدین (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) سے مسئلہ دریافت کریں جو مشورہ دیا علامہ نے اس پر عمل کیا۔ اس اجمال کی تفصیل ... میں درج ہے (۶)

(۶) مارچ ۱۹۲۷ء میں بانی سلسلہ احمدیہ کے دوسرے جانشین مرزا بشیر الدین محمود احمد (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) کا ایک لیکچر مذہب ... پر علامہ اقبال کے زیرِ صدارت لاہور میں ہوا۔ لیکچر کے بعد صدارتی خطاب میں فرمایا: "ایسی پُر از معلومات تقریر بہت عرصہ بعد لاہور میں سننے میں آئی ... جو قرآن کریم کی آیات سے مرزا صاحب نے استنباط کیا ہے وہ نہایت ... مجھے اس تقریر سے جو لذت حاصل ہو رہی ہے وہ زائل نہ ہو جائے ... کو ختم کرتا ہوں۔"

(۷) ۵ ستمبر ۱۹۳۰ء کو علامہ نے جماعت احمدیہ کے امام حضرت محمود احمد (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) کے سیکرٹری کو ایک خط میں لکھا:

"چونکہ آپ کی جماعت منظم ہے اور نیز بہت سے متعدد آدمی ایسی جماعت میں موجود ہیں اس واسطے آپ بہت مفید کام مسلمانوں کے لئے انجام دے سکیں گے۔" (۹)

(۸) کشمیر کے مسلمان ڈوگرہ راج کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ آزادی کشمیر کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ وسط ۱۹۳۱ء میں مسلمانان سرینگر کے پرامن اور نہتے مجمع کو ریاستی حکام نے گولیوں کا نشانہ بنا کر مسلمانان ریاست کی بے کسی اور مظلومیت انتہا تک پہنچا دی۔ جماعت احمدیہ کے اس وقت کے امام نے پنجاب اور ہندوستان کے سرکردہ مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی اور درخواست کی کہ وہ جمع ہو کر کشمیر کے معاملہ پر غور کریں چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو نواب ذوالفقار علی خاں کی کوٹھی واقع شملہ میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں علامہ اقبال اور ہندوستان کے بہت سے مسلم اکابرین شامل ہوئے۔ طے پایا کہ ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی جائے جو تحریک آزادی کشمیر کے سارے کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ جو اکابرین اجلاس میں موجود تھے۔ سب نے کمیٹی کا رکن بننا منظور کیا۔ علامہ اقبال نے تجویز کیا کہ جماعت احمدیہ کے امام اس کمیٹی کے صدر ہوں کیونکہ ان کے پاس مخلص اور کام کرنے والے کارکن بھی ہیں اور وسائل بھی۔ امام جماعت احمدیہ نے اپنے اور اپنی جماعت کے تعاون کا یقین دلایا لیکن کمیٹی کی صدارت قبول کرنے سے معذرت ظاہر کی۔ لیکن علامہ اور دوسرے اکابرین کے اصرار پر صدارت قبول کر لی۔ کچھ دنوں بعد علامہ نے ایک خط میں امام جماعت احمدیہ کو لکھا کہ "کشمیر کے متعلق آپ کی کوششیں یقین ہے بار آور ہوں گی۔ مگر ذرا ہمت سے کام لیجئے اور اس معاملہ کو انجام تک پہنچائیے۔" اسی خط میں مشورہ دیا "اس تجویز کی بجائے یہ کیجئے کہ تین معززین کا وفد جس میں ایک آپ ہوں انگلستان جائے اور وہاں صرف دو ماہ قیام کرے اور انگریزوں اور پارلیمنٹ کو کشمیر کی تاریخ اور موجودہ حالات سے آگاہ کرے۔ اس پر زیادہ سے زیادہ آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہوگا اور نتائج بے انتہا خوشگوار ہوں گے۔" (۱۰)

(۹) ۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن تشریف لے گئے۔ احمدیہ مسجد لندن کے امام مولانا فرزند علی مرحوم نے علامہ اقبال اور بعض دوسرے اکابرین کو مسجد میں ایک تقریب میں شمولیت کی دعوت دی۔ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب" لاہور بھی ان دنوں لندن میں تھے۔ وہ بھی اس تقریب میں شامل ہوئے۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں جو "انقلاب" لاہور میں شائع ہوا لکھا:

"علامہ اقبال لندن کے قیام کے دوران میں احمدیہ مسجد لندن کی ایک تقریب میں شامل ہوئے جہاں نومسلم انگریزوں کی زبان سے قرآن مجید سن کر خوش ہوئے۔ اور خصوصاً ایک انگریز نوجوان مسٹر عبدالرحمٰن ہارڈی کے حسن قرأت اور صحیح تلفظ سے بے حد محظوظ ہوئے۔ ایک چھ سال کی انگریز بچی نے سورۃ فاتحہ سنائی جس پر علامہ نے اسے ایک پاؤنڈ انعام دیا اور امام مسجد لندن مولوی فرزند علی صاحب کا شکریہ ادا کیا جن کی توجہ سے یہ موقع میسر آیا۔" (۱۱)

(۱۰) ۱۹۳۲ء میں ایک صاحب چوہدری محمد احسن کے نام اپنے خط میں علامہ اقبال نے لکھا:

"اشاعت اسلام کا جوش جو ان (بانی سلسلہ احمدیہ۔ ناقل) کی جماعت کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے قابل قدر ہے۔" (۱۲)

(۱۱) علامہ اقبال کئی سال انجمن حمایت اسلام لاہور کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے اور کچھ عرصہ انجمن کے صدر بھی رہے۔ دو ایک احمدی بھی مجلس انتظامیہ کے رکن ہوتے تھے۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں احمدی مقررین بھی تقریریں کرتے تھے۔ محاذ آرائی سے پہلے علامہ نے کبھی اس پر اعتراض نہ کیا۔ اسی طرح مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں احمدیوں کی شمولیت پر علامہ کی طرف سے کبھی اعتراض نہ ہوا۔ بلکہ ایک سال تو چوہدری ظفر اللہ خاں احمدی لیگ کے صدر بھی رہے۔ لیکن علامہ کی طرف سے کوئی احتجاج نہیں ہوا۔

(۱۲) پنجاب کونسل کے انتخاب میں چوہدری ظفر اللہ خاں ایک مسلم حلقے سے منتخب ہوئے۔ علامہ بھی لاہور سے منتخب ہوئے اور دونوں یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ علامہ اقبال کی طرف سے چوہدری صاحب کے ایک مسلم حلقہ سے منتخب ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔

مندرجہ بالا حقائق اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ۱۹۳۵ء کے آغاز تک علامہ اقبال کے نزدیک احمدی دائرہ اسلام سے خارج نہ تھے۔ مسلمانوں کے مفاد کی نگہداشت کی تحریکوں میں وہ نہ صرف ان سے تعاون کرتے تھے بلکہ تحریک آزادی کشمیر میں جماعت احمدیہ کے امام کو تحریک کی قیادت بہ اصرار سونپی تھی۔ ان دنوں تو تعصب ضرور دور دورہ ہے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب تعصب کی گھٹا چھٹ جائے گی اور محقق حضرات ضرور اس بات کی چھان بین کریں گے کہ احمدی جماعت جو بقول علامہ اقبال "اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ تھی" ۱۹۳۵ء میں ایکا ایکی کیوں علامہ کی رائے میں دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہو گئی۔ ایسی تحقیق کے نتیجے میں انہیں معلوم ہوگا کہ احمدیت کے متعلق علامہ کی رائے میں تبدیلی جس کے لئے شاید تعجب ماہیت کا لفظ زیادہ موزوں ہو کی وجہ کانگریس احرار سازش کے تحت احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ سازشیوں کی خوش قسمتی سے انہی دنوں ایک ذاتی معاملہ میں علامہ کا احساس محرومی بھی شامل ہو گیا جس کی وجہ سے احمدیت کے خلاف ان کے بیانات میں وہ شدت اور تلخی در آئی جو عام طور پر اُن کے شیوہ کے مطابق نہ تھی۔ آئندہ کے تحقیق کرنے والوں کی راہنمائی کے لئے مختصراً کچھ اشارات درج کئے جاتے ہیں۔

کشمیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی چلانے کے لئے ہندوستان کے مسلم اکابرین کے ایک اجتماع میں ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کئے جانے اور اس کی قیادت جماعت احمدیہ کے سپرد کئے جانے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کمیٹی کی مساعی سے تھوڑے ہی وقت میں کشمیری مسلمانوں کی تحریک آزادی میں جان پڑ گئی۔ اس صورت حال نے کشمیر کے ہندو مہاراجہ اور ہندوستان کی ہندو نواز کانگریس دونوں کو پریشان کر دیا۔ تحریک کو سبوتاژ کرنے کے لئے کانگریس نے اپنی باجگزار مجلس احرار کو آلۂ کار بنایا۔ باخبر حلقوں کا تو اُن دنوں بھی خیال تھا کہ تحریک آزادی کشمیر کو سبوتاژ کرنے کی احراری سازش سے پردہ اٹھا تو اُس میں کچھ کانگریسی پردہ نشینوں کے بھی نام آئیں گے۔ چنانچہ اس کا ثبوت اب احرار کی ایک کتاب "رئیس الاحرار" سے ملتا ہے۔ اس میں احراری لیڈر حبیب الرحمٰن لدھیانوی لکھتے ہیں:

"ہم نے موجودہ کشمیر کمیٹی (جس کے سربراہ جماعت احمدیہ کے امام تھے۔ ناقل) کی سیاسی سازش۔ ڈاکٹر اقبال کی کشمیر کمیٹی میں شمولیت سر فضل حسین کی سرپرستی اور انگریزی حکومت کی مداخلت۔ فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں مولانا آزاد سے تفصیلی گفتگو کی تو مولانا آزاد نے سب باتیں سن کر کہا کہ احرار کو فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے مسئلہ کشمیر کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے" (۱۳) گویا احرار کو تحریک آزادی کشمیر کو

سبوتاژ کرنے کی مہم کے لئے مارچنگ آرڈر کانگریس کے مولانا آزاد سے ملے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے معاوضہ بھی وہیں سے ملے ہوں گے۔ ان مارچنگ آرڈر کی تعمیل کے متعلق حبیب الرحمان لدھیانوی لکھتے ہیں: "احرار رہنماؤں نے محسوس کیا کہ کشمیر کمیٹی کی وجہ سے تمام مسلمان مرزائی اور قادیانی ہو جائیں گے۔ ہندو مسلم اتحاد کو سخت دھکا لگے گا۔ مولانا مظہر علی نے مسئلہ کشمیر میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔" (۱۶) اعلان تو کر دیا لیکن احرار اپنی کانگریس نوازی کی وجہ سے مسلمانوں میں اپنی ساکھ کھو چکے تھے۔ اس لئے کوئی انہیں گھاس نہ ڈالتا تھا۔ احراریوں کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ علامہ اقبال جنہیں مسلم عوام میں بڑی مقبولیت حاصل تھی کشمیر کمیٹی سے وابستہ تھے۔ تحریک کشمیر کی قیادت سے جماعت احمدیہ کے امام کو ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے علامہ کو احمدیوں سے برگشتہ کرنا ضروری تھا۔ احراری لیڈروں کی فراست کی داد دینا پڑتی ہے انہوں نے جھٹ توپ ہوا کھڑا کیا کہ احمدی کشمیر میں اپنے مخصوص عقائد کی تبلیغ کر رہے ہیں اور اگر تحریک کشمیر کی قیادت اس جماعت کے امام کے پاس رہی تو کشمیر کے تمام مسلمان مرزائی ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ احراریوں کو اور کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اس کی تفاصیل خود احراریوں کی زبانی سنئے۔

مفکر احرار چودھری افضل حق اپنی تصنیف تاریخ احرار میں لکھتے ہیں:

"اس دوران میں کشمیر پھر دیار گریہ بن گیا۔ سرینگر کے خون شہداء کے باعث کربلا کی سی صورت پیش کی۔ ابھی جاری (یعنی احرار کی۔ ناقل) سست فکری کسی منزل پر نہ پہنچی تھی کہ کچھ عافیت کوش مسلمان شمع کی جانب پروانوں کی طرح گرے (آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے قیام کی طرف اشارہ ہے۔ ناقل)۔ ان خانہ برباد رؤسا اور امراء (یہ اشارہ ہندوستان کے ان اکابرین بشمول علامہ اقبال کی طرف ہے جو شملہ کانفرنس میں شامل تھے۔ ناقل) نے یہ غضب ڈھایا کہ مرزا بشیر محمود کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ جمعیت العلماء نے ستم یہ کیا کہ اس کشمیر کمیٹی سے تعاون کا اعلان کر دیا۔" (۱۵)

تحریک آزادی کشمیر کو کامیاب بنانے کے خیال سے سکندر حیات خان نے کوشش کی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی اور احرار میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے اپنے مکان پر ایک میٹنگ کی جس میں علاوہ اور حضرات کے امام جماعت احمدیہ بطور صدر آل انڈیا کشمیر کمیٹی اور چودھری افضل حق بطور نمائندہ مجلس احرار شامل ہوئے۔ باتوں باتوں میں چودھری افضل حق تو تاؤ میں آ گئے وہ اپنی تصنیف "تاریخ احرار" میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میں نے کہا مرزا صاحب! کوئی الیکشن ایسا نہیں گزرا جس میں مرزائیوں نے میرے خلاف ایڑی چوٹی کا زور نہ لگایا ہو ...... ہمارا بھی خدا کے فضل سے فیصلہ ہے کہ اس جماعت کو مٹا کے چھوڑیں گے۔" (۲۰)

گویا کشمیر کے مسلمانوں کی امداد کو پس پشت ڈالتے ہوئے احرار کا اولین مشن یہ قرار پایا کہ چونکہ جماعت احمدیہ نے الیکشن میں چودھری افضل حق کی مخالفت کی ہے اس لئے اس جماعت کو مٹا دیا جائے اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تخریب کر کے تحریک کشمیر اپنے ہاتھ میں لی جائے۔ چونکہ علامہ اقبال کو عوام مسلمانوں میں مقبولیت حاصل تھی اور وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں شامل تھے۔ اس لئے احرار کے نزدیک یہ ضروری ہوا کہ کسی طرح علامہ اقبال اور جماعت احمدیہ کے تعاون میں رخنہ اندازی کی جائے۔ اس غرض کو حاصل کرنے کے لئے پہلے تو اپنی روایتی شورہ پشتی سے علامہ کو ڈرانے کی کوشش کی گئی۔ علامہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ مارچ ۱۹۳۲ء کے آخری ہفتہ میں کانفرنس کا اجلاس ہوا پہلے دن خطبہ صدارت میں کشمیر کمیٹی کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا: "جہاں تک ہے مجھے ان واقعات کے تاریخی پس منظر میں جانے کی ضرورت نہیں جو حال میں رونما ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کا دفعتاً جاگ اٹھنا جس میں شعلہ خودی بجھ چکا ہو کے باوجود ان کے لئے مسرت کا باعث ہے۔" (۱۷)

دوسرے دن جب علامہ کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تو احراریوں نے علامہ کے پنڈال میں داخل ہوتے ہی جس غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا اس کا حال "انڈین اینول ریکارڈ" میں ان الفاظ میں محفوظ ہے۔

"آل انڈیا مسلم کانفرنس کا دوسرا دن"

آج کانفرنس کا آخری اجلاس شورہ پشتی کے مظاہروں کی نذر ہو گیا۔ کی کارروائی دو گھنٹے تاخیر سے شروع ہوئی اور جونہی سر محمد اقبال پنڈال میں داخل ہوئے ان کے ساتھ احراریوں کے ایک بڑے گروہ نے بھی داخل ہونے کی کوشش کی مگر روک دیا گیا۔ اس پر کانفرنس کے والنٹیئروں اور احراریوں میں گیٹ پر باقاعدہ رسہ کشی ہوئی۔ جس کے نتیجے میں باہم لاٹھیاں چلیں اور خشت باری ہوئی۔ بالآخر پولیس نے آ کر مظاہرین کو منتشر کر دیا۔ لیکن جونہی پولیس ہٹی شورہ پشتی پھر شروع ہو گئی۔ کانفرنس کی کارروائی بغیر کسی بحث و تقاریر کے جلد جلد ریزولیشن پاس کرنے میں تبدیل ہو گئی اور تمام ریزولیشن انتہائی عجلت کے ساتھ اس صورت حال میں پاس ہوئے کہ پنڈال کے باہر مجمع (احراریوں کا۔ ناقل) پنڈال میں بزور داخل ہونے کے لئے مختلف انواع نعرے لگا رہا تھا۔" (۱۸)

علامہ کے خلاف شورہ پشتی کے اس مظاہرے کے بعد جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام مسلمانوں میں آپ کی مقبولیت کے باوجود آپ پر خشت باری کی جا سکتی ہے۔ احرار نے ان سے مفاہمت کی طرح ڈالی۔ احرار کے ایک مؤرخ نے اس کا ذیل انکشاف کیا ہے۔

"حضرت امیر شریعت (جناب سید عطاء اللہ شاہ بخاری) ڈاکٹر اقبال سے ملے۔ ڈاکٹر اقبال حضرت شاہ صاحب کو پیر جی کہا کرتے تھے۔ کشمیر کمیٹی کے مسئلہ پر دونوں کے درمیان چودھری افضل حق کی معیت میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ بشیر الدین محمود احمد اور عبد الرحیم درد کو اکران کی موجودہ ذمہ داری سے نہ ہٹایا گیا تو کشمیر کے ۳۲ لاکھ مظلوم مسلمان کفر و ارتداد کا شکار ہو جائیں گے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ آزادی کشمیر کی باگ ڈور مجلس احرار کے سپرد کر دی جائے۔" (۱۹)

احرار کی خوش قسمتی سے انہیں دنوں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے احرار کی جماعت سے کشیدہ کرنے میں احرار کی مدد کی۔ سر فضل حسین وائسرائے کی کونسل کے رکن جون ۱۹۳۲ء سے چار ماہ کی رخصت پر جانے والے تھے ان کی جگہ کے لئے علامہ کا نام بھی لیا جا رہا تھا لیکن حکومت برطانیہ نے چودھری ظفر اللہ خان احمدی کو مقرر کر دیا۔

چودھری افضل حق اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی علامہ اقبال سے ملاقاتوں میں جو فیصلہ کیا گیا اس کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں ۴ مئی ۱۹۳۳ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ایک خبر شائع کرائی گئی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے بعض اراکین نے کمیٹی کو ایک درخواست بھیجی ہے کہ آئندہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر قادیانی ہونا چاہئے۔ اس خبر کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال اور دس اراکین کشمیر کمیٹی کے دستخطوں

کشمیر کمیٹی (امام جماعت احمدیہ) کو ایک خط لکھ کر پندرہ دنوں کے اندر کشمیر کمیٹی کا اجلاس عہدہ داران کمیٹی کے انتخاب کے لئے بلایا جائے۔ اگرچہ کمیٹی کے بعض اراکین نے صدر کمیٹی کو آگاہ کیا کہ یہ آپ کو صدارت سے علیحدہ کرنے کے لئے ایک چال ہے اس لئے فی الحال آپ اجلاس نہ بلائیں لیکن امام جماعت احمدیہ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور ۷ مئی ۱۹۳۳ء کو کمیٹی کا ایک ہنگامی اجلاس بلایا اور انتخاب کے لئے راستہ صاف کرنے کی غرض سے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا جس پر علامہ اقبال کو اُن کی جگہ عارضی صدر منتخب کیا گیا۔

احرار کے جماعت احمدیہ کے امام کو اس چال سے کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علیحدہ کرنے کا ردِ عمل کشمیر میں کیا ہوا اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ مسلمانانِ کشمیر کے لیڈروں مثلاً شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد، چودھری غلام عباس، خواجہ غلام نبی گلکار وغیرہ نے امام جماعت احمدیہ کے استعفیٰ پر اپنے رنج کا اظہار کیا اور اپنے پیغامات میں خواہش کی کہ امام جماعت احمدیہ تحریک آزادیٔ کشمیر میں اپنی دلچسپی جاری رکھیں۔ کشمیر کے مختلف علاقوں کے اکابرین نے بھی تحریراً اسی خواہش کا اظہار کیا۔ امام جماعت احمدیہ نے سب کو یقین دلایا کہ کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کے باوجود وہ اور ان کی جماعت کشمیر کی تحریک آزادی میں ہر طرح حصہ لیتی رہے گی اور اس وعدہ کا ایفا بھی کیا (۲۰)

احرار کے امیرِ شریعت اور مفکرِ احرار کی علامہ اقبال کے ساتھ کئی ملاقاتوں کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ علامہ احرار کی تنظیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ اس کا اعتراف خود مفکرِ احرار چودھری افضل حق نے ان الفاظ میں کیا ہے :-

"میں اس پیدا شدہ صورتِ حال سے گھبرا گیا اور لاہور پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا داؤد غزنوی تانگے پر سوار پریشان جا رہے ہیں۔ پوچھا کدھر کا عزم ہے۔ کہا کہ مرزا کی قیادت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوگی میں شہر کے علماء سے مل کر ان کی قیادت کے خلاف اعلان کرانا چاہتا ہوں۔

.... اُسی دن یا اگلے دن علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں حبیبیہ ہال میں عمائدینِ شہر کا جلسہ تھا جس میں کشمیر کی اوس پڑی قسمت زیرِ غور تھی۔ مولانا ظفر علی۔ غالباً مولانا داؤد غزنوی بھی اور میں بھی محمد ہال گئے۔ خیال یہ تھا کہ کوئی تدبیر کر کے مرزا بشیر کی کمیٹی کے مقابلے میں احرار کے حق میں ان لوگوں کی تائید حاصل کی جائے۔ باقی حاضرین طبقۂ اعلیٰ سے متعلق تھے۔ وہ احرار کے نام پر حقارت سے منہ بسورتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب احرار کو آگے بڑھانے پر بضد تھے۔ بہرحال ہم بہ ندری و بہ زاری اُن کا اعلان اپنے حق میں کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ بس تھوڑی سی کھڑے ہونے کو جگہ مل گئی۔ بیٹھنے اور پاؤں پسار کر ساری جگہ پر قبضہ کرنے کے لئے بہت وقت درکار تھا۔" (۲۱) مزید لکھتے ہیں:- "علامہ سر اقبال کشمیر کمیٹی کے فرد ممبر ہو گئے تھے لیکن یہ کیفیت اضطراری تھی۔ وہ فوراً الگ ہو کر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں لگ گئے اور احرار کی تنظیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔" (۲۲)

جیب الرحمٰن لدھیانوی، علامہ اقبال کو مرزائیت کے چنگل سے نجات دلانے کا قصہ اس طرح بیان کرتے ہیں :- "حضرت شاہ صاحب (مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری) نے تحریکِ خلافت کے زمانے سے لے کر تحریک احرار کے زمانے تک میرے والد سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سرپرستی فرمائی۔ انہوں نے قادیانیوں کے بارے میں جماعت احرار کو نقطۂ نظر سے اسلام میں ختم نبوت کی بنیادی اہمیت سمجھانے کے لئے سر ڈاکٹر محمد اقبال سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر اقبال کو اپنا ختم نبوت کا رسالہ پڑھ کر سنایا۔ اس کے فوراً بعد ہی ڈاکٹر اقبال نے کشمیر کمیٹی کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا جس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود قادیانی تھے۔ اس طرح ڈاکٹر اقبال نے مرزائیت کے چنگل سے نجات پائی اور اسلام کے صحیح اعتقادات پر عقیدہ رکھنے کی ڈاکٹر صاحب کو توفیق حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قادیانیوں کے خلاف مضامین لکھے۔" (۲۳)

مجلس احرار خالصتاً ایک سیاسی جماعت تھی۔ اُن کی تحریک احمدیت کی مخالفت میں کئی عوامل کارفرما تھے۔ مثلاً نہرو رپورٹ اور کانگرس کی اندھا دھند تائید کی وجہ سے مسلمانوں میں اُن کی مقبولیت کو سخت دھچکا لگا تھا۔ اس کے ازالہ اور دوبارہ مسلمانوں میں نفوذ و مقبولیت حاصل کرنے کے لئے احمدیت کی مخالفت ایک آسان اور کارگر حربہ تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی رائے میں احرار کے تحریک کشمیر میں دلچسپی لینے کی ایک اور وجہ مسلمانوں سے مالی منفعت کا حصول بھی تھا (۲۴) مزید برآں سکندر حیات خاں کے مکان پر جس میٹنگ کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اس میں چودھری افضل حق کہہ چکے تھے کہ چونکہ احمدیوں نے ہر الیکشن میں ان کی مخالفت کی ہے اس لئے وہ اس جماعت کو مٹا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ احرار اپنے اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی سعیٔ ناکام میں ہر حربہ سے کام لے رہے تھے۔ علامہ اقبال کو استعمال کرنے کی غرض سے یہ بیان مولانا نے اسی سلسلہ کی کڑی تھی۔ اس کی تائید علامہ کے ایک معتقد مولانا عبدالمجید سالک کی تحریر سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"۱۹۳۵ء میں مولانا ظفر علی خاں اور مجلسِ احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک کا آغاز کیا .... خدا جانے علامہ اقبال نے کس عقیدت مند کی بحث (؟) پر ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ اس فرقہ کی بنیاد ہی غلطی پر ہے .... اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقہ کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے۔ گویا علامہ نے وہی مطالبہ کیا جو مجلسِ احرار کر رہی تھی۔ مولانا سالک کو علم تو ہوگا کہ یہ "عقیدت مند" بزرگ کون تھے لیکن انہوں نے "خدا جانے" کے الفاظ سے ان کی پردہ پوشی کی ہے۔ اُن دنوں علامہ کے حاشیہ نشینوں میں دو ایک "عقیدت مند" ایسے بھی تھے جنہیں سلسلہ احمدیہ سے ذاتی عناد تھا۔ اس کی تائید میں ناقابلِ تردید شہادت موجود ہے جس کی تفصیل بیان کرنا یہاں ضروری نہیں۔

سخت کلامی عام طور پر علامہ اقبال کا شیوہ نہ تھا۔ تعلیم کے لئے انگلستان جاتے ہوئے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر دعا کی تھی کہ "میری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے۔" اور حتی الامکان وہ ایسا کرنے سے احتراز کرتے تھے سوائے اس کے کہ کبھی مقالوں میں سخن گسترانہ بات آ پڑے۔ سلسلۂ احمدیہ کے خلاف ۱۹۳۵ء کے بیانات میں اتنی شدت اور تلخی شاید نہ ہوتی اگر ایک ذاتی معاملہ میں اُن کو احساسِ محرومی لاحق نہ ہوتا۔ اور اس مرتبہ تو ان کے احساسِ ناکامی کے شدید ہونے کی وجہ بھی تھی کیونکہ پیالہ ہاتھ میں آ کر لبِ بام رہ گیا والا معاملہ ہوا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں سر فضل حسین وائسرائے ہند کی کونسل کے رکن چار ماہ کی رخصت پر گئے۔ ان کی جگہ علامہ کے تقرر کا ذکر اخبارات میں آیا لیکن وزیرِ ہند نے چودھری ظفر اللہ خان کو مقرر کر دیا۔ سر فضل حسین کی تقرری کی میعاد اپریل ۱۹۳۵ء میں ختم ہونے والی تھی۔ ان کی جگہ کون لے گا اس کے متعلق پیشگوئیاں ہو رہی تھیں۔ چونکہ چودھری ظفر اللہ خان عارضی طور پر چار ماہ ان کی جگہ کام کر چکے تھے اس لئے ان کا نام بھی مستقل تقرری کے سلسلے میں لیا جا رہا تھا۔ ان کی تقرری کے خلاف احراریوں نے

معذ نامہ" زمیندار " نے بدست پروپیگنڈہ " شروع کر رکھا تھا۔ "زمیندار" نے ایک کھلا خط زیر عنوان " مکتوب مفتوح بنام نائب السلطنت کشور ہند " شائع کیا۔ جس میں لکھا گیا
" چودھری ظفر اللہ خان قادیانی ہیں اور قادیانیت ہرگز اسلام کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ بالکل علیحدہ مذہب ہے اس لئے سر فضل حسین کی جگہ ان کو نہ مقرر کیا جائے بلکہ اور کسی ایسے جلیل القدر مسلمان کو یہ منصب رفیع سپرد کیا جائے جو مسلمانان ہند کے اعتماد کا حامل ہو۔ (مراد علامہ اقبال سے تھی۔ ناقل) (۲۹) اس ضمن میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا۔ علامہ کے خالی معتقد مشہور صحافی میاں محمد شفیع (م۔ش) کی روایت* ہے کہ جن دنوں میاں فضل حسین کے جانشین کے تقرر کا معاملہ زیر غور تھا لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند نے ایک ملاقات میں علامہ کو یہ کہہ کر کہ WE WILL BE MEETING FAIRLY OFTEN ہم اب اکثر ملتے رہیں گے یا سر فضل حسین کی جگہ ان کے تقرر کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ ممکن ہے احراریوں اور "زمیندار" کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر لارڈ ولنگڈن نے وزیر ہند سے علامہ کے تقرر کی سفارش کی ہو اور انہیں اپنی سفارش کے منظور ہو جانے کا یقین بھی ہو لیکن وزیر ہند نے اتفاق نہ کیا ہو۔ واللہ اعلم آخر کار اکتوبر ۱۹۳۴ء میں چودھری ظفر اللہ خان کے تقرر کا اعلان ہو گیا اور مئی ۱۹۳۵ء میں انہوں نے چارج بھی لے لیا۔ پھر کیا تھا احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں کو علامہ کو بھڑکانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ چودھری ظفر اللہ خان کا تقرر وزیر ہند نے کیا۔ اس میں جماعت احمدیہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا لیکن نزلہ عضو ضعیف پر گرا۔

قدرت کی نعمتوں کی تقسیم میں ایک طرح کا توازن کارفرما معلوم ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اور تو کئی نعمتوں سے نوازا ہوا تھا لیکن مالی فراغت اور آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ زندگی کے آخری آٹھ دس سالوں میں کچھ تو ان کی علالت کے باعث اور کچھ سیاست میں پڑ جانے کی وجہ سے آمدنی اور بھی محدود ہو گئی۔ بس کشتم پشتم گزر ہوتی تھی۔ تنگ ہیں آیا گل میں کیا والا حال تھا۔ وہ خود تو بڑے قناعت پسند اور تہی کیسہ و خورسند رہنے والے تھے لیکن آنے والی کا سوال تو گھرداری کا انتظام کرنے والی خاتون خانہ کو معلوم ہوتا ہے۔ وہ لوگ بے تعب اس بات پر اُن سے اُلجھتی رہتی تھیں کہ یا تو ڈھنگ سے وکالت کریں یا کہیں ملازمت کر لیں۔ علامہ دل سے ملازمت کو پسند نہ کرتے تھے لیکن حالات سے مجبور ہو کر چاہتے تھے کہ اگر کوئی مناسب انتظام ہو سکے تو ملازمت کر لیں لیکن کوئی مناسب انتظام نہ ہو سکا۔

احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے دنوں میں اخبار کے ایک نمائندے نے اُن کی ۱۹۱۱ء والی علی گڑھ کی تقریر کے حوالے سے ان سے دریافت کیا کہ آپ تو اس فرقہ کو "اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ" سمجھتے تھے۔ علامہ نے جواب میں اعتراف کیا کہ ۲۵ سال پہلے انہیں اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی امیدیں تھیں۔ لیکن انہیں اس وقت شکوک پیدا ہوئے جب بانیٔ اسلام کی نبوت سے برتر ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا (۲۷) بانیٔ سلسلۂ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآبؐ کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ کوئی احمدی بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو سرکار دو عالمؐ سے برتر یقین کرتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ کو قرآن کریم میں خاتم النبیین کہا گیا ہے اور انہیں خاتم النبیین تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزو ایمان ہے۔ حضور رسالت مآبؐ کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں نے ان کے عشق رسول کو EXPLOIT کرتے ہوئے ان کو احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لئے تراشی اور علامہ نے اسے درست باور کر لیا۔ اپنی خداداد عقل و دانش کے ساتھ ساتھ علامہ میں ایک ذرا بچوں والی معصومیت اور بھولپن بھی تھا۔ ان معنی میں کہ وہ سُنی سنائی بات کا بغیر تحقیق یقین کر لیتے۔ اس کی ایک مثال جس نے انہیں ایک بڑی مشکل سے دوچار کیا۔ مولانا سالک کے "ذکر اقبال" میں بیان کی گئی ہے (۲۸) ۱۹۳۲ء میں کسی حاشیہ نشین نے گپ ہانکی کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان "رستا مین" نام مقرر ہوا ہے۔ علامہ نے باور کر لیا اور بڑے شوق سے یہ خبر اپنے بڑے بھائی کو خط میں لکھی (۲۹) ۱۹۳۲ء میں کسی ملنے والے سے سُنا کہ البانیہ میں مسلمانوں نے نماز سے پہلے وضو کرنا غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔ دوسرے نے ترکی میں نماز میں تبدیلیوں کی خبر سنائی۔ تیسرے نے کہا مصر میں بھی ایسی تحریک جاری ہے۔ علامہ ان خبروں سے دل گرفتہ ہوئے اور بڑے افسوس سے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں ان کا ذکر کیا۔ انہوں نے جواباً اطمینان دلایا کہ خبریں غلط اور بے اصل ہیں (۳۰) معلوم ہوتا ہے اسی طرح کسی عقیدت مند حاشیہ نشین نے احمدیت سے اپنے عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا ہو گا کہ احمدی بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو (نعوذ باللہ، نعوذ باللہ) حضور رسالت مآبؐ سے SUPERIOR (برتر) مانتے ہیں۔ علامہ نے اس افترا کو سچ سمجھ لیا حالانکہ اس کی تحقیق کچھ مشکل نہ تھی۔ اور تحقیق کے لئے گھر سے باہر جانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح ایک معتقد نے جو آخری ایام میں ان کے بہت قریب تھے غلط نقشہ کھینچا کہ "جماعت احمدیہ میں ہر کوئی شامل ہو سکتا ہے خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ احمدیوں کے خلیفہ کی بیعت کر لے" (۳۱) چونکہ اُن دنوں احمدیت کے خلاف ایسی ایسی بے بنیاد اور بے سروپا باتیں اُن کے حضور بیان کی جاتیں اور باور کر لی جاتیں۔ اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے۔

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سُنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

بنام فقیر سیّد وحید الدین

لاہور - [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
محمد اقبال
[illegible]

کرنل سیّد وحید الدین [۱۹۰۵ء - ۱۹۷۸ء] مصنف "روزگار فقیر" [حصہ اول ۱۹۵۰ء - حصہ دوم ۱۹۶۴ء] اقبال کے بے حد قریبی عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ سیّد وحید الدین بمبئی جا رہے تھے۔ اقبال نے انھیں ایک کام سپرد کیا کہ رفیق غزنوی نے ان کی چند غزلیں ہز ماسٹرز وائس کے لیے ریکارڈ کرنے کی غرض سے منتخب کی ہیں۔ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون کون سی غزلیں ہیں۔ سیّد صاحب نے بمبئی پہنچ کر جو معلومات اقبال کو خط کے ذریعے فراہم کیں یہ خط اسی سلسلے کا ہے۔ اس خط کا عکس پہلی بار "روزگار فقیر" [حصہ اول] میں شائع ہوا۔

سلیمان اطہر جاوید

شعبۂ اردو، ایس، وی، کالج، تروپتی (آندھرا پردیش)

اقبال کا ادبی تنقیدی شعور

ہر خالق ناقد بھی ہوتا ہے۔ کم یا زیادہ کی بات اور ہو سکتی ہے لیکن کوئی تخلیق کار ایسا نہیں جو تنقیدی شعور نہ رکھتا ہو بلکہ فنکار تخلیق کرنے سے قبل ہی اپنے تنقیدی شعور کو کام میں لاتا ہے۔ کیا؟ کیوں؟ اور کس طرح؟ ــــ ان سوالات کے تشفی بخش جوابات ہی کا نتیجہ تخلیق ہے اور یہ سوالات تخلیق کار کے تنقیدی مزاج اور موقف کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جتنا بڑا فنکار ہوگا اس کا تنقیدی شعور اتنا ہی فزوں ہوگا بلکہ سچ تو یہ ہے تنقیدی شعور جس قدر زیادہ گہرائی اور گیرائی کا حامل ہوگا وہ اتنا ہی بڑا فنکار ہوگا۔ یوں تنقید کو تخلیق پر عظمت حاصل ہو یا نہ ہو، سبقت ضرور حاصل ہے!

اقبال بھی جیسے عظیم شاعر تھے اُن کا تنقیدی شعور بھی اُسی طرح افزوں اور جلا یا یا ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے ان معنوں میں تنقید نہیں کی کہ وہ نقاد کہلاتے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ امیر خسرو، قلی، وجہی اور ولی سے لے کر آج تک ہمارے بیشتر فنکاروں نے اپنی تخلیقات میں جس طرح شعر و ادب کے بارے میں تنقیدی اشارے کیے ہیں۔ اقبال کے کلام میں ان سے زیادہ تنقید کی کارفرمائی ملتی ہے۔ و نیز کلام ہی نہیں چند ایک مضامین اور خطوط وغیرہ میں بھی اقبال کا تنقیدی ذہن خاصا روشن، رچا ہوا اور بھرپور انداز میں سامنے آتا ہے۔

اُردو میں اِن دنوں تنقید خاصا وزن و وقار رکھتی ہے۔ آج سے (۷۰)، (۸۰) سال قبل کی صورتِ حال کا تصور کیجئے۔ ہماری تنقید کا دامن تہی تھا۔ جو بھی تنقید تھی بڑی حد تک برائے نام! سائنٹیفک اندازِ نظر کی کمی بُرے طور پر کھٹکتی تھی اقبال کو اس کا کما حقہٗ احساس تھا اور یہ احساس خود ان کے وسیع تنقیدی شعور اور ادبی بصیرت کی آئینہ داری کرتا ہے وہ اس خیال کے بھی حامل تھے کہ اُردو والوں کو انگریزی تنقید سے استفادہ کی ضرورت ہے۔ لاہور سے سکندر علی وجد کے موسومہ مکتوب مورخہ ۹ جون ۱۹۳۷ء میں رقمطراز ہیں:

> ہندوستان میں عام طور پر ادبا کو زمانۂ حال کے فنِ تنقید کے اصولوں سے واقفیت حاصل نہیں ہے۔ اس واسطے
> یہ بھی مفید ہوگا کہ آپ انگریزی میں چند مشہور اور مستند کتابیں پڑھیں ان کے طرزِ بیان اور اندازِ تنقید
> سے آگاہی حاصل کریں اگر آپ اُن کے اصولوں اور اُن کے اسالیبِ بیان کو اختیار کر سکیں تو یہ بجائے
> خود اُردو زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔ [خطوطِ اقبال۔ صفحہ ۱۳۲]

اہلِ لکھنؤ سے زبان و بیان کے معاملات پر اقبال کی نوک جھونک چلتی رہی۔ کبھی صرف خود کو اہلِ زبان قرار دیتے ہوئے اہلِ لکھنؤ نے خاص طور پر اہلِ پنجاب کو ہدف بنایا۔ پنجابی ہونے کی وجہ سے اقبال کا زد میں آنا ضروری تھا۔ لیکن اقبال ان موشگافیوں کو کہاں خاطر میں لاتے، انہیں لانا بھی نہیں چاہیے تھا۔ انہوں نے اپنے کئی اشعار میں اہلِ لکھنؤ کا حوالہ دیے بغیر اور اپنی نثری تحریروں میں بھی یہاں وہاں اور بعض مواقع پر اہلِ لکھنؤ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھنوی طرزِ تنقید کی مذمت کی اور اس کے منفی پہلوؤں کی سمت اشارہ کیا ہے کہ یہ موشگافیاں شعر و ادب ہی کے لیے نہیں زندگی کے حق میں بھی مضرت رساں ہیں۔ سید شوکت حسین کے موسومہ مکتوب مورخہ ۷ جنوری ۱۹۱۹ء میں انھوں نے تحریر کیا ہے:

> بہر حال نظم کی خامیاں نفسیاتی ہیں اور بعض مقامات پر خامیوں کا تعلق اظہارِ بیان سے ہے۔ لکھنوی ناقدوں

کو ابھی فنیٔ تنقید کے اصولوں کو سیکھنے کی ضرورت ہے۔ [خطوطِ اقبال ص۱۳۴]

واقعہ یہ ہے کہ شعر و ادب کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر قطعی جُداگانہ تھا۔ انھوں نے شعر و ادب کی روایات سے استفادہ کیا اور اسلوب کی ندرت پر پوری توجہ دی لیکن کبھی بھی ان اور ایسی چیزوں کو مقصود بالذات متصور نہیں کیا اور نہ ان کی خاطر موضوع اور مقصد کو قربان کیا ــــ اہلِ لکھنؤ کی شاعری ایک عرصہ تک موضوع اور مقصد سے آشنا ہی کب تھی۔ وہاں تو زبان و بیان اور فن ہی سب کچھ سمجھے جاتے تھے، کیا کہا جائے سے زیادہ کیسے کہا جائے کی اہمیت تھی اور شاعر الفاظ کی بازیگری اور فن کے کرتبوں میں اُلجھ کر رہ جاتا تھا۔ چنانچہ چند ایک مستثنیات سے قطع نظر کر لیا جائے تو خارجیت لکھنوی شاعری کا نمایاں ترین وصف قرار پاتی ہے۔ ظاہر ہے اقبال کا نظریۂ شعر اس کے قطعاً متضاد تھا کہ اس کو تسلیم کرنا تو کجا، اس سے مفاہمت کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اقبال نے اہلِ لکھنؤ کو کبھی مسکت جواب دیا ہے اور کہیں یوں ہی اپنی بات کہہ دی ہے، اپنے موقف کو واضح کرتے ہوئے ایک دوست محمد دین فوق کے موسومہ مکتوب محررہ ۶ مارچ ۱۹۱۷ء میں انہوں نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

لکھنؤ والے یا اور معترضین یہ خیال کرتے ہیں کہ اقبال شاعر ہے، مگر میری غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں، نہ میں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر سمجھا ہے۔ حقیقت میں فن شاعری اس قدر دقیق اور مشکل فن ہے کہ ایک عمر میں بھی انسان اس پر حاوی نہیں ہو سکتا پھر میں کیوں کر کامیاب ہو سکتا ہوں جسے روزی کے دھندوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ میرا مقصود گاہ گاہ نظم لکھنے سے صرف اس قدر ہے کہ چند مطالب جو میرے ذہن میں ہیں ان کو مسلمانوں تک پہنچا دوں اور بس۔" [مکاتیب اقبال بنام گرامی ص۸]

ایک اور جگہ بھی انہوں نے اسی انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"شاعری میں لٹریچر، بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن)، غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ وقت میں میرے لیے ممکن نہیں۔ [اقبال نامہ۔ ص۱۰۸]

اور یہ مکتوب ہے سید سلیمان ندوی کے موسومہ مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۲۵ء:

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات اور روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

[اقبال نامہ۔ صفحہ ۹۳]

و نیز اپنی کتاب "علم الاقتصاد" کے دیباچہ اور اپنے مقالہ "اُردو زبان پنجاب میں" میں بھی انہوں نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے اور کہیں اس انداز سے؎

قبائے علم و ہنر لطفِ خاص ہے ورنہ ۔۔۔ تری نگاہ میں تھی میری ناخوش اندامی

اقبال نے اپنے اور بھی کئی اشعار میں اس خیال کو کسی نہ کسی طور سے پیش کرتے ہوئے خود کو ان معنوں میں شاعر قرار دینے سے گریز کیا ہے جن معنوں میں لوگ عام طور پر شاعر قرار پاتے ہیں یعنی رنگین الفاظ، دلکش اندازِ بیان اور فن کو صرف فن کی طرح برتنے کی سعی۔ یہ اشعار کس کے ذہن میں نہیں ہوں گے؎

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو ۔ نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی کہ بانگِ صورِ سرافیل دلنواز نہیں
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اس طرح خود کو شاعر اور اپنی شاعری کو شاعری نہ قرار دے کر اقبال نے گویا اُس شاعری کو رد کیا ہے جس کا شہرہ اُن کے عصر تک بہت زیادہ تھا اور اس نوع کی شاعری کے ہمنوا آسمان ادب پر چھائے ہوئے اور استادانِ فن کہلاتے تھے۔ اسی کے ساتھ اقبال نے گویا شاعری کے بارے میں اپنا تصور بھی پیش کیا جو دنیائے شاعری میں نیا تو نہیں تھا لیکن اسے بھرپور اور موثر انداز میں شاید بہت کم نے پیش کیا ہو۔ یہ کہنا تو خیر نہیں ہے کہ اقبال نے اُردو شاعری کی روایات سے یکسر بغاوت کی۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے اجتہاد سے کام لیا اور اس اجتہاد میں بھی اتنی احتیاط برتی اور ایسا اہتمام کیا کہ ہماری شاعری کی خوبیوں اور مثبت پہلوؤں کو نہ صرف اپنایا بلکہ انھیں فروغ دینے کی سعی بھی کی۔

اقبال کے نزدیک لفظ و معنی کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ الفاظ کے مزاج سے بخوبی آگاہی رکھتے تھے۔ کفایت لفظی کے آرٹ سے واقف تھے اور الفاظ کو ان کے صحیح سیاق و سباق میں استعمال کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ ان کے ہاں معنویت کا ایک جہاں آباد رکھتے ہیں اور ان کے ہاں لفظ و معنی میں ایک گہرا باہمی رشتہ ہوتا ہے، اس قدر گہرا کہ انہی کے الفاظ میں "ارتباطِ حرف و معنی اختلاطِ جان و تن" ـــــ یہ کیفیت الفاظ کی مرتبت کو بھی افزوں کر دیتی ہے اور معنویت کو بھی تہہ دار اور دلکش بنا دیتی ہے۔ چنانچہ اسی ارتباطِ حرف و معنی سے اُن کے ہاں معنوی دلکشی اور دلآویزی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تاثیر کا ایک باعث یہ بھی ہے۔ یہ ایک شعر جس میں انہوں نے معانی کی اہمیت اور ضرورت پر اصرار کیا ہے ؎

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

اقبال نے ہرچند یہ ضرور کہا کہ اثر کرے نہ کرے سُن تو لے میری فریاد، نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد، لیکن انہوں نے شاعری میں تاثیر کو کلیدی حیثیت دی ہے۔ وحشت لکھنوی کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۱۱ء میں لکھتے ہیں:

شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والوں کے دل پر چھوڑا جائے [خطوطِ اقبال ص ۱۱]

لیکن یہ اثر صرف وقت گزارنے، لذت حاصل کرنے، فرصت کے اوقات کو دلکش بنانے اور شعر سن کر واہ واہ کرنے کی حد تک نہیں ہو بلکہ یہ اثر اور تاثیر مقصدیت کی حامل ہونی چاہئے اور مقصدیت زندگی کو سنوارنا، اس کو مفید بنانا اور معاشرے کو ترقی اور بہتری کی راہ پر گامزن کرنا ہونا چاہئے۔

"ادب برائے زندگی" اور ادب میں مقصدیت کی باتیں ادھر نصف صدی سے اُردو ادب میں بہت زیادہ کی جا رہی ہیں اور اس کا سہرا کچھ ترقی پسند تحریک ہی کے سر باندھا جاتا ہے کہ اس نے ادب برائے زندگی کے رجحان کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے اور ادب میں مقصدیت پر زور دیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبال نے ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بہت پہلے ادب برائے زندگی کے نظریے پر زور دیا۔ اپنے اشعار، خطوط اور مضامین میں انہوں نے اس پہلو پر بار بار اور طرح طرح اصرار کیا کہ ادب اگر زندگی کے کام نہ آئے، زندگی کو حسین اور کارآمد بنانے میں حصہ ادا نہ کرے اور کسی مقصد کا حامل نہ ہو تو وہ کوئی اچھا ادب نہیں ہے۔ یہ بت گری اور بُت پرستی نہیں۔ مثنوی "اسرارِ خودی" کے تعلق سے انہوں نے کہا ہے ؎

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست بُت پرستی، بُت گری مقصود نیست

اقبال کے نزدیک شاعری، انفرادی طور پر کسی کے لیے کوئی کردار نہیں رکھتی بلکہ ایک پورے معاشرے کے لیے شاعری کو اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ معاشرے کی صلاح و فلاح اگر شاعر کا مقصود نہ ہو اور شاعری معاشرے کے رنگ رُخ کو نکھارنے میں اپنا حصہ ادا نہ کر سکتی ہو تو وہ شاعر نہ شاعر ہے اور نہ وہ شاعری، شاعری ـــ لہٰذا ادب برائے زندگی اور ادب برائے مقصد کی گفتگو کرتے ہوئے اقبال کے موقف کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے نہ صرف اقبال کے ادبی تنقیدی موقف بلکہ اُن کے گہرے معاشرتی شعور پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"شاعری" دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے وہ افسردگی اور انحطاط کو صحت اور وقت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پر قوم کو ہلاکت کی طرف لیجائے۔ اس کا تو یہ فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اُسے دیا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اٹھائی گیرا بن کر جو رہی سہی پونجی اُن کے پاس ہے اس کو بھی ہتھیالے۔ [مقالاتِ اقبال۔ صفحہ ۱۸۸]

اقبال فن کے سچے اور غیر معمولی پارکھ تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ اہلِ وطن زبان و بیان کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے یا فن کو محض فن کے بطور پیش کرنا چاہتے تھے لیکن اقبال کا اس وقت بھی یہی نقطۂ نظر تھا کہ فن کار اس وقت تک حریفِ سنگ نہیں ہو سکتا تا آنکہ زندگی کے حقائق پر نظر نہ ہو۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اقبال زندگی میں اپنے طور پر ایسے باعمل انسان نہیں تھے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے بے عمل اور راہبانہ زندگی گزاری ہو۔ انہوں نے اپنے وطن میں اور وطن سے باہر بالخصوص یورپ میں زندگی کو دیکھا اور پرکھا۔ مختلف زبانوں اور مختلف علوم پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اقوامِ عالم کی تاریخ اور تہذیب کا اُن کا مطالعہ بڑا گہرا اور بسیط تھا۔ خاص طور پر مشرق اور مغرب کے فلسفوں سے آگاہی جس قدر اقبال کے حصہ میں آئی، سرزمینِ مشرق پر اُن کے عہد میں ایسے افراد مشکل سے اتنے ہوں گے کہ انگلیوں پر گنے جاسکیں۔ مذاہب کے فلسفوں کا تو انہوں نے اور زیادہ توجہ اور لگن کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ وہ ہر جگہ بصارت اور بصیرت دونوں سے کام لیتے رہے۔ یوں اگر اقبال نے فن برائے فن کے نظریہ کو رد کرتے ہوئے فن برائے حیات کے نظریے کی تائید کی تو اس میں متعجب ہونے کی بات ہی کیا ہے؟ بلکہ اس امر میں بھی تعجب نہیں کہ انہوں نے اپنے موقف کو اس قدر شدت کے ساتھ پیش کیا کہ فن برائے فن کے نظریہ کو حکومت کی جانب سے ممنوع قرار دینے کی تجویز کی۔ مئی ۱۹۳۵ء میں اقبال نے خواجہ عبدالحمید سے جو گفتگو کی تھی ان کے الفاظ یوں منقول کیے گئے ہیں:

"اگرچہ آرٹ کے متعلق دو نظریے موجود ہیں۔ اوّل یہ کہ آرٹ کی غرض محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے اور دوم یہ کہ آرٹ سے انسانی زندگی کو فائدہ پہنچنا چاہیے۔ ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسانی زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے اور اس سے وہ آرٹ جو زندگی کے لیے مفید ہو اچھا اور جائز ہے اور جو زندگی کے خلاف ہو، جو انسانوں کی ہمتوں کو پست اور اُن کے جذباتِ عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو قابلِ نفرت اور پرہیز ہے اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دینی چاہیے"۔

[ملفوظاتِ اقبال]

ایسا نہیں ہے کہ اقبال کے خیالات عمر کے آخری دور میں ایسے رہے ہوں بلکہ عرصہ دراز ہی سے اقبال کے خیالات کچھ اسی نوعیت کے تھے۔ فن کو انہوں نے ہمیشہ اس معیار پر جانچا کہ وہ زندگی کی صلاح اور فلاح کے لیے کس حد تک سودمند ثابت ہو سکتا ہے اور معاشرے کی بہبودی اور بہتری کے لیے فن کو کس قدر ممد و معاون ہونا چاہیے۔ اقبال نے حافظ کی شاعری کی بڑی مذمت کی۔ وہ عرفی کے بڑے مداح تھے۔ حافظ کی مذمت کا جواز اُن کے نزدیک یہ تھا کہ حافظ کی شاعری زندگی کو بے حقیقت بتاتی ہے اور فرد کو اس سے زیست کا حوصلہ نہیں ملتا۔ ایک بے بسی اور مُردنی ـــــ حافظ کی شاعری نے اپنے پڑھنے والوں کو اور کچھ نہ دیا۔ حافظ کے بارے میں اقبال کے ان خیالات کے باعث ادبی دنیا میں خاصا ہنگامہ رہا۔ اقبال کے خلاف اعتراضات کا سلسلہ جاری رہا۔ اقبال کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ معترضین کا جواب دیتے۔ اقبال نے اپنے موقف کی مختلف اوقات میں اور مختلف انداز سے صراحت کی ہے چنانچہ انہوں نے "اخبار وکیل" کی اشاعت مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء میں جو لکھا ہے اس سے فن اور زندگی کے بارے میں اُن کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

فردی اور ملی اعتبار سے کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی معیار ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک معیار یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کے اشعار اغراضِ زندگی میں ممد ہیں تو وہ اچھا شاعر ہے اور اگر اس کے اشعار زندگی کے منافی ہیں یا زندگی کو کمزور اور پست کرنے کا میلان رکھتے ہیں تو وہ شاعر خصوصاً قومی اعتبار سے

مضرت رساں ہے۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات منم مسعود حسین خاں

اقبال نے ازراہِ انکسار خود کو شاعر نہ کہا ہو لیکن شاعر کا مرتبہ ان کے نزدیک معاشرتی زاویہ سے بے حد بلند اور اہم ہے۔ انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ "بانگِ درا" کے حصۂ اوّل میں ۱۹۰۵ء تک کے اپنے کلام میں "شاعر" کے بعنوان یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ؎

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم　　منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم　　شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد ہو کوئی عضو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

گویا شاعر کی مرتبت اقبال کے نزدیک خاصی افزوں ہے ـــــ معاشرے کے لئے اگر شاعر کے پاس کوئی پیغام نہیں ہے۔ شاعر کا فن معاشرے میں عزم و حوصلہ پیدا کرنے میں ناکام اور اس کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اس کے کلام سے معاشرے میں جمود کا احساس ہوتا ہے اور اس پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں تو اقبال کے نزدیک ایسا شاعر، ایسا فنکار، نہ شاعر ہے نہ فنکار کہ مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے۔ "فنونِ لطیفہ" کے عنوان سے انہوں نے لکھا ہے ؎

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے لیکن　　جو شے کی حقیقت کو نہ جانے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر، سوزِ حیاتِ ابدی ہے　　یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا　　اے قطرۂ نیساں، وہ صدف کیا، وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں　　جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

انہوں نے یہ بات کئی مواقع پر، کئی انداز اور کئی اسالیب میں کہی ہے۔ ان اشعار کو کون نظر انداز کرے گا ؎

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل　　کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن، عینِ حیات　　ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی
لطفِ کلام کیا ہو، جو نہ ہو دل میں دردِ عشق　　بسمل نہیں ہے تو تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

اور جو شاعر، جو فنکار حقیقت کو جاننے کی نظر نہیں رکھتا۔ جس کا ہنر ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر ہوتا ہے، جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا، جس سے چمن افسردہ ہو جاتا ہے، جو ضربِ کلیمی کا حامل نہیں ہوتا۔ جس کا نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل ہوتا ہے، جس کا سینہ روشن نہیں ہوتا، جس کا دل دردِ عشق سے عاری ہوتا ہے۔ ایسے فنکاروں، شاعروں پر اقبال نے غیر معمولی تنقید کی ہے۔ ان کے نزدیک ایسے فنکار لائقِ افسوس ہیں جو اپنے منصب کو پہچاننے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ منصب جو بے حد ہمہ گیر اور وقیع ہے۔ اقبال نے "ضربِ کلیم" میں شامل نظم "ہنروَرانِ ہند" میں جس قدر طنز و تضحیک سے کام لیا اور اظہارِ افسوس کیا ہے وہ ایسے شاعروں کے بارے میں بہت کم جگہوں پر کیا ہوگا۔ ملاحظہ ہو ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اُن کا　　اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری اُن کے صنم خانوں میں　　زندگی سے ہنر اُن برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند　　کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس　　آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنا عبث ہوگا کہ اقبال جمالیاتی حس سے عاری تھے۔ قطع نظر اس کے بھی کہ اقبال کی ذاتی زندگی اُن کے جمالیاتی طور پر ایک بھرپور انسان ہونے کی دلیل ہے، اقبال نے یہاں اُن شاعروں، صورت گروں اور افسانہ نویسوں پر اظہارِ افسوس کیا ہے جن کے اعصاب پر عورت ہے سوار، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ایسے اشعار بھی لکھے ہیں ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ　　اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی　　کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن　　اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ والی بات تھی ورنہ میرا عرض کرنا یہی ہے کہ اقبال نے فن اور زندگی کے رشتے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور یہ رشتہ مثبت اور تعمیری نوعیت کا ہے اور فن اگر اس عنصر سے خالی اور زندگی دوست نہیں ہے تو وہ فن کے بطور کتنی ہی اونچی حیثیت کا مالک اور دلکش و رعنا کیوں نہ ہو، بے مایہ اور لایعنی ہے، چنانچہ اقبال نے "فن برائے فن" کے موقف کی بے حد شدت اور بڑی توجہ کے ساتھ بخیہ گری کی ہے۔ یہ ۱۹۱۶ء کی بات ہے جب کہ انہوں نے کہا تھا:

"بلند ترین فن وہ ہے جو ہماری سوئی ہوئی قوتِ ارادی کو جگا دے اور ہمیں زندگی کے ہر امتحان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی توانائی بخشے۔ ہر وہ فن جو خواب آور ہے اور گرد و پیش کے ان حقائق سے غافل کر دیتا ہے جن پر مکمل غلبہ پا لینے ہی پر زندگی کا دار و مدار ہے، انحطاط اور موت کا پیغامبر ہے۔ فن میں افیون نوشی کی گنجائش نہ ہونا چاہیئے "فن برائے فن" کا عقیدہ انحطاط پرستی کی ایک چالاک اختراع ہے اور اس کا مقصد ہوشیاری سے ہمیں زندگی اور طاقت سے محروم کرنا ہے۔ [اقبال کی نظری و شعری جمالیات۔ صد ۴۲، ۴۴]

اقبال نے ۱۹۱۶ء میں ایک مختصر سا مضمون بعنوان "رسول اللہ صلعم فنِ شعر کے مبصر کی حیثیت میں" لکھا تھا، جس کی اشاعت ایک اخبار "ستارہ صبح" کرم آباد مورخہ ۸ راگست ۱۹۱۶ء میں عمل میں آئی تھی۔ اس مضمون سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے فن برائے فن کے نظریہ کو کس قدر لغو قرار دیا ہے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے "ذکرِ اقبال" میں اس مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے اقبال کے خیالات کی ترجمانی یوں کی ہے:

اس مضمون میں علامہ اقبال نے صاف صاف آرٹ کا یہ نظریہ بیان کر دیا کہ "فن برائے فن" لغو بات ہے۔ "فن برائے زندگی" ہی بہترین نظریہ ہے۔

یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صفت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی اور اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکہ دے کر چھین لی جائے۔ غرض رسول اللہ صلعم کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کی شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صفت کے ہر کمال کی شانِ ارتقاء کیا ہے۔ ذکرِ اقبال صد ۸۹

ظاہر ہے ابلیسی قوتیں ہی خواہاں ہوں گی کہ انسان زندگی اور قوت سے محروم ہو جائے چنانچہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں ابلیس اپنے مشیروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تماشائے حیات کو انسان کی نگاہوں سے چھپا دیا جائے ؎

ہے وہی شعر و تصوف اُس کے حق میں خوب تر　　جو چھپا دے اُس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

یہی بات انہوں نے اپنے بعض اشعار میں مزید تلخ لہجہ میں کہی ہے خصوصاً یہ شعر ؎

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام　　حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

اور صرف یہی سبب ہے کہ انہوں نے شعرائے عجم بالخصوص حافظ کی شاعری پر شدید اعتراضات کئے بلکہ اس کی نفی کرنے کو کسی زمانے میں اپنا نصب العین بنا لیا۔ شعرِ عجم کو طربناک اور دلآویز قرار دینے کے باوصف انہوں نے کہا ؎

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلآویز　　اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں　　بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

اقبال کی نظر میں اگر حافظ کی شاعری کو اچھی شاعری قرار دیا جائے تو یہ دنیا عمل سے محروم، عزم و ہمت سے تہی اور ولولۂ شوق سے عاری ہو جائے۔ اپنے ایک خط میں انہوں نے طنزاً لکھا ہے:

اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حُسن حُسن ہے تواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مُضر تو خواجہ حافظ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔ [اقبال نامہ ص۵۳]

دنیز اپنے مضمون "اسرارِ خودی اور تصوّف" میں انہوں نے ایک اور پیرایہ میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"شاعری نام ہی اس کا ہے کہ اشیاء و مقاصد کو اصلیت سے حسین تر بنا کر دکھایا جائے تاکہ اوروں کو ان اشیاء اور مقاصد کی طرف توجہ ہو اور قلوب ان کی طرف کھینچ آئیں۔ ان معنوں میں ہر شاعر جادوگر ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کا جادو کم چلتا ہے کسی کا زیادہ۔ خواجہ حافظ اس اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے مقصد یا حالت یا خیال کو محبوب بناتے ہیں"۔ [مقالاتِ اقبال]

اس تجزیہ کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں کہ اقبال کا ادبی تنقیدی شعور اثباتی اور صحت مند تھا۔ انہوں نے تنقید میں حقیقت پسندی سے کام لیا، مقصدیت اور معنویت پر زور دیا۔ اُن کے استادِ معنوی مولانا جلال الدین رُومی کے ہاں ان عناصر ہی پر زور ملتا ہے لیکن یہ وہ نکات ہیں جن کی اہمیت افلاطون کے پاس بھی رہی، ٹالسٹائی، رسکن، وہائٹ ہیڈ اور ایسے کئی فنکاروں کے ہاں ——

اقبال کا تنقیدی شعور زندگی دوست ہے۔ وہ زندگی کے معاملات، مسائل اور موضوعات کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ زندگی اور زمانے کا مطالعہ اُن کے نزدیک فنکار کے لیے ازبس ضروری ہے۔ یوں بھی انہوں نے خانقاہی نظام کی مخالفت کی ہے۔ ادب میں وہ بھی خانقاہیت کی نفی کرتے ہیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُن کے ہاں داخلیت اور دروں کی کوئی وقعت نہیں اور وہ محاسبۂ ذات پر زور نہیں دیتے یا نجی کیفیات اور جذبات و احساسات کو رد کرتے ہیں۔ اقبال تو اُن فنکاروں میں ہیں جن کے داخل اور دروں گرانمایہ حیثیت رکھتے ہیں۔ تخلیقِ فن کے لیے فنکار کی ذات اور اُس کے مشاہدات، تجربات اور جذبات و احساسات کو اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے ان کیفیات کو کہیں کچھ، کہیں نفس اور کہیں خونِ جگر سے موسوم کیا ہے۔ پہلے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نَے — شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں — یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے

اقبال سوزِ نفس کو کیمیا قرار دیتے ہیں لیکن یہی سوزِ نفس اگر منفی کردار ادا کرے تو زندگی فن اور ذات، سب کے لیے باعثِ افسردگی ہو جاتا ہے۔ نفس کا کام نغمہ کو آتشناک بنانا ہے۔ اگر نفس یہ کردار انجام نہیں دیتا تو لاحاصل ہے۔ یہ شعر ؎

نہ ہو جلال تو حُسن و جمال بے تاثیر — ترا نفس ہے اگر نغمہ نہ ہو آتشناک

اور نفس کی تطہیر و تقدیس فنکار کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر فنکار کا ضمیر ہی پاک نہ ہو تو ؎

نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود — وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

نفس کا سوز، اس کی آتشناکی اور پاکی اپنی جگہ، اقبال نے خونِ جگر پر بھی بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اُن کے ہاں ایسے کئی اشعار مل جائیں گے۔ یہی خونِ جگر ہے جو زندگی کو زندگی اور فن کو فن بناتا ہے۔ میں یہاں چند اشعار درج کرتا ہوں ؎

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش — ہے رگِ ساز میں رواں، صاحبِ ساز کا لہو

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا سوز و سُرور و سُرود

واقعہ یہ بھی ہے کہ قطرۂ خونِ جگر سِل کو دل بناتا اور سرمایۂ حیات ہے۔ یہی اصلِ فن ہے اور اساسِ فن بھی۔ فنکار کا فن ہی سے نہیں زندگی اور زندگی کے معاملات اور مسائل سے خلوص، جذباتی وابستگی اور اپنی ذات کو فن کے لیے تج دینے کا جذبہ جس قدر قوی اور بھرپور ہوگا فن نکھرے گا

بھی اور پُر وقار اور دلنواز ہوگا۔ اقبال نے فن کو عبادت کا درجہ دے دیا ہے، ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو، میری نوا ؤں
جگر کا لہو ــــــ اور جب فن ہی عبادت ٹھہرے تو فنکار کے خلوصِ نیت اور اس کے فن کی برگزیدگی اور تقدس پر کون ا
ایک اچھی تخلیق کے لیے اقبال فن کے تکنیکی پہلو پر بھی خاصا زور دیتے ہیں۔ اقبال نے زبان دانی کا دعویٰ نہیں کیا اور اس کا اعترا
کئی جگہوں پر کیا ہے کہ شاعری کے رموز اور آدابِ فن کی وہ چنداں پروا نہیں کرتے اور انہیں اپنے اشعار کی تہذیب و آرائش کا بھی اہ
مثلاً اُن کا یہ شعر ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

اس کے علاوہ اور اشعار ــــ لیکن اُن کے کلام کا سرسری مطالعہ کرنے والے بھی اس نتیجہ سے ہمکنار ہوں گے کہ اُن کے ہا
بیان کی خامیاں اگر ہوں گی بھی تو چند ایک، برائے نام! انھوں نے جذبات و احساسات اپنے پیام اور اپنے مقصد کو عزیز رکھا اور
سلسلے میں انہوں نے کہیں رورعایت سے کام نہیں لیا۔ اپنے مقصد اور منہاج کا دامن نہیں چھوڑا۔ تاہم عروض اور زبان و بیان کی اہ
کی موزونیت کو بھی وہ رد یا کم نہیں کرتے۔ ایک موقع پر وہ شاعر کے جذبات کو جانِ شاعری قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذباتِ انسانی اور کیفیاتِ قلبی اللہ کی دین ہے ہاں یہ ضرور
ہے کہ طبع موزوں اس کے ادا کرنے کے لیے پُر اثر الفاظ کی تلاش کرے۔ نظم کے اصناف کی تقسیم جو قدیم سے ہے ہمیشہ
رہے گی اور انسانی جذبات ماحول کے تابع رہیں گے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر
ہوں گے وہ شاعر جدید رنگ کا حامل متصور ہو سکتا ہے نہ کہ نفسِ شعری۔ اگر ہم نے پابندیٔ عروض کی خلاف ورزی کی
تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا اور اس نقطۂ خیال سے یہ کہنا پڑے گا اور یہ کہنا درست ہے کہ موجودہ شعرا
کا کام تعمیری ہونا چاہیے نہ کہ تخریبی"۔ [اقبال نامہ ص ۲۸]

ایک اور مکتوب میں اقبال نے ردیف اور قافیہ کے التزام پر زور دیا ہے۔ وہ زمانہ تھا جب کہ اُردو میں بلینک ورس کا آغاز تھا
معاشرہ ردیف اور قافیہ اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیات، غنائیت وغیرہ کا عادی ہو چکا تھا اس لئے بلینک ورس کو ابتداً ا
بعض حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ اقبال بھی ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بلینک ورس کو نہ صرف ناپسند کیا
سے مایوسی کا اظہار کیا۔ ایک شاعر کو جو غالباً ان کے شاگرد بھی تھے، اقبال نے لکھا:

"سنیے، غزل اور رباعی کے لیے قافیہ کی شرط لازمی ہے اگر ردیف بھی بڑھا دی جائے تو سخن میں اور بھی
لطف بڑھ جاتا ہے، البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں، قافیہ تو ہونا چاہیے۔ اب کچھ عرصہ سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں
لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے جس کا نام انگریزی میں بلینک ورس ہے جس کو نثرِ مرجز، کہنا چاہیے اگر
چہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے مگر میرے خیال میں یہ روش آئندہ مقبول نہ ہو گی" [اقبال نامہ ص ۲۰۹]

یہ اور بات ہے کہ اقبال کا یہ خیال صائب نہ ہو سکا اور آج بلینک ورس بھی اسی طرح مقبول ہے جس طرح مقفّیٰ اور مردّف ن
میں سوز و گداز کی بات عام طور پر کی جاتی ہے لیکن بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کے ہاں سوز و گداز، دونوں پائے جاتے ہیں
میں سے ہیں جن کے کلام میں سوز بھی ہے اور گداز بھی۔ اقبال کے ہاں گداز، بہت کم منظومات، بہت کم اشعار میں ملتا ہے لیکن ان
وصف، اس کا حامل سوز ہوتا ہے۔ اور ایک ایسے شاعر کے لیے جو سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا، ٹھہرے ہوؤں کو آگے بڑھانا، بے
وصاعت معاشرے کو متحرک اور فعّال بنانا چاہتا ہے۔ جس کے ہاں "فرمانِ خداوندی" جیسی منظومات ملتی ہیں اور جو "بانگِ درا" او
لینا چاہتا ہے، اس کے ہاں سوز کی حیثیت ہی اساسی ہونی چاہیے۔ اقبال نے اس پہلو پر خاطر خواہ زور دیا ہے اور شاعری کی جو خو
میں سوز کو اہمیت دی ہے۔ اپنے اشعار میں بھی انہوں نے اس سمت اشارے کیے ہیں اور یہ چیز یں انہیں ہر دولتِ گراں بہا
امیر و سلطاں سے بھی ؎

عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے — وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی

قطع نظر اس کے، اقبال نے مختلف ادبی و شعری موضوعات و مسائل اور خود شاعروں اور اُن کے کلام کے بارے میں جہاں تہاں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کے مطالعہ سے اقبال کے تنقیدی مزاج، اُن کی ادبی تجزیاتی صلاحیتوں، اُن کے شعری ذوق اور مختلف زبانوں اور زمانوں کے ادب پر اُن کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہیں وہ اشعار کی بندش کو سراہتے ہیں تو کہیں فلسفیانہ نقطۂ نظر کی داد دیتے ہیں اور کہیں اسلوبِ بیان کی ستائش ہوتی ہے، اسی طرح انہوں نے ٹالسٹائی، غالب، سحابی نجفی، گوئٹے، ہیگل، اکبر الٰہ آبادی، حافظ، امراءالقیس اور مجموعی طور پر فارسی، عربی، جرمن اور انگریزی ادبیات کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔

عالمی ادب میں ٹالسٹائی کی اہمیت بے پناہ ہے۔ ٹالسٹائی دنیا کے اُن چند فنکاروں میں ہے جن کے فن کی عظمت اور وقعت نہ صرف ہر دور میں رہے گی بلکہ ہر دور میں اس عظمت و وقعت میں اضافہ ہوا ہے اور اضافہ ہوتا رہے گا۔ اقبال بمبئی سے یورپ کو روانہ ہوتے ہوئے جہاز میں عدن سے ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو مولوی انشاء اللہ خاں مدیر "وطن" لاہور کو خط لکھتے ہیں۔ ایک روسی جاننے والے پادری نے اقبال سے جب پوچھا کہ کیا تم ٹالسٹائی بننا چاہتے ہو تو وہ کہتے ہیں:

"ٹالسٹائی بن جانا آسان نہیں ہے۔ زمین سورج کے گرد لاکھوں چکر لگاتی ہے تب جاکے کہیں ایک ٹالسٹائی پیدا ہوتا ہے" [خطوطِ اقبال ص۹۱]

اسی دوران کوئٹہ کے انگریز ڈپٹی ہائی کمشنر سے ملاقات ہوئی جو عمر خیام کا بے حد مداح تھا۔ اقبال اُس سے کہتے ہیں:

"اہلِ یورپ نے ابھی سحابی نجفی کی رباعیات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ عمر خیام کو کبھی کے فراموش کر گئے ہوتے۔ [اقبال: دانائے راز ص۱۴۶، ۱۴۷]

اور یہاں دیکھئے فارسی اور انگریزی، دونوں ادبیات کا حوالہ ہے۔ بات میں کتنی گہرائی اور وزن و وقار ہے:

"افسوس یہ لوگ (اہلِ بمبئی) فارسی لٹریچر سے غافل ہیں ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ زرتشتی رنگ اس کے رگ و ریشہ میں ہے اور اسی پر اُس کے حسن کا دار و مدار ہے [اقبال کی تلاش ص۳۹]

اقبال نے "پیامِ مشرق" گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں لکھا جب کہ خود گوئٹے کے مغربی دیوان کا محرک "دیوانِ حافظ" ہے۔ جس کا فان ہیمر کا ترجمہ گوئٹے کی نظروں سے گزر چکا تھا۔ اقبال کے لیے "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں اس کا سرسری تذکرہ بھی کافی تھا لیکن اقبال ظاہر ہے معاشرتی اور تمدنی نقاد ہی نہیں تھے۔ بلند پایہ ادبی تنقیدی شعور بھی رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے دیباچۂ پیامِ مشرق میں عمیق نظری سے کام لیتے ہوئے حافظ اور گوئٹے کے فکر و فن کی روشنی میں بڑی گہرائی کے ساتھ اپنی بات پیش کی ہے۔ یہ اقتباس، تقابلی اور تجزیاتی تنقید کا عمدہ نمونہ بھی ہے:

"۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئٹے کی عمر اس وقت (۶۵) سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کے لئے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہوکر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا تھا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجانِ عظیم برپا کر دیا جس نے آخر کار مغربی دیوان کی ایک پایہ دار اور مستقل شکل اختیار کر لی مگر فان ہیمر کا ترجمہ گوئٹے کے لیے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب و غریب خیال کا ماخذ بھی تھا۔ بعض بعض جگہ اس کی نظم خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوتِ تخیل کسی خاص مصرعہ کے اثر سے ایک نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے" [دیباچہ — پیامِ مشرق]

اس کے علاوہ بھی گوئٹے کا فن اور بالخصوص اس کے ڈرامہ "فاوسٹ" پر اقبال کی نظر تھی اور وہ گوئٹے کی فنکاری کے غیر معمولی مداح تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے لکھا ہے :

"اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فاوسٹ اور شیطان کے عہد و پیماں کی قدیم روایت کے پیرایے میں انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن تصوّر میں نہیں آسکتا۔" [اقبال اور مغربی مفکرین صہ ۱۸۵]

عبدالمجید سالک نے "ذکرِ اقبال" میں اقبال کے جس مضمون "رسول اللہ صلعم کی شعر کے متعلق حیثیت میں" کا حوالہ دیا ہے اس کے مطالعے سے بھی شاعری، عربی شاعری اور عرب کے شاعر امراءالقیس کے بارے میں اقبال کے وسیع مطالعہ کا اندازہ اور اُن کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ عبدالمجید سالک کے الفاظ میں :

"اس مضمون میں آپ (اقبال) نے یہ حقیقت واضح کی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وقتاً فوقتاً اپنے عہد کی عربی شاعری کے متعلق جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا وہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ادبی نصب العین کے دلیلِ راہ رہیں گے۔ مثلاً حضور صلعم نے امراءالقیس کے متعلق جو اسلام سے چالیس سال پہلے ہوا ہے، ارشاد فرمایا۔ "ھو اشعر الشعراء و قائدھم الی النار" یعنی وہ شاعروں میں سب سے بڑا شاعر ہے لیکن انہیں جہنم کی طرف لے جانے والا لیڈر بھی ہے۔ اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ حضور اعلیٰ درجہ کی شاعری کے مرتبہ شناس بھی تھے اور امراءالقیس کی شاعری کے موضوعات کو ناپسند کرنے کے باوجود اس کے کمالِ شاعرانہ کا اعتراف فرماتے ہیں لیکن چونکہ اسی شاعر کی حسین و جمیل شاعری، سننے والوں کو حقائقِ حیات سے غافل کر کے اُن میں بے خودی کی کیفیت پیدا کرتی ہے اور مے معشوق کی طرف رہبری کرتی ہے اس لئے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔" ذکرِ اقبال صہ

شیخ عبدالقادر نے "بانگِ درا" کے دیباچہ میں لکھا ہے :

اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کو اُردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے اُن کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔" [کلیاتِ اقبال صہ ۹]

لیکن خود اقبال کو بھی غالب سے بے پناہ عقیدت تھی۔ انہوں نے اپنی نظم "مرزا غالب" میں غالب کو جس بلند آہنگ انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس سے اُن کے والہانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ گوئٹے کو غالب کا ہمنوا قرار دیتے ہیں بلکہ غالب کی شعری مرتبت کو یوں پیمانہ کر دیتے ہیں ؎

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

اس شعر سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ شاعری کے لیے اقبال فکر و تخیّل کی ہم آہنگی پر کس قدر زور دیتے ہیں۔

اقبال، اکبر الٰہ آبادی کی شخصیت اور شاعری، دونوں کے قدر داں تھے اور اس قدر کہ اُن کے ابتدائی رنگ کی شاعری پر اکبری رنگ غالب ہے۔ اقبال نے اکبر کے اسلوبِ شاعری اور مزاحیہ طرز ہی کی داد نہیں دی بلکہ اُن کے موضوعات، اُن کی باریک بینی، اُن کے تفکر اور فلسفیانہ رنگ کو بھی سراہا۔ اکبر نے ہنستے ہنستے بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں اور بعض سنجیدہ، ثقہ بلکہ فلسفیانہ موضوعات پر ایسے شگفتہ شعر کہے ہیں کہ معمولی ذہن کا قاری بھی بات کی تہہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ یہاں اکبر کا ایک شعر ہے اور اکبر ہی کے موسومہ مکتوب مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۴ء میں اقبال تحریر کرتے ہیں :

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اللہ! کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے۔ ہیگل، جس کو جرمنی والے افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے ہیں اور تخیل کے اعتبار سے حقیقت
طون سے بڑا۔ اس کا تمام فلسفہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ آپ نے ہیگل کے فلسفہ کو ایک قطرہ میں بند کر دیا اقبال نامہ ص ۴۳
کے ملک بھر کے لکھنے پڑھنے والوں، شاعروں اور ادیبوں سے مراسم رہے۔ اُن کی مقبولیت کا یہ بھی ایک ثبوت تھا۔ اِدھر جنوبی ہند کے
بھی اقبال کا ربط رہا۔ حیدرآباد، میسور اور مدراس میں تو اُن کے کئی قدرداں تھے۔ مدراس میں انہوں نے اپنے مشہور خطبات دیئے:
شکیل جدید"! ــــ چنانچہ اِن علاقوں میں اقبال کا آنا بھی ہوا۔ اس طرح مختلف اصحاب سے اُن کے تعلقات کے باعث اُن کو یہاں سے
ورنثری کتب وغیرہ آتے رہے ہوں گے مدراس کے ایک شاعر ابو المعانی محمد عبد الرحمٰن شاطر کے موسومہ مکتوب مورخہ ۴ ر فروری ۱۹۰۵ء
ات اور قصیدوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اکثر اشعار نہایت بلند پایہ اور معنی خیز ہیں۔ بندشیں صاف اور ستھری ہیں اور اشعار کا اندرونی دردِ مصنّف
کے چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہایت نمایاں کر کے دکھا رہا ہے۔ انسان کی روح کی اصلی کیفیت "غم" ہے۔ خوشی
ایک عارضی شئے ہے۔ آپ کے اشعار اس امر پر شاہد ہیں کہ آپ نے فطرتِ انسانی کے اس گہرے راز کو خوب
سمجھا ہے"۔ [خطوطِ اقبال ص ۶۹]

ں ہے کہ یہ ایک رسمی رائے ہے کیوں کہ اقبال کے مکاتیب وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے تو مترشح ہوگا کہ وہ اس معاملے رُو رعایت کے قائل
راے بڑی دو ٹوک اور تنقید بڑی جچی تلی ہوا کرتی ہیں۔ ان کا اندازِ تکلف بر طرف سا ہوتا ہے۔ وہ یقیناً ہمت افزائی سے بھی کام لیتے ہوئے
پھ نہ ہو اور صلاحیتوں کا فقدان ہو تو انھوں نے صاف صاف اور کھری کھری بھی سنا دی۔ ضلع لائل پور کے ایک شاعر، شاکر صدیقی نے
رتے ہوئے اقبال سے اصلاح کی خواہش کی تھی۔ لگتا ہے موصوف کا کلام اقبال کو جچا نہیں۔ ظاہر ہے رسماً دو چار الفاظ بطور ستائش لکھے
اس کی بجائے اقبال نے صدالحق کہی، انتہائی واضح انداز میں اور شاکر صدیقی ہی کے نام مکتوب میں :

اُردو زبان میں آپ سے زیادہ نہیں جانتا کہ آپ کے کلام کو اصلاح دوں۔ باقی رہے شاعرانہ خیالات و
سوز و گداز، یہ سیکھنے سکھانے کی شئے نہیں، قدرتی بات ہے۔ ان سب کے علاوہ مجھ کو اپنے مشاغلِ ضروری سے
فرصت کہاں کہ کوئی ذمہ داری کا کام اپنے سر لوں۔ میں نے آپ کے اشعار پڑھے ہیں۔ میری رائے میں آپ اس
جھگڑے میں نہ پڑیں تو اچھا ہے"۔ [اقبال نامہ ص ۴۱]

ل خود اپنی نظم کے اسلوبِ بیان کی تصریح کرتے ہوئے آل احمد سرور کو لکھتے ہیں مکتوب مورخہ ۱۲ ر مارچ ۱۹۳۷ء :

آپ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے لکچرر ہیں۔ اس واسطے مجھے یقین ہے لٹریچر کے اسالیبِ بیان سے مجھ
سے زیادہ واقف ہیں۔ تیمور کی روح کو اپیل کرنا تیموریت کو زندہ کرنا مقصود نہیں بلکہ وسطِ ایشیا کے ترکوں کو
بیدار کرنا مقصود ہے۔ تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوبِ بیان ہے۔ اسلوبِ بیان کو شاعر کا حقیقی تصور
کرنا کسی طرح درست نہیں۔ ایسے اسالیبِ بیان کی مثال، دنیا کے ہر لٹریچر میں موجود ہیں"۔ اقبال نامہ ص ۳۱۲

نے یہاں اپنے اسلوبِ بیان ہی کی مدافعت نہیں کی ہے عمومی طور پر اسلوبِ بیان کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ یہ ایمائی
راز اور اسلوب کو معنوی اعتبار سے یوں تہہ دار بنا کر پیش کرنا ہر عظیم فنکار کا وصف رہا ہے۔ خاص طور پر اُن فنکاروں
لینے کو کچھ ہوتا ہے اور جو اپنے فکر اور فلسفہ کو شاعری میں پیش کرنا چاہتے ہیں، اسلوبِ بیان کی نزاکتوں سے کما حقہٗ
۔ ایسے فنکار تشبیہات اور استعارات سے بھی کام لیتے ہیں، تلمیحات اور اشارات سے بھی۔ وضاحت سے بھی کام لیتے ہیں اور اجمال
نے بھی اُن سب کو آزمایا ہے۔ فلسفہ و شعر کی اُن کے ہاں حقیقت ہی یہ ہے کہ حرفِ تمنا اسے رُوبرُو نہ کہہ سکے ؎

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رُوبرُو

کے بقول کمالِ گویائی : برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است

اقبال نے ایک جگہ کہا ہے ؎

ہاں سُنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش
کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری

آیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ شاعری پیغمبری کا جزو ہے ؟ نہیں! — شاعری پیغمبری کا جزو اُسی وقت بنتی ہے جب وہ جزوی طور پر پیغمبرانہ صفات کی حامل بھی ہو۔ اور پیغمبروں کا ایک منصب یہ بھی رہا ہے کہ وہ معاشرے کی اصلاح کرتے ہیں اور فرد کو انسان بنانا چاہتے ہیں کیونکہ معاشرہ صالح ہوگا تو انسان صالح ہوگا اور انسان، انسان ہوگا تو معاشرہ صحیح خطوط پر گامزن ہوگا اور مختصر یہ کہ شعر اور شاعر کا کام یہی ہونا چاہیئے کہ فرد کو انسان بنانے میں مدد دے۔ اقبال نے شعر و ادب کو اسی زاویہ سے دیکھا، پرکھا اور عام کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے اسی زاویہ سے تخلیقِ شعر بھی کی اور تنقیدِ شعر بھی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

شعر را مقصود گر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

❁

غزل بخطِ اقبال

اقبال کی عکسی تحریر "اقبالیات" [illegible] مطبوعہ جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء سے لی گئی ہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود!
فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمالِ بے نقاب!

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب!

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب!

محمد اقبال

وحید عشرت
اقبال اکادمی پاکستان، ۱۳۹ - A نیو مسلم ٹاؤن - لاہور

اقبالؒ کا فلسفۂ انقلاب

حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے جب یہ فرمایا تھا کہ "گرما ؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے" تو اس وقت عالم اسلام ہی نہیں، دنیا کا بیشتر حصہ تو آبادیاتی استعماریت اور استبداد کی سیاسی ذہنی اور معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور جہاں نوآبادیاتی ظلم نے اپنے پنجے نہیں گاڑے ہوئے تھے وہاں ملوکیت، آمریت، جاگیرداریت اور مذہبی پیشوائیت اپنی مکروہ صورت میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا مقدر بنی ہوئی تھی۔ یورپ جو اپنی تہذیب کے نصف النہار پر تھا، سرمایہ دارانہ چیرہ دستیوں کے باعث ایک غیر تخلیقی رویہ رکھنے کی وجہ سے شاخِ نازک پر ایک ناپائیدار آشیانہ نظر آرہا تھا اور مارکس اور اشپنگلر اس کی برائیاں بیان کر کے اس کی زوال آمادگی کا نوحہ لکھ رہے تھے اور اسی سرمایہ دارانہ استبدادیت کی کوکھ سے اس کی ایک انتہا پسندانہ ضد اشتراکیت ابھر رہی تھی۔ اگر سرمایہ داریت تھیسس تھی تو اشتراکیت انٹی تھیسس اس کا سنتھیسس ٹوئن بی اپنی فکریات میں یہ پیش کر رہا تھا کہ تہذیب مغرب کو زوال سے بچانے کے لیے لازم ہے کہ مغرب اپنے تمدن کی نئی اساس بدھ مت کی وجدانیت، اسلام کی حسیت، ہندو کی اقلیت اور عیسائیت کی تصوریت پر استوار کرے اور یوں مختلف تہذیبوں کے حاصلات کو اپنی روح میں سموئے۔ یہ مشرق و مغرب میں ایک ہمہ گیر زوال کی حالت تھی جس میں اقبال نے اپنے انقلاب انگیز نغمات اور خیالات پیش کیے۔ منطقی ایجابیت، لسانی فلسفہ اور فرائڈیت کے تحت مرتب ہونے والی نفسیات اور اسی طرح ڈارون کی ارتقائیت نے مذہب کو شدید دھچکا لگایا تھا اور جدید دور میں اس سوال کو جنم دیا کہ کیا مذہب کا امکان ہے۔ مادہ پرستی اور مادیت پر مرتب ہونے والے فلسفوں نے مذہبی مابعد الطبیعیات پر لوگوں کا ایمان متزلزل کر دیا تھا اور فکری انسان نے تو اس بات کو فرنگی تمدن کے نتیجے کے طور پر پیش کیا کہ خدا مر چکا ہے، مذہب تو انسان نے فطرت کی بے پناہ اندھی قوتوں کے مقابل خود کو تحفظ اور قوت فراہم کرنے کے لیے ایجاد کیا اور خدا کے تصور کی نوعیت انسان کے لیے وہی ہے جو بچے کے لیے باپ کی ہے کہ وہ ماحول سے خود کو تحفظ دینے کے لیے باپ کی پناہ لیتا ہے۔ اسی پر انسان نے فطرت کی قوتوں سے خود کو محفوظ اور مامون رکھنے کے لیے باپ کے تصور پر خدا یا آسمانی باپ کا تصور پیش کیا۔ مارکس نے تو مذہب کو افیون کہا کہ یہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ سماج کا ایک آلہ تھا جس سے وہ اپنے زیردستوں پر اپنی آقائی مستحکم کرتے اور زیردست اس سے اپنی مفعولیت کی توجیہہ کرتے ہیں۔ تاریخ کی مادی تعبیر بھی کائنات کے مادی متصور ہونے اور مادہ کے ناقابلِ فنا اور ناقابلِ تحویل ہونے کے تصور کے تحت کی گئی۔ اقبال نے کائنات کی اس مادی تعبیر کو جدید طبیعیات کے حاصلات کی روشنی میں ناقابلِ قبول قرار دیا کیوں کہ جدید سائنسی تحقیقات نے مادہ کو قابلِ فنا اور مرئی سے غیر مرئی میں قابلِ تحویل ہونا ثابت کر دیا تھا۔ اس جدید ترین تحقیق نے ہر اس تصور کو کاٹ کر رکھ دیا جس کی اساس مادیت پر تھی۔ اس طرح اقبال نے کائنات کی نئی روحانی تعبیر سے ایک نئی مابعد الطبیعیات کو پیش کیا جس میں مذہبی تجربے کو اقبال نے فکر و دانش اور عقل کے وجدان سے ایک نامیاتی رشتہ کی دریافت کے ذریعہ ملایا اور اس طرح وحی، الہام، وجدان، عقلِ کلی اور عقلِ جزوی کو علم کے مختلف مگر باہم مربوط مراتب و درجات کے ایک تسلسل میں بیان کیا۔ جس طرح زندگی جمادات و نباتات، حیوانات اور انسانوں حتیٰ کہ فرشتوں اور ذاتِ الٰہی کے مختلف درجات اور مراتب سے گزرتی ہے اس طرح وحی سے عقل اور نامحسوس تجربے سے محسوس تجربے کے بھی مختلف مراتب اور درجات ہیں، یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی کہ اقبال کے تصورِ عقل و عشق کو نہایت غلط طور پر سمجھا گیا ہے، اقبال جب عقل پر تنقید کرتے ہیں تو عقلِ جزوی ان کی مراد ہوتی ہے۔ ایک درجے اور مرتبۂ وجود کے حقائق دوسرے مرتبۂ عقل سے جب بھی سمجھے جائیں گے کنفیوژن اور ابہام پیدا ہوگا، ہر مرتبۂ وجود اپنے حقائق کی تفہیم کے لیے ایک مخصوص اور متعین مرتبۂ عقل رکھتا ہے مثلاً مراتب وحی کا علم مرتبۂ وحی پر متمکن بصیرت کا ہی خاصہ ہے۔ کسی اور درجے عقل میں اگر مراتب وحی پر غور ہوگا تو ابہام ناگزیر ہے۔ یہیں سے وحی کا جواز پیدا

ہوتا ہے کہ مراتب بالا کے حقائق کے انکشاف بھی مرتبہ بالا میں ہی ممکن ہے۔ اقبال نے فکر اور وجدان میں نامیاتی رشتہ کی دریافت سے ایک: مباحث کا فکری سطح پر انقلاب پرور دروا کیا ہے۔ اقبال کا یہ علمی دنیا میں انقلاب ابھی پوری طرح متحقق اور نقطۂ توجہ نہیں بنا، تاہم نئی فکری بصیرت کی اساس رکھی جا سکے گی اور یہ انقلاب تمدّنی دنیا میں ایک بڑا انقلاب ہوگا جس سے مذہب کا ایک نئی محکم مابعد الطبیعی ہوگا۔

اقبال کے تصوّرِ مذہب کی اسی اساس پر کائنات کے حرکی تصوّر کا استدلال ہوا ہے۔ اقبال کے نزدیک کائنات پیہم نشو و نما پانے ارتقا کوش حقیقت ہے مگر کائنات کی یہ حرکت خود مکتفی ہے، کہیں خارج سے نہیں۔ کائنات کی غایت بھی اس کا اپنا باطنی لزوم ہے۔ اس کی کز اس کی کمی پر نہیں بلکہ اس کے اظہارِ ذات کے سبب ہے۔ خود یہ کائنات بھی ذات کا ایک اپنا پیرایۂ اظہار ہے۔ اس طرح سکون و اثبات فریب محض مرور اور دوران پر ہماری جزوی تقسیم اور نظر کا شاخسانہ ہے۔ کائنات کا یہ حرکی تصوّر، یونانیت کے سکونی تصوّر کے خلاف ایک انقا

اقبال نے اپنے اسی حرکی تصوّرات کا تاریخ، تمدّن اور عمرانی صورتِ حال پر اطلاق کرکے تاریخ، تمدّن اور سماج کو بھی ایک تعبیر کیا جو کبھی کسی ایک حالت پر قرار نہیں پاتی۔ ہم اسے اپنی سہولت کے لیے زمانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ تاریخ، تمدّن اور سماج کی اس نئی تعبیر نے تاریخ کے نامیاتی تصوّرات اور ان کے تحت تمدّنوں اور تہذیبوں پر بچپن، جوانی، بڑھاپا اور موت کے تصوّرات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اور ا اور اس کے متعیّن کے اس تصوّر کو رد کیا کہ اسلامی تہذیب و تمدّن پر بھی کہنگی کے بعد موت طاری ہو چکی ہے اور اب اس کے احیا کی کوئی صورت اقبال نے حیات بعد الموت کے حوالے سے خود زندگی کو بھی ایک مسلسل حرکت سے تعبیر کیا اور خود موت کو بھی زندگی کی ایک حالت کہا، اس طرح اسلامی بازآفرینی کا جواز پیدا کیا۔ زوال کو سکونی نظر اور عروج کو تمدّن کی حرکی نظر پر محمول کیا اور اسلامی تمدّن کے زوال کے منظر نامے میں یونانی بریکٹ کیا اور اسی سکونی فکر کے تحت کائنات اور حیات کے عالمِ فریب ہونے کے تصوّر پر پلنے والے تصوّف کی نفی کی ورنہ حقیقت کو حرکت ا زندہ حقیقت اور زندگی کو عمل ماننے والے تصوّف کے اقبال قطعاً خلاف نہ تھے۔ اقبال کا حرکی تصوّف، جو انسان کو اس کے اپنے مرتبۂ وجود ایک وجدانی اور وہبی ذریعہ ہے، تصوّف میں ایک انقلاب کی پیش بینی کا مظہر ہے، اقبال انسان کی وجودیاتی ضرورت تصوّف کے مما سکتے تھے۔

تمدّن، سماج اور عمرانی تصوّرات میں اقبال کا فلسفۂ حرکت کسی ایسے اجتماعی اصول کی یافت پر منحصر ہے جو ایسے اداروں کی تشکیل کر روحانی استخلاص ہو سکے۔ اقبال کے نزدیک یہ اصول سلطانی جمہور ہے جس میں مقتدرِ اعلیٰ خدا ہے اور انسان اس کے نائب کی حیثیت سے ا ایک ایسی ہیئت حاکمہ متشکل کرتے ہیں جو ان کے روحانی اور مادی استخلاص کے لیے اسباب و وسائل کی منصفانہ دستیابی کی صورت گرا اداروں کو متشکل کرتی ہے۔ اقبال کے اس انقلابی تصوّر نے ہر طرح کی ملوکیت، آمریت، استبدادیت، مذہبی پیشوائیت اور مذہبی اد کاٹ کر رکھ دی ہے اور انسان کا رشتہ مسلم سماج میں گھٹن پیدا کرنے والے ملوکانہ عہد کے اداروں سے منقطع کر کے براہِ راست خدا، ا اور اس کی کتاب قرآن سے جوڑ دیا ہے۔ اسی تصوّر کے تحت اقبال نے تنگ نظر مذہبی پیشوائیت اور فرقہ بندی کی جڑ کاٹنے کے لیے ایک منتخب پیش کیا جس کے ارکان مغربی جمہوریت کی طرح محض ایک ووٹ کے تصوّر پر منتخب نہ ہوں بلکہ ان کا انتخاب تو پوری امّتِ مسلمہ کے ارکان کو اساس اور معیار اس کا اہلِ رائے ہونا، تفقہ فی الدین رکھنا اور امورِ مملکت اور امورِ دنیا میں حکیمانہ دسترس ہو۔ اہلِ رائے کی ایک ایسی کو اقبال ریاستی سطح پر اجتہاد کا حقدار گردانتے ہیں اور ایسی پارلیمان کے ارکان ہی ایک ایسی مسلم ریاست کی تشکیل کر سکتے ہیں جو قرآن کے ر ربوبیت کی مظہر ہو جس میں معاشی عدل کی فراوانی ہو، مسلم ریاست کو استحصال کی تمام صورتوں سے اس طرح پاک کر دے جس طرح نے بتوں کو پاک و صاف کر دیا تھا۔ دولت کو بچت کے اصول پر منجمد کرنے کی بجائے اسے بھی زکوٰۃ، انفاق اور تجارت کے اصول پر حرکت دولت کا اصول بچت کی بجائے تجارت کو بنائے، اس نکتہ کی وضاحت ہم کسی اور مقالہ میں کریں گے یہاں صرف یہ بات ذہن نشین کرانا مق کے انجماد اور دولت کے ذریعے استحصال کے ذرائع قطع کر دیے جائیں بلکہ افزائشِ دولت اور استفادۂ دولت کے ذرائع معاشرے کے رکھیں، ریاست کا بنیادی وظیفہ ہو کہ وہ دولت کی تقسیم و افزائش کو مسلسل اور متوازن رکھنے کے لیے اقدامات کرتی رہا کرے۔ اقبال کے ا

کی منزل کا حصول عالمِ مادّی کے اسباب و ذرائع کی منصفانہ بلکہ اسلام کے اصولِ احسان پر تقسیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی سے اقبال کے نزدیک تمیزِ آقا و بندہ ختم ہو سکتی ہے۔ ان سارے تصوّرات کی اطلاقی جہت کے تعیّن کے لیے اقبال جدید سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دنیا میں ہونے والے تجربات کے حاصلات کو پیشِ نظر رکھنے پر توجّہ دلاتے ہیں۔ کم ظرف لوگوں نے اپنی کم فہمی کی وجہ سے اقبال کو سوشلزم کا حامی بنا ڈالا حالانکہ اقبال ان تجربات کی منہاجیات، اسلوب اور نتائج کا مطالعہ کرنے پر توجّہ دلاتے ہیں تاکہ ہم ان سے استفادہ کرتے ہوئے خود اپنے اجتماعی اور انفرادی رویّوں کو منظّم کر سکیں۔

انقلاب اقبال کے ہاں کسی توڑ پھوڑ، نعرے بازی اور مختلف طبقات میں آویزش بپا کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ انسان کے رویّہ اور ذہن و دل کی تبدیلی کا عمل ہے جو ایک پورے معاشرے کو ایک متحرک اور فعّال قوّت میں منقلب کر دیتا ہے۔ اقبال کے اسی فلسفۂ انقلاب نے قوموں کے لیے آزادی کی حُدی خوانی کی اور اقبال کا یہی فلسفۂ انقلاب آج کی معروضی صورت میں قوموں کو اپنے ذہنی، فکری اور سماجی نظامات کو متشکل کرنے کے لیے بھی بنیادی منہاج اور رویّہ فراہم کر سکتا ہے بشرطیکہ اس میں ذرا اتر کر غوّاصی کی جائے۔ ❁

بنام شیخ عنایتُ اللہ

معروف اشاعتی ادارے تاج کمپنی لمیٹڈ مینجنگ ڈائرکٹر کے نام اقبال کے اس خط کا عکس پہلی بار تاج کمپنی کی شائع کردہ کتاب حیاتِ اقبال میں شائع ہوا

[illegible] السلام علیکم

[illegible] مبارک

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

محمد اقبال ۲۲ [illegible]

لاہور [illegible]

رفیع الدین ہاشمی

شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، لاہور

۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب

(ایک مختصر جائزہ)

۱۹۸۶ء کے اقبالیاتی ادب پر نظر ڈالیں تو اس کی حدود مختلف اطراف میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ذخیرۂ ادب کی مختلف سطحیں ہیں اور کئی نوعیتیں۔ دورانِ سال میں بعض مستقل اور مخصوص موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی اور حوالہ جاتی کتابوں کے علاوہ مقالات و مضامین کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ اسی طرح مجلّات کے اقبال نمبر، جامعات کے امتحانی مقالے اور کلامِ اقبال کے ترجمے اور تشریح سے متعلق کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ پھر ایک بڑا ذخیرہ رسائل و اخبارات میں شائع شدہ متفرق مقالات و مضامین کا ہے۔ اس سال علامہ اقبال کا کچھ نیا متن دریافت ہوا ہے، اور خطوط کے دو پُرانے مجموعے اور انگریزی خطبات نئی تحقیق و تدوین کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ چند اہم کتابیں مکرر اشاعت پذیر ہوئی ہیں ـــــ علاوہ ازیں اقبالیات اور اقبالیاتی ادب کے متفرقات، اور بعض ایسے پہلو ہیں، جن کا تذکرہ سالانہ جائزے میں ناگزیر ہے۔

متنِ اقبال: ۱۹۸۶ء میں علامہ کا ایک غیر مطبوعہ انگریزی مضمون دریافت ہوا ہے، اور نو غیر مطبوعہ خطوط۔ مضمون بہ عنوان: BEDIL IN THE LIGHT OF BERGSON ڈاکٹر تحسین فراقی اور اقبال اکادمی پاکستان کے مجلّہ: "اقبال ریویو" (اکتوبر تا دسمبر) کے توسط سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ اصل مضمون بہ خطِ اقبال، اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے۔ اس مضمون سے، مرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴ء ـــ ۱۷۲۰ء) سے علامہ کے ذہنی استفادہ و تاثر کی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔ بیدل اور برگساں کے بارے میں اقبال نے کسی اور جگہ، اس قدر شرح و بسط کے ساتھ اظہارِ خیال نہیں کیا۔ ڈاکٹر فراقی نے علامہ کے اس مضمون پر اپنے مفصّل اور سیر حاصل تعارف میں اقبال کی شیفتگیِ بیدل، ان سے علامہ کے تاثر، اور دونوں کے مابین مماثلتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسری دریافت علامہ کے نو غیر مطبوعہ خطوط ہیں۔ بیجاپور کی امینہ بی بی کے نام دو خطوں (اقبالیات مثنا سری نگر) سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بی بی امینہ کو مثنویِ رومی کے منظوم ترجمے سے منع کیا کیونکہ ان کے خیال میں شاعری سے منظوم ترجمے کی کاوش ایک بنیادی غلطی ہے۔ دوسرے خط میں علامہ نے ہندوستانی تصوّف سے لاتعلقی ظاہر کی ہے، جو اُن کے نزدیک ہندوستان میں زوالِ اسلام کا ایک اہم سبب بنا ہے۔ تیسرا خط (اقبال ریویو، اپریل تا ستمبر) ریاست بہاول پور کے نواب صادق محمد عباسی کے نام ہے علامہ نے ۱۹۳۷ء کے اس خط میں مسلمانوں کے بارے میں کانگریس کے رویّے پر نکتہ چینی کی ہے۔ کہا ہے کہ بندے ماترم ایک سیاسی گیت ہے۔ یہ خط برّاعظم میں اسلام اور اسلامی تہذیب کے مستقبل کے بارے میں اقبال کے خدشات اور ان کی فکرمندی کا آئینہ دار ہے ـــــ "نقوش" لاہور میں م حسن لطیفی کے نام علامہ کے چھ خطوں کے عکس چھپے ہیں۔ یہ ذاتی نوعیت کے خطوط ہیں۔

متنِ اقبال کا کچھ حصّہ، از سرِ نو مرتب و مدوّن ہو کر سامنے آیا ہے۔ ایک تو خطبات کا محشّی ایڈیشن ہے اور دوسرے مکاتیبِ اقبال کے دو مجموعے۔ پروفیسر ایم سعید شیخ نے برسوں کی تحقیق و پژوہش کے بعد RE CONSTRUCTION کا محشّی ایڈیشن تیار کیا ہے۔ (ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور) اس متن میں اہتمامِ رموزِ اوقاف کے علاوہ اسماء و اعلام، نثری اقتباسات اور اشعار صحیح صورت میں درج کیے ہیں۔ ـــــ پروفیسر ایم سعید شیخ کا حاصلِ تحقیق متنِ کتاب پر ان کے حواشی و تعلیقات اور کتابیات اور اشاریہ ہیں۔ یہ نوّے صفحے، مقدار سے قطعِ نظر، اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے سیکڑوں، بلکہ ہزاروں صفحات پر بھاری ہیں۔ فاضل مرتب نے اس تحقیق میں کیا کیا کھکھیڑ اٹھائی، اس کا اندازہ اس کام کو دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ اس عظیم الشان کام پر مرتب کے ہاں کوئی ادعا نہیں تھا۔ صحیح معنوں میں ایک عالم کی سی شان

کے ساتھ، وہ اُن افراد اور اداروں کا نام بنام کرکے شکریہ ادا کرتے ہیں، جن سے کسی نہ کسی درجے میں بھی انھیں تعاون ملا۔ پروفیسر ایم سعید شیخ کا یہ کام غیر معمولی ہے، اور متنِ اقبال کی تدوین کے سلسلے میں ایک معیاری بلکہ مثالی کام ہے۔ جناب محمد عبداللہ قریشی نے "شادِ اقبال" (مرتبہ: ڈاکٹر محی الدین قادری زور) اور "صحیفہ" (اقبال نمبر جلد اوّل، اکتوبر ۱۹۷۳ء) میں شائع شدہ مکاتیب اقبال بنام شاد کو یکجا کرکے نئی (زمانی) ترتیب اور حواشی و تعلیقات کے ساتھ " اقبال بنام شاد" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اصل میں تو یہ "شادِ اقبال" ہی کا اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ ہمارے خیال میں اس مجموعے کا اصل نام برقرار رکھنا چاہیے تھا، اور سرورق پر ڈاکٹر زور کا نام بھی درج کرنا قرینِ انصاف تھا۔ خطوطِ اقبال کا ایک اور مجموعہ "مکاتیبِ اقبال بنام نیاز الدین خاں" دوبارہ شائع ہوا ہے (ناشر: اقبال اکادمی پاکستان لاہور) اس ایڈیشن میں مکتوب الیہ کے مختصر تعارف، خطوطِ گرامی بنام نیاز الدین خاں اور اسمار الرجال کا اضافہ کیا گیا ہے۔ محمد شریف بقا نے "موضوعاتِ اقبال" کے نام سے مختلف عنوانات کے تحت اقبال کے اردو کلام کا ایک انتخاب پیش کیا ہے۔

کلامِ اقبال کا ترجمہ:۔ THE SECRETS OF THE SELF کے نام سے "اسرارِ خودی" کا منظوم ترجمہ (از: مقبول الٰہی) اقبال اکادمی پاکستان لاہور نے شائع کیا ہے۔ مقبول الٰہی کا یہ ترجمہ خاصا کامیاب ہے، اور اکثر صورتوں میں نکلسن کے ترجمے سے بہتر ہے۔

کتبِ حوالہ:۔ اس سال کے حوالہ جاتی کاموں میں اقبال کے اردو کلام کے الفاظ و تراکیب کا اشاریہ "کلیدِ اقبال" (مرتبہ: محمد یونس حسرت۔ ناشر: اقبال اکادمی پاکستان لاہور) سرِفہرست ہے۔ اس کی مدد سے، اقبال کے کسی شعر یا مصرعے میں مذکور کسی ایک لفظ کے ذریعے، شعر تک رسائی ہوسکتی ہے۔ یہ کتاب، اس شعبے میں کی جانے والی سابقہ کوششوں پر ایک اضافہ ہے۔ محض اضافہ نہیں بلکہ نسبتاً ایک بہتر، جامع تر اور سائنٹی فک کام ہے۔

ڈاکٹر محمد ریاض کی مرتبہ "کتاب شناسی اقبال" (ناشر: مرکزِ تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد) فارسی میں علامہ اقبال کی پہلی ببلوگرافی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتابوں اور اقبال نمبروں کی ببلوگرافی ہے، مگر کہیں کہیں مضامین کے حوالے بھی شامل ہوگئے ہیں۔ بعض حوالے اجمالی اور بعض وضاحتی ہیں۔ بہت سے اندراجات میں تکرار ہے اور ترتیب بھی درست نہیں۔ متعدد کتابوں کے اصل ناموں TITLES کے بجائے ان کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ یہ کام بہت عجلت میں انجام دیا گیا، اس لیے اس کے نقائص کچھ زیادہ باعثِ تعجب نہیں۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ناشر نے کتاب کے دیباچے میں، ان نقائص کا ذکر کرتے ہوئے، فردِ جرم تمام تر مرتب پر عائد کی ہے۔ ہمارے خیال میں ناشر کا رویّہ کاروباری اخلاقیات کے منافی ہے۔

تیسری حوالہ جاتی کتاب "مطالعۂ تلمیحات و اشاراتِ اقبال" (ڈاکٹر اکبر حسین قریشی) کا نیا ایڈیشن متعدد مفید اضافوں کے ساتھ اقبال اکادمی لاہور نے شائع کیا ہے۔ پہلا باب بہ عنوان: " اقبال کا ماحول اور شخصیت" متعدد ترامیم کے باوجود، ہنوز اصلاح و تصحیح طلب ہے۔ بلکہ اسے ازسرِ نو لکھنے کی ضرورت ہے۔

اقبال کی سوانح اور شخصیت:۔ "اقبال کی ابتدائی زندگی" (ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین) سے اقبال کی ابتدائی تعلیمی زندگی کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ بکھرے ہوئے تحریری مواد کو یکجا کرنے کے ساتھ مصنف نے بعض زبانی روایات، اور چند نئے ماخذات کی مدد سے نئی معلومات مہیا کی ہیں۔ مصنف نے جو کاوش اور محنت کی ہے، وہ داد و ستائش کے لائق ہے مگر فاضل محقق کی مہیا کردہ بعض معلومات زائد از ضرورت اور غیر متعلق محسوس ہوتی ہیں۔ بعض مقامات (ص ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۴۸، ۸۱، ۹۱، ۹۶ وغیرہ) پر وہ تضاد بیانی کا شکار ہوگئے ہیں اور کہیں محض ظن و تخمین سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ تاریخ ولادت کی بحث بے حد تشنہ ہے۔ اسی طرح حقائق و واقعات اور استخراجِ نتائج میں کہیں کہیں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوسکی۔ بایں ہمہ بحیثیت مجموعی: "یہ کتاب اقبالیات میں ایک اہم اضافہ قرار دی جاسکتی ہے۔" (ڈاکٹر وحید قریشی) ڈورس احمد کی یادداشتوں پر مشتمل IQBAL : AS I KNEW HIM (ناشر: اقبال اکادمی پاکستان لاہور) علامہ اقبال کے آخری دو سالوں کے حوالے سے ان کی شخصیت کا دلچسپ مرقع ہے۔ اس کتاب سے علامہ کی دین داری، قرآن حکیم سے ان کے غیر معمولی شغف، لباس کے معاملے میں بے نیازی، مالی تنگ دستی، ملازمین سے حسنِ سلوک، بچوں سے غیر معمولی شفقت و محبت اور ان کے بارے میں علامہ کی فکر مندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال اپنے بقول "ایک معذور کی سی زندگی" بسر کر رہے

تھے، مگر طویل علالت اور تفکرات کے باوجود زود رنجی، کبیدہ خاطری یا چڑچڑے پن کا شکار نہیں ہوئے ـــــ یہ کتاب علامہ اقبال اور رجالِ اقبال کا ایک بے لاگ اور معروضی کوائف نامہ ہے۔ اور علامہ کی شخصیت کی بلاواسطہ گواہی، اور اس اعتبار سے سوانحِ اقبال کا ایک بنیادی ماخذ بھی ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل کی "اقبال، سوانح ۽ افکار" (ناشر: اقبال اکادمی پاکستان لاہور) سندھی زبان میں علامہ کی دوسری سوانح حیات ہے، جس کا ایک حصہ تصانیف اقبال کے تعارف اور اقبال کی شاعری اور فکر و فلسفے کے تجزیہ و تنقید پر مشتمل ہے۔ مصنف اقبال کے ایک راست فکر نقاد اور شارح ہیں، مگر ان کی بعض تشریحات محلِ نظر ہیں۔ "اقبال اور حیدر آباد" میں سید شکیل احمد نے زیر بحث موضوع کے بعض نئے زاویے اجاگر کیے ہیں۔ مصنف کا موقف یہ ہے کہ حیدر آباد میں کسی منصب یا ملازمت کا حصول، علامہ کا مقصود بالذات نہ تھا۔ ان کی جانب سے اپنی خدمات کی پیش کش اس وجہ سے تھی کہ وہ حیدر آباد کو اس بھنور سے نکالنے کے لیے فکرمند تھے، جس میں وہ گھرا ہوا تھا۔ مصنف نے علامہ سے متعلق، سرکار حیدر آباد کے نامناسب رویّے کو ہدفِ تنقید بنایا ہے کہ سب سے بڑی مسلم ریاست محض سیاسی وجوہ کی بنا پر اقبال کو وظیفہ نہ دے سکی۔ سید شکیل احمد کی یہ کتاب، اپنے موضوع پر ایک معروضی مطالعہ ہے۔ ایک حیدر آبادی مصنف کا ایسا ناقدانہ رویّہ اور ایسی حقیقت پسندانہ جرأت مندی قابلِ قدر ہے۔

ہمارے یہاں جس نفسیات کی تدریس ہوتی ہے، وہ تقریباً تمام تر مغرب سے مستعار ہے۔ ہمارے ہاں شخصیات کے نفسیاتی تجزیے بھی بالعموم مغربی کلیوں کی روشنی میں کیے جاتے ہیں۔ "اقبال کی شخصیت کا نفسیاتی جائزہ" (امتحانی مقالہ برائے ایم ایس سی نفسیات گورنمنٹ کالج لاہور) توقیر سلیم خان کی ایسی ہی کاوش ہے۔ معلومات اور مطالعے کی کمی ہے۔ پھر مقالہ نگار نے اقبال کی شخصیت اور ماحول کو بعض مغربی نفسیاتی زاویوں سے دیکھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ بہت سی متضاد باتیں کہہ گئے ہیں۔ بعض تاثرات سطحی ہیں اور سرسری طور پر اخذ کیے گئے ہیں تاہم آخر میں انھوں نے صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال فلسفیانہ اور خلاق ذہن کے مالک تھے اور نفسیاتی طور پر صحت مند شخصیت کے مالک تھے۔ ڈاکٹر شہین دخت مقدم صفیاری نے "جاویدانِ اقبال" کا حصہ سوم شائع کیا ہے۔ یہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی "زندہ رود" کا فارسی ترجمہ ہے۔

محمد امین زبیری نے "خدوخالِ اقبال" میں اقبال کا سوانحی مطالعہ خاصی پست سطح پر، اور منفی ذہن سے کیا ہے۔ اس کتاب میں مذاق و تمسخر، طنز و تعریض اور استہزا کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں دیا گیا۔ ہر وہ بات جو علامہ کے حق میں جاتی ہے، مصنف کو مشکوک اور مشتبہ نظر آتی ہے اور ہر ایسا واقعہ جس سے ان کا امیج بلند ہوتا ہے، زبیری صاحب کے نزدیک مجہول ہے، احساس ہوتا ہے مصنف، اقبال کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ ہمارا تاثر ہے کہ مصنف حسِ لطیف، ذوقِ سلیم اور کامن سنس سے عاری تھے۔ کتاب میں صریح بے انصافی کی بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ کتاب کسی سنجیدہ مطالعے یا علمی مباحثے کے لائق نہیں۔

سوانحی مطالعے کے سلسلے میں چند معلومات افزا مضامین بھی شائع ہوئے ہیں مثلاً محمد زبیر شوکت الٰہ آبادی کا "چند یادگار لمحے" (تجارت" کراچی ۹ دسمبر) محمد صدیق کا "علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج" ("فاران" لاہور) ممنون حسن خاں کا انٹرویو (قومی زبان کراچی۔ مارچ) اور راغب کا مضمون "دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا ورودِ مسعود" (نوائے وقت میگزین ۲۲ اگست)

فکر و فن پر تنقیدی کتابیں:۔ مفکر اور فلسفی کے بجائے، شاعر اقبال کا مطالعہ، ہندوستان میں اقبال شناسی کا اہم رجحان ہے۔ قاضی عبید الرحمن ہاشمی کا تحقیقی مقالہ "شعریاتِ اقبال" (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی) اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مصنف نے قارئین کو بار بار ایک ایسے نکتے کی طرف متوجہ کیا ہے، جو اقبال کے فن کے سابقہ مطالعوں میں نمایاں نہیں ہو سکا، اور وہ یہ ہے کہ اقبال کی تشبیہات و استعارات اور علامات کا بڑا حصہ، ان کی دینی بصیرت اور مذہبی اعتقادات کی پیداوار ہیں، اور اسی لیے ان کے ہاں، مذہبی شعور کے واسطے سے ایک نئی شعری جمالیات وجود میں آئی ہے۔ اسی طرح یہ کہ اقبال کا نظریۂ فن و ادب، ان کے تصورِ دین سے عبارت ہے، پروفیسر محمد منور کے مجموعۂ مضامین DIMENSIONS OF IQBAL میں علامہ کے فکری و ادبی سرمائے، برعظیم کی سیاست میں ان کے کردار، اقبال کے تصورِ جمہوریت، اقبال اور مرگِ حجازی، اقبال اور بنی آدم کی خوا گرگری اور ایمان و ایقان کی آزمائش پر حوالہ اقبال ایسے اہم موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ ان سب مضامین میں قرآنی حوالہ بہت نمایاں ہے۔ مصنف کے نزدیک جہانِ اقبال، دراصل جہانِ قرآن ہے۔ یہ کتاب "اقبالیات کے فروغ پذیر ادب میں ایک خوش آمیز اضافہ ہے"

ڈاکٹر جاوید اقبال، ان کی دوسری کتاب، اقبال میموریل لیکچرز کے سلسلے میں ان کا خطبہ ہے، جو پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا گیا۔ یہ دو حصوں میں

ہے۔ خطبہ کا بنیادی موضوع آدم کی خود شناسی ہے۔ اقبال محی الدین کی "حرفِ اقبال" علامہ اقبال کے وحدت الوجودی خیالات کی توضیح و تشریح اور تعبیر و تاویل پر مبنی ہے۔ انھوں نے بحث یا استدلال نہیں کیا، مگر اشعار بہت جمع کر دیے ہیں یہ کوئی علمی تصنیف نہیں، وحدت الوجود کے حق میں ایک طویل خود کلامی ہے۔ "اقبال اور جدّوجہد آزادی" حمید رضا صدّیقی اور اجمل صدّیقی کی مشترکہ تالیف ہے (ناشر: کاروانِ ادب ملتان)۔ اصل موضوع اقبال اور جدوجہد پاکستان ہے۔ مصنّفین کو اس سے اتفاق نہیں کہ علّامہ نے سب سے پہلے خطبہ الہ آباد کے ذریعے علاحدہ وطن کا تصوّر پیش کیا۔ ان کے خیال میں علامہ کے ہاں جداگانہ وطن کا تصوّر، اس سے بہت پہلے ۱۹۱۰ء کے خطبہ علی گڑھ میں موجود ہے۔ اقبال اکادمی لاہور کی شائع کردہ "اقبال اور ثقافت" (از مظفر حسن ملک)، کی بحث میں یہ امر تشنۂ وضاحت رہ گیا کہ بذاتِ "ثقافت" کا مفہوم کیا ہے؟ اور کیا اس کی حدود متعیّن ہو سکتی ہیں؟ اگر یہ طے ہو جاتا تو یہ پھیلی ہوئی بحث مرتکز ہو کر کسی قدر نتیجہ خیز صورت اختیار کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی " علّامہ اقبال اور بلوچستان" (ناشر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد) "بلوچستان میں اقبال شناسی کا ایک خوبصورت مرقع ہے" (ڈاکٹر محمد صدیق شبلی) مصنّف نے پرانے اخبارات و رسائل سے لوازمہ جمع کرنے میں غیر معمولی کاوش سے کام لیا ہے اور معلومات و مواد کی پیش کش میں بھی۔ بحیثیتِ مجموعی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ باب دوم (علّامہ اقبال کی بلوچستان میں تشریف آوری) کتاب کا اہم ترین باب ہے مگر یہی سب سے مختصر اور کمزور باب بھی ہے۔ جناب محمد حسن کی کتاب "اقبال، اسلامی جمہوریہ پاکستان، جنرل محمد ضیاء الحق" اپنے نام کی طرح موضوعاً بھی دلچسپ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال اس صدی کا ممتاز ترین شاعر ہے، اور ان کے مرتبے کو دنیا کا کوئی شاعر نہیں پہنچ سکا۔ لیکن بیک وقت ایک اچھا شاعر ہونا اور ایک اچھا مسلمان ہونا بہت مشکل ہے۔ اقبال کے ہاں ان کے عقیدے اور شاعرانہ تقاضوں میں مسلسل تصادم ہوتا رہتا ہے۔ شاعر اقبال اکثر اوقات گمراہی کی حد تک شاعرانہ باتیں کر جاتا ہے، مثلاً علامہ کا یہ شعر: ؎

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم   نہایت اس کی حُسینؓ، ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

ان کے "بدعقیدہ ہونے کی کھلی علامت" ہے (ص ۲۲) کیوں کہ انہوں نے حسین ابن علیؓ کا نام، ایک پیغمبر کے ساتھ لیا ہے۔ اور دونوں کو برابر مقام دیا ہے۔ وغیرہ " رومی و اقبال و حکمتِ قرآن" جناب رئیس امروہوی کے بقول نوجوان اور "بھرپور مصنّف، محقّق اور مفکّر" عمران لیاقت حسین کی "عالیشان تصنیف" ہے، جس سے بظاہر یہ مقصود ہے کہ رومی و اقبال کے افکار حکمتِ قرآنی کے نور سے مستنیر ہیں۔ ایک اقتباس: "مولانا روم کی مثنوی، غزلیات، قصائد اور منقبت کا پچھتر فیصد حصّہ حضرت علیؓ کے فضائل سے جگمگا رہا ہے... علّامہ اقبال کے کلام میں بھی نوّے فیصد اشعار، جو عشق سے متعلّق ہیں، ان کا مرکز بھی حضرت علیؓ کی ذاتِ مبارکہ ہے"۔ پونے چار سو صفحات کی اس کتاب میں اقبال اور رومی کے اشعار اس قدر کثیر اور مختلف مصنّفین کے نثری اقتباسات اتنے طویل ہیں کہ مصنّف کی اپنی تحریر کل ضخامت کے ایک چوتھائی سے بھی کم ہوگی۔ ہزار بارہ سو اغلاطِ کتابت کے لیے "تصحیح نامے" کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ "اقبال کا وجدانِ توحید" کے عنوان سے ملک غلام حیدر نے علّامہ کے تصوّرِ توحید کو، آنحضورؐ کی صدائے توحید کی بازگشت قرار دیا ہے ـــــ ایک اور مختصر کتابچے " علّامہ اقبال، سیّد مودودی اور تحریکِ پاکستان" میں ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدّین نے اس الزام کا دفاع کیا ہے کہ مولانا مودودی تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔

علّامہ اقبال کی شاعری اور افکار نے عالمِ عرب کو متاثر کیا ہے اور عرب دانشوروں اور مصنّفین کے ہاں اقبال شناسی کا حوصلہ افزا رجحان فروغ پزیر ہے۔ اس سال عربی زبان میں ایک کتاب، مقالات کا ایک مجموعہ اور چار کتابچے شائع ہوئے ہیں۔ مصری مصنّف عبد اللطیف جوہری کی کتاب "مع اقبال، شاعر الوحدت الاسلامیۃ" ایک تعارفی، معلوماتی اور عمومی نوعیّت کی ہے۔ ان کے ہاں اقبال سے عقیدت کا گہرا جذبہ نظر آتا ہے۔ عربوں کے روایتی خطیبانہ لہجے نے تحریر کو اور موثر بنا دیا ہے۔" نداء اقبال" اقبال کانفرنس دمشق (نومبر ۱۹۸۰ء) کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ بیشتر مقالات عمومی نوعیت کے ہیں۔ بعض دانش وروں پر عرب قوم پرستی کا اثر نظر آتا ہے۔ بعض کو علامہ کی انقلاب پسندی اور انسان دوستی میں کشش محسوس ہوتی ہے۔ کہیں کہیں معلومات کی کمی بھی نظر آتی ہے۔ بایں ہمہ اقبال کی شخصیت اور افکار کی جانب ان کا رویّہ پُرجوش، تائیدی اور عقیدت مندانہ ہے۔ اس مجموعے کا سب سے اچھا مقالہ ڈاکٹر سعید رمضان البوطی کا ہے ـــــ "اقبال پاکستان" دمشق کے پاکستانی سفارت خانے کا شائع کردہ ایک تعارفی کتابچہ ہے۔ محمد اقبال سہیل کے کتابچے "اقبال والامۃ الاسلامیۃ" میں بتایا گیا ہے کہ

علامہ نے اپنی عبقریت اور تجزیہ و تحلیل کی غیر معمولی صلاحیت کے سبب نہ صرف امتِ اسلامیہ کے امراض کی تشخیص کی، بلکہ اس سے نجات کے لیے دوا بھی تجویز کی ہے۔" المسئولیۃ الخلقیۃ فی فکر الدکتور محمد اقبال" میں ڈاکٹر عبد الباری الفضلی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ علامہ ایک روحانی مورالسٹ ہیں مگر ان کے معیارات اسلامی اور فکر قرآنی سے ماخوذ ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن عبد الرحمٰن نے اقبال تعقبا یا معاصرہ میں مغربی فکر و تہذیب خصوصاً اس کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظریات پر اقبال کے نقد و انتقاد کو بیان کیا ہے۔

۱۹۸۷ء میں مقالات کے مجموعے نسبتاً کم تعداد میں سامنے آئے۔ تین مجموعے اقبال اکادمی نے شائع کیے، اور تین دیگر ناشرین نے۔ ڈاکٹر وحید عشرت کا مرتبہ " اقبال ۸۴ء" ایک سال کے ۳۷ منتخب مضامین اور تقریباً ۸۰ مضامین کی تلخیص پر مشتمل ہے، اور اس اعتبار سے یہ سال کا ضخیم ترین مجموعہ ہے۔ " افکار اقبال" میں محمد حامد نے دو نکات کو اجاگر کیا ہے۔ اوّل: اقبال مسلمانوں میں علمی تحقیق کا ذوق پیدا کرنے کے شدید آرزومند تھے۔ دوم: سیاسی آزادی کے باوجود عالمِ اسلام ذہنی اور فکری اعتبار سے مغرب کا غلام ہے، فکرِ اقبال کا تقاضا ہے کہ اس صورتِ حال سے نجات حاصل کی جائے۔ ڈاکٹر آغا یمین نے " اقبال اور نژادِ نو" (بزم اقبال لاہور) کے مقالات نوجوان نسل کی رہنمائی کے لیے تحریر کیے ہیں۔ لہٰذا توقع ہے کہ "یہ مضامین پاکستانی طلبہ اور نوجوانوں کے لیے تفہیم اقبال میں مفید ثابت ہوں گے...... [اور] انہیں وہ پذیرائی حاصل ہوگی، جس کے وہ مستحق ہیں" (ڈاکٹر وحید قریشی) " تعاریر بیادِ اقبال" (مرتبہ: شعبۂ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد) میں تقاریب یوم اقبال کے منتخب مضامین اور تقاریر کو یکجا کیا گیا ہے۔" اقبال شناسی" (مرتبہ: مشرّف احمد) بھی منتخب مقالات کا مجموعہ ہے۔ یونس جاوید کی مرتبہ "صحیفۂ اقبال" مجلسِ ترقیِ ادب لاہور کے مجلّہ "صحیفہ" کے مضامینِ اقبالیات کا متنوع انتخاب ہے۔ بھارت کی دو کتابوں کے پاکستانی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں (۱) نوائے مشرق (اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ) از سعید احمد۔ (۲) اسلوب احمد انصاری کی "نقشِ اقبال" ملتان سے "مطالعۂ اقبال کے چند پہلو" کے عنوان سے چھپی ہے۔

متفرق کتابیں:۔ اسد کلیم کی " علامہ اقبال، معلومات کی روشنی میں" اور مسز قدسیہ سرفراز کی "معلوماتِ اقبال" کوئز مقابلوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ یہ بھی اپنے نوع کی دیگر کتابوں کی طرح موضوع کا خاطر خواہ مطالعہ کیے بغیر تحریر کی گئی ہیں۔ بعض سوالوں کے جواب غلط ہیں۔ بعض سوال ہی سرے سے غلط، بلکہ لغو ہیں۔ اوّل الذکر کتاب سے دو سوال جواب ملاحظہ فرمائیے:

ایک سوال ہے: علامہ اقبال تمباکو پینے کے لیے کن سے رجوع کیا کرتے تھے؟ ــــ جواب: ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش۔ اسی طرح ایک اور سوال ہے: علامہ اقبال کی ملاقات ایک مشہور ایرانی شاعر سے ہوئی تھی، کس موقع پر؟ جواب ہے: پاکستان آمد پر گورنر سندھ کی طرف سے دی گئی دعوت کے موقع پر۔" اقبال قلندر" علامہ کے حضور پنجابی شعرا کا منظوم ہدیۂ عقیدت ہے (مرتبہ: غلام مصطفےٰ بسمل۔ حفیظ احمد) اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن کا شائع کردہ" سووینیر، عالمی اقبال سیمینار" اپریل میں منعقدہ عالمی اجتماع کا یادگاری مجلّہ ہے۔"۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب" (از: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی) ایک سال کا اقبالیاتی جائزہ ہے۔ مطبوعات کے تعارف اور ان پر تبصرے کے علاوہ جملہ مطبوعات کے کتابیاتی کوائف بھی مہیا کیے گئے ہیں۔

تشریحاتِ اقبال:۔ تشریحاتِ اقبال کے ضمن میں اس سال دو کتابیں چھپی ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (کے شعبۂ اقبالیات) نے "تسہیل خطباتِ اقبال" میں نامور اہلِ قلم اساتذہ کی تحریر کردہ تسہیلاتِ خطباتِ اقبال مرتب کرکے شائع کی ہیں۔ تسہیل نگاروں میں ڈاکٹر سی اے قادر، ڈاکٹر محمد معروف، عبد الحمید کمالی، نیاز عرفان، ڈاکٹر ابصار احمد، ڈاکٹر محمد ریاض اور رحیم بخش شاہین شامل ہیں۔ ہر خطبے کے اہم نکات اور اس پر حواشی بھی دیے گئے ہیں۔ تسہیل نگاروں نے خطبات کو سہل بنا کر پیش کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔" ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" محمد شریف بقا کی شرح ہے۔ بعض اعتبار سے، اس کی افادیت یوسف سلیم چشتی کی شرح سے زیادہ ہے۔

جامعات کے تحقیقی مقالے:۔ "محمد اقبال و موقفہ من الحضارۃ الغربیۃ" ہندوستانی عالم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن عبد الرحمٰن کا مقالہ محمد قطب کی نگرانی میں لکھا گیا اور جامعہ ام القریٰ مکہ نے اس پر ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی۔ اس کا موضوع مغربی تہذیب کے بارے میں اقبال کا طرزِ عمل ہے۔ جامعۂ پنجاب کے شعبۂ علوم اسلامیہ سے فرخندہ فرحت نے" اقبال کا فلسفۂ توحید" ادارہ تعلیم و تحقیق سے طفیل محمد گوہر، عظیم بخش اور محمد عبد اللہ نے

"تعلیمی نظریات میں علامہ محمد اقبال اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وحدتِ فکر۔ ایک جائزہ" پر اور دبیر حسین شاہ، محمد شریف شاہ اور ضیاء الرحمٰن نے "علامہ اقبال اور سید مودودی کے نظریۂ تربیت کا تقابلی مطالعہ" پر ایم اے اور ایم ایڈ کے لیے امتحانی مقالے تحریر کیے۔ توقیر سلیم کے مقالے کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

اقبال نمبر:۔ اقبال اکادمی پاکستان کے اردو مجلّے "اقبالیات" کے دو اور فارسی مجلّے کا ایک اقبال نمبر شائع ہوا۔ "صحیفہ" "تہذیب الاخلاق لاہور" اور "ہومیوپیتھی راولپنڈی" نے بھی خاص اشاعتیں پیش کیں۔ ہندوستانی مجلّوں میں میری نگر سے "اقبالیات" اور حیدرآباد دکن سے "شاداب"، "شگوفہ" اور "نئے نکات" کے اقبال نمبر چھپے۔ پاکستان کے جملہ روزناموں نے ۲۱ اپریل اور ۹ نومبر کو اقبال ایڈیشنوں کا اہتمام کیا۔

اقبالیاتِ متفرق:۔ آخر میں چند ایسے امور کا ذکر، جو اقبالیاتی ادب سے براہِ راست متعلق نہیں، مگر بالواسطہ ان کے اثرات، اقبالیات اور اقبالیاتی ادب پر مرتب ہوتے ہیں۔

"وفیات" اس برس چند اہم اقبالی شخصیات ہم سے جدا ہو گئیں۔ اقبالیات کے نامور معلم اور ممتاز اقبال شناس ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (۱۴ اگست) اقبالی مصنف اور عالم مولانا اعجاز الحق قدوسی (۱۹ فروری) اور کلامِ اقبال کے پہلے کشمیری مترجم غلام احمد نازکی (۱۸ نومبر) کی رحلت اقبالیات کی محرومی ہے۔

"تقاریب بہ یادگارِ اقبال" اس سال دو بین الاقوامی تقاریب منعقد ہوئیں۔ تہران کی اقبال کانفرنس (۱۰-۱۳ مارچ) کا اہتمام حکومتِ ایران نے کیا تھا اس میں ایران کے علاوہ پاکستان، بھارت، سری لنکا، بنگلہ دیش، اور شام کے مندوبین شریک ہوئے۔ دکن کا عالمی سیمینار (۱۸-۲۲ اپریل) اقبال اکیڈمی حیدرآباد نے منعقد کرایا۔ اس میں بھارت کے علاوہ پاکستان، مصر اور انگلستان سے مندوبین شریک ہوئے۔ بھوپال کے اقبال ادبی مرکز میں "تہذیبِ حاضر میں قدروں کا بحران اور اقبال" کے موضوع پر ۹، ۱۰ نومبر کو سیمینار ہوا۔ لاہور میں مرکزی مجلسِ اقبال کے ۲۱ اپریل اور ۹ نومبر کے اجتماعات ہوئے۔ حلقۂ اقبال لاہور نے ڈاکٹر این میری شمل اور ڈاکٹر مبشر طرازی کے ساتھ خصوصی نشستیں منعقد کیں۔ پروفیسر محمد منوّر صاحب نے اپنے دورۂ شام میں اور بعد ازاں دبئی اور ابوظبی میں یومِ اقبال کی تقاریب سے خطابات کیے۔ توقع ہے ان سے عربوں کے اندر اقبال شناسی کو فروغ ملے گا۔

"انعامات و اعزازات" حکومتِ پاکستان نے "زندہ رود" کو اقبالیات (۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء) کی بہترین کتاب قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کو ۲۵ ہزار روپے کا انعام اور طلائی تمغے کا مستحق قرار دیا۔ انٹرنیشنل اقبال ایوارڈ کمیٹی نے سید خلیل اللہ حسینی (صدر اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن) کو ان کی اقبالی خدمات پر ۱۹۸۲ء کا اقبال ایوارڈ عطا کیا۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن نے سالانہ اقبال ایوارڈ دکن کے مرحوم اقبال شناس ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ہریانہ کے گورنر سید مظفر حسین برنی کو عطا کیا۔ اقبال اکادمی بھوپال نے "امتیازِ اقبال" کے نام سے اس سال کا ادبی ایوارڈ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کو دینے کا اعلان کیا۔ بھوپال کے صوبائی حکومت نے بہترین اقبالی خدمات پر پچاس ہزار روپے کا اقبال ایوارڈ جاری کیا اور پہلا ایوارڈ جناب علی سردار جعفری کو عطا کیا گیا۔

"یادگار" "شیش محل (جہاں علامہ اقبال مقیم رہے) بھوپال کے سامنے واقع پارک کو، حکومت نے ۱۹۸۲ء میں "اقبال میدان" قرار دیا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ نے سنگِ بنیاد رکھا۔ اس سال ۱۴ فروری کو موجودہ وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش جناب موتی لال ووہرا نے باقاعدہ افتتاح کیا۔ یہ میدان اور اس میں نصب کتبے اور شاہین کا مجسمہ، یہاں سے گزرنے والوں کو اقبال کی یاد دلاتے رہیں گے۔

"اقبالیاتی ادارے" اس سال اقبال اکادمی پاکستان نسبتاً زیادہ فعال رہی۔ اس نے دیگر مطبوعات کے علاوہ صرف اقبالیات پر گیارہ نئی کتابیں اور پانچ مجلّات شائع کیے۔ اکادمی میں کئی منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔ قاموسِ اقبال (اقبال انسائیکلوپیڈیا) کی تفصیلات طے ہو چکی ہیں۔ فنڈ فراہم ہوتے ہی اس پر کام شروع ہو جائے گا۔ علامہ کے فارسی کلام کی تسہیل، کئی جلدوں میں شائع ہوگی۔ اس کا بیشتر حصہ تیار ہو چکا اور زیرِ اشاعت ہے۔ مزید برآں جناب محمد سعید شیخ کے مرتبہ نسخے کی بنیاد پر، خطباتِ اقبال کا ایک سلیس ترجمہ (مع تشریح اور حواشی) زیرِ تالیف ہے۔ اسی طرح کلیاتِ مکاتیبِ اقبال کا ایک منصوبہ بھی زیرِ غور ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ اقبالیات نے تین اور بزمِ اقبال لاہور نے

دو کتابیں تاٹع کیں، مگر بزم کے مجلّے "اقبال" کی اشاعت تعطل کا شکار ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ اقبالیات بھی دو برس سے عملاً حالت تعطل میں ہے۔ یونیورسٹی کو شعبے کے لیے کوئی موزوں صدرنشین نہیں مل سکا۔ کشمیر یونیورسٹی سری نگر کا اقبال انسٹی ٹیوٹ ماضی میں خاصا فعّال رہا، مگر اس برس اس نے صرف "اقبالیات" کا ایک شمارہ شائع کیا۔ بھوپال میں اقبال اکادمی کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم ہوا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں دو سال پہلے اقبال چیئر قائم ہوئی تھی مگر تاحال خالی چلی آرہی ہے۔ پہلے فیض احمد فیض کا تقرر ہوا۔ وہ نہیں گئے، پھر قمر رئیس نامزد ہوئے، مگر کون جائے ذوق پر دتی کی گلیاں چھوڑ کر۔ اب پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو پیش کش ہوئی ہے۔ وہ بھی کلکتہ جانے پر رضامند نہیں۔ انھیں اپنے علمی منصوبے "روداد اقبال" کی تکمیل زیادہ عزیز ہے۔ کیمبرج اور ہائیڈل برگ میں کئی سال سے دو الگ الگ اقبال چیئر قائم ہیں، ان پر بعض پاکستانی فضلا رفائز رہے ہیں۔ اقبالیات کے باب میں ان کا حاصل کیا ہے؟ ان مسندوں کے ذریعے تحقیقِ اقبال میں کیا پیش رفت ہوئی؟ اور انھوں نے کیا علمی کارنامہ انجام دیا؟ یہ ہمیں نہیں معلوم، اور غالباً کسی کو بھی معلوم نہیں۔

"جامعاتی تحقیق" محمد آفتاب ثاقب نے "اردو شاعری پر اقبال کے اثرات" کے عنوان سے پنجاب یونیورسٹی میں اپنا مقالہ داخل کیا ہے۔

——— بعض موضوعات پر کام ہو رہا ہے مثلاً: شعبۂ اردو سے جناب صابر کلوروی "باقیات کلام اقبال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے زیر عنوان اپنا تحقیقی مقالہ مرتب کر رہے ہیں۔ بھوپال یونیورسٹی میں پروفیسر آفاق احمد کی نگرانی میں فرزانہ رضوی "اقبال کے اردو کلام کی شرحوں کا تجزیاتی مطالعہ" پر تحقیق کر رہی ہیں۔ اورنٹیل کالج لاہور میں اقبالیات کے مختلف موضوعات پر ایم اے کے تین مقالے تیار کیے جا رہے ہیں۔

حرفِ آخر: ۱۹۸۶ء کے اقبالیاتی ادب پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ: نو خطوط کے علاوہ، علامہ کے ایک غیر مطبوعہ مضمون BEDIL IN THE LIGHT OF BERGSON کی دریافت۔

انگریزی خطبات کے محشیٰ ایڈیشن کی تدوین (مرتبہ: محمد سعید شیخ)

سوانحِ اقبال پر ڈورس احمد کی یادداشتوں اور اقبال کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ڈاکٹر سلطان محمود حسین کی مہیا کردہ بعض تفصیلات اور اردو کلام کے اشاریے کو ۱۹۸۶ء کے اقبالیاتی ادب میں بیش قیمت اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

گذشتہ برس کے اقبالیاتی ادب میں مطالعۂ خطبات کا ایک رجحان نمایاں تھا۔ خطبات کے نئے ایڈیشن، نیز "تسہیل خطباتِ اقبال" سے اس رجحان کو مزید تقویت ملی ہے۔

اس سال کے اقبالیاتی ادب پر حسابی نگاہ ڈالیں، اور گذشتہ دو سالوں کی مطبوعات سے اس کا موازنہ کریں تو نقشہ کچھ یوں بنتا ہے:

	۱۹۸۴ء	۱۹۸۵ء	۱۹۸۶ء
کتابیں۔ تحقیقی مقالات	۳۹	۳۶	۴۹
اقبال نمبر	۸	۲	۱۰
جملہ مطبوعات	۴۷	۳۸	۵۹

ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال حوصلہ افزا ہے۔ تاہم محض اقبالیات کی مقداری پیش رفت، ہمارے لیے وجۂ اطمینان نہیں بن سکتی۔

اقبالیاتی ادب کی ایک ضرورت یہ ہے کہ پامال موضوعات کو مزید پامالی سے بچایا جائے۔ کرنے کے بہت سے کام ہیں اور خامہ فرسائی کے لیے خاصی گنجائش موجود ہے، مگر سرسری، رسمی اور سطحی تحریروں سے اجتناب ضروری ہے۔ اس سے لکھنے والا تو اپنا بھرم کھوتا ہی ہے، اقبالیاتی ادب کا وقار بھی مجروح ہوتا ہے۔ ہمارے متعدد اقبالی مصنفین کے مقالات و کتب میں، بہ لحاظ تحریر و تصنیف اور تدوین، ایک غیر علمی انداز ملتا ہے۔ حوالے ندارد یا ادھورے اور نامکمل۔ اشعار میں تصرفات۔ غیر متعلق مباحث اور بلا جواز طوالت اور پھیلاؤ۔ مغز کم اور چھلکے زیادہ۔ نہ وقتِ نظر ہے، نہ احتیاط ہے اور نہ باریک بینی، اس کے بغیر آخر معیار کیسے قائم ہوگا۔ اس سلسلے میں اقبالیاتی اداروں پر نسبتاً زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مسوّدات کی تدوین اور کتابوں کی اشاعت و پیش کش میں ان کا قائم کردہ معیار، پرائیویٹ ناشرین کے لیے دلیلِ راہ بن سکتا ہے۔

اقبال

باب ۳

قطعہ

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریان و بے تیغ و سناں عشق

اقبالؒ

عبدُاللطیف اعظمی
۳۴۹ - ذاکر باغ - جامعہ نگر - نئی دہلی - ۲۵

ترانۂ ہندی - ایک تنقیدی مطالعہ

"ترانۂ ہندی" پر ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کا ایک مبسوط اور تحقیقی مضمون ماہنامہ آجکل بابت ماہ ستمبر ۸۳ء میں شائع ہو چکا ہے، مگر اس کے باوجود یہ مضمون صرف اس لیے اشاعت کے لیے دے رہا ہوں کہ میرے مضمون کا اپروچ ان کے مضمون سے کچھ مختلف ہے، نیز میرا خیال ہے کہ اس کا دائرہ نسبتاً وسیع ہے۔

"ترانۂ ہندی" علامہ اقبال مرحوم کی مشہور ترین اور مقبول ترین نظموں میں سے ہے۔ میں نے جب اپنی کتاب: "اقبال دانائے راز خطوط اور معاصر تحریروں کی روشنی میں" لکھی تھی جو جولائی ۱۹۷۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، تو اس وقت اس نظم کے متعلق میرا مطالعہ کچھ زیادہ نہیں تھا، اس لیے حیات اقبال کی اہم تاریخیں مرتب کرتے وقت: "ببلیوگرافی آف اقبال" پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نظم کے بارے میں لکھا تھا کہ سب سے پہلے یہ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ مگر عین طباعت کے وقت معلوم ہوا کہ یہ سنہ غلط ہے ۱۹۰۱ء میں نہیں ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ چنانچہ حاشیے میں اس کی تصحیح کر دی، مگر اس وقت سے میں اس نظم کی تحقیق میں لگ گیا۔ اسی دوران میں معلوم ہوا کہ یہ نظم سب سے پہلے مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کے ایک غیر معروف پندرہ روزہ اخبار" اتحاد" میں شائع ہوئی تھی۔ اب مجھے اس شمارے کی تلاش شروع ہوئی، جس میں یہ نظم شائع ہوئی ہے۔ دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ وغیرہ کے کتب خانوں میں ڈھونڈ ڈالا مگر اس اخبار کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ پٹنہ، گیا اور خدا بخش لائبریری میں تلاش کیا تو اس اخبار کے کچھ شمارے ضرور ملے، مگر وہ شمارہ نہیں تھا جس میں یہ نظم چھپی تھی۔ اسکے بعد عبدالصمد خاں صاحب سے ملاقات ہوئی جو اس وقت حیدرآباد میں تھے اور یہ مجھے معلوم تھا کہ ان کے پاس کتابوں رسالوں کا بہت قیمتی اور نایاب ذخیرہ ہے۔ خاں صاحب کی کتابوں اور مضامین کے بارے میں معلومات بھی بہت وسیع ہیں اور ریسرچ اسکالر ان کی ان معلومات اور ان کے ذخیرۂ کتب سے کافی استفادہ کرتے رہتے ہیں مگر اس وقت تک انھیں بھی معلوم نہیں تھا کہ اقبال کی یہ نظم" اتحاد" میں شائع ہوئی ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ یہ نظم سب سے پہلے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ماہنامہ" زمانہ" (کانپور) میں ستمبر کے مہینے میں اور" مخزن" (لاہور) میں اکتوبر کے مہینے میں، اس لیے" اتحاد" میں اگست یا جولائی میں شائع ہوئی ہوگی۔ اگر ان دونوں مہینوں کے شمارے ہوں تو تکلیف کر کے انھیں دیکھ لیجئے اگر مل جائے تو براہ کرم اس کی فوٹو کاپی بھیج کر ممنون فرمائیے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی جب انھوں نے ہفتہ عشرہ میں اس کی فوٹو کاپی بھیج دی۔

دراصل اس نظم کو اس اخبار میں کوئی نمایاں جگہ نہیں دی گئی تھی، بلکہ اخبار کے اداریہ میں بغیر کسی عنوان ایک مختصر نوٹ کے ساتھ شائع کی گئی، جس کی وجہ سے بالعموم لوگ اس سے بے خبر رہے۔ چنانچہ اگر میں نے عبدالصمد خاں صاحب کو کافی تفصیل سے نہ بتلایا ہوتا تو شاید ان کی نظر سے بھی یہ نظم اوجھل ہو جاتی۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایک استاد ڈاکٹر شریف احمد صاحب نے مولانا شرر پر تحقیقی کام کیا ہے، انھوں نے مجھے بتلایا تھا کہ" اتحاد" کے کچھ شمارے ان کے پاس ہیں، مگر وہ اس سے لاعلم تھے کہ یہ نظم اس میں شائع ہوئی، اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس نظم کو نمایاں جگہ نہیں دی گئی۔ چنانچہ ابھی حال تک" اتحاد" کی یہ نظم لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہی اور اردو کے مشہور محققین اور بعض ماہرین اقبال یہی سمجھتے رہے کہ سب سے پہلے یہ نظم" زمانہ" میں شائع ہوئی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری صاحب نے لکھا ہے: " زمانہ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اقبال کی شہرۂ آفاق نظم " سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔" اسی طرح مدیر زمانہ کے صاحبزادے برج نرائن نگم نے صرف یہ لکھا ہے کہ: "ستمبر ۱۹۰۴ء کے" زمانہ" میں پہلی بار" ہمارا دیس" شائع ہوئی، بلکہ انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ: "دادا صاحب کے اصرار پر علامہ

اقبال نے قومی ترانہ لکھا"[۳۶] ۲۲ مارچ ۱۹۸۳ء کو یوپی اردو اکادمی کے زیر اہتمام منشی دیا نرائن نگم کی یاد میں ایک کل ہند سمینار منعقد ہوا تو بعض مقالہ نگاروں نے بھی یہی بات کہی۔ مثلاً صباح الدین عمر صاحب نے فرمایا: ڈاکٹر اقبال کی مشہور و معروف نظم "ترانۂ ہندی" سب سے پہلے زمانہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں "ہمارا دیس" کے عنوان سے شائع ہوئی"[۳۷] ایک اور ادیب ویریندر پرشاد سکسینہ نے بھی یہی بات کہی[۳۸] جب مقالہ پڑھنے کی میری باری آئی تو میں نے اپنے مقالے میں پہلی مرتبہ اس خیال کی تردید کی اور عرض کیا: "زمانہ میں یہ ترانہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا مگر اس سے قبل ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء کو یہ ترانہ مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کے غیر معروف پندرہ روزہ "اتحاد" (لکھنؤ) میں شائع ہوا تھا"[۳۹] میری اس گزارش یا تردید کو منشی دیا نرائن کے صاحبزادے برج نرائن نگم نے تسلیم کرنے سے بالکل انکار کر دیا اور بعد میں جب میں نے "اتحاد" کی فوٹو کاپی دکھلائی تب انھوں نے تسلیم کیا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب کا شمار ماہرینِ اقبال میں ہوتا ہے۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ نظم سب سے پہلے "زمانہ" میں چھپی ہے۔ چنانچہ "مکاتیب نگم [مرتبہ: محمد ایوب واقف] پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی خیال کا اظہار کیا ہے"[۴۰]۔ ہمارے ادیبوں محققوں کو یہ غلط فہمی غالباً اس وجہ سے بھی ہوئی ہے کہ اقبال کے انتقال کے بعد منشی جی نے اپنے رسالے میں جو تعزیتی نوٹ اور دوسرے مہینے میں مرحوم کی شخصیت پر جو مضمون لکھا۔ ان دونوں میں کچھ ایسی ہی بات لکھی تھی۔ جس کا بادی النظر میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس نظم کو پہلی مرتبہ شائع کرنے کا شرف "زمانہ" کو حاصل ہے۔ علامہ کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ اسی مہینے کے "زمانہ" میں ایک صفحہ کا تعزیتی نوٹ شائع ہوا تھا جس میں مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے منشی جی نے لکھا: "۱۹۰۴ء میں آپ نے اپنا مشہور گیت "ہندوستاں ہمارا" کا صحیح ایڈیشن بھی سب سے پہلے "زمانہ" ہی کو اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا تھا"[۴۱]۔ "دوسرے مہینے میں" علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا تھا، اس میں لکھتے ہیں: "ہندوستاں ہمارا پر آپ نے اپنی نظم کا صحیح اور مستند ایڈیشن رسالہ "زمانہ" کو اشاعت کے لیے عنایت فرمایا تھا"[۴۲]۔ منشی نگم کی ان دونوں تحریروں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے "صحیح اور مستند ایڈیشن" پر کافی زور دیا ہے اور اس لحاظ سے ان کی بات صحیح ہے۔ اگرچہ ان کو اس کی خبر تو نہیں رہی ہوگی کہ "اتحاد" کو یہ نظم اقبال نے نہیں ان کے کالج کے ایک حاضر باش اور عقیدت مند طالب علم محمد عمر نے ان کی اجازت کے بغیر بھیجی تھی، کیونکہ یہ راز تو اس کی اشاعت کے بیالیس (۴۲) سال کے بعد ظاہر ہوا، جس کی بحث آگے آئے گی، مگر چونکہ اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے اس لیے ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مستند ایڈیشن وہی ہے جو "زمانہ" میں شائع ہوا لیکن یہ دعویٰ تو بہر حال باطل ہو گیا کہ یہ نظم سب سے پہلے "زمانہ" میں شائع ہوئی تھی۔

۱۔ **ترانہ کا پہلا ایڈیشن مطبوعہ اتحاد:** ۔ اس طولانی بحث کے بعد جو پس منظر کو واضح کرنے کے لیے ضروری تھی، ترانے کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ اتحاد کا عکس پیش کیا جاتا ہے:

[مذکرہ عکس صفحہ نمبر ۱۱۱ پر دیکھئے [ادارہ]]

پہلے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ نظم پندرہ روزہ "اتحاد" (لکھنؤ) مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء کے ادارتی نوٹ میں بغیر کسی عنوان کے شائع ہوئی تھی۔ پیش کردہ فوٹو کاپی اخبار کے چوتھے صفحے کی ہے، اس کی وجہ سے نظم سے قبل جو نوٹ لکھا گیا ہے وہ نامکمل ہے، اس کا کچھ حصہ تیسرے صفحے کے آخر میں ہے، اگر حسب ذیل جملے کا اضافہ کر دیا جائے تو معنوی لحاظ سے یہ نوٹ مکمل ہو جائے گا۔:

"لاہور میں ینگ مینز انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ..."

اس نظم کی اشاعت کے تقریباً ۴۲ سال بعد، جیسا کہ گزشتہ سطروں میں عرض کیا جا چکا ہے، اقبال کے ایک عقیدت مند محمد عمر صاحب نے اس نظم کی شان نزول پر اپنے ایک مضمون میں روشنی ڈالی جو پہلی مرتبہ پندرہ روزہ "آجکل" (دہلی) مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۴۶ء میں "ہندوستاں ہمارا کی شان نزول" کے عنوان سے شائع ہوا، اس کے اکیس (۲۱) سال کے بعد صاحبزادہ سید ظفر ہاشمی کے عنوان سے ایک اور مضمون یکم مئی ۱۹۶۷ء کے ہفتہ وار "چٹان" (لاہور) میں شائع ہوا، جس کا عنوان ہے: "علامہ اقبال کے ترانے کی شان نزول"۔ جس کے شروع میں چٹان کے بڑے سائز کے پورے صفحے میں محمد عمر (نور الٰہی) کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی علمی و ادبی لیاقت اور علامہ اقبال سے ان کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد "آجکل" کے مضمون کو مکمل طور پر نقل کر دیا ہے۔ یہی مضمون "چٹان" کے حوالے سے "اوراق گم شدہ" (مرتبہ: رحیم بخش) میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

اسی کتاب کے حوالے سے اقبال کے مشہور عقیدت مند اور پرستار سید نذیر نیازی مرحوم نے اپنی کتاب: "دانائے راز ــ سوانح حیات حکیم الامت

ایک کلب قائم ہوا ہے جس کے سب سے اہم وظائف یہ ہیں کہ ہندوستان کی کل اقوام میں میل جول کرایا جائے اور وہ سب باتفاق قومی ہمدردی ترقی و بہبودی ملک کی جانب راغب کی جائیں۔ اس کے ایک جلسہ میں پنجاب کے مشہور و نازک خیال شاعر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ نے ایک مختصر و پُر جوش نظم پڑھی جس نے حاضرین پر اتنا اچھا اثر کیا کہ سب کے اصرار سے جلسہ کے افتتاح و اختتام دونوں اوقات میں گا کے سنائی گئی اس نظم سے چونکہ اتحاد کو اپنے مشن میں مدد ملی ہے۔ لہذا ہم اپنے پرانے دوست مولوی محمد اقبال صاحب کا شکریہ ادا کر کے درج اتحاد کرتے ہیں:——

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستان ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسمان کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اسکی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں سے ہے آسماں نامہرباں ہمارا
اقبال اپنا کوئی محرم نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو درد نہاں ہمارا

مندرجۂ ذیل شوخ اور باذاق نظمیں خان بہادر سید اکبر حسین صاحب کی ظرافت آفرینی کا نمونہ ہیں جن کو ہم اتحاد کے اغراض کے موافق دیکھ کے رسالہ زمانہ سے نقل کرتے ہیں:——

وہ لطف اب ہندو مسلمان میں کہاں
اغیار ان پر گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا۔ زبان کی کبھی بحث
ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤ زبان

کہتا ہوں ہندو مسلمان سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو۔ مگر ایک رہو

کس کو ہو سکتا ہے سرسید کی استادی میں شک
چال کو ڈھنگ بھی وہ سکھلا گئے ہیں ہنس کی
جو ملے دل سے ہیں اس کا دوست ہوں آزاد ہو تو
قید کچھ مجھکو نہیں عبد الصمد و ہربنس کی
عہد انگلش میں بھی ہے آزادی ظلم بتاں
تیغ ابرو کے لیے حاجت نہیں لیسنس کی

پنجۂ فولاد نے دھرم پرچارک کی جو عبارت پیش کی بیشک قابل افسوس ہے اگرچہ شرک کو کوئی برہنہ جو خاور کہتا نہ مانے تو پھر ہمیں کو اپنی آنکھیں بند کر لینی چاہئیں

حسرت اقبال (مطبوعہ ۱۹۷۹ء) میں لکھا ہے: "محمد اقبال کے ہندو دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔۔۔۔ سوامی جی سوامی رام تیرتھ کی طرح مشہور ہندو انقلابی رہنما ہر دیال سے بھی ان کے خاصے تعلقات تھے۔ ہر دیال بہت ذہین طالب علم تھے، غضب کا حافظہ پایا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر رشی اور منی ہونے کا دعویٰ کرتے تو غلط نہ ہوتا، وطن سے بے پناہ محبت تھی، جلا وطن ہو کر امریکہ چلے گئے، برلن میں انتقال ہوا۔ طالب علموں میں حد درجہ ہر دلعزیز تھے۔ محمد اقبال کی حب الوطنی اور فلسفہ پسندی دوستی کا ذریعہ بنی۔ ۱۹۰۴ء میں ہر دیال نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے مقابلے میں وائی۔ ایم۔ آئی۔ اے YOUNG MEN ASSOCIATION کی بنیاد ڈالی۔ افتتاحی جلسے کی صدارت محمد اقبال نے کی لیکن انہوں نے تقریر کی بجائے اپنی مشہور نظم "قومی ترانہ" سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا پڑھ کر سنائی۔ سامعین تقریر کے منتظر تھے، ترانے کو سنا تو سر دھننے لگے۔ جسے دیکھیے اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہے۔[10]"

اس شان نزول کے ساتھ ایک کہانی بھی وابستہ ہے، جس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ محمد عمر صاحب کے بیان کے مطابق، علامہ اقبال "نظم پڑھتے گئے، اور میں پنسل سے کاغذ پر اتارتا گیا۔ میں ان دنوں ایف سی کالج میں پڑھتا تھا۔۔۔۔ ہوسٹل میں پہنچ کر میں نے نظم صاف کر کے لکھی۔ ان دنوں عبد الحلیم شرر اپنے رسالہ اتحاد میں ہندو مسلم کے گیت الاپ رہے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یہ نظم برائے اشاعت بھیج دی۔[11]۔۔ مگر جب یہ نظم شائع ہوئی اور علامہ کو اس کا علم ہوا تو وہ بے حد خفا ہوئے۔ علامہ کی خفگی کی وجہ محمد عمر صاحب نے یہ بیان کی ہے "اس میں بہت سی غلطیاں بھیجنے والے کی بدولت وارد ہو گئی ہیں اور ان غلطیوں کو سامنے رکھ کر مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ" اردوئے معلیٰ" میں اہل پنجاب کو جی بھر کر جلی کٹی سنائی ہیں"۔[12]

اس بیان میں اس قدر مبالغے سے کام لیا گیا ہے کہ خلاف واقعہ ہو گیا ہے۔ اگر واقعی یہ بات صحیح ہے کہ اس نظم کو دیکھ کر اقبال خفا ہوئے، تو اس کی یہ وجہ تو ہو سکتی ہے کہ کسی نے ان کی اجازت کے بغیر اشاعت کے لیے بھیج دی، ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نظم کو اخبار میں نمایاں جگہ نہیں دی گئی، اس کے علاوہ "اتحاد" کو کوئی خاص شہرت بھی حاصل نہیں تھی اور نہ ہی اردو صحافت میں اس کو کوئی ممتاز مقام حاصل تھا، مگر یہ وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس میں بہت سی غلطیاں تھیں اور یہ بات سرے سے غلط ہے کہ مولانا موہانی نے اس پر کوئی اعتراض کیا تھا، چہ جائیکہ "اہل پنجاب کو جی بھر کر جلی کٹی سنائی ہو۔ ایسی ہی مبالغہ آمیز بات صاحبزادہ ظفر ہاشمی صاحب نے بھی لکھی ہے۔ ان کا ارشاد ہے: "چونکہ اس میں بے شمار غلطیاں چھپ گئی تھیں، اس پر تمام ہندوستان کے شاعروں اور ادیبوں نے اور خاص کر مولانا حسرت موہانی نے بہت لے دی کی اور علامہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی[13]"۔ اس کے علاوہ اس بیان میں ایک تضاد بھی ہے۔ محمد عمر صاحب نے لکھا ہے کہ جلسے میں میں نے پنسل سے پوری نظم نوٹ کر لی تھی اور بعد میں صاف کر کے "اتحاد" کو بھیجا۔ اس کے برعکس صاحبزادہ صاحب اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں: "ان کا ترانہ: سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کسی طرح محمد عمر صاحب نے حاصل کر کے لکھنؤ کے رسالہ "اتحاد" میں چھپوا دیا۔"[14] غالباً یہی وجہ ہے کہ کسی مستند کتاب میں اس کہانی کو بیان نہیں کیا گیا۔ سید نذیر نیازی مرحوم نے صرف شان نزول کو اہمیت دی۔

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی بے یقینی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: "بعض اوقات بعض مصنف اپنی غلطیوں کو سہو کاتب کے سر منڈھ دیتا ہے۔ اگر محمد عمر کا بیان صحیح ہے تو اقبال نے بھی اپنی لغزشوں کو راوی کی گردن پر ڈال دیا۔"[15] مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کہانی میری معلومات کے مطابق اقبال کی زندگی میں کبھی شائع نہیں ہوئی، ان پر الزام اس وقت آتا جب ان کے انتقال سے پہلے شائع ہوتی اور وہ اس کی تردید نہ کرتے۔ اقبال کی شرافت اور علمی دیانت کا اظہار تو اس سے ہوتا ہے کہ ادھر مولانا شرر نے اعتراض کیا، ادھر انہوں نے فوراً اصلاح کر کے "مخزن" میں اشاعت کے لیے یہ نظم بھیج دی۔ چنانچہ مولانا حسرت موہانی نے بھی اقبال کے اس رویے کو تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: "اکتوبر کا پرچہ مخزن دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض درشت زبان اور ناواقف لوگوں سے قطع نظر کر کے جو نکتہ چینی کا جواب سب و شتم سے دینا چاہتے ہیں۔ اہل پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج اور صحت زبان کے خواستگار ہیں، وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور نکتہ چینوں کی نکتہ چینی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر اقبال صاحب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا تھا ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں — معلوم ہے ہیں کو درد نہاں ہمارا

"دلگداز" نے اعتراض کیا کہ اس شعر کے آخر میں "ہمارا" کے بجائے "اپنا" چاہیے اور اقبال نے اب اس کو بدل کر "مخزن" میں اس طرح چھپوایا ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں ۔۔۔ معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

نامناسب نہ ہوگا اگر ترانے کی شانِ نزول کے مصنف محمد عمر مرحوم کا اختصار کے ساتھ تعارف کرا دیا جائے۔ نہ جانے کیوں محمد عمر کے ساتھ بریکٹ میں ایک اور نام "نور الٰہی" لکھا ہوتا ہے، یہ دو مستقل شخصیتیں ہیں، مگر نہ جانے کیوں دونوں نام ایک ساتھ لکھے جاتے ہیں، چنانچہ "آجکل" میں جو مضمون شائع ہوا ہے، اس پر محمد عمر کے ساتھ بریکٹ میں "نور الٰہی" کا نام چھپا ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے محمد عمر کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:
"جموں اور کشمیر کے دو مایہ ناز ادیب اور نثر نگار محمد عمر (نور الٰہی) جو جسمانی طور پر دو جسم تھے مگر قلم اور زبان سے ایک تھے" اس سلسلے میں ایک دلچسپ کارٹون کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "ان کا ایک معرکے کا مضمون "نیرنگِ خیال" میں شائع ہوا اور مضمون کے ساتھ حکیم یوسف حسین صاحب نے محمد عمر (نور الٰہی) صاحبان کا ایک دلچسپ کارٹون بھی شائع کیا۔ کارٹون میں دو ملے ہوئے چہرے دکھائے گئے تھے اور ان کے نیچے لکھا ہوا تھا: محمد عمر (نور الٰہی)" علامہ اقبال سے تعلق کے بارے میں موصوف نے لکھا ہے: "حضرت علامہ کو محمد عمر صاحب سے بے حد پیار تھا اور ان کا ذکر ان کی زبان پر آتا رہتا تھا۔"

دوسرا ایڈیشن مطبوعہ زمانہ :۔ اقبال کی اس مشہور غزل یا نظم: "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پر مولانا شرر نے اپنے ماہوار رسالہ "دلگداز" مورخہ اگست ۱۹۰۴ء میں جو اعتراضات کئے تھے، وہ ابھی منظر عام پر نہیں آئے تھے کہ اقبال نے اپنی یہ نظم نظر ثانی کے بعد "ہمارا دیس" کے عنوان سے ماہنامہ "زمانہ" (کانپور) کو اشاعت کے لیے بھیجی، جو ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی، اس کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔ [صفحہ نمبر ۱۱۴ پر عکس دیکھیے]

تیسرا ایڈیشن مطبوعہ مخزن :۔ معلوم ہوتا ہے، اگست ۱۹۰۴ء کا "دلگداز" جس میں شرر مرحوم کے اعتراضات شامل تھے، اتنی تاخیر سے شائع ہوا کہ اب اس نظم کے مسودے میں کسی قسم کی ترمیم ممکن نہیں تھی جو "زمانہ" کو اشاعت کے لیے بھیجی گئی تھی جو ستمبر کے شمارے میں شائع ہوئی یا اقبال نے مدیر زمانہ کو کچھ لکھنا مناسب نہ سمجھا ہو، اس لیے ان اشعار میں ترمیم و اصلاح کر کے جن پر دلگداز نے اعتراض کیا تھا، ماہنامہ "مخزن" (لاہور) کو یہ نظم بھیج دی جو اکتوبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اس نظم کا عکس ملاحظہ ہو:۔ [صفحہ نمبر ۱۱۵ پر عکس دیکھیے]

اصلاحِ سخن اور ادیب کا ترانہ سے تعلق :۔ ۱۹۷۸ء کی بات ہے جب میں ترانۂ ہندی پر تحقیق کر رہا تھا تو دہلی یونیورسٹی کے ایک استاد نے جو متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، فرمایا کہ یہ ترانہ اوّل اوّل ایک مصرعِ طرح کے لیے کہا گیا تھا چنانچہ ایک گلدستہ کی طرحی غزلوں میں شامل ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ گلدستہ ان کے پاس موجود ہے تو میں ان کے مکان پر حاضر ہوا اور اس رسالے کو دیکھا۔ اس طرح پہلی مرتبہ ماہنامہ اصلاحِ سخن (لاہور) سے میرا تعارف ہوا، چونکہ اس وقت میری کتاب: "اقبال دانائے راز" طباعت کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی، اس لیے توقیتِ اقبال میں اس کا صرف ذکر کر دیا، زیادہ تفصیل کی اس میں گنجائش نہیں تھی۔

"اصلاحِ سخن" کے ایڈیٹر وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی تھے۔ اس کا پہلا شمارہ جون ۱۹۰۷ء میں نکلا، جب اقبال مزید تعلیم کے لیے یورپ میں تھے، مگر پھر بھی طرحی غزلوں میں ان کی نمائندگی کو ضروری سمجھا گیا اور شاید تبرک کے طور پر ان کا حسبِ ذیل شعر اس میں شامل کر دیا گیا:

فتنے اٹھتے ہیں تیرے کوچے سے ۔۔۔ یہ زمیں آسمان ہے گویا

اس شعر کے بارے میں حاشیے میں ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے: "شیخ صاحب نے ایک مختصر سی غزل اس طرح ہمیں سنائی تھی، ایک شعر یاد رہا، وہی لکھ دیا گیا۔" (ایڈیٹر) قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اقبال کے اس شعر کا دوسرا مصرع ہی اس پہلے شمارے کی "طرح" تھی، دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اقبال کے نام کے ساتھ "پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور" درج ہے۔

چوتھے شمارے بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۷ء کا مصرعِ طرح تھا:

ہندوستاں کے ہم ہیں، ہندوستاں ہمارا

اسی کے تحت اقبال کی نظم "ہمارا دیس" درج کی گئی ہے۔ اس وقت بھی اقبال ہندوستان سے باہر تھے، اس لیے ان کے بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بہت ممکن ہے کہ ان سے اجازت بھی نہ لی گئی ہو اور فاضل مدیر نے اپنے تعلقات کی بنا پر طرحی غزلوں میں شامل کر لیا ہو۔ اس مرتبہ اقبال

ہمارا دیس

ہندوستانی زبانون مین اور خصوصاً اردو مین حب الوطنی اور جوش ملکی کے متعلق ایسی نظمین شاذ و نادر لکھی گئی ہونگی جن مین اس ملک کے خصوصیات کے بیان کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ ترین جذبہ حب الوطنی کا اظہار ہو۔ انگلستان مین ایسے گیت ہر خاص و عام کی زبان زد ہوتے ہین۔ اور وہان کے باشندون کے دلون پر انکا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ جنگ و جدل کے وقت اور امن و چین کے زمانہ مین غرض ہمیشہ ان گیتون کی بدولت انکے دلون مین اپنے وطن کی محبت تازہ رہتی ہے۔ اور اسکی عظمت اور شان قائم رکھنے کا خیال جاگتا ہے پھر کوئی وجہ نہین کہ ہمارے مخدوم پروفیسر اقبال کی یہ نظم جو انھون نے ہمارے پیارے اور پرانے دیس پر لکھی ہے۔ ملک بھر مین ہر دلعزیز اور مفید ثابت نہو۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹے بڑون خاص و عام ہر ایک کے مقبول ہونیکی مستحق ہے۔

سارے جہان سے اچھا ہندوستان ہمارا — ہم بلبلین ہین اسکی یہ گلستان ہمارا
غربت مین ہون اگر ہم رہتا ہے دل وطن مین — سمجھو وہین ہمین بھی دل ہو جہان ہمارا
پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا — ہندی ہین ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسمان کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسبان ہمارا
گودی مین کھیلتی ہین جسکے ہزارون ندیان — گلشن ہے جسکے دم سے رشک جنان ہمارا
اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھکو — اترا ترے کنارے جب کاروان ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہان سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشان ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہین ہماری — صدیون سے آسمان ہے نامہربان ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہین جہان مین
معلوم ہے ہمین کو درد نہان ہمارا

اقبال

اس پھول بھیجتے ہیں یہ مصلحت ہو ساقی
مرجھا بھی جائیگا تو کچھ بو رہیگی باقی

آزاد عظیم آبادی

ہمارا دیس

جذبات دل کے ایک پہلے سے دوسرے پر منعکس ہونیکا بھی عجیب قانون ہو۔ ہمارے دوست نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہو بہو وہ خیالات ظاہر کئے ہیں۔ جو وطن سے دُور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ میں اگر نظم لکھتا تو شاید لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کئے ہیں۔ (عبدالقادر)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہو دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں — معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

(اقبال)

کے نام کے ساتھ "سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور" لکھا گیا ہے۔ چونکہ یہ نظم طرحی غزلوں میں شامل کی گئی تھی، اس لیے ظاہر ہے کہ اس کا کوئی عنوان ممکن نہیں تھا۔

ماہنامہ "ادیب" (الٰہ آباد) میں یہ نظم جس طرح شائع ہوئی ہے، اس کی وجہ سے اس کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دراصل مجھے ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری صاحب کے ایک جملے سے غلط فہمی ہوئی۔ انھوں نے "ہمارا دیس" کی دو اشاعتوں (زمانہ اور مخزن) کا ذکر کرنے کے بعد لکھا تھا: "اس کے بعد جولائی ۱۹۱۲ء میں ادیب الٰہ آباد میں شائع ہوئی تھی"[۱۵] موصوف کے اس جملے میں یہی سمجھا کہ زمانہ اور مخزن کی طرح "ادیب" میں بھی کسی عنوان کے تحت مستقل حیثیت سے شائع ہوئی ہوگی، مگر جب خدابخش لائبریری (پٹنہ) کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور اسسٹنٹ لائبریرین سلیم الدین احمد صاحب کی عنایت سے اس کی فوٹو کاپی ملی۔ تب اس کا انکشاف ہوا کہ ایک مضمون کے آخر میں بطور مثال کے یہ نظم شائع ہوئی ہے۔

اگرچہ اقتباس[۱۶] میں "چند اشعار" لکھا ہے، مگر پوری نظم نقل کی گئی ہے، اور اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے کہ کہاں سے لی گئی ہے، لیکن متن اور ترتیب اشعار کے لحاظ سے وہی ہے جو مخزن میں شائع ہوئی ہے۔ [صفحہ نمبر ۱۱۷ پر عکس دیکھیے]

<u>ابتدائی تین اڈیشنوں کا تقابلی مطالعہ</u>: "بانگ درا" کی اشاعت، مارچ ۱۹۲۴ء سے پہلے، مجھے جس قدر سراغ مل سکا، اس نظم کے بس یہی اڈیشن مل سکے ہیں، جن کا تفصیل سے میں نے ذکر کیا ہے، لیکن دراصل ابتدائی تین نظموں میں قطع برید اور ترمیم و اصلاح کی گئی ہے اور انھیں کی مستقل بالذات حیثیت ہے، اس لیے ذیل میں صرف ان ہی تین نظموں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔:

ان تین اڈیشنوں کے اشعار کی تعداد نو (۹) ہے۔ تینوں میں اشعار کی ترتیب مختلف ہے، تینوں کے متن میں الفاظ کا کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ تیسرے اڈیشن میں شرر کے اعتراض کے پیش نظر دو اشعار میں بنیادی تبدیلی کی گئی ہے۔ دوسرے اڈیشن کے ایک مصرع میں ایک لفظ دیا گیا تھا، مگر تیسرے اڈیشن میں پہلے اڈیشن کا لفظ دوبارہ رکھا گیا ہے۔ مثلاً

گودی میں کھیلتی ہیں <u>اس کی</u> ہزاروں ندیاں

پہلے اڈیشن اور تیسرے اڈیشن میں خط کشیدہ لفظ (اس کی) اسی طرح ہے، مگر دوسرے اڈیشن میں اس کے بجائے "جس کے" ہے۔ بانگ درا میں "اس کی" ہے۔ اس نظم کا ایک مصرع ہے:

"اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن <u>ہے</u> یاد تجھ کو"

"بانگ درا" کی اشاعت سے پہلے پانچوں اڈیشنوں میں خط کشیدہ لفظ "ہے" درج ہے اور بانگ درا کے جتنے اڈیشن میری نظر سے گزرے، ان میں "ہے" کے بجائے "ہیں" ہے۔

ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ دوسرے اڈیشنوں میں بطور نسخہ حاشیے میں حسب ذیل مصرع درج ہے۔:

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اضافہ (نسخہ) اقبال کے قلم سے ہے یا اڈیٹر زمانہ کے قلم سے؟ یہ مصرع پہلے اڈیشن کے متن میں بھی ہے اور تیسرے اڈیشن کے متن میں بھی۔ دوسرے اڈیشن کے متن کا یہ مصرع: "پنجاب کیا، دکن کیا، بنگال بمبئی کیا" صرف دوسرے اڈیشن میں ہے۔ لطف یہ کہ "بخط اقبال" کے متن یا حاشیے میں یہ مصرع نہیں ہے۔ افسوس کہ اس مسئلے کی طرف محققین اور ماہرینِ اقبال میں سے کسی نے بھی توجہ نہیں کی۔ اڈیٹر زمانہ منشی دیا نرائن نگم کے صاحبزادے برج نرائن نگم نے میرے استفسار کے جواب میں اس کی خاطر خواہ وضاحت کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اقبال نے جب پہلی مرتبہ یہ نظم "زمانہ" کو بھیجی تھی تو اس کا متن وہی تھا جو زمانہ میں شائع ہوا ہے، لیکن جب دوبارہ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کو یہی نظم بھیجی تو اس میں وہ مصرع نہیں تھا جو متن میں شامل ہے، اس کے بجائے وہ تھا جو حاشیے میں درج ہے۔ چونکہ اقبال کی کوئی ہدایت نہیں تھی کہ اس کو نکال دیا جائے، اس لیے پہلے مسودے کو بجنسہٖ باقی رکھا گیا اور دوسرے مسودے کے اس مصرع کو حاشیے میں لکھ دیا گیا۔ اس سلسلے میں نگم صاحب نے مجھے جو خط لکھا تھا، وہ انگریزی میں ہے، متعلقہ حصّہ کا اقتباس ذیل میں ملاحظہ ہو:

کوئی معمولی نثار و شاعر نہیں - اسکی تصدیق اُن کی متعدد تصانیف سے پوری پوری ہوتی ہے - فی زمانہ وہ "علی گڈھ اسکول" کے مسلمہ سرگروہ ہیں - مولوی نذیر احمد اور مولوی شبلی کا بھی تعلق اسی گروہ سے ہے - یہ دونوں بزرگ بھی دولت آصفیہ کے نمک خوار رہ چکے ہیں ناولسٹوں کے زمرہ میں سرشار اور شرر بہت مشہور ہیں لیکن میں اُن تصنیفات سے اتنی کم واقفیت رکھتا ہوں کہ کوئی رائے اُن کے متعلق نہیں قایم کرسکتا - لیکن سید احمد خاں کے بعد جو ہندوستانی مصنف اپنی وسیع الخیالی اور سہل و آسان طرز تحریر کے ذریعہ سب سے زیادہ میری توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے وہ مولوی محمد حسین آزاد ہیں جنکی دو کتابیں آب حیات اور دربار اکبری ہندوستان میں منجملہ تمام ہندوستانی تصانیف کے نہایت متداول ہیں - کتنی تاسف خیز بات ہے کہ ایسے عالی دماغ اور روشن خیال مصنف نے اسقدر جلد اُس فرق کو اُٹھا دیا جو عقل و حواس اور مجنونیت کے درمیان حایل سمجھا جاتا ہے - اور اب اُس وقت سے ابتک اُن کے بقیہ زندگی کے ایام بالکل بیکار گذر رہے ہیں - لیکن اُسی شہر میں جہاں محمد حسین آزاد عربی و فارسی ادب کے پروفیسر تھے یعنی لاہور میں ہمارے لئے ڈاکٹر محمد اقبال پی - ایچ - ڈی ایسا نوجوان موجود ہے جو علمی شہرت کے مدارج طے کر رہا ہے جنکی مختصر لیکن شیرین نظم "ہندوستان ہمارا" تمام ہندوستان میں نہایت کیفیت انگیز چیز سمجھی جاتی ہے - مین اپنے اس مضمون کو اُسی حُبِّ وطن کے راگ کے چند اشعار نقل کرکے اس اُمید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ زمانۂ حال کے دوسرے ہندوستانی شعرا بھی انھیں کے نقش قدم پر چلنے اور اپنے اشعار میں یہی کیفیت پیدا کرنے کی سعی کرینگے - ۵

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہیں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اُسکی ہزاروں ندیاں گلشن ہے جنکے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھکو اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے ابتک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(ترجمہ انگریزی) **سید محمد فاروق**

* THOUGH THE LETTER IS DATED AUG. 10, 1904, IT APPEARS THAT THE TARANA HAMARA DES PUBLISHED IN ZAMANA IN 1904, WAS A VERSION RECEIVED EARLIAR THAN THIS LETTER OF AUG. 10. 1904. THE ORDER OF THE COUPLET IS DIFFERENT THAN PUBLISHED IN THE ZAMANA AND ONE OF THE MISRA (ONE HALF OF THE COUPLET) STANDS IMPROVED UPON IN THE LETTER, AND THAT INAPROVED MISRA IS INCLUDED IN THE PUBLISHED POEM AS A FOOT NOTE.

میرے خیال میں مذکورہ بالا انگریزی اقتباس سے جہاں حاشیے کے مصرع کا مسئلہ بحسن و خوبی حل ہو جاتا ہے، وہاں اس مسئلے پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس نظم کی تاریخ تخلیق یا تاریخ تصنیف ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء نہیں ہے، جس کی بحث آگے آئے گی۔

ہمارا دیس بخط اقبال :۔ ہمارا دیس بخط اقبال کا مسئلہ بھی اچھا خاصا پیچیدہ ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، اب تک کسی نے پورے وثوق کے ساتھ نہیں لکھا ہے کہ یہ کب منظر عام پر آیا اور اقبال نے اسے کس کے لیے لکھا تھا؟ اس کی اہمیت اس لیے اور بڑھ گئی ہے کہ اس پر ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کی جو تاریخ درج ہے، اسے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اس نظم کی تاریخ تخلیق قرار دیا ہے۔[23] اس سلسلے میں لوگوں نے اپنے شبہات کا اظہار کیا اور موصوف سے طرح طرح کے سوالات کیے، مگر میں نے سنا ہے کہ انھوں نے کسی کو کوئی جواب نہیں دیا، مگر میرا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ ابھی حال میں دہلی کے ایک جلسے میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کے موقف سے اختلاف کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ ضروری نہیں کہ بخط اقبال پر جو تاریخ درج ہے وہ لازمی طور پر تخلیق کی تاریخ ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے میری باتوں کو توجہ سے سنا اور اپنے موقف پر قطعاً اصرار نہیں کیا۔

میں نے آزاد صاحب سے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ آپ نے بخط اقبال والی نظم کب اور کہاں دیکھی تھی؟ انھوں نے فرمایا کہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء میں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس کا تراشہ ان کے پاس تھا، اگر مل گیا تو اس کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دیں گے۔ گھر پہنچنے کے بعد لکھا کہ مطلوبہ تراشہ کاغذات کے انبار میں دب گیا ہے، فی الحال نہیں ملا۔ میری اطلاع کے مطابق نہرو لائبریری (تین مورتی، نئی دہلی) میں اس اخبار کے فائل موجود ہے، ارادہ ہے کہ کسی دن جا کر دیکھوں گا، مگر "توقیت اقبال" (مرتبہ: جگن ناتھ آزاد) میں بخط اقبال کا جو عکس شائع ہوا ہے، وہ بعینہ وہی ہے[24] جسے اقبال نے 'زمانہ' کو اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو سول اینڈ ملٹری گزٹ کی یہ تاریخ (۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء) صحیح نہیں ہو سکتی، کوئی اور ہوگی کیوں کہ 'زمانہ' کی بخط اقبال والی نظم کا عکس پہلی مرتبہ مئی ۱۹۳۸ء کے 'زمانہ' میں شائع ہوا ہے۔ چنانچہ جس شمارے میں "علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا تھا، اس میں فاضل مدیر نے لکھا کہ: "دفتر زمانہ میں آپ کے (یعنی اقبال کے) ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ابھی تک محفوظ ہے اور اسی پرچے میں ہدیۂ ناظرین ہے۔"[25] 'زمانہ' کا یہ عکس حسب ذیل ہے: [صفحہ نمبر ۱۱۹ پر عکس دیکھیے]

اس عکس کو 'آجکل' 'اقبال نمبر' نومبر ۱۹۷۷ء (صفحہ ۵) کے عکس سے ملا کر دیکھ لیجیے، دونوں میں سر مو کوئی فرق نہیں ہے۔

<u>**ہمارا دیس کی تاریخ تخلیق**</u> :۔ گزشتہ صفحات میں کسی جگہ میں لکھ چکا ہوں کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ہمارا دیس یا ترانۂ ہندی ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کو کہی گئی ہے۔ اس پر بھی تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے کہ "اتحاد" میں چھپنے سے پہلے یہ نظم ایک جلسے میں پڑھی گئی تھی، مگر بدقسمتی سے اس جلسے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، اس لیے محض قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ اس میں تو کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ نظم ۱۹۰۴ء میں کہی گئی ہے، اب صرف مہینے اور تاریخ کے تعین کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی تعطیلات گرما سے قبل کہی گئی ہوگی، یعنی ۱۵ مئی ۱۹۰۴ء سے پہلے۔ اس خیال کی دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ صدر جلسہ علامہ اقبال اور منتظم جلسہ لالہ ہردیال، دونوں کا تعلق ایک ہی کالج سے تھا اور بالعموم اہم جلسے تعطیلات میں نہیں ہوتے، دوسری وجہ یہ کہ اس سال تعطیلات گرما میں اقبال اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے یہاں ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے اور علالت کی وجہ سے وہاں قیام طویل ہو گیا تھا، چنانچہ زمانہ کو یہ نظم انھوں نے ۱۰ اگست کو ایبٹ آباد سے بھیجی تھی۔ اس نظم کے ساتھ دیا نرائن نگم کو اقبال نے جو خط لکھا تھا، وہ فی الحال مل نہ سکا، مگر رومن رسم خط میں اس کی ایک نقل محفوظ تھی، جسے برج نرائن نگم صاحب نے از راہ کرم اردو رسم خط

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں ۔ سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا ۔ وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں ۔ گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا

اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو ۔ اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ۔ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے ۔ اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ۔ صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

۱۰ اگست ۱۹۰۴ء — اقبال

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے "ترانۂ ہند" کا اصلی مسودہ
جو مرحوم نے سنہ ۱۹۰۴ء میں اپنے دست مبارک سے لکھکر
زمانہ کو مرحمت فرمایا تھا

یں بھیجا ہے، ذیل میں ملاحظہ ہو: [اس خط کا عکس شامرے اسی نمبر میں (نوادراتِ اکبر حیدری) میں دیکھیے]

از ایبٹ آباد ضلع ہزارہ

جنابِ من۔ میں کئی دنوں سے یہاں ہوں، لیکن افسوس کہ یہاں پہنچتے ہی بیمار ہوگیا، اس وجہ سے آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ ابھی پورا افاقہ نہیں ہوا۔ اشعار ارسالِ خدمت کرتا ہوں۔

دوسرا صفحہ ملاحظہ ہو۔

محمد اقبال

معرفت شیخ عطا محمد

سب ڈویژنل افسر، ملٹری ورکس

۱۰ر اگست سنہ ۱۹۰۴ء

اس بات کی تصدیق کہ اس سال اقبال تعطیلاتِ گرما میں ایبٹ آباد تشریف لے گئے تھے، 'مخزن' کے ایک نوٹ سے ہو جاتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۰۴ء کے مخزن (جلد ۸ نمبر۱) میں اقبال کا ایک مضمون: "قومی زندگی" شائع ہوا ہے، جس پر ایڈیٹر کے قلم سے یہ نوٹ شائع ہوا ہے۔: ہمارے مکرم دوست شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے، گرمی کی تعطیلوں میں اپنے برادرِ معظم شیخ عطا محمد صاحب سب ڈویژنل آفیسر ایبٹ آباد کے پاس تشریف لے گئے تھے۔[۲۶]"

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر قیاس کہتا ہے کہ اقبال کی یہ مشہور نظم مئی ۱۹۰۴ء کے اوائل یا اپریل کے اواخر میں کہی گئی ہوگی۔

<u>تنقیدِ ہمدرد کی بحث</u>:۔ جہاں تک اصل موضوع کا تعلق ہے، یہ بحث ختم ہوگئی، جس میں میں نے اس کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس موضوع کے تمام ضروری نکات اور مسائل اس میں آگئے ہیں، ان شبہات اور مسائل پر بھی کسی نہ کسی حد تک روشنی پڑ گئی ہے، جنھیں جین صاحب نے اپنے مضمون: "ترانۂ ہندی کی کہانی" میں ابھارا ہے، مگر ایک مسئلہ ابھی باقی رہ گیا ہے، جس کا اس موضوع سے براہِ راست تعلق نہیں ہے، مگر اس قسم کی بحثوں میں اس کا ذکر ضرور آتا ہے، چنانچہ جین صاحب کے مضمون میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ وہ "تنقیدِ ہمدرد" کا مسئلہ یعنی "تنقیدِ ہمدرد" کے فرضی نام سے "اردوئے معلیٰ" میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں، جن میں اقبال اور اہلِ پنجاب کی زباں دانی پر اعتراضات کیے ہیں، انھیں دراصل کس صاحب نے لکھا ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خود مولانا حسرت تھے جو اس فرضی نام سے لکھا کرتے تھے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ جین صاحب کے مضمون میں ایک جگہ اکبر حیدری صاحب کے ایک نجی خط کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ سید امتیاز علی تاج کے صاحبزادے مولوی ممتاز علی کی ایک رائے زنی سے خفا ہو کر "حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ اگست ۱۹۰۳ء میں 'تنقیدِ ہمدرد' کے فرضی نام سے ایک مضمون: "اردو زبان پنجاب میں" لکھا۔[۲۷]" جگن ناتھ آزاد کا بھی یہی خیال ہے کہ "تنقیدِ ہمدرد" دراصل مولانا حسرت ہی کا دوسرا نام تھا۔ وہ اپنے مضمون: "حسرت موہانی اور اقبال" میں لکھتے ہیں: "... اس ادبی بحث کا ذکر ضرور معلوم ہوتا ہے، جو حسرت موہانی نے تنقیدِ ہمدرد کے نام سے اقبال کے کلام پر کی اور جس کے متعلق مولانا عبدالمجید سالک نے "ذکرِ اقبال" میں بارہ صفحات وقف کیے ہیں۔ غالباً یہ بات مولانا عبدالمجید سالک کو بھی معلوم نہیں رہی ہوگی کہ "تنقیدِ ہمدرد" کے نام سے اعتراضاتِ اقبال کے بعض اشعار پر کیے گئے تھے، وہ مولانا حسرت موہانی کے اعتراضات تھے اور اقبال کو یقیناً یہ معلوم نہیں تھا کہ ان پر اعتراض کرنے والا کوئی معمولی اہلِ قلم نہیں ہے، بلکہ دیوانِ غالب کا شارح اور متروکاتِ سخن، معائبِ سخن اور محاسنِ سخن کا مصنف ہے۔[۲۸]"

افسوس کہ آزاد صاحب نے اُن دلائل اور شواہد سے ہمیں محروم رکھا جن کی بنا پر ان کو یقین ہے کہ مولانا حسرت ہی نے "تنقیدِ ہمدرد" کے فرضی نام سے مضامین لکھے ہیں۔ مجھے اس خیال سے اس لیے اتفاق نہیں ہے کہ یہ بات مولانا حسرت کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ہے کہ وہ اپنے صحیح خیالات کے اظہار کے لیے، چاہے وہ ادبی و لسانی ہوں یا سیاسی، کسی فرضی نام کا سہارا لیں۔ دوسرے "تنقیدِ ہمدرد" کے جس مضمون: "اردو زبان پنجاب میں" کا جین صاحب کے مضمون میں حوالہ دیا گیا ہے، اس پر ایڈیٹر کی حیثیت سے مولانا کا یہ نوٹ ہے: "ہم کو سخن سنجانِ پنجاب کی دل شکنی کے خیال سے اس مضمون کے شائع کرنے میں کس قدر تامل تھا، لیکن یہ دیکھ کر کہ صاحبِ مضمون نے زبان کی کمزوریوں سے گزر کر حضرت اقبال کی نفسِ شاعری پر مطلق اعتراض نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی جا بجا تعریف کی ہے، ہم اس کی اشاعت کو جائز رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ اہلِ پنجاب کی انصاف پسند طبیعتوں کو یہ بیانِ حقیقت ناگوار نہ گزرے گی۔[۲۹]" میں ذاتی طور پر مولانا کو ریاکار اور منافق نہیں سمجھتا کہ ایک طرف بحیثیت ایڈیٹر اپنے نوٹ میں لکھیں کہ مجھے اہلِ پنجاب کی دل شکنی

کابہت خیال ہے اور دوسری طرف "تنقید ہمدرد" کے نام سے اہل پنجاب کے جذبات و احساسات کو کچوکے لگائیں۔ اس لیے جب تک کوئی محکم اور ناقابل انکار ثبوت نہ دیا جائے، میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ "تنقید ہمدرد" اور حسرت ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔
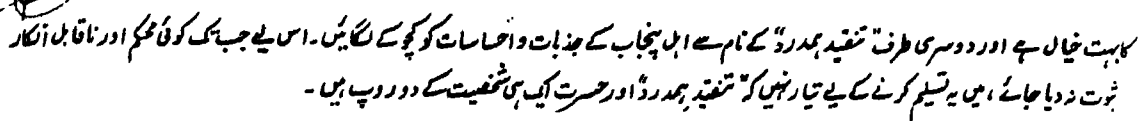
حوالہ جات:

(۱) اکبر حیدری کاشمیری: یادگار جشن صد سالہ منشی دیا نرائن نگم (مطبوعہ: ۱۹۸۲ء) صفحہ ۲۶۰ (۲) منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر ماہنامہ زمانہ (کانپور) (۳) برج نرائن نگم: یادگار جشن صد سالہ منشی دیا نرائن نگم، صفحہ ۲۹۹ (۴) صباح الدین عمر: مقالات نگم (مطبوعہ: ۱۹۸۳ء) صفحہ ۵۱) (۵) ویریندر پرشاد سکسینہ: ایضاً، صفحہ ۷۰ (۶) عبداللطیف اعظمی: ایضاً، صفحہ ۱۸ (۷) جگن ناتھ آزاد: (انگریزی مجلہ) اقبال ریویو (لاہور) اپریل تا جون (جلد ۲۷۔ شمارہ ۱)، صفحہ ۱۳۳ (۸) منشی دیا نرائن نگم: زمانہ اپریل ۱۹۳۸ء صفحہ ۲۶۸ (۹) ایضاً: زمانہ مئی ۱۹۳۸ء، ۳۲۷ (۱۰) سید نذیر نیازی: دانائے راز سوانح حیات حکیم الامت حضرت علامہ اقبال (مطبوعہ: ۱۹۷۹ء) صفحات: ۲۳۳، ۲۳۴ (۱۱) محمد عمر: اوراق گم گشتہ (مرتبہ: رحیم بخش) اشاعت دوم مارچ ۱۹۷۹ء۔ مضمون: "علامہ اقبال کے ترانے کی شان نزول" از صاحبزادہ سید ظفر ہاشمی صفحہ ۳۱۸ بحوالہ، چٹان (لاہور) یکم مئی ۱۹۶۷ء (۱۲) ایضاً صفحہ ۳۱۹ (۱۳) صاحبزادہ سید ظفر ہاشمی: ہفتہ وار چٹان (لاہور)، یکم مئی ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۵ (۱۴) ایضاً (۱۵) گیان چند جین: ماہنامہ آجکل (نئی دہلی) ستمبر ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۴ کالم اوّل (۱۶) حسرت موہانی: اردوئے معلّٰی (علی گڑھ) نومبر ۱۹۰۴ء، صفحہ ۳۸ (۱۷) صاحبزادہ ظفر ہاشمی: چٹان، صفحہ ۱۵ کالم اوّل (۱۸) (۱۹) ایضاً، صفحہ ۱۷ کالم چار (۲۰) وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی: اصلاح سخن، جون ۱۹۰۷ء، صفحہ ۳ (۲۱) اکبر حیدری کاشمیری: یادگار جشن صد سالہ منشی نگم، صفحہ ۲۶۰ (۲۲) سید محمد فاروق: ماہنامہ ادیب (الٰہ آباد)، جولائی ۱۹۱۲ء صفحہ ۲۳ (۲۳) جگن ناتھ آزاد: آجکل۔ اقبال نمبر۔ نومبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۵ (۲۴) ایضاً (۲۵) منشی دیا نرائن نگم: زمانہ مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۲۷ (۲۶) شیخ عبدالقادر: مخزن (لاہور)، اکتوبر ۱۹۰۴ء، صفحہ ۲۳ (۲۷) ترانۂ ہندی کی کہانی (از گیان چند جین) آجکل ستمبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۱۴ کالم ۲ (۲۸) جگن ناتھ آزاد: نشان منزل (مطبوعہ: جون ۱۹۸۲ء) صفحات: ۱۵ - ۱۶ (۲۹) حسرت موہانی: اردوئے معلّٰی، بحوالہ برہان (دہلی) اکتوبر ۱۹۶۱ء مضمون: حسرت (از عابد رضا بیدار)، صفحہ ۲۴۲

بنام راغب احسن

مولانا راغب احسن [۱۹۰۵ء - ۱۹۷۵ء] کے نام اقبال کے تمام خطوط محمد فرید الحق ایڈووکیٹ نے ۱۹۸۲ء میں "اقبال ۔ جہانِ دیگر" کے عنوان سے شائع کر دیئے تھے۔ شاعر شمارہ ۱۹۸۵ء میں ان خطوط کے عکس شائع کیے تھے۔ "اقبال ۔ جہانِ دیگر" کے صفحہ ۹۶ سے اس خط کا عکس لیا گیا۔

Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M.A., Ph.D.
Barrister at Law
Lahore

۱۰ [illegible] ۳۴ء

ڈیر راغب صاحب

دنیا اس وقت ایک عظیم کشمکش میں مبتلا ہے
جمہوریت فنا ہو رہی ہے سرمایہ داری کے خلاف ایک جہاد عظیم
ہو رہا ہے [illegible] ایک کشمکش میں مبتلا ہے
ان حالات میں آپ کے خیال میں دنیا کی جدید تشکیل میں
اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے [illegible]
[illegible]
خود مطالعہ سے گزر رہا ہوں [illegible] مفید
[illegible]

محمد اقبال

اقبال نمبر

اقبال اور مسجد قرطبہ

اقبال کی شاہکار نظم "مسجد قرطبہ" کی تخلیق کے دو مناظر۔ یہ نظم ۱۹۳۳ء میں تخلیق کی گئی تھی۔ اندرون" محو نماز اور بیرون مسجد ایستادہ یہ دونوں تصاویر ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا عطیہ ہیں اور ان کے مرتب کردہ "مرقع اقبال" مطبوعہ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے لی گئی ہیں۔
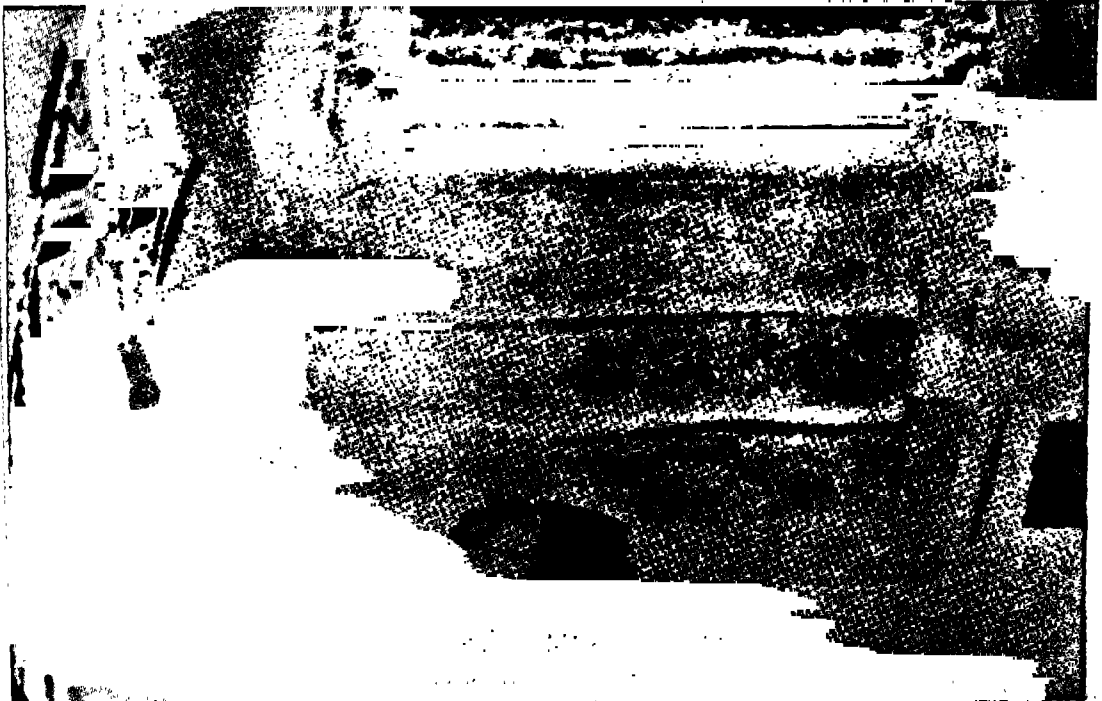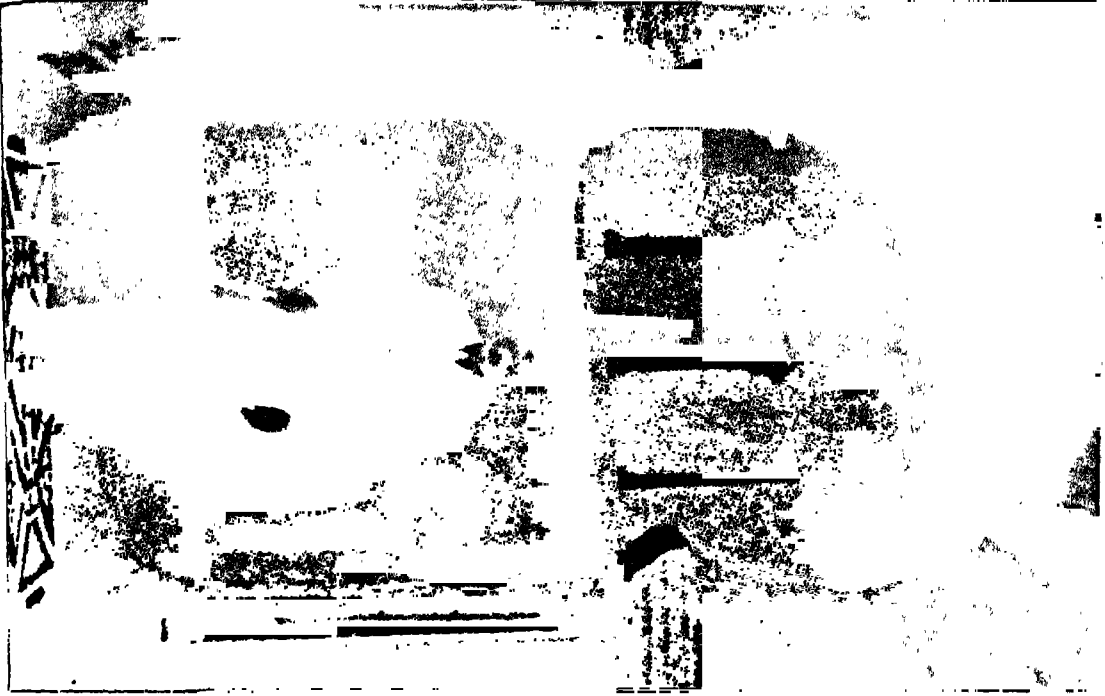
مسجدِ قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

[یہ نظم بالِ جبریل (اشاعت اول، مطبوعہ جنوری ۱۹۳۵ء) سے لی گئی ہے۔]

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات!
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات!
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات! کارِ جہاں بے ثبات!

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا!

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام!
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام!

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود
عرشِ معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود!
کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے!

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل
اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل!
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل!
ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل!

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

کعبۂ اربابِ فن سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ خلقِ عظیم صاحبِ صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں!

جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے!
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے!

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں

حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!

سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب!

آبِ روانِ کبیر• تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب!

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب!

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

• وادالکبیر قرطبہ کا مشہور دریا جس کے قریب ہی مسجدِ قرطبہ واقع ہے۔

رفاد فتیحی
یو ٹی آر سی، سابردن، سولن ۱۷۳۲۱۱ (ہماچل پردیش)

مسجدِ قرطبہ
ایک اسلوبیاتی مطالعہ

تخلیقی عمل ایک نفسیاتی اور لسانیاتی عمل ہے۔ ایک ایسا عمل جس کی مدد سے تجربے اور فکر و احساس کو خارجی اور لسانیاتی ہیئت دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لسانیاتی ڈھانچے اور انفرادی تجربے کے درمیان ایک طرح کا تفاعل پیدا ہو جاتا ہے۔ انفرادی تجربے اور لسانیاتی ڈھانچے کی مکمل ہم آہنگی ASSIMILATION سے تخلیق ابھرتی ہے یعنی کوئی بھی تجربہ اس وقت تک معرضِ وجود میں نہیں آسکتا جب تک زبان کا سہارا نہ لے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادب میں زبان انتقالِ خیال یا فکری ترسیل کے نظام کا نام ہے۔ اس لئے ادبی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم یکے بعد دیگرے ادبی اور لسانی معیاروں کو استعمال کریں۔ عام طور پر تحسین اور محاکمے میں ہم یا تو ادبی کارناموں کے کسی ایک پہلو پر اظہار رائے کرتے ہیں یا پھر موضوع کی معنویت اور پھیلاؤ پر توجہ صرف کرتے ہیں۔ ادبی تخلیقات کے اس مطالعے سے ادبی کارنامے کی سالمیت مجروح ہوتی ہے۔ ادبی کارنامہ چونکہ ایک اکائی UNITS کی شکل میں ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے اس لئے اسے اس طرح عناصر کے تفریق اور انتشار کے ساتھ دیکھنا مناسب نہیں۔ ادبی تخلیق کوئی ایسی چیز یا شے نہیں جو شدت جذبات کے کسی ایک خاص لمحے میں خود بخود وجود میں آگئی ہو بلکہ ایک ایسی تخلیق ہوتی ہے جو سلیقے محنت اور شعوری کوشش سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ یعنی اس میں اگر ایک جانب فکر اور احساس کو اہمیت حاصل ہوتی ہے تو دوسری جانب زبان کی بھی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ اسی لسانی ساخت کے ذریعے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ادب جمالیاتی احساس کو فکری احساس میں تبدیل کر دے۔ الفاظ اور زبان کے وسیلے سے اسے یہ موقع میسر آتا ہے کہ وہ اس ردِ عمل کو جسے آرٹ کے مواد نے اس کے اندر پیدا کیا ہے ایک لطیف اور نازک سانچے میں ڈھال دے۔ روایتی تنقید میں ایک عام غلطی جو ہم سے سرزد ہوتی ہے وہ یہ کہ ہم الفاظ کو ایک بے جان اور منفعل سی چیز سمجھتے ہیں اور انہیں تخلیقی عمل میں ایک ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ ہم بہت آسانی سے یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ الفاظ نہ صرف جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہیں بلکہ وہ جذبات کے اظہار میں گہرائی ہمواری اور زرخیزی بھی پیدا کرتے ہیں۔ محض مطالب کو خارجی لبادہ نہیں پہناتے بلکہ ان کی وسعتوں میں اضافہ کرتے ہیں اور ان میں وزن و وقار پیدا کرتے ہیں۔ گو یہ حقیقت ہے کہ اسلوب صرف "الفاظ" کا نام نہیں لیکن ہم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اسلوب وہیں نظر آتا ہے جہاں شخصیت الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے۔ تجربہ۔ فکر۔ جمالیاتی احساس اور لسانیاتی اکائیوں LINGUISTIC UNITS کی مکمل ہم آہنگی اسلوب کی معراج ہے۔ ادیب کے اسلوب کے تجزیے کے لئے یہ ضروری ہے کہ لسانیات اور تنقید کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہو۔ گو ادبی تنقید اور لسانیات ذہنِ انسانی کی دو تحریکیں ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی مکمل ہم آہنگی ہی تنقید کا معیار ہے ادبی تخلیق کا اسلوبیاتی تجزیہ زبان کی ہر سطح پر ممکن ہے۔ یعنی اس ادبی تخلیق کو ہم صوتی۔ صرفی نحوی۔ سطح پر پرکھ سکتے ہیں۔ تجربے فکر اور صوتی صرفی اور نحوی سطح پر لسانی ساخت سے مکمل آہنگی تخلیق کی کامیابی کی علامت ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں بالِ جبریل کی ایک طویل اور مشہور و معروف نظم "مسجدِ قرطبہ" کا اسلوبیاتی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تجزیے کے ذریعے نظم کے مرکزی خیال اور صوتی اور نحوی سطح پر نظم کی لسانی ساخت LINGUISTIC STRUCTURE کی ہم آہنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظم کا ساختی تجزیہ STRUCTURAL ANALYSIS نظم کے مرکزی خیال تک ہماری رسائی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

مسجدِ قرطبہ بالِ جبریل کی طویل نظموں میں اپنی فنی اور لسانی خصوصیات کی بنا پر ایک ممتاز نظم ہے۔ اس نظم میں چند ایسی نمایاں فنی اور لسانی خصوصیات ہیں جو بلند مرتبہ نظموں کا خاصا ہے۔ اس نظم میں آٹھ بند ہیں اور ہر بند میں ایک مرکزی خیال پایا جاتا ہے۔ اس نظم میں اقبال کی تمام تر شاعرانہ خوبیوں کو ابھارنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ اقبال کی فکری بلند آہنگی کے ساتھ فنی خصوصیات کو بھی معرضِ گفتگو بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ زیرِ نظر تجزیہ میں اقبال کی فکری بلند آہنگی

کے ساتھ ساتھ فن پارے کو ایک لسانی کل کے طور پر برتنے کے مسئلہ کو بھی معرضِ بحث بنایا گیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی اپنے ایک مضمون میں اقبال کی شاعری کے صوتیاتی نظام سے بحث کرتے ہیں اور اس نظم کا صوتیاتی تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس نظم میں صفیری آوازوں FRICATIVE SOUNDS کی تعداد دوسری آوازوں سے کہیں زیادہ ہے لیکن پروفیسر نارنگ اپنے اس مضمون میں صفیری اور مسلسل آوازوں کی اس تکرار کی وجہ نہیں ڈھونڈتے۔ شاید اس تکرار کے اسباب ڈھونڈنا مضمون کا مقصد بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس مضمون میں تو بنیادی طور پر اقبال کی شاعری کے صوتیاتی نظام سے بحث کی گئی ہے۔ جب کہ اس مضمون میں ہر بند کے صوتی نظام PHONOLOGICAL STRUCTURE اور خیال کی ہم آہنگی کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس نظم کے پہلے بند میں آٹھ شعر ہیں۔ ان اشعار میں اقبال بڑے فن کارانہ انداز میں وقت کے بہاؤ اور روانی کی تصویر کو الفاظ کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات   سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ   جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

اس بند میں سلسلۂ روز و شب کی تکرار معنی خیز ہے۔ سلسلۂ روز و شب دراصل وہ زندگی ہے جو متحرک ہے۔ زندگی کے تغیرات اور انقلابات اسی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں گویا یہ حرکت روانی اور بہاؤ زندگی کی ایک شان ہے۔ یہ حرکت اور روانی زندگی میں پوشیدہ ہے اور یہ زندگی اصل حرکت میں پوشیدہ ہے۔ حرکت زندگی سے ہے اور زندگی حرکت سے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس پہلے بند میں سلسلۂ روز و شب کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس کلیدی فقرے کی تکرار ہمیں روانی بہاؤ اور حرکت کا احساس دلاتی ہے۔ تکرار کے اضافے کے ساتھ ہی روانی اور بہاؤ کا یہ احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کلیدی فقرے کی صوتی ساخت بھی کچھ ایسی ہے جو ہمیں روانی اور بہاؤ کا احساس دلاتی ہے۔ اس کلیدی فقرے کی صوتی ساخت کا تجزیہ یہ واضح کر دیتا ہے کہ اس فقرے میں صفیری FRICATIVE آوازوں کو فوقیت حاصل ہے اس فقرے میں صفیری آوازوں کی تکرار ایک مخصوص صوتی فضا بنانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ماہرین لسانیات کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مختلف لسانی اصوات بذاتِ خود اپنے مفہوم کی عکاسی کرتے ہیں یعنی ان اصوات اور ان کے معنی و مفہوم کے درمیان ایک طرح کا فطری ارتباط ASSOCI ATION پایا جاتا ہے جس کی پہلی وجہ عضویاتی ARICULATORY ہوتی ہے۔ دوسری وجہ سماجی تہذیبی یا تاریخی ہو سکتی ہے۔ صفیری آوازوں کی ادائگی میں تلفظ کا ARTICULATOR اعضائے تکلم POINT OF ARTICOLATION کے اتنے قریب آجاتا ہے کہ راستہ تنگ ہو جاتا ہے اور تنفسی بہاؤ اس تنگ راستے سے گزر کر رگڑ پیدا کرتا ہے۔ ان صفیری آوازوں کی ادائیگی میں رگڑ کی یہ کیفیت ہمارے ذہنوں میں روانی، حرکت اور بہاؤ کی تصویر ابھارتی ہے اس طرح نظم کا یہ کلیدی فقرہ نظم کے بنیادی خیال کی ترجمانی کرتا ہے اور نظم کے مرکزی خیال سے صوتی ہم آہنگی رکھتا ہے۔ اس فقرے کا صوتی تانا بانا نظم کے مرکزی خیال اور احساسِ حرکت SENSE OF MOVEMENT کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے۔ صوت اور معنی کے اس فطری ربط اور مطابقت کو صوتی رمزیت SOUND SYMBOLISM کا نام دیا گیا ہے۔

حرکت اور گردش تغیر اور تبدیلی کی علامت ہے۔ مادی مفکرین کے نزدیک کائنات ایک وسیع میکانی نظام ہے جس کی بنیاد اصولِ حرکت پر ہے۔ اقبال کی نظر میں زندگی مسلسل حرکت کا دوسرا نام ہے۔ یہ ازل سے رواں دواں ہے۔ یہ ایک سیل ہمہ گیر ہے جس کی موج بلا میں انقلاباتِ زمان و مکاں اسیر ہیں۔ زندگی یہی متحرک قوت جب جذبۂ عشق سے ملحق ہوتی ہے تو اسے اپنے وجود اپنی انفرادیت اور عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ اس عظمت اور انفرادیت کے احساس میں خودی کا جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی اس نظم میں حرکت کے تصور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اسی بنیاد پر نظم کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ نظم ایک زبردست ذہنی اور فکری قوت کے زیرِ اثر شروع ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اس میں ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور آخری بند میں ٹھہراؤ کی یہ کیفیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ نظم کے پہلے بند میں صفیری آوازوں کی تعداد سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ دوسرے بند سے ان آوازوں کی تعداد میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ چھٹے۔ ساتویں۔ اور آٹھویں بند میں یہ کمی نمایاں طور پر نظر آنے لگتی ہے اس طرح نظم کا فکری نشیب و فراز اپنے لسانی ساخت سے مکمل ہم آہنگی رکھتا ہے۔

اوپر کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ صفیری آوازیں اپنے مخصوص تلفظ کی وجہ سے احساسِ حرکت سے SENSE OF MOVEMENT مطابقت رکھتی ہیں۔ ان آوازوں کی تکرار ہمیں حرکت اور روانی کے احساس سے ہم آہنگ کراتی ہے۔ جب ہم اس پس منظر میں اس نظم کا صوتی تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلے بند میں صفیری آوازوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے یعنی روانی حرکت یا ہلچل کا احساس پہلے بند میں سب سے زیادہ ہے۔ جب کہ ہم اس بات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ اس بند کے قافیے مثلاً حیات۔ حادثات۔ صفات۔ ممکنات۔ کائنات۔ برات، رات۔ بے ثبات اور ممات بند شیہ /ت/ پر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اس بند میں صفیری

FRICATIVE آوازوں کی بہتات معنی خیز ہے۔ دراصل انہی آوازوں کی مدد سے اقبال حرکت اور روانی کے احساس کو قلم بند کرتے ہیں۔ اس مثال سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شعر و ادب میں موضوع کا اس کے لسانیاتی طبق زیریں سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے جمالیاتی نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ شاعری کا مطالعہ صرف موضوع اور مفہوم تک محدود نہ رہے بلکہ اس کی ہیئت اور آہنگ کا بھی جائزہ لیا جائے۔ ہر ادبی تخلیق سب سے پہلے اصوات کا مجموعہ ہوتی ہے جس سے معنی ابھرتے ہیں۔ شعر میں جہاں مزاج اور معنی ایک ہو جاتے ہیں زبان لسانی تکمیل کو پالیتی ہے اور تخلیق کا شعری حسن ابھر آتا ہے۔ نظم کے اس پہلے بند میں صوت و معنی کا گہرا رشتہ اقبال کے انفرادی اسلوب کی کامیابی ہے۔

نظم کے دوسرے تیسرے اور بعد کے تمام بند میں ٹھہراؤ کی ایک کیفیت نظر آتی ہے۔ دوسرے بند کے چند اشعار کو دیکھئے۔

عشق دمِ جبریل عشق دلِ مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے ہے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

مسجد قرطبہ کا یہ بند اقبال کی فکر اور تجربے کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ اس بند کے داخلی سطح پر نظر آنے والے جذبے کی شدت الفاظ و آہنگ کے ذریعہ بند کی خارجی سطح پر نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اقبال اس بند میں اپنے فلسفۂ عشق کو پیش کرتے ہیں۔ عشق کی علامت اقبال کے لئے ایک سیلِ رواں ہے جس میں جاودانی اور ابدیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا پاکیزہ اور روحانی جذبہ ہے جس کا مادی اور دنیاوی عشق سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس کی پاکیزگی کا اندازہ دمِ جبریل اور دمِ مصطفیٰ سے ہوتا ہے۔ عشق اقبال کی نظر میں نورِ حیات اور نارِ حیات ہے۔ عشق کے مضراب سے ہی نغمۂ تارِ حیات کا وجود ہے۔ عشق کی یہ نغمگی اس پورے بند میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ صفیری آوازوں کی جگہ اس بند کی کثیر الاستعمال آوازیں انفی مصمتے NASAL CONSONANTS اور انفی مصوتے NASALIZED VOWELS ہیں۔ اس بند کے صوتی تجزیے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے مصرعے میں یہ انفی آوازیں پانچ بار استعمال ہوئی ہیں۔ دوسرے مصرعے میں چار بار۔ اس طرح ہر مصرعے میں ان کی تعداد نمایاں نظر آتی ہے۔

ان انفی کلامی اصوات کی ادائیگی میں منہ میں واقع ہوا کے راستے کو مکمل طور پر بند کر کے ہوا ناک کے راستے NASAL CAVITY نکالی جاتی ہے۔ مثلاً /م/ کی ادائیگی میں دونوں لب آپس میں جڑ جاتے ہیں اور صوت تانت VOCAL CORDS مرتعش ہو جاتا ہے۔ اور ہوا دہنی جوف ORAL CAVITY کی جگہ ناک کے راستے باہر نکلتی ہے انفی مصمتے نغمگی اور موسیقیت کا احساس دلاتے ہیں۔ پھیپھڑوں سے نکلی ہوئی ہوا کو ناک کے راستے نکالنے کی وجہ سے ان مصمتوں کی ادائیگی میں ایک جھنکار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔ انفی مصمتوں کے استعمال سے پیدا شدہ اس بند کی یہ نغمگی عشق کے جذبے سے مکمل ہم آہنگی رکھتی ہے۔ بقول شاعر

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اس بند میں نغمگی پہلے مصرعے سے آخری مصرعے تک محسوس ہوتی ہے۔ اس بند کے درمیان تک پہنچتے پہنچتے نغمگی کا یہ احساس اپنے شباب تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر اس میں آہستہ آہستہ ٹھہراؤ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بند کے آٹھویں مصرعے میں انفی مصمتوں اور انفی مصوتوں کی تعداد سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نغمگی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہو۔ اس مصرعے کے پہلے اور بعد میں انفی آوازوں کے استعمال میں ہمیں ایک ترتیب نظر آتی ہے۔ اس مخصوص مصرعے کے پہلے حصے میں ۱۹ انفی مصمتے استعمال ہوئے ہیں جب کہ دوسرے حصے میں ۲ انفی مصمتوں کا استعمال ہوا ہے۔ اس ترتیب اور پیٹرن کی وجہ سے اس پورے بند میں ہمیں ایک مخصوص صوتی آہنگ کا احساس ہوتا جو اس بند کے جذبے کی شدت سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس بند کی یہ نغمگی جذبۂ عشق کی موسیقیت سے مکمل ہم آہنگی رکھتی ہے۔

لسانی ساخت LINGUISTIC STRUCTURE اور فکر و جذبے کی یہ ہم آہنگی نظم کے ہر بند میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ادبی تخلیق حقیقت کا انکشاف ہے۔ اقبال کی شاعری میں حقیقت کا یہ انکشاف زبان کی ہر سطح پر نظر آتا ہے۔ اقبال کے اسلوب کی یہ انفرادیت فکر و جذبے کو متشکل کر دیتی ہے۔ مثلاً اسی نظم کے چھٹے اور ساتویں بند میں اقبال کی ذہنی اور زندگی کی حرکت یا عشق کی کارفرمائیوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ عہد ماضی کے گرد

ہوتی ہے۔ مسجد کا ذکر کرتے کرتے اقبال کا ذہن اس قوم کے کارناموں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس نے عہدِ ماضی میں یہ عدیم المثال مسجد تعمیر کرائی تھی۔ یادِ ماضی ایک المیہ ہے۔ مسلمانانِ اندلس کی تاریخ اقبال کے دل میں درد و رنج کا احساس جگا دیتی ہے۔ درد و رنج کا یہ احساس اس نظم کے چھٹے اور ساتویں بند میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس بند کے صوتی ڈھانچے میں بھی رنج و غم کی یہ کیفیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔

آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار   حاملِ خلقِ عظیم صاحبِ صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب   سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

مسلمانانِ اندلس کے چھ سو سالہ تاریخ کا ذکر اقبال افسردہ لب و لہجے میں کرتے ہیں۔ اس حصّے کا پہلا شعر لفظ "آہ" سے شروع ہوتا ہے اور رنج و غم کی یہ کیفیت آخر تک برقرار رہتی ہے۔ طویل مصوّتے LONG VOWELS اس مخصوص ذہنی کیفیت اور جذبات و احساسات کے اظہار و ابلاغ میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مصوتوں کی ادائگی میں منہ کے کھلنے اور زبان کے نیچے رہنے کی حالت مختلف ہوتی ہے۔ اس فرق کی وجہ سے مصوتوں کی رمزی کیفیت میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ طویل مصوتے عام طور سے حزن و یاس اور آہ و زاری کی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس چھٹے اور ساتویں بند میں طویل مصوتوں کی بہتات نظر آتی ہے۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں   آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے   عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب   رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

ان دو بند میں طویل مصوتوں کی تکرار واضح طور پر نظر آتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں بند میں طویل مصوتوں کی تعداد زیادہ ہے بلکہ اس پوری نظم میں صرف یہ دو ایسے بند ہیں جن میں قافیے طویل مصوتوں پر ختم ہوتے ہیں۔ چھٹا بند انفی مصوتہ /ایں/ پر ختم ہوتا ہے جب کہ ساتواں بند انفی مصوتہ /آں/ پر۔ ان دونوں مصوتوں کا انفی ہونا بھی قابلِ توجہ ہے۔ ان مصوتوں کے انفی ہونے کی وجہ سے اس بند کا سماعی تصور خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کا لہجہ قوافی کی فراہم کردہ صوتی آہنگ کے نظام کے تابع ہوتا ہے۔ اس بند کے 'آسماں' 'اذاں' 'جاں' 'فشاں' 'رواں' 'جہاں' 'خواں' اور 'زباں' جیسے قوافی میں طویل مصوتہ /آں/ کا صوتی آہنگ ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے جو اس بند کے مرکزی خیال سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور ایک مخصوص حزن و یاس اور آہ و زاری کی کیفیت ابھارنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

اس نظم کے آخری بند میں بھی ایک مخصوص صوتی کیفیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہ نظم ایک فکری اور جذباتی ہلچل کے ردّعمل میں شروع ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اس میں ایک ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ ٹھہراؤ کی یہ کیفیت نظم کے چوتھے پانچویں چھٹے اور ساتویں بند میں صاف طور پر نظر آتی ہے۔ نظم کے آٹھویں اور آخری بند میں ٹھہراؤ کی یہ کیفیت ایک طرح کی نرمی اور دھیما پن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس بند کی شروعات ایک ایسے منظر سے ہوتی ہے جہاں پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبتا ہوا سورج شفق کی لالی چھوڑ جاتا ہے۔ شام کے اس دھندلکے میں "دخترِ دہقاں" کے گیت فضا میں نغمگی بکھیرتے ہیں۔ اس رومان انگیز ماحول میں شاعر دریائے کبیر کے کنارے مستقبل کے دریچوں میں جھانکتا ہے۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ عالمِ نو پردۂ تقدیر کے پیچھے سے طلوع ہونے والا ہے۔ یہ قدرتی مناظر ہمارے ذہنوں میں ایک ایسی پُرسکون تصویر بناتے ہیں جو پہلے بند کی اس روانی اور ہلچل کی تصویر سے قطعی مختلف ہے۔ آخری بند کی یہ پُرسکون تصویر شاعر کے ذہنی کشمکش کے خاتمے کا احساس دلاتی ہے اور نظم اس پُریقین لہجے پر ختم ہو جاتی ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی   روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم   کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

شاعر کے فکر و فلسفے میں سکون اور ٹھہراؤ کی یہ کیفیت اس بند کے صوتی ڈھانچے میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ پہلے بند کے اسلوبیاتی تجزیے میں ہم نے دیکھا کہ اس بند کی کثیر الاستعمال آوازیں صفیری مصمتے ہیں۔ صفیری آوازوں کی ادائگی میں مقامِ تلفظ سے ہوا کا رگڑ کر نکلنا ہمارے ذہنوں میں حرکت کا احساس جگاتا۔ سلسلۂ روز و شب کا تکرار وقت اور زندگی کے روانی کا احساس دلاتی ہے۔ وقت اور زندگی کی یہ روانی نظم کے اس بند کے صوتی ساخت PHONEMIC STRUCTURE سے مکمل ہم آہنگی رکھتی ہے۔ نظم کا آخری بند فکر و جذبے میں نظم کے پہلے بند سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں زندگی کی کشمکش روانی اور ہلچل کی وہ نغمہ نہیں نظر آتی جو ہمیں پہلے بند میں نظر آتی ہے۔ اس آخری بند میں سکون دھیما پن اور ٹھہراؤ کا احساس ہوتا ہے۔ اس دھیما پن اور ٹھہراؤ کو ہم اس بند کے صوتی ڈھا

میں بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر پہلے بند میں صفیری آوازوں کی کثرت تھی تو اس بند میں بندشی مصمتوں STOP CONSONANTS کی کثرت ہے۔ بندشی مصمتوں کی ادائگی میں ہوا کا راستہ ایک ثانیہ کے لئے بند کر دیا جاتا ہے اور ہوا لمحے بھر کے لئے رک جاتی ہے۔ اس بند میں ایک سو دو (۱۰۲) بندشی مصمتوں کا استعمال معنی خیز ہے۔ اس بند میں صفیری مصمتوں کے استعمال میں واضح کمی ہوئی ہے اور ان صفیری مصمتوں کی جگہ بندشی مصمتوں نے لے لی ہے۔ بندشی مصمتوں کی ادائگی میں ہوا کا لمحے بھر کے لئے رکنا غالباً ٹھہراؤ کی کیفیت سے مناسبت رکھتا ہے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بند میں ٹھہراؤ کی یہ کیفیت اس بند کے صوتی ڈھانچے میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔

نحو و فلسفے اور تجربے کی لسانی ساخت سے یہ ہم آہنگی صرف صوتی ساخت تک ہی محدود نہیں بلکہ صرف و نحو میں بھی یہ ہم آہنگی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ زبان کے مطالعے میں قواعد یا صرف و نحو کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ قواعد ایک ذہنی طریقۂ کار کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک قدرتی اور خودکار عمل کے زیر اثر جملہ ایک مخصوص ترتیب میں ڈھل جاتا ہے۔ مشہور ماہر لسانیات چومسکی CHOMSKY نے زبان و قواعد کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جس میں جملے کو قواعدی صحت GRAMMATICALNESS اور مفہومی صحت MEANINGFULNESS کی سطح پر امتیاز کیا۔ چامسکی کے مطابق ہر قواعد جملہ ایک مخصوص سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ جس میں جملے کا ایک حصہ اسم فقرہ ہوتا ہے جب کہ دوسرا حصہ فعل فقرہ۔ اس طرح ایک سیدھا سادہ جملہ فقروی ترکیبی قاعدے PHRASE STRUCTURE RULE کے مطابق مختلف خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

جملہ = اسم فقرہ + فعل فقرہ

اسم فقرہ + فعل خاص + معاون فعل

اسم فقرہ + اسم + فعل متعدی + معاون فعل

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جملوں میں فعل کی اپنی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اور ان کے بغیر جملے مکمل نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فعل جملے کے مکمل ہونے کا احساس دلاتے ہیں اور اسما کی ترتیب میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

فعل — اسم ۱ — اسم ۲ — اسم ۳

اردو میں افعال کی اس اہمیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ہم اس نظم کے نحوی ساخت کو پرکھیں تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس نظم کے پہلے بند کے پہلے تین مصرعوں میں فعل کا استعمال نظر نہیں آتا۔ ان مصرعوں کے تمام الفاظ اسم ہیں۔ گویا ان مصرعوں کی ظاہری سطح SURFACE STRUCTURE پر ہمیں فعل کا استعمال نظر نہیں آتا۔

(۱)	سلسلۂ روز و شب	نقش گر حادثات
	اسم 1 +	اسم ۲
(۲)	سلسلۂ روز و شب	اصل حیات و ممات
	اسم 1 +	اسم ۲
(۳)	سلسلۂ روز و شب	تار حریر دو رنگ
	اسم 1 +	اسم ۲

اردو زبان کی لسانی ساخت LINGUISTIC STRUCTURE کے مطابق فعل جملے کا لازمی حصہ ہے فعل کے بغیر جملہ مکمل نہیں ہوتا۔ لیکن شعر کا مصرع جملے سے مختلف ہوتا ہے۔ شعری زبان میں روایت سے انحراف کے امکان ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصرعے میں ظاہری سطح پر ان تمام اصول و قواعد کی پابندی ضروری نہیں ہوتی جو ہم بول چال کی زبان میں کرتے ہیں۔ ان مصرعوں میں بھی ہمیں ظاہری سطح پر فعل کا استعمال نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر ہم ان مصرعوں کا تجزیہ عمیق سطح پر کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ عمیق سطح DEEP STRUCTURE پر فعل "ہے" پوشیدہ ہے۔ گویا ہم ان مصرعوں کو افعال کے استعمال کے ساتھ یوں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

سلسلۂ روز و شب　　نقش گر حادثات　　(ہے)

اسم ۱　　اسم ۲　　(فعل)

سلسلۂ روز و شب　　اصل حیات و ممات　　(ہے)

اسم ۱　　اسم ۲　　(فعل)

سلسلۂ روز و شب　　تار حریر دو رنگ　　(ہے)

اسم ۱　　اسم ۲　　(فعل)

اس طرح عمیق سطح پر فعل کے استعمال کے امکانات واضح ہو جاتے ہیں۔ لیکن اقبال شعوری طور پر افعال کا استعمال نہیں کرتے۔ لیکن اس بند کے بعض دوسرے مصرعوں میں ہمیں افعال کا استعمال نظر آتا ہے۔

(۱)　جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

(۲)　تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ

(۳)　جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

ان مصرعوں میں "دکھاتی ہے" اور "بناتی ہے" جیسے افعال کا استعمال ہوا ہے۔ آئیے ان مصرعوں میں ان افعال کے استعمال کی اسلوبیاتی خصوصیات STYLISTIC BEAUTY پر ایک نظر ڈالیں۔ اقبال نے پہلے تین مصرعوں میں فعل "ہے" کے استعمال سے گریز کیا ہے جب کہ بعد کے تین مصرعوں میں افعال کا استعمال نظر آتا ہے۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اس نظم کے پہلے بند میں روانی اور حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ اس احساس کو برقرار رکھنے کے لئے اقبال نے ایک ایسی لسانی ساخت کا استعمال کیا ہے جو اس حرکت اور روانی کے احساس سے مطابقت رکھتی ہو۔ ان کی یہ کوشش اصوات کے انتخاب و ترتیب میں بھی نظر آتی ہے۔ اور الفاظ کے انتخاب و ترتیب میں بھی۔ فعل "ہے" کے استعمال سے گریز کرنے اور افعال "دکھاتی ہے" "پرکھتا ہے" اور "بناتی ہے" کے استعمال کو ترجیح دینے میں ہمیں ایک اسلوبیاتی کشش نظر آتی ہے۔

مصرعہ نمبر	مصرعے	فعل	قسم فعل
(۱)	سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات (ہے)	(ہے)	جامد فعل STATIVE VERB
(۲)	سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات (ہے)	(ہے)	جامد فعل STATIVE VERB
(۳)	سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ (ہے)	(ہے)	جامد فعل STATIVE VERB
(۴)	جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات	(بناتی ہے)	متحرک فعل MOTION VERB
(۵)	جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات	(دکھاتی ہے)	متحرک فعل MOTION VERB
(۶)	تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ	پرکھتا ہے / پرکھتا ہے	متحرک فعل MOTION VERB

پہلے بند کے پہلے تین مصرعوں میں "ہے" کا استعمال ممکن تھا لیکن اقبال نے اس کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ کیونکہ "ہے" ایک جامد فعل STATIVE VERB ہے۔ جامد فعل کسی کام کے مکمل ہو جانے کا احساس دلاتا ہے۔ اور یہ احساس ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اقبال نے اس بند کے پہلے تین مصرعوں میں فعل "ہے" کے استعمال سے گریز صرف شعری ضرورتوں کے لئے نہیں کیا بلکہ اس لسانی ڈھانچے کے لئے کیا ہے جو اس بند کے احساس حرکت SENSE OF MOVEMENT سے مطابقت رکھتا ہو۔ جامد فعل "ہے" کے استعمال سے اس لسانی ڈھانچے میں ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس بند کے پہلے تین مصرعوں

اس سے گریز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب کہ دوسری جانب "بناتی ہے" "دکھاتی ہے" اور "رکھتا ہے" جیسے افعال متحرک افعال ہیں اور جن کے استعمال سے احساسِ حرکت
SENSE OF MOVEMEN میں اضافہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اقبال نے اس بند میں ان کے استعمال سے گریز نہیں کیا۔ افعال کے انتخاب و ترتیب میں اسلوبیاتی
حسن نظم کے آخری بند میں بھی نظر آتی ہے۔ نظم کے آخری بند میں جامد فعل "ہے" کا بھرپور استعمال نظر آتا ہے جو اس بند کے مخصوص ٹھہراؤ کی کیفیت سے مطابقت
رکھتا ہے۔

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب — لعلِ بدخشاں کا ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت — کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب

اس طرح اقبال نے اس نظم میں افعال کے اس انتخاب و ترتیب سے ایک اسلوبیاتی حسن پیدا کیا ہے جو ہر بند کے مرکزی خیال سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور یہی اقبال کے
اسلوب کی کامیابی ہے۔ نظم ایک زبردست ذہنی ہلچل کی کیفیت سے شروع ہوتی ہے۔ اور نقطۂ عروج کو پہنچتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ نظم میں ایک ٹھہراؤ
کی کیفیت پیدا ہونے لگتی اور آخری بند تک پہنچتے پہنچتے نظم ایک پرسکون لب و لہجے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ نظم کے اس فکری اور ہئیتی اتار چڑھاؤ کو ہم مندرجہ
ذیل تصویر کے ذریعے پیش کر سکتے ہیں۔
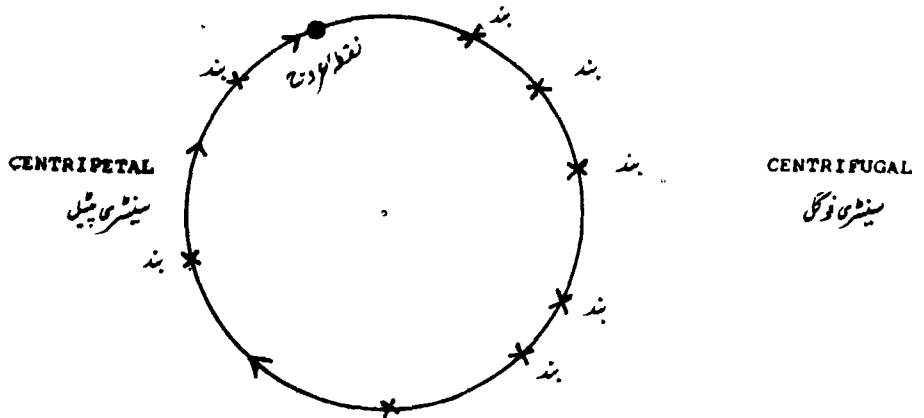
نظم کے پہلے حصے میں نظم کا ہئیتی ارتقا "سینٹری پیٹل" CENTRIPETAL نظر آتا ہے یعنی نظم ایک نقطے سے شروع ہوتی ہے اور نقطۂ عروج کی
طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ نظم کے دوسرے حصے میں نظم کا ہئیتی "سینٹری فوگل" CENTRIFUGAL ہو جاتا ہے۔ یعنی نظم نقطۂ عروج سے ٹھہراؤ کی ایک کیفیت
کی جانب بڑھنے لگتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ ایک پرسکون اور پریقین لب و لہجے پر ختم ہو جاتی۔
اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس نظم کا لسانیاتی ڈھانچہ LINGUISTIC STRUCTURE نظم کے مرکزی خیال سے مکمل ہم آہنگی رکھتا ہے
اور اقبال کے اسلوب کی کامیابی ہے۔ ❀

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چون رسیم
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

الملک للہ

*

[پیامِ مشرق صفحہ ۱۲۹ ۔ کلیاتِ اقبال صفحہ نمبر ۲۹۹]

غالب انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات

دیوانِ غالب

غالب انسٹی ٹیوٹ کے اس خاص ایڈیشن میں نسخۂ حمیدیہ میں شامل اس کلام کا انتخاب بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ متن کی صحت پر خاص کر توجہ کی گئی ہے۔ دبیز سفید کاغذ، بے حد خوب صورت گرد پوش اور مضبوط جلد۔

صفحات: ۲۴۰ ✿ قیمت ۲۵ روپے

مثنویاتِ غالب

مع اردو ترجمہ

ترتیب و ترجمہ — ڈاکٹر ظ انصاری

قیمت ✿ ۶۰ روپے

مقالاتِ بین الاقوامی غالب سمینار

انگریزی ۱۹۶۹ء

مرتبہ — ڈاکٹر یوسف حسین خاں

بین الاقوامی غالب سمینار میں پڑھے گئے انگریزی مقالات کا مجموعہ۔

صفحات ۱۴۶ ✿ قیمت ۱۰ روپے

غزلیاتِ غالب (فارسی)

(انگریزی)

مرتبہ — ڈاکٹر یوسف حسین خاں

غالب کی فارسی غزلوں کا انگریزی ترجمہ۔ ترجمے میں انگریزی ترجمے کے ساتھ فارسی متن بھی شامل ہے۔

قیمت ✿ ۸۰ روپے

یادگارِ غالب: مولانا حالی

یہ کتاب پہلی بار ۱۸۹۷ء میں نامی پریس کانپور میں چھپی تھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اس اولین ایڈیشن کو فوٹو آفسیٹ کے ذریعے بہت اہتمام سے چھاپا ہے

صفحات ۲۳۸ ✿ قیمت ۶۰ روپے

سیر المنازل

اوائل انیسویں صدی عیسوی کی دہلی کی مستند اور معتبر تاریخ

مرزا سنگین بیگ (فارسی متن مع اردو ترجمہ)

ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

قیمت ✿ ۴۵ روپے

خاندانِ لوہارو کے شعراء

مرتبہ — حمیدہ سلطان احمد

جس میں خاندانِ لوہارو کے شعراء کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام مع تنقید و تبصرہ پیش کیا گیا ہے

قیمت ✿ ۳۰ روپے

غالب کے خطوط

مرتبہ — ڈاکٹر خلیق انجم

مشہور و ممتاز محقق ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے اردو خطوط کا چار جلدوں میں تنقیدی ایڈیشن تیار کیا ہے دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں باقی دو جلدیں زیر طبع ہیں۔

صفحات ۴۸۲ قیمت ۷۵ روپے

مقالاتِ بین الاقوامی غالب سمینار

اردو ۱۹۶۹ء

مرتبہ — ڈاکٹر یوسف حسین خاں

صفحات ۳۵۶ ✿ قیمت ۲۰ روپے

نقد قاطع برہان مع ضمائم

پروفیسر نذیر احمد

قیمت ✿ ۶۰ روپے

دیوانِ غالب (ہندی)

مرتبہ — نور نبی عباسی

قیمت ✿ ۴۰ روپے

غزلیاتِ غالب (اردو)

(انگریزی)

مرتبہ — ڈاکٹر یوسف حسین خاں

غالب کی غزلوں کے انتخاب کے کئی انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں لیکن یہ ترجمہ ایک اسکالر کا ہے جو غالب کا مزاج شناس ہے

ترجمے کے ساتھ اصل غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں

قیمت ✿ ۹۶ روپے

قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ

مرتبہ — قاضی عبدالودود

غالب کی فارسی اور اردو نثر کا بیش قیمت تحفہ

صفحات ۲۹۶ ✿ قیمت ۲۵ روپے

غالب انسٹی ٹیوٹ کا ششماہی رسالہ

غالب نامہ

اردو ادب میں ادبی تحقیق اور تنقید کی رفتار کا آئینہ

مدیر اعلیٰ — پروفیسر نذیر احمد

مدیران: رشید حسن خاں، نور الحسن انصاری، شاہد ماہلی

قیمت فی شمارہ — ۳۰ روپے

زرِ سالانہ — ۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

باب ۲

قطعہ

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؑ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی!

اقبالؒ
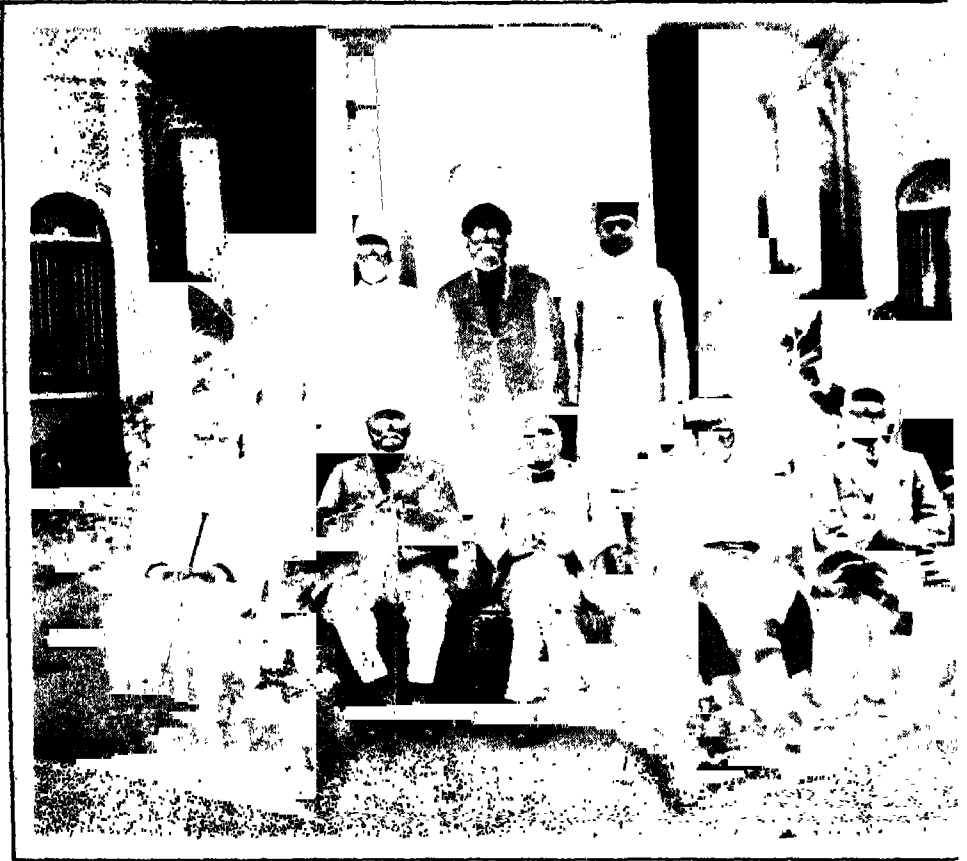
حاجی سر محمد اسماعیل کے دولت کدے پر

پر دکن کے دوران ۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو حاجی سر محمد اسماعیل سیٹھ بنگلور کے دولت کدہ پر لی گئی تصویر میں۔ دائیں سے بائیں:
الیٰ [لاہور] مولوی عبدالغفور، سر محمد اقبال۔ حاجی سر محمد اسماعیل سیٹھ اور نامعلوم۔ ایستادہ: فرزند محمد اسمٰعیل
حامد عبدالرحیم بنگلوری، محمد جمیل بنگلوری۔

میسور یونیورسٹی (میسور) کی ایک یادگار تصویر

میسور یونیورسٹی کے اردو طلبہ، پرنسپل، پروفیسروں اور معززین شہر کے ساتھ اقبال کی ایک یادگار تصویر۔ اس میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے (بائیں سے دائیں) پروفیسر محمد جلال الدین، سید غوث محی الدین (مدیر اسلام)، چودھری محمد حسین (لاہور)، محمد آباسیٹھ، پرنسپل دالو، ڈاکٹر اقبال، پروفیسر واڈیا، پروفیسر گوپال سوامی، پروفیسر عبداللہ چغتائی (ل)
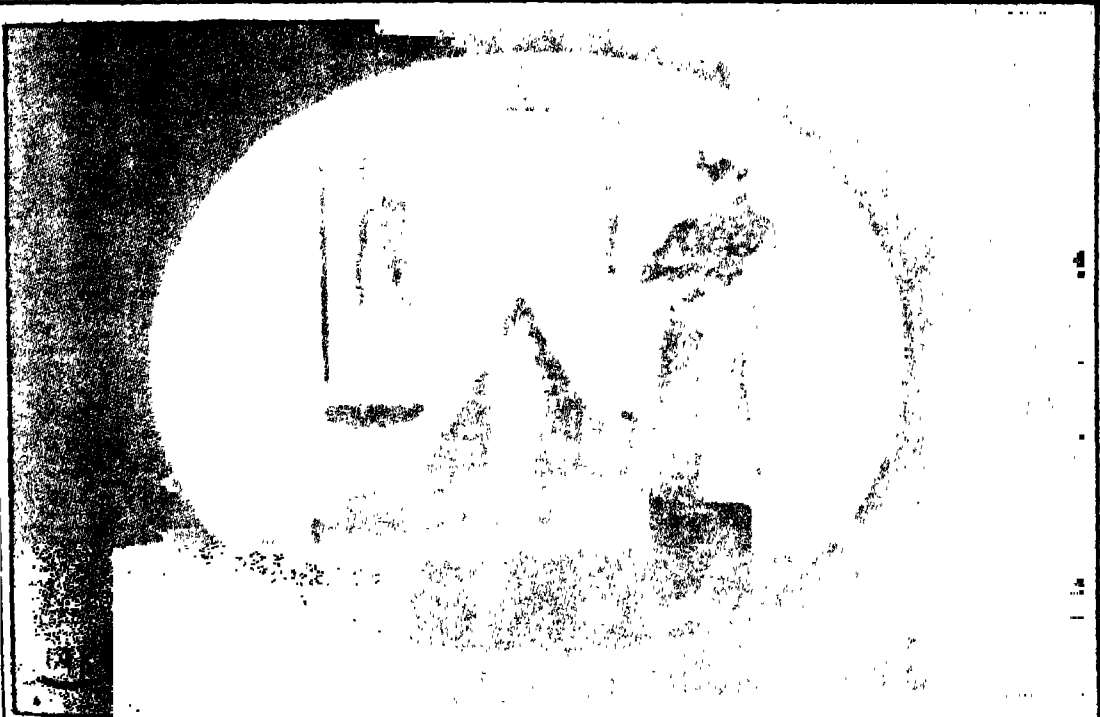
اقبال مزارِ سلطان شہید پر

۱۰ جنوری ۱۹۲۹ء کی دوپہر میں اقبال سری رنگ پٹن (میسور) میں شہید ٹیپو سلطان کے مزار پر حاضر ہوئے۔ یہ تصویر اسی موقع کی یادگار ہے۔

سلیم تمنائی

دودھ پورہ مکان، عیدگاہ، میسور (۵۷۰۰۲۱) کرناٹک

داستانی از دکن آوردہ ام

"اللہ اللہ! یہ انسان ایک کروڑ سالانہ کی تجارت کرتا ہے، تہمد کرتا پہنتا ہے اور حقیقتِ مادہ و روح جیسے علمی مسائل پر انگریزی، اردو میں گفتگو کرتا ہے۔ اس کو فکر دامن گیر ہے کہ مسلمانوں کی قدیم اور نئی تعلیم کا حقیقی اتصال ہو اور اسلام اپنی اصلی شان میں دنیا پر ظاہر ہو، مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ TYPE نہ پیدا ہوگا نصب العین تک رسائی محال ہے۔" [1]

اقبال نے مندرجہ بالا الفاظ میں حاجی محمد جمال بن حاجی جمال محی الدین راؤتر کی تعریف فرمائی تھی۔ جناب موصوف نے ایک مجلس کی بنیاد رکھی ا اس کے زیر اہتمام مولانا سید سلیمان ندوی اور جناب مارماڈیوک پکھتال نے "سیرت محمدی ﷺ" اور "اسلام اور مدنیت" پر تقاریر کیں۔ اب ڈاک اقبال مدعو تھے، علامہ موصوف نے دسمبر ۱۹۲۸ء کی بجائے جنوری ۱۹۲۹ء کو مدراس آنا منظور فرمایا۔

اقبال کا یہ سفر ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۸ء کی صبح لاہور سے شروع ہوا۔ دہلی میں دو دن کے قیام کے بعد ۲ر جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح عازمِ بمبئی ہوئے ۳ر جنوری دوپہر بمبئی پہنچے، سیٹھ ہاشم اسماعیل نے آپ کا استقبال کیا اور بیگم اسماعیل نے گوئٹے کی تصنیف "فاؤسٹ" حضرت اقبال کے ہاتھوں مع درخواست کی کہ اس پر کوئی شعر تحریر فرمادیں۔ علامہ اقبال نے یہ شعر رقم کر دیا [2]

کلام و فلسفہ از لوحِ دل فرو شستم
ضمیرِ خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق

اور فرمایا:

"وہ نتیجہ ہے جس پر فاؤسٹ کو پہنچنا چاہیئے تھا مگر وہ نہ پہنچا۔" [3]

اسی دن پانچ بجے شام بوری بندر کے قریب گرینز ہوٹل (متصل تاج ہوٹل) میں چائے کا اہتمام تھا۔ سردار غلام محمد خاں قونصل جن افغانستان، سر چمن لال سیتل واڈ اور محمد علی سالسٹر بھی زینتِ محفل رہے۔

رات کے آٹھ بجے مسلم فیڈریشن بمبئی کی دعوتِ طعام، اقبال نے قبول کرلی تھی۔ جناب حسین وزیر لوکل سلف کے ساتھ دیگر معززینِ شہر بھی موجو ۳ر جنوری ۲۹ء شب کے دس بجے ڈاکٹر اقبال اپنے دو معزز ساتھیوں (چودھری محمد حسین، پروفیسر عبداللہ چغتائی) کے ساتھ مدراس میل م سوار ہو کر پانچ جنوری کی صبح سات بج کر پینتیس[۳۵] منٹ پر مدراس پہنچے:

"مدراس کے مسلمانوں نے ڈاکٹر اقبال کا پُر جوش استقبال کیا۔ ریلوے اسٹیشن مشتاقانِ جمال اقبال سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا عوام دیوانہ وار ریل گاڑی کی طرف لپکے اور آپ پر پھولوں کی بارش برسادی۔ پھولوں کے ہار گلے کی زینت بنے عوام کی جانب سے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ ریل گھر پر ہم نے مسلمانِ مدراس کے تمام معزز قائم مقام رؤسا اور ذی علم حضرات کو جمع دیکھا۔" [4]

---

[1] راوی چودھری محمد حسین: مطبوعہ روزنامہ "انقلاب" لاہور مورخہ ۸ر جنوری ۲۹ء [2] "خطبات مدراس" مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۲۵ء [3] "انقلاب" لاہور ۲۴ر جنوری ۲۹ء [4] مدراس میل جنوری

مہمانوں کو مدراس کے مشہور برسٹو ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔

مدراس کے مشہور قابلِ دید مقامات کی سیر کے بعد چار بجے شام، حاجی جمال محمد، جمالیہ ہوٹل لے گئے۔ وہاں سے سیدھے گوکھلے ہال پہنچے
وزیرِ تعلیم ڈاکٹر سبرائن صدرِ اجلاس رہے۔ حمید حسن سیٹھ نے معزز مہمان کا خیر مقدم کیا۔ وزیرِ تعلیم نے فرمایا:

"میرے لیے یہ باعثِ عزت ہے کہ میں اگرچہ ہندو ہوں لیکن اسلامی فلسفہ پر لیکچر کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا ہوں۔
میں خوش ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ صحیح ہے۔ اسلام نے مشرق کو بلکہ ساری دنیا کو سبق دیا ہے۔ ہم ہندو، ذات پات اور قومی امتیازات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی اسلامی تہذیب اور اسلامی لیکچر سے اخوت کا سبق سیکھنا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے اور تمام ہندوستانی اقوام میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہمیں اسلامی اخوت کو دلیلِ راہ بنانا ہے[1]"

اقبال نے اہلِ مدراس کے پُر جوش خیر مقدم کا شکریہ ادا کیا اور اپنا خطبہ[2] پڑھا جو ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ ایک دریا تھا کہ بہا جا رہا تھا۔ بہت اور گہرا دریا۔ جس کی گہرائی کا احساس ہر کسی کو تھا مگر علم نہیں تھا کہ کتنا عمیق ہے[3]

اتوار چھے جنوری ۲۹ء کی صبح اخبارِ ہندو، مدراس میل، سوراجیہ، اخبارِ مسلمان وغیرہ اخباروں میں علامہ اقبال کی تقریر کا خلاصہ نظر آیا
دس بجے صبح گوکھلے ہال پھر سے سج دھج گیا۔ دس بجے انجمن ترقی اردو مدراس اور ہندی پرچار سبھا مدراس نے سپاس نامے پیش کیے۔
گیارہ بجے انجمن حمایتِ اسلام کے زیرِ اہتمام چلنے والے یتیم خانہ اسلامیہ کا سالانہ جلسہ بھی منعقد ہوا۔ انجمن ترقی اردو، اور ہندی پرچار کے معتمدین نے اپنے سپاسنامے گذارے۔ علامہ اقبال نے فرمایا:

"آپ اردو زبان کی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہیں، سو زبان کی ترقی اور اشاعت کے لیے سرگرم سعی ہیں۔ آپ کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ زبانِ اردو کو فروغ دیے بغیر جنوبی ہند کی سوشیل، تعلیمی و تمدنی مشکلات حل نہیں ہو سکتیں۔ زبان احساس زندگی کی معنوی حقیقت کا مظہر ہے۔ جس طرح زندگی میں پیہم کشمکش ہے۔ اسی طرح انسانی خیالات و افکار میں ہر گھڑی کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔
جس زبان میں نئے خیالات کو اپنے اندر جذب کرنے کی قدرت ہے وہی زبان، دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے"۔

عربی زبان کی وسعت اور تعریف کرتے ہوئے فرمایا!

"تمام غیر یورپین زندہ زبانوں میں فقط عربی ایک ایسی زبان ہے جس کا کوئی مستقبل ہے۔ یہ زبان باوجود اتنی پرانی ہونے

---

[1] روزنامہ الکلام (اقبال نمبر) مطبوعہ ۹ جنوری ۱۹۲۹ء   [2] لکچر کا عنوان "دینیات اسلامیہ اور افکارِ حاضرہ"
THE MUSLIM THEOLOGY AND MODERN THOUGHT

[3] خطبے اس حد تک علمی ہیں کہ برصغیر میں انہیں سمجھنے والے چوٹی کے چند افراد ہیں اور بس۔ جب ان خطبات کی شہرت پنجاب کے علمی حلقوں تک پہنچی تو سر عبدالقادر، ڈاکٹر تاثیر اور غلام رسول مہر نے علامہ سے التماس کی کہ وہ اہلِ لاہور کے سامنے بھی خطبے ارشاد فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے اسلامیہ کالج ہال میں یہ سلسلہ شروع کیا۔ پہلے جلسے میں سر عبدالقادر (صدرِ جلسہ) نے مولانا ظفر علی خاں اور پروفیسر احمد شاہ بخاری سے کہا کہ وہ خطبے کے اہم نکات نوٹ کرتے جائیں اور خاتمے پر حاضرین کو اردو میں سمجھائیں۔ جب خطبہ ختم ہوا تو مولانا ظفر علی خاں اٹھ کر آئے اور یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ "یہ خطبہ میرے ناقص فہم سے بہت بلند تھا۔ اس لیے میں معذرت چاہتا ہوں"۔ اب پطرس کی باری تھی، اٹھے اور کہنے لگے:
"اس میں مشکل کون سی چیز تھی؟ سر اقبال نے اپنا خطبہ لیڈیز اینڈ جنٹلمین سے شروع کیا تھا۔ جس کا ترجمہ ہے۔ خواتین و حضرات، رہا باقی خطبہ تو اس کا مفہوم آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اس لیے السلام علیکم"
پطرس بیٹھ گئے اور ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔
("میں اور اقبال" از ڈاکٹر غلام جیلانی برق، مطبوعہ مجلہ "ضیابار" سرگودھا، ۱۹۷۳ء)

کے اس لیے زندہ ہے کہ اپنے اندر نئے خیالات و افکار کو جذب کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

دیکھیے۔ ہمارے ملک میں بائیسکل پہلے پہل آیا اور لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا۔ تو ہماری زبان میں یا ہندوستان کی کسی زبان میں اس کو پکارنے یا نام لینے کے لیے کوئی لفظ نہ تھا۔ اسی لفظ بائیسکل کو ہمیں اختیار کرنا پڑا۔ لیکن جب یہی بائیسکل مصر میں پہونچا تو مصریوں کے پاس جو عربی زبان بولتے ہیں پہلے ہی اس مشین کا عربی نام وضع کرنے کے لیے ایک مادّہ موجود تھا۔ عربی میں ایک لفظ "درج" ہے جس کے معنی تیز رفتاری کے ہیں۔ "درّاج" اس کے مبالغے کا صیغہ ہے۔ مصریوں نے لفظ درّاج کو بائیسکل کے معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ بائیسکل کو درّاج ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح لفظ اسٹیشن ہماری زبان میں کوئی لفظ نہیں لیکن مصری یا عرب اسٹیشن کو محطہ کہیں گے۔ اسی طرح عربوں نے یورپین اصطلاحات اور نئے اسماء کے لیے سیکڑوں عربی لفظ وضع کر لیے ہیں۔ عربی SYNTHETIC زبانوں میں سے ہے اور سنسکرت بھی۔ مغرب میں غالباً جرمن زبان کے سوا اور کوئی زبان SYNTHETIC نہیں اس لیے یورپ کی زبانوں نے اکثر الفاظ LATIN سے مستعار لیے ہیں، عربی زبان زندہ زبان ہے اور ان زبانوں میں سے ہے جن میں ہمیشہ زندہ رہنے کی خصوصیات موجود ہیں۔ باقی زبانوں میں ایسی زبانوں کے لیے زندہ رہنے کا زیادہ موقع ہے جو SYNTHETIC زبانوں کے الفاظ مستعار لیتی ہیں، کسی زبان کو قومی زبان اختیار کرنے سے پہلے یہ سوچنا پڑے گا کہ زبان کا انحصار کن باتوں پر ہے۔ جنوبی ہند کے لیے اس امر پر سوچنا اور بھی ضروری ہے کیوں کہ آپ کے ہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اردو زبان ہندستان میں اب ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ اس میں موجودہ زمانے کے علوم کا بہت سا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔"

ہندی پرچار سبھا کے سپاس نامے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

اُردو اور ہندی کا جھگڑا محض تعصب اور تنگ دلی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ دونوں زبانوں میں عام طور پر الفاظ وہی ہیں۔ اگر ہم بلا ضرورت عربی اور سنسکرت کے الفاظ اردو ہندی میں ٹھونسیں تو یہ مناسب نہیں۔

میں اپنے دوستوں سے کہوں گا کہ وہ ہندستان کی اصلی مشکلات پر غور کریں۔ اگر ہندستان زندہ قوموں میں شمار ہونا چاہتا ہے تو اسے ایک زندہ وسعت پذیر زبان پیدا کرنا ہوگی"۔[1]

اس اجلاس کے بعد حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائی۔ حاضرین کے اصرار پر اس شرط پر اپنا کلام سنایا کہ حاضرین یتیم خانے کی امداد و اعانت فراخ دلی سے کریں جو انجمن حمایتِ اسلام کے زیر نگرانی یتامیٰ کی تعلیم و تربیت کا محافظ ہے۔[2]

چار بجے شام اپنا دوسرا انگریزی خطبہ سنایا۔

۷ جنوری کو سوراجیہ کے نمائندے نے حاضری دی اور مذہب و سیاست پر کافی دیر گفتگو کی "پان اسلامزم" خاص طور پر زیر بحث رہا۔

۵ بجے شام خواتینِ مدراس کے اجلاس میں شرکت فرمائی۔ خواتینِ اسلام نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اقبال نے اس کے جواب میں بہ عنوان "دورِ حاضرہ کی مسلم خواتین" ایک مختصر جامع اور حقائق سے بھرپور تقریر کی۔[3]

۸ جنوری کو اقبال نونہالانِ چمن کے ساتھ تھے۔ محمڈن کالج کے پرنسپل مسٹر گرین اور افضل العلماء مولوی عبدالحق ساتھ تھے۔

---

[1] مطبوعہ سہ ماہی سفینہ مدراس ۱۹۲۹ء اور دانائے راز دیارِ دکن میں۔ از راقم الحروف۔

[2] روزنامہ الکلام ۱۹۲۹ء۔

[3] علامہ ممدوح نے تقریباً انھیں خیالات کا اعادہ فرمایا جن کو آپ اپنی نظموں میں مجمل اور رموزِ بے خودی میں بہ وضاحت ظاہر کر چکے ہیں [سہ ماہی سفینہ محمڈن کالج مدراس سنہ ۱۹۲۹ء]

مسٹر گرین نے علامہ اقبال کی ادبی و علمی خدمات کا تذکرہ کیا اور ان تصانیف کا ذکر بھی، جن کا اثر ہندستان سے گذر کر یورپین ممالک تک پہنچ رہا تھا۔ آج کے اس موقعہ کو وہ اپنی زندگی کے ممتاز واقعات میں شمار کر رہے تھے کہ انھیں آج ایک مشہور شاعر کے خیر مقدم کا موقعہ ملا تھا۔

سپاس نامہ پیش ہوا۔ جواب میں حضرت اقبال نے فرمایا کہ انھیں اپنی پروفیسری کا زمانہ یاد آ رہا ہے جب وہ اپنے طلبہ سے مخاطب ہوتے تھے۔

"آج ہمارے لیے نہ تو کوئی راہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ واقعی جدید راستہ کوئی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ البتہ قافلہ نیا ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ اس جدید گروہ کو ایسے قدیم راستے سے ان کے مذاق کے مطابق آشنا کیا جائے"

بمیر قافلہ از من و عارساں و بگوئے
کہ راہ ہمانا ست و کارواں دگر است [1]

تقریر کے اختتام پر طلباء کے اصرار پر اپنا کلام سُنایا۔
گو کھلے ہال حسبِ معمول بھرا ہوا تھا۔ آپ نے اپنا تیسرا خطبہ سُنایا۔[2]

کتنا مسرور ہے دار السرور بنگلور آج

۹ جنوری ۲۹ء کی صبح بڑی حسین نظر آ رہی تھی۔ جمالِ اقبال کی دید کے مشتاق لوگ انتظار میں آنکھیں بچھائے کھڑے تھے۔ اقبال کا دل بھی مسرور تھا۔ حاجی اسماعیل سیٹھ کی دعوت اور خاص روضۂ سلطانی کی زیارت کے شوق نے حضرت اقبال کو اس سفر پر مجبور کیا تھا[3] اور عبدالواحد بنگلوری نے تحریر فرمایا تھا کہ:

"انشاء اللہ میں اس امر کی کوشش کروں گا کہ کچھ عرصہ وہاں گذاروں۔ اس کے علاوہ سلطانِ شہیدؒ سے مجھے ایک خاص عقیدت بھی ہے۔" [۸ فروری ۱۹۲۹ء][4]

ریلوے اسٹیشن پر ایک طوفان اٹھا کہ اقبال سا جانِ جاناں جہاں آ گیا۔ سر مرزا اسماعیل، حاجی اسماعیل سیٹھ، مولوی عبدالغفور، مدیر الکلام سید غوث محی الدین اور ابو حامد وغیرہ نے آپ کا استقبال کیا۔ مدیر الکلام نے "الکلام" کا اقبال نمبر پیش کیا۔ دیوانِ میسور سر مرزا اسماعیل نے مدیر الکلام سید غوث محی الدین کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ سید صاحب ٹیپو سلطان کے جاں باز وفادار سپہ سالار سید غفار شہید کے پوتے ہیں۔ حکومتِ میسور کی طرف سے آپ کی ہم راہی کا شرف انھیں حاصل رہے گا

---

[1] "سفینہ" مدراس ۱۹۲۹ء [2] حضرت علامہ اقبال نے گذشتہ سال مدراس کی انجمن اسلامیہ کی تحریک پر جو چھ خطبات مرتب کرنے کا وعدہ کیا تھا ان میں سے صرف تین خطبے مرتب ہوئے جو اسی سال کے آغاز میں مدراس، میسور اور حیدر آباد میں علامہ ممدوح نے بنفسِ نفیس سنائے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بقیہ تین خطبے بھی مکمل ہو گئے ہیں۔ سر راس مسعود کی درخواست پر تمام خطبے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں سنانے منظور فرمائے ہیں۔ علامہ آج مورخہ ۱ نومبر [۱۹۲۹ء] فرنٹیر میل سے علی گڑھ جا رہے ہیں۔ اور ایک ہفتے میں خطبے ختم کر کے لاہور واپس آ جائیں گے۔ امید واثق ہے کہ جنوری کے آغاز میں تین تازہ خطبوں کے ارشاد کے لیے علامہ مدراس اور حیدر آباد کا سفر کریں گے۔ [۱۹ نومبر ۲۹ء مطبوعہ انقلاب لاہور از چودھری محمد حسین]
مورخہ ۱۴ اگست ۲۹ء کے ایک خط میں محمد جمیل بنگلوری نے لکھا کہ: "میں اپنے تازہ خطبات مرتب کر رہا ہوں جو امید ہے کہ اواخر اکتوبر تک مکمل ہو جائیں گے"
مورخہ ۴ نومبر ۲۹ء کے ایک خط میں [بنام محمد جمیل بنگلوری] یہ تحریر ہے کہ:
"میرے خطبات اب مکمل ہو چکے ہیں اور غالباً اس ماہ علی گڑھ میں ان کو سنانے کے لیے جاؤں گا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے بھی اواخر جون ۳۰ء میں اس سلسلے میں حاضری کی دعوت موصول ہوئی ہے۔ مدراس کی راہ سے بھی دعوت نامہ موصول ہوا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ حاضر نہ ہو سکوں گا۔
[3] ذکرِ اقبال از حضرت عبدالمجید سالک، [4] دانائے راز دیارِ دکن میں از راقم الحروف

شہر سجا دیا گیا تھا۔ مہمان کی کار دولہن کی طرح قدم قدم پر رک رہی تھی اور ہار گلے کا ہار ہو رہے تھے۔
سپاس نامہ "خیر مقدم اقبال نیک خصال" کے الفاظ کی صورت پیش کر، مہمان کو حاجی سر اسماعیل سیٹھ کے دولت کدے پر پہنچا، خدا حافظ کہہ
دوسرے دن مسلم لائبریری اور انجمن ترقی اردو نے سپاس نامے پیش کیے صدارت سر مرزا اسماعیل نے کی۔ اور اپنی قسمت پہ ناز کیا۔ تالیوں کی گونج میں ڈاکٹر اقبال اٹھے اور فرمایا:

"جنوبی ہند کے سفر میں مجھے اس امر کا اندازہ ہو چکا ہے کہ یہاں اردو زبان کی وسعت اور اس کے استحکام کے لیے ایک احساس پیدا ہو چکا ہے۔ قومی ترقی کا دارومدار قوم کی وسعتِ زبان پر منحصر ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس کی وسعت کی کوشش نہیں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مذہبی اور دینی باتوں سے پوری طرح محروم ہو جائیں گے۔ زبان خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ زبان ہی کے ذریعہ بولنے والے کی روحانی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ زبان ہی کے ذریعہ بولنے والے کی عقلی فراست کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اگر زبان درست نہ ہوگی تو اس کے خیالات بھی اچھے نہ ہوں گے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اردو زبان کی بخوبی ترقی ہو جائے۔ یہاں آپ اس خیال سے غافل نہیں ہیں۔

قومی ترقی کا دوسرا ذریعہ کتب خانے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ کتب خانے ہر جگہ موجود تھے۔ بغداد میں تو اس قدر کتب خانے تھے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کتب خانوں کا رکھنا ایک فیشن تھا۔ مسلمانانِ سلف میں علم و فن کی قدر تھی۔

موجودہ زمانے میں اکثر لوگوں کی دینی، اقتصادی اور سیاسی حالت پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک انقلاب عظیم برپا ہو چکا ہے اور ایک نئی دنیا بنائی جا رہی ہے۔ اس نئی دنیا میں پرانی دنیا کے اقوام کو داخل ہونا پڑے گا۔ اور نئی دنیا کے طرزِ عمل کو اختیار کرنا پڑے گا جوان کی زندگی کو آسائش سے بدل سکتی ہے۔ جو قوم نئی دنیا کے طرزِ عمل سے گریز کرتی ہے، وہ دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ اس کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ جس طرف دیکھیے انقلاب نظر آتا ہے لیکن مسلمانوں کے پاس کلام پاک ایک ایسا قانون ہے جس پر اگر عمل کیا گیا تو وہ نہایت آسانی سے ترقی کر سکتے ہیں۔ کلام پاک ہمیں میانہ روی سکھاتا ہے۔ میانہ روی مسلمانوں کا اصول ہے۔ ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں میانہ روی کی راہ کو اختیار کرنا چاہیے۔ ہندوستان میں آٹھ کروڑ مسلمان آباد ہیں اور ان کی آواز کا بہت بڑا اثر ہے لیکن انھیں چاہیے کہ صرف آواز ہی نہیں بلکہ اپنے طرزِ عمل سے بھی دوسروں کو سبق دیں کہ دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ مسلمانوں کا طریقہ، اعتدال اور میانہ روی ہے۔ وہ روحانی ترقی سے غفلت نہیں کر سکتا۔ روحانی قوت مرتب کرنے کے لیے ہمارے پاس قرآن شریف موجود ہے۔ ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔

آج کل ہندستان میں اکثر بے ہودہ مراسم رائج ہو گئے ہیں۔ جن کو دور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ یہاں کوئی مصطفےٰ کمال نہیں ہے جو آئینی اصطلاحات کو جاری کر کے افسوس ناک مراسم کا انسداد کر سکے۔ یہاں خود قوم کو اپنی بھلائی اور برائی کا خیال کرنا چاہیے۔ آپ کو اپنی تنزل پذیر حالت کا اندازہ کرنا چاہیے یا کم از کم ہماری آنے والی نسلوں کی حالت پر غور کر کے ان کے لیے راستہ صاف کر دینا چاہیے ؎

بمیر قافلہ از من دعا رساں بگو
اگرچہ راہ ہماں کارواں دگر ست

میرا روئے سخن اس سے ان لوگوں کی طرف ہے جو دوسروں کی راہ نمائی کرتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ مقلدین پیروؤں کے خیالات کو معلوم کریں اور پھر اسی راستے پر چلیں۔ جس طرف ان کا رجحان ہے"۔[1]

---

[1] روزنامہ الکلام ۱۹۲۹ء۔

محمود شریف[1] سابق صدر مسلم لائبریری نے علامہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور جب عوام ٹوٹے مالے کی طرح جلسے کے بعد بکھر گئے تو علامہ اقبال نے کتب خانہ ملاحظہ کیا اور کتاب رائے میں لکھا:

"جنوبی ہندستان کے مسلمان نوجوانوں اور خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہو چکا ہے۔ جس کو میں تمام ہندستان کے مسلمانوں کے لیے فال نیک تصور کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلم لائبریری نے اس احساس کے بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اراکینِ کتب خانے کو چاہیے کہ تاریخِ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ فرمائیں۔"[2]

شام حسین: نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا لگایا ہوا مشہور "لال باغ" اور ٹیپو سلطان کا محل دیکھا۔

۹ر جنوری کی شام، شامِ اودھ سے کچھ کم نہیں تھی۔ سینٹرل کالج بنگلور کے چہرہ بہ چہرہ روبرو کلو جیٹ سکول میں مجلسِ ملیہ اسلامیہ، انجمن تعلیم مسلمانانِ بنگلور، اور مسلم لائبریری کے ملن نے اس جلسے کی تشکیل کی تھی۔

ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات ڈاکٹر سبا راؤ صدرِ اجلاس نے ہنستے ہوئے کہا:

"ایسے اجلاسوں کی صدارت کا کام نہایت آسان ہوا کرتا ہے۔ یعنی صدر مقرر صاحب کا حاضرین سے تعارف کرا دیتا ہے اور یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ کس موضوع پر تقریر کرنے والے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صدر، مقرر سے بالکل ناواقف ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی جلسے میں ایک صدر صاحب نے مقرر کا تعارف کراتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ میں مقرر کے نام سے ناواقف ہوں [قہقہہ] بعینہٖ یہی میری بھی حالت ہے۔ لندن میں علامہ اقبال سے نیاز حاصل کر چکا ہوں۔ میں انھیں جانتا ہوں مگر وہ مجھے نہیں جانتے [قہقہہ]

آپ ایک شاعرِ بے نظیر ہی نہیں بلکہ ایک زبردست فلاسفر بھی ہیں۔ آج آپ کی تقریر کا موضوع "مذہبی تجارب کے فلسفیانہ انکشافات" ہوگا۔"

تقریر کے آخر میں ایک لطیفہ فرمایا:

"ایک مرتبہ کسی جلسے میں صدر صاحب نے مقرر کا تعارف کرانے کے بعد مقرر کو مخاطب کر کے فرمایا: جنابِ من! آپ اپنا اڈریس دیجیے۔ مقرر نے فوراً بے اختیار فرمایا، میرا اڈریس نمبر ۱۲ جانسن روڈ ہے۔ [قہقہہ]

میں فلاسفر نہیں ہوں صرف ایک ماہرِ اقتصادیات ہوں۔ میں فلسفیانہ نکات کی تشریح نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر اقبال سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنا اڈریس شروع کریں۔"[3]

فلسفیانہ نکات:- ڈاکٹر اقبال نے مدراس میں پڑھا پہلا خطبہ سنایا۔ اخبار کے نمائندوں نے اپنی اپنی یادداشت میں صرف اتنا لکھا کہ:

"ڈاکٹر اقبال نے ایک بہترین اڈریس پڑھا۔ جس کو آئندہ سلسلہ وار ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔

اڈریس کے بہترین ہونے میں کلام نہیں لیکن فلسفیانہ نکات ویسے بھی کم شکل نہیں ہوتے مگر لاینحل نہیں۔"

پڑھے لکھے اصحاب نے فرمایا:

ان پر ڈاکٹر اقبال کی شخصیت اور لیاقت کا جادو پوری طرح اثر کر چکا تھا۔

---

[1] جب ریاستِ میسور میں ذمہ دار حکومت کا قیام عمل میں آیا تو مسلم نمائندے کی حیثیت سے آپ کو وزارت میں شامل کیا گیا۔

[2] دانائے راز دیارِ دکن میں از راقم الحروف۔

[3] روزنامہ الکلام بنگلور ۱۹۲۹ء۔

نظرِ اقبال سے روشن نظر آباد[1] کے چراغ

۱۰ جنوری ۱۹۲۹ء کو مہمانِ محترم میسور پہنچا اور مہاراجا کا مہمان ہوا۔ چودھری محمد حسین نے غلام رسول مہر کو لکھا:

"عجیب پُرفضا مقام ہے۔ شہر کی سڑکوں کی صفائی اور بجلی کے انتظام کے بھی کیا کہنے۔ بہت شہر ہندستان میں اتنے صاف ستھرے اور پُرفضا ہوں گے، قدرت بھی اس مقام پر خوب مہربان ہے مگر انسانی حسنِ انتظام بھی داد کا مستحق ہے۔"[2]

شام کے چھ بجے میسور ٹاؤن ہال جگمگا اٹھا۔ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد نے جلسہ سجایا تھا۔ مسٹر چانڈی، وائس چانسلر صدرِ اجلاس تھے۔ پروفیسر گوپال سوامی اور پروفیسر واڈیا جیسے نامور ماہرانِ نفسیات و فلسفہ اقبال کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ مہمانِ محترم نے یہاں بھی مدراس میں سنایا ہوا پہلا خطبہ پڑھا۔ گوپال سوامی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"ہم ڈاکٹر اقبال کے شکر گذار ہیں۔ آپ جیسی ہستیاں کسی ایک قوم و مذہب کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ مسلمان ان کو لاکھ اپنائیں لیکن یہ سب کے ہیں۔ ساری دنیا کے ہیں۔ ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ آپ ہندستانی ہیں۔"

مہاراجا کرشن راج وڈیر سے ملاقات: ۱۱ جنوری ۲۹ء کی صبح مہاراجہ میسور سے ہاتھ ملایا۔ دونوں ایک دوسرے سے متاثر نظر آرہے تھے۔ علامہ اقبال نے اپنا یہ تاثر اپنی ایک تقریر میں بیان کیا۔

کرشنا راج ساگر: گیارہ بجے صبح اس حسین باندھ کو دیکھا۔ صدر دروازے پر ٹیپو سلطان کے کتبے پر نظر پڑی تو فرمایا:

"سلطان ٹیپو کی روح آج بھی یہاں جلوہ گر ہے اور راستہ دکھا رہی ہے۔"

حسن بن صباح کی جنت کو شرمانے، سر مرزا اسماعیل جیسے کنہیا کے ہاتھوں بننے سنورنے اور برندابن نام پانے والے باغ وچمن دیکھے تو باغ باغ ہو کر فرمایا:

"لاہور کے شالیمار باغ کی اسکیم کی یہاں انتہا ہوگئی۔"

منزل: اب قافلہ سری رنگ پٹن کی طرف بڑھ رہا تھا، منزل کی طرف، دوپہر کوئی ایک بجے کارواں منزل مقصود پر پہنچا۔ گنبدِ سلطانی کے صدر دروازے پر معزز مہمانوں کے موٹر رکے۔ ڈاکٹر اقبال نہایت ادب واحترام کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ روضۂ سلطانی کے منقش دروازے پر پہنچ کر مدیر الکلام سے فرمایا:

"سید صاحب! میں روضۂ سلطانی پر مراقبہ کرنے والا ہوں۔ جب تک میں خود واپس نہ آجاؤں مجھے کوئی نہ بلائے۔"[3]

علامہ اقبال کے سارے ساتھی باہر نکل گئے۔ آپ نے اندر سے دروازہ بھیڑ لیا۔ کوئی ڈھائی بجے روضۂ سلطانی کا دروازہ کسی خوبصورت پرندے کے شاہ پروں کی طرح کھلا۔ قدر دانوں کی مشتاق آنکھوں نے دیکھا کہ علامہ اقبال نڈھال سے گنبد سے نکلے اور گنبد کے سنگِ سیاہ کے ستون سے لگے آنسو بہا رہے تھے۔ ان آنسوؤں کے موتیوں کی حقیقت کو جاننے عوام و خواص بالکل آنسوؤں کی طرح پھیل رہے تھے۔

گنبد سلطانی اور مسجد اقصیٰ کے درمیان صحن میں ڈاکٹر اقبال کی نشست کا انتظام تھا۔ علامہ اپنے جلال وجمال کے ساتھ دھیرے دھیرے اپنی نشست پر براجمان ہوگئے۔ مطربِ خوشنوا علی جان شاآن نے اپنا بوٹا سا حسین و متناسب قد لیے آرکسٹرا کے ساتھ علامہ اقبال کا استقبال کیا۔ خوشنوا مغنی نے جب راگ چھیڑا تو عجب سماں بندھ گیا۔ ڈاکٹر اقبال پر رقت طاری ہوگئی۔[4] کبھی آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور آنکھیں خون کبوتر کی طرح لال ہو جاتیں[5] اور اشکوں کا گنگا جمنی سیلاب جاری ہو جاتا تھا۔

---

[1] ٹیپو سلطان نے میسور شہر کا نام نظر آباد رکھا تھا۔ [2] مطبوعہ روزنامہ انقلاب مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۲۹ء۔ [3] روزنامہ الکلام مورخہ ۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء۔ [4] سلطان شہید کے مزار پر ایک میسوری شاعر نے ایک نظم سنائی۔ جس سے ڈاکٹر اقبال بے حد متاثر ہوئے اور اول سے آخر تک آبدیدہ رہے۔ ذکر اقبال از سالک ح۔ [5] روزنامہ الکلام بنگلور ۱۹۲۹ء۔

راگ نے دم لیا اور نواب غلام احمد کلامی نے فرمایا :

علی جان صاحب ! آپ کی شایانِ شان کچھ اور کچھ اور ہو

مانو وہ کہہ رہے ہیں کہ ساقیا، ایک جام اور، ایک جام اور !

اس پر علی جان شان نے نہایت سوز و گداز سے علامہ اقبال کا نغمہ ؎

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

بڑا۔ نغمہ نہیں مانو سازِ دل کے تار چھیڑ دیے۔ ایک تصویرِ درد کھنچ گئی۔

سامعین کے جذبات پہلے ہی سے برانگیختہ تھے اور دلوں میں یاس و حسرت اور درد و غم کا طوفان بپا تھا۔ اب نظم نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ سامعین کی حالت متغیر ہو گئی۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ مطربِ خوش نوا کی یہ راگنی کچھ دیر قائم رہی کہ سامعین نے اپنا اپنا گریبان چاک کیا۔ یہ دیکھ کر مغنیہ نے لہرا کے ہونٹوں پہ انگلی رکھ لی۔ اب ہر کوئی خاموش تھا۔ کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ بولا ہی بول لیتا۔ محسن الملک محمد ابا سیٹھ، علامہ اقبال کے قریب ہو بیٹھے اور نہایت ادب و احترام سے پوچھا :

ڈاکٹر صاحب فرمائیے کہ اتنی دیر روضۂ سلطانی میں مراقبہ رہا۔ یقیناً کوئی پیغام ملا ہوگا کیا ملا بھلا ؟ [۱]

پیغام ؟ ڈاکٹر اقبال کے ہونٹ دھیرے دھیرے وا ہوئے۔ ہر کسی کے کان تیز ہوئے۔ آنکھیں چونکیں کہ ادھر پنکھڑیوں نے انگڑائی لی، پھول مسکرایا در مہکا، اور ادھر دل و دماغ کو زندگی عطا کر گیا۔

"ہاں ملا ہے، اقبال نے دھیرے سے فرمایا"

"کیا ؟ محمد ابا سیٹھ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا"

"پیغام تو بہت سے ملے ہیں"، اقبال نے کہا لیکن ان میں ایک شعر کی صورت عالم مراقبے میں ڈھل گیا ہے ؎

درجہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست [۲]

---

[۱] روزنامہ الکلام بنگلور ۲۹ء۔ [۲] محمد ابا سیٹھ نے بڑی خوشی اور فخر سے اس منظر کی تصویر کشی راقم کے سامنے کی تھی۔ [۳] لاہور پہنچنے کے بعد مندرجہ ذیل اشعار ڈاکٹر اقبال نے کہے اور "انقلاب" لاہور میں (مورخہ ۱۲ مارچ ۲۹ء) چھپے۔ ان اشعار کا ذکر مولانا غلام رسول مہر نے راقم کے نام ایک خط میں کیا ہے :

"علامہ مرحوم نے چند اشعار مرحمت (انقلاب کے لیے) فرمائے تھے جن میں پہلا شعر وہی تھا جو آپ نے نقل کیا۔ آخری وہ جس میں سلطان شہید کا ایک قول نظم کر دیا تھا۔ اس پر سعیدِ شہید نے مجاہدانہ انداز میں عمل کیا۔"

محترم عابد رضا بیدار نے "برہان" دہلی (۱۹۶۱ء) میں اور راقم کو ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو لکھا کہ یہ اشعار ۱۲ مارچ ۲۹ء کے انقلاب لاہور میں شائع ہوئے تھے بعنوان "پیغامِ شہید" ؎

آتشِ درد دل دگر بر کردہ ام — داستانی از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجرِ آئینہ فام — می کشم او را بتدریج از نیام
نکتہ گویم ز سلطانِ شہید — زاں کہ ترسم تلخ گردد روزِ عید
پیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او — تا شنیدم از مزارِ پاکِ او
در جہاں نا تواں اگر مردانہ زیست — ہمچو مرداں جاں سپردم زندگیست

بشیر احمد ڈار نے "انوار اقبال" میں ان اشعار کا فوٹو شائع کیا ہے۔ یہ اشعار علامہ اقبال کے کسی مجموعہ کلام میں نہیں۔

اب کارواں میر کارواں کے ساتھ دریا دولت باغ (= سلطان ٹیپو کا ایوانِ عام تھا) پہنچا۔ اس عمارت کی دیواروں پر ڈاکٹر اقبال نے معنی خیز تصاویر دیکھیں اور فرمایا:

"اللہ کی شان! عجب مردِ حق تھا۔ حیدر علی اور سلطان شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مرقع بہت خوب ہیں۔"[1]

"ہمارا خیال تھا، علامہ اقبال نے دریائے کاویری کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔" اورنگ زیب ہی ایک ایسا مسلم شہنشاہ تھا جس پر مسلمانانِ ہند بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ٹیپو سلطان شہید خلد آشیاں بھی بہت بڑی بلند پایہ اور اسلام دوست ہستی تھی جس کے سامنے شہنشاہ اورنگ زیب کے کارنامے ہیچ ہیں۔"[2]

معزز مہمان مسجدِ اعلیٰ پہنچا۔ بانئ مسجد کا تاریخی و دیگر کتبے دیکھے اور سلطان کے حضور یوں خراجِ تحسین ادا کیا:

"عجیب آزاد مرد تھا۔ سلطان سچ مچ ہندستان کا آخری سپاہی تھا جس کو ہندستان کے مسلمانوں نے اس قدر جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندستان میں اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر ہم زندہ لوگوں کی بہ نسبت زیادہ تازگی رکھتی ہے۔ مجھے نہایت خوشی ہوگی اگر ٹیپو سلطان شہید کے نام سے ایک اعلیٰ درجے کا فوجی تربیتی مرکز قائم کر دیا جائے۔"[3]

یہ مختصر و معتبر قافلہ مسجد سے آگے بڑھا اور اس جگہ پہنچا جہاں ٹیپو سلطان نے شہادت پائی تھی۔ آنکھ انگاہ بھی پانی بھی۔ دل گداز، آنکھ پرنم میر کارواں کا دل دکھ درد محسوس نہ کرے، آنکھ چھلکے اور نہ چھلکے، ناممکن،

ڈاکٹر اقبال نے سلطان کا شکستہ محل دیکھا۔ اس کے عین مقابل رنگا سوامی کا مندر تھا آس پاس دو چار اور مندر بھی۔ اذان کے ساتھ ناقوس اور گھنٹیوں کی آواز بھی کانوں میں پڑتی تھی مگر اس نیک طینت انسان اور مردِ مومن کی کشادہ پیشانی پر کبھی بل نہ آئے، سلطان کی عطا کردہ چیزیں آج بھی استعمال ہوتی ہیں۔ اپنے تو اپنے غیروں کے ساتھ بھی سلطان کا رویہ عین اسلامی و انسانی رہا۔ اس سلوک کی تاریخ نے اقبال کی آنکھوں میں مسکراتے آنسو بھر دیے۔

آگے ایک عجیب و غریب قید خانہ دیکھا، جس کی چھت پھاڑ کر ایک بڑی سی توپ اندر پڑی تھی۔ قدم آگے بڑھے تو سلطان کے حاکم پر فرانسیسی انجینیر دی ہیولنیڈ کی بنائی "ہلتی جلتی" کمان دیکھی اور سید غفار شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھ غفار شہید کے پوتے مدیر الکلام سید غوث محی الدین سے فرمایا:

"سید صاحب آپ اس شہید نامور کی یادگار ہیں۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ آپ کے ہاتھ میں قلم ہے۔ اس سے کام لیجیے۔"[4]

---

[1] جنگی مرقعوں کو اقبال نے خصوصیت کے ساتھ دیکھا اور ان کی بہت تعریف کی (روزنامہ الکلام بنگلور ۱۹۲۹ء) [2] اس کے راوی مدیر الکلام سید غوث محی الدین ہیں جن کا ذکر انھوں نے راقم کے اور اپنے مضمون "علامہ اقبال کی رفاقت میں چند روز" میں کیا۔ [3] اقبال نامہ دوم میں ڈاکٹر اقبال کا ایک خط جو سیرتِ اقبال سے نقل کیا گیا ہے، درج کیا گیا ہے جو کسی میجر کے نام ہے۔ آپ کے نام نامی سے منسوب ایک فوجی اسکول قائم کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے میجر کو لکھا:

"ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی اسکول کو موسوم کرنا زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی اسکول کا نام ٹیپو فوجی اسکول رکھیں۔ ٹیپو ہندستان کا آخری سپاہی تھا جس کو ہندستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندستان میں جیسا کہ خود میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے۔ بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے رہے ہیں۔"

[4] مدیر الکلام نے اپنی ایک نظم میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے ؎

سُنا اقبال نے جب اس مجاہد کا میں پوتا ہوں | تھیں حاصل فوجِ سلطانی میں جن کو توقیریں
مسرت سے لپٹ کر آپ نے مجھ سے یہ فرمایا | قلم کا ہے تو سید ہیں یہ بے کار شمشیریں

شہر نگاراں میسور کی ایک شامِ حسین :- میسور ٹون ہال امیر و غریب، اور عوام و خواص سے بھرا ہوا تھا۔ نواب غلام احمد کلامی
، کرسی صدارت سنبھالی۔ یتیم خانہ اسلامیہ میسور کے ایک دو یتیم نے قرآن مجید کی چند آیات تلاوت کیں۔ بچوّں نے "چین و عرب ہمارا"، "ہندستان
ارا" نغمہ چہک کے سنایا پھر آرکسٹرا بجا گا۔ اور علی جان شان نے نہایت سُریلی، درد و رقّت میں ڈوبی آواز میں اقبال کی نظم سُنانی شروع کی

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امّت بے چاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

نکا جادو ابھی سر چڑھ کر بول رہا تھا کہ کلامی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر شروع کی۔ جس میں ریاستِ میسور کے روشن ضمیر مہاراجا کی
سان دوستی۔ اقلیت نوازی، اردو تعلیم کی سہولتوں کے ذکر کے ساتھ، اقبال کی شاعری، جدّت طرازی وغیرہ کی تعریف تھی۔

سخنِ شیریں :- نواب صاحب و دیگر حضرات!

شیریں سخن اقبال کی زبان سے پھول جھڑنے شروع ہوئے:

مَیں آپ کے شہر کی خوبی صفائی پاکیزگی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ ہندستان بھر میں ایسا خوش نما شہر نہیں دیکھا۔ اس شہر کو بجائے میسور کہنے کے عروس البلاد کہنا چاہیئے۔ یہ نتیجہ ہے سر حضور مہاراجا بہادر کی بیدار مغزی اور مردم شناسی کا، آج صبح کو مجھے ان کا نیاز حاصل کرنے کا شرف مِلا۔ ان کی شخصیت کا گہرا اثر میرے دل سے قیامت تک مٹ نہ سکے گا۔ سیرت، بیدار مغزی اور رواداری کے لیے تمام ہندستان کے رؤسا کے لیے ایک نمونہ ہیں۔ تمام قوموں کے لیے تعلیم اور اقتصادی ترقی کے لیے تمام مواقع حاصل ہیں، اس ملک میں تھوڑے یا بہت جتنے بھی مسلمان ہوں، ان کو چاہیئے ان سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ میں ان کی درازیٔ عمر و اقبال کے لیے دعا کرتا ہوں[1]

اب میں چند باتیں مسلمان بھائیوں سے کرنا چاہتا ہوں۔

اس وقت دنیائے اسلام پر نہ صرف اس ملک میں بلکہ ایشیا کے دیگر ممالک میں بھی نازک وقت ہے۔ اس وقت میری یہ مراد نہیں کہ مسلمانوں کے ممالک چھینے جا رہے ہیں بلکہ خود مسلمانوں کے طبائع کے اندر معنوی اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ اچھے اور بُرے۔

موجودہ اضطراب ایشیا کے مسلمانوں کی اصلاح کے درپے ہے۔ چار پانسو سال کے جمود کے بعد زمانے نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ دنیا میں عزّت و آبرو کے ساتھ رہنا آسان نہیں۔ ایک جہاد اور کوشش چاہیئے۔ ؎

زندگی جہد است استحقاق نیست
جز بہ علم انفس و آفاق نیست

وہی قوم زندہ ہے جس میں ابھرنے، اخذ کرنے اور فطرت کا جزو بننے کی صلاحیت ہے۔ جو قوم ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ انفاس اور آفاق کے علوم حاصل کرنے کا نام حیاتِ انسانی ہے، اس سے غافل اقوام بامراد نہیں ہو سکتیں۔ انسانوں کی حالت کو سنوارنے والی چیز اگر کوئی ہے تو علم ہے۔ اس کا درجہ اسلام میں نہایت بلند ہے، قرآن شریف میں لفظِ علم مختلف مشتقات میں دو تین ہزار بار سے زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ ہم نے اس قوم کو علم و حکمت عطا کی جس کے ہم آج خوشہ چیں بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے عقیدوں کی رو سے حضرت نبی کریمؐ کو ذاتِ الٰہی کا عین مشاہدہ ہوا۔ باوجود اس کے کہ حقیقت جو کچھ ہو، حضورؐ یہی فرماتے رہے "ربّی زدنی علماً"

---

[1] حاضرین نے بہ آوازِ بلند آمین کہا۔ [روزنامہ الکلام ۱۹۲۹ء]

آنکہ چشمش ذات را بے پردہ دید
ربی زدنی از زبان او چکید

حضورؐ کی یہی دعا تھی کہ الٰہی مجھکو علم حقائق اشیاء عطا فرما۔

آپ سے میری یہ استدعا ہے کہ مذہبی تعلیم کو ترقی دیں۔ مذہبی تعلیم ہماری ترقی کا پیش خیمہ ہے۔ قرآن شریف ہمیں دنیا میں امن وصلح اور خاموشی کے ساتھ ترقی کرنا سکھاتا ہے۔ اسلام کے معنیٰ ہی صلح وامن کے ہیں۔ جس قوم نے دنیا میں محبت کرنے اور صلح کرنے کا پیغام دیا تھا وہ دوسرے لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی۔ مسلمان اپنے پیارے نبیؐ کی طرح دنیا کو پیغام رحمت دیں۔ تمام اقوام سے برادرانہ سلوک رکھیں اور یہ ثابت کریں کہ اسلام کے لیے سرمایۂ رحمت ونعمت یہی ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہونے پائے۔ یہی تعلیم کا ایک بڑا گُر ہے۔

اپنی عملی زندگی سے دنیا پر یہ ثابت کر دیں کہ مسلمانوں کا رب، رب العالمین ہے، نفرت وحقارت اسلام کا شیوہ نہیں۔ لڑائی کر دبھی تو محبت واخلاص قائم رکھو ع

موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

آپ کو چاہیئے کہ جو کام آپ کر سکتے ہیں، کبھی اس کی تکمیل کے لیے دوسروں پر بھروسہ نہ کریں۔ اردو کی ترقی، ترویج و اشاعت اور استحکام میں کوشش کریں اور نیا لٹریچر پیدا کریں۔ کتابیں ترجمہ کریں۔ ان کی اشاعت کریں۔ اردو انجمنیں قائم کریں۔

آپ اپنی روایات کا علم اور کلچر کا علم، محفوظ رکھیں۔ اور خود میں اس قسم کی اہلیت پیدا کریں۔"

تقریر نے نئی زندگی دی، حرکت عطا کی۔ کچھ کر گذرنے کی آرزو مچل رہی تھی۔ رب العالمین اور اس کے برحق نبی کے فلسفۂ امن کو سمجھ رہے تھے۔ ایک دنیا کے تصور کی حقیقت اجاگر ہو رہی تھی ؎

گماں مبر کہ ہمیں ایک جہاں نشیمن است
کہ ہر ستارہ جہاں است و یا جہاں بود است

میں اصلیت کا پہلو نظر آیا۔

محمد ابا سیٹھ نے ڈاکٹر اقبال اور نواب کلائی کو ہار پہنائے۔ اور صدر جلسہ نے علی جان شان سے فرمائش کی اور ساقی نے نغمے کے جام لنڈھائے ؎

یارب دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

پروفیسر واڈیا نے فرمایا۔

میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔ ہم اسلامی دنیا کو مبارکباد کہتے ہیں کہ ان میں ایک درخشاں ستارہ پیدا ہوا ہے۔ جس کی روشنی نہ صرف ہندستان بلکہ ایک جہان نور حاصل کر رہا ہے۔ بیس سال پہلے میں نے اقبال کا ترانہ سُنا تھا جو ہندے ماترم سے بھی بڑھ کر مشہور ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کل شام انگریزی میں جو لکچر دیا وہ جملہ انگریزی خواں اصحاب کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ ہندستان میں ایسے شعرا کہاں ہیں جنھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ہمیں تو صرف ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر اقبال ہی کے نام معلوم ہیں۔ گو مسلمان ڈاکٹر اقبال کو اپنے حلقۂ مذہب میں کھینچنے کی کوشش کریں لیکن ہمارا حق یہ ہے کہ ہم ڈاکٹر اقبال صاحب کو چھین لیں اور یہ کہیں کہ یہ ہندستان کے بہترین سرمایہ ناز ہندستانی ہیں اور بعد میں مسلمان ہیں۔ آج ہم کو ایسی مقدس ہستی سے روبرو اور سینہ بہ سینہ استفادہ حاصل

کرنے کا جو موقعہ حاصل ہے اس کو ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔"

درِ شہوار درہائے ایتام کے ساتھ :- ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ء ڈاکٹر اقبال یتیم خانہ پہنچے۔ یتیموں کے سر پر محبت و شفقت کا ہاتھ پھیرا، سنت کی پیروی کی۔ اور منتظمین یتیم خانہ سے فرمایا :

"یہ بچے قوم کی امانت ہیں۔ ان کے ساتھ حد درجے محبت، ہمدردی اور حسنِ سلوک سے پیش آنے کی ضرورت ہے۔"

علامہ اقبال میسور یونیورسٹی میں :- اردو طلباء نے ڈاکٹر اقبال۔ پروفیسر عبداللہ چغتائی، چودھری محمد حسین، پرنسپل راؤ، میسر واڈیا، پروفیسر گوپال سوامی، مدیر الکلام، محمد ابا سیٹھ وغیرہ کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔

ڈاکٹر گوپال سوامی صدر شعبۂ نفسیات نے اپنے شعبہ کا دارالتجربہ دکھایا[۱]۔ پھر ایک جدید آلے کی کرشمہ سازی کا مظاہرہ بھی کیا۔

مردانِ حق آگاہ کی بارگاہ میں :- بنگلور پلٹتا ہوا یہ کارواں چن پٹن رکا۔ مردانِ حق بین و حق آگاہ حضرت سید عاقل شاہ قادری[۲] سید بڈھن شاہ قادری کے مزاروں پر صوفی اقبال نے حاضری دی۔ زیارتِ قبور اور فاتحہ خوانی کے بعد درگاہ سے باہر تشریف لائے تو مدیر نے فرمایا :

"ڈاکٹر صاحب! یہ مشہور ہے کہ سید عاقل شاہ قادری نواب حیدر علی کے مرشد تھے اور سید بڈھن شاہ قادری سلطان ٹیپو کے۔"

ایک خوش خبری اور مدیر الکلام :- جب قافلہ بنگلور پلٹا تو مدیر الکلام سید غوث محی الدین نے علامہ اقبال سے کہا :

"ڈاکٹر صاحب! سر اکبر حیدری نے آپ کے ساتھ حیدر آباد آنے اور حضور نظام کے مہمان بننے کی دعوت بذریعہ تار دی ہے۔ پتا نہیں یہ سب کیسے ہوا ؟"

"سید صاحب! ڈاکٹر اقبال نے کمالِ محبت و مہربانی سے فرمایا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ چند دن اور میرے ساتھ رہیں اس لیے میں نے سر اکبر حیدری کو تار دیا تھا کہ آپ کو مدعو کریں۔"

"اس سرفرازی پر اس حقیر کے پاس شکریے کے وہ الفاظ کہاں ہیں جو ادا ہوں۔" مدیر الکلام نے نہایت عجز و انکسار اور خوشی سے فرمایا، پھر موضوع کو بدلا اور کہا :

"ڈاکٹر صاحب! سفر سے متعلق یہ طے ہوا ہے درجہ اوّل میں آپ کی نشست محفوظ کرا دی جائے۔ پروفیسر عبداللہ چغتائی، چودھری محمد حسین اور یہ خاکسار سیکنڈ کلاس میں رہیں۔"

"نہیں جی! ڈاکٹر صاحب نے فرمایا سیکنڈ کلاس کا ایک ایسا ڈبہ محفوظ کر دیا جائے جس میں صرف چار نشستیں ہوں[۳]"

"بہتر! سب نے اس تجویز کو قبول کیا۔ اور ان سب کے لیے ڈاکٹر اقبال کا ساتھ نعمتِ غیر مترقبہ ہی تو تھا۔"

شہر بھاگ متی کے بھاگ جاگے

شہر بھاگ متی (حیدر آباد دکن) پہنچنے سے پہلے ہندستان کے مشہور مؤرخ محمود خان محمود سے گنتکل ریلوے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔

۱۔ اگلے دن صبح (۱۳ جنوری ۱۹۲۹ء) ڈاکٹر صاحب میسور یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات عملی کے دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے، وہاں چند دل چسپ تجربے دیکھے۔ پھر فوٹو بھی اتارے گئے۔ (مطبوعہ انقلاب لاہور مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۲۹ء)

۲۔ یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت سید عاقل شاہ قادری۔ نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو دونوں کے پیر و مرشد تھے۔ "گلشن رحمانی" اور "تحفہ شطاریہ" میں رقم ہے کہ نواب حیدر علی خاں کو حضرت سید شاہ عطاء اللہ شطاری رحمہ سے عقیدت و ارادت تھی، راقم نے تفصیل "مشائخین جنوبی ہند کے نسب نامے" مرتب سید عبدالوہاب شطاری، کے مقدمے میں پیش کی ہے۔

۳۔ راوی، سید غوث محی الدین مدیر الکلام۔

ں [illegible] راقم الحروف سے ایک ملاقات (۵ مارچ ۱۹۵۰ء) اور اپنی تصنیف "صحیفۂ ٹیپو سلطان" میں کیا ہے!

"راقم الحروف مدۃ العمر کبھی ان زریں گھڑیوں کو بھول نہ سکے گا جو اس حکیم ملت کی معیت میں بسر ہوئیں اور شاید ہی یہ فخر کسی کو حاصل ہوگا کہ گنٹکل میں کھانے کے وقت جب میں اپنا برتن (جنوبی ہند کے رواج کے مطابق) الگ لے بیٹھا تو آپ نے اس کو کھینچ کر علاحدہ کر دیا اور آپ کے روبرو جو برتن تھا اس میں نہ صرف کھانے کو کہا بلکہ اپنے ہاتھ سے نوالے تک بنا کر میرے منہ میں دیئے۔"

۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء ـــــــ سلطان محمد قطب شاہ کی مشہور و معروف محبوبہ و ملکہ بھاگ متی کے ـــــــ محل کی جیتی جاگتی سانولی سلونی سرزمین پر ریل رکی تو بڑی آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا کہ ننھی منی کلیوں سے نغمے پھوٹ رہے ہیں، معصوم بچے قطار میں کھڑے علامہ موصوف کا ترانہ گا رہے ہیں:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا [1]

لحنِ داؤدی سے گا رہے ہیں۔ اتنے میں اے۔ ایچ، انصاری رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی سید ہاشمی فرید آبادی [2] وغیرہ نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور بڑی ہی چاہ سے چائے پیش کی اور یہ اطلاع بھی دی کہ معزز مہمان کا قیام مہمان خانہ شاہی میں ہوگا۔ [3]

مولانا محمد صالح مصنف "قرآن و اقبال" اپنی تحریک "تحریک قرآن" کے سلسلے میں نواب نذر یار جنگ بہادر کے ہم راہ ملے اور تعارف کے بعد قرآن کا اولین مقصد، قرآن مجید کی تعلیم، معنی و مطالب کے ساتھ عام اور لازمی کرنا بیان کیا [4] تو اقبال نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر ایک نظر ڈالی پھر اپنا کمبل ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے فرمایا!

"مولوی صاحب! آپ کی تحریک سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ مگر پہلے یہ بتائیے کہ قرآن پڑھائے گا کون"؟

"ڈاکٹر صاحب! بے شک حقیقی معنوں میں قرآن کے پڑھانے والوں ہی کی کمی ہے، جس دن یہ کمی پوری ہوئی، سب کچھ ہو جائے گا مگر آپ بھی قرآن، قرآن کرنے دیجئے کیوں کہ آپ کے حسبِ منشا قرآن پڑھانے والے بھی قرآن ہی سے پیدا ہوں گے۔" [5]

مولانا محمد صالح کے ایک شاگردِ عزیز نے ایک لطیفے کی گنجائش نکال ہی لی۔ یعنی دوسرے دن مولانا نے شائع شدہ لٹریچر اُن شاگردِ عزیز کے ہاتھ روانہ فرمائے۔ تحریک سے متعلق لگے ہاتھوں رائے بھی طلب کرنی چاہی لیکن شاگرد نے خود حضرت اقبال کو بھی قرآن مجید کی تعلیم و تبلیغ کی دعوت دے دی، علامہ اقبال نے مسکرا کر فرمایا:

"ہاں جی! پہلے میں آپ کے استاد سے قرآن پڑھ لوں، پھر ایسا ضرور کروں گا۔" [6]

"اور مسائل کے ساتھ اردو زبان کا مسئلہ بھی اٹھایا جاتا۔" مدیر الکلام نے مجھ سے فرمایا۔ [7]

---

[1] روزنامہ الکلام ۱۹۲۹ء، نیرنگ خیال (اقبال نمبر) ذکر اقبال، انقلاب لاہور (مطبوعہ ۲۲ر جنوری ۲۹ء۔ [2] روزنامہ "انقلاب" لاہور مطبوعہ ۲۲ر جنوری ۱۹۲۹ء۔ [3] (i) بذریعہ تار (قیام بنگلور میں) یہ خبر ملی کہ علامہ مدظلہٗ کے قیام کے لیے جناب حیدر نواز جنگ دام اقبالہٗ وزیر فینانس نے "دلکشا" میں انتظام فرمایا ہے (مدیر الکلام کا خط مطبوعہ روزنامہ الکلام مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء) (ii)، وہیں ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی گئی کہ آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام کی گورنمنٹ کے مہمان ہیں۔ اس لیے آپ کو گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں جانا ہوگا۔ (روزنامہ انقلاب لاہور مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۲۹ء) (iii) ساری تفصیل میں نے ظفر الحسن کی خواہش پر فیض احمد فیض کے رسالہ "غالب" اور میری اپنی کتاب "دانائے راز دیارِ دکن میں" دی ہے۔ [4] [5] [6] "قرآن و اقبال" از مولانا محمد صالح۔

[7] اس کا ذکر ان کے اپنے مضمون "میری زندگی کا ماحصل" اور روزنامہ الکلام (۱۹ر جنوری ۱۹۲۹ء) میں بھی کیا ہے۔

اُور یہ گذارش بھی ہوئی کہ علامہ اقبال اردو پر کچھ اور زیادہ زور دیں:۔ "اُس وقت میرے مخاطبین نہ صرف ہندستانی مسلمان ہیں بلکہ ساری دنیا کے۔ اگر میں اپنے خیالات اُردو ہی میں ظاہر کرنے لگوں تو میرے پیغامات ہندستان سے باہر کثیر التعداد مسلمانوں تک کیسے پہنچ سکیں گے۔ اس لیے ایسی زبان اختیار کرنی پڑتی جو دنیا بھر میں عموماً بولی جاتی ہے۔ پس فارسی اور عربی اس مقصد کے لیے بہ نسبت اردو کے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہیں:۔"

جوش ملیح آبادی دارالترجمہ کے ناظم تھے۔ آپ کے حسنِ انتظام سے ۱۵ جنوری کی شب مہاراجا کرشن پرشاد کی حویلی میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جب ڈاکٹر صاحب سے اصرار ہوا۔ اور جنت آشیانی نے بھی فرمایا کہ سُنا دیجئے نا اقبال صاحب! تو خواص کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ صاف انکار کر دیا اور اصرار بڑھا تو فرمایا کہ[1] FOOLS ! I WANT TO GIVE AN EMPIRE AND YOU WANT POETRY FROM ME

ڈاکٹر اقبال کی معرکۃ الآرا تقاریر:۔ ڈاکٹر اقبال نے مورخہ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ جنوری ۲۹ء کو جامع عثمانیہ میں تقاریر کیں۔ وہی خطبے تھے جسے علامہ موصوف نے مدراس میں سنائے تھے۔

۱۷ جنوری ۲۹ء کو حسین و جمیل دل فریب و نظر فریب باغ عامہ میں سر اکبر حیدری کی صدارت میں ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا، جہاں بقول مدیر روزنامہ الکلام حضرت اقبال نے ایک طویل تقریر فرمائی جو مذہب اسلام سے متعلق تھی۔

سیر و تفریح:۔ حیدر آباد شہر کی سیر کے بعد سر اکبر حیدری نے سلاطین قطب شاہیہ کے مزار اور گولکنڈہ کے تاریخی قلعے کی سیر کرائی۔ اس سیر میں مروز روشن کے علاوہ شب ماہ بھی شامل تھی اور بقول سر شیخ عبدالقادر، ایسی شب جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور و ظلمت میں لڑائی ٹھن رہی تھی، سچے شاعرانہ جذبات کی نشوونما کے لیے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان اور کیا ہوگا۔ جہاں شاعر کی آنکھوں نے ٹھنڈک محسوس کی وہاں "شکریہ"[2] ادا ہو گیا اور جہاں دل پر چوٹ لگی وہاں "گورستان شاہی"[3] کی تخلیق ہو گئی۔

آٹوگراف:۔ علامہ اقبال اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ جناب ممتاز الدولہ بہادر تشریف لائے اور درخواست کی یتیم خانے تک قدم رنجہ فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ بانی اور مہتمم بھی آپ ہی ہیں تو خوش ہوئے۔ غریبوں اور بچوں سے پیغمبرانہ صفت ہے۔ "حضرت اقبال کا شگفتہ موڈ دیکھ کر ممتاز الدولہ نے آٹوگراف بک پیش کی" مدیر الکلام نے فرمایا "آپ جانتے ہیں سلیم صاحب علامہ اقبال نے کیا رقم فرمایا"

BOOKS ARE DEAD THINGS LIVING EXPERIENCE ALONE IS THE SOURCE OF KNOWLEDGE

یعنی کتابیں مردہ چیزیں ہیں۔ زندہ تجربہ ہی سرچشمہ علم ہے[4]

تاجدار دکن سے ملاقات:۔ ۱۸ جنوری ۲۹ء کو ڈاکٹر اقبال آصف جاہی دستار اور ربگلس کے بغیر حضور نظام کے حضور پہنچے[5] رموزِ بے خودی کا ایک نسخہ گردانتے ہوئے ایک فارسی نظم پیش کی۔ اور حضور نظام کے اس بیش بہا ہیرے[6] کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی،

---

[1] علامہ مرحوم سے منسوب ان الفاظ سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ وہ روایت (جس کا ذکر نظر حیدر آبادی نے اپنی تصنیف "اقبال اور حیدر آباد" میں کیا ہے) کہ اقبال حیدر آباد دکن کو کامن ویلتھ میں ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے، شاید ٹھیک ہی ہو اور ان الفاظ میں اقبال نے اسی کی جانب اشارہ کیا ہو، مگر مولانا غلام رسول مہر نے راقم کو لکھا کہ:۔ اگر علامہ مرحوم سے ان الفاظ کا انتساب درست ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ میں تو مسلمانوں میں مملکت آرائی کے اوصاف و خصائص مہیا کر رہا ہوں۔ ایک بلند نصب العین کے لیے والہانہ قیام کی دعوت دے رہا ہوں اور ع اے حدیثِ دل بری خواہد زمن۔ [2][3] یہ دونوں نظمیں اسی سرزمین اور اسی سفر کی مرہونِ منت ہیں۔ [4] مدیر الکلام نے اس کا ذکر ۲۰ جنوری ۱۹۲۹ء کے روزنامہ الکلام میں بھی کیا ہے۔ [5] رات ۹ بجے کے قریب امین جنگ صاحب کا رقعہ آ گیا کہ اعلیٰ حضرت شہریار دکن نے ۱۸ جنوری ۱۱ بجے صبح آپ کو ملاقات کے لیے یاد فرمایا ہے۔ (چودھری محمد حسین کا خط بنام غلام رسول مہر مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۲۹ء۔ [6] بقول قاضی عبدالحمید (رسالہ اردو اقبال نمبر)

جس کی خبر انھیں حکیم اجمل خاں نے دی تھی۔ تاجدارِ دکن نے فوراً حکم صادر فرمایا۔ اور اقبال نے اس چمکتے دمکتے حسین مادی ید بیضا کو دیکھا اور شکریہ ادا کیا۔

اقبال صاحب! حضور نظام نے فرمایا۔ ہم سال گذشتہ دہلی آئے تھے۔ دہلی سے لاہور نہایت قریب ہے لیکن آپ ہماری ملاقات کے لیے تشریف نہیں لائے۔؟"

حضور! اقبال نے جواب دیا۔ "اقبال تو ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہتا ہے، لیکن یہ جسمانی اقبال ان دنوں بیمار تھا اس لیے حاضرِ خدمت نہ ہو سکا۔ اس سہو کی تلافی کے لیے اب ڈیڑھ ہزار میل کا سفر طے کر کے حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔

آپ قبول فرمائیں تو ہم آپ کو اسٹیٹ کا وزیر قانون بنا دیں [۴]

حضور! اقبال نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ آپ اقبال کو آزاد ہی رکھیں تو بہتر ہوگا۔ اس قسم کی سرکاری ذمہ داریوں کی تکمیل کے لیے میں اپنے آپ کو موزوں نہیں پاتا۔" [۳]

خدا حافظ:۔ نظام دکن نے شاداں و فرحاں اقبال کو رخصت کیا۔ اور حضرت اقبال ۱۹ر جنوری ۱۹۲۹ء کو اپنا جنوبی ہند کا سفر ختم کر کے بمبئی کے راستے لوٹ رہے تھے۔ چودھری محمد حسین ساتھ تھے اور پروفیسر عبداللہ چغتائی بیدر تشریف جانے اور وہاں بہمنی و بریدشاہی حکمرانوں کے شکستہ مزاروں پر عبرت کے دو آنسو بہانے اور کھنڈروں کو دیکھنے کے لیے حیدرآباد میں ٹھہر گئے۔

علامہ اقبال جیسے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے جہاں آنکھوں نے ٹھنڈک محسوس کی تھی اور دل خوشیوں سے بلیوں اچھل رہا تھا وہاں آج وہی آنکھیں بھر آئی تھیں اور دل مغموم تھے۔ ❀

---

[۱] [۲] میری زندگی کا ماحصل، مدیر الکلام۔

یادش بخیر۔ حیدرآباد دکن میں "یوم اقبال" تزک و احتشام سے منایا گیا۔ اس موقع پر سر اکبر حیدری کی کوششوں سے نظام دکن نے توشہ خانہ سے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں ایک ہزار روپے کی رقم چیک کی صورت میں روانہ کی۔ ڈاکٹر اقبال نے چیک لوٹاتے ہوئے ذیل کا قطعہ سر اکبر حیدری کے نام لکھا ؎

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر — حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش — کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول

جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

[۳] میری زندگی کا ماحصل از مدیر الکلام۔ [۴] تازیانہ (لاہور) ۱۹۲۹ء۔ [۵] علامہ اقبال کے سفر کے دلچسپ (از ممتاز حسن بسمل مطبوعہ ہفتہ وار تازیانہ لاہور ۱۹۲۹ء)

زندہ رود

*

تخم اشکے ریختیم اندر دکن — لالہ ہا روید زخاکِ آں چمن

رود کاویری مدام اندر سفر — دیدہ ام در جانِ او شورِ دگر

جاوید نامہ "آں سوئے افلاک" صفحہ ۱۸۱
کلیاتِ اقبال صفحہ نمبر ۷۶۹

باب ۵

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

قطعہ

رہ و رسمِ حرم نامحرمانہ
کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اقبال

اقبالؒ بنام لمعہ حیدر آبادی

پ: ۱۹۱۱ء ——— م: ۱۹۷۷ء

اقبال کے خط کا یہ عکس "اقبال نامہ" [حصہ اول مطبوعہ ۱۹۴۴ء، صفحہ نمبر ۱۷۲ مرتبہ شیخ عطاء اللہ] سے لیا گیا ہے۔ اقبال کے لمعہ کے نام خطوط کو جعلی اور وضعی کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اقبال نامہ [حصہ اول] پر اظہار رائے کرتے ہوئے ان خطوط کو جعلی قرار دیا ہے [اقبال کا فکر و فن مرتبہ افضل حق قریشی، مطبوعہ ۱۹۷۷ء لاہور]۔ ۱۲ فروری ۱۹۳۵ء کا ایک خط بنام لمعہ میں اقبال نے ایک جگہ تحریر کیا ہے :

"میں یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ مثنوی مولانائے روم سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

خط کی نثر میں ایک ٹکڑا "استفادہ حاصل کرنا" کو بنیاد بنا کر تمام خطوط جن کی تعداد ۲۹ ہے، جعلی اور وضعی قرار دینے کو عبدالواحد معینی نے بھی درست تسلیم کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ :

"ڈاکٹر تاثیر قطعی طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ اکثر وہ خطوط جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اقبال نے ڈاکٹر لوما کو لکھے تھے جعلی ہیں۔"

نقش اقبال از سید عبدالواحد معینی مطبوعہ ۱۹۶۹ء [لاہور]

محض ایک ٹکڑے کو بنیاد بنا کر بہت سے خطوط و شواہد کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ بعض ثقہ ماہر اقبالیات عبدالواحد معینی کو درست مانتے ہیں۔ معینی صاحب نے لمعہ کا نام کئی جگہ غلط یعنی "لوما" تحریر کیا ہے۔ خطوں کے متن میں اس نوع کی غلطیاں ناقل یا کاتب سے سرزد ہوئی ہیں اور خطوط اقبال کا کوئی بھی مجموعہ غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL   LAHORE.

BARRISTER-AT-LAW.

۱۳ [illegible] ۳۴ء

مکرم [illegible]

قرآن شریف کا نسخہ جو آپ نے کمال عنایت سے ارسال فرمایا ہے

ابھی موصول ہوا۔ اس مقدس تحفہ کے لیے میں آپ کا

نہایت شکر گزار ہوں۔ انشاء اللہ اسی نسخہ سے تلاوت کیا کروں گا

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

محمد اقبال

(نوٹ) [illegible]

مرتبہ: اکبر رحمانی

انتخابِ کلام لمعہ حیدرآبادی

ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی ایک بلند پایہ شاعر، نثر نگار اور انشا پرداز تھے۔

ایک زمانے میں ان کا کلام مخزن، نیرنگِ خیال، ہمایوں، ہمدرد، زمین دار اور شاعر جیسے وقیع ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتا تھا۔ علامہ اقبال بھی ان کی شاعری کے مدّاح تھے۔ مکاتیبِ اقبال بنام لمعہ حیدرآبادی میں "بعض مقامات پہ لمعہ کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے علامہ اقبال کے قلم سے ایسے توصیفی جملے نکل گئے ہیں جو شاید ہی کسی شاعر کی تعریف میں علامہ نے کہے ہوں۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال جو ہمیشہ اصلاحِ سخن سے پہلو تہی کرتے رہے وہ ڈاکٹر لمعہ کو نہ صرف مفید مشوروں سے نوازتے ہیں بلکہ ان کے کلام پہ مسلسل اصلاحیں بھی دیتے ہیں۔" (اقبال اور حیدرآباد۔ سیّد نظر حیدرآبادی)

دُکھ کی بات یہ ہے کہ جس کی تعریف میں علامہ اقبال جیسا شاعر رطب اللسان ہے اس کا کوئی مجموعہ کلام کا نام علامہ اقبال نے "تقدیرِ اُمم" تجویز کیا تھا۔ مرحوم نے انتقال سے چند ماہ قبل اپنے کلام کا مسوّدہ مجھے دیا تھا۔ یہ مختصر انتخاب اسی مسوّدے سے کیا گیا ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لمعہ حیدرآبادی نے صرف اردو ہی میں شاعری نہیں کی بلکہ فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی شاعری کی ہے۔ فارسی میں انھوں نے ایک دیوان موسوم بہ "مشرق نامہ" یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی انگریزی نظمیں ہندستان اور امریکہ کے رسائل و اخبارات میں شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ گرودیو ٹیگور نے ان کی انگریزی شاعری کی بے حد تعریف کی ہے۔

ایک شام دریائے نیلین پر

میں کہ نبود و بود کو جان کے بھی خموش ہوں
میں کہ جہانِ حسن میں عاشقِ سر فروش ہوں
میں کہ تخیلات میں رہبرِ ناؤ نوش ہوں
میں کہ خودی و بیخودی دونوں کی عقل و ہوش ہوں

پردوں میں چشمِ لمعہ کے نورِ علین ذات ہے
اور نبود و بود میں فلسفۂ حیات ہے

میں کہ ندائے لاالٰہ مندرِ سومنات میں
میں کہ فروغِ شانتی قلب کی کائنات میں
میں کہ سراپا درد و غم عالمِ ذی حیات میں
اپنی ہی میں مثال ہوں، ذات میں اور صفات میں

فقر میرا منال ہے، علم میرا جمال ہے
حُسن کی دید کے لیے عشق شریکِ حال ہے

اپنی خودی کے سامنے سر کو جھکا رہا ہوں میں
رازِ حیات کے لیے خود کو مٹا رہا ہوں میں
کھو کے جہانِ فکر میں اپنے کو پا رہا ہوں میں
حسنِ جہاں کی آنکھ سے خود کو بچا رہا ہوں میں

نذر ہے اس کی دل میرا طاقتِ دید جس نے دی
اس پہ فدا ہے دل، جسے کہتے ہیں "بت ہری ہری"

میں جو ہوا تو کیا ہوا اور نہ ہوا تو کیا ہوا ہونے سے میرے مجھ پہ ہی باب خودی کا وا ہوا
ہو کے شریک سب میں، میں سب سے سدا جدا ہوا پا کے خودی کے باب کو، عشق کا باب وا ہوا
میرا خدا خودی میری، میری خودی میرا خدا
خود میں عیاں ہوا ہوں میں رہ کے جہاں سے جدا

علم نواز دل میرا، عقل نواز جاں میری حسن نواز آنکھ ہے، عشق نما فغاں میری
مُردوں میں روحِ زندگی پھونکتی ہے اذاں مری صدق جو ہے زباں مری زیست ہے جاوداں مری
کشمکشِ حیات میں فقر کا لمعہ میسر ہے
عشق کا شاہ ہے مگر حسن کا اک فقیر ہے

کھو کے تمام مال و زر میں نے خودی خرید کی دے کے تمام عافیت، خواہشِ غم مزید کی
رنج نہ عاقبت کا اب اور نہ خوشی ہے عید کی آنکھ کو آرزو ہے بس حسنِ خودی کی دید کی
سیل سرشک نے میری شمع کو بھی بجھا دیا
نورِ بصر نے عشق کا مجھ کو خدا بنا دیا

میری نظر میں ہیچ ہے اہلِ فرنگ کی ارتقا، ڈوب رہی ہے لے کے یہ دونوں جہاں کو برملا
ہند کی دیویاں ہوئیں مغربیت میں مبتلا حسن جو پردہ پوش تھا حیف وہ پردہ در ہوا
نیم برہنہ ہو گیا غرب کے ساتھ شرق بھی
ہو یہ کہیں خدا کرے کشتیٔ شوق غرق بھی

درس فروش ماسٹر علم فروش جامعات روح کی موت بالیقیں عقل کی گم ہے کائنات
کھو کے خودی کو اپنے سب بن گئے ملات و منات شیکسپیر کا درس ہے بٹتی ہے حسن کی زکات
مرد کی ہمتیں ہیں پست، مرد کی روح سرد ہے
مغربیت کے رنگ میں زن بہ صفات مرد ہے

جلوۂ حسن عام ہے، عشق ہوس کا نام ہے شیشہ رہے میں عشق ہے، عصمتِ حسن جام ہے
روحِ حیا ہے اشک بار، شرم کا اختتام ہے غرب کے ساتھ شرق، لمعہ کا یہ پیام ہے
راہ شہِ عربی بجو، خیز کہ صبح شام شد
کلمۂ لاالٰہ بگو ورنہ جہاں تمام شد [۱۰ جون ۱۹۲۷ء]

(۱)

رسولِ خدا بھی ہے قرآں بھی میرا دو عالم بھی میرے، خدا بھی ہے میرا
نہ گھر وار اپنا، نہ اموال اپنا یہ دنیا ہے واللہ دین بسیرا
فریبِ تخیل ہے یہ حسنِ عالم نگاہوں میں جلوہ ہے میرا ہی میرا
یہ اپنا وہ اپنا، یہ میرا وہ تیرا یہ دیوانہ پن ہے نہ تیرا نہ میرا
جو تیرا ہے وہ تجھ کو دِکھتا نہیں ہے جو میرا ہے تو اس کو سمجھا ہے تیرا
دوئی کو مٹا دے خودی کو بسا لے تو واللہ سب کچھ ہے تیرا ہی تیرا
میں ہو کر بھی سب کا خود اپنا ہوں اپنا ذرا جاگ، ہونے کو ہے اب سویرا

(۲)

تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ
اپنے کو حقیقت میں ہم آغوشِ خدا دیکھ

مومن ہے اگر تو، تو محمدؐ سے وفا کر
چھُٹ جائے نہ ہاتھوں ترے دامانِ وفا دیکھ

سجدے ترے باذوق ہوں پُرکیف نمازیں
اک آہ میں کونین کو قدموں پہ جھکا دیکھ

ہر سجدے میں جھکتے ہیں ترے ساتھ دو عالم
تو کون ہے، تو کون ہے اپنے کو ذرا دیکھ

یہ کس نے سکھائیں تجھے خلوت کی نمازیں
خلوت سے نکل قوم کی حالت کو ذرا دیکھ

تقدیر بدل جاتی ہے ہاں ذوقِ جنوں سے
اسرارِ جہاد اپنی طبیعت میں بسا دیکھ

دربانِ محمدؐ ہوں مشہور ازل سے
در پردہ فنا میں مری اسرارِ بقا دیکھ

(۳)

میں چھپ چھپ کر تجھے جب دیکھتا ہوں
تو تو، آنکھوں میں چھپ جاتا ہے میری

میں رو رو کر تجھے جب دیکھتا ہوں
تو تو نظروں میں آ جاتا ہے میری

میں ہنس ہنس کر تجھے جب دیکھتا ہوں
تو، اشک آنکھوں سے برساتا ہے میری

ترے جلوؤں سے جب آنکھیں ہوئیں چور
تو، خواب آنکھوں میں لے آتا ہے میری

(۴)

موت کے راز میں نہاں سازِ حیات سُن لیا
نغمۂ لاالٰہ میں عشق کی بات سُن لیا

ذات و صفات مری، تیرے سوائے کون ہے
سرِ خودی میں ڈوب کر راز کی بات سُن لیا

جامِ الست پی کے میں کاشفِ راز ہو گیا
میں نے یہ کیا غضب کیا نغمۂ ذات سُن لیا

حاصلِ زندگی خودی، حاصلِ موت بے خودی
سازِ ممات سُن لیا سازِ حیات سُن لیا

تو ہی ہے جلوہ گر میرے قلب کی بارگاہ میں
حاصلِ عشق بن کے میں عرش کی بات سُن لیا

تیری ہی مخفلیں ہیں سب لمعہ کے چشم و گوش و ہوش
ان کا شریک ہو کے میں سازِ نجات سُن لیا

(۵)

بہ طرزِ غالب

اسرارِ زماں اور ہیں، اسرارِ مکاں اور
عقبیٰ کی بصیرت میں ہے پندارِ جہاں اور

با کتمِ عدم جب مرا مقصود تھا موجود
مشہود کے پردے میں تھا شاہد کا نشاں اور

پندارِ ممات عقدہ کشائے نفس ہے
کھونا ہے یہاں اور تو پانا ہے وہاں اور

اک ذوقِ مسلسل ہے کہ یہ مرگِ گراں ہے
مر کر بھی تیری یاد میں جیتا ہے وہاں اور

محسوسِ خلائق ہوں وہ افکار ہے میرے
وہ سوزِ دروں دے کہ فغاں کی ہو زباں اور

مقصودِ پرستش تھی خدا کی پسِ پردہ
"کافر کی اذاں اور ہے مومن کی اذاں اور"

پابندِ نظر کر کے میں حسنِ ازلی کو
رکھتا ہوں رُخِ حسن کو آنکھوں میں نہاں اور

اقبال ہوں رومی ہوں کہ غالب ہوں کہ لمعہ
ہے سب کی فغاں ایک تو اندازِ بیاں اور

قطعات و رباعیات

ہوئی ہے عمر صرفِ بے نیازی
مرا نغمہ مری لَے ہے حجازی
مری زد سے نہیں باہر کوئی شئے
حقیقت ہو کہ ہو سرِّ مجازی

○

منوّر ہے خودی علم الیقیں سے
جہاں روشن ہے یہ نورِ مبیں سے
محمّد منبعِ سرِّ یقیں ہے
کہ ملتا ہے خدا صاحبِ یقیں سے

○

خودی کی محفلوں میں کھو گیا میں
کہ ان کے روبرو گویا نہ تھا میں
خودی میں ڈوب کر دہ میں نے پایا
کہ جس کو پا کے مولا بن گیا میں

○

ترے قطرے ہی سے دریا بنا میں
صدف میں تیری پل کر دُر ہوا میں
خودی کے بحر میں غوطہ لگا کر
رموزِ کن مکاں کو پا گیا میں

○

دنیا ہے اک سرائے ہم تم ہیں مہماں
اس جا نہ بنائے کوئی بھولے سے مکاں
ہر وقت رہے خیال دل میں اُس کا
آئے ہیں جہاں سے پھر کے جانا ہے وہاں

○

میں حسن کو پا کے خود کو کھو دیتا ہوں
چہرے کو غمِ عشق سے دھو لیتا ہوں
آتا ہے جو لمعہ اپنے عصیاں کا خیال
جی بھر کے میں تنہائی میں رو لیتا ہوں

○

مجھ کو تو لمعہ تہذیبِ نو میں
بو آ رہی ہے خونِ حیا کی
عصمت فروشی عادت ہے اس کی
صورت نہ دیکھو اس بے وفا کی

نذرِ لمعہ بحضور علامہ اقبال

خودداریٔ عشاق ہے ہر بات میں تیری
گیرندۂ آفاق ہے تیری ہی فقیری
پُر کیف دعاؤں سے تری مردِ خود آگاہ
زندہ ہے زمانے میں فقیروں کی امیری

(اقبال نامہ حصہ اول، مطبوعہ ۱۹۴۴ء)

اکبر رحمانی

کاشانۂ سہیل، ۲۷، بھوانی پیٹھ، جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱

اقبال بنامِ لمعہ حیدرآبادی

علامہ اقبال کے انتقال کے بعد اُن کے مکاتیب جمع کرنے اور انہیں شائع کرنے کے لیے اُدارۂ اقبال کے نام سے ایک انجمن تشکیل دی گئی تھی جس کے سرپرست سر عبد القادر مدیر مخزن لاہور، صدر میر سید اکبر علی خاں (راجہ آف پنڈراول) اور نائب صدر عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی تھے۔ شیخ عطاء اللہ اس ادارہ کے ناظم تھے۔ لیکن اس ادارہ کی تشکیل سے پہلے ہی شیخ عطاء اللہ نے مکاتیبِ اقبال جمع کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ حیدرآباد بھی گئے جہاں انہوں نے اقبال کے دوستوں اور عقیدت مندوں سے ملاقاتیں کر کے بہت سارے خطوط جمع کیے۔ حیدرآباد میں جس شخص نے مکاتیبِ اقبال جمع کرنے میں سب سے زیادہ تعاون کیا وہ ڈاکٹر لمعہ ہی کی ذات تھی۔ شیخ عطاء اللہ نے اقبال نامہ کے دیباچے میں اس مخلصانہ تعاون کا اس طرح اعتراف کیا ہے:

> "سر عبد القادر نے مجھ پر سب سے بڑا کرم یہ کیا کہ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ (حیدرآبادی) جاگیردار تونڈاپور مشرقی خاندیس سے میرا تعارف کرا دیا اور اس طرح اس خدمتِ ملت کے لیے مجھے اقبال کے ایک نوجوان مخلص دوست، مدّاح اور عقیدت مند میسر آ گئے، جنہوں نے نہ صرف مکاتیبِ اقبال کا ایک گراں قدر مجموعہ مرحمت فرمایا بلکہ دوسروں سے مکاتیب حاصل کرنے میں تعاون کیا۔"

(دیباچۂ اقبال نامہ حصہ اوّل)

علامہ اقبال نے لمعہ حیدرآبادی کو جو خطوط لکھے ہیں ان کے ایک ایک لفظ سے عقیدت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اقبال نامہ حصہ اوّل میں لمعہ کے نام جو خطوط ہیں ان کے علاوہ بھی کئی خطوط ایسے تھے جن میں علامہ نے اپنی ازدواجی اور خانگی زندگی کے حالات بیان کیے تھے اور ان معاملات پر لمعہ سے مشورے بھی طلب کیے تھے۔ مگر افسوس کہ ایسے تمام خطوط لمعہ نے ضائع کر دیے۔ جب راقم الحروف نے ان قیمتی خطوط کے ضائع کرنے کی وجوہ سے متعلق استفسار کیا تو لمعہ نے فرمایا:

> "خطوط دو اشخاص کے دلی جذبات و احساسات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی مکتوب نگار اس یقین کے ساتھ اپنی نجی زندگی کے اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے کہ یہ راز اور باتیں مکتوب الیہ تک ہی محدود رہیں گی اور دوسروں پر ظاہر نہ ہوں گی...... میں خطوط کو ہمیشہ نجی کی باتیں سمجھتا آیا ہوں اس لیے انہیں شائع کرنا تو دور رہا دوسروں کو دکھانا تک معیوب سمجھتا ہوں۔ میرے بھائی! یہ دنیا ہے۔ یہاں اچھے بھی لوگ ہیں اور بُرے بھی۔ مجھے آخرت کا ہمیشہ خیال رہتا ہے اور وہاں کی بازپُرس سے بہت ڈرتا ہوں۔ اگر کوئی نجی خطوط کو غلط مقصد کے لیے استعمال کرے تو آخرت میں علامہ اقبال کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ ...... بس اسی خوف کی وجہ سے میں نے وہ سب خطوط ضائع کر دیے۔
> میں نے یہی بات شیخ عطاء اللہ سے بھی کہی تھی جب وہ مکاتیبِ اقبال جمع کرنے حیدرآباد تشریف لائے تھے......
> میں نے تو وہ تمام خطوط بھی دینے سے انکار کر دیا تھا جو اقبال نامہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مگر سر عبد القادر نے مکاتیبِ اقبال کی اہمیت و افادیت سے متعلق خط لکھا اور اصرار کیا کہ اقبال کی نجی زندگی کے علاوہ دیگر مکاتیب شیخ

عطاء اللہ کے حوالے کر کے اُن کے ساتھ تعاون کریں.........سر عبدالقادر ہی کی ایما پر میں نے مکاتیب اقبال جمع کرنے میں شیخ عطاء اللہ کے ساتھ تعاون کیا اور ان کی ملاقات ایسے ایسے لوگوں سے کروائی جہاں وہ پہنچ بھی نہ سکتے تھے.......شیخ عطاء اللہ کو میں نے علامہ اقبال کے تقریباً پچاس ساٹھ خطوط دیے تھے۔ان میں سے صرف ۱۹ خطوط اقبال نامہ میں شائع ہوئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ بقیہ خطوط سر شیخ عبدالقادر نے اپنے پاس محفوظ کر لیے تھے۔ان خطوط کی واپسی کے لیے میں نے پھر کوئی خط و کتابت نہ کی"۔

(ڈاکٹر لمعہ سے ایک انٹرویو)

اقبال نامہ جلد اوّل میں جو خطوط شائع ہوئے ہیں اُن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اور لمعہ حیدر آبادی کے درمیان گہرے اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ اِن خطوط کے مطالعے سے جہاں اقبال کی شخصیت و سیرت کے کئی پہلوؤں کا علم ہوتا ہے وہاں "لمعہ کی شخصیت اور ان کی صلاحیتوں سے بھی تعارف حاصل ہوتا ہے"۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لمعہ کو اقبال سے بڑی گہری محبت اور عقیدت تھی اور اقبال بھی لمعہ سے محبت رکھتے تھے۔

اِن خطوط میں اقبال نے اپنے دل کی دھڑکنیں انہیں سنائی ہیں۔ ایک طرف وہ لمعہ کی قدم قدم پر رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اسے مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ دوسری طرف وہ اس نوجوان طالب علم کے مفید مشوروں کو قبول کرنے اور اس کی رائے کا احترام کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اس سے اقبال کے کردار کی عظمت اور بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ الزام قطعی بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبال نے ہمیشہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں ہی کو پسند کیا اور عامیوں اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں سے احتراز کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے جن لوگوں سے مراسم تھے اور جن لوگوں کو خطوط سے نوازا ان میں اکثریت کا تعلق امراء اور اعلیٰ طبقے ہی سے ہے۔ ان میں راجے، نواب، وزراء، علماء، فضلاء، پروفیسر اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز لوگ ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں ادنیٰ اور عام طبقے کے لوگوں سے نفرت تھی۔ اُن کے گھر کا دروازہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے لیے کھلا تھا۔ اُن کے یہاں امیر و غریب کے درمیان کوئی تفریق نہ تھی۔ چھوٹوں کے ساتھ بھی وہ محبت و احترام سے پیش آتے تھے۔ اس کی بیّن مثال جواں سال ڈاکٹر لمعہ سے اُن کے مراسم تھے۔ یہ مراسم ایسے تھے کہ بڑے بڑے لوگ بھی اس پر رشک کرتے تھے۔ شاید ہی اعلیٰ طبقے کے کسی فرد کو یہ شرف حاصل رہا ہو۔

اقبال کا لمعہ کی شاعری پر اصلاح دینا

لمعہ اقبال کے شیدائی تھے۔ وہ کلام اقبال سے متاثر ہو کر اشعار کہتے اور پھر ان اشعار کو نذرِ عقیدت کے طور پر علامہ اقبال کی خدمت میں روانہ کرتے تھے۔ ان کی دلی تمنّا تھی کہ علامہ اقبال اُن کے کلام پر اصلاح فرمائیں۔ چنانچہ ابتدا میں لمعہ نے اصلاحِ کلام کے لیے اقبال کو کئی خطوط لکھے۔ اُس زمانے میں اُستاد و شاگردی کی ظرف دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ جو بھی کوچۂ شاعری میں قدم رکھتا کسی نہ کسی کو اپنا استاد بنا لیتا تھا۔ ہر قریہ اور ہر شہر میں یہ دکانیں اس قدر چمکی ہوئی تھیں کہ ہر اُستاد کے ساتھ شاگردوں کا ایک جمِ غفیر ہوا کرتا تھا۔ علامہ اقبال کی انقلاب پسند طبیعت ان فرسودہ رواجوں اور رسومات کی قائل نہ تھی۔ اگرچہ ابتدا میں انہوں نے بھی زمانے کی مروجہ اس روایت کو گلے لگایا تھا مگر بہت جلد وہ اس کوچے سے نکل آئے تھے۔

جب علامہ اقبال کی شاعری پورے ملک میں مقبول ہونے لگی تو ہر مبتدی نے اپنے کلام پر اُن سے اصلاح کرانا چاہی مگر اقبال نے ہمیشہ اصلاحِ سخن سے پہلو تہی کی۔ ڈاکٹر لمعہ کو بھی ابتدا میں انھوں نے نہایت نرم انداز میں جواب دیا:

جنابِ من ڈاکٹر لمعہ

السّلام علیکم

"آپ کا خط مل گیا ہے۔ فی الحال اصلاحِ شعر سے معاف فرمائیے کہ فرصت بالکل نہیں۔ کسی فرصت کے وقت دیکھوں گا۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

مخلص: محمد اقبال، مئی ۱۹۲۹ء[12]

اس مختصر خط کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کسی کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اگر چاہتے تو واضح اور دو ٹوک انداز میں لکھ سکتے تھے کہ "میں استادی و شاگردی کی رسم کا قائل نہیں ہوں۔ اصلاحِ شعر میرا پیشہ نہیں ہے۔ آئندہ آپ اس کے لیے خط نہ لکھیں"۔ مگر انہوں نے کچھ اس انداز

معذرت طلب کی کہ دل شکنی نہ ہو۔ اگرچہ یہ نہایت معمولی اور چھوٹی بات ہے لیکن اس سے بھی اقبال کے اخلاق و کردار کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس
مذرت نامہ سے لمعہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ ان الفاظ کو پڑھ کر کہ "۔۔۔۔۔ کسی فرصت کے وقت دیکھوں گا" ان کے دل میں امید کی شمع روشن ہوئی۔
نانچہ اس کے بعد وہ اپنا کلام وقتاً فوقتاً علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کرتے رہے۔ علامہ موصوف نے بھی اُن کی کبھی دل شکنی نہیں کی بلکہ انکی
نت بڑھاتے رہے لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیتے رہے کہ وہ شعر و سخن میں کم وقت صرف کریں۔ چنانچہ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

لاہور

۲۴ر فروری ۱۹۳۳ء

مائی ڈیر عباس علی خاں لمعہ

میں نہایت ممنون ہوں کہ آپ وقتاً فوقتاً اپنی نظمیں بھیجتے رہتے ہیں۔ اگر میں آپ کی اس توجہ کا ہمیشہ بر وقت شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں تو اسے میری بے رُخی پر محمول نہ فرمائیے اور یہ نہ سمجھے کہ میں اس جذبے کی جس کے تحت آپ مجھے یہ تحفہ بھیجتے ہیں پوری پوری قدر کرنے میں کوتاہی کا مرتکب ہوں۔ میں ہمیشہ انہیں بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں کیوں کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کس حد تک اپنی نظموں کو آپ معنویت یا روحانیت کا حامل بنا سکے ہیں۔ آپ میں ایک معنوی میلان پایا جاتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کا برمحل استعمال کریں۔ میرے خیال میں اردو کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ اختیار کرنے میں آپ نے بڑی دانائی سے کام لیا ہے۔ اپنی زبان غیر زبان سے ہر حالت میں بہتر ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آپ کی صحت اب اچھی ہوگی۔ کیا آپ کو بر وقت ایک گُر بتا دوں ؟
شعر و سخن میں کم وقت صرف کیجیے تو آپ کی صحت کو فائدہ پہنچے گا۔

مخلص : محمد اقبال ؒ

اس جواب سے ڈاکٹر لمعہ کی ہمت بڑھی اور انھوں نے مشقِ سخن کو جاری رکھا۔ بیماری کی حالت میں بھی شعر گوئی ترک نہیں کی۔ ایک بار ڈاکٹر لمعہ
ئی دنوں تک "نارو" جیسے جان لیوا مرض میں مبتلا رہے۔ اس حالت میں بھی آپ نے نارو پر ایک دلچسپ اور مختصر نظم لکھ کر اقبال کی خدمت
میں روانہ کی۔

نارو کے درد کا بھی عطیہ ہمیں ملا	یہ درد کیا ہے تارِ محبت کا سلسلا
ہے سوز اس میں آتشِ نمرود کا نہاں	سوزش بھی اس کی سوزِ محبت کی ہے زباں
نارو کا تار عشق کی زندہ مثال ہے	پیچیدگیوں میں اس کی قیامت کی چال ہے
بچپن سے جو کہ آتشِ نمرود میں پلا	خائف وہ درد سے کبھی نارو کے بھی ہوا

علامہ اقبال نے نظم کافی پسند کی اور ایسی سخت علالت میں بھی شعر گوئی ترک نہ کرنے پر انہیں مبارک باد دی۔ فرماتے ہیں :
" آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا۔ آپ کی طویل علالت کی خبر سن کر مجھے افسوس ہوا۔ نارو کا مرض۔ واقعی بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ صفائی کا خیال رکھیے۔ یہ اپنی مقررہ مدت پر اچھا ہوتا ہے۔ خدا سے امید ہے کہ وہ بہت جلد آپ کو شفایاب فرمائے گا۔ اتنی سخت علالت میں آپ کے مشاغل نہایت قابلِ مبارکباد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عقل و حواس پر قابو پا رہے ہیں۔ تکلیف اور خوف کا احساس آپ سے دور ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔ آپ کی نارو والی نظم بہت دلچسپ ہے"۔

(خط مرقوم یکم اگست ۱۹۳۲ء)

علامہ اقبال کا لمعہ کی نظموں کو دلچسپی سے پڑھنا، ان کے اشعار میں روحانیت اور معنویت کی تلاش کرنا اور پھر یہ کہنا کہ "آپ میں ایک معنوی میلان
پایا جاتا ہے" لمعہ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ علامہ کی اس تعریف نے لمعہ کی ہمت اور بڑھائی اور انہوں نے مشقِ سخن جاری رکھا

ڈاکٹر اقبال نے خرابی صحت کی وجہ سے لمعہ کو شعر و سخن میں کم وقت صرف کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن بعد ازاں انھوں نے جو خطوط لکھے ان سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال نے لمعہ کی شاعری کی بے حد تعریف و توصیف کی ہے اسی پر انہوں نے بس نہیں کیا بلکہ اپنی گذشتہ رائے اور مشورے میں تبدیلی کرتے ہوئے لمعہ کو شعر و سخن میں اپنا وقتِ عزیز صرف کرنے کا دوستانہ مشورہ بھی دیا نیز 'لطفِ سخن' اور 'بے ساختہ پن' پیدا کرنے کے لیے مشقِ سخن جاری رکھنے کی بالواسطہ ہدایت بھی کی۔

" محبی لمعہ صاحب۔ تسلیم
آپ کا عنایت نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ ...... آپ کے خطوط اور خیالات پڑھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس اخلاق کا شکر گزار ہوں۔ ہاں آج کل کیا مشاغل ہیں۔ آپ بھی جوان اور آپ کی شاعری بھی جوان۔ مجھے تو آپ کی نظموں میں ایک خاص جذبہ نظر آتا ہے۔ اور زبان کی سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ جاتے ہیں بلا قصد کہہ جاتے ہیں۔ اسی کا نام آمد ہے۔ یہ کیفیت من جانب اللہ ہے۔ کوشش سے حاصل نہیں ہوتی۔ رِند کہتا ہے :

مشق کر مشق تا لطفِ سخن پیدا ہو　　　خود بخود شعر میں بے ساختہ پن پیدا ہو"

(خط مرقوم ۱۹ مارچ ۱۹۳۳ء)[5]

ایک خط میں لکھتے ہیں :

" جنابِ من　　تسلیم
آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ شعر و سخن میں اپنا وقتِ عزیز ضرور صرف کریں۔"

(خط مرقوم ۳۰ جون ۱۹۳۳ء)[6]

۶ جولائی ۱۹۳۳ء کے خط میں بھی اسی مخلصانہ مشورہ کا ذکر ہے کہ "...... آپ شعر و شاعری کا مشغلہ ترک نہ کریں۔" (اقبال نامہ حصہ اول ص ۷۷)

ایک اور خط میں علامہ اقبال، لمعہ کے کلام میں پائی جانے والی معنویت اور وجدان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مکرم بندہ۔ تسلیم
...... میں نے آپ کا کلام دیکھا ہے اور تازہ ترنظمیں بھی۔ مجھے شعریت سے زیادہ معنویت نظر آئی۔ اور میں بے حد متاثر ہوا۔ میری یہ خواہش ہے کہ اس قدرتی عطیہ کو آپ بہترین طریقے سے استعمال کریں۔ آپ کے اکثر اشعار وجدان کے حامل ہیں"۔

خط مرقوم یکم دسمبر ۱۹۳۶ء[8]

ڈاکٹر لمعہ کو فنِ شاعری سے زیادہ واقفیت نہیں تھی بلکہ وہ بقول مولانا روم اکثر کہا کرتے تھے " من نہ دانم فاعلاتن فاعلات"۔ مگر فارسی اور انگریزی ادبیات پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ ان کی طبیعت میں شاعری کا ملکہ فطری تھا۔ وہ شعر و سخن کے لیے موزوں طبیعت رکھتے تھے۔ یہ ایک خداداد عطیہ تھا۔ اس خصوصیت کو فارسی شاعر انوری نے 'فیضِ یزدانی' سے تعبیر کیا ہے جس کے بغیر سچی شاعری تکمیل نہیں پاتی ہے :

شاعری را سہ چیز می باید　　　تا کہ اشعار بر مراد آید
طبع و تحصیل و فیضِ یزدانی　　　ہر کرا نیست ژاژ می خاید

اس خصوصیت نے لمعہ کی شاعری کو معنویت اور وجدان عطا کیا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر لمعہ کو فنِ عروض سے بہت کم واقفیت تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ علامہ اقبال ان کے کلام پر اصلاح دیں۔ اس طرح فنِ عروض اور شعر کی نزاکتوں اور باریکیوں سے بھی آگاہی ہو جائے۔ لمعہ کا یہ حال تھا جو کچھ دل پر گزرتی تھی اُسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر لیتے تھے اور نظرِ ثانی کیے بغیر علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کر دیتے تھے۔ جب کلام پر اصلاح کے لیے اصرار حد سے　　پڑھا تو علامہ نے

بھی اُن کے کلام پر توجہ دینا شروع کیا۔ علامہ جہاں ضرورت ہوتی کلام میں درستی اور اصلاح کر دیتے اور کلام کے متعلق اپنی رائے کا بھی اظہار فرما دیتے۔ لمعہ بعض اوقات اپنا کلام بیاض میں نقل کرکے پوری بیاض اصلاح کے لیے علامہ کی خدمت میں ارسال کر دیتے۔ ایک خط میں علامہ تحریر کرتے ہیں :

مجی لمعہ صاحب سلمہٗ۔ تسلیم
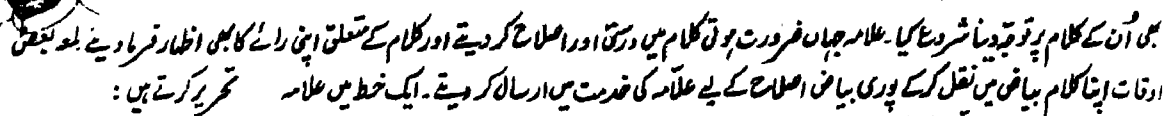
ابھی محبت نامہ صبح صبح ملا۔ حالانکہ میرے لب تبسم آشنا نہیں ہیں تاہم آپ کے خط سے متحرک ہو جاتے ہیں۔ آپ کی نثر بھی نظم سے کم نہیں ہوتی۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ !

آپ کی نظم و نثر کی بیاض محفوظ ہے۔ کہیں کہیں درست کرنے کی ضرورت پڑی۔ واپس کرنے میں خوف ہو رہا ہے۔ کیا واپس ہی کر دوں ؟ لیکن پہنچنے نہ پہنچنے کا میں ذمہ دار نہیں۔ یا رہنے دیجیے جب آپ سے ملاقات ہوگی دست بدست لے لیجیے۔ بہرحال جو مناسب ہو مطلع کیجیے۔

آپ کے مشاغل کیا ہیں ؟ کیا شاعری جاری ہے ؟ کبھی کبھی جب طبیعت لگے ضرور شعر کہیے۔ آپ کی طبیعت شاعری کے لیے مناسب ہے اور آپ کی نظموں میں مجھ کو لطف آتا ہے .... خدا نے آپ کو ادب کی خدمت مخلوق کی خدمت [ڈاکٹری] کے ساتھ ساتھ کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور جوانوں کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے

(خط مرقوم ۲۱ جون ۱۹۳۵ء) ۸

اسی خط میں علامہ اقبال نے لمعہ سے کہا تھا کہ ... "چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی نثر میں لکھیے۔ آپ کی نثر بھی دلچسپ ہوتی ہے۔" چنانچہ لمعہ کی بیاض نثر و نظم دیکھنے کے بعد علامہ نے جو رائے دی ہے وہ اس قدر بلیغ ہے کہ لمعہ کی پوری شاعری اور نثر نگاری کی روح اس میں سما گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور بہتر اور کوئی رائے نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :

" .... آپ کے افسانے اور کلام بعد مطالعہ واپس کر رہا ہوں۔ ماشاء اللہ خوب ہیں۔

رموزِ فطرت کا ایک مبصر تیرے خیالوں میں گا رہا ہے — تو خود شناسی سے اپنی دنیا کو، رازِ انساں بتا رہا ہے

(خط مرقوم ۱۲ اپریل ۱۹۳۴ء) ۹

لمعہ کی شاعری کے متعلق علامہ اقبال کے تعریفی و توصیفی کلمات پر چند تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے تعجب ۱۰ کا اظہار کیا ہے۔ یہاں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اقبال نے کافی غور و فکر کے بعد لمعہ کی شاعری پر اپنی رائے دی ہے۔ ابتدا میں اقبال نے لمعہ کو شعر و سخن میں کم وقت صرف کرنے کا مشورہ دیا۔ اصلاحِ کلام سے معذرت کی۔ بعد ازاں تین چار سال مشقِ سخن ہو جانے کے بعد اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور کلام میں پائی جانے والی معنویت اور وجدان کی تعریف کی۔ جب علامہ کو یقین ہو گیا کہ لمعہ میں شعر کہنے کی صلاحیت موجود ہے اور اشعار میں معنویت، آمد اور وجدانی کیفیت ملتی ہے تب انھوں نے لمعہ کو شعر و سخن میں اپنا وقتِ عزیز صرف کرنے کا مشورہ دیا۔ اس لیے لمعہ کی شاعری سے متعلق اقبال کے تعریفی و توصیفی کلمات کو 'خیالِ خاطرِ احباب' کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ کلمات تعجب انگیز کہے جا سکتے ہیں ہاں — یہ بات یقیناً تعجب انگیز اور حیرت میں ڈالنے والی ہے کہ اقبال جیسے عظیم فلسفی شاعر نے جس شخص (لمعہ حیدرآبادی) کی شاعری کی اس قدر تعریف و توصیف کی ہے وہ اردو داں طبقے کے لیے نہایت غیر معروف رہا اور بقول نظر حیدرآبادی "اقبال سا شاعر جن کی صلاحیتوں کا معترف ہے وہ حیدرآباد میں بھی اتنا ہی گمنام رہا۔" ۱۱

یہ گمنامی لمعہ کی زندگی کا ایسا مقدر بنی کہ اس حالتِ گمنامی میں وہ دیول گاؤں ماہی (ضلع بلڈانہ برار) جیسے غیر معروف مقام پر ۶ مارچ ۱۹۸۳ء کو ۶۷ سال کی عمر میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ نہ کسی اخبار و رسالے میں اُن کے انتقال کی خبر شائع ہوئی اور نہ ادبی حلقوں میں رنج و غم کا اظہار ہوا اور نہ کسی نے خراجِ عقیدت پیش کیا۔

علامہ اقبال کو نوجوان عقیدت مند لمعہ سے محبت تھی۔ وہ اُن کی شاعری کو نہ صرف سراہتے تھے بلکہ اُن کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے اور مفید مشوروں سے بھی نوازتے تھے۔ ایک خط میں لمعہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں :

"........ مشق کیے جایئے اور جو کچھ آپ کا ضمیر آپ کو لکھائے فوراً قلمبند کر لیا کریں"........
(خط مرقوم ۷ جولائی ۱۹۳۵ء) [۱۶۲]

علامہ اقبال نے لمعہ کو مشقِ سخن ہی کا مشورہ نہیں دیا بلکہ انہیں اچھے شعر کی خوبیوں سے بھی آگاہ کیا اور فنِ شاعری کے اسرار و رموز سے بھی باخبر کیا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۳۴ء کے مکتوب میں قدیم و جدید شاعری پر بحث کرتے ہوئے لمعہ کو نہایت مفید مشوروں سے نوازا ہے:

"........ آپ کے جواہر پارے گنجِ سخن میں محفوظ ہیں اور میں دیکھ کر محظوظ ہو رہا ہوں خدا کرے آپ کو شاعری کے لیے کافی مہلت مل جائے۔ سنیے۔ غزل اور رباعی کے لیے قافیہ کی شرط تو لازمی ہے اگر ردیف بھی بڑھا دی جائے تو سخن میں اور بھی لطف بڑھ جاتا ہے۔ البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں۔ قافیہ تو ہونا چاہئے۔

اب کچھ عرصے سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے جس کا نام انگریزی میں بلنک ورس ہے جس کو "نثرِ مرجز" کہنا چاہئے۔ اگر پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے مگر میرے خیال میں یہ روش آئندہ مقبول نہ ہو گی۔ نظموں کے لیے اولاً سبجکٹ اور مضامین تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ نیچرل مضامین تو سبجکٹ ہی کے اعلیٰ انتخاب سے کچھ لطف دیتے ہیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ حتی الامکان آپ کی نظمیں اس خصوصیت سے مالا مال ہوتی ہیں۔ کلام کی پختگی تو اب بھی آپ کے خیالات میں موجود ہے اور مشق سے ہوتے ہوتے حاصل ہو گی۔

قدیم شاعری اور جدید شاعری کا سوال بھی سرمایۂ ادب کا ایک سبجکٹ ہو گیا ہے۔ میں فقط فرسودہ مضامین کی حد تک قدیم و جدید کی بحث کو مانتا ہوں۔ شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذباتِ انسانی اور کیفیاتِ قلبی اللہ کا دین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبعِ موزوں اس کے ادا کرنے کے لیے پُر اثر الفاظ تلاش کرے۔ نظم کے اصناف کی تقسیم جو قدیم سے ہے ہمیشہ رہے گی اور انسانی جذبات ماحول کے تابع رہیں گے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں وہ جدید رنگ کا حامل متصور ہو سکتا ہے نہ کہ نفسِ شعری! اگر ہم نے پابندیٔ عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا اور اسی نقطۂ خیال سے یہ کہنا پڑے گا اور یہ کہنا درست ہے کہ موجودہ شعرا کا کام تعمیری ہونا چاہئے نہ کہ تخریبی۔" [۱۶۳]

یہ خط ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس خط سے اقبال کے نظریۂ شاعری نیز جدید شاعری بالخصوص بلا ردیف و قافیہ نظموں یا آزاد شاعری سے متعلق خیالات کا علم ہوتا ہے۔ اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی کے سخت خلاف تھے اور اسے تخریب کاری سمجھتے تھے۔ اُن کی نظر میں شاعری کی جان جذبات و احساساتِ قلبی کا پُر اثر اندازِ بیان اور بلندیٔ مضامین ہے۔ اس معیار و کسوٹی پر ہی انھوں نے لمعہ کے کلام کو پرکھا تھا جب انھیں لمعہ کے کلام میں علوئے تخیل، بلندیٔ مضامین، خیالات میں پختگی، طبیعت میں موزونیت اور کلام میں وجدانیت نظر آئی تب انھوں نے مناسب جانا کہ فنِ شاعری سے ناواقفیت کی بنا پر جو خامیاں رہ گئی ہیں انہیں درست کریں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ "علامہ اقبال جو ہمیشہ اصلاحِ سخن سے پہلو تہی کرتے تھے وہ لمعہ کو نہ صرف اپنے مشوروں سے مستفید کرتے ہیں بلکہ مسلسل اصلاحیں بھی دیتے ہیں۔" [۱۶۴]

علامہ اقبال نے لمعہ کی ایک نظم پر جو اصلاح دی ہے وہ اقبال نامہ میں درج ہے۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لمعہ میں شعر کہنے کی صلاحیت تھی۔ علامہ اقبال اس نظم کے متعلق لکھتے ہیں:

"مجی۔ تسلیم

آپ کی نظم آج ہی ملی۔ دیکھ کر آج ہی واپس کر رہا ہوں۔ بار بار پڑھا۔ بڑا لطف آیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ........
(خط مرقوم ۲۰ اگست ۱۹۳۶ء) [۱۶۵]

اب ذرا وہ نظم اور علامہ کی اصلاح ملاحظہ کیجئے:

لمعہ ہے نیپشن ہے اور آرزوئے وصال ہے — مشقِ خرام نیپشن، موسمِ برشگال ہے ← ن

ساحلِ نیپشن پہ آج عشق کا اور حال ہے — لب پہ سرودِ سرمدی حسن سے قیل و قال ہے

موجیں ہیں نغمہ زن اِدھر ابر اُدھر ہے اشکبار — دونوں کی کشمکش میں آج حسن بھی پائمال ہے ن ۔ ذوق

بربط دل میں لمعہ کے نغمے ہیں وہ سنے سُنے — جس کا خدا ہے کارساز جس میں خودی کا حال ہے

سوزشِ عشق نے مری شمع کو بھی سمجھا دیا — میرے ہی صدائے درد میں ہے تو یہی کمال ہے

علم کی جان و جسم میں میرا قیام ہے مدام — آنکھ میں شمس ہے اگر دل میں مرے جلال ہے

مجھ سے گنہگار پر آج رسے تری نوازشیں — دل بھی دیا دماغ بھی جان بھی ہے نہال ہے

اس کے سوا نہیں کوئی اور تو آرزو میری — وصل ہو دید کا مجھے، دید میرا وصال ہے

جان کے دل کا راز وہ مجھ سے پوچھتے ہیں پھر — آپ چھپا رہے ہیں کیوں آپ کا کیا سوال ہے ← ن

دل بھی دیا دماغ بھی جاہ بھی اور منال بھی — مری اگر ہے کوئی شئے آرزوئے وصال ہے

عشقِ مجاز نے مجھے ذوقِ طلب عطا کیا — دل میں جگر میں آنکھ میں ایک ترا خیال ہے

عرشِ خیال شعر پر لمعہ ہے آج جلوہ گر — نوکِ قلم سے زرفشاں رازِ خودی کا حال ہے" [۱۶]

'ن' کی علامت کے ذریعے علامہ اقبال نے اس نظم میں جہاں جہاں اصلاح کی ہے اُسے بغور ملاحظہ کیجئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے جہاں ضرورت لازم ہوئی وہیں اصلاح کی ہے لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ شاعر کا تخیل مجروح نہ ہونے پائے۔

میری محدود معلومات کے مطابق اس نظم کے علاوہ علامہ اقبال کے اصلاحِ سخن کا کوئی اور نمونہ اب تک منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔ اس اعتبار سے لمعہ حیدرآبادی واحد شاعر ہیں جنہیں علامہ اقبال نے اصلاحِ سخن سے نوازا۔ اور یہ بات یقیناً چونکا دینے والی ہے۔ کیوں کہ اقبال کے تمام سوانح نگار اور نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ انھوں نے نہ کسی کو اپنا شاگرد بنایا نہ کسی کے کلام پر اصلاح دی۔ [۱۷]

علامہ اقبال نے لمعہ کے کلام پر باقاعدہ اور مسلسل اصلاحیں دی ہیں اس کا ثبوت مندرجہ ذیل مکاتیب کے مطالعہ سے ملتا ہے:

"..... آپ کا کلام میرے حدِ مذاق تک بہت پُرلطف ہے۔ اس کی اشاعت میں تامل کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ آپ کے شوق کی بات ہے۔ میں نے حتی الامکان جہاں جہاں ضرورت معلوم ہوئی ترمیم کی ہے لیکن آپ کے تخیل کو مجروح ہونے سے بچایا ہے۔ طبع کے وقت مکرر غور بھی ممکن ہے اور انتخاب بھی۔ یہ سب چیزیں بالمشافہ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔"
(خط مرقوم ۲۲ مارچ ۱۹۳۵ء) [۱۸]

"..... آپ کی نظم و نثر کی بیاض محفوظ ہے۔ کہیں کہیں درست کرنے کی ضرورت پڑی...... آپ کی طبیعت شاعری کے لیے مناسب ہے اور آپ کی نظموں میں مجھ کو لطف آتا ہے......."
(خط مرقوم ۲۱ جون ۱۹۳۵ء) [۱۹]

"...... میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں...... آپ کی تازہ نظم پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے......"
(خط مرقوم ۱۰ فروری ۱۹۳۵ء) [۲۰]

علامہ اقبال نے لمعہ کے کلام پر نہ صرف اصلاحیں دیں بلکہ انتخابِ کلام میں بھی رہنمائی فرمائی اور مجموعۂ کلام کے لیے نام بھی تجویز فرمایا۔ لمعہ کے نام ایک خط میں علامہ لکھتے ہیں:

"..... رجسٹر اور خط موصول ہوا نظمیں ایک جگہ سب کی سب محفوظ ہیں۔ انتخاب آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ نظم ہو یا غزل مختلف مضامین کی حامل ہوتی ہیں اور ناظرین یا سامعین کی طبائع مختلف۔ اس لئے میرے خیال میں اشعار کا انتخاب مشکل کام ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کلام مدارج کے لحاظ سے منتخب کیا جائے۔ آپ کا ایک خاص

رنگ ہے اور آپ کے اکثر اشعار ایک وجدانی کیفیت رکھتے ہیں۔ اپنے مجموعۂ کلام کے لئے آپ نے جو نام تجویز فرمائے ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے اور سب نام ایک سے ایک بہتر! نظرِ انتخاب کہیں جمتی نہیں۔ میری رائے میں آپ اپنے جملہ کلام کو ایک ہی نام سے معنون کریں اور جلد اوّل دوّم سے موسوم کریں ۔ "تقدیرِ امم" موزوں نام ہے۔۔۔"

(خطِ مرقوم ۲ فروری ۱۹۲۲ء) [۱۲]

علامہ اقبال کا لمعہ کی شاعری کو پسند فرمانا، ان کی طبیعت کی موزونیت کا اعتراف کرنا، ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونا، انھیں مفید مشوروں سے نوازنا، انھیں شعر و سخن میں زیادہ وقت صرف کرنے کی تلقین کرنا، ان کے کلام کی نہایت بلیغ انداز میں تعریف و توصیف کرنا، ان کے کلام پر باقاعدہ اور مسلسل اصلاحیں دینا، بیانِ نثر و نظم کو درست کرنا، انتخابِ کلام میں رہنمائی فرمانا اور مجموعۂ کلام کے لیے نام تجویز کرنا ـــــ شاید ہی علامہ نے کسی نوجوان سے اتنی شیفتگی اور محبت کا اظہار کیا ہو۔ یہ وہ اعزاز ہے جو شاید ہی علامہ اقبال کے کسی عقیدت مند کو نصیب ہوا ہو۔

ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی واحد شاعر ہیں جنھیں اقبال نے اصلاحِ سخن سے نوازا ہے۔ اس لحاظ سے لمعہ کو اقبال کے حقیقی معنوں میں شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اگر تحقیقِ بسیار کے بعد علامہ اقبال کے اور تلامذہ نکل آئے تب بھی اُن میں لمعہ حیدرآبادی کا مقام سب سے بلند ہوگا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ علامہ اقبال کی انقلاب پسند طبیعت اُستاد شاگردی جیسی رسم کی قائل نہیں تھی۔ اس لیے اگر انھوں نے کسی کے کلام پر اصلاح دی تو یہ اعلان نہیں کیا کہ وہ میرا شاگرد ہے۔ جس طرح غالب، ذوق، آتش، ناسخ، داغ، امیر مینائی اور سیماب جیسے اُستادانِ سخن کے تلامذہ کی لمبی لمبی فہرستیں ملتی ہیں ویسے علامہ اقبال کے تلامذہ کی کوئی فہرست نہیں ہے۔ لیکن سوائے لمعہ حیدرآبادی کے اب تک کسی اور شاعر کا ایسا کلام سامنے نہیں آیا جس پر علامہ اقبال نے اصلاح دی ہو۔ اور وہ بھی مسلسل اور باقاعدہ۔ اس لیے لمعہ حیدرآبادی کو 'تلمیذِ اقبال' کہنا حقیقت کے عین مطابق ہوگا۔

اقبال اور ٹیگور :۔ علامہ اقبال اور ٹیگور ہندوستان کے وہ جامع الکمال شعرا ہیں جن کے افکار و نظریات نے صرف ہندوستانی ادب ہی کو نہیں بلکہ عالمی ادب کو بھی متاثر کیا۔ حالانکہ ان دونوں کے افکار و نظریات میں بیّن فرق ہے اور دونوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں ہے" [۱۳] دونوں آفاقی شاعر اور ہم عصر ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ناآشنا تھے۔ ان کے درمیان کوئی مراسم نہ تھے۔ دونوں محبِ وطن تھے اور ان کے قومی ترانے "جن گن من ۔۔۔" اور "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پورے ہندوستان میں مقبول تھے اور آج تقسیمِ ملک کے بعد بھی ان کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ اقبال کے ترانے کو آکاش وانی اور دوردرشن پر جو مرتبہ حاصل ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہ حاصل ہوا۔

دورِ غلامی میں انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" پالیسی نے ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر کچھ اثر ڈالا تھا کہ دل و نظر میں کشادگی کی جگہ تنگی آگئی تھی۔ ہر مسئلہ کو چاہے وہ ادب و شعر سے متعلق کیوں نہ ہو، فرقہ وارانہ عینک سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں بعض تنگ نظر نقاد اور سیاستدان ٹیگور اور اقبال جیسے محبِ وطن اور آفاقی شعرا کا موازنہ کر رہے تھے اور انہیں ایک دوسرے کا حریف و رقیب ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان دونوں شاعروں کے درمیان کوئی قدرِ مشترک نہ تھی اس لیے موازنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسی زمانے میں ٹیگور اور اقبال کے نام سے ایک کتابچہ شائع ہوا جس میں دونوں کا موازنہ کیا گیا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس قسم کے موازنے کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ صحیح اور بے لاگ ہے:

> "آج کل بعض سخن سنج اقبال کے کلام کا مقابلہ ہندوستان کے ایک دوسرے نامور اور فخرِ ہندوستان شاعر ٹیگور کے کلام سے کرتے ہیں۔ ٹیگور کے کلام میں بے شک پریم رس گھلا ہوا ہے۔ اس کی محبت عالمگیر ہے۔ وہ تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے۔ اس کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسکین اور روح میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں وہ آگ نہیں جو اقبال میں ہے۔ ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن۔ ٹیگور کا جذبۂ محبت گو بہت گہرا اور بے تھاہ ہے لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر بھی آگے نہیں نکل جاتا اور باوجود کیف و وجد کے آپے سے باہر نہیں ہونے پاتا۔ اقبال کا مطمحِ نظر اگرچہ مقابلتاً محدود ہے مگر زیادہ قوی، زیادہ پُرزور، اور زیادہ شورانگیز ہے۔ ٹیگور کے ہاں نازک سے نازک موقع پر بھی عقل کی پرچھائیں آس پاس ضرور نظر آتی ہے۔ مگر یہاں جذبات کے تلاطم کے سامنے بعض

اوقات بیچاری عقل اپنی آبرو بچانے کے لیے اُچک کر الگ جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں جذب و کیفیت کے ساتھ خودداری ہے اور یہاں وارفتگی شیفتگی ہے

با ہر کمال اند کہ آشفتگی خوش است　　　ہر چند عقل کُل شدۂ بے جنوں مباش [۲۳]

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ٹیگور اور اقبال کی راہیں الگ الگ تھیں۔ دونوں کی شاعری کا رنگ و آہنگ جُدا جُدا تھا۔ اس کے علاوہ دونوں میں نظریاتی اختلاف تھا۔ ایسی کوئی بنیاد نہ تھی کہ دونوں کا موازنہ کیا جاتا۔ پھر بھی اس دور کے تنگ نظر نقاد ناگوار قسم کا موازنہ کر رہے تھے۔ ایسے منافرت انگیز ماحول میں ڈاکٹر لمعہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دونوں کو ملانے کی کوشش کی۔ ان کے درمیان ہونے والے ناگوار موازنے کا خاتمہ کیا اور ان کے درمیان پیدا غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ لمعہ کو اقبال اور ٹیگور دونوں سے محبت و عقیدت تھی اور دونوں سے اُن کے نہایت مخلصانہ مراسم تھے۔ جس طرح لمعہ اپنا اردو کلام علامہ اقبال کی خدمت میں بغرض اصلاح روانہ فرماتے تھے اسی طرح انگریزی کلام پر وہ گرودیو ٹیگور سے اصلاح لیتے تھے۔ ٹیگور نے بھی اقبال کی طرح لمعہ کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اُن کی انگریزی شاعری کی تعریف و توصیف کی ہے۔ لمعہ، اقبال کی خدمت میں اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی نظمیں بھی ارسال کرتے تھے اور ان نظموں سے متعلق ٹیگور کی رائے سے بھی انہیں آگاہ فرماتے تھے اس طرح وہ ٹیگور اور اقبال کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور متعارف کرانے کی بالواسطہ کوشش کر رہے تھے۔ ایک خط میں علامہ اقبال، لمعہ کو لکھتے ہیں :

"...... آپ کی انگریزی نظموں کا مجموعہ میں نے بغور دیکھا ہے اور ٹیگور کے خطوط بھی۔ ٹیگور آپ سے بے حد خوش ہیں
اور کیوں نہ ہوں انگریزی زبان پر بھی آپ کو اچھا خاصا عبور ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ مشق کیے جائیے اور جو کچھ آپ
کا ضمیر آپ کو لکھائے فوراً قلمبند کر لیا کریں ......"　　(خط مرقوم ۷ جولائی ۱۹۳۵ء) [۲۴]

لمعہ اکثر اپنے خطوط میں ٹیگور کو اقبال کی شاعری سے متعارف کراتے رہتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اقبال کا غائبانہ تعارف ٹیگور سے کروا دیا تھا۔ لمعہ نے ایک خط میں ٹیگور اور اقبال کی شاعری میں پائے جانے والے ایک خاص اندرونی تعلق کو واضح کرتے ہوئے ٹیگور سے فرمائش کی کہ وہ اس اعتبار سے کلامِ اقبال کا ضرور مطالعہ کریں۔ اس خط میں انھوں نے ٹیگور کو موجودہ حالات سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ بعض تنگ نظر دونوں کے متعلق کیسی کیسی غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں اور کس قسم کا ناگوار موازنہ کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ٹیگور سے گذارش کی کہ وہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ فرمائیں۔ [۲۵]

اس خط کے جواب میں ٹیگور نے جو خط لمعہ کو لکھا وہ یادگار حیثیت کا حامل ہے۔ یہ خط بقول شیخ عطاء اللہ ـــــ "اقبال اور ٹیگور کو حریف و رقیب ثابت کرنے والوں کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے"۔ [۲۶] اس خط سے اقبال اور ٹیگور کے درمیان کیے جانے والے "ناگوار موازنہ" کا نہ صرف خاتمہ ہوا بلکہ غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوا۔ اس خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ٹیگور کے دل میں اقبال کے لیے کتنی عزت و عظمت تھی! "اس خط میں ٹیگور نے عظیم ادب اور عظیم شاعری کے بارے میں مختصراً جو اشارے کیے ہیں، علامہ اقبال کی شاعری کی جو تعریف کی ہے اور اُن کے بلند ادبی مرتبے کا ذکر جس پُر خلوص لہجے میں کیا ہے اس کی وجہ سے یہ مکتوب ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے"۔ [۲۷]

ٹیگور کا یہ خط انگریزی میں ہے اور میری محدود معلومات کے مطابق اب تک اصل انگریزی خط کہیں نہیں شائع ہوا ہے۔ صرف اس خط کا ترجمہ دیباچۂ اقبال نامہ [حصّہ اوّل، سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ شمارہ اکتوبر ۱۹۶۱ء] اور نیرنگِ خیال [لاہور] کے اقبال نمبر میں شائع ہوا ہے۔ راقم نے ڈاکٹر لمعہ کے پاس اصل خط دیکھا تھا اور اُسے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا تھا۔ اور اسی مضمون میں اس خط کا وہ اُردو ترجمہ دیا تھا جو نیرنگِ خیال کے "اقبال نمبر" میں اور اس کے حوالے سے سہ ماہی فکر و نظر [علی گڑھ] میں شائع ہوا تھا۔ ذیل میں اس خط کا وہ ترجمہ دیا جا رہا ہے جو اقبال نامہ حصّہ اوّل کے دیباچے میں شیخ عطاء اللہ نے شائع کیا ہے۔ شاید انھوں نے ہی یہ ترجمہ کیا ہے :

" آپ کے نوازش نامے اور نظم نے میرے دل پر خاص اثر کیا مجھے یہ معلوم کر کے بے پایاں مسرت ہوئی کہ آپ اپنے
شاعرِ اعظم سر محمد اقبال کے کلام اور میری نظموں میں ایک ربطِ باطنی محسوس کرتے ہیں۔ ان زبانوں سے جن میں اقبال
شعر کہتے ہیں، نا واقفیت کی بنا پر اُن کی قوتِ تخلیق کی گہرائیوں تک نہ تو میری رسائی ممکن ہے اور نہ ہی میں اُن کے

کلام سے متعلق کوئی رائے پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ لیکن اقبال کی نظموں کو جو شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی ہے اس کی بنا پر مجھے یقینِ واثق ہے کہ اقبال کے ان جواہر پاروں میں ادبِ جاوداں کی عظمت و تابناکی موجود ہے۔
میرے لیے یہ خیال بارہا باعثِ اذیت ہوا ہے کہ بعض نقاد میری اور سر محمد اقبال کی ادبی کاوشوں کو حریفانہ اور رقیبانہ میزان پر جانچ کر غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ادب سے متعلق جس کا خطاب جملہ بنی نوعِ انسان سے ہو یہ روش حد درجہ مذموم ہے کیونکہ ادبِ عالمگیر کی مملکت میں بلا لحاظِ زمان و مکان شعراء و اصحابِ فنون کی ایک انسانی برادری معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔
مجھے یقین ہے کہ سر محمد اقبال اور میں ادب میں حُسن و صداقت کے دو خدمت گار ہیں اور ہم اُس سرحد پر مل جاتے ہیں جہاں سے انسانی دل و دماغ اپنا بہترین و جمیل ترین ہدیۂ جاوداں عالمِ انسانیت کے حضور میں پیش کرتا ہے۔"

ڈاکٹر لمعہ نے اقبال اور ٹیگور میں ملاقات کروانے کی بھی کوشش کی۔ جب لمعہ کو معلوم ہوا کہ ٹیگور لاہور تشریف لے جا رہے ہیں تو انھوں نے ایک خط کے ذریعے فرمائش کی کہ وہ اقبال سے ضرور ملاقات کریں۔ چنانچہ ٹیگور لاہور پہنچنے پر اقبال کی مزاج پرسی کے لیے اُن کے گھر گئے۔ مگر سوءِ اتفاق سے علامہ اقبال اس وقت لاہور میں موجود نہ تھے۔ علامہ اقبال نے لمعہ کے نام ایک خط میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے:

"......... آپ کی ایما پر ٹیگور میری مزاج پرسی کے لیے لاہور آئے تھے مگر میں لاہور میں موجود نہ تھا اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ انہیں مطلع کر دیجئے ......"

(خطِ مرقوم ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء) [۲۹]

مندرجہ بالا خطوط سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اقبال اور ٹیگور کے درمیان ڈاکٹر لمعہ کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ بقول نظر حیدرآبادی "لمعہ کی سعی و کوشش سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا اور ٹیگور لاہور کے دورانِ قیام میں اقبال کی مزاج پرسی کے لیے اُن کے گھر گئے۔" [۳۰] بہر حال جب بھی کوئی سوانح نگار یا نقاد ٹیگور اور اقبال کے تعلقات کا ذکر کرے گا لمعہ کی خدمات کو فراموش نہ کرے گا۔

لمعہ حیدرآبادی کی نثر نگاری

اقبال نامہ میں لمعہ کے نام خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لمعہ نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ بلند پایہ نثر نگار اور انشاء پرداز بھی تھے۔ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ وہ مجموعۂ کلام جس کا نام خود علامہ اقبال نے "تقدیرِ اُمم" تجویز کیا تھا اور جس پر نظرِ ثانی کی تھی اس کے بھی شائع ہونے کی اب تک نوبت نہیں آئی ہے۔ لیکن نثری شہ پاروں اور انشائیوں کا ایک مجموعہ پریم رس کے نام سے سر عبد القادر مرحوم ایڈیٹر مخزن لاہور کی زیرِ نگرانی مخزن اردو پریس لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ نثری کتاب لمعہ کی زندگی ہی میں شائع ہوئی تھی۔ اب یہ کتاب نایاب ہے۔ اس کا صرف ایک نسخہ ایوانِ ادبیات اُردو حیدرآباد میں موجود ہے۔ لمعہ کے پاس بھی ایک ہی نسخہ رہ گیا تھا جسے راقم الحروف نے ملاحظہ کرنے کے بعد لوٹا دیا تھا۔
پریم رس کا دیباچہ حکیم یوسف حسن [ایڈیٹر نیرنگِ خیال لاہور] نے لکھا ہے۔ سر شیخ عبد القادر، مولانا محمد علی جوہر، مولانا مناظر احسن گیلانی، نیاز فتحپوری، بابائے اردو عبد الحق، احسن مارہروی، مولانا عبد الماجد دریا آبادی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور جیسے مشاہیرِ علم و ادب نے اس کتاب پر اپنی قیمتی رائیں دی ہیں۔ ان مشاہیرِ ادب نے لمعہ کی نثر نگاری اور اسلوبِ بیان کی تعریف و توصیف کی ہے۔ [۳۱]
علامہ اقبال نے بھی اپنے خطوط میں لمعہ حیدرآبادی کی نثر نگاری کو سراہا ہے:

"....... آپ کے افسانوں اور مثنوی سے میں نے استفادہ حاصل کیا ہے۔ افسانے نہایت دلکش اور موثر ہیں۔ زبان شستہ ہے ......"

(خط مرقوم ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء) [۳۲]

"...... آپ کی نثر بھی نظم سے کم نہیں ہوتی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ..... چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی نثر میں لکھئے۔ آپ کی نثر بھی دلچسپ ہوتی ہے ......"

(خط مرقوم ۲۱ جون ۱۹۳۵ء) [۳۳]

"...... آپ کے افسانے اور کلام بعد مطالعہ واپس کر رہا ہوں۔ ماشاء اللہ خوب ہیں۔

رموزِ فطرت کا ایک مبصر ترے خیالوں میں گا رہا ہے   تو خود شناسی سے اپنی دنیا کو رازِ انساں بنا رہا ہے" [۳۴]

(خط مرقوم ۱۲ اپریل ۱۹۳۴ء)

مولانا محمد علی کے بارے میں اقبال کا ایک اہم مکتوب

اقبال نامہ میں لمعہ حیدرآبادی کے نام بعض ایسے خطوط ہیں جن سے اقبال کے سیاسی طرزِ فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ اقبال محبِ وطن فرور تھے مگر وہ وطن کو خدا بنا دینے کے سخت خلاف تھے۔ کیونکہ اس نیشنلزم نے یورپ میں جو تباہ کن اثرات پھیلائے اس سے اقبال اچھی طرح آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مولانا کی نیشنلسٹ سیاست کی کبھی تعریف نہیں کی۔ نظر حیدرآبادی کہتے ہیں کہ "مولانا محمد علی کی ابتدائی سیاسی زندگی یعنی وطن پرستی اور نیشنل رجحانات کے بارے اقبال کی رائے ہمیشہ واضح رہی۔" [۳۵] چنانچہ مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد انھوں نے لمعہ کو جو خط لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخری سالوں میں مولانا نے نظریہ وطنیت کے متعلق اپنی جو رائے تبدیل کی تھی یہ دراصل اقبال کے سیاسی طرزِ فکر کا عملی اعتراف تھا۔ [۳۶]

لاہور

یکم فروری ۱۹۳۱ء

مائی ڈیر ڈاکٹر عباس علی خاں

نوازش نامہ اور اس کے ملفوظات کے لیے سراپا سپاس۔ مسٹر محمد علی مرحوم کا خاتمہ بخیر ہوا۔ اگرچہ میں اُن کی سیاست کا کبھی مداح نہ تھا۔ لیکن ان کی اسلامی سادگی اور آخری سالوں میں اپنی بعض آراء کے بدل لینے میں جس امانت و دیانت کا انھوں نے ثبوت دیا، بہت احترام کرتا ہوں۔ اپنے متعلق اُن کی پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی۔ اور اس سے بھی قوم میں ان کا وقار بڑھ گیا ہے۔ مسجد اقصیٰ میں آخری آرام گاہ میسر آنا اُن کی خوش نصیبی ہے جس سے ان کا مرتبہ بلند تر ہو گیا ہے۔

اب تو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے ان کا مرتبہ نہایت ارفع ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

اُمید ہے آپ آج کل سیاست سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے ہوں گے۔

مخلص

محمد اقبال [۳۷]

حوالے اور اشارے :- [۱] یہ انٹرویو ڈاکٹر لمعہ حیدرآبادی کی زندگی ہی میں لیا گیا تھا۔ لمعہ کے نام اقبال کے خطوط کی روشنی میں یہ انٹرویو تھا جو میری ذاتی ... میں آج بھی محفوظ ہے اسے کہیں شائع نہیں کیا گیا ہے۔ (اکبر رحمانی) [۲] اقبال اور حیدرآباد از نظر حیدرآبادی ص ۲۲۱ [۳] اقبال نامہ حصہ اوّل مرتبہ ... عطاء اللہ ص ۲۶۶ [۴] ایضاً ص ۲۶۹ [۵] ایضاً ۲۷۳ [۶] ایضاً ص ۲۷۱ [۷] ایضاً ص ۲۷۵ [۸] ایضاً ص ۲۷۶ [۹] ایضاً ص ۲۸۲ - ۲۸۳ ... ۲۸۷ - ۸۸ [۱۰] ایضاً ص ۲۸۱ [۱۱] اقبال اور حیدرآباد ۔۔۔ از نظر حیدرآبادی ص ۲۳۲ [۱۲] ایضاً ص ۲۳۱ [۱۳] اقبال نامہ حصہ اوّل ص ۲۸۹ - ... ایضاً ص ۲۸۰ - ۲۸۷ [۱۵] اقبال اور حیدرآباد ص ۲۳۱ [۱۶] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۹۰ [۱۷] ایضاً ۲۹۲ - ۲۹۳ [۱۸] اقبال اور حیدرآباد ص ۲۳۱ [۱۹] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۸۵ [۲۰] ایضاً ص ۲۸۷ [۲۱] ایضاً ص ۲۸۳ [۲۲] ایضاً ص ۲۷۴ - ۲۷۳ [۲۳] اقبالیات کا تنقیدی جائزہ از قاضی میاں اختر ... ص ۶۹ [۲۴] تنقیدات بعد الحق ص ۷۹ [۲۵] اقبال نامہ حصہ اوّل ۲۸۹ [۲۶] ڈاکٹر لمعہ سے ایک انٹرویو   اکبر رحمانی [۲۷] دیباچہ اقبال نامہ حصہ اول ... سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ شمارہ اکتوبر ۱۹۶۱ء [۲۸] اقبال، ٹیگور اور ڈاکٹر لمعہ حیدرآبادی اس عنوان سے میرا ایک مضمون ماہنامہ قومی زبان کراچی ... جنوری ۱۹۷۸ء، پندرہ روزہ قومی راج بمبئی کے اقبال نمبر ۲۵ دسمبر ۱۹۷۷ء اور ہما ڈائجسٹ دہلی کے اقبال نمبر اگست ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مضمون میں ٹیگور کا اصل انگریزی خط بھی شائع ہوا ہے۔ دراصل یہ خط ڈاکٹر لمعہ نے مجھے نقل کرکے دیا تھا۔ اصل خط ان کے پاس تھا (اکبر رحمانی) ... اقبال نامہ حصہ اول ۲۸۷ [۲۹] اقبال اور حیدرآباد ص ۲۳۲ [۳۰] ڈاکٹر لمعہ حیدرآبادی کی کتاب پریم رس پر جن مشاہیرِ علم و ادب نے رائیں دی ہیں

افسر سیمابی

پ: ۱۹۲۳ء ● ● م: ۱۹۶۶ء

خاورستان

قبال نے عالمی نوعیت کے موضوعات و مواد کو شعری قالب عطا کر کے جس فکری کائنات کو خلق کیا۔ لفظیات و تراکیب میں جو تجدد کیا۔ فنی سطح پر جو
ت پیدا کی وہ انھیں پر تمام نہیں ہوئی بلکہ ان کی شاعری کے اثرات ان کے بعض ہم عصر شعراء اور بعد کی نسلوں پر بھی مرتب ہوئے لیکن ہوتا یہ ہے
ی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مفسرین صرف چند نام ایک ہی سانس میں پڑھتے ہوئے تیزی سے گذر جاتے ہیں۔ وہ بغیر کسی سیاق و سباق
مفید مطلب بات کہنے میں اس قدر جانب دار ہو جاتے ہیں کہ فوری طور پر استنباط اور پھر اس کا غیر ضروری ایزاد کر کے الجھاوے ہی پیدا کرتے
ی تحریریں یا تو سوال در سوال جواب طلب بن جاتی ہیں یا پھر ان الجھی ہوئی تحریروں کو مکمل طور پر رد کرتے ہی بنتی ہے۔
گذشتہ نصف صدی سے ناموں کی یہی محدود ترین فہرست ایک مفسر سے دوسرے مفسر تک ہوتی ہوئی بغیر کسی ترمیم و اضافے کے ۱۹۸۸ء تک
ہے۔ اس محدود فہرست میں شامل شعراء کے ناموں سے ہر کوئی واقف ہے۔ ان میں بھی بعض وہ نام ہیں جنھوں نے اقبال کی شاعری سے
ملا اثر تو لیا لیکن اپنی ایک الگ راہ بھی بنائی، انفرادیت پیدا کی اور مشہور ہوئے۔
سوال یہ ہے کہ اقبال کی بڑی شاعری کے اثرات صرف چند ناموں ہی تک کیوں؟ کیا بڑی شاعری کو عظیم اور منفرد بنانے کے لیے اقبال کے

چند نئے ہم عصر شعراء کو کم تر ظاہر کیے بغیر اقبال کی شاعری بڑی شاعری نہیں بنتی ؟ میرا سوال تو یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کے نام لیے جاتے ہیں کیا
واقعی ان لوگوں نے اقبال کا تتبع کیا ، ان کی تقلید کی ؟ اقبال کی شاعری کی عظمت ان کی اپنی زندہ شاعری ہی ہے تاہم ان کی عظمتوں میں اض
کرنے والے وہ بے شمار شعراء بھی ہیں جو رسائل و کتب میں بکھرے پڑے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ختم ہوتی ہوئی بیسویں صدی کے اردو شعر و ادب کی معروضی چھان پھٹک کی ہی نہیں گئی کہ کچھ اور باکمال شعراء
نمایاں ہو سکتے۔ اقبال کی شاعری اور اس کے فکری رویوں کی تفہیم و تسلسل ان بہت سے شعراء کے بغیر ممکن نہیں جن پر توجہ نہیں دی گئی۔

میں یہاں ایک ایسے شاعر کا تعارف آپ سے کروا رہا ہوں جسے مفسرینِ اقبال نہیں جانتے۔ اس شاعر کا نام ہے افسر سیمابی (آپ :
۱۹۲۳ء - م : ۱۹۶۶ء) علامہ سیماب اکبر آبادی کے تلامذہ میں افسر سیمابی احمد نگری کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے معل
ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف اقبال کی تقلید ہی نہیں کی بلکہ ان میں اچھی شاعری کے جوہر بھی تھے۔ ان کا شعری مجموعہ خاورستان ۱۹۵۱ء میں شا
ہوا۔ اس مجموعے میں ۱۹۵ چھوٹی بڑی نظمیں شامل کی گئی ہیں چند ایک عنوانات یہ ہیں :

عصر نو ، ادراک ، عرفان ، جہاں میں ہوں ، کربلائے عصر ، ماتم امروز ، نظارگی ، صبح کاذب ، تعبیرِ تاریخ ، شاعر کا ترانہ ، آدم نو ، راگ
مآل ، گم شدہ فردوس ، خیر و شر ، ہمالہ ، احتجاج ، اے مردِ انقلاب ، بارگاہِ عشق ، سیرِ جہاں ، سورج کی آواز ، انقلاب ، ہدیہ اشک ، آثارِ
نظریے ، زندگی اور خودی ، مومن ، ضمیرِ کائنات ، اسرارِ حیات ، شکست ، شکوہ ، عقل و عشق ، یہ انسان ۔ یہ کائنات ، فراق ، کربلا ، اعلا
بغاوت ، شب خون ، لہو ترنگ ، انسان کی چیخ ، مرحلے ، انتباہ ، طلاطم ، ماتم ، افرنگ زدگی ، حدیثِ اضطراب وغیرہم ۔ ان عنوانات
اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال کے بے شمار معنوی شاگردوں میں افسر سیمابی کو اقبال کی شاعری کا کامیاب ترین مقلد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس
توثیق علامہ نیاز فتح پوری کے شامل کتاب دیباچے سے بھی ہو جاتی ہے۔

سیماب نے اپنے تلامذہ کو جہاں روایت کا شعور عطا کیا تھا وہیں اپنے دور کی شاعری کی عام نہج اور ڈگر سے ہٹ کر تخلیقی عمل کی تا
بھی کی تھی۔ اپنی تحریروں کے ذریعے ، اصلاحوں کے ذریعے ، فنی اجتہادات کے ذریعے ، اپنے شذرات و خطبات کے ذریعے اور سب سے
اپنی بے پناہ شاعری کے ذریعے نئے تخلیقی جہانوں کا پتہ دیا تھا۔ افسر سیمابی نے غالب ، اقبال اور سیماب ، ان تین بڑے شعراء کے فکر
کو اپنے آپ میں جذب کرتے ہوئے نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اقبال کا تتبع کیا۔

دبستانِ سیماب یا آگرہ اسکول سے وابستہ شعراء میں ایک دو نہیں متعدد ایسے نام ہیں جنھوں نے اپنی ایک علاحدہ شعری شخصیت :
تاہم ان شعراء نے جہاں آگرہ اسکول کی تعلیمات کو اپنی شاعری سے عام کیا وہیں اقبال کی فکری شاعری اور اس کے تازہ کار ڈکشن سے استفا
سیماب اکبر آبادی کے ہزاروں تلامذہ میں سے ایک افسر سیمابی اور ان کے شعری مجموعے خاورستان کا تعارف اور انتخاب پیش کرنے کا م
یہ ہے کہ : اردو کے ممتاز ادیب و صحافی نیاز فتح پوری کا دیباچہ خاورستان میں شامل ہے۔ نیاز فتحپوری مرحوم کی یہ تحریر نایاب تھی۔

اردو کے بے شمار ادبی رسائل و کتب میں اقبال کی شاعری کا تتبع یا تقلید کرنے والے شعراء بڑی تعداد میں موجود ہیں ، معیاری
باکمال شعراء جنھوں نے اقبال کے فکر و فن کو اپنی منزل بنایا۔ افسر سیمابی احمد نگری مرحوم ان میں سے ایک تھے۔

اقبال سے متعلق ایک وسیع ترین تحقیقی پروجکٹ یہ بھی ہے کہ دبستانِ سیماب یا آگرہ اسکول کی تبلیغ کے لیے جو ہفت روزہ اور ...
جاری ہوئے ان میں ثریا ، تاج ، پیمانہ ، ایشیا ، کنول اور شاعر جیسے تاریخ ساز رسائل کا جائزہ لیا جائے۔ شاعر کا اجراء ۱۹۳۰ء سے ...
(آگرہ سے) تک شاعر کے خاص و عام شماروں میں شعر و ادب کا جو ایک بے پناہ جہاں پوشیدہ ہے۔ اس میں بہ طور خاص دبستانِ سیما
وابستہ شعراء کی نظمیں (سیماب نے نظم کو غزل پر ترجیح دی تھی اور نظم کے فروغ کے لیے شاعر میں کئی عنوانات اور سلسلے شروع کیے تھے تا
شعراء کی نظمیں اپنی لفظیات ، آہنگ ، موضوعات اور شعریت کے اعتبار سے یا پھر فنی سطح پر کیے جانے والے تجربات میں اقبال کے فکر و
چمک موجود ہے۔

تاریخ ساز ادبی رسائل کا تحقیقی جائزہ لیا جائے تاکہ اقبال کے فکر و فن کے وسیع تر اثرات کا تعین کیا جاسکے۔

سخنہائے گفتنی

نیاز فتحپوری

اختر سیمابی کے اس مجموعۂ کلام کی آپ صرف ورق گردانی کر ڈالئے اور غور
سے پڑھئے تو بھی آپ کو کم از کم یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ اختر پڑھا لکھا شاعر ہے
رکھتا ہے پامال طرزِ ادا سے ہٹ کر کہتا ہے، اس کے خیال میں سنجیدگی و عمق ہے
ل کہنے والا ہے۔ اور اسی کے ساتھ غالباً یہ خیال بھی قائم ہوگا کہ وہ کوئی پختہ عمر کا
ن ہے لیکن جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اختر کی عمر اس وقت صرف ۲۰ سال اور
شاعری کی عمر ۱۲ سال کی ہے تو آپ کو تعجب ہوگا اور اس مشہور قول کی صحت کا
ہونا پڑے گا کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔

اختر کا نام عبدالغفور ہے اور وطن احمد نگر، ان کے والد ماجد مولوی محمد اسماعیل
احمد نگر کے اربابِ فضل و کمال میں سے تھے اور انھوں نے اپنی خاندانی روایات
ادب کو قائم رکھنے کے لئے اختر کی تعلیم میں بھی خاص اہتمام سے کام لیا، لیکن
کی عمر ابھی ۱۵ سال کی تھی کہ وہ انتقال کر گئے اور اپنے ہونہار فرزند کے ادبی عروج
دیکھ سکے۔

والد کے انتقال کے بعد گو اختر کی تعلیم کا کوئی منظم سلسلہ باقی نہ رہ سکا لیکن
ت کی طرف سے جو ذوقِ علم و ادب ان میں ودیعت ہوا تھا، اب اس نے ان کی رہبری
وران کو ایسے سنجیدہ لٹریچر کے مطالعہ کی طرف مائل کر دیا کہ غور و فکر ان کی طبیعت
بن گئی جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے جب انھوں نے شعرائے حال کے کلام کا مطالعہ
اقبال ہی پر جا کر ان کی نگاہ ٹھہری، اقبال ہی کے کلام کو دیکھ کر ان کا ذوق آسودہ
اُردو شاعری میں اقبال کی حیثیت ایک ایسے سنگِ میل کی سی ہے جس کو سبھی نظم گو
نے اپنا نشانِ منزل قرار دیا لیکن بعض تو راہ کی دشواری کو دیکھ کے فوراً پیچھے ہٹ گئے
وہ ایک قدم چلے اور واپس آئے اور بہت کم ایسے تھے، جو "شعلۂ آہنگِ خونِ منصور" ہم
کا دعویٰ کر سکے۔

اختر بھی انہیں "شعلۂ آہنگِ خونِ منصور" کہنے والوں میں سے تھے اور اس میں
نہیں کہ بڑے عزم و استقلال کے ساتھ وہ اب تک اسی وضع کو نباہتے چلے آ رہے ہیں۔
ں تو اختر کا ذوقِ شعری وراثتی چیز ہے کیونکہ ان کے دادا فقیر محمد تجلّیؔ اور چچا سلیمان
بھی احمد نگر کے قابلِ ذکر شعراء میں سے تھے لیکن اختر کا وہ مخصوص ذوق جو ان کے کلام سے
ہوتا ہے، غالباً ان کی ذاتی و انفرادی چیز ہے، کیونکہ جب ۱۹۴۳ء میں انھوں نے اپنی
ری کی ابتدا کی تو اس وقت بھی ان کی غزلوں کا رنگ یہ تھا۔

ہے منزلِ ادراکِ حقیقت اختر — دل جو ہنگامۂ باطل سے پریشاں ہو جائے
ے آیا ہوں لے اختر جنونِ تیز گام — وسعتِ عالم بقدرِ یک فغاں ہے اور بس

م اُس وقت کا ہے جب اختر کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی اور اس سے اندازہ ہو سکتا
وہ نظم نگاری ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے اور غالب یا اقبال ہی میں سے کسی
کی راہ انھیں اختیار کرنا تھی۔

اقبال نے انھیں کیوں متاثر کیا، اس کا تعلق غالباً دو باتوں سے ہے، ایک اختر
طری رفعت پسندی، دوسرے ان کا عقیدہ احساس، اور اس میں شک نہیں کہ
انھوں نے بڑی کامیابی سے اس اثر کو قبول کیا۔

اقبال کے کلام کی تین خصوصیتیں بہت نمایاں ہیں، ندرتِ بیان، خیال کی گہرائی اور دردمندانہ لب و لہجہ اور انھیں تینوں خصوصیات کو سامنے رکھ کر اختر نے نظمیں کہنا شروع کیں، وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے اس کا اندازہ دشوار نہیں، کیونکہ بعض جگہ وہ اقبال سے اس قدر قریب ہو کر گزرے ہیں کہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے مثلاً فلسفۂ خودی کے متعلق ان کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

خودی کی موت سے ہوتی ہی پرورش اس کی — وہ اختلال کہ ہیں جس میں اُمتوں کے مزار
یہی ہے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ — کہ تیری رُوح پہ طاری ہو نشۂ کردار

اقبال کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو:۔

کل شاعرِ مشرق نے کہا خواب میں مجھ سے — افسوس کہ مومن ہے غلامی پہ رضامند
ہر حال میں محکوم ہے، مغموم ہے، معذور — نہ غیر سے خورسند نہ آقا ہی سے خورسند
تُو کشورِ انجم کی حکومت کا سزاوار — کیوں تجھ پہ زمیں تنگ ہے اے مردِ ہنرمند
غمگیں نہ ہو پژمردگیٔ لالہ و گل سے — تخریب ہے اس دہر میں تعمیر کے مانند

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

خود شناسی کے عنوان سے ان کی ایک نظم کے بعض اشعار دیکھئے:۔

نگاہِ شوق میں ہے جلوہ خانۂ جبریل — یہ دشتِ سادہ کی پہنائی و ہجومِ تخیل
چمن میں لالہ و گل نے ہزار رُخ بدلے — ہنوز مقصدِ فطرت ہے تشنۂ تکمیل
وہ سرفروش مجاہد ہے بندۂ مومن — لئے ہوئے ہے جو عشقِ خودی کی تیغِ اصیل

مجاہد کے عنوان سے انھوں نے ایک نظم لکھی ہے جس میں رنگ و زبان دونوں اقبال کی ہیں:۔

مجاہد نام ہے اے دوست اس انسانِ کامل کا
مٹا دیتا ہے جو اک وار میں ہر نقشِ باطل کا
سکھاتا ہے جو گردِ راہ کو اسرارِ الوندی
جو اپنے خون سے کرتا ہے لالہ کی حنا بندی
مجاہد بے خطر ہوتا ہے مرگِ ناگہانی سے
مجاہد غسل کر سکتا ہے تلواروں کے پانی سے

الغرض اختر کا اقبال کے فلسفہ، اقبال کی زبان اور اقبال کے اندازِ بیان سے متاثر ہونا ان کی اکثر نظموں سے ظاہر ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ انھوں نے اس رنگ سے ہٹ کر کوئی نظم نہیں لکھی درست نہ ہوگا، کیونکہ علاوہ خالص ادبی رنگ کی نظموں کے بعض ایسے مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے جو اقبال کے زمانہ میں زیرِ بحث نہ تھے اور بڑی قوت کے ساتھ ان پر رائے زنی کی ہے۔

جدید ہندوستان کے آثارِ آزادی کو دیکھ کر جب وہ بے اختیار ہو جاتے ہیں تو ان کے لحن کی دلکشی کا اندازہ ہوتا ہے۔

چمن کی خاک پہ سرو و صنوبر بہم ہے | تمام جوشش بہاراں تمام سنبل ہو
ابل رہے ہیں سرور خودی کے فوارے | چھلک رہے ہیں نشاط خود آگہی کے سبو
چمک رہا ہے فضا میں خلوص کا پرچم | بسی ہوئی ہے فضا میں حیات کی خوشبو
وہ راگ چھیڑ گئی ہے نسیم نرم خرام | کہ شعلہ زن ہے رگ خار و خس میں ذوق نمو

تمام طوق و سلاسل پگھلنے والے ہیں

مہاتما گاندھی کی موت پر جو نظم انہوں نے لکھی ہے اس کے خلوص و صداقت کو ملاحظہ فرمائیے

یہ جبر و قہر کے بندے یہ شور و شر کے غلام | نہ پا سکیں گے تری زندگی کا رمز دوام
دیا ہے صلح و مساوات کا سبق تو نے | عطا کیا ہے جنوں کو نیا افق تو نے
وفا کے راگ محبت کی آگ لے کے گیا | تو اپنے ساتھ وطن کا سہاگ لے کے گیا

سیاسیات و قومیات سے ہٹ کر بھی انھوں نے بعض نظمیں کہی ہیں۔ جن میں ہلکی سی کیفیت تغزل کی پائی جاتی ہے لیکن مفکرانہ رنگ سے وہ بھی خالی نہیں

مثلاً سموم و نسیم کی نظم ملاحظہ ہو جس میں نسیم کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے:۔

ہے یہ پیغمبر فطرت اسے کہتے ہیں نسیم | اس کی چھاگل سے ٹپکتی ہے نمیء تسنیم
یاسمین و سمن و سنبل و ریحاں اس کے | ہر طرف عطر فشاں گیسوئے پیچاں اس کے
رقص کرتی ہے فضاؤں میں ترنم بن کر | ڈھل جاتی ہے لب گل پہ تبسم بن کر
اس کی ہر موج میں پیغام خود افروزی ہے | حور کے گیت کی شیرینی و دلسوزی ہے

اب اس کے مقابلہ میں سموم کی کیفیت ملاحظہ ہو:۔

ہے یہ تاراج گر انجمن سرو و سمن | چاٹ جاتی ہے شگوفوں کو یہ اندھی ناگن
اس کی ہر سانس نقیب آگ کے طوفانوں کی | ملک ہے یہ بھڑکتے ہوئے ویرانوں کی

اختر کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا محتاط شاعر ہے بہت سنبھل کر سوچ سمجھ کر کہتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پہلے ہر ہر لفظ پر غور کر لیا ہے اور پھر اس کا انتخاب کیا ہے

ندرت بیان اور جدت تشبیہ شاعری کی جان ہے لیکن بعض شعراء میں اس کا غلو اس حد تک پایا جاتا ہے کہ وہ صحت الفاظ، صحت تراکیب اور زبان و محاورہ کی خوبیوں کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اختر کا کلام اس عیب سے بالکل پاک ہے۔

وہ کوشش کرتے ہیں کہ نحوی حیثیت سے کوئی غلط لفظ ان کے قلم سے نہ نکل جائے کوئی ایسی فارسی ترکیب استعمال نہ کریں جو بے معنی یا بے محل ہو اور تشبیہات میں ندرت پیدا کرنے کے باوجود وہ حقائق کو نظر انداز نہیں کرتے، یہ تو ہوئیں ظاہری خصوصیات جن کا آج کل بہت کم خیال رکھا جاتا ہے، اب رہیں معنوی خصوصیات، سو میں سمجھتا ہوں کہ یہ زیادہ وزنی و گرانقدر ہیں۔

اختر کے یہاں باوجود اس کے کہ وہ نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، آزادی کا مفہوم مذہب و اخلاق سے روگردانی نہیں ہے بلکہ اسے ترقی انسانیت اور ارتقائے اجتماعیت کا ضروری جزو خیال کرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اسے ملایانہ تقشف و فرسودگی سے علیحدہ رکھ کر صرف کردار و عمل پر زور دیتے ہیں۔ جو اصلی روح ہے مذہب کی۔

ایسی نظموں میں جو جوش و ولولہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے وہ نتیجہ ہے اُن کے خلوص و صداقت کا اور ایک ایسی ہی دردمندی کا جس کا تعلق احساس سے نہیں بلکہ کرب احساس سے ہے۔ اپنی نظم دشت کربلا میں وہ شہادت حسین پر گریہ و زاری نہیں کرتے بلکہ اس کو کردار و عمل کا ایک پیغام قرار دیتے ہیں اور اس کی اہمیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

کسی خیال میں کھویا ہوا یہ ویرانہ | سنا رہا ہے یقین و عمل کا افسانہ
متاع زیست ہیں اک سوز اندروں یہاں | خرد ہے افسردہ اورنگ سرنگوں ہیں یہاں
یہاں خرد کو ہے احساس ناتمامی کا | گداز عشق ہے عنوان تشنہ کامی کا
یہ انجمن ہے جواں سال آفتابوں کی | رگوں رگوں ہے یہاں نبض انقلابوں کی
یہاں ہے رعشہ بر اندام نازِ حشمت و جاہ | ازل سے تا بہ ابد لا الہ الا اللہ

جمال عشق سے پردے اُٹھائے جائیں گے
یہاں کی خاک سے انساں بنائے جائیں گے

پانچویں اور چھٹے شعر کو دیکھئے ممکن نہیں کہ بغیر دل کی آواز اور روح کے احساس کے قلم سے نکل جاتے۔

عام شعراء کی طرح اختر بھی جذبۂ عشق سے خالی نہیں لیکن ان کے یہاں فلسفۂ عشق محبت بہت بلند ہے، اس میں مادیت کم اور معنویت بہت زیادہ ہے۔ عشق ان کے یہاں خون کا وہ ہیجان نہیں جو صرف جذبۂ جنسی سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ وہ ایک نہایت بلند لطیف احساس ہے جو مادیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ یکسر وجدانی طہارت و پاکیزگی ہے کہتے ہیں:۔

عشق نور زندگی ہے، عشق نار زندگی | نور و نار زندگی پروردگار زندگی
ہے متاع عشق صرف اک آرزوئے ناصبور | جلوہ زار عشق آبادی کے ہنگاموں سے دور
مانگتے ہیں بارگاہ عیش سے عیش ازل | شام کے سینے میں دھندلکے صبح کے تازہ کنول

ان چند اشعار کے بعد خیال کا عروج شروع ہوتا ہے:

عشق کا سیل تجلیات ہے آدم فروز | ساز کی آواز میں دبکی ہوئی اک صبح سوز
عشق سے تیغ محمدؐ عشق سے چوب کلیمؑ | عشق یزدانی لبوں کا اک تبسم ہے ندیم
عشق ذوق تازہ کاری عشق پیکار حیات | بے سرور عشق انساں بار بردار حیات

کہیں کہیں انھوں نے محبت کی کیفیت کو صرف محاکاتی احساس تک محدود رکھا ہے لیکن ایسی نظموں میں بھی وہ عام روش اختیار نہیں کرتے بلکہ بہت بلند شاعرانہ تعبیرات سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً فراق کا مفہوم ان کے نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیے:۔

وادیٔ کوہ و جوئبار خموش | دشت خاموش، لالہ زار خموش
چاندنی رنگ و نور سے عاری | ماہ و انجم پہ بیخودی طاری
بیقراری سی ابر پاروں میں | جان باقی نہیں ستاروں میں

یہ سکوت سپہر مینائی
روح فرسا ہے شام تنہائی

اس میں شک نہیں کہ اختر نے اپنے انداز فکر اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اس وقت کے تمام نوجوان شعراء میں اپنا ایک مقام علیحدہ پیدا کر لیا ہے جس پر ان کو فخر کرنا چاہئے۔

میں ان کے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ انھوں نے ابتدا ہی میں انتہا کے منازل طے کر لئے ہیں لیکن ان سے اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اگر انھوں نے اس جادہ سے قدم نہ ہٹایا اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسا کریں، تو ایک وقت ایسا آئے گا جب ان کے کلام کی اہمیت ادبی و فنی نقطۂ نظر سے ہٹ کر صرف جذبات تک رہ جائے گی اور یہی شاعری کا صحیح مقصد

خاورستان سے انتخاب

خودشناسی

وِ شوق میں ہے جلوہ خانۂ جبریل
یہ دشتِ سادہ کی پہنائی و ہجومِ تخیل
ی نوائے پریشاں ہے صورِ اسرافیل
کہ تو ہے راہ روِ جادۂ کلیم و خلیل
ا رہی ہے تجھے تیرگیٔ شامِ سفر
اندھیری رات کا تارا نہیں تری قندیل
ن میں لالہ و گل نے ہزار رُخ بدلے
ہنوز مقصدِ فطرت ہے تشنۂ تکمیل
تو اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے
ہیں تیرے بحر کی موجیں فرات و دجلہ و نیل
ی خودی میں ہے فردوسِ گم شدہ کا سُراغ
عطا ہوا تجھے صبرِ حسینؓ و صدقِ خلیل
غ ہوائے زمانہ پہ گام فرسا ہو
تری نگاہ سے پوشیدہ ہے نشاطِ رحیل
سرفروش مجاہد ہے بندۂ مومن
لئے ہوئے ہے جو عشق و خودی کی تیغِ اصیل
کبھی دماغ میں گونجا ہوا ترانۂ رزم
کبھی زباں پہ رسولِ خدا کا ذکرِ جمیل

مجاہد

مجاہد نام ہے لے دوست اس انسانِ کامل کا
مٹا دیتا ہے جو اک وار میں ہر نقشِ باطل کا
سکھاتا ہے جو گردِ راہ کو اسرارِ الوندی
جو اپنے خون سے کرتا ہے لالے کی حنا بندی
ہے داخل جس کی فطرت میں جہانبانی، جہانگیری
ادا کرتا ہے اپنا سر کٹا کر رسمِ شمشیری
نظر میں بجلیوں کی شعلہ افشانی، عبا سادہ
خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ
مجاہد فی الحقیقت شاہکارِ کبریائی ہے
زمیں سے عرشِ اعظم تک مجاہد کی خدائی ہے
مجاہد بے خطر ہوتا ہے مرگِ ناگہانی سے
مجاہد غسل کر سکتا ہے تلواروں کے پانی سے
حریمِ قدس کا راز آشنا معلوم ہوتا ہے
بسا اوقات یہ انسان خدا معلوم ہوتا ہے
مجاہد سازِ ہستی کے لئے مضراب ہوتا ہے
سمندر بھی مجاہد کے لئے پایاب ہوتا ہے
یہ جانِ فتح و نصرت ہے یہ روحِ کامرانی ہے
مجاہد مر نہیں سکتا، مجاہد غیر فانی ہے

مجاہد کو عطا ہوتا ہے منصب تشنہ کامی کا
اسے کہتے ہیں غارت گر شبستانِ غلامی کا
نہ وہ تختِ خلافت ہے، نہ وہ تاجِ شہادت ہے
جہاں کو پھر کسی مردِ مجاہد کی ضرورت ہے!

غمگین نہ ہو بژمردگیٔ لالہ و گل سے
تخریب ہے اس دہر میں تعمیر کی مانند
معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز!

اقبالؒ

ایک خواب

کل شاعرِ مشرق نے کہا خواب میں مجھ سے
افسوس کہ مومن ہے غلامی پہ رضامند
کھلتا نہیں یہ راز کہ اے بندۂ مجبور
تو صاحبِ لولاک ہے یا دانۂ اسپند
کیا عالمِ تدبیر تجھے راس نہ آیا
کیوں تیری خودی ہو گئی تقدیر کی پابند
ہر حال میں محکوم ہے، مغموم ہے، معذور
تدبیر سے خورسند، نہ تقدیر سے خورسند
تو کشورِ انجم کی حکومت کا سزاوار
کیوں تجھ پہ زمیں تنگ ہے اے مردِ ہنرمند
آغوشِ صدف جس کے لئے وا ہو وہ قطرہ
رکھتا ہے نظر میں مہ و پرویں کو نظربند
لیتا ہے ستاروں سے خراج اپنے جنوں کا
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ سمرقند
شاہیں کے لئے تنگ ہے یہ وسعتِ افلاک
وابستہ ہے شمشاد سے گلزار میں پربند

زندگی اور خودی

خودی کو ذات کا عرفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خودی حقیقتِ عریاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
نہ پوچھ مجھ سے وہ راحت جو اضطراب میں ہے
تو مثلِ انجمِ رخشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہو شعلہ بار کہ دنیا ہے تودۂ خاشاک
تری خودی شرر افشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد ہے لذتِ ایماں کے ذکر سے بیزار
حیاتِ لذتِ ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
تو جس کی سعی سے تاباں ہے کوکبِ تقدیر
فروغِ عالمِ امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خودی کی ضرب سے لرزاں ہے کائنات تمام
خودی کے بحر میں طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہ فیضِ سوزِ خودی تیری زیست کی راہیں
حریفِ صبحِ زرافشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
تجھے خبر نہیں کیا ہے حیاتِ شعلہ مزاج
رگوں میں شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خودی کا زخمہ ہے مضرابِ سازِ کون و مکاں
خودی کا سازِ غزل خواں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ترے جمال کی اس پر اساس ہے اے دوست
تو اپنے دل کا نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کمالِ عشق ہے ذوقِ نظر کی سیرابی
یہاں تجلیٔ فاراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وجودِ قطرۂ نیساں سے ہے صدف کی نمود
صدف میں قطرۂ نیساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مری نواؤں سے لرزاں ہیں تارِ عودِ حیات
میں زندگی کا حدی خواں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

شاعرِ مشرق اور بندۂ محکوم

محکوم

اے ترے نغموں سے روئے حاکمیت بے حجاب
یہ زوالِ مردِ مومن ہے حقیقت یا کہ خواب
مٹ گئی وہ محفلِ عزم و عمل مثلِ سراب
سنگِ خارا ہو گیا ہے زندگی کا لعلِ ناب
کیا ملے کیوں کر ملے گم گشتہ منزل کا سراغ
ساحرِ افرنگ کے سحر رہیں سب شیخ و شاب!

شاعرِ مشرق

آ بتاؤں تجھ کو شانِ عارف و مردِ تمام
وارثِ دینِ مبیں، آتش نسب، والا مقام
عشق رزمِ زندگانی، عشق تیغِ بے نیام
عشق کی گرمی سے پیدا تابشِ کاس الکرام
اب کہاں وہ عشق و مستی کا جمالِ جاوداں
وہ جنونِ دعوتِ حق، وہ خیالِ ننگ و نام
اب کہاں وہ عشق و مستی کا جلالِ بے اماں
مردِ مومن کو مبارک ہو نمازِ بے قیام
کاروانِ عشق پہنچا منزلِ مقصود پر
ہیں خرد کے کارواں لیکن ابھی دور از مقام
آتشِ افرنگ کے شعلوں میں گم کر رہ گیا
مکتبِ اسرارِ فطرت کا جوانِ سبز فام
عشق نے مجھ کو عطا کی سوزشِ دردِ دروں
تھا مرے افکار کا سرمایہ سوزِ ناتمام!

محکوم

یاد ہے مجھ کو ابھی تک وہ ترا حرفِ بلند
کر دیا بحرِ معانی تو نے اک نقطے میں بند
بندۂ محکوم کو کیا ہو اسیری سے خطر
"قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند"

شاعرِ مشرق

تیرا قلبِ پُر سکوں تھا محوِ وردِ لا الٰہ
آج ہے بے ربطیٔ افکار کی آماجگاہ
اے اسیرِ جہل و عصیاں! ناشناسِ زندگی!
پستیٔ فطرت سے ہے تو بے گلیم و بے کلاہ!

محکوم

بادۂ آلام سے پُر ہے ایاغِ زندگی
کس طرح روشن ہو مومن کا چراغِ زندگی؟

شاعرِ مشرق

اس کی ہے شاہنشہی دنیائے مہر و ماہ پر
تیز ہے تیغِ دو پیکر کی طرح جس کی نظر
جس کی فطرت بے نیازِ گردشِ شام و سحر
جس کی ہستی کامیابی کا جمالِ منتظر
جس کے حق میں پھول بن جاتا ہے ہر خارِ شرر
ہے وجودِ ذاتِ باری کا وہی پیغامبر!
بندۂ آزاد کی آواز صوتِ سرمدی!
بندۂ محکوم کی آواز بالکل بے اثر!
خاکِ محکومی سے گرد آلود ہے تیری جبیں
زندگی خود داریوں کا نام ہے اے بے خبر!!

ہوئے ہیں گلشنِ اقبال میں اب برگ و بر پیدا

سید مظفر حسین برنی

یہ بات عام طور پر معلوم نہیں کہ علامہ اقبال کے صاحب زادے صرف ڈاکٹر جاوید اقبال نہیں۔ جن کا نام ان کی شاعری میں اکثر آیا ہے بلکہ ان کے ایک اور بڑے صاحب زادے بھی تھے۔ آفتاب اقبال۔ ان کی والدہ علامہ اقبال کی پہلی بیوی تھیں جن کا انتقال مارچ ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ آفتاب اقبال بیرسٹر تھے چند سال قبل کراچی میں انتقال فرما گئے۔ ان کے صاحب زادے ڈاکٹر آزاد اقبال اتفاق سے شاعر ہیں اور پورے خاندان میں واحد فرد ہیں جن کو قدرت نے یہ ملکۂ ودیعت کیا ہے۔

ڈاکٹر آزاد اقبال بھی بیرسٹر ہیں اور آج کل ایک سعودی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کی انگریزی سوانح حیات مرتب کرنے کے سلسلہ میں ان سے خط و کتابت کی ابتدا ہوئی تو یہ راز کھلا کہ آزاد اقبال شعر بھی کہتے ہیں۔

میں نے اس سال ان کو سالانہ انڈو پاک مشاعرہ انبالہ میں مدعو کیا تھا جس کا اہتمام ہر سال وہاں کی ایک فعال تنظیم "شامِ بہار ٹرسٹ" کرتی ہے۔ افسوس کہ ڈاکٹر آزاد اقبال اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر شرکت نہ کر سکے لیکن انہوں نے اپنی دو نظمیں مجھے ارسال کیں اور اجازت دے دی کہ میں ان کو کسی باوقار ادبی جریدہ میں شائع کرا دوں۔ ایک نظم کا عنوان ہے "آمدِ جہاد" جو انہوں نے اس وقت لکھی جب ان کے ہاں ۱۷ ارمئی ۱۹۸۳ء کو بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام "جہاد" رکھا گیا۔ دوسری نظم کا عنوان ہے "احساسِ زندگی" ڈاکٹر آزاد اقبال کا کلام ابھی تک پاکستان میں بھی شائع نہیں ہوا۔ اب یہ پہلی بار ہندوستان میں رسالہ "شاعر" میں اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر آزاد اقبال کی شاعری پر علامہ اقبال کی گہری چھاپ ہے۔ ان کو اس بات کا احساس بھی ہے اور اعتراف بھی کہ ان میں نہ علامہ کی سی بلند خیالی ہے اور نہ ان کی شاعری کی سی گہرائی۔ ان کی دعا ہے کہ خدا ان کو علامہ اقبال کا سا "نورِ بصر" عطا فرمائے۔ کیا اردو شاعری ان سے غیر معمولی توقعات وابستہ کرنے میں حق بجانب ہوگی؟

آزاد اقبال

احساسِ زندگی

کہاں ہے وہ جوانمردی نگاہوں کے اشاروں میں
کہاں ہے وہ خودی کا رنگ باغوں میں بہاروں میں

گلستانِ تمنا اوج بے بنیاد رکھتا ہے
مسلماں ڈھونڈتا ہے آبرو ناقص سہاروں میں

لبوں پر آج تک ہیں تذکرے تعمیرِ اُمت کے
مگر توحید کا جذبہ نہیں بے اختیاروں میں

سبق ہے جو صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
ضرورت ہے بہت اس کی، مگر ہے بند پاروں میں

سمجھ آتی نہیں قرآن کی حکمت بھری باتیں
اُلجھ کر فلسفے سے پڑ گیا مسلم خساروں میں

مسلماں منتشر ہیں بات کرتے ہیں اخوت کا
خبر ہو کاش کیسا جذب باہم ہے ستاروں میں

گزارہ اب ترا مشکل نظر آتا ہے اے مسلم
نہیں ہے تو رموزِ زندگی کے رازداروں میں

ابھی بھی وقت ہے بیدار ہو جا خوابِ غفلت سے
نکل موجوں میں آ، کچھ بھی نہیں رکھا کناروں میں

ید قدرت سے وہ حسنِ عمل کی داد لیتے ہیں
نمایاں بات یہ دیکھی گئی ہے پختہ کاروں میں

ضرورت دل کو گرمانے کی ہے زندہ تمنا سے
عمل کی روح مسلم پھونک سکتا ہے ہزاروں میں

آمدِ جہاد

آزاد اقبال

تیری آمد سے ہوے شجر میں برگ و بر پیدا
تو ہے اقبال کا بلبل، تو کر اُس کا اثر پیدا

سفر ہے زندگانی کا بہت مشکل بھی آساں بھی
نظامِ بحر و بر میں ہے یہ طوفاں بھی گلستاں بھی

بلندی کا تو ہے شاہیں، تو قوت میں کوہستانی
ترے بازو میں دیدی ہے مسلماں کی فراوانی

ترے دل میں ہے پوشیدہ چمن اُن راز دانوں کا
جو کھلتا ہے تو بنتا ہے وہی اک در خزانوں کا

تو ہے اسلام کا پرچم خلیل اللہ کا گوہر
تیری فطرت میں ہے عشقِ خدا اور عشقِ پیغمبر

ترے سینے میں بہتا ہے لہو، اُس مردِ غازی کا
جہادِ زندگانی میں اثر روحِ بلالی کا

تیری حکمت سے ہو جائے مسلماں کا یقین محکم
تو ہے شمشیرِ مومن کی، چراغِ جستجو پیہم

اقبال

قطعہ

ترا جوہر ہے نُوری، پاک ہے تُو

فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو

ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حُور

کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تُو!

اقبالؒ

اکبری اقبال

اکبری اقبال (طبع اوّل ۱۹۱۸ء، طبع دوم ۱۹۲۳ء) کے دو ایڈیشن علامہ اقبال کی حیات ہی میں شائع ہوئے تھے۔ میرے پیشِ نظر کتابچے کا دوسرا ایڈیشن ہے جو کتب خانہ کالی داس گیتا رضا سے حاصل ہوا۔ اس کا عکس یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنی زیرِ تحقیق تصنیف "روداد اقبال" کے ایک باب "طنزیات و مزاحیات" (غیر مطبوعہ) کے تحقیقی مواد کا ماخذ اکبری اقبال طبع اول ہی کو بنایا ہے۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں آزاد صاحب نے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کے اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا:

"۔۔۔۔ لیکن آپ نے ہندوستان کے جس اشاعتی ادارے کا ذکر کیا ہے اس نے بھی تو مرغوب ایجنسی (لاہور) والے کتابچے ہی کو دوبارہ چھاپا ہوگا ورنہ ۱۹۱۸ء والے کتابچے کی عبارت اس کے سامنے کہاں سے آگئی۔۔۔۔"

لکھنؤ سے شائع ہوئے اکبری اقبال ۱۹۲۳ء کے کتابچے میں اس کی کوئی تفصیل نہیں ہے کہ یہ کون سا ایڈیشن ہے؟ مواد کہاں سے لیا گیا ہے؟ اسے دوبارہ کیوں شائع کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۲۳ء کے بعد کے کسی تیسرے ایڈیشن کا علم مجھے نہیں۔

اکبری اقبال میں شامل ظریفانہ کلام "انجمن حمایتِ اسلام" کے ۲۹ویں سالانہ جلسے میں پڑھا گیا۔ ڈاکٹر گیان چند کی تحقیق کے مطابق ۲۹واں سالانہ جلسہ فروری یا مارچ ۱۹۱۴ء میں منعقد ہوا ہوگا۔ (مقالہ: رگڑا یا اکبری اقبال مطبوعہ ماہنامہ شگوفہ (حیدر آباد) اکبری اقبال نمبر ۱۹۸۷ء) ڈاکٹر صاحب نے اپنے اسی متذکرہ مقالے میں تحریر کیا ہے کہ اکبری اقبال اور بانگِ درا کا بیشتر ظریفانہ کلام رسالہ زمانہ (کانپور) جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اکبری اقبال ۱۹۱۸ء کا اولین ماخذ رسالہ زمانہ (کانپور) کا یہی شمارہ ہے۔

اکبری اقبال (طبع اوّل، دوم) اور بانگ درا (طبع اوّل، دوم، سوم) میں شامل ظریفانہ کلام کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوا کہ درج ذیل کلام بانگ درا کے لیے منسوخ کر دیا گیا تھا۔

۱ — انساں ہوئے مہذب لیکن مزا تو جب ہے
۲ — ہر محکمے میں عہدے تقسیم ہوں برابر
۳ — کہی اچھی نقیبِ انجمن نے
۴ — دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانے میں
۵ — وفاداران سہ قسم اند؛ اربعانی
۶ — جنابِ شیخ کو پلاؤ خاص لندن کی

اکبری اقبال اور بانگ درا کی اشاعتوں کے درمیان حیدر آباد (دکن) سے کلیاتِ اقبال مرتبہ مولوی عبدالرزاق راشد (مطبوعہ ۱۳۴۳ھ-۱۹۲۴ء) بھی شائع ہوا۔ کلیات میں "نکات" کے تحت ظریفانہ کلام دیا گیا ہے۔ ان تینوں مجموعوں کے تقابلی مطالعے کے بعد معلوم ہوا کہ درج ذیل کلام اکبری اقبال اور بانگ درا دونوں ہی میں شامل نہیں کیا گیا۔

۱ — گاندھی سے ایک روز یہ کہنے لگا لوی
۲ — اتنی خدمت کی ہے خلق اللہ کی
۳ — پٹی خوب جمن کے ہاتھوں نصیبن
۴ — عمل عاشقوں کے ہیں بے طور سارے
۵ — بختِ مسلم کو شبِ تار سے ڈرتی ہے سحر
۶ — اخبار میں لکھتا ہے لندن کا پادری
۷ — دل شمع صفت عشق سے ہو نور سراپا
۸ — بندگی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ
۹ — ہزار چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
۱۰ — بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے
۱۱ — گرچہ تو زندانیِ اسباب ہے

اکبری اقبال میں شامل آخری نظم "ترلقمہ" بانگِ درا میں "خطاب بہ جوانانِ اسلام" کے عنوان سے صفحہ نمبر ۱۹۸، ۱۹۹ (طبع سوم ۱۹۳۰ء) پر دی گئی ہے جو ۱۲ اشعار پر مشتمل ہے جب کہ "ترلقمہ" میں کل ۱۰ شعر ہیں۔ "خطاب ۔۔۔ اسلام" نظم میں شعر نمبر ۵ اور ۷ اضافہ ہیں۔

اقبال کا غیر متداول کلام ان کے محققین نے تلاش کے بعد باقیاتِ اقبال کے طور پر شائع کیا ہے ایسے مجموعوں کی تعداد ۷ ہے۔ ان میں "رختِ سفر" مرتبہ: محمد انور حارث (طبع اول ۱۹۵۲ء، طبع دوم ۱۹۷۷ء) "باقیاتِ اقبال" مرتبہ: سید عبدالواحد معینی (طبع اوّل ۱۹۵۲ء، طبع دوم ۱۹۶۹ء محمد عبداللہ قریشی کے اضافوں کے ساتھ۔ طبع سوم ۱۹۷۸ء) "تبرکاتِ اقبال" مرتبہ: بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی (طبع اوّل ۱۹۵۹ء) "سرودِ رفتہ" مرتبہ: غلام رسول مہر (طبع اوّل ۱۹۵۹ء) "نوادرِ اقبال" مرتبہ: عبدالغفار شکیل (طبع اول ۱۹۶۲ء) وغیرہ میں اکبری اقبال کی وہ ۶ نظمیں شامل ہیں جو بانگِ درا کے لیے محذوف کی گئی تھیں۔
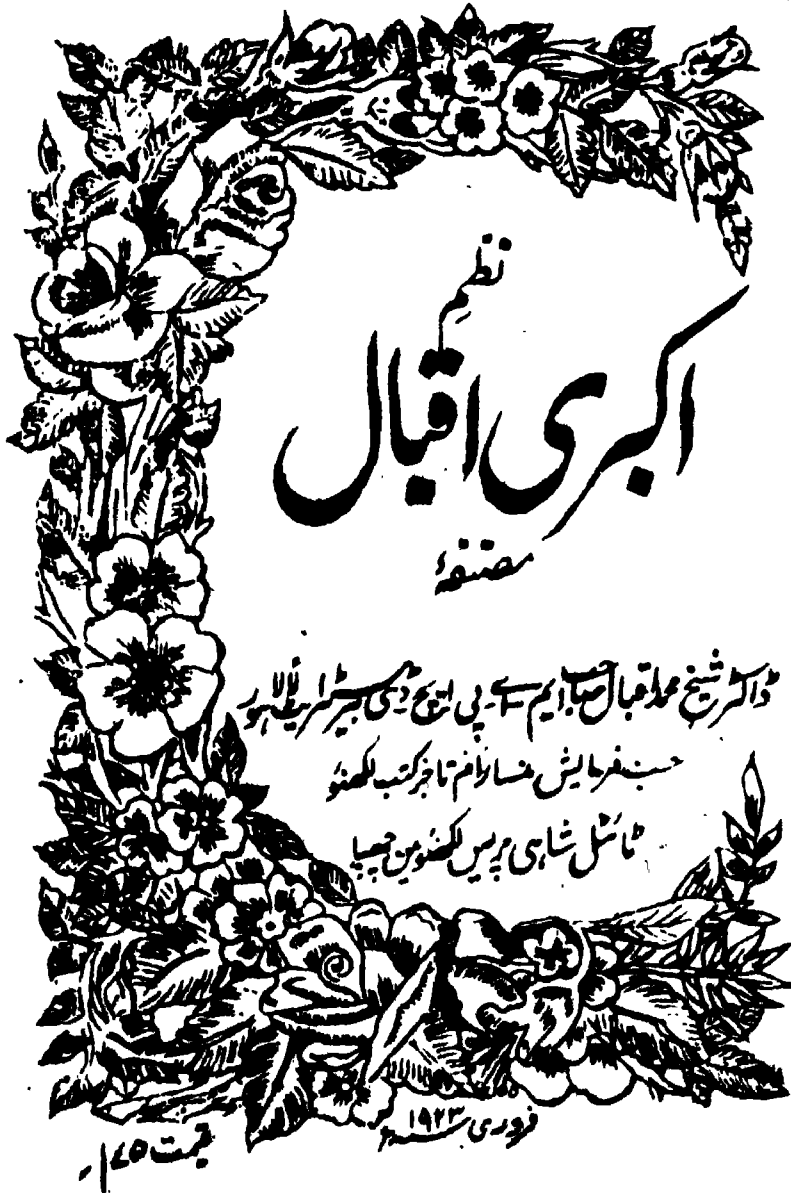
ڈاکٹر گیان چند کا ایک تحقیقی مقالہ "کلامِ اقبال کے دو قدیم مخطوطے" سہ ماہی اقبالیات (مطبوعہ جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء، لاہور) میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جن دو مخطوطات کی نشان دہی کی ہے ان میں سے ایک محمد انور خاں طالب علم جامعہ ملیہ اسلامیہ (علیگڑھ) کا تحریر کردہ ہے جس میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۴ء تک کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ دوسرا مخطوطہ "بیاض اقبال" عماد الملک سید حسن بلگرامی کا تحریر کردہ ہے اس میں بھی بانگِ درا کی اشاعت سے قبل کا کلام مختلف اخبارات و رسائل سے جمع کیا گیا ہے۔ محمد انور خاں کے مخطوطے میں اقبال کی ایک اکبری رنگ کی نظم "مالوی جی" اکبری اقبال، کلیاتِ اقبال اور بانگِ درا میں شامل نہیں۔

دونوں مخطوطات کے سرسری جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ بانگِ درا کی اشاعتِ اوّل سے قبل جتنا کچھ ظریفانہ کلام مختلف رسائل میں شائع ہوا تھا وہ اکبری اقبال، کلیاتِ اقبال اور بانگِ درا کے ساتھ ہی ان مخطوطات میں بھی موجود ہے۔ بیاضِ بلگرامی میں درج ایک ظریفانہ قطعہ ع "دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک" کو ڈاکٹر صاحب نے بانگِ درا کے لیے منسوخ بتایا ہے جب کہ یہ قطعہ بانگِ درا (طبع سوم ۱۹۳۰ء) کے صفحہ نمبر ۳۳۱ پر موجود ہے۔ غالباً سہواً ایسا ہوا ہے۔

اکبری اقبال سے کلیاتِ اقبال (از عبدالرزاق) اور بانگِ درا کے بعد باقیاتِ اقبال کے باب میں غیر متداول ظریفانہ کلام کی یک جائی۔ اسی طرح حالیہ برسوں میں "ظریفِ اقبال" مرتبہ: سلیم تمنائی مطبوعہ ۱۹۸۴ء ماہنامہ شگوفہ (حیدر آباد) اکبری اقبال نمبر ۱۹۸۶ء اور "اکبری اقبال ۔ ایک تعارف" از عطا خورشید مطبوعہ ہفت روزہ ہماری زبان (دہلی) ۸ مارچ ۱۹۸۸ء تک کتابچہ اکبری اقبال کا متن اور اس کی تعلیقات کی دستیابی کے باوصف اس کی ایک اور اشاعت کا جواز یہ ہے کہ:

- علامہ اقبال کی حیات میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔
- طبع دوم کے بعد پہلی بار اس کتابچے کا عکس شاعر کے صفحات پر پیش کیا جا رہا ہے۔
- اکبری اقبال کی ۶ نظمیں باقیاتِ اقبال میں بکھری ہوئی ہیں۔
- خواجہ حسن نظامی مرحوم کی خوب صورت تحریر اس میں شامل ہے۔

---

[1] میرے مطالعہ میں آیا ہے کہ انجمن کا ۲۷ واں جلسہ ۱۹۱۶ء میں منعقد ہوا جس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم "شمع و شاعر" سنائی تھی۔ اس حساب سے ۲۹ واں سالانہ جلسہ ۱۹۱۴ء میں نہیں بلکہ ۱۹۱۸ء میں منعقد ہوا تھا۔ مزید تفصیلات کے لیے شاعر کے آخری صفحات ملاحظہ کیجیے جس میں انجمن حمایت اسلام کے متعلق کچھ اور معلومات درج کی گئی ہیں۔

نظم

اکبری اقبال

مصنفہ

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا لاہور

حسب فرمائش منشا رام تاجر کتب لکھنؤ

ٹائٹل شاہی پریس لکھنؤ میں چھپا

فروری سنہ ۱۹۲۳

قیمت ۱۷۵

اکبری اقبال

انجمن حمایت اسلام لاہور کے اُنتیسوین سالانہ جلسے مین جناب
ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی بیرسٹرایٹ لا
لاہور نے لسان العصر سید اکبر حسین صاحب پنشنر جج الہ آبادی کے رنگ
مین بصدارت نواب ذوالفقار علی خان صاحب ذیل کی نظم پڑھی
اور اس نظم کا عنوان مذاقاً "رگڑا" رکھا تھا۔

پریسیڈنٹ جلسہ جناب نواب ذوالفقار علی خان صاحب نے
اپنی پرمعنی ابتدائی تقریر مین ڈاکٹر صاحب موصوف کو شکسپیئر اور
سعدی سے تشبیہ دیتے ہوے فرمایا کہ اگر یہی اقبال ولایت مین ہوتا
تو اسکی قدر و منزلت شکسپیئر سے بھی بڑھی ہوتی۔ مگر افسوس
کہ ہمارے اہل ملک نے اس کی قابلیت سے کم آشنا ہین۔ اسکی
دنیوی زندگی کے بعد معلوم ہوگا کہ اقبال کیا چیز تھا۔

ڈاکٹر صاحب اس مرتبہ بوجہ مصروفِ کاروبار (انجمن کیلئے)
کوئی نظم پیشتر تیار نہ کر سکے لیکن اراکین انجمن کے اِبرام سے

صرف دو تین دن پہلے جلدی مین اپنے چند خیالات کو منظوم
کرنا شروع کیا۔ اِس لیے آپ نے جلسہ مین نظم پڑھنے سے
پہلے تمہیداً فرمایا کہ یہ چند "ٹکوڑے" ہین جو پبلک کی
ضیافت طبع کے لیے پیش کرتا ہون۔ بعض تازے اور
بعض تو ان مین ۲۴ گھنٹے کے تلے ہوے ہین، مگر بعد ان
ٹکوڑون کے ایک "ترلقمہ" بھی ہوگا۔

اس اکبری رنگ کے کلام کو قوم کے اکثر افراد نے
پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور قبولیت کے کانون سے سُنا
اور تحسین کی زبان کو حرکت دی۔

اِس نظم کے اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال
اکبری رنگ کی جھلک کھانے پر بھی کس قدر قادر ہین۔ آپکے
اِس نئے رنگ پر حضرت خواجہ حسن نظامی نے ذیل کی تمہید
تسطیر فرمائی اور خواجہ صاحب نے ہی اِس نظم کا عنوان
اکبری اقبال موزون فرمایا۔

فضل الٰہی مرغوب رقم

تمہید

ازقلم

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی

هُوَالْکُلُ یامُعین

لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہین جن کا نام محمد اقبال ہے۔ اور ڈاکٹر ہے۔ اور بیرسٹر ہے۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔ وہ شعر کہتے ہین اور شعر بجاتے ہین۔ اور موقع پاتے ہین تو شعر پیدا بھی کر لیتے ہین۔

مین نے اُن کو آدمی اس ڈر سے کہا کہ جو لوگ آدمیت کی عینک لگائے ہوئے ہین اور اقبال اُن کو آدمی ہی نظر آتے ہیں کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھین۔ ورنہ مین اقبال کو پیکرِ خاک نہین سمجھتا۔ اور اُن کے پُتلے کو آدم زاد نہین جانتا ممکن ہے کہ وہ بشر ہون۔ مگر اُن کی بشریت فقط اُن کی بیوی بچون' یا اُن کے لئے مبارک ہو جو اُن کو گوراچٹا مونچھون والا عقلمند پروفیسر بیرسٹر کہتے ہین۔

مین نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی۔ سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی۔ یورپ مین اقبال کو بھی دیکھا ہو اور لندنی اقبال کو بھی۔ مگر کبھی آدمی نہین پایا۔ وہ ازل سے حیوان ہین اور حیات ابدی کے نشان ہین ہندوستان

کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہین مگر مین اُس
لفظ مین وہ جان پاتا ہون جو ہند کے کسی انسان مین نہین۔
برسات مین مکھیان اور پروانے دونون پیدا ہوتے
اور دونون جاندار کہلاتے ہین۔ مگر ایک آدمی کو
ستاتا ہے۔ اور مگس بیحیا کا نام پاتا ہے اور دوسرا
شمع کے رُخ پر قربان ہوجاتا ہے اور عبرت
ڈھونڈنے والون کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر
رُلاتا ہے۔

اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو اُن دیکھی شمع کا
دیوانہ ہے۔ مکھیان اسکے اشعار کو مٹھاس سمجھکر چاٹتی ہین
اور پروانے شعلہ سمجھکر قربان ہونے آتے ہین۔
اقبال ہمیشہ آسمان پر اُڑتے ہین۔ زمین پر کبھی آتا

ہوتا ہے تو اُس زمین مین جو آسمان سے زیادہ دور ہوتی ہے
اسلئے وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہین ہین یہ کہتے
رہ جاتے ہین کہ اقبال کہان ہین؟ ہم اُن تک کیونکر پہونچین؟
ایک دن بھری سبھا کے اندر اقبال زمین پر آئے اور چند
جملے اُن کی زبان مین سُنائے جو زمانہ کی زبان کہلاتے ہین
جن کا نام اکبر ہے۔ جو الہ آباد مین بیٹھکر اللہ کی آبادیان بساتے
ہین۔ اکبر کے ہم زبان ہوکر بولنا آسان بات نہین ہے
اکثر اشاراتِ ربانی کے حامل ہین۔ اکبر کو گویا کرنے والا
پہلے آنکھ سے دکھاتا ہے پھر قلم سے لکھاتا ہے۔ اکبر کی
ہر بات زمین آسمان کو ایک کردیتی ہے۔ ہر قول وہ وجود
لیکر آتا ہے جسکو انگریزی مین کیرکٹر کہتے ہین۔ اکبر نے اُس
دھوپ مین بال سفید کیے ہین جسنے اسلامی سلطنت کا بانہ صاف کیا

اقبال نے اکبری زبان مین جو کچھ کہا وہ اکبری اقبال ہے
خلقت اُسکو دیکھتی ہو کہ اقبال نے کس حد تک اکبری
روش کو نباہا ہو۔ اور اکبر کیطرح کیونکر تنگ قافیون کو کشادہ کیا ہو
مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان مین بولتے بولتے اب اقبال
کی زبان مین بھی آیا ہو خدا خیر کرے دیکھیے ان حروف کے پردے کیا نکلنے والا ہے
ہندوستان کی بیقراری مین کام کی باتین درکار ہین
جن مین نتائج ہون۔ اور چلنے کے لئے راستہ جو عبرت کے
لیے دل خوش کن آگاہی و تنبیہ ہو۔ اکبر و اقبال کا ابتدا سے
یہی شیوہ رہا ہو۔ مگر اقبال نے اور طریق سے کہا اور اکبر نے
اور پیرایہ سے۔ اس نظم مین جو منشی مرغوب رقم صاحب کے
ذریعہ شایع ہوتی ہے اقبال نے اکبری نقش قدم پر پاؤن
اُٹھایا ہو۔ اور حق یہ ہو کہ ضبط طبی سے ہر نشان پر پاؤن جا پڑا ہو۔

مجھ سے کہتے ہین کہ مین اس نظم پر وہ لکھون جسکو لوگ
ریویو کہتے ہین۔ مگر مین پوچھتا ہون کہ بہتے ہوے دریا کی
روانی کو اسکی کیا ضرورت ہو کہ دوسرا اسکے تیز بہاؤ کی
حقیقت پر لکچر دے۔ موجین مارنے والا سمندر جب خود
نظر آتا ہے تو کسی کا یہ کہنا کہ "کشتیان چکرائین گی ہواؤن
کو چکر آئینگے، بادل اُٹھین گے، اور زمین پر مینھ
برسائین گے" فضول ہے۔ جاننے والے خود جانتے ہین
کہ یہ طوفان کسی موسم کی خبر دیا کرتا ہے۔ اسواسطے
مین اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہین چاہتا۔ اتنا کہنا
ہی اِسکی اعلےٰ شان کی دلیل ہو۔

حسن نظامی

نظم

مشرق مین اصول دین بنجاتے ہین　　مغرب مین مگر مشین بنجاتے ہین
رہتا نہین ایک بھی ہمارے پلے　　وان ایک کے تین تین بنجاتے ہین

لڑکیان پڑھ رہی ہین انگریزی　　ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر　　وضع مشرق کو جانتے ہین گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین　　پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہین
مفت مین کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہوگئے
وعظ مین فرمایا کل آپ نے یہ صاف صاف
"پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہوگئے"

یہ کوئی دن کی بات ہے۔ اے مرد ہوشمند!
غیرت نہ تجھ مین ہوگی۔ نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور۔ کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

انسان ہوے مہذب۔ لیکن مزا تو جب ہے
جنگل مین کہہ رہی تھی ہاتھی سے کل یہ ہتھنی۔
"تقریر کو کھڑی ہو۔ کلو میان کی بیوی
پردھان ہو سبھا مین بنسی کی دھرم پتنی"

ہر محکمے مین عہدے تقسیم ہون برابر　　ہوتی نہین ہے ہمکو جنگ جدل سے سیری
خفیہ پولس مین جب سے ہو گئی ہے قائم　　ہندو ہین پیدا افسر مسلم ہین آنریری

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفرین
پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج مین مار ڈینگ
بستے ہین ہند مین جو خریدار ہی فقط
آغا بھی لے کے آتے ہین اپنے وطن سے ہینگ
میرا یہ حال ۔ بوٹ کی ٹو چاٹتا ہون مین
اُن کا یہ حکم دیکھ! میرے فرش پر رینگ
کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدّا سا جانور
اچھی ہے گاے ۔ رکھتی ہو کیا نوکدار سینگ

کہی اچھی نقیب انجمن نے — وہ سمجھے گا اسے جو کارداں ہے
خدا واحد ہو دو ناظم ہین اپنے — دو علے مین ہمارا آشیان ہے

دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانہ مین — ملا کا محتسب کا ۔ خدا کا ۔ نبی کا ڈر
دو خوف رہگئے ہین ہمارے زمانہ مین — مضمون نگار بیوی کا ۔ سی آئی ڈی کا ڈر

کچھ غم نہین جو حضرت واعظ ہین تنگدست — تہذیب کے تو سامنے سر اپنا خم کرین
ردِ جہاد مین تو بہت کچھ لکھا لیا — تردیدِ حج مین کوئی رسالہ رقم کرین

وفاداران ترسم اند ۔ اربدانی! — زبانی اند و تانی اند و جانی
زبانی راز منصب عزتے دہ — زمینے برسرِ ہنر بستانی
اگر باغی بخواند دیگران را — بیائید زآستان او را برانی
دگر ذوقِ ملاقاتِ تو دارد — جوابش دہ بلفظِ لن ترانی
وفادارانِ جانی را بدست آر — اگر خواہی زجانی جان ستانی

جناب شیخ کو پلواؤ خاص لندن کی — عجیب نسخہ ہے خود فراموشی کیلیے
ہمارے حق مین تو جینا بتر ہے مرنے سے — جو زندہ ہین تو فقط آپکی خوشی کیلیے

ہوا مین جینے سے بیزار جب تو فرمایا
کہان سے لاؤگے بندوق خودکشی کیلیے

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ،
دفعِ مرض کے واسطے پل پیش کیجیے!
تھے وہ بھی دن کہ خدمت اُستاد کے عوض
دل چاہتا تھا، ہدیہ دل پیش کیجیے،
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجیے"!

انتہا بھی اسکی ہے آخر خریدین کب تلک
چھتریان، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئینگے غسال کابل سے کفن جاپان سے

ہم مشرق کے مسکینون کا دل مغرب مین جا اٹکا ہے
وان کنٹر سب بلوری ہین یان ایک پرانا مٹکا ہے
اس دور مین سب مٹ جائینگے، ہان! باقی وہ رہ جائیگا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہین
گردون نے کتنی بلندی سے ان قومون کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستور محبت قائم تھا،
یا بحث مین اُردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

ترلقمہ

کبھی اے نوجوان مسلم! تدبر بھی کیا تو نے ؟
وہ کیا گردون تھا؟ تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تا را!
تجھے اُس قوم نے پالا ہے آغوش محبت مین،
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤن سے تاج سرِ دارا!
تمدن آفرین! خلاق آئین جہانداری،
وہ صحرائے عرب، یعنی شتربانون کا گہوارہ
سمان الفقر فخری کا رہا شانِ امارت مین
بہ آب ورنگ، خال وخط چہ حاجت روئے زیبارا
غرض مین کیا کہون تجھ سے! کہ وہ صحرا نشین کیا تھے
جہانگیر وجہان دار وجہان بان وجہان آرا،

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہین سکتی،
کہ تو گفتار، وہ رفتار، تو ثابت، وہ سیارا،
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسمان نے ہم کو دے مارا،
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اِک عارضی شئے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا،
مگر وہ علم کے موتی، کتابین اپنے آبا کی،
جو دیکھو ان کو یورپ مین تو دل ہوتا ہے سیپارہ
غنی! روزِ سیاہِ پیرِ کنعان را تماشا کن،
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را،

اقبال

گجرات اُردو اکادمی

دفتر بھنڈار بھون، سیکٹر ۱۷، گاندھی نگر - ۳۸۲۰۱۷

اغراض و مقاصد

(۱) اعلا معیار کی طبع زاد و غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد۔
(۲) (ہندی، انگریزی کے علاوہ) دیگر ہندوستانی زبانوں کی کلاسیکی کتابوں کے اُردو تراجم کی اشاعت کیلئے مالی امداد۔
(۳) منظور شدہ کتب خانوں کو اُردو کتابیں خریدنے کے لئے مالی امداد۔
(۴) اُردو کلاسس کے لئے گرانٹ۔
(۵) اعلا معیار کی بہترین کتابوں پر انعامات۔
(۶) نئے لکھنے والوں کو ان کی پہلی کتاب کی اشاعت کے لئے مالی امداد۔
(۷) نایاب کتابوں کی اشاعت کے لئے گجرات کے ادبی و تحقیقی اداروں کو امداد۔
(۸) سہ ماہی رسالہ 'سایہ نامہ' کی اشاعت۔
(۹) گجرات کے نامور ادیب، شاعر اور محقق کا اعزاز۔
(۱۰) گجرات کے مختلف شہروں میں ادبی سیمینار، کانفرنس اور مشاعروں کا انعقاد۔
(۱۱) گجری ادب اور گجرات میں اُردو کے موضوع پر تحقیقی کتابوں کی تیاری۔
(۱۲) گجرات کے نامور ادیبوں اور محققوں کی اعلیٰ پائے کی تصانیف کی اکادمی کی جانب سے اشاعت،
(۱۳) ضعیف العمر شعرا و ادبا کی معاشی امداد

مزید معلومات کے لئے سکریٹری گجرات اُردو اکادمی، دفتر بھنڈار بھون سیکٹر ۱۷ گاندھی نگر ۳۸۲۰۱۷ سے رابطہ قائم کریں

اشاعتی پروگرام

اکادمی کے اشاعتی پروگرام کے تحت مندرجہ ذیل کتابیں زیر طبع ہیں۔

(۱)	تذکرۂ وجیہہ	[حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی کی سوانح اور ان کی دینی و علمی خدمات کا جائزہ]	از سید حسینی پیر علوی
(۲)	گجری مثنویاں		از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
(۳)	مضامین مدنی	(تحقیقی مضامین)	از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
(۴)	ادبی اصناف		از ڈاکٹر گیان چند جین
(۵)	پیشۂ تو سپہ گری کا بھلا	(تنقیدی مضامین)	از وارث علوی
(۶)	کچھ بچالایا ہوں	(تنقیدی مضامین)	از وارث علوی

مظلوم اقبال

مظلوم اقبال (چند یادیں چند تاثرات) علامہ اقبال کے برادر زادے شیخ اعجاز احمد کی تصنیف ہے جسے اقبال کی سوانح کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب اپنی اشاعت کے بعد ہی سے بحث کا موضوع بن گئی تھی۔ ہندوستان میں بھی یہ کتاب موضوعِ بحث بنی لیکن اس بحث کے تمام تر ماخذات پاکستان میں شائع ہوئے تبصروں، تذکروں اور چند ایک ہندوستانی ماہر اقبالیات کے اذکار و بیانات ہی کی گونج تک محدود رہے اور اقبال کے بے شمار عقیدت مند اور اردو ادب کے طلبا اس کتاب یا اس کے مندرجات، بہ طورِ خاص کتاب میں شامل خطوط کے مطالعے سے محروم ہی رہے۔
مظلوم اقبال میں شامل لوازمے پر بحث و تمحیص سے کتاب کے مواد کی چھان پھٹک کا کام پاکستان میں ہو چکا ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ خیال تھا کہ شاعر کے اقبال نمبر میں اس پوری کتاب کا عکس شامل کیا جائے تاکہ ہندوستان میں بھی اقبال کے بے شمار قارئین اور اقبال پر تحقیقی کام کرنے والوں کو بہ آسانی دستیاب ہو سکے تاہم محدود صفحات کے سبب مکاتیب والا باب ہی مکمل طور پر اقبال نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے

۳۸۴ صفحات کو محیط اس کتاب میں "پیش لفظ" کے علاوہ طویل و مختصر ۳۴ ابواب کے تحت مختلف عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن میں اقبال کے سوانحی کوائف کو حوالوں اور ماخذات کے ساتھ اجاگر کرنے کی اپنی سی سعی کی گئی ہے۔ یہ سارا مواد دل چسپ بھی ہے اور بحث طلب بھی۔ مظلوم اقبال مصنف شیخ اعجاز احمد کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اقبال پر تحریر کی گئی کتابوں میں در آنے والی بعض روایات کی تردید و تصحیح کی گئی ہے۔ مبصرین اقبال کے تسامحات کو درست کیا گیا ہے۔ اعجاز احمد صاحب چوں کہ قادیانی عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا پوری کتاب میں اسی تعلق کی شعوری فضا بندی کا احساس ہوتا ہے۔

مظلوم اقبال پر کیے گئے دو اہم تبصرے اس کتاب میں شامل آمیزے کو پوری طرح سمجھنے میں معاون ہوں گے لہٰذا ڈاکٹر وحید عشرت کے دونوں تبصرے یہاں شائع کیے جا رہے ہیں۔ بہ ظاہر یہ تبصرے یک طرفہ ہیں تاہم بہت سے تاریخی حقائق کی بحث شائع کردہ مکاتیب کے تناظر میں قارئینِ اقبال کے لیے دل چسپی کا باعث ہوگی۔ وحید عشرت صاحب کے دونوں تبصروں میں احمدیت کی بحث خاصی طویل ہے اسی لیے کتاب مظلوم اقبال کا باب نمبر ۳۳ مستقل مضمون کے طور پر "اقبال نمبر" میں شامل کیا گیا ہے تاکہ موضوع کے تمام پہلو قارئین کو بھی معلوم ہو سکیں

کتاب میں شامل ۱۰۳ خطوط چاہے جس نوعیت کے ہوں ان کی اہمیت یہ ہے کہ علامہ اقبال کے تحریر کردہ ہیں اور خطوط اقبال کے ذخیرے میں اضافہ ہیں۔ خطوط کا متن ہندوستان میں پہلی بار شاعر کے اقبال نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔ باوجود اس کے کہ اصل خطوط کے عکس نہیں ہیں اور خطوط کے متن میں بھی عبارات حذف کی گئی ہیں لیکن جو لوازمہ باقی بچا ہے اس سے بھی اقبال کے ذہنی ارتقاء اور ان کے فکری تغیر و تبدل کی تفہیم میں مدد ملتی ہے کہ یہ ۴ جون ۱۹۱۴ء سے ۲، دسمبر ۱۹۳۷ء تک "اپنوں" کو لکھے گئے تھے۔

مظلوم اقبال میں شامل مباحث یہ ہیں: علامہ اقبال کے جدِ اعلیٰ کا مشرف بہ اسلام ہونا۔ علامہ اقبال کے جدِ اعلیٰ نے کب اسلام قبول کیا۔ علامہ اقبال کے اجداد میں سے کس نے اور کب کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی۔ علامہ اقبال کے خاندان کی گوت سپرو (کشمیری پنڈت) تھی۔ علامہ اقبال کے والد۔ علامہ اقبال کی والدہ۔ علامہ اقبال کے بڑے بھائی۔ شبنم اور طوفان۔ اقبال منزل۔ علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش۔ علامہ اقبال کی شادیاں۔ علامہ اقبال کا سجع۔ ایک کشف۔ من نہ کردم شما حذر بکنید۔ مولانا میر حسن ہال۔ اولیں پرسش نماز بود۔ شعر سش زلبش شنیدہ ام۔ کیا علامہ اقبال مالی لحاظ سے خوش حال تھے؟ کیا علامہ اقبال سرد مہر اور "طوطے پیر ہن" تھے؟ کیا علامہ اقبال تفضیلی عقیدہ رکھتے تھے؟۔ جاٹ اور علامہ اقبال کی شاعری۔ برکات لامحدود۔ پیراں نمی پرند، مریداں می پرانند۔ ایک تمنا جو پوری نہ ہوئی۔ علامہ اقبال کی وسعتِ مطالعہ۔ انیسویں صدی کے آخر کا سستا زمانہ۔ آخری ملاقات۔ صدق و اخلاص و صفا باقی نماند۔ جاوید اور منیرہ کی ولایت کے متعلق وصیت۔ (وصیت نامہ) ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے۔ علامہ اقبال کی یادگار اشیا۔ زندہ رود: علامہ اقبال کی سوانح حیات ۔ علامہ اقبال اور احمدیت۔ شکوۂ جور و جفا۔ علامہ اقبال کے مکتوبات۔

ڈاکٹر وحید اشرت کے مقالے "تعصّب ایک خط کا..." کے مطالعے کے بعد چند باتیں ذہن میں ابھرتی ہیں کہ: مظلوم اقبال میں شامل تمام خطوط

بغیر کسی قطع برید کے شائع ہوں۔ کتاب پر جو مختلف النوع تبصرے ہوئے ہیں شیخ اعجاز احمد صاحب ان پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔
جن دستاویزات کے حوالے کتاب میں دیے گئے ہیں یا جو عبارتیں، دستاویزات سے نقل کی گئی ہیں ان کے عکس بھی دوبارہ شائع کیے جائیں۔ یہ سب کچھ
ایک نئی کتاب کا قابلِ مطالعہ لوازمہ بن سکتے ہیں۔

مکتوبات میں خط نمبر ۸۰ کے متن کے بعد جو طویل وضاحتی نوٹ دیا گیا ہے وہی "قصہ ایک خط کا..." موضوع بنا ہے۔ اس طرح اقبال نامہ
اول دو ماہ بعد پھر بعد کے دیگر مکاتیب اقبال کے مجموعوں میں حذف و اضافوں کی مثالیں ملتی ہیں۔

[۲]

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اعجاز احمد کے متعلق مختصر ہی سہی کچھ معلومات قارئین شاعر کو فراہم کر دی جائیں۔ حالاں کہ علامہ اقبال کے خطوط اور
شیخ اعجاز احمد صاحب کی تعلیقات میں صاحب کتاب کے بارے میں بہت کچھ آ گیا ہے۔

علامہ اقبال کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد [پ: ۱۸۵۹ء م: ۱۹۴۰ء] کے صاحب زادے شیخ اعجاز احمد ۱۲ر جنوری ۱۸۹۹ء کو
سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اسکاچ مشن ہائی اسکول سے میٹرک اور اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ اس کے بعد ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے
وکالت شروع کر دی۔ موگا، دہلی، حافظ آباد اور چنیاں میں سب جج رہے۔ تقسیم ہند کے وقت وہ حکومت ہند کے محکمہ خوراک میں تھے۔ ۱۹۴۷ء
میں کراچی منتقل ہو گئے۔ ۱۹۵۴ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ان دنوں کراچی ہی میں سکونت پذیر ہیں۔

مظلوم اقبال کے دیباچے میں شیخ اعجاز احمد صاحب نے کتاب کے عنوان کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ انھیں کتاب کا نام روزنامہ جنگ [لاہور]
میں شائع شدہ ایک مذاکرے سے حاصل ہوا ہے جس میں فیض احمد فیض مرحوم شریک تھے۔ فیض صاحب کے بقول "اقبال کی ذات کے اجنبی گوشوں
اور ان کی شخصیت کی غیر معروف گہرائیوں کی تحقیق کا کام ابھی تشنۂ تکمیل ہے..." مظلوم اقبال کے آخری سرورق پر فیض احمد فیض کی ایک نظم
دی گئی ہے۔ قارئین کے مطالعے کے لیے اس نظم کو یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا ؎

آیا ہمارے دیس میں اک خوشنوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا!!
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سیکڑوں لذت شناس ہیں
اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں

ظاہر ہے کہ چند عزیزوں میں جناب جاوید اقبال اور جناب شیخ اعجاز احمد ہی علامہ اقبال کی وہ دو اک نگاہیں ہیں جنھیں اہم ترین اور قریب
ترین ماخذ اقبال کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس اعتبار سے جاوید اقبال صاحب کی باپ بیتی زندہ رود [تین جلدیں] اور شیخ اعجاز احمد کی غم بیتی مظلوم اقبال کو کسی
طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ اقبال کی شخصیت کے سلسلے میں معتبر اور نا معتبر مباحث از سر نو ان دونوں کتابوں سے شروع کیے جائیں گے۔

کتاب میں "شجرۂ نسب خاندان اقبال" زندہ رود میں دیے گئے شجرے اور دیگر کتابوں میں شامل شجرے میں جو اختلاف ہے وہ شاعر کے بابت
میں تمام اختلافات کی نشان دہی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ باوجود بہت سی بحث طلب باتوں کے مظلوم اقبال ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔

علامہ اقبال کے مکاتیب

نقل و حرکت کے معاملے میں چچا جان "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" واقع ہوئے تھے لیکن خط و کتابت میں بڑے مستعد تھے۔ ان کے نام خاصی تعداد میں خطوط موصول ہوتے۔ خط کسی عزیز کا ہو یا دوست کا۔ کسی واقف کا ہو یا ناواقف کا وہ پہلی فرصت میں اپنے ہاتھ سے جواب لکھتے۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے کبھی جواب میں تاخیر ہو جائے تو ہو جائے ورنہ حتے الامکان خط لکھنے والے کو جواب کے انتظار کی زحمت نہ دیتے۔ ۱۹۳۷ء کے شروع میں موتیا شدت سے اترنا شروع ہوا تو معالجوں نے لکھنے پڑھنے کی ممانعت کر دی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے اس معمول میں فرق نہ آنے دیا۔ اتنا ہوا کہ اب خط کے جواب کا مضمون اپنے حاشیہ نشین احباب میں سے کسی کو لکھوا دیتے۔ اگرچہ جاوید کی عمر اس وقت صرف تیرہ سال تھی لیکن کبھی کبھی یہ کام اس سے بھی لے لیا جاتا تھا۔

لاہور میں تعلیم و تعلم کے زمانے میں انہوں نے جو خطوط اپنے والد یا بڑے بھائی کو لکھے ان میں سے کوئی خط محفوظ نہیں۔ اُن دنوں کسی کو اُن کے خطوط کی قدر و قیمت کا احساس بھی کہاں ہوگا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اُن کا قیام زیادہ تر انگلستان میں رہا۔ اگرچہ وہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہاں سے اُن کا خط میاں جی کے نام ہفتے میں ایک بار ضرور آتا۔ شہر میں ولایت کی ڈاک کی تقسیم کا ایک دن مقرر تھا۔ اس دن بے جی کو ڈاکیے کا سخت انتظار رہتا۔ وہ خط لاتا تو بے جی اُسے چار آنے دیا کرتی تھیں۔ اگر ولایت کی ڈاک کی تقسیم کے دن کسی وجہ سے ڈاک نہ آتی تو گھر بھر کی شامت آ جاتی۔ بے جی ہر ایک سے بات بے بات اُلجھتیں۔ بیچارے بے قصور ڈاکیے کو کوستیں۔ ایسے موڈ میں اُن سے کوئی بات منوانا میرے لئے بھی ممکن نہ ہوتا حالانکہ میری بات وہ بہت کم ٹالتی تھیں۔ اُن ایام میں تایا جان کا قیام اپنی جائے ملازمت پر ہوتا تھا۔ ان کے نام چچا جان کے خطوط وہاں جاتے ہوں گے۔ اُن تین سالوں میں جو خطوط میاں جی اور تایا جان کے نام آئے اُن میں سے بھی کوئی خط محفوظ نہیں رہا۔

انگلستان سے واپس آکر چچا جان نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ اپنی وفات تک تقریباً تیس سال کے عرصہ میں انہوں نے بہت سے خطوط میاں جی اور تایا جان کو لکھے ہوں گے۔ ان میں سے صرف ۳۲ خطوط محفوظ ہو سکے کیونکہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۱ء تک تعلیم کے سلسلہ میں اور پھر ۱۹۲۹ء سے چچا جان کی وفات تک ملازمت کے سلسلہ میں میرا قیام سیالکوٹ سے باہر رہا۔ تعلیم کے دوران چھٹیوں میں سیالکوٹ جاتا تو ان کا کوئی خط اگر میرے ہاتھ لگ جاتا تو اُسے محفوظ کر لیتا۔ ملازمت کے عرصہ میں اس کا اہتمام بھی نہ ہو سکا۔ ان ۳۲ خطوط کے علاوہ ۶۸ خطوط ایسے ہیں جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۶ء کے دوران مجھے لکھے گئے۔ ایک خط ہماری پھوپھی کریم بی بی کے نام ہے اور ایک میرے چھوٹے بھائی مختار کے نام۔ یہ ۱۰۲ خطوط ضروری وضاحتوں کے ساتھ شائع کئے جا رہے ہیں۔ خطوط کی ترتیب اُن کی تاریخ تحریر کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ ہر مکتوب علیہ کے نام خطوط یکجا درج نہیں کئے گئے۔ ان خطوط کے لئے یہی ترتیب مناسب معلوم ہوئی۔

ان خطوط کی اشاعت سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔ اس لئے خطوط کے وہ حصے حذف کر دیئے گئے ہیں جن میں چچا جان کی متاہل زندگی کے المیہ کا ذکر ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے چچا جان اور بڑی چچی جان کی وفات کے بعد اس المیہ کے متعلق پبلک میں بحث و تمحیص مجھے مناسب معلوم نہیں ہوئی اور اب تو بھائی آفتاب بھی فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تینوں سے رحمت کا سلوک فرمائے۔ چچا جان کے متعلق سب خطوط اب پاکستان نیشنل میوزیم کراچی کی تحویل میں دے دیئے گئے ہیں۔

(۱)

۱۹۱۴ء کی پہلی ششماہی میں میں نے سکاچ مشن سکول سیالکوٹ سے انٹرنس کا امتحان دیا۔ میں ریاضی کے مضمون میں سخت کمزور تھا۔ اس امتحان میں میری کامیابی مشکوک تھی میرے ایک ہم جماعت امتحان کے نتیجے کا پتہ لگانے کے لئے لاہور گئے۔ اُن کا کوئی عزیز غالباً یونیورسٹی کے دفتر میں ملازم تھا۔ نتیجے کے مشتہر ہونے سے ایک دن قبل وہ سیالکوٹ واپس آئے اور امتحان میں اپنی اور میری کامیابی کا مژدہ سنایا۔ میں نے اُسی وقت چچا جان کی خدمت میں خط لکھ کر دریافت کیا کہ آئندہ تعلیم کے لئے مجھے کس کالج میں داخلہ لینا چاہیئے اُن کے نام یہ میرا سب سے پہلا خط تھا۔ اس کے جواب میں اُن کا یہ خط موصول ہوا جو میرے نام ان کا پہلا خط تھا۔

لاہور ۲۴ جون ۱۴ء

عزیز از جان اعجاز طال عمرہ

تمہارا نتیجہ کل نکل تھا مگر مجھے علم نہ تھا کہ نتیجہ نکل گیا ہے۔ آج پتہ چلا تو میں یونیورسٹی گیا اور تمہارا نام کامیاب طلباء میں دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ گھر آیا کہ تم کو تار دوں مگر میز پر تمہارا کارڈ پڑا پایا۔ الحمدللہ تم نے پہلی منزل طے کر لی۔ تمہارے نمبر ۲۴۴ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئے ہو۔ ایف اے کے لئے اس سے زیادہ محنت و توجہ کی ضرورت ہوگی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تمہیں ہمیشہ اسی طرح کامیاب کرتا رہے ایف اے کورس کی فہرست بنا کر مجھے ارسال کرنا ممکن ہے بعض کتابیں گھر میں موجود ہوں۔ ان کے خرید کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ میری رائے میں یہ بہتر ہے کہ تم ابھی دو سال اور سیالکوٹ میں رہو اور وہاں کے سکاچ مشن کالج میں داخل ہو جاؤ اور نیز یہ بھی لکھو کہ کون کون سے مضمون امتحان ایف اے کے لئے لینا چاہتے ہو۔ یہ یاد رکھو کہ تم اب کالج میں داخل ہوا چاہتے ہو تمہارا بچپن کا زمانہ گزر گیا ہے کالج کے لڑکے جنٹلمین سمجھے جاتے ہیں نہ کہ لڑکے۔ یہ مرحلہ ایف اے کا مشکل ہے شروع سے ہی توجہ اور بلاناغہ کام کرنا چاہیئے۔ تین گھنٹے ہر روز پڑھائی کافی ہے بشرطیکہ باقاعدہ ہو۔ ایف میں کم از کم تم کو سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہونا چاہیئے۔ بی اے کے واسطے تم کو گورنمنٹ کالج میں داخل کر دیا جائے گا۔ اپنے ابا سے میرا سلام کہنا اور ان کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد دینا۔ علی ہذا القیاس والدہ مکرمہ اور والدہ کی خدمت میں بھی مبارک باد کہنا۔

والسلام

محمد اقبال

۲

چچا جان کے ارشاد کے بموجب میں نے سیالکوٹ میں اُن کے پرانے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت تک اس کالج میں بی اے تک تعلیم کا انتظام ہو چکا تھا۔ کالج کے لئے علیحدہ عمارت شہر سے باہر تعمیر ہو گئی تھی اور نام بجائے سکاچ کالج کے مرے کالج رکھا جا چکا تھا۔ چچا جان کے استاد مولانا میر حسن کالج میں عربی پڑھاتے تھے۔ وہی مجھے داخلہ کے لئے پرنسپل کے پاس لے کر گئے۔ مولانا پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے سروقد کھڑے ہو کر تعظیم دی اور جب تک مولانا کرسی پر بیٹھ نہ گئے وہ بھی کھڑے رہے۔ کالج کے دیگر اساتذہ اور طلباء بھی اسی طرح مولانا کی تعظیم کرتے تھے۔ مولانا نے یہ کہہ کر پرنسپل سے میرا تعارف کرایا کہ آپ کے کالج کے ایک اولڈ بوائے "کے بیٹے" کو داخلہ کے لئے لایا ہوں۔ پھر چچا جان سے میری قرابت کا ذکر کیا۔ داخلہ کے لئے مولانا کا ساتھ لے جانا ہی کافی تھا۔ چنانچہ داخلہ میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

ایف اے میں فارسی بھی میرا ایک مضمون تھا۔ کالج میں گیا ہوں جماعت کو مولانا فارسی نہیں پڑھاتے تھے لیکن میں نے اُن کے گھر جا کر اُن سے فارسی پڑھی ہے۔ چچا جان کے جاننے والوں اور دوستوں میں سے ایک پروفیسر غلام محمد تھے جو شاعر تھے اور طور جن کا تخلص تھا وہ ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے اور دوسرے پروفیسر محمد شفیع ہسٹری کے استاد تھے بعض چچا جان سے تعلق کی وجہ سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ کالج میں پڑھتے ایک سال ہو چکا تھا کہ پروفیسر طور لاہور گئے اور چچا جان سے بھی ملے۔ انہوں نے میرے متعلق دریافت کیا۔ طور صاحب نے پہلے تو کلمات دو ایک کلمۂ خیر کہے اور پھر پوست کندہ میری خامیاں بھی گنوا دیں۔ اس پر چچا جان نے ابا جان کو یہ خط لکھا۔

لاہور ۲۱ جون [illegible]

برادر مکرم۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط ملا الحمد للہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے

پروفیسر طور یہاں بھی آئے تھے میں نے اُن سے اعجاز کے متعلق دریافت کیا تھا۔

وہ کہتے ہیں کہ اس کا مذاق لٹریری ہے۔ عام طور پر وہ اس کی ذہانت کی تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کا دماغ نہایت صاف و روشن ہے مگر جو نقص انہوں نے بیان کئے وہ بھی لکھتا ہوں۔

۱۔ طرز تحریر انگریزی میں اچھا ہے مگر الفاظ بہت نہیں جانتا اور ہجا عموماً غلط لکھتا ہے۔

۲۔ ریاضی میں کمزور ہے یہاں تک کہ ایف اے میں اس مضمون میں پاس ہو جائے تو غنیمت ہے۔

۳۔ پھرتا بہت ہے۔ بیٹھنے سے اسے نفرت معلوم ہوتی ہے۔

میرے خیال میں نقص نمبر ۳ پہلے دو نقصوں کا ذمہ دار ہے اگر بیٹھنے کی عادت ہوگی تو پڑھنے کی عادت بھی پیدا ہو گی اور اگر پڑھنے کی عادت ہو گئی تو الفاظ بھی بہت سے آ جائیں گے اور ہجے بھی صحیح ہو جائیں گے۔ ہجا درست کرنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ کثرت سے مطالعہ ہو اور ہر لفظ جو نہ آتا ہو اس کے معانی ڈکشنری میں دیکھے جائیں اور اس کا ہجا ذہن نشین کیا جائے۔ جو شخص ایک اجنبی زبان سیکھتا ہے اور ڈکشنری دیکھنے میں سستی کرتا ہے وہ کبھی اس زبان کو سیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کو کم از کم چار گھنٹے روز علاوہ کالج کے اوقات کے پڑھنا چاہیئے۔ انگریزی ناول پڑھنا مفید ہے کہ دلچسپی کی دلچسپی ہے اور زبان بھی سیکھی جاتی ہے۔ ریاضی کی طرف ابھی سے خاص توجہ چاہیئے ورنہ امتحان میں کامیابی موہوم ہے

والسلام

محمد اقبال

چچا جان کے ارشادات میں سے کم از کم چار گھنٹے علاوہ کالج کے اوقات کے پڑھنا چاہیئے "اور ریاضی کی طرف ابھی سے خاص توجہ دینی چاہیئے ورنہ امتحان میں کامیابی موہوم ہے" پر تو افسوس ہے میں نے کچھ ایسا عمل نہ کیا۔ ہاں "انگریزی ناول پڑھنا مفید ہے" پر عمل کرنے میں ساری کسر نکال دی۔ نتیجہ وہی نکلا جس کا اندیشہ طور صاحب نے اور چچا جان نے ظاہر کیا تھا یعنی میں ایف اے کے امتحان میں ریاضی میں فیل ہو گیا۔

آئندہ تعلیم کے لئے مجھے لاہور بھیج دیا گیا۔ ایک فیل شدہ طالبعلم کے گورنمنٹ کالج میں داخلے کا تو امکان ہی نہ تھا لہٰذا مجھے اسلامیہ کالج میں ایف اے سیکنڈ ایئر میں داخل کرا دیا گیا۔ اُن دنوں ایف اے میں ریاضی لازمی مضمون تھا۔ اس لئے یہاں بھی ریاضی سے میری خلاصی نہیں ہوئی۔ اسلامیہ کالج سے ایف اے کا امتحان دیا تو میں کامیاب ہو گیا اور بعد میں اسی کالج میں داخلہ لے لیا۔

بھائی آفتاب نے سینٹ سٹیفنز کالج دہلی میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ چچا جان علاوہ اس ماہانہ رقم کے جو وہ ہماری بڑی چچی محترمہ کو بھیجتے تھے بھائی آفتاب کو ۵۰ روپیہ ماہوار بھیجتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے سنہ میں ان سے مطالبہ کیا گیا کہ ۵۰ روپیہ ماہوار کے حساب سے دو سال کے ۱۲۰۰ روپے یکمشت دیئے جائیں۔ چچا جان کا حال تو "چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں" والا تھا۔ چچی سردار اگرچہ ہماری طرح ایک متوسط حال خاندان کی بیٹی تھیں لیکن بڑی فراخ دل تھیں۔ انہیں اس مطالبے کا علم ہوا تو انہوں نے میاں جی کو لکھا کہ اُن کا زیور فروخت کر کے اس مطالبے کو پورا کر دیا جائے۔ میاں جی نے جواب میں جو خط سردار چچی کو لکھا وہ چچا جان نے پڑھا تو انہیں سردار چچی کی اس پیش کش کا علم ہوا۔ اس پر انہوں نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

نوٹ: یہ تین صفحات کا خط ہے جس میں سے قریباً نصف خط حذف کر دیا گیا ہے۔

لاہور ۵ جون [illegible]

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط جو آپ نے سردار بیگم کے نام آیا ہے میں نے دیکھا ہے اور نیز اس نے اس خط کا مضمون بھی مجھے سنایا ہے جو اس نے آپ کی خدمت میں تحریر کیا تھا۔ یہ اس کے دل کی وسعت اور فراخ حوصلگی کی دلیل ہے مگر یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ میں اس کا زیور بیچ کر ایک ایسے لڑکے کی تعلیم پر صرف کر دوں جس سے مجھے کچھ توقع ہو سکتی ہے نہ مجھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنا زیور اس خیال سے نہیں دیتی کہ کل کو اسے اس کا معاوضہ ملے گا بلکہ وہ محض اس غرض سے دیتی ہے کہ مجھ پر کوئی شخص حرف گیری نہ کرے لیکن اگر کوئی شخص مجھ پر حرف گیری کرے تو اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ وہ شخص مجھ سے ناراض ہے۔ برخلاف اس کے ناانصافی میں خدا اور رسول کی ناخوشی ہے جس کو برداشت کرنا میری طاقت

سے باہر ہے۔ میں اور لوگوں کی حرف گیری آسانی سے برداشت کر سکتا ہوں مگر خدا و رسول کی ناخوشی سے میرا دل کانپتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ دس سال کے عرصہ میں بیس پچیس ہزار میرے ہاتھوں میں آیا ہے مگر یہ سب اپنے اپنے موقع پر مناسب طور پر خرچ ہوا جس کے لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ تاہم اس وقت تک میں ایک عمدہ مکان کرایہ پر نہیں لے سکا۔ نہ مکان کے لئے فرنیچر اور سازو سامان خرید کر سکا ہوں۔ نہ عمدہ گاڑی گھوڑا خرید سکا ہوں یہ سب لوازمات اس پیشہ کے ہیں۔ اب میں نے تہیہ کیا ہے کہ جس طرح ہو سکے یہ لوازمات بہم پہنچائے جائیں۔ اب حالات اس قسم کے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کا بہم پہنچانا لازم اور ضرور ہے۔ میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم ونثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا کہ یہ ایک خداداد قوت ہے جس میں میری محنت کو دخل نہیں خلق اللہ کی خدمت میں اسے صرف ہونا چاہیئے مگر ضروریات سے مجبور ہو کر مجھے اس عہد کے خلاف کرنا پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

- -

- -

شیخ گلاب دین صاحب کو بھی اس نے خط لکھا تھا مگر انہوں نے اُسے یہ جواب دیا ہے کہ حالات مجھے معلوم ہیں اس واسطے میں ڈاکٹر صاحب سے اس بارے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتا ....

....

مگر کچھ عرصہ بعد میرے ہاتھ میں روپیہ آگیا تو میں اُسے یکمشت بارہ سو روپیہ دے دوں گا۔ باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ اپنی خیریت سے اطلاع دیں۔

محمد اقبال لاہور

اس خط میں چچا جان نے وکالت کے پیشے کے بعض ضروری لوازمات کا ذکر کیا ہے جو وہ اپنی دس سالہ پریکٹس میں بہم نہ پہنچا سکے تھے اور لکھا ہے کہ ان لوازمات کو جس طرح ہو سکے بہم پہنچانے کا اب انہوں نے تہیہ کر لیا ہے۔ ایسا ارادہ ان کی افتادِ طبیعت کے بالکل خلاف تھا۔ ان کی شان استغنا، ظاہر ہی تھا کہ بالطبع بے نیاز تھی۔ بھلا جو مفکر "مال و دولتِ دنیا" کو "نبات وہم و گماں" سمجھتا ہو وہ "افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں" کے حصول کے لئے ضروری تگ و دو کیسے کر سکتا تھا۔ اُن کے ہاں آنے جانے والے جانتے ہیں کہ اُن کا "بیرسٹرانہ" ارادہ جس کا اس خط میں ذکر ہے عمر بھر عملی جامہ نہ پہن سکا۔ سنہ کے آخر میں انارکلی والا مکان چھوڑ کر انہوں نے میکلوڈ روڈ پر ایک کوٹھی کرایہ پر ضرور لی لیکن وہ شکستہ کوٹھی "عمدہ مکان" کہلائے جانے کی کسی طرح مستحق نہ تھی اور خود ان کے بقول وہ بس ان کی دعاؤں کے سہارے کھڑی تھی۔ مکان کے لئے تھوڑا بہت فرنیچر اور سازوسامان بھی خریدا لیکن وہ معمولی سا تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کوٹھی میں زیادہ تر وہی سامان تھا جو انارکلی والے مکان میں تھا علاوہ ان دو چار گھسیا قالینوں کے جو ایک شخص اُن کے پاس مہنگے داموں فروخت کر گیا تھا۔ سنہ ۲۴ میں عمدہ گاڑی گھوڑا خریدنے کی بجائے ایک موٹر بھی خریدا لیکن سیکنڈ ہینڈ اور بالکل کھٹارا جو اکثر قابلِ مرمت رہتا۔

"یوں رہیں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے"

لیکن خود ابن اہلِ کمال کو اس آشفتہ حالی میں رہنے کا افسوس تھا نہ رنج۔ گلہ تھا نہ شکایت۔ بڑے بڑے اہلِ ثروت اور اہلِ کمال ملنے آتے تو انہیں سے اپنے معمولی سازو سامان والے کمرے میں ملتے انہیں ذرا بھی جھجک محسوس نہ ہوتی۔ چونکہ "سامان کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی" کے قائل تھے اس لئے "مستور ہے کہ راحت غارت گر ساماں ہو" پر عامل تھے۔

شیخ گلاب دین جن کا اس خط میں ذکر ہے سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ اُن کا مکان ہمارے ساتھ کے محلے میں تھا۔ وہ عرصہ سے لاہور ڈسٹرکٹ عدالتوں میں وکالت کا کام کرتے تھے۔ اس پیشے سے انہوں نے کافی روپیہ کمایا۔ چونکہ سوچ سمجھ کر خرچ کرنے والوں میں سے تھے۔ اس لئے خاصی جائیداد بنائی۔ چچا جان سے اُن کے دوستانہ مراسم ولایت جانے سے پہلے کے تھے۔ لاہور میں ان کی سکونت بھاٹی دروازہ کے اندر داخل ہو کر بائیں ہاتھ ایک گلی میں تھی۔ ولایت جانے سے قبل چچا جان بھی ان کے پڑوس میں ایک مکان میں رہائش رکھتے تھے۔ جب میں نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کر لیا تو چچا جان مجھے دو چار ہفتے شیخ صاحب کے ساتھ ڈسٹرکٹ عدالتوں میں بھیجتے رہے تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ ضلع کی عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کس طرح کی جاتی ہے۔

یہاں ایک روایت کی صحت بھی کرتا چلوں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی اپنے مضمون "لاہور میں علامہ اقبال کی قیام گاہیں" (صحیفہ، اقبال نمبر حصہ اول۔ دسمبر سنہ) میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مکان کی شکل صورت بنانے میں علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ وہ اس مکان کو بنانے سنوارنے کے لئے سیالکوٹ سے آکر کئی مہینے قیام پذیر رہے۔" اس روایت کے بیان کرنے میں چغتائی صاحب کی یادداشت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ابا جان اس کرایہ والے مکان کو "بنانے سنوارنے" کے لئے سیالکوٹ سے نہیں آئے تھے اور نہ ہی اس مکان کو بنایا سنوارا گیا۔ وہ سنہ ۳۴ میں جاوید منزل کی تعمیر کے لئے سیالکوٹ سے آکر کئی مہینے لاہور میں قیام پذیر رہے اور اس کوٹھی کو اپنی نگرانی میں تعمیر کرایا۔ اگلے صفحات پر چچا جان کے جو خطوط ابا جان کے نام درج ہیں جو سنہ ۲۳ کے نصف آخر میں سیالکوٹ کے پتہ پر لکھے گئے۔ یہ خط اس روایت کی تردید کے لئے کافی ہیں

(۴)

ابا جان ستمبر سنہ کے آخر میں رخصت قبل از پنشن پر سیالکوٹ آگئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے رہائشی مکان کو گرا کر از سر نو تعمیر کرایا اور چچا جان کے نام پر مکان کا نام "اقبال منزل" رکھا۔ یہ جی نے ابا جان کی کمائی سے جو کچھ پس انداز کیا ہوا تھا اس کا معتد بہ حصہ مکان کی تعمیر میں صرف ہو گیا۔ ابا جان کی پنشن اور مکان کے پیچھے والی دکانوں اور ساتھ والے چھوٹے مکان کے کرایہ سے جو آمد ہوتی وہ گھر کے اخراجات کے لئے مشکل کفایت کرتی۔ اُن دنوں چچا جان بھی غالباً ۵۰ روپیہ ماہوار بھیجتے تھے۔ ابا جان چچا جان کی مرضی کے خلاف اس کوشش میں رہتے تھے کہ وہ پھر کہیں ملازمت کریں۔ آخر غالباً سنہ میں ملٹری ورکس والوں نے انہیں دوبارہ اُن کی پرانی ملازمت پر پشاور بلا لیا۔ اسلامیہ کالج میں ایف اے کے دوسرے سال کے دوران چچا جان میرے تعلیمی اخراجات کے لئے ۲۵ روپے ماہوار مجھے دیتے تھے۔ اُن دنوں اسلامیہ کالج کے ہوسٹل میں رہنے والے ایک میانہ رو طالب علم کے لئے ۲۵ روپیہ ماہوار کافی ہوتے تھے۔ ملازمت پر دوبارہ جانے کے کچھ عرصہ بعد ابا جان نے میرے تعلیمی اخراجات کے لئے کچھ رقم چچا جان کو یکمشت بھجوا دی اور ماہانہ

...سکے کو سالوں میں اس میں سے ۲۰ روپیہ ماہوار مجھے ملتے تھے۔ چونکہ ابا جان ملازمت کے سلسلے میں پشاور میں تھے اور چچا جان اور میں لاہور میں لہٰذا سیالکوٹ میں میاں جی کے پاس گھر کی خواتین کے علاوہ مردوں میں سے صرف میرے دو چھوٹے بھائی تھے جو کم عمر تھے۔ اس لئے ابا جان اور چچا جان کو میاں جی کی بڑی فکر رہتی تھی۔ نیز اُن کی طبیعت خراب ہوتی تو دونوں بھائی گھبرا جاتے تھے۔ سنہ ۱۹ کی گرمیوں کی چھٹیوں میں میں سیالکوٹ گیا ہوا تھا کہ میاں جی بیمار ہو گئے۔ میں نے ابا جان اور چچا جان کو اطلاع دی تو ابا جان نے چچا جان کو تار دیا کہ وہ فوراً سیالکوٹ پہنچیں۔ اتنے میں میاں جی کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی جس کی اطلاع میں نے دونوں بھائیوں کے اطمینان کے لئے بذریعہ تار کر دی۔ اس کے جواب میں چچا جان نے مجھے یہ خط لکھا اور دو چار دن بعد خود بھی میاں جی کو دیکھنے سیالکوٹ آئے۔

عزیز اعجاز کو بعد دعا کے واضح ہو تمہارا تار مل گیا ہے جس سے اطمینان ہوا۔ بھائی صاحب کا تار بھی راستے کو آیا تھا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ جلد سیالکوٹ جاؤ کہ والد مکرم علیل ہیں۔ اگر تمہارا تار مجھے نہ مل گیا ہوتا تو میں کل ہی روانہ ہو جاتا۔ میری فرصت ۵ اگست کو ہوگی بہرحال والد مکرم کی خدمت میں عرض کر دو کہ میں ۵ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ان کی خدمت میں پہنچوں گا۔ تم اسٹیشن پر آ جانا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲ اگست سنہ

۵

معلوم ہوتا ہے سنہ ۱۹ کے آخر میں بھائی آفتاب جو سینٹ سٹیفنز کالج دہلی میں زیر تعلیم تھے کچھ بیمار ہو گئے۔ میاں جی نے چچا جان کو اطلاع دی تو جواب میں انہوں نے یہ خط لکھا۔

قبلہ و کعبہ ام۔ السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ کل ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ امید ہے ملاحظہ عالی سے گزرا ہو گا۔ مجھے تو دہلی سے کبھی کوئی خط نہیں آیا اور نہ کسی نے مجھے اُس کی بابت لکھا ہے۔ . . . . میں نے سنا تھا کہ حافظ صاحب ملازمت چھوڑ کر گوجرانوالہ چلے گئے ہیں اور اب گجرات میں ہیں مگر یقیناً یہ خبر بھی معلوم نہیں۔ میرے خیال میں آپ اسے خط لکھیں اور تسلی دے دیں کہ بیماری سے گھبرانا چاہیئے اور نہ موت سے ڈرنا چاہیئے اور شاید یہ اس کے لئے بہتر ہو کہ اپنے علاج کے لئے چند روز کے لئے گجرات چلا جائے۔ اچھا ہو جائے تو پھر کالج چلا جائے۔ . . . .

. . . .

. . . . باقی خیریت ہے

محمد اقبال لاہور

(نوٹ۔ یہ خط دو صفحات کا ہے جس کا اکثر حصہ حذف کر دیا گیا ہے)

خط میں جن حافظ صاحب کا ذکر ہے وہ بھائی آفتاب کے ماموں جان ڈاکٹر حافظ عطا محمد صاحب تھے جو سرکاری ملازمت سے پنشن پانے کے بعد ریاست مالیر کوٹلہ میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کا وطن مالوف گجرات تھا۔ ریاست کی ملازمت سے فارغ ہو کر وہ گجرات میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

چچا جان میاں جی سے اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ کبھی لاہور آ کر ان کے پاس بھی کچھ دن قیام کریں لیکن میاں جی عمر کے تقاضے سے سیالکوٹ سے باہر جانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ یوں تو خدا کے فضل سے اس وقت تک اُن کے قوائے جسمانی اچھی حالت میں تھے۔ بصارت اور سماعت میں کچھ فرق تو پڑ چکا تھا لیکن چلنے پھرنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ ضرورت پڑنے پر بازار سے سودا سلف بھی لے آتے لیکن ضعیف العمری میں معمولاتِ زندگی میں ذرا سی تبدیلی بھی گوارا نہیں ہوتی۔ یہ بھی تھا کہ بے جی کی وفات کے بعد ان کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری میری والدہ محترمہ نے سنبھال لی ہوئی تھی اور وہ اپنے آرام و آسائش کے لئے اُن پر بہت انحصار کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹ کے ابتدا میں میاں جی نے کچھ دنوں کے لئے چچا جان کے پاس لاہور جانے کا عزم کیا اور انہیں اس کی اطلاع دی۔ اس پر چچا جان نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے الحمد للہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے۔ میں دہلی ۲۰ فروری کو غالباً جاؤں گا اور وہاں سے دو چار روز بعد واپس آؤں گا۔ آپ ابھی آ جاتے تو یہاں بھی میری عدم موجودگی میں رونق ہو جاتی۔ اگر آپ تو فرماویں تو میں اعجاز یا علی بخش کو سیالکوٹ بھیج دوں کہ آپ کو ہمراہ لے آئے اور اگر مارچ میں آنے کی صلاح ٹھہرے تو مضائقہ نہیں اس وقت علی بخش یا اعجاز کو بھیج دیا جائے۔ اعجاز تو امتحان میں مصروف ہو گا علی بخش کو بھیج دیا جائے گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ مجاور صاحبہ کو اب بالکل آرام ہے۔ بھائی صاحب کا خط آج آیا تھا وہ بھی بفضل خدا خیریت سے ہیں۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۲ فروری سنہ ۱۹

میں ان دنوں بی اے کے آخری سال میں تھا اور دو تین ماہ بعد میرا امتحان ہونے والا تھا۔ پنجاب میں رولٹ ایکٹ کے سلسلے میں حکومت کے خلاف تحریک کی وجہ سے سفر مشکل ہو گیا اس لئے میاں جی اس سال لاہور نہ جا سکے۔ خط میں مجاور صاحبہ سے مراد میری والدہ محترمہ ہیں جنہیں گھر میں اور محلے میں سب 'مجاوری جی' کہتے تھے۔ شاید اس لئے کہ ان کی اولاد بھی یہی کہتی تھی۔

۷

رولٹ ایکٹ کے خلاف سیاسی تحریک زور پکڑ گئی۔ اپریل کے پہلے ہفتے ... اور بعض دیگر شہروں میں حکومت کے خلاف مظاہرے ہونے۔ جلوس نکلے اور بعض جگہ پولیس کے ساتھ تصادم بھی ہوا۔ ۹ اپریل کو امرتسر میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ وہاں کے لیڈروں کو شہر بدر کر دیا۔ لوگ اور مشتعل ہو گئے۔ ایک دن لاہور کے طلباء نے ایک جلوس نکالا جس میں میں اور اسلامیہ کالج کے بہت سے طلبا پیش پیش تھے۔ جلوس کے آگے آگے ایک پرچم تھا جس پر رولٹ ایکٹ کے خلاف نعرے لکھے ہ...

تھے۔ اس پرچم کو ایک طرف سے میں نے اٹھایا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے ایک اور طالب علم نے۔ جلوس نعرے لگاتا ہوا ریلوے روڈ سے ہوتا ہوا انارکلی بازار میں داخل ہوا۔ ارادہ مال روڈ پر واقع گورنمنٹ ہاؤس جانے کا تھا۔ جب جلوس انارکلی میں چچا جان کے مکان کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ مکان کی بالکنی میں کھڑے ہیں۔ میرے شانہ بشانہ ایک نوجوان چل رہے تھے جنہوں نے دو ایک مرتبہ مجھ سے پرچم لینے کی ناکام کوشش کی تھی۔ چچا جان کو دیکھ کر میں نے فوراً پرچم اُس نوجوان کو پکڑا دیا اور خود جلوس کے عقب میں چلا گیا تاکہ چچا جان مجھے نہ دیکھ سکیں۔ نیلے گنبد کے قریب پولیس نے جلوس کو روکنا چاہا اور جب جلوس والے نہ رُکے تو پولیس نے گولی چلا دی۔ ایک گولی اُس نوجوان کے گھٹنے کے نیچے لگی جس نے میری جگہ پرچم اٹھایا تھا۔ یہ نوجوان ایم۔ جان (عطا محمد جان) تھے۔ لا کالج کے قریب ان کی قانونی کتب کی دوکان تھی۔ افسوس کہ وہ بے چارے عمر بھر لنگڑاتے رہے اور میں چچا جان کی نظروں سے بچنے کی وجہ سے لنگڑا ہونے سے بچ گیا

امرتسر میں مظاہرین نے تین انگریزوں کو مار ڈالا۔ ایک انگریز عورت کو بھی پیٹا گیا۔ گورنر اوڈوائر نے جنرل ڈائر کو امرتسر میں امن قائم کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اُس نے آتے ہی پبلک جلسوں پر پابندی لگا دی۔ ۱۳ اپریل کو جلیانوالہ باغ میں ایک پبلک جلسہ منعقد کیا گیا تو جنرل ڈائر نے نہتی پبلک پر فوج سے گولی چلوا کر قتل عام کرایا۔ دوسرے دن چچا جان نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم۔ آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ اعجاز کل سیالکوٹ گیا ہے۔ لاہور کے حالات اس نے مفصل بیان کئے ہوں گے۔ لاہور میں آج ۸ روز سے ہڑتال ہے۔ دکانیں بند ہیں اور شہر میں قبرستان کی خموشی الحمد اللہ کہ کوئی امرتسر وغیرہ کی طرح یہاں کوئی ایسا فساد نہیں ہوا۔ میں خدا کے فضل و کرم سے بمع اہل و عیال تندرست ہوں۔ کل ایک مقدمہ کے لئے پٹیالہ جاؤں گا۔ اور کو وہاں سے واپس آجاؤں گا بھائی صاحب کو امید ہے رخصت مل جائے گی اور اگر مل گئی تو امید ہے وہ کل یا پرسوں تک آپ کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔ باقی خیریت ہے۔ بچوں کو دعا

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۴ اپریل ۱۹۱۹ء

اس خط میں ایک دن قبل میرے سیالکوٹ جانے کا ذکر ہے لیکن سفر میں وقت کی وجہ سے میں جا نہ سکا تھا۔ خط کے مضمون سے ظاہر ہے کہ اُس وقت تک جلیانوالہ باغ کے حادثہ کی اطلاع چچا جان کو نہیں ہوئی تھی۔ امرتسر میں فساد کا ذکر تو ہے لیکن اس سے مراد وہ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے جو اُن دنوں امرتسر میں ہو رہی تھی۔ خط میں ۱۵ اپریل کو پٹیالہ جانے کے ارادہ کا بھی ذکر ہے لیکن یہ سفر انہیں ملتوی کرنا پڑا تھا۔ ابا جان نے کچھ دنوں کی رخصت لی تھی اور وہ سیالکوٹ پہنچ گئے۔

۸

ابا جان کے رخصت پر سیالکوٹ پہنچنے کی اطلاع چچا جان کو ۱۵ اپریل کو ملی تو انہوں نے فوراً یہ خط لکھا

برادر مکرم السلام علیکم۔ الحمد اللہ آپ مع الخیر سیالکوٹ پہنچ گئے۔ میں نے آپ کو تین چار روز ہوئے خط لکھا تھا جواب نہ آنے سے تردد تھا۔ ڈاک اور ریل کا انتظام درست نہیں۔ اس واسطے خطوط نہیں پہنچے۔ کل والد مکرم کی خدمت میں کارڈ لکھا تھا امید ہے پہنچا ہو گا لیکن گجرانوالہ میں سنا ہے کہ فساد ہو گیا ہے اور کوئی پل توڑ دیا گیا ہے اس واسطے ممکن ہے کہ ڈاک میں تعویق ہو جائے۔ مجھے آج ایک مقدمہ کے لئے پٹیالہ جانا تھا۔ ریل کا انتظام مخدوش ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکا۔ کل وہاں تار دے دیا تھا کہ مت منتظر رہیں۔ غرضیکہ بڑی گڑبڑ ہے ہر طرف سے وحشت ناک خبریں آ رہی ہیں۔ لاہور میں آج چھ روز سے ہڑتال ہے پہلے تو کچھ فساد ہوا اور چند لوگ مارے گئے مگر اب شہر میں بالکل خموشی ہے اور لوگ دکانیں نہیں کھولتے اپنی ضد پر قائم ہیں۔ غالباً آج یا کل اگر یہی حالت رہی تو شہر فوج کے قبضے میں دے دیا جائے گا بچے اب نہیں مزید اعجاز کو میں نے پہلے سے منع کر دیا تھا اور کل پیغام بھی بھیجا تھا کہ وہ یہاں آ جائے اور مطالعہ کرے کہ بورڈنگ میں اسے تکلیف ہوتی ہو گی مگر وہ کہتا ہے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آج میں نے آپ کا خط اس کو دکھانے کو بھیجا ہے۔ اول تو یہاں آ جائے گا ورنہ سیالکوٹ چلا آئے گا۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے کوئی تردد کی بات نہیں ہے آپ مطمئن رہیں۔ جب تک پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ ریل کا انتظام درست ہے آپ لاہور کی طرف نہ آئیں کیونکہ تکلیف کا احتمال ہے۔ پرسوں رات امرتسر میں پھر شدید فساد ہوا ہے بہت سے بڑے اسٹیشنوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔ خدا رحم کرے۔ میں تو آپ کو خط لکھنے والا تھا کہ ملازمت چھوڑ کر گھر آ جائیے جو کچھ تھوڑا بہت پاس ہے اس پر چل چل کر گزارہ کریں گے۔ پشاور کی تبدیلی کے موقع پر بھی میں نے آپ کو لکھا تھا کہ جہاں آپ ہیں وہیں رہیے۔ اس طرف نہ جائیے اس وقت نظام عالم کا مطلع نہایت غبار آلود ہے اور معلوم نہیں کیا واقعات ظہور پذیر ہوں گے۔ ومکرو ومکراللہ واللہ خیر الماکرین۔

لاہور میں بالکل خموشی ہے اور کسی قسم کا فساد نہیں ہے مطمئن رہیئے۔ والد مکرم کی خدمت میں السلام عرض کر دیں۔ والسلام محمد اقبال لاہور۔

جیسا کہ خط میں لکھا ہے چچا جان نے مل بخش کو روانہ ہوسٹل بھیجا تھا کہ وہ مجھے ہوسٹل سے گھر لے آئے لیکن میں نے کہلا بھیجا کہ ہوسٹل میں کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرے دن انہوں نے ابا جان کا خط جو ان کے نام تھا مجھے بھیجا جس میں تاکید تھی کہ میں ہوسٹل چھوڑ کر گھر چلا جاؤں۔ لیکن میں پھر بھی ہوسٹل میں ہی رہا کیونکہ وہاں کوئی خطرہ تھا نہ کوئی تکلیف تھی۔ صوبے میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا۔ فوج نے کئی قسم کی پابندیاں عاید کر رکھی تھیں۔ طالب علموں کو خاص طور پر مارشل لا والے تکالیف میں ڈال رہے تھے۔ بعض کالجوں کے طالب علموں کو روزانہ مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں حاضری دینی ہوتی تھی۔ ہمارے پرنسپل مسٹر ڈی وائنز کے رسوخ کی وجہ سے ہمارے کالج کے طلبا ان مشکلات سے بچے رہے۔

اس خط میں چچا جان نے پھر اپنی اس خواہش کا اعادہ کیا کہ ابا جان ملازمت چھوڑ کر گھر آ جائیں۔ اصل میں وہ شروع ہی سے ابا جان کے دوبارہ ملازمت کرنے کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ابا جان اب گھر پر آرام کریں اور اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ انہیں اٹھانے دیں۔ دوسری طرف ابا جان چچا جان کی افتاد طبیعت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ انہیں روپیہ کمانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اپنی ذمہ داریوں سے مجبور ہو کر با دل ناخواستہ وکالت کا کام کرتے ہیں۔ منشی طاہر دین نے انہیں بتلایا ہوا تھا کہ مہینے کی ضروریات کے لئے کافی روپیہ ہاتھ میں آ جائے تو چچا جان وکالت کا مزید کام مشکل سے ہی لیتے ہیں۔ اس طرح منشی جی کی آمدنی بھی متاثر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ منشی جی نے تجارت کا کام بھی شروع کر دیا ہوا تھا

اور کوہیات کے انہوں نے منقش پھندے جسے لاہور سو ربھی کہتے ہیں کے لئے ایک مولانی طرز نظم تیار کی ہوئی تھی جو بڑی مقبول ہوئی۔ اس کی فروخت سے منشی جی نے بڑا روپیہ پیدا کیا۔ بیرسٹر صاحب تو کرایہ کی رہائش گاہ کوٹھی میں رہتے رہے اور ان کے منشی جی نے فیروز پور روڈ پر حکمت کی کمائی سے ایک کوٹھی تعمیر کی جس کا نام "دل روز ولا" رکھا۔ ان دنوں حالات ابا جان چچا جان پر حتی الامکان اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے اور ان کے اصرار کے باوجود جس کا اظہار اس خط میں بھی کیا گیا ہے وہ جب تک ہو سکا ملازمت کرتے رہے۔

۹

رخصت کے ختم ہونے پر ابا جان اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ ملک میں جو حالات تھے اس کی وجہ سے وہ چچا جان سے ملنے لاہور نہ جا سکے۔ میاں جی کی طبیعت ناساز تھی۔ چچا جان نے یہ خط لکھ کر مزاج پرسی کی۔

لاہور ۳۰ اپریل ۱۹۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا کارڈ بھی آیا ہے وہاں بھی خدا کا فضل ہے۔ آپ کی طبیعت ناساز تھی اپنی خیریت مزاج سے آگاہ فرمائیں کہ اب کیا کیفیت ہے بچوں کو دعا۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

۱۰

جواب میں خیریت کی اطلاع دی گئی تو اس خط میں اطمینان کا اظہار کیا۔

قبلہ و کعبہ ام۔ السلام علیکم

پوسٹ کارڈ مل گیا ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آج ہی ملا ہے۔ وہاں بھی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ الحمد اللہ کہ اب آپ کا مزاج بالکل ٹھیک ہے۔ موسم بھی غیر معمولی ہے۔ یہاں سب لوگ بفضلہٖ خیریت سے ہیں اور سب کی طرف سے آپ کو آداب عرض ہے۔ بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۵ مئی ۱۹۱۹ء

۱۱

انگریزی حکومت ہند اور افغانستان کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ ابا جان کی ملازمت جنگی علاقہ میں تھی اس لئے چچا جان کو بڑی تشویش رہتی۔ خیریت کی اطلاع ملنے میں کبھی دیر ہو جاتی تو گھبرا کر تار دیتے۔ خیریت کی اطلاع ملتی تو میاں جی کو بھی مطلع کرتے۔ میرا بی۔ اے کا امتحان شروع ہو گیا۔ انگریزی کا پہلا پرچہ اچھا ہو گیا تو اس خط سے میاں جی کو اس کی اطلاع دی

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

بھائی صاحب کے دو خط سات اور آٹھ تاریخ کے لکھے ہوئے مل گئے ہیں۔ میں نے آج صبح ان کو تار دیا تھا مگر تار دینے کے بعد ہی یہ خطوط مل گئے۔ الحمد للہ کہ وہ بخیر و عافیت ہیں۔ ان کی خیریت کا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ چونکہ سرکار انگریزی کی جنگ افغانستان سے شروع ہو گئی ہے اس واسطے خطوط کے ملنے میں دیر ہوئی امید ہے کہ اس صورت حال کا خاتمہ جلد ہو جائے گا۔ پھر اس قسم کی تعویق نہ ہو گی۔ میں نے تو انکو لکھا تھا کہ گرما کے مہینوں کے لئے رخصت لے لیویں مگر اب بوجہ جنگ چونکہ ان کا کام زیادہ ہو جانے کا اس واسطے ان کو رخصت نہ مل سکے گی۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے اپنی خیریت سے مطلع کریں۔ اعجاز کا پہلا پرچہ آج ہو گیا ہے۔ اور اس نے یہ پرچہ اچھا کر لیا ہے۔

والسلام محمد اقبال لاہور ۱۴ مئی ۱۹۱۹ء

۱۲

دو دن بعد پھر میاں جی کو یہ دن انگریزی کے دونوں پرچے اچھے ہو جانے کی اطلاع اس خط میں دی۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے سب طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا تار بھی آیا ہے۔ یہ تار انہوں نے معلوم ہوتا ہے از خود دیا ہے۔ یہ میرے تار کا جواب نہیں تھا کیونکہ میں نے بھی ان کو تار دیا تھا۔ بہر حال خدا کے فضل و کرم سے وہاں پر سب طرح خیریت ہے امید ہے کہ اس جنگ کا جلد خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ سرکار انگریزی کی قوت کے مقابلے پر افغان کچھ نہیں کر سکتے۔ دیگر خیریت ہے۔ اعجاز کا انگریزی کا امتحان ہو گیا ہے۔ اب تاریخ کا امتحان ہے۔ اس کے بعد اس کو آٹھ روز کی فرصت ہو گی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ یہاں آ جائے مگر وہ بورڈنگ میں رہنا پسند کرتا ہے۔ وہاں بھی بورڈنگ ہر طرح محفوظ ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ امید ہے کہ غلام نبی کا خط بھی آیا ہو گیا والسلام بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۱۴ مئی ۱۹۱۹ء

شیخ غلام نبی جن کا اس خط میں ذکر ہے میرے ماموں تھے۔ وہ بھی ملٹری ورکس میں سب ڈویژنل افسر تھے اور ان کی تعیناتی بھی سرحد کے علاقہ میں تھی۔

۱۳

دوسرے دن پھر میاں جی کو میرے پرچے اچھے ہونے کی اور ابا جان کی خیریت کی اطلاع اس خط میں دی۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آج آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ سب طرف خیریت ہے۔ اعجاز امتحان لے رہا ہے اس کے پرچوں کے متعلق پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس وقت تک اس نے کام اچھا کیا ہے امید ہے کہ آپ کی دعا برکت سے کامیاب ہو جائے گا۔ بھائی صاحب کا تار آیا تھا خیریت ہے۔ آج ان کو بھی خط لکھا ہے۔ باقی خدا کا فضل ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ جلد سے صلح کرے کیونکہ ہم اس کے مصاف کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ البتہ وہ ہم پر اپنا فضل و کرم کرے۔ بچوں کو دعا

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۰ مئی ۱۹۱۹ء

اس خط کے آخری فقروں کا پس منظر یہ ہے کہ پھوپھی کریم بی بی کی جو میاں جی کے علاوہ کہ کوئی نہیں اپنے کسی عزیز سے کچھ ان بن ہو گئی تھی۔ پھوپھی جی کے خیال میں اس ناچاقی میں زیادتی اس عزیز کی طرف سے ہوئی۔ انہوں نے میاں جی کے خط میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی طرف سے لکھا کہ اللہ تعالےٰ منصف ہے وہ انصاف کرے گا۔ اس کے جواب میں چچا جان نے لکھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے انصاف طلب نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ہم اس کے انصاف کے متحمل نہیں ہو سکتے البتہ ہمیں اس کے فضل و رحم کی استدعا کرنا چاہیئے۔

(۱۴)

ابا جان دوسرے تیسرے دن تار کے ذریعہ چچا جان کو اپنی خیریت سے مطلع کرتے تو میاں جی کی تشویش دور کرنے کے لئے وہ انہیں خیریت کا تار ملنے کی اطلاع دیتے۔ میرے امتحان کے متعلق بھی لکھتے کہ پرچے کیسے ہو رہے ہیں۔ ۱۹ مئی کو یہ خط لکھا۔

قبلہ و کعبہ ام۔ السلام علیکم

خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ بھائی صاحب کا بھی پرسوں آیا تھا۔ وہ بھی خیریت سے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کی دعا سے اعجاز امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ آیہ کریمہ کا ورد شروع ہے۔ بشیر بھی چند گھنٹوں کے لئے لاہور ٹھہری تھی۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء

اس خط میں امتحان میں میرے کامیاب ہونے کی امید کا ذکر کر کے لکھا ہے "آیہ کریمہ کا ورد شروع ہے" اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ شاید وہ آیہ کریمہ کا ورد میری کامیابی کے لئے کر رہے تھے۔ لیکن امتحان میں میری کامیابی ایسا اہم معاملہ تو نہ تھا جس کے لئے وہ آیہ کریمہ کا ورد کرتے۔ ممکن ہے کوئی اور امر درپیش ہو لیکن مجھے یاد نہیں کہ ان دنوں کوئی ایسا امر درپیش تھا جس کے لئے وہ آیہ کریمہ کا ورد کرتے میاں جی حل مشکلات کے لئے آیہ کریمہ کے ورد کی تاکید کیا کرتے تھے۔

(۱۵) تا (۱۷)

پچھلے خط کے بعد ان تین خطوط میں صرف اپنی اور ابا جی کی خیریت کی اطلاع دی ہے۔ موخرالذکر خط کی تاریخ غلطی سے ۷ مئی لکھی گئی۔ یہ خط دراصل ۷ جون ۱۹۱۹ء کا ہے جیسا کہ ڈاکخانہ کی مہر سے ظاہر ہے اس خط میں جس ظفر کا ذکر ہے وہ ہماری پھوپھی کریم بی بی کے سب سے بڑے بیٹے ظفر الحق ہیں جنہوں نے اس سال انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا کوئٹہ میں اُن کے والد ملازم تھے۔ موضع تت ضلع گوجرانوالہ میں ان کا ددھیال تھا۔

قبلہ و کعبہ ام۔ السلام علیکم

خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا ہے۔ وہ بھی خیریت سے ہیں۔ اپنی خیریت سے آگاہ فرمایئے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۴ مئی ۱۹۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

کارڈ مل گیا ہے الحمد للہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ وہاں بھی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بچوں کو دعا

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۹ مئی ۱۹۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

کارڈ مل گیا الحمد للہ کہ گھر میں ہر طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کے کل دو خط آئے تھے وہاں بھی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ ظفر کوئٹہ سے آیا ہوا ہے۔ امتحان میں پاس ہو گیا ہے۔ آئندہ کالج کی فکر کر رہا ہے۔ کل یہاں سے روانہ ہو کر تت جائے گا۔ باقی خیریت ہے۔ بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۷ مئی ۱۹۱۹ء   اصل میں جون ہے

اعجاز کا خط بھی مل گیا تھا۔

(۱۸)

پچھلے خط سے دو دن بعد پھر میاں جی کو یہ خط لکھا

لاہور ۹ جون ۱۹۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آپ کا کارڈ ابھی ملا الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ یہاں بھی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ میں امتحان کے پرچوں میں مصروف رہا اور اب تک ہوں اس واسطے خط لکھنے میں توقف ہوا انشاء اللہ جون کے آخر سب کاموں سے فراغت ہو جائے گی تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ امید ہے جون کے آخر پرچے بھی ختم ہو جائیں گے اور ریل کے سفر کی مشکلات بھی کم ہو جائیں گی۔ ظفر چلا گیا ہے میں نے اس کو ہی مشورہ دیا تھا کہ کتابیں ابھی نہ خریدے۔ پہلے تت جائے گا۔ وہاں سے سیالکوٹ آئے گا۔ اس کا ارادہ ہے کہ لاہور اسلامیہ کالج میں داخل ہو ابھی دو ماہ باقی ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۹ جون ۱۹۱۹ء

معلوم ہوتا ہے میاں جی نے انہیں سیالکوٹ آنے کے لئے لکھا ہو گا جس کے جواب میں جون کے آخر میں امتحان کے پرچوں سے فارغ ہو کر آنے کا لکھا ہے معلوم نہیں خط لکھنے میں توقف کی معذرت کیوں کی ہے کیونکہ دو ہی دن پہلے ۷ جون کو خط لکھ چکے تھے شاید وہ خط یاد نہ رہا ہو۔

(۱۹)

میں بی اے کے امتحان سے فارغ ہو کر سیالکوٹ چلا گیا تھا۔ کامیابی کی صورت میں میری خواہش ایم اے میں داخل ہونے کی تھی۔ حکومت ہند کی حکومت افغانستان کے ساتھ صلح کی بات چیت چل رہی تھی اور توقع تھی کہ ۱۹۱۹ء کے خاتمہ تک جنگ بھی

ختم ہو جائے گی اور آپ جی کی ملازمت بھی۔ میں چاہتا تھا کہ ایم اے میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ کہیں ملازمت بھی کر لوں تاکہ تعلیمی اخراجات کا بوجھ کسی پر نہ پڑے۔ میرا خیال تھا کہ چچا جان کی وساطت سے شاید پنجاب یونیورسٹی کے دفتر میں ملازمت کی صورت نکل سکے۔ چنانچہ میں نے اس کے متعلق اُن کو خط لکھا جس کے جواب میں ان کا یہ خط آیا۔

یہ خط انہوں نے خلاف معمول انگریزی میں لکھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ایم اے کے تعلیمی اخراجات کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمت کرنے کی میری تجویز انہیں پسند نہیں آئی تھی۔ اس تجویز کا مطلب غالباً یہ سمجھا گیا کہ تعلیمی اخراجات کے لئے ان سے مالی امداد ملنے کا مجھے یقین نہیں۔ شاید تجویز کے ناپسند ہونے کے اظہار کی شدّت کو کم کرنے کے لئے انگریزی زبان استعمال کی گئی ہو ۱۹۲۲ء کے ابتداء میں بھی میری ایک احمقانہ تجویز کو انہوں نے انگریزی میں جواب دے کر نامنظور کیا تھا۔ خیر اس کا ذکر بعد کے صفحات میں آئے گا۔

Lahore,
11th June, 1919.

My dear Ijaz,

Your letter. You need not bother about service yet. Let us wait till the results are out. The University Office may give you a clerkship carrying Rs. 50/- a month; but in that case you cannot, as a clerk appear at the M.A. Exam. If you secure an Asst. Professorship of History it will be much better. I am not quite sure whether History is a paying subject. Economics may be more paying than History. But this point will be considered when the results are out. After you have passed your M.A. I may try and get something for you in the Government of India. In case you do not get any job I shall, somehow or other manage to provide your expenses for the M.A.

Yours affectionately,

(MUHAMMAD IQBAL)

۲۰

میں نے اُن کے خط کا جواب نہ دیا۔ اور کوئی جواب طلب بات اُس میں تھی بھی نہیں۔ میاں جی کی طرف سے بھی اُن کے خط محررہ ۹ جون کا جواب گیا تو میاں جی کے نام اُن کا یہ خط آیا۔

قبلہ و کعبہ ام ۔ السلام علیکم

کئی دن ہوئے خط لکھا تھا امید ہے پہنچ کر ملاحظہ عالی سے گزرا ہوگا۔ اعجاز کے نام بھی خط لکھا تھا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ یہاں پر خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ آپ اپنی خیریت مزاج سے آگاہ کریں۔ بھائی صاحب کے خطوط بھی آتے جاتے ہیں وہ بھی بفضلہ

خیریت سے ہیں۔ گرمی کا سخت زور ہے۔ بارش کے کوئی آثار نہیں ایسے زور سے لاہور میں آج تک گرمی نہیں ہوئی۔ باقی خیریت ہے۔ بچوں کو دعا۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۷ جون ۱۹۱۹ء

۲۱

میاں جی کے نام ۹ جون ۱۹۱۹ء کے خط میں چچا جان نے جون کے آخر میں سیالکوٹ آنے کے ارادے کا اظہار کیا تھا لیکن اس ارادے کی تکمیل کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہو رہی تھیں۔ اُن کا تفصیلی ذکر میاں جی کے نام اس خط میں کیا۔

لاہور ۳۰ جون ۱۹۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے۔ الحمد اللہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ وہ بھی خیریت سے ہیں۔ اب تو صلح کے انتظام ہو رہے ہیں امید ہے سفر کی مشکلات کا جلد خاتمہ ہو جائے گا۔ چند روز تک شاید مزید گاڑیاں کم ہو جائیں۔ پھر موٹر کی ضرورت نہ رہے گی۔ بھائی کرم الٰہی کے موٹر اگر منگوانے گئے تو ان کو کرایہ کا بہت نقصان ہو گا۔ ذوالفقار علی خان کا موٹر موجود ہے مگر چونکہ پرانا ہو گیا ہے اتنا لمبے سفر کے قابل نہیں رہا لہٰذا میں منتظر ہوں کہ شاید ریل گاڑی کی ہی سہولت ہو جائے اس کے علاوہ منتظر رہا جاتا ہے کہ دس روز میں آ جائے گی۔ اس کا انتظار بھی کرنا ہو گا دونوں ملازم بھی اپنے اپنے گاؤں جانا چاہتے ہیں پیچھے مکان کی حفاظت کے لئے ایک آدمی کا رہنا ضروری ہے۔ اس کے لئے ابھی علی بخش نے ہشیارپور خط لکھا ہے اس کا بھی انتظار ہے۔ اگر تو کوئی راستے ہی میں شاید مل جاتا مگر ایسا آدمی پیچھے چھوڑنے کی ضرورت ہے جو قابل اعتبار ہو جہاں ایک مکان گھر بن جائے۔ ان سے لکھنے کے لئے سامان کی ضرورت ہوتی ہے پھر اور ملازم کے مقدمات کا بھی انتظام کرنا ہے۔ وہ بھی کسی کے سپرد ہو جائیں تو یہاں سے مل سکوں یہ بھی خیال ہے کہ جولائی کے مہینے میں تو میں نے چھٹی کر لی آگے دو ماہ کے لئے کچہری چھٹی کرے گی گویا تین ماہ۔ بیکاری کے ہوں گے خیر اللہ مالک ہے۔ میں مناسب موقع پر آپ کی خدمت میں لکھوں گا کہ کب حاضر ہوں گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہیں۔ بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور

اصل میں چچا جان سفر سے ہی گھبراتے تھے۔ اور مستورات کے ساتھ ریل کے سفر تو اُن کی جان جاتی تھی۔ مستورات کا ساتھ ہو تو جب تک ریل کا ڈبہ ریزرو نہ ہو سفر نہ کرتے تھے جن ایام کا ذکر ہے اُن دنوں کئی وجوہات کے باعث سفر میں بڑی مشکلات تھیں۔ کچھ پرمٹ وغیرہ کا جھنجھٹ بھی تھا۔ میاں جی نے لکھوایا تھا کہ اگر ریل کے سفر میں دقت ہے تو سفر کے لئے چھوٹے چچا کرم الٰہی کا موٹر بھجوا دیا جائے۔ یہ ہمارے سب سے بڑے پھوپھا جان کے بیٹے بھائی فضل الٰہی سے میری بڑی ہمشیرہ آپا اکبری بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپھا کا کاروبار کوئٹہ میں تھا۔ پہلے سپورٹس کے سامان کی دکان تھی۔ پھر موٹروں کی مرمت کے لئے گیراج بھی کھول لیا۔ پھر موٹر کے پرزہ جات اور موٹروں کی خرید و فروخت بھی کرنے لگے اس کام میں بڑی ترقی کی۔ ہزاروں روپیہ کمایا۔ سیالکوٹ چھاؤنی میں بھی ایک برانچ کھول دی تھی موٹر کاریں بھی ان کی اپنی تھیں جو کرایہ پر دی جاتی تھیں۔

اس خط میں نواب ذوالفقار علی خاں کے موٹر کا بھی ذکر ہے۔ یہ وہی موٹر تھا جو بقول سردار جگندر سنگھ کبھی "مانند برق تیز مثال صبا خوش" تھا معلوم ہوتا ہے یہ قصہ تھا جب کا کہ موٹر جوان تھا۔ اب بوجہ پیرانہ سالی "پاشکستہ" ہو کر لمبے سفر کے قابل نہ رہا تھا۔

مختار جن کے لدھیانے سے آٹھ دس روز میں آنے کا خط میں ذکر ہے ہماری لدھیانے والی ماں جی "مختار بیگم" تھیں۔ ان کا میکہ لدھیانے میں تھا۔

۲۲

پہلا خط لکھنے کے دوسرے دن سیالکوٹ کے ایک صاحب مستری نور دین جو اپنے کسی مقدمہ کے سلسلہ میں لاہور گئے ہوئے تھے۔ چچا جان سے ملے اور انہیں بتایا کہ وزیر آباد سے لاہور تک سفر کے لئے پرمٹ لینا پڑتا ہے اور پھر بھی گاڑی میں جگہ کا مل جانا یقینی نہیں ہوتا۔ چونکہ انہیں ایک مقدمے کے سلسلہ میں ۲۴ جولائی کو پٹیالے جانا تھا اس لئے فوراً مجھے یہ خط لکھا

لاہور ۲۹ جون ۱۹ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

آج صبح مستری نور دین سیالکوٹ سے آیا تھا وہ کہتا تھا کہ سیالکوٹ سے وزیر آباد تک تو کوئی دقت سفر کی نہیں ہے مگر وزیر آباد سے لاہور تک آنے میں بہت دقت ہے۔ وہاں سے پرمٹ لینا چاہیئے اور پرمٹ ملنے پر بھی یقینی نہیں کہ گاڑی میں جگہ مل جائے۔ اس معاملے کی تحقیق کر کے مجھے جلد خط لکھو۔ کیونکہ ۲۴ جولائی کو مجھے پٹیالہ جانے کے لئے سیالکوٹ سے واپس آنا ہوگا۔ اگر واپس آنے میں دقت ہو تو پھر میں سب کام کر کے آؤں کہ دو ماہ تک پھر واپس آنا نہ پڑے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب۔ بچوں کو پیار

محمد اقبال

۲۳

میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مین لائن پر ریل گاڑیوں میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ فوجی نقل و حرکت کی وجہ سے گاڑیوں کے نظام اوقات غیر یقینی ہیں۔ پرمٹ ہو تو ٹکٹ تو مل جاتا ہے لیکن گاڑی میں جگہ کا ملنا یقینی نہیں ہوتا۔ میں نے صورت حال سے مطلع کیا اور لکھا کہ وہ پٹیالے والا کام نپٹا کر ہی آئیں۔ پھوپھا کرم الہٰی مصر تھے کہ اگر ریل کے سفر میں دقت ہو تو ان کا موٹر استعمال کیا جائے اور اُن کے نقصان کی فکر نہ کی جائے۔ میں نے اس کے متعلق بھی انہیں مطلع کر دیا۔ جواب میں یہ خط آیا۔ خط میں انہوں نے "سردیوں میں اپنا موٹر خریدنے" کا ذکر تو کیا ہے لیکن یہ ارادہ کہیں ۵ سال بعد ۴۴ء میں پورا ہوا جب انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر خریدا۔

لاہور ۸ جولائی ۱۹ء

برخوردار اعجاز کو بعد دعائے عمر درازی کے واضح ہو تمہارا خط مل گیا تھا۔ طاہر دین پھر پشاور گیا ہے کل امید ہے واپس آ جائے گا۔ تمہارے ابا کا خط بھی آج آیا تھا۔ وہاں ہر طرح خیریت ہے۔ طاہر دین بھی زبانی پیغام خیریت کا لے آئے گا۔ اس سے پیشتر بھی طاہر دین گیا تھا۔ اس کے متعلق پہلے لکھ چکا ہوں۔

میں انشاء اللہ ۱۴ جولائی کو یہاں سے سیالکوٹ آنے کا قصد رکھتا ہوں اگر ریل کے سفر کی حالت بدستور رہی تو موٹر کے لئے تم کو تار دوں گا یا خط لکھ دوں گا۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آیا موٹر میں اتنے آدمیوں کے لئے جگہ ہوگی پھر کچھ تھوڑا بہت اسباب بھی ہوگا۔ معلوم نہیں بھائی کرم الہٰی کے موٹر میں کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ تین آدمی تو ہم ہوں گے۔ دو نوکر یعنی کھانا پکانے والی عورت اور اس کی لڑکی۔ ان سب کے علاوہ تم اور موٹر ہانکنے والا کل سات آدمی ہوں گے۔ دو تین ٹرنک اسباب بھی ہوگا۔ غرضیکہ تم یہ سب امور پہلے دیکھ کر مجھے مطلع کرو کہ آیا اس موٹر میں اس قدر وسعت ہے۔ اگر ہو تو جب میں لکھوں تم موٹر لے کر آ جانا۔ یہاں سے سیالکوٹ تک گوجرانوالہ کے رستے صرف تین چار گھنٹے کا سفر ہے صبح پانچ بجے چل کر ۸ یا ۹ بجے سیالکوٹ پہنچ سکتے ہیں۔ پٹرول وہیں سے خرید لینا قیمت ادا کر دی جائے گی کیونکہ ممکن ہے یہاں سے نہ ملے یا گراں ملے۔

میں نے آج نواب صاحب کو بھی شملہ خط لکھا ہے کہ ان کا موٹر مرمت ہو کر سفر کے قابل ہوا یا نہیں۔ امید نہیں کہ ہوا ہو کیونکہ یہاں پر ان کے آدمیوں سے آج کل کوئی نہیں ہے۔ مذکورہ بالا امور کے متعلق مجھے جلد آگاہی دو۔ انشاء اللہ سردیوں میں شاید میں اپنا موٹر خرید لوں گا۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں میری طرف سے آداب کہیں۔ تم اپنے نتیجہ امتحان کی طرف سے مطمئن رہو۔ انشاء اللہ ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ اب یہ سوچنا چاہئے کہ ایم اے میں کون سا مضمون لو گے۔ باقی خیریت ہے۔ وسیمہ کو پیار

محمد اقبال۔ لاہور

۲۴

جولائی ۱۹ء کے دوسرے ہفتے میں مجھے ایک دوست کی برات کے ساتھ لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو میں چچا جان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ پھوپھا جی کی کار کے متعلق میں نے بتلا دیا کہ موٹر بڑا ہے۔ اس میں سب کے لئے گنجائش نکل آئے گی چنانچہ چچا جان نے سفر کے لئے ۲۹ جولائی مقرر کی اور کہا کہ وہ مجھے بذریعہ تار کار لانے کو کہیں تو میں کار لے کر لاہور آ جاؤں۔ اس پروگرام سے انہوں نے میاں جی کو بھی اس خط کے ذریعہ مطلع کیا۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا ہے۔ وہاں بھی خدا کا فضل ہے۔ یہ خدا تعالیٰ نے اچھا سبب بنا دیا ہے۔ بھائی صاحب کی خیر خیریت ہر دوسرے تیسرے روز مل جاتی ہے۔ یا تو کوئی آدمی وہاں سے آ جاتا ہے یا دستی خط آ جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ خدا کا خاص فضل ہے۔ اعجاز برات پر آیا تھا اور مجھ سے بھی ملا تھا۔ اب وہ گھر پہنچ گیا ہے۔ امید ہے آپ کو اس نے سب حالات بتائے ہوں گے۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ آپ کی زندگی میں یہ خوشی نصیب ہوئی۔ بارش کل تھوڑی سی ہوئی تھی مگر آج گرمی بدستور ہے۔ انشاء اللہ میں ۲۹ جولائی کو حاضر ہونے کا قصد رکھتا ہوں موٹر منگوا لیا جائے گا۔ گھر کے سب آدمی اس میں آ جائیں گے۔ ذوالفقار علی خاں کا موٹر مرمت ہو رہا ہے اور امید نہیں کہ اس کی مرمت آخر جولائی تک مکمل ہو۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۱۰ جولائی ۱۹ء

چچا جان نے یونیورسٹی کے دفتر سے میرے بی۔ اے کے امتحان کے نتیجہ کا پتہ کرا لیا تھا اور مجھے میری کامیابی کی اطلاع دے دی تھی۔ چونکہ ابھی نتیجہ یونیورسٹی کی طرف سے مشتہر نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے مجھے تاکید کر دی تھی کہ سوائے گھر کے لوگوں کے اور کسی سے اس

کا ذکر کیا جائے۔ خط میں لکھا ہے کہ امید ہے اعجاز نے آپ کو سب حالات بتا دیئے ہوں گے۔ "سب حالات" سے مراد امتحان میں میری کامیابی کی خبر تھی اور یہی مراد اس فقرہ سے تھی۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ آپ کی زندگی میں یہ خوشی نصیب ہوئی۔"

۲۵

جس دن موخر الذکر خط لکھا گیا اُسی شام بی اے کا نتیجہ مشتہر ہو گیا۔ اس پر دوسرے دن میاں جی کو امتحان کے نتیجے کی اطلاع اس خط میں دی جس میں مشورہ دیا کہ مجھے اب لا کالج میں داخلہ لینا چاہیئے۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

اعجاز کے امتحان کا نتیجہ کل شام نکل گیا۔ پاس ہو گیا ہے آپ کو اور بھاوج صاحبہ کو مبارک ہو۔ اب اس کو یہ سوچنا چاہیئے کہ ایم اے میں داخل ہو یا قانون کے امتحان ایل ایل بی میں داخل ہو۔ دونوں امتحانوں کے لئے دو سال ہیں۔ ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے میں بھی بہت سے فوائد ہیں۔ بھائی صاحب کی خدمت میں بھی میں نے یہی لکھا ہے اعجاز کو بھی اپنی قابلیت کا جائزہ لینا چاہیئے۔ وکیل کا کام اگر بہت نہ بھی چلے تو روڈھائی سو روپیہ ماہوار کما لیتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پہلے چند سال محنت کرنی پڑتی ہے اور انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اس پر غور کرنے کے بعد مجھے بھی لکھے کہ اس کی طبیعت کا میلان کدھر ہے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۹ جولائی ۱۹ء

۲۶

پچھلے خط میں ارشاد تھا کہ میں آئندہ تعلیم کے متعلق اپنی طبیعت کے میلان سے انہیں مطلع کروں۔ چونکہ میری طبیعت ایم اے میں داخلہ لینے کی طرف راغب تھی اس لئے میں نے فی الفور جواب نہ دیا۔ اس پر انہوں نے میاں جی کے نام یہ خط لکھا۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ یہاں پر بھی خدا کے فضل سے ہر طرح خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا وہ بھی خیریت سے ہیں۔ اعجاز کے متعلق جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور میرے باقی دوستوں نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا ہے اگر اس نے محنت کرکے یہ امتحان پاس کر لیا تو مجھے یقین ہے آئندہ زندگی میں بہت فائدہ اٹھائے گا۔ اگر پریکٹس نہ بھی کرے تو ملازمت کے حصول میں آسانی ہوگی۔ بھائی صاحب کا خط ابھی اس بارے میں نہیں آیا اور نہ یہ معلوم ہوا ہے کہ اعجاز کی رائے کیا ہے۔

بارش یہاں پر بھی ہوئی ہے۔ ہوا کا سوز کم ہو گیا ہے اور وہ تپش نہیں رہی۔ مگر بارش کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔ مطلع ابر آلود ہے امید ہے کہ اور بھی برسے گا۔ پشاور میں بھی ابھی کچھ بہت بارش نہیں ہوئی۔ بھائی صاحب کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ تھوڑی سی بارش ہو گئی ہے۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام محمد اقبال لاہور ۳۰ جولائی ۱۹ء

۲۷

جس مقدمہ کی پیروی کے لئے چچا جان پشاور گئے تھے اس میں کامیاب ہو کر وہ ۲۶ جولائی کو لاہور واپس آ گئے اور اسی دن میاں جی کو یہ خط لکھا جس میں یہ بھی ارشاد ہوا کہ ان کا تار ملنے پر میں ۳۰ جولائی کو موٹر لاہور لے آؤں۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

پشاور کے مقدمہ سے فارغ ہو کر میں آج صبح واپس آ گیا ہوں۔ مقدمہ میں بھی کامیابی ہوئی۔ یہ وہاں کے ایک پیرزادہ خاندان کا مقدمہ تھا جو تمام ریاست میں مشہور تھا۔ اب ۲۸ جولائی کو لاہور میں ایک مقدمہ ہے۔ اس سے فارغ ہو کر انشاء اللہ ۳۰ جولائی کو حاضر خدمت ہونے کا قصد ہے۔ اعجاز ۳۰ کو یہاں موٹر لے آئے۔ مگر میں تار بھی دوں گا۔ میرا تار ملنے پر موٹر لائے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۶ جولائی ۱۹ء

۲۸

۳۰ جولائی کو موٹر لاہور لانے کے لئے ان کا تار نہ ملا۔ معلوم ہوتا ہے وہ ریل کا ڈبہ ریزرو کرانے کی کوشش میں تھے اور ۲ اگست کی رات کی ایک پسنجر ٹرین سے ریزرویشن ہو بھی گئی۔ چنانچہ ۲ اگست کو مجھے تار کے ذریعہ اس امر سے مطلع کیا اور موٹر لانے سے منع کر دیا۔ جس ٹرین سے ریزرویشن ہوئی وہ وزیر آباد جنکشن پر صبح ۴ یا ۵ بجے پہنچتی تھی۔ جہاں سے سیالکوٹ جانے کے لئے گاڑی بدلنا ہوتی تھی۔ اُن دنوں اس گاڑی کے لئے وزیر آباد اسٹیشن پر چند گھنٹے انتظار کرنا ہوتا تھا۔ گھر میں طے پایا کہ میں چچا جی کا موٹر لے کر ۲ اگست کی شام کو وزیر آباد چلا جاؤں اور ۳ اگست کی صبح کو چچا جان کے قافلہ کو موٹر میں سیالکوٹ لے آؤں۔ اس فیصلے کے مطابق میں اور میرا خالہ زاد بھائی فیض مرحوم جو موٹر چلانا جانتا تھا وزیر آباد پہنچ گئے۔ وزیر آباد جاتے میں تو موسم اچھا بھلا تھا لیکن رات کو بارش شروع ہو گئی۔ برسات کا موسم تو تھا ہی بادل ایسا ٹوٹ کر برسا کہ جل تھل ہو گیا۔ رات پلیٹ فارم پر بڑی خواری میں کٹی۔ ٹرین آئی تو قافلہ مقصود غائب۔ جب اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ لاہور سے آنے والا قافلہ کسی وجہ سے اس ٹرین میں سوار نہیں ہو سکا تو واپس سیالکوٹ کا رُخ کیا۔ اُس وقت تک بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ وزیر آباد سے سیالکوٹ جائیں تو راستے میں پہلا بڑا قصبہ سودھرا پڑتا ہے۔ اُن دنوں اس کے قریب ایک برساتی نالہ تھا جو عام طور پر تو خشک رہتا تھا لیکن زیادہ بارش ہو تو اس کا پانی پختہ سڑک پر آ جاتا تھا۔ جس کے گزرنے کے لئے پختہ سڑک میں ایک گیپ (Gap) بنا ہوا تھا۔ ہم اس کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ برساتی نالے کے پانی سے جو سڑک کے گیپ سے گزر رہا تھا راستہ مسدود تھا۔ رات کی کوفت کی وجہ سے فیض کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ "بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے" پر عمل کرتے ہوئے اپنے آہنی گھوڑے کو نالے کے بہتے پانی میں موڑ دیا۔ اُس وقت پانی کافی گہرا تھا۔ موٹر نے نالے کو پار تو کر لیا لیکن اس کے بعد نہیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ فیض نے سب جتن کر دیکھے۔ سودھرے سے کرایہ پر آدمی لاکر دھکم دھکیل بھی کرائی لیکن "یا حفیظ" کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا۔ جب متوقع وقت تک ہم سیالکوٹ نہ پہنچے تو سمجھ لیا گیا کہ ہم پر کوئی افتاد پڑی ہے۔ چونکہ خیال تھا کہ لاہور کا

والد بھی ساتھ ہے۔ اس لئے وہاں سے دو موٹروں میں ایک ریلیف پارٹی روانہ کی گئی جس میں میرے دو پھوپھی زاد بھائی فضل الٰہی مرحوم اور فضل حق مرحوم۔ میرا منجھلا بھائی امتیاز مرحوم اور ایک ماہر مکینک تھا شامل تھے۔ انہوں نے سودھرے کے قریب ہی سڑک پر رکا ہوا پایا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ موٹر کے انجن میں پانی پہنچ جانے کی وجہ سے نقص ہو گیا ہے اور بغیر مرمت اسٹارٹ نہیں ہوگا۔ چنانچہ سودھرے سے مضبوط رسّے خرید کرائے گئے اور خراب شدہ موٹر کو دوسرے موٹر کے پیچھے رسّوں سے باندھا گیا اور ہم لوگ سیالکوٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ اتنے میں بارش پھر تیز ہو گئی۔ چونکہ جو موٹر خراب شدہ موٹر کو کھینچ کر لے جا رہا تھا، اس کو تیز چلانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے ہم لوگ بارش میں بھیگتے خراماں خراماں شام تک گھر پہنچے۔ اس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ چچا جان کا قافلہ لاہور سے کیوں روانہ نہ ہو سکا تھا۔ اس کی وجہ میرے نام اس خط کے آنے سے معلوم ہوئی۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

کل میں نے تمہیں تار دیا تھا کہ موٹر نہ لاؤ وجہ یہ تھی کہ بڑی سعی سفارش سے گاڑی سیالکوٹ تک ریزرو کرائی تھی مگر عین وقت پر جب کہ ہم لوگ سٹیشن پر جا چکے تھے۔ ریل والوں نے جواب دے دیا کہ گاڑی بوجہ ملٹری افسروں کے آ جانے کے نہیں دی جا سکتی چنانچہ رات کے ایک بجے میں مع عیال سٹیشن سے واپس آیا اور اس قدر روحانی اور جسمانی تکلیف ہوئی کہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ یہ تکلیف اس قدر ہمت شکن ہے کہ اب ریلوے سفر کی دوبارہ ہمت مجھ میں باقی نہیں ہے۔ جب بارش ختم ہو جائے اور سڑک وغیرہ ٹھیک ہو جائے تو موٹر لے آنا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کرنا۔ بچوں کو دعا۔

محمد اقبال لاہور ۲ اگست ۱۹ء

۲۹

ہم پر جو گزری میں نے اُس کی تفصیل لکھ بھیجی۔ آئندہ تعلیم کے متعلق میں نے لکھا کہ میری طبیعت کا میلان ایم اے یا پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کی طرف ہے۔ قانون کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی کیونکہ میں تقریر کے فن سے نابلد ہوں۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ قانون کے پیشے میں اس فن میں مہارت ضروری ہے۔ جواب میں ان کا یہ خط موصول ہوا۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ خیریت ہے۔ ایل ایل بی کا جو مشورہ میں نے تم کو دیا تھا اس میں مندرجہ ذیل امور میرے ذہن میں تھے۔ (۱) ایل ایل بی پاس کر لینے کے بعد اگر تم پریکٹس نہ کرو تو عمدہ ملازمت ملنے میں سہولت ہوتی ہے (۲) اگر پریکٹس کرو تو کام میں تم کو خود سکھا سکتا ہوں اور گھر میں جو کتب خانہ قانونی کتابوں کا جمع ہو رہا ہے اس سے بھی تم فائدہ اٹھا سکو گے۔ یہ کام مذاق کا اس قدر نہیں جس قدر کہ محنت اور تجربے کا ہے۔ پریکٹس سے آدمی اس کے سب پہلو سیکھ جاتا ہے۔ البتہ اعلیٰ درجے کے قانونی کام کے لئے جس میں بڑی بڑی تقریروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مذاق اور قابلیت کی ضرورت ہے سو وہ پنجاب میں فی الحال ہیں نہیں۔ (۳) تین سال کی پریکٹس کے بعد اگر تم پریکٹس کرو تو ہائی کورٹ کے وکیل ہو جاؤ گے۔ اس وقت اگر حالات مساعدت کریں تو تم کو دو سال کے لئے ولایت بھیج دیا جائے گا جہاں سے آسانی بیرسٹری کر آ سکو گے۔ لیکن اگر تمہاری طبیعت اس سے متنفر ہے تو پھر پی ایچ ڈی پر میں امتحان ایم اے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد تم کو کالج میں ملازمت مل سکتی ہے بشرطیکہ ایم اے عمدہ طور پر پاس کرو۔ موجودہ صورت میں عمدہ ملازمت ملنا مشکل ہے۔ ایل ایل بی یا ایم اے مزید [illegible] پریکٹس کا ارادہ نہ بھی ہو تو ان دونوں میں سے کسی [illegible] کو حاصل کرنا چاہیئے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب: ان کا کارڈ بھی مل گیا ہے۔ زیبتین کو سخت تکلیف ہوئی مگر والد مکرم کی خدمت میں عرض کریں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ معاً ایک مقدمہ مل گیا جس میں معقول فیس مل گئی۔ اگر میں گاڑی پر سوار ہو جاتا تو اس سے محروم رہتا۔ والسلام

محمد اقبال لاہور ۷ اگست ۱۹ء

آموں کی کوئی اور پیٹی آئے تو اُسے کھول کر ریل سے آم لے لینا چاہیئے۔

۳۰

معلوم ہوتا ہے ۲ اگست کی رات کو جو کوفت انہیں ہوئی اس سے وہ اور چچی سردار دونوں کچھ علیل ہو گئے۔ جس کی اطلاع مجھے اس خط میں دی۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ والد مکرم کا خط بھی ساتھ ملا اور ادھر سے بھائی صاحب کا خط بھی آ گیا۔

غلام نبی کا میرے پاس مبلغ چار سو روپیہ ہے۔ تم ان کو وہاں سے دے دو۔ طاہر دین کے پشاور جانے کی اب ضرورت نہیں رہی کیونکہ بھائی صاحب لکھتے ہیں کہ وہ خود سیالکوٹ آئیں گے۔ پیچش کی وجہ سے صاحب فراش ہوں چونکہ اس موسم کی پیچش کے بڑھ جانے کا امکان ہے۔ اس واسطے آج صبح اس کا ٹیکہ لگوایا ہے۔ تمہاری چچی بھی کئی دن سے بیمار تھی اب اس کو آرام ہے۔ باقی خدا کا فضل ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔ والسلام

محمد اقبال ۱۱ اگست ۱۹ء

۳۱

مؤخر الذکر خط میں وہ کچھ باتیں لکھنا بھول گئے تھے۔ لہٰذا دوسرے دن مجھے یہ خط لکھا۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

کل میں نے تمہیں خط لکھا تھا مگر ایک دو باتیں بھول گیا۔ (۱) کشمیرے کا سوٹ تم بنا لو فی الحال مجھے ضرورت نہیں۔ (۲) قانون کے متعلق جو مشورہ تم کو دیا گیا اس میں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں کوئی مجبوری نہیں اگر تمہاری طبیعت خود اس فیصلے پر صاد کرے تو اس پر عمل کرنا چاہیئے ورنہ کوئی ضرورت نہیں بصورت دیگر ایم اے میں داخل ہو سکتے ہو۔

(۳) یہ بات دریافت طلب ہے کہ جب موٹر تم فیروز آباد لانے تھے تو کیا سڑک کی خرابی کی وجہ سے موٹر کو کوئی نقصان پہنچ گیا تھا؟ اگر ایسا ہوا تو کیا نقصان ہوا؟ باقی خیریت ہے۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۰ اگست ۱۹[illegible]ء

اس خط میں جن تین باتوں کا ذکر ہے ان کی وضاحت کرتا چلوں۔

(۱) ابا جی نے پشاور سے چچا جان کے سوٹ کے لئے کشمیرے کا کپڑا بھیجا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر کہ مجھے فی الحال ضرورت نہیں وہ کپڑا مجھے عطا کر دیا۔ غالباً اس لئے کہ مجھے ایم اے یا ایل ایل بی میں داخلہ لینا تھا۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ اس کے پاس ڈھنگ کا ایک سوٹ تو ہونا چاہیئے۔

(۲) چونکہ میں آئندہ تعلیم کے متعلق لکھ چکا تھا کہ قانون کی طرف میری طبیعت راغب نہیں اور ان کا مشورہ ایل ایل بی میں داخلے کا تھا اس لئے انہوں نے یہ وضاحت کر دی کہ اُن کے مشورہ پر عمل کرنے کی کوئی مجبوری نہیں۔

(۳) موٹر کی خرابی کے واقعہ کی تفصیل لکھی جا چکی ہے۔ نقصان کے متعلق استصواب اس لئے کیا گیا تھا کہ اُس کا معاوضہ ادا کیا جائے۔ وہ معاملہ کے بڑے صاف اور لین دین کے کھرے تھے۔ بعد میں جب سیالکوٹ آئے تو معاوضے کی ادائیگی کرنے پر اصرار کرتے رہے۔ اُدھر ہمارے چھوٹے چچا کرم الٰہی بھی بڑی اونچی ناک رکھتے تھے وہ کسی طرح معاوضہ لینے پر رضامند نہ ہوتے تھے۔ آخر میاں جی نے یہ کہہ کر بات ختم کرادی کہ موٹر کے انجن میں جو خرابی ہو گئی تھی وہ تو امتیاز نے ٹھیک کر دی اور اُس پر کوئی خرچ نہیں ہوا۔

(۳۲)

اگرچہ میرے نام اپنے ۲۰ اگست والے خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ ۲۰ اگست والے واقعہ سے جو تکلیف انہیں ہوئی وہ اس قدر ہمت شکن ہے کہ اب دوبارہ ریل سے سفر کی ہمت ان میں باقی نہیں۔ لیکن افغانستان کے ساتھ ۶ ماہ کے لئے عارضی صلح ہو جانے کی وجہ سے ابا جان کو ہفتہ دو ہفتہ کی رخصت ملنے کی امید ہو گئی۔ لہٰذا سیالکوٹ آنے کے لئے چچا جان نے پھر ریل کا ڈبہ ریزرو کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ اِس کی اطلاع مجھے اِس خط میں دی۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

بھائی صاحب نے لکھا تھا کہ کشمیرے کے کوٹ کے لئے اَستر سیالکوٹ سے خرید نہ کرنا۔ وہیں سے بھیجا جائے گا۔ میں پھر گاڑی ریزرو کرانے کی کوشش کر رہا ہوں اُمید ہے دو تین روز تک ہو جائے گی۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا وہ بھی خیریت سے ہیں۔ افغانستان کے ساتھ چھ ماہ کے لئے عارضی صلح ہو گئی ہے اب امید ہے ان کو ہفتہ دو ہفتہ کے لئے رخصت مل سکے گی۔

والدعا

محمد اقبال لاہور ۱۳ اگست ۱۹[illegible]ء

(۳۳)

چونکہ ۱۵ اگست والے خط میں انہوں نے اپنی اور چچی سردار کی علالت کا ذکر کیا تھا۔ اس لئے سیالکوٹ میں سب کو تشویش ہوئی اور دریافت حال کے لئے خط لکھے گئے جواب میں انہوں نے مجھے یہ خط لکھا۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ والد مکرم اور بھائی صاحب کے خطوط بھی اس کے ساتھ ہی ملے۔ الحمد للہ کہ سب طرف خیریت ہے۔ جاوید کی پیچش سے اب بالکل آرام ہے اور تمہاری چچی بھی تندرست ہے اس کی گردن و بازو پر گرمی دانے نکلے تھے جو بڑھ کر پھوڑے بن گئے کہ ان میں پانی پڑ گیا تھا۔ اب اسے بھی بالکل آرام ہے۔ باقی خدا کا فضل ہے۔ والد مکرم کے نام ابھی خط لکھ چکا ہوں۔ ڈاک میں ڈالنے کے بعد تمہارا خط پہنچا۔ والد مکرم کی خدمت میں عرض کریں کہ اب کوئی شکایت نہیں۔ جاوید کا محض احتیاطاً ٹیکہ کروایا گیا تھا کہ پیچش طویل نہ ہو جائے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۱۷ اگست ۱۹[illegible]ء

(۳۴)

داخلے کا وقت قریب آرہا تھا اور میں ابھی آخری فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ کیا کروں۔ ذہن ناپختہ تھا اور مجھ میں کچھ خود رائی کا مادہ بھی تھا۔ آخر میں نے انہیں لکھ دیا کہ میری طبیعت قانون کی طرف بالکل راغب نہیں ہوتی اور میں ہسٹری میں ایم اے کرنا چاہتا ہوں۔

اس کے جواب میں اُن کا یہ خط آیا۔

لاہور ۲۰ اگست ۱۹[illegible]ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

بعد دعا کے واضح ہو تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ گھر میں ہر طرح خیریت ہے۔ والد مکرم کا کوئی خط تمہارے متعلق ابھی نہیں ملا۔ بہرحال اگر تمہاری طبع کا میلان قانون کی طرف نہیں ہے تو بہتر ہے ایم اے کلاس میں داخل ہو جاؤ۔ یہ سب کچھ میں تم کو پہلے لکھ چکا ہوں۔ حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی کا اگر تمہیں خیال ہے تو فارسی اور اردو میں اچھی لیاقت پیدا کرنی چاہیئے۔ خود ہسٹری کے مطالعہ کیلئے بھی فارسی بلکہ عربی کی بھی ضرورت ہے۔ عربی نہ سہی تو فارسی کے بغیر کام چلانا مشکل ہے بشرطیکہ اور بہتر کام مقصود ہو۔ میں ابھی سیالکوٹ آنے کے لئے چند روز کا اور انتظار کروں گا۔ اگر گاڑی مل گئی تو ضرور آؤں گا۔ بارش پھر ہو رہی ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ بچوں کو دعا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔

محمد اقبال

(۳۵)

لکھنے کو تو میں نے لکھ دیا کہ ایم اے میں داخلہ لینا چاہتا ہوں لیکن تذبذب کی کیفیت بدستور تھی۔ دو چار احباب سے مشورہ کیا تو وہ بھی قانون کے حق میں تھے۔ میاں جی تو شروع سے کہہ رہے تھے کہ اقبال کی رائے صائب ہے تمہیں اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ میرے یہ اندیشہ بھی تھا کہ ابا جان رخصت پر گھر آ رہے ہیں۔ یہ بات اُن تک بھی پہنچے گی اور وہ چچا جان کی طرح آسانی سے میرے اپنے میلان طبیعت کے مطابق ایم اے میں داخلہ لینے پر رضامند نہیں ہوں گے بلکہ مُصر ہوں گے کہ چچا جان کی رائے پر عمل کیا جائے۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے انہیں لکھا کہ چونکہ اکثریت کی رائے قانون کے

حق میں ہے لہٰذا میں نے ایل ایل بی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس پر انہوں نے یہ جواب دیا۔

لاہور ۱۹ اگست ۱۹۱۹ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

بعد دعا کے واضح ہو تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ والد مکرم کی علالت کی خبر سے تردد ہے۔ ان کی خیریت سے جلد آگاہ کرنا چاہیئے۔ انشاء اللہ میں بھی دو چار روز تک حاضر ہوں گا۔ گاڑی کے ریزرو کرانے کی بھی کوشش کر رہا ہوں۔ کھانے کے لئے انہیں ساگودانہ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اراروٹ دیا جائے۔

قانون کے متعلق تم نے فیصلہ کر لیا ہے تو بہتر چشم ما روشن دل ما شاد مگر تم تو کہتے تھے کہ طبیعت ہی ادھر راغب نہیں بیچارگی کی رائے طبیعت میں رغبت نہیں پیدا کر سکتی۔ بہرحال اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو بہتر ہے۔ میں مکان کی تبدیل کے فکر میں ہوں۔ لیکن اب تک کوٹھی نہیں مل سکی۔ جب تک کوٹھی نہ ملے تم لاکالج ہوسٹل میں رہو یا مسلم ہوسٹل میں۔ مرزا یعقوب بیگ صاحب کو اس بارے میں لکھ دوں گا۔ فی الحال تم لاکالج کے پرنسپل کے نام ایک عرضی ایڈمشن کے لیے لکھ دو (لالہ کنورسین ایم اے بیرسٹر ایٹ لا پرنسپل لاکالج لاہور) یہ اس واسطے ہے کہ ایک مقررہ تعداد (۲۰۰) سے زیادہ ایڈمٹ نہیں کی جاتی۔ تمہاری عرضی وقت پر پہنچ جانی چاہیئے۔ بہتر ہو کہ ابھی لکھ دو۔ وقت پر میں بھی ان کو خط لکھ دوں گا۔ امید ہے اس میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ تمہارا بستر ابھی تک نہیں ملا۔ علی بخش یہاں نہیں ہے۔ دوسرے ملازم کو بھیجا تھا مگر جو لڑکا بستر لایا تھا وہ وہاں موجود نہ تھا اور اس کے ساتھیوں نے بستر دینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس لڑکے کے آنے پر بستر دے دیں بھجوا دیا جائے گا مگر اب تک انہوں نے بستر نہیں بھیجا آج پھر آدمی ارسال کروں گا۔ والسلام

والد مکرم کی خدمت میں آداب محمد اقبال لاہور

(۳۶)

میرے خط میں میاں جی کی طبیعت ناساز ہونے کا ذکر تھا اس لئے پہلا خط لکھنے کے دوسرے دن انہوں نے میاں جی کو یہ خط لکھ کر مزاج پرسی کی اور لکھا کہ وہ ریل کے ڈبہ کی ریزرویشن کی کوشش کر رہے ہیں اور جلد سیالکوٹ آئیں گے۔

قبلہ و کعبہ السلام علیکم۔ آپ کا خط مل گیا تھا لیکن آپ کی علالت طبع سے تردد ہے۔ اعجاز کا خط بھی آیا تھا میں نے اسے لکھا ہے کہ آپ کی خیریت سے آگاہ کرے۔ گاڑی کا انتظام ہو جائے گا آج باقاعدہ درخواست کروں گا امید ہے کہ تین دن میں گاڑی مل جائے گی پھر میں انشاء اللہ حاضر خدمت ہوں گا اور سب کو ہمراہ لاؤں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے اپنی خیریت سے آگاہ فرمائیے۔ بچوں کو دعا۔ والسلام

محمد اقبال ۱۹ اگست ۱۹۱۹ء لاہور

(۳۷)

میں نے میاں جی کی خیریت کی اطلاع دی اور ان کے اطمینان کے لئے خود میاں جی سے بھی اپنی طرف سے خط لکھوا دیا۔ اس خط میں میں نے پھر قانون کی طرف رغبت نہ ہونے کا رونا رویا۔ جواب میں یہ خط لکھ کر ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط اور والد مکرم کا کارڈ ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ گھر میں خیریت ہے۔ ابھی ایک خط ڈاک میں ڈال چکا ہوں۔

مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ تم ہسٹری کے طالب علم ہو اور تمہیں قانون سے رغبت نہیں کہ ان دونوں علوم کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ بہرحال جب تم قانون پڑھو گے تو مجھے امید ہے تم کو اس سے رغبت ہو جائے گی۔ کتابیں تم کو سب خرید کرنی چاہیئے۔ کہ مجھے بروقت پریکٹس میں ان کی ضرورت رہتی ہے البتہ [illegible] اور [illegible] دونوں سیالکوٹ کی کتابوں میں دیکھو شاید وہاں سے مل جائیں ممکن ہے کہ [illegible] جو رکھی ہوئی ہیں لیکن یقینی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے علاوہ میرے پاس پرانی ایڈیشن ہیں تم کو نئی ایڈیشن پامک وغیرہ کی خرید کرنی چاہئیں لالہ کنورسین کے نام میرے حوالے سے ایک خط لکھ دو فارم بعد میں پُر کر دیا جائے گا۔ ہر معاملے میں اپنی رائے کو دخل نہ دیا کرو۔ اس ضمن میں جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ اس واسطے تھا کہ میں نے لالہ کنورسین صاحب سے تمہارا عرصہ ہوا ذکر کر دیا تھا۔ پھر تم لاہور آؤ گے تو ایک دستی خط ان کے نام دوں گا۔ امید تو نہیں کہ تین سو سے زائد درخواستیں ہوں تاہم یہ سب کچھ میں نے ازراہ احتیاط کیا تھا۔ باقی خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں عرض کر دیں کہ کوٹھی کی تلاش میں ہوں تعویق اس واسطے ہوئی کہ کوٹھی موقع پر نہیں ملتی اور جو کوٹھیاں موقع پر ہیں ان کے مالک ہندو ہیں جو قدرتی طور پر ہندو کرایہ داروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ کوٹھی نہ ملنے کی اصل وجہ یہ ہے۔ کم بخت نے وعدہ کیا اور بعد میں بدعہدی کر کے جو آج کل کے مسلمانوں کا عام شیوہ ہے کوٹھی کسی اور کو دے دی۔

والسلام
محمد اقبال لاہور

اس وقت تو اپنی کم فہمی کی وجہ سے شاید اس ڈانٹ کے جواز کا احساس نہ ہوا ہو لیکن اب تو سمجھتا ہوں کہ اپنی متلون مزاجی پر میں اس سے زیادہ سرزنش کا سزاوار تھا کیونکہ وہ لاکالج کے پرنسپل سے میرا ذکر کر چکے ہوئے تھے۔

اس خط میں مجھے قانون کی کتابیں خرید کرنے کے متعلق ہدایت کرتے ہوئے دو کتابوں کی نسبت لکھا ہے کہ سیالکوٹ کی کتابوں میں دیکھو شاید وہاں مل جائیں۔ مراد وہ کتابیں تھیں جو انگلستان جاتے وقت وہ سیالکوٹ چھوڑ گئے تھے۔ چونکہ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے خود بھی پنجاب یونیورسٹی کا قانون کا امتحان دیا تھا۔ اس لئے انہیں خیال ہوگا کہ قانون کی وہ دو کتابیں جن کا ذکر خط میں ہے۔ سیالکوٹ والی کتابوں میں ہوں گی لیکن قانون کی کوئی کتاب ان کتابوں میں نہ تھی۔

اس خط کے آخر میں میاں جی کے نام کوٹھی کے متعلق جو پیغام ہے وہ قابل توجہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں بھی ہندو مالکان اپنی جائیداد کرایہ پر دینے کے لئے ہندو کرایہ داروں کو ترجیح دیتے تھے گویا اس معاملے میں بھی چھوت چھات پر عامل تھے۔ خط میں جس مسلمان مالک مکان کی بدعہدی کا ذکر ہے اس کا نام میں نے دانستہ حذف کر دیا ہے تاکہ ان کی بدعہدی کے اس سارٹیفیکیٹ سے ان کی بے قصور آل اولاد کو ناکردہ شرمسار نہ ہونا پڑے۔

(۳۸)

جس دن مندرجہ بالا خط لکھا اسی شام کو یہ خط لکھا۔ اعجاز میرے خیال میں

کے لئے جو دوائی بھیجنے کو لکھا ہے وہ سیالکوٹ میں دستیاب نہ تھی اور انہیں لاہور سے بھیجنے کے لئے لکھا گیا تھا۔

۴۴ ؎ یہاں کتابوں میں نکل آئی ہے اسٹرٹ وہاں تلاش کر دیہاں نہیں ہے۔
جس خط لکھ چکا ہوں۔ اقبال کے لئے دوائی کل بذریعہ پارسل روانہ ہوگی۔
محمد اقبال ۲۹ اگست ۱۹۱۹ء لاہور

ابا جان کی رخصت منظور ہوگئی اور انہوں نے سیالکوٹ آنے کا پروگرام بنا لیا۔ ادھر چچا جان بھی ریل کا ڈبہ ریزرو کرانے میں کامیاب ہوگئے اور سیالکوٹ کا سفر طے پا گیا۔ اس کی اطلاع مجھے اس خط میں دی۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ وہ اتوار کے روز وہاں سے چلیں گے۔ غالباً میں بھی اسی روز چلوں گا یا ایک روز بعد پانچ چھ ستمبر کو لاہور کی نیم شبی گاڑی کا تعلق وزیرآباد سے سیالکوٹ جانے والی گاڑی کے ساتھ ہو جائے گا۔ میل میں تو آج کل کسی کو جگہ نہیں ملتی رات کی گاڑی میں ہی آنا ہوگا کیونکہ بھائی صاحب کے کپڑوں کا ٹرنک بھی ساتھ لانا ہے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔

بچوں کو دعا   محمد اقبال لاہور ۳ ستمبر ۱۹۱۹ء

ستمبر ۱۹۱۹ء کے شروع میں ابا جان رخصت پر سیالکوٹ آ گئے۔ چچا جان بھی چچی سردار اور چچی مختار کے ہمراہ تشریف لے آئے۔ وہ تو ایک ہفتہ کے قریب ٹھہر کر واپس لاہور چلے گئے۔ دونوں چچیوں کو بھابی جی نے روک لیا کہ کچھ دن اور ٹھہریں۔ ستمبر کے آخر میں چچا جان نے یہ خط میرے نام لکھا۔ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن ستمبر کے آخری ہفتہ کی کسی تاریخ کا ہے

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

ملفوفہ خط سٹیشن ماسٹر سیالکوٹ کے نام ہے میں نے یہاں لاہور کے سٹیشن سے تمام حالات دریافت کرکے لکھا ہے۔ یہاں سے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ اس مضمون کا خط سٹیشن ماسٹر سیالکوٹ کے نام لکھا جائے۔ امید ہے اس عرضی سے گاڑی آپ کے لئے ریزروڈ ہو جائے گی۔ اور اس میں صرف عورتیں بیٹھ سکیں گی۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ صبح ۳۰ ستمبر کو آپ وہاں سے چلیں۔   والسلام

محمد اقبال لاہور

کرایہ زیادہ نہ دینا پڑے گا جس قدر ٹکٹ ہوں گے انہیں کا کرایہ دینا ہوگا۔ دو ٹکٹ تمہاری چچیوں کے ہوں گے تم بھی ان کے پاس بیٹھ جانا اور اگر کوئی لیڈی آ گئی تو تم کو مردوں کے کمرے میں بیٹھنا ہوگا۔ واپسی کا ٹکٹ تیسرے درجہ کا ہوگا۔ بورڈ گاڑی پر لگوا لینا۔

سٹیشن ماسٹر سیالکوٹ کے نام جو خط ملفوف تھا وہ انہیں پہنچا دیا گیا۔ اس کے مطابق ۳۰ ستمبر صبح کی گاڑی سے سیکنڈ کلاس کا ایک ڈبہ خواتین کے لئے مخصوص کر دیا اور میں اس گاڑی سے دونوں چچیوں کو لے کر لاہور پہنچ گیا۔

چچا جان کے متعلق ایک عام تاثر یہ ہے کہ اپنے شاعرانہ مزاج اور فلسفیانہ طبیعت کی وجہ سے ان کا عملی پہلو کمزور تھا اور اسی لئے انہوں نے وکالت کے پیشہ کی طرف پوری توجہ نہیں دی۔ یہ تاثر درست نہیں۔ ان کے اکثر خطوط اس تاثر کی نفی کرتے ہیں اب اسی خط کو لیجئے۔ سیالکوٹ سے لاہور کے مختصر سفر کے لئے پہلے تو "لاہور سٹیشن سے تمام حالات دریافت کر کے" سٹیشن ماسٹر سیالکوٹ کے نام خواتین کے لئے ایک ڈبہ مخصوص کرنے کے لئے مجھے خط بھجوایا۔ اس کے ساتھ جزئیات کے متعلق مفصل ہدایات بھیجیں "کرایہ زیادہ نہ دینا پڑے گا جس قدر ٹکٹ ہوں گے انہیں کا کرایہ دینا ہوگا" "دو ٹکٹ تمہاری چچیوں کے ٹکٹ ہوں گے" "تم بھی ان کے پاس بیٹھ جانا اور اگر کوئی لیڈی آ گئی تو تم کو مردوں کے کمرے میں بیٹھنا ہوگا۔" "واپسی (خادم) کا ٹکٹ تیسرے درجے کا ہوگا" "بورڈ (مخصوص برائے خواتین) گاڑی پر لگوا لینا" لیکن یہ مفصل ہدایات کسی ایسے شخص کی ہو سکتی ہیں جس کا عملی پہلو کمزور ہو۔ یہ درست ہے کہ وکالت کے پیشے میں وہ مقدمات حاصل کرنے کے لئے مروجہ بھاگ دوڑ نہ کرتے تھے لیکن جو مقدمات لے لیتے ان کی تیاری اور پیروی بڑی محنت اور توجہ سے کرتے۔

ہمارے پھوپھا غلام محمد امین کے ساتھ ہماری منجھلی پھوپھی بیاہی ہوئی تھیں ذکر میاں جی کے ذکر میں کیا جا چکا ہے۔ ہماری یہ پھوپھی میرے لڑکپن میں ہی بیٹے چھوڑ کر فوت ہو گئی تھیں۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کو پھوپھا جی نے بڑے سکول امرتسر میں داخل کرانا چاہا۔ لیکن یہ خیال انہیں اس وقت آیا جب سکول بند ہو چکا تھا۔ سکول کے پرنسپل ڈاکٹر میر ہدایت اللہ تھے۔ پھوپھا جی کے کہنے پر میاں جی نے چچا جان کو لکھا کہ وہ لڑکے کے داخلے کے لئے پرنسپل کو لکھیں۔ چچا جان نے جواب دیا کہ سکول میں داخلہ بند ہو جانے کے بعد اب کسی طالب علم کا داخل کیا جانا شاید نہ ہو لیکن تعمیل ارشاد میں ڈاکٹر میر ہدایت اللہ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب سے وہی جواب آیا جس کی توقع تھی۔ اس پر میاں جی کو یہ خط لکھا۔

پھوپھا جی کو عمر بھر یہ شکوہ رہا کہ میرے بیٹے کے داخلے میں مدد نہیں کی۔

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

کئی دن ہوئے ایک خط غلام محمد کے لڑکے کے بارے میں آپ کی خدمت میں لکھا تھا۔ جس کا مفہوم اجمالاً یہ ہے کہ میں نے لے سمجھا دیا تھا۔ آج میر ہدایت اللہ کا جواب آیا ہے جو میرا خیال تھا صحیح نکلا۔ ڈاکٹر میر ہدایت اللہ لکھتے ہیں کہ کالج و سکول بند ہو چکا ہے اب کسی کے اثر و رسوخ سے کوئی لڑکا سکول میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اطلاعاً عرض ہے۔ اب اس کو یا تو اسلامیہ کالج میں داخل ہو جانا چاہئے یا ایک برس انتظار کرنا ہوگا اگر وہ میڈیکل سکول میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے

محمد اقبال لاہور   ۹ اکتوبر ۱۹۱۹ء

۴۲

ہماری پھوپھی کریم بی بی نے چچا جان کو خط لکھا جس میں اپنا ایک خواب لکھا اور اُس کی جو تعبیر میاں جی نے کی وہ بیان کی۔ جواب میں انہوں نے پھوپھی جی کو یہ خط لکھا

لاہور ۸ دسمبر ۱۹[illegible]ء

ہمشیرہ عزیزہ السلام علیکم

تمہارا خط مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے۔ اس وقت واقعی وہی حالت دنیائے اسلام کی ہے جو تم کو خواب میں دکھائی گئی اور والد مکرم نے جو نتیجہ نکالا وہ بھی خدا کے فضل و کرم سے صحیح ہے اور میرا عقیدہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نئی زندگی عطا فرمائے گا اور جس قوم نے آج تک اس کے دین کی حفاظت کی ہے اس کو ذلیل و رسوا نہ کرے گا۔ مسلمان کی بہترین تلوار دعا ہے سو اسی سے کام لینا چاہیئے۔ ہر وقت دعا کرنا چاہیئے اور نبی کریمؐ پر درود بھیجنا چاہیئے کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس امت کی دعائیں لے اور اس کی غریبی پر رحم فرمائے میں جو اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے اگر یہ قوائے دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسول کی میں کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے خیال آتا ہے کہ والد مکرم مجھے علوم دینی ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہر حال جو کچھ خدا کے علم میں تھا ہوا اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا میں نے کیا۔ لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہیئے تھا اور زندگی تمام و کمال نبی کریمؐ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیئے تھی۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں میری طرف سے بہت بہت آداب عرض کریں۔ بھائی صاحب کی علالت کے متعلق تم نے کچھ نہیں لکھا امید ہے کہ اُن کا مزاج بخیر ہوگا۔ اعجاز کے ہم دست مرچ تمباکو اور دوائی بھیجی جائے گی۔ ڈاکٹر علی نقی کہتے تھے کہ پھوڑوں پر جونک نہ لگوانی چاہیئے جو دوا وہ ارسال کریں گے وہ خون کے لئے بھی مفید ہوگی۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

پھوپھی جی کے خواب کی تفصیل مجھے معلوم نہیں کیونکہ میں ان دنوں لاء کالج میں تعلیم پانے کی وجہ سے لاہور میں رہتا تھا اور چچا جان کے نام پھوپھی جی کا خط میری نظر سے نہیں گزرا۔

ڈاکٹر علی نقی جن کا خط میں ذکر ہے مولانا میر حسن کے بڑے بیٹے اور گورنر ہاؤس لاہور کے عملہ کے ڈاکٹر تھے۔ ابا جان کو پھوڑے نکلے ہوئے تھے۔ ان دنوں کئی امراض میں جونکیں لگوانے کا رواج تھا۔ چچا جان نے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا ہوگا۔ انہوں نے جونکیں لگوانے سے منع کیا اور دوائی تجویز کی۔ میں دسمبر کی تعطیلات میں سیالکوٹ جانے والا تھا۔ میرے ہاتھ دوائی بھیجنے کا لکھا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی کر دیا جائے کہ چچا جان کو بچپن میں کسی مرض کے علاج کے طور پر جونکیں لگوائی گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کی داہنی آنکھ کی بینائی قریباً جاتی رہی تھی۔ جب ۱۹[illegible]ء میں انہوں نے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی ملازمت کے لئے امتحان دیا تو اسی نقص کی وجہ سے وہ طبی معائنہ میں ناکام ہو گئے۔

چچا جان حقے کے رسیا تھے۔ اُن کے بعض زمیندار دوست مداح اور متوکل انہیں تحفتاً اچھا تمباکو بھیجا کرتے تھے۔ چونکہ میاں جی اور ابا جان بھی حقے کے شوقین تھے اس لئے انہیں بھی تمباکو کا حصہ ملتا تھا۔

۴۳

"روزگار فقیر" کے مصنف کرنل وحید الدین کے والد فقیر نجم الدین سے چچا جان اور ابا جان دونوں کے دوستانہ مراسم تھے۔ غالباً ان کے کسی ایک بیٹے کی شادی تھی اور بارات لاہور سے باہر گئی تھی۔ فقیر صاحب نے دونوں بھائیوں کو مدعو کیا تھا۔ ابا جان تو علالت کی وجہ سے نہ جا سکے۔ انہوں نے چچا جان سے دریافت کیا کہ بارات کے ساتھ گئے یا نہیں۔ اس کے جواب میں ابا جان کو یہ خط لکھا۔

برادرم مکرم۔ السلام علیکم

فقیر صاحب کی برات کے ہمراہ میں نہیں گیا۔ اس واسطے کہ اس روز بہت بارش اور سردی تھی۔ اندیشہ تھا کہ اس سے کوئی تکلیف نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ ٹریبون کا رش سفر ممکن نہ تھا۔ ریزرو گاڑی شاید ان کو نہ مل سکی۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید ہے کہ اعجاز بخیر و عافیت پہنچ گیا ہوگا اور گھر میں سب طرح خیریت ہوگی۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ امید ہے کہ سردی کم ہونے پر وہ بھی لاہور تشریف لائیں گے۔ باقی خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۵ دسمبر ۱۹[illegible]ء

۴۴

دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخر میں کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ اُن دنوں ہندو مسلمان شیر و شکر ہو کر انگریز کی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خلافت کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی انہیں دنوں امرتسر میں ہوا۔ چوٹی کے ہندو مسلم رہنما ان اجلاسوں میں شرکت کے لئے امرتسر میں جمع ہوئے۔ علی برادران بھی جیل سے رہا ہوتے ہی امرتسر پہنچے۔ چچا جان اس سیاسی تحریک میں عملی طور پر تو شامل نہ تھے لیکن کس محب وطن کو آزادی کی خواہش نہ تھی۔ یہ اسی خواہش کا اظہار تھا کہ وہ نواب ذوالفقار علی خاں اور مرزا جلال الدین کے ساتھ رونق دیکھنے صبح موٹر پر امرتسر جاتے اور شام واپس آ جاتے۔ امرتسر جانے کے متعلق میاں جی کو یہ خط لکھا۔

یہ خط دراصل یکم جنوری ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ جنوری کی بجائے دسمبر بے دھیانی میں لکھ گئے۔

خط میں کسی مرزا صاحب کی کتاب کا ذکر ہے۔ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ یہ کون صاحب

تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مثنوی مولانا روم کی شرح لکھی تھی جس پر چچا جان نے یہ مختصر تبصرہ کیا۔

قبلہ و کعبہ ام۔ السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ مل گیا تھا۔ الحمد للہ کہ سب طرح سے خیریت ہے۔ امرتسر میں خوب رونق رہی۔ میں بھی دو روز جاتا رہا۔ شام کو واپس آجایا کرتا تھا۔ کانگرس کا جلسہ اس زور سے ہوا کہ اس سے پہلے آج تک نہیں ہوا۔ اور نہ امید ہے کہ ایسا جلسہ کبھی پھر ہو۔ غرض کہ خوب رونق کا زمانہ رہا۔

سردی ذرا کم ہو جائے تو آپ ضرور تشریف لاویں۔ مرزا صاحب کی کتاب اچھی ہے مگر شرح لکھنے والے کا دل ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسا کا مصنف کا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید ہے کہ بھائی صاحب کی طبیعت اب بالکل اچھی ہوگی۔

والسلام

محمد اقبال لاہور یکم دسمبر سنہ۲۰ء

(۴۵)

ابا جی نے چچا جان کے لئے ایک کابل دُھسہ منگوایا تھا۔ سیالکوٹ میں چمڑے کے سوٹ کیس نئے نئے بننے لگے تھے۔ ہمارے محلے کا ایک نوجوان بڑے اچھے سوٹ کیس بناتا تھا۔ اُس سے ابا جی نے چچا جان کے لئے ایک سوٹ کیس بنوایا تھا۔ یہ دونوں اشیاء کسی کے ہاتھ اُن کو بھیجیں۔ اُن کے ملنے کی اطلاع اس خط میں دی۔

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ ملا الحمد للہ کہ گھر میں سب طرح خیریت ہے۔ یہاں پر خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ سردی چند روز خوب زور پر رہی۔ بارش بھی بہت ہوئی مگر اب آسمان صاف ہے اور سردی بھی بہت کم ہوگئی ہے۔ والدہ مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ دھسہ اور سوٹ کیس پہنچ گئے تھے۔ والسلام

بچوں کو دعا

محمد اقبال لاہور ۱۹ فروری سنہ۲۰ء

(۴۶)

میں نے لاء کالج میں داخلہ لیا ہوا تھا اور میرا قیام کالج کے ہوسٹل میں تھا لیکن جب کبھی چچا جان کو کسی وجہ سے لاہور سے باہر جانا ہوتا تو اُن کی عدم موجودگی میں مجھے اُن کے ہاں ٹھہرنا ہوتا۔ فروری سنہ۲۰ء کے آخری ہفتے میں وہ کسی کام کے سلسلہ میں دہلی گئے۔ وہاں سے مجھے لاہور واپس آنے کی تاریخ سے مطلع کیا۔ اس خط کے لکھنے کے فوراً بعد انہیں مرزا جلال الدین بیرسٹر کی طرف سے ایک خط ملنے پر اپنے واپسی کے پروگرام میں تبدیلی کرنا پڑی۔ اُس کی اطلاع مجھے اس خط میں کی۔

خط کے اوپر میٹکاف ہاؤس کے بعد بے دھیانی میں دہلی کی بجائے لاہور لکھ گئے۔ مرزا جلال دین اُن کے جگری دوست تھے۔ اگرچہ خط میں لکھا ہے کہ انہیں دہلی میں ۷ مارچ تک ٹھہرنا ہوگا لیکن جیسا کہ اگلے خط سے ظاہر ہوگا وہ ۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو لاہور واپس آ گئے تھے۔

Meatcalf House,
Lahore.

3rd March, 1920.

[illegible]y dear Ijaz,

[illegible] moment ago I posted a letter to you telling you of the [illegible] date of my arrival in Lahore. I have, however, just [illegible] a letter from M. Jalaluddin Barrister AT Law, Lahore asking [illegible]ay in Delhi in connection with the Probate case. Please tell [illegible]nt that I have been detained. Mirza Jalaluddin will reach [illegible] the 5th March and we shall have to stay till the 7th. I [illegible] your aunt knew of this possibility.

[illegible]ping you are well.

Yours affectionately,

(MUHAMMAD IQBAL)

(۴۷)

دہلی سے واپس آکر ابا جان کو یہ خط لکھا۔ یہ دو صفحوں کا خط ان کی اہلی زندگی کے المیہ کے متعلق ہے۔ اس لئے متعلقہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔

برادر مکرم السلام علیکم

میں آج مع الخیر واپس آگیا ہوں۔ امید ہے گھر میں ہر طرح خیریت ہوگی۔ آپ کا ۲۰ فروری کا لکھا ہوا خط مل گیا ہے۔ . . . .

. . . .

میرے خیال میں یہ معاملہ کسی تیسرے آدمی کی وساطت سے طے ہونا چاہیئے۔ والدہ کی خدمت میں آداب۔

والسلام

محمد اقبال

(۴۸)

میرے لئے مناسب رشتہ کی تلاش ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں ابا جان کے خط کے جواب میں انہیں یہ خط لکھا۔

لاہور ۷ اپریل سنہ۲۰ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ میری بھی ذاتی رائے یہی ہے۔

کہ سیالکوٹ میں رہنا بہتر ہے لیکن اگر سیالکوٹ میں موزوں جگہ نہ ملے تو مجبوراً کسی اور جگہ تلاش تلاش کرنا چاہئیے۔ ایسا نہ ہو کہ سیالکوٹ کو مقدم سمجھنے سے غیر موزوں جگہ پر قناعت کی جائے۔ اس امر کے علاوہ آپ کو اور لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتے بھی کرنے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ تعلقات کا دائرہ وسیع ہو۔ میں نے اپنے بعض احباب سے ذکر کیا ہے اور اوروں سے بھی کروں گا۔

ہفتے کے روز شام کو شملہ جاؤں گا۔ وہاں ایک ہفتہ قیام رہے گا۔ اعجاز ایک ہفتے کے لئے یہاں آ جائے گا۔

ایک نوکر کی ضرورت ہے اس کی تلاش کیجئے۔ میرا پرانا نوکر مہر الٰہی ہشیار پور سے آگیا تھا۔ مگر پھر چلا گیا ہے اور اس کے بھائی اسے آنے نہیں دیتے۔ اگر سیالکوٹ سے کوئی آدمی ایسا مل جائے جس پر اعتبار ہو سکے تو بہت عمدہ بات ہے۔ احمو سے پوچھئے وہ کہیں نہ کہیں سے پیدا کرے گا۔ کام کچھ نہیں ہے صرف مکان کو صاف رکھنا اور حاضر باشی۔ مہر الٰہی آٹھ روپیہ ماہوار لیتا تھا اور کھانا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض

والسلام

محمد اقبال

ان دنوں ان کے ہاں دو ملازم تھے۔ علی بخش اور مہر الٰہی دونوں ضلع ہشیار پور کے تھے۔ مہر الٰہی اپنے وطن واپس چلا گیا۔ اُس کی بجائے ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ احمو جس سے ملازم کے متعلق پوچھنے کو لکھا ہے اُن کے لڑکپن کا ہم جلیس تھا۔ اس کا نام احمد دین تھا۔ دونوں میں قدر مشترک کبوتر تھے۔ احمو کو میں نے دیکھا ہوا ہے۔ سرخ و سفید رنگت کا کشمیری تھا۔ اس کے ہاں قسم قسم کے اچھی نسل کے بہت سے کبوتر تھے۔ چچا جان سیالکوٹ آتے تو احمو کبھی کبھی ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ سارا وقت کبوتروں کے متعلق گفتگو ہوتی۔ میرے لڑکپن میں احمو کے ہاں سیالکوٹی کاغذ تیار ہوتا تھا جب اس کاغذ کی مانگ نہ رہی تو پھر کوئی اور کاروبار کرتا تھا۔

(۴۹)

اپریل ۱۹۲۲ء میں کشمیر سے ایک پیرزادہ صاحب جن سے چچا جان کی کوئی شناسائی نہ تھی۔ ان سے ملنے آئے۔ پیرزادہ صاحب نے اُن سے اُن کے متعلق اپنا ایک کشف بیان کیا۔ اُسے سُن کر ان کی جو کیفیت ہوئی اس کا ذکر میاں جی کے نام اس خط میں کیا اور اپنی "روح کی نہایت کرب و اضطراب کی حالت" کا علاج دریافت کیا۔ یہ خط چچا جان پر تحقیق کرنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

لاہور ۲۳ اپریل ۱۹۲۲ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

قریباً چار ماہ کا عرصہ ہوا کہ مجھے ایک گمنام خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ نبی کریمؐ کے دربار میں تمہاری ایک خاص جگہ ہے جس کا تم کو کچھ علم نہیں اگر تم فلاں وظیفہ پڑھا کرو تو تم کو بھی اس کا علم ہو جائے گا۔ وہ وظیفہ خط میں درج تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ وہ خط گمنام تھا اس کی طرف کچھ توجہ نہ کی اب وہ خط میرے پاس نہیں ہے معلوم نہیں ردی میں مل ملا کر کہاں چلا گیا۔

پرسوں کا ذکر ہے کہ کشمیر سے ایک پیرزادہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ اس کی عمر قریباً تیس پینتیس سال کی ہوگی۔ شکل سے شرافت کے آثار معلوم ہوتے تھے گفتگو سے بھی سمجھدار اور پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی گفتگو کرے مجھ کو دیکھ کر بے اختیار زار و قطار رونے لگا۔ میں نے سمجھا کہ شاید مصیبت زدہ ہے اور مجھ سے کوئی مدد مانگتا ہے۔ استفسار حال کیا تو کہنے لگا کہ کسی مدد کی ضرورت نہیں مجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔ میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی اب میں ان کی پنشن کھا رہا ہوں رونے کی وجہ خوشی ہے نہ غم۔ مفصل کیفیت پوچھنے پر اس نے کہا کہ نوگام میں جو میرا گاؤں سری نگر کے قریب ہے میں نے عالم کشف میں نبی کریمؐ کا دربار دیکھا۔ صف نماز کے لئے کھڑی ہوئی تو حضور سرور کائنات نے پوچھا کہ محمد اقبال آیا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ محفل میں نہیں تھا۔ اس پر ایک بزرگ کو اقبال کے بلانے کے واسطے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک جوان آدمی جس کی داڑھی منڈی ہوئی تھی اور رنگ گورا تھا مع اُن بزرگ کے صف نماز میں داخل ہو کر سرور کائنات کے دائیں جانب کھڑا ہوگیا۔ پیرزادہ صاحب کہتے ہیں کہ اس سے پہلے میں آپ کی شکل سے واقف نہ تھا نہ نام معلوم تھا کشمیر میں ایک بزرگ مولوی نجم الدین صاحب ہیں جن کے پاس جا کر میں نے یہ سارا قصہ بیان کیا۔ تو انہوں نے آپ کی بہت تعریف کی وہ آپ کو آپ کی تحریروں کے ذریعہ جانتے ہیں گو انہوں نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں۔ اس دن سے میں نے ارادہ کیا کہ لاہور جا کر آپ سے ملوں گا۔ سو محض آپ کی ملاقات کی خاطر میں نے کشمیر سے سفر کیا ہے اور آپ کو دیکھ کر مجھے بے اختیار رونا اس واسطے آیا کہ مجھ پر میرے کشف کی تصدیق ہوگئی کیونکہ جو شکل آپ کی میں نے حالتِ کشف میں دیکھی اس سے سرمو فرق نہ تھا۔ اس ماجرا کو سن کر مجھ کو معاً وہ گمنام خط یاد آیا جس کا ذکر میں نے اس خط کے ابتدا میں کیا ہے مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے اور روح نہایت کرب و اضطراب کی حالت میں ہے کہ میں نے کیوں وہ خط ضائع کر دیا۔ اب مجھ کو وہ وظیفہ یاد نہیں جو اس خط میں لکھا تھا۔ آپ مہربانی کر کے اس مشکل کا کوئی علاج بتائیں کیونکہ پیرزادہ صاحب کہتے تھے کہ آپ کے متعلق میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ آپ کے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے بالکل صحیح ہے کیونکہ یہ اعمال تو اس قابل نہیں ہیں۔ ایسا فضل محض آپ کی دعا کا ہی نتیجہ ہو لیکن اگر حقیقت میں پیرزادہ صاحب کا کشف صحیح ہے تو میرے لئے لاعلمی کی حالت سخت تکلیف دہ ہے اس کا یا تو کوئی علاج بتائیے یا مزید دعا فرمائیے کہ خدا تعالیٰ اس گرہ کو کھول دے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بھائی صاحب کا خط مل گیا تھا۔ کل پرسوں سے امتحانات کے پرچے آئیں گے ان کو ختم کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

محمد اقبال

میاں جی نے اس خط کے جواب میں اُن کی "سخت تکلیف دہ حالت" کا کیا "علاج" تجویز کیا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ ہاں وہ "یا حیی و یا قیوم" کا ورد بکثرت کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ ان کے ذکر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مجھے بھی ایک دن ان اسمائے الٰہی کے ورد کی تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ اقبال کو بھی میں نے اس ورد کی تاکید کی ہوئی ہے۔ شاید یہ "علاج" اسی خط کے جواب میں تجویز کیا گیا ہو۔ واللہ اعلم "بہرحال یا حی و یا قیوم" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان اسماء الٰہی کا ورد کیا کرتے تھے۔

۵۰

لاہور ۔ ۱۰ جون ۲۰ء

قبلہ و کعبہ السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ملا۔ الحمد اللہ کہ آپ کی صحت اچھی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالے دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سر پر رکھے گا۔ بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظام خوراک وغیرہ کے بارے لکھا تھا۔ یہ طریق بہت اچھا ہے اور اسی کو دستور العمل بنانا چاہیئے۔ میں نے یورپ کے ایک مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے ہیں ایسے جراثیم ہیں جو قاطع حیات ہیں اور دہی کی لسی ان جراثیم کے لئے بمنزلہ زہر کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبتاً عموماً طویل العمر اور تندرست ہیں۔ مل بخش نے کل مجھے بتایا کہ اس کی بچی کی لمبی عمر ہوئی۔ اور آخر عمر میں اس کا گذران زیادہ تر لسی پر تھی۔ ترش لسی تو شاید آپ کے لئے مفید نہ ہو کہ آپ کا گلا خراب ہے۔ البتہ میٹھے دہی کی لسی اگر صبح پی جائے تو شاید مفید ہو اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیئے۔ افسوس ہے کہ کوئی اچھا مکان رہنے کو نہیں ملتا۔ موجودہ مکان میں جوان لوگ تو با آسائش رہ سکتے ہیں بڈھوں کو تکلیف ہے ورنہ میری خواہش تھی کہ سال کا زیادہ حصہ آپ میرے پاس بسر کیا کرتے۔ ذرا ریل کا انتظام ٹھیک ہو جائے تو انشاءاللہ آپ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوں گا۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے آپ کے دانت بنانے تھے اگر وہ خراب ہو گئے ہوں تو ان کو ڈاک میں بھیج دیجئے گا پھر مرمت کرا دیئے جائیں گے اور اگر وہ قابل مرمت بھی نہ ہوں تو لکھئے ڈاکٹر عبداللطیف کو سیالکوٹ بھیج دوں گا کہ وہاں جا کر آپ کے دانت بنائے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ گھر سے سب آپ کی خدمت میں آداب کہلواتی ہیں۔

روحانی کیفیات کا سب سے بڑا ممد و معاون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے۔ نبی کریم کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔ دنیا کے حالات اور عام لوگوں کے حالات ایسے ہی ہیں ان کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ عام لوگوں کی نگاہ بہت تنگ ہے ان میں سے بیشتر محض حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اسی واسطے مولانا روم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ چراغ لے کے تمام شہر میں پھرا کہ کوئی انسان نظر آئے مگر نظر نہ آیا۔ اور موجودہ زمانہ تو روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے اسی واسطے اخلاص محبت و مروت و یکجہتی کا نام و نشان نہیں رہا۔ آدمی آدمی کا خون پینے والا اور قوم قوم کی دشمن ہے۔ یہ زمانہ انتہائے تاریکی کا ہے لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ نور محمدی عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کا فضل ہے۔ غلام رسول بیمار تھا کل میں نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لئے فیروز پور تار دیا تھا مگر تا حال جواب نہیں آیا۔ آج کل تار بھی دیر میں پہنچتے ہیں۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

اس خط سے ایک تو اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ ان کو میاں جی سے کس قدر عقیدت تھی۔ افسوس ہے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ میاں جی سال کا زیادہ حصہ اُن کے پاس (لاہور میں) بسر کیا کریں۔ انارکلی والے مکان کی ساخت واقعی ایسی تھی کہ اس میں رہنے سے میاں جی کو تکلیف ہوتی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انارکلی والے مکان کے زمانۂ قیام میں میاں جی دو یا تین مرتبہ چچا جان کے پاس گئے تھے میکلوڈ روڈ والے مکان کے زمانۂ قیام میں میاں جی کا لاہور جانا مجھے یاد نہیں۔ وہ جب بھی لاہور گئے ہفتہ عشرہ سے زیادہ قیام نہیں کیا۔ اصل میں خود میاں جی کو سیالکوٹ سے باہر جا کر رہنے میں تامل ہوتا تھا۔ اس لئے چچا جان ہی جب موقعہ ملتا انہیں ملنے سیالکوٹ آ جاتے۔

عبداللطیف دندان ساز جس کا خط میں ذکر ہے چچا جان کے معتقدین میں سے تھے۔ ان کی دندان سازی کی دکان انارکلی بازار میں چچا جان کے مکان کے قریب ہی تھی۔ انہوں نے میاں جی کے مصنوعی دانت بنائے تھے۔ ان میں کچھ نقص ہو گیا تھا۔ جب میں گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد لاہور واپس آیا تو وہ دانت مرمت کے لئے ساتھ لے آیا۔ چچا جان کے ارشاد پر میں وہ دانت عبداللطیف صاحب کی دکان پر دے آیا تھا۔

ایک اور بات جو اس خط میں قابل توجہ اور قابل غور ہے وہ ایک تو ان کا بے لاگ اظہار خیال ہے کہ "موجودہ زمانہ روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست اور انتہائے تاریکی کا ہے" اور دوسرے اُن کی اُمید کہ "کیا عجب اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ نور محمدی عطا کرے کہ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب دُنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔"

غلام رسول صاحب جن کا خط میں ذکر ہے ہمارے چھوٹے پھوپھا تھے۔ کتاب کے شروع میں میاں جی کے ذکر میں اُن کا ذکر آ چکا ہے۔ وہ اُن دنوں محکمۂ ریلوے میں فیروز پور کے مقام پر تعینات تھے۔ چچا جان کے بڑے معتمد علیہ تھے۔ بڑے معاملہ فہم اور شفیق انسان تھے۔ میرے ساتھ تو بڑی شفقت فرماتے تھے۔ میرے نام کا تلفظ اعجاز کیا کرتے تھے۔ ایک دن چچا جان کے سامنے اَعجاز کہا تو انہوں نے صحت کرتے ہوئے کہا کہ اس کے نام کا صحیح تلفظ اِعجاز ع کے نیچے زیر ہے۔ خود مجھے بھی اپنے نام کا صحیح تلفظ اُسی دن معلوم ہوا۔

۵۱

ابا جان کے نام اس خط میں صرف ابر کی بخیلی کی شکایت ہے اور چھٹیوں کے بعد تیرے لاہور واپس لاہور واپس پہنچ جانے کی اطلاع

برادر مکرم السلام علیکم

الحمد اللہ کہ آپ کے ہاں بارش ہو گئی۔ یہاں ابھی بارش کا انتظار ہے۔ ابر تو آج صبح خوب آیا تھا مگر بخیل ثابت ہوا۔ البتہ گزشتہ رات آرام میں گزری۔ اعجاز پہنچ گیا ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کر دیں۔ بچوں کو دعا۔

محمد اقبال لاہور ۸ جولائی ۲۰ء

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ابا جان کی علالت کی خبر ملی تو مجھے سیالکوٹ بھیج دیا۔ وہاں پہنچ کر ان کی حسبِ خواہش میں نے علالت کی کیفیت سے بذریعہ تار مطلع کیا تو مجھے یہ خط لکھا چونکہ ابا جان کو مرض سے افاقہ ہو رہا تھا میں نے تار دے دیا کہ آپ آنے کی زحمت نہ کریں۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا تار ابھی ملا ہے۔ آج اتوار ہے کل کے مقدمات کا انتظام نہیں ہو سکتا لہٰذا میں منگل کے روز سیالکوٹ آؤں گا۔ خدا تعالیٰ جلد فضل کرے۔ مجھے سخت تردد ہو رہا ہے۔ اگر یہ کارڈ تم کو سوموار یا منگل کے روز صبح تم کو مل جائے اور بھائی صاحب کی حالت بھی رو بترقی ہو تو مجھے بذریعہ تار مطلع کر دینا تاکہ اطمینان ہو جائے۔ باقی خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب۔

محمد اقبال لاہور ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء

۵۳

ابا جان نے میرے رشتہ کے لئے کسی گھرانے میں تحریک کرنے کی تجویز کی تھی۔ اس کے جواب میں انہیں یہ خط لکھا۔

حاجی شمس الدین جن کا خط میں ذکر ہے کشمیری برادری سے تھے۔ وہ انجمن حمایت اسلام کے جنرل سکریٹری تھے اور چچا جان سے اُن کے اچھے مراسم تھے۔

میاں جی ہمیشہ گھر میں دودھ کے لئے گائے یا بھینس رکھتے تھے۔ اُس کی دیکھ بھال ملازم سے اپنی نگرانی میں کراتے تھے۔ دو ایک مرتبہ چچا جان نے بھی گائے سیالکوٹ بھجوائی تھیں۔

برادر مکرم السلام علیکم لاہور ۳ نومبر ۱۹۲۰ء

والا نامہ مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ حاجی شمس الدین کشمیر گئے ہوئے ہیں۔ ۱۰ نومبر کو آئیں گے اُن سے خط لکھواؤں گا اتنے عرصے میں آپ لڑکی کے متعلق زیادہ تحقیق کر لیں۔ اگر ممکن ہو کیونکہ آپ نے لکھا ہے کہ لڑکی اچھی بتائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا علم لڑکی کے متعلق محض شنیدہ ہے۔ اس سے زیادہ تحقیق مطلوب ہے۔ کیا لڑکی ڈسکے میں ہے یا کامل پور میں؟ بہرحال اگر حاجی صاحب خط لکھنے میں عذر ہوا تو اس اثنا میں میں کوئی اور دوست ان کا تلاش کروں گا جو ان کو خط لکھے اگر یہ بھی نہ ہوا تو پھر خود خط لکھوں گا۔

گائے میں آپ کے لئے منٹگمری سے منگواؤں گا اگر نہ آئی تو اپنی گائے بھیج دوں گا۔ ابھی اس کے بچہ دینے میں دو تین ماہ باقی ہیں بچہ دینے کے بعد ارسال کروں گا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب

والسلام

محمد اقبال

۵۴

سیالکوٹ میں کانگریس اور خلافت تحریکوں کا بڑا زور تھا۔ ترک موالات کی تحریک چل رہی تھی۔ سکولوں کا الحاق یونیورسٹی سے توڑ کر انہیں قومی سکول بنائے جانے پر زور دیا جا رہا تھا۔ میرا سب سے چھوٹا بھائی مختار احمد سکول میں پڑھتا تھا۔ ابا جان کا خیال تھا کہ اسے لاہور کے کسی سکول میں داخل کرا دیا جائے۔ انہوں نے چچا جان کو لکھا جس پر انہوں نے جواب میں یہ خط لکھا۔

لاہور ۳۰ دسمبر ۱۹۲۰ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ بہتر ہے آپ اپریل تک انتظار کریں۔ بعد میں ضرورت ہوئی تو مختار کو یہاں کے کسی سکول میں داخل کرا دیا جائے گا گو سکول لاہور کے بھی بعض خراب ہیں اور لڑکوں کی آوارگی کے ممد۔

اسلامیہ کالج کی حالت بدستور اہی ہے اور انجمن کی جنرل کونسل کے اکثر ممبروں کی رائے یہی ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو کالج اپنی موجودہ حالت میں رہے اور یہی تعلیم دے ہاں اگر ضرورت ہو تو ایک نیشنل کالج بھی کھول دیا جائے۔ آئندہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ بشارت کا سکول قومی ہو گیا تھا۔ اب سنا ہے کہ انہوں نے یونیورسٹی سے پھر ملحق کر لیا ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ سردی کا بڑا زور ہے بارش مطلق نہیں ہوئی۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

۵۵

۱۹۲۰ء کے دسمبر کی تعطیلات گزار کر میں واپس لاہور گیا تو میاں جی نے میری زبانی چچا جان کو پیغام بھجوایا کہ ان کی طبیعت اُداس رہتی ہے وہ میاں جی کی اُداسی کی وجہ سمجھ گئے۔ جواب میں یہ طویل خط لکھا۔

لاہور ۳ جنوری ۱۹۲۱ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

اعجاز کی زبانی آپ کا پیغام پہنچا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت اداس رہتی ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے ایک کتاب یورپ میں خریدی تھی مگر آج تک اس کے پڑھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ان تعطیلوں میں اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا آغاز اور اختتام یہ فقرہ ہے "میری کوئی چیز نہیں اور میرے لئے تمام اشیاء کا وجود عدم برابر ہے" یہ ساری کتاب اسی جملے کی تشریح ہے اور حقیقت میں بہت خوب ہے۔ حقیقی شخصیت یہی ہے کہ انسان اپنی اصلی حقیقت کا خیال کر کے تمام تعلقات سے آزاد ہو جائے یعنی بالاتر ہو جائے۔ نبی کریمؐ کی زندگی میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ ان سے زیادہ اپنے عزیزوں سے محبت کرنے والا بلکہ ساری دنیا کو اپنا عزیز جاننے والا اور کون ہوگا؟ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا تھا جب آپ کو نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ عائشہ کون ہے اور ابوبکر کون ہے نہ یہ کہ محمد کون ہے۔ بعض صوفیا نے اس کو فنا سے تعبیر کیا ہے لیکن سچ بات یہ ہے کہ یہ شخصیت یا خودی کا کمال ہے اسے فنا نہیں کہنا چاہیئے اور انسانی حیات کی یہی کیفیت حیات مابعد الموت کی تیاری ہے۔ لیکن آپ اس نکتے کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ہمارے عزیزوں میں آپس میں جب بگاڑ ہو جاتا ہے تو ہم جو ان کی صلح و آشتی میں خوش ہوتے ہیں ان کا بگاڑ دیکھ کر رنجیدہ اور پریشان ہوتے ہیں جب اسی قسم کا بگاڑ اور لوگوں میں ہو جو عام معنوں میں ہمارے عزیز یا رشتہ دار نہیں ہیں تو ہم کو کوئی رنج نہیں ہوتا۔ اور کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ جو آدمی انسانی زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہے اُسے معلوم ہے کہ تمام بنی نوع انسان آپس میں عزیز و رشتہ دار ہیں کیونکہ حیات انسانی کی جڑ ایک

[illegible] گئی وجہ یہ ہے کہ چند آدمیوں کے بگاڑ سے جن کو ہم خاص طور پر اپنا رشتہ دار کہتے ہیں ہم کو رنج ہوتا ہے اور باقی لوگوں کے بگاڑ سے ہم پر کچھ اثر نہیں ہوتا حالانکہ عزیز تو حقیقت میں وہ بھی ہیں۔ انسان اس فطری میلان سے مجبور ہے کہ جو آدمی خون کے اعتبار سے ہم سے قریب تر ہیں ان کو اپنا رشتہ دار کہتا ہے اور جو دور ہیں ان سے بے تعلق ہو جاتا ہے حالانکہ خون اور زندگی میں قرب اور بُعد نزدیکی و دوری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ تعلقات کی وجہ سے جو پریشانی ہم کو لاحق ہوتی ہے اس کی بنا اصل میں ناانصافی پر ہے۔ ناانصافی یہ کہ بعض افراد کو قرب خونی کی وجہ سے قریب جاننا اور بعض کو بعد خونی کی وجہ سے بعید جاننا حالانکہ زندگی کے حقیقت قرب و بُعد سے منزا ہے۔ کامل انسان تمام عالم کے لئے رحمت ہے بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ کامل انسان تعلقات سے بالاتر ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں امید کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ بھائی صاحب کی خدمت میں آداب۔

اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا ہے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ جب یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہوئی تو یہاں کے صوفیا نے اس پر اعتراض کیا کہ کتاب کا مصنف مسلمانوں کو مغربی خیالات سکھاتا ہے اور ان کو فرنگیت کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے مغرب والے مترجم نے دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمد اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں صداقت کی آگ ایسی ہے کہ ہم اس کی تعریف کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

محمد اقبال

تمام تعلقات سے آزاد ہو جانے یعنی بالاتر ہو جانے کا جو فلسفہ اس خط میں بیان کیا گیا ہے وہ آں سبیل سبک سیرم ہر بند گسلم من۔ کی تشریح معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم۔

اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ شائع ہو گیا تھا۔ ترجمہ پروفیسر نکلسن نے کیا جن کا شمار بڑے مستشرقین میں ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے اس ترجمہ کی اشاعت کے بعد ایک مرتبہ قیام سیالکوٹ کے دوران اس ترجمہ کا ذکر میاں جی اور ابا جان سے کرتے ہوئے فرمایا نکلسن ہے تو بڑا مستشرق لیکن ترجمہ میں وہ ایک فاش غلطی کر گیا ہے۔ ایک غلطی بیان کر کے دیر تک ہنستے رہے جو مثنوی کے مصرع "صورتِ غنچہ زرنگ و بوئے" [illegible] کے ترجمہ میں کی گئی ہے۔ اس مصرع میں "نے" بمعنی [illegible] استعمال کیا گیا ہے نکلسن نے اسے "نے" پڑھ کر اس کا ترجمہ [illegible] کیا ہے

۵۶

چچا جان کا جو کلام کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوتا میں اسے ایک بیاض میں نقل کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی غیر مطبوعہ کلام بھی اُن کی میز پر پڑا ہاتھ لگ جاتا تو وہ بھی نقل کر لیتا تھا اس طرح میری بیاض میں اُن کے کلام کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ جب کبھی شعر کا ذوق رکھنے والے احباب جمع ہوتے تو اس ذخیرے سے لطف اندوز ہوتے۔ دسمبر ۱۹۲۰ کی تعطیلات میں سیالکوٹ گیا تو ہماری ایسی مجالس میں شامل ہونے والے ایک صاحب کے کوئی عزیز میرٹھ سے آئے ہوئے تھے۔ نام غالباً مشتاق احمد تھا۔ شعر سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لئے ہماری دو ایک مجلسوں میں شریک ہوئے۔

ایک دن مجھے کہا کہ آپ کے چچا اپنے کلام کا مجموعہ شائع کیوں نہیں کرتے۔ بڑے اصرار کے ساتھ مجھ سے خط لکھوایا کہ اگر انہیں اجازت دی جائے تو وہ مجموعہ شائع کرنے پر تیار ہیں۔ تعطیلات کے بعد لاہور گیا تو میرے خط کا یہ جواب لاء کالج کے جانسٹن ہال کے پتہ پر جہاں میری سکونت تھی ملا۔

جواب انگریزی زبان میں دیا اور وہ بھی دو ٹوک لہجہ میں ایک طرح سے سرزنش تھی جس کا میں اپنی احمقانہ تحریر کی وجہ سے ہر طرح سزاوار تھا۔ اب مجھے اپنی حماقت پر حیرت ہوتی ہے کہ میں نے بے سوچے کیسے ایسی درخواست کرنے کی جرات کیسے کی۔ مشتاق صاحب کی خواہش دل کی دل میں رہ گئی۔

Lahore

10th Jan. 1921.

My dear Ijaz,-

I am afraid I cannot accede to your friend's request for reasons which it is unnecessary to detail here

The most important of these reasons is that I am already preparing a collection of poems for publication.

Yours affectionately,

(MUHAMMAD IQBAL)

۵۷

چچا جان کے استاد مولانا میر حسن صاحب تھے۔ ابا جان کو اس خط میں تاکید فرمائی کہ میری طرف سے شاہ صاحب کی خیریت آپ خود جا کر پوچھئے۔ شاہ صاحب پنجاب یونیورسٹی کے ممتحنوں میں سے تھے۔ اُن کی رقم یونیورسٹی سے واجب ہوگی جس کے بھجوانے کا خط میں ذکر ہے۔ ذکی شاہ صاحب جن کا خط میں ذکر ہے۔ شاہ صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ڈاکخانہ میں ملازم تھے۔ تنخواہ تھوڑی تھی اور بچے زیادہ۔ شاہ صاحب اپنی تنخواہ کا ایک حصہ انہیں دے دیتے تھے۔ میں ریاضی کے مضمون میں کمزور تھا۔ سکول کے زمانہ میں میں اُن سے ریاضی پڑھا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ میرے استاد کا درجہ رکھتے تھے۔

برادرم مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا الحمدللہ کہ اب آپ کو بالکل آرام ہے۔ مجھے بھی تین چار روز زکام رہا اور ایک شب درد کا سا بخار بھی ہو گیا۔ اب خدا کے فضل و کرم سے آرام ہے۔ امید ہے کہ جناب قبلہ شاہ صاحب کو بھی اب بالکل آرام ہو گیا ہوگا۔ ان کے روپے یونیورسٹی دفتر سے بھیج دیئے گئے ہیں ذکی شاہ صاحب سے کہہ دیجئے گا اور میری طرف سے شاہ صاحب کی خیریت آپ خود جا کر پوچھئے۔ اگر امیر شاہ کا خط مقصود تو نہیں رہا تو کچھ مضائقہ نہیں۔

باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ بارش بالکل نہیں ہوئی۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کیجئے گا۔

محمد اقبال لاہور ۱۷ جولائی ۲۱ء

۵۸

۱۰ کالج کے اخراجات کے لئے مجھے چچا جان سے ۳۰ روپے ماہوار ملتے تھے۔ اُن دنوں وہ ایک سو روپیہ ماہوار سیالکوٹ بھی بھیجتے تھے۔ ایل ایل بی کے امتحان کے لئے داخلہ فیس ادا کرنی تھی جس کے لئے میں نے ابا جان کو لکھا۔ انہوں نے چچا جان کو لکھا تو اس کے جواب میں انہوں نے یہ خط ابا جان کو لکھا۔ شاہ صاحب سے مراد مولانا میر حسن صاحب ہیں۔

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ شاہ صاحب کا خط بھی آیا تھا وہ بھی خیریت سے ہیں۔ بہت بہتر ہے اعجاز کو روپیہ دے دیا جائے گا اطمینان فرمائیں سردی یہاں بھی کل پرسوں سے کچھ زیادہ ہے۔ بارش بالکل نہیں ہوئی البتہ آج مطلع ابر آلود ہے۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ یہ خدا کا خاص فضل ہے کہ ان کی صحت اچھی ہے۔ اسرار خودی پر انگلستان اور امریکہ کے اخباروں میں ریویو عجیب وغریب شائع ہو رہے ہیں۔ دیکھیں جرمنی اور دیگر ممالک اس کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۱ جولائی ۲۱ء

۵۹

ابا جی پھر ملازمت کی فکر میں تھے۔ جھنگ ڈسٹرکٹ بورڈ میں انجینئر کی جگہ کے لئے انہوں نے درخواست دی۔ انٹرویو کے لئے وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ انہیں زیادہ تر ضلع میں دورہ پر رہنا ہوگا اس لئے واپس چلے آئے کہ ضلع گردی اب ان کے بس کی بات نہ تھی چچا جان کو اطلاع دی تو انہوں نے یہ خط لکھا۔

اس میں دو باتیں نوٹ کرنے کے قابل ہیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ان کا بھروسہ۔ دوسرے "اسرار خودی" کے متعلق انگلستان کے علمی حلقوں کے تبصرے

لاہور ۲۸ جنوری ۲۱ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط ملا الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ افسوس ہے آپ کو جھنگ جانے آنے کی ناحق تکلیف ہوئی۔ آپ کو اب اگر ملازمت کا خیال ہو بھی تو سوائے سیالکوٹ کے اور جگہ کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔ سیالکوٹ میں اگر مل جائے تو غنیمت ہے مفرد رہنے کا احساس بعض اوقات آپ کے دل کو ملازمت پر برانگیختہ کرتا ہے مگر خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے انشاء اللہ خود بخود سامان ان کے پورا ہونے کے نکل آئیں گے۔ آپ اطمینان فرمائیں۔ مجھے تو اس کی ذلت پر بھروسہ ہے اسی واسطے اگرچہ مجھ کو بھی وہاں یہی احساس ہے جیسا کہ آپ کو تاہم طبیعت متفکر نہیں ہوتی۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ اسرار خودی کے ریویو انگریزی زبان میں ہیں جو کچھ ہندوستان میں ہوا وہاں بھی ہو رہا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ مگر بحیثیت مجموعی وہاں کے لوگ اس کے خیالات کو بہت اچھا جانتے ہیں۔ مترجم کا خط آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ کتاب کا استقبال اس ملک میں بہت اچھی طرح ہوا۔ مگر بعض خیالات کے متعلق بعض ریویو لکھنے والوں کو غلط فہمی ہوئی۔ ایسا ہونا یقینی ہوتا ہے کیونکہ طبائع میں اختلاف ہے خصوصاً جب کہ زندگی پر ایک نئے نقطہ خیال سے نگاہ ڈالی جائے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے ایشیا والوں کو اور خصوصاً مسلمانوں کو جنگ کی تعلیم دی ہے اور اس کتاب کا ایک سیاسی مفہوم ہے اور اس کے ہر لفظ میں ایک سیاسی قوت مضمر ہے۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہم اس کتاب کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک بڑی زبردست ہستی کی صحبت میں بیٹھے ہیں غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ امریکہ کے اخبارات یہاں نہیں آئے ان میں بھی اسی قسم کے خیالات ہوں گے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہو جانے میں خدا کی حکمت معلوم ہوتی ہے مجھے یقین ہے کہ اس سے اس کتاب کے مقاصد کے پورا ہونے میں بڑی مدد ملے گی۔ باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔

گھر والی نے بچہ دیا ہے مگر کچھ بیمار ہو گئی ہے امید ہے دو چار روز تک اچھی ہو جائے گی۔ ڈاکٹر علاج کر رہے ہیں۔ بچوں کو دعا

محمد اقبال

لاہور کے ہندو کالجوں میں عدم تعاون کا زور ہو رہا ہے۔

۶۰

اس خط کا پہلا پیراگراف حذف کر دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ پہلے بیان کر دی گئی ہے۔

دوسرے پیراگراف میں جس مقدمہ کا ذکر ہے اُس کی پیروی کے لئے وہ کشمیر نہ جا سکے تھے اور مقدمہ واپس کر دیا تھا۔

تیسرے پیراگراف میں ایک "معاملہ معلومہ" کا ذکر ہے۔ اُن دنوں ریاست کشمیر میں کچھ اصلاحات نافذ کئے جانے کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لئے تجویز تھی کہ چچا جان کو ریاست کی چیف جج کا عہدہ پیش کیا جائے اور سردار جگندر سنگھ کے چیف منسٹر ہونے کی توقع تھی۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔

لاہور ۱۰ مارچ ۲۱ء

برادرم مکرم السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔

....

(خط کا یہ حصہ حذف کیا گیا ہے)

جموں کے مقدمے میں تاریخ ۱۸ مارچ ملی تھی مگر میں اس تاریخ پر نہ جا سکتا تھا وسط اپریل کی تاریخ طلب کی جو نہ ملی۔ اسی اثنا میں ایک مقدمہ شدہ کا مل گیا ایک ہفتہ وہاں رہنا ہوگا۔ یہ مقدمہ وسط اپریل میں ہوگا۔ اس کے بعد ریاست کی طرف سے مجھے تار ملا کہ آپ کی خواہش کے مطابق وسط اپریل ہی کی تاریخ مقرر ہوگی۔ اب مشکل ہے کہ شدہ کو

مقدمہ قبول کر چکا ہوں۔ آج کشمیر سے مزموں کی طرف سے خط ملا ہے کہ ریاست سے استدعا کیجئے کہ مقدمہ سری نگر میں ہو۔ آنے جانے کا خرچ موکل ادا کر دیں گے۔ بہرحال دیکھیں کس طرح ہو سکتا ہے۔

معاملہ معلومہ کے متعلق سلسلہ چل رہا ہے۔ مگر چیف منسٹر صاحب جموں سے جا چکے ہیں۔ مہاراجہ اپنی ریاست میں بھی اصلاحات جاری کرنے والے ہیں جن کا اعلان عنقریب ہوگا۔ اگر چیف منسٹر کی جگہ سردار جوگندر سنگھ چلے گئے تو خوب ہوگا۔ معاملات پر بہت غور و فکر کرنے کے بعد بھی آخر انہیں تقدیر کے ہی سپرد کرنا پڑتا ہے۔ انسانی علم و عقل ذرا ذرا سی بات میں اپنی کمزوری اور عجز کا معترف ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کیجئے۔ مولوی گرامی صاحب آئے ہوئے ہیں وہ ان کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں۔ دنیا میں پھر بے چینی کے آثار پیدا ہیں۔ خدا تعالیٰ رحم فرمائے۔ اعجاز کی منگنی کے متعلق آپ نے کچھ نہیں لکھا۔ اس کے کپڑوں کے لئے روپیہ بھیج دوں گا۔

والسلام

محمد اقبال

۶۱

مرحوم امتیاز میرا منجھلا بھائی اپنا ورکشاپ کھولنے کے لئے سامان خریدنے لاہور گیا تھا۔ اُس کے لاہور پہنچنے کی اطلاع اس خط میں دی۔

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ ابھی ملا ہے الحمد للہ کہ ہر طرح خیریت ہے اس سے پہلے بھی آپ کا کارڈ مل گیا تھا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ امتیاز بھی آ گیا تھا ابھی اپنی دکان کی چیزیں خریدنے میں مصروف ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۷ مارچ سنہ ۳۱ء

۶۲

ریاست جموں والے مقدمہ کی جو تاریخ ریاست کے حکام نے مقرر کی اس دن اُن کے ایک اور مقدمے کی پیشی شملہ میں مقرر تھی اس لئے جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے یہ مقدمہ واپس کر دیا۔

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ اعجاز امتحان کی تیاری میں مصروف ہے اور مجھے بھی غیر معمولی مصروفیت گزشتہ دنوں میں رہی اس واسطے خط نہ لکھ سکا کو اس سے پہلے ایک کارڈ لکھا تھا جو اُمید ہے پہنچ گیا ہوگا۔ جموں کے مقدمہ کی تاریخ کشمیر میں مانگی تھی مگر ریاست نے نہیں دی۔ ۱۸ اپریل مقرر کی ہے مگر اس تاریخ کو مجھے شملہ جانا ہوگا اس واسطے یہ مقدمہ واپس ہی کرنا پڑے گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ آج ایک مبلغ ایک سو روپیہ کا آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔ اعجاز کو ساٹھ روپے کپڑوں کے واسطے دے چکا تھا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔ گھر میں سب کو سلام۔ بچوں کو دعا۔

محمد اقبال لاہور ۳۰ مارچ سنہ ۳۱ء

۶۳

ابا جان کو میرا رشتہ طے کرنے کی جلدی تھی۔ انہوں نے سیالکوٹ کے ایک گھرانے کا ذکر کرتے ہوئے چچا جان سے مشورہ طلب کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے یہ خط لکھ کر ایسے معاملے طے کرنے میں عجلت نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ یوں بھی میں ابھی تعلیم پا رہا تھا اس لئے شادی کی کوئی جلدی نہ تھی۔ تلاش رشتہ کے سلسلہ میں یہاں یہ بات بھی بیان کر دی جائے کہ دراصل چچا جان سیالکوٹ سے باہر رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ مزید برآں ان کی بڑی خواہش تھی کہ رشتہ کسی سپرو خاندان میں ہو سکے لیکن باوجود تلاش انہیں پنجاب میں کسی مسلمان سپرو خاندان کا سراغ نہ مل سکا۔

لاہور ۳ اپریل سنہ ۳۱ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط پہنچا الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ اعجاز کے متعلق عرض یہ ہے کہ اگر آپ ارادہ مصمم کر چکے ہیں کہ سیالکوٹ کے باہر جانا نہ چاہئے تو یہ معاملہ جس کے متعلق آپ نے لکھا ہے قابل غور ہے اور اگر آپ کا یہ ارادہ مصمم نہ ہو تو سیالکوٹ سے باہر بھی تلاش کرنی ضروری ہے مثلاً امرتسر، لاہور وغیرہ میں۔ چراغ دین کو میں جانتا ہوں وہ بھلا مانس آدمی ہے مگر اس کی اوقات کا اندازہ مجھ کو نہ تھا۔ ہاں لڑکیاں اس کی ضرور اچھی ہوں گی شاید اس نے لڑکیوں کا جانا چھوڑ دیا ہے اور پیشے کا مذکار شروع کر دیا ہے۔ بہرحال بہت جلد ایسے معاملے کا کرنا درست نہیں جب تک تلاش و تجسس پورے طور پر نہ کر لیا جائے۔ خدانخواستہ آپ یا آپ کے لڑکے میں کوئی نقص نہیں۔ اچھی جگہ مل سکنے کی توقع ہے بشرطیکہ سیالکوٹ سے باہر کا بھی آپ کو خیال ہو۔ موجودہ حالات میں میری تو یہی رائے ہے کہ ابھی تلاش کو چھوڑنا نہ چاہئے اور کم از کم دو تین ماہ تو تلاش کرنی چاہئے۔ اگر آپ کہیں تو میں امرتسر و لاہور میں بعض احباب کو لکھوں۔ یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ سیالکوٹ سے باہر بھی خیال کرتے ہوں۔ سیالکوٹ میں تو آپ کے مطلب کا کوئی آدمی نہیں۔ مہراں کی لڑکی سے ہو جاتا وہ اور بات تھی۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ بچوں کو دعا۔

محمد اقبال

۶۴

جس مقدمہ کی پیروی کے لئے شملہ گئے تھے۔ اس سے واپس آ کر یہ خط لکھا۔

سیالکوٹ کے سرنسپل انتخاب میں ابا جی خلافت کمیٹی کے امیدوار کے طور پر ہونے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

برادر مکرم السلام علیکم

میں شملہ سے بخیریت واپس آ گیا۔ وہاں کام خدا کے فضل سے اچھا ہو گیا ۴، ۵ اور ۶ مئی کو ان مقدمات پر بحث ہوگی۔ انشاء اللہ امید کامیابی کی ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔ بچوں کو دعا۔ اعجاز سے معلوم ہوا کہ آپ میونسپل

میں نہیں آئے۔ لاہور میں خلافت کمیٹی کے نامزد کردہ ممبروں کو بہت کام یابی ہوئی۔

والسلام

محمد اقبال ۲۲ اپریل ۲۱ء

۶۵

ان دنوں چچا جان کو پھر ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ ابا جان کو اس خط میں کوئی معتبر آدمی تلاش کرنے کے لئے لکھا۔

بیرسٹری کے ابتدائی سالوں میں چچا جان کے ہاں سواری کے لئے ایک ٹمٹم گاڑی اور ایک گھوڑا تھا۔ پرانا نوکر خدا داد جس کا ذکر خط میں ہے۔ بطور سائیس ملازم تھا۔ یہ نوجوان راولپنڈی کی طرف کا رہنے والا تھا۔ انارکلی والے مکان کے نچلے حصّے میں اس کی رہائش تھی۔ گھوڑا گاڑی بھی نچلے حصہ مکان میں رکھے جاتے تھے۔

خط میں جس امتحان کے لئے میرے محنت کرنے کا ذکر ہے وہ ایل ایل کا امتحان تھا۔

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے الحمد اللہ کہ سب طرح خیریت ہے۔ یہاں بھی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ اعجاز محنت کر رہا ہے امید ہے کام یاب ہو جائے گا۔ اس کے رشتہ کے متعلق میں نے ایک دو جگہ لکھ رکھا ہے ابھی کوئی جواب نہیں آیا۔ کیا آپ نے بھی کوئی مزید جستجو کی؟

کچھ عرصہ ہوا میں نے آپ کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک ملازم کی ضرورت ہے اس کی تلاش کیجئے شاید سیالکوٹ سے کوئی معتبر آدمی مل جائے۔ انھوں نے ایک دفعہ ایک آدمی کا پتہ بتلایا تھا۔ میں نے اپنے پرانے نوکر خدا داد کو بھی لکھا ہے وہ راولپنڈی میں ہے ممکن ہے آجائے گو توی امید نہیں ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ کل پٹیالے جاؤں گا ۳۰ کو واپس پہنچوں گا۔

والسلام

محمد اقبال لاہور ۲۷ اپریل ۲۱ء

۶۶

ایک مقدمہ کی پیروی کے لیے پٹیالے گئے تھے۔ واپس آنے کی اطلاع ابا جی کو اس خط میں دی۔ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ان دنوں وہ ایک سو روپیہ ماہوار سیالکوٹ بھیجا کرتے تھے۔ اس میں سے پندرہ روپیہ ہماری منجھلی پھوپھی کریم بی بی کو دینے کی ہدایت کی۔ وہ ان دنوں ہمارے ہاں رہتی تھیں۔ وہ ہر ایک کا خیال رکھتے تھے۔

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ میں مع الخیر پٹیالے سے واپس آگیا ہوں۔ طاہر دین آج آپ کی خدمت میں روپیہ ارسال کرے گا۔ اس میں سے پندرہ روپیہ ہمشیرہ کو دیجئے والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔

محمد اقبال لاہور ۲ مئی ۲۱ء

۶۷

میرے رشتہ کے متعلق میاں جی کی رائے تھی کہ جہاں تک ہو سکے سیالکوٹ میں ہی کیا جائے۔ چچا جان نے ابا جان کو جو لکھا کہ سیالکوٹ میں تو آپ کے مطلب کا کوئی آدمی نہیں تو اس سے میاں جی نے یہ سمجھا کہ چچا جان سیالکوٹ سے باہر رشتہ کرنا چاہتے ہیں انہیں اپنی رائے سے مطلع کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ میاں جی کی علالت کی اطلاع ملنے پر وہ بڑے پریشان ہو جاتے تھے۔

میرا ایل۔ایل بی کا امتحان ہو رہا تھا۔ میاں جی کو میری کامیابی کے لئے دعا کرنے کی بھی تاکید کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دعا پر بڑا یقین تھا۔

لاہور ۵ مئی ۲۱ء

قبلہ و کعبہ السلام علیکم

آپ کا خط (ملا) الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ آپ کی علالت کی خبر معلوم کر کے تردد (ہوا) بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا اس سے بھی یہ خبر معلوم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرے۔ باداموں کی کھیر آپ کے لئے بڑی مفید ہے پھر آپ نے اُسے کیوں ترک کر دیا اس پر مداومت کرنی چاہیئے۔ گرمی ابھی سے بہت شروع ہو گئی ہے۔ آج کل امتحان کے پرچوں کا بھی زور ہے اور کچہری کا کام بھی اعجاز امتحان دے رہا ہے امید ہے کام یاب ہو جائے گا آپ اس کے لئے دعا کیا کریں رشتہ کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے بالکل مناسب ہے اگر سیالکوٹ میں موزوں رشتہ نہ ملے تو باہر جانا چاہیئے ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

۶۸

ابا جی نے میاں جی کی صحت یابی کی اطلاع دی تو ان کا تردد رفع ہوا اور ابا جان کو یہ خط لکھا۔

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ ملا جس سے تردد رفع ہوا خدا کا فضل ہے کہ والد مکرم کو بالکل صحت ہو گئی۔ اعجاز کا امتحان ابھی تین چار روز میں ختم ہو گا اس کے ہمراہ تمام چیزیں ارسال خدمت ہوں گی۔ ایک گھی کا کنستر بھی اس کے ہاتھ مرسل ہو گا اس کے پاس اسباب بہت ہے اگر امتیاز پھر آیا تو اس کے ہاتھ بھیج دیا جائے گا۔ مگر معلوم ہوتا ہے وہ چلا گیا ہے مجھے اس کے آنے کی اطلاع نہیں ہوئی مگر کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ مناسبہ بھائی کرم الٰہی اور فضل حق نے آپ کے الیکشن کے معاملے میں بڑی مدد کی ہے۔

باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والسلام

محمد اقبال لاہور ۹ مئی ۲۱ء

۶۹

ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان سے فارغ ہو کر میں سیالکوٹ چلا گیا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ انشاء اللہ ضرور کامیاب ہو جاؤں گا میں نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ کامیابی کی صورت میں مجھے کہاں پریکٹس کرنی چاہیئے۔ جواب میں ان کا یہ خط ملا۔

لاہور ۱۰ جون ۱۹۲۱ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ نتیجہ جون کے آخر میں غالباً نکل جائے گا تم اس وقت تک انتظار کرو اور دیوانی اور فوجداری ضابطہ کا خوب مطالعہ کرو۔ جولائی اور اگست لاہور رہ کر تھوڑا بہت کام سیکھو بعد میں تم کو کسی جگہ بھیجا جائے گا۔ مجھے پہلے سے اس بات کی تکوب خیال ہے کہ شاید تمہارے لئے چکوال (ضلع جہلم) کی سب ڈویژن اچھی ہو۔ اتفاق سے وہاں کے سب ڈویژن افسر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اور منصف تینوں مسلمان ہیں اور تینوں میرے احباب میں سے ہیں۔ علاوہ اس کے جہلم کے ضلع کا کام میں نے خصوصیت سے اچھا کیا ہے۔ میرے جاننے والے لوگ بھی وہاں ہوں گے یعنی مقدمہ باز جماعت میں۔ مگر یہ فیصلہ آخری نہیں ابھی دیگر احباب سے مشورہ کرنا باقی ہے جن کی اس معاملے میں مجھ سے زیادہ صائب رائے ہے۔ چکوال بھی خط لکھ کر دریافت کروں گا۔ بھائی صاحب کا خط بھی آیا تھا مضمون واحد ہے

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال

۷۰

ایل ایل بی کے امتحان کا نتیجہ جون کے آخر میں نکلا اور میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس میں کامیاب ہو گیا۔ پہلے تو چچا جان کا خیال تھا کہ مجھے چکوال ضلع جہلم میں پریکٹس کرنی چاہیئے۔ بعد میں اپنے احباب سے مشورے کے بعد انہوں نے طے کیا کہ دو تین ہفتے شیخ گلاب دین وکیل کے ساتھ لاہور کی ضلعی عدالتوں میں کام دیکھنے کے بعد فی الحال سیالکوٹ میں پریکٹس کرنا بہتر ہوگا۔ چنانچہ میں نے سیالکوٹ میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔ سیالکوٹ میں ان دنوں سیاسی تحریکوں کانگرس اور خلافت کی گرم بازاری تھی۔ شہر کے اکثر وکلاء ان تحریکوں میں شامل تھے اور نوجوان وکلا کا گروپ تو پیش پیش تھا۔ چنانچہ میں نے بھی خلافت تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ابا جان نے اس کے متعلق چچا جان کو لکھا تو ان کی طرف سے یہ جواب آیا۔

لاہور ۲۴ دسمبر ۱۹۲۱ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ امرتسر سے بھی جواب آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ چار پانچ روز کے بعد مفصل حالات لکھے جائیں گے۔ سو مفصل جواب آنے پر آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔ اگر اعجاز آپ کی ملنے سے اتفاق کر گیا تو بہتر ورنہ امرتسر میں سلسلہ جنبانی جاری رکھی جائے گی۔ ملک محمد دین صاحب نے ابھی تک خط کا جواب نہیں دیا معلوم ہوتا ہے وہ کرنال میں نہیں ہیں آج میں نے ان کو بھی خط لکھا ہے۔ اعجاز کو چاہیئے کہ وہ پہلے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے پھر ملک کی تحریکوں میں شامل ہو خلافت کا کام کرنے سے میں اسے روکتا نہیں کیونکہ یہ بات قلب کی حالت پر منحصر ہے البتہ پہلے اپنے کام میں پختہ ہو جانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ خلافت کمیٹیوں کے بعض ممبر ہر جگہ قابل اعتبار نہیں ہوتے وہ بظاہر پکے مسلمان معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ باطن اخوان الشیاطین ہیں اسی وجہ سے میں نے خلافت کمیٹی کے سکرٹری شپ سے استعفا دے دیا تھا۔ اس استعفے کے وجوہ اس قابل نہ تھے کہ پبلک کے سامنے پیش کئے جاتے لیکن اگر پیش کئے جا سکتے تو لوگوں کو سخت حیرت ہوتی۔ بہر حال اعجاز خود سمجھدار ہے۔ گزشتہ رات لاہور میں بھی بہت سی گرفتاریاں ہوئیں اور کلکتہ میں تو معلوم ہوتا ہے قیامت برپا ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔

ان کے لئے کستوری کا نافہ منگوایا ہے۔ ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیئے کہ کستوری افیون میں کس طرح ملائی جائے

والسلام

محمد اقبال

خط کا پہلا حصہ تو میرے رشتہ کے متعلق ہے۔ انہوں نے امرتسر کے کسی گھرانے کے حالات معلوم کرنے کے لئے اپنے کسی ملنے والے کو لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح ملک محمد دین صاحب (ازل بعید ملک مرحوم کے والد) کو جو ان کے احباب میں سے تھے اور ان دنوں شاید نواب کرنال سے متعلق تھے اچھا رشتہ تلاش کرنے کے لئے لکھا ہوا تھا۔ ابا جان نے سیالکوٹ کے کسی گھرانے کا ذکر کیا ہوگا۔ یہ بات نوٹ کرنے والی ہے کہ رشتہ کے سلسلہ میں اس خط میں انہوں نے میری رائے کو مقدم قرار دیا ہے۔

سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کے متعلق ان کے خیالات خط کے دوسرے پیراگراف میں لکھے گئے ہیں۔ خلافت کمیٹیوں کے بعض اراکین کے متعلق انہوں نے جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ نوٹ کرنے کے قابل ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ رائے اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر قائم کی ہوگی۔

میاں جی کو ڈاکٹر نے دوائی کے طور پر کستوری میں تھوڑی سی افیون ملا کر گولیاں استعمال کرنے کو کہا تھا۔ ان کے لئے کستوری کا نافہ منگوانے کی اطلاع دی ہے۔

۷۱

سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے مجھے چار پانچ مہینے ہو گئے۔ اول تو یہ مختصر عرصہ ایک نووارد کے لئے وکالت کے میدان میں قدم جمانے کے لئے کافی نہ تھا۔ دوسرے سیاسی تحریکوں کی وجہ سے وکالت کے کاروبار میں ان دنوں مندا تھا۔ اس لئے اس پیشہ میں میرا دل نہ لگا۔ انہیں دنوں میرے مرحوم دوست سید میر افضل علی نے جو انکم ٹیکس کلکٹر تھے مجھے اطلاع دی کہ ان کے محکمہ میں انکم ٹیکس کلکٹر کی دو ایک آسامیاں نکلنے والی ہیں ان دنوں مسٹر ڈارلنگ انکم ٹیکس کمشنر تھے جو چچا جان کے دوست تھے۔ میں نے یہ اطلاع ان کو دی اور لکھا کہ میں اس جگہ کے لئے کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ جواب میں ان کا یہ خط ملا۔

خط میں نواب صاحب سے مراد نواب ذوالفقار علی خاں صاحب ہیں۔ چوہدری محمد حسین جو بعد میں چچا جان کے قریبی دوست بن گئے ان دنوں نواب صاحب کے صاحبزادگا

کے اتالیق تھے اور نواب صاحب ان کو سرکاری ملازمت دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

لاہور ۱۸ جنوری ۲۳ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ بہتر ہے تم کوشش کرو اور عرضی کی ضرورت ہے تو عرضی دے دو میں بھی جہاں تک ممکن ہوگا کوشش کروں گا۔ انگریز ان دنوں میں صرف انہیں لوگوں کو ملازمت دیتے ہیں جنہوں نے زمانہ جنگ میں کوئی خدمات کی ہوں۔ بہرحال کوشش کرنا ضروری ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ نواب صاحب چودھری محمد حسین کے لئے کوشش کر رہے تھے مگر ان کو ناکامی ہوئی تم تحقیق کر لو کہ جو آگاہی تمہیں ملی ہے درست ہے۔ میں ڈارلنگ صاحب سے خود بھی کہوں گا اور نواب صاحب سے بھی کہلواؤں گا۔ وہ پرسوں دہلی گئے ہیں آٹھ دس روز کے بعد آئیں گے پھر ان سے مشورہ کرنے کے بعد تم کو لکھوں گا۔ تم مجھے پھر یاد دلانا۔ باقی رہا پیشہ وکالت سو موجودہ صورت میں تو جو تم کہتے ہو ٹھیک ہے۔ علاوہ اس کے اس پیشے میں ابتدا میں بہت سی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے مگر آئندہ زمانے میں اس پیشے کے بہت سے امکانات ہیں بشرطیکہ مزید اصلاحات گورنمنٹ نے منظور کر لیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے

والسلام

محمد اقبال

۷۲

چچا جان نے مجھے تحقیق کرنے کو لکھا تھا کہ نئی آسامیاں نکلنے کی خبر درست بھی ہے یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ خبر کے درست ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس پر اُن کا یہ خط ملا۔

خط میں مسٹر مارٹن اور مسٹر وُلنر سے سندات حاصل کرنے کو لکھا ہے۔ اول الذکر مسٹر ہنری مارٹن اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ اس کالج میں تعلیم پانے کے زمانہ میں میں مارٹن ہسٹاریکل سوسائٹی کا سکریٹری تھا۔ دو ایک اور طلبا کی سوسائیٹیوں کا عہدہ دار بھی تھا۔ مارٹن صاحب مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے۔ مسٹر وُلنر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ وہ بھی مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے کیونکہ میں یونیورسٹی ڈبل کمپنی کا ممبر تھا جس کے وہ کمانڈنگ افسر تھے۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ تم بے شک کوشش کرو۔ مسٹر مارٹن اور وُلنر صاحب سے بھی سندات حاصل کر لو اور جب وقت آئے تو ایک تحریری عرضی دینا جس میں تمہارے ابا جان کی خدمات کا بھی ذکر ہو۔ وہ عرضی تم میرے پاس بھیج دینا میں اپنے سفارشی خط کے ساتھ ڈارلنگ صاحب کے پاس بھیجوں گا۔ وہ میرے انگلستان کے زمانہ کے واقف ہیں اور میری بہت عزت کرتے ہیں مگر ملازمت وغیرہ کے معاملے میں انگریزوں کی واقفیت وغیرہ پر اعتماد کرنا ٹھیک نہیں۔ سعی پورے طور پر کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو آج کل کسی قدر شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اس شک میں ہمارے ہم وطن بھی انگریزوں کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ اس وقت تو بالعموم انہیں مسلمانوں کو ملازمت کے لئے پسند کیا جاتا ہے (خاص کر اعلیٰ ملازمتوں کے لئے) جن کی اسلامیت حکومت کے خیال میں کمزور ہو اور اس کمزوری کا نام وسعت خیال یا لبرلزم رکھ جاتا ہے۔

باقی رہی وکالت سو یہ اللہ پر توکل رکھنے والوں کا پیشہ ہے اگر کسی مہینے میں آمدنی نہ ہو تو ابتدا میں سخت گھبراہٹ ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ اس کی عادت ہو جاتی ہے بڑے بڑے پرانے اور مشہور کام کرنے والوں کو بھی گاہے ماہے یہ تجربہ ہو جایا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ لطیف ہے ایک دو ماہ کام نہ آنے تو تیسرے مہینے کسر نکال دیا کرتا ہے۔ تم محنت کرتے جاؤ خواہ کام آئے نہ آئے کتابیں قانون کی پڑھتے رہو۔ خاص کر پنجاب ریکارڈ جب کام آنا شروع ہوگا تو پڑھنے کی فرصت نہ ہوگی۔ مگر گھبراؤ نہیں کام ضرور آئے گا۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کرنا۔ مولوی گرامی صاحب ان کو سلام کہتے ہیں۔

محمد اقبال لاہور ۱۹ جنوری ۲۳ء

۷۳

خبر کی مزید تصدیق کے لئے میں نے میر افضل علی صاحب کو بھی خط لکھا تھا۔ اُن کا جواب آیا تو میں نے چچا جان کو بھیج دیا۔ اس خط کے جواب میں ان کا یہ خط موصول ہوا

لاہور ۲۸ جنوری ۲۳ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ گھر میں سب طرح سے خیریت ہے۔ گزشتہ رات تمہاری پھوپھی کا انتظار رہا اب تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ ان کا ارادہ بدل گیا میر افضل علی کا خط میں نے دیکھ لیا ہے جو اس خط میں بند کر کے واپس کرتا ہوں تمہیں شاید اس کی ضرورت پڑے۔

ڈارلنگ صاحب کی بیوی کا خط کل مجھے آیا تھا انہوں نے ۵ فروری (اتوار) کو مجھے لنچ پر بلایا ہے۔ معلوم نہیں ڈارلنگ صاحب خود بھی اس روز لاہور میں ہوں گے یا باہر بہرحال اگر اس روز اور لوگ وہاں نہ ہوئے تو میں ڈارلنگ صاحب سے زبانی کہوں گا ورنہ بعد میں تمہارے لئے ان کو خط لکھوں گا۔ نواب صاحب سے اس موقع پر کہلوانا مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلے چودھری محمد حسین کے لئے کہہ چکے ہیں لیکن میں خود تمہارے لئے جہاں تک ممکن ہوگا کوشش کروں گا۔ وُلنر صاحب کو خط لکھ کر سارٹیفکیٹ لے لو یا ایک روز آکر ان سے مل لو۔ میں اپنا خط تمہاری عرضی کے ہمراہ بھیجوں گا جس میں سب حالات لکھوں گا اور یہ بھی دریافت کروں گا کہ اگر وہ تم کو دیکھنا چاہیں تو اطلاع دیں۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ اپنے ابا جان سے میرا سلام کہنا۔ والسلام

محمد اقبال

تھیں رستا ہیں میں لاہور گیا۔ مسٹر مارٹن اور مسٹر وُلنر سے ملا۔ اُن سے اپنی درخواست کی تائید میں خطوط حاصل کئے اور درخواست دے دی۔ اُن خطوط کا تو کیا اثر ہونا تھا چچا جان کی وجہ سے ڈارلنگ صاحب نے مجھے منتخب کر لیا اور تین مہینے کی ٹریننگ کے لئے پشاور تعینات کر دیا۔

۷۴

ملازمت تو آسانی سے مل گئی لیکن پشاور میں ٹریننگ کئی وجوہات سے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئی۔ ایک تو پشاور شہر میں رہائش کا مناسب انتظام نہ ہو سکا۔ میرے ماموں غلام نبی صاحب اُن دنوں ملٹری ورکس میں سب ڈویژنل افسر تھے اور جمرود چھاؤنی میں تعینات تھے جو پشاور سے کئی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مجبوراً ان کے ہاں قیام کیا۔ صبح ان کے سائیکل پر پشاور میں واقع انکم ٹیکس کے دفتر جاتا اور دفتر بند ہونے کے بعد سائیکل پر ہی جمرود واپس آتا۔ جمرود اور پشاور کے درمیان سڑک تو اچھی تھی۔ لیکن سائیکل پر اتنے میل آنے جانے کی مشقت بڑی کٹھن تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ مہینہ رمضان کا تھا۔ اُن دنوں شعائر اسلام سے اتنی بیگانگی نہ تھی جتنی اب ہے۔ صوبہ سرحد میں تو خاص طور پر ماہِ صیام کا احترام کیا جاتا تھا۔ دن کے اوقات میں پشاور میں کھانے پینے کے لئے کچھ ملنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اِدھر میرے ماموں جان کٹر قسم کے مذہبی آدمی تھے۔ ان حالات میں میں اگر روزہ نہ رکھتا تو خافت کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روزے سے روزانہ اتنے میل سائیکل سواری سے ہفتہ میں دو تین دفعہ مجھے اختلاج قلب کی شکایت ہوئی۔ ماموں جان نے سائیکل سواری کی ممانعت کر دی۔ اس کی بجائے کرایہ کے تانگہ کا انتظام کیا گیا جو صبح مجھے پشاور لے جاتا اور دفتر بند ہونے کے بعد واپس جمرود لے آتا۔ پشاور کے تانگے تو مشہور ہیں۔ آرام دہ اور تیز رفتار۔ ملٹری ایریا ہونے کی وجہ سے سڑک بڑی اچھی حالت میں تھی۔ اُس پر تانگہ میں سواری کا بڑا لطف آتا۔ لیکن جب یہ یاد آتا کہ تانگے کا روزانہ کا کرایہ میرے ٹریننگ الاؤنس (۵۰ روپیہ ماہوار) سے زیادہ ہے تو سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ میں نے تو اختلاج کی شکایت کا ذکر ابا جان کے خط میں نہ کیا لیکن ماموں جان نے کیا ہوگا۔ وہاں سے یہ خبر لاہور پہنچی تو چچا جان نے مجھے یہ خط لکھا۔

برخوردار اعجاز احمد طال عمرہٗ

بھائی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو ۱۱ روز میں دو دفعہ اختلاج قلب کی شکایت ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس کا باعث بائی سیکل کی متواتر سواری ہے تم کو چاہیئے کہ بائی سیکل کی سواری کچھ دنوں کے لئے بالکل ترک کر دو اور اب تو تمہیں شاید اس کی ضرورت بھی نہ پڑے۔ اس کے علاوہ تم اپنا مفصل حال لکھو تو میں تمہارے لئے یہاں سے کوئی نسخہ تجویز کرا دوں۔ کسی معدہ ٹانک کا استعمال ضروری ہوگا۔ اس قسم کی شکایت مجھے بھی زمانہ طالب علمی میں تھی۔ گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔

محمد اقبال لاہور ۱۷ مئی ۳۲ء

۷۵

اُن کے خط کے جواب میں میں نے لکھا کہ سائیکل سواری تو بند کر دی ہے اور صحت کے لحاظ سے اب کوئی خاص شکایت نہیں۔ پشاور میں ایک اور تکلیف یہ تھی کہ وہاں کے انکم ٹیکس کلکٹر جن سے ٹریننگ لینی تھی عیسائی تھے۔ وہ ہندو مذہب ترک کرکے عیسائی ہوئے تھے۔ شاید اس لئے مسلمانوں سے ان کو تعصب دو آتشہ تھا۔ ان دنوں میرے علاوہ ایک اور انکم ٹیکس کلکٹر بھی پشاور میں زیر ٹریننگ تھے۔ اگرچہ ہم دونوں انہی کی طرح انکم ٹیکس کلکٹر تھے لیکن ہمارے ساتھ ان کا رویہ غیر ہمدردانہ ہی نہیں آمرانہ تھا۔ اُن کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہماری تقرری کو ناپسند کرتے ہیں۔ میں نے اپنے خط میں اس تکلیف کا بھی ذکر کیا تو اُن کی طرف سے یہ بڑا مشفقانہ جواب ملا۔

لاہور ۲۱ مئی ۳۲ء

عزیزم اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط ملا الحمد اللہ کہ کوئی خاص شکایت تم کو نہیں مجھے اس کا بڑا تردد ہو رہا تھا۔ کوئی فکر نہ کرنا اگر تم کام کر سکتے ہو تو کرو ورنہ کچھ پروا نہیں آخر تمہارے ہاتھ میں ایک مفید پیشہ ہے جس سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ رزق انسان کا عمرو زید کے ہاتھوں میں نہیں کے خدا کے ہاتھ میں ہے۔

رزق از طے جو مجو از زید و عمر
مستی از مے جو مجو از بنگ و خمر

تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیئے اور ہر قسم کا فکر دل سے نکال دینا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کارساز ہے اور انسان کا فکر ہی اس کے لئے باعث آزار ہے۔ بالفرض اگر تم کو اپنی موجودہ مہم میں کامیابی نہ ہوئی تو بھی کیا۔ خدا تعالےٰ رزق کا کوئی اور سامان پیدا کر دے گا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ غرض یہ ہے کہ انسان کو اپنی صحت کی حالت کے مطابق اپنے فرائض کی ادا میں کوتاہی نہ کرنا چاہیئے اور نتائج خدا کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

ڈارلنگ صاحب نے حال میں بیچارے منور کو موقوف کر دیا ہے اس کو انکم ٹیکس کلکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے

محمد اقبال

منور صاحب جن کا اس خط میں ذکر ہے لاہور کے ایک سرکردہ مسلم خاندان کے نوجوان تھے۔ وہ مجھ سے پہلے انکم ٹیکس کلکٹر مقرر ہوئے تھے۔ بعد میں سنا کہ وہ بھی ہمارے استاد کے کشتۂ ستم ہوئے تھے۔ واللہ اعلم

۷۶

لکھنے کو تو میں نے چچا جان کو لکھ دیا کہ صحت کے لحاظ سے مجھے اب کوئی خاص شکایت نہیں لیکن روزانہ روزے سے جمرود سے پشاور آنے جانے کی جسمانی کوفت اور دفتر کے اوقات کی ذہنی کوفت مل جل کر میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ جسمانی کوفت تو شاید میں جھیل بھی جاتا لیکن ذہنی کوفت ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ رمضان کے آخری عشرے میں مجھے تین چار مرتبہ اختلاج کی شکایت ہوئی۔ اور اس عشرے کے آخری دنوں میں انگریزی محاورے کا وہ سوا آخری تنکا اونٹ پر لادا گیا جس نے اس کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ ہوا یوں کہ ماہ رمضان کے اختتام پر عید کی چھٹیاں جو اُس سال غالباً تین تھیں قریب آگئیں۔ جن حالات میں سے میں گزر رہا تھا۔ اُن حالات میں عید کے موقع پر گھر جانے کی خواہش قدرتی بات تھی۔ میں نے کلکٹر صاحب ہمارے
The last straw to break the camel's back ¹
اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اُن چھٹیوں میں سیالکوٹ جانے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے نہایت حقارت آمیز انداز میں فرمایا

There are no holidays in the income tax department. You proceed to Mardans and in these days check the accounts of some assessees

(انکم ٹیکس کے محکمہ میں کوئی چھٹیاں نہیں ہوتی۔ تم مردان چلے جاؤ۔ اور کچھ ٹیکس دہندگان کے حسابات کی پڑتال کرآؤ)۔ ان کا یہ حکم میری درخواست منظور نہ کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ ورنہ عید کی چھٹیوں میں مردان کے ٹیکس دہندگان کے دفاتر کب کھلے ہوتے؟ دوسرے اُن کا اندازِ تخاطب ایسا تھا جیسے اپنے چپڑاسی کو حکم دے رہے ہوں مجھے چچا جان کی بات یاد آئی۔ مجھے قانون کے پیشے کی طرف راغب کرنے کے لئے ایک مرتبہ فرمایا۔ "جن دنوں میں گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ ایک دن پرنسپل نے طالبعلموں کی حاضری کے سلسلہ میں میرے ساتھ اس انداز میں بات کی جیسے اپنے کلرک سے کر رہا ہو۔ اسلئے اُسی دن سے میری طبیعت ملازمت سے متنفر ہو گئی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا میں ملازمت سے احتراز کروں گا۔" کلکٹر صاحب تو مجھے حکم دے کر دفتر سے چلے گئے۔ میں نے ملازمت سے اپنا استعفیٰ لکھا اور اُن کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کر کے عید سے پہلے واپس سیالکوٹ پہنچ گیا۔ چچا جان چچی سو وکھوں پاسے لوٹ کے بڑھو گھر کو آئے۔ چچا جان کو خبر ملی تو اُن کی بے پایاں شفقت کا ثبوت اس تسلی نامے میں ملا۔

لاہور ۸ رجون ۳۲ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

بعد دعا کے واضح ہو مجھے اِس بات کا سخت افسوس ہے کہ زندگی کی دوڑ میں داخل ہوتے ہی تمہیں خرابیٔ صحت کا سامنا ہوا جس کی وجہ تم کو اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنی پڑی۔ مگر گھبرانا نہ چاہیئے۔ انشاء اللہ تمہاری صحت جلد اچھی ہو جائے گی۔ زندگی کو باقاعدہ بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور جوانی کی قوت سے یہ فائدہ اٹھانا چاہیئے کہ صحت دیر تک قائم رہے۔ میرے نزدیک صحت جسمانی و روحانی کی سب سے بڑی ضمانت مذہبی زندگی ہے میں نے تم کو لکھا بھی تھا کہ قرآن پڑھا کرو اور جہاں تک ممکن ہو نماز میں بھی باقاعدہ ہو جاؤ تو سبحان اللہ مگر قرآن پڑھنے پر میں زیادہ اصرار کرتا ہوں کہ اس کے پڑھنے کے فوائد میرے تجربے میں آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنا اکسیر ہے سیالکوٹ میں تو صرف دو آدمی ہیں جن کی زندگی اور صحبت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے یعنی تمہارے دادا اور شاہ صاحب۔ کبھی کبھی شاہ صاحب کی خدمت میں چلے جایا کرو۔ کیا اچھا ہو کہ صبح ہر روز ان کے ساتھ پھرنے کے لئے چلے جایا کرو۔ یہ باتیں بظاہر معمولی ہیں مگر کچھ عرصے کے بعد ان کے فوائد تم کو خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔ باقی جہاں تک ممکن ہو زندگی کو سادہ بنانے کی کوشش کرو۔ تم نے مجھ سے مسواک کے متعلق سوال کیا تھا میری مراد اس سے دیسی مسواک تھی نہ انگریزی طرز کے منجن۔ یورپ کی بنی ہوئی چیز خوبصورت ضرور ہوتی ہے مگر اس میں ایک اخلاقی زہر ہوتا ہے جس کا اثر آج کل کے مادی طبیعت رکھنے والے انسان فوراً محسوس نہیں کر سکتے۔ میں نے بھائی صاحب کو لکھا تھا کہ اگر اعجاز چاہے تو سیالکوٹ سے چند روز کے لئے لاہور آ جائے یہاں کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا جائے۔ تم تسلی رکھو مجھے یقین ہے کہ زندگی میں ذرا سی باقاعدگی تمہاری صحت کو اچھا کر دے گی۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

اِس خط میں ارشاد ہوا کہ "بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنا اکسیر ہے لہٰذا میاں جی اور شاہ صاحب (مراد مولانا میر حسن صاحب) کی صحبت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے" میاں جی تو گھر میں ہی تھے۔ تعمیلِ ارشاد میں میں نے اُن کے پاس التزام کے ساتھ بیٹھنا شروع کر دیا خصوصاً اُس وقت جب وہ اسرارِ خودی یا رموزِ بیخودی جو اکثر اُن کے زیرِ مطالعہ رہتیں پڑھ رہے ہوتے۔ میاں جی مثنویوں کو اُونچی آواز میں رُک رُک کر پڑھتے تھے اور اکثر ساتھ ساتھ روتے جاتے تھے۔ میں پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد فرماتے اب تم سناؤ تو میں پڑھ کر سناتا مجھے یاد ہے ایک دن میں انہیں رموزِ بیخودی سے "سلیٹے مثل تفضلِ مُشبرے" والے اشعار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ میاں جی بڑے رقیق القلب تھے۔ جب میں نے "ای صراطت مشکل از بے مرکبی۔ من چہ گویم چوں مرا پسر نبیؐ" پڑھا تو میاں جی کے آنسو بہنے لگے اور "پیش پدر این جور نا زیبا مکن۔ پیشِ خواجہ بندہ را رسوا مکن" والے شعر پر تو روتے روتے اُن کی حالت غیر ہو گئی۔ اس پر بھابی جی (میری والدہ محترمہ) نے سختی سے مجھے "میاں جی کو رُلانے" سے منع کر دیا۔ اُن کی صحبت سے مستفید ہونے کا ایک موقع رات کو سوتے وقت اُن کے پاؤں دابنے کے وقت ملتا۔ اس وقت کی گفتگو مختلف موضوعات پر سادہ اور دلنشین انداز میں ہوتی۔ باتوں باتوں میں پتے کی بات کہہ جاتے بالخصوص جب میری کسی فروگذاشت پر تنبیہ مقصود ہوتی۔

جب میں سیالکوٹ میں تعلیم پاتا تھا بالخصوص مرے کالج میں تعلیم کے دو سالوں میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا اکثر موقع ملتا تھا۔ کیونکہ اُن کے مکان پر میں اُن سے فارسی پڑھنے جاتا تھا۔ تعلیم کے لئے لاہور چلا گیا تو پھر کبھی چھٹیوں میں سیالکوٹ آنا ہوتا تو سلام کے لئے یا چچا جان کا پیغام یا کوئی تحفہ پہنچانے کے لئے دو ایک بار ان کی خدمت میں جانا ہوتا۔ اس خط میں چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ "کبھی کبھی شاہ صاحب کی خدمت میں چلے جایا کرو۔ کیا اچھا ہو کہ صبح ہر روز اُن کے ساتھ پھرنے کے لئے جایا کرو۔" شاہ صاحب بلا ناغہ صبح پیدل اپنی ہمشیرہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے قبرستان جایا کرتے تھے جو شہر سے خاصے فاصلہ پر تھا۔ میں پیدل چلنے سے ہمیشہ ہی چرا رہا ہوں۔ اس لئے اپنی اس کم ہمتی کی وجہ سے "صبح ہر روز اُن کے ساتھ پھرنے کے لئے جایا کرو" کی تعمیل نہ کر سکا۔ اس خط کے ایک ہفتہ بعد اُن کا ایک اور خط میرے نام آیا (اس کا ذکر آگے آئے گا) جس میں شاہ صاحب کو چچا جان کا ایک پیغام پہنچانے کا ارشاد تھا۔ پیغام پہنچانے کے بعد میں نے کبھی کبھی حاضرِ خدمت ہونے کی اجازت طلب کی تو فرمایا آپ نے دروازے پر کوئی دربان بیٹھا دیکھا ہے۔ یہ شاہ صاحب کے بات کرنے کا انداز تھا۔ مطلب جب جی چاہے آیا کرو تمہیں منع کس نے کیا ہے۔ اس کے بعد میں ہفتہ عشرہ میں دو ایک بار حاضر ہوتا۔ اکیلے کتاب خوانی میں مصروف ہوتے تو زیادہ گفتگو نہ ہوتی۔ میاں جی اور چچا جان کی خیر خیریت پوچھ لیتے یا کوئی اِدھر اُدھر کی بات ہو جاتی اُن سے علمی گفتگو کرنے کی تو مجھ میں قابلیت تھی نہ جرأت۔ ہاں اگر کبھی کسی کو فارسی یا عربی نظم پڑھا رہے ہوتے تو مختلف اساتذہ کے بیسیوں اشعار سناتے۔ وہ علم کا ایک بحرِ زخار تھے۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائیں۔

اِس خط میں یہ بھی فرمایا کہ "میں نے تم کو لکھا بھی تھا کہ قرآن پڑھا کرو اور جہاں تک ممکن ہو نماز میں بھی باقاعدہ ہو جاؤ تو سبحان اللہ مگر قرآن پڑھنے پر میں زیادہ اصرار کرتا ہوں کہ اس کے پڑھنے کے فوائد میرے تجربہ میں آ چکے ہیں۔" قرآن کریم ناظرہ تو

میں داخل ہونے سے پہلے گھر پر میں نے ختم کر لیا ہوا تھا لیکن پھر سکول اور کالج میں تعلیم کے دوران قرآن کریم دہرانے کی توفیق ہی نہ ملی اس لئے روانی سے تلاوت نہ کر سکتا تھا اور زیر زبر کی غلطیوں کا بھی احتمال تھا۔ چچا جان کے قرآن پڑھنے کی تاکید فرمانے پر میں نے ارادہ کیا کہ کسی حافظ قرآن سے قرآن کریم دو ایک بار دہرا لیا جائے۔ میری خوش قسمتی سے اُن دنوں سیالکوٹ کی ایک مسجد کے امام ایک نوجوان نابینا حافظ محمد رمضان صاحب تھے۔ انہیں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن پڑھانے کا شوق ہی نہیں جنون تھا۔ جس نوجوان کو قرآن پڑھانا شروع کرتے اُس کا نام اپنی پاکٹ بک میں جو ہمیشہ اُن کی جیب میں ہوتی لکھوا لیتے۔ اُن کی کوشش رہتی کہ اُن کی اس فہرست میں اضافہ ہوتا رہے۔ جب اپنے ایک شاگرد (میرے دوست شیخ محمد عبداللہ علیگ مرحوم وکیل) سے میری خواہش کا علم ہوا تو خود میرے ہاں تشریف لائے اور مجھے بھی اس فہرست میں شامل کر لیا۔ وہ قرآن پڑھانے کا معاوضہ تو ایک طرف کسی شاگرد کے ہاں سے چائے یا شربت کا گھونٹ تک نہ پیتے تھے۔

حافظ صاحب کو چچا جان کا کلام سننے کا بڑا شوق تھا اور اکثر مجھ سے سُنا کرتے تھے۔ ایک بار چچا جان سیالکوٹ تشریف لائے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب قرآن پڑھانے آئے تو انہیں اُن کی تشریف آوری کا علم ہوا۔ بڑے پرشوق لہجے میں مجھے کہا "کدی سانوں وی بزرگاں دیاں زیارتاں کراؤ ناں" (کبھی ہمیں بھی بزرگوں کی زیارت کرایئے نا)۔ چچا جان اُس وقت ابا جان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے وہاں جا کر عرض کیا کہ میرے استاد حافظ صاحب جو نابینا ہیں آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق رکھتے ہیں۔ اجازت ہو تو انہیں یہاں لے آؤں۔ جواب میں فرمایا وہ تمہارے استاد ہیں اور وہ بھی قرآن کریم کے۔ اُن کی عزت ہم پر لازم ہے۔ میں اُن سے ملنے وہیں آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر والی مردانہ بیٹھک میں تشریف لے آئے۔ حافظ صاحب سے مصافحہ کیا۔ حافظ صاحب کی عادت تھی کہ نئے آدمی سے ملتے تو اُس کے چہرے، ہاتھوں اور بازوؤں پر اپنے ہاتھ پھیر کر اُن کی "شناخت" اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ یہی عمل انہوں نے چچا جان کی "شناخت" ذہن میں محفوظ کرنے کے لئے کیا۔ چچا جان نے اُن سے کہا کہ آپ کا بڑا احسان ہے جو اعجاز کو قرآن پڑھا رہے ہیں۔ جواب میں کہا "احسان اینہا دا اے جنہاں سانوں ثواب کمان دا موقعہ دیندے نے" (احسان ان کا ہے کہ مجھے ثواب کمانے کا موقعہ دیتے ہیں)۔ جس طرح معصوم بچہ اپنا کھلونا ہر ایک کو دکھا کر خوش ہوتا ہے۔ اسی بھولپن اور سادگی کے ساتھ حافظ صاحب نے اپنی پاکٹ بک جیب سے نکال کر چچا جان کے ہاتھ میں دے دی کہ دیکھئے کتنے انگریزی خواں نوجوان قرآن کریم پڑھ رہے ہیں فہرست دیکھ کر چچا جان بہت خوش ہوئے اور فرمایا "حافظ صاحب آپ بڑا نیک کام کر رہے ہیں۔ اس کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ دے گا۔" حافظ صاحب نے اس پر خوش ہو کر کہا "اسی تے چھلڑ ای دیندے آں۔ گریاں تے تسی دیندے او" (ہم تو چھلکے ہی دیتے ہیں۔ مغز تو آپ ہی دیتے ہیں)۔ حافظ صاحب بڑے بے نفس انسان تھے۔ فرشتہ کی طرح معصوم۔ حق تعالیٰ نے ضرور اُن سے رحمت کا سلوک فرمایا ہوگا۔

۷۷

ابا جان کے نام اِن کا ۱۳ جون ۳۲ء کا خط سارے کا سارا اُن کی اپنی زندگی کے متعلق ہے۔ اس لئے اُسے حذف کیا جا رہا ہے۔

لاہور ۱۲ جون ۳۲ء

برادر مکرم السلام علیکم

کل ایک خط خدمت شریف میں روانہ کر چکا ہوں ....

....

....

والد مکرم کو بھی یہ خط سُنا دیں۔ باقی خیریت ہے۔ آفتاب امتیاز بھی آ گیا ہے۔

والسلام

محمد اقبال

۷۸

چچا جان کے ۸ جون والے شفقت نامے کے جواب میں مَیں نے ملازمت کے تلخ تجربے کا رونا رویا تو جواب میں یہ تسلی نامہ موصول ہوا۔ ۳۲ء کے اس خط میں اُس زمانہ کے مسلمان نوجوانوں کے نام اپنے جس پیغام کا ذکر فرمایا ہے وہ آج کل کے مسلمان نوجوانوں کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے یعنی اپنے ذہنی اضطراب و بے چینی سے نجات پانے کے لئے مذہب میں پناہ لو۔ لیکن ان کا مطلب "نیموں میں رحمت لقب پانے والے" کے لائے ہوئے مذہب سے ہوگا جو "مس خام کو کندن" بنا دینے کی تاثیر رکھتا ہے نہ کہ کٹھ ملاؤں کے خود ساختہ مذہب سے کیونکہ بقول اُن کے "دینِ مُلا فی سبیل اللہ فساد" ہے

اِس خط کے ایک حصہ کا مضمون، ابا جان کے نام تھا۔ حسبِ ارشاد خط اُن کو دکھا دیا۔ اِس کا موضوع اُن کا وہی اپنا معاملہ تھا جو ۱۳ جون والے خط میں درج تھا۔ لہٰذا اِس حصے کو حذف کر دیا ہے۔

مولانا میر حسن صاحب کے نام اِس خط میں جو پیغام تھا وہ میں نے انہیں پہنچا دیا۔

لاہور ۱۵ جون ۳۲ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ امید ہے تمہاری صحت جلد اچھی ہو جائے گی اور جو تکلیف تم کو پشاور جانے آنے میں ہوئی ہے وہ بعد کی کامیابی سے فراموش ہو جائے گی۔ تلخ تجربات سے گھبرانا نہ چاہیئے زندگی پر اُن کا بھی Restraining Influence ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے ان کی تلخی کا احساس ہوتا ہے اور روح کو ایذا پہنچتی ہے تاہم بعد میں ان کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے اور انسان اس بات کے لئے شکر گزار ہوتا ہے کہ اس کو اس قسم کے تجربات ہوئے۔ جرمنی کے مشہور پیغمبری صفت شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر جوانوں کے روحانی اضطراب و بے چینی کا مشاہدہ کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا۔

Art Still has truth

Take refuge there

اس وقت اسلامی دنیا کی وہی حالت ہے جو نپولین کے وقت میں جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مسلمان نوجوانوں کے نام وہی ہے جو اس نے دیا تھا صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے Art کی جگہ لفظ Religion رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آرٹ میں اطمینان ضرور ہے مگر قوت نہیں ہے۔ مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں

. . . .

. . . .

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کر دیں۔ حضرت قبلہ مولوی میر حسن صاحب سے کہہ دیں کہ میں نے ان کو کارڈ در بارہ کاغذات امتحانات ایم اے ایل لکھا تھا معلوم ہوتا ہے وہ کارڈ ان تک نہیں پہنچا۔ یہاں مولوی محمد حسین صاحب ان کے پرچوں کا انتظار کرتے رہے۔ آخر میں نے اُن سے کہا کہ وہ خود سیالکوٹ تشریف لے جائیں اور نمبروں کا مقابلہ کر لیں امید ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب وہاں گئے ہوں گے اور پرچوں کے متعلق تمام امور طے ہو گئے ہوں گے۔

محمد اقبال

۷۹

ملازمت کے بہت مختصر لیکن بہت ہی تلخ تجربے کے بعد میں نے تہیہ کر لیا کہ اب دلجمعی سے وکالت کا کام کروں گا۔ حُسنِ اتفاق سے پریکٹس چل نکلنے کی ایک صورت بھی نکل آئی۔ سیالکوٹ کے ایک با اثر بزرگ سید نقیر علی شاہ آبا جان کے احباب میں سے تھے۔ وہ ڈسٹرکٹ اور سیشن کورٹ میں سررشتہ دار تھے۔ اُن کے بیٹے سید مظہر حسین مرحوم میرے دوست تھے۔ اُنہوں نے بھی میرے بعد قانون کا امتحان پاس کیا اور سیالکوٹ میں وکالت شروع کی۔ اُن دنوں پنجاب میں وُکلاء کے مل کر مشترکہ کام کرنے کا ابھی رواج نہ ہوا تھا۔ مظہر حسین کی تجویز پر ہم نے مشترکہ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے پنجاب میں غالباً اور سیالکوٹ میں یقیناً وکلاء کے کام میں اشتراک کی یہ پہلی مثال تھی نقیر علی شاہ صاحب پرانے عدالتی اہلکار تھے اور ضلع کے مقدمہ باز حلقوں میں ان کی کافی واقفیت تھی۔ شہر میں بھی اُن کا بڑا رسوخ تھا۔ اُن کی وجہ سے کام ملنا شروع ہوا۔ مظہر حسین یوں تو بڑے سمجھدار تھے لیکن عدالتوں میں کام کرنے کا ابھی تجربہ نہ تھا۔ ہاں موکلوں کو قابو کرنے میں بڑے ماہر تھے۔ مجھے عدالتی کام کا کچھ تجربہ ہو گیا تھا لہٰذا یہ کام میں نے سنبھالا۔ وکالت کی گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ آبا جی نے چچا جان کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا تو اُن کی طرف سے اُن کے نام یہ خط آیا۔

لاہور ۱۷ جولائی ۳۲ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا تھا اور والد مکرم کی خیریت ذکی شاہ سے بھی معلوم ہو گئی تھی الحمد للہ ذالک۔ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے پھوڑے کی طرف جلد توجہ کر دی ورنہ ممکن ہے زیادہ تکلیف ان کو ہوتی۔ ذکی شاہ کے ہم دست آم آپ کو بھیج چکا ہوں۔ ملتان سے آم آنے کی توقع تھی جن کی نسبت خیال تھا کہ بہت اچھے ہوں گے میرا خیال تھا کہ وہ آم آئیں تو آپ کو بھیجوں مگر افسوس کہ وہ اس وقت تک نہیں آئے اور بھیجنے والے صاحب ڈلہوزی چلے گئے۔ بہرحال جو آم میں نے بھیجے ہیں وہ بھی ملتان کے ہیں مگر اس سے بہتر دیسی آم لاہور میں نہیں ہیں۔ گو ان میں رس تھوڑا ہے مالدہ آم مجھے بھی پسند نہیں مگر سردار کو اس سے عشق ہے۔ اس واسطے گھر میں جب کبھی آم آتے ہیں وہی منگوائے جاتے ہیں۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اعجاز کا کام چل نکلا ہے۔ آپ اس سے کہہ دیں کہ وہ محنت کرتا ہے اور کام سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرے۔ جب وہ اچھی طرح سے تجربہ حاصل کرلے گا تو ممکن ہے کوئی پبلک پراسیکیوٹری کی جگہ نکل آئے میں اس کے لئے کوشش کروں گا۔ پبلک پراسیکیوٹری سے اور بھی اچھی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن کام جتنا بھی ہو تندہی اور توجہ سے کرے۔ حکام سے بھی جو وہاں ہوں رسوخ رکھے۔ انشاءاللہ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی ابھی اس کی عمر بڑی نہیں ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال

اس خط کی ایک بات خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کیونکہ وہ چچا جان کے کردار پر دلکش روشنی ڈالتی ہے۔ وہ آموں کے رسیا تھے لیکن مالدہ آم انھیں پسند نہ تھے۔ اس کے برعکس چچی سردار کو مالدہ آموں سے بقول چچا جان "عشق تھا"۔ یوں تو آم کی فصل کے دنوں میں اچھی اچھی اقسام کے آم دوست احباب کی طرف سے تحفتاً آتے تھے لیکن جب کبھی بازار سے آم منگوائے جاتے تو چچی سردار مالدہ آم ہی منگوائیں۔ چچا جان کبھی اپنی پسند کے آم منگوانے پر اصرار نہ کرتے۔

آموں کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی بیان کر دوں۔ جب کبھی آم تحفتاً آتے اور علی بخش یا کوئی دوسرا ملازم آموں کی پیٹی کھولتا تو اُسے دو چار اچھے اچھے "آم چن کے نکالنے کے لئے کہتے۔ جب وہ اپنی دانست کے اچھے آم نکال لیتا تو کہتے "اچھا اب یہ آم تم کھا لو۔"

۸۰

جولائی ۳۲ء کے آخری عشرے میں مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ یاد نہیں آرہا کہ کس سلسلہ میں جانا ہوا۔ جون کے شروع میں چچا جان نے آبا جان کو لکھا تو تھا کہ اگر اعجاز چاہے تو کچھ دنوں کے لئے لاہور آ جائے۔ شاید اس ارشاد کی تعمیل میں جانا ہوا یا کسی اور وجہ سے۔ میرے لاہور سے واپس آنے کے بعد آبا جان کے نام اُن کا یہ خط موصول ہوا۔

لاہور ۲۹ جولائی ۳۲ء

اُمید ہے اعجاز بخیریت گھر پہنچ گیا ہو گا۔ افسوس ہے کہ آم کی ایک ٹوکری گاڑی چلے جانے کے بعد اسٹیشن سے ملی اگر چند منٹ پہلے مل جاتی تو اعجاز کے ہمراہ بھیج دی جاتی۔ بہرحال اگر میری ڈلہوزی روانگی اور ٹوکری کہیں سے آگئی تو ہمراہ لاؤں گا۔ یہ آم جو مظفر گڑھ سے آئے تھے کچھ تو میں نے یہاں دے دیئے ہیں کچھ لدھیانے دیتا جاؤں گا۔ کل شام روانہ ہوتا ہوں آپ شملہ کوٹھی نو بہار کے پتہ پر مجھے اس خط کا جواب دیں۔ اگر شملہ کی آب و ہوا نے پاؤں کو تکلیف نہ دی تو وہاں کچھ مدت قیام رہے گا ورنہ واپس آ جاؤں گا اور ایک آدھ ہفتہ لاہور میں قیام کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

اعجاز تو بہت دُبلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی چھاتی میں بھی نسبتاً کمی ہے اور چہرے سے فکر و تردد کے آثار پائے جاتے ہیں۔ میرے دل پر ان باتوں نے بڑا اثر کیا ہے ممکن ہے کہ اس کے دل پر اور باتوں کے علاوہ آپ کی ناخوشی کا بھی اثر ہو۔ آپ اس کی صحت کی فکر کریں اور اس کو تسلی دیں کہ انشاءاللہ اس کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی بہتر صورت نکلے گی۔

فی الحال اس کو اپنا کام سیکھنے کی طرف پوری توجہ دینی چاہیئے اگر تعطیلات میں آئیں تو بھی قانونی کتب کا مطالعہ کرتا رہے۔ وکیل کی زندگی میں وہ وقت نہایت بیش قیمت ہے جب کہ کام نہ آتا ہو کیونکہ ان اوقات میں وہ مطالعہ کر سکتا ہے جو اس کے کام کے

کلام آئے گا جب لوگ اپنے معاملات اُن کے سپرد کرنے لگیں گے۔ دو تین سال تکلیف کے ہیں پھر میں بھی انشاء اللہ اس کے لئے کوشش کروں گا اور اگر آپ کے دل میں اس کی طرف سے کوئی ناخوشی ہو تو اس کو دور کر دیں اگر فضول خرچی کا عیب اس میں ہے بھی تو میرے نزدیک یہ عیب بدچلنی سے بہتر ہے اور الحمد للہ کہ یہ موخر الذکر عیب اس میں نہیں۔ یہی غنیمت ہے خدا کا شکر کرنا چاہیے۔ آپ اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر کے اپنے قلب کو افکار سے فارغ کریں۔ اللہ تعالیٰ غیر متوقع سامان کر دے گا مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والدہ مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ امید ہے اُن کا پھوڑا اچھا ہو گیا ہو گا۔

محمد اقبال

اس خط کے آخر میں میرے متعلق ابا جان کو لکھا ہے کہ "اگر فضول خرچی کا عیب اس میں ہے بھی تو میرے نزدیک یہ عیب بدچلنی سے بہتر ہے اور الحمد للہ کہ موخر الذکر عیب اس میں نہیں۔" اپنے متعلق ان کے اس بزرگانہ حسنِ ظن کا معلوم ہو کر قدرتاً مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس خط کی تحریر سے کوئی ۲۵ سال بعد ۱۹۷۳ء میں مجھے ان کا ایک خط مرحوم سر راس مسعود کے نام پڑھنے کا اتفاق ہوا جو ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کو یعنی اپنی وفات سے کوئی ۱۰ ماہ پہلے انہوں نے لکھا تھا۔ اس خط سے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ میرے متعلق ان کا یہ حسنِ ظن آخر عمر تک قائم رہا کیونکہ میرے متعلق لکھا ہے "شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا نہایت صالح آدمی ہے"۔ یہ خط اور سید صاحب موصوف کے نام کئی اور خطوط صہبا لکھنوی مدیر "افکار" کراچی کی مرتبہ کتاب "اقبال اور بھوپال" میں شائع ہوئے ہیں جسے "اقبال اکادمی" نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ ۱۰ جون والے اس خط کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنا ضروری ہے۔ شاید قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو۔

چچا جان کے بہت سے مکتوبات اوّل اوّل شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور نے ۱۹۴۵ء میں "اقبال نامہ حصہ اوّل" کے نام سے شائع کئے تھے انہیں شیخ عطاء اللہ پروفیسر علی گڑھ کالج نے مرتب کیا تھا۔ اقبال نامہ (حصہ اول) میں چچا جان کے کئی خطوط سید راس مسعود کے نام شامل ہیں جن میں ۱۰ جون ۱۹۳۷ء والا خط بھی ہے۔ "اقبال نامہ" (۱۹۴۵ء) کا ایک نسخہ میرے پاس ہے لیکن اس میں ۱۰ جون ۱۹۳۷ء والے خط میں میرے متعلق اُن کا بھتیجا اور نہایت صالح آدمی ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ میں نے صہبا صاحب سے دریافت کیا کہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء والا خط انہوں نے کہاں سے نقل کیا ہے۔ اُن سے یہ معلوم ہو کر تعجب ہوا کہ وہ خط اور سید راس مسعود کے نام دوسرے خطوط جو "اقبال اور بھوپال" میں شائع کئے گئے ہیں سب کے سب شیخ محمد اشرف کے "اقبال نامہ" حصہ اول سے نقل کئے گئے ہیں۔ اپنے بیان کی تائید میں انہوں نے "اقبال نامہ" کا وہ نسخہ مجھے دکھایا جس سے یہ سب خطوط نقل کئے گئے۔ جب اس نسخہ میں مندرجہ خطوط بنام سر راس مسعود کا مقابلہ ان خطوط سے کیا گیا جو میرے پاس والے نسخہ میں شامل ہیں تو مزید تعجب ہوا کیونکہ دونوں نسخے اگرچہ ۱۹۴۵ء والے پہلے ایڈیشن کے ہیں (دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی) لیکن اُن میں حسب ذیل ضمن اختلاف ہیں۔

۱۔ خط محررہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء کا کچھ حصہ میرے پاس والے نسخے میں حذف شدہ ہے۔

۲۔ خط محررہ ۱۸ دسمبر ۱۹۳۵ء میرے پاس والے نسخہ میں سرے سے موجود ہی نہیں۔

۳۔ خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کا کچھ حصہ جس میں میرے متعلق متذکرہ بالا کلمۂ خیر لکھا گیا ہے۔ میرے پاس والے نسخہ میں حذف شدہ ہے۔

جب صہبا صاحب نے شیخ محمد اشرف سے اس معمہ کی گرہ کشائی چاہی تو انہوں نے اپنے خط محررہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں یہ جواب دیا۔

"مکاتیبِ اقبال کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں طبع ہوا تھا۔ جس وقت یہ کتاب چھپ کر بازار میں آئی اُس وقت چودھری محمد حسین جن کو آپ خوب جانتے ہوں گے زندہ تھے۔ چودھری صاحب پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور Paper controller بھی تھے۔ میرے ان سے تعلقات بھی تھے۔ علامہ اقبال مرحوم نے ایک خط سر راس مسعود کو تحریر کیا ہوا تھا جو بالکل درست تھا۔ وہ خط بھی طبع شدہ ایڈیشن میں موجود تھا۔ چودھری صاحب پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ خط اس مجموعہ میں شامل ہو۔ میں نے ہر چند اُن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس خط کو حذف نہ کیا جائے مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً وہ خط حذف کر دیا گیا۔ جو نسخے قبل ازیں فروخت ہو گئے اُن میں وہ خط شامل ہو گا۔ بقایا نسخے اس خط کے بغیر ہوں گے۔ یہی فرق ہے جس کی طرف آپ نے نشان دہی کی ہے۔ اس خط کا عکس اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اصل خط شیخ عطاء اللہ صاحب مرحوم کے پاس موجود تھے۔ انہوں نے واپس نہیں کئے تھے۔ اب غالباً اُن کے صاحبزادے مختار مسعود کے پاس محفوظ ہوں گے۔ آپ نے صحیح تحریر فرمایا ہے۔ بعض نسخوں میں صفحات بھی کم ہیں اور عبارتیں بھی مختلف ہیں۔ چونکہ ایک بہت اہم اور طویل خط حذف کر دیا گیا تھا اس وجہ سے صفحات اور عبارت میں ضرور فرق ہونا لازمی تھا۔ امید ہے آپ کی الجھن دور ہو گئی ہو گی۔ اگر مزید ضرورت ہو تو آپ ہر وقت دریافت کر سکتے ہیں"۔

اس وضاحت کے موصول ہونے کے بعد میں نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ مختار احمد کو جو لاہور میں رہتے ہیں اس صورت حال سے آگاہ کر کے لکھا کہ وہ شیخ محمد اشرف سے مل کر اپنے طور پر بھی تصدیق کریں اور اگر کوئی ایسا نسخہ اُن کے پاس موجود ہو جس میں یہ تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں تو اُسے ہر قیمت پر خرید لیں۔ اُن کا حسب ذیل جواب محررہ ۱ اپریل ۱۹۷۴ء موصول ہوا۔

"میں کل شیخ محمد اشرف صاحب کو ملا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اقبال نامہ حصہ اوّل کے بارے میں انہوں نے وہی بات بتائی جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس کتاب کی تقریباً ۱۰۰ کاپیاں جب فروخت ہو گئیں تو چودھری محمد حسین صاحب نے چند خطوں کے بعض حصوں کو حذف کرنے کو کہا۔ میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا۔ سب نے یہی کہا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے مجھے علم ہوا کہ چودھری صاحب ۲ ماہ کے بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ چودھری صاحب اُس (لڑائی) کے زمانے میں Paper controller بھی تھے اور کاغذ کا کوٹہ بھی وہی دیتے تھے۔ انہیں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا فیصلہ کیا کہ ابھی کتاب کی فروخت بند کر دی جائے اور کسی طرح ۲ ماہ گزارے جائیں ان کے ریٹائر ہونے کے بعد کتب فروخت کریں گے۔ چودھری صاحب کو دو سال کی EXTENTION مل گئی۔ میں مجبور ہو گیا۔ کتاب کی ۱۰۰۰ کاپیاں چھپی تھیں۔ اُن کاپیوں میں ورق تبدیل کرنے پڑے جس میں مجھے کافی نقصان ہوا۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس اب کوئی کاپی نہیں ورنہ میں آپ کو مایوس نہ کرتا۔"

چچا جان کے احباب میں سے چودھری محمد حسین کے علاوہ سید نذیر نیازی بھی اُن کی زندگی کے آخری سالوں میں اُن کے بہت قریب تھے۔ میں نے اُن سے بھی اقبال

نامہ میں شائع ہونے والے بعض مکتوبات بنام سید راس مسعود ہیں کتاب کے شائع ہو جانے کے بعد چودہری محمد حسین کے قطع و برید کر لینے کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے اپنے خط محررہ ۳۰ اپریل ۱۹۳۸ء میں تسلیم کیا "کہ بعض (خطوط) میں چودہری صاحب مرحوم نے مصلحتاً کچھ تبدیلیاں بھی کیں ان معنوں میں کہ جو عبارت پسند نہ آئی اسے قلم زد کر دیا۔"

شیخ محمد اشرف صاحب اور سید نذیر نیازی صاحب کی متذکرہ بالا تصریحات سے ثابت ہوا کہ اقبال نامہ کے شائع ہو جانے اور کچھ کا پیاں فروخت ہو جانے کے بعد چودہری محمد حسین صاحب نے بعض خطوط مندرجہ اقبال نامہ میں مصلحتاً قطع و برید کرنے پر شیخ محمد اشرف صاحب کو مجبور کیا۔ سید راس مسعود صاحب کے نام خط محررہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء (اقبال اور بھوپال صفحہ ۸۷) کا کچھ حصہ اور خط محررہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء (اقبال اور بھوپال صفحہ ۱۵۰) سارے کا سارا حذف کرا دینے میں محترم چودہری محمد حسین کی کیا مصلحت تھی یہ تو انہیں ہی معلوم ہو گا لیکن سید صاحب موصوف کے نام خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء (اقبال اور بھوپال صفحہ ۱۸۹) کا جو حصہ چودہری صاحب نے حذف کرایا۔ اُس کی مصلحت سمجھ میں آتی ہے۔ اس حذف شدہ حصہ میں میرے متعلق لکھا تھا کہ "نہایت صالح آدمی ہے۔" یہ صالحیت کا سارٹیفکیٹ اگرچہ اُس حُسن ظن کا مرہون منت تھا جو بزرگ عام طور پر اپنے عزیزوں کے متعلق رکھتے ہیں لیکن اس کی اشاعت میرے محترم شریک کار (ہم دونوں جاوید اور منیرہ کے گارڈین تھے) کی "سیاست" کو گوارا نہ ہوئی اس "سیاست بازی" کے متعلق مزید کچھ کہنا مناسب نہیں کہ چودھری صاحب محترم اب اپنے خالق کے پاس پہنچ چکے ہیں اور اُن کا معاملہ اب اللہ تعالےٰ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کا انہیں اجر عظیم عطا فرمائیں اور تعصب کے زیر اثر ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں۔

حال ہی میں بھوپال کے ایک صاحب اخلاق اثر نے بھی چچا جان کے خطوط بنام سید راس مسعود کا مجموعہ "اقبال نامے" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اُس میں بھی چچا جان کے ۱۰ جون ۱۹۳۷ء والے خط کا بقول مرتب "معیاری اور مکمل اور مستند متن" شامل ہے جو "اقبال اور بھوپال" والے متن سے بھی قدرے مختلف ہے۔ اس میں لکھا ہے "نمبر ۱۲ شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا GUARDIAN ہو سکتا ہے یا نہیں۔" اگر یہی متن مکمل اور مستند متن ہے تو بھی یہاں تک اُن کی طرف سے میری صالحیت (جس کا مجھے کوئی دعویٰ نہیں) کا سارٹیفکیٹ موجود ہے جسے میں اُن کے شفقتانہ حُسنِ ظن پر محمول کرتا ہوں۔

خط محررہ ۲۴ جون ۱۹۳۲ء میں ایک اور بات جو نوٹ کرنے والی ہے وہ اُن کا اللہ تعالیٰ کی نصرت پر یقین محکم ہے۔ خط کے آخر میں آبا جان کو مشورہ دیتے ہیں کہ آپ اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر کے اپنے قلب کو افکار سے فارغ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ نے غیر متوقع سامان کرے گا۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔" اور واقعی اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے غیر متوقع سامان پیدا کئے جن کی تفصیل بیان کرنے سے یہ وضاحتی نوٹ اور طویل ہو جائے گا لہٰذا اسے ترک کرتا ہوں۔

۸۱

ستمبر ۱۹۲۲ء میں آبا جان پھر بیمار ہو گئے اگرچہ اُس وقت اُن کی عمر ۴۲ سال کے لگ بھگ تھی، لیکن کوئی خاص عارضہ لاحق نہ تھا۔ دراصل اُن کی طبیعت کی ناسازی ذہنی تفکرات کا نتیجہ تھی۔ اُن کے تین بیٹوں اور تین بیٹیوں میں سے اس وقت تک صرف ایک بیٹی کی شادی ہوئی تھی اور بیٹوں میں سے صرف ایک تعلیم مکمل کر کے برسرکار ہوا تھا اسلئے وہ فکر مند رہتے تھے کہ اتنی ذمہ داریوں سے کیسے عہدہ برآ ہوں گے۔ اُن کا بخار رکا تو میں نے چچا جان کو مطلع کیا۔ یہ اطلاع ملنے پر انہوں نے آبا جان کو یہ خط لکھا جو کئی لحاظ سے خاص توجہ کا مستحق ہے۔

لاہور ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء

برادر مکرم السلام علیکم

اعجاز کے خط سے معلوم ہوا کہ مسہل کے بعد بخار رک گیا ہے۔ الحمد للہ میں آپ کے لئے دعا کر رہا ہوں انشاء اللہ آپ کی صحت ضرور اچھی ہو جائے گی میں نے جو نسخہ آپ کو بتایا تھا اس پر ضرور روزانہ عمل کئے جایئے اس کی بنا محض فلسفیانہ خیالات پر نہیں بلکہ اس انکشاف پر ہے جو خدا تعالےٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے قلب انسانی کے متعلق مجھ کو عطا فرمایا ہے۔ اگر بعض خیالات آپ کو افسردہ کرتے ہیں تو ان کو یک قلم دل سے نکال دینا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ آپ کی تمام مشکلات رفع کر دے گا اور برکت نازل کرے گا۔ اگر آپ زندگی سے دل بردا شتہ بھی ہوں تو محض اس خیال سے کہ اسلام پر بہت اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے۔ اپنی صحت کی طرف توجہ کیجئے تاکہ آپ اپنی آنکھوں سے اس زمانے کا کچھ حصہ دیکھ لیں۔ آج چودہ یا شاید ۱۶ سال ہو گئے جب مجھ کو اس زمانے کا احساس انگلستان کی سرزمین پر ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک یہی دعا رہی ہے کہ بار الہا اس وقت تک مجھے زندہ رکھ یہاں تک کہ اپنی بعض پرائیویٹ مشکلات کے متعلق بھی میں نے شاذ ہی دعا مانگی ہوگی۔

آپ نے اخباروں میں پڑھ لیا ہو گا کہ ترکوں کا قبضہ بغیر جنگ کے اپنے تمام ممالک پر ہو گیا ہے۔ آبناؤں پر ان کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا ہے البتہ یہ اقتدار بعض شرائط کا پابند ہو گا جس کا فیصلہ مجلس اقوام کرے گی۔ ترکستان کی جمہوریت کو بھی روس کی گورنمنٹ نے تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے صدر غازی انور پاشا ہوں گے اس سے بھی زیادہ معنی خیز خبر یہ ہے کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد شاہین نام ہے لے نن جو پہلے صدر تھا بوجہ علالت رخصت پر چلا گیا ہے اس کے علاوہ روسی گورنمنٹ کا وزیر خارجہ بھی ایک مسلمان مقرر ہوا ہے جس کا نام قرہ خان ہے۔ ان تمام واقعات سے انگریزی پولیٹیکل حلقوں میں بہت تشویش پیدا ہو گیا ہے اور ان سب باتوں پر طرہ یہ ہے کہ ایشیا میں ایک لیگ اقوام کی قائم ہونے والی ہے جس کے متعلق افغانی اور روسی گورنمنٹ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے یہ سب اخباروں کی خبریں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ حقیقت ان سے بھی زیادہ ہے۔ غالباً اب مسلمانان ایشیا کا فرض ہے کہ تمام اسلامی دنیا میں چندہ کر کے کابل اور قسطنطنیہ کو بذریعہ ریل ملا دیا جائے اور یہ ریل ان تمام اسلامی ریاستوں میں سے ہو کر گذرے جو روس کے انقلاب سے آزاد ہوئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تجویز ضرور عمل میں آئے گی۔ باقی خدا کا فضل و کرم ہے جو واقعات رونما ہونے ہیں انہوں نے قرآنی حقائق پر مہر لگا دی ہے کہ حقیقت میں کوئی کمزور یا طاقتور نہیں جس کو اللہ چاہتا ہے طاقتور بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تن کی آن میں تباہ کر دیتا ہے۔ والدہ مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال لاہور

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر خط سے ۱۷ سال قبل قیام انگلستان کے زمانے میں انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ اسلام پر بہت اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے۔ ان کے اس بیان کی تائید اُن کی "زمانہ آیا ہے بے حجابی کا" والی غزل سے بھی ہوتی ہے جو قیام انگلستان کے دوران ۱۹۰۷ء میں کہی گئی جو بانگِ درا میں شائع ہو چکی ہے۔ اسلام کی نصرت اور سربلندی کے لئے اُن کی تڑپ کا یہ عالم تھا کہ اخباری گپ پر بھی یقین فرما لیتے۔ "اخباری خبر کہ روس کا صدر ستالن مسلمان ہے اور اس کا نام "محمد ستالین" ہے" اخباری گپ ہی تھی ورنہ واقعتاً یہ بات درست نہ تھی۔ بہرحال "اسلام پر جلد بہت اچھا زمانہ آنے" کا اُن کا احساس اپنی جگہ درست تھا۔ اُن کی حیات میں تو ان کے "آئینۂ ادراک میں آنے والے دور کی تصویر دھندلی" سی تھی لیکن ان کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد اس تصویر کے نقوش اُبھرنے لگے۔ اسلامی دنیا میں سیاسی انقلاب برپا ہوا۔ اُن کا پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں اسلامی ممالک غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزاد ہوئے۔ انقلاب کا یہ عمل ابھی جاری ہے۔ سیاسی انقلاب کے علاوہ ایک روحانی انقلاب بھی برپا ہے جس کی طرف ابھی سیاسی دنیا کی توجہ نہیں لیکن قرآن کریم کی پیش گوئی "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ" پوری ہو کر رہے گی۔ انشاء اللہ۔

۸۲

انکم ٹیکس کے محکمہ سے مستعفی ہونے کے بعد سیالکوٹ میں بطور وکیل پریکٹس کرتے ہوئے مجھے تقریباً ۲ سال ہو گئے تھے۔ پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس پریکٹس میں میرے ساتھ ایک اور وکیل دوست سید مظہر حسین بھی شریک تھے۔ انہیں ایام میں سیالکوٹ کے ایک پرانے وکیل علی بخش صاحب کے صاحبزادے مسٹر کے۔ اے۔ حمید مرحوم انگلستان سے بیرسٹری کی سند لے کر آئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ یہ کہنا تو مبالغہ آرائی ہوگی کہ ہماری پریکٹس زوروں پر تھی لیکن جونیئر وکلاء کی حیثیت سے کچھ غیر تسلی بخش بھی نہ تھی۔ حسنِ اتفاق سے اُن دنوں سیالکوٹ میں دیوانی، فوجداری اور محکمۂ مال کے سب افسران نوجوان وکلا کی بڑی حوصلہ افزائی کرنے والے تھے۔ ہم تینوں کے ان سب سے اچھے مراسم تھے۔ اپنے ہم عصر وکلاء سے بھی میرے اچھے تعلقات تھے۔ بار ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا انتخاب ہوا تو مجھے ایسوسی ایشن کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اُن دنوں شہر میں سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ اُن میں اور بالخصوص تحریک خلافت میں مسلم نوجوان وکلا بھرپور حصہ لیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے لئے میں نے خلافت کمیٹی کے معتمد کے طور پر بھی کام کیا۔ غرضیکہ ہر رنگ میں پریکٹس کے لئے حالات سازگار تھے لیکن جیسا کہ چچا جان نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا "وکالت اللہ پر توکل رکھنے والوں کا پیشہ ہے۔ اگر کسی مہینے آمدنی نہ ہو تو ابتدا میں سخت گھبراہٹ ہوتی ہے۔" مجھے اعتراف ہے کہ توکل کا یہ مقام مجھے حاصل نہ تھا اس لئے جس مہینے آمدنی کافی نہ ہوتی تو سخت گھبراہٹ ہوتی۔ میری خواہش تھی کہ آمدنی خواہ تھوڑی ہو لیکن مستقل ہو اور یہ صورت صرف ملازمت میں ہو سکتی تھی۔ اس لئے پہلے تلخ تجربہ کے باوجود میری طبیعت ملازمت کی طرف مائل تھی۔ اُن دنوں پنجاب جوڈیشل سروس میں داخلے کا طریقہ یہ تھا کہ سال دو سال بعد جب کچھ آسامیاں خالی ہونے والی ہوتیں تو ہائی کورٹ ہر ضلع کے ڈسٹرکٹ جج سے اُس ضلع میں پریکٹس کرنے والے جونیئر وکلا میں سے ایک ایک یا دو دو کے نام منگواتی۔ ہائیکورٹ میں جو نام موصول ہوتے ان میں سے ہائیکورٹ کے جج صاحبان کی ایک کمیٹی ضرورت کے مطابق دس بارہ امیدواروں کا انتخاب کر لیتی جنہیں جوڈیشل اور ریونیو ٹریننگ دے کر بطور سب جج تعینات کیا جاتا۔ ۱۹۲۳ء کے وسط میں جب ہائیکورٹ سے اس غرض کے لئے ڈسٹرکٹ ججوں سے نام طلب کئے گئے تو میں نے بھی قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔ ابا جان نے چچا جان کو میرے ارادے سے مطلع کیا تو انہوں نے جواب میں یہ خط لکھا۔

لاہور ۱۳ جولائی ۱۹۲۳ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ بہت بہتر ہے آپ اعجاز کا نام بھجوا دیجئے میں چیف جج صاحب سے اس کا ذکر پہلے کر چکا ہوا ہوں۔ اس کو چند ماہ کا وعدہ ہو گیا۔ مگر بعد میں مَیں خود بعض وجوہ سے خاموش رہا جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ بہرحال اب وہ اکتوبر میں ولایت سے واپس آئیں گے۔ تو پھر اُن سے کہوں گا۔ باقی والدہ مکرمہ کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ مسوڑھے کے پھول جانے سے اب کے بہت تکلیف ہوئی۔ آخر چیرا ہی دلانا پڑا۔ پرسوں سے بالکل آرام ہے۔ رات یہاں بارش ہوئی۔ موسم خنک ہو گیا ہے۔ ابھی مطلع ابر آلود ہے یا امید ہے اور برسے گا۔ شہر میں بخار اور نزلہ کے کوئی کوئی کیس ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فضل و کرم کرے میں غالباً ابتدائے اگست میں قصور جاؤں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

۸۳

اُن دنوں سیالکوٹ کے ڈسٹرکٹ جج شیخ رحیم بخش صاحب تھے۔ شیخ صاحب بڑے شریف النفس انسان تھے۔ طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف تھا۔ صحت بڑی اچھی تھی۔ شہرت بھی اچھی تھی لیکن ذرا ڈرپوک ٹائپ تھے۔ یوں بھی اُس زمانے میں ہائی کورٹ کی باگ ڈور سر شادی لال کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کے دور حکومت میں جوڈیشل سروس کے مسلم افسران ویسے ہی سہمے سہمے رہتے تھے۔ میں نے درخواست تو دے دی لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ میری سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے شیخ صاحب جوڈیشل سروس کے لئے میرا نام ہائیکورٹ کو بھیجنے کی شاید ہمت نہ کر پائیں۔ میں نے چچا جان کو لکھا کہ شیخ صاحب کو کہلوایا جائے۔ ابا جی نے بھی انہیں لکھا تو ان کا یہ جواب موصول ہوا

لاہور ۳۰ جولائی ۱۹۲۳ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط کل مل گیا تھا الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ اعجاز کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ شیخ رحیم بخش صاحب کو خط لکھوایا جائے۔ میری رائے میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اعجاز نے بھی مجھے خط لکھا تھا کہ ان کو لکھوں مگر میں خاموش رہا۔ شیخ رحیم بخش میرے پرانے مہربان ہیں میں اور وہ کالج میں اکٹھے تھے اگرچہ ہم جماعت نہ تھے ان کو خوب معلوم ہے کہ میرے اعجاز کے کیا تعلقات ہیں اور مجھ سے انہوں نے خود ذکر بھی کیا تھا کہ اعجاز کی نسبت ان کے خیالات

بھی اچھے ہیں۔ غرضیکہ موجودہ حالات میں کسی خاص سفارش کی ضرورت نہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اعجاز کا نام ضرور بھیج دیں گے۔ یہاں لاہور میں بھی سخت مقابلہ ہوگا کیونکہ ہر ضلع سے دو دو نام آئیں گے اور سفارشوں کی کوئی حد نہ ہے گی۔ بہر حال کوشش شرط ہے اور انشاء اللہ میں بھی کوشش کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ چیف جج صاحب سے میں اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ اب موقع آنے پر پھر دوبارہ ذکر کروں گا۔ آفیشل اخبار سے بھی رحیم بخش صاحب کو لکھنا یا لکھانا ٹھیک نہیں اس کے متعلق فی الحال تو امد سخت ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

والسلام

محمد اقبال

۸۴

اُن دنوں ہماری پھوپھی کریم بی بی جو ہمارے ساتھ رہتی تھیں کچھ دنوں کے لئے چچا جان کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ اُنہیں میاں جی سے بہت اُنس تھا وہ غالباً وہاں کچھ اداس ہو گئیں اور انہوں نے میاں جی کے نام اپنے خط میں اس کا اظہار کیا۔ میاں جی رقیق القلب تو تھے ہی۔ پھوپھی جی کے خط سے بڑے متاثر ہوئے اور مجھے ارشاد فرمایا کہ میں چچا جان کو پھوپھی جی کو جلد سیالکوٹ واپس بھیجنے کے لئے لکھوں۔ میرا خط ملا تو چچا جان نے میاں جی کو یہ خط لکھا۔

لاہور ۱۰ راگست ۱۹۳۲ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

اعجاز کا خط ابھی ملا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ہمشیرہ کریم بی بی کے خط سے آپ کے دل پر بڑا اثر ہوا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ وہ جلد سیالکوٹ آجائیں۔ مجھے آپ کی بے چینی کا حال پڑھ کر بہت رنج ہوا ہے بلکہ میرا دل بھی اس خط سے ایسا ہی متاثر ہوا جیسا کہ آپ کا۔

میں نے مختار سے کہہ دیا ہے کہ اگر گاڑی میں کافی وقت ہے تو آج ہی ہمشیرہ کو لے جائے ورنہ کل روانہ ہو جائے۔ سو انشاء اللہ اول تو آج ہی جائے گا ورنہ کل روانہ ہو جائے گا۔ میں بھی انشاء اللہ چند روز کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ مقدمات کرال کے تصفیے کے لئے شملہ جانا ہے اور ان کی تاریخ کا انتظار ہے۔ وہاں سے واپس ہونے کے بعد انشاء اللہ ضرور آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ اطمینان فرمائیں اور ہمشیرہ کریم بی بی کے پہنچنے کے بعد اپنی خیریت سے مطلع کریں۔ اس کی جب ضرورت ہو کی اسے پھر بلایا جائے گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

برخوردار اعجاز کو بعد دعا کے واضح ہو کہ میں نے تمہارے دونوں خط پڑھ لئے ہیں۔ والد مکرم کی طبیعت پہلے بھی رقیق تھی اب بہ سبب ضعفِ پیری کے اور بھی رقیق ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ عمر کا آدمی کوئی رفیق اپنا نہیں دیکھتا اس کو دنیا نئی معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے جس سے اس کی طبیعت اور گھبرا جاتی ہے اس واسطے میرا مشورہ تم کو یہ ہے کہ دن میں ایک دفعہ وقت نکال کے ایک آدھ گھنٹہ ضرور ان کے پاس بیٹھا کرو اور جن باتوں میں ان کو دلچسپی ہے ان کے متعلق ان سے گفتگو کیا کرو

خواہ وہ گفتگو بہ تکلف ہی کیوں نہ ہو۔ تم اس بات کو زندگی کے دیگر فرائض کی طرح لازم کر لو اور ایک دن بھی اس فرض کی انجام دہی سے غافل نہ ہو۔ غالب گمان ہے کہ اس سے تم کو بہت فائدہ پہنچے گا کیا عجب ہے کہ جو بات ان سے . . . کو حاصل نہیں ہو سکی وہ تم کو مل جائے۔ اور اگر یہ بات ہو گئی تو زندگی بھر ان کے احسان کو فراموش نہ کر سکو گے اگرچہ اس وقت تم کو اس کا احساس نہ ہو کیونکہ جوانی کے خیالات کا رُخ اور طرف ہوتا ہے۔ مجھے خود جو فائدہ ان کی ذات سے ہوا اس کا احساس اب ہوا ہے اور میں اس کو ہر قسم کے علم اور دنیوی وجاہت پر ترجیح دیتا ہوں۔ تم ان کے مذاق کا مطالعہ کرو اور پھر خواہ بہ تکلف ہی کیوں نہ ہو تھوڑی دیر کے لئے اس مذاق میں رنگین ہو جایا کرو تاکہ وہ تمہیں ہم رنگ تصور کریں۔ اس میں تمہارے لئے بڑے بڑے فائدے مستور ہیں جن کو میں اب بیان نہیں کر سکتا اور اگر بیان کروں بھی تو شاید تم ان کو اچھی طرح سمجھ بھی نہ سکو گے۔ اس فائدے کے علاوہ دنیوی فائدے کا بھی امکان غالب ہے کہ کسی وقت خوش ہو کر ایک کبیر السن آدمی کے منہ سے دعا نکل جائے تو اسے دنیا کے تجربے نے نہایت پُر تاثیر بتایا ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

خط میں مختار سے مراد میرے سب سے چھوٹے بھائی شیخ مختار احمد ہیں جو اُن دنوں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں چچا جان کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ پھوپھی جی کو سیالکوٹ واپس پہنچا گئے۔

اس خط کا آخری حصہ میرے نام ہے اور خاص توجہ کا مستحق ہے۔ میں تو پہلے دو سالوں سے اکثر میاں جی کی صحبت میں بیٹھتا تھا۔ لیکن اس خط کے بعد سے تو چچا جان کے ارشاد کے مطابق میں نے اس فرض کو زندگی کے دیگر فرائض کی طرح لازم کر لیا۔ اور اس سے مجھے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ خط میں میاں جی سے فیض حاصل نہ کر سکنے کے سلسلہ میں ایک عزیز کا نام لکھا تھا۔ وہ میں نے حذف کر دیا ہے کیونکہ ان مکتوبات کی اشاعت سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔

۸۵

شیخ رحیم بخش صاحب کے متعلق میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ جوڈیشل سروس کے لئے ہائی کورٹ کو میرے نام کی بجائے انہوں نے سیالکوٹ کے ایک تحصیل ہیڈ کوارٹر میں پریکٹس کرنے والے وکیل صاحب کا نام بھیجا جو مجھ سے دو سال جونیئر تھے۔ میرا نام نہ بھیجنے کی وجہ یہ لکھی کہ اگرچہ یہ امیدوار باقی ہر لحاظ سے بہترین ہے لیکن سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتا رہتا ہے لہٰذا اس کا نام بھیجنا مناسب نہیں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں سمجھا شاید ڈسٹرکٹ جج صاحب نے ڈپٹی کمشنر سے مشورہ کیا ہو اور یہ اعتراض انہوں نے اٹھایا ہو۔ ڈپٹی کمشنر ایک بیدار مغز انگریز سولین تھے۔ بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری ہونے کی وجہ سے وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ میں ان سے ملا اور دریافت کیا کہ جوڈیشل سروس کے لئے میرے نام پر قدغن کیا حکومت کی یا ان کی پالیسی کے تحت لگائی گئی ہے تاکہ اگر ایسا ہے تو میں اس معاملہ میں مزید تگ و دو نہ کروں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس معاملہ میں ڈسٹرکٹ جج کے لئے ان سے مشورہ کی ضرورت نہ تھا اور نہ ہی ان سے مشورہ کیا گیا۔ مزید کہا

کہ اگرچہ تم سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہتے ہو لیکن تمہاری طرف سے قانون شکنی کی کوئی بھی شکایت نہیں ملی اس لئے اگر ہائی کورٹ جوڈیشل سروس کے لئے تمہاری درخواست پر غور کرے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری درخواست پر انہوں نے مجھے ایک تحریر بھی اس مطلب کی لکھ دی۔ میں نے یہ سارے حالات چچا جان کو لکھے اور کہا کہ ان حالات میں ہائی کورٹ ڈسٹرکٹ جج سے میرا رول منگا سکتی ہے جس کے لئے کوشش کی جانے۔ اس کے جواب میں اُن کا یہ خط موصول ہوا۔ خط پر تاریخ درج نہیں لیکن اگست ۳۴ء کے آخر یا ستمبر کے شروع کا ہے۔

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ مجھے شیخ صاحب سے کوئی توقع نہ تھی اسی واسطے میں نے ان کو خط لکھنے سے احتراز کیا تھا۔

اب یہ بات کہ جہاں ہائی کورٹ خاص طور پر تمہارا رول منگوائیں بہت مشکل نظر آتی ہے کیونکہ اس کے لئے خاص وجوہ کی ضرورت ہے تاہم میں اس بات کی کوشش پورے طور پر کروں گا اور چیف جج صاحب سے تمام ضروری باتیں کہہ دوں گا۔ تم ستمبر کے آخر میں مجھے ڈپٹی کمشنر کے سارٹیفکیٹ کی ایک نقل بھیج دینا جو انہوں نے تم کو دیا ہے علاوہ اس کے یہ بھی لکھنا کہ جن لوگوں کے نام بھیجے گئے ہیں وہ تم سے سینیئر ہیں یا جونیئر اور اگر جونیئر ہیں تو کتنے سال۔ تم نے خط میں لکھا تھا کہ خلافت کمیٹی کا ممبر ہونے کی وجہ سے تم پر اعتراض کیا گیا تھا جس کے متعلق ڈپٹی کمشنر کی تحریر تم نے خط میں نقل کی تھی اگر وہ تحریر انگلش نہ ہو تو اس کی نقل بھی بھیج دینا۔

ان سب باتوں کے علاوہ سیالکوٹ شہر کے وکلاء کو خاص طور پر اس امر کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے کہ سیشن جج صاحب نے اپنی سفارشات میں ان کے حقوق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بار کمیٹی کو چاہیئے کہ وہ ایک ریزولیوشن اس کے خلاف پاس کر کے چیف جج صاحب کے نام بھیج دے۔ یہ تجویز تم خود کرو یا تمہارا کوئی دوست بار ایسوسی ایشن میں یہ تجویز پیش کرے۔ بہتر ہے کہ تمہارا کوئی دوست ایسا کرے۔ اس سلسلے میں میرا ذکر نہ کرنا چاہیئے یعنی کہ یہ تجویز میرے ایما سے کی گئی ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو میرے ہاتھ ذرا مضبوط ہو جائیں گے اور میں زیادہ صفائی کے ساتھ چیف جج صاحب سے کہہ سکوں گا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال لاہور

۸۶

ابا جان نے بھی انہیں اس معاملے کے متعلق لکھا تھا جس کا جواب یہ موصول ہوا۔

لاہور ۲ ستمبر ۳۴ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ اعجاز کا خط بھی پہنچا ہے مجھے منشی رحیم بخش صاحب سے زیادہ توقع نہ تھی اسی واسطے میں ان کو خط نہ لکھنا چاہتا تھا۔ مگر خیر ان کی سفارشات کا بھی جہاں ہائی کورٹ پر کوئی ایسا اثر نہیں ہے۔ حال ہی میں ان کے ایک فیصلہ کی اپیل میں جہاں نے ان پر نہایت خراب ریمارک کئے ہیں یہی وجہ ان کے خوف کی ہے۔ یہ معاملہ سفارشات کا مجلس کی کمیٹی میں پیش ہوگا۔ چیف جج آئیں گے تو میں خود ان سے سب حال کہہ دوں گا اور مگر اعجاز کے آنے کی ضرورت ہوئی تو اس کو بھی بلا لوں گا۔ فی الحال تعطیلوں میں کچھ کام نہ ہوگا اور جو جج چھٹیوں میں کام کر رہے ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اعجاز کو بھی یہ خط دکھا دیجئے بہرحال جو کچھ ہو سکے گا کیا جائیگا اعجاز کو گھبرانا نہ چاہیئے اور موقع نکل آئیں گے۔

والسلام
محمد اقبال

۸۷

اُن دنوں سردار چچی جان اور مختار چچی جان دونوں امید سے تھیں۔ مختار چچی تو اپنے میکے لدھیانے گئی ہوئی تھیں۔ سردار چچی کو انہوں نے "بھابی جی" کے پاس سیالکوٹ بھیج دیا ہوا تھا۔ ۵ اکتوبر ۳۴ء کو خدا کے فضل و کرم سے جاوید سلمہٗ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ابا جان کے نام اس خط میں مجھے چیف جسٹس سے ملنے کے لئے لاہور آنے کے لئے لکھا ۱۸ اکتوبر کا یہ خط دوسرے دن سیالکوٹ پہنچ گیا۔ لیکن اس کے سپرد ڈاک کرنے کے بعد ۱۸ اکتوبر کو ہی انہیں لدھیانہ سے مختار چچی جان کی تشویشناک حالت کا تار ملا۔ انہوں نے اسی دن یہ خبر ابا جان کو بذریعہ تار بھیجی اور مجھے فوراً لاہور طلب فرمایا تاکہ ان کے ساتھ لدھیانہ چلوں۔ میں دوسرے دن صبح کی گاڑی سے لاہور پہنچ گیا اور اُسی دن ہم لدھیانے چلے گئے۔

مختار چچی جان کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ سخت کمزور ہو گئی تھیں اور وضع حمل کی تکلیف برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۲۱ اکتوبر کو دردِ زہ بند ہو گیا۔ ڈاکٹروں سے کہا گیا کہ جہاں تک ہو سکے زچہ کی جان بچانے کی کوشش کریں اور بچے کا خیال نہ کریں۔ لیکن ڈاکٹروں کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور چچی جان رحلت فرما گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

لاہور ۱۸ اکتوبر ۳۴ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا خط اور پوسٹ کارڈ دونوں مل گئے ہیں۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ لدھیانے سے بھی خط آیا تھا۔ وہاں بھی خیریت ہے۔ انشاء اللہ کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائیگا۔ یا کوئی اور ایسی ہی تجویز کروں گا۔ آئندہ جو اللہ کو منظور ہے۔ آپ اطمینان کریں۔

اعجاز کی بچی سے کہہ دیں کہ سردار امراؤ سنگھ صاحب کی بیوی نے شملہ سے ان کو مبارکباد بھیجی ہے۔ میں آج شام جھنگ جانے والا تھا مگر ذار جنگ صاحب جنہوں نے اعجاز کو منفرد کیا تھا ولایت جانے والے ہیں ان کی بیوی کا خط آج صبح آیا کہ اتوار کی شام کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں اس واسطے تلرشے کے تاریخ مقدمہ بدلوائی ہے اب ۲۹ اکتوبر کی شام کو جاؤں گا۔ اعجاز سے کہہ دیجئے کہ وہ اس تاریخ سے پہلے کسی روز آجائے بہتر ہو کہ اتوار کی صبح کو وہ یہاں ہو تاکہ وہ چیف جج صاحب سے مل سکے میں اس کو خط لکھتا کہ وہ میری موجودگی میں ان سے مل سکے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔ بچوں کو دعا۔

امید ہے جاوید کی ماں اب اچھی ہوگی۔

محمد اقبال

۸۸

تمہاری چچی جان کی دردناک وفات نے چچا جان کے دل پر بڑا اثر کیا۔ اپنے کرب کا ذکر ابا جان کے نام اس خط میں کیا جو لدھیانہ سے وفات کے دوسرے دن لکھا گیا۔ خط میں جن دو لڑکیوں زہرہ اور عائشہ کا ذکر ہے وہ مرحومہ چچی جان کی خالہ زاد بہنیں تھیں۔ چچا جان کی ہدایت کے موجب سردار چچی جان نے انہیں ہمدردی کا خط لکھا اور وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ انہیں اپنی بہنیں سمجھیں گی اور پھر اس عہد کو زندگی بھر نبھایا۔

لدھیانہ ۲۲ اکتوبر ۲۳ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ ابھی موصول ہوا ہے۔ کل میں آپ کی خدمت میں تار دے چکا ہوں۔ تقدیر الہٰی کا مقابلہ تدبیر انسانی سے نہیں ہو سکتا۔ مرحومہ کی موت کا منظر نہایت درد انگیز تھا۔ خدا تعالیٰ اس کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ بہترین ڈاکٹروں کا علاج تھا جو دن میں تین دفعہ اور اگر ضرورت ہو تو اس سے زیادہ دفعہ آتے تھے اور بعض دفعہ رات بھر یہیں رہتے تھے مگر اللہ کے علم میں مرحومہ کی زندگی کے دن ختم ہو چکے تھے۔ اس موقعہ پر آپ کا اور بھاوج صاحبہ یا گھر کا کوئی اور آدمی آ جاتے تو بہت بہتر ہے۔ میں ۲۵ اکتوبر تک یہیں ہوں گا اور قلوں کے بعد جاؤں گا۔ سردار بیگم سے کہہ دیجئے کہ وہ زہرہ اور عائشہ کے نام بہت ہمدردی کا خط لکھے کیونکہ ان دونوں لڑکیوں کا رونا کوئی شخص کیسا ہی سنگدل ہو نہیں سن سکتا۔ ان کی ہر طرح تسلی کرنی چاہیئے اور لکھنا چاہیئے کہ میں تا عمر تمہاری بہن ہوں اور ہمیشہ تم کو ایسا ہی سمجھوں گی وغیرہ وغیرہ۔ یوں بھی سردار بیگم کو ان دونوں لڑکیوں سے محبت ہے اور اس موقع پر وہ بہت ہمدردی کی مستحق ہیں۔ آپ خود اس کو مضمون لکھ دیں وہ نقل کر کے اور اپنی طرف سے جو اضافہ ضروری ہو کر کے ان کو خط لکھے۔ جب وہ اچھی ہو جانے تو لدھیانے بھی اظہار ہمدردی کے لئے آئے۔ مرحومہ نے نہایت طمانیت اور سکون سے جان دی۔ موت سے دس پندرہ منٹ پہلے میں نے اس کو دیکھا اور حال پوچھا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ اچھی ہوں۔ حالانکہ اس وقت اس کا وقت بالکل قریب تھا اور اس کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ نمونیا نے اسے سخت کمزور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ڈلیوری کی زحمت وہ برداشت کرنے کے ناقابل تھی۔ آخر میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو اس کی جان بچانے کی کوشش کریں اور بچہ کا خیال نہ کریں۔ چنانچہ یہی تجویز قرار پائی بچے کو رحم سے نکالنے کے لئے آلات کا استعمال ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ اس نے جان دے دی۔ مرنے سے تقریباً دو گھنٹے پہلے نلم وروزہ بند ہو گیا تھا اور یہی علامت بڑی خراب تھی۔ غرض کہ درد کی حالت میں اس کی حالت بیچارگی اور بیکسی کی تھی کہ میرے لئے اس کے چہرے کی طرف نگاہ کرنا بھی مشکل تھا اور میرا قلب سخت رقیق ہو گیا۔ ایک معمولی انسان کو دنیا میں لانے کے لئے جو پچاس ساٹھ سال سے زیادہ اس دارِ فانی میں نہیں ٹھہرتا پھر اس قدر تکلیف ایک ضعیف عورت کو دیتی ہے!

زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کے فضل کی دعا کیجئے۔ والدہ مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال

۸۹

رسم قل ادا ہو جانے کے بعد ہم لاہور واپس آ گئے۔ لاہور سے یہ خط ابا جان کو لکھا۔

لاہور ۲۷ اکتوبر ۲۳ء

برادر مکرم السلام علیکم

میں بخیریت لدھیانے (سے) پرسوں مع اعجاز کے آ گیا تھا۔ ماتم پرسی کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ طبیعت نہایت پریشان ہے۔ پرسوں شام جھنگ مقدمہ کے لئے جاؤں گا اس طرح طبیعت کے اور طرف لگ جانے سے ایسے خیالات میں اطمینان و سکون پیدا ہو گا۔ مرحومہ کے بھائیوں نے اس کا تمام زیور اور سامان واپس کر دیئے ہیں ہرچند میں نے کہا کہ شریعت کی رو سے اس کے بیشتر حصے کے وارث اس کے بھائی بہن ہیں مگر انہوں نے ایک نہیں مانی معلوم ہوتا ہے وہ مرنے سے پہلے ان سے یہی کہہ گئی تھی۔ اب ارادہ ہے کہ یہ ترکہ اس کی کسی یادگار کی صورت میں صرف کیا جائے کچھ روپیہ میں اور اپنی طرف سے اس میں اضافہ کر دوں گا۔ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو بہت اچھی صورت ہو جائے گی۔ والدہ مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔

امید ہے جاوید اور اس کی والدہ دونوں اچھے ہوں گے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اعجاز کا رول بلا لیا جائے گا۔ باقی مرحلہ جو زیادہ محنت طلب ہے بعد میں آئے گا اس کے لئے بھی انشاء اللہ کوشش کروں گا۔

والسلام

محمد اقبال

قیام لاہور کے دوران میں جج مرزا ظفر علی صاحب اور جج سید عبدالرؤف صاحب سے ملا اور اپنا کیس بیان کیا۔ دونوں نے اُس وقت صرف اتنا ہی کہا کہ آخری انتخاب ججوں کی کمیٹی کرے گی۔ لیکن تمہارا کیس کمیٹی کے سامنے پیش ہونا چاہیئے۔ اس لئے تمہارا رول ڈسٹرکٹ جج سے منگوا لیا جائے گا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن ڈسٹرکٹ جج صاحب کو بیرارول بھیجنے کی ہدایت کر دی گئی۔

جیسا کہ چچا جان نے اس خط میں لکھا ہے اُن کی طبیعت اس سانحہ سے بڑی پریشان تھی اور کئی دن تک یہی کیفیت رہی۔ فرماتے تھے کہ درد کی شدت کی وجہ سے مرحومہ کے چہرے پر جو بے چارگی اور بے کسی کی کیفیت تھی وہ نہیں بھولتی۔

یہاں یہ ذکر بھی کر دوں کہ مرحومہ کی وفات کے دوسرے یا تیسرے دن لدھیانہ ہی میں انہوں نے مرحومہ چچی جان کا قطعہ تاریخ وفات کہا جو یہ ہے

اے دریغا ز مرگِ تم سفرے
دلِ من در فراقِ اُو همه درد
بالف از غیب داد تسکینم
سخنِ پاکِ مصطفےٰ آورد
بهرِ سالِ رحیلِ او فرمود
بشہادت رسید و منزل کرد ۱۳۴۲ھ

مرحومہ کی لوح مزار چچا جان نے لاہور سے تیار کرا کر بھیجی۔ اُس پر یہ قطعہ

تاریخ وفات کندہ ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے یہ قطعہ "سرود رفتہ" میں شائع کیا ہے مگر اس میں دو ایک غلطیاں ہیں جو کتابت کی معلوم ہوتی ہیں اولاً تاریخ وفات جو ۲ اکتوبر ۱۹۲۲ء لکھی گئی ہے درست نہیں۔ صحیح تاریخ وفات ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء ہے۔ دوسرے ہجری سن وفات ۱۳۴۲ لکھا گیا ہے جو درست نہیں۔ ہجری سن وفات ۱۳۴۳ ہے۔ ان دو فروگزاشتوں کے علاوہ قطعۂ وفات کا آخری مصرعہ "بشہادت رسید و منزل کرد" درج ہوا ہے جس سے سن وفات ۱۳۴۰ نکلتا ہے۔ صحیح مصرعہ یوں ہے: "بشہادت رسید و منزل کرد" جس سے سن وفات ۱۳۴۳ نکلتا ہے۔ "بشہادت" کی جگہ "بشہادت" چھپنے سے "ہ" کے پانچ عدد کا اضافہ ہو جاتا ہے جس سے سن وفات کی صحت میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

۹۰

ہائی کورٹ کی ہدایت پر ڈسٹرکٹ جج صاحب نے میرا رول بھیج تو دیا لیکن ساتھ ایک خط میں پہلے رول نہ بھیجنے کی وجہ بھی لکھ دی یعنی یہ کہ یہ امیدوار سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتا رہا ہے۔ چچا جان چیف جسٹس سے ملے اور میرے کیس کے حالات ان کے گوش گزار کئے۔ اس کی اطلاع انہوں نے ابا جان کو اس خط میں دی۔

لاہور ۵ نومبر ۱۹۲۴ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ اگر جاوید اور اس کی والدہ تندرست ہیں تو بہتر ہے۔ اور نومبر تک آجائیں۔ لیکن اگر کوئی احتمال ابھی باقی ہے تو وہیں قیام کریں۔ ڈاکٹر میر حیدر صاحب کا نسخہ ہمراہ لیتے آئیں اس کا استعمال جاری رہے گا لیکن میں نومبر کے مہینے میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ کام کے علاوہ بہت سی اور مصروفیتیں ہیں نئے گورنر صاحب کے بہت سے ڈنر ہیں وہاں جانا ہے اس کے علاوہ علی گڑھ کے ایک پروفیسر مجھ سے ملنے کے لئے آرہے ہیں وہ میرے متعلق کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ مجھ سے سوالات کرنا چاہتے ہیں جن کے جوابات مخطوطہ ہیں گے۔ اعجاز کے ہمراہ آجائیں میں انشاء اللہ دسمبر میں والد مکرم کی زیارت کے لئے حاضر ہوں گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اعجاز کا رول امید ہے آج پہنچ گیا ہوگا مرزا ظفر علی اور سید عبدالرؤف چچا جان سے زور مل گیا ہے۔ باقی چیف جج صاحب سے میں نے اس کے تمام حالات بیان کر دیئے تھے اور اس ه د کا بھی ذکر کر دیا تھا جو سیشن جج صاحب نے رول کے ہمراہ بھیجی ہے اگر وہ یہ ه.د نہ بھیجتے تو بہتر ہوتا بہر حال امید نہیں کہ بااثر ہو۔ مشکل جو اس معاملے میں ہے وہ یہ ہے کہ پنجاب کونسل نے رزولیوشن پاس کیا ہے کہ پچاس فیصدی ملازمتیں زمینداروں کو دی جائیں۔ چیف جج صاحب سے پھر بھی ملوں گا اس کے لئے جہاں تک ہوگا کوشش کی جائے گی۔ آئندہ اس کا مقدر۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

والسلام

محمد اقبال لاہور

سردار بیگم جان ابھی سیالکوٹ میں ہی تھیں۔ ان کی طبیعت کچھ علیل تھی۔ ڈاکٹر میر حیدر صاحب علاج کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب شہر کے ایک باا‌ثر سید خاندان کے فرد تھے۔ مولانا میر حسن صاحب سے بھی اُن کی قرابت داری تھی۔ ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے اور اپنا مطب کرتے تھے۔ تھے تو اسسٹنٹ سرجن لیکن ہاتھ میں شفا تھی اس لئے ان کا مطب مرجع خاص و عام تھا۔ ہمارے خاندانی معالج تھے۔ اُن کے ایک صاحبزادے سید بشیر حیدر جو محکمۂ ایکسائز میں ملازم تھے۔ چچا جان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مختار بیگم جان سے شادی طے پانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا کیونکہ اُن دنوں وہ لدھیانے میں تعینات تھے۔

یہ معلوم نہیں کہ علی گڑھ کے جس پروفیسر کا ذکر ہے وہ کون صاحب تھے اور انہوں نے وہ کتاب لکھی یا نہیں جو وہ لکھنا چاہتے تھے۔ سردار بیگم کو صحت ہوئی تو میں انہیں اور جاوید کو لاہور پہنچا آیا۔

یہاں یہ ذکر کر دوں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے چچا جان کی کوشش کامیاب ہوئی اور ہائی کورٹ کے ججوں کی کمیٹی نے مجھے جوڈیشل سروس کے لئے منتخب کر لیا۔ الحمد للہ۔

۹۱

شیخ گلاب دین صاحب کا ذکر خط نمبر ۳ کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ کسی امر کے متعلق اُن کا تنازعہ سیالکوٹ کے بعض افراد کے ساتھ تھا۔ اس کے تصفیے کے لئے وہ سیالکوٹ آرہے تھے۔ چچا جان نے یہ خط ابا جان کو لکھا کہ تنازعہ کا جلد فیصلہ کرانے میں کوشش کریں۔ میرے لئے ارشاد تھا کہ ضرورت پڑے تو میں بھی اس معاملے میں شیخ صاحب کی مدد کروں۔ چنانچہ تعمیل ارشاد کی گئی۔

لاہور ۷ فروری ۱۹۲۵ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم

میں اب خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں۔ مختار کے متعلق آپ کا خط مل گیا تھا۔ میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اسے غلط آگاہی ملی تھی۔ آئندہ سال اس کے لئے انشاء اللہ کوشش کی جائے گی۔

شیخ گلاب دین صاحب سیالکوٹ آتے ہیں۔ ان کا معاملہ آپ کو معلوم ہے اس میں جہاں تک ہو سکے جلد ان کا فیصلہ کرانے میں کوشش کیجئے حالات آپ کو معلوم ہی ہیں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فرصت ہو تو اعجاز سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ اس معاملے میں شیخ صاحب کی مدد کرے۔

والسلام

محمد اقبال

۹۲

میاں جی نے اپنے بزرگوں سے سنا ہوا تھا کہ ہمارے آباء میں سے جو بزرگ سب سے پہلے اسلام کی نعمت سے سرفراز ہوئے وہ "لول حج" کے عرف سے مشہور تھے۔ اُن کی بعض کرامتوں کی داستانیں خاندان کی بڑی بوڑھیاں بیان کیا کرتی تھیں لیکن یہ سب

سُنی سنائی باتیں تھیں۔ تفصیلی حالات معلوم نہ تھے۔ چچا جان کو اپنے بزرگوں کا سراغ لگانے کی جستجو رہتی تھی۔ یہ سراغ انہیں کس طرح ملا۔ اس کا حال انہیں کی زبانی سنیئے جو آبا جان کے نام اس خط میں درج ہے۔ اس خط کا ذکر کتاب کے شروع میں خاندانی حالات کے تحت کر دیا گیا ہے۔ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

لاہور ۵ راکتوبر ۱۹۲۵ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے جس سے بہت اطمینان ہوا۔ الحمد للہ علی ذالک جاوید اب بالکل تندرست ہے۔ آج پورے ایک سال کا ہو گیا ہے۔ اس کی والدہ آج قربانی دینے میں مصروف ہے۔ آپ اور والد مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔ حضرت بابا لول حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ ان کا ذکر خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر میں اتفاقاً مل گیا ہے۔ والد مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا، بحیثیت مجموعی درست ہے۔ ان کا اصل گاؤں لوچر نہ تھا بلکہ موضع چکو پرگنہ آدون تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اس واسطے ترک دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔ واپس آنے پر اشارہ غیبی پاکر حضرت بابا نصر الدین کے مرید ہوئے جو حضرت نور الدین ولی کے مرید تھے۔ بقیہ عمر انہوں نے بابا نصر الدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں۔ اب امید ہے کہ مزید حالات بھی معلوم ہو جائیں گے۔ خواجہ اعظم کا تذکرہ مختصر ہے مگر یہ مختصر نشان غالباً مزید انکشافات کا باعث ہو گا۔ ان حالات کے معلوم ہونے کا سبب بھی عجیب و غریب ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار الہ آباد یونیورسٹی کی ڈاکٹری کی ڈگری کے حاصل کرنے کے لئے ایک کتاب کشمیری تہذیب و تمدن پر لکھ رہے ہیں۔ میں ان کے ممتحنین میں سے ہوں۔ باقی دو ممتحنین انگلستان اور آئرلینڈ کے پروفیسر ہیں۔ اتفاق سے رجسٹرار صاحب کل آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کسی اپنے دوست کو ہدایت کی تھی کہ خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر کا قلمی نسخہ میرے مکان پر پہنچا دے۔ وہ شخص قلمی نسخہ تاریخ مذکور کا لایا میں اس وقت فارغ بیٹھا تھا۔ یہی کتاب دیکھنی شروع کر دی۔ دو چار ورق ہی الٹے تھے کہ بابا صاحب کا تذکرہ مل گیا۔ جس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ غالباً بابا نصر الدین کی اولاد کشمیر میں ہو گی۔ ان سے مزید حالات معلوم ہونے کی توقع ہے اور کیا عجب کہ ان کے پاس اپنے مریدوں کا سلسلہ موجود ہو۔ والسلام

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں۔

محمد اقبال

یہ خط جاوید کی پہلی سالگرہ کے دن لکھا گیا تھا۔ خط میں ذکر ہے کہ "اس کی والدہ آج قربانی دینے میں مصروف ہے۔" سردار چچی جان جاوید کی سالگرہ صدقہ کے طور پر بکرا ذبح کر کے اس کا گوشت غرباء میں تقسیم کر کے منایا کرتی تھیں۔ ابھی سالگرہ کا کیک کاٹنے، موم بتیاں بجھانے اور رنگین برتھ ڈے ٹوپیاں پہننے کا رواج عام نہ تھا اور ہوتا بھی تو چچا جان ہرگز اس کی اجازت نہ دیتے۔

تو آبا جان سیالکوٹ سے آکر ان کی عدم موجودگی میں ان کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ اسی اثنا میں گاندھی ارون سمجھوتے کے نتیجے میں کانگریس نے گول میز کانفرنس میں شامل ہونا منظور کر لیا تھا اور گاندھی جی کو اپنا واحد نمائندہ نامزد کیا تھا۔ مہاتما گاندھی کانفرنس کے سلسلہ میں لندن گئے تو ہندو اخبارات نے لندن میں ان کی "آؤ بھگت" کے قصے بڑھا چڑھا کر شائع کئے۔ لندن سے چچا جان کا آبا جان کے نام یہ خط دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کیونکہ اس سے گول میز کانفرنس کے بعض حالات اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مصالحت کی کوششوں پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ خط میں جہاں اپنے دونوں بچوں کو دُعا اور چودھری محمد حسین اور منشی طاہر دین کو سلام لکھا ہے وہاں اپنے دونوں ملازمین علی بخش اور رحمان کو بھی فراموش نہیں کیا اور ان کو بھی سلام بھجوایا ہے۔ لاہور میں آبا جان علیل ہو گئے تو وہ واپس سیالکوٹ چلے گئے تھے اور اپنی جگہ میرے چھوٹے بھائی محمد احمد کو چچی جان کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ یہ خط جو لاہور کے پتہ پر آیا تھا ابا جی کو سیالکوٹ کے پتہ پر بھجوا دیا گیا تھا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء

برادر مکرم۔ السلام علیکم

خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ امید ہے گھر میں بھی سب طرح خیریت ہو گی۔ ہندوستان سے اخبار آتے ہیں۔ عجیب خبریں اخبارات میں چھپتی ہیں۔ مثلاً پرتاب میں لکھا ہے کہ مہاتما گاندھی کو شاہی محل میں کمرہ مل گیا ہے۔ اور جب وہ بازار سے گزرتے ہیں تو ہزاروں لوگوں کا ہجوم ان کے گرد ہوتا ہے۔ حالانکہ حال یہ ہے کہ ان کے آنے کا یہاں اثر ہوا ہے۔ میں نے اسی واسطے لکھا تھا کہ غیر مسلم ذرائع سے جو اخبار آئیں ان پر اعتبار نہ کیا جائے۔ مسلمان ڈیپوٹیشن متحد ہے اور گفتگو مصالحت کے خاتمہ کا الزام ہندوؤں کے یا سکھوں کے سر پر ہے۔ اخبار ٹائمز میں مفصل حالات چھپ گئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندو مسلمانوں کو بدنام کرنے کی ہر کوشش کر رہے ہیں مگر برٹش پبلک کو اب ان کے پروپگنڈے کی اصل حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ عام طور پر ہمدردی ہے نومبر میں مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات یعنی عالم اسلام کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کے متعلق انگریزوں کی طرف سے ایک بہت بڑی میٹنگ ہو گی جس کے پروپگنڈے پر ایک ہزار پونڈ خرچ کیا جائے گا۔ فی الحال عام انتخابات پارلیمنٹ کی وجہ سے آفیشل میٹنگ کانفرنس کی نہیں ہو رہی۔ ۳ نومبر کو نئی پارلیمنٹ کا اجلاس ہو گا۔ اس کے بعد ہماری کانفرنس کی کارروائی کا آغاز ہو گا۔ اس سے پہلے جنرل کمیٹی کا اجلاس دو دفعہ ہوا اور دونوں دفعہ چند منٹ کے بعد اجلاس ملتوی ہو گیا۔

یہاں بھی فرصت کم ہے تمام دن لوگ آتے جاتے ہیں گویا لنڈن بھی لاہور ہی ہے جاوید اور منیرہ کو دعا۔ والسلام

محمد اقبال لنڈن

چودھری محمد حسین صاحب کو سلام، طاہر دین اور علی بخش اور رحمان کو بھی سلام

۱۹۳۱ء میں چچا جان دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے

جاوید نے اپنے ابا جان کو جو خط لندن کے پتہ پر لکھا تو میرے چھوٹے بھائی

مختار احمد کے نام اس خط میں بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ اس خط سے بھی گول میز کانفرنس کے متعلق بعض امور پر روشنی پڑتی ہے۔ منشی طاہر دین نے بنکوں کے متعلق فکر کا اظہار کیا۔ اس کے متعلق خط کے آخر میں منشی صاحب کے نام جو جواب بھیجا ہے وہ نوٹ کرنے کے قابل ہے۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء

عزیزمن مختار ۔ السلام علیکم

تمہارا خط ہوائی ڈاک کے ذریعہ سے مل گیا ہے۔ الحمد اللہ کہ گھر میں سب طرح سے خیریت ہے۔ طاہر دین کا خط بھی آیا تھا اس سے بھی خیر خیریت معلوم ہوئی۔ طاہر دین نے لکھا تھا کہ کتاب کے ٹائیٹل پیج کے لئے کون سا کاغذ خریدا جائے اس نے چند نمونے بھی بھیجے تھے تم اس سے کہہ دینا کہ چودہری محمد حسین اور سالک صاحب جو کاغذ پسند کریں وہ لگا دینا چاہیئے۔ جاوید کا خط دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اس سے کہنا کہ وہ خوب محنت کرے یہاں کے کیسے پرانے دوست مرد اور خواتین سب کہتی ہیں کہ جاوید کو کیوں ساتھ نہ لائے۔ ایک میری استانی نے جرمنی سے خط لکھا ہے اور اسے بھی جاوید کو دیکھنے کی خواہش کی ہے۔ اس نے بچوں کے متعلق پوچھ بھیجا تھا۔ منیرہ کو بہت بہت پیار کرنا امید ہے کہ میری واپسی تک وہ چلنا پھرنا سیکھ لے گی۔

چودہری محمد حسین صاحب کا صرف ایک ہی خط آج تک ملا ہے۔ ان سے کہہ دینا کہ فیڈرل کمیٹی کے تین اجلاس ہوئے اور تینوں دفعہ کمیٹی پرائیویٹ گفتگو کے لئے ملتوی ہو گئی۔ اس واسطے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ہوا۔ یہی بات حجانی صاحب کو سیالکوٹ بھی لکھ دینا۔ کیونکہ انہوں نے لکھا تھا کہ تمہاری تقریر کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔ ہندوؤں نے یہاں بھی میرے ایڈریس کے متعلق بعض انگریزوں سے پروپگنڈا کرایا میں نے اس کا دندان شکن جواب اخبار ٹائمز میں شائع کرایا تھا۔ ۴ نومبر کو انڈیا سوسائٹی میں میرا لیکچر ہے جس کا مضمون فلسفہ اور شعر ہے۔ ۹ نومبر کو سی ام کلب کی عورتوں نے دعوت دی ہے۔ وہاں میں ایک ظریفانہ تقریر کروں گا۔ ۱۰ نومبر کو یہاں کے مسلمان طلباء مجھے ایڈریس دینے والے ہیں۔ کانفرنس کا اجلاس شاید وسط نومبر میں ختم ہو جائے۔ ایسا ہوا تو میں پیرس، برلن، روم ہوتا پورٹ سعید پہنچوں گا۔ وہاں سے ایک ہفتہ کے لئے مصر اور فلسطین جاؤں گا۔ غالباً وسط دسمبر تک لاہور پہنچ جاؤں گا۔ باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ یہاں آکر میری صحت اچھی ہو گئی۔ البتہ گزشتہ رات سردی کی وجہ سے دانت کا درد ہوا۔ مگر تکلیف جلد رفع ہو گئی۔ باقی چودہری محمد حسین صاحب سے کہئے کہ کام خوب ہو رہا ہے۔ افسوس کہ ہندو ویسا ہی سکھ بہت روڑا اٹکاتے ہیں۔ برادر مکرم کا خط بھی تمہارے خط کے ساتھ ہی ملا تھا۔ ان کی طبیعت کی ناسازی کی خبر سن کر مجھے ایک گونہ فکر پیدا ہوا۔ یہ خط خود پڑھ کر اور سب کو سنا کر ان کو سیالکوٹ بھیج دینا چاہیئے زندگی اور موت رنج و راحت سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ انشاء اللہ ان سے ملاقات ہوگی اور میں ان کو تندرست پاؤں گا۔ طاہر دین نے بنکوں کے متعلق فکر کا اظہار کیا تھا اس سے کہہ دینا چاہیئے کہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ میرے تمام معاملات جان و مال اور روپیہ اللہ کے سپرد ہے۔ جب سے میں نے ایسا کیا ہے مجھے کوئی تردد نہیں ہوتا۔ سب کچھ اسی کا ہے اس کی مرضی میری مرضی ہے۔

والسلام

محمد اقبال لندن

۹۵

۱۹۳۲ء میں میں چونیاں میں جو ضلع لاہور کا ایک تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے سب جج کے طور پر تعینات تھا۔ ان دنوں وہاں کے سول ہسپتال کے انچارج ایک شریف النفس اور نیک سکھ اسسٹنٹ سرجن تھے جو حضرت بابا گرونانک کی اولاد میں سے تھے شہر لاہور کے ایک گوردوارے کے گرنتھی صاحب کہ وہ بھی حضرت بابا جی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بیدی صاحب کہلاتے تھے کاہے گاہے چونیاں آکر ڈاکٹر صاحب کے ہاں قیام کرتے تھے۔ وہ بڑے خوش بیان تھے۔ جب چونیاں آتے تو ہر روز شام کو وہاں گوردوارے میں وعظ فرماتے جسے سننے کے لئے کثرت سے لوگ گوردوارے جاتے ڈاکٹر صاحب سننے کے لئے کثرت سے لوگ گوردوارے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں بھی کئی دفعہ ان کا دیا کھیان سننے کے لئے گوردوارے گیا اور ڈاکٹر صاحب کے مکان پر اکثر ان سے ملاقات ہوتی تھی۔

ایک دن بیدی صاحب میرے ہاں تشریف لائے اور تخلیہ میں گفتگو کرنی چاہی میں سمجھا شاید کسی مقدمہ میں سفارش کریں گے۔ جب تخلیہ ہوا تو فرمایا میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے چچا سے میری ملاقات کا انتظام کر دیں۔ ان کی اس غیر متوقع درخواست سے مجھے کچھ تعجب ہوا کیونکہ میرے مشاہدے میں وہ سکھوں اور ہندوؤں میں بڑے مقبول تھے ستمبر کی تعطیلات میں دیوانی عدالتیں ایک مہینے کے لئے بند ہونے والی تھیں اور میں سیالکوٹ جانے والا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ستمبر میں مجھے لاہور جانے کا بھی اتفاق ہوگا تو ان کی ملاقات کا انتظام ہو جائے گا۔

میں سیالکوٹ گیا تو وہاں بیدی صاحب کا جموں توی سے لکھا ہوا خط ملا وہ علامہ اقبال سے کب مل سکیں گے۔ اس خط میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ مسلمان ہونے کے بعد ان کا موجودہ ذریعہ معاش تو ختم ہو جائے گا اس لئے اس کا بھی کچھ انتظام چاہیئے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ ستمبر کے آخر میں چونیاں جانے سے پہلے میں دو ایک دن لاہور ٹھہروں گا۔ آپ فلاں تاریخ کو آجائیں تو ملاقات ہو جائے گی۔ یہ بھی لکھ دیا کہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی کوئی ایسی منظم جماعت نہیں جو نو مسلموں کے ذریعہ معاش کا انتظام کر سکے میں نے بیدی صاحب کا خط اور اپنے جواب کی نقل چچا جان کو بھیج کر بیدی صاحب کے لئے ملاقات کی استدعا کی۔ اس کے جواب میں اُن کا یہ خط مجھے سیالکوٹ کے پتہ پر ملا

لاہور ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء

عزیزم اعجاز سلمہ

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ لڑکی کا نام قدسیہ رکھنا چاہیئے۔ مختار کے ہاں لڑکا ہوا اس کا نام میں نے زوار احمد تجویز کیا ہے۔

باقی رہا بیدی صاحب کا معاملہ سو تم نے ان کو ٹھیک لکھا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں کوئی منظم جماعت ایسی نہیں کہ نو مسلموں کے لئے کوئی انتظام معاش کر سکے۔ البتہ عرصہ ہوا مجھے پنجاب کے ایک مقام سے خبر آئی کہ کئی ہزار مذہبی سکھ مسلمان ہونے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ ان کے لئے زمین کا انتظام کر دیا جائے۔ علی ہذا القیاس تین چار سکھ اور ہندو میرے پاس آئے کہ اگر ان کے لئے ملازمت کا انتظام ہو جائے تو وہ مسلمان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ غرض یہ کہ بالعموم اس قسم کے حالات میں دنیوی محرکات عمل کرتے

اگر بیدی صاحب کی توقعات کا حال معلوم ہو تو میں یہاں کی کسی انجمن سے گفتگو کرسکوں ۔ ان کے خط میں مطالبات کا کہیں ذکر نہیں ۔ عام طور پر اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ تبدیلیٔ مذہب سے کسی کا مقصود محض منفعت مادی ہے تو وہ اسے نہایت مکروہ جانتے ہیں ۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ان کے سیاسی زوال کے اوقات میں ہوا ہے ۔ حکومت کے عروج کے زمانے میں اسلام نہیں پھیلا مگر اس بات کا کیا علاج کیا جائے کہ اس ملک میں مسلمان نہایت افلاس زدہ ہیں خود موجودہ مسلمان قوموں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے ۔ تاہم جوشِ تبلیغ کسی حد تک مسلمانوں میں موجود ہے ۔ یہی حال میں نے یورپ میں دیکھا ہے ۔ اسلام کے متعلق ان کی راز جوئی روز بروز ترقی کر رہی ہے مگر مسلمانوں میں استطاعت اس قدر نہیں ہے کہ وہ یورپ میں کلچرل اور مذہبی مشن بھیج سکیں ۔ جو مشن وہاں موجود ہیں ان میں کوئی آدمی اس قابل نہیں کہ وہ یورپ کی موجودہ مشکلات کو سمجھ سکے اور ان مشکلات کی روشنی میں اسلام کی مذہبی اور کلچرل حیثیت ان کے سامنے پیش کر سکے

والسلام

محمد اقبال

ستمبر کے آخری دنوں میں چونیاں جاتے ہوئے لاہور ٹھہرا ۔ تاریخ مقررہ پر بیدی صاحب تشریف لائے ۔ چچا جان سے کچھ سرسری گفتگو رہی ۔ جس میں چچا جان نے انہیں سمجھایا کہ اگر آپ اسلام اس لئے قبول کر رہے ہیں کہ آپ کو اس کی حقانیت پر یقین ہو گیا ہے اور کوئی دنیاوی غرض شامل نہیں تو اللہ تعالےٰ آپ کے لئے خود غیب سے سامان پیدا کرے گا ۔ اس گفتگو میں انہوں نے فرمایا کہ اُن کے والد کو گوجرانوالہ ضلع کے ایک بزرگ سے عقیدت تھی اور وہ انہیں ملنے جایا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ گئے تو وہ بزرگ اپنے مکان کے باہر چارپائی پر بیٹھے تھے ۔ اتنے میں ایک جنگلی خرگوش جس کے پیچھے کتے لگے ہوئے تھے بھاگتا ہوا آیا اور بزرگ کی چارپائی کے نیچے آ کر بیٹھ گیا ۔ کتے جو تعاقب کر رہے تھے وہاں آدمیوں کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئے ۔ کچھ دیر بعد اُس بزرگ نے چارپائی کے نیچے دیکھا اور خرگوش سے مخاطب ہو کر بولے عقلمند پناہ بھی لی تو ایک انسان کی ۔ چچا جان نے یہ واقعہ سنایا اور اُن پر رقت طاری ہو گئی ۔ صوفے پر بیٹھے تھے ۔ اُس کی پُشت پر سر رکھ دیا اور زار و قطار دیر تک روتے رہے ۔ میں نے پہلی بار انہیں اس طرح روتے دیکھا ۔

یہ واقعہ سنانے سے بیدی صاحب کا یہ سمجھانا مقصود تھا کہ انہیں اگر اسلام سچے دل سے قبول کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ ڈھونڈنی چاہیئے نہ کہ انسانوں کی ۔ بیدی صاحب سمجھ گئے کہ ان تلوں میں تیل نہیں ۔ اس کے بعد بیدی صاحب نہ کبھی چونیاں آئے نہ ہی ان کے اسلام قبول کرنے کی خبر سُنی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اپنے گورداسپور کے متعلقین سے ان کا کچھ تنازعہ تھا جس کی وجہ سے انہیں گرنتھی کے عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا ۔

۹۶

[illegible]ء میں میں دہلی میں بطور سب جج تعینات تھا ۔ میری اہلیہ کے بدن پر جگہ جگہ ورم نکل آتے تھے ۔ ایلوپیتھک والے اس بیماری کو آرٹیکیریا (ARTICARIA) کا نام دیتے ہیں ۔ ہم نے ایلوپیتھک ، یونانی ، ہومیوپیتھک سب ہی قسم کے علاج کرائے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ ایک دفعہ چچا جان سے اس کا ذکر آیا تو فرمایا تم دہلی میں تعینات ہو حکیم عبدالوہاب صاحب کو کیوں نہیں دکھاتے ۔ ۱۹۳۷ء میں وہ بھی ان کے زیرِ علاج تھے شروع اپریل میں دو تین دن کے لئے دہلی گئے ۔ افغانستان کے قونصل جنرل ان کے دوست تھے ان کے ہاں قیام فرمایا ۔ وہاں سے بذریعہ ڈاک مجھے یہ خط میرے دہلی کے پتہ پر لکھا ۔

برخوردار اعجاز احمد طال عمرہٗ

میں کل صبح دہلی آیا تھا ۔ آج حکیم صاحب نابینا سے ملاقات کی ہے اور تمہاری بیوی کے متعلق ان سے مفصل کہہ دیا ہے ۔ تم کسی روز اُن سے مل کر والدۂ تحسین کی نبض دکھانے کے لئے وقت مقرر کر لو تاکہ حکیم صاحب وہ وقت مریضہ کے لئے خالی رکھیں اور تخلیہ میں مفصل حالات سُن سکیں ۔ میں کل شام واپس لاہور جا رہا ہوں ۔ باقی تمہارے بچوں کو دعا و سلام ۔ اس خط میں حکیم صاحب کے نام بھی ایک خط ملفوف ہے جو اگر ضرورت ہو تو حکیم صاحب کو دکھلا دینا

محمد اقبال

قونصل خانہ ۔ افغانستان نیو دہلی

۳ اپریل ۱۹۳۷ء

اس خط کا متن ان کا قلمی نہیں ۔ کسی اور سے لکھوایا گیا ۔ لیکن دستخط اُن کے ہیں قونصل خانہ کا پتہ اور تاریخ تحریر خط بھی ان کی قلمی ہیں ۔ اُن کے ارشاد کے بموجب میں نے حکیم صاحب سے وقت لیا ۔ وہ بڑی شفقت سے پیش آئے بڑی توجہ سے میری اہلیہ کی نبض دیکھی ۔ حالات سُنے اور دوائی عطا کی جس سے میری اہلیہ کو افاقہ ہوا ۔

۹۷

میں نے حکیم صاحب سے ملاقات کی کیفیت چچا جان کو لکھی تو اُس کے جواب میں یہ خط موصول ہوا ۔

اُن دنوں اُن کی آنکھوں میں موتیا اُتر رہا تھا ۔ ایک دفعہ معائنہ ہو چکا تھا ۔ دوسرے معائنہ تک ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہوا تھا ۔ یہ خط جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کسی دوست سے لکھوایا ۔ دستخط بھی اُن کے نہیں لیکن اندازِ تحریر انہیں کا ہے

من اندازِ قدش را می شناسم

لاہور

۲۳ اپریل ۱۹۳۷ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے ۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ تمہاری بیوی کو حکیم صاحب کے علاج سے فائدہ ہوا ہے ۔ یہ علاج جاری رہنا چاہیے بلکہ کامل صحت ہو جانے کے بعد بھی کچھ مدت تک اس کا جاری رہنا ضروری ہے ۔ حکیم صاحب طبیب ہونے کے علاوہ درویش ہیں اور مجھ کو ان کی یہ ادا نہایت پسند ہے ۔ والسلام

تمہارے بچوں کو دعا

محمد اقبال

یہ خط میں نے ایک دوست سے لکھوایا ہے کیونکہ ڈاکٹر نے مجھ کو آنکھ کے دوسرے معائنہ تک لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے ۔

۹۸

اپریل ۱۹۳۷ء میں چچا جان نے دہلی آکر حکیم نابینا صاحب کو نبض دکھائی تھی اور اُن کی تجویز کردہ دواؤں کا استعمال شروع کیا تھا۔ مئی کے تیسرے ہفتہ میں یہ خط میرے نام آیا جس میں اُن دواؤں کے استعمال کے بعد جو ان کی حالت تھی وہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ میں "یہ خط خود جاکر حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کروں اور جو دوا وہ دیں اُسے لے کر انہیں پارسل کر دوں۔" اگرچہ ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کیا ہوا تھا لیکن دو صفحات کا یہ طویل خط انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔

لاہور ۲۰ مئی ۱۹۳۷ء

برخوردار اعجاز طال عمرہ

بعد دعا کے واضح ہو میں نے حکیم نابینا صاحب کے خدمت میں کچھ دن ہوئے ایک رجسٹرڈ خط لکھا تھا جس کا کوئی جواب اب تک نہیں ملا۔ مہربانی کر کے تم یہ خط خود جاکر ان کی خدمت میں پیش کرو اور جو دوا وہ دیں اسے لے کر مجھے پارسل کر دو!

(۱) سنہری گولی جو صبح بالائی میں رکھ کر کھائی جاتی ہے اب ختم ہونے کو ہے۔ یہ گولی مجھے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس کے کھانے سے پیشاب کی درد رفع ہوئی۔ اس کی کافی تعداد اگر حکیم صاحب روانہ کرا دیں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ حکیم صاحب کو بار بار زحمت دینے کی ضرورت نہ رہے گی۔

(۲) سفید ورق والی گولی جو ناشتے میں کھائی جاتی ہیں اس کی کافی تعداد ابھی میرے پاس موجود ہے اس کے روانہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے

(۳) سفید ورق والی جو پان میں رکھ کر کھائی جاتی ہے۔ قریب الاختتام ہے صرف تین گولیاں باقی۔ یہ تولید بلغم کو کم کرنے والی گولی ہے اگر اس کا جاری رکھنا ضروری ہے تو یہ بھی کافی تعداد میں ارسال فرما کر مشکور فرمائیں۔

(۴) اپریل کے ابتدا میں جب میں حکیم صاحب سے ملا تھا تو انہوں نے فرمایا تھا کہ تمہارا جگر ریح پیدا کرتا ہے اب اس کا علاج ضروری ہے اس کے لئے انہوں نے ایک معجون مجھے عطا فرمائی تھی۔ اس معجون کا نسخہ اس خط میں ملفوف کرتا ہوں۔ وہ حکیم صاحب کو دکھا دیں تاکہ انہیں یاد آجائے۔ یہ بھی اب قریب الاختتام ہے چند خوراک باقی ہے اگر اسی کو جاری رکھنا ہو تو اس کی مقدار بھی کافی ارسال کریں۔ مگر پیشتر اس کے کہ حکیم صاحب نئے سرے سے اسی معجون کے استعمال کا حکم دیں یا اس میں کوئی ترمیم کریں۔ مندرجہ ذیل امور اُن کے گوش گزار کرنا لازم ہے۔

(۱) جگر بدستور ریح پیدا کرتا ہے اس میں کمی نہیں ہوئی غالباً یہ معجون موثر نہیں ہوئی۔

(۲) دم بھی پھولتا ہے گو پہلے کی نسبت کم اس سے میں یہ اندازہ کرتا ہوں کہ دل کی تقویت کے لئے کسی خاص موثر دوا کی ضرورت ہے۔

(۳) قبض کی شکایت بھی کم و بیش ہے۔

(۴) اس معجون کے استعمال کے چند روز بعد پیشاب کا درد بھی عود کر آیا حالانکہ اس کے استعمال سے پہلے مطلق نہ تھا میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا عود کر آنا معجون کے استعمال کی وجہ سے ہے تاہم یہ واقعہ حکیم صاحب کے نوٹس میں لانا ضروری ہے۔

بہرحال جو امور حکیم صاحب کی خاص توجہ کے مستحق وہ یہ ہیں۔

(۱) ریح کا پیدا ہونا (۲) دم پھولنا (۳) قبض کی شکایت (۴) پیشاب کے درد کا پھر عود کر آنا (۵) ریح جو پیدا ہوتی ہے جب تک نہ نکلے کمر میں درد ہوتا رہتا ہے اور دونوں طرف کے گردوں پر بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ نکل جائے تو درد میں تخفیف ہوتی ہے۔

غرضیکہ یہ تمام تفصیل میرے موجودہ حالات کی ہے ایک ایک بات حکیم صاحب کے گوش گزار کر کے ان کا جو جواب ہو مجھے اس سے مطلع کریں جو کچھ وہ فرمائیں اسے نوٹ کرتے جائیں تاکہ بعد میں آسانی سے مجھے لکھ سکو۔ دوا کی ترسیل کے لئے خاص تاکید ہے۔ جلد ارسال ہونی چاہیے۔ والسلام

محمد اقبال

افسوس ہے کہ جاوید کا ماموں عبدالغنی کل بقضائے الٰہی فوت ہو گیا۔ نہایت شریف اور نیک آدمی تھا خدا اسے مغفرت کرے۔

امید کہ تمہاری بیوی کی صحت اب بالکل اچھی ہو گی۔

میں خط ملتے ہی حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسب ارشاد "ایک ایک بات حکیم صاحب کے گوش گزار" کی۔ حکیم صاحب نے جو دوائیں دیں اور اُن کے متعلق مفصل ہدایات اُسی دن لاہور بھیج دی گئیں۔ پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ چچا جان اپنی کیفیت لکھوا بھیجتے جو میں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیان کر دیتا اور جو دوائیں تجویز ہوتیں وہ بذریعہ پارسل بھیج دیتا۔ اس خط کے بعد ۱۹۳۷ء میں جتنے خطوط موصول ہوئے وہ سب کسی اور کے لکھے ہوئے تھے۔ انہیں صرف پانچ محفوظ رہ گئے ہیں۔

۹۹

۲۰ مئی ۱۹۳۷ء کے بعد کے خطوط جو محفوظ رہ گئے اُن میں پہلا خط یہ ہے جو ۲۲ جولائی کا ہے۔ جون ۱۹۳۷ء اور جولائی ۱۹۳۷ء کے نصف اول میں بھی اس سلسلہ میں خطوط آئے ہوں گے جو محفوظ نہیں رہے۔ حافظ محمد سعید جن کا اس خط میں ذکر ہے دہلی کے ایک نوجوان وکیل تھے جو حکیم صاحب کے قانونی کام کرتے تھے۔ اُن کے ذریعہ میں حکیم صاحب سے ملاقات کا وقت لیا کرتا تھا۔

حسب ارشاد حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر چچا جان کی کیفیت بیان کر دی گئی اور جو دوائیں ملیں وہ بھیج دی گئیں۔

لاہور ۲۲ جولائی ۱۹۳۷ء

برخوردار اعجاز احمد طال عمرہ

حکیم صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ کچھ دنوں سے میرے دونوں گردوں کی طرف ایک بوجھ سا رہتا ہے اور گزشتہ رات بائیں جانب کے گردہ میں خفیف سی درد بھی محسوس ہوتی رہی جو اس وقت نہیں ہے۔ اسی بائیں جانب کے گردہ میں دس سال ہوئے جب مجھے درد ہوئی تھی۔ جب حکیم صاحب نے اس کا علاج کیا۔ دس سال تک ذرا سی کسک بھی محسوس نہیں ہوئی۔ سوائے گزشتہ رات کے بیان حکیم صاحب کے نوٹس میں لانا ضروری ہے۔ مہربانی کر کے یہ خط ان کو حافظ محمد سعید صاحب کی معرفت بھجوا دیں اور اگر حکیم صاحب کوئی دوائی تجویز کریں تو وہ لے کر مجھے بھجوا دینا۔ باقی جو دوائیاں حکیم صاحب کی ہیں ان کا استعمال جاری ہے۔ ان کے ختم ہونے کے قریب اطلاع دوں گا۔

والسلام

محمد اقبال

دیکھنے سے معلوم ہوا کہ دونوں معجونیں جو حکیم صاحب نے ارسال فرمائی تھیں۔ قریب الاختتام ہیں۔ گولیوں کی تعداد ابھی اتنی ہے

ستمبر کی تعطیلوں میں دیوانی عدالتیں بند ہو گئیں جن میں دہلی میں رہا تاکہ دوائیں وقت پر پہنچاتا رہوں۔ میں نے اس کی اطلاع تو چچا جان کو کر دی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے میرا وہ خط انہیں نہیں ملا۔ وہ سمجھے کہ میں تعطیلوں میں دہلی سے چلا گیا ہوں لہٰذا انہوں نے حافظ محمد سعید کو براہِ راست خط لکھا۔ حافظ صاحب مسوری پہاڑ پر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں سے انہیں لکھا اور میرے دہلی میں ہی قیام کی اطلاع دی۔ اس پر یہ خط موصول ہوا۔

میں یہ خط لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکیم صاحب کو یہ معلوم ہو کر اطمینان ہوا کہ ان کے علاج سے چچا جان کو فائدہ ہو رہا ہے۔ جو مزید دوائیں انہوں نے دیں وہ بذریعہ پارسل بھجوا دی گئیں۔

۱۷ ستمبر ۳۷ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

حافظ محمد سعید صاحب کے خط سے جو مسوری سے آیا معلوم ہوا کہ تم ابھی دہلی میں ہو اور ستمبر کی تعطیلوں میں کہیں باہر نہیں گئے۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم وہاں نہیں ہو۔ اس لئے میں نے حافظ صاحب ہی کو خط لکھا تھا کہ دوا حکیم صاحب سے لے کر ارسال فرما دیں۔ امید ہے کہ تم بھی حکیم صاحب کی خدمت میں پیغام بھیج دو گے۔ تاکہ وہ جلد توجہ فرمائیں۔ امید ہے تمہارے اہل و عیال بخیریت ہوں گے۔ میں بھی بفضلِ خدا تعالیٰ پہلے سے بہت اچھا ہوں۔ حکیم صاحب کی دواؤں نے بہت فائدہ پہنچایا ہے

والسلام

محمد اقبال

دوائیاں ملنے پر انہوں نے یہ خط لکھا اس کا مضمون بھی حکیم صاحب کے گوش گزار کر دیا اور جو جواب حکیم صاحب نے دیا وہ چچا جان کو لکھ دیا گیا۔ اکتوبر نومبر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا لیکن وہ خط محفوظ نہیں ہے۔

۲۲ ستمبر ۳۷ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

حکیم صاحب کی بھیجی ہوئی دوائیں مل گئیں۔ اب کے انہوں نے صرف دو معجون کھانے کے لئے ارسال کی ہیں۔ اس سے قبل دوا کا دستور العمل یہ تھا۔

صبح سنہری گولی بالائی میں۔

آٹھ بجے سفید گولی ناشتے کے دوران میں۔

دس بجے سفید گولی دونوں معجونوں میں سے ایک کے ساتھ

چار بجے شام دوسری معجون

اب کے جیسا کہ لکھا گیا ہے صرف دو معجونیں صبح و شام کے لئے موصول ہوئی ہیں الگ کوئی گولیاں نہیں بھیجی گئیں۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ سنہری اور سفید گولیاں جن کا استعمال ہو رہا تھا ان معجونوں میں شامل کر دی گئی ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیا سہواً ایسا ہوا ہے یا پھر حکیم صاحب نے قصداً ان کا استعمال بند کرا دیا ہے آپ یہ امر ان کے مطب سے دریافت کر کے مجھے مطلع کریں۔

والسلام

محمد اقبال

یہ بات اس لئے دریافت کی کہ سنہری گولیوں سے مجھے بے حد فائدہ ہوا تھا۔ ان کا ترک کر دینا غالباً ٹھیک نہ ہو گا۔ ہاں اگر یہ گولیاں معجون میں شامل ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں

اُن دنوں دسمبر کے مہینے میں دیوانی عدالتیں کرسمس کی تعطیلوں کے لئے ہفتہ دس دن کے لئے بند ہوتی تھیں۔ سنہ ۳۷ء میں ان تعطیلوں میں جاوید اور منیرہ کے سیالکوٹ جانے کی تجویز تھی۔ بچوں کی جرمن گورنس اُن دنوں میں اپنے عزیزوں کو ملنے علی گڑھ جانا چاہتی تھی۔ اس لئے کرسمس کی تعطیلوں میں میرے سیالکوٹ جانے کا پروگرام دریافت کرنے کے لئے چچا جان کا یہ خط موصول ہوا۔

یکم دسمبر ۳۷ء

برخوردار اعجاز احمد طال عمرہٗ

میں نے تم کو ایک خط منیرہ اور اس کے متعلق لکھا تھا۔ جس کا جواب اب تک نہیں ملا۔

بھائی صاحب کا ارشاد تھا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں جاوید اور منیرہ چند روز کے لئے سیالکوٹ آ جائیں۔ دونوں بچے خود بھی۔ وہاں جانے کے لئے بیتاب ہیں۔ تم مجھ کو فضل نور (فوراً) اطلاع دو کہ دسمبر کی کون سی تاریخ اور کون سے وقت لاہور پہنچ گے۔ غالباً تمہارے اہل و عیال تمہارے ساتھ ہوں گے۔ بہتر یہ ہے کہ اگر گاڑیوں کے اوقات اس بات کو ممکن کریں تو تم سب پہلے یہاں آ جاؤ۔ پھر جاوید اور منیرا یہیں سے تمہارے ساتھ سیالکوٹ روانہ ہو جائیں۔ اس خط کا جواب مفصل بہت جلد تحریر کرنا چاہئے۔ جلدی کی ضرورت اس لئے ہے کہ منیرا اور جاوید کی گورنس بھی اپنے اوقات علی گڑھ جانے کے لئے معین کرنا چاہتی ہے۔ زیادہ دعا۔

والسلام

محمد اقبال

کیونکہ بچے تمہارے ہمراہ ہوں گے اور یہاں سے دو بچے اور ساتھ ہو جائیں گے۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو ایک سیکنڈ یا انٹر کپارٹمنٹ لاہور سے وزیر آباد تک ریزرو کرایا جائے۔

اُن کے ارشاد کے مطابق میں اپنے بچوں سمیت پہلے لاہور گیا اور وہاں سے جاوید منیرہ کو ساتھ لے کر سیالکوٹ چلا گیا۔

یہ خط کسی مبتدی سے لکھوایا گیا معلوم ہوتا ہے ایک تو تحریر بھی پختہ نہیں دوسرے فی الفور کو "فعل فور" لکھا ہے۔

اس خط کے پہلے پیراگراف کا ذکر اگلے خط کے ساتھ کیا جائے گا۔

۱۰۳

چچا جان کی دائیں آنکھ کی بینائی تو بچپن سے ہی کمزور تھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوئے تو اسی بنا پر طبی معائنہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ سرکاری ملازمت میں چلے جاتے تو حکیم مشرق نہ بن سکتے۔

زندگی کے آخری سالوں میں دوسری آنکھ میں موتیا اترنا شروع ہو گیا۔ سنہ ۳۷ء کے شروع میں تو موتیا کی شدت کی وجہ سے معالجوں نے لکھنے پڑھنے کی بھی ممانعت کر دی۔ ان دنوں اس مرض کے علاج یعنی آپریشن کے بڑے ماہر ڈاکٹر متھرا داس موگا والے سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے ملازمت کی ابتدا تو اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں موتیا کے آپریشن کی ایسی مہارت عطا کی تھی کہ ہندوستان بھر میں ان کی شہرت تھی۔ ان کی ملازمت کا زیادہ عرصہ موگا منڈی کے سول ہسپتال کے انچارج کے طور پر گزرا۔ ان کی وجہ سے وہ ہسپتال موتیا کے آپریشن کے لئے اتنا مشہور ہوا کہ دور دور سے سینکڑوں مریض علاج کے لئے وہاں آتے۔ سنہ ۳۳ء میں وہ ملازمت سے ریٹائر ہو کر لاہور میں اپنا مطب کرتے تھے۔ باوجود اتنی شہرت، عزت اور فنی مہارت کے وہ بڑے خلیق اور وضعدار بزرگ تھے۔ ان کے بھتیجے دیس راج باہوا اور میں ایک ساتھ جوڈیشل سروس کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ میرا تقرر دیس راج سے پہلے ہو گیا اور حسنِ اتفاق سے پہلی تعیناتی موگا میں ہوئی۔ دیس راج ان دنوں موگا میں ڈاکٹر صاحب کے پاس مقیم تھے۔ موگا میں کچھ دن میرا قیام ڈاکٹر صاحب کے ہاں دیس راج کے مہمان دوست کی حیثیت سے رہا۔ موگا کے قیام کے دوران اور پھر اس کے بعد بھی ہمیشہ ڈاکٹر صاحب نے میرے ساتھ ویسی ہی شفقت کا برتاؤ کیا جیسی دیس راج سے کرتے تھے۔ اب ایسی وضعداریاں کہاں ہیں

میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر متھرا داس سے اپنے تعلق کا ذکر کر کے چچا جان سے عرض کیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو ڈاکٹر صاحب سے ان کی آنکھ کے معائنہ کا انتظام کیا جائے۔ نومبر ۳۷ء میں انہوں نے مجھے ایسا کرنے کے لئے لکھا۔ میں نے اسی وقت ایک خط ڈاکٹر متھرا داس کی خدمت میں لکھا اور ایک چچا جان کی خدمت میں کہ وہ منشی طاہر دین کو بھیج کر ڈاکٹر صاحب سے معائنہ کے لئے وقت لے لیں۔ یکم دسمبر ۳۷ء کا محررہ خط جس میں ڈاکٹر متھرا داس کے متعلق میرا جواب نہ ملنے کا ذکر ہے۔ سپرد ڈاک کرنے کے بعد اسی دن میرا خط انہیں مل گیا تھا اور انہوں نے منشی طاہر دین کو کہہ دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے مل کر معائنہ کے لئے وقت لے لیں۔ ادھر میرا خط ڈاکٹر صاحب کو بھی اسی دن ملا۔ ان کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ وہ دوسرے دن صبح خود چچا جان کے ہاں معائنہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اور معائنہ کے بعد انہیں اطمینان دلایا کہ جب آنکھ آپریشن کے قابل ہو جائے گی وہ خود آپریشن کریں گے اور پوری بصارت عود کر آئے گی۔ چچا جان ڈاکٹر صاحب کے اخلاق سے بڑے متاثر ہوئے اور اسی دن مجھے یہ خط لکھا جس میں فرماتے ہیں: "ڈاکٹر صاحب نہایت خوش اخلاق آدمی ہیں اور میں خوش ہوں کہ تم اپنے تعلقات کے لئے ایسے با اخلاق آدمیوں کا انتخاب کرتے ہو۔"

۲ر دسمبر ۳۷ء برخوردار اعجاز احمد طال عمرہ

تمہارا خط آنے پر میں نے منشی طاہر الدین کو ڈاکٹر متھرا داس صاحب سے وقت مقرر کرنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا خط ڈاکٹر صاحب موصوف کو طاہر الدین کے ملنے سے پیشتر مل گیا تھا۔ وہ آج خود تشریف لے آئے اور میری آنکھ کا معائنہ کیا۔ ان کا خیال ہے کہ موتیا بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ماہ مارچ میں آپریشن کے لائق ہو جائے۔ مگر فروری میں پھر معائنہ کریں گے۔ اگر مارچ میں آپریشن کے لئے آنکھ پختہ نہ ہوئی اور آپریشن کی ضرورت گرمیوں میں محسوس ہوئی تو پھر آپریشن مصوری پہاڑ پر کیا جائے گا۔ مارچ میں ہوا تو لاہور میں ہو جائے گا۔ گرمیوں میں ہوا تو مصوری میں اور اگر اس نے اکتوبر تک طول کھینچا اکتوبر میں لاہور میں ہی ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ انہوں نے ہر طرح اطمینان دلایا ہے کہ آپریشن نہایت عمدگی کے ساتھ ہوگا۔ اور پوری بصارت عود کر آئے گی۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوش اخلاق آدمی ہیں۔ اور میں خوش ہوں کہ تم اپنے تعلقات کے لئے ایسے با اخلاق آدمیوں کا انتخاب کرتے ہو۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے

محمد اقبال

چونکہ سنہ ۳۸ء کے شروع میں ہی چچا جان پر دمہ کے شدید دورے پڑنے لگے اس لئے آپریشن ستمبر سنہ ۳۸ء تک ملتوی کر دیا گیا۔ افسوس کہ ستمبر سنہ ۳۸ء سے پہلے ہی اس دیدۂ بینائے قوم ۲۱ کو آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

وحید عشرت

مظلومِ اقبالؒ

ایک تبصرہ

نام کتاب	———	مظلوم اقبال
مصنف	———	شیخ اعجاز احمد (علامہ اقبال کے قادیانی بھتیجے)
ناشر	———	مصنف بذاتِ خود
سال اشاعت	———	۱۹۸۵ء
قیمت	———	۷۵ روپے
ملنے کا پتہ	———	بی ۳۰ ایم داؤد پوتہ روڈ کراچی ۳

مجلد، خوبصورت جلد، سنہری ڈائی، گردپوش عمدہ علامہ کی تصویر سے مزین کاغذ عمدہ کتابت اور پروف ریڈنگ کی متعدد اغلاط بمجموعی اعتبار سے اور طباعت کے لحاظ سے کتاب اچھی ہے۔

مظلوم اقبال کتاب کی طرف فوری طور پر توجہ منعطف ہونے کی دو وجوہات ہیں، پہلی تو اس کا نام ہے کہ قاری اسے پڑھتے ہی چونک جاتا ہے اور سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس کتاب میں حکیم الامت علامہ اقبال کے حوالے سے متعدد ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہوگی جس سے علامہ کی شخصیت کو گھٹانے، مسخ کرنے یا ان کے بارے میں غلط بیانیوں پر مبنی باتیں پھیلانے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ تاہم کتاب کو دیکھ کر خاصی مایوسی ہوتی ہے کہ بہت معمولی قسم کی واقعاتی اور تاریخی باتوں میں اختلاف کے سوا فاضل مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے کتاب کے نام کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ اس کتاب کے اس نام کی شانِ نزول جو انہوں نے بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی صاحب قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہے تھے تو علامہ نے اس پر فرمایا کہ "ایک زمانے میں حسینؓ مظلوم تھے ان دنوں قرآن مظلوم ہے کہ جو اٹھتا ہے اس کی تفسیر لکھنے بیٹھ جاتا ہے"۔

اقبال کی مظلومیت کیلئے شیخ اعجاز کے بیانات کی حقیقت

شیخ صاحب نے مظلوم اقبال کے جواز میں دوسری روایت فیض احمد فیض کی بیان کی ہے۔ کہتے ہیں روزنامہ جنگ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک مذاکرے میں فیض احمد فیض نے کہا کہ "آج کل کے دور میں اگر شعرا میں سب سے مظلوم کوئی ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں۔ ہر نقاد اور مبصر اقبال کو اپنے نظریات اور خیالات اور عقاید کی اقلیم میں کھینچ تان کر لانے کی کوشش کرتا ہے ایسے

حضرات علامہ اقبال کا کوئی نہ کوئی مصرعہ یا شعر اپنے خیالات کی تائید کے لیے پیش کر دیتے ہیں"۔
مظلوم اقبال نام رکھنے کے لیے شیخ صاحب نے ان دو واقعات سے استدلال فرمایا ہے۔ کہ ان الفاظ میں اقبال

بھی مظلوم ہے کہ ان پر ہر کوئی مشق کر رہا ہے اور عجیب عجیب فرضی روایات ان سے منسوب کر رہا ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب نے اس کتاب میں بالخصوص مولانا عبدالمجید سالک۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ خالد نظیر صوفی اور جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتابوں کو مختلف حوالوں سے ہدف تنقید بنایا ہے۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب زندہ رود کو حرف آخر اور مستند کتاب قرار دینے کے باوجود محض اس لیے نشانۂ تنقید بنایا ہے کہ اس میں علامہ اقبال کے خاندان ماں، باپ، بھائی اور دوسرے عزیز و اقارب کے قادیانی ہونے کی مستند اور مدلل حوالوں سے تردید کی گئی ہے۔ دوسروں کی روایات کو سنی سنائی اور ساقط الاعتبار قرار دیتے ہوئے وہ خود جن روایات کو بیان کرتے ہیں۔ وہ بھی سنی سنائی اور قادیانی جماعت کے تشہیری بیانات پر مشتمل ہیں اکثر جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ خود کوئی مستند حوالہ دینے کی بجائے اپنی روایت کی ہوئی بات کو بلا دلیل مستند کہتے ہوئے دوسروں کے دلائل کو رد کرتے ہیں۔ متعدد جگہ خود انہوں نے بالخصوص قادیانیت کے حوالے سے جو گھپلا کیا ہے اس سے ان کی دوسری روایتوں کی صحت کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک عبدالمجید سالک۔ عبداللہ چغتائی اور دوسرے افراد کی روایات کے ساقط الاعتبار ہونے کا تعلق ہے تو اس میں خود ان بزرگوں کو دوسروں سے بھی ایسا ہی شکوہ تھا۔ ۱۹۷۷ء میں جب علامہ اقبال کا صد سالہ جشن ولادت منایا جا رہا تھا تو میں اس وقت بھی اقبال اکادمی میں ریسرچ سکالر تھا اور ایک عارضی آسامی پر کام کر رہا تھا۔ جشن صد سالہ کی ذیل میں چھپنے والی کتب کی تدوین کا کام میرے سپرد تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اپنی چھڑی اور مخصوص بھولا رلڑی کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر معز الدین اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ بھی یہی کہتے کہ علامہ اقبال کے بارے میں بہت سی روایات غلط ہیں۔ ذکر اقبال اور اقبال کے حضور پر خاص طور پر انہیں اعتراض ہوتا۔ وہ فرماتے کہ ان کتب میں اقبال کے ساتھ اپنا قد کاٹھ اونچا کرنے کے لیے خود ساختہ روایات کا طومار بھر دیا گیا ہے۔ آج شیخ اعجاز صاحب ان کے بارے میں یعنی ان کی کتاب روایات اقبال کے متعلق ایسے ہی کہہ رہے ہیں اگر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی آج زندہ ہوتے تو شاید مظلوم اقبال کے بارے میں یہ بات وہ بھی پورے شد و مد کے ساتھ کہتے اور پھر شیخ صاحب کو ان روایات کی صحت کا بھی اندازہ ہو جاتا

دوسری وجہ جو شیخ صاحب نے اس کتاب کے ضمن میں فیض احمد فیض کے حوالے سے بیان کی ہے۔ وہ بھی کوئی لائق اعتنا نہیں۔ اقبال ایسی قد آور شخصیت پر جو اسلامی نشاۃ ثانیہ کی علامت ہے اور عصر حاضر میں مسلمانوں کے عمرانی سیاسی، فکری اور الہیاتی مسائل کے بارے میں روشنی دینے والی بصیرت ہے۔ اقبال کا نام دنیا میں اسلامی قوتوں کے لیے سرچشمہ طاقت ہے جس نے برصغیر کی سیاسی بساط کے تمام مہروں کو مات دی اور انگریز اور ہندو کی شاطرانہ سیاست کی چالیں الٹ دیں۔ انہوں نے انگریز اور ہندوؤں کی چالوں سے متنبہ مسلمانوں کو دو قومی نظریہ اور علیحدہ وطن کا نصب العین دیا ان پر جس قدر لکھا جاتے کم ہے پھر ابھی اقبال پر مواد جمع ہونے کا مرحلہ ہے۔ ایک وقت پھر ایسا آئے گا۔ جب اس مواد کو جانچا اور پرکھا جائے گا۔ ایسے میں اقبال کی اس ہمہ گیر اور جادو اثر شخصیت پر بہت سی مستند کتب کے ساتھ ساتھ بہت سی غیر مستند کتب بھی شائع ہوئی ہیں تو اس سے اقبال کو مظلوم نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کیسا جادو ہے جس نے پوری دنیا کو ان کی طرف متوجہ کر دیا پھر اگر یہ کہا جائے کہ فکر اقبال کو سب سے زیادہ بگاڑنے کی کوششیں فیض نہیں تو اس کے نظریاتی بھائی بندوں نے زیادہ سرانجام دی ہیں تو مضائقہ نہیں اس لیے کہ کمیونسٹ پارٹی کا یہ واضح اشارہ ہے کہ اگر تم کسی فکر اور نظریے کو رد نہیں کر سکتے تو اس کو مختلف تعبیرات اور توجیہات کے ذریعے اتنا الجھا دو کہ وہ اپنی ہیئت کھو دے۔ اقبال کو اشتراکیانے کی مختلف جہات سے کوششیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود اقبال کا اپنا ایک تشخص ہے اور اپنی الگ شناخت ہے جو ان پر طوائف کو قتل کرنے .

شراب نوشی اور رندی و سرمستی کے بہتانوں اور اتہامات کے باوجود کبھی کم نہیں ہوا۔ لہٰذا اقبال کو مظلوم بنانے یا ثابت کرنے کا شغل کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کتاب کا عنوان نہایت بچکانہ اور بودا ہے۔ سستی جذباتیت کے ذریعے کچھ مقاصد کے لیے ہمدردی حاصل کرنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے۔ تاہم لوگوں کو چونکا دینے اور کتاب کی سیل ویلیو بڑھانے کے لیے ایسے نام کسی طور پر مفید قرار دیئے جا سکتے ہیں مگر اس عنوان سے کتاب کی معنویت ثابت نہیں کی جا سکی۔

مظلوم اقبال کے مطالعہ کی دوسری وجہ

اس کتاب کی مقبولیت کی دوسری وجہ ظاہر و باہر ہے کہ یہ کتاب علامہ اقبال کے "صالح" بھتیجے کے قلم سے لکھی گئی ہے لہٰذا اس میں ایسے متعدد نئے انکشافات ہوں گے جن سے علامہ اقبال کی زندگی کے کچھ نئے گوشے منور ہوتے ہوں گے۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ اس کتاب میں بہت سے خطوط بھی ہیں جو معلومات افزا اور نئے بھی ہیں اس لحاظ سے یہ کتاب اہم اور مفید ہے۔ اس کتاب میں ۴۰ خطوط شیخ صاحب نے شامل کیے ہیں جو کتاب کو اقبال شناسوں میں وقیع بنانے کے لیے کافی ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنی کتاب میں جو شجرہ نسب درج کیا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ صرف عبدالرحمٰن کے بیٹے احمد کی اولاد میں اختلاف ہے۔ شیخ صاحب نے اس کی تفصیل یوں درج کی ہے۔ احمد کی اولاد میں سراج دین، تاج دین، حاکم بی، زینب، احمد دین اور حیات شامل ہیں جبکہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے احمد کی اولاد کی تفصیل یوں دی ہے[۵] کہ سراج الدین، تاج دین، حاکم بی، زینب بی، حسن بی، احمد دین اور حیات۔ یعنی حسن بی ڈاکٹر صاحب کے شجرہ میں ایک اور نام ہے جو شیخ صاحب کے شجرہ میں رہ گیا۔

کتاب میں ایک اور بات بڑی نمایاں ہے۔ شیخ صاحب علامہ اقبال کا ذکر چچا جان کے بطور کرتے ہیں یا کہیں علامہ اقبال بھی لکھتے ہیں تو بڑی ملائمت، محبت اور چاہت سے ذکر کرتے ہیں۔ کتاب میں کئی جگہ انہوں نے علامہ کا دفاع بھی کیا ہے خصوصاً شراب نوشی کی روایات کو غلط قرار دیا ہے اور یہ شہادت دی ہے کہ انہوں نے انہیں ایسا کرتے کبھی نہیں دیکھا بلکہ ایک محفل میں تو اقبال نے کہا کہ میں نے تو یورپ میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پھر ڈاکٹر اجمل اور سلیم احمد کے اس موقف کو بھی سختی سے رد کیا ہے کہ علامہ اقبال کو کوئی نفسیاتی یا جنسی عارضہ[۶] تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پچھلے چند سالوں میں دو ایک دانشوروں نے ماہر نفسیات کا لبادہ اوڑھ کر علامہ کی تحریروں کی روشنی میں ان کی نفسیات کا جائزہ لینے کے بہانے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ ایک کہتے ہیں۔ "اقبال نہ زبان کے شاعر ہیں نہ رعایت لفظی کے۔ نہ صنائع بدائع کے اور نہ جذبات و محسوسات کے۔ ان کے خیال میں وہ تصورات اور خیالات کے شاعر ہیں اور تصورات و خیال بھی روایتی نہیں ان کے اپنے ہیں۔ پھر وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ "خیالات کی شاعری اچھے یا برے معنوں میں شاعری ہوتی بھی ہے یا نہیں؟" دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک علامہ اقبال کی شاعری شاعری ہی نہیں۔ یہاں تو خیر علمی بات تھی۔ برعکس بر خیال خویش خبطے دارد۔ غالب کے متعلق ان کی زندگی میں "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" کہا جاتا تھا۔ گر نہ بیند بروز شپرہ چشم۔ لیکن علامہ کی شاعری پر اعتراض سے ان کے حسد کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں کبھی کبھی میرے دل میں ایک خطرناک خیال آتا ہے لیکن میں کسی ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ کیا علامہ کسی خطرناک جسمانی (جنسی) عارضے میں مبتلا تھے؟ ناطقہ سر بگریباں ہے

اسے کیا کہیے۔

دوسرے دانشور ماہر نفسیات کی رائے میں اقبال "کامل مرد نہیں تھے" لیکن وہ یہ نہیں فرماتے کہ یہ انکشاف ان پر کیسے اور ان کی کس تحریر سے ہوا۔ رشید احمد صدیقی ایسی تحریروں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اپنے ایک مضمون میں کر چکے ہیں جس کے بعد ان ہفوات کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر محمد اقبال کے بارے میں ایسی کچی اور ناپختہ باتوں کا نوٹس لیتے وقت اپنا سارا وزن علامہ کے پلڑے میں ڈالا ہے اور ہر اس شخص کی خبر لینے کی کوشش کی ہے جو ان کے ہاتھ آیا۔ اور یہاں ان کی زلمی علامہ کے حق میں بڑی زوردار اور جاندار ہے۔ تاہم جہاں قادیانیت کے بارے میں علامہ کا موقف بیان کیا ہے وہاں خود ان کا اپنا لہجہ علامہ کے بارے میں غیر ثقہ، غیر ہمدردانہ بلکہ افسوسناک حد تک جارحانہ ہے۔ اور انہوں نے ہر چھوٹا بڑا وہ واقعہ بیان کر دیا ہے جو کسی صورت بھی علامہ کے قادیانیت سے تعلق کو ظاہر کر سکتا ہو۔ یہاں ان کا اور جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال دونوں کے بارے میں لہجہ تلخ اور کڑوا ہے۔

مظلوم اقبال کے مذموم مقاصد

اگر شیخ صاحب کی کتاب کو قادیانیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقبال سے بڑا واقعی کوئی مظلوم نہیں۔ انہوں نے نہایت چابکدستی سے غیر متعلقہ اور جزوی واقعات کے حوالے سے اقبال کو قادیانیت کے کیمپ میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے اور علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد، والدہ کریم بی بی، بھائی جو ان کے والد ہیں بھابھی جی جو ان کی والدہ ہیں اور اپنی پھوپھیوں سب کو ایک ہی ہلے سے قادیانی بنا دیا ہے اور ان پر اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو گا کہ ان کی سند بھی شیخ صاحب کی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بھابھی (والدہ) اور پھوپھیوں سے ایسا سنا۔ اقبال اس لحاظ سے مظلوم اور بدقسمت ہے کہ خود اس کے چھوٹے بھتیجے نے جو ان سے پیار اور محبت کا مدعی ہے ان کے عقائد پر حملہ کیا ہے اور اپنے عقائد کے استناد کے لیے علامہ اقبال کی شہرت کو بلیک میل کیا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی کتاب زندہ رود جسے وہ حرف آخر اور مستند قرار دیتے ہیں کے اقبال اور احمدیت کے سلسلے میں دلائل کے بعد اس کتاب کا کیا جواز تھا۔ اگر یہ کتاب زندہ رود سے پہلے آئی ہوتی تو اس کا ایک جواز مان لیا جاتا۔ مگر ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کو خاندان اقبال کے قادیانی ہونے کے بارے میں اپنے دلائل کی مکمل تفصیل دینے اور شائع کرانے کے بعد ان کا مظلوم اقبال کے نام سے کتاب لکھنا ان کے کچھ دوسرے مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے جو ان سے چھپائے نہیں چھپے۔ اگر مظلوم اقبال سے پہلے یا اس کے پڑھنے کے بعد کوئی غیر جانبدار شخص زندہ رود کی تیسری جلد کے صفحات ۵۱۱ تا ۵۹۹ پڑھے تو قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے خاندان اور اقبال کا پورا موقف دلائل کے ساتھ مفصل طور پر سامنے آ جاتا ہے اور شیخ اعجاز احمد کے دلائل کی قلعی کھل جاتی ہے۔ انہوں نے محض اپنے خونی اور خاندانی رشتے کے بل پر علامہ اقبال جو اس ملک کے نظریہ ساز ہیں کے دل میں قادیانیت کے لیے نرم گوشہ ثابت کرنے کے لیے جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اس کی وجہ ملک کی وہ صورت حال ہے جس میں قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔ ایسے وقت میں اس کتاب کی بڑے اہتمام کے ساتھ اشاعت در اصل اس سبب سے ہے کہ علامہ اقبال کے ساتھ قادیانیت کو نتھی کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ اس ملک میں جس کی بنیاد فکر اقبال پر ہے وہاں قادیانیت کو جس سے وہ ہمدردی رکھتے تھے غیر مسلم اقلیت قرار دیا جانا مناسب نہیں۔ شیخ صاحب کے یہ بیان کہ اقبال پر احراریوں کا اثر

تھا جس کی بنا پر انہوں نے ۱۹۳۵ء میں سیاسی دباؤ کے تحت قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی حمایت کی کے پس منظر میں شیخ صاحب کہنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے پیچھے احراریوں کی ہی تحریک ہے۔

کیا اقبال ۱۹۳۵ء تک قادیانیت کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے؟

مظلوم اقبال میں یوں تو پوری کتاب کے پس منظر میں اقبال کی مظلومیت کی آڑ میں قادیانیت کی نام نہاد مظلومی کا رونا رویا گیا ہے اور اقبالیات کے پردے میں قادیانیت کو پیش کیا گیا ہے مگر شیخ صاحب کھل کر اپنی کتاب میں باب ۲۳ اور ۲۴ میں سامنے آئے ہیں۔ باب ۲۳ کا عنوان ہے "زندہ رود۔ علامہ اقبال کے سوانح حیات" اور باب ۲۴ کا عنوان ہے "علامہ اقبال اور احمدیت" زندہ رود کے بارے میں ان کی رائے ہے۔

"زندہ رود کی اشاعت سے پہلے علامہ اقبال کے سوانح حیات کی کوئی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ زندہ رود نے اس کمی کو احسن طریق سے پورا کر دیا ہے اس میں صرف ان کی زندگی کے حالات ہی نہیں ان کے افکار اور نظریات کے بتدریج ارتقا کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ میں کوئی نقاد نہیں لیکن اقبالیات کے ایک قاری کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ کے سوانح حیات پر یہ کتاب حرفِ آخر سمجھی جائے گی۔"

اس ابتدائی تمہید کے بعد شیخ اعجاز کہتے ہیں کہ انہوں نے جسٹس جاوید اقبال کو لکھا کہ وہ اقبال اور احمدیت کے بارے میں صحیح صورت حال پیش کرنا چاہتے ہیں جس پر جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے انہیں لکھا کہ وہ اقبال اور احمدیت کے موضوع پر ایک مفصل نوٹ بھیج دیں تو وہ اختلاف کے باوجود اسے شائع کر دیں گے چنانچہ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے وہ نوٹ کتاب میں شامل کر دیا جو زندہ رود کی جلد سوم کے بیسویں باب میں شامل ہے۔ جسٹس جاوید اقبال کی طرف سے ان کے نوٹ کی قبولیت پر شیخ صاحب نے اظہار انبساط کیا ہے۔ اور اسے جاوید اقبال کی طرف سے اعلیٰ اخلاقی نسل کی مثال قرار دے کر کہا ہے کہ ان کا اگلا باب اسی کے ترمیم و اضافے پر مشتمل ہے۔ مختصراً زندہ رود اور اقبال اور احمدیت کے ابواب میں شیخ صاحب نے بنیادی طور پر جو باتیں کی ہیں۔ ان کا جواب مفصل طور پر جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب زندہ رود کی جلد سوم میں دے کر یہ قرض چکا دیا ہے۔ یہاں ہم قارئین کے استفادے کے لیے مختصراً اس بحث کا تذکرہ کرتے ہیں۔ شیخ صاحب کا بنیادی موقف یوں ہے کہ:

۱۔ ۱۹۳۵ء سے قبل احمدیت کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے سخت اختلاف کے باوجود چچا جان احمدیوں کو قطع نظر ان کے عقائد کے مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ سمجھتے تھے اور جماعت احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیتے تھے۔

۲۔ "اپنی حیات کے آخری تین چار سالوں میں چچا جان نے احمدیت کے خلاف جو محاذ کھڑا کیا اس کی ابتدا اسی ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ بیان کا ماحصل یہ تھا کہ چونکہ احمدی سرکار دو عالمؐ کے بعد ختم نبوت کے قائل نہیں اس لیے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس جماعت کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس مطالبہ پر سٹیٹس مین میں اس پر تنقید ہوئی اور نہرو نے رسالہ ماڈرن ریویو کلکتہ میں تنقیدی مضامین شائع کیے۔

۳۔ "معلوم ہوتا ہے ان مضامین سے علامہ اور برافروختہ ہوئے نہرو کی تنقید سے انہیں احمدی کانگریسی سیاسی گٹھ جوڑ کا شبہ ہوا جو بے بنیاد تھا۔ انہوں نے ایڈیٹر سٹیٹس مین کے اداریے کے جواب میں ان کو ایک خط لکھا (۲۲) اور پنڈت نہرو کے جواب میں بھی ایک مفصل وضاحتی بیان میں اپنے پہلے بیان کا اعادہ

گیا (۳۰) ان سب تحریروں کا لب لباب وہی ہے جو پہلے بیان کیا گیا ہے:

۴۰۔ "احمدیوں کے متعلق ان کے تکفیری بیانات کو مسلمانوں کے سنجیدہ حلقوں میں بھی تعجب سے پڑھا گیا۔ اوّل اس لیے کہ علامہ جانا ن ملاؤں کے شغل تکفیر بازی کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ خود بھی اس اوچھے اور کثرت استعمال سے کند شدہ ہتھیار سے گھائل ہو چکے تھے۔ دوسرے اس لیے کہ احمدیوں کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے اختلاف کے باوجود علامہ عمر بھر اپنے قول و فعل سے احمدیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کرتے تھے اور مئی ۱۹۳۵ء سے قبل انہوں نے کبھی احمدیت کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس وقت تک بانی سلسلہ احمدیہ اور ان کے دو جانشینوں کے متعلق ان کی رائے عقیدت مندانہ رہی تھی۔"

قادیانیت کے خلاف اقبال کا تاریخی معرکہ

اس کے بعد شیخ صاحب علامہ اقبال کے ۱۹۳۵ء کے قبل کے رویے کو زیر بحث لاتے ہوئے متعدد مثالیں دیتے ہیں جن سے علامہ اقبال کے قادیانی جماعت کے بانی حکیم نور الدین، بشیر الدین محمود وغیرہم سے ملاقاتوں تعلقات کا ذکر ہے۔ کہ اگر اقبال کو شکایت ہوتی تو وہ ایسا کیوں کرتے۔ اقبال سے بھی اس قسم کا سوال کیا گیا کہ پہلے تو آپ قادیانیت کی کسی نہ کسی پہلو سے تعریف کرتے تھے مگر اب آپ کا رویہ کیوں تبدیل ہو گیا ہے۔ آپ کے خیالات میں تناقص کیوں ہے چنانچہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر کے حوالے سے اقبال نے جو جواب دیا وہ یوں ہے:

"مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر بزبان اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی۔ اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ بانی تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ "براہین احمدیہ" میں انہوں نے بیش قیمت مدد پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہیئے تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر کے شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانی تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت ——— بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ؐ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویے میں کوئی تناقص ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔"

یہاں شیخ صاحب سے صرف اس قدر کہنا ہے کہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف محاذ کھڑا نہیں کیا بلکہ اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان کا سوشل بائیکاٹ کر کے اور ان کے نماز و جنازہ میں شرکت سے انکار سے قادیانیت

نے تمام مسلمانانِ امت کے خلاف محاذ کھڑا کیا۔ اگر وہ پوری امتِ مسلمہ کو اپنے عقائد کی رو سے کافر کہہ سکتے ہیں یا تقیہ کر کے کافر نہیں کہتے صرف دل سے سمجھتے ہیں تو جمہور مسلمانوں اور ان کے ایک ممتاز قومی اور سیاسی لیڈر کی طرف سے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبہ پر کس اخلاقی اصول کے تحت سیخ پا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے قادیانیوں سے خود کو نہیں کاٹا بلکہ قادیانیوں نے خود کو مسلمانوں سے کاٹ کر خود کو کافر کہلوانے اور غیر مسلم اقلیت بننے کی راہ ہموار کی ہے۔ اس کے باوجود شیخ صاحب تصویر کا یہ رُخ دکھاتے ہیں کہ اقبال نے قادیانی جماعت سے بہتری کی توقعات بھی رکھیں اور بعض مواقع پر ستائش بھی کی مگر اس طرف نہیں آتے کہ جماعتِ احمدیہ سے اقبال کے وہ اختلاف کیا تھے جنہیں شیخ صاحب خود سخت اختلافات کہتے ہیں اور نہ وہ ان اختلافات کا ذکر کرتے ہیں جو ۱۹۰۱ء کے مرزا قادیان کے دعویٰ نبوت کے بعد اقبال کے ہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جس کا اظہار اقبال نے ۱۹۰۲ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں اس شعر سے کیا:

اے کہ بعد از نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک

بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفان کردہ[۵]

پھر ۱۹۱۴ء میں انہوں نے ایک بیان دیا کہ:

"جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہے جس کا انکار مستلزم کفر ہو وہ خارج از اسلام ہوگا اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"[۶]

اس سے صاف مترشح ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اور کافر سمجھنے کا اقبال کا رویہ ۱۹۳۵ء میں سامنے نہیں آیا۔ بلکہ وہ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۱۴ء یعنی ایک تواتر کے ساتھ اس مسئلہ کا سنجیدگی سے نوٹس لے رہے تھے اور اس جماعت کے عقاید کو اسلام کے منافی تصور کرتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں ہی جب مرزا قادیان کی بیعت کا پیغام آیا تو انہوں نے مئی ۱۹۰۲ء کے مخزن اور ۱۱ جون کے محمد دین فوق کے پنجہ فولاد میں نظم کے شائع کرائی جس میں قادیانی مذہب کے نتائج کا تجزیہ کیا۔

ترجمائی پر جان دیتا ہے

وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے

اس عبادت کو کیا سراہوں میں

مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے

اور آنسو بہا رہا ہوں میں[۷]

اس میں قادیانیت کی طرف سے منافرت، بھائی بھائی میں تفریق اور مرزا قادیان کی طرف سے دوسروں کے بارے موت کی پیش گوئیوں پہ تنقید کی گئی ہے اور ان کے رویہ کو غیر پیغمبرانہ بتایا گیا ہے۔ یہ شیخ صاحب کے اس خیال کا جواب ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء سے قبل قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے تھے۔

جملہ معترضہ کے طور پر ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے گرچہ ۱۹۰۱ء میں دعویٰ نبوت کر دیا تھا مگر وہ پوری جرأت کے ساتھ کبھی بھی اس پہ قائم نہ رہا۔ کبھی خود کو مسیح موعود، کبھی مہدی، کبھی مصلح، کبھی ظلی نبی، کبھی بروزی نبی یعنی کبھی کچھ اور کبھی کچھ کے ڈھول میں بلکتا رہا تاکہ وہ ہر موقع پر حسبِ منشا اس کی تاویل کر سکے۔ خود نور الدین نے مرزا قادیان کو کبھی نبی تسلیم نہ کیا بلکہ اسے دعویٰ نبوت سے کسی حد تک باز رکھنے کی کوشش بھی کی خود حکیم نور الدین نے اپنے عہدِ خلافت میں کبھی مرزا قادیان کو نبی نہ کہا اور نہ مانا یہ مرزا غلام احمد قادیانی کا بیٹا بشیر الدین محمود تھا جس نے حکیم نور الدین کی وفات کے بعد خلیفہ بنتے ہی اپنے باپ کی نبوت کو منوانا شروع کر دیا اور

چلا مرزا قادیانی (بشیر الدین محمود) کے ہاتھوں "پکا نبی" بن گیا ورنہ وہ تو ساری عمر مختلف اور متضاد دعووں کے درمیان ہی گھرا رہا۔ اس کے باوجود ۱۹۰۰ء میں جب علامہ کے کان میں اس جھوٹی نبوت کی بھنک پڑی تو انہوں نے مشرک فی النبوت کہہ کر اس کا فوری نوٹس لیا۔ پھر بلاشک ۱۹۱۱ء میں اس اعتراف کے باوجود کہ قادیانیوں نے "ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ" بننے کی سعی کی ہے محض دعویٰ نبوت کی بنا پر انہیں ۱۹۱۴ء میں اپنے بیان کے ذریعے اسلام سے خارج کہا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء تک قادیانیت جس طرح عمرانی، تہذیبی اور سیاسی قوت بننے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ اس کے ممکنہ نتائج کو محسوس کر کے اقبال نے اسے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر دیا۔

کشمیر اور پنجاب کو قادیانی صوبہ بنانے کی سازش

جہاں تک شیخ صاحب کے دوسرے نکتہ کا تعلق ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی حیات کے آخری سالوں میں قادیانیت کے خلاف محاذ کھڑا کیا۔ وہ یوں غلط ہے کہ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۱۴ء میں وہ قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ اور ۱۹۰۱ء میں مرزا قادیان کے دعویٰ نبوت کو انہوں نے شرک فی النبوت قرار دیا اور ۱۹۱۴ء میں اپنے بیان میں واضح کر دیا کہ اگر قادیانی جماعت نبی اکرم کے بعد نبوت کی قائل ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ ۱۹۳۵ء میں علامہ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیوں کیا۔ اس کی وجہ شیخ صاحب سیاسی تصور کرتے ہیں۔ تو وہ حق بجانب ہیں اس لیے کہ ۱۹۳۵ء میں صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب ہونا تھا اور مرکزی اسمبلی کا انتخاب ان ہی صوبائی اسمبلیوں سے ہونا تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ فضل حسین اور ظفر اللہ خان کے گٹھ جوڑ سے یہ خدشہ تھا کہ ان انتخابات کے نتیجے میں درپردہ قادیانی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں نہ پہنچ جائیں۔ اور اپنے ناموں سے جمہور مسلمانوں کو دھوکہ دے کر کانگریس کے ہاتھ میں مسلمانوں کے مفادات فروخت نہ کر دیں۔ اور قادیانی انگریز اور کانگریس کے ساتھ مل کر علیحدہ وطن کے منصوبے کو سبوتاژ نہ کر دیں۔ یہ خدشہ تھا جس کی بنا پر اقبال چاہتے تھے کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قبل مسلمانوں کی وحدت کے اندر نقب لگانے والی جماعت کو غیر مسلم قرار دے کر بے نقاب کر دیا جائے۔

جہاں تک قادیانیت کی طرف سے ظفر اللہ خاں کو برصغیر کی سیاست میں فیصلہ کن لیڈر بنانے کی سازش اور احراریوں کا معاملہ ہے شیخ اعجاز نے اپنی کتاب میں جس اقبال کی تصویر ہمیں خود دکھائی ہے وہ اتنا کم ظرف نہ ہو سکتا تھا ظفر اللہ خاں کی وائسرائے کی کونسل کی ممبری پر اتنا شدید فیصلہ کرتا تاہم اصل بات یہی ہے مگر ذرا ایک دوسرے رخ سے جس طرح قادیانی سر فضل حسین سے اپنے مراسم کے ذریعے ظفر اللہ خاں کو برصغیر کی سیاست میں کاشت کر رہے تھے اور من حیث الجماعت سر فضل حسین سے مسلمانوں کے مفادات کے منافی فیصلے کروا رہے تھے اور ظفر اللہ خاں جیسے استحقاق نہ رکھنے والے شخص کی پشت پناہی کر کے اس کی لیڈری کو معتبر بنا رہے تھے اور اسے جس طرح انہوں نے سر فضل حسین کے ذریعے وائسرائے کی کونسل تک پہنچایا اقبال کے لیے یہ تجربہ بھی بڑا تلخ تھا۔ وہ اس سارے ڈرامے کے عینی شاہد تھے کہ قادیانی پہلے کشمیر کو کشمیر کمیٹی کے ذریعے قادیانے اور پھر مسلم لیگ کی صدارت کے ذریعے جس کا نوٹس دہلی کے مسلمانوں نے بروقت لیا اور اس میں ناکامی کے بعد قادیانی یونینسٹ پارٹی اور سر فضل حسین کے توسط سے پنجاب کو قادیانی صوبہ بنانے کا جتن کر رہے تھے۔ اقبال اس سے قبل پنجاب کو سکھوں کے پاؤں تلے روندا جاتا دیکھ چکے تھے۔ اب وہ قادیانیوں کے نرغے میں پنجاب کو آتا دیکھ کر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے خواہشمند تھے اسی پس منظر میں انہوں نے یہ ۱۹۳۵ء والا بیان دیا۔ شیخ اعجاز اس پس منظر میں دیکھیں کہ فوری وجہ ظفر اللہ خاں کی ممبری نہیں تھی بلکہ

۱۹۳۵ء میں پنجاب کی سیاسی صورت حال کا یہ تقاضا تھا جو انہوں نے کمال جرأت کے ساتھ پورا کیا۔ جہاں تک احراریوں کے کہنے پر علامہ کے قادیانیوں کے خلاف محاذ آرا ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اقبال پنجاب کی سیاست اور قادیانیت کی پیدائش اور ارتقا کے احراریوں سے زیادہ باخبر اور عینی شاہد تھے لہٰذا وہ خود یہ فیصلہ کر سکتے تھے کہ انہیں کب اور کس وقت اس فتنے پر وار کرنا ہے چنانچہ پنجاب اور برصغیر کی سیاست کے نہایت اہم مرحلے پر انہوں نے از خود براہ راست اقدام کیا۔ لہٰذا احراریوں کے کہنے پر اقبال کے اس فیصلے کو محمول کرنا سراسر جھوٹ ہے۔ اقبال اگر کانگرس سے احراریوں کے تعلق کی مخالفت کرتے ہوئے ان کے دباؤ میں نہ آئے تو قادیانیت کے سلسلے میں وہ دباؤ میں کس طرح آ سکتے تھے؟ پھر اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ احراریوں کے کہنے پر انہوں نے ایسا کیا تو کیا برا کیا، اگر ایک صائب فیصلے تک پہنچنے میں انہیں احراریوں سے مدد یا راہنمائی ملی تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ان کا یہ فیصلہ اپنے تناظر میں درست تھا یا نہیں۔ اگر قادیانیت کو ۱۹۳۵ء میں علامہ کے کہنے پر غیر مسلم قرار دیا جاتا تو یہ فتنہ اسی وقت مر سکتا تھا۔ بہرحال جمہور علما کی قادیانیت کے خلاف جنگ میں اقبال نے جمہور علما اور مسلمانوں کے حق میں وزن ڈال کر مسلمانوں کو توانائی بخشی جس کے نتیجے میں ایک طویل محاذ آرائی کے بعد ۱۹۷۴ء میں آخر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دلوا کر اہل پاکستان نے علمائے اسلام اور اقبال کے خواب کو اسی طرح تکمیل تک پہنچایا جس طرح ایک علیحدہ وطن کے انکے خواب کو تعبیر بخشی تھی۔ حالانکہ افسوس اس وقت ہوتا اگر اقبال قادیانیوں کے بارے میں اس واضح موقف کا اظہار نہ کرتے۔

کچھ خاندانِ اقبال کے بارے میں

شیخ اعجاز احمد نے اپنے دادا دادی اور والد کے قادیانی ہونے پر تو اصرار کیا ہے مگر ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر نظیر صوفی کے اس بیان کی تردید نہیں کی کہ خود شیخ اعجاز کی اپنی اولاد بھی جو دو بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل ہے قادیانی نہیں بلکہ خدا کے فضل سے مسلمان ہے۔

"ان کی (شیخ اعجاز احمد) کی اولاد جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے میں سے کوئی بھی ان کے عقیدے یا مسلک کا حامی نہیں بلکہ ختم نبوت کے مسئلہ پر ان سب کا موقف وہی ہے جو عام مسلمانوں کا موقف ہے"

خود اقبال کی رائے بھی شیخ اعجاز کے بارے میں اچھی نہ رہی تھی۔ سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:

"شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں؟"

اب شیخ صاحب خود علامہ کی نظروں میں اپنے عقاید کے لحاظ سے کس قدر معتبر تھے وہ واضح ہے۔ اسی طرح ان کا اپنے دادا، دادی اور والد پر قادیانیت کا بہتان بھی واضح ہے۔ شیخ عطا محمد اقبال کے بڑے بھائی کچھ عرصہ قادیانیت کے دام فریب میں ضرور اسیر رہے مگر علامہ اقبال کی مسلسل صحبت سے بالآخر انہوں نے ان کے بیٹے مختار احمد اور بیٹیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم نے بھی احمدیت کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا ایک ثبوت ان کی قبروں کا مسلمانوں کے قبرستان میں ہونا اور ان کی نماز جنازہ کا مسلمانوں کی طرف سے پڑھا جانا ہے۔ شیخ اعجاز احمد نے محض ان کے عقائد کو مشکوک بنانے کے لیے ان کی اپنے احمدی دوستوں کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی اور غیر قادیانیوں کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کے قادیانی حکم کا بھی بطلان کیا۔ اس پر پہلی گواہی تو ہم نے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی فراہم کی ہے تو دوسری گواہی شیخ عطا محمد کے داماد ڈاکٹر نظیر صوفی کی دیتے ہیں جن کے شیخ اعجاز احمد سالے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ کہنا کہ علامہ کے خاندان کے کئی افراد نے میرزائیت قبول کر لی تھی سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت علامہ کے

والد، والدہ، چچا، چچی، بہنیں، بھائی اور ان کی اولادیں سب ہی سنی مسلمان تھے اور ہیں سوائے ایک بھتیجے کے جو کہ ججی میں ترقی کے لیے چوہدری ظفر اللہ کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں سے اکلوتا "قادیانی" بن گیا ہے۔[11]

اس کی گواہی حکیم عبدالرحمٰن جوہر نے بھی ایک نجی ملاقات میں دی۔ حکیم صاحب اس وقت حیات ہیں۔ شام نگر میں اب بھی مطب کرتے ہیں اس سے قبل وہ علامہ اقبال کے محلے میں مطب کرتے تھے۔ وہ شیخ اعجاز احمد کے ہمعصر اور بچپن کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے راقم کو بتایا کہ شیخ اعجاز چوہدری ظفر اللہ کا پروردہ ہے اور نوکری کے لالچ میں دین سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ڈاکٹر نذیر صوفی کے مطابق:

"علامہ کے برادر بزرگ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو فوت ہوئے ان کا جنازہ حسب وصیت سنی مسلمانوں نے اٹھایا۔ یہ وصیت انہوں نے دوران بیماری مجھ سے کی تھی۔ ...... ان کی نماز جنازہ بھی حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم امام مسجد جہانگیری نے پڑھائی اور وہ حضرت امام صاحب سے ملحق قبرستان میں سالوں پہلے خود بنوائی ہوئی پختہ قبر میں دفن کیے گئے۔"[12]

شیخ اعجاز کی والدہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"علامہ کے اس اکلوتے قادیانی بھتیجے نے حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم کے پیچھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی والدہ کا جنازہ پڑھا۔ وہ اپنے والد مرحوم و مغفور کے جنازہ پر مسلمانوں سے علیحدہ کھڑے رہنے کا تلخ تجربہ کر چکے تھے۔ اس لیے قادیانی مسلک کو دہرانے کی ہمت نہ ہوئی۔"[13]

یہ دو واضح شہادتیں اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ اقبال کے والد، ان کے بھائی، ان کی والدہ، ان کی بہنیں حتیٰ کہ شیخ صاحب کے بھائیوں، بہنوں اور اولاد کا بھی قادیانیت سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ قادیانیت صرف شیخ اعجاز نے قبول کی اور بقول ان کے وہ اس پر اب بھی قائم ہیں۔ جبکہ خاندانِ اقبال سے اگر کبھی کوئی ہمدردی بھی رکھتا تھا تو اس نے اس سے اپنا دامن چھڑا لیا۔

تاریخ پیدائش کا معاملہ

ایسا ہی نازک معاملہ اقبال کی تاریخ پیدائش کا بھی ہے جو شیخ اعجاز احمد نے دوبارہ اٹھایا ہے اور اس کے لیے دلائل فراہم کیے ہیں کہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء علامہ کی صحیح تاریخ پیدائش ہے۔ اب چونکہ سرکاری طور پر یہ طے پا چکا ہے کہ علامہ کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے تو اس مسئلے کو بار بار چھیڑنا درست نہیں اور سرکاری اعلان کردہ تاریخ کو ہی درست سمجھنا صائب ہے کیونکہ بار بار اس مسئلہ کو اٹھانا قومی مفاد کے منافی ہے۔ جبکہ سچی بات تو یہ ہے کہ خود علامہ اقبال کو بھی اپنی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہ تھی۔ ورنہ وہ کیمبرج سے اپنے والد کو خط نہ لکھتے۔ ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں ساری باتیں ہی تخمینے ہیں۔ دلائل کے اعتبار سے ڈاکٹر نذیر صوفی کے بیان کو دیکھا جائے تو وہ بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر صوفی کا یہ کہنا بھی غلط معلوم نہیں ہوتا کہ چند سیاسی مصالح کے تحت ۱۸۷۷ء کی تاریخ مقرر کی گئی اس لیے کہ جب صد سالہ جشن اقبال منانے کا فیصلہ کیا گیا تھا تو اس وقت ۱۹۷۳ء تو گزر چکا تھا یا گزر رہا تھا اور صد سالہ جشن اس سال منانا ممکن نہ تھا۔ صوفی نذیر کے دلائل ان کی کتاب حیات و پیام اقبال میں موجود ہیں۔ جنہیں ایک نظر دیکھ لینا بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ تاہم قومی مصالح کے تحت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی تاریخ کو قبول کر لینا اب

واحد چارہ کار ہے۔ اس پر مفصل بحث زندہ رود باب ۳ میں تاریخ ولادت کا مسئلہ کے تحت کی گئی ہے جس میں جسٹس جاوید اقبال نے تمام ہی تواریخ پیدائش کے تجزیے کے بعد اپنی رائے بھی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے پلڑے میں ڈالی ہے اب تو یہی درست تصور کی جانی چاہیے۔

اقبال اور تفضیل علیؓ

شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب کا باب ۱۰ اس عنوان سے لکھا ہے کہ کیا علامہ اقبال تفضیلی عقیدہ رکھتے تھے جس طرح شیخ صاحب نے اقبال کو قادیانیت کے ساتھ باندھنے کی کوشش کی ہے اسی طرح کچھ لوگ انہیں تفضیلی کہہ کر شیعہ بنانے پر بھی تلے رہتے تھے۔ تاہم شکر ہے کہ شیخ اعجاز نے اس تفضیلیت کا جواب خود ہی فراہم کر دیا ہے کہ اقبال اہل بیت سے دلی محبت رکھتے تھے۔ دراصل اقبال حضرت علیؓ کی شخصیت، ان کے علمی فضائل اور حضورؐ سے نسبت کے قائل ضرور تھے مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ پر بہ مرتبے میں اور بہ خلافت میں فضیلت کے قائل تھے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں ان کی رائے اس شعر سے ثابت ہوتی ہے:

ہمت او کشت ملت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر[۱۴]
اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار[۱۵]

جس کے بعد یہ واضح ہے کہ وہ خلافت کے مسئلہ پر حضرت ابوبکر صدیق کی فضیلت کے ہی قائل تھے۔ وہ انہیں ثانی اسلام کہتے تھے یعنی حضورؐ کے بعد ان کو سب سے افضل مانتے تھے

مظلوم اقبال میں ۱۰۳ خطوط

شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب مظلوم اقبال میں ۱۰۳ خطوط شائع کیے ہیں جن میں سے بیشتر شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اقبال کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بعض خطوط کے اہم حصے کاٹ دیئے ہیں۔ اب جب کہ اقبال کی ازدواجی زندگی کوئی سربستہ راز نہیں رہی اور سب جانتے ہیں کہ آفتاب اقبال کے ایما پر اقبال کی پہلی بیویؒ کتاب لکھی گئی جس میں والدہ آفتاب اور اقبال کے کشیدہ تعلقات کے حوالے سے اقبال کو مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ پھر جسٹس جاوید اقبال اور خالد نظیر صوفی اور ڈاکٹر نظیر صوفی کے ان معاملات کو کھول کر بیان کرنے کے بعد کوئی ایسی پوشیدہ بات نہیں رہی جس کا اخفا ضروری تھا۔ شیخ صاحب کو اقبال کے خطوط مکمل طور پر شائع کرنے چاہیئیں تھے ان کو خطوط کی قطع و برید کا حق نہ تھا کہ اس سے اب یہ کنفیوژن پیدا ہوا ہے کہ آخر وہ کون سی بات تھی جو شیخ صاحب کو چھپانا مطلوب تھی۔ یہ خط مکمل طور پر شائع کر کے حقائق کو اس کے تناظر میں سمجھنے سمجھانے کا موقع دینا واجب تھا۔ تاہم شیخ صاحب کے ایسا کرنے سے جو خطوط سامنے آئے ہیں ان میں کچھ پتہ نہیں کہ انہوں نے کیا رہنے دیا اور کیا کاٹ دیا؟ پھر ان سب خطوط کی اگر عکسی نقول بھی شائع کی جاتیں تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اب ہر قاری کے لیے ان خطوط کی تصدیق کے لیے علامہ اقبال میوزیم کراچی جانا تو ممکن نہیں عکسی نقول کی مدد سے وہ ان عبارتوں کی تصدیق تو کر سکتا تھا جو شیخ صاحب نے نقل کی ہیں۔ تاہم

سوائے چند ایک خطوط کے اکثر نجی اور ذاتی نوعیت کے ہیں جن کا تعلق گھریلو خیر و عافیت سے ہے۔ کچھ خطوط میں شیخ اعجاز کا ذکر ہے۔ کچھ ان کے نام ہیں جن میں ان کی تعلیم ان کی اولاد کے نام رکھنے وغیرہ طرز کی باتیں ہیں۔ کچھ شیخ عطا محمد کے نام ہیں جس میں شیخ اعجاز کے بارے میں اطلاعات ہیں۔ کچھ انگلستان میں گول میز کانفرنس کی یاد کے ہیں۔ ایک خط میں ۱۹۱۹ء کے پنجاب میں مارشل لا کا ضمناً تذکرہ ہے کچھ علامہ کے والد کی بیماری اور دیگر گھریلو مصروفیات کا ذکر ہے یوں یہ خط اس لحاظ سے تو اہم ہیں کہ یہ علامہ اقبال کے ہیں اور ان کی خاندانی زندگی اور ان کی مصروفیات کا پتہ دیتے ہیں تاہم یہ خط ملک کی سیاسی صورت حال، مسلمانوں کے مستقبل یا کسی دقیق علمی، ادبی، شعری یا فکری مسئلے پر روشنی نہیں ڈالتے۔ ان خطوط کا محور کیونکہ خود شیخ اعجاز کی ذات ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں پورے اہتمام کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔ تاہم یہ بات پھر اہم ہے کہ اس کتاب کے توسط سے علامہ کے خطوط اقبال شناسوں کو پڑھنے کو ملے یہی اس کتاب کا اصل سرمایہ ہے جو شیخ اعجاز احمد نے اقبال شناسوں کو دیا ہے۔

حواشی

۱۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال — زندہ رود جلد اول — شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ بار اول
شجرہ نسب کا آغاز میں چارٹ
۲۔ سلیم احمد — اقبال ایک شاعر — نقش اول کتاب گھر لاہور ۱۳۹۸ھ — ص ۱۱۹
۳۔ شیخ اعجاز احمد — مظلوم اقبال — کراچی ۱۹۸۵ء — ص ص ۱۷۶/۱۷۷
۴۔ شیخ اعجاز احمد — مظلوم اقبال — کراچی ۱۹۸۵ء — ص ۱۸۳
۵۔ بشیر احمد ڈار — اقبال اور احمدیت — آئینہ ادب۔ لاہور — ص ص ۵۸، ۵۹
۶۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال — زندہ رود جلد سوم — شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۴ء — ص ۵۷۱
۷۔ محمد رفیق افضل — گفتار اقبال — ص ۴۲
۸۔ غلام رسول مہر (مرتبہ) — سرود رفتہ — ص ۳۰
۹۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال — زندہ رود جلد سوم — ص ۵۷۱
۱۰۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال — " — ص ۵۷۰
۱۱۔ ڈاکٹر نظیر صوفی — حیات و پیام اقبال — ص ۹۱
۱۲۔ ایضاً — ایضاً — ص ۹۰/۹۱
۱۳۔ ایضاً — ایضاً — ص ۹۰
۱۴۔ شیخ اعجاز احمد — مظلوم اقبال — ص ۱۴۲
۱۵۔ علامہ محمد اقبال — بانگ درا — شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور — ص ۲۲۴

تبصرہ لکھنے کے دوران مندرجہ ذیل کتب بھی جزوی طور پر زیر مطالعہ رہیں

۱۔ قادیانی مذہب — الیاس برنی — شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور بار ششم
۲۔ قادیانی قول و فعل — الیاس برنی — ۱۳۵۶ھ شیروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ
۳۔ ذکر اقبال — عبدالمجید سالک — بزم اقبال لاہور مئی ۱۹۸۳ء
۴۔ سرگزشت اقبال — ڈاکٹر عبدالسلام خورشید — اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء
۵۔ قادیانیت (مطالعہ و جائزہ) مولانا ابوالحسن ندوی — ادارہ نشریات اسلام لاہور ۱۹۶۶ء طبع دوم
۶۔ تحدیث نعمت — چودھری ظفراللہ خاں کی خود نوشت سوانح
۷۔ روایات اقبال — عبداللہ چغتائی — اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء
۸۔ فضل حسین ۔ ایک سیاسی بیاگرافی — عظیم حسین — انگلش
۹۔ براہین احمدیہ جلد اول ۔ غلام احمد قادیانی

وحید عشرت

قصہ ایک خط کا

اقبالیات جولائی ۱۹۸۶ء میں علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی کتاب 'مظلوم اقبال' پر تبصرہ شائع کیا گیا تھا جس میں ان حالات و واقعات کا ذکر کیا گیا تھا جن کے نتیجے میں علامہ اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ قادیانی چونکہ خود اپنے سوا جمہور مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں اور وہ انگریز اور ہنود کے ساتھ مل کر ایسی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں جن سے مسلمانوں کا اجتماعی تشخص اور مفاد خطرے میں ہے۔ لہٰذا ان کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے کر مسلمانوں کو اس فتنے سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ شیخ اعجاز نے کتاب میں عجیب منطق استعمال کی تھی ان کے بیان کے مطابق علامہ اقبال تھے تو نابغہ اور عبقری مگر انہوں نے احراریوں کے کہنے پر ۱۹۳۵ء میں قادیانیت کے خلاف اپنا لب و لہجہ، بہلاوے میں آکر، سخت کر لیا تھا۔ نیز ان کے بیشتر عزیز و اقارب بھی قادیانی تھے اور خود اقبال بھی قادیانیت کے لیے ایک عرصے تک نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اور وہ چند شدید اختلافات کے باوجود بھی قادیانیوں کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔

ہم نے اپنے تبصرے میں شیخ اعجاز کی اس صریح غلط بیانی اور اقبال پر بہتان کا پردہ چاک کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ علامہ اقبال ۱۹۰۲ء سے لے کر ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۵ء تک قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کرتے چلے آرہے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں دستور جدید کے تحت چونکہ عام انتخابات ہونے والے تھے چنانچہ ڈر تھا کہ مسلمانوں کے بھیس میں قادیانی اسمبلیوں میں پہنچ کر مسلمانوں کے علیحدہ آزاد وطن کی تحریک کو سبوتاژ نہ کر دیں لہٰذا انہوں نے کھل کر سیاسی بنیادوں پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیے جانے کا مطالبہ کیا ہم نے یہ بھی بتایا کہ علامہ اقبال کے اعزہ میں شیخ اعجاز ہی چودھری ظفر اللہ کی طرف سے دیے گئے سب جج کے لالچ کے تحت قادیانی ہوئے تھے۔ خود علامہ اقبال انہیں صالح تصور کرتے تھے مگر ان کے قادیانی عقائد کی وجہ سے انہیں ناپسند کرنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اقبال نے انہیں اپنے بچوں کی گارڈین شپ سے بھی خارج کرنے کا فیصلہ کر لیا

ان کی جگہ سر راس مسعود کو لانا چاہا۔ اور سر راس مسعود کے نام خط میں شیخ اعجاز کے عقائد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ہمارے اس بیان پر پہلا تبصرہ تو خود شیخ اعجاز احمد صاحب نے کیا کہ آپ کے موقر مجلہ میں مظلوم اقبال کا ذکر بھی سرسری سا کیا گیا جبکہ متعدد دوسرے اصحاب نے ہم سے شیخ اعجاز صاحب کے بارے میں علامہ اقبال کے سر راس مسعود کے نام خط کا حوالہ طلب کیا۔ ہم نے اس سلسلے میں اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ دیکھا تو ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ اقبال نامہ کے ایک ہی ایڈیشن کے دو نسخوں کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ اس خط میں دانستہ تحریف کا یقین نہ کرنا حماقت ہے۔ خود ہم نے زندہ رود جلد سوم سے یہ حوالہ لیا تھا اور زندہ رود کے فاضل مصنف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے ڈاکٹر اخلاق اثر کے مرتبہ اقبال نامے کا حوالہ دیا تھا۔ ہم نے اس سلسلے میں بھوپال میں ڈاکٹر اخلاق اثر سے مراسلت کی انہوں نے فرمایا کہ علامہ کا یہ خط جس کا عکس ان کی کتاب "اقبال اور ممنون حسن خان" میں بھی موجود ہے، اقبال نامے میں اصل خط کی عبارت کا بھی ایک حصہ چھوٹ گیا تھا۔ جو اقبال نامے کے اس نسخے میں جو انہوں نے مجھے بھجوایا ہے انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ اس خط میں تحریفات کے پیش نظر ایک بات پوری طرح عیاں ہے کہ ان تحریفات کے پیچھے کوئی طاقت ور ہاتھ کام کرتا رہا ہے۔ اور اس کا مقصد علامہ اقبال کی شیخ اعجاز اور ان کے مذہب کے بارے میں رائے کو چھپانا ہے۔ ہم اس مختصر سے مضمون میں اس خط کے حوالے سے چند معروضات پیش کرتے ہیں۔

اس خط کے بارے میں "مظلوم اقبال" کے صفحہ ۳۲۳ سے ۳۲۹ تک شیخ اعجاز احمد کے مباحث بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ ان کے بقول یہ خط انہیں ۵۲ سال بعد یعنی ۱۹۷۳ء میں سر راس مسعود کے نام خطوط میں پڑھنے کو ملا جو علامہ نے ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کو سر راس مسعود کو لکھا تھا۔ شیخ اعجاز کے بقول:

> "یہ خط اور سید صاحب موصوف کے نام کئی اور خطوط صہبا لکھنوی مدیر "افکار" کراچی کی مرتبہ کتاب "اقبال اور بھوپال" میں شائع ہوئے جسے اقبال اکادمی نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ ۱۰ جون والے اس خط کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنا ضروری ہے۔ شاید قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو۔ چونکہ ان کے بہت سے مکتوبات اول اول شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور نے ۱۹۴۵ء میں "اقبال نامہ" اول کے نام سے شائع کیے تھے۔ انہیں شیخ عطاء اللہ

پروفیسر علی گڑھ کالج نے مرتب کیا تھا۔ اقبال نامہ (حصہ اوّل) میں چھاپا ان کے کئی خطوط سید راس مسعود کے نام شامل ہیں جن میں ۱۰ جون ۱۹۳۷ء والا خط بھی ہے۔ اقبال نامہ ۱۹۴۵ء کا ایک نسخہ میرے پاس ہے لیکن اس میں ۱۰ جون ۱۹۳۷ء والے خط میں میرے متعلق ان کا بھتیجا اور نہایت صالح آدمی ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں نے صہبا صاحب سے دریافت کیا کہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء والا خط انہوں نے کہاں سے نقل کیا ہے ان سے یہ معلوم ہو کر تعجب ہوا کہ وہ خط اور سید راس مسعود کے نام دوسرے خطوط جو "اقبال اور بھوپال" میں شائع کیے گئے ہیں سب کے سب شیخ محمد اشرف کے اقبال نامہ حصہ اول سے نقل کیے گئے ہیں۔ اپنے بیان کی تائید میں انہوں نے "اقبال نامہ" کا وہ نسخہ مجھے دکھایا جس سے یہ سب خطوط نقل کیے گئے۔ جب اس نسخہ میں مندرج خطوط بنام سر راس مسعود کا مقابلہ ان خطوط سے کیا گیا جو میرے پاس والے نسخہ میں شامل ہیں تو مزید تعجب ہوا کیونکہ دونوں نسخے اگرچہ ۱۹۴۵ء والے پہلے ایڈیشن کے ہیں (دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی) لیکن ان میں حسب ذیل تین اختلاف ہیں:

۱۔ خط محررہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء کا کچھ حصہ میرے پاس والے نسخے میں حذف شدہ ہے۔

۲۔ خط محررہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء میرے پاس والے نسخے میں سرے سے موجود ہی نہیں۔

۳۔ خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کا کچھ حصہ جس میں میرے متعلق متذکرہ بالا کلمۂ خیر لکھا گیا ہے، میرے پاس والے نسخہ میں حذف شدہ ہے۔

اس عقدہ کو بھی شیخ اعجاز نے خود ہی کھولا ہے کہ "اقبال نامہ" میں تحریفات کی شانِ نزول کیا ہے۔ شیخ اعجاز لکھتے ہیں:

"جب صہبا صاحب نے شیخ محمد اشرف سے اس معمہ کی گرہ کشائی چاہی تو انہوں نے اپنے خط محررہ ۳ راکتوبر ۱۹۷۴ء میں یہ جواب دیا۔

مکاتیب اقبال کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ہے دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں طبع ہوا تھا جس وقت یہ

کتاب چھپ کر بازار میں آئی ۔ اس وقت چودھری محمد حسین جن کو آپ
خوب جانتے ہوں گے زندہ تھے چودھری صاحب پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ
تھے اور پیپر کنٹرولر بھی تھے میرے ان سے تعلقات بھی تھے علامہ اقبال مرحوم
نے ایک خط سر اس مسعود کو تحریر کیا ہوا تھا جو بالکل درست تھا وہ خط بھی
طبع شدہ ایڈیشن میں موجود تھا۔ چودھری صاحب پسند نہیں کرتے تھے
کہ وہ خط اس مجموعہ میں شامل ہو میں نے ہر چند ان کو سمجھانے کی کوشش
کی کہ اس خط کو حذف نہ کیا جائے مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے مجبوراً وہ
خط حذف کر دیا گیا۔ جو نسخے قبل ازیں فروخت ہو گئے ان میں وہ خط شامل
ہوگا بقایا نسخے اس خط کے بغیر ہوں گے ۔ یہ ہی فرق ہے جس کی طرف
آپ نے نشان دہی کی ہے ۔ اس خط کا عکس اب بھی میرے پاس
موجود ہے ۔ اصل خط شیخ عطاء اللہ صاحب مرحوم کے پاس موجود تھے
انہوں نے واپس نہیں کیے تھے ۔ اب غالباً ان کے صاحب زادے
مختار مسعود کے پاس موجود ہوں گے ۔ آپ نے صحیح تحریر فرمایا ہے بعض
نسخوں میں صفحات بھی کم ہیں اور عبارتیں بھی مختلف ہیں چونکہ ایک اہم اور
طویل خط حذف کر دیا گیا تھا اس وجہ سے صفحات اور عبارت میں ضرور
فرق ہونا لازمی تھا امید ہے آپ کی الجھن دور ہو گئی ہو گی۔ تکه

شیخ محمد اشرف کے صہبا لکھنوی کو اس جواب کے نقل کرنے کے بعد شیخ اعجاز نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ مختار کو جو لاہور میں رہتے تھے یہ ساری صورت حال بتائی چنانچہ شیخ مختار نے شیخ اشرف سے ملاقات کر کے اپریل ۱۹۰۵ کو اپنے بڑے بھائی شیخ اعجاز کو خط لکھا کہ:

"میں کل شیخ محمد اشرف صاحب کو ملا تھا وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں
اقبال نامہ حصہ اوّل کے بارے میں انہوں نے وہی بات بتائی جس کا
آپ نے ذکر کیا ہے انہوں نے بتایا کہ اس کتاب کی قریباً ۱۰۰ کاپیاں
جب فروخت ہو گئیں تو چودھری محمد حسین صاحب نے چند خطوں کے بعض
حصوں کو حذف کرنے کو کہا میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا سب
نے یہی کہا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے علم تھا اگر چودھری صاحب چھ ماہ کے
بعد ریٹائرڈ ہو جائیں گے چودھری صاحب اس لڑائی کے زمانے میں بیسر پکڑلے

بھی تھے اور کاغذ کا کوٹہ بھی وہی دیتے تھے۔ انہیں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔
فیصلہ کیا کہ ابھی کتاب کی فروخت بند کر دی جائے اور کسی طرح چھ ماہ گزر جائیں
ان کے ریٹائر ہونے کے بعد کتاب فروخت کریں گے۔ چودھری صاحب کو دو
سال کی ایکسٹینشن مل گئی۔ میں مجبور ہو گیا کتاب کی چار ہزار کاپیاں چھپی تھیں ان
کاپیوں میں ورق تبدیل کرنے پڑے جس میں مجھے کافی نقصان ہوا۔ انہوں
نے کہا کہ میرے پاس اب کوئی کاپی نہیں ورنہ میں آپ کو ایسا نہ کرتا۔"[۴]

شیخ اعجاز نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے سید نذیر نیازی سے بھی پوچھا جس پر سید
نذیر نیازی نے بھی تسلیم کیا کہ

"بعض (خطوط) میں چودھری صاحب مرحوم نے مصلحتاً کچھ تبدیلیاں بھی کیں ان
معنوں میں کہ جو عبارت پسند نہ آئی اسے قلم زد کر دیا۔"[۵]

شیخ اعجاز اس ساری بحث کے بعد خط میں تحریف کا سارا الزام چودھری محمد حسین پر دھرتے ہوئے
لکھتے ہیں،

"اس کی اشاعت میرے محترم شریک کار (ہم دونوں (یعنی چودھری محمد حسین
اور شیخ اعجاز) جاوید اور منیرہ کے گارڈین تھے) کی سیاست کو گوارا نہ ہوتی
اس سیاست بازی کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں۔"[۶]

شیخ اعجاز ڈاکٹر اخلاق اثر کے اقبال نامے میں "چھپنے والے ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کے خطوط کے بارے میں
لکھتے ہیں کہ شیخ عطاء اللہ کے مجموعۂ خطوط کے اس اصل خط کی بھی نقل انہوں نے پنجاب پبلک لائبریری
سے حاصل کر لی ہے جو چودھری محمد حسین کی تحریف سے بچ گیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر اخلاق اثر کے اقبالنامے
کا وہ فیصلہ اصل خط دیکھ کر ہی کر سکتے ہیں معلوم نہیں یہ اصل خط کس کے پاس ہے۔ پھر انہوں نے
اصل خط کی فوٹو کاپی دینے کی استدعا کی ہے حالانکہ اس خط کی فوٹو کاپی اقبال اور ممنون حسن
خان مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر نامی کتاب میں صفحہ ۱۵ پر موجود ہے۔ خود اقبالنامہ مرتبہ ڈاکٹر اخلاق اثر
میں بھی اس خط کا پورا متن شائع نہیں ہوا۔ جبکہ علامہ اقبال نے اس خط میں یہ بھی وضاحت کر دی
تھی کہ خود قادیانی مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں اس واسطے ان کے نزدیک یہ
امر خاص مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں۔
ہم علامہ صاحب کے اس خط کا عکس اقبال اور ممنون حسن خان مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر سے لے
کر شائع کر رہے ہیں۔ جس کے بعد ہم یہ چاہیں گے کہ شیخ اعجاز نے اس خط کے بارے میں

جو یہ عذر تراشا ہے کہ شیخ مختار مسعود اور ممنون حسن خان نے ان کے استفسارات کے جواب نہیں دیے ورنہ

• اگر اس کتاب کی طباعت سے پہلے ان میں سے کوئی ایک فوٹو کاپی مل گئی تو صورت حال عرض کر دی جائے گی۔

اب شیخ صاحب فرمائیں کہ اس عکسی نقول کی اشاعت کے بعد وہ بیچ اس معاملہ کے کیا فرماتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ساری تان اس خط کی عدم دریافت پر توڑ دی ہے۔ اس خط میں چودھری محمد حسین نے کیوں تحریف کی، شیخ محمد اشرف کیوں ان سے کسی قدرد بے رہے اور شیخ عطاء اللہ اور شیخ مختار مسعود نے اس کے بارے میں کبھی کوئی وضاحت کیوں نہیں کی۔ ایسے جواب ہیں جو ان ہی متعلقہ افراد کے لواحقین یا احباب دے سکتے ہیں مگر یہ دلچسپ حقیقت سمجھ میں نہیں آتی کہ اس پردہ زنگاری میں کون تھا جو چودھری محمد حسین کو یہ خط شائع نہ کرنے پر مجبور کر رہا تھا اور شیخ محمد اشرف نے چودھری محمد حسین کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس خط کو اپنی اصل حیثیت میں پھر کبھی شائع کرنے یا اس کے بارے میں لکھنے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی۔ پھر شیخ اعجاز کا یہ الزام کہ اقبال کی طرف سے انہیں ملنے والے صالحیت کے سرٹیفکیٹ کے اخفا سے چودھری محمد حسین نے شیخ اعجاز سے کوئی سیاست کی بھی نا قابل فہم ہے اس لیے کہ صالحیت کے اس سرٹیفکیٹ کو چھپانے کا چودھری صاحب کو کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے کہ صالحیت کے سرٹیفکیٹ سے زیادہ خطرناک بات شیخ اعجاز کے قادیانی عقائد کے حوالے سے اس خط میں موجود تھی جو ان کی صالحیت کی خوشی سے زیادہ اذیت ناک ہے اور ان کی صالحیت ان کے عقیدے کے ظاہر ہونے کے بعد بے معنی ہو جاتی ہے۔ چودھری صاحب کو شیخ اعجاز کا عقیدہ، سیاست کرتے وقت ان کی صالحیت اور گارڈین شپ کے لیے زیادہ مہلک ہتھیار کے طور پر ہاتھ آ سکتا تھا مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ لہٰذا چودھری صاحب پر شیخ اعجاز کا یہ الزام ناروا ہے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس خط کے بارے میں یہ سند کافی ہے کہ یہ خط سر راس مسعود کو لکھا گیا جو بھوپال میں اس وقت وزیر تعلیم تھے اور ممنون حسن خان ان کے سیکرٹری تھے اس امر کا اعتراف خود مظلوم اقبال ص ۳۳۸ میں موجود ہے۔ تاہم یہ سوال قارئین اقبال کے لیے حل طلب ہے کہ علامہ اقبال کے خطوط میں کتر بیونت کا حق کیا اقبال نے ان کو دیا یا انہوں نے خود ہی اپنے مفادات یا اپنی صواب دید کے تحت کی اور ان کی یہ مصلحتیں کیا تھیں خود شیخ اعجاز نے مظلوم اقبال میں خاندانی

اور ذاتی مراسلے کے پردے میں خطوطِ اقبال کی کتر بیونت کیوں کی ہے ہو سکتا ہے کہ ان خطوط میں بھی اقبال کی شخصیت کے نہایت اہم گوشے شیخ صاحب کی کرم فرمائی سے اوجھل رہ جائیں۔ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز سے سیاست کی تھی تو شیخ اعجاز نے کیا اقبال سے سیاست کی ہے؟ لیجیے ہم اس موضوع پر کچھ کہنے سے پیشتر آپ کی خدمت میں ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ خط عکسی نقل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

لاہور

ڈیئر مسعود - [illegible]

[illegible]

والسلام

محمد اقبال

یہ خط ہم نے نیچے نقل کر دیا ہے تاکہ اس کا مفہوم سمجھنے اور عبارت پڑھنے میں کسی کو کوئی دقت نہ ہو۔

لاہور

۱۰ر جون ۱۹۳۷ء

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمہیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

۲۔ چودھری محمد حسین ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

۳۔ شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔

۴۔ عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (۳) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان

کافر ہیں اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا
آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے
علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے
میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کر دوں۔ مجھے
امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور
سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا۔ تو لاہور میں رہنے والے
گارڈین تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت
ہے لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے
نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا
کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے یہ ایک تو مرہم
کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ مؤخر الذکر کے
استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

اب اس خط کا قصہ سنیے کہ تمام جگہ دوسرے سارے مضامین میں اس کی اشاعت میں سرمو فرق نہیں مگر
ہر کہیں فرق ہے تو شیخ اعجاز احمد اور قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے ریمارکس میں۔
شیخ اعجاز کہتے ہیں کہ گارڈین شپ میں ان کے حریف چودھری محمد حسین نے سیاست کرتے
ہوئے علامہ اقبال کی طرف سے ان کی صالحیت کے سرٹیفکیٹ کو دبانے کے لیے یہ تحریف کی حالانکہ
شواہد یہ ہیں کہ چودھری محمد حسین نے اس تحریف کے ذریعے شیخ اعجاز احمد کی گارڈین شپ
کو محفوظ کر دیا اور عبدالغنی مرحوم کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین شپ دینے کی اقبال کی
خواہش ظاہر کی۔ ہم اقبال نامے کی دونوں عبارتوں کا عکس دے کر اس صورت حال
کی وضاحت کرتے ہیں۔

(۲۲۹) —— (۲۴۴)

لاہور — خط نمبر ۲

۱۰ جون ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔
اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians از روئے وصیت مقرر کئے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکریٹریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے۔ ایل ایل بی۔ سب جج دہلی (۴) عبد الغنی مرحوم

عبد الغنی بیچارے کی بابت تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کردوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ IODEX اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے

والسلام

محمد اقبال

اقبال نامہ ۳۸۶ حصہ اوّل

(۲۲۹) —— (۲۴۴)

لاہور — خط نمبر ۱

۱۰ جون ۱۹۳۶ء

ڈیر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔
اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ gua dians از روئے وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکریٹریٹ لاہور یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے۔ ایل ایل بی۔ سب جج دہلی (۴) عبد الغنی مرحوم

اقبال نامہ ۳۸۷ حصہ اوّل

عبد الغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے۔ لیکن وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کردوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ Iodex اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔ والسلام

محمد اقبال

خط نمبر ۱۔ اقبال نامہ کا وہ خط ہے جو چودھری محمد حسین کی قطع و برید سے قبل شائع ہوا۔ اس میں لکیر زدہ عبارت ملاحظہ ہو اس میں مندرجہ ذیل باتیں واضح ہیں :۔

۱۔ عبدالغنی مرحوم کی جگہ میاں امیر الدین سب رجسٹرار کو مقرر کرنے کا علامہ نے ارادہ ظاہر کیا۔

۲۔ شیخ اعجاز کی جگہ سر راس مسعود کو Guardian مقرر کرنا چاہا۔

جبکہ تحریف کردہ خط نمبر ۲ میں

۱۔ عبدالغنی مرحوم کی جگہ میاں امیر الدین کے تقرر کا کوئی ذکر نہیں۔

۲۔ عبدالغنی کی جگہ سر راس مسعود کے تقرر کا مستند بنا دیا گیا ہے۔

۳۔ یوں شیخ اعجاز کی Guardian شپ کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔

یعنی چودھری محمد حسین نے تو شیخ اعجاز سے سیاست نہیں کی بلکہ شیخ اعجاز کی گارڈین شپ محفوظ کرنے کے لیے اقبال کے خط کی عبارت کو بدل دیا اور شیخ اعجاز کے متنازعہ اور ان کی Guardian شپ سے محرومی کی وجہ کو چھپا دیا ہے اور انہیں خط سے نکال کر شیخ اعجاز کی خدمت انجام دی۔ اس لیے شیخ اعجاز کو تو چودھری محمد حسین کا احسان مند ہونا چاہیے حالانکہ وہ اُلٹا گلہ کر رہے ہیں کہ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز کی متنازعہ شخصیت کو غیر متنازعہ بنا دیا۔ اس کی وجہ بچوں کی گارڈین شپ میں شیخ اعجاز کو شریک رکھنا بھی مطلوب ہو سکتا ہے کہ خاندان اقبال کے اس فرد کو کسی نہ کسی طرح گارڈین شپ میں باقی رکھا جاتے۔ تاہم نیک نیتی سے بھی کی گئی اس کتر بیونت کے اخلاق جواز کی تفہیم نہیں ہوتی۔ کہ جس چیز کو علامہ شرعاً مشتبہ سمجھتے تھے اس کو اس عبارت سے حذف کر کے مباح کرنے کی سعی کیوں کی گئی۔ اور شیخ اعجاز کے لیے یہ نرم گوشہ کیونکر پیدا کیا گیا۔

ذیل میں ہم اقبال اور بھوپال از صہبا لکھنوی میں شائع کیے گئے اس خط کا عکس شائع کر رہے ہیں۔

لاہور ۔۔۔ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء

ڈیر مسعود ۔۔۔ پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardians مقرر کیے تھے۔ یہ ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔ (۱) شیخ طاہر الدین یہ میرے کلارک ہیں جو کہ قریباً بیس سال

سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

(۲) چودھری محمد حسین ایم اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سکریٹریٹ لاہور
یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان۔

(۳) شیخ اعجاز احمد بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سب جج دہلی

(۴) عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں
اس کی جگہ خان صاحب میاں امیرالدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔
نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیالدار
ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو
Guardians مقرر کردوں مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا
یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور
میں رہنے والے Guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی
خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی
مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے
آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ Iodex اس کے لیے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت
میں ہوتی ہے دوسری سیال صورت میں۔ موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام۔ محمد اقبال

راس مسعود نے اس خط کا فوراً جواب دیا۔ اُن کا یادگار اور تاریخی خط ملاحظہ ہو۔

"بھوپال — ۱۴ر جون ۱۹۳۶ء

نہایت پیارے اقبال — تمہارا خط مورخہ ۱۰ر جون ابھی ۳ بجے میں نے بغور پڑھا۔
چوتھے گارڈین کی بابت میری رائے یہ ہے کہ چونکہ میں نہ لاہور میں رہتا ہوں اور
نہ کوئی امید لاہور کے قریب رہنے کی ہے۔ تو مجھے مقرر نہ کرو۔ بلکہ کسی ایسے دوست کو
جو کم سے کم پنجاب ہی میں مقیم ہو۔ البتہ اپنی وصیت میں یہ ضرور لکھو کہ اگر گارڈین
کو کسی معاملہ میں جہاں تک کہ منیرہ سلمہا اور جاوید سلمہ کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی مالی
دقت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں کیونکہ جب تک کہ ان دونوں کی انشاء اللہ
بائیس برس کی عمر نہ ہو جائے میں ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ
میں زندہ رہا۔ یہ خود ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لیتا
ہوں جو مجھے تم سے ہے۔ یہ ضرور کرنا کہ میرے متعلق اس سلسلے میں جو الفاظ اپنے
وصیت نامہ میں درج کرو جو کہ رجسٹرار کے پاس محفوظ کر رہے ہو ان کی ایک نقل
میرے پاس ضرور بھیج دینا۔ اگر خدانخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمہارے
ان دونوں بچوں کے لیے ان کی تعلیم کے معاملے میں میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے
لیے۔ یہ ضرور صلاح دیتا ہوں کہ جہاں تک جائداد وغیرہ کا تعلق ہے اس کا انتظام

اپنے سامنے ہی ایسا کرو کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ شکر ہے خدا کا نادرہ اب ذرا بہتر ہے۔

میں ہوں تمہارا چاہنے والا ——— راس مسعود

"اقبال اور بھوپال" میں علامہ اقبال کے اس خط کی اشاعت کا عکس اور سر راس مسعود کی طرف سے اس کے جواب کی اشاعت کا عکس اس بات کو تو ظاہر کرتا ہے کہ یہ خط ہر لحاظ سے درست اور صحیح ہے کیونکہ ۱۰ جون ۳۷ء کو علامہ نے خط لکھا اور ۱۴ جون ۳۷ء کو راس مسعود نے خط کا جواب دیا اور لکھا کہ ۱۰ جون کا خط میں نے بغور پڑھا اب خط پر اعتراض بے معنی ہے تاہم "اقبال اور بھوپال" کے اس خط میں بھی شیخ اعجاز کے عقائد اور قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے ریمارکس حذف کر دیے گئے ہیں۔ اب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود جلد سوم میں جو اقتباس دیا ہے اس کے بارے میں اقبال نامے کے مرتب ڈاکٹر اخلاق اثر نے ہمارے نام ایک خط میں وضاحت کی گو وہ بھی مکمل نہیں ہے کیونکہ خود اقبال نامے کی کتابت میں سے یہ عبارت رہ گئی:

"کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے۔"[۲۱]

ڈاکٹر اخلاق اثر نے اس میں بتایا ہے کہ اصل میں اقبال نامے کا جو نسخہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو دیا گیا اس میں یہ عبارت موجود نہ تھی۔ ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر اخلاق اثر کے خط کا عکس:

Dr AKHLAQ ASAR
M.A. (...), M.A. (...), Ph.D
Vice President
All India Urdu Writers & Journalist Forum
For National Integration (Registered)

Sadiq Manzil,
Chowki Imambara,
Bhopal 462001

Dated 7-1-86

محترم وحید عشرت صاحب! وعلیکم السلام

زندہ رود (تین جلدیں) اور اقبال اور حیدرآباد موصول ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ۔ آپکی حسب فرمائش اپنی تالیفات "اقبال اور شیشہ محل" "اقبال نامے" اور تصنیف "اقبال اور مغربی" رجسٹری سے روانہ کر رہا ہوں۔ "اقبال نامہ" کا دوسرا ایڈیشن اور "اقبال کا وظیفہ" انشاء اللہ عنقریب مکمل ہونے کی امید ہے۔ "مخدوم اقبال" اور دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اقبال کے اشعار اور سوانحی حالات پر معلومات مکمل ہو جائیں۔ اگر ممکن ہو تو بہ زحمت اور برداشت فرمائیں۔ میری تالیفات کے بارے میں آپ کی نیک خواہشات میرے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔

"مطالعہ اقبال" پر آپ کا تبصرہ پڑھ رہا تھا۔ اُس میں اقبال کے ۱۰ رجون ۱۹۳۶ء
کے مکتوب کا حوالہ تھا جو آپ نے "زندہ رود" سے لیا تھا۔ اس وقت میرے سامنے "زندہ
رود" نہیں، دیکھی تھی (اور یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اقتباس "اقبال نامہ" سے لیا گیا ہے۔
اس مکتوب کا مکمل متن "اقبال اور قرآن" صفحہ ۱۵ پر فوٹو کاپی کی شکل میں دیا گیا ہے۔
"زندہ رود" میں اس مکتوب کا اہم حصہ رہ گیا جو بعد کے نسخوں میں ہاتھ سے بڑھا دیا گیا تھا اور
یہ تحریر اس نسخہ میں بڑھائی نہ جا سکی تھی جو جناب جاوید اقبال صاحب کی خدمت میں پیش کی
گئی تھی۔ کتابت کی غلطی بہت بعد میں نظر آئی۔ وہ اہم حصہ یہ ہے:-

"یہ کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔
اس واسطے یہ امر مشتبہ ہے"

امید ہے کہ ۱۰ رجون ۳۶ء کے مکتوب کی فوٹو کاپی سے آپ کی ضرورت پوری ہو جائے
گی۔ دیگر مکاتیب کے علاوہ یہ مکتوب بھی مجھے جناب ممنون حسن خاں صاحب سے موصول
ہوا تھا۔ جس کی تفصیل "اقبال نامہ" میں دی ہوئی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے جناب رفیع الدین
ہاشمی صاحب اس مکتوب اقبال کی فوٹو کاپی شیخ اعجاز احمد صاحب کو ارسال کر چکے ہیں۔
میری کاوش تصانیف یا تالیفات کے حقوق اشاعت کی ضرورت سمجھیں تو تحریر فرمائیں
اور رائلٹی کی شرائط کی تفصیلات بھی لکھیں تاکہ میں اپنی [illegible] - اجازت دے کر
کارروائی کروں۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ تعاون کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔ آپکا

اخلاق اثر

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب سے ہم نے استفسار کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے اس مکتوب کی فوٹو کاپی نہیں ملی اور نہ میں نے شیخ اعجاز کو کوئی کاپی ارسال کی ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے اپنے اس خط میں ان احوال کی وضاحت کر دی ہے کہ کیونکر یہ عبارت مکمل طور پر زندہ رود جلد سوم میں نہیں آسکی۔

اب ایک اور حکم شہادت جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور منیرہ بیگم کی آیا محترمہ ڈورس احمد نے اپنی حالیہ انگریزی کتاب "اقبال جیسا کہ میں جانتی ہوں" میں فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علامہ اقبال شیخ اعجاز احمد کو بہت عزیز رکھتے تھے مگر علامہ ان کے قادیانی ہو جانے کی وجہ سے ان سے سخت نالاں تھے اور وہ اپنے بچوں کے سرپرستوں میں سے بھی انہیں نکال کر کسی اور متبادل کی تلاش میں تھے، چنانچہ علامہ نے ان سے متعدد بار اپنے اس کرب کا اظہار کیا اور شیخ اعجاز کے قادیانی ہو جانے کے عمل کو ہمیشہ اور مکمل طور پر ناپسند کیا۔[۱۳]

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اس خط میں تحریف کوئی نادانستہ طور پر کسی ایک فرد نے نہیں کی بلکہ کسی خاص فرد اور جماعت کی طرف سے ایک خاص منصوبہ بندی اور کوشش سے مختلف اشخاص سے اپنے اثر و نفوذ کی بنیاد پر تحریف کروائی گئی ہے۔ اور اس کا مقصد شیخ اعجاز، ان کے عقیدے اور قادیانیوں

کے بارے میں علامہ اقبال کے واضح اور صریح اظہار و موقف کو چھپانے کی سعی نامسعود کی گئی ہے۔ تاہم مختلف خطوط میں مختلف عبارات نے اس سراسر جھوٹ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ہماری طرف سے اس تازہ خط اور اس کی عکسی نقل کی اشاعت کے بعد چند باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ علامہ اقبال کے جملہ خطوط کی چھان بین کی جائے۔

۲۔ تحریفات اور خطوں کی عبارت کی قطع و برید کو ختم کیا جائے اور علامہ کے خط ان کی اصل حالت میں شائع کیے جائیں۔

۳۔ ذاتی اور خانگی حالات کی آڑ میں علامہ کے خطوط کی تصحیح یا قطع و برید نہ کی جائے اس لیے کہ علامہ کے خانگی حالات پر بہت کچھ سامنے آچکا ہے۔ موجودہ صورت میں قطع و برید غلط فہمیوں کو جنم دے گی۔

۴۔ علامہ کے خطوط کی عکسی نقول بھی شائع کی جائیں۔

۵۔ علامہ کے اصل خطوط اقبال میوزیم میں یا کسی اور محفوظ مقام پر اپنی اصل حالت میں محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا جائے۔

۶۔ تمام اردو اور انگریزی خطوط کو ایک کلیات مکاتیب اقبال میں عکسی نقول کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔

۷۔ خطوط کے بارے میں معلومات، مکتوب الیہ، خطوط کا زمانہ تحریر، وجۂ تحریر مقام تحریر وغیرہ ہم واضح طور پر دی جائیں۔

۸۔ مختلف خطوط کے مجموعوں کے تقابلی مطالعہ سے خطوط کی اصل عبارت کا تعین کیا جائے۔

۹۔ تمام مکتوبات کی مائیکرو فلمیں بنائی جائیں۔

اس طریق کار سے علامہ اقبال کے خطوط محفوظ ہوسکیں گے اور تحقیق کاروں کو اصل متن اور ان کے مفہوم تک پہنچنے میں سہولت ہوگی۔ اور بہت سے سیاسی، اخلاقی، ادبی، علمی اور تاریخی حقائق تک اقبال کی اپروچ سے آگاہی ہوسکے گی۔

حوالہ جات

۱۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال — زندہ رود جلد سوم — شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۲۔ شیخ اعجاز احمد — مظلوم اقبال — جی ۲۱۴ داؤد پوتہ روڈ کراچی ۴ — ص ۳۲۴

۳۔ ایضاً — ایضاً — ایضاً — ص ۳۲۴، ۳۲۵

۴۔ ایضاً — ایضاً — ایضاً — ص ۳۲۵، ۳۲۶

۵۔ ایضاً — ایضاً — ایضاً — ص ۳۲۶

۶۔ ایضاً — ایضاً — ایضاً — ص ۳۲۷

۷۔ ایضاً — ایضاً — ایضاً — ص ۳۲۸

۸۔ ڈاکٹر اخلاق اثر — اقبال اور ممنون حسن — دار الاقبال بھوپال — ص ۱۵

۹۔ شیخ عطاء اللہ — اقبال نامہ — شیخ محمد اشرف لاہور — ص ۳۸۶، ۳۸۷

۱۰۔ صہبا لکھنوی — اقبال اور بھوپال — اقبال اکادمی کراچی حال لاہور — ص ۲۴۵

۱۱۔ ایضاً — ایضاً — ایضاً — ص ۲۴۵

۱۲-۱۳۔ ڈاکٹر اخلاق اثر کا ڈاکٹر وحید عشرت کے نام خط۔

۱۴۔ ڈورس احمد، اقبال۔ جیسا کہ میں جانتی ہوں (انگریزی) اقبال اکادمی پاکستان لاہور۔ ۱۹۸۶ء، ص ۳۴

خدوخالِ اقبال

حالیہ برسوں میں اقبال پر کئی ایک گراں قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن اسی دوران محمد امین زبیری مرحوم کی ایک کتاب "خدوخال اقبال" بھی منظر عام پر آئی اور متنازعہ ثابت ہوئی۔ علمی وادبی حلقوں میں بطورِ خاص علامہ اقبال کے ناقدین، محققین اور اقبال کے قارئین میں ۱۹۸۶ء سے تاحال اس کتاب کی گونج برابر سنائی دیتی رہی۔ آج ۱۹۸۸ء میں اس کتاب کی کچھ زیادہ اہمیت تو نہیں رہی کہ اس میں شامل لوازمے کے بیشتر جائزے یا بے جا اعتراضات کسی حد تک واقعی اعتراضات تھے اور غیر واضح تھے وہ کسی حد تک صاف ہو چکے ہیں۔ مگر یہ کتاب کئی وجوہ سے شاعر کے اقبال نمبر میں مکمل شائع کی جا رہی ہے کہ ایک متنازعہ فیہ کتاب پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے قارئین اقبال تک بھی پہنچے۔ یہ کتاب ہندوستان میں تقریباً نایاب ہے۔ ۱۹۵۵ء تک اقبال پر جو کتابیں شائع ہوئی تھیں اور ان کے مصنفین سے جو فروگذاشتیں ہوئی تھیں، تضاد بیانیاں راہ پا گئی تھیں وہ بہت کچھ امین زبیری صاحب نے مفید مطلب "خدوخال اقبال" میں جمع کر لیں۔ اقبال پر کیے جانے والے کئی بنیادی اعتراضات اس کتاب کی اساس ہیں۔

قطع نظر اس سے کہ "خدوخال اقبال" کے ابتدائی صفحات پر کیا قصے کہانیاں سچی ہوئی ہیں یا یہ کہ امین زبیری صاحب نے متذکرہ کتاب سے قبل کیا علمی کارنامے انجام دیئے، ان کے مقاصد اور پس منظر کیا تھے، مجھے صرف اور صرف پیش منظر کتاب کے اس تمام لوازمے سے دلچسپی ہے جو باب نمبر ا سے باب نمبر ۲ تک پھیلا ہوا ہے۔ خواہش تھی کہ کتاب کے تمام ابواب کی ذیلی سرخیوں کے ایک ایک حرف و لفظ کی چھان پھٹک کروں، بہت کچھ ذہن میں آیا بھی تاہم بعض کلیدی ماخذات کی عدم دستیابی کے سبب میں ایسا نہیں کر سکا البتہ "خدوخال اقبال" کے مطالعے کے دوران بننے والے خیالات کے کچھ عکس یہاں تحریر کر رہا ہوں۔ مگر بے ترتیب سے عکس۔

بہ ظاہر تو یوں لگتا ہے کہ مکمل کتاب عمداً اقبال کے خلاف ہی لکھی گئی ہے لیکن دوسرے رُخ سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کتاب اقبال کے خلاف نہیں بلکہ ان ناقدین و شارحین کے خلاف ہے جنھوں نے اقبال کی شخصیت اور شاعری کو بیان کرنے میں غیر ضروری ایزاد سے کام لیا ہے۔

"خدوخال اقبال" جیسی کتابوں سے اقبال کی شاعری کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، ہاں! ایک طرفہ تحریروں کے مقابلے میں خدوخال جیسی کتابیں یا تحریریں ذہنی ورزش کے لیے ضروری ہیں تاکہ تازہ کار تحریریں اور کتابیں معرض وجود میں آسکیں۔

اقبال کی شخصیت کے تمام پہلو اہم ہو سکتے ہیں جن پر بحث و تمحیص کی گنجائشیں ہیں لیکن اصل چیز تو اقبال کی شاعری ہے۔ کہ اقبال شاعر پہلے ہیں بعد میں کچھ اور۔ اقبال کی شخصیت کے تضادات کچھ اور ہیں اور شاعری کے تضادات کچھ اور۔

خدوخال اقبال میں شامل کیا گیا مواد اور اس کی توجیہات بہت کچھ سامنے آچکی ہیں لیکن مربوط انداز میں اس سارے مواد کی سمائی پہلی بار کتاب میں ہوئی ہے۔

کتاب میں جس نوع کے مواد سے استنباط کیا گیا ہے وہ تمام تر اقبال پر تحریر کی گئی کتابوں میں موجود ہے جب تک اس طرح کی تحریروں کی تحقیق تدوین نہیں ہوگی "خدوخال اقبال" جیسی کتابیں گاہے بگاہے آتی رہیں گی اور تاویلات و تعلیقات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ غیر محتاط تحریروں اور روتیوں نے ایک بالکل ہی الگ موضوع کو راہ دی ہے۔

اقبال ایک مسلمان فلسفی اور باکمال شاعر ضرور تھے لیکن اس انتہا کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دور کے تمام فلسفیوں اور تمام شاعروں سے بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ یا یہ انتہا کہ اقبال دنیا کے سب سے بڑے یا عظیم ترین شاعر تھے۔ کیا ایک بلند مرتبہ فلسفی اور باکمال شاعر ہونا کافی نہیں؟

اقبال کی سیرت پر لکھی گئی ابتدائی کتابوں میں جن روایات کو درج کیا گیا ہے ان میں جو تضادات اور حاشیہ آرائیاں ہیں ان سب کی نشان دہی مصنف خدوخال اقبال نے کی تو لیکن اپنی طرف سے جو نتائج اخذ کیے وہ کہیں کہیں باوزن لگتے ہیں۔ اکثر جگہ وہ صحیح نتائج کی طرف پیش رفت تو کرتے ہیں لیکن پھر درمیان ہی میں کہیں رہ جاتے ہیں۔

روایات و واقعات بھی من وعن نہیں آتے، جملوں کی ساخت اور لہجے بدلتے رہتے ہیں اور مفہوم بین السطور میں کہیں گم رہتا ہے۔ علامہ اقبال کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ امین زبیری صاحب کا یہ استخراج خارج از بحث نہیں ہو سکتا کہ: "لیکن اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان خطوط میں بھی کتر بیونت کی گئی ہے طباعت و اشاعت کے بعد متعدد صفحات تبدیل و خارج کیے گئے ہیں" ص۵

صاحبِ کتاب نے کئی جگہ بغیر حوالوں کے بھی اظہارِ خیال کیا ہے جو قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ تحقیقی کتابوں کے یہ کمزور ترین پہلو ہیں۔

"خدوخال اقبال" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امین زبیری صاحب نے اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کا مطالعہ کیا ہے ان پر تحریر کی گئی کتابوں کو پڑھا ہے۔ اقبال کے تمام دستیاب مکاتیب سے استفادہ کیا ہے۔

باب نمبر ۲ "مشاہیر سے تعلقات" میں کشن پرشاد اور سر راس مسعود کے ذیل میں بہت دلچسپ بحث کی ہے۔ تجزیے اور نتائج پیش کئے ہیں۔ خطوط میں تحریفات کا ذکر بھی کیا ہے۔ بعد کی تحقیقات سے بعض خطوط کی تحریفات و ترمیمات کی نشان دہی ہو چکی ہے۔ اس باب میں قائم کیے گئے کچھ سوال اور اعتراضات آج کی تحقیق کے مطابق ایک حد تک درست بھی لگتے ہیں۔ سر راس مسعود کے نام بعض خطوط اور شاد کے نام علامہ اقبال کے نو دریافت خطوط وغیرہ اس کا ثبوت ہیں۔ یہاں کئی سوال ابھرتے ہیں کہ مکاتیبِ اقبال میں تحریفات کیوں کی گئیں۔

باب نمبر ۳ "اقبال کی شاعری" میں اعتراضات کے ساتھ ساتھ مبصرین و شارحین اقبال کے مغالطوں اور مبالغوں کو ترتیب تو دے سکے تاہم بعض تاویلات نہایت ہی سطحی اور معمولی ہو گئی ہیں لیکن بحث دلچسپ ہے اور کئی سوال بناتی ہے۔ ویسے تمام ہی ابواب دلچسپ لگتے ہیں۔

ہر بڑی شخصیت کے مخالفین بھی بڑے قد ہی کے ہوتے ہیں۔ بونے تو اپنا ہی قد ناپتے رہ جاتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں اور دنیا میں ایسا نہیں ہوا کہ عظیم سے عظیم شخصیت کو مکمل طور سے قبول کر لیا گیا ہو۔ اقبال نے بھی کئی مشاہیر عالم پر نثری اور شعری تنقیدیں کی تھیں تو کیا وہ مشاہیر اپنے درجے سے کمتر ہو گئے؟ ان کے کارنامے بے معنیٰ ہو گئے؟

ہم دوسروں سے اپنے لیے جس طرح کی توقعات رکھتے ہیں ہمیں دوسروں کی توقعات پر بھی اسی طرح پورا اترنا چاہیئے۔ ہر بڑی شخصیت کی زندگی کا ایک ایک پل پھر اس کا اپنا نہیں رہ جاتا، وہ عوامی ہو جاتا ہے۔ اس کی عظمت صرف اس کے کام سے نہیں بنتی بلکہ اس کے اعمال سے بھی بنتی ہے۔

جس طرح تضادات کی اپنی نفسیات ہوتی ہے اسی طرح تاویلات و توجیہات کی بھی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ اقبال کے تمام سیرت نگار اور شارحین اپنی اپنی نفسیات کے اسیر رہے ہیں۔ نفسیاتی الجھنوں اور کمزوریوں سے امین زبیری صاحب بھی نہیں بچ سکے ہیں۔

"خدوخال اقبال" پر پاکستان کے ماہرِ اقبالیات رفیع الدین ہاشمی صاحب کا تبصرہ اسی شمارے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ ہاشمی صاحب نے زبیری صاحب کے جن اعتراضات کا جواب دیا ہے وہ اتنے اہم نہیں۔ ان سے زیادہ اہم تو وہ اقتباسات اور اعتراضات ہیں جو مختلف ابواب کی ذیلی سرخیوں میں بیان ہوئے ہیں۔ محض کتاب یا صاحبِ کتاب کو برا بھلا کہنے والا تبصرہ علمی نوعیت کا نہیں ہو سکتا۔ زبیری صاحب کا مطمعِ نظر چاہے کچھ بھی رہا ہو ان کے کئی اعتراضات توجہ طلب ہیں۔ ایسی کتابوں کے حرف حرف اور لفظ لفظ کا تحقیقی استدلال کے ساتھ عالمانہ جواب ہونا چاہیئے تاکہ بنیادی اعتراضات کی مسلسل گونج ہی ختم ہو جائے۔

"خدوخال اقبال" پر ایک اور تبصرہ سہ ماہی اقبالیات (مطبوعہ جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء، اقبال اکادمی لاہور) میں شائع ہوا ہے، مبصر ہیں سید نظر علی زیدی صاحب۔ ۲۱ صفحات کو محیط اس طویل تبصرے میں زیدی صاحب نے نہایت ہی جذباتی نوعیت کا رویہ اختیار کرتے ہوئے علامہ اقبال کا دفاع کیا ہے سوال یہ ہے کہ اگر کتاب قابلِ اعتنا نہیں تو پھر کتاب کے صرف چند اجزا پر تبصرہ کیا معنیٰ، اجزا بھی وہ جو اتنے اہم نہیں، اگر اہم تھے تو پورے استناد کے ساتھ تبصرہ ہونا چاہیئے تھا۔ امین زبیری صاحب نے کتاب میں سوال بنا بنا کر چھوڑ دیے ہیں۔ آج جب کہ علامہ اقبال پر جدید تحقیق کے بعد بہت سا مواد سامنے آیا ہے، بے شمار کتابیں دستیاب ہیں۔ لہٰذا ۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء میں کتاب کے ہر سوال اور قائم کئے گئے تمام اعتراضات کا بھرپور جواب ممکن تھا۔

علامہ اقبال جیسے عبقری شاعر اور مفکر کو "خدوخال" جیسی کتابیں اسی صورت میں نقصان پہنچا سکتی ہیں کہ ان کتابوں اور تحریروں کو نہایت ہی غیر جانب داری کے ساتھ جذباتی ہوئے بغیر معروضی سطح پر نہ دیکھا جائے یا پرکھا جائے۔ یہ کتاب ۱۹۵۵ء کے آس پاس کی ہے لیکن اس کے بعض اعتراضات آج بھی تازہ کیوں معلوم ہوتے ہیں؟۔ ۱۹۵۰ء تک علامہ اقبال پر شائع ہونے والی کتب کے مصنفین واقعی ناقد، محقق تھے یا صرف عقیدت مند؟ کیا ان پرانی کتابوں کی از سرِ نو تحقیقی تدوین ممکن نہیں ہو سکتی؟

ہر شدید عمل کا ردِ عمل ناگزیر ہے۔ قارئین شاہ "خدوخال اقبال" کا مطالعہ کریں اور عادتِ ذہنی سے پرے کتاب میں دیے گئے حوالوں کی چھان پھٹک کریں۔

نام : (مولوی) محمد امین زبیری
والد کا نام : (مولوی) امانت حسین شفا
ولادت : جمادی الاخریٰ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء
مولد : قصبہ دَرَو، ضلع نینی تال - یو پی (بھارت)

قصبہ مارہرہ شریف، ضلع ایٹہ یو پی (بھارت)
۔ ۵ ستمبر ۱۹۵۸ء مطابق ۲۰ صفر ۱۳۷۸ھ بمقام کراچی۔
لمہ نصب :- زبیری، حواریٔ رسول حضرت زبیر بن العوام کے صاحبزادے حضرت
۔ حجاج بن یوسف نے حرم کعبہ میں سفاکانہ قتل کر دیا تو آل زبیر کے کچھ خانوادے
۔ رطن کرکے عراق اور افغانستان ہوتے ہوتے ہندوستان میں وارد ہوئے
مقامات پر قیام کرتے ہوئے قدیم اسلامی دار سلطنت منصورہ سے قریب
جسے عرب مورخین نے کمنبایہ لکھا ہے جو بعد میں کنبہ بولا جانے لگا۔) میں متوطن
یش دو سو برس بعد سیاسی حالات سے مجبور ہو کر یہ لوگ پہلے ملتان اور
اس کے مضافات میں جا بسے۔ آل زبیر کی یہ شاخ چونکہ کنبہ سے نکلی تھی اس
روع شروع میں تشخص کی خاطر وطنی نسبت سے کنبوی یا کنبوہ کہا جانے لگا
زبیریان (کنبوی) میں سے محمد عمر زبیری (جو ہمایوں کے سپہ سالار تھے اور
جنگ میں مقتول ہوئے) کے بیٹے محمد اسمٰعیل زبیری کو ان کے والد کی خدمات
شہنشاہ اکبر نے میرٹھ، بریلی، مراد آباد اور مارہرہ (ضلع ایٹہ) وغیرہ کے
۳۶۵ گاؤں بطور جاگیر عطا کیے۔ محمد اسمٰعیل زبیری نے اتنی بڑی
نتظام کے لیے مارہرہ (ضلع ایٹہ) کو اپنا مستقر بنایا۔ چنانچہ اسی وقت
بریان کا اصل مرکز و معدن رہا آ رہا ہے (ماخوذ از کتاب زیست سوانح زبیری
بر زبیری و مقالہ از انیس مصطفےٰ امینا زبیری مطبوعہ میگزین سیکشن مدنا
(۱/۱۱/۱۹۸۵)

ابتداً اپنے والد مولوی امانت حسین شفا سے اردو، فارسی وغیرہ
صل کی پھر رامپور کے سرکاری اینگلو ورناکیولر اسکول میں کچھ عرصے ہی پڑھنے
لد کے انتقال کی وجہ سے معاشی حالات ناسازگار ہو گئے تو باقاعدہ مکتبی
منقطع کرنا پڑا اور تلاش معاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بعد میں اللہ
اسانگر نیزی میں جو کچھ علمی استعداد و مہارت پیدا کی وہ صرف ذاتی
سل تھا جس کا اظہار مختلف موضوعات علم و ادب پر ان کی گرد و پیش ۴۳
تصنیفات و تالیفات اور برصغیر کے مقتدر جرائد میں شائع شدہ ان گنت مقالات
سے ہوتا ہے۔

معاشی جد و جہد تلاش میں گھر سے رخصت ہو کر پہلے ریاست گوالیار، پرتاب
گڑھ، بارہ بنکی وغیرہ کے محکمات بند و بست اراضی سے وابستہ رہے لیکن یہ ملازمتیں
چونکہ ان کے مذاق سے ہم آہنگ نہ تھیں اس لئے بمبئی کا رخ کیا جہاں کچھ عرصے
تک دو دو کے بعد بالآخر روزنامہ مسلم ہیرالڈ سے کالم نویسی پر منسلک ہو گئے کچھ عرصے
بعد حاجی رحمت اللہ حاجی داؤد میمن سے ملاقات ہو گئی اور ان کی طرف سے نکاح
بیوگان کی ترغیب کے لئے قلیل مشاہرے پر مختلف اخبارات و رسائل میں مضامین
لکھتے رہے۔ اسی دوران نواب محسن الملک تک رسائی ہو گئی جنھوں نے ان کی
تحریروں کو بہت پسند کیا اور بحیثیت اپنے پرسنل اسسٹنٹ ۲۳ روپیہ ماہانہ
پر تقرر کر لیا۔ نواب صاحب کے ساتھ کافی عرصہ تک تصنیف و تالیف کی خدمات
انجام دیں جس کی بنا پر نواب صاحب کا ان کے ساتھ بہت ہی مشفقانہ استاد
کا تعلق قائم ہو گیا۔

زبیری صاحب کی صلاحیت ذوق و شوق اور تصنیفی معیار کو سراہتے ہوئے
نواب صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ ان کا تذکرہ سیرت النبیؐ کے دیباچہ میں کیا
جائے۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی نے جلد اول میں ان کی پُرخلوص خدمات کا ذکر کیا ہے۔

بعد میں نواب صاحب کی سفارش پر بدر الدین طیب جی کے اخبار مراۃ الاخبار
میں جو بمبئی سے نکلتا تھا، نائب مدیر مقرر ہوئے اور کچھ ہی عرصہ بعد نواب صاحب
کی امداد سے اپنا اخبار "سفیر" جاری کیا۔

نواب صاحب کے ساتھ کام کرنے کے دوران ہی ان کی دوستی مولوی عبدالحق
اور مولانا ظفر علی خان جو ان دنوں بمبئی میں ہی مقیم تھے قائم ہوئی مگر نواب محسن الملک صاحب
کے علی گڑھ اور مولوی عبدالحق اور ظفر علی خان کے حیدر آباد چلے جانے کے بعد زبیری
نے بھی بمبئی چھوڑ دیا اور بھوپال چلے گئے۔

وہاں پہنچ کر پہلے ملا غلام حسین بوہرہ کی دکان پر بطور محاسب اور مقدمات
کے پیروکار کی حیثیت سے کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ایک بہت با اقتدار وکیل سید
عبدالعزیز کے ساتھ بطور ان کے اسسٹنٹ کے وابستہ ہو گئے یہ وابستگی اس حد
تک مستحکم ہوئی کہ وکیل صاحب کے گھر میں ان کی حیثیت بڑے بیٹے کی سی ہو گئی اور
زبیری صاحب کا ان کے بیٹوں سے یہ تعلق تادم زیست رہا۔

وکیل صاحب جب حکومت کی مجلس مشاورت کے جائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے
تو انہوں نے زبیری صاحب کو اسی محکمے میں عارضی ملازمت دلا دی۔ اسی دوران
میں والیٔ ریاست سلطان جہاں بیگم کو اپنے لئے ایک لٹریری اسسٹنٹ کی

ضرورت پیدا ہوئی۔ دیگر ناموں کے ساتھ زبیری صاحب کا نام بھی پیش ہوا۔ باقاعدہ امتحان لیا گیا جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ ان کی تحریر والیٔ ریاست نے بہ نفس نفیس پسند فرمائی اور ۴۰ چالیس روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر روبکاری خاص میں ان کا تقرر ہوا۔ تقریباً ۲۴ سال بیگم بھوپال سے ان کا اتنا قریبی ربط رہا کہ دوسرے اعلیٰ افسران رشک کرتے تھے۔ ساری ملازمت میں وہی ان کی براہ راست افسر رہیں چونکہ وہ تعلیم نسواں میں گہری دلچسپی لیتی تھیں۔ اس لئے اس سلسلے میں انہوں نے بہت کام کیا۔ ایک سرکاری رسالہ "ظل السلطان" کا اجراء زبیری صاحب کی ادارت میں ہوا۔ وہ اکثر بیگم بھوپال کے ساتھ دوران سفر بھی شاہی عملے میں شامل ہوتے اور ہر خوشی کے موقع اور تقریبات پر انعام واکرام اور تحائف سے نوازے جاتے۔ ۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۱ء مختلف موضوعات علم وادب پر تصنیفی فتوحات حاصل کرتے رہے۔

۱۹۳۱ء میں ان کے انتقال کے بعد زبیری صاحب نے فوراً پنشن کی درخواست دیدی اس لئے کہ بقول خود ان کے اتنے طویل عرصے براہ راست بیگم صاحبہ سے منسلک رہنے کے بعد نئے ماحول میں ملازمت کرنا اور درباداری ان کے لئے مشکل تھی۔ نواب حمید اللہ خاں جن کے حق میں بیگم صاحبہ سبکدوش ہو چکی تھیں بچپن سے ہی زبیری صاحب کو قریبی طور پر جانتے تھے انہوں نے ۲۰۰ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کی جو وہ اپنے انتقال تک پاتے رہے۔

پنشن کے بعد اپنے بیٹے اور دو بھتیجوں کی تعلیم کی خاطر علی گڑھ میں اقامت گزیں ہو گئے۔ وہاں کے قیام کے دوران یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر سید راس مسعود، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سے خصوصی اور دیگر پروفیسروں سب ہی سے قریبی رابطہ رہا۔ ویسے زبیری صاحب کے تعلقات برصغیر کے تمام ہی مشاہیر علم وادب سے قائم رہے جن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر سے تو ان کی دوستی تقریباً ۶۰ سال رہی۔

زبیری صاحب، علی گڑھ تحریک پر ایک اتھارٹی تھے۔ سرسید کے قائم کردہ ایم اے او کالج سے یونیورسٹی تک کے بارے میں زبیری صاحب کی متعدد تصانیف ہیں جن کے اقتباسات مختلف مصنفین اپنی تصنیفات میں شامل کرتے رہتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی آگئے تھے اور یہیں انتقال کیا۔

جمیل زبیری

پیش گفت

(از انیس شاہ جیلانی)

اقبال بے حد وجیہہ انسان تھے، شخصیت ایسی جاذب نظر تھی کہ ہر شخص کھنچا چلا آتا تھا، جن میں سے عطیہ فیضی کی شخصیت نمایاں ترین ہے۔ جو حسن وجمال اور علم وہنر کا پیکر تھیں۔ انہیں ایک جگہ لکھتے ہیں "وہ جو آپ کا روزنامہ فرنگ اخباروں میں چھپ رہا ہے اور ہر ایک کی زبان پر ہے، داد طلب ہے۔ میں بھی ثنا خواں ہوں" جواب یہ ملا کہ "حضور، وہ ہم نہیں ہماری بہنا لکھتی ہیں" اور پھر یہ سن کر اور پڑھ کے کہ "آپ شاعر اور فلسوف بھی ہیں!" یہ ہم نے کہیں نہیں سنا۔ "لاہور کے مشاعروں اور ادبی جرائد میں چھپنے چھپانے کو جانے دیجئے، یہاں تو لندن جانے سے پہلے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کو گرمانا بھی کام نہ آیا۔ یہ جان کر انجان بننے کی کشمکش دونوں کو اتنا قریب سے قریب تر لے آئی کہ جیتے جی کوئی کسی کو نہ بھلا سکا۔ عطیہ اور جرمن مس ویگے ناست سنے وارفتہ محبت ناموں کو تمامتر تجاہل عارفانہ کے باوجود حرز جاں بنا کر رکھا۔ سنے کاش یہ توفیق اقبال کو بھی ارزاں ہوتی ہوتی۔ کیا عجب یہ ممکن ہوا ہو مگر نادان اقبالیوں کے ہاتھوں ان جوابی نگارشات کا قصہ پاک ہو گیا ہو۔ صرف چودھری محمد حسین ہی نہیں اس حمام میں اور سب پائے جاتے ہیں۔ اقبال کی اقادِ طبع کے واقعات کچھ تو یار دوں سے ہی چھپائے نہ چھپے اور مزید سینہ گزٹ میں بھی شائع ہوتے رہے۔ انہیں سنجیدگی سے لئے جانے میں قباحت کیا ہے، یہ ہمارے پلّے پڑنے والی بات نہیں ہے۔ یہاں ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں جس کے راوی خلیفہ عبدالحکیم اور رئیس احمد جعفری، دونوں معروف اقبالی ہیں۔ علی بخش جیسا کہ سب جانتے ہیں، عنفوان شباب ہی سے مثل نفس ناطقہ بن چکا تھا اور ہر طرح کی آزمائشوں سے دوچار ہونے اور رہنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کا معیار حسن علامہ کے حسن نظر سے کیسے لگا کھا سکتا تھا؟ چنانچہ ادبی شلوار نے رنگ ظرافت کو بھڑکایا اور ٹانے کا ایک بہانہ ہاتھ آیا کہ "یہ تم کس دلہن کو لے آئے؟" دھتا بتانے کے لئے اس سے بڑھ کر شوخ وشریر اور چلتا جملہ اور کون کس سکتا تھا؟

اقبال کی پہلی بیوی سے ہزار جتن کے باوجود مفاہمت نہ ہو سکی۔ بنائے مخاصمت کیا تھی یہ کسی "اقبالی" نے نہیں لکھا۔ اگر لکھا تو بس یہ کہ "اس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔" اب یہ ناگفتنی کسی سے اگلوائے کون؟ آفتاب اقبال مرحوم کی ایما سے سید حامد جلالی نقوی نے جون ۱۹۶۷ء میں "علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی" اور ستمبر ۱۹۶۹ء میں شیخ عطا محمد کے خطوط "شائع کئے تھے جن میں موصوفہ کی بے گناہی اور مظلومیت کے تمام دستاویزی ثبوت پیش کر دیئے تھے، اگرچہ وہ بھی غائب کر دی گئیں کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری جو کسی کے کانوں میں بھنک پڑ سکے۔ خیر مگر اقبال کا وصیت نامہ تو شائع ہو چکا ہے جس کی رو سے کریم بی بی اور ان سے پیدا ہونے والے خود اپنے بیٹے آفتاب اقبال کو منقولہ یا غیر منقولہ املاک میں سے ایک حبہ دینے کی بھی وصیت نہیں کی، حالانکہ اخلاقاً، شرعاً اور قانوناً ان کا حق بنتا تھا۔ مگر ان مظلوموں نے کسی صورت میں چارہ جوئی نہیں کی۔ مذکورہ دونوں شواہد ناپید سہی۔ یہ وصیت نامہ یہاں کی مظلومیت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

زبیری مرحوم سے میری تقریب ملاقات کیا تھی، اب یاد نہیں۔ شاید "خطوط شبلی بنام عطیہ" کے مطالعہ سے ہی مراسلت کی تحریک ہوئی ہو۔ اس مختصر سے مجموعے کو بابائے اردو نے اردو زبان کا زیور کہا ہے مگر اسی کی بناء پر یاروں نے زبیری مرحوم کو شبلی دشمنوں کا سرخیل بنا دیا۔ جب مرحوم نے اقبال پر بھی قلم اٹھایا تو تعریف تو سبھی نے کی اور تقاضہ بھی کیا کہ چیز ایسی ہے کہ چھپنی ہی چاہئے مگر بدنام تو ہو چکے تھے کہ باوجود طویل رفاقت کے بابائے اردو بھی اشاعت کے معاملے میں ہمت نہ کر سکے۔ میں نے بابائے اردو پر سبقت لے جانے کی کوشش کی تو آیا مرحوم کی ڈانٹ پڑی کہ "چند ٹکوں کیلئے اقبال مرحوم کی پگڑی اچھالنا ہوگا!" نتیجتاً زبیری مرحوم سے مسودہ کے حصول کے لئے جو سلسلہ مراسلت دسمبر ۱۹۶۷ء

ء قیمت ۴ روپے ۱۷/۱۸ نایاب ۱۹ مکتبہ جدید لاہور

ء ۵ ۸ روپے مجلد ۳ روپے عمر فاروق پبلشرز لاہور

۵۹ ۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵ (نایاب) تذکرہ سرسید زیر طبع

(۴)

(لفافہ از کراچی)

۳ جنوری ۱۹۵۷ء

مکرم محترم تسلیم والانامہ مورخہ دسمبر کا شکریہ

ضعیفان اقبال کا حق تالیف زیادہ قابل گفتگو نہیں جو آپ نے جو تجویز کیا ہے۔

وہ مجھے منظور ہے۔ یہ کتاب بڑے معرکہ کی ہے۔ آج کل اقبال کو انبیائے کرام کی صف میں ان کے سیرت نگاروں نے شامل کر دیا ہے۔ غلط واقعات اور تدلیس کے علاوہ واقعات کو بنایا گیا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے جس قدر تعریف کی جائے بجا ہے مگر انہوں نے جو اخلاقی اقدار پیدا کئے وہ بہت سے ایسے ہیں کہ ناممکن العمل مثلاً بہت مشہور شعر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مگر ان کے خطوط سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی تقدیر ایک ہندو امیر کے ہاتھوں میں دیدی۔ عزائم بہت بلند عمل ایچ، بارگاہ الٰہی میں ادب کی حالت

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اسی طرح بہت سے اشعار ہیں۔ مدح امراء بھی ایک خاص موضوع ہے۔ ان کے بہت سے اشعار خارج کرکے تعریف ہے۔ میری کتاب دراصل ان کی سوانح عمریوں کی تنقید ہے واقعات اور انہی کے خطوط سے، اور اسی طرح اقبال کے اصل خد و خال جن پر پوڈر ملا گیا ہے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ان کی سیاست بھی ایک بڑا موضوع ہے۔ تصور پاکستان ان کی طرف بڑے زور کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ ان کا نمبر چھٹا ہے پانچ اصحاب پہلے ۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۹ء یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں، ایک نے تو اسکیم بھی شائع کی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے تو پورا تصور بھی نہیں ظاہر کیا۔ غرض یہ کتاب اس نوعیت کی ہے لیکن میں نے خود کوئی تعریض نہیں کی بلکہ ہر ایک پوائنٹ کا ثبوت پیش کر دیا ہے اور ناقابل تردید۔

جب تک آپ مسودہ نہ دیکھیں اندازہ نہیں کر سکتے، مجملاً چند عنوان پیش ہیں۔

تمہید، شاعری کی تعریف، سیرت نگاروں پر تنقید، نقوش سیرت، ابتدائی حالات، مسائل زندگی، اقتباس خطوط عطیہ بیگم، غیر ملکی لباس سے نفرت، شان فقر غیور، ایک نیشنل فنڈ، بلند ارادے، عمل زندگی، خطاب، جنگ عظیم کے متعلق نظمیں، ملیگڑھ تحریک، مدحت طرازی، خاص تعلقات، اقبال اور وزیر اعظم سرکشن پرشاد، نظام سے ملاقات، شاہان افغانستان سے تعلق، سر سید راس مسعود سے درخواستیں اور وظیفہ بھوپال، سیاسیات، عام سیاسی موضوعات، تصور پاکستان کا تاریخی پس منظر، چودھری رحمت علی کے ایک مفتی کا بیان، چند تعجبات، انتقال۔ یہ فہرست بہت مجمل ہے تاہم نصف اندازہ ہو جاتا ہے۔

میری مؤلفہ کتب میں ضیائے حیات چھ روپیہ، ذکر شبلی دو روپیہ، شبلی کی رنگین زندگی ایک روپیہ ۸ آنہ، تاریخ علیگڑھ ۸ آنہ یہاں کتب فروشوں کے یہاں ہیں، ایک نئی کتاب مسلم خواتین کی تعلیم، یہ تاریخی ہے حال میں شائع ہوئی ہے ۳ روپے یہ پانچوں یہاں دستیاب ہوتی ہیں اور عام قیمت ہے جو بازاری ہے، البتہ سیاست ملیہ نایاب ہے لیکن ایک صاحب کے پاس علی گڑھ میں چند نسخے ہیں وہ زیادہ قیمت پر دیتے ہیں حال میں دو صاحبوں نے دس دس روپے میں منگوائی، اسی طرح حیات سلطانی ۵ میں، اگر آپ منگوائیں تو ۲۶ روپے بھیج دیں یہاں کی تو فوراً اور بھارت والی پندرہ بیس دن کے وقفہ سے ملیں گے۔

اپنے محترم والد صاحب کی خدمت میں سلام نیاز عرض کیجئے والانامہ کا منتظر ہوں

مخلص

محمد امین زبیری

۱۲۲ اک اک اسکول

بفضل خدائے لایزال، میرے پاس کوئی تصویر میری نہیں، پیر حسام الدین راشدی کے پاس ہے، انہوں نے خود اتار لی، ذرا موسم صاف ہو تو ان سے کاپی لے کر پیش کر سکوں گا مکرر۔ پرنس آغا خاں بھی مل جائے گی تین روپے قیمت ہے۔

(۵)
(لفافہ)

۸ جنوری ۱۹۵۸ء

مکرم تسلیم آپ کا خط مورخہ ۵ جنوری ۵۸ء آج موصول ہوا،

میرا شغل تصنیف و تالیف پیشہ ورانہ نہیں، میں ۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۱ء فردوس آشیاں بیگم صاحبہ بھوپال کا لٹریری اسسٹنٹ اور ایک بڑے دفتر کا انچارج تھا جس کا تعلق مصنفین وغیرہ سے بھی رہتا تھا۔ دفتر میں ہمیشہ تین چار ادیب و مصنف میرے ماتحت تھے، خدا کا شکر اور بھوپال کا احسان ہے کہ مجھے میرے گزارہ کے قابل پنشن ملتی ہے، البتہ ہجرت نے گذارہ گراں تر بنا دیا ہے، ہجرت سے پہلے میری جس قدر کتابیں شائع ہوئیں وہ میرے شوق کا نتیجہ تھیں اور صرف یہ خیال رہتا تھا کہ گرہ سے خرچ نہ ہو اور نفع اتنا ملے کہ اپنے دوستوں کو اور لائبریریوں کو ہدیہ دے سکوں۔

پنشن کے بعد البتہ یہ خیال چھوڑنا پڑا کیونکہ اب بچوں کی تعلیم کا بار تھا، چنانچہ علیگڑھ کی تاریخ پر کام معاوضہ سے کیا، دو ہزار طے ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی موت اور اس انقلاب نے وہ کتاب مکمل نہ ہونے دی۔ مگر اب یہاں ایک پریس نے میری بقیہ رقم دے کر کتاب لے لی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال کی لائف لکھنے کو طلب کر لیا گیا اور پانچ ہزار معاوضہ پیا مور ہوا سال بھر میں تیار کر دی۔ آپ سرکاری مراسلت سے اندازہ کر سکیں گے حالانکہ مجھے پھر طلب کرکے یہ کام قانوناً لیا جا سکتا تھا، اسی دوران میں پنشن بھی ملتی رہی؟

ہجرت کے بعد تکالیف مالی نے مجبور کر دیا، آغا خاں کی لائف کا پندرہ سو روپیہ معاوضہ اسمٰعیلیہ ایسوسی ایشن نے علاوہ دیگر اخراجات صفائی مسودہ وغیرہ کے دیا۔ عورت اور مسکرات کے سیکنڈ ایڈیشن کا معاوضہ تین سو روپے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے دیا۔

۱؎ میں نے معاوضہ ڈیڑھ سو روپیہ سے زیادہ تجویز نہیں کیا تھا (صفحہ ۱) امین۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۵ء

۲۰۔ گیارہ قصے ۷۱ ۱۹۲۰ء اصلاحی افسانے

۲۱۔ نساء الاسلام کی تعلیمی تاریخ ۱۹۵۱ء زیر طبع

۲۲۔ تذکرہ سرسید ۱۹۵۳ء زیر طبع

نوٹ:۔ مندرجہ فہرست کتب میں کتب مندرجہ نمبر ۲ کمارا مرا اسمٰعیلیہ ایسوسی ایشن نمبر ۵ ڈاکٹر محمد یسین زبیری جنرل سیکرٹری ڈاکٹر ضیاء الدین احمد میموریل کمیٹی، نمبر ۱۹ مکتبہ جدید لاہور نمبر ۲۰ عمر فاروق پبلشر مال روڈ لاہور، نمبر ۲۳ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نمبر ۲۳ سرسید اسکول راولپنڈی سے مل سکتی ہیں باقی نایاب ہیں۔

محمد امین زبیری

متوطن قصبہ مارہرہ متصل علی گڑھ سابق مہتمم دفتر تصنیف علیا حضرت سرکار عالیہ بھوپال نو درس اکشیان و مدیر ماہنامہ ظل السلطان حال مہاجر پاکستان (کراچی)

پتہ لکھنے کا انداز: بخدمت جناب سید انیس شاہ صاحب

محمد آباد ڈاکخانہ

سنجر پور بہاولپور

(۲)

(مہر ڈاکخانہ کراچی ۱۳ دسمبر ۱۹۵۶ء)

جناب محترم تسلیم

والا نامہ کا شکریہ۔ میری نسبت آپ کا حسن ظن بہت زیادہ ہے۔

جو نایاب ہیں وہ نایاب ہی ہیں البتہ کسی کسی کے پاس نظر آجاتی ہیں۔ دو کتابیں شبلی کے متعلق لاہور سے مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتی ہیں۔ ضیائے حیات کی قیمت چھ روپیہ ہے۔ تذکرہ وقار اور حیات سلطانی و سیاست ملیہ بھی ایک صاحب کے پاس ہیں مگر یہ تینوں کتابیں تیرہ روپیہ میں مل سکتی ہیں، غرض یہ چاروں کتابیں ۱۹ روپیہ اور ۲ دو روپیہ تخمیناً محصول ڈاک ارسال کریں تو بھجوا دوں۔

علامہ اقبال پر میری تنقید شاعرانہ نہیں بلکہ علامہ اقبال کی سیرت پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان یا انہی کے خطوط سے تنقید ہے مثلاً ان کا مشہور شعر ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

مگر وہ ایک ہندو امیر کو خط لکھتے ہیں کہ میری تقدیر آپ کے ہاتھ میں ہے اس سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ فقرا امرا کے گرد رہنے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ لیکن امراء کی مدح و ستائش ان کا خاص شغل ہے، غرض اپنے خطوط سے اقبال وہ نہیں جو اشعار میں ہے سیاسیات میں وہ معمولی آدمی ہیں مگر پروپیگنڈہ نے ان کو ہیرو بنا کر تصور پاکستان ان سے ہی منسوب کر دیا حالانکہ یہ تصورات ۱۹۰۸ء سے تھا اور ۱۹۲۰ء میں ایک اسکیم بھی شائع ہو چکی تھی پھر لیگ میں بھی یہ بیان آیا غرض اقبال سے پہلے کا یہ تصور ہی نہیں بلکہ بحث ہے۔ غرض حلقۂ پرستاران اقبال میں ایک ہیجان پیدا ہو جائے گا مگر جواب کسی کے پاس نہ ہوگا اگر آپ تیار ہوں تو میں مسودہ دے دوں گا۔ اس کتاب کے متعلق بالمشافہ گفتگو کی ضرورت ہے میں بیمار ۶۹ سال کی عمر میرے لئے سفر ممکن نہیں، آپ خود تکلیف

فرمائیں اس کا تاریخی نام "خد و خال اقبال" ہے
۱۳۷۵ھ

علیہ بیگم ملکوڈ روڈ ایوان رفعت پتہ ہے، مری خاص عنایت فرماہیں۔ آپ آئیں تو کئی باتیں طے ہو جائیں گی، آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں اس وقت ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے اور ایک وقت میں زیادہ لکھنے سے بھی قاصر ہوں، یہ عریضہ برسبیل استعجال لکھ دیا ہے۔ لفافہ و ٹکٹ کی زحمت نہ فرمائیے

خادم

معرفت اے ایک اسکول کراچی محمد امین زبیری

(۳)

(لفافہ) ۲۵ دسمبر ۱۹۵۶ء

مکرم محترم تسلیم نیاز

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۴ دسمبر موصول ہوا۔

کتاب کا نام میں نے "خد و خال اقبال" تجویز کیا ہے۔ مسودہ دیکھے بغیر آپ قیمت
۱۳۷۵ھ
کا اندازہ صحیح نہیں کر سکتے، میں نے کبھی یہ سودا نہیں کیا تھا۔ البتہ کراچی کی مجبوریوں نے آمادہ کر دیا۔ میں نے آغا خان کی لائف معاوضہ پر لکھی، پندرہ سو روپیہ علاوہ دیگر مصارف کے۔ میری کتاب "عورت اور عسکریت" کا معاوضہ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ نے بلا دوام شائع کرنے کا اور صرف ایک اشاعت کے لئے تین سو روپیہ دیا۔ یہ کتاب عورتوں کی عسکری تاریخ ہے بار اول حیدرآباد دکن میں شائع ہوئی تھی اب بار ثالث میرے ہی ایک عزیز شائع کر رہے ہیں، عورتوں کی تعلیمی تاریخ حال میں شائع ہوئی ہے۔ کانفرنس ناشر ہے پانچسو روپیہ معاوضہ۔

اصل یہ ہے کہ آپ دیکھ کر ہی اندازہ کر سکتے ہیں، زیادہ انسب ہوگا کہ آپ ہی تحسین کر کیا ادا کر سکتے ہیں۔ کتاب مطبوعہ ۲۰۰ صفحات ہو جائیں گے میں نے تمام کتابیں حوالوں سے ہی کام لیا ہے، بہرحال آپ آئیے اور دیکھ کر رائے قائم کیجئے۔

اپنے والد صاحب کی خدمت میں بھی سلام نیاز کہیئے۔

"سیاست ملیہ" کی علی گڑھ سے بمشکل تمام دس روپیہ فی نسخہ دو جلدیں ملی تھیں وقار صاحب لے گئے جنہوں نے علی الحساب پہلے ہی قیمت جمع کرا دی تھی، "حیات سلطانی" مرر فی کاپی، یہ دونوں منگوانی پڑیں گی، ذکر شبلی تو لاہور میں مکتبہ جدید سے منگوا لیجئے چھ قیمت ہے اور شبلی کی رنگین زندگی اشرف پبلشر سے ایک روپیہ قیمت ہے۔

اصل تو یہ ہے کہ اقبال کو جو فرشتہ بنانے کی کوشش ہے اس سب کا رد موجود ہے بلکہ انہی کے حوالوں اور بیانوں سے مجھے اس تنقیدی کتاب پر یک گونہ ناز ہے ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی مسودہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

مخلص

محمد امین زبیری

معرفت اے ایک اسکول کلفٹن کراچی

مر ۱۲ نایاب ۵ منگوائی جا سکتی ہے

مر ۱۱ تا ۱۳ نایاب مر ۲ مر ۵ منگوائی جا سکتی ہے

اس تمہید کے بعد یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے خط کے ایک فقرہ پر کہ "کم از کم دنیا کو تصویر کا دوسرا رخ نظر تو آجائے گا" بے ساختہ خیال کیا کہ

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

خدا کرے ہمارے نوجوان ایسے ہی خیال کے ہو جائیں تو یہ طمع کاریاں نہ ہو سکیں، اب معاملہ معاملہ کی طرح کیجئے مسودہ غیر صاف شدہ ہے۔ صفحات کہیں باریک لکھے ہیں کہیں موٹے، کہیں کٹے پٹے ہیں، کہیں حاشیوں پر اس سے صفحات کا اندازہ نہیں ہوگا بلکہ مطبوعہ سے ہو سکے گا اگر صاف کرایا جائے تو بھی صحیح نمبر معلوم نہ ہوں گے لہٰذا صفحہ مطبوعہ کی مناسبت رکھی جائے دیکھئے دوبارہ طباعت کی نوبت جب ہی آئے گی کہ طبع اول ختم ہو اور ظاہر ہے کہ یہ علامت قبولیت ہوگی، دائمی حق کے ساتھ، اشاعت مابعد پر فی صد مقرر کیجئے اور مجھے نہ دیجئے کسی یتیم خانہ کو دیجئے خواہ وہ بہاولپور کا ہو ورنہ کراچی کا یتیم خانہ بہت اچھا کام کر رہا ہے ۲۵ کاپیاں مجھے بھی دینی ہوں گی۔

میں مسودہ آپ کے سپرد کر دوں گا اور رقم آپ مجھے ادا کریں گے۔ جو صفحات زیادہ کٹے پٹے ہوں گے وہ یہاں تین چار دن میں صاف ہو جائیں گے آپ کا خود آنا ضروری ہے اور چیزیں بھی تیار ہو رہی ہیں۔

میرے ایک بھتیجے نے جو قائد اعظم کے ساتھ بہت رہے ایم اے ایل ایل بی ہیں ۱۹۴۱ء میں انگریزی میں مسلم انڈیا لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی اسی زمانہ میں میں نے سیاست ملیہ لکھی، مواد پر بہت صرف ہوا مگر دونوں تاریخیں بہت مقبول ہوئیں اب میرے ایک ایم اے عزیز نے سیاست ملیہ کو ۱۹۴۰ء تک ملخص کیا ہے اور ۱۹۴۷ء تک واقعات اضافہ کئے ہیں میں نظر ثانی کر رہا ہوں۔

میرے فرزند محمد یامین زبیری نے پاکستان "اسٹیپ بائی اسٹیپ" انگریزی میں ۵۰۰ فلسکیپ صفحہ کی تاریخ لکھی ہے عہد سرسید سے قائد اعظم کے گورنر جنرل ہونے تک کے سیاسی اہم حالات ہیں، ایک پریس نے ان سے مسودہ لیا مگر چونکہ وہ انگلینڈ چلے گئے ہیں معلوم نہیں کیا طے ہوا پریس والے ان کے دوست اور علیگڑھ کے کلاس فیلو ہیں۔

عورت اور عسکرت میں اضافے کئے ہیں اور ایک عزیز ڈاکٹر یٰسین زبیری اس کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ صرف میرا مشغلہ اور شوق ہے جو مری مدد ان سب کے ساتھ ہے۔

اب کوئی معاملہ نہیں رہا، یہ یاد رکھئے کہ وعدۂ فردا پر کل معاملہ نہ ہوگا۔ آپ نے لکھا ہے کتنے صفحے بنتے ہیں تو یہ تو طباعت کے بعد اور سائز کے تعین کتابت کے طرز پر منحصر ہے، ایک سائز پر جو مضمون نصف صفحہ میں ہوگا۔ وہ بھی دوسرے سائز میں پون صفحہ اور پورا صفحہ لے گا عموماً سائز ۲۲×۱۸ طباعت و کاغذ میں کفایت رہتی ہے اس سائز پر جتنے صفحے ہوں۔

آپ کو کتاب منتقل کرنے کا حق نہ ہوگا لیکن آپ کسی سے معاملہ کریں کہ وہ آپ کو ایک رقم دے اور آپ اس کو حق اشاعت دے دیں کتاب یقیناً بہت قابل غور اور دلچسپ ہوگی۔ میں نے مولانا سید سلیمان مرحوم کی کتاب حیات شبلی پر دو سو صفحہ کا تبصرہ کیا تھا اور حق تالیف حق انجمن ترقی اردو ہبہ کیا، انجمن کی اجازت ایک صاحب نے اس شخص سے منتقل کرالی اور صرف دو سو کاپیاں شائع کر کے باقی نیاز مندان سلیمانی کے نذر کر کے تلف کرادیں اس کا خلاصہ ذکر شبلی لاہور کے مکتبہ جدیدہ نے شائع کیا ہے، میں نے اس اتلاف کا ذکر اس خلاصہ میں کر دیا ہے، بہر حال ان تمام امور پر غور کر کے رائے قائم فرمائیے جو کتابیں یہاں ملتی ہیں اور دوسری جگہ سے منگائی ہیں ان کی قیمت جلد بھیجئے ورنہ ان کا ملنا بھی مشکل ہوگا آپ کے لئے میں نے محفوظ کرادی ہیں مگر زیادہ انتظار تو ممکن نہیں۔

مخلص

۲۲ اے اک اسکول کلفٹن کراچی محمد امین زبیری

(۶)

(کارڈ۔ مہر ڈاک خانہ کلفٹن کراچی، ۲ جنوری ۱۹۵۰ء)

حضرت سلامت۔ عنایت نامہ آپ کا آئے ہوئے کے بعد یہ خاموشی کیا معنی، اجنو کے بعد آپ نے پھر کوئی خط نہیں لکھا خدا کرے آپ مع الخیر ہوں

بہاولپور میں میجر شمس الدین صاحب سے آپ واقف تو ضرور ہوں گے ان کی کتاب اسلامی نظریۂ تعلیم جو قرآن مجید کے احکام وغیرہ پر ہے آپ نے دیکھی ہوگی، واقفیت کے علاوہ آپ کے تعلقات کیسے ہیں، یہ میں ایک خاص ضرورت سے دریافت کر رہا ہوں اور شاید آپ کو پھر تکلیف دوں۔

خادم
محمد امین زبیری
۲۲ اے اک اسکول کراچی

(۷)

(کارڈ۔ مہر ڈاک خانہ کلفٹن کراچی ۱۹ جنوری ۱۹۵۰ء)

مکرم تسلیم۔ ۱۷ جنوری کے خط سے اطمینان ہوا کہ بفضلہ خیریت ہے۔ میرے کارڈ کا جلد جواب دیجئے۔

میں نے آپ کے لئے کچھ کتابیں محفوظ کرادی ہیں بک سیلر کا تقاضا ہے علیگڑھ کو لکھ دیا ہے وہاں سے بھی عنقریب آجائیں گی یہ روپیہ تو بھیج دیجئے کوئی بڑی رقم نہیں آپ نے جلد بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

میجر شمس صاحب کے حالات و تعلقات لکھئے جلد

۲۲ اے اک اسکول امین

(۸)

کارڈ۔ مہر ڈاک خانہ ۱۹۵۰ء کراچی

جناب من تسلیم مورخہ ۲ جنوری کا عنایت نامہ موصول ہوا میں پہلے لکھ چکا کہ میری کوئی تصویر میرے پاس نہیں پیر حسام الدین راشدی مالک کالونی جمشید روڈ نے ایک دفعہ فوٹو لے لیا تھا۔ میں اس سخت موسم میں دو دفعہ وہاں گیا لیکن ملاقات ہوئی آپ ان کو لکھئے مجھ میں بار بار جانے اور موٹر رکشا کی کرایہ کی سکت نہیں۔ نایاب کتابوں کی رقم جو دو ماہ کے قریب سے آپ کو فکر میں ڈالے ہوئے

آپ کے بھروسہ پر چند دوستوں کے سامنے شرمندہ ہوا تو خدوخال اقبال یہ الا سلسلہ توشکریہ
کا ہے اس کے متعلق کیا خیال کروں مجھے موا تع ہیں کہ اچھے شرائط پر معاملہ کروں مگر آپ کے
اصرار پر ملتوی رکھا ہے اور اب ڈر ہے کہ یہ التوا ہی باعث نقصان ہو۔

منیجر صاحب سے خاص کام نہیں۔ •

مجھے گھر سے بس اسٹاپ تک جانا ہیں اور بس میں تھوڑی دور کا سفر ہی تکلیف دہ
نا بہ بہادر لپور چہ رسم خدا مبارک وقت لائے دعا میری قائم مقام ہوگی۔

محمد امین زبیری

(۹)

کارڈ۔ مہر ڈاک خانہ؟)

مکرم

خدا کرے آپ زندہ بصحت و عافیت ہوں، آپ کے خطوط کی تلاش ہے تاکہ
مصنف و مؤلف اپنی تصویر بھی تیار رکھے۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بلند بانگ خطوط محض۔۔۔نخرے، بہرحال آپ سے اخلاقاً
پوچھنا ضرور تھا۔

امین

۴ ایک اسکول کراچی

(۱۰)

(کارڈ، مہر ڈاک خانہ کلفٹن، اپریل ۱۹۵۷ء

جناب من تسلیم۔ اتنے اشتیاق آمیز خطوط کے بعد یہ خاموشی میری سمجھ سے باہر ہے
یا تو آپ میرے ساتھ مذاق کر رہے تھے اور اپنے پندار میں بنا رہے تھے یا کوئی اس پردہ میں
آپ کے ذریعہ مسودہ حاصل کرنے کی تاک میں تھا۔

بہرحال اب میں آپ کے نام ایک کھلا خط اخبارات میں شائع کروں گا تاکہ دوسروں
کو عبرت اور سبق ہو آپ کے خطوط محفوظ ہیں۔

قانونی طور پر بھی آپ کی ذمہ داری کم نہیں مگر پہلے آپ کے والد صاحب کو ایک دوست
کے ذریعہ مطلع کروں گا۔

امین زبیری

۴ ایک اسکول کراچی

کتاب کہانی

(ناشر کی زبانی)

پیش نظر کتاب بھی "کل امر مرھون بوقتہ" کا ایک ثبوت ہے کہ جب
مصنف مرحوم تین برس تک ۵۵-۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۸ء اس کی اشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش
میں ناکام رہ کر داغ حسرت ہی لئے ہوئے چل بسے تو ان کی وہ آرزو اب پوری ہو
رہی ہے۔ مگر اب بھی یہ کوئی تعجب خیز واقعہ نہیں ہے کیونکہ یہ قلمی کاوش تو محض
۱۳ برس (۵۷-۱۳ تا ۹۰-۱۳۰۶ء) بعد ہی منظر عام پر آ رہی ہے جب کہ اب تو صدیوں
پہلے کے مدفون و مستور مخطوطات بھی محققین نے کھوج نکال کر پیش کر دیئے ہیں۔
اور کیئے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اس کی اشاعت تو مدبر الامور کا ایک معمولی کرشمہ ہے۔

کیونکہ عالم امر کے ہر فیصلہ کے عالم خلق میں ظہور کیلئے علم الٰہی میں مقررہ وقت کے
ساتھ ہی ایک متعین سلسلۂ اسباب بھی ہوتا ہے لہٰذا اس کتاب کی اشاعت کیلئے
تدبیر الٰہی کا آغاز یوں ہوا کہ جب ۲۱.۹.۸۰ء کو مجھے انیس شاہ جیلانی کا ارسال کردہ
"نوازش نامے" کا نسخہ ملا تو اس میں زبیری صاحب مرحوم کے مکاتیب کے مطالعہ سے
متاثر ہو کر ۲۵.۹.۸۰ء کو انہیں "خدوخال اقبال" کے اس مسودہ کا کھوج لگانے
کیلئے لکھا جسے وہ بوجوہ مرحوم سے حاصل نہیں کر سکے تھے۔ جواباً جیلانی صاحب
نے ۲۹.۹.۸۰ء کو مطلع کیا کہ "خدوخال اقبال" (امین زبیری مرحوم ... محمد حسین
کے تصرف میں ہے

اس خط کے جواب میں ۲۲.۱۰.۸۰ء کو میں نے لکھا کہ ایوب قادری صاحب
سے معلوم ہوا کہ محمد حسین صاحب کئی برس سے مفلوج اسپتال میں پڑے ہیں اور یہ
بھی انہی نے بتایا کہ "خدوخال اقبال" کا مسودہ بابائے اردو نے لیا تھا اور ان
سے کوئی اقبال پرست لے گیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے ۲۸.۱۰.۸۰ء کو لکھا کہ
"ایوب قادری صاحب کی اطلاعات غلط ہیں، مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد وہ
نسخہ محمد حسین صاحب ہی کی تحویل میں تھا اور ان کا اصرار تھا کہ اسے چھپنا نہیں چاہیے
غالباً آپ کا خط آیا تو اسی دن ایک اور ضرورت سے "مکاتیب عبدالحق مرتبہ
جلیل قدوائی" دیکھ رہا تھا اس کے صفحہ ۵۰۹ پر محمد حسین کے نام دو خط ہیں دونوں
میں خدوخال اقبال" کا ذکر ہے جلیل قدوائی صاحب کا حاشیہ یہ ہے کہ مسودہ
محمد حسین خاں کے پاس محفوظ ہے۔

دریں اثناء میں نے اس مسودہ کی جستجو دیگر ذرائع سے بھی شروع کر دی تھی۔

---

(۱) میں نے اپنی تقریب شادی میں بلانے کی حماقت کر ڈالی تھی، مرحوم نے اپنے پانچویں خط سے
اپنی تصانیف کی مطبوعہ فہرست بھی منسلک کر دی تھی اور اپنے قلم سے نمبر ۱، ۲، ۴ پر x کا نشان بنا دیا نمبر ۳
کے سامنے قیمت لکھی صرف پانچ روپے اور نمبر ۸ کی قیمت لکھنے کا انداز یہ ہے ۸۰-۰۰-۴۰-۰۰-۵
وہ دور روپے آنے پائیوں کا تھا اب تو سو پیسوں کا روپیہ ہے (انیس یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء حیدرآباد

چنانچہ ۲۲-۱۱-۸۰ء کو ایک عریضہ محترمی الحاج محمد زبیر زبیری صاحب سابق اسسٹنٹ لائبریرین محمد حسین آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں بھی ارسال کر کے ان سے درخواست کی کہ وہ مسودہ محمد حسین صاحب سے حاصل کرنے میں مدد فرمائیں جس کا جواب ۳۰-۱۱-۸۰ء کو انہوں نے یہ دیا کہ "محمد امین زبیری میرے بہت قریبی عزیز تھے۔ مارہرہ میں ان کی ماں میرے گھر کے پاس رہتی تھیں۔ وہ اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے بہترین مصنف و مؤلف بن گئے بڑے پایہ کی کتابیں لکھیں۔ کراچی میں محمد حسین انکے بہت کام آئے اور ذہنی پریشانیوں میں انکے بڑے مددگار ہے۔ چنانچہ وہ اپنا علمی سرمایہ یعنی کتابیں اور مسودے وغیرہ ان کے سپرد کر گئے۔ ڈاکٹر اقبال کے متعلق جو انہوں نے بلند پایہ کتاب لکھی تھی وہ ہم پاکستانیوں کی تنگ نظری کے باعث نہ چھپ سکی۔ اور اس کی اشاعت کی آرزو لے کر وہ رحلت کر گئے۔

زبیری صاحب کے اس خط سے منقولہ بالا اقتباس میں نے ۳-۱۲-۸۰ء کو جب جیلانی صاحب کو لکھ بھیجا تو انہوں نے جواباً ۱۱-۱۲-۸۰ء کو لکھا کہ "آپ کے یہی لیل و نہار رہے تو "خد و خال اقبال" کا مسودہ کسی نہ کسی دن آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ (محمد حسین) تو اب گئے کام سے لیکن یہ بزرگ.... کچھ نہ کچھ کر ہی گزریں گے۔ آپ ان کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ مولوی عبدالحق کے دو خطوط محمد حسین کے نام ہیں پہلا ۲۵ ستمبر ۱۹۵۰ء کا، دوسرا ۲۷ مارچ ۱۹۵۹ء کا مولوی عبدالحق نے پہلا خط زبیری مرحوم کے انتقال پر لکھا ہے اس میں مسودے کا ذکر ہے کہ اردو اکیڈمی سندھ والے شائع کرنا چاہتے ہیں دوسرے میں لکھا ہے کہ "مسودہ آگیا ہے کسی وقت آ کر لے جائیے۔ مسودہ غالباً اردو اکیڈمی سندھ کے خالد صاحب کے ہاں سے واپس آیا ہوگا۔

جمیل زبیری صاحب سے بھی محمد امین زبیری مرحوم نے اپنے انتقال سے کچھ روز قبل ایک مرتبہ خود اس مسودے کا ذکر کیا تھا پھر جمیل زبیری، عمران صاحب اور میری گفتگو میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ ۲۶ برس کی پیلے کاغذ پر کتابت سے اب طباعت ممکن ہو سکے گی یا نہیں۔ چنانچہ جون ۱۹۸۵ء میں جب جدہ سے عمران صاحب کے پاس سے آئی تو جمیل زبیری صاحب اور مجھے یہی متفقہ فیصلہ کرنا پڑا کہ یہ ۲۶ سال پرانی پیلے کاغذ پر کتابت ناکارہ ہے لہٰذا از سر نو بٹر پیپر پر کتابت کرانی پڑے گی چنانچہ کتابت کا انتظام کیا گیا جواب پیش نظر ہے۔

محمد امین زبیری مرحوم کو میں نے کبھی دیکھا نہ کبھی ان سے غائبانہ تعلق بذریعہ مراسلت و مکاتیب ہی رہا تو پھر فطرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر چھ برس تک ان کی اس قلمی کاوش کی جستجو میں کیوں سرگرداں رہا؟ یہ بھی نہیں کہ میں اقبال کے خواہ مخواہ مخالفوں میں ہوں لہٰذا یہ ساری تگ و دو حب علیؓ کی بناء پر نہیں بلکہ بغض معاویہؓ کی وجہ سے ہو، پھر یہ بھی کہ اس کتاب کے مشمولات سے جو اجمالی تعارف نوازشنامہ میں مرحوم کے مکاتیب سے ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھنے کے لئے کافی تھا کہ اسی اجمال کی تفصیل اس کتاب میں ہوگی جیسا کہ مطالعہ کے بعد واضح بھی ہوا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی کھلی کہ مصنف کا اصل مقصد علامہ کی تنقیص نہیں بلکہ جیسا کہ انہوں نے جیلانی صاحب کو اپنے خطوط میں نیز اپنی اس تصنیف میں لکھا ہے، یہ محض ان مخصوص مجاوران اقبال کی "می پرانند" کی تردید ہے جو اقبال کی قبر پر چڑھ کر اپنے قد کی بلندی کے مدعی ہیں اور محض اپنی مجاورت کی اہمیت و عظمت کا سکہ جمانے کے لئے اسے ہر قول و فعل و علمی و فکری بشری خامی سے "معصوم" تیرھواں امام ثابت کرنے کے لئے اپنی ساری علمی و ادبی، ذہنی و قلمی صلاحیتیں صرف کئے جا رہے ہیں۔ یہ بزعم خویش ماہرین اقبالیات اس مجاورانہ گر کو خوب سمجھتے ہیں کہ کسی چھوٹے پیر کے مزار کے جاروب کشوں کی وہ توقیر نہیں ہوتی جو کسی بڑی درگاہ کے مجاوروں کی ہوتی ہے اور پھر کیونکہ اقبال کو ایوانہائے حکومت میں بھی کرشمۂ قدرت سے ایک مقام رفیع حاصل ہے لہٰذا اس کی قصیدہ خوانی اور مدح سرائی سے (مضحکہ خیز ہی کیوں نہ ہو) مادی منفعت اندوزی بھی کی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی نام نہاد اقبال شناسوں لیکن دراصل اقبال فروشوں کے خلاف زبیری مرحوم نے قلم اٹھایا اور دستاویزی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ علامہ اپنے عہد اور ایک جہت میں نابغہ بے شک تھے مگر دیگر جہات آدمیت میں ان کمزوریوں سے مبرا نہیں تھے جو بشریت کے لوازمات ہیں۔

اگر یہ کتاب تصنیف کے مابعد ۱۹۵۵/۱۹۵۶ء میں شائع ہوتی تو اس میں ہیں ان میں سے کچھ ضرور چونکا دینے والے ہوتے مگر تب سے اب تک ۳۰/۳۱ میں علامہ کی ظاہری و باطنی شخصیت کی ہر جہت پر دونوں ملکوں کے محققین اتنا کچھ مواد فراہم کر دیا ہے کہ اب اس کتاب میں ایسی بات نظر نہیں آئے گی جو پہلے ہی کوئی نہ کوئی صراحتہً یا کنایتہً نہ لکھ چکا ہو۔ تقریباً ایک ثلث صدی تک اسے غیبت صغریٰ میں روپوش رکھنے میں مشیت ایزدی یہی تھی کہ امین زبیری مرحوم کو پتھر پھینکنے والا نہ کہا جا سکے۔

ایک تہائی صدی تک پردۂ غیب میں کالعدم رہنے والی اس قلمی کاوش کو منصۂ شہود پر لانا دراصل میرا کوئی کارنامہ نہیں ہے بلکہ مجھے تو مسبب الاسباب نے مرحوم کی آخری آرزو کی تکمیل کے لئے محض ایک سبب بنا ڈالا جو کسی کو بھی بنا سکتا تھا کیونکہ سنت الٰہیہ یہی ہے کہ اس عالم اسباب میں کسی چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کے ظہور کے لئے بھی اسباب کا ایک سلسلہ پیدا کر دیا جاتا ہے خواہ کوئی اسے سمجھے یا نہ سمجھ سکے۔ جیلانی صاحب، زبیر صاحب، قدوائی صاحب، عمران صاحب، جمیل زبیری صاحب اور میں، ہم سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن کے وقت پر جڑنے کے بعد ہی یہ نتیجہ ظاہر ہونا مقدر تھا جو اس کتاب کی صورت میں پیش ہے۔

علامہ کو آدمیت سے خارج کر کے دیوتاؤں کے سنگھاسن پر براجمان کرنے میں جن ذی اقبال دانشوروں کا ذاتی مفاد ہے ان کا ذہنی ردعمل اس آئینۂ حقائق سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ تو ظاہر ہے لیکن ان کے طلسم خانہ سے آزاد وہ اہل فکر قارئین جن کے دل و دماغ مسحور نہیں ہیں ان سے البتہ امید ہے کہ زبیری مرحوم کی اس حقائق کشا تحریر کا غیر متعصبانہ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد علامہ کا صحیح مقام بشریت کو سمجھنے میں معاون پائیں گے۔۔

باب ۱

نقوشِ سیرت

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شاعری میں ان پیغامات کا بڑا حصہ ہے جن کو
اللہ پیغمبرانہ شان کا جلوہ کہا جاتا ہے اور جن کی وجہ سے یہ نذر پیش
کی گئی ہے

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

ذکر دیکھنے کے بعد قدرتی طور پر اس بات کے دیکھنے کی خواہش پیدا
ہوتی ہے کہ خود شاعر کی ذات میں یہ جلوہ کتنا نمایاں ہے اور روزمرہ کی زندگی
اور عام تعلقات میں اس کی کیا ضیا باریاں ہیں اور اسلامی روح
سے رکھتی ہے اور اس کی روح میں بھی یہ روح موجود ہے؟
نجی معاملات اور شخصی زندگی کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ دنیا میں کون
ہے جو کبھی نہ کبھی اپنے کمزور لمحوں میں ایسی حرکتوں کا مرتکب نہیں
جسے دوسروں سے چھپانا چاہتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ نجی
ت کو بے نقاب کرنے میں بڑی احتیاط و ذوقِ سلیم اور خدا ترسی کی
ضرورت ہے۔ عام طور پر ستہ عیوب ہی قومی فلاح اور ذوقِ پسندیدہ کا
تقاضہ ہے۔ لیکن ایک شخص کی تعلیمات اور شخصی زندگی کو بالکل جدا
نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ ایک شخص قومی رہنمائی کا ادعا کرتا ہے تو
اس کے نجی معاملات بھی قوم کی املاک ہو جاتے ہیں اس کی شخصی زندگی
شخصی سرزمین ہوتی ہے اس کے خیالات و افکار کے لئے اور ایسے
بغیر اس کی تعلیمات کا کامل اندازہ لگانا اور اس کی صحیح قدر و
قیمت پہچاننا امر محال ہے۔ (موج کوثر صفحہ شیخ محمد اکرام)
علامہ کی متعدد سوانح عمریاں بھی شائع ہوئی ہیں۔ مگر سوانح عمری
کا معیار یہ ہے کہ:
"وہی سوانح عمری سب سے اچھی سمجھی جاتی ہے جس میں صاحب
سوانح کی شخصیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیل درج ہو اور ان
جزئیات کا تذکرہ کیا جائے جن کو پڑھ کر اس شخصیت کا بولتا چالتا
نقشہ پڑھنے والے کے ذہن میں آجائے۔" (ذکر اقبال صفحہ ۱ ۔ سالک)
مگر یہ ضرورت زیادہ تر ان اصحاب کی روایات و بیانات سے
پوری ہوتی ہے جو اس کے ہم نشین ہوں یا اس سے قریبی تعلق رکھتے ہوں
ان میں مبالغہ، تصنع، اور حق و باطل کی آمیزش کا بھی احتمال ہے۔
اس لئے بہترین ذریعہ وہ دستاویزات ہیں جن سے حقائق و واقعات
اخذ کیا جاتا ہے اور اس میں بھی سب سے زیادہ قابلِ استناد وہ
خطوط ہیں جو خود اس شخص نے لکھے ہیں جس کی سیرت کا ہم اندازہ
کرنا چاہتے ہیں (تقریر یوم اقبال ۱۹۵۰ء)
"صرف ایک ہی شے انسان کی حقیقی شکل و صورت کا آئینہ ہو سکتی
ہے اور وہ اس کے ذاتی اور نجی خطوط اور مکاتیب کا ذخیرہ ہے۔
خط لکھنے والے کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ پوشیدہ اعترافات کبھی
عالم پر آئیں گے۔ پھر بہت سے مکتوب الیہ ایسے ہوتے ہیں جو اس کے
ہمراز اور عزیز دوست ہوتے ہیں جن سے کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ اس
لئے وہ بے تکلفی کے ساتھ اپنا ہر حال اور خیال بے پس و پیش
سپردِ قلم کرتا جاتا ہے۔ اس لئے اس آئینہ میں انسان ایسا ہی نظر آتا
ہے جیسا کہ درحقیقت وہ ہے۔ انسان کی بڑی سے بڑی لائف اگر
مرتب کی جائے اور حالات کے تتبع کا خاص اہتمام کیا جائے تاہم
سوانح نگار کو اس کی زندگی کے بہت سے اوراق سادہ چھوڑنے پڑیں گے۔
بیچ بیچ میں ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال کے حالات ناواقفیت کی تاریکی
میں مخفی رہ جاتے ہیں لیکن اکابر رجال اور خصوصاً اہلِ قلم اور مصنفین
کے بہت کم دن ایسے گزرے ہیں کہ ان کو خود خط لکھنا اور دوسروں
کے خطوط کا جواب دینا نہ پڑتا ہو۔ اس لئے اس مسالہ سے اگر ان کی
سوانح نگاری کا فرض ادا کیا جائے تو ان کی زندگی کے روزنامچہ کا
کوئی خانہ خالی نہ رہ سکے گا" (سید سلیمان ندوی مقدمہ مکاتیب شبلی)
"خانگی خطوط میں اور خاص کر جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے
جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں
ہوتی ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے تکلف کا پردہ بالکل اٹھ
جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں ہوتا گویا انسان خود اپنے
سے باتیں کرتا ہے جہاں اندیشہ لائم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات اور
جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے، پھر کون ہے جو
اس خاموش آواز سننے کا مشتاق نہ ہوگا یہ ہماری فطرت میں ہے
اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں اور آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے
ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں ان میں وہ صداقت و خلوص ہے جو دوسرے
کام میں نظر نہیں آتا یہاں انسان بچپن کی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات
کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں جنہیں نہ انشاء
کی صنعت مسخ کر سکتی ہے اور نہ تشبیہوں و استعارات کا بوجھ دبا سکتا
ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے
جس میں ہر حرکت ہر خیال اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور کھلتی بڑھتی نظر آتی
ہے" (مولوی عبدالحق مقدمہ مکتوبات شبلی)
مگر علامہ اقبال کے سوانح نگاروں نے ان کے خطوط و مکاتیب کو جو تعداد میں
بہت زیادہ اور مختلف مذاق و فکر اور درجات رکھنے والوں کے نام ہیں
بہت کم پیشِ نظر رکھا ہے اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ عمداً
اعراض بھی کیا گیا ہے ساتھ ہی واقعات و روایات کی تحقیق و تنقید نظر انداز
کی ہے اور پھر ان کے بیانات میں زیادہ تر اپنی ادبی قابلیت کے
مظاہرات نظر آتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ بعض واقعات کی تردید خود علامہ
ہی کی تصانیف و خطوط میں ملتی ہے۔
اب ہم خطوط[1] کی روشنی میں اور تحقیق و درایت سے کام لیکر سیرت
اقبال کے نقوش پیش کریں گے۔ لیکن اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ
ان خطوط میں بھی کتر بیونت کی گئی ہے اور طباعت و اشاعت کے بعد
متعدد صفحات تبدیل و خارج کئے گئے ہیں۔
اقبال کی سوانح عمریوں اور اقبال کے متعلق مقالوں کی یہ خصوصیت
بہت نمایاں ہے کہ ان میں سر سید اور علی گڑھ تحریک کی تحقیر و مذمت پائی جاتی
ہے اور اس مذمت کے لئے مسخ واقعات وغیرہ کو بھی جائز رکھا گیا ہے
زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ بعض کتابیں جو مستند اداروں بزمِ اقبال
اور اقبال اکادمی کراچی کے اہتمام سے شائع ہوتی ہیں ان میں بہت
یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ان اداروں کو حکومت کی سرپرستی حاصل
ہے اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ حکومت کا ایما نہ سہی اس کی پسندیدگی
ہوگی۔ ہم نے آخر میں ذکرِ اقبال شائع کردہ بزمِ اقبال اور اقبالیات
تنقیدی جائزہ شائع کردہ اقبال اکادمی کی تمہیدوں کا جو پہلی اقساط
کے استاد محترم کے بیان میں ہے اور دوسری آغاز کتاب میں درج
کر کے اس پر بھی تبصرہ پیش کیا ہے۔

ابتدائی حالات

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۹۴ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔
ان کے والد ماجد شیخ نور محمد نہایت وجیہ، ذی عقل اور سنجیدہ مزاج
تھے۔ ان کی شادی جس خاتون سے ہوئی ان کا نام امام بی بی تھا۔
علم سے بہرہ نہ پایا تھا لیکن نہایت دانشمند اور اپنے محلہ و برادری
میں بے حد محترم اور ہر دلعزیز تھیں۔
خود شیخ نور محمد بھی پڑھے لکھے نہ تھے لیکن چونکہ ابتدا سے ہی
صلحا کی صحبت میں رہے اور غور و فکر کی عادت کے علاوہ تصوف
سے ذوق و دلچسپی رکھتے تھے اس لئے بعض ہم عصر اکابر علم ان کے متعلق
کہا کرتے تھے کہ شیخ نور محمد ان پڑھ فلسفی ہیں۔ بعض لوگ تصوف کی کتابیں
پڑھ کر ان کے مشکل مطالب کی تشریح کے لیے شیخ صاحب کی طرف
رجوع کرتے تھے۔ (ذکر اقبال صفحہ ۸)
سیالکوٹ میں ایک ڈپٹی وزیر علی نے ان کو اپنے ہاں پارچہ
پر ملازم رکھا تھا لیکن علامہ کی والدہ ان کی تنخواہ میں سے ایک حبہ
لیتی تھیں کیونکہ ان کے نزدیک ڈپٹی کی آمدنی کا غالب حصہ
ناجائز تھا[2]۔
پھر شیخ نور محمد یہ ملازمت چھوڑ کر ٹوپیاں بنانے لگے جو بہت
بکتیں اور دوسرے کئی بیاد و کار رکھنے پڑے۔ ان کے دو لڑکے
عطا محمد اور علامہ اقبال تھے، عطا محمد نے معمولی تعلیم پائی تھی لیکن
انجینئرنگ اسکول کا امتحان پاس کر کے ایم۔ ای۔ ایس میں اوور سیئر
کافی روپیہ کمایا۔ علامہ کو اعلیٰ تعلیم دلوانے یورپ بھیجا۔ علامہ بھی
بڑے بھائی کے فریفتہ تھے۔ (ذکر اقبال صفحہ ۹)

---

[1] شادِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور حیدرآباد دکن (۲) اقبال نامہ مجموعہ خطوط مرتبہ شیخ عطاء اللہ لاہور (۳) مکتوباتِ اقبال مرتبہ بزمِ اقبال (۴) ذکرِ اقبال مرتبہ مولانا عبدالمجید سالک (۵) سیرتِ اقبال مرتبہ محمد طاہر فاروقی (۶) اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خان ... اقبال کی کہانی مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین احمد

[2] اس خدمت میں کافی روپیہ کمایا جاسکتا ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، تعجب ہے کہ والدہ نہایت متقی تھیں لیکن فرزند پر کوئی اثر نہ تھا اور یہی روپیہ علامہ کی تعلیم پر صرف ہوا۔ ذکر اقبال میں بھی یہ بیان موجود ہے، مزید براں والدہ کی نسبت تحریر ہے کہ علامہ اقبال نے ایک روز مجھ سے فرمایا کہ والدہ مرحومہ کا بیان ہے کہ اندھیری رات تھی کمرہ میں بھی چراغ روشن نہیں تھا آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کمرہ تمام روشن ہے حالانکہ نہ باہر چاندنی اور نہ چراغ تھا۔

شیخ نور محمد کو صاحبِ کرامت و کشف بھی کہا گیا ہے۔ علامہ کی ولادت سے قبل انھوں نے حسبِ بیان خود ایک خواب بھی دیکھا کہ ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ اوپر فضا میں ایک بہت خوبصورت زنگارنگ کے پروں والا پرندہ اڑ رہا ہے اس کی خوبصورتی و دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اٹھا کر اس پرند کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم اترا اور میری گود میں آن گرا۔ آپ نے اس کی تعبیر خود ہی بیان کی کہ میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خدمت اسلام میں ناموری حاصل کرے گا۔" (ذکر اقبال ص)

"اس میں شک نہیں کہ اقبال کے دماغ کی پرورش از طویل سلسلہ تعلیم میں ہوتی رہی۔ لیکن غذائے روح ان کو شروع ہی سے جسمانی رزق کے ساتھ ماں باپ سے ملتی رہی۔" (ذکر اقبال ص)

"علامہ کو بچپن ہی سے شیر پالنے اور کبوتر بازی اور اکھاڑہ کی ورزش کا شوق تھا پھر اس میں غزل گوئی کا شوق بھی شامل ہو گیا اور مقامی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ (ذکر اقبال صفحہ ۱۶)

تعلیم ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر سیالکوٹ کے مشن کالج اور بعد ازاں بعد لاہور میں ثانوی و اعلیٰ تعلیم ہوئی۔ سیالکوٹ میں اپنے زمانے کے ایک فاضل اجل مولانا میر حسن پروفیسر علوم مشرقی سے بطور خاص فارسی و عربی کی بھی تعلیم پائی۔ ایم اے کے بعد مغربی تعلیم کے لئے یورپ گئے۔ وہاں کی تعلیم اور دیگر تعلیمی حالات و علمی خدمات کا بیان علامہ کے ہی ایک خط سے لینا مناسب ہے جو ۱۵ اپریل ۱۹۱۶ء کو مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھا تھا۔

"مخبر دکن سے معلوم ہوا ہے کہ حیدر آباد ہائی کورٹ کی ججی کے لئے چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں جن میں ایک نام خاکسار کا بھی ہے۔ اس خیال سے کہ میرا نام اور ناموں کے ساتھ پیش ہوا ہے اور یہ ایک قسم کا مقابلہ ہے چند امور آپ کے گوش گزار کرنا ضروری ہیں جن کا علم ممکن ہے کہ سرکار عالی کو نہ ہو۔ ممکن ہے کہ ان امور سے متعلق حضور نظام سرکار سے استفسار فرمائیں اس جگہ کیلئے فلسفہ دانی کی چنداں ضرورت نہیں ہے تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ اس فن میں میں نے ہندوستان اور یورپ کے اعلیٰ ترین امتحان انگلستان (کیمبرج) جرمنی (میونک) یونیورسٹیوں کے پاس کئے ہیں۔ انگلستان سے واپس آنے پر گورنمنٹ کالج لاہور میں مجھے فلسفہ کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا یہ کام میں نے ۱۸ ماہ تک کیا اور یہاں کی اعلیٰ ترین جماعتوں کو اس فن کی تعلیم دی گورنمنٹ نے بعد ازاں مجھے یہ جگہ آفر بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں صبح کچہری نہ جا سکتا تھا۔ چیف کورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصہ میں پیش ہوا کریں۔ چنانچہ ۱۸ ماہ تک اسی پر عملدرآمد ہوتا رہا۔ مگر اس عہدہ کے لئے جو حیدرآباد میں خالی ہوا ہے غالباً عربی دانی کی زیادہ ضرورت ہوگی اس کے متعلق یہ امر سرکار کے گوش گزار کرنا ضروری ہے کہ عربی زبان کے امتحانات میں میں پنجاب میں اوّل رہا ہوں۔ انگلستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لئے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ واپسی پر پنجاب اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں میں عربی اور فلسفہ میں بی اے اور ایم اے کا ممتحن مقرر کیا گیا اور اب بھی ہوں۔ اب کے الہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ پنجاب میں بی اے کی فارسی کا ایک پرچہ اور ایم اے فلسفہ کے دو پرچے میرے پاس ہیں۔ علاوہ ان مضامین کے میں نے پنجاب گورنمنٹ کالج میں علم اقتصاد۔ تاریخ اور انگریزی بی اے اور ایم اے کی جماعتوں کو پڑھائی ہے اور حکام بالادست سے تحسین حاصل کی ہے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ایک عرصہ سے جاری ہے۔ علم الاقتصاد پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی۔ انگریزی میں چھوٹی چھوٹی تصانیف کے علاوہ ایک مفصل رسالہ فلسفہ ایران پر بھی لکھا ہے جو انگلستان میں شائع ہوا تھا باقی جو کچھ میرے حالات ہیں وہ سرکار پر بخوبی روشن ہیں۔ ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقہ اسلام میں اس وقت ایک مفصل کتاب بزبان انگریزی زیر تصنیف ہے جس کے لئے میں نے مصر و شام اور عرب سے مسالہ بہم کیا ہے جو انشاء اللہ بشرط زندگی شائع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو تفصیل مسائل کے اعتبار سے ایسا ہی بنا دوں جیسا کہ امام نسفی کی مبسوط ہے جو ساٹھ جلدوں میں لکھی گئی تھی۔"[1]

قانونی پریکٹس

سوانح نگار کا بیان ہے کہ یونیورسٹی سے استعفیٰ ... اپنی توجہ قانونی پریکٹس پر مبذول کی لیکن اس میں ان کو شہرت و کامیابی حاصل نہ ہوئی اور فکر روزی سے ... ہی رہے۔ بیرسٹری کے بہترین زمانے میں بھی ان کی آمدنی کبھی ... ہزار سے تجاوز نہ ہوئی (ذکر اقبال ص)

خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ:

"زراندوزی کی ہوس نہیں تھی بس اپنے اخراجات پورے کرنے تک ہی پریکٹس کرتے تھے۔ مجھ سے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ کوئی آٹھ سو ماہوار تک وکالت کا کام لیتا ہوں۔" رسالہ نقوش

سیاسی کارنامہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

"یہ بات نہ تھی کہ اقبال کی مہارت قانونی میں کسی کو شک ... اور بار دونوں کو ان کی قانون دانی کا اعتراف تھا ایک سے زائد ... لاہور کی ججی کے سلسلے میں ان کا نام لیا گیا تھا لیکن بہر حال یہ امر ... ہے کہ آمدنی کے نقطہ نظر سے وہ اپنے زمانے کے کامیاب ... وکلا میں شمار نہیں کئے جاتے تھے۔ اور ان کی آمدنی بس یوں ہی ... تھی اس کی اصل وجہ بھی اقبال کی آزادی طبع تھی ہمیشہ وکالت میں ... کا راز قانون سے زیادہ جج کو سمجھنے میں مضمر ہے۔ ایک کامیاب و... پہلے جج کو رام کرتا اور قانون کی اپنے موافق تعبیر و توجیہ کرتا ہے اس کے لئے اس کو وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جس کو عام طور پر ... انداز میں دنیا سازی کہا جاتا ہے۔ تملق و چاپلوسی بھی کرنی پڑتی ... ڈنر اور عصرانے بھی دینے پڑتے ہیں پھر اگر حاکم عدالت واقعی حاکم ... بھی ہو حاکم وقت قوم کا فرد بھی ہو تو نوبت تملق و چاپلوسی ڈنر اور ...

---

[1] (۱) علامہ ۱۹۱۶ء میں حیدر آباد کی ملازمت کے خیال سے بھی بیزار تھے۔ جناب عطیہ بیگم کو لکھا کہ حیدر آباد میں ملازمت کا سوال تو میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

(۲) علامہ کی مذہبی تعلیم معمولی تھی مولانا میر حسن سے عربی و فارسی زبان دانی حاصل کی تھی۔ علامہ خود معترف ہیں کہ "میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے البتہ فرصت کے اوقات میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں گزری ہے اور مغربی نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے دانستہ یا نادانستہ میں اس نقطۂ نگاہ سے اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔ (خط بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ۳ ستمبر ۱۹۲۵ء)

(۳) مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ "اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔ فی الحال انشاء اللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ (۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء)"

(۴) اب دوسری کتاب کو دیکھئے جس کا مفصل بیان آئندہ اوراق میں سر سید راس مسعود کے نام کے خطوں میں ہے اور جس کے لئے پانسو روپے ماہوار مقرر ہوا۔ "عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں قرآن کریم پر نوٹ یا اس کتاب کے لکھنے کی بے تابی کا اندازہ اس مراسلت سے ہوتا ہے جو کسی نسبت سے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ "انشاء اللہ عزم مصمم ہے کہ انگریزی کتاب بھی شروع کر دوں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے اس میں آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے (خط ۱۰ اگست ۱۹۳۵ء) مگر یہ کتاب حسرت ناتمام رہ گئی۔ وظیفہ مئی ۱۹۳۵ء میں مقرر ہوا اور انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ یعنی دیگر تین سال وظیفہ حاصل کرتے رہے۔

لف اہل وشرب نائٹ کلب اور ناچ گھر تک پہنچ جاتی ہے
زمانے میں بھی کامیاب وکالت کی یہی ترکیبیں تھیں لیکن
ے کوئی مناسبت ہی نہیں بلکہ نفرت سی تھی۔
ں پیشۂ وکالت میں ان کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی انگریز
اور خوشامد سے نفرت تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی
اشی سکون اور آسودہ حالی سے نا آشنا رہی۔" (صفحہ ۳۱۹-۳۲۰)
سی کارنامہ" میں افسوس ہے کہ اقبال کی ناکامی کے جو اسباب
ۂ ہیں وہ ایک عام حملہ تھیوں اور دکھاوں پر مبنی ہے۔ کامیاب
ت میں بہت ایسی ہستیاں نظر آئیں گی جن میں اقبال سے زیادہ
ور داری کا جوہر تھا دور جانے کی ضرورت نہیں صرف
اندر اقبال کے تین چار معاصر وکلا ہی کو دیکھا جائے مثلاً
ں، سر شفیع، شاہ دین، سر عبدالقادر، کیا انھوں نے ان ہی
ے کامیابی حاصل کی جن سے اقبال کو تنفر تھا۔
رٹ کی بھی صرف ممتاز و کامیاب اصحاب کو پیش کی جاتی ہے
رف انون میں کوئی امتیاز حاصل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی
ں کورٹوں کے علاوہ حیدر آباد دکن میں بھی باوجود سرکشن پرشاد
ری کی دوستی کے وہ یہ عہدہ حاصل نہ کر سکے پھر اگر یہ
جائے کہ وہ قابل نفرت ترکیبیں گوارا نہ کرتے تھے تو یہ جیسے
یہ تراکیب نہیں ہوتیں۔ اس طرح وہ اپنا قانونی جو جبہ
ے تھے بہرحال ان کو فکر معیشت سے شاذ ہی نجات ملی۔
بسری سے مستعفی ہونے کے بعد آمدنی کی ایک مستقل مد
البتہ قانونی پریکٹس اعزازی لکچروں اور امتحانوں کی فیس
لیف ذرائع معاش رہے جو غیر کفیل تھے اور اسی وجہ سے
ں میں گرفتار رہا کرتے تھے۔
"ذکر اقبال" کے مصنف کا بیان ہے کہ علامہ ابھی
ندگی میٹرک کے امتحان سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آنکے
نے جب کہ وہ عمر کی بیسویں منزل میں تھے شادی کر دی۔
دولتمند بزرگ کی لڑکی تھیں۔ اقبال کی یہ شادی ناکام
انھوں نے نباہ کی بے حد کوشش کی اور اس بیوی سے
ریم اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے لیکن زوجین
نکان کم ہوتا گیا اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔"
(صفحہ ۱۰)
علامہ اپنی اس شادی سے جو گجرات میں ہوئی مطمئن نہ تھے
ومصالحت کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اس لیے وہ
سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواہشمند تھے
شمیری خاندان میں نکاح ہوا۔ ہنوز رخصت نہ ہوئی تھی کہ بعض
سے علامہ مشتبہ ہو گئے اور اس کو معلق چھوڑ کر لدھیانہ کے ایک
نامی تیسری شادی کی۔ لیکن جب تفتیش حالات سے ثابت ہوا
وہ ایک شریر و بدباطن آدمی کا کام تھا تو علامہ اب اُن کو لانے
ہ ہوئے، اور تجدید نکاح کر کے لے آئے۔ اس خاتون سے
ہ کی والدہ ہیں شادی ہو جانے کے بعد اقبال نے کبھی کسی
ف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں
اثر ہے۔ اس کے بعد اقبال کی زندگی کا اسلوب کاملاً بدل
قبال صفحہ)

خطوط بنام عطیہ بیگم

ان حالات کے مطالعہ کے بعد ان خطوں کو پڑھنا زیادہ دلچسپ ہوگا۔ جو اقبال نے عطیہ بیگم کو لکھے۔[1] مگر یہ سلسلہ مراسلات ۱۹۱۱ء کے بعد کم ہو گیا اور اب جو خطوط ملے ہیں[2] وہ بقول عطیہ بیگم کسی کو دکھانے کے قابل نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت تک بیگم موصوفہ ناکتخدا تھیں ۱۹۱۲ء میں اُن کی شادی ہوئی۔ عطیہ بیگم کو اتنی بیزاری ہو گئی تھی کہ ۱۹۱۱ء میں لاہور گئیں تو اقبال کو نہ روانگی کی اطلاع دی اور نہ لاہور پہنچ کر ان سے ملنے کو گئیں جس کی اقبال نے ایک خط میں شکایت بھی کی ہے۔ (مکاتیب اقبال)

چند اقتباسات

میں قید ملازمت سے آزاد رہنا چاہتا ہوں اور دوسرے میرا ارادہ اولین فرصت میں اس ملک سے ہجرت کرنیکا ہے وجہ آپ کو معلوم ہے ....[3] میری زندگی صد درجہ تلخ ہے اس مصیبت کا واحد علاج یہی ہے کہ میں اس بدنصیب ملک کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ جاؤں یا پھر شراب نوشی کی لت ڈالوں کہ خودکشی کا مرحلہ آسان ہو جائے کتابوں کے بوسیدہ و ضخیم اوراق میرے لئے سرمایۂ مسرت سے عاری ہیں۔ میری روح کا سوز انھیں اور تمام سماجی رسم و رواج کو جلا کر خاک کر دینے کے لئے کافی ہے۔

آپ کہتی ہیں کہ دنیا کو ایک خدا نے خیر نے پیدا کیا ہے ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن دنیا کے حقائق تو کسی دوسرے نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اگر عقل انسانی کو ہی معیار قرار دیا جائے تو یزداں کی نسبت ایک قادر مطلق اور ابدی اہرمن پر ایمان لانا زیادہ آسان نظر آتا ہے۔ ان خرافات کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میں ہمدردی کا طالب نہیں ہیں تو اپنی روح کا زہ بار ہلکا کرنا چاہتا ہوں جس کے نیچے وہ دبی چلی جا رہی ہے۔ (۹ اپریل ۱۹۰۹ء)

(۲) میرا سینہ یاس انگیز اور غم انگیز خیالات کا خزینہ ہے یہ خیالات میری روح کی تاریک باںبیوں سے سانپ کی طرح نکلتے چلے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک سپیرا بن جاؤں گا گلیوں میں پھروں گا اور تماش بین لوگوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے ہوگی۔

یہ خیال نہ فرمایئے کہ میں مبتلائے یاس ہو چکا ہوں یقین مانئے میری تیرہ بختی میرے لئے ایک لطیف لذت کی سرمایہ دار ہے اور میں اُن لوگوں پر ہنستا ہوں جو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔
(۱۷ اپریل ۱۹۰۹ء)

(۳) مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میری نیت اور میرے عمل سے متعلق ایک افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں ....

مجھے امید ہے کہ میں اپنے اخلاص و صداقت کا آپ کو قائل کرسکونگا مجھے آپ کی فطری نیکی پر ایسا ہی اعتماد ہے ....

ہمارے درمیان جو غلط فہمی ہوئی ہے اس کے متعدد اسباب ہیں اور یہی اسباب غیر شعوری طور پر آپ کے دل و دماغ پر مسلط ہیں۔ ان اسباب نے میری شومئ قسمت سے آپ کو مجھ سے اس حد تک بدظن کر دیا ہے کہ آپ مجھ پر دروغ بافی کی تہمت تک لگاتی ہیں اور میرے تعلقات کو خلوص و صداقت سے معرا سمجھتی ہیں .....

یہ میری بدقسمتی ہے کہ آپ میرے خطوط آپ سے متعلق میرے رویہ کے غلط اندازہ کی روشنی میں مطالعہ کرتی ہیں اور یہ کوشش نہیں کرتیں کہ آپ کا خیال جس غلط راستہ پر پڑ چکا ہے اس سے ہٹالیں مگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو ازراہ کرم خلوص و دیانت کی خاطر (اور اس جنس میں میری تہی مائگی مسلّم اور آپ کا دامن مالا مال ہے) اس وقت تک انتظار کیجئے کہ حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے۔ مقتضائے انصاف یہی ہے آپ منصف مزاج ضرور ہیں خواہ بعض اوقات ضد ہی کیوں نہ کر بیٹھیں .... مجھ میں اب شاعری کے لئے کوئی ولولہ باقی نہیں رہا ایسا محسوس کرتا ہوں کہ کسی نے میری شاعری کا گلا گھونٹ دیا ہے اور میں محروم تخیل کر دیا گیا ہوں۔ (۷ اپریل ۱۹۱۱ء)

(۴) گذشتہ چار یا پانچ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی حامل ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ پبلک کو انھیں پڑھنے کا حق نہیں۔ بعض نظمیں نے تلف کر ڈالی ہیں تاکہ کوئی انھیں چرا کر شائع نہ کر دے۔
(۷ جولائی ۱۹۱۱ء)

ان اقتباسات کو پڑھنے کے بعد جن کو ترادش جگر نہیں بلکہ تراوش طبع کہنا چاہیئے۔ ہر حساس دل میں گجرات والی خاتون کی عزت و ہمدردی میں زبردست اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ شریف خاتون ایک دولتمند باپ کی اکیلی بیٹی تھی اور اولاد سے بھی مایوس نہ تھی[4] کیونکر گوارا کر سکتی تھی کہ اس کا شوہر مصری کی مکھی بن جائے۔ اس لئے ہسکار رنج اور اس کا اظہار ایک فطری امر اور ناقابل برداشت جذبہ تھا۔ ان خطوط سے بھی صاف مترشح ہوتا ہے کہ علامہ خود عطیہ بیگم کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے تھے اور جب انھیں اپنی کوششوں میں ناکامی اور مایوسی نظر آئی تو سلسلہ مراسلت ترک ہو گیا اور درمیانی بیوی جو کشمیری تھیں تجدید نکاح کے بعد اقبال دولہن بن گئیں اور اب اقبال چہل سالہ بھی ہو گئے تھے۔ اس لئے بمقتضائے عمر رنگ رلیاں بھی ختم ہو گئیں۔

ملہ مجموعہ مکاتیب میں دس مکتوب ہیں جن کا سلسلہ ۱۹۰۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ دونوں بغرض تعلیم یورپ میں تھے اور اسی دوران میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور علمی مذاق کی یکسانی سے دوستانہ راہ و رسم پیدا ہوئی۔

ملہ راقم کے استفسار پر یہ جواب تحریری دیا۔

ملہ نقاط کے بعد مرتب نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ یہاں اقبال نے ایک خانگی اور ذاتی پریشانی کا ذکر کیا ہے۔

ملہ اقبال عاسف کی ولادت یورپ جانے سے پہلے ہو چکی تھی۔

نشہ ٔ عمر ما ندتا بہ سی سال
چو چل آمد فرو ریزد پر و بال

وتنعم کے اسباب سے بیزاری

"پنجاب کے ایک دولتمند رئیس نے ایک قانونی کے لئے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور دو ایک مشہور دوں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں اُن کے انتظام کیا۔ بات کہ جس وقت اقبال اپنے کمرہ میں آرام کرنے گئے تو ہر طرف عیش وتنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت قیمتی بستر پاکر معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس رسول پاک کی جوتیوں کے صدقہ میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اُس نے بوریے پر سوکر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی اس بستر پر لیٹنا اُن کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اُٹھے اور غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے میں ہی سوتے رہے۔" (فاروقی۔ سیرت اقبال ص۶۸)

یہ واقعہ بھی قوت ایجاد کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ علامہ اس سے قبل اور بعد کے زمانوں میں حیدر آباد دکن، بھوپال اور کابل کے مہمان خانوں میں رہے جو عیش وتنعم کے سامان سے آراستہ تھے مگر یہ خیال اور نہ پھر کبھی تازہ ہوا۔

غسل خانے میں جاکر بیٹھنا اور ایک سے زیادہ راتوں کا بسر کرنا بھی آمیز ہے۔ ایسے غسل خانے اتنے وسیع نہیں ہوتے۔ بشاور منہ ہاتھ دھونے کے لئے ظروف۔ صابن یا پانی کے دیگر ظروف ٹب وغیرہ یا پاٹ اور نہانے دھونے کا دوسرا سامان بھی اسی میں ہوتا ہے۔ علاوہ بریں غسل خانے میں سونا صحت کے لئے بھی مضر ہے۔ علامہ تہجد اور نماز پنجگانہ وتلاوت کے پابند تھے۔ نفیس مزاج بھی تھے۔ پھر ان کا ذاتی بستر بھی بوریہ نہ تھا۔ عیش وتنعم کا سامان جو اس خیال کی محرک ہوا میزبان کی خاطر ومدارات وناشتہ، لنچ اور ڈنر وغیرہ سب میں ہی ہوگا۔ پھر نہ تو میزبان نے اور نہ رفقا نے اس کا خیال کیا کہ یہ محترم مہمان ورفیق اس طرح کی راتیں کاٹ رہا ہے۔

شانِ فقرِ غیور

محمد طاہر صاحب فاروقی "سیرت اقبال" میں لکھتے ہیں کہ:

"ایک دفعہ سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد نے آپ کو توشہ خانہ سے ایک ہزار روپیہ کا چک بھیجا۔ چونکہ یہ دوستانہ تحفہ نہ تھا بلکہ روپیہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا جس کا لینا علامہ کی غیرت کسی طرح گوارا نہ کر سکتی تھی اس لئے آپ نے چک واپس کر دیا اور یہ شعر لکھ بھیجے:

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہ پرویز | دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر | حسنِ تدبیر سے دے آنی وفانی کو ثبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات" (ارمغانِ حجاز)

کہانی کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

"یہ فقرِ غیور کے لئے اقبال کی ہستی شاید اسلامی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہوگی۔ ایک دفعہ اقبال ڈے کے موقع پر سر اکبر حیدری وزیر اعظم دولت آصفیہ حیدر آباد نے اقبال کی ذات سے پورے ملک کی عقیدت مندی اور اس کے بلند جذبات کے اعتراف کے طور پر مگر توشہ خانہ عامرہ کے ذریعہ ایک بڑی رقم اقبال کو بھیجی لیکن اقبال نے اس بلیغ قطعہ کے ساتھ یہ رقم جوں کی توں سر اکبر حیدری کو واپس کر دی۔"

اب اس واقعہ میں سر اکبر نذر علی حیدری کے تعلقات اور دیگر امور پر بھی نظر کرنی چاہیئے۔ ۱۹۲۹ء میں جب علامہ حیدر آباد گئے تھے تو سر اکبر حیدری نے ان سے نہایت احترام ومحبت کا برتاؤ کیا اور بیگم حیدری نے اکثر اصحاب سے ملاقاتیں کرائیں۔ علامہ کے دل پر ان کے اخلاق کا نہایت گہرا اثر تھا۔ چنانچہ عطیہ بیگم فیضی کو ایک خط میں لکھا کہ:

"حیدری صاحب ایک پابند وضع اور وسیع المشرب بزرگ ہیں۔ اُن سے ملاقات کے قبل میری رائے تھی کہ وہ اعداد وشمار سے کام رکھنے والے ایک خشک طبع انسان ہوں گے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ قدرت نے اُنھیں دردِ دل اور فکرِ بلند کی نعمت سے مالامال کر رکھا ہے۔ ان دونوں کے لئے میرے دل میں بیحد احترام ہے۔" (۱۰ مارچ ۱۹۲۹ء)

اس سفر میں ایک نظم "گورستان شاہی" لکھی جس کی نثری تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

"حیدر آباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی اے معتمد فنانس جن کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربہ سے دولت آصفیہ مستفید ہو رہی ہے مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرتناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلودہ آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم ان ہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اس کو میں اپنے سفر حیدر آباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور اعلیٰ لیئق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جنھوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیام حیدر آباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔"

یہ مخلصانہ تعلقات روز بروز وسیع ومستحکم ہوتے رہے۔ ادھر سر اکبر حیدری حکومت نظام میں مسلسل ترقی کرتے رہے اور آخر میں وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے۔ وہ جب ایک معتمد رعہدے پر پہنچے تو ان کی خواہش ہوئی تھی کہ جامعہ عثمانیہ میں جو نئی نئی قائم ہوئی تھی علامہ کی قابلیت سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن علامہ ہائی کورٹ کی ججی کے متمنی تھے اور سر اکبر حیدری اُن کی اس خواہش کو بوجوہ پورا نہ کر سکے تھے مگر تعلقات اپنی جگہ بدستور تھے۔

۱۹۲۹ء میں جب علامہ پھر حیدر آباد گئے تو سر اکبر حیدری نے جو اس وقت فنانس منسٹر تھے بڑی خاطر ومدارات کی اور خود اپنے ہمراہ لے جا کر نظام سے ملاقات کرائی۔ سول سروس کی طرف سے ایک بڑا شاندار ڈنر بھی دیا گیا۔ علاوہ بریں بقول علامہ ۱۹۳۳ء میں انگلستان سے سر اکبر حیدری نے ایک خط میں لکھا تھا کہ:

"اگر حج بیت اللہ تمہاری معیت میں نصیب ہو تو بڑی خوشی کی بات ہے۔"

(خط علامہ اقبال بنام مخدوم الملک میراں شاہ ۶ اگست ۱۹۳۳ء)

ان تعلقات کو پیش نظر رکھنے کے بعد ایک ہزار کے چک کا واقعہ دیکھا جائے۔

وزارت فنانس اور وزارت عظمیٰ میں ایک مخصوص رقم اس لئے رکھی جاتی تھی کہ وزرا اور صدر اعظم مختلف اغراض کے لئے اپنے اختیار تمیزی سے مستحقین اور ضرورت مند لوگوں کو مدد دیتے رہیں۔ اور اس مد کا نام "مد تواضع" تھا۔

سر اکبر حیدری نے وزارت فنانس کے زمانے میں اس مد سے علامہ کی کئی دفعہ مدد کی مگر اس کی شکل یہ تھی کہ اپنے چک سے ادا کرتے تھے۔ اب جبکہ مارچ ۱۹۳۶ء میں وہ وزیر اعظم ہوئے تو کچھ عرصے بعد علامہ کی علالت کے زمانے میں انھوں نے ایک ہزار روپیہ منظور کیا اور غلطی سے اس کا چک دفتر سے جاری ہو گیا۔ اس رقم اور نظم کے متعلق ارمغان حجاز کے ص۲۲۰ پر جس کا حوالہ سیرت میں بھی ہے یہ نوٹ ہے:

"یوم اقبال کے موقع پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے تحت ہے ایک ہزار روپیہ کا چک بطور تواضع موصول ہونے پر۔"

ارمغان حجاز علامہ کی رحلت کے چھ ماہ بعد نومبر میں جاوید اقبال صاحب نے شائع کی مگر چک کی واپسی کا وہ ذکر نہیں کرتے۔ یوم اقبال ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو حیدر آباد میں دو نہایت عظیم الشان جلسے منعقد ہوئے تھے۔ اور حیدر آباد کی حالت دیکھتے ہوئے قیاس بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ معمولی رقم اتنا اہم اور وہ بھی اقبال کی ذات سے پورے ملک کی عقیدتمندی اور بلند پایہ خدمات کے اعتراف میں بھیجی گئی پھر یہ کہ نظم میں جو استعارات وتلمیحات ہیں وہ کسی رقم پر منطبق نہیں ہوتے۔ شکوہ پرویز۔ ملوکانہ صفات شہنشاہی۔ حسن تدبیر۔ زکات خدائی۔ تو ایک مقتدر اور با اختیار عہدے پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ علامہ کا یہ قطعہ دراصل عرفی کے اس شعر کا جواب ہے:

گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن صدقہ نہ شرط انصاف است

بلاشبہ ان کا تخیل عرفی سے بہت بلند ہے مگر چک کے واقعہ کے ساتھ چسپاں نہیں ہوتا۔

بھوپال سے جو وظیفہ مقرر ہوا علامہ اسکو بھی ظاہر کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ اور اس کے اخفا کی سخت تدغن تھی (ملاحظہ ہو خطوط سر راس مسعود) اس پر قیاس کرنا پڑتا ہے کہ ان کی افتاد طبع کیا تھی اور یہ کیا نہیں ہو سکتا کہ حقیقی شانِ فقر غیور کیا تھی؟

ایک طرف سر اکبر حیدری کا سفر حج کے متعلق وہ خط ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے دوسری طرف ہمارے سامنے جاوید نامہ کی وہ نظم ہے جس کا عنوان ہے۔

"روح انسان نالہ وفریاد می کند"

مرد جعفر زندہ روح او ہنوز	کے شبِ ہندوستاں آید بروز
آشیاں اندر تنِ دیگر نہد	تا ز قیدِ یک بدن وامی رہد
گاہ جیش دیریاں اندر نیاز	گاہ او را با کلیسا سازِ باز

دین او آئین او سوداگری است
عنتری اندر لباس حیدری است

چوتھے شعر میں کتنا صاف اور واضح حملہ ہے جس کی کوئی اور تاویل کرے مگر بظاہر یہی سمجھا جائے گا کہ علامہ کے ذہن میں ان کے دوست حیدری (سر اکبر نذر علی) ہی تھے۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء

، جبکہ علامہ حیدرآبادی توقعات سے مایوس ہو چکے تھے
زر اس مسعود کے نام کے خطوط سے ظاہر ہے علاوہ
ل کانفرنس میں دونوں کے درمیان تلخ گفتگو بھی ہوئی

کے سلسلہ میں ایک اور بیان ہے کہ :-
قت ہے کہ اُن کی زندگی میں کسب مال اور حصول
ں ہزاروں مشکلیں پیدا ہوئیں لیکن ان کی استغنا پسند
طبیعت نے اپنی غیرت و خودداری میں کبھی آنکھ
، کی طرف نہیں دیکھا وہ کسی قسم کے نقصان مفت
زحمت ہوئی کو تصور میں بھی برداشت نہیں کر سکتے

ت لکھتے ہیں کہ :-
ے انہوں نے وکالت ترک کردی تھی ۱۹۳۴ء
لالت کی تکلیف سے ان کے لئے لکھنا پڑھنا تقریباً
تھا۔ اس طرح اب ذریعہ معاش باقی نہ رہا تھا۔ ان کی
۔ مالی حالت خستہ ہو گئی تھی۔ پوری عمر میں
ہو تا تھا کہ ایک ہی دفعہ یکمشت پچیس تیس ہزار
یں اپنی تصانیف سے حاصل ہوئے تھے جس سے
ز جاوید منزل تعمیر کی۔ اس کے سوا اُن کے پاس
ستہ نہ تھا اب پیری و علالت دونوں نے مل کر یک
ر حملہ کردیا تھا۔ مالی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ بڑی تکلیف
، زمانہ میں نواب صاحب بھوپال نے محض اپنے
ات دوستی و محبت کے تحت اپنی جیب خاص سے
پیہ وظیفہ ماہانہ مقرر کردیا۔ اس کے بعد ہز ہائنس
نے بھی انھیں وظیفہ دینا چاہا اور دیگر ذرائع سے
الی امداد کی کوششیں کی گئیں لیکن اُن میں سے
، اُنہوں نے قبول نہیں کیا۔ (یہ بیان سیاسی کارنامہ
کے خلاف ہے۔ آئندہ باب میں بھوپال کے وظیفہ کا ذکر
ہ کیا گیا ہے۔

کے کیسۂ زر سے انکار

کے عقیدت مندوں اور معترفوں نے ایک اور
ے کے موقع پر قوم کی جانب سے اقبال کی بارگاہ
ہ تسری کا ایک مادی ثبوت پیش کرنے کے لئے
کیسۂ زر نذر کرنے کی تجویز پیش کی اس تحریک نے
ری کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ اقبال کو جب اس
لاع پہنچی تو انھوں نے اس کے بانیوں کو لکھا کہ
نیت کے درد کی دوا اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ
ئے درد کا شریک اور مشاکل حیات اور زندگی کی
سے اپنے بل بوتے پر نپٹنے اور ان کو اپنے زور
حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ عیش و تنعم کی زندگی
نام سے محروم کردیتی ہے وہ پھر انسانیت کے
، دوا نہیں بن سکتا۔ آج اگر اقبال آپ کی نظر میں
ی کوئی خدمت کر رہا ہے تو یہ محض اس وجہ سے
کے آلام میں خود شریک ہے تو کیا یہ کیسۂ زر
، قوم کو اقبال سے محروم کردینا چاہتے ہو انہی نے

اس تحفۂ زر کے لینے سے انکار کردیا۔ اور معطیوں کو اُن کے
عطیئے واپس کئے گئے۔

چوں بہ کمال میرسد فقر دلیل خسروی است
مسند کیقباد را در تہ بوریا طلب

صمدیت کی اس بلند شان کا مظاہرہ اقبال نے اس وقت کیا
ہے جب کہ وہ اپنے فکری استغراق اور گوناگوں امراض کی
وجہ سے کسب معاش پر توجہ نہ دے سکتے تھے اور انتہائی
تنگدستی سے زندگی بسر کر رہے تھے قلبی حملوں نے ان
کی زندگی کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا۔ ......
"تنگدستی اس کی فقیرانہ غیرت کے لئے ہمیشہ ایک مہمیز کا
کام دیتی تھی۔ اور جتنی زیادہ تنگدستی کا اس پر بوجھ پڑتا اتنی
ہی زیادہ اس کی خودداری نمایاں ہوتی تھی اسی قسم کے
ایک امتحان کے موقع پر اس نے اپنے پیرو مرشد رومی کی
جانب رجوع کیا تھا رومی کا جب یہ جواب اُس کو ملا
کہ :-

بندۂ یک مرد صاحب دل شوی
بہ کہ بر فرق سر شاہاں روی

تو اقبال کی شان صمدیت میں چار چاند لگ گئے اور اُس نے
دریا کے بلبلوں سے غیرت مردانہ کا ایک نادر سبق حاصل کیا

چوں حباب از غیرت مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش"

اقبال نے اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے ابتلائی دور
میں جس خودداری بے نیازی اور عظمت نفس کا ثبوت دیا
ہے اس سے اس کے فکر اور عمل کی یکسانیت کا پتہ چلتا
ہے اس نے اپنے عمل کو اس فکر کے مطابق بنائے رکھا

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیز وجود من
نہ گیرم گر مرا بخشی حیات جاودانی را"

(رکھائی)

اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے (جیسا کہ ادعا کیا
جاتا ہے) کہ اقبال میں ایک خاص مذہبی جوش اور ملی ولولہ تھا،
ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق مستقبل کے خطرات کا
احساس بدرجہ اتم تھا۔ طرابلس و بلقان اور ترکی و فلسطین کے
بھائیوں کا دل میں درد تھا۔ فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کی اہمیت
و ضرورت بھی پیش نظر تھی جس کے لئے مصر و شام اور عرب سے مواد
بھی جمع کیا تھا۔ ان کی تجویز تھی کہ اسلام کو خطرہ سے نکالنے کے لئے
ایک بہت بڑا نیشنل فنڈ ہو جو مسلمانوں کے تمدنی اور سیاسی
حقوق کی حفاظت اور دینی اشاعت پر خرچ ہو مسلمانوں کی
دینی اور سیاسی اعتبار سے تنظیم کی جائے۔ قومی عساکر بنائے
جائیں مسلمان اخباروں کو قومی کیا جائے، اور ان تمام وسائل سے
اسلام کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے اس کا مستقبل محفوظ کیا جائے اور
ان امور کے متعلق حوصلہ و عزم یہ تھا کہ

"اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لئے مجھے اپنے کام چھوڑنے
پڑیں تو انشاء اللہ چھوڑ دوں گا۔ اور اپنی زندگی کے باقی ایام
اسی ایک مقصد جلیل کے لئے وقف کردوں گا"

(خط بنام منشی صلاح محمد صاحب، ۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء)

وہ ایک ایسا اسلامی اقامتی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے کہ :

"جس میں علوم جدیدہ و دینیہ کے فاضل ماہر جمع کئے جائیں
جو اپنی زندگیاں اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے
پر تیار ہوں" (خط بنام شیخ جامعہ از ہر ۱۹۵۱)

اس موقع پر خیال ہوتا ہے کہ یہ بیش کیسۂ زر ان اہم مقاصد پر صرف
ہو سکتا تھا۔

اقبال کی عزت و استغنا اور طرز — وائسرائے کی ایک دعوت سے انکار

سے متعلق واقعات میں ایک یہ واقعہ بھی قابل لحاظ ہے کہ :-

"ایک دفعہ دلی میں وائسرائے سے ان کی ملاقات ہوئی۔
وائسرائے نے اُن سے کہا کہ کل کھانا میرے ساتھ کھایئے۔
.... علامہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کل دلی سے لاہور
چلا جاؤں گا اس لئے آپ کی دعوت قبول نہیں کرسکتا۔"

(۱۴۴۰۔ سیاسی کارنامہ)

لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ ملاقات کہاں اور کب ہوئی، کون وائسرائے
تھا، خود اقبال نے یہ روایت بیان کی یا کسی اخبار میں مشتہر ہوئی اس
مجبوریت پر درایتاً نظر ڈالی جائے۔

وائسرائے سے ملاقاتوں اور دعوتوں کے آداب و ضوابط مقرر
تھے، سرکاری ڈنر پر جن کو بلانا مقصود ہوتا تھا ان کو کافی عرصہ پہلے
اطلاع دی جاتی تھی اور اس کا جواب بھی لازمی ہوتا تھا۔ پرائیویٹ
دعوت کے لئے ملٹری سیکرٹری خط بھیجتا تھا، یہ ایک معمول واقعہ تھا
اور اقبال کا دعوت میں مدعو کیا جانا ان کے مرتبہ کے مطابق تھا
مگر سوانح نگار نے ایسے رنگ میں پیش کیا جس کو طبیعت قبول
نہیں کرتی اسی طرح کا ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ :-

ایک معزز عہدہ سے انکار

"ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا
ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ
پیش کیا مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بی بی کو پردہ نہ کرائیں گے
اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک
ہوا کریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ
قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اور خود لارڈ ولنگڈن
(وائسرائے وقت) سے کہا کہ میں بے شک ایک گنہگار آدمی
ہوں احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوئی
ہیں مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کرسکتا کہ محض آپ کا
ایک عہدہ حاصل کرنے کے لئے شریعت کا حکم توڑ دوں"

(۲۲۲۔ سیاسی کارنامہ)

اگرچہ اس باقاعدہ پیش کش کا کوئی زمانہ متعین نہیں کیا گیا لیکن وائسرائے
کا نام تحریر ہے۔ اور یہ وائسرائے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک رہا تو اس
زمانہ میں یہ عہدہ پیش ہوا، اگر باقاعدہ طور پر اقبال کو
اطلاع دی گئی تو اس میں سرکار کا اندراج بھی ہوگا۔ جواب بھی
باقاعدہ تحریری ہوگا۔ ان کا اقتباس و حوالہ ضروری تھا، اور اسلوب

۱۔ سر آغا خاں کا وظیفہ جاوید کے نام چاہتے تھے۔

شکوکس موقع پر ہوئی یہ مجہول ہے اور جواب بھی نہ صرف
سے کے آداب بلکہ اخلاق کے خلاف ہے، اور پھر یہ زمانہ
ہ علالت کا تھا اور ایک رفیقۂ حیات کی دائمی جدائی سے
ی ذمہ داری کا تھا اور دو تین سال سے علامہ مرحوم بیمار
ہے تھے، ابتدا میں سنگ گردہ کی شکایت تھی جس میں حکیم نابینا
کے علاج سے فائدہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں آپ عید کی
ہ کر واپس آئے تو گرم دودھ میں سوئیاں اُبال کر کھائیں تو
ہ عجب اثر پیدا ہوا کہ آواز بیٹھ گئی لاکھ ڈاکٹری علاج کئے مگر
رد ہوا، آخر حکیم نابینا صاحب کی دعا سے اس شکایت میں
ت ہو گئی، درد گردہ اور نقرس کے دورہ ہوتے رہتے تھے،
میں آپ کی رفیقۂ حیات آپ سے جدا ہو گئیں۔ اس کے بعد
دم کشی اور ضعفِ قلب کی تکالیف مستقل طور پر رہنے لگی
تھوڑا سا چلنے پر بھی سانس پھول جاتا تھا، گویا ۱۹۳۱ء تا
ہ زمانہ علالت ہے۔

کا خطاب "نائٹ ہڈ"

علامہ اقبال کے خطاب "سر" کو بھی سوانح نگاروں نے ایک خاص موضوع
ت بنالیا ہے۔

"خطاً عام طور سے مشہور ہے کہ حکومت کے کاسہ لیسوں کو
خطابات ملا کرتے ہیں، یہ خطاب ایک ایسے شخص کو ملا جو
ملوکیت کا سخت دشمن اور جمہوریت کا زبردست حامی آزادی
کا علمبردار اور انقلاب کا نقیب تھا۔"

ن میں ایک انگلستانی صحافی بھی نمایاں ہوتا ہے جس کا کوئی نام
نہیں بتایا گیا مگر ادبی دنیا میں کافی شہرت رکھتا تھا اور ممالک
ی کی سیاحت کرتا ہوا لاہور پہنچا تھا اور گورنر کا مہمان تھا اور
کو ترکی سے افغانستان تک جس اسلامی قلمرو میں گذرنے کا
ق ہوا تھا ڈاکٹر اقبال کا نام ہر جگہ سننے میں آیا تھا اُس نے
ان سے علامہ کی ملاقات کی خواہش کی مگر اربابِ حکومت چونکہ
سے ادبی مشاہیر سے بے خبر ہیں اور ان کے کارناموں سے
شنا ہوتے ہیں اس لئے کچھ تعجب نہیں اگر گورنر پنجاب اقبال
ظمت سے ناواقف نکلا، تاہم اخبار نویس نے انھیں مجبور کیا کہ
ورنمنٹ ہاؤس میں چاء پر علامہ کو مدعو کر کے ان کی صحبت سے
فیضیاب ہونے کا موقع دے چنانچہ علامہ ایک دوست کے اصرار پر گئے
روہی گورنمنٹ ہاؤس تک پہونچا بھی آئے، علامہ ملاقات
ہ بعد سیدھے اُن کے یہاں گئے اور متذکرہ بالا واقعہ
ن وعن سنایا۔

اس کے چند دن بعد آپ کے روبرو "خان بہادر" کے خطاب
ی تجویز پیش کی گئی جسے آپ نے ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد شمس العلما
ی تجویز ہوئی اُسے بھی آپ نے رد کر دیا، بالآخر جب نائٹ ہڈ کی
تجویز ہوئی تو اس کو قبول کرنے میں بھی آپ کو تامل تھا لیکن نواب
سر ذوالفقار علی خاں کے اصرار پر اس پر رضامند ہو گئے۔

ذکر اقبال کے مصنف نے نواب سر ذوالفقار علی خاں کو ہی اس
خطاب کا محرک بتایا ہے کہ اُن سے اور سر میکلاگن گورنر سے گہرے
تعلقات تھے انھوں نے ایک دن بنگال کے مشہور شاعر ٹیگور کی مثال
دے کر اور اقبال کی قابلیت شاعری وغیرہ دکھا کر قدر دانی سے محرومی کا
ذکر کیا، گورنر نے پہلے خان بہادر اور پھر شمس العلماء کا خطاب تجویز کیا

مگر نواب موصوف نے نامناسب قرار دیا۔ استنے میں گورنر نے علامہ
کو گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کیا جب علامہ پہنچے تو بڑے تپاک سے ملاقات
کی اور بتایا کہ لندن ٹائمس کے ایک مقالہ نگار میرے مہمان ہیں اور
آپ سے ملنے کے خواہاں ہیں، اس مقالہ نگار نے اسرار خودی کا انگریزی
میں ترجمہ پڑھا تھا اور مشرق وسطیٰ کے جن جن ملکوں میں گیا تھا اُن کے
علمی و ادبی حلقوں میں علامہ اقبال کے کمالات کا چرچا سن آیا تھا اسکے
علاوہ اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کے متعلق علامہ کی رائے معلوم کرنا
چاہتا تھا۔

یہ صحبت دو تین گھنٹہ جاری رہی آخر میں سر ایڈورڈ میکلاگن نے علامہ
سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی ادبی خدمت کے صلہ میں آپ کے لئے
سر کے خطاب کی سفارش کروں، علامہ نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں خطابات
و اعزازات کے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ علامہ نے دیکھا کہ اُن کے انکار
سے گورنر کی طبیعت مکدر سی ہو گئی اور یہ قدرتی بات تھی کہ ملکی عوام میں
سیاسی لیڈروں نے خطابات کے خلاف نفرت پیدا کر رکھی تھی اور لوگ
عام طور پر خطاب کو غیر ہر دلعزیزی کا سامان سمجھنے لگے تھے، گورنر سمجھے کہ اقبال
بھی اس معاملہ میں عوام کے ہی ہم خیال ہیں لیکن جب علامہ نے کہا کہ اگر
آپ کو اصرار ہے تو خیر یوں ہی سہی۔ تو گورنر صاحب کے چہرہ پر خوشی کے
آثار نمایاں ہو گئے۔

دونوں روایات میں جو اختلاف اور مجہولیت ہے ذرا سا غور کرنے
سے معلوم ہو جاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ حکومت اہل علم و فضل کو بھی ایسے اعلیٰ خطاب سے نوازتی
تھی اور اب تک جن کو سر کا خطاب ملا تھا ان میں کسی مسلمان کا نام نہ تھا
علامہ اپنی تصانیف و شاعری کی وجہ سے یورپ میں بھی مشہور تھے۔ خود
علامہ نے اپنے خط موسومہ شاد ۱۲ جنوری ۱۹۲۳ء میں لکھا ہے کہ:-

"یہ اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ہونے اور اس پر یورپ اور
امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے۔ دنیوی نقطۂ نگاہ سے یہ ایک
قسم کی عزت ہے مگر ہر عزت فقط اللہ کے لئے ہے؟"

اکتوبر میں وائسرائے نے پنجاب ہائی کورٹ کے افتتاح کے موقع پر اپنی تقریر
میں علامہ کی تعریف بھی کی تھی اس کی نسبت شاد کو لکھتے ہیں کہ:-

"تقریر نہایت دلکش اور نہایت عمدگی سے ادا کی گئی۔ اقبال
کی تعریف سے سب کو تعجب ہوا کہ اس کی توقع نہ تھی اخباروں
میں ایجی ٹیشن کہ یہ تقریر سرکار والا کی نظروں سے گزرے گی"

مولانا عبدالماجد کو اس خطاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

"آپ کے مختصر الفاظ نے اس موقع پر میرے جذبات کی نہایت
صحیح ترجمانی کی ہے۔ حالات مختلف ہوتے تو میرا طریق عمل بھی
اس بارے میں مختلف ہوتا لیکن یہ بات دنیا کو عنقریب معلوم
ہو جائے گی کہ اقبال کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا، ہاں کھلی
کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے"

اس وقت تک اقبال سیاسیات سے الگ تھے اور تحریک ترک موالات
کی بھی تعلیمی حیثیت سے بحیثیت معتمد اسلامیہ کالج انھوں نے سخت مخالفت
کی تھی۔

نہ ملوکیت کے دشمن تھے نہ جمہوریت کے نقیب۔ خود ان ہی کی
چند نظموں سے ظاہر ہے کہ اعلیٰ حکام اقبال کی عظمت سے واقف تھے
اور ان کو خطاب کا بہر صورت استحقاق بھی تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کے سر محمد شفیع اور سر فضل حسین سے بہت
گہرے تعلقات تھے اور سر شفیع تو اس وقت حکومت ہند کے ممبر قانون
و تعلیم بھی تھے، دہلی کی جدید یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر عبدالرحیم
جو صرف قانون پیشہ تھے سر کا خطاب تجویز ہوا تھا۔ اقبال تو بار ایٹ لا بھی
تھے، اور علمی شہرت رکھتے تھے۔ اس لئے سر شفیع کی نسبت جو بعض اصحاب کا
خیال ہے کہ وہ محرک تھے صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس خطاب کے لئے
بھی قاعدہ تھا کہ اگزیکیٹو کونسل کا کوئی رکن سفارش کرے اور حسب الشرائط
بھی منظور کر لے تو صوبہ کے گورنر سے بھی دریافت کیا جائے کہ اس کو تو
کوئی اعتراض نہیں اس سلسلہ میں گورنر بھی آتا ہے۔

عزم و عمل

نظم میں تو علامہ کی ہمت اس قدر بلند تھی کہ دوسرے انسان
کے خیال کی رسائی بھی وہاں تک ممکن نہیں لیکن عمل میں
اس کی سطح نیچی نظر آتی ہے۔

مثلاً ایک اعلیٰ مقصد سے ۱۹۲۹ء میں ممالک اسلامیہ کے سفر کا
عزم کرتے ہیں۔

"اب باوجود مالی مشکلات کے ایران و ترکی کے سفر کی تیاری
میں مصروف ہوں خدا تعالیٰ پر بھروسہ ہے اور میں اُمید
رکھتا ہوں کہ اس سفر کے لئے جو میں محض اسلام اور مسلمانوں
کی سربلندی کے لئے اختیار کر رہا ہوں زاد راہ میسر آ جائے گا"

(۳ جنوری ۱۹۲۹ء)

"میں ترکی اور مصر کے سفر کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں
جیسا کہ آپ جانتے ہیں "زر کی قلت" والا معاملہ ہے اور
ہندوستان کے مسلمان امراء اسلام کی راہ میں خرچ کرنے
کی ضرورت و اہمیت سے قطعی ناآشنا ہیں"

(۳۰ مئی ۱۹۲۹ء)

"ابھی تک اسلامی ممالک کی سیاحت کا کوئی امکان نظر نہیں
آتا مالی مشکلات ہنوز سدِ راہ ہیں" (۱۱ اگست ۱۹۲۹ء)

(خطوط بنام محمد جمیل بنگلوری)

غرض یہ سدِ راہ حائل ہی رہی اور دور نہ ہوئی، لیکن مسلمان امراء کی ناشناسائی
ضرورت کی شکایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید بعض امراء سے زادِ راہ کے لئے
خواہش کی ہو۔ کاش وہ اس خدمت کا اعلان کر دیتے تو یقیناً امراء کا فرار
ہی اس کو پورا کر دیتے اور ایک لاکھ کیسۂ زر والے ان مشکلات کو دور
کرنے کے لئے بے تابانہ آگے بڑھتے۔

اس کے ساتھ ایک ایسے عزم کو بھی دیکھئے جس کا تعلق دینی
جذبات سے تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اکبر کو لکھتے ہیں کہ:-

"خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارت روضۂ رسولؐ نصیب کرے
مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھئے
کب جوان ہوتی ہے" (مجموعہ مکاتیب اقبال صفحہ ۔)

ربع صدی بعد ۱۵ جنوری ۱۹۳۶ء کو خط موسومہ سید راس مسعود
لکھتے ہیں کہ:-

"اس سال دربارِ حضورؐ میں حاضری کا قصد تھا مگر بعض موانع پیش
آ گئے انشاء اللہ امید کہ سال آئندہ حج بھی کروں گا اور دربار
رسالت میں بھی حاضری دوں گا"

مگر افسوس کہ یہ آرزو ۲۵ سال میں بھی جوان نہ ہو سکی حالانکہ مالی مشکل
اتنی آسان ہو گئی تھیں کہ تمام عمر کا اندوختہ نادر شاہ کی نذر یا اعطا
کے پیش کیا اور پچیس ہزار روپیہ سے جاوید منزل تعمیر کی۔

ہر ایک آسان سفر کا موقع ملا جب کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے خرچ پر
سے یروشلم گئے، اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ علامہ یہ
ہیں کہ :-

"مدینۃ النبیؐ کی زیارت کا قصد تھا مگر میرے دل میں یہ خیال
عاجز ہیں ہو گیا کہ دنیوی مقاصد کے سفر کرنے کے ضمن میں حرم
نبوی کی زیارت کی جرأت کرنا سوء ادب ہے، اس کے
علاوہ بعض مقامی احباب سے وعدہ تھا کہ جب حرم نبویؐ کی
زیارت کے لئے جاؤں گا تو وہ میرے ہم عناں ہوں گے ان
دو خیالوں نے مجھے باز رکھا ورنہ کچھ مشکل امر نہ تھا۔"

(خط مولوی محمد صالح صاحب ۱۹ فروری ۱۹۳۳ء)

اقبال کے سیرت نگار یہ بیان نہیں کرتا کہ ان متذکرہ اعلیٰ مقاصد کے لئے
اقدامات ہوئے ۔ یا یہ کہ کیا موانع تھے کہ جن کی وجہ سے عمل پیرا نہ
ہو سکے، اور پھر یہ کہ ایک ایسا نادر موقع بھی آ گیا تھا کہ ایک معقول رقم
ایک لاکھ بصورت کیش زر حاصل ہو رہی تھی جس کو ان میں سے
کسی ایک مقصد پر صرف کیا جا سکتا تھا اس کو کیوں ضائع کر دیا؟ اُن
سے پہلے ایسی مثالیں نہیں کہ بعض مشاہیر کو تھیلیاں پیش ہوئیں۔ اور
انہوں نے قبول کر کے اُن کی رقم قومی مقاصد پر صرف کیں، اس فنڈ
کو مستقل فنڈ کا سرمایہ بنایا جا سکتا تھا جس سے کام شروع ہو جاتا
اور بتدریج اضافہ پذیر ہوتا یا پنجاب کے کسی گاؤں میں جیسا کہ خیال
تھا اسلامی اقامتی ادارہ کی بنیاد ڈالتے ۔ یہ ایسا مقدس عزم تھا کہ جس
کو ہر طرف سے یقیناً مالی امداد ہوتی ، افسوس ہے کہ تھیلیاں لے لینے
کے بعد واپس نے لیے اور کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ وہ اقبال کے ہی
تجویز کردہ عزائم میں سے کسی ایک مقصد پر صرف کریں۔

جو ادارہ وہ قائم کرنا چاہتے تھے اس کا اقدام بھی نہ ہوا، البتہ
پٹھانکوٹ میں چودھری نیاز علی نے پٹھان کوٹ میں ایک دارالاسلام
کی بنیاد رکھی تھی اُن کو علامہ لکھتے ہیں کہ :-

"اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے جن
لوگوں کو کچھ احساس ہے اُن کا فرض ہے کہ اس کی
حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں انشاء اللہ
آپ کا ادارہ اس مقصد کو بہ احسن وجوہ پورا کرے گا۔
علما میں مداہنت آ گئی ہے یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے
صوفیا اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں
اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور
ذاتی عزت و منفعت کے سوا کوئی مقصد اُن کی زندگی کا
نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود مگر کوئی ان کا بے غرض رہنما
نہیں ہے۔" (۱۰ محرم الحرام ۱۹۳۸ء)

اچھا ہوتا کہ ان حالات میں علامہ خود رہبری کرتے اور ایک نمونہ
دکھا دیتے۔

اہم تصنیف کا ارادہ

علامہ اقبال کی وفات کے ساتھ ہی یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ وہ اپنی زندگی
کے آخری دنوں میں ایک ایسی کتاب کی تصنیف کا ارادہ رکھتے تھے جس
میں بتایا جائے کہ اسلام کیا ہے اور اس کے قوانین کس طرح دورِ حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ کئے جا سکتے ہیں۔ بعض جلسوں میں یہ بھی کہا
گیا کہ انہوں نے اس کتاب کا بیشتر حصہ لکھ لیا تھا لیکن دیگر حضرات
نے اس کی تردید کی اور کہا کہ انہوں نے اس کتاب کے صرف عنوانات
اور ابواب قائم کئے تھے اور ان کے ساتھ کچھ تشریحی نکات لکھے تھے۔

کچھ دن ادھر اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پنجاب اسمبلی کے
رکن محترم محمد شفیع صاحب نے علامہ اقبال کے اپنے ہاتھوں کے لکھے
ہوئے کچھ نوٹس اقبال اکیڈمی کراچی کو دیے ہیں۔ یہ نوٹس اس کتاب
کے متعلق ہیں جس کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمیں ان نوٹس کی ایک نقل
محترم ممتاز حسن صاحب سکرٹری وزارت مالیات حکومت پاکستان کی
حسن وساطت سے ملی ہے واضح رہے کہ علامہ اقبال نے اپنی پیش نظر
کتاب کے بعض عنوانات لکھے تھے اور کہیں کہیں ایک ایک دو دو لفظوں
میں یہ بھی لکھا تھا کہ فلاں عنوان کے تحت کیا کچھ لکھا جائے گا اس سے
زیادہ انھوں نے ان نوٹس میں کچھ نہیں لکھا۔ ان نوٹس کو پھیلا کر ایک
مفصل مضمون بھی مرتب کیا جا سکتا تھا۔

بعض مقامات پر بات مبہم بھی رہ گئی ہے، اس لئے کہ حضرت علامہ
نے ان نوٹس کو محض اپنی یادداشت کے لئے لکھا تھا۔ دوسروں کو دکھانے
کی غرض سے نہیں لکھا تھا۔ نیز بعض مقامات پر اُن کی تکرار بھی ہو گئی
ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس ضمن میں جو جو باتیں اُن کے ذہن
میں آتی رہتی تھیں وہ انھیں بطور یادداشت نوٹ کرتے رہتے تھے۔

مگر ۱۹۱۷ء میں سرکشن پرشاد کو عدالت العالیہ حیدرآباد کی ججی کے
سلسلہ میں جو خط لکھا ہے اس میں ایک مفصل کتاب فقہ اسلام پر
بزبان انگریزی کی تصنیف کا بیان ہے اور اس کے لئے معو شام
سے بھی مواد جمع کرنے کا ذکر کیا ہے۔ دوسری کتاب قرآن مجید کے
تفسیری نوٹ ہیں جس کے متعلق سید راس مسعود کے خطوط میں
جذبہ و جوش کا اظہار ہے۔ اسی غرض سے ہزہائی نس نواب صاحب
بھوپال نے وظیفہ بھی مقرر کیا تھا اور جو لکھنا چاہتے تھے اس پر برسوں
غور بھی کیا تھا مگر اس کے لئے بظاہر کوئی عملی اقدام نہیں ہوا۔

اقبال اور ملّا

مذہبی مباحث کے سلسلہ میں یہ لکھنا بھی شاید غیر موزوں نہ ہو گا کہ ملّا، صوفی، عالم، فقیہ اور واعظ و ناصح جو قدیم الایام
سے ہمارے شاعروں کے تیروں کا نشانہ رہے ہیں، ان پر علامہ اقبال
نے بھی کچھ کم تیر نہیں برسائے اور ایک فاضل ادیب ڈاکٹر خلیفہ
عبدالحکیم نے ان تیروں کو جمع کر کے ایک دلچسپ مقالہ "اقبال اور
ملّا" مرتب کیا جس میں خود ان کی توضیحات و تشریحات نے لطف دوبالا
کر دیا ہے۔

انھوں نے ایک موقعہ پر فقہ کی تشکیل جدید کی ضرورت پر بھی علامہ اور علماء
کے خیالات ظاہر کرتے ہوئے علامہ کے ایک فتویٰ کا ذکر کیا ہے کہ ایک
ہندو بیرسٹر نے محض اپنے مطالعہ سے اسلام قبول کیا تھا وہ علامہ کے
پاس آئے اور انھوں نے اپنی اس مشکل کا حل چاہا کہ :-

"میں بیوی بچوں والا ہوں میری بیوی بہت اچھی اور
نیک ہے اس کا فوراً مسلمان ہو جانا زیادہ دشوار ہے
اور میں ایسا تقاضا بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ اس سے گھر کی
پُر امن فضا میں فساد پیدا ہو جائے گا اور بچوں پر بھی اثر پڑے گا
اس نے یہ بھی کہا کہ تمام مولوی صاحبان جن سے میں نے
پوچھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اب وہ تم پر حرام ہو گئی ہے۔ اس
کو الگ کر دو۔"

اقبال نے کہا کہ :-

"دیکھو ہرگز ایسا نہ کرنا وہ بیوی تمہارے لئے بالکل جائز اور
حلال ہے بلکہ پہلے سے بہتر سلوک کرو تاکہ اس کو معلوم ہو کہ
مسلمان ہونے سے آدمی زیادہ بہتر انسان ہو جاتا ہے۔ اب تم کسی
مولوی سے نہ پوچھنا میں نے جو کچھ تمہیں کہا ہے وہ عین اسلام
ہے خواہ کسی فقہ کی کتاب میں درج نہ ہو۔"

اسی ضمن میں خود مقالہ نگار نے اپنا واقعہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے
ایک ایسے ہی موقع پر اقبال والا فتویٰ سنا کر نو مسلم ہندو کو جو بیوی
بچوں والا تھا مطمئن کر دیا۔ ہندوؤں کے اہل کتاب ہونے کی بحث
چھیڑ دیں۔ (اقبال اور ملّا)

اس جدید فقہی مسئلہ و فتویٰ کے مطابق برعکس صورت یعنی مسلم
اور ہندو شوہر میں بھی ہندو حلال ہو گا۔ علامہ غالباً مہاراجہ سرکشن پرشاد
کا یہ فعل کہ انھوں نے ایک مسلم عورت کو بیوی بنایا جائز سمجھتے ہوں گے
اب اگر علامہ کی فقہ کی تشکیل جدید کا یہی نمونہ ہے تو بہت اچھا ہوا کہ
کتاب مرتب نہ ہوئی جس کے لئے وظیفہ بھوپال مقرر ہوا تھا اور اہل
مسلمان ایک بہت بڑے اور نئے فتنے سے محفوظ رہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تفقہ کے لئے قرآن و حدیث کی کامل تفہیم
سیرت نبوی صلعم اور آثار صحابہ کا عمیق مطالعہ لازمی ہے اور ان علوم
اقبال کے تعلیمی حالات سے ظاہر ہے صرف معمولی طور پر عربی پڑھ لینے
سے تفقہ کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی جب تک حدیث کی تکمیل نہ کی ہو۔ یہی
سبب یہی وجہ ہو کہ وہ ۲۰ سال میں بھی باوجود عزم قوی و شدت احساس
فراہمی کتب چند صفحے بھی نہ لکھ سکے۔

انھوں نے خود بھی مولوی سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا۔

"میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے البتہ فرصت
اوقات میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ
ہو۔" (مکاتیب اقبال)

عملی زندگی پہ اعتراضات اور جواب

۱- اقبال کی عملی زندگی کی نسبت اُن کی حیات ہی میں اعتراض ہوتے رہتے تھے۔

"ایک بار بلوچیوں کا ایک وفد علامہ کی خدمت میں آیا مختلف
سیاسی معاملات پر دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ وفد
کے ایک ممبر نے کہا کہ آپ کی تعلیمات نے مدت کی سوئی ہوئی
قوم کو بیدار کر دیا اور آپ نے انسانیت اور اسلام کے تمام
اسرار و رموز ہم کو سکھا دیئے۔ لیکن ہمیں شکایت ہے کہ
آپ نے خود نمونہ عمل پیش نہیں کیا۔"

سر اقبال نے جواب میں فرمایا کہ :-

"کیا یہ میرا عمل نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا ہے اور
تمہارے سامنے عمل کی شاہراہ پیش کر دی ہے میرا کام تو
درس دینا ہے آگے یہ تمہارا ذمہ ہے کہ ان تعلیمات پر عمل کرو اور
میدانِ زندگی میں جہاد کرتے رہو۔"

پھر آپ نے فرمایا کہ :-

"دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی شخص نے خود ہی کوئی
نظریہ قائم کیا ہو اور خود ہی اس پر عمل کر کے دکھایا ہو کیا
آپ تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں؟"

اس کے بعد کچھ دیر تک سکوت کر کے خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے
اور فرمانے لگے :-

البتہ دنیا میں صرف ایک ہی ایسی ہستی گرامی ہے کہ جس نے

لے ۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء

ایک درس اور پیغام پیش کیا اور پھر خود ہی اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آپ لوگ جانتے ہیں وہ شخصیت کون تھی، وہ ذات محمد عربی صلعم کی تھی یا پھر مثال میں حضرت موسیٰؑ کا نام لیا جاتا ہے۔"
(سیرت اقبال۔ صفحہ)

۔ ایک اور جواب بھی قابل ملاحظہ ہے جو مولانا محمد علی (مرحوم) کو دیا۔
"تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے۔ لیکن سننے والے پھڑکتے ہیں، وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں۔ لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جانے میں تو قوم کا قوال ہوں، میں گاتا ہوں تم ناچتے ہو، کیا تم چاہتے ہو میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کردوں؟" (ممم سیاسی کارنامہ)

نائک وساسین کہ محض اپنی موسیقیت اور کمال فن سے وجد میں لاتا ہو مگر شعر کے مضمون کا کچھ اثر نہیں ہوتا، اس کا دل و دماغ عرفانی و وجدانی کیفیتوں سے خالی ہوتا ہے، اس مثال سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ اقبال کا کمال قابلیت و فن تھا ورنہ آن کے دل و دماغ ان افکار سے متاثر نہ تھے۔

ان کے ایک مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:۔
"اپنے وظیفۂ حیات کے متعلق آن کا یہ وجدان اور طبعی میلان بالکل درست تھا جس کو عملی یا سیاسی زندگی کہتے ہیں اس سے ان کی توتیں مرتکز ہونے کے بجائے منتشر ہو جاتیں اور اقبال اقبال نہ بن سکتا۔ وہ سیاسی اور عملی زندگی کے مرد میدان نہ تھے۔" (نقوش شخصیات نمبر)

۳۔ اسی سلسلہ میں ایک اور بیان بھی ہے:
"ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے ایک دن علامہ اقبال سے سوال کیا کہ آپ کے اشعار نے ہندوستان میں آزادی کی روح پھونک دی لیکن آپ خود اس سلسلہ میں کچھ بھی عملی جد و جہد نہیں فرماتے۔ علامہ نے بیساختہ جواب دیا کہ شعر کا تعلق عالم علوی سے ہے چنانچہ جب میں غور کرتا ہوں تو عالم علوی میں ہوتا ہوں لیکن یوں تو میرا تعلق عالم اسفل سے ہے۔ اس طرح تم میرے اشعار اور عمل میں کس طرح مطابقت دیکھ سکتے ہو؟"

۴۔ بقول مصنف ذکر اقبال:۔ مولوی محمد علی ایم اے کنٹب نے بھی اسی قسم کا سوال کیا تھا جس کا جواب علامہ نے یہ دیا کہ اگر میں اپنی پیش کردہ تعلیمات پر عمل بھی کرتا تو شاعر نہ ہوتا بلکہ مہدی ہوتا۔"

ان جوابوں سے واقعی امر تو یہ ہے کہ قرآن مجید میں شاعروں کے متعلق جو کچھ ارشاد ہے وہ منطبق ہو جاتا ہے، لیکن ان جوابات سے قطع نظر اقبال کو اپنی بے عملی کا خود بھی احساس تھا وہ آن ہی کے قلم سے دیکھئے۔

۵۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں کہ:۔
"یہاں لاہور میں منزدہ بات اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں، یہاں انجمن اور کالج اور دیگر مناصب کے سوا اور کچھ نہیں، پنجاب میں ملاؤں کا ہونا بند ہو گیا ہے اور اگر خدا تعالے نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیا کی دوکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی، اور علماء اور صوفیاء پر انحطاط کے بعد اب

اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے، میں بھلا کیا کر سکتا ہوں صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں، قوت عمل مفقود ہے، ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوق خداداد کے ساتھ قوت عمل بھی رکھتا ہو مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔"

اصل حقیقت تو یہی ہے جو اس خط میں ہے، باقی وہ جوابات جو سطور بالا میں ہیں کہانیاں ہیں۔

انجمن حمایت اسلام اور علامہ

علامہ کو انجمن حمایت اسلام کے ساتھ خاص دلچسپی تھی اسی کے پلیٹ فارم سے انھوں نے شہرت حاصل کی۔ اس کے سالانہ جلسوں میں خاص طور پر نظمیں سناتے تھے۔ اس کے جھگڑوں میں ثالثی بھی کرتے تھے، اس کے سکریٹری اور صدر بھی رہے۔

مگر کوئی سوانح نگار یہ نہیں لکھتا کہ علامہ کی نظموں سے انجمن کو کیا فوائد پہنچے اور یہ نظمیں بحق انجمن رہیں یا خود علامہ کی ملکیت رہیں، نیز یہ کہ آن کی سکریٹری اور صدارت میں انجمن نے مالی و اخلاقی طور پر کس قدر اور کیا ترقی کی؟

جہاں تک معلوم ہوا علامہ کی تمام نظموں کے حقوق تصنیف و طباعت محفوظ تھے۔ اس کے ساتھ لامحالہ یہ بات یاد آتی ہے کہ آن کے پیشرو مولانا حالی کا مسدس عام تھا اور شاید ہی کوئی صوبہ ایسا ہو جہاں وہ طبع اور فروخت نہ ہوا ہو۔ اسی طرح انھوں نے "چپ کی داد" جو ایک مشہور نظم ہے علی گڑھ کے زنانہ اسکول (بعدہ کالج) کو مع حق تصنیف دیدی، علاوہ بریں "مناجات بیوہ" کا بھی حق محفوظ نہیں کیا۔ دو نظمیں اسلامیہ کالج اٹاوہ کے لئے مخصوص کر دیں۔

آثار قدیمہ کی عظمت

علامہ پر اسلامی آثار قدیمہ دیکھ کر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ دہلی کی مسجد قوۃ الاسلام دیکھنے کے تذکرہ میں بیان کیا کہ:۔

"مغرب کا وقت تھا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں۔ لیکن مسجد کی قوت اور جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا، میرا احساس یہ تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔"

مگر تیسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد۔

"علامہ نے بے اختیار چاہا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں اس عمارت کے نگراں سے پوچھا اس نے کہا کہ میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں ادھر وہ پوچھنے گیا ادھر علامہ نے نیت باندھ لی، اور اس کے آنے سے پہلے ہی پہلے ادائے نماز سے فارغ ہو گئے۔"

بحالت قعدہ مغربی لباس میں نظر آتے ہیں۔

حیرت یہ ہے کہ علامہ پہلے تعلیمی سفر کے بعد دو مرتبہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر لندن گئے مگر کبھی ووکنگ مسجد تک جانے کی تکلیف گوارا نہ کی حالانکہ وہ اس زمانے کی ایک بڑی اسلامی یادگار ہے۔ جس سے بڑے مقاصد بھی وابستہ ہیں۔ اور اس مسجد میں عیدین و جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے۔ اور عموماً بلا خیال اختلاف و عقاید جو مسلمان بھی پہنچتا وہ اس بین المسلمین[1] مسجد کی نماز میں ضرور شرکت کرتا۔

حتیٰ کہ اسمٰعیلی فرقہ کے امام سر آغا محمد شاہ خاں کو بھی نماز میں امام مسجد کی اقتدا میں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر علامہ نے یہ تکلیف گوارا نہ کی کہ وہ اس زندہ یادگار کو دیکھتے اور ووکنگ کے مشن کو تقویت پہنچاتے۔

باب ۲

مشاہیر سے تعلقات

اقبال و شاد
مدح اور تمنائیں

سر مہاراجہ کشن پرشاد المتخلص بہ شاد حیدر آباد دکن کے ایک بہت بڑے خاندان کے تھے جو ہندو گھرانے میں ہندو والدین سے پیدا ہوئے اور اپنے ہندو اور کٹر ہونے کا بار بار تحریری فخر بھی کرتے رہے۔ آخری وصیت نامہ میں بھی اپنے ہندو اور کٹر ہونے کا اظہار کیا ہے۔ (دلائف مہاراجہ کشن پرشاد ص ۲۰۳) قدیم تعلیم یافتہ تھے۔ شعر و سخن اور ادب سے ذوق تھا، مزارات پر حاضری زیارت اور فقراء و مشائخ کی دعاؤں کے بڑے معتقد تھے اور خود کو ایک صوفی کی حیثیت سے نمایاں کرتے تھے۔

حالانکہ ان کی کئی بیویاں موجود تھیں مگر انھوں نے اپنی مرضی کی نقاب ڈال کر اور اپنے اقتدار و دولت اور رعب وزارت عظمیٰ جو نظام سادس میر محبوب علی خاں کے عہد میں تھا ایک سید کی حسینہ کو بیوی بنا لیا۔

۱۹۲۱ء میں جب ڈاکٹر اقبال حیدر آباد گئے تو شاد نے بڑی مدارات کی، اقبال نے واپس آکر ایک مدحیہ قصیدہ لکھا اور اس کے ساتھ تمہید بھی۔ قصیدہ میں قدیم طرز کی مدحت کا پورا رنگ ہے ضمن میں میر عثمان علی خاں نظام دکن کی بھی تعریف کی ہے۔

۱۹۱۱ء میں میر عثمان علی خاں نظام سابع فرمانروا ہونے تو بعد میں شاد وزارت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ یہ ان کی زندگی کا سخت ... اب ہزاروں پرمنت و دعا کے لئے انھوں نے ایک دورہ کیا، ۱۹۲... لاہور بھی آئے۔ اقبال سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، انجمن حمایت اسلام یتیم خانہ کا وفد بھی پیش ہوا جس کو ایک ہزار روپیہ کا عطیہ دیا گیا۔[2]

لیکن اس نماز کا ایک فوٹو بھی ہے جس میں علامہ ایک خوبصورت جانماز پر

---

[1] یہ مسجد نواب شاہجہان بیگم والئ بھوپال نے تعمیر کرائی تھی اور ایک مدت بعد بڑی جد و جہد سے خواجہ کمال الدین نے اس پر قبضہ حاصل کیا۔ نواب سلطان جہان بیگم آخری بیگم فرمانروائے بھوپال نے اس کا مشاہرہ مقرر کیا اور مسجد کی توسیع کرائی، لندن گئیں تو نماز جمعہ میں شریک ہوئیں۔

[2] اس واقعہ پر بہت کچھ ہیجان ہوا مضامین بھی نکلے تھے

ہیں کہ بارش ہوتو ان کی خدمت میں حاضر ہوکر طالب
ں گا۔" (۳ جون ۱۹۱۶ء)
چودھری صاحب نے جیسا کہ میں نے گذشتہ عریضہ
رض کیا تھا مجھے قانون کی پروفیسری پیش کی ہے اور یہ
ہے کہ اگر پرائیویٹ پریکٹس کے ساتھ اجازت ہو گیا
دوں گا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ میر مجلس عدالت العالیہ عالی
اس کے متعلق انھوں نے خط میں کوئی اشارہ لکھا ہے
اگر ایسا ہو جائے تو میں اسے قانون کی پروفیسری پر
دوں گا۔ آپ حیدری صاحب سے ملیں تو ضمناً تذکرہ
توجہ اس طرف دلائیے۔ اقبال خواہ حیدرآباد میں ہو یا لاہور میں
مرغ سدرہ ہے۔ وہ فقیر لسرس روحانی ہے جو اس سرکار
ہے انشاء اللہ العزیز قائم رہے گا۔ نہ وقت اسے دیرینہ کر سکتا
نہ تعلقات اسے کمزور کر سکتے ہیں۔
یہ چند نا چیز وہاں قیام پذیر ہو گیا اور حالات زمانہ نے
مدت کی تو انشاء اللہ اقبال شاد کے کام آئے گا۔"
(۱۴ اگست ۱۹۱۶ء)
"میرے مقدمہ کے والوں کی آپ کو تلاش ہے تو ممکن ہیں
جائیں اگرچہ بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی سرکار
ما الہام ہوتے تو اس قدر جستجو گوارا کرنے کی ضرورت نہ
تی، اگر زمانہ نے مجھے آپ کے آستانہ پر لا ڈالا تو میری
ن سعادتمندی ہے اس وقت دوستانہ و نیازمندانہ مہرو
کا ثبوت دے سکوں گا۔" (۱۰ اپریل ۱۹۱۸ء)
"سرکار کی صاحبزادی کی علالت کی خبر سن کر متردد ہوا ہوں
شد تعالیٰ صحت کامل عطا فرمائے۔ انشاء اللہ کل صبح کی نماز
کے بعد دعا کروں گا۔ بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لئے اٹھتا
ہا بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گذر جاتی ہے۔ سو خدا
کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی دعا کروں گا
اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے۔ طالع
ل پریشانیاں بڑھ رہی ہیں۔"
(۱۱ جون ۱۹۱۸ء)
(۱۱) "سرکار نے یہ کیا لکھا کہ آپ آتے ہو نہ مجھے بلاتے ہو۔
قبال ایک مدت سے منتظر امام ہے، کئی سال پیشتر عرض
کر چکا ہے۔
کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
سرکار ظہور امام کی خبر دیتے ہیں۔ پھر کیا عجب ہے کہ اقبال
کی دیرینہ ارادت اور شاد کی کشش متحد ہو کر کام کر جائے
اقبال جو معنوی اعتبار سے پہلے ہی شاد کا آستانہ نشین ہے
صوری اعتبار سے بھی حاضر ہو جائے۔ اقبال کی کشش تو ایک
عرصہ سے قوت کھو چکی ہے۔ شاد کی کشش کا امتحان باقی
ہے۔" (۷ اکتوبر ۱۹۲۶ء)
(۱۲) "ٹیلیفون کا سلسلہ جاری ہے اور کئی اطراف میں حضور چاہے
تو نقشہ حسب مراد بنے گا۔ مگر اقبال آپ کی استقامت اور سکونِ
قلب کی داد دیتا ہے۔" (۹ مارچ ۱۹۳۳ء)
(۱۳) "برار کے مسئلہ میں یاد آوری اقبال کی ضرورت
ہے۔" (۱۱ مارچ ۱۹۳۳ء)

(۱۸) "خاکسار نے جو پیغام مولانا شاہ تاج الدین صاحب کی خدمت
میں بھیجا ہے۔ اس کا جواب سرکار والا کی خدمت میں پہلے
پہنچا ہوگا۔ اخباروں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطلوبہ
جواب سرکار عالی تک پہنچ گیا ہے لیکن اقبال حضور سے
سننے کا مشتاق ہے، تصدیق ہو جائے تو مزید عرض کروں گا"
(۲۶ مارچ ۱۹۳۳ء)
(۱۹) "مجھے یقین ہے کہ سرکار والا کا تقرر حیدرآباد کے لئے
بے انتہا برکات کا باعث ہوگا، بلکہ میں تو اس بات کا امیدوار
ہوں کہ سرکار کا وجود باوجود ان تمام مشکلات کے ازالہ کا باعث
ہوگا جو اس وقت ہندوستانی رؤساء کو درپیش ہیں۔
(یہاں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی آمد کا ذکر کر کے اور اس میں ادائے شہادت
کے لئے بین الاقوامی محققین کی جماعت تیار کرنے کا مشورہ دے کر
لکھا کہ) اگر اس مسئلہ میں اقبال کی ضرورت ہو تو وہ بھی اپنی
بساط کے مطابق حاضر ہے۔ انشاء اللہ سرکار والا اسے خدمت
میں قاصر نہ پائیں گے۔" (۲۷ دسمبر ۱۹۳۶ء)
اس آخری خط کے بعد جامع "مکاتیب شاد و اقبال" کو اور خطوط مہیا نہ
ہو سکے۔
ستمبر ۱۹۱۶ء کے خط میں علامہ نے جو دو شعر کشن پرشاد کے پاس
"بنظر اصلاح" بھیجے تھے ان کے مطالب و معنویت اور تلمیح وغیرہ پر کسی
نے روشنی نہیں ڈالی، عام فہم طلبہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ
برہمن خدا پر طعن کرتا ہے کہ تیری مخلوق اور پرستار انسانوں سے
میرا معبود یعنی میرا بنایا ہوا بت زیادہ پائندہ تھا۔
کیا جناب احدیت میں ایسے معروضات اور شاعرانہ تخیلات سماعی ہیں؟
پھر شاد کی نظر اصلاح کیا معنی؟
علاوہ ازیں سورۂ فاتحہ کے الفاظ کا جو استعمال ہوا ہے وہ صاف طور پر
ستر ادب و آداب کلام الٰہی سے بعید اور استہزا کے مترادف ہے، اس لئے
اس کی توجیہ و تصریح بھی ضروری تھی۔

نظام سے ملاقات

۱۹۲۹ء میں جب اقبال حیدرآباد پہنچے تو اسٹیشن پر بہت شاندار استقبال ہوا اور ان کو بتا دیا گیا کہ وہ نظام کے خاص مہمان ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی میں ایک تقریر بھی ٹاؤن ہال میں کی اور نظام سے بھی ملاقات ہوئی۔
اس گفتگو کو جو اس ملاقات میں ہوئی کوئی سوانح نگار نہیں لکھتا البتہ ایک نے یہ ضرور لکھا ہے کہ:۔
"ڈاکٹر صاحب کو قیمتی پتھروں بالخصوص ہیروں سے بہت
دلچسپی تھی اور چونکہ ان کو حکیم اجمل خاں سے یہ معلوم ہوا تھا
کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پاس ایک بیش بہا ہیرا ہے
جو نہایت چمکیلا ہے۔ اس لئے اعلیٰ حضرت کا شرف باریابی
حاصل ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اس ہیرے کے دیکھنے کی
خواہش ظاہر کی اور اعلیٰ حضرت نے فوراً اس ہیرے کو
منگوایا اور ڈاکٹر صاحب اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے
اور ایک موقع پر اس کی چمک دمک اور حسن و جمال کا تذکرہ
نہایت جوش و خروش کے ساتھ کیا۔"
اب اس روایت پر ذرا تنقیدی نظر ڈالئے۔
اسٹیشن پر نظام کی خاص مہمانی کے متعلق بتانے والا بھول رہا
گیا ہے جن لوگوں کو ریاستوں میں جانے آنے کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں
کہ ماسٹر ریاست کا افسر متعلقہ استقبال کرتا ہے اور مہمان کو اس کے جائے
قیام پر لے جاتا ہے۔ حیدرآباد میں علی العموم ایسے مشاہیر مہمان خانہ
ریاست میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ اقبال کی خصوصیت نہ تھی۔ البتہ
وائسرائے ایوان فلک نما میں ٹھہرتے اور والیان ریاست اور مخصوص
اصحاب کے لئے جداگانہ انتظام ہوتا۔ اولین ملاقات میں ہیرا دیکھنے
کی بے تکلف خواہش آداب و متانت کے منافی تھی۔ اقبال ایسے علی الذہن
نہ تھے کہ دیگر مناسب موضوعات گفتگو کو چھوڑ کر ایسی خواہشات کا اظہار کرتے
وہ پتھروں کے جوہری بھی نہ تھے۔ البتہ شعر و سخن اور علم و فضل کے جوہر
اور جوہری تھے اور اس لحاظ سے نظام کی شاعری اور عثمانیہ یونیورسٹی
عمدہ و مناسب موضوع گفتگو تھے۔ اقبال نظام کی شاعری کے معترف بھی
تھے۔ اور داد سخن دے چکے تھے۔ (خط موسومہ شاد ۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء)
عثمانیہ یونیورسٹی کو نظام اپنے مفاخر میں سمجھتے تھے اور اصل میں یہ صحیح بھی
تھا۔
سر کشن پرشاد اور اقبال کی مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن
کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کشن پرشاد نے اپنے اس طویل زمانہ وزارت
میں اقبال کی کیا خدمت کی اور کس امید کو پورا کیا۔ مگر خطوط سے ظاہر
ہے کہ اقبال نے جج عدالت العالیہ کے علاوہ جس کے ۱۹۱۶ء سے
متمنی تھے۔ برار کے مقدمہ کے لئے بھی اپنی خدمات پیش کیں اور راؤنڈ
ٹیبل کانفرنس کے وقت بھی۔ مگر ان کو قبول نہیں کیا گیا۔ یہ بات بھی تعجب
سے دیکھنے کی ہے کہ علامہ نے دو مرتبہ سفر حیدرآباد کیا اور قیام بھی
مناسب مدت تک رہا مگر وہاں کے اہل علم و فضل مشاہیر سے جو اقبال
جوہر کے صحیح جوہری تھے جیسے عماد الملک سید حسین بلگرامی۔ نواب نظامت
یار جنگ (انگریزی کا مشہور فلسفی شاعر) نواب سر امین جنگ۔ مسز
نائیڈو۔ ان میں سے کسی سے کسی صحبت یا ملاقات کا بیان نہیں ہے۔

علامہ اقبال اور فرمانروایان افغانستان

علامہ کی زندگی میں افغانستان کے بادشاہوں سے تعلقات کی بھی دلچسپ داستان ہے۔
اس کی ابتدا ۱۹۲۳ء سے ہوتی ہے جب کہ علامہ نے اپنی بے نظیر نظموں کا مجموعہ "پیام مشرق" امیر امان اللہ خاں کی خدمت

۱؎ سی پی کے ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ۔ ۲؎ وزارت عظمیٰ کی دعا و قبولیت۔
۳؎ راقم خود دو مرتبہ حیدرآباد گیا ہے۔ پہلی مرتبہ نواب محمد حمید اللہ خاں (بھوپال) کی معیت
میں جب کہ وہ صرف تیسرے صاحبزادے تھے ان کے اور ہمراہیوں کے لئے خاص انتظام ہوا تھا۔
دوسری مرتبہ ہز ہائی نس بیگم صاحبہ کے ساتھ وہ ایوان آسمان منزل میں ٹھہرائی گئی تھیں۔

اس کا عنوان ہے

"اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں فرمانروائے دولت
مستقلہ افغانستان خلد اللہ ملکہٗ و اجلالہٗ"

فی اشعار ہیں جن میں عام مدحیہ قصائد کے طرز پر مدح، تعلّی،
گردش کا شکوہ ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

یرا نگار سے شہریار	نوجوان و مثل پیران پختہ کار
زپردگی با محرم است	دل میان سینہ ات جام جم است
پایندہ چوں کہسار تو	حزم تو آساں کند دشوار تو
رچوں خیال من بلند	ملّت صد پارہ را شیرازہ بند
ہنشہاں داری بسے	لعل ویاقوت گراں داری بسے

اے امیر ابن امیر ابن امیر
ہدیۂ از بے نوائے ہم پذیر

رِ حیات آموختند	آتشے در پیکرم افروختند
اے سینہ تابے آوردہ ام	عشق را عہد شباب آوردہ ام

ناعرانہ انداز میں گردش کے ساتھ اپنا مقابلہ و موازنہ کرکے اپنی
ہیں:۔

وز مملکت برمن کشود	نقش غیر از پردۂ چشمم ربود
سرمایہ دارم کردہ اند	در دیار ہند خوارم کردہ اند
ازلم بے نصیب	طائرم در گلستان خود غریب

بسکہ گردوں سفلہ و دوں پرور است
وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است

عرب، مصر، ترکی اور ایران کی حالت زار بیان کرتے
انان ہند کی نسبت کہا کہ

مسلم ہندی شکم را بندۂ
خود فروشے دل ز دیں برکندۂ

نہایت دلنشین پیرایہ میں آئین صدیق[1] و عمرؓ کی یاد
ور ملت افغانیہ کی تہذیب میں ترقی کی کوشش اور تسلیم
ہے۔

سیرت نگار نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ہدیہ کس طرح پیش اور
ور اس امیر ابن امیر نے اپنی منت پذیری یا قبولیت کا
اظہار کیا۔

اطلاع یہ ہے کہ علامہ نے یہ پیشکش ایک ایسے شخص کے
لی تھی جو لاہور کا باشندہ تھا اور امان اللہ خاں کے
ت میں ایک مترجم اور جاسوس تھا۔

اب پیش ہوئی تو اسے کے لئے افسر تعلیمات کے پاس بھیجی
مقررہ قاعدہ کے مطابق ایک کمیٹی بناکر اس کے سامنے

کے ارکان نے کبھی اقبال کا نام بھی نہ سنا تھا اور نہ وہاں
میں ان کی کوئی نظم شائع ہوئی تھی اور ان ارکان میں
کوئی جانتا ہی نہ تھا، اس سے قبل کوئی فارسی کی دوسری
ان نہ پہونچی تھی، تاہم اس نظریہ کے تحت کہ شاعر ہند سے
نا اور مسلم ہندی کے دل پر اپنا اثر ڈالنا بھی سیاسی
ورات کے تحت ضروری تھا اور چونکہ تمہیدی اشعار میں
برتر تھا اس لئے غور کرتے وقت کمیٹی نے طے کیا کہ اگر امیر
سی ہندوستانی کو انعام یا عطیہ دیا جائے تو افغانستان

کی خدمات کا لحاظ ہونا چاہیئے اور اس خیال سے اس کا پہلا استحقاق مولانا
محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو پہنچتا ہے جنھوں نے افغانستان کی حمایت
میں ہمیشہ آواز بلند کی ہے، اقبال تو انگریزوں کے خطاب یافتہ ہیں۔
اور ان کی کوئی خدمت بھی نہیں ہے۔

غرض اس پیش کش کا انجام یہ ہوا[2]

علامہ کی اس مثنوی میں مدحت، تعلّی، شکوۂ افلاک اور قسمت کی شکایت
سب ہی کچھ موجود ہے جو عموماً درباری شعرا کے قصائد میں پایا جاتا ہے
لیکن یہ مصرعہ:۔

در دیار ہند خوارم کردہ اند

واقعیت و صحت سے بعید اور خودان کی شان سے گرا ہوا ہے۔

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی تعلیم اور اُن کے ہنر کی سلیقہ داری
کی مناسبت سے علی گڑھ حیدرآباد دکن اور خود اپنے مستقر لاہور میں
پروفیسری پیش کی گئی اور حکومت پنجاب نے تو ساتھ ساتھ پریکٹس کی
آسانی کا بھی انتظام کر دیا تھا۔

ایک سیرت نگار ناقل ہیں کہ حکومت نے انڈین ایجوکیشنل سروس
میں وہ اعلیٰ عہدہ پیش کیا جو اب تک کسی ہندوستانی کو نصیب نہ ہوا
تھا مگر اقبال نے انکار کر دیا جس پر مسٹر جسٹس شاہ دین کا مشورہ تھا
کہ اس سے انکار نہ کریں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ تعلیمی لائن میں اقبال کی قابلیت
سے ملک کو بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔

حیدرآباد، علی گڑھ اور میسور میں ان کو لکچروں کے لئے دعوت
دی گئی اور ان لکچروں سے استفادے کئے گئے، ان کو اسلامیہ کالج
کا معتمد منتخب کیا گیا۔ اور جس سال یہ پیشکش ہوئی ہے۔ اسی کی
یکم جنوری نو روز کو حکومت کا سب سے بڑا خطاب "سر" جو مخصوص اعلیٰ
مرتبہ کے ہندوستانیوں کو ملتا تھا حاصل ہوا اس لئے

در دیار ہند خوارم کردہ اند

کسی طرح صحیح نہیں نظر آتا۔

مثنوی کا یہ شعر کہ:۔

مسلم ہندی شکم را بندۂ
خود فروشے دل ز دیں برکندۂ

مسلمانان ہند کی انتہائی تذلیل پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم سے گذشتہ
پندرہ سال ۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۳ء کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا
کہ مسلم ہندی نے قومی نشاۃ ثانیہ میں کس قدر جد و جہد کی، مالی امداد کی
اور سرفروشانہ خدمات انجام دیں۔

مسلم لیگ کی تاسیس سے اپنی قومی سیاسی پوزیشن کی حفاظت
و مضبوطی مسلم یونیورسٹی کے قیام سے تعلیمی ترقی، تقسیم بنگال کی تنسیخ سے
ایک عام لہر کا پیدا ہونا، طرابلس و بلقان کے مظلوموں سے ہمدردی اور
اُن کی امداد، اور خلافت کے بقا کی کوشش میں مالی ایثار اور صعوبات
کا تحمل اسی زمانہ کی تاریخ ہے، ہجرت کا آغاز بھی انہی ایام میں ہوا مسلمانوں
نے افغانستان کو ملجا و ماوا قرار دے کر ادھر کا رخ کیا مگر وہاں اس "امیر
ابن امیر" نے ہندوستانی مسلمانوں پر کابل کا دروازہ ہی بند کر دیا اور
ہزارہا مسلمان دشوار گزار راہوں میں طعمۂ زاغ و زغن بنے، پھر اسی

سال مسلمان، اقبال کی قدر شناسی کا عملی ثبوت "اقبال فنڈ" قائم کرکے
دینا چاہتے تھے جس کی نسبت خود ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اقبال فنڈ قائم کرنا میری رائے میں جس میں میرے ضمیر کی
آواز بھی شامل ہے درست نہیں۔ مسلمان غریب قوم ہیں اور
باوجود اپنی غریبی کے گذشتہ دس بارہ سال میں ایک کروڑ سے
زیادہ چندوں میں دے چکے ہیں۔"

(۱۵ جون ۱۹۲۳ء موسومہ خان نیاز محمد خاں)

امان اللہ خاں کو ہندوستان اور خاص کر اس ملک کے مسلمانوں سے نفرت تھی۔
ممکن ہے کہ علامہ نے مسلم ہندی کو بندۂ شکم خود فروش اور دین
سے متنفر بتاکر امان اللہ خاں کے دل کو خوش کرنا چاہا ہو۔

بہر حال یہی ہدیہ تعلقات کی پہلی کڑی تھا۔ اس کے بعد ایک سیرت
نگار لکھتے ہیں کہ:۔

"بچہ سقہ اور ملا کے شور بازار کی ہلڑ بازی نے افغانستان
کے تاجدار امان اللہ خاں کو تخت افغانستان سے کنارہ
کشی پر مجبور کر دیا تو نادر خاں نے جو پیرس میں مقیم تھے اس
ملاگردی کو دور کرنے اور تباہی کے دلدل میں گرفتار افغانستان
کو نجات دلانے کے لئے افغانستان کا عزم کیا تو ان کو خدا حافظ
کہنے کے لئے لاہور کے اسٹیشن پر اقبال بھی موجود تھے۔ گاڑی
روانہ ہونے سے کچھ پہلے اقبال نے اُن سے تخلیہ میں کہا کہ تم
ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو، میں ایک فقیر آدمی ہوں،
نیک تمناؤں اور دعاؤں کے سوا ہی تمہاری خدمت کر سکتا ہوں
اتفاق سے پانچ ہزار کی رقم میرے ساتھ ہے اگر تمہارے کام
آ سکے تو مجھ کو بڑی خوشی ہوگی نادر خاں نے جو چشم پُرآب تھے
فقیر کی اس دین کو بڑا ہی نیک شگون سمجھا اور بڑے احترام
سے اس ہدیہ کو قبول کیا۔" (کہانی صفحہ ۹۵)

اس واقعہ کے متعلق مکاتیب صفحہ ۳ پر درج ہے کہ:۔

"عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جب نادر خاں لاہور سے گزرے
تو اقبال اپنا تمام اندوختہ جو اس وقت اُن کے پاس موجود
تھا لیکر اسٹیشن پر پہنچے اور علیحدگی میں نادر خاں سے کہا کہ
میری کائنات یہی کچھ ہے اسے قبول فرماکر اس جہاد کے ثواب
اور افغانستان کے استقلال کی کوشش میں شمولیت کا شرف
مجھے حاصل ہونے دیجئے نادر خاں نے متاع درویش کے
قبول سے بصد شکریہ انکار کر دیا۔"

ان مندرجات کو پڑھتے وقت یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ:۔

تخلیہ کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں گاڑی کے اندر صرف باتھ روم اور
پلیٹ فارم پر ویٹنگ روم لیکن نادر خاں کے ہمراہی ایک ایسے شخص کے
ساتھ جو امان اللہ خاں کا مداح رہا تھا خلوت میں جانے کی اجازت شاید
کبھی نہ دیتے اور حالات کے لحاظ سے مقتضائے احتیاط بھی یہی تھا
دوسرے یہ کہ خلوت کی ملاقات سیاسی غلط فہمیوں کا بھی باعث تھی تو جو تنہا
ایسی ملاقات ہوئی بھی تو رقم کے لینے یا مسترد کرنے اور جو گفتگو ہوئی اس کے
بیان کرنے کا کوئی راوی بھی تو ہو، مزید برآں کہانی والے صاحب کو چشم

---

[1] اقتباس خط مولوی محمد حسین خاں ایم اے دعلیگ جالندھری سابق ڈائرکٹر تعلیمات افغانستان۔
[2] بحوالہ خط مولوی محمد حسین خاں سابق وزیر تعلیم افغانستان۔

کیوں کر نظر آتی!

یہ روایت کی اس سے زیادہ بے سروپائی کیا ہو سکتی ہے!

ان کے راوی یا تو علامہ ہو سکتے تھے یا خود نادر خاں مگر ان کا حوالہ

اقبال اور اندوختہ بمشکل ہی قیاس میں نہیں آسکتا۔ اور اگر

اس متن کے برلانے میں صرف کیا گیا ہوتا جو زیارت گنبد خضری

سے دل میں پرورش پا رہی تھی!!

یہ سنہ ۱۹۲۹ء میں افغانستان کی امداد و استقلال کے لئے ایک

قائم کیا تھا اور اس میں امداد کی درخواستیں بھی کی تھیں اس کے متعلق

نگار خاموش ہیں مگر مکاتیب میں مسٹر جمیل بنگلوری کے نام علامہ

کا جو خط ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے یہ فنڈ قائم کیا لکھتے ہیں

"مجھے امید ہے کہ احباب بنگلور جن سے میں نے اس سلسلہ میں اعانت

کی درخواست کی ہے فراخدلی سے چندہ دیں گے، میں نے

سیٹھ حاجی اسمٰعیل ایڈیٹر الکلام اور عبدالغفور صاحب کو بھی تار

دیا ہے۔ براہ کرم ہمارے افغان بھائیوں کی طرف سے جو ذمہ داری

ہم پر عائد ہوتی ہے وہ ان حضرت کو یاد دلا دیجئے، افغانستان

کا استقلال و استحکام مسلمانان ہندوستان اور وسط ایشیا کے

لئے وجہ جمعیت و تقویت ہے، بچہ سقا اپنے گیارہ ساتھیوں

سمیت قتل ہو چکا ہے اور نادر خاں بادشاہ بتدریج استحکام

حاصل کر رہے ہیں"

۔ کی اس اپیل اور جد و جہد کا کیا نتیجہ نکلا، کس قدر فنڈ جمع ہوا اور کس طرح

حال کیا گیا اور کب تک جاری رہا یہ سب عالم خفا میں ہے، علامہ کی

زندگی میں یہ بڑا واقعہ ہے کہ وہ کسی فنڈ کے جمع کرنے پر آمادہ ہوئے،

سے اس کو تفصیل کے ساتھ سیرت نگاروں کو دکھانا چاہیئے تھا۔

سے اُن کے عزم اور پبلک پر اثر کی حالت کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا

ہے کہ بنگلور جو لاہور سے ہزاروں میل دور ہے وہاں علامہ اپنے

احباب سے درخواست کرتے ہیں لیکن پنجاب کو نظر انداز کر جاتے ہیں

کہ یہاں ایسی تحریک کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور نہ یہ کہ علامہ نے خود اس فنڈ

میں کتنی رقم عنایت کی۔

کے مصنف رقمطراز ہیں کہ:۔

"نادر خاں نے افغانستان پہونچ کر بہت جلد اپنے بلند منصوبے

میں کامیابی حاصل کی اور نادر شاہ کے لقب سے تخت افغانستان

پر متمکن ہونے کے بعد اقبال سے افغانستان آنے کی درخواست

کی، اقبال نادر خاں کی درخواست پر راس مسعود کے ساتھ

افغانستان پہنچے۔ نادر نے اقبال کا جو پرتپاک خیر مقدم کیا ہے

وہ افغانستان کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے، نادر نے

ہمیشہ محسوس کیا کہ افغانستان کا تخت فقیر اقبال ہی کا تحفہ

ہے، پہلی ملاقات میں مغرب کی نماز کے موقع پر نادر شاہ نے

اقبال سے امامت کی درخواست کی، اقبال نے کہا کہ نادر

میں نے اپنی پوری عمر کسی شاہ و عادل کی اقتدا میں نماز کی

تمنا میں گزاری ہے۔ آج جبکہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے

پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے ہیں تو کیا تو مجھے اس نعمت

سے محروم کرنا چاہتا ہے؟ آؤ میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں

گا، امامت تجھ کو کرنی ہوگی، نادر نے فقیر کے اس حکم کی تعمیل میں

امامت کی، نادر مصلیٰ پر کھڑے تھے اور اقبال اشکبار

تھے، ان میں ایک امیر بہ سلطانی فقیر ہے کی مثال بنا ہوا

تھا تو دوسرا "فقیر او بہ درویشی امیر ہے" کا مکمل نمونہ،

خدائے واحد کے آگے دونوں کے سر سجدے میں تھے اور

پوری کائنات سجدہ کناں ان کا طواف کر رہی تھی"

(کہانی ص ۱۹۶)

افسوس کہ اقبال کے پرتپاک استقبال کا تاریخی باب ایک ناتمام جملہ میں

ختم ہے، اور تخت ملنے کے بعد احسان مندی کے احساس کا تو پتہ ہی نہیں۔

افغانستان جانے کا واقعہ یہ تھا کہ ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ نے افغانستان

کی تعلیمی اصلاح و ترقی میں مشورہ حاصل کرنے کے لئے سر سید راس

مسعود، مولوی سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال کو مدعو کیا تھا۔ چنانچہ سید

راس مسعود اور علامہ اقبال ساتھ ساتھ اور ندوی صاحب دو تین روز

بعد کابل پہنچے، مہمانوں کے لئے سفر کی راحت و آرام کا ہر منزل پر

بدرجہ غایت اہتمام تھا اور نمائندگان حکومت مدارات کے لئے موجود

تھے۔ کابل پہنچنے پر اقبال کے پرتپاک استقبال کی انفرادی خصوصیت

کوئی نہ تھی۔ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ تھا، وزرا و امرا نے بھی سب

ہی کی مشترکہ دعوتیں کیں۔ نادر شاہ نے بھی تینوں مہمانوں سے ملاقاتیں

کیں، جمعہ کے دن مسجد میں شاہی مقصورہ کے اندر مہمان بھی شریک

نماز تھے۔

مولوی سید سلیمان نے سنہ ۱۹۳۳ء میں اس سفر کے حالات "معارف"

میں مسلسل شائع کئے، اور اقبال نے بھی نادر شاہ کی شہادت کے بعد

ایک مثنوی "مسافر" کے نام سے شائع کی اس میں ایک عنوان

"مسافر وارد می شود بہ شہر کابل و حاضر می شود بحضور اعلیٰحضرت

شہید"

قائم کر کے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے اول کے چند اشعار میں کابل اور

قصر دلکشا میں نادر کی تعریف کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر ہے:۔

پیش سلطانے فقیرے دردمند	شاہ را دیدم در آں کاخ بلند
ہدیہ آوردم ز قرآن عظیم	در حضور آں مسلمان کریم
در ضمیرا و حیات مطلق است	گفتم ایں سرمایۂ اہل حق است
حیدر از نیروئے او خیبر کشاست	اندرو ہر ابتدا را انتہاست

نشئہ حرفم بخون او دوید

دانہ دانہ اشک از چشمش چکید

پھر نادر شاہ کا جواب ہے جس کا آخر یہ ہے کہ:۔

غیر قرآن غمگسار من نبود

قوتش ہر باب را برمن کشود

اس کے بعد خاتمۂ ملاقات یہ ہے کہ:۔

بازبامن جذبۂ سرشار داد	گفتگوئے خسرو والا نژاد
آں کہ مومن را کند پاک از جہات	وقت عصر آمد صدائے الصلوٰۃ
کردم اندر اقتدائے او نماز	انتہائے عاشقاں سوز و گداز

رازہائے آں قیام و آں سجود

جز بہ بزم محرماں نتواں کشود

اس بیان میں علامہ کے ساتھ کسی مابہ الامتیاز برتاؤ کا اور نہ اس "جدیۂ

فقیر" کے تشکر کا کوئی اشارہ و نشان ہے جو کہانی میں مذکور ہے۔ نادر

نے ان مہمانوں کو جو تحائف دیئے وہ بھی یکساں مالیت کے تھے۔

علامہ نے اس مثنوی میں نادر شاہ کے جانشین کو بھی خطاب کیا ہے

کہ:۔

"خطاب بہ بادشاہ اسلام اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ ایّدہ اللہ بنصرہ"

اس میں ظاہر شاہ کی تعریف اور اپنی طبیعت اور اپنے مقام معرفت کو

بیان کرتے ہوئے دعوت دی ہے کہ

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام ۔۔۔ تا درخشی مثل تیغ بے نیام

نادر شاہ کی شہادت کے بعد یہ مثنوی علٰحدہ طبع کرائی گئی جس سے

قرین قیاس ہے کہ وہ ظاہر شاہ کو بھی بھیجی گئی ہوگی مگر اس کے متعلق بھی سیرت

نگاروں نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ یہ بھی تعجبات سے ہے کہ علامہ کے قلم سے

"بادشاہ اسلام"

لکھا گیا، اسلام کا تو کوئی بادشاہ نہیں!! سوائے تاجدار مدینہ صلعم کے۔

سیّد راس مسعود سے تعلقات اور وظیفۂ بھوپال

سر سید راس مسعود سے جو اصحاب واقف

ہیں وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ان میں

دل و دماغ کی وہ تمام خوبیاں موجود

تھیں جو اُن کے جد امجد سر سید احمد خاں

اور والد ماجد سید محمود میں تھیں۔

پرجوش، ہمدرد، فیاض، قدر شناس علم و ادب سے شوق و مناسبت

رافت و شفقت اور ہر وقت دوسروں کی مدد کے لئے آمادگی اور

بے کینہ و صاف، ان کی مخصوص صفات تھیں۔

سخن گو نہ تھے مگر سخن سنج تھے، ہر قوم کے مشاہیر علم و فن سے رابطہ

تھا، ادیبوں اور شاعروں سے دلچسپی تھی۔ اس صورت میں کیوں کر ممکن

تھا کہ علامہ اقبال کی عظمت و قدر اُن کے دل میں نہ ہو مگر چوں کہ وہ

یورپ سے ختم تعلیم کے بعد جار ہی بنگال ایجوکیشنل سروس سے متعلق ہو گئے

اور پھر حیدر آباد دکن میں ان کی خدمات منتقل ہو گئیں اس لئے تعلقات

اور پنجاب سے دور رہے اور علامہ اقبال سے روابط خصوصی نہ ہوئے

لیکن حیدر آباد سے سبکدوشی کے بعد جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر

مقرر ہوئے تو سنہ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے علامہ اقبال کو خصوصی لکچروں کے

لئے مدعو کیا چنانچہ علامہ نے چند دن ان کے یہاں رہ کر چھ نہایت عالمانہ لکچر دیئے

یونیورسٹی میں ایسے لکچروں کا معاوضہ ایک مقررہ شرح سے دیا جاتا تھا

مگر سید راس مسعود نے اس شرح کا معیار کم سمجھا اور وائس چانسلر فنڈ سے

زیادہ شرح پر معاوضہ دیا۔ یہ مراعات خصوصی تھیں علامہ نے اپنے علیگڑھ

جانے اور وہاں کے ماحول کے متعلق مولوی عبدالماجد کو ایک خط میں لکھا کہ

"وہاں نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے اور سید راس مسعود

بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں" (۲۹ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء)

اب خاص مراسم کا آغاز ہوا تھوڑی مدت بعد ہی دونوں دعوت افغانستان

پر کابل گئے، ہم سفری کے علاوہ کئی دن تک شبانہ روز یکجائی رہی

اور اس طرح روابط میں جدید جوش کا اضافہ ہوا۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں سر سید راس مسعود وائس چانسلرشپ سے مستعفی ہونے

کے بعد بھوپال میں وزارت تعلیم کے عہدہ پر مقرر ہوئے تو ۲ جون کو علامہ

نے ان سے ملنے اور ایک ذاتی مشورہ لینے کے لئے اُن سے پہلے ان کا

پروگرام دریافت کیا چنانچہ جواب کے بعد علامہ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء میں

بھوپال گئے اور واپسی کے بعد سلسلۂ مراسلت شروع ہوا۔

اس کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید راس مسعود نے علامہ کے

متعلق حیدر آباد دکن اور بہاولپور میں کوئی خاص کوشش کی تھی مگر

کہ ان دونوں جگہوں سے مایوسی تھی، اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک

خط میں سید راس مسعود کو لکھا کہ:۔

"آپ نے میرے متعلق جس دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے

لئے آپ کا ممنون ہوں اگرچہ مجھے آپ سے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ مجھے اس سلسلہ میں کامیابی کی کچھ زیادہ توقع نہیں تھی کچھ عرصہ پہلے تو اس خیال سے مسرت تھی کہ آپ کے اس کوشش میں کامیاب ہونے کی قوی امید تھی اور اس طرح میرے لئے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آ دے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر کوئی پیشکش مسلمانان عالم کو نہیں کر سکتا۔

بہرحال دیدہ باید ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے اگر عالم جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لئے مقدر ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لئے ضروری ذرائع بہم پہنچا دے گا۔" (۲۳ اپریل ۱۹۳۵ء)

پھر ۲ مئی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"میری خواہش تو حقیقت میں اس انسان کی خواہش ہے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور سفر آخرت سے پہلے کچھ نہ کچھ خدمت انجام دینے کا تمنائی ہے مجھے امید ہے کہ آپ اعلیٰ حضرت کی خدمت اقدس میں اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔"

پھر ۳۰ مئی کو ایک اور خط لکھ کر:

"چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں"

تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں جو تھوڑی سی ہمت اور طاقت مجھ میں ابھی باقی ہے اسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جد امجد (حضور نبی کریم) کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ عظیم الشان دین کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لا سکا۔"

دراصل یہ مقصد و شرف ایسا تھا کہ جس کے دل میں اسلام کی خدمت کا جذبہ ہوتا اس کے لئے امکانی جدوجہد سے آمادہ ہو جاتا۔ بھوپال کی فرمانروا [illegible] نے اور بالخصوص نواب سلطان جہاں بیگم فردوس آشیاں نے جو اسلامی خدمات کی ہیں وہ تاریخی افتخار رکھتی ہیں۔

فردوس آشیاں نے اپنی والدہ خلد مکان نواب شاہجہاں بیگم کی تعمیر کرائی ہوئی ووکنگ مسجد انگلستان کو اسلامی مرکز بنانے میں خواجہ کمال الدین مرحوم کی امداد کی اور سیرت نبوی صلعم کی تالیف میں مولانا شبلی اور دارالمصنفین کو جو مدد پہنچائی وہ مشہور و معروف ہے۔

ہز ہائینس حاجی محمد حمید اللہ خاں کے دل میں قدرتی طور پر مذہب کا گہرا جذبہ تھا اور ان کی تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی۔ وہ زمانہ حاضرہ کے افکار کی روشنی میں اس مقصد کی اہمیت سمجھتے تھے۔ خواجہ صاحب سے ملاقاتوں میں یہ مسئلہ موضوع گفتگو رہتا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کی امداد میں مسئلہ آنے سے پہلے ہی مالی امداد کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اب کہ سر سید راس مسعود نے یہ مسئلہ حضور ممدوح کے سامنے پیش کیا تو قدرتی طور پر کامیابی پیش پیش تھی۔

پھر ۳۰ مئی کا خط پہنچنے سے پہلے ہی اعلیٰ حضرت نے علامہ کے ارادہ کی تکمیل کا ذریعہ بہم پہنچا دیا یعنی پانچ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر کے "فکر روزی" سے نجات دیدی۔ اور ۲۷ مئی کو سر راس مسعود نے علامہ کو حسب ذیل خط لکھا[1]۔

"میرے پیارے اور بہت پیارے اقبال!

میں نے کل مبارکباد کا ایک تار بھیجا تھا جب کہ چند گھنٹہ بعد ہی آپ کے خط سے آپ کی بیگم کے انتقال کی الم انگیز خبر معلوم ہوئی اور فوراً دوسرا تار اس ساتھ میں ہمدردی کا روانہ کرنا پڑا۔ ہم دونوں کو دلی رنج ہے اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو اس صدمہ کے برداشت کی طاقت اور صبر عطا کرے۔

مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بہت اطمینان ہے کہ ہز ہائینس فرمانروائے بھوپال نے اپنے ذاتی تعلق سے جو آپ کے ساتھ ہے اور خدمت اسلام کی غرض سے بہ الطاف خسروانہ پانچ سو روپیہ ماہوار کی تاحیات پنشن مقرر کی ہے اور یہ پنشن ہز ہائینس کے صرف خاص سے جاری ہوگی جو باوجود ان مالی مشکلات کے ہے جس میں کہ ہم بھی سنٹرل انڈیا کی طرح مبتلا ہیں اور یہ پنشن یکم جون ۱۹۳۵ء سے جاری ہوگی گویا آئندہ ماہ یکم سے۔

ہز ہائینس کی بڑی خواہش ہے کہ آپ قرآن کریم کی اس تفسیر کا کام شروع کریں جس کے متعلق آپ کا ارادہ ہے جو بلکہ تو آپکی ہے گی اور جو منافع اس کی فروخت سے ہوگا وہ ہمیشہ آپ کو اور آپکی اولاد کو ملتا رہے گا۔ لیکن آپ کو یا تو ٹائیٹل پیج پر یا اندر دیباچہ میں صاف اور واضح الفاظ میں اس کتاب کا تعلق بھوپال کے موجودہ روشن دماغ فرمانروا سے دکھانا ضروری ہے کہ جنہوں نے ذاتی طور پر یہ ممکن کر دیا کہ آپ اس کتاب کو لکھ سکیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب کو ان کے نام سے معنون کر دیں اور عام رواج کے مطابق اس میں یہ ظاہر کر دیں کہ اگر ان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو یہ کتاب دن کی روشنی نہ دیکھتی۔ براہ کرم مجھے اس خط کا جواب جلد دیجئے کہ میں جلد از جلد ماہوار اجرائے پنشن پر ضروری احکام جاری کرا دوں۔

آخر میں یہ اضافہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ امر آپ کو بہت دور کہ ہز ہائینس ایک اور ذریعہ سے بھی آپ کے لئے ماہوار آمدنی کی کوشش کر رہے ہیں۔"

علامہ نے پر درد جواب لکھا (۳۰ مئی ۱۹۳۵ء)

"زیر سکون آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں انھوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی جبکہ میں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا"

خداوند تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے۔ ہندوستان کے تمام مسلمان شرفا میں سے کون ہے جو اعلیٰ حضرت کا اور ان کے دودمان عالی کا ممنون احسان نہیں ہے ؎

دور دستاں را باحسان یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

یہ عریضہ اعلیٰ حضرت کو سنا دیجئے۔

"اب میری درخواست صرف اس قدر ہے کہ احکام اس پنشن کے تو جاری ہوں گے سرکار عالی اپنے ہاتھ سے بھی اسی مضمون کا ایک خط مجھے لکھ دیں جو آپ نے مجھے لکھا ہے یہ خط میری اولاد میں بطور یادگار رہے گا۔ اور وہ اس پر فخر کریں گے۔"[2]

سر راس مسعود نے جواب میں لکھا کہ:

"جب خدمت میں حاضر ہوں گا تو جو مضمون چاہتے ہو ان کے ہاتھ سے لکھوا کر انشاء اللہ تمہارے پاس روانہ کر دوں گا تاکہ تمہارے خاندان میں جاوید سلمہ کے پاس بطور یادگار محفوظ رہے۔

مجھے اس کی پوری امید ہے کہ تمہارے لئے جو مزید کوشش اس وقت سرکار کر رہے ہیں اس میں بھی کامیابی ہوگی۔"

(۴ جون ۱۹۳۵ء)

سرکار نے ہز ہائینس آغا خاں کو خط لکھا تھا کہ وہ بھی اقبال کا وظیفہ اور دیگر والیان ریاست سے بھی امداد کرائیں۔ اس طرح اقبال وظیفہ قایم کیا جائے۔ ہنوز یہ سلسلہ ختم نہ ہوا تھا کہ ہز ہائی نس نے سر راس کو جواب دیا کہ ہم خود ہی وظیفہ مقرر کر دیا اور علامہ کی خواہش کے مطابق سے خط لکھوا کر بھیج دیا اس کے جواب میں علامہ نے اطلاع دی کہ[3]

"میں نے سادہ اور خوبصورت فریم میں لگوا دیا ہے۔"

علامہ نے یہ درخواست بھی کی کہ:

"اخباروں میں اس کا چرچا مناسب معلوم نہیں ہوتا اور اس کی ہدایت بھی صرف اعلیٰ حضرت ہی کو ہونی چاہئے۔"

(۱۸ ستمبر ۱۹۳۵ء)

اخبارات میں چھپ جانے ہونے کا مطلب تو صاف ظاہر ہے کہ اس کی شہرت نہ ہو لیکن طریقۂ ادائیگی کی یہ خواہش بے معنی معلوم ہوتی ہے ہز ہائینس آغا خاں کے وظیفہ کے متعلق علامہ کی خواہش تھی کہ:

"جاوید کے نام تا ختم تعلیم ہو جاوے[4]"

چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ نے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۵ء کو ایک مفصل خط لکھا:

"کل خط لکھ چکا ہوں آج اس تمام معاملہ پر کامل غور و فکر کرنے کے بعد پھر لکھتا ہوں آپ اس خط کو کا نفیڈنشل تصور فرمائیں۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے بھوپال میں آپکے ڈرائنگ روم میں گفتگو کی تھی میرا خیال تھا کہ میرا خیال معلوم کرنے کے بعد آپ نے شاید اس تجویز کو ڈراپ کر دیا ہوگا۔ اس کے بعد جس منسٹری کا آپ نے مجھ سے ذکر کیا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ بہرحال آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد میں ہیں وہ جو ہم سب کے لئے زندگی کا طرز ہے اُن کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے ان حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس رقم مزید کو قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے اور میں ہمیشہ بہتر کی حالت میں ہوں مجھے نہیں معلوم کہ آپ سے اور ہز ہائینس

---

[1] اصل خط انگریزی میں ہے لیڈی مسعود
[2] بحوالہ مکاتیب اقبال حصہ اول میں سر راس مسعود کے نام خطوط شامل ہیں ایڈیشن [illegible]
[3] اس موقع پر علامہ کے یہ پر جوش اشعار یاد آتے ہیں ؎
فطرت کو بر فلک بند نظر
پست می گردد احسان نگر
[5] یہ بیان ممنون حسن خان صاحب کا ہے جو سید راس مسعود کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔
[6] تیرہ اسے ہست بیضا مرنج [illegible]

آغا خاں سے کی خط و کتابت ہوئی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ میری اس تقریر کو ناشکری پر محمول نہ کیا جائے بہرحال میں نے ہز ہائینس آغا خاں کا شکریہ کا خط لکھ دیا ہے مگر اس میں منصوبہ بالا خیالات کا اظہار مطلق نہیں کیا گیا اور اغلباً مجھ کو ایسا کرنے کی جرات بھی نہ کرنی چاہئے تھی تاہم جب اس معاملہ پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے بہت سے پہلو ہیں اور میں نے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر آپ کو یہ خط لکھا ہے۔ آپ مہربانی کر کے مجھ کو جلد اس امر سے اطلاع دیں کہ آیا آپ کو میرے ان خیالات سے

اتفاق ہے یا نہیں اگر اتفاق نہیں ہے اور اب اس تجویز کا قداپ ترین مصلحت نہیں ہے تو پھر میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ہز ہائینس آغا خاں یہ پنشن جاوید کو عطا کر دیں اس وقت تک کہ اس کی تعلیم کا زمانہ ختم ہو جائے یا جس وقت تک کہ ہز ہائینس مناسب تصور کریں۔ بعض پرائیویٹ وجوہ کی بنا پر جن کا کچھ نہ کچھ حال آپ کو معلوم بھی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی تعلیم کی طرف سے بہ کلی اطمینان ہو جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہز ہائی نس آغا خاں میری اس تجویز کی نسبت کیا خیال کریں گے۔ میں نے اپنی مشکلات کا حال آپ کو لکھ دیا ہے اب آپ جو تجویز چاہیں کریں اور مجھ کو اپنے خیالات سے مطلع کریں۔ جہاں تک ممکن ہے جلد۔ آخری فیصلہ تک اس بات کا پریس میں جانا مناسب نہیں ہے امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

محمد اقبال۔ لاہور

علامہ نے جو شکریہ کا خط ہز ہائینس نواب صاحب کو مورخہ ۳۰ مئی کو لکھا ہے اس میں مبالغہ حد سے زیادہ کیا ہے کہ ہندوستان کے تمام خاندان شفا کو ممنون احسان بنا دیا[1]۔ علامہ نے ہز ہائینس کے قلمی خط کی جو خواہش کی تھی اس میں ایک قانونی نکتہ مضمر تھا جسکو علامہ محل کرنہ سکتے تھے۔ سر راس مسعود ریاست کے ملازم تھے، ان کو صرف خاص کے متعلق کسی معاہدہ کا حق نہ تھا اور کتاب کاپی رائٹ ایکٹ کی رو سے نواب صاحب کی ملکیت ہوتی اس لئے نواب صاحب کے خط سے ملکیت کا سوال ختم ہوتا تھا۔ اقبال نے اپنے کسی خط میں اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا اس لئے سوانح نگار رنجیدگی سے تعبیر کرتے ہیں کہانی والے مصنف فرماتے ہیں کہ:۔

"ایک مرتبہ لاہور جاتے ہوئے راس مسعود سے ملنے کے لئے میں بھوپال اتر گیا۔ اتفاق سے اقبال مسعود ہی کے مکان میں فروکش تھے لیکن بیماری کا ان پر غلبہ تھا۔ معراج کی شب تھی، ان کا مدار المہام امور مذہبی کی حیثیت سے مسجد شاہجہانی میں منعقدہ تقریب میں شریک ہونا شاید ضروری تھا......

تقریب معراج میں جاتے ہوئے مسعود صاحب نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ جبر پر ضرور وکش ایک مولانا نے وحی اور نبوت کے اسرار کو جس طفلانہ انداز میں پیش کیا۔ میں نے دیکھ کر راس مسعود کو اس جہل اور جہالت نے بہت دکھ پہنچایا ہے۔ وہ ان جہالات کے سننے کے لئے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے گھر واپس آئے تو اقبال جاگ رہے تھے اور قلبی درد کی وجہ سے کسی قدر رنجیدہ تھے......

مزاج پرسی کے بعد ان کے کمرے میں چلے گئے اور ان کا دل بہلانے کے لئے نہایت ہی دلچسپ اور مشیریانہ انداز میں مولانا کی اس بیہودہ سرائی کا ذکر کیا"

پھر ایک طول طویل داستان ہے ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ علامہ دو مرتبہ بھوپال گئے، پہلی دفعہ راس مسعود کے یہاں مہمان ہوئے اچھے خاصے تھے، دوسری مرتبہ آواز کے برقی علاج کے لئے گئے اور ایک سرکاری محل "شیش محل" میں مقیم ہوئے جو ہاسپٹل کے قریب اور سر سید راس مسعود کی سکونت کوٹھی سے اندازاً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ بھوپال میں شب معراج کی کوئی سرکاری تقریب نہیں ہوتی اور مسجد شاہجہانی ایک ناتمام و غیر مکمل عمارت اور غیر آباد محل وقوع پر ہے جہاں رات کو کوئی اجتماع نہ ہوتا تھا البتہ موذن و امام جو متعین تھے نماز پنجگانہ اور قرب و جوار کے مسلمان نماز جمعہ کے لئے اس میں جمع ہو جاتے تھے، اسی طرح رمضان المبارک کی تراویح میں بھی چند ہی آدمی ہوتے تھے، مصنف نے محض ایک واقعہ تصنیف کیا اور لکھ دیا۔

راقم ۳۳ سال مسلسل بھوپال میں مقیم رہا اور ۱۹۲۱ء کے بعد ہر سال جاتا رہا۔ اور ۱۹۴۵-۴۳ء میں نواب صاحب کی لائف مرتب کرنے کی خدمت سپرد ہوئی اور دو سال کے قریب مستقل قیام رہا۔ تقریب شب معراج کبھی سرکاری طور پر نہ سنی نہ دیکھی۔

علی گڑھ اور کشمیر

علی گڑھ تحریک اور علامہ

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کے لئے سر سید نے جو تحریک شروع کی وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے زیادہ تر شہرت پذیر ہوئی وہ تعلیمی بھی تھی اور سیاسی بھی۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی نہیں بلکہ قدیم تعلیم یافتہ امرا اور غربا و متوسط سب ہی کو اس تحریک سے دلچسپی پیدا ہو گئی جو روز بروز بڑھتی رہی۔

اس تحریک کا مرکز اگرچہ علی گڑھ صوبہ متحدہ تھا مگر سب سے زیادہ پنجاب میں وہ مقبول و موثر تھی۔ سر سید کے اعوان و انصار میں بھی مسلمانان پنجاب کا زیادہ حصہ تھا کالج میں بھی پنجابی طلبا کی کثرت تھی اور ان میں اہل طبقہ کے نوجوان تھے مگر بظاہر علامہ کو اس تحریک سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوئی۔

۱۸۹۸ء میں مسلم یونیورسٹی کی پہلی مرتبہ تحریک لاہور میں ہوئی تھی اس وقت تو وہ طالب علم تھے۔ ۱۹۰۰ء میں سر سید کے متعلق ایک نظم ملتی ہے مگر اس کی شان نزول کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ البتہ ۱۹۰۶ء میں طلبا کے نام ایک پیغام نظر آتا ہے جس کی شان نزول یہ ہے کہ اس سال یورپین اساتذہ کے خلاف کالج کے طلباء نے اسٹرائک کی اور بعض قدیم طلباء مثلاً مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کی تائید سے ان کو بڑی مدد ملی۔ علامہ اس زمانہ میں بغرض تعلیم لندن میں تھے اور ان کے استاد معین کالج کے سابق پروفیسر مسٹر آرنلڈ بھی وہیں تھے۔ علامہ اور ان کے مابین بھی شاگردی و استادی کا تعلق تھا۔ ایسی حالت

اور اس موقع پر ذیل کا "پیام" دیا گیا مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس کے بھیجا کس اخبار میں شائع ہوا کوئی حوالہ نہیں ہے

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے — عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے

طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم — یہ بھی سنو کہ نالۂ طائر بام اور ہے

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں — کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا — اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو — گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے

شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

آخری شعر یہ تھا

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے منہ پہ تم خشت کلیسیا ابھی

اس پیام کے چھ شعروں میں جو کچھ ہے وہ شاعری یا ایک قسم کا فلسفہ ہے علی گڑھ سے کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ آخری شعر میں یورپ کے اساتذہ کے خلاف اسٹرائک کی تائید اور انسان کی عظمت کا پیام ہے۔

علامہ جب واپس آئے تو علی گڑھ نے پروفیسری پیش کی دیا جس کو عام طور سے ناپسند کیا گیا[2]۔ اسی زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک اور ہا پر ترقی کر رہی تھی لیکن علامہ نے اپنی نظم "جواب شکوہ" میں اس کو ہی تصور کر لیا ع

کشور ہند میں ہے کلیہ ناکام کا بت

۱۹۲۵ء میں ان کو یونیورسٹی میں کسی اعزاز کی تجویز کی گئی تو پروفیسر محمد شریف کو لکھا کہ:۔

"یہ اعزاز اور بھی گرانقدر ہو جاتا ہے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میرا کوئی حق اس یونیورسٹی پر نہ تھا اور نہ عام طور پر علیگڑھ تحریک سے میرا کوئی خاص تعلق رہا ہے۔" (مکاتیب)

پھر سر سید راس مسعود نے اپنے زمانہ میں ۱۹۳۰ء میں لیکچروں کے لئے ... میں انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ اس وقت تک کوئی خاص ربط ... جب وائس چانسلری پر ڈاکٹر سر ضیاء الدین منتخب ہوئے اور ہز ہائینس بھوپال نے چانسلر شپ سے استعفیٰ دیا۔ تو اپنی اور اپنے دیگر احباب کی اور نیشنل پریس میں ایک زور دار بیان شائع کرایا۔ اس زمانے میں امید و آمال تھا۔

اس علی گڑھ کے سلسلہ میں سوانح نگاروں کی سوانح آفرینی خلیفہ عبدالحکیم رسالہ نقوش میں لکھتے ہیں کہ:۔

علی گڑھ والوں نے کئی مرتبہ ان کو بلایا لیکن وہ ایک دفعہ وہاں نہیں گئے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الدین نے بہت اصرار کیا جواب دیا کہ تم مجھے علیگڑھ بلاتے ہو مجھے یہیں رہنے دو میں یہاں میں رہتا ہوں[3]۔ ایک مرتبہ میر عثمان علی خاں علی گڑھ آ رہے تھے تو ضیاء الدین کو خیال ہوا کہ اگر اقبال بھی آ جائیں اور کچھ اشعار

---

[1] اسی طرح کشن پرشاد کو لکھا کہ "آپ کی ذات تو انسان کے لئے چشمۂ فیض و برکات ہے"

[2] علامہ دو مرتبہ بالمعاوضہ لیکچر دینے کو جا... علامہ کے لئے نہ بن سکی۔ (۱۶ مئی ۱۹۱۷ء)

[3] یہ جواب ۱۹۱۳ء میں مولانا شوکت علی کو دیا تھا لگ ... ایجاد خیالی ہے

کا شان میں پڑھ دیں تو زیادہ رقم یونیورسٹی کو مل جائے۔ یہاں کو تجربہ ہو چکا تھا کہ نثر لکھنے سے اقبال پر کوئی اثر نہیں ہوتا اس لئے ڈاکٹر ضیاء الدین نے ڈاکٹر بٹ پرنسپل طبیہ کالج کو لاہور بھیجا کہ جا کر وہ چونکہ عزیز بھی ہیں ان کو اصرار کر کے اپنے ہمراہ لیتے آئیں۔ ڈاکٹر بٹ لاہور میں ہمارے ہاں ٹھہرتے تھے انھوں نے مجھے ہمراہ لیا اور ہم دونوں اس مہم کو سر کرنے کے لئے ان کے پاس حاضر ہوئے۔ علامہ اقبال کچھ معذرت کرنے لگے لیکن ڈاکٹر بٹ مصر تھے کہ آپکو جانا ہی پڑے گا۔ اقبال ٹالنے کے فن میں ماہر تھے فرمایا کہ نزول جب ہوگی کہ میں نظام کی شان میں اور اس تقریب کے سلسلہ میں کچھ اشعار پڑھوں اگر کچھ اشعار ہو گئے تو پھر چلیں گے۔ ڈاکٹر بٹ نے کہا اچھا ہم پھر کل آئیں گے دوسرے روز گئے تو فرمانے لگے کہ رات کو میں بستر پر لیٹ گیا اور فکر شعر کرنے لگا کسی اور دنیا سے نظام کے متعلق ایک شعر بھی نازل نہیں ہوا اور اس کے بجائے بغیر کسی کوشش کے اور دس بیس اشعار ہو گئے جو اسی مضمون کے تھے غرضکہ دو تین روز اسی طرح ٹالا آخر ڈاکٹر بٹ مایوس ہو کر علیگڑھ واپس آ گئے۔

میں نے علامہ اقبال سے کہا کہ قومی خدمت ہے چاہئے آپ کے لئے شعر کہنا کونسی بڑی بات ہے۔ ریل کے سفر میں حرکت میں برکت پیدا ہو جائے گی۔ فرمانے لگے خود کچھ شعر کہہ لو اور وہاں جا کر میری طرف سے پڑھ دو۔ میں نے کہا کہ اس نالائق حرکت کا کوئی جواز نہیں۔

(نقوش جنوری ۱۹۵۵ء)

اس بیان پر جو ایک قریب ترین شخص کا ہے ناظرین خود ہی رائے قائم کر سکتے ہیں مگر اس کا پس منظر یہ تھا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین ہر ممتاز وزیر کی وزارت کو اس کے مزاج و میلانات کے مطابق نشاط و دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے تھے نظام بھی شاعر تھے اور ان کے صدر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد بھی۔ علامہ اور نظام کی ملاقات بھی ہو چکی تھی اور علامہ مدح بھی کر چکے تھے اور مہاراجہ کے ساتھ تو علامہ کے تعلقات محبوبیت تھے[2] مگر چونکہ نظام نے ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال کے متعین ہونے کے بعد پنشن منظور کی تھی اور کچھ ہی پہلے بھوپال سے ان کا وظیفہ مقرر ہوا تھا اس لئے علامہ کو ہز ہائینس کے تکدر خاطر کا خیال مانع رہا اور پھر مہاراجہ اور حیدرآباد سے تمام امیدوں میں ناکام بھی ہو چکے تھے اور اس راز کو ظاہر کرنا بھی نہ چاہتے تھے یہ زیادہ تعجب انگیز ہے کہ ڈاکٹر بٹ سخت قسم کے کھلے ہوئے قادیانی اور علامہ اقبال قادیانیت کے سخت ترین مخالف۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ذہین تھے انھوں نے ڈاکٹر بٹ کو اس کام کے لئے منتخب کرنے میں مصلحت سمجھی۔ یہ واقعہ بھی مفروضہ معلوم ہوتا ہے۔ راقم خود علی گڑھ موجود تھا ان تدابیر و انتظامات کو قریب سے دیکھتا رہتا تھا یہ کبھی نہ تھا کہ علامہ کو مخصوص دعوت دی جائے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ تحریک کا ایسا ادارہ تھا جس نے غیر منقسم ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں تعلیم کی ضرورت کا احساس اور حیات اجتماعی کے فوائد کا خیال اور شعور پیدا کیا۔ ۱۸۸۶ء سے ۱۹۲۰ء تک اس کے بتیس اجلاس ملک کے مختلف مقامات میں منعقد ہو چکے ۱۹۲۰ء کا اجلاس رنگون میں ہوا تھا۔ غرض بنگال، سندھ، پنجاب، مدراس اور یوپی اور صوبے سب ہی اس کے دائرہ میں تھے اور اس کے آغاز سے ہی مسلم یونیورسٹی تحریک اس نے اٹھائی اور کامیاب۔ بڑے بڑے مشاہیر اور ذی وجاہت اصحاب نے اجلاسوں کی صدارت کی متعدد اصحاب پنجاب کے تھے۔ اس کے علاوہ ہزارہا غریب طالبان تعلیم کا ذریعہ بنی اور خود اس کی ایک شاندار عمارت تعمیر ہوئی

البتہ ۱۹۲۱ء میں تعلیمی مقاطعہ کے باعث اس کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا مگر ۱۹۲۳ء میں جب سکون ہوا تو علی گڑھ میں ہی اجلاس قرار پایا اور سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب صدر منتخب ہوتے۔ اس موقعہ پر بہ لحاظ حالات امید تھی کہ علامہ بھی شریک اجلاس ہوں گے۔ اور اہم تعلیمی مسائل اور بالخصوص تعلیمی مقاطعہ پر اظہار خیالات کریں گے لیکن وہ شریک نہ ہوئے اور وجہ جو تھی وہ ان ہی کے قلم سے یہ تھی کہ:۔

"افسوس ہے کہ میں علی گڑھ نہ جا سکوں گا۔ سردی کا موسم ہے اور مجھے اس موسم میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ کانفرنس ایک عرصہ سے مردنی ہے۔ حبیب الرحمن خاں شروانی اس کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر

پئے نافہائے رمیدہ بو مپسند زحمت جستجو
بخیال حلقۂ زلف او گرہے زن و بختن آ

(۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ء مکاتیب اقبال)

لیکن یہ علامہ کا خیال ہی خیال تھا اور عرصہ کا لفظ محض تراوش قلم تھی وہ اتنی زندہ قوت تھی کہ ۱۹۲۳ء میں قائد اعظم نے بمبئی میں سالانہ اجلاس کے لئے مدعو کیا اور سالانہ اجلاسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۲۶ء کے اجلاس منعقدہ مدراس کے صدر علامہ کے مخلص ترین دوست سر عبدالقادر تھے انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں سرسید اور ان کے جانشینوں کی مساعی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"گذشتہ چالیس سال میں جس قدر بھی بڑے بڑے آدمی مسلمانان ہند میں ہوئے یا جنھوں نے اچھی خدمات قومی انجام دیں انھیں بالعموم اس کانفرنس سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے۔"

پھر شروانی صاحب کی نسبت کہا کہ:۔

"انہیں کی کوشش سے وہ روایات جو اس کانفرنس سے مخصوص تھیں قائم رہیں اور وہ اعلیٰ تخیل جو کانفرنس کے ممتاز بانی نے پیش کیا قوم کی نگاہ میں جچا رہا۔"

پھر سیاسی ہیجان و طوفان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"مگر ہمارے باہمت سکریٹری صاحب ان ناسازگار حالات سے خوفزدہ نہ ہوئے اور انھوں نے خاموشی مگر استقلال کے ساتھ اس کام کو جو ان کے سپرد تھا جاری رکھا اور کئی جگہ بہت کامیاب اجلاس کانفرنس کے ہوتے رہے۔"

علامہ اب تک غالباً اس صف میں نہ تھے جن کا تعلق اس کانفرنس سے تھا" جو نافۂ رمیدہ بو نہ تھی بلکہ اس کی خوشبو ہر طرف پھیل چکی تھی۔

علامہ اور کشمیر

علامہ نے اپنے کشمیری الاصل ہونے پر فخر کیا لیکن کشمیریوں کے مفاد میں ان کا صرف یہ کام نظر آتا ہے کہ وہ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے جنرل سکریٹری تھے۔ ۱۹۰۹ء میں ڈھاکہ کے خواجہ سلیم اللہ خاں نے وائسرائے کی کونسل میں فوج میں کشمیریوں کی ملازمت اور زراعت پیشہ ہونے کے متعلق سوال کیا تھا اور اسی بنا پر حکومت صوبہ نے اعداد و شمار فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کیا اب علامہ نے ایک اپیل شائع کی کہ قومی کارکنان اعداد و شمار کی فراہمی کے متعلق حکام سے تعاون کریں۔ نیز چند رباعیاں بھی مسلمانان کشمیر کی نسبت لکھیں۔ ذکر اقبال کے مرتب نے دو رباعیاں بطور نمونہ پیش کی ہیں ؎

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر — چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
در مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں — مل کے دنیا میں رہو مثل حروف کشمیر

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور — یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر — بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

مختلف زمانوں میں اکثر خاندانوں نے کشمیر سے ہجرت کر کے ہندوستان اور خصوصاً پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی اس سوال اور اپیل کا تعلق انہیں مہاجر کشمیریوں سے ہے لیکن ان لاکھوں مسلمانوں سے جو کشمیر میں تھے کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ مگر علی گڑھ پر اس کا سخت اثر تھا اور ان کے مفاد میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو آنریری سکریٹری کانفرنس تھے نے انہماک اور درد و جوش کے ساتھ جد و جہد شروع کر دی ۱۹۱۱ء میں کانفرنس کراچی میں کشمیری طلباء کے لئے مخصوص وظائف حاصل کئے اور کانفرنس سے بھی اس قسم کا انتظام کیا کہ غریب کشمیری طلبا جو علی گڑھ اور لاہور میں تعلیم حاصل کریں ان کی مدد کی جائے یہ جد و جہد مسلسل جاری رہی ہر سال کانفرنس میں ضرورت کے لحاظ سے قرار دادیں منظور ہوتی رہیں ایک خاص سفیر کشمیر میں متعین کیا کہ وہاں کی تعلیمی ضروریات کے متعلق تحقیقات کر کے اعداد و صحیح حالات جمع کرے اور لوکل کمیٹیاں قائم کرے خود جا کر ایک وفد مرتب کیا اور مہاراجہ کے سامنے ایک میمورینڈم پیش کیا۔ اگرچہ جواب دل شکن تھا مگر عزم صمیم سے وہاں کام کرتے رہے۔ وہ سب تمام حالات ایک رسالہ کی صورت میں شائع کئے پھر مسلسل جد و جہد جاری رہی اور علی گڑھ میں طلباء کی آمد و امداد کا سلسلہ قائم رہا لیکن علامہ کی کوئی تائید و امداد نظر نہیں آتی۔

---

[1] ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور نظام سے خود گہرے تعلقات تھے۔ پرائیوٹ مراسلت تھی علامہ کے اشعار سے کوئی امید نہ تھی کہ زیادہ رقم مل جائے نظام نے جو کچھ عطیات دیئے وہ ڈاکٹر صاحب اور آغا خاں کے اثر سے اور یونیورسٹی کی ضرورت کے لحاظ سے دیئے۔ (ملاحظہ ہو ضیائے حیات)

[2] خطوط موسومہ مہاراجہ کشن پرشاد ملاحظہ طلب۔

[3] یوں تو کشمیر کے متعدد طلباء نے اپنے کردار و عمل اور قابلیت سے شہرت حاصل کی لیکن نظم میں چودھری خوشی محمد ناظر اور سیاسیات میں اسیر پنجۂ ظالم شیخ عبداللہ سابق وزیر اعظم کشمیر جو اپنے وطن میں ہی بھارتی قید میں تھے خاص طور پر شہرت رکھتے

ملہ جواب شکوہ کے متعلق بیان ہے کہ ۱۹۱۱ء کے ماہ اپریل میں انجمن حمایت الاسلام کا جو سالانہ اجلاس ہوا اس میں علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم شکوہ ریواز ہوسٹل کے صحن میں پڑھی چند ماہ بعد موچی دروازہ کے باہر ایک بہت بڑے جلسے میں علامہ نے جواب شکوہ تحت اللفظ پڑھ کر سنائی آب یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ مجروحین بلقان کے لئے لکھی گئی ۱۹۱۱ء میں نظم لکھی اور ۱۹۱۲ء میں جنگ شروع ہوئی۔ جواب شکوہ کا ایک بند تھا۔

کشورِ ہند میں ہے کلیہ ناکام کا بت — عربستان میں شفاخانہ اسلام کا بت
اور لندن میں عبادت کدہ عام کا بت — لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بت

بادۂ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

جواب شکوہ ہی میں ایک بند اسی شعر سے شروع ہوتا ہے ع

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا
غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا (جنگ بلقان کی طرف اشارہ ہے) یہ اُس زمانہ کی قومی تحریکات پر حملہ تھا۔ کلیہ ناکام یعنی مسلم یونیورسٹی کی تحریک پنجاب میں بار آور ہو رہی تھی۔ چند ماہ پہلے فروری میں آغاخاں کے وفد فراہمی سرمایہ کا بڑا شاندار استقبال و جلسہ ہوا تھا۔ مسلم لیگ مسلم دستوری تحفظات میں برابر کامیاب ہو رہی تھی اور دسمبر ۱۹۱۱ء میں کانگریس اور اس کے مابین ایک میثاق کی تجویز ہو چکی تھی۔ بیمار حاجیوں کی سہولت کے لئے شفاخانہ اور لندن میں مسلمانان مقیم لندن اور نومسلموں کے لئے ایک مسجد کی تجویز تعین کیا یہی بین الاسلامی نظریات تھے کہ ان تحریکوں کو اصنام سے تشبیہ دی جائے اس نظم کی اشاعت کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ہی اس بند پر ناگواری عام کا خیال پیدا ہوا یا وہ ظاہر ہوئی تو اس کو تبدیل کر دیا۔

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں — اُمتی باعثِ رسوائیٔ پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں — تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے
قوم دنیا میں یہی احمد بے میم کی ہے

"اُمتی باعثِ رسوائیٔ پیغمبر ہیں" گستاخانہ کلمہ ہے، پیغمبر کی رسوائی کیا معنی وہ تو رسوا ہوتا ہی نہیں اسی طرح "قوم دنیا میں یہی احمد بے میم کی ہے" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ احمد بے میم احد ہوا۔ حالانکہ محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صاف ہے۔ رسول اللہ صلعم کو احد نہیں کہہ سکتے مگر اس شعر کو بانگ درا سے خارج کر کے پھر وہی شعر کہا ہے

بادۂ آشام الخ

ع سے بھی موجود تھا لیکن اس میں شدت اور گرمی مغرب
ی۔ اس کی طبیعت میں یہ آفتاب حشر مغرب میں طلوع ہوا
واپسی کے بعد اقبال کی غالباً سب سے پہلی نظم بلاد اسلامیہ
ی انقلاب کا پتہ دیتی ہے کہ اقبال نے اب وطنیت کے دائرہ سے باہر
قدم رکھا ہے بعد اس کے ترانۂ ملی کی زمین میں ترانۂ ملی لکھا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

... ہمیت بھی شدت کے ساتھ رہا ہے۔ وہ دنیا والوں کے لئے ایک پیام
... ہے جو بیدار ہو، ہر طرح ہر جگہ ... اسی الفت مسلم کی
... پہنچانے کے لئے آتا ہے۔
... اعلیٰ درجہ کا شاعر ہونے کے علاوہ مفکر اور مصلح بھی ہے۔ بعض
... حیثیت شاعر ملت ہے۔ بعض نظموں میں حکیمانہ افکار شعر کے پیرایہ
... ہیں اور بعض نظموں میں جذبہ اصلاح غالب ہے۔ (ص ۔۔)
... سے ۱۹۰۸ء تک کی دو سالہ مدت میں علامہ اقبال کی فکر کے دو
نہایت واضح اور معین راہ عمل اختیار کی ایک خودی اور دوسرے
... نظریہ ......
... دور کی اردو نظموں میں بلاد اسلامیہ۔ ترانۂ ملی۔ وطنیت
... مدینہ کے راستے میں، شکوہ، جواب شکوہ، خطاب بہ جوانان اسلام
... میں۔ شفاخانۂ حجاز۔ دعا۔ فاطمہ بنت عبداللہ۔ شبلی و حالی۔
... فرد اسلام، بلال اور متعدد نظمیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ شاعر کے
... اپنے مقدس نصب العین کو مقبول بنانے کا جوش بدرجہ اتم پیدا
..... ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کی آفت نازل ہوئی جو ۱۹۱۳ء تک رہی
وہ تو مجروحین بلقان کیلئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے لکھی گئی (ص ۔۔)
مذکورہ نظموں کے علاوہ اور نظمیں بھی ہیں مثلاً دار کانفرنس دہلی اور جلسہ فتح
... بی بی اور جواہر لال نہرو سے اظہار والہی و عقیدت۔ آغاخاں اور قائد اعظم
... کا تحفہ۔ رات اور شاعر۔ موٹر۔ پھولوں کی شہزادی۔ کسی کی گود میں بلی
... کس شعبے سے متعلق کہا جائے گا۔
... سوانح نگار کا بیان ہے کہ:۔
"مولانا میر حسن کی تعلیم کے اثر سے اقبال پر علوم اسلامی اور
... تصوف کے اسرار اور معارف بھی کھل گئے تھے۔"
... اس بیان کے مطابق اقبال چالیس سال کی عمر تک اسلامی
... پاکبازی و عفت سے محروم رہا نصیب تھے اور مرتب فکر اقبال
...
... کی شاعری وہ شاعری ہے جو شاعر کے تلمیذ الرحمٰن
... کا نتیجہ ہوتی ہے اور جسے پیغمبری کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔
... اردو فارسی کے تمام اساتذہ میں شاید کوئی دوسرا شاعر
... قماش کا مل سکے جس نے بغیر اپنی باطن کی نفسی تحریک کے کبھی
... نہیں کہا۔
... میں چند مختلف اشعار درج کرتے ہیں جن سے ان دعاوی پر پوری
... ہے۔

... جز رضائے تو بجوئیم — جز آن راہے کہ فرمودی نپوئیم
... نادان بگوئی — خرے را اسپ تازی گو نگوئیم

... جنوں من جبرئیل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

... روز محشر برہمن گفت — فروغ زندگی تاب شرر بود
... گرنہ رنجی باتو گوئیم — صنم از آدمی پایندہ تر بود

دو مانت فخر اشرات عرب   عقل کل را حکمت آموز آمدی

آشنا نے معنی بیگانہ
جلوۂ تیغے مرا پروانہ

ان اشعار کے بعد ۵ شعروں میں اپنی رفعت تخیل کو بیان کرکے آخری شعر کہتے ہیں ؎

نذر اشک بیقرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

مگر اسرار خودی کی اشاعت ثانی میں یہ اشعار خارج ہیں مؤلف "ذکر اقبال" سر علی امام سے تعلق کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کسی موقع پر ان کے جذبہ اسلامیت نے علامہ اقبال کو متاثر کیا ہو اور علامہ نے اس تاثر کے تحت اسرار خودی ان کے نام معنون کردی ہو (صفحہ ۸۵)

مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ لوگوں نے تعنون پر اعتراض کیا کہ ایسی کتاب کو ایک طالب دنیا اور ایک ریاست کے وزیر اعظم کے نام پر معنون کرنا کیا معنی؟ مگر یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ سر علی امام اس وقت صدر اعظم نہ تھے بلکہ ۱۹۱۹ء میں صدارت پر فائز ہوئے البتہ اقبال جیسا کہ شاد کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"سرکار تو صدر اعظم کی خبر سنتے ہیں پھر کیا عجب کہ اقبال کی دیرینہ ارادت اور خاکی شاد کی کشش متحد ہو کر کام کر جائیں۔"

(۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء)

اقبال ایک مدت سے منتظر امام تھے اور اپنی امیدوں کی پرورش کر رہے تھے علامہ نے "رموز بے خودی" نظام سابع کی خدمت میں حسب ذیل مدحیہ اشعار کے ساتھ پیش کی:

اے مقامات برتر از چرخ بریں	از تو باقی سطوت دین مبین
جلوۂ صدیق از سیمائے تو	حافظ ما تیغ جوشن خائے تو
از تو اہل سیح خنداں شام ہند	آستانت مرکز اسلام ہند
دانش ملت زندہ از امروز تو	تاب این برق کہن از سوز تو
بندۂ مستیم ما تو خواجۂ	از پئے مزد اشعار ساچۂ
گوہرم را شوخی ناش سپاک کرد	تا گریباں صدف را چاک کرد

پیش سلطاں ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خون جگر آوردہ ام

مدح کے جو نمونے ہم نے پیش کئے ہیں ان کو دیکھ کر قدرتی طور پر اس بات کے دیکھنے کا بھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان عالی مرتبت امراء و رؤساء نے اس مدحت کی قدر یا شکر گزاری کس نہج سے کی سر علی امام نے اسرار خودی کے تعنون اور شاعر کے اشک بیقرار اور گریۂ بے اختیار کو کس طرح قبول کیا۔ نظام نے اس "قطرۂ خون جگر" کو جو رموز بے خودی میں موتی بن کر چمکا اپنے جواہر خانۂ دل میں کیسے رکھا کشن پرشاد سے جو امیدیں تھیں وہ کہاں تک بر آئیں۔

سیرت نگار سب خاموش ہیں اور علامہ نے بھی کہیں اشارۃً ذکر نہیں کیا۔ البتہ تاجدار ہند نے سر کی نذر کو قبول کرکے سرخرو بنا دیا۔

بعض مدحیہ نظموں میں علامہ نے تشبیہات و استعارات کا نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو مذہبی احساس پر بار ہو جاتا ہے۔ نظام کی مدح میں ان کے آستانہ کو مرکز اسلام ہند کہنا یقیناً ملت اسلام کے منافی ہے پھر اس اضافت کا مطلب ہی بین شاعرانہ ہے اسلام تو عرب، ترک، ایران، غرض تمام دنیا کا ایک ہی ہے۔ چین و عرب اور ہند کی تقسیم کے کیا معنی ہیں؟

تشریحات کلام | اقبال کے کلام کا بڑا حصہ پوری تشریح کا محتاج ہے اور جب تک شرح سامنے نہ ہو شاعر کی فکر پر عبور نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی مطلب اخذ ہو سکتا ہے اور بقول مؤلف "سیاسی کارنامہ" اقبال کو سمجھنا اگر مشکل ہے تو سمجھانا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ ایک سیرت نگار لکھتے ہیں کہ:

"اقبال کے متعلم کو اگر صحیح معنی میں اقبال کی روح سے اتصال پیدا کرنا ہو اور اس کے پیام کی گہرائیوں تک پہنچنا مقصود ہو تو اس کو ان تینوں مرحلوں سے گزرنا پڑے گا۔ اس میں اتنا ادبی مذاق ہونا چاہئے کہ اقبال کے بلند پایہ ادبی خصوصیات لطیف تلمیحات و اشارات اور ادق استعارات و کنایات کی تہ تک پہنچ سکے ادب کا جو نقطۂ معراج ہوتا ہے وہی فلسفہ کے لئے نقطۂ آغاز کا کام دیتا ہے جو نگاہ فلسفہ کی غلام گردش میں بھٹک کر رہ جائے اور فکر انسانی کے تدریجی ارتقا سے کما حقہٗ واقفیت کا موقع نہ پا سکی ہو وہ اقبال کے عمیق فلسفیانہ مباحث کے سمجھنے سے قاصر رہے گی فلسفہ جب اپنی معراج پر پہنچ چکتا ہے تو جب کہیں مابعد الطبیعاتی اور الٰہیات کے مباحث کے آغاز کی نوبت آتی ہے "چیست عالم چیست آدم چیست حق ...."

جن تین بلند سطحوں پر مضبوطی سے قدم جما کر اقبال نے فکر کے ان گنجلک عقدوں کو حل کیا ہے اقبال کے شارحین میں خود ان کو بلند سطحوں تک پہنچانے کے بجائے اقبال کو اپنی پست سطحوں پہلے تنے کا میلان زیادہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔" (کہانی ص ۴۰)

مرتب "اقبال نامہ" و "مکاتیب اقبال" لکھتے ہیں:

"میری تجویز و درخواست پر مولوی محمد یحییٰ صاحب عباسی کیفی چریاکوٹی نے جن کے علم و فضل کا احترام خود اقبال کو تھا "تلمیحات اقبال" کے نام سے ایک کتاب مرتب کرنی شروع کی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے قرآن کریم، احادیث نبیؐ اور تاریخ ادب اسلام سے متعلق کلام اقبال میں جو حوالہ جات اور اشارات پائے جاتے ہیں ان کی تشریح و توضیح سے اقبالیات کی ہر دلعزیزی و عالمگیری میں معقول اضافہ ہوگا۔"

قاضی اختر اپنی کتاب "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" میں لکھتے ہیں کہ:

"اقبال کی شاعری تمام قرآنی تعلیمات پر مبنی اور اس کا پس منظر قرآن ہی قرآن ہے اور اسی لحاظ سے خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا یہ جامع و مانع قول اس صداقت کو واضح کرتا ہے کہ "اقبال قرآن کا شاعر ہے اور شاعر کا قرآن ہے۔"

(إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)

اور اسی سلسلہ میں ہیرو اقبال انجمنوں کے لئے حسب ذیل لائحہ عمل بھی پیش کرتے ہیں:

(۱) ایک جامع لغات کی ترتیب جس میں اقبال کی تمام تصانیف میں مختلف علمی و فنی اصطلاحات کو بہ ترتیب حروف تہجی جمع کرکے ان کے معنی و مطالب کی تشریح کی جائے۔

(۲) اقبالی تلمیحات و اشارات پر ایک جامع کتاب کی تدوین جس میں تمام تلمیحات کی تشریح و توضیح ہو۔

(۳) فہرست اعلام و اماکن جس میں کلام اقبال کے تمام اشخاص و اماکن اور کتب کا احوال ہو۔

(۴) سیرت اقبال بڑے پیمانہ پر تیار کی جائے جو ان کی زندگی کے تمام حالات و خیالات کے مختلف شعبوں اور کارناموں پر حاوی ہو۔

(۵) کلام اقبال کے مجموعوں کے خاص ایڈیشن مقدمات اور تشریحی حواشی کے ساتھ شائع کئے جا سکتے ہیں۔

تضاد | اقبال کی زندگی کی تمام روئداد پڑھنے کے بعد ضمیر پاکر دعمل کا یہ عجیب تضاد نظر آتا ہے کہ وہ ایک طرف "کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو" کا نعرہ لگاتے ہیں اور نوجوانان ملت میں ایک لہر پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر دوسری طرف امرا کی مدح سرائی بھی کرتے ہیں۔ ان کے آستانہ پر حاضری کو شرف جانتے ہیں ایک غیر مسلم میر کے نام کشن پرشاد میں ذوالمنن کی ہمدردی جتا کر اپنی تقدیر کو مخفی دیکھتے ہیں اور اس کی نظر عنایت کی تمنا کرتے ہیں اس کی ایسی خدمت انجام دینے کے لئے جس سے اپنی توقعات بھی وابستہ ہیں مجذوبوں، سجادہ نشینوں اور مزاروں پر حاضری کے لئے اوقات عزیز صرف کرتے ہیں اور استخارہ کو بھی رہنما جانتے ہیں۔ وہ پیام میں تو "نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں" سناتے ہیں مگر اپنی تقدیر دوسروں کے ہاتھوں میں سپرد کر دیتے ہیں۔

دراصل تقدیر سے انھوں نے ایک قسم کی بغاوت کی اور تقدیر نے ان کو سزا دی انھوں نے دوسروں پر بھروسہ کیا جو کبھی کامیاب نہ ہوا۔

اقبال کے وہ خطوط جو سر کشن پرشاد اور سر راس مسعود کے نام ہیں اور ان کے اشعار جو امیر امان اللہ خاں وغیرہ کے نام ہیں پڑھنے کے بعد دیکھئے ؎

تو اگر خود دار ہے منت کش ساقی نہ ہو	عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
در جہاں جز درد دل درماں مخواہ	نعمت از حق خواہ و از سلطاں مخواہ
از غم ہستی مئے گلفام گیر	نقد خود از کیسۂ ایام گیر
فطرتے کو بر فلک بندد نظر	پست می گردد ز احسان دگر
مشت خاک خویش را از ہم مپاش	مثل مہ رزق خود از پہلو تراش

کار مرداں ست تسلیم و رضا
بر ضعیفاں راست نایدایں قبا

اگر اقبال کی سیرت اور حالات کو ان کے خطوط ہی کی روشنی میں دیکھا جائے تو عامۃً ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں قناعت نہ تھی شاعرانہ تخیلات اور عائلی تفکرات نے سخت کوشی محنت اور عزم و استغنا سب ہی کو مجروح و معطل کر دیا تھا۔

پروفیسری سے طبعاً متنفر تھے، قانونی پریکٹس میں محنت نہ کر سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ کبھی حیدر آباد کی سمت دیکھتے تھے کبھی افغانستان کی طرف نظر دوڑاتے کبھی منتظر امام رہتے۔ کبھی سر کشن پرشاد کی وزارت کے تحت "دین الجائز" کے مطابق وہ متن کرتے جو ایک فلسفی اور حکیم امت سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتے۔

اقبال کی روئداد زندگی ان کے تمام پیغامات سے زیادہ سبق آموز اور بصیرت افروز ہے۔ واہب العطایا نے علم و عرفان ذہنی قابلیت دماغی قوت اور نفسانی بصیرت سے انہیں بڑا حصہ عطا کیا تھا مگر اقبال نے اس کی قدر نہ کی اور ان عطیاتِ الٰہی سے فائدہ نہ اٹھایا۔

اقبال کے تمام مصنفات کلام پر نظر ڈالنے کے بعد جہاں ان کے کمال شاعری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے وہاں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآنی تعریف "فی کل واد یہیمون"[1] ان پر صادق آجاتی ہے۔

ان کے پیغامات بڑے دلچسپ ہیں لیکن علامہ کی پوری روئداد زندگی جب سامنے ہے اس میں اپنے ہی پیغامات کا کوئی پرتو نہیں اور وہ "یقولون ما لا یفعلون"[2] کے مصداق ہو گئے ہیں۔ قرآن کی اس تنبیہ کا کہ "کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ..."

---

[1] وہ (شاعر لوگ) خیالی مضامین کے ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں (سورۂ شعراء ۲۲۵)

[2] اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں (سورۂ شعراء ۲۲۶)

جب مسلم لیگ میں آئے تو علامہ نے جو طرح کے اجلاس تھے ایک تمہیدی تقریر کے ساتھ وہ نظم سنائی جو مصنف نے تمیں کے پھول بہ چلنے کے مترادف قرار دیا ہے انھوں نے اپنی بات کو کہا۔

"جناب صدر و حضرات!! علی برادران کے اس جلسہ میں تشریف لانے پر جو قطعہ صدر نے ارشاد فرمایا ہے اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔ یہ دونوں بھائی قوم کے عزیز محبوب ہیں نہ صرف ان خدمات کے عوض جو انھوں نے قلمی زبانی یا کسی اور طریق سے انجام دی ہیں بلکہ میرے خیال ناقص میں ایک بہت بڑی خدمت کی ہے جس نے انہیں پہلے سے زیادہ محبوب بنا دیا ہے اس کا ذکر اس وقت ضروری ہے وہ خدمت ان کی دینی استقامت ہے علی برادران کی نظربندی کا زمانہ اور ان کی دینی استقامت بمنزلہ ایک چٹان کے ہے جس پر مسلمانوں کی سیرت کا آئندہ محل تیار ہوگا۔

"صاحبان، یاد رکھئے اگر اس ملک و قوم میں علی برادران ایسے کچھ اور فرزندان اسلام ایک درجن بھی پیدا ہو جائیں تو قوم کی سوشل پولیٹیکل اور دیگر حالتوں کی اصلاح کے لئے کافی ہوں گے۔ کل مجھے معلوم ہوا کہ ان کا تار آیا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ کل صبح امرتسر پہنچیں گے اس موقع پر دو تین اشعار میرے خیال میں آئے اور یہ قدرتی بات ہے کہ جو محبت اور اخلاص ان سے مجھے ہے اس کا کسی قدر اظہار ان اشعار میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ کے مندرجہ ذیل شعر پر دو تین شعر موزوں کئے ہیں اور عرض کرتا ہوں:"

شہپر زاغ و زغن الخ

(رپورٹ مسلم لیگ ۱۹۱۹ء)

مسلم لیگ کا یہ اجلاس بہت شاندار تھا ہزاروں کوس کا سفر کرکے بہت سے ممبر شریک ہوئے تھے۔ صدر استقبالیہ مولوی ثناء اللہ اور صدر اجلاس حکیم اجمل خاں تھے۔ مسٹر محمد علی جناح بھی شریک اجلاس تھے۔ انھیں دنوں کانگریس کا اجلاس بھی منعقد ہو رہا تھا لیگ کی قراردادوں میں نظام حجاب، خلافت اور ہندوؤں کے ساتھ مواخات اہم مسائل تھے جن پر علامہ کے خیالات یقیناً اہم ہوتے مگر انھوں نے کسی قرارداد کے متعلق کوئی تائیدی تحریک یا اختلافی حصہ نہیں لیا۔

اب وفد خلافت و علامہ کے واقعہ کا دوسرا رخ بھی دیکھئے جب یورپ سے وفد واپس آیا تو مولوی سید سلیمان ندوی کو جو خلافت کی مذہبی حیثیت واضح کرنے کے لئے شریک وفد تھے علامہ لکھتے ہیں کہ:

"مراجعت صحیح الخیر کی مبارکباد آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور ملے گا۔ خدا جانے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔ وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے جو ان حالات میں پیشتر دیکھا ہے، اَوُمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُھُمَا لَنَا عٰبِدُوْن، تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا۔"

(۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء)

اس خط کے ساتھ ہی مولانا گرامی کے ساتھ تیرہ ماہ قبل کا خط ۱۰ ستمبر ۱۹۱۹ء والا بھی پڑھ لیجئے مرتب مکاتیب لکھتے ہیں کہ:

"حضرت علامہ نے جنگ بلقان (طرابلس و بلقان) میں ایک الحمدللہ کو ابلنہ کیا اور جنگ عظیم کے بعد تحریک خلافت میں ایک حد تک خود شامل رہے۔"

گو یہ قول سے واضح طور پر صرف دو لفظوں ہی میں محدود نظر آتی ہے کہ تحریک خلافت کی شمولیت ایک عملی اقدام تھا اس کی وضاحت نہیں کی لیکن علامہ کے ان خطوط میں جو مکاتیب اقبال ہی میں شائع ہوئے ہیں یہ وضاحت موجود ہے جس سے صورت متعین ہو سکتی ہے۔ وہ خط یہ ہیں۔

(۱) "مسئلہ خلافت ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق مسلمانوں کو ہر صورت کرنا لازم ہے بعد میں چاہئے گی۔"

(۱۰ ستمبر ۱۹۱۹ء)

(۲) "آج نقریر میں نے کی وہ ایک مذہبی لحاظ کی تائید یا شاید تحریک میں تھی مسئلہ خلافت پر نہ تھی، خدا جانے اس کا حرمین کی حفاظت سے تعلق رکھتا ہے۔"

(۱۵ دسمبر ۱۹۱۹ء)

ان واقعات کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ایسے امور میں شمولیت کے لئے جرأت مومن چاہئے علامہ تو ۱۹۱۹ء کے زمانہ کو بھی "طوفان بے تمیزی" اور "مرکز کشتی نوح" سمجھتے تھے یہ زمانہ تو مقابلۃً زیادہ نازک تھا۔

اسی زمانہ میں اکبر الہ آبادی نے کچھ اشعار لکھے تھے ان کو دیکھ کر لکھتے ہیں کہ:

"وقت کی مصلحت نہیں ورنہ آپ کے اشعار پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا۔"

(۲۸ اکتوبر ۱۹۱۹ء)

"آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ گاندھی صاحب کا خاموش مقابلہ کہاں تک رنگ لایا کہ حکام لاہور اور پنجاب کے دیگر مقامات میں مارشل لاء کے اجراء پر مجبور ہو گئے الحمد للہ لعنۃ الی نفس... عجیب زمانہ آرہا ہے آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر یہ زمانہ گھر سے باہر نکلنے کا نہیں۔"

(۲۰ اپریل ۱۹۱۹ء)

حالانکہ ایک اور دوست کو مارشل لاء کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مگر امن پسند لوگوں کے لئے اس میں کوئی اندیشہ نہیں۔"

(۱۱ اپریل ۱۹۱۹ء) مکاتیب اقبال

۱۹۲۰ء میں جب یہ ترک موالات شروع ہوئی تو حامیان تحریک نے اسلامیہ کالج لاہور پر بھی حملہ کیا علامہ اقبال اس وقت کالج کے معتمد تھے اور تحریک سے اختلاف تھا انھوں نے کوشش کی کہ کالج محفوظ رہے لیکن ان کی کوششیں ناکام رہیں۔

یہ ایک واقعہ تھا مگر اس ناکامی کو جو کسی تنقیص کا موجب نہ تھی اہمیت دینے کے سلسلہ بیان میں سیاسی لائف نگار رقمطراز ہیں کہ:

"علی برادران نے علی گڑھ پر دھاوا بول دیا ہے اور مسلم یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے تحریک ترک موالات کا طوفان علی گڑھ کو ایک ذرہ بے مقدار کی مانند اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کو علی برادران کے مقابلہ میں منہ کی کھانی پڑی۔" (۲۰۵)

سیاسی کارنامہ کا یہ بیان مبالغہ آمیز بلکہ لغو ہے۔ حقیقت صرف یہ تھی کہ جب یہ حملہ ہوا جو کئی دن تک جاری رہا تو طلباء کی ایک قلیل جماعت نے اسلام کی آواز سمجھ کر کالج چھوڑ دیا لیکن کثیر جماعت بدستور تعلیم میں مصروف رہی اور خلفشار سے بچنے کے لئے چند روز کو کالج بند کر دیا گیا اور جب دسمبر میں کالج کھلا تو وہ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تھا اور بالکل وہ جامعہ ملیہ جو ایک رئیس کی کوٹھی اور خیموں کی شکل میں اس کے قریب ہی قائم ہوا یونیورسٹی میں داخلہ کھول دیا گیا جس شدت سے حملہ ہوا تھا اتنی ہی استقامت سے مقابلہ کیا گیا اور نتیجہ میں کچھ دنوں کے بعد ہی جامعہ کو منتقل کرنے پر مجبور کر دیا یہ تاریخی واقعہ ہے مگر مصنف سوانح نے مسخ کر دیا۔

مصنف نے قومیت کی تشکیل دو قومی نظریہ اور ہندوستان میں پارلیمانی طرز حکومت کی ناموزونی پر بحث کرتے ہوئے ان امور کو سب سے اول واضح کرنے کا امتیاز بھی علامہ کی ہی طرف منسوب کیا ہے وطنیت سے رجوع کرنے کے بیان میں رقمطراز ہیں کہ:

"یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں ہم کو ہندوستان کے اندر جتنے سیاسی کارکن اور مفکرین نظر آتے ہیں ان سب میں اقبال ہی غالباً ایک ایسا منفرد شخص ہے جو متحدہ وطنیت کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے خلاف پورے زور شور سے اپنی آواز بلند کرتا ہے، خود نواب محسن الملک، وقار الملک اور ان کے دیگر ساتھیوں (جنھوں نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی اور اس علیحدگی پسند تحریک کی ابتدائی قیادت کی) کے ذہنوں میں متحدہ وطنی قومیت اور علیحدہ مسلم قومیت کے متعلق واضح تصورات موجود نہیں تھے اور اگر یہ تصورات تھے بھی تو اصولی اور عملی نقطہ نظر سے ان کے باہمی تضاد کا انھیں واضح الفاظ میں ادراک نہیں تھا۔"

(ص ۴۳، سیاسی کارنامہ)

"اقبال ہندوستان کا پہلا مفکر ہے جس نے اس علیحدگی پسند تحریک کی ابتدا میں ہی علی الاعلان اس امر کا اظہار کر دیا کہ متحدہ وطنی قومیت اور مسلم قومیت کا آپس میں کوئی پیوند نہیں لگایا جا سکتا......

ہندوستان کے سیاسی حالات نے اقبال کے ذہن و فکر پر اثر ڈالا یا نہیں اس مسئلہ میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن حقیقت سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اقبال کے ذہن و فکر کی اس تبدیلی نے ہندوستان کی سیاست مابعد پر نہایت گہرے نقوش چھوڑے ہیں اس کی فکر کے اس تغیر نے ہندوستان کی مسلم قومیت کی نشوونما کے لئے ایک فلسفیانہ اساس فراہم کر دی اس کے ہی نغموں سے مسلم فرد میں قومیت کا شعور بیدار ہوا اور اس کے تفکر کے ان ہی خدوخال سے دو قومی نظریہ کا وہ نقش ابھرا جس نے بالآخر پاکستان کا نام پا لیا۔"

(ص ۴۹، سیاسی کارنامہ)

ہندوستان میں برطانوی جمہوریت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"برطانوی جمہوریت کا نمونہ ایک ایسے ملک کے لئے کارآمد و مفید ثابت نہیں ہو سکتا جہاں کئی قومیں رہتی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمانان ہند ہی وہ واحد جماعت ہندوستانی ہے جس کو مجازاً بطور پر اور جدید معنی میں ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ ہندو اگرچہ ہر لحاظ سے ہم سے آگے بڑھے ہوئے ہیں تاہم ابھی تک وہ اس قسم کی ہم آہنگی حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں جو ایک قوم کے لئے ناگزیر ہے۔" (ص ۱۴۳)

"علامہ اقبال عملاً بھی پارلیمانی جمہوری حکومت کو ہندوستان کے لئے موزوں و مفید خیال نہیں کرتے تھے انگلستان کا جمہوری نظام اس واقعہ کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا تھا کہ وہاں ایک ہی قوم رہتی ہے لیکن ہندوستان کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی یہاں ایک قوم نہیں بلکہ کئی قومیں آباد ہیں۔"

"اس لئے علامہ اقبال چاہتے تھے کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو اسی بنیاد پر طے کیا جانا چاہئے کہ یہاں ایک قوم نہیں بلکہ ایک سے زیادہ قومیں بستی ہیں اس لحاظ سے وہ دو قومی نظریہ جس کو بہت جلد بعد میں چل کر مسلمانوں کے سواد اعظم نے قبول کیا جس کی بنیاد پر ہندوستان کے سیاسی دستوری مسئلہ کو ۱۹۳۰ء سے حل کرنے کی مختلف کوششیں شروع ہوئیں دراصل علامہ اقبال کی ہی اس وطنی قومیت کی مخالفت کے بطن سے پیدا ہوا اور اس طرح ہندوستان میں اس نظریہ کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جس وقت سے کہ علامہ اقبال نے وطنیت کو بت پرستی سے تعبیر کیا......" (ص ۲۱۴)

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کی ملکی سیاست میں دو قومی نظریہ کے سب سے پہلے بانی تھے۔" (ص ۲۲۶)

افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے تاریخ قوم کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہ کی۔ اپنے تخیل پر بھروسہ کیا اور غلط واقعات کا طومار باندھ دیا۔

دو قومی نظریہ کی تاریخ دراصل ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتی ہے جبکہ سر سید احمد خاں نے اپنے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں جا بجا مسلمانوں کا تذکرہ بحیثیت ایک مستقل جداگانہ قوم کے کیا ہے اور پھر انھوں نے اس نظریہ کو متحدہ ہندوستان کے مقابلہ میں واضح کیا ......

ؔ مصنف ذکر اقبال کا بیان ہے کہ امرتسر جاتے ہوئے مولانا سے ملے۔

ؔ یہ مصنف کا خیال ہی خیال ہے انھوں نے تو اپنی سیاست میں ان اصول پر عمل کرنے بھی پیش کئے ہیں۔

رہے نہ تو وہاں بھی اپنی تقریروں میں اسی نظریہ کو پیش کیا۔ لوکل سیلف گورنمنٹ پر بحث کی اس میں کہا کہ :۔

"ہندوستان فی الحقیقت ایک براعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی بکثرت رہتے ہیں۔ ....

ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں کہ ذات پات کے اختلافات اب تک موجود ہیں اور جہاں مختلف قومیں خلط ملط ہوئی ہیں۔

بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر غالب آجاوے گی۔"

یں میں مسلمانوں کو شرکت سے روکنے میں جو اس نظریہ کارفرما تھا ایک بیان میں کہا کہ

"کانگریس درحقیقت بن ہتھیاروں کی ایک سول وار ہے، سول وار کا منشا یہ ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کس کے ہاتھ میں رہے۔ نیشنل کانگریس کا جو یہ مقصود ہے کہ انگلش گورنمنٹ برائے نام ہندوستانی گورنمنٹ رہے مگر ملک کی اندرونی حکومت ان کے ہاتھ آوے وہ علانیہ اپنا نام نہیں لیتے یا خوب سمجھتے ہیں کہ مسلمان تو اس لائق نہیں پھر ملک کی اندرونی حکومت انہیں کے ہاتھ میں رہے ہم بھی سول وار کو پسند کرتے ہیں مگر بن ہتھیاروں کی سول، اگر نہیں بلکہ ہتھیاروں والی سول وار اگر گورنمنٹ اندرون ملک کی حکومت اپنے ہاتھ سے منتقل کرنا پسند کرتی ہے تو ہم اس سے درخواست کریں گے کہ قبل اس کے وہ ایک قانون مقابلہ پاس کرے اور جو نوجوان کامپیٹیشن کے امتحان میں پاس ہو اس کے ہاتھ میں اندرون ملک کی حکومت سپرد کردے مگر اس کامپیٹیشن میں دوسرے قسم کے علم کے کام میں لانے کی اجازت دے جو ہمارے باپ دادا کے لکھنے کا قلم تھا اور جو درحقیقت ملک کی حکومت لکھنے کا قلم ہے پھر جو پاس ہو وہی ملک کی حکومت کرے۔ اگر ہمارے دوست بنگالی پاس ہوں تو بیشک ان کی جوتیاں اٹھا دیں گے اور اپنے سر پر رکھیں گے مگر بغیر اس سول وار کے تو ہم اپنی قوم کو ان کی جوتیوں کے تلے روندوانا پسند نہ کریں گے۔"

۱۸۸۸ء میں مسٹر بدرالدین طیب جی کے ایک بیان کے جواب میں اپنا مفصل بیان کیا اور اس میں کہا کہ :۔

"یہ امر واجب ہو یا ناواجب مگر ایک مسلمان موچی سے لیکر ایک مسلمان رئیس تک اس بات پر راضی نہ ہوگا کہ ہماری حالت ایسی ہوجائے کہ ہم دوسری قوم کے جو ہمارے ساتھ رہتی ہے حلقۂ غلامی میں آجائیں۔"

ک یونان دہلی کی ۱۸۹۸ء کے زمانہ میں ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ :۔

"مسلمانوں میں ایک عرصۂ دراز سے بلحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہوگیا ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہوگیا ہے اور کل مومن اخوۃ کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے اس لئے وہ ہر ملک کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں۔"

حالی کی روشنی میں ماننا پڑتا ہے کہ دراصل سرسید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں برطانوی جمہوری طرز حکومت کو مناسب نہیں سمجھا تھا اور دو قوموں کی وضاحت پیش کی۔

لیاقت علی خاں شہید وزیر اعظم پاکستان نے اپنے خطبۂ صدارت تعلیمی کانفرنس ۱۹۴۳ء میں کہا کہ :۔

"جب ہندوستانی سیاست اپنے ارتقائی دور کی منزل پر تھی اور عملی سیاست میں ایک خود اختیار حکومت کا خیال بھی ذہن میں نہ آسکتی تھی سرسید احمد خاں نے اپنی دوربینی کے تحت اسی وقت بہ زور الفاظ میں متنبہ کیا تھا کہ برطانوی طرز کے پارلیمانی ادارے جن کا مدار ہم نوع قوم اور ملک پر ہے، ہندوستان جیسے مختلف الانواع ملک کے لئے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوسکتے۔ حالانکہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں برادرانہ تعلقات کے قیام کے لئے بہت زیادہ حامی تھے۔ لیکن انہوں نے مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کے نظریہ کو برقرار رکھا انہوں نے اس خطرے کو فوراً محسوس کرلیا جو مسلمانوں کو ہندو قومیت میں مدغم ہوجانے سے پیش آسکتا

تھا اس لئے انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا۔" سرسید نے ۱۸۸۳ء میں مسئلہ (اہلیت) جمہوری سلطنت کے لوازم اور ہندوستان کی حالت پر اپنے ایک بیان میں مفصل بحث کی ہے، وہ جمہوری سلطنت کی سب سے پہلی اور ضروری شرط قرار دیتے ہیں کہ :۔

"اس کی آبادی میں ہم جنسیت ہو اور وہ جتنے زیادہ تر مشابہ ہوں اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ جمہوری حکومت میں ضروری خیال کرلیا جاتا ہے کہ افراد ایسے ہی مشابہ ہیں جیسے شطرنج کے دانے ....

کل دنیا کے ممالک سے ہندوستان جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے لئے موزوں ہے، اس تجربہ کو جو انڈین نیشنل کانگریس کرنا چاہتی ہے ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو شک اور مصائب سے بھرا ہوا ہے کل اقوام ہند کے لئے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے کیونکہ اگرچہ مسلمان بیماری میں ہیں لیکن سب سے بڑی بیماری ہیں اور کم سے کم روایتاً اس بات کے عادی ہیں کہ جب بیماری قائم کرے تو تلوار ہاتھ میں لیں جو طریقہ کہ شمار کی صحبتوں سے بھی زیادہ تر ہے۔"

سیاسی کارنامہ کے مصنف نے بھی سرسید کی تعریف کی مگر اس کو دور تیاری سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"انگریزی تعلیم نے ان کے اندر دنیوی ترقی کا شوق تو پیدا کردیا لیکن انگریزی تہذیب و معاشرت سے مرعوبیت کے باعث نوجوان نسل میں دین کی طرف سے ایک حد تک بے رغبتی بلکہ بیزاری کے آثار بھی پیدا ہوگئے اور سیاسی نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت اس صغیر السن لڑکے کی مانند تھی جو ابھی تک انگریز کی انگلی پکڑے اپنا راستہ طے کررہا ہو.... ۱۹۱۲ء سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اسی سال مولانا ابوالکلام آزاد "الہلال" جاری کرتے ہیں اور مولانا محمد علی "کامریڈ" نکالتے ہیں اس زمانے میں تنسیخ بنگال کا اعلان ہوتا ہے اور مسجد کانپور کی شہادت کا واقعہ پیش آتا ہے ....

سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات دیکھتے ہوئے مغربی تہذیب و معاشرت کو قبول کرنے کا مشورہ دیا ان کا رخ تھا کہ مغرب کی طرف۔

اقبال اور ان کے ساتھیوں نے مغرب کی تہذیب و شائستگی کا حکیمانہ مطالعہ کیا اور مغرب کی اجتماعی زندگی کی نفسیات کو ٹٹولا اس کے بعد مسلمانوں کو از سر نو اسلام کی طرف پکارا اس بیداری میں جدید تعلیم یافتہ اور قدیم علماء دونوں شریک تھے علی گڑھ اور دیوبند دونوں مکاتب خیال کو اس تحریک نے اپنے اندر سمو لیا تھا۔ دین اور دنیا کی دوئی ختم ہوچکی تھی، وہ دونوں یکجا آکر اس تحریک میں مل گئے تھے۔"

(۲۷۴، ۳۹۰ سیاسی کارنامہ)

مصنف نے اس بیان میں سرسید اور ان کی تحریک و رفقاء پر بعض اقبال کو نمایاں کرنے کے لئے یہ تجاہل عارفانہ یا بے جا زیادتی کیا ہے سرسید کا پیغام تو یہ تھا کہ :۔

"اگر تم آسمان کے تارے ہوجاؤ اور ہماری قوم میں نہ رہو تو ہم تعلق میں جو رشتہ ہے وہ بالکل ٹوٹ جائے گا۔"

"سب سے اول ہمارا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں نیشنلٹی یعنی قومیت اور قومی اتحاد اور قومی ہمدردی جو اول سیڑھی ترقی قوم کی ہے قائم رہے اور اس کے لئے مقدم یہ کہنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہب اسلام

کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو مذہبی تعلیم بھی دیں۔"

اس غرض سے کالج میں ابتدا سے آخری درجوں تک مذہبی نظام تعلیم قائم کیا گیا مشہور علماء مولوی شبلی، مولوی سید اکبر، مولوی خلیل احمد، مولوی عبداللہ انصاری (دیوبندی)، مولوی عباس حسین اور مولوی سلیمان اشرف اور پھر وقتاً فوقتاً دیگر علماء مقرر ہوتے رہے۔ مذہبی تعلیم ہر مسلمان طالب علم پر لازمی قرار دی گئی، سیرت کی کتابوں کا نصاب بھی اہتمام کیا گیا، بیرونی اصحاب سے بھی ایسے ہی لیکچر دلوائے جاتے تھے حتیٰ کہ لباس تک میں قومیت کا لحاظ رکھا گیا سرسید نے اس کے متعلق کہا کہ :۔

"ہندوستان میں سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی نیشنلٹی قائم کرنے کی ہے جس کو ان کے بزرگوں نے ہندوستان میں آکر ڈبو دیا ہے۔ آثار نیشنل لباس اختیار یا ایجاد کرنا لازم ہے جو نیشنلٹی کا ظاہر کرنے والا ہو۔"

انھوں نے ترکی لباس کو موزوں سمجھا اور جاری کردیا اور کس طرح کہ طلباء کی انگلش اسٹاف کے سامنے ایڈریس کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"یہ مغرور اور متعصب انگریز ہندوستانیوں کو غلامی کی حالت میں رکھنا پسند کرتے ہیں..... مگر ہم کو ان متعصب اور مغرور انگریزوں پر خیال نہیں کرنا چاہئے بلکہ خود ہم کو دیکھنا چاہئے کہ ہم کو اپنی قوم کی بہتری کے لئے کیا کرنا لازم ہے۔"

جس قدر بھی انگریزی معاشرت اپنی ضروریات کے مطابق ترمیم کرکے اختیار کی گئی اس سے اور جسارت ہی بڑھی۔ مذہبی تعلیم کے متعلق تو صرف اس تاریخی واقعہ کی طرف ہی اشارہ کرنا کافی ہے کہ ۱۹۰۷ء میں امیر افغانستان حبیب اللہ خاں نے جب علی گڑھ کالج میں وزٹ کی تو انہوں نے جامع طور پر طلباء کا امتحان لیا اور اس کے بعد وہ متاثر ہوئے کہ اپنی تقریر میں ان غلط بیانیوں پر تعزیت کی جو نوجوانان کالج کے متعلق ان سے کی گئی تھیں! سرسید کے بعد رفقاء اور جانشینوں کا زمانہ تھا جب ۱۹۱۲ء میں بیرونی علماء نے علی گڑھ آکر طلباء کا امتحان لیا ان علماء میں مولوی ابوالکلام آزاد بھی تھے جنہوں نے نتیجۂ امتحان پر علی گڑھ کالج کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں بے نظیر تعلیم گاہ اور ایسا مرکز قرار دیا جس کی ترقی پر کل مسلمانان ہند کی اصلاح اور بحالی دیگر گوں کل مسلمانان ہند کا انحصار ہے اور طلباء نے جو جوابات دیئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو تعلیم مذہبی کا حال تھا اس پر بھی مذہب سے بیزاری کے آثار صرف مصنف سیاسی کارنامہ اور اقبال کے دیگر سوانح نگاروں کو ہی نظر آئے۔

اجتماعی زندگی میں نئے دور کا آغاز بھی علی گڑھ سے ہی ہوا۔ ۱۸۸۶ء میں تعلیمی کانفرنس کی تاسیس سے قوم میں اجتماعی زندگی پیدا کی گئی مختلف صوبوں اور اقطاع ہند میں اس کے سالانہ جلسوں کا انعقاد ایک اجتماعی زندگی کا نمونہ تھا، اس کی تقریریں اور نظمیں بھی احساسات و جذبات میں جوش و عزم پیدا کرنے میں کامیاب و نتیجہ خیز ثابت ہوتی تھیں۔

سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی علی گڑھ ہی رہبر تھا۔ سرسید نے اپنی موت تک پوری قوم کی سیاسی نمائندگی اور تشخص قائم

"وہ درحقیقت ایک جلیل القدر انسان تھے، انھوں نے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے جو ہر مسلمان کے لئے قابل تقلید ہے .... وہ ہر مسلمان کے دل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک کے پیشرو کی حیثیت سے اب بھی زندہ ہیں اور ان کی سیرت کی عظمت کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔"

سیاست کوئی عقیدہ دائمی نہیں بلکہ واقعات و حالات کے تحت موقف

---

۱ اس زمانے میں کانگریس کے لیڈر بنگالی ہی تھے۔

ہوئی جو ۱۹۰۶ء میں انعقاد پر جو فیصلے ہوئے علی گڑھ نے ہی اُن کی حمایت کی۔ "شملہ وفد" جو مسلم سیاست کا سنگ بنیاد ہے، علی گڑھ سے ہی مرتب ہوا۔ آل انڈیا مسلم لیگ جس کی کوششوں سے پاکستان وجود میں آیا علی گڑھ والوں نے ہی قائم کی۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ پر سب سے پہلے جو جارحانہ مضمون نکلا وہ علی گڑھ کالج ہی کے سیکریٹری اور مسلم لیگ کے بانی نواب وقار الملک ہی کا تھا جس نے قوم کے دل میں ایک جوش عزم پیدا کر دیا۔ اس میں صاف طور پر جتا دیا گیا تھا کہ حکومت کی وفاداری فرض ہے جوہر نہیں۔

طرابلس و بلقان اور خلافت کے واقعات میں علی گڑھ والے ہی ہمت کے ساتھ پیش پیش تھے، علماء کرام تو اس وقت بھی سو رہے تھے! پھر ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ والوں نے ہی ان کو سیاست کی اجتماعی زندگی میں شریک کرنے کی کوشش کی اور مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں انہیں کی سعی سے چند علماء شریک اجلاس ہوئے۔ صدر مجلس نے خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"ایک زمانہ دراز کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ قدیم و جدید خیالات کے لوگ اہل دنیا اور اہل دین خاص و عام اپنے مذہب کی حمایت کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔"

اس دور جدید میں زیادہ حصہ ان ہی طلباء کی سرفروشانہ جد و جہد کا تھا جو جدید سرسید کے تھے۔ اقبال تو صرف منظومات طرابلس پر دو نظمیں لکھ کر ہی خاموش ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال جس کی عربی آمیز عبارت جیسے عام فہم نہ تھی اس زمانے کی بیداری کا باعث تھا بلکہ زمیندار اور کامریڈ اور عام مسلم پریس قوی اسباب تھے۔ اقبال تو خطوں میں اپنی تفصیل غرض سے اعراض کرتے تھے اور ان کوششوں کو سادہ لوحی کہہ کر تمسخر اڑا رہے تھے۔

پھر ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک کو علی گڑھ کالج کے طلباء نے اسلام کی پکار کہہ کر لبیک کہا تھا۔ یہ جذبات علی گڑھ کی سرزمین اور اسی تحریک کے علمبرداروں کے قول و عمل سے پیدا ہوئے تھے، علامہ تو حسب بیان سوانح نگاران ۱۹۲۶ء سے میدان سیاست میں آئے۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس

آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کو علامہ کی سیاست میں نہایت نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مصنف ذکر اقبال کا بیان ہے کہ:-

"علامہ اقبال اور بعض دوسرے بزرگوں کی تحریک سے جنوری ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی اور علامہ مسلم لیگ کی طرف سے اس میں شریک ہوئے۔"

اس کانفرنس کی روداد بھی اس زمانے میں شائع ہوئی اور اس میں وہ تصویر بھی شامل ہے جس میں صف اول میں کانفرنس کے دیگر ممتاز شرکاء کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور علامہ صدر کانفرنس ہز ہائینس آغا خاں کی کرسی کے عقب میں ایستادہ صف میں نظر آتے ہیں۔

کانفرنس کی تحریک کے متعلق رپورٹ میں بیان ہے کہ:-

"۱۰ ستمبر ۱۹۲۸ء کو شملہ میں مرکزی مقننہ کے چند ممبروں نے وقت کی سیاسی حالت اور مسلمانوں کے انتشار پر غور کر کے ایک مینی فسٹو جاری کیا جس میں ایسی کانفرنس کے انعقاد اور اہمیت پر زور دیا گیا۔ اس پر مختلف صوبوں کے سترہ ممبروں کے دستخط ہوئے۔"

کارروائی کے روح رواں بمبئی کے فاضل ابراہیم رحمت اللہ تھے اور وہی سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔ تین ماہ بعد دہلی میں ایک عظیم الشان اجلاس کی تیاری کی گئی جس میں شرکت کے لئے صوبائی اور مرکزی مجالس مقننہ اور دیگر اداروں سیاسی کے نمائندوں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ پنجاب سے ۲۸ اصحاب شریک ہوئے ان ہی میں ایک علامہ بھی تھے جو بحیثیت ممبر مجلس مقننہ پنجاب مدعو تھے مگر وہ کسی تنظیمی مشورہ میں شریک نہیں تھے۔ علامہ نے کھلے اجلاس میں دیگر نمائندوں کی طرح ایک مختصر تقریر بھی کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ:-

"سرسید نے نصف صدی پہلے مسلمانان ہند کو جو راہ عمل دکھائی وہ بالکل صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد اس پالیسی کی اہمیت کو ہم آج محسوس کر رہے ہیں۔"

علامہ نے بڑا زور اس امر پر دیا کہ صرف تحفظ حقوق کے لئے علیحدہ سیاسی پروگرام بنایا جائے۔ علامہ کا نام نہ تو مسلم لیگ کے نمائندوں کی فہرست میں ہے نہ وہ کسی سبجیکٹ کمیٹی میں شریک ہیں۔ ان کا نام صرف پنجاب کی مجلس مقننہ کے مدعو شدہ ممبروں کی فہرست میں ہے۔ یہ شرکت محض ایک رزولیوشن کی تائید کی غرض تک محدود تھی۔

اجلاس کے بعد مسلم لیگ کی اس وقت کی حالت سے فائدہ اٹھا کر بعض سیاسیین نے اس کانفرنس کو ایک مستقل ادارہ کی صورت دیدی۔ ان میں مولانا محمد شفیع داؤدی بہت نمایاں اور سرگرم کار تھے۔

فروری ۱۹۳۲ء میں ایک اجلاس منعقد ہوا، علامہ صدر تھے انھوں نے خطبہ صدارت میں چند تنظیمی تجاویز ضرور پیش کیں جو خلاصۃً حسب ذیل تھیں۔

"ایک ہی سیاسی انجمن ہو، ایک ہی قومی سرمایہ ہو جس کے تحت یوتھ لیگیں قائم کی جائیں اور رضاکاروں کے جیش منظم کئے جائیں اور کلچرل ادارے قائم ہوں تعلیمی ترقی کا انتظام ہو علماء اور وکلاء کی مجلسیں قائم ہوں جن کا مقصد و کام شریعت اسلام کی حفاظت ہو۔ اور بشرط ضرورت حالات جدیدہ کی روشنی میں نئے سرے سے اس کی تعبیر و تاویل کی جائے۔ مسلمانوں کے پرسنل لا کے مسائل بھی مجالس مقننہ میں پیش ہوں زیر بحث آنے سے قبل یہ مجلس بحث و تحقیق کے تمام مراحل طے کرے۔"

لیکن ان تجاویز پر اقدام کا کوئی نشان نہیں اور جب چند سال بعد مسلم لیگ کا انتشار دور ہوا تو یہ نومولود انجمن خود بخود تحلیل ہو گئی۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

علامہ اور مسئلہ فلسطین

فلسطین کے واقعات نے تمام مسلمانوں کے قلوب میں بے چینی پیدا کر رکھی تھی اور ہر سیاسی جماعت نے صدائے ہمدردی و احتجاج بلند کی تھی۔

ستمبر ۱۹۳۷ء میں مختلف صوبوں کے سرکردہ اصحاب کا ایک وفد بھی وائسرائے کے پاس گیا۔ کلکتہ میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس منعقد ہوئی۔ لکھنؤ کے اجلاس لیگ میں اس کی قرارداد کی توثیق ہوئی۔ مصر میں بھی ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں مسلم لیگ کے نمائندے بھی شریک ہوئے اور انگلستان جو وفد گیا اس میں بھی دو نمائندوں، مسٹر خلیق الزماں اور عبدالرحمٰن صدیقی نے شرکت کی اور وزیر ہند و وزیر نوآبادیات کے سامنے مسلمانان ہند کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی۔

پھر ۱۹۳۸ء میں بھی اجلاس مسلم لیگ میں یہ مسئلہ زیر بحث و توجہ رہا۔ غرض مسلم لیگ جو کر سکتی تھی اس نے کیا اور اپنے مستقل مسائل میں شامل کر لیا۔ اب علامہ کی جد و جہد دیکھئے۔ جامع و ناشر مکاتیب اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"حضرت علامہ کو مسئلہ فلسطین سے غایت درجہ دلچسپی تھی اور ہندوستان کے دور غلامی میں فلسطین کو پنجۂ اغیار سے چھڑانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مس فارقوہرسن کے نام ان کے خطوط شاہد ہیں.... مس فارقوہرسن سے تجویز کیا جا رہا ہے کہ فلسطین کے سلسلہ میں اپیل کے لئے ہز ہائینس آغا خاں کی تائید و اعانت حاصل کریں اور اپیل کا مسودہ مصر و فلسطین کے رہنمائے فکر و عمل کے مشورہ سے مرتب کریں۔"

حیرت ہے کہ اس مسئلہ میں دلچسپی و اعانت کے لئے مس فارقوہرسن اور لارڈ ازنگٹن کا شکریہ ادا کیا جا رہا ہے کیا اس ہمدردی کو یہی اعانت تھی!

کہا جاتا ہے کہ علامہ اس مسئلہ پر جیل تک جانے کو تیار تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے متعلقہ جلسوں میں جو مختلف مقامات پر ہوئے قدم رنجہ نہ فرمایا۔

ایک مقالہ نگار اپنی تمہیدی مقالہ میں مسلمانوں پر انگریزی حکومت کے مظالم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"اس صورت حال کا مسلمانوں میں ایک رد عمل تو یہ ہوا کہ ان کے مذہبی شعور رکھنے والے متوسط اور نچلے طبقوں میں انگریزوں کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اور انگریز دشمنی ان کا ایک مذہبی عقیدہ بن گیا اور اس کا دوسرا رد عمل یہ ہوا کہ سرسید اپنی زندگی کے آخری سالوں میں علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپلوں کے زیر اثر کانگریس کے ہر مطالبہ کی مخالفت کرنے لگے یہاں تک کہ وہ نیابتی طرز حکومت کے خلاف ہو گئے تا وقتیکہ مسلمانوں کی فلاح اسی میں سمجھنے لگے کہ یہاں ہمیشہ ہمیشہ انگریزی حکومت رہے اور تو اور سرسید نے اس بات کی بھی مخالفت کی کہ آئی سی ایس کے مقابلہ کے امتحان ہندوستان میں ہوں آخر میں علی گڑھ کالج اور اس کی سیاسی پالیسی بالکل انگریز پرنسپل کے حوالے کر دی گئی جو اسے برطانوی استعمار کے لئے بڑے دھڑلے سے استعمال کرتا تھا۔"

ضیاء۔ امروز کراچی

۲۴ اپریل ۱۹۵۶ء

ہم پہلے رد عمل کی بحث میں نہیں جاتے کیونکہ اس کتاب کے صفحے اس کی طوالت کے متحمل نہیں ہوں گے البتہ دوسرے رد عمل کی نسبت اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ سرسید کے متعلق یہ غلط الزام انتہائی دیدہ دلیری سے قائم کیا گیا ہے۔ سرسید کے زمانہ میں کالج کے دو پرنسپل ہوئے ایک مسٹر تھیوڈور بارسن جو چند سال بعد ریٹائر ہو گئے اور پھر مسٹر بیک کانگریس کے قائم ہونے سے پہلے آ گئے تھے، بے شبہ جب نمائندگی کا سوال لوکل بورڈوں وغیرہ میں پیش ہوا تو سید محمود اور مسٹر بیک نے ایک مشترکہ یادداشت تیار کی تھی یہ بھی خیال رہے کہ کانگریس کا سنگ بنیاد ایک انگریز نے ہی رکھا تھا اور کئی دفعہ اس کی صدارت انگریزوں نے کی۔

سرسید نے جو پالیسی اختیار کی اس کی اہمیت کا احساس و اظہار علاوہ مسلم زعماء سیاست کے مولانا محمد علی صدر کانگریس ۱۹۲۳ء کے ایڈریس اور علامہ اقبال کی تقریر آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں دیکھا جائے۔

انگریزی حکومت یا برطانوی اقتدار کی نسبت کانگریس کے خطبات صدارت کے چند اقتباسات قابل مطالعہ ہیں:-

(۱) "جو کچھ نصیحت ہم کرتے ہیں وہ برٹش گورنمنٹ کی بدولت ملی ہے ہم کو مردانہ وار بر سر عام کہنا چاہیئے کہ ہم راج بھگت ہیں اور حکومت کے وفادار ہیں۔ ہماری رگ رگ میں راج بھگتی بھری ہوئی ہے ہم انگریزی سلطنت کے فائدوں کو سمجھتے ہیں اور ہم اس ملک کی تعریف کرتے ہیں جس کی بدولت ہم اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گئے ہیں۔ یہ علم ہمیں اس وقت ملا ہے جب کہ ایشیا کے ماہر ہمارے دیس میں اپنی من مانی کر رہے تھے۔"

(بنرجی بانی کانگریس ۱۸۸۵ء)

(۲) "ہم کو مردوں کی طرح اعلان کرنا چاہیئے کہ ہم پورے طور پر وفادار حکومت ہیں" (۱۸۹۵ء)

(۳) "کانگریس کی بنیاد برٹش راج کے ساتھ وفاداری کے لئے ڈالی گئی ہے جس سے ہمارا ملک خوشحال ہے۔ کانگریس نے کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ ذرا سی شبہ پیدا ہو کہ برطانوی راج اُلٹ دیا جائے" (۱۹۰۵ء)

(۴) "جب سے کہ ہندوستان کا برطانوی تاج سے بلاواسطہ تعلق ہوا ہے ہم ہمیشہ بادشاہ کے وفادار رہے اور ہماری وفاداری غیر متزلزل" (۱۹۰۶ء)

(۵) "تمام سوچنے سمجھنے والے برطانوی راج کو اللہ کی جانب سے سمجھتے ہیں" (۱۹۱۱ء)

٭

یہ بھی غلط ہے کہ سرسید نے ہر مطالبہ کی مخالفت کی اور نیابتی طرز حکومت کے مخالف ہو گئے۔ بلاشبہ وہ قومی مفاد میں ہندوستان میں امتحان مقابلہ کے مخالف تھے ان کے نزدیک ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ سرسید نے یہ اختلاف ۱۸۸۷ء میں کیا تھا مگر اقبال نے تو ۱۹۲۸ء میں آئی سی ایس کے امتحانوں میں ہندوستانی ممتحنین کے زیادہ مقرر کرنے پر زور دیا۔ دونوں کا یہ مطالبہ مصلحت سیاسی و وقتی کا تقاضا تھا۔

تصورِ پاکستان

سیاسی کارنامہ کے مصنف نے آخر میں ایک عنوان "اقبال کی فکر سیاسی کا شاہکار" قائم کیا ہے جس میں اقبال کے خطبہ صدارت مسلم لیگ سنہ ۱۹۳۰ء کا اقتباس ہے پھر سیاسی اصلاحات وفاقی و وحدانی پر بحث کے بعد خطبۂ صدارت کے متعلق بعض اعتراضات کا جواب ہے۔ یہ مسئلہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے جس سے کتاب میں قطع نظر کیا گیا ہے مگر ہم اسلئے اس کو ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی ہو، یوں

تو انتظامی نقطۂ نظر سے ہندوستان کی جغرافیائی تقسیم کئی مرتبہ کی گئی اور سنہ ۱۹۰۵ء میں جو تقسیم ہوئی ممکن ہے کہ اس میں انتظام کے ساتھ سیاسی نقطۂ نگاہ بھی ہو اور لارڈ کرزن کی پالیسی سے یہ بعید بھی نہ تھا۔

اس تقسیم سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو کچھ فوائد بھی پہونچنے شروع ہوگئے اور ہندوؤں کی غلامی سے جو ہر شعبۂ زندگی پر مسلط تھی آزاد ہوجانے کا کچھ موقع ملا۔ مگر ہندوؤں نے اس کے خلاف سخت ایجی ٹیشن کیا۔ مسلمان خاموش ہے کیونکہ وزرائے سلطنت نے یکے بعد دیگرے تقسیم کے قطعی ہونے کا یقین دلایا تھا لیکن دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء میں بادشاہ کی زبان سے اس کی تنسیخ کا اعلان ہوا تو وہ مسلمانوں پر بجلی بن کر گرا اور ان کی سیاسی پالیسی میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا اور تقسیم کے فوائد پر بھی خیالات رجوع ہونے۔ خاص کر علی گڑھ میں جہاں ہر صوبے کے مسلمان نوجوان طلباء موجود تھے اور ان کو اب سیاست پر اپنے اصل خیالات ظاہر کرنے کی آزادی بھی تھی چونکہ یہ اعلان دماغوں پر مسلط تھا اس لئے موضوع بحث و گفتگو رہتا تھا۔

اس اعلان پر خود کالج کے سیکریٹری نے ایک انقلاب آفریں مضمون لکھا تھا جو ہندوستان کے طول و عرض میں شائع ہوا۔

کالج ہی کے دو نوجوان خیری برادرز (دہلوی) سنہ ۱۹۱۵ء سے جرمنی میں نظر بند تھے۔ اسٹاک ہالم میں ہندوستانی نوجوانوں کی ایک کانفرنس سنہ ۱۹۱۷ء میں ہوئی تھی جس میں یہ مسئلہ پیش ہوا تھا۔ جب مراسلت کی آزادی ہوئی تو ان خیری بھائیوں نے ایک خط سر تھیوڈور ماریسن کو لکھا جس میں تقسیم کے مسئلہ پر متوجہ کیا تھا۔ چونکہ سر موصوف عرصہ دراز تک علیگڑھ میں پرنسپل رہے تھے اور مسلمانوں کے حالات وجذبات اور احساسات سے پورے باخبر تھے۔ انہوں نے ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی انگلستان میں مسلمانوں کے جذبات و مقاصد کی ہمیشہ ترجمانی کی۔

اسی بناء پر اپنی کتاب "ہندوستان میں برطانوی سیاست"[1] میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر ہندوستان کے پانچ ملین مسلمان کسی صوبہ یا ملک کے کسی حصہ میں جمع کر دیئے جائیں مثال کے طور پر شمالی ہند میں تو ایک قومی اسپرٹ ان علاقوں میں پیدا ہوجائے گی۔

جس سے مالیہ مسئلہ کا جزوی طور پر حل ہو سکتا ہے۔

حقیقت میں یہ کوئی اسکیم نہیں تھی مگر اس امر کی صاف شہادت ہے کہ خیالات اس طرف رجوع تھے اور ہندوستان بھر میں ذبیحہ گاؤ کے مسئلہ پر ہندو اہل سیاست مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے فسادات کرا رہے تھے۔ اور اس سوال کو خود گاندھی جی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کے دو قدیم طالب علموں نے عبدالقدیر کے فرضی نام سے گاندھی جی کے نام بدایوں کے اخبار "ذوالقرنین" میں ایک کھلا خط شائع کیا جس کے آخر میں ان فسادات کے خاتمہ کا واحد علاج تقسیم ہند کو قرار دیا۔

پھر دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ علی گڑھ میں جو بموقع جشن جوبلی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منعقد ہوا تھا یونیورسٹی پولیس سے بلا دو میں بصورت کتاب اس طرح کی اشاعت کی گئی کہ کتاب بہ اہتمام محمد مقتدیٰ خاں شیروانی ممبر مطبع طبع ہوئی تھی اس اسکیم میں ذبیحہ گاؤ پر مفصل بحث کے بعد بیان ہے کہ:۔

"مخالفت کی بنا صرف گاؤ کشی ہی نہیں، بلکہ اردو ہندی کے جھگڑے نظام سلطنت میں ہمارے حقوق کی مزاحمت، انتخاب جداگانہ سے انکار، سرکاری ملازمت وغیرہ وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ پر اتحاد کے موانع ہیں اس لئے یہ اصول تسلیم کر لینے کے بعد کہ مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھا جائے اور جانبین کے معتقدات سے تعرض نہ کیا جائے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ زبردست کمیشن مساوی التعداد ہندو مسلمانوں کے معتمد علیہ اشخاص کا مقرر کیا جائے جو حسب ذیل اسکیم پر غور کرنے کے بعد ایک قابل قبول اور ممکن العمل فیصلہ کر دے:

(۱) ہندوستان کی تقسیم از سر نو قومیت کی بناء پر اس طرح کی جائے کہ ہر قوم کے لئے بڑے سے بڑا حصہ اس کی آبادی کا علیحدہ کر دیا جائے اور یہ حصہ اس قوم کا حلقۂ اثر قرار دیا جائے مسلمانوں کے لئے حسب ذیل تین صوبجات بنائے جا سکتے ہیں:۔

الف: سرحد و مغربی پنجاب کے دس اضلاع راولپنڈی، اٹک، جہلم، گجرات، شاہپور، میانوالی، جھنگ، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں اور ملتان کو ایک جا کر کے ایک صوبہ بنا دیا جائے

(ب) بنگال میں بوگرا، رنگ پور، تاجپور، جیسور، ندیا، فرید پور، ڈھاکہ، راجشاہی، پبنا، میمن سنگھ، باقر گنج، نواکھالی، ٹپرا، چاٹگام کے اضلاع کا دوسرا صوبہ بنا دیا جائے۔

(ج) سندھ کو بمبئی پریسیڈنسی سے علیحدہ کر کے تیسرا صوبہ بنا دیا جائے۔

(۲) یہ بات اصولاً اس تقسیم کے بعد ہر حصہ ملک کا نظم و نسق اس کی کثیر التعداد رعایا کے مفاد کے لئے کیا جائے۔

(۳) قلیل التعداد اقوام کی حفاظت واداء مراسم مذہبی و حقوق ملازمت وغیرہ کے لئے قواعد مرتب کئے جائیں اور ان کے لئے قومی و سیاسی اہمیت کی بناء پر حسب ضرورت دارالامن قائم کئے جائیں مثلاً پنجاب میں سکھ ایک بااثر قوم ہے لیکن کسی واحد ضلع میں وہ بلحاظ آبادی کے ہندو یا مسلمانوں سے زیادہ نہیں ہے جو اس کا حلقۂ اثر بنایا جا سکے اس لئے قومی و پولیٹیکل اہمیت کی بناء پر سکھوں کے لئے ایک دارالامن قائم کیا جائے لدھیانہ اور امرتسر اس کے لئے بہت موزوں ہیں ان مقامات کا نظام حکومت سکھوں کے مفاد کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے سیالکوٹ عیسائیوں کا ملجا و ماویٰ قرار دیا جائے اور ان کو وہاں وہی حقوق دیئے جائیں جو سکھوں کو امرتسر اور لدھیانہ میں اسی طرح ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں جو اسلامی تمدن کا گہوارہ ہے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے خاص انتظام کی ضرورت ہوگی۔

(۴) تبادلۂ آبادی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ قلیل التعداد اقوام کے افراد جو کسی وجہ سے ترک وطن کر کے خود اپنی قوم کے حلقۂ اثر میں جانا چاہیں وہ بغیر زیادہ نقصان کے تبدیل سکونت کر سکیں۔

(۵) کمیشن مجوزہ کا فیصلہ قومی معاہدہ کی صورت میں ترتیب دیا جائے اور گورنمنٹ کے سامنے بطور ملکی مطالبہ کے پیش کیا جائے۔

(الف) اس اسکیم کی اشاعت کے بعد اولین مرتبہ اسی اجلاس مسلم لیگ میں صوبہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کا ریزولیوشن منظور ہوا۔

ہندو مسلم زعما کے مابین مفاہمت و اتحاد کا موضوع بھی زیر غور و بحث تھا اور مذاکرات بھی جاری تھے جس کے سلسلہ میں۔

(ب) سنہ ۱۹۲۰ء میں مولانا حسرت موہانی نے بھی یہ تجویز پیش کی کہ ہندو اور مسلم ریاستیں الگ الگ قائم کی جائیں اور مرکز میں ان دونوں ریاستوں کی ایک وفاقی حکومت

(ج) لالہ لاجپت رائے مشہور کانگریسی لیڈر نے بھی ایک اسکیم تیار کی اور کہا کہ میری اسکیم کے مطابق مسلمانوں کی چار ریاستیں ہوں گی۔

(۱) پٹھان صوبہ یا شمالی و مغربی سرحد

(۲) مغربی پنجاب

(۳) سندھ

(۴) مشرقی بنگال

"اگر ہندوستان کے کسی اور حصہ میں بھی مسلمانوں کی ٹھوس اکثریت ہو جس سے بہ آسانی ایک صوبہ کی تشکیل ہو سکے تو ان کو اس کی اجازت دینی چاہئے لیکن یہ بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ متحدہ ہندوستان نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی واضح تقسیم ہے۔"

اسی اسکیم میں ایک موقع پر یہ وضاحت بھی کی تھی کہ ہندوستان سے باہر ہندو کا کوئی دوست نہیں ہے اور اگر ہندو مسلم کسی جھگڑے میں دو پارٹیاں بن جائیں تو ہندوؤں کی ایک ہی جماعت ان کی نمائندہ ہو سکتی ہے اور وہ ہندو جیسا کہ ہے ۷ کروڑ مسلمانوں سے نہیں ڈرتا لیکن ۷ کروڑ ہندی مسلمان اور ان کے ساتھ افغانستان، مرکزی ایشیا، عرب، میسوپوٹیمیا اور ترکی کی فوجی طاقتوں کا مقابلہ ممکن نہیں۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں صوبہ سرحد میں ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کی رپورٹ میں انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے صدر سردار محمد گل خاں کا ایک صاف بیان ہے جو انہوں نے کمیٹی کے سامنے شہادت کے دوران میں دیا تھا۔

کمیٹی کے ایک رکن نے ان سے سوال کیا کہ آپ کی انجمن کو بنیادی اصول یہ ہے یعنی یہ کہ اسلام ایک قسم کی جمعیت اقوام ہے اور اسی لئے صوبہ کا پنجاب میں انضمام مطمح نظر کے خلاف ہوگا۔ یہی تخیل آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا ہے۔

سردار صاحب نے جواب دیا کہ یہی ہے۔ لیکن مجھے کچھ اضافہ کرنے دیجئے ان کا خیال یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کبھی نہ ہو سکے گا۔ ان کی خواہش ہے کہ صوبہ جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ میرا خیال کیا ہے تو میں بحیثیت رکن انجمن یہ ظاہر کرتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی علیحدگی کو پسند کریں گے۔

۲۳ کروڑ ہندو جنوب میں اور آٹھ کروڑ مسلمان شمال میں ہیں ہندوؤں کو راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ اور مسلمانوں کو آگرہ تا پشاور کا خطہ دیجئے میرا مطلب ایک مقام سے دوسرے مقام میں تبادلہ آبادی ہو۔ یہ تجویز تبادلہ کی ہے تبادلہ کا یہ یقیناً ناقابل عمل ہے لیکن اگر قابل عمل ہو تو ہم کسی دوسری تجویز پر اس کو ترجیح دیں گے۔

پھر آخر دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی میں جو قرار داد منظور ہوئی وہ وفاقی طرز حکومت کی بناء پر تھی اس میں سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دیئے جانے اور صوبہ سرحد و بلوچستان میں آئینی اصلاحات کے نفاذ پر زور دیا تھا۔

یہ قرار داد سر محمد شفیع (پنجاب) نے پیش کی تھی اور مہاراجہ محمود آباد نے اس کی تائید کی اقبال بھی مؤیدین میں تھے۔

اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ میں قائد اعظم کے ۱۴ نکات مرتب ہوئے جو تقریباً متذکرہ کے مماثل تھے۔

ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے حکومت برطانیہ نے لندن میں ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد کی۔ کانفرنس کے اوّلین اجلاس نومبر سنہ ۱۹۳۰ء سے پہلے ہی اقبال

---

[1] اس کا حوالہ مصنف سیاسی کارنامہ نے بھی دیا ہے۔

[2] اس تجویز کے متعلق سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک ممتاز کانگریسی پنڈت سندر لال نے کہا تھا کہ جن کی زبان سے پہلا تقسیم کا لفظ نکلا وہ لالہ لاجپت رائے تھے

علامہ نے اپنی اسکیم "پاکستان" شائع کی[6]۔ ان سب کے بعد دسمبر ۱۹۳۰ء میں بمقام الٰہ آباد مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ ہوا اور علامہ اقبال نے خطبۂ صدارت میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی کی قراردادوں کے متعلق کہا کہ:

"میرے نزدیک تو اس کا قرار ہی مقدس جذبہ تصور کیا جائے اس لیے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبۂ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے بجائے اس امر میں خود مختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقے میں اپنے مخصوص نظریات زندگی کے ماتحت اپنے جوہر مضمر کی نشو و نما کر سکیں پھر ان صحیح عناصر سے ایک آہنگ کل کی تخلیق ہو اور مجھے یقین ہے کہ لیگ کا یہ اجلاس مسلمانوں کے ان مطالبات کی پرزور تائید کرے گا جو مذکورہ بالا قرارداد میں بیان کئے گئے ہیں.......

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں تو ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے، ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایۂ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی لیکن انہوں نے ان کو اس بناء پر رد کر دیا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا تو ایک ریاست معرض وجود میں آئے گی جس کا سنبھالنا مشکل ہوگا۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس غرض سے کر رہے ہیں کہ بوقت ضرورت حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ ان کے ہاتھ آ جائے۔

میں مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں بلکہ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقع ملے اس لئے کہ اس قسم کے مواقع حاصل ہونا اس وحدانی نظام میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصود وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں غلبہ حاصل ہو۔"

تعجب ہے کہ علامہ نے مشرقی بنگال کو اس طرح اپنے ذہن سے دور رکھا کہ اشارہ تک نہیں کیا، حالانکہ وہاں مسلم اکثریت اتنی تھی کہ لارڈ کرزن جیسے وائسرائے نے اس کو مسلم صوبہ کہا تھا اور اس کی تقسیم کی تنسیخ مسلمانوں کی سیاسی موت تھی۔

بہرحال مذکورہ حوالوں سے صاف طور پر ثابت ہے کہ تقسیم ہند کا تخیل و تصور علامہ کا نہ تھا ان سے پہلے بھی اس کا صاف صاف اظہار ہو چکا تھا۔

علامہ نے گول میز کانفرنس کے زمانہ میں بھی جب کہ رحمت علی اسکیم کا ہر طرف چرچا تھا، اس تقسیم کے متعلق کوئی بیان نہیں دیا البتہ ۱۹۳۲ء میں بحیثیت صدر مسلم کانفرنس اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ:

"ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت خواہ وہ وفاقی ہو قائم نہ کی جائے بلکہ ہر صوبہ کو آزاد ڈومینین بنا دیا جائے جس کا تعلق ہندوستان کی کسی مرکزی حکومت کی بجائے براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو۔"[4]

نیز ۲۸ دسمبر ۱۹۳۳ء کو دارالعوام کے تاریخی جلسے میں مسلمانوں کے مطالبات کا یہ خلاصہ بیان کیا کہ مرکز میں ایک تہائی نشستیں، بلوچستان میں اصلاحات اور صوبائی خود مختاری۔ گول میز کانفرنس سے مراجعت پر خود علامہ نے کانفرنس میں اپنی شرکت کا یہ مقصد بیان کیا:

"ہندوستان کے آئندہ سیاسی نظام میں مسلمان دوسری اقوام میں ضم نہ ہو سکیں یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس مسئلہ کے سوا گول میز کانفرنس کی کسی دوسری کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔"[5]

اقبال نے قرطاس ابیض کے شائع ہونے کے بعد مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اگرچہ اس فیصلہ میں ہمارے سب مطالبات منظور نہیں کئے گئے۔ تاہم ایک با عمل جماعت کی حیثیت سے وہ ایک ہی راستہ اختیار کر سکتے ہیں کہ اس فیصلہ کو جرأت کے ساتھ قبول کریں اور اس کی حمایت کریں۔[6]

با ایں ہمہ یہی سوانح نگار کہتے ہیں کہ بعض اہل الرائے سے پرائیویٹ ملاقاتیں کر کے اپنی اسلامی ہند والی تجویز کا پروپیگنڈہ کرتے رہے۔ کیمبرج کے چودھری رحمت علی نے علامہ کے اس تخیل کو پاکستان کا نام دے کر ایک پاکستان نیشنل کانگریس[7] کی بنیاد بھی رکھ دی تھی اور اس کے پمفلٹ تمام سیاسی حلقوں میں تقسیم کئے جا رہے تھے۔ یعنی اہل فکر و نظر سنجیدگی سے اس پر غور کرنے لگے تھے۔

"علامہ پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے گول میز کانفرنس میں اس تجویز کو باضابطہ طور پر کیوں پیش نہیں کیا۔ جواب میں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک مدرسہ فکر کامل آزادی کا حامل تھا۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی اس کے نمایاں سرگرم تھے۔ دوسرا مدرسہ خیال درجہ نو آبادیات کا قائل تھا۔ سر محمد شفیع اس مکتب کی نمائندگی کر رہے تھے۔ علامہ مرحوم کا تعلق عملاً اسی دوسرے گروہ سے تھا اور اس گروہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے انہوں نے متحدہ مملکت کی بجائے خود مختار ریاست کے الفاظ استعمال کئے۔ پھر انہیں اس بحث سے دلچسپی بھی نہ تھی کہ ہندوستان کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے آزادی کامل کو سیاسی نصب العین قرار دینا چاہیے یا درجہ نوآبادیات کو۔ ان کی نظر میں اہم ترین مسئلہ جو کچھ تھا وہ یہ تھا کہ اس ملک میں ایک خطۂ زمین اسلامی آئین کی جلوہ گری کے لئے علیحدہ متعین کر دیا جائے اس لئے وہ متحدہ مملکت کے الفاظ استعمال کر کے انتہا پسند گروہ کی یک گونہ ہمدردی حاصل کر سکتے تھے مگر اعتدال پسند جماعتوں کی ہمدردی بالکلیہ کھو دیتے اور حکمران جماعت کی ناراضی کو اس نازک موقع پر خواہ مخواہ مول لیتے اور یہ سیاسی فراست کا کوئی اچھا مظاہرہ نہ ہوتا اس لئے انہوں نے ایسے الفاظ میں اس تصور کو پیش کیا جن میں انتہا پسند و اعتدال پسند دونوں گروہوں کے نقاط نظر کی رعایت ملحوظ تھی اور یہ مقصد بھی پیش نظر تھا کہ برطانوی حکومت بھی اس تجویز کو سنتے ہی چراغ پا نہ ہو جائے۔"

(سیاسی کارنامہ ص۴۹)

"وقت کا تقاضا حالات کا اقتضا اور مصلحت و تدبر کا یہی مطالبہ تھا کہ علامہ مرحوم اپنی اس تجویز کو ان کانفرنسوں میں پیش نہ کرتے۔"

(سیاسی کارنامہ ص۵۰)

"اقبال کی فراست ایمانی نے تدبر و مصلحت کا یہی تقاضا سمجھا تھا کہ اس تجویز کو آئینی طور پر فی الحال آگے نہ بڑھایا جائے۔ گویا گول میز کانفرنس کے موقع پر اس اسکیم کو پیش نہ کرنا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ اسکیم علامہ مرحوم کی کوئی سنجیدہ تجویز نہیں بلکہ ایک شاعرانہ ترنگ تھی یا یہ کہ وہ اس کو وفاقی اسکیم ہی کا ایک جزو سمجھتے تھے بلکہ یہ ان کے تدبر اور عملی سیاست سے مکمل واقفیت کا ایک ثبوت ہے۔"

(سیاسی کارنامہ ص۴۲)

"علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں اپنی اس تجویز کو سنجیدگی سے پیش کرنے کے باوجود آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد دہلی اور سائمن کمیشن کی بعض سفارشات کی تائید اصولاً اس لئے کی تھی کہ یہ قرارداد اور یہ سفارشات مجموعی حیثیت سے علامہ اقبال کے مجوزہ ارمان سے قریب تر تھیں اور انہوں نے اپنی تجویز کو خود مختار ریاست کے الفاظ کا جامہ اس لئے پہنایا اور گول میز کانفرنس میں اس کو باضابطہ طریقہ پر اس لئے پیش نہیں کیا کہ عملی سیاست اور مصلحت وقت کا یہی تقاضا تھا۔"

یہ جواب جس قدر ناقابل اطمینان یا پھس پھسے ہیں اس پر کچھ لکھنا فضول ہے۔ ان فقرات میں "انتہا پسند و اعتدال پسندوں دونوں کے نقاط نظر کی رعایت" "برطانوی حکومت کے چراغ پا نہ ہونے کے مقصد" "تقاضائے حالات" "مطالبہ مصلحت و تدبر" اور "عملی سیاست" کا ایک گلدستہ بنا کر پیش کیا گیا ہے مگر یہ پھول خوشبو نہیں دیتے اور صرف دیکھنے ہی میں خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

چودھری رحمت علی اور علامہ

مگر اس بیان کے متعلق کوئی ثبوت کیا کسی کوئی صحیح اشارہ بھی نہیں کہ چودھری رحمت علی اور علامہ کے درمیان اتحاد عمل کسی صورت میں بھی ہوا ہو، بلکہ اقبال کو چودھری رحمت علی اور ان کے رفقا ایک مخالف خیال کرتے تھے کہ پاکستان کا تصور و تخیل کا کریڈٹ چودھری رحمت علی سے چھین کر اقبال کو دیا جا رہا ہے۔
چنانچہ خان اے احمد نے اس مسئلہ پر "دی فونڈر آف پاکستان" کے نام سے انگلستان سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا اس میں لکھتے ہیں:

"اقبال ایک بڑے شاعر تھے لیکن وہ ایک ادنیٰ درجہ کے سیاستدان تھے جو کچھ اپنے اقوال میں وہ اعلان کرتے تھے اپنے اعمال میں اس سے پھر جاتے تھے اس بات سے بعض لوگ چونک پڑتے ہیں لیکن مندرجہ ذیل واقعات اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں:

(۱) سالہا سال تک وہ مسلمانوں کے سرکاری خطابات قبول کرنے کو بڑا

---

[1] قائد اعظم نے بھی اپنی تقریر اجلاس مسلم لیگ منعقدہ دہلی ۱۹۴۳ء میں کہا تھا کہ "چند نوجوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا جائے۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں یہ لفظ گھڑا، پنجاب سے پ، افغانستان سے الف (کیونکہ صوبہ سرحد اب تک افغانیہ کہا جاتا ہے) ک کشمیر سے اور (س) سندھ اور (تان) بلوچستان سے، اس طرح ایک لفظ بن گیا۔"

[2] قائد ملت لیاقت علی خان نے اپنے خطبہ صدارت میرٹھ ڈویژنل مسلم لیگ کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں کہا تھا کہ "سب سے پہلے نہرو کمیٹی کے سامنے یہ تجویز آئی تھی کہ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کو ایک نظام حکومت کے ماتحت کر دیا جائے تاکہ مسلم اکثریت ایک جگہ ہو جائے۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس خیال کو ذرا وضاحت سے بیان کیا۔"

[3] ذکر اقبال ص۱۷۱، [4] ذکر اقبال ص۱۸۰، [5] ذکر اقبال ص۱۸۲

[6] چودھری رحمت علی کا اولین پمفلٹ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا جس میں لفظ پاکستان کے ایجاد کی وضاحت کی تھی۔

[7] صحیح نام پاکستان نیشنل موومنٹ۔

ملاقات تک نہ کی بلکہ یہ پیغام بھیجا کہ:۔

"پنجاب سے ہاتھ الگ رکھیں اس کی قسمت یونینسٹ پارٹی کے سپرد ہے۔"

علامہ نے بھی قائداعظم کی کرسی کی تائید و امداد کی بلکہ دراصل اس نظم مندرجہ بالا سے استقبال کیا۔ علامہ پنڈت نہرو کے قدیم مخلص مداحوں میں تھے اور اس زمانے میں ان سے مراسلت کا سلسلہ جاری تھا چنانچہ سر سید راس مسعود کو لکھتے ہیں کہ:۔

"پنڈت جواہر لال نہرو کا خط آیا تھا۔ آجکل مسٹر محمد علی جناح لاہور آئے ہوئے ہیں یہاں کی مختلف پارٹیوں کے اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں۔"

(۳۰ مئی ۱۹۳۶ء)

بہرحال لاہور میں ان حالات کے باوجود مسلم لیگ کا ایک شاندار اجلاس منعقد ہوا جس میں قائداعظم نے ایک معرکۃ الآراء اور بصیرت افروز تاریخی تقریر کی۔

غالباً اسی موقع پر علامہ نے دوسرا قطعہ ارشاد فرمایا ہے جو "محمد علی باب" کے عنوان سے مجموعہ میں موجود ہے۔

تھی خوب حضور علما باب کی تقریر — بیچارہ غلط پڑھتا تھا اعراب سماوات
اس کی غلطی پر علما تھے متبسم — بولا نہیں معلوم تمہیں میرے مقامات
اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد — محبوس تھے اعراب میں قرآن کی آیات

اتفاق کہ کچھ عرصہ بعد ہی سر فضل حسین کا انتقال ہو گیا، اور لیگ کی قوت بھی روز افزوں زور پکڑ رہی تھی اور قائداعظم پر ملت کا اعتماد تھا کہ علامہ اپنے ایک بیان کے مطابق جس میں قائداعظم کی تعریف و تائید تھی منظر سیاست پر جلوہ گر ہوئے اور مئی ۱۹۳۶ء سے سلسلہ مراسلت شروع کر دیا، پھر علامہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے صدر بھی منتخب ہوئے لیکن بیماری سے جلد ہی بیزار ہو گئے چنانچہ اس سلسلہ میں سر سید راس مسعود کو لکھتے ہیں:۔

"تمہارا خط ابھی ملا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے میرا بھی یہی فیصلہ ہے جو تم نے کیا ہے یہ واقعی افضل ہے، میں نے تو پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت سے بھی استعفیٰ دے دیا ہے بورڈ کی میٹنگ کل ہو گی۔ آج کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں جو نوٹ اس استعفیٰ پر نکلا ہے ممکن ہے تمہارے ملاحظہ سے گزرا ہو بورڈ کے ممبر اصرار کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لئے ملتوی کر دوں بہرحال اس ماہ کے اختتام تک میں اس کی صدارت سے دست بردار ہو جاؤں گا۔"

(۲۷ اگست ۱۹۳۶ء)

مراسلت

علامہ کی مراسلت میں چند خطوط بصیغۂ راز بھی ہیں جن میں سر سکندر حیات خاں وغیرہ کے متعلق کچھ اطلاعات ہیں جو سر فضل حسین مرحوم کے سیاسی جانشین تھے۔

پنڈت جواہر لال کی ایک تقریر پر توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

بصیغۂ راز مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء

۱۔ "آپ کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہے کہ ہندوستان اور اسلامی ایشیا کی آئندہ سیاسی ترقیات کے پیش نظر دستور جدید ہندی مسلمانوں کو اپنی تنظیم کے لئے ایک نادر موقع بہم پہنچاتا ہے۔"

(دستور کی تائید کرتے ہیں)

۲۔ "۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء کے خط میں ایک نیشنل کنونشن کا اجلاس منعقد کرنے کا مشورہ ہے۔"

۳۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں معاشی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے لیکن جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، اسلامی ہندوستان میں ان مسائل کے حل کو آسانی رائج کرنے کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا ایک سے زیادہ اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔"

۴۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے خط میں ہندو مسلم فسادات پر اظہار خیال ہے اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلم وزارت مسلمانوں سے ناانصافی برتنے پر مجبور ہوتی ہے اس کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ دستور جدید ہندوؤں کی ہی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے ..... موجودہ دستور ہندی مسلمانوں کے لئے زہر قاتل کا اثر رکھتا ہے ......

ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب اسی طریق پر ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق میں اسلامی اصلاحات کا نفاذ ..... ہندوستان کا امن نسلی، مذہبی اور لسانی میلانات کی بناء پر ملک کی تقسیم مکرر پر موقوف ہے۔"

۵۔ "۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کے خط میں لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد کرنے کی درخواست کی ہے۔

۶۔ ۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے خط میں کیمونل ایوارڈ کے متعلق لیگ قرارداد کا شکوہ ہے، اور مسئلہ فلسطین پر اظہار اضطراب، اور لیگ میں قرارداد اور راہ عمل متعین کرنے کی اہمیت کے اظہار کے بعد لکھتے ہیں:۔

"ذاتی طور پر میں کسی امر کے لئے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو، جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔"

۷۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں کی تنظیم کے لئے کوشش اور قوتوں کو وقف کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اس وقت تک دم نہ لینا چاہئے جب تک کہ پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہو جاتی اور بلوچستان کو اصلاحات نہیں ملتیں۔"

۸۔ یکم نومبر ۱۹۳۷ء بصیغۂ راز سر سکندر، لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے متعلق بعض اطلاعات

۹۔ ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء (راز)

"سر سکندر اور ان کے دوستوں سے متعدد گفتگوؤں کے بعد اب میری قطعی رائے ہے کہ سر سکندر لیگ اور پارلیمنٹری بورڈ پر اپنا پورا پورا قبضہ چاہتے ہیں .... مجھے تو اس تمام کھیل کا مقصد لیگ پر پہلے قبضہ جمانا اور پھر اس کا جنازہ نکال دینے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا ...."

۱۰۔ ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء تک علامہ دستور جدید کو جو گول میز کانفرنس کا نتیجہ تھا ایک نادر موقع بتاتے ہیں پھر وہ ایک آزاد اسلامی مملکت یا پاکستان کا نظریہ پیش نہیں کرتے بلکہ ہندوستان کی تقسیم مکرر اور مسلم صوبوں کا ایک جداگانہ وفاق اور پھر پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی حکومت اور بلوچستان کی اصلاحات پسند کرتے ہیں۔

غرض نہ تو ان خطوط میں علامہ نے آزاد مملکت کا خیال ظاہر کیا اور نہ گول میز کانفرنس کے زمانے میں انہوں نے پرائیویٹ طور پر پروپیگنڈا کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مخالفین کا لاہور میں بھی مقابلہ کرتے بلکہ خط بھی بصیغۂ راز لکھے ہیں۔

پھر یہ کہ مسلم لیگ کے اجلاس جو لکھنؤ و پٹنہ وغیرہ میں منعقد ہوئے ان میں شرکت کر کے کوئی نظم یا تقریر یا اثر ڈالنے کے لئے نہیں فرمائی، صرف مشوروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

وہ فلسطین کے مسئلہ پر تو جیل جانے کو تیار نظر آتے ہیں مگر ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلہ میں گول کمرہ کے اندر قلمی مشورہ اور بعض اوقات دروازہ بند کر کے پیش کرتے ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس ان کے قدوم سے محروم ہی رہی۔ جس کے لئے جیل جانے کو بھی تیار تھے۔

ان خطوط کے ملاحظہ کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ ۲ مئی ۱۹۳۷ء کو سر سید راس مسعود کے نام جو خط ہے اس میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میری صحت خدا کے فضل سے بحال ہو گئی ہے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس بیماری سے پہلے جو حالت تھی وہ عود کر آئی ہے ....."

اسی طرح دوسرے خطوط میں بھی تندرستی کا ذکر ہے، بیماری بھی عارضی نہیں تھی۔

نوٹ:۔ مکاتیب اقبال کے مجموعہ میں اور جداگانہ بھی یہ خطوط شائع ہوئے ہیں قائداعظم کا پیش لفظ بھی ہے جو کسی درخواست پر لکھا ہے اس کے آخر میں تحریر ہے کہ:۔

"ان کے نظریات بنیادی طور پر میرے نظریات کے ہم آہنگ تھے اور میں نے ان نظریات سے وہی نتائج پیدا کئے جو ہندوستان کے آئینی مسائل کے دقیق مطالعہ سے نکلتے تھے اور ان کا اظہار کچھ عرصہ میں مسلم انڈیا کے متحدہ عزم میں ہوا جیسا کہ لاہور سے آل انڈیا مسلم لیگ کے رزولیشن میں ظاہر کیا گیا۔"

اقبال اور ہز ہائینس آغا خاں

اقبال اور ہز ہائینس آغا خاں میں کوئی خاص تعلق نہ تھا لیکن اقبال کی دلچسپی کے متضاد آثار ضرور ملتے ہیں۔

مسلم لیگ پرانی کی جو طنزیہ نظم ہے اس میں سر آغا خاں کو بھی امام بنا کر ایک نشانہ بنایا ہے لیکن امامت کی تعریف ایک اور نظم میں کی ہے۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے — حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست — زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے — فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

۱۹۱۹ء میں پیرس کی صلح کانفرنس کے موقع پر جب ہز ہائینس آغا خاں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ایک وفد کو انگلستان آنے کا مشورہ دیا تھا تو علامہ نے لکھا کہ:۔

شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ رند لم یزل — رکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
یہ اگر سچ ہے تو کس درجہ حیرت کا مقام — رنگ اک پل میں بدل دیتا ہے یہ نیلی رواق
حضرت کرزن کو اب فکر مداوا ہے ضرور — حکم برداری کے معدے میں ہے درد لایطاق

وفد ہندوستان سے کرتے ہیں آغا خاں طلب
کیا یہ چورن ہے پئے ہضم فلسطین و عراق

مگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو نظر آتا ہے کہ ۱۹۲۹ء کی آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی میں شرکائے کانفرنس کا جو گروپ لیا گیا ہے اس میں صدر اجلاس سر آغا خاں کی کرسی کے عقب میں علامہ اقبال ایستادہ ہیں۔

پھر مئی ۱۹۳۷ء میں مس فارقوہرسن کو لکھتے ہیں کہ:۔

"جہاں تک فلسطین کا تعلق ہے میں ایک اپیل شائع کرنے پر غور کر رہا ہوں میں نے پہلے بھی آپ کو لکھا کہ ہز ہائینس آغا خاں کی اعانت حاصل کریں۔ ایسی اپیل میں ان کی شمولیت نہایت موثر ثابت ہو گی۔"

۱۹۳۵ء میں سید راس مسعود کے توسط سے خواہشمند ہیں کہ ہز ہائینس سر آغا خاں ان کے فرزند جاوید کو تاختم تعلیم وظیفہ عطا کریں۔ اسی سال مولوی سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے، میں نے آغا خاں کو باوجود ان کی تمام کمزوریوں کے ان سب سے بہتر مسلمان پایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے ان کے حالات میں انقلاب عظیم آ رہا ہے۔

باب ۶

اقبال کے استاد محترم

"ذکر اقبال" میں اقبال کے استاد محترم حضرت مولانا حافظ میر حسن شاہ کے حالات بھی لکھے ہیں لیکن جیسا کہ بعض مصنفین اپنے صاحب سوانح کی عظمت دکھانے کے لئے دوسروں کو مورد طعن و حقارت بنا لیتے ہیں اور اس کے لئے بڑی بڑی روایات لکھنے پر دلیر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ذکر اقبال میں بھی بعض [illegible] اور بعض نئی نظر آتی ہیں۔"

اس سلسلے میں یہ روایت عجیب و غریب ہے کہ:۔

"[illegible] میں ایم اے او کالج فاؤنڈیشن میں حضرت مولانا بھی تشریف لے گئے تھے اسی سید نے وائسرائے کے اعزاز میں ایک بہت بڑا ڈنر دیا شاہ صاحب کو بھی مدعو کیا لیکن آپ نے کہا کہ میں ایسی دعوتوں میں شرکت

نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سرسید نے اپنے فرزند سید محمود کے ہاتھ کھانا بھیجا اور کہا کہ جب تک شاہ صاحب کھانا کھائیں ان کی خدمت میں حاضر رہنا اور ان کی باتیں سننا۔ صفحہ ۲۰

ظاہر کس قدر صاف روایت ہے مگر اب ذرا محک تنقید پر لائیے:

مولانا نے نہ تو "ایسی دعوتوں" کی تشریح کی نہ مجبوری ظاہر کی بلکہ ایک اکھڑ جواب دیا حالانکہ مولانا سرسید کے شاگرد اور ارادتمند تھے اور سرسید عمر میں ان سے بہت بڑے اور مرتبہ میں ان سے بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وائسرائے کے ڈنر میں مغربی طریق پر کھانا ہوتا اور مولانا چھری کانٹے کے استعمال میں مشاق نہ ہوں گے اس لئے بہتر طریقہ یہ تھا کہ ادب کے ساتھ معذرت کر لیتے۔

دوسرا حصہ دیکھئے: سید محمود کے ہاتھ کھانا بھیجا اور حاضر رہنے اور باتیں سننے کی ہدایت کی۔ سید محمود خود مشرقی علوم میں دستگاہ رکھتے تھے اور مولانا کے تقریباً ہم عمر تھے اور اس وقت ہائیکورٹ کے جج تھے پھر یہ کہ سرے سے ڈنر کا وجود ہی نہ تھا وائسرائے آیا اور تمام مراسم ادا کر کے چلا گیا اور روانہ ہو گیا۔ یہ روایت محض مولانا کی عظمت دکھانے کے لئے تراشی گئی ہے!

مشرقی تہذیب، تعلیم اور تدریس میں استاد کا حفظ مرتبہ اور ادب بڑی اہمیت رکھتا ہے مگر ملاحظہ ہو کہ:

"ایک مرتبہ اقبال شاہ صاحب کے ساتھ چلے جا رہے تھے اور سبق پڑھ رہے تھے ایک ہاتھ میں کتاب تھی دوسرے میں بٹیر، شاہ صاحب نے پوچھا کہ اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بے تکلف بولے حضرت ذرا پکڑ کر دیکھئے۔ شاہ صاحب ہنس دیئے۔"

راستہ چلتے میں سبق، دونوں ہاتھ گھرے ہوئے بٹیر اور کتاب، مولانا کا سوال اور علامہ کا جواب اور وہ بھی حضرت استاد کو!! (صفحہ ۳۵)

مولانا کی مذکورہ روایتوں میں ایک روایت یہ ہے کہ:

"ایک مرتبہ ۱۸۸۸ء کو گرمیوں کا موسم تھا لو چل رہی تھی اور شاہ صاحب پاس بیٹھے تھے۔ سرسید نے کہا کہ کیا ہی پنجاب ہے جسے انتخاب ہفت کشور کہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں اگر ہندوستان جنت نشان ہے تو پنجاب ضرور انتخاب ہفت کشور ہے۔" (صفحہ ۲۸)

لطیفہ کتنا ہی دلچسپ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ سرسید نے موسم گرما میں کبھی پنجاب کا سفر نہیں کیا۔ پہلی مرتبہ ۱۸۷۳ء میں دوسری مرتبہ ۱۸۸۴ء میں مختلف مقامات پر گئے۔ تیسری اور آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر جو لاہور میں منعقد ہوا۔ پھر ۱۸۹۸ء میں وہ جلسہ میں اور یہ تمام سفر موسم سرما میں کئے ہیں۔

اس لطیفہ میں سرسید کو محض عظمت بیان و زیب داستان کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ (صفحہ ۳۲)

اسی طرح ایک اور روایت دیکھئے کہ:

"۱۸۹۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں ہوا شاہ صاحب کے پاس ممبری کا ٹکٹ تھا جو اتفاق سے گم ہو گیا۔ دروازہ پر رضاکاروں نے روک دیا۔ اتنے میں نواب محسن الملک کی نظر پڑ گئی انھوں نے پکار کر رضاکاروں سے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو ایسے بزرگ کو روکتے ہو جس نے کانفرنس قائم کی ہے۔" (صفحہ ۴۶)

اول تو کانفرنس کا کوئی اجلاس ۱۸۹۸ء میں لاہور میں نہیں ہوا، اور اجلاس ہوئے تو ایک ۱۸۸۸ء میں دوسرا ۱۸۹۸ء میں مگر نواب محسن الملک پہلے اجلاس کے موقع پر حیدرآباد میں تھے اور دوسرا اجلاس بڑا شاندار ہوا تھا۔ لاہور میں اس شان کا یہ پہلا اجلاس تھا کہ جس کی ریسپشن کمیٹی میں پنجاب کے ممتاز اصحاب شریک تھے یہ اجلاس گورنر پنجاب کے درباری خیمہ میں منعقد ہوا تھا۔ ممبروں، ڈیلیگیٹوں اور وزیٹروں کا تعلق اسی کمیٹی سے تھا اس کا انتظام دروازہ پر بھی تھا۔ مولانا سے لوگ کیسے ناواقف نہ تھے؟ مجمع میں رضاکاروں کا روکنا اور نواب محسن الملک کی نظر پڑ جانا اور ان کا رضاکاروں کو متنبہ کرنا اور خلاف واقعہ کہنا کسی طرح قرین عقل نہیں۔

کانفرنس کی پوری تاریخ میں کوئی شائبہ بھی نہیں کہ مولانا کو اس کے بانیوں میں شمار کیا جاتا البتہ کبھی کبھی عام ممبروں کی طرح فیس ممبری بھیج دیتے تھے!

پھر یہ کہ اگر یہ واقعہ حقیقت پر مبنی ہے تو بجائے عظمت کے مولانا کی کسر شان [ہوتی ہے]۔ زیادہ اثر انداز ہوتا ہے کہ ایسی بزرگ ہستی کے مرتبہ سے رضاکاران مقابل بھی واقف نہ تھے!

مولانا کو نوروز ۱۹۲۳ء پر شمس العلماء کا خطاب ملا اس کے بارے میں سوانح نگار اقبال لکھتے ہیں کہ:

"علامہ اقبال کی پرزور سفارش تھی۔ جب خود ان کے خطاب کے متعلق گورنر نے ان سے گفتگو کی ہے تو اس میں یہ مسئلہ بھی داخل تھا بقول مصنف سیرت اقبال حکومت نے ۱۹۲۳ء میں آپ کو نائٹ کا خطاب پیش کیا۔ یہاں اقبال کی فراخ حوصلگی اور بے نیازی کا یہ لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب آپ کو سر کا خطاب پیش کیا گیا تو آپ نے کہا کہ میں خطاب صرف اس صورت میں قبول کر سکتا ہوں جبکہ میرے استاد کو اول شمس العلماء کا خطاب دیا جائے گا۔ گورنمنٹ کو اس شرط کے ماننے میں تامل تھا کہ علامہ میر حسن مرحوم باہمہ علم و فضل کسی غیر معمولی شہرت کے مالک نہ تھے لیکن اقبال نے اپنی شرط پوری کرا ہی لی اور اپنی نائٹ ہڈ کے ساتھ مولوی صاحب کو شمس العلماء بنوا دیا۔" (صفحہ ۱۹)

مگر ذکر اقبال کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

"میکلاگن نے علامہ سے دریافت کیا کہ آیا آپ کی نظر میں اس وقت کوئی شخص شمس العلماء کے خطاب کے لئے موزوں ہے؟ علامہ نے فرمایا کہ میں ایک شرط پر نام پیش کرنے کو تیار ہوں کہ صرف اسی نام کو پیش نظر رکھا جائے کسی دوسرے نام کو سفارش میں شریک نہ کیا جائے۔ میکلاگن نے کسی قدر تامل کے بعد شرط قبول کر لی۔ علامہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک مولوی میر حسن شاہ پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ اس خطاب کے بہترین مستحق ہیں۔ میکلاگن نے کہا کہ میں نے ان کا نام آج پہلی دفعہ سنا ہے۔ کیا انھوں نے کچھ کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ نے فرمایا کہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں وہ میرے استاد محترم ہیں۔" (صفحہ ۱۰)

پہلے بیان میں حکومت یعنی گورنمنٹ ہے، دوسرے میں گورنر معنی ہے کہ بیانات میں بھی نیا پن ہے پہلے میں اقبال کی شرط ہے دوسرے میں خود گورنر کا استفسار ہے، بہرحال ایسی روایت کے راوی دو ہی ہو سکتے ہیں گورنر یا خود اقبال، اگر اقبال نے یہ قصہ بیان کیا تو نام لکھنے میں سوانح نگار کیوں تامل کرتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ مولانا میر حسن ایک مشن کالج کے تقریباً پچاس سال سے علوم مشرقی کے پروفیسر تھے۔ پرنسپل اور اساتذہ کی نظر میں ان کی عزت تھی، سررشتہ تعلیم کے افسروں میں وہ احترام رکھتے تھے ان کے صاحبزادے سید علی نقی شاہ گورنمنٹ ہاؤس میں ڈاکٹر کے عہدہ پر ممتاز تھے اور اس جگہ عام آدمی مقرر نہیں ہو سکتا۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ڈاکٹر کا عہدہ بڑی ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اقبال کے ماسوا تلامذہ میں دیگر بہت سے ممتاز اصحاب اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹر، کمشنر، جج اور جج ہائیکورٹ بھی تھے۔

اس لئے مولانا میر حسن صاحب اقبال کی سفارش کے محتاج نہ تھے۔ پھر یہ کہ جن کی سفارش کرنے والا سب سے بڑا تو پر نسب تھا...... اور یہ کوئی لازمی چیز نہیں کہ تا ہوں کی تصنیف بھی ہو۔ علی گڑھ میں مولوی عباس حسین اور مولوی خلیل احمد کو اور لاہور میں مولوی عبداللہ ٹونکی کو بغیر تصنیف شہرت کے خطابات ملے تھے اور یہ سب سررشتہ تعلیم ہی سے متعلق تھے اس لئے علامہ اقبال کا نام دوسرے سوانح نگاروں کی طرح محض قرب زمانہ کے سبب سے داخل کر دیا گیا ہے۔ مولانا کو ۱۹۲۲ء میں اور اقبال کو ۱۹۲۳ء میں خطاب ملا تھا۔

اقبال کی رحلت

اقبال کا انتقال درحقیقت ایک سانحہ عالمگیر تھا مسلم دنیا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا ایک متاع گرانمایہ سے محروم ہو گئی۔ لیکن ان کے ایک عقیدت مند عبد احمد خان صاحب نے ایک عجیب قصہ بیان پیش کیا ہے۔

"اقبال کی وفات پر لاہور کے ایک معتمد انگریز افسر نے اقبال کے ایک عقیدت مند سے کہا کہ تم نے ہندوستان کے آخری مسلمان کو سپرد خاک کر دیا۔ یہ معتمد گو ہوں انگریز تو خیر انگریز ہی تھا لیکن یہ عقیدت مند بزرگ تو مسلمان تھے کہاں کو اپنی نسبت بھی یقین ہوا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔

گویا ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہندوستان میں صرف ایک ہی مسلمان رہ گیا تھا سو اس کو بھی سپرد خاک کر دیا گیا۔ (ایا اقبال منو ...)

محمد اشرف خان رکن ادارہ احسان بروایت آغا مرتضیٰ خان مدیر احسان رقمطراز ہیں کہ "رات کے ساڑھے کا وقت تھا چارپائی پر لیٹے لیٹے یکایک دل میں ایک عجیب سی گلی اور بیقراری کا احساس ہو گیا میں چارپائی سے اٹھا کپڑے پہنے اور حضوری باغ کی طرف روانہ ہو گیا ناقابل بیان کشش مجھے علامہ مرحوم کی قبر پر لئے جا رہی تھی جب میں قبر پر پہنچا تو لاہور کا ایک مجذوب بزرگ جسے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں قبر پر بیٹھا ہوا بڑبڑا رہا تھا میں نے فاتحہ پڑھی تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا میرے دل پر خوف طاری ہو گیا مجذوب کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں میں فاتحہ خوانی سے فارغ ہوا تو اس سے پوچھا بابا جی تم اس وقت کہاں چکر لگا رہے ہو۔ اس نے جواب کڑکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ تجھے معلوم نہیں آج حضور نبی کریم صلعم کی سواری اس طرف سے گزر رہی ہے۔ اور میں پہرہ دار مقرر ہوا ہوں مجھے مجذوب کی ان باتوں سے خوف آ رہا تھا اور باوجود ہوا کے تیز جھونکوں کے میرا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور میں بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے چپل ہاتھ میں پکڑی اور بھاگ نکلا گھر پہنچا لیکن صبح تک میرے حواس درست نہ ہوئے۔ لیکن میرے دل کو پوری پوری تسکین حاصل تھی۔" (صفحہ ۱۳ سیرت اقبال)

۱۰ اپریل ۱۹۳۸ء

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنے مقالہ اقبال اور ملا میں رقمطراز ہیں کہ:

"یورپ اوہام پرستی کے پاگل خانوں میں اور امراض نفس کے شفاخانوں میں بڑی کثرت سے اپنے آپ کو مسیح سمجھنے والے ملتے ہیں، یہ مجانین اگر مشرق میں ہوتے خصوصاً پنجاب میں تو ان میں سے کوئی دیوانہ یا ہوشیار ضرور ایک خاص امت پیدا کر لیتا، علامہ اقبال پنجاب کے زندہ دل ہونے کے قائل تھے اور یہاں کے سادہ دل عوام کی خوبیوں کو تسلیم کرتے تھے لیکن یہ حقیقت ان پر جان گداز معلوم ہوتی تھی کہ یہ لوگ جلد کسی اقتدار پسند مذہب کے پیرو بن کر تن من دھن کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان سکھ ہو یا جیرو سرفروش مرید ملتے ہیں...."

ان بیانات کو غور سے پڑھنے کے بعد دیکھئے کہ اقبال کی وفات کے بعد ان کے معتقدین اور سوانح نگاروں کو کہاں سے کہاں لئے جا رہے ہیں۔

سلے ملاحظہ ہو: ولادت سرسید ۱۸۱۷ء، ولادت مولانا ۱۸۴۴ء، ولادت سید محمود ۱۸۵۰ء۔

رفیع الدین ہاشمی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب اقبال کیمپس لاہور [پاکستان]

خدوخالِ اقبال ۔ ایک مطالعہ

اس کتاب کا موضوع بظاہر، علامہ اقبالؒ کی سوانح اور شخصیت کا مطالعہ ہے۔ اس مطالعے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ مصنّف، مقدمہ نگار اور ناشر کے خیال میں، اقبال کے سوانح نگاروں نے جھوٹی اور غلط روایات کے ذریعے، علامہ کو فرشتہ، نبی اور خدا بنا ڈالا ہے، مصنّف علامہ کے مقامِ بشریّت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

بطورِ مصنّف محمد امین زبیری (۱۸۷۲ء ——— ۱۹۵۸ء) کا کوئی مقام ہو یا نہ ہو موصوف مولانا شبلیؔ کی کردار کشی کے حوالے سے ضرور شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے عطیہ بیگم کے نام شبلی کے خطوط شائع کیے۔ "حیاتِ شبلی" پر ایک زہریلا تبصرہ لکھا۔ اور پھر "شبلی کی رنگین زندگی" شائع کی۔ موصوف نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی کانٹوں میں گھسیٹا۔ خامہ بگوش بتاتے ہیں کہ: "اس بدتہذیبی پر پورے ہندوستان کے عالموں اور ادیبوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا مولانا مناظر احسن گیلانی نے تو یہاں تک لکھا کہ "منشی محمد امین صاحب اس کتاب کے بعد کسی مہذب سوسائٹی اور جماعت میں شریک ہونے کے لائق نہیں رہے" لیکن سب سے زیادہ دلچسپ تبصرہ سیّد ہاشمی فرید آبادی کا تھا۔ انہوں نے کہا "منشی صاحب، علامہ شبلیؔ کے بارے میں بہت متشدّد ہیں، اس لیے انہیں منشی نہیں، بالتّشدید منشّی کہنا چاہیے۔" سلہ (حوالہ آخر میں)

ہم نے اس کتاب کو مختلف اوقات میں، اور کبھی کئی دنوں بلکہ ہفتوں کے وقفوں سے پڑھا، اور ایک سے زائد بار۔ ہمیں ہر بار یہ احساس ہوا کہ لکھنے والے نے قطعی ایک منفی ذہن کے ساتھ، اور خاصی پست سطح پر اتر کر یہ کتاب لکھی ہے۔ پھر یہ احساس بھی شدّت کے ساتھ ہوتا ہے کہ مصنّف نے پہلے سے طے کر لیا ہے کہ اسے موقع بے موقع اور جا و بے جا اقبالؒ پر اعتراض کرنا ہے۔ ان کی ذات پر چھینٹے اڑا کر اسے داغدار بنانا ہے۔ ان پر بالواسطہ یا بلا واسطہ، وضاحت کے ساتھ یا اشارے کنائے میں حملہ کر کے ان کی شخصیت کو مجروح کرنا، اور اسے قارئین کی نظروں سے گرانا ہے۔ لکھنے والا، انہیں بدنام و رسوا کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا۔ اگر موقع نہ بھی ہو، تو بھی کسی نہ کسی طرح وہ مذاق و تمسخر کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتا ہے۔ بقول پروفیسر اسرار احمد سہاوری: "تحریر میں ہر جگہ علامہ پر طنز و تعریض ہے، اور ان کے افعال و اعمال کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعرانہ خیالات، مذہبی عقاید، فلسفیانہ بصیرت، زبان دانی سیاسی سوجھ بوجھ ہر چیز کو نشانۂ استہزا بنایا گیا ہے"۔ سلہ ہر وہ بات جو علامہ کے حق میں جاتی ہے، وہ مصنّف کو مشکوک اور مشتبہ نظر آتی ہے اور ہر وہ واقعہ جس سے ان کا امیج بلند ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک خلافِ واقعہ اور مجہول نظر آتا ہے ——— قصّہ مختصر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے اس کتاب کا مصنّف، اقبالؒ کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔

اس اعتبار سے تو یہ کتاب کسی سنجیدہ مطالعے یا بحث و مباحثے کے لائق نہیں ہے تاہم یہ دکھانے کے لیے کہ محمد امین زبیری کی علمی قابلیت کا معیار و منہاج کیا ہے؟ ان کی تصنیفی و تالیفی صلاحیت کس درجے کی ہے؟ اور ان کا اندازِ استدلال اور زورِ منطق کیسا ہے؟ ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) اعتراضات کی نوعیت عجیب و غریب سی ہے، مثلاً ایک اعتراض یہ ہے کہ اقبال، انگلستان سے واپسی پر مسجد قرطبہ گئے، مگر انگلستان کے تین سفروں میں انہوں نے "ڈوکنگ مسجد تک جانے کی زحمت گوارہ نہیں فرمائی حالانکہ اس زمانے کی وہ بھی ایک بڑی اسلامی یادگار ہے"۔ (ص ۷۹)

(خیال رہے کہ ڈوکنگ مسجد نواب شاہ جہاں بیگم والئ بھوپال نے تعمیر کرائی تھی۔ زبیری صاحب نے چوبیس سال تک ریاست بھوپال کی نوکری کی، زبیری صاحب چاہتے تو یہ اعتراض بھی کر سکتے تھے کہ علامہ نے "مسجد قرطبہ" کے طرز پر ڈوکنگ مسجد کی بڑی اسلامی یادگار سے متعلق بھی ایک نظم

کیوں نہ لکھی۔

(۲) پروفیسر حمید احمد خاں نے، اقبال کی رحلت پر انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا: "اقبال کی وفات پر، لاہور کے ایک مقتدر انگریز افسر نے، اقبال کے ایک عقیدت مند سے کہا کہ تم نے ہندوستان کے آخری مسلمان کو سپردِ خاک کر دیا" ــــ اس پر زبیری صاحب فرماتے ہیں: "گویا ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہندوستان میں صرف ایک ہی مسلمان رہ گیا تھا، سو اس کو بھی سپردِ خاک کر دیا گیا ــــ" مزید لکھتے ہیں: "یہ مقتدر مگر مجہول انگریز تو غیر انگریز ہی تھا، لیکن یہ عقیدت مند بزرگ تو مسلمان تھے۔ کیا ان کو اپنی نسبت بھی یقین ہوا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں؟" (ص ۱۵۵) (۳) اقبال کے اس مصرعے: ؏ پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے ــــ پر حاشیے کا نشان بنا کر پاورقی میں لکھتے ہیں: "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں توحید گرو نانک نے پھیلائی؟ نویں اور اوائل دسویں صدی سے قبل شرک ہی شرک تھا؟" (ص ۱۰۳) متذکرہ بالا مصرع علامہ ایک نظم "نانک" (بانگِ درا۔ ص ۲۷۰) سے لیا گیا ہے۔ اس میں گرو نانک اور گوتم کا ذکر آیا ہے۔ زبیری صاحب نے اس ضمن میں ایک فریضہ اقبال اکیڈمی کو بھی سونپا ہے۔ فرماتے ہیں: "ان نظموں کے متعلق بھی اقبال اکیڈمی کے محققین کا فرض ہے کہ اس کی تحقیق کریں کہ آیا یہ الہامی ہیں؟ مسلم عقیدہ کی رو سے ہندو اور سکھ مشرک ہیں۔ اقبال ان کی تعریف میں مذہبی انداز سے رطب اللسان ہیں۔" (حاشیہ: ص ۱۰۳) (۴) مصنف نے دعویٰ کیا کہ اقبال کی مذہبی تعلیم معمولی تھی (ص ۱۰) اور اقبال نے قرآن و حدیث، سیرتِ نبویؐ اور صحابہ کرام کے حالات کا عمیق مطالعہ نہیں کیا تھا۔ صرف معمولی طور پہ عربی پڑھ سکتے تھے (ص ۲۴) اس کا ثبوت وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں خود اعتراف کیا تھا کہ "میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔"

(۵) سوانحِ اقبال کا معروف واقعہ ہے کہ طویل علالت کے آخری دور میں سر اکبر حیدری کی مساعی سے ایک ہزار روپیہ کا چیک حیدر آباد کے خزانے سے جاری ہوا تھا، اس پر توشک خانۂ عامرہ کی سلپ منسلک تھی، جس سے کبیدہ خاطر ہو کر، اقبال نے سر اکبر حیدری کے نام ایک قطعہ لکھا، جس کا آخری شعر ہے: ؎

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

زبیری صاحب نہ تو اس جذبۂ خودداری کو سمجھ سکے ہیں، جس کے تحت علامہ نے چیک واپس کیا اور نہ انہیں اس شعر کا پہلا مصرع سمجھ میں آیا۔ انہوں نے اس واقعے میں بھی اعتراض کا پہلو تلاش کر ہی لیا۔ گرفت اس پر ہے کہ "ارمغانِ حجاز" کے نوٹ میں چیک کی واپسی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ لکھتے ہیں۔ "ارمغانِ حجاز" علامہ کی رحلت کے چھ ماہ بعد نومبر میں جاوید اقبال صاحب نے شائع کی مگر چیک کی واپسی کا وہ ذکر نہیں کرتے ــــ" (ص ۲۲)

اس طرح کی منطق اور استدلال کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ہمارا تاثر یہ ہے کہ موصوف حسِ لطیف، ذوقِ سلیم اور کامن سنس سے بھی عاری ہیں۔ کتاب کے آغاز میں انہوں نے شیخ محمد اکرام کے الفاظ مستعار لیتے ہوئے، "مشاہیر کے تذکرے میں" احتیاط، ذوقِ سلیم اور خدا ترسی کی ضرورت کا ذکر کیا ہے (ص ۲، سطر ۲)

مگر اس کتاب میں انہوں نے متذکرہ ضرورت کا خیال نہیں رکھا۔ ذوقِ سلیم کی بات تو ہو چکی، احتیاط اور خدا ترسی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ انصاف اور دیانت کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ اس کتاب کے متعدد بیانات حد درجہ بے احتیاطی، خدا سے بے خوفی اور بددیانتی پر مبنی ہیں۔ مثلاً اقبال کے دورِ آخر کی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پنجاب میں سر شفیع اور میاں سر فضل حسین کا قومی سیاسیین میں نہایت اہم کردار تھا۔ اقبال جب میدانِ سیاست میں آئے تو سر شفیع کے زیرِ سایہ رہے ــــ سر فضل حسین نے اقبال کو جج کا عہدہ دلانے، اور مجلسِ اقوام کی ممبری اور ان کے دیگر اعزازات سے متعلق کوشش کی۔ غرض نائٹ ہڈ، صوبہ کونسل کی رکنیت، انگول میز کانفرنس کی ممبری، ان دونوں کی مہربانیوں اور عنایتوں کا نتیجہ ہے۔ جب تک یہ زندہ رہے، اقبال کی سیاست ان ہی کی تابع رہی لیکن اوّل سر شفیع کا، اور پھر ۱۹۳۵ء میں سر فضل حسین کا جب انتقال ہو گیا، تو اب علامہ نے قائدِ اعظم کی جانب توجہ کی۔" (ص ۱۶۱، ۱۶۲)

اس قطعے کے مفروضات اور تاریخی اعتبار سے بے بنیاد ہونے کے ساتھ بے انصافی اور بددیانتی کے ساتھ ساتھ ان کی بدنیتی کو بھی آشکار کرتے ہیں۔

دیباچے میں جمیل زبیری نے محمد امین زبیری کی علمی، تصنیفی فتوحات اور ان کے علمی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہ نواب محسن الملک کے پرسنل اسسٹنٹ رہے۔ بہت سے مشاہیر علم و ادب (بشمول سر راس مسعود، سر ضیاء الدین احمد، سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق) سے ان کی دوستی رہی۔ انہوں نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں۔ "علی گڑھ تحریک پر ایک اتھارٹی تھے۔ یہ بات کہ ان کی تصانیف سے "اقتباسات" مختلف مصنفین اپنی تصنیفات میں شامل کرتے رہتے ہیں"۔ اگر مرحوم کے لیے وجۂ افتخار بن سکتی ہے، تو ہم اسے بھی ان کا اعزاز مان لیتے ہیں —— لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس علمی شغف، ادب دوستی اور بڑے لوگوں کی صحبت نے ان کے ذہن و دل و دماغ، اور ان کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب کیے؟ ان کی تصانیف کا زیادہ تر حصہ محسن الملک، وقار الملک، نواب حمید اللہ خاں، سر آغا خاں اور سر ضیاء الدین احمد جیسے اکابر کی سوانح عمریوں پر مشتمل ہے۔ ان اوراقِ حیات سے محمد امین زبیری میں کیا اخلاقی رویہ پیدا کیا، اور انہیں کیا سبق سکھایا؟ کیا یہی کہ بزرگوں کی پگڑی اچھالی جائے، ان کی کردار کشی کی جائے، اور ان کی شخصیتوں کو مسخ کر کے پیش کیا جائے۔

اس کتاب کے ابتدائی حصے میں ناشر اور مصنف نے بھی یہ تاثر دیا ہے کہ ان کا مقصد، اقبال کے سوانح نگاروں کی غلط اور بے بنیاد روایات کی تردید ہے، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے مباحث کی ساری زد، خود اقبال پر پڑتی ہے۔ لگتا ہے کہ سوانح نگاروں کی تردید تو محض ایک بہانہ تھا، اصل مقصود اقبال کا رد، اور ان کی شخصیت کا انہدام ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں انہوں نے یہ پردہ بھی اٹھا دیا، اور واشگاف طور پر اقبال پر حملوں میں قباحت محسوس نہیں۔ خامہ بگوش کے الفاظ میں "منشی امین زبیری نے" بقول ناشر "یہ کتاب مجاورانِ اقبال کو راہِ راست پر لانے کے لیے لکھی تھی، لیکن اصل مقصد خود علامہ اقبالؒ کو راہِ راست پر لانا تھا۔" [35]

محترم جمیل زبیری صاحب بتاتے ہیں کہ محمد امین زبیری، "مختلف موضوعاتِ علم و ادب پر تصنیفی فتوحات حاصل کرتے رہے" (ص ۷) خود مرحوم نے اپنے خطوط میں اپنی جملہ تصانیف کا وضاحت کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔ مکتوب الیہ کو بتاتے ہیں کہ فلاں کتاب دو ہزار روپے کے معاوضے پر لکھی۔ نواب بھوپال کی لائف پانچ ہزار معاوضہ پر سال بھر میں تیار کر دی، اسی طرح آغا خاں کی لائف کا معاوضہ پندرہ سو روپے (علاوہ دیگر اخراجات صفائی مسودہ وغیرہ) ملا۔ عورت اور عسکریت کا معاوضہ تین سو روپے ملا (ص ۱۸-۱۹) لطف کی بات یہ ہے کہ اسی خط میں وہ یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ "میرا شغلِ تصنیف و تالیف پیشہ وارانہ نہیں!") ان خطوط میں وہ اپنی تصانیف کی قیمتوں کے ساتھ ان کے ناشرین کے پتے بھی درج کرتے ہیں، یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ ناشر کے علاوہ کتاب کہاں کہاں سے ملے گی اور ڈاک پر کیا خرچ آئے گا اپنی تصانیف کی فروخت کے لیے اس بے تابی میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ زبیری صاحب کی تالیفات کس معیار کی ہیں؟ اگر آپ "خدوخالِ اقبال" کے آئینے میں اس کا اندازہ لگانا چاہیں تو قدرے مایوسی ہوگی۔ ان کی منفی ذہنیت سے قطع نظر بطور ایک تصنیف یا تالیف بھی یہ ایک معمولی کتاب ہے۔ ایک سلیقہ مند مؤلف سے توقع کی جاتی ہے کہ پہلے وہ اپنے موقف کو مناسب الفاظ میں بیان کرے، پھر اس کی تائید میں حوالے اور شہادتیں فراہم کرے۔ بعدہٗ ان کی بنیاد پر بذریعہ منطق و استدلال استخراجِ نتائج کرے۔ اس اعتبار سے بھی ہم محمد امین زبیری کو ایک ہنرمند اور کامیاب مؤلف نہیں قرار دے سکتے۔ ان کے ہاں طول طویل اقتباسات کی کثرت ہے۔ موضوع و بیان میں بے ربطی ہے، متعدد حوالے نامکمل اور ادھورے ہیں اور بعض تو قطعی مجہول ہیں اور من گھڑت معلوم ہوتے ہیں۔ استدلال کی عمارت بیشتر عبدالمجید سالک کے بیانات پر قائم کی گئی ہے حالانکہ روایت و درایت کے اعتبار سے "ذکرِ اقبال" علامہ کی جملہ سوانح عمریوں میں سب سے کمزور اور غیر مستند کتاب ہے۔ "خدوخالِ اقبال" پڑھتے ہوئے یہی احساس ابھرتا ہے کہ مصنف کو علامہ کی ذات سے شدید پرخاش ہے اور وہ ان کے بارے میں انتہائی تعصب میں مبتلا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر اسرار احمد سہاروی لکھتے ہیں:

> "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ذاتی کدورت اور عناد کی وجہ سے انتقامی جذبہ اپنے سینے میں پرورش کرنے کے بعد، یہ تحریر لکھنے بیٹھا ہے اور عموماً ایسے نجی واقعات شوق اور تفصیل سے درج کیے گئے ہیں، جن کا علامہ کی علمی، ادبی، سیاسی اور دینی زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً تلخی اور بدمزگی کا یہ عالم ہے کہ علامہ کی عربی دانی، فقہ پر عبور، فلسفے کا تدبر، سیاسی سوجھ بوجھ، تحقیقی کاوش وغیرہ ہر چیز کا استخفاف کیا گیا ہے، اور بڑی لذت اندوزی کے ساتھ علامہ مرحوم کی شخصیت اور کردار پر کچوکے لگائے گئے ہیں۔" [36]

محمد امین زبیری نے متعدد شخصیات پر قلم اٹھایا۔ جیسا اوپر ذکر ہوا انہوں نے پرنس آغا، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب حمید اللہ خاں، نواب سلطان جہاں بیگم والیٔ بھوپال اور سر ضیاء الدین احمد وغیرہ کی سوانح نگاری کی ـــــ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا زبیری صاحب نے ان سب شخصیات کا مطالعہ اس زاویۂ نظر اور انہی پیمانوں سے کیا، جن سے انہوں نے اقبال کی شخصیت کا ناپ تول کیا ہے؟ اگر نہیں، اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے تو پھر یہ امتیازی سلوک صرف اقبال ہی کے ساتھ کیوں؟ مرحوم کو اس کا احساس تھا، اور انہوں نے عمداً ایسا کیا اس لیے انہیں اپنے بقول "اس کتاب پر ایک گونہ ناز" تھا (ص ۱۵) ـــــ اس مایۂ ناز کتاب میں مصنف نے اقبال پر تنقید (یا تنقیص!) کی وجہِ جواز یہ پیش کی ہے کہ ان کے سوانح نگاروں نے انہیں فرشتہ یا نبی بنا دیا۔ اس سے قطعِ نظر کہ زبیری صاحب نے متعین طور پر نہیں بتایا کہ کس سوانح نگار نے کب اور کہاں اقبال کو فرشتہ یا نبی قرار دیا ہے اگر کوئی اقبال سے عقیدت مندی کا اظہار کرتا ہے یا ان کی خوبیوں (اور ایک عظیم شخص کی بہت سی خوبیاں بہر حال ان میں موجود تھیں) کا ذکر و اعتراف کرتا ہے، تو اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ وہ انہیں فرشتہ یا نبی سمجھتا ہے۔ زبیری بعض (مستند یا غیر مستند) روایات و واقعات کو ایک خاص ترتیب سے پیش کرتے ہیں، ان سے ایک من مانا، پسندیدہ اور بیشتر صورتوں میں خود ساختہ نتیجہ اخذ کر کے اسے روایت نگاروں کے سر منڈھ دیتے ہیں، اور ساتھ ہی دہائی دیتے ہوئے علامہ اقبال پر تبرّیٰ بازی کرنے لگتے ہیں، اپنے اس طریق کار بلکہ طریقِ واردات پر وہ خود تو ناز کر سکتے ہیں، مگر کوئی انصاف پسند شخص اس کی تائید نہیں کرے گا۔ یہی سبب ہے کہ تا دمِ تحریر "خد و خالِ اقبال" پر جتنے تبصرے شائع ہوئے ہیں سب میں ان کی کاوش پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ "سیارہ" کے مبصّر نے لکھا ہے کہ "علامہ کی شخصیت تو اس قسم کی خوردہ گیریوں سے بہت بلند و بالا ہے۔ اس طرح انکی کردار کشی ممکن نہیں۔ جو شخص یہ مشغلہ اختیار کرتا ہے، وہ علم و ادب تو کجا، خود اپنی بھی کوئی خدمت نہیں کرتا۔ اقبال کو آخر فرشتہ یا نبی کس نے کہا، جو اس پر اس قدر برہمی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اقبال ایک انسان تھے، اور ہر انسان سے غلطی اور خطا کا صدور ہوتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ اس کی شخصیت کا مجموعی رنگ کیا ہے۔ اس کے آگے بڑھ کر جو افراد قوموں کی تقدیر سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں اور اجتماعی زندگی کو خیر و فلاح کے میلانات اور داعیوں سے متّصف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ نہایت قیمتی لوگ ہوتے ہیں وہ قوم کے محسن ہوتے ہیں۔ اقبال بھی اس ملّت کے محسن تھے، اور اپنے محسنوں کی کردار کشی بہر حال قابلِ مذمّت ہی قرار پاتی ہے۔ اس لیے ہم مؤلّف کتاب کی اس منفی کاوش پر اسے داد نہیں دے سکتے۔"[۵] داد کا یہ اعزاز صرف مقدمہ نگار اور ناشر کو حاصل ہے۔

اس ضمن میں جناب نعیم صدیقی نے بھی ایک سوال اٹھایا ہے۔ صدّیقی صاحب لکھتے ہیں: "ممتاز شخصیتوں کا جائزہ لینے والوں کو یہ ضرور غور کرنا چاہئے کہ جہاں ان کو سربلند کرنے والی خوبیاں کام کر رہی تھیں، وہاں ان کو نیچے گرانے والی کمزوریاں بھی ان میں تھیں، پھر کیا وجہ ہوئی کہ ایک شخصیت کی کمزوریاں اس کو نیچے نہ لا سکیں، اور اس کی خوبیاں اس کو بلندی پر لے اُڑیں۔ اور آج ۱۹۰۸ء سے ۱۹۸۶ء تک برابر کہکشاؤں پر پرواز کر رہا ہیں۔ پھر آخر ان کمزوریوں کو محدب شیشوں سے بڑا کر کے دیکھنے کا فائدہ؟ تجزیہ یہ کرنا تھا کہ اقبال بعض کمزوریوں کے باوجود بڑا آدمی کیوں بنا ہے؟ کیا محض پروپیگنڈے کے زور سے ـــ؟"[۶] لیکن زبیری صاحب تو اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اس لیے اب یہ سوال مرحوم کے ذہنی پسماندگان یعنی انیس جیلانی اور کنور محمد اعظم علی خاں خسروی کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا ہے، جن کی تگ و دَو اور تائید و کاوش سے "خد و خالِ اقبال" کو اشاعت کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ محمد امین زبیری نے اپنے بقول یہ "معرکۃ الآراکتاب" لکھی تو اسے کوئی بھی چھاپنے پر راضی نہ ہوا۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق سے مصنف کے دیرینہ مراسم تھے، مگر انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ انیس شاہ جیلانی نامی ایک صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے مسودہ حاصل کرنے کی ٹھانی اور اپنے بقول "بابائے اردو پر بھی سبقت لے جانے کی کوشش کی" (ص ۹) بذریعہ خط و کتابت زبیری صاحب سے مول تول کرتے رہے، مگر معاملہ نہ پٹ سکا۔ کہتے ہیں: "ابا مرحوم کی ڈانٹ پڑی کہ چند ٹکوں کے لیے اقبال مرحوم کی پگڑی اُچھالتے ہو"؟ چنانچہ مصنف سے سلسلۂ مراسلت ختم ہو گیا۔ ابا مرحوم ہو گئے اور "تیس برس بیت گئے"، جو ایک عمر ہوتی ہے "مگر افتادِ طبع خصوصاً ذہن کی کجی میں تو تیس سال کیا، ایک سو تیس میں بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اب جو "خد و خالِ اقبال" کی اشاعت کے آثار پیدا ہوئے تو بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ دیباچے سے ان کی مسرّت چھپائے نہیں چھپتی۔ دیباچہ (بہ عنوان: پیش گفت) کیا لکھا ہے، جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ ایک اقتباس اقبال سے منسوب کیا ہے۔ ایک عطیہ فیضی کے کھاتے میں ڈالا ہے۔ ایک لطیفہ خلیفہ عبد الحکیم اور رئیس احمد جعفری

کہ دونوں مرحوم ہو چکے ہیں، کے منہ میں ڈالا ہے۔ لیکن یہ سب نمک مرچ طبع زاد، بلکہ خانہ زاد ہے۔ قلم زہر آلود اور انداز کثیلا۔ موصوف خوش ہیں کہ مرحوم کی یہ محنت رائیگاں نہیں گئی" اور "متاعِ گم گشتہ" پیش کی جا رہی ہے۔ استہزا اور تمسخر سے معمور یہ تحریر ان کی ذہنیت کی خوب خوب عکاسی کرتی ہے:

"خدوخالِ اقبال" کے ناشر خسروی صاحب نے ۱۹۸۰ء میں مسودے کی تلاش شروع کی۔ انہیں نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے، مگر مسودہ مل گیا۔ دل کی مُراد بر آئی۔ اس کے باوجود کیسے بے نفس بزرگ ہیں کہ اسے اپنا "کوئی کارنامہ" ہی نہیں سمجھتے۔ نہایت معصومیت سے فرماتے ہیں: "مصنّف کا اصل مقصد علّامہ کی تنقیص نہیں۔ (بلکہ انہوں نے) دراصل اقبال فروشوں کے خلاف قلم اٹھایا تھا"

یہی وجہ ہے کہ آنجناب اقبال فروشی کے تو سخت خلاف ہیں۔ مگر "خدوخالِ اقبال فروشی" میں کیا حرج ہے۔ تیسرے درجے کی کتابت ہے اور پونے دو سو صفحات کی یہ بے جلد کتاب کی قیمت صرف پچپن روپے میں خسروی صاحب سے دستیاب ہے۔

مختصر یہ کہ تینوں اصحاب (محمد امین زبیری، انیس شاہ جیلانی اور کنور محمد اعظم علی خاں خسروی) کو علّامہ اقبال سے جو خاص کد ہے، اس کا اظہار ایک صاحب نے یہ کتاب لکھ کر، دوسرے نے دل میں اسے چھاپنے یا چھپوانے کی حسرتِ دیرینہ پال پال کر اور تیسرے نے بالفعل اسے شائع کیا ——— تاحال ہمیں کسی چوتھے آدمی کا سُراغ نہیں ملا، جو اس "حرکت" کی تائید کر سکتا ہو حتیٰ کہ اس کتاب کے دیباچہ [جمیل زبیری صاحب نے بھی] امین صاحب کے سوانحی کوائف اور ان کی دیگر تصنیفی سرگرمیوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے"۔ خدوخالِ اقبال" پر کوئی تبصرہ تو کجا۔ اس کا نام تک نہیں لیا لہٰذا اس "فخریہ پیش کش" کا اعزاز محمد امین زبیری (مصنّف) انیس شاہ جیلانی (ہدایت کار) اور خسروی (پروڈیوسر) کے لیے مخصوص ہے۔ ہم "تھری مسکیٹرز" کے لیے دُعا گو ہیں۔ ؏ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حواشی ● (۱) تکبیر کراچی۔ ۵ جون ۱۹۸۷ء ص ۳۸ (۲) سیّارہ لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۶ء ص ۳۲۷ (۳) تکبیر، مذکورہ شمارہ ص ۳۹ (۴) سیّارہ مذکورہ شمارہ ص ۳۲۶ (۵) (ا) خامہ بگوش، تکبیر۔ مذکورہ شمارہ (ب) پروفیسر اسرار احمد سہاوری، مذکورہ شمارہ (ج) نعیم صدیقی، ترجمان القرآن، لاہور، ستمبر ۱۹۸۶ء (د) شہاب قدوائی: قومی زبان لاہور۔ ستمبر ۱۹۸۶ء (۶) سیّارہ: مذکورہ شمارہ ص ۳۲۷ (۷) ترجمان القرآن، لاہور، ستمبر ۱۹۸۶ء ص ۴۷ (۸) اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ کتاب کی اشاعت سے مایوس ہو کر محمد امین زبیری نے سوچا، کتاب کی اشاعت سے نہ سہی اس کی عدم اشاعت ہی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ انہوں نے علّامہ اقبال کے ایک عقیدت مند کو، جو ایک بڑے سرکاری عہدیدار تھے، یہ پیغام بھجوایا کہ تمہارے ممدوح کے خلاف ایک نہایت خطرناک کتاب شائع ہونے والی ہے اگر تم علّامہ کو دائمی رسوائی سے بچانا چاہتے ہو، تو مصنّف سے اس کا مسوّدہ خرید لو۔ سرکاری عہدیدار شریف آدمی تھے۔ انہوں نے شر کا راستہ بند کرنے کے خیال سے مسوّدہ خرید لیا۔ لیکن منشی صاحب کچّی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انہوں نے مسوّدے کی کئی نقلیں تیار کر رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک سرکاری عہدیدار کو دے دی۔ وہ مطمئن ہو گئے کہ معاملہ ختم ہو گیا۔ ادھر منشی صاحب نے اپنی کتاب کو کسی غیر ملک خصوصاً بھارت میں چھپوانے کی کوشش کی کہ یہاں نہیں تو وہاں چھپ جائے۔ لیکن وہاں بھی اس کارِ فضول کی اشاعت پر کوئی راضی نہیں ہوا۔ (خامہ بگوش، تکبیر، مذکورہ شمارہ) ❁

> "اس کتاب کے بارے میں سب سے پہلا سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جب اقبالؒ ایک متنازعہ شخصیت نہیں ہیں۔ انھیں بطور ایک شاعر اور بطور مسلمان فلسفی عالم گیر شہرت حاصل ہو چکی ہے، ان کی مخالفت کرنے اور انھیں ایک معمولی بلکہ معمولی سے بھی کسی قدر کم درجہ کا آدمی ثابت کرنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ اور کیا اس کاوش بے جا کا کوئی نتیجہ بھی مرتب ہو سکتا ہے؟"
>
> [خدوخالِ اقبال پر ایک نظر، مبصّر سید نظر زیدی، مطبوعہ "اقبالیات" (لاہور) جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء]

مطبوعات اترپردیش اردو اکادمی

مختلف موضوعات پر اتر پردیش اردو اکادمی کی مطبوعات کا سلسلہ پونے تین سو تک پہنچ رہا ہے۔ اب تک شائع شدہ بعض منتخب کتابوں کی فہرست اور زیر طبع کتابوں میں سے کچھ کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

جدوجہد آزادی سے متعلق ادب

رپورٹ کیری انڈین نیشنل کانگریس۔ مترجمہ۔ گنگا پرشاد ورما ۲۴/-
کراچی کا تاریخی مقدمہ ——— میرزا عبدالقادر بیگ ۲۰/۵۰
خطبات آزادی۔۔۔ قبل آزادی کانگریس کے صدارتی خطبات ۱۸/-
آزادی کی نظمیں ——— سید سبط حسن ۱۰/-
اردو میں قومی شاعری کے سو سال ۔۔۔ علی جواد زیدی ۱۷/-
انقلاب ۱۸۵۷ء۔ تصویر کا دوسرا رخ حسام الدین ۶/-

تراجم

رامائن فراقی۔ منظوم بہ شکل مسدس (جلد اول) رائے سدھناتھ بلی فراقی ۲۳/-
رامائن فراقی۔ منظوم بہ شکل مسدس (جلد دوم) رائے سدھناتھ بلی فراقی ۱۲/-
مالویکا اگنی متر (کالی داس) ——— عرفان صدیقی ۳/۶۰
شاعر اعظم بھرتری ہری ——— امتیاز الدین ۶/-

بچوں کے لیے آفسٹ سے چھپی باتصویر کتابیں

سوتا جاگتا (الف لیلیٰ کی ایک کہانی پر مشتمل ڈرامہ۔ نیر مسعود ۳/-
سرخ گلاب ——— بشیشر پردیپ ۴/-
کھلتی کلیاں ——— محمد اطہر مسعود خان ۴/۵۰
منسا ماما کا گدھا ——— محسن خاں ۴/-
جاپانی کہانیاں ——— حامد اللہ افسر ۵/۲۰
روسی کہانیاں ——— حامد اللہ افسر ۴/۴۰

شعری اور نثری انتخاب

انوار نظر (کلیات نوبت رائے نظر)۔ مرتبہ منشی دیانارائن نگم ۱۹/-
انتخاب مرزا محمد ہادی رسوا ——— ڈاکٹر محمد حسن ۱۰/-
انتخاب بستان حکمت ——— نیر مسعود ۷/-
انتخاب منظومات نظیر اکبرآبادی ——— پروفیسر مسعود حسین خاں ۷/-
انتخاب کلام یگانہ چنگیزی ——— ڈاکٹر انیس اشفاق ۴/-

● زیر طبع ●

انتخاب غبار خاطر ○ انتخاب جعفر علی خاں اثر ○ انتخاب اقبال ○ انتخاب خطوط غالب ○ انتخاب امیر اللہ تسلیم ○ انتخاب کلام رجب علی بیگ سرور ○ انتخاب کلام ظہیر دہلوی ○ انتخاب کلام جگر مرادآبادی سریلے بول اور متعدد دوسری کتابیں

مکمل فہرست اور دیگر تفصیلات کیلئے رابطہ قائم کریں

سکریٹری: اترپردیش اردو اکادمی بلرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
فون نمبر
۴۳۱۴۲ ● ۳۶۰۴۲

اقبال یورپ میں

علامہ اقبال کے فکری ارتقاء میں سفرِ یورپ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء تقریباً تین سال کے دوران اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ ذہن و دل میں جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں اس کا احوال اقبالیات کے ذخیرے میں یہاں وہاں موجود ہے۔ اقبال کے سوانح نگار یا کسی بھی پہلو سے ان پر مقالات لکھنے والے قلم کاروں نے سفرِ یورپ کے موجود تمام روایت در روایت ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔

اقبال اپنی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صرف چند ماہ (تقریب ۲۰ جولائی تا ۵ نومبر ۱۹۰۷ء) جرمنی میں بھی رہے لیکن جرمنی تمام عمر ان کی روح میں جاگتا رہا۔ جرمنی ان کی روح کا دائمی گھر تھا۔ فکری، شعری، اور جذباتی سطحوں پر جرمن تہذیب و تمدن کا نفوذ ان کے شعور کا سرچشمہ بنا۔ جرمنی کے سفر میں اقبال نے بہت کچھ سوچا اور بہت کچھ سیکھا۔ جرمنی ان کا دیارِ عزیز رہا ان کے آدرشوں پر اثر انداز رہا۔

"اقبال اور یورپ" کے موضوع پر تمام تر لوازمے میں ڈاکٹر سعید اختر درانی کی کتاب "اقبال یورپ میں" وہ تحقیقی کارنامہ ہے جو اس موضوع سے متعلق مفروضات، نتائج اور ماخذات کو نئی معنویت عطا کرتا ہے کیوں کہ تمام تر موجود لوازمے میں بہت کچھ تحقیق طلب بھی تھا۔ انگلستان، جرمنی، ہسپانیہ سے اقبال کے تعلق پر کی گئی نئی تحقیقات پر مشتمل اس کتاب کو موجود مواد کی بازدید بھی کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سعید اختر درانی کی اس تصنیف میں اقبال کے احوال و آثار سے متعلق بہت سے حقائق و انکشافات، نئی معلومات، مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوط کے متن، بعض خطوط کے عکس اور گم شدہ تحریریں، تصویریں اور دیگر متفرقات اپنے موضوع پر نہایت ہی وقیع اور تازہ ترین ہیں۔

"اقبال یورپ میں" شامل مقالات میں سے دس ڈاکٹر درانی کے تحریر کردہ ہیں۔ تین مقالوں میں کیمبرج میں اقبال کی یادگاری تختی از آئین اسٹفنز، برٹش میوزیم اور علامہ اقبال، از یحییٰ سید اور "اقبال اور جرمنی" از امان اللہ ہوبوہم ترجمہ ہیں۔ کتاب کے عنوانات یہ ہیں:

شاعرِ مشرق کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ، علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش، اقبال کے استاد مشفق۔ سر طامس آرنلڈ، علامہ اقبال اور کیمبرج یونیورسٹی، کیمبرج میں علامہ اقبال کی یادگار، انگلستان میں علامہ اقبال کی چند دستی تحریریں، برمنگھم سے ایک خط، محمد اقبال اور جرمنی، اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط بنام مس ویگے ناسٹ، فلسفۂ عجم کے اصل مسودے کی دریافت اور اس کے متن کا تقابلی جائزہ، ہسپانیہ میں علامہ اقبال کے نقشِ قدم پر۔

ضمیمے کے طور پر مضامین کے عنوانات یہ ہیں: دستی تحریروں اور دستاویزات وغیرہ کی تصاویر اور متون، مس ویگے ناسٹ کے نام اقبال کے خطوط کے جرمن اور انگریزی متون، فلسفۂ عجم کے چند غیر مطبوعہ صفحات کا عکس، لندن یونیورسٹی کا نصاب عربی (۸-۱۹۰۷ء)۔

کتاب کے آخر میں اشاریہ کے تحت: اشخاص، اماکن و ادارے، کتب و رسائل، اور افکار و نظریات کی ذیلی سرخیوں میں بحروفِ تہجی، صفحات نمبر اور دیگر ضروری حوالے دیے گئے ہیں۔ اغلاط نامہ کے ذیل میں کتاب کی ۱۴۶ غلطیوں کی تصحیح آخری صفحات میں دی گئی ہے۔

۲۳۸ صفحات پر مشتمل پوری کتاب ہی دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے لیکن باوجود خواہش کے اقبال نمبر میں اتنی گنجائش نہیں نکل سکی کہ مکمل کتاب ہی ہدیۂ قارئین کی جا سکے تاہم کتاب کے تین مضامین اقبال نمبر میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ پہلا مضمون علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش (چند نئے زاویے) اپنے آپ میں ایک پرانی بحث کی کچھ نئی معلومات رکھتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی تاریخ پیدائش اور اپنے والد کے نام میں خود ہی الجھاوے پیدا کیے تھے۔ پیدائش کا سال! ۱۸۷۹ء، ۱۸۷۵ء، ۱۸۷۷ء۔ اصل اور بنیادی ماخذ اندراج کے وہ ماخذ ہیں جن میں علامہ کی پیدائش کا مہینہ اور سال تحریر کیا گیا ہے۔

دوسرا مقالہ ایک نو مسلم محمد امان اللہ ہربرٹ ہوبوہوم کا تحریر کردہ "محمد اقبال اور جرمنی" (نام پیام دل کا) ہے۔ یہ انگریزی تقریر کا وہ متن ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر درانی نے کیا ہے۔ یہ مقالہ ماہنامہ "افکار" (کراچی) کے شمارے نومبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اقبال نمبر میں اس ترجمے کی دوبارہ اشاعت کا مقصد آئندہ صفحات میں شامل اقبال بنام مس ویگے ناسٹ کے مکاتیب کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا ہے۔ اقبال اور جرمنی کے موضوع پر بھی کچھ اہم مواد اس مقالے میں آ گیا ہے۔

ایما ویگے ناسٹ EMILIE EMMA WEGENAST (پ: ۱۸۷۹ء م: ۱۹۶۴ء) کا ذکر سب سے پہلے عطیہ فیضی

نے اپنی انگریزی کتاب "اقبال" (مطبوعہ ۱۹۴۷ء) میں کیا۔ چالیس سال بعد انھوں نے یہ کتاب لکھی اور شائع کی۔ اس کتاب کے بعد سے علامہ اقبال کی اس جرمن اتالیق مس ویگے ناسٹ پر توجہ دی گئی اور بہ طورِ خاص حالیہ برسوں میں ڈاکٹر سعید اختر درانی نے سابقہ ماخذات و مفروضات کی نئی تحقیقی ترتیب و تشکیل کی۔

تعداد میں یہ ۲۷ خطوط ہیں (۱۷ جرمن میں اور دس انگریزی میں) ان میں سے خط نمبر ۴ محررہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۷ء کا متن سید وحید الدین فقیر کی کتاب IQBAL IN PICTURE (مطبوعہ ۱۹۶۵ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ خط نمبر ۲، محررہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۷ء اور خط نمبر ۵، محررہ ۲۹ دسمبر ۱۹۰۷ء۔ اصل خطوط کے عکس روزنامہ "جنگ" (لندن) بابت یکم مئی ۱۹۸۲ء کو شائع ہوئے ہیں لیکن یکجا طور سے تمام ۲۷ خطوط کا متن اور اردو ترجمہ اقبال نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر درانی نے جناب محمد امان اللہ کے مقالے کے ذریعہ اور اپنے تحقیقی وضاحتی اشارات و تعلیقات کی مدد سے ان خطوط کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔ ان خطوط کی اشاعت ہندوستان میں پہلی بار شاعر میں ممکن ہو سکی ہے۔ خطوط کی گونج بہت سے عقیدت مندانِ اقبال کے درمیان سنی گئی۔ علامہ اقبال کی حرف حرف اور لفظ لفظ تحریروں کی تلاش و بازیافت نیز خطوط کے ذخیرے میں یہ مکاتیب اضافہ ہیں۔ یہ خطوط ان معنوں میں بھی اہم ہیں کہ یورپ اور بہ طورِ خاص جرمنی کے سفر نے ہر پہلو سے اقبال کی شعری و فکری شخصیت کی تعمیر و تشکیل کی ہے اور مس ویگے ناسٹ نے اقبال کو نہ صرف یہ کہ پوری طرح متاثر کیا بلکہ ان کی شخصیت میں جذب ہو گئی تھیں حالانکہ ۱۹۰۷ء کے بعد یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے سے مل نہیں سکی تھیں۔

ان خطوط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عمیق مطالعے کے متقاضی ہیں۔ اقبال کی شخصیت ان کی نفسیات اور افتادِ طبع کی تفہیم میں یہ معاون ہوں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان خطوط کی بازیافت اتنی اہم نہیں لیکن ایک بنیادی نقطہ بہر حال اہم ہے کہ ایک عظیم فن کار کا ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ اس کی شعری شخصیت کی تفہیم کی کلید ہوتا ہے۔ اسی کے حوالے سے اس کے عصر اور اس کے بے پناہ فن کی مسلسل بازگشت کو سنا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے یہ مکاتیب چاہے عمر کے کسی بھی موڑ کی دین ہوں بہر طور اہم ماخذ ہیں۔ البتہ خطوط کا یہ متن اپنی تمام تر اہمیتوں کے باوجود قدرے نامعتبر ماخذ ٹھہرے گا کہ اصل خطوط یا ان کے عکس دستیاب نہیں۔

ایک اہم سوال یہ ابھرتا ہے کہ مس ویگے ناسٹ نے اقبال کو جو خطوط لکھے تھے وہ کہاں ہیں؟ کیا ایسے خطوط کی بازیافت اہم نہیں جو مشاہیر نے اقبال کو تحریر کئے تھے۔

کتاب میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی تقریظ کے علاوہ ڈاکٹر سعید اختر درانی کا ۷۰ صفحات کو محیط ایک طویل ترین دیباچہ بھی شامل ہے جس میں کتاب کے مقالات کے مواد کے متعلق ایک دل چسپ داستان پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایک نہایت ہی مبسوط مقالہ ہے۔

کتاب کے مندرجات سے متعلق کچھ اہم باتیں اور! ______________

ڈاکٹر درانی کے دیباچے میں علامہ اقبال کے نو دریافت خط کا ترجمہ شامل ہے۔ ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء کا یہ خط سر طامس آرنلڈ کی صاحب زادی مس نینسی کے نام ہے۔ انگریزی خط، اس کا ترجمہ اور خط سے متعلق دیگر تحقیقی مواد اقبال نمبر کے نوادرات والے باب میں ملاحظہ کیجیے!!

- کتاب کے مختلف ابواب میں دی گئیں کئی تصویریں اقبال نمبر میں شائع کی جا رہی ہیں۔
- کتاب میں شامل ضمیموں میں سے صرف ضمیمہ نمبر ۳ اور ضمیمہ نمبر ۴ ہی اقبال نمبر میں دیے جا رہے ہیں۔
- اقبال نمبر کے لیے جن تین مقالوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کے حواشی شاعر کے صفحات پہ تبدیل ہو گئے البتہ بعض حواشی من و عن رہنے دیے گئے ہیں کہ یہ کتاب میں بکھرے ہوئے لوازمے سے متعلق ہیں۔

یوں تو مکمل کتاب ہی اپنے موضوع پہ تحقیقی معلومات کا خزینہ ہے لیکن خود درانی صاحب نے کئی کئی جگہ نہ صرف یہ کہ سوال بنا کر چھوڑ دئے ہیں بلکہ نتائج اخذ کرنے میں قیاس سے بھی کام لیا ہے۔ تکرارِ واقعات اور بکھرے ہوئے حوالے، کتاب کے قاری سے خاص محنت بھی کرواتے ہیں۔ اس بکھراؤ کا مصنف نے اپنے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کیوں کہ تمام ہی مضامین مختلف ادوار اور مواقعوں پر تحریر کیے گئے تھے۔ یہاں کوئی تنقیدی تبصرہ مقصود نہیں، یہ تو کتاب کا تعارف نامہ ہے۔

یہاں غیر موزوں نہ ہوگا اگر صاحبِ کتاب کا تعارف بھی دے دیا جائے۔ درج ذیل معلومات کتاب کے فلیپ سے لی گئی ہیں۔

ڈاکٹر سعید اختر درّانی برمنگھم یونیورسٹی میں شعبۂ طبعیات کے استاد ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کئی سال تک برطانوی اٹامک انرجی کے ہارویل سینٹر میں کام کیا۔ پھر پاکستان اٹامک انرجی کمیشن سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۵ء اٹامک انرجی سینٹر (لاہور) کے ڈائرکٹر رہے۔

ڈاکٹر درّانی کا خاص موضوع REDIATION PHYSICS کی تحقیق ہے۔ انھوں نے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۸ء تک امریکی اور روسی ماہ نوردوں کے لائے ہوئے مہتابی مواد پر بہ حیثیت محقق اعلیٰ PRINCIPAL INVESTIGATOR تحقیقی کام کیا۔ برمنگھم یونیورسٹی نے ۱۹۷۸ء میں ڈی ایس سی کی ڈگری تفویض کی۔

ان دنوں ڈاکٹر درّانی شہابی مواد METERRITES پر کام کر رہے ہیں۔ ایک بین الاقوامی مجلے NUCLEAR TRECKS & REDIATION MEASUREMENT کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ طبعیات کے میدان میں مختلف موضوعات پر تقریباً دو سو تحقیقی پرچوں کے علاوہ کئی ایک کتابوں کے مصنف اور مؤلف بھی ہیں۔ ڈاکٹر درّانی اقبالیات کے سرگرم طالب علم اور اقبال کے بے پناہ عقیدت مند ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں مسندِ اقبال IQBAL PROFESSORIAL CHAIR کے قیام۔ کیمبرج کے زمانہ طالبعلمی میں اقبال کی قیام گاہ (۱۷، پرچگال اسٹریٹ) پر یادگاری تختی اور برطانیہ میں عمومی طور پر فروغ اقبالیات کے لیے سرگرم عمل رہے ہیں۔

اقبال یورپ میں۔ مطبوعہ ۱۹۸۵ء۔ صفحات ۳۸۰۔ قیمت ۷۵ روپے۔ مطبوعہ: اقبال اکاڈمی پاکستان، ۱۲۹۔ ۱۔ اے، نیو مسلم ٹاؤن، لاہور

کتاب "اقبال یورپ میں" سے لیے گئے مضامین میں جو اغلاط راہ پا گئی ہیں انھیں کتاب کے اغلاط نامے سے یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ شاعر کے صفحات پر ان کی تصحیح کر لیجیے۔

علامہ اقبال کی تاریخِ پیدائش کا مسئلہ (چند نئے زاویے)

شاعر کا صفحہ نمبر	کالم نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
۳۲۴	۲	۲۲	PORTUGAL PALACE	PORTUGAL PLACE
۳۲۷	۱	۲۴	۱۲۷۳ھ	۱۸۷۳ء

محمد اقبال اور جرمنی نامہ و پیام دل کا

شاعر کا صفحہ نمبر	کالم نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
۳۲۹	۱	۲	الموف	الملفوف
۳۲۹	۱	حاشیہ ۱	IQBAL AND NEITZCHE,	IQBAL AND NEITZSCHE
۳۳۰	۲	۷	LUDWIG MAXIMILIAN	LUDWINO-MAXIMILLIANS
۳۳۰	۲	۲۴	اور 1919	اور 1919ء
۳۳۱	۱	۱۹	یعنی ویگیناسٹ	یعنی میری عزیزہ مس ویگے ناسٹ
۳۳۱	۱	۲۰	ایک لفظ میری عزیزہ مس میری"	ایک لفظ "میری"
۳۳۱	۱	حاشیہ ۲ سطر ۲	CONVERSATION	CONVERSATIONS
۳۳۱	۲	۳۱	نہ تھیں	نہ تھی
۳۳۱	۲	۳۱	جو اقبال	جہاں اقبال

شاعر صفحہ نمبر	کالم نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
۳۳۲	۱	حاشیہ ۱ سطر ۹	Ci CL	Ci L C
۳۳۲	۱	حاشیہ ۱ سطر ۱۰	کی یادگاری	کا یادگاری
۳۳۲	۱	حاشیہ نمبر ۱ سطر ۱۲	ہوتی	ہوگی
۳۳۲	۲	۲۸	بڑی آرزو	میری بڑی آرزو

ترجمۂ خطوط کے بارے میں

خطوط کے حواشی میں ضمیمہ نمبر ۴ کا مفہوم انگریزی و جرمن خطوط کے متن سے ہے۔ یہ متن اگلے صفحات پر ملاحظہ کیجئے۔

شاعر کے صفحہ نمبر ۳۳۳، کالم نمبر ۱، نوٹ نمبر ۱ سے مراد "اقبال یورپ میں" کے صفحہ نمبر ۹۵ تا ۱۰۲ کو محیط مقالہ "محمد اقبال اور جرمنی" ہے۔ یہ مقالہ اقبال نمبر میں ملاحظہ کیجئے۔

شاعر صفحہ نمبر ۳۳۳، کالم نمبر ۲، نوٹ نمبر ۱ میں "محمد اقبال اور جرمنی" "مشمولہ شاعر" اقبال نمبر" کے صفحہ نمبر ۳۰۳ کالم نمبر ۲، نوٹ نمبر ۳، ملاحظہ کیجئے۔ کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر درّانی نے اقبال بنام مِس ویگے ناسٹ کے جرمن و انگریزی کے ۲۷ خطوط کی توثیق کی ہے۔

خطوط کے متن میں جو اغلاط راہ پاگئی ہیں ان کی تصحیح ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

خطوط میں بعض اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ بعض وہ اغلاط جن میں نقطے وغیرہ رہ گئے تھے ان کی اغلاط نامے میں نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔

شاعر صفحہ نمبر	کالم نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
۳۳۳	۲	۱۳	ممتاز حسن	جناب ممتاز حسن
۳۳۳	۲	۲۶	جرمنی وہ	جرمنی میں وہ
۳۳۳	۲	۳۰	دے رہے تھے	دے رہے ہیں
۳۳۴	۲	حاشیہ ۳	FRAULEIN=FRI	FRAULIEN=FRI
۳۳۵	۲	حاشیہ ۱	تقریباً خطوط	تقریباً سب خطوط
۳۳۵	۲	۲۳	پہلے میں	پہلے خط میں
۳۳۶	۱	۱۵	وہ بڑے	یہ بڑے
۳۳۹	۱	۲۶	رہیئے گا۔	رہیئے گا.....
۳۴۰	۲	۱۷	حقیقتاً	حقیقتاً
۳۴۰	۲	حاشیہ ۲ سطر ۴	طامس آرنلڈ	طامس آرنلڈ کی صاحبزادی نینسی
۳۴۲	۱	۴	۳۱ ۹ ء	۱۹۳۱ء
۳۴۲	۱	۷	صحیم	صبح
۳۴۲	۱	حاشیہ ۵	3.A	113 A
۳۴۳	۲	۷	جرمنی	جرمنی میں
۳۴۴	۱	۲	جنوری ۳۲ ۱۹ء	جنوری ۳۳ ۱۹ء

ڈاکٹر سعید اختر درّانی
مصنف کتاب "اقبال یورپ میں"

سر طامس واکر آرنلڈ
[پ: ۱۹ اپریل ۱۸۶۴ء — م: ۹ جون ۱۹۳۰ء]

علامہ اقبال کی اولیں اقامت گاہ، ۱۷ پرتگال پلیس (17 Portugal Place) کیمبرج، پر نصب شدہ یادگاری تختی، جس کی نقاب کشائی لارڈ بٹلر نے ۲۲ جون ۱۹۷۸ء کے روز کی تھی۔ (تصویر بہ شکریہ کیمبرج ایوننگ نیوز)

مس ایما ویگے ناسٹ
[پ: ۱۸۶۹ء — م: ۱۹۴۴ء]

علامہ اقبال کی تاریخِ پیدائش ،

(چند نئے زاویے)

چند ماہ ہوئے ، روزنامہ "جنگ" لندن میں میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا ، بعنوان "شاعر مشرق کی صحیح تاریخ پیدائش کا مسئلہ" (جنگ ، مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۷۷ء)۔ اس میں میں نے بیان کیا تھا کہ علامہ اقبال کی تاریخِ پیدائش ، حوالے کی مختلف کتابوں میں مختلف درج ہے ، چنانچہ یہ تاریخیں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء (بمطابق 'Iqbal : His Art and Thought' : by S.A. Vahid, 1948) سے لے کر ۹ نومبر ۱۸۷۷ء (بمطابق 'Gabriel's Wing': by Dr. Annemarie Schimmel, 1963) تک محیط ہیں ۔ یہ آخری تاریخ جس پر حکومت پاکستان کا ، ۱۹۷۷ء کو علامہ اقبال کا صد سالہ سالِ ولادت قرار دینے کا فیصلہ منحصر ہے ، دراصل علامہ اقبال کے تحقیقی مقالے کے دیباچے سے لی گئی ہے ۔ یہ تحقیقی مقالہ وہی ہے جس پر علامہ کو میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی یعنی 'The Development of Metaphysics in Persia'. (ایران میں علم مابعد الطبیعیات کا ارتقاء)۔ یہ مقالہ علامہ اقبال نے ۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا ، اور بعد ازاں یہ لندن سے کتابی صورت میں شائع ہو گیا تھا (Luzac and Co. London : 1908) ، لیکن اس مطبوعہ کتاب میں وہ دیباچہ شامل نہیں ، جس میں بقول پروفیسر شمل کے علامہ نے اپنی تاریخ پیدائش "۲ ذی قعد ۱۲۹۴ء بمطابق ۱۸۷۶ عیسوی" تحریر کی ہے ۔

پچھلے سال۱ میونخ یونیورسٹی میں میری تحقیقات کے نتیجے میں یہ بات پہلی مرتبہ برسرِ عام آئی کہ علامہ کے تھیسس کا یہ نادر اصل نسخہ تقریباً چار سال ہوئے ، حکومت ہند نے جرمنی کی حکومت سے یہ کہہ کر حاصل کر لیا تھا کہ چونکہ علامہ اقبال کی پیدائش اور وفات بطور ایک ہندوستانی شہری کے ہوئی تھی ، اس لیے بھارت میں ان کی صد سالہ برسی منانے کے سلسلے میں یہ نسخہ ان کو (بھارتی حکومت کو) تحفۃً دے دیا جائے ۔ میری اس اطلاع کے نتیجے میں کئی پاکستانی اخبارات نے اداریے بھی تحریر کیے کہ حکومتِ پاکستان کو چاہیے کہ وہ تصورِ پاکستان کے خالق کے صد سالہ جشنِ ولادت کی مناسبت سے اب یہ نسخہ بھارت کی حکومت سے واپس حاصل کر لے ۔

میں نے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کے مسئلے پر تحقیق جاری رکھی اور کچھ مزید دلچسپ امور منصّۂ شہود پر آئے ۔

علامہ اقبال یورپ میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک قیام پذیر رہے ۔ اس دوران میں بطور طالب علم وہ بے حد محنتی اور ذہین ثابت ہوئے اور تین سال کے قلیل عرصے میں نہ صرف انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے کیا ، بلکہ میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی پائی اور لندن کی لنکنز ان (Lincoln's Inn) سے بیرسٹری کی سند بھی حاصل کر لی ۔ میونخ یونیورسٹی کے ریکارڈ کا تو میں پچھلے سال جائزہ لے ہی چکا تھا ، اب میں نے سوچا کہ کیمبرج یونیورسٹی اور لنکنز ان سے ان کی تاریخِ پیدائش کے بارے میں استفسار کیا جائے ۔

سب سے پہلے میں نے کیمبرج یونیورسٹی کے کنگز کالج کے سابق فیلو اور پاکستانی امور پر لکھنے والے مشہور انگریز مصنف جناب الین اسٹیفنز صاحب کے توسط سے علامہ اقبال کے کالج یعنی ٹرنٹی کالج کیمبرج سے رابطہ قائم کیا ۔ اسٹیفنز صاحب نے میری طرف سے ٹرنٹی کالج کیمبرج کے لائبریرین جناب ڈاکٹر گیسکل صاحب (Dr. J. P. W. Gaskell) کو لکھا کہ چونکہ علامہ اقبال کی صد سالہ برسی منانے کے سلسلے میں ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کافی اختلاف رائے پیدا ہو چکا ہے ، اس لیے اگر وہ ٹرنٹی کالج کے رجسٹر داخلہ سے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش دریافت کر کے ہمیں اطلاع دیں تو شاید شبہات کا ازالہ ہو سکے ۔ اس پر ڈاکٹر گیسکل صاحب نے لکھا کہ "ہمارے رجسٹر داخلہ میں محمد اقبال کی تاریخ پیدائش محرم ۱۸۷۶ء درج ہے ، جو بدقسمتی سے آپ کے مسئلے کا صرف آدھا ہی حل ہے "۔

اس دلچسپ اطلاع کے ملنے پر میں نے جب جناب گیسکل صاحب کو لکھا کہ اگر وہ براہِ کرم اپنے رجسٹر میں سے اس داخلے کے اندراج کی فوٹو کاپی مجھے روانہ کر سکیں ، تو میں بے حد ممنون ہوں گا ۔ ڈاکٹر فلپ گیسکل صاحب نے ۱۷ فروری ۱۹۷۷ء کو ٹرنٹی کالج کیمبرج کے رجسٹر داخلہ سے یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء کے اندراجات کا عکس مجھے بھیجا ۔ اس میں علامہ اقبال نے اپنے ہاتھ سے اپنے شخصی اور تعلیمی حالات درج کیے ہیں ۔

انھوں نے کیمبرج میں اپنی قیام گاہ کا پتہ 17 Portugal Palace Cambridge درج کیا ہے ۔ (راقم السطور بھی اپنے زمانۂ طالب علمی میں اس جگہ کے بہت ہی قریب قیام پذیر رہا)۔ کیمبرج آنے سے پہلے اپنی درسگاہ انھوں نے "پنجاب یونیورسٹی ، گورنمنٹ کالج" بتائی ہے ، جس کے پرنسپل مسٹر رابسن تھے ۔ اس کے بعد بدست خود انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش محرم ۱۸۷۰ء لکھی ہے ۔ ان کے ٹیوٹر کا نام (پروفیسر) Sedgwick کسی کلرک کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اسی رسم الخط میں انھیں 'Advanced Student, Pensioner' ظاہر کیا گیا ہے (بقول ڈاکٹر گیسکل کے "پنشنر" کیمبرج یونیورسٹی کے ایسے طالب علم کو کہتے ہیں ، جسے کالج سے وظیفہ نہیں ملتا تھا ، بلکہ جو اپنے خرچ پر یا بیرونی وظیفے پر وہاں پڑھتا تھا) اس کے بعد علامہ کے بدست خود دستخط (محمد اقبال)۔ اور والد کا نام "نور محمد" (جو میر محمد بھی پڑھا جا سکتا ہے) تحریر ہیں اور آخر میں انھوں نے اپنی جائے پیدائش سیالکوٹ (انڈیا) لکھی ہے ۔

میں نے ڈاکٹر گیسکل صاحب سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ آیا علامہ اقبال نے کیمبرج سے بی اے کے بعد ، ایم اے کی ڈگری

۱۔ یعنی ۱۹۷۶ء میں ۔

DR PHILIP GASKELL
TUTOR AND LIBRARIAN
CAMBRIDGE 38301

TRINITY COLLEGE
CAMBRIDGE
CB2 1TQ

17 February 1977

Dr S. A. Durrani,
Department of Physics,
Chancellor's Court,
The University of Birmingham,
P.O. Box 363,
Birmingham B15 2TT.

Dear Dr Durrani,

Thank you for your letter of 14 February (ref. 113/SAD/JMM) about Shaikh Muhammad Iqbal.

I enclose a xerox copy of Iqbal's entry in the College Admissions Book. His tutor was Adam Sedgwick, Professor of Zoology (1854-1913); the Dictionary of National Biography and Who was Who both give details of Sedgwick's career.

The Registry confirms that Iqbal was admitted as an Advanced Student and that he submitted a dissertation (apparently on a Moral Sciences topic) which was approved for the B.A. degree, by special dispensation, on 7 March 1907. He took that degree on 13 June the same year, but never took the M.A. Regulations for the Ph.D. degree were only approved in May 1920 and the first candidate presented himself in 1921.

I am sorry not to be able to be more helpful, but unfortunately we have no other information about Iqbal's time at Trinity.

Yours sincerely,

Philip Gaskell

مصنف کے نام ٹرنٹی کالج کیمبرج کے لائبریرین جناب ڈاکٹر فلپ گیسکل کے خط مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۷۷ء کا عکس

بھی لی ؟ (جو بی اے سے چند سال بعد عموماً بغیر کسی مزید امتحان کے لیے بس مقررہ فیس ادا کرنے پر مل جاتی ہے) اور یہ کہ انھوں نے کیمبرج سے پی ایچ ڈی حاصل کرنے کے بجائے میونخ کو کیوں ترجیح دی ؟

ان سوالات کے جواب میں ڈاکٹر گیسکل نے مجھے ایک معلوماتی خط تحریر کیا ، جو اس گتھی کے سلجھانے میں مددگار ہے - وہ لکھتی ہیں : "رجسٹرار سے دریافت کرنے پر اس بات کی تصدیق ہوئی ہے کہ شیخ محمد اقبال کو بطور Advanced Student کے داخلہ ملا تھا اور انھوں نے بی اے کی ڈگری کے لیے ایک مقالہ dissertation پیش کیا ، (یعنی امتحان کے ذریعے نہیں) جو غالباً Moral Sciences یعنی اخلاقیات کے کسی موضوع پر تھا - یہ مقالہ یونیورسٹی کی خاص اجازت سے ۷ مارچ ۱۹۰۷ء کو پیش کیا گیا ، اور انھیں اسی سال ۱۳ جون کو بی اے کی ڈگری ملی - انھوں نے ایم اے کی ڈگری حاصل نہیں کی تھی - کیمبرج یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے قواعد (Regulations) مئی ۱۹۲۰ء میں منظور و مرتب ہوئے ، اور سب سے پہلے جس طالب علم نے یہ ڈگری حاصل کی ، وہ ۱۹۲۱ء میں پیش ہوا"-

گویا یہی مقالہ (dissertation) جو علامہ نے کیمبرج میں لکھا تھا ، اس پر مزید کچھ کام کرنے کے بعد ، کوئی پانچ مہینے کے وقفے سے انھوں نے ۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی بھی حاصل کر لی (ورنہ جرمنی سے از سر نو پی ایچ ڈی حاصل کرنے میں عموماً تین چار سال لگ جاتے ہیں) -

کیمبرج یونیورسٹی سے استفسارات کے علاوہ میں نے ایک خط لنکنز ان (Lincoln's Inn) کے لائبریرین صاحب کو بھی اس موضوع پر لکھ دیا تھا (یاد رہے کہ قائد اعظم نے بھی اس قانونی ادارے سے بیرسٹری کی ڈگری لی تھی) - وہاں کے لائبریرین جناب واکر صاحب (Mr. Roderick Walker) نے ۲۲ فروری ۱۹۷۷ء کو اس کے جواب میں اپنی درس گاہ کے رجسٹر داخلہ اور Bar Book (اسناد کے عطا کی کتاب) سے دو اندراجات کی فوٹو کاپیاں مجھے روانہ کیں - واکر صاحب نے میرے نام خط میں لکھا : "مجھے امید ہے کہ یہ اطلاع مزید شکوک کے پیدا کرنے کا باعث نہ ہوگی -" لنکنز ان کے رجسٹر داخلہ میں نمبر ۹۶ کے سامنے جو اندراج ہے ، اس کے ایک حصے کا ترجمہ یوں ہے : "شیخ محمد اقبال ; از ٹرنٹی کالج کیمبرج ، جن کی عمر ۲۹ سال ہے - اور جو شیخ میر محمد (یہاں "میر محمد" ہی درج ہے ، اس لفظ کا انگریزی املا نور محمد سے بہت مشابہ ہے) کے دوسرے صاحبزادے ہیں - باشندہ سیالکوٹ (اس کے ہجے Sealkot درج ہیں) پنجاب ، انڈیا - پیشہ مرد شریف (Gentleman) - اس سوسائٹی (یعنی Honourable Society of Lincoln's Inn) میں بتاریخ ۶ نومبر ۱۹۰۵ء شریک ہوئے -"

لنکنز ان کا دوسرا اندراج ٹرنٹی یعنی موسم گرما کی ٹرم (Trinity term) برائے ۱۹۰۸ء کا ہے ، جس کے مطابق علامہ اقبال نے یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی - اس سند پر ان کے دستخط رول نمبر ۵۲ پر ثبت دیکھے جا سکتے ہیں -

* کیمبرج اور لندن کی ان دو دستاویزوں سے علامہ اقبال کی تاریخ پیدایش پر مزید روشنی پڑتی ہے - کیمبرج یونیورسٹی میں انھوں نے اپنی تاریخ ولادت محرم ۱۸۷۶ء درج کی ہے - لنکنز ان کا اندراج ۶ نومبر ۱۹۰۵ء کا ہے جبکہ وہ ۲۹ برس کے تھے - ۱۹۰۵ء سے ۲۹ تفریق کرنے سے یہ سال بھی ۱۸۷۶ء بنتا ہے - اس کے برعکس اگر میونخ یونیورسٹی کے رجسٹر میں درج شدہ تاریخ پیدایش کو صحیح تسلیم کیا جائے ، تو ۶ نومبر ۱۹۰۵ء کو علامہ کی عمر صرف ۲۷ برس بنتی ہے - چنانچہ انگلستان کے دونوں اندراجات کے مطابق ان کی تاریخ پیدایش ۱۸۷۶ء قرار پاتی ہے ، جو جرمنی میں مندرجہ تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی -

کیمبرج کے رجسٹر میں علامہ نے جو تاریخ درج کی ہے ، اس کے ماہ و سال میں ہم آہنگی نہیں ہے - یعنی مہینہ ہجری اور سال عیسوی دیا ہے -

اسی طرح میونخ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے مقالے میں بقول پروفیسر شمل ، علامہ نے اپنی تاریخ پیدایش "۲ ذی قعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء" لکھی ہے ، اور پروفیسر اینماری شمل (Prof. Annemarie Schimmel) اپنی کتاب Gabriel's Wing مطبوعہ ۱۹۶۳ء میں لکھتی ہیں کہ یہاں علامہ اقبال سے غلطی ہوئی ہے ، کیونکہ سنہ ۱۲۹۴ ہجری کا آغاز ہی جنوری ۱۸۷۷ء میں ہوا ، چنانچہ ذی قعد ۱۲۹۴ ، نومبر ۱۸۷۷ء میں پڑتا ہے -

میرے چھوٹے بھائی جناب کے - زیڈ - درانی نے پالیکورٹ کی پچھلی صدی کی جنتری نکلوا کر تاریخوں کا مقابلہ کیا اور بتایا کہ وہاں مندرجہ ذیل اندراجات ہیں :

یکم جنوری ۱۸۷۶ء ، ۳ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ

یکم جنوری ۱۸۷۷ء ، ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ

یکم جنوری ۱۸۷۸ء ، ۲۶ ذی الحجہ ۱۲۹۴ھ -

ان تاریخوں کے مطابق "محرم ۱۸۷۶ء" ۲۶ یا ۲۷ جنوری ۱۸۷۶ء سے لے کر ۲۳ تا ۲۹ فروری ۱۸۷۶ء جاری رہا - ۲ ذی قعد ۱۲۹۴ھ میرے حساب کے مطابق ، ۷ یا ۸ نومبر ۱۸۷۷ء کو پڑتا ہے - فقیر سید وحیدالدین صاحب "روزگار فقیر" میں علامہ کے تحقیقی مقالے "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء" کے دیباچے کے حوالے سے ان کی خود نوشت تاریخ پیدایش "۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۶ء)" لکھتے ہیں ، اس لحاظ سے ۳ ذی قعد ۱۲۹۴ھ کا ۹ نومبر ۱۸۷۷ء (نہ کہ ۱۸۷۶ء) کو ہونا قرین قیاس ہے -

اب اس مسئلے میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ خود علامہ اقبال نے مختلف جگہوں پر مختلف تاریخیں درج کی ہیں ، تو ہم ان کی دی ہوئی ہجری تاریخوں کو صحیح مانیں یا عیسوی تاریخوں کو ؟

میں نے اس بارے میں ڈاکٹر محمد اجمل صاحب سے بات چیت کی ، جو حکومت پاکستان کے ایجوکیشن سیکرٹری ہونے کے علاوہ اس تحقیقاتی کمیٹی کے سربراہ بھی رہ چکے ہیں ، جس نے چند سال ہوئے علامہ اقبال کے سال پیدایش کی جانچ پڑتال کی تھی - انھوں نے فرمایا کہ ان کی کمیٹی نے ملک کے مختلف اداروں کے رجسٹروں میں علامہ کی تاریخ پیدایش کا جائزہ لیا تھا ، جن میں سیالکوٹ کی میونسپل کمیٹی کا رجسٹر ، گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی اور شاید ہائی کورٹ کے رجسٹر بھی شامل ہیں - انھوں نے کہا کہ ان میں جہاں بھی عیسوی تاریخ پیدایش درج تھی ، وہ بے شک ۱۸۷۶ء

ہی تھی، لیکن آخری فیصلہ علامہ کے جرمنی والے تحقیقی مقالے میں دی گئی ہجری تاریخ ہی پر منحصر تھا، کیونکہ علامہ اقبال نے کہیں بھی مختلف ہجری تاریخ تحریر نہیں کی۔

اس سے پیشتر لندن کے پاکستانی سفارت خانے کے تعلیمی اتاشی، پروفیسر نذیر احمد صاحب نے بھی مجھ سے یہی بات کہی تھی۔ وہ بھی حکومت کی اس تحقیقاتی کمیٹی کے رکن رہ چکے ہیں۔ جب یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ خود حضرت علامہ نے کیمبرج اور میونخ میں دو مختلف ہجری تاریخیں درج کی ہیں (یعنی ذی قعد اور محرم) تو ڈاکٹر اجمل صاحب کا استدلال صحیح نہیں رہتا، اور یہی اس قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سالِ پیدائش ۱۸۷۶ء ہی ہوگا۔ یاد رہے کہ میونخ میں درج شدہ ہجری تاریخ کے ساتھ ہی علامہ نے اس وقت بھی عیسوی سنہ ۱۸۷۶ء ہی لکھا ہے۔ یعنی اگر ایک تاریخ غلط ہے تو وہ غلطی غالباً ہجری سال ہی میں ہے اور سہو حافظہ سے علامہ نے ۱۲۹۳ھ کے بجائے ۱۲۹۴ھ لکھ دیا (کیونکہ ۱۲۹۴ھ اور ۱۸۷۶ء دونوں بیک وقت صحیح نہیں ہوسکتے)۔

علامہ کی صحیح سنہ پیدائش ۱۸۷۶ء کے ہونے کا ایک اور ثبوت فقیر سید وحید الدین صاحب کی کتاب ''روزگار فقیر'' سے بھی ملتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب ۱۹۳۱ء میں (دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے) انھوں نے انٹرنیشنل پاسپورٹ کے لیے درخواست دی، تو اس میں بھی اپنا سالِ پیدائش ۱۸۷۶ء ہی درج کیا۔ فقیر صاحب نے اپنی کتاب میں اس پاسپورٹ کی عکسی نقل بھی شائع کی ہے۔ وہاں تاریخ پیدائش صرف ۱۸۷۶ء درج ہے، مہینہ نہیں دیا گیا۔ بر سبیلِ تذکرہ یہاں یہ کہنا شاید مناسب ہو کہ سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش میں ۱۸۷۳ء کو شیخ نور محمد صاحب (عرف شیخ نتھو) کے یہاں ایک لڑکے کی پیدائش کا جو اندراج ملتا ہے، وہ فقیر وحید الدین صاحب کے خیال میں کسی ایسے لڑکے سے متعلق ہے جو علامہ اقبال کی پیدائش سے چند برس قبل پیدا ہو کر شیرخواری کی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔ اس کمیٹی کے رجسٹر میں ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں شیخ نور محمد صاحب کے یہاں کسی اور لڑکے کی پیدائش درج نہیں ہے، لیکن پچھلے ماہ جب میں نے اپنے والد صاحب سے (جو ریٹائرڈ سیشن جج ہیں)، اس بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جہاں تک انھیں یاد پڑتا ہے، گورنمنٹ آف انڈیا کا Births and Deaths Registration Act ۱۸۸۶ء کے لگ بھگ پاس ہوا تھا، چنانچہ اس سے پیشتر پیدائش کا اندراج لازمی نہیں تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لنکنز ان کے رجسٹر میں شیخ محمد اقبال کو اپنے والد کا دوسرا بیٹا ظاہر کیا گیا ہے، جو اس امر سے اتفاق رکھتا ہے کہ علامہ کے صرف ایک بڑے بھائی اس وقت زندہ تھے، یعنی شیخ عطا محمد صاحب جو ۱۹۴۰ء میں فوت ہوئے۔

میں اپنی تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ علامہ اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش یقیناً ۱۸۷۶ء ہی تھی، اور وہ محرم ۱۲۹۳ء یعنی جنوری فروری ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس تاریخ سے صرف ان کی میونخ یونیورسٹی کے تحقیقاتی مقالے والی ہجری تاریخ ولادت ہی اختلاف رکھتی ہے، لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے وہاں بھی سنہ عیسوی ۱۸۷۶ء ہی درج ہے۔ مزید برآں اس میں درج شدہ ہجری سنہ (۱۲۹۴ھ) اس لیے بھی مشکوک ہے کہ وہ ان کے بیان کردہ عیسوی سنہ (۱۸۷۶ء) سے مطابقت نہیں رکھتا۔

میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ ٹرنٹی کالج کیمبرج میں درج شدہ تاریخ (محرم ۱۸۷۶ء) سب سے زیادہ قابل یقین ہے۔ اگر اسے صحیح تسلیم کی جائے تو ایک دلچسپ اور اہم بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانان ہند کے لیے یہ سال (۱۸۷۶ء) ایک بے حد مبارک سال تھا، کیونکہ اس کے آغاز میں علامہ اقبال پیدا ہوئے اور اس کے آخر میں قائد اعظم۔ عالم اسلام کے دو مایہ ناز ستارے اسی مبارک سنہ میں ظہور پذیر ہوئے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ جس برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے، اسے کیا معلوم تھا کہ اس سال کے دوران میں پیدا ہونے والے ایک برہمن زادے کے پیش کردہ تصور کی بنیاد پر ہندوستان کے ایک حصے میں، ایک عظیم الشان اسلامی مملکت وجود میں آئے گی۔

آخر میں، میں صرف یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگرچہ حکومت پاکستان کے فیصلے کے مطابق ہم نے ۱۹۷۷ء میں شاعر مشرق کا صد سالہ جشن ولادت منایا، مگر اس سے حکیم الامت کے کارناموں اور ان سے ہماری عقیدت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بقول شیکسپیئر گلاب کو کسی نام سے بھی پکارا جائے، اس کی خوشبو ویسی ہی عطر بیز رہتی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال خواہ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے ہوں، یا ۱۸۷۷ء میں، اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے قومی اعمال و کردار ان کے شایان شان ہیں یا نہیں؟ شاعرِ مشرق ہی کہہ گئے ہیں:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اب کیا معلوم کہ ہماری ہدایت کے لیے ایک ملت تک ''دگر دانائے راز آید کہ ناید''۔ ہم سب کی دعا اور کوشش یہی ہونی چاہیے کہ علامہ اقبال کی دو صد سالہ برسی جب منائی جا رہی ہو، تو ان کا تخلیق کیا ہوا ملک پاکستان اور ان کی جگائی ہوئی ملت اسلامیہ ترقی اور شوکت کی شاہراہ پر آج سے کئی ہزار فرسنگ آگے نکل چکی ہو۔ ❁

(جنگ، لندن - ۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء)

حضرت علامہ اقبال کا سفر یورپ

روما سے لیکچروں کی دعوت

حضرت علامہ اقبال گول میز کانفرنس کے سلسلے میں انگلستان جا رہے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل حضرت علامہ کو روما سے ایک دعوت نامہ پہنچا تھا، جو والرلیس کے شہرۂ آفاق موجد مارکونی نے (Learned Men's Academy of Rome) یعنی روم کے حلقۂ اہل علم کے ممبر کی حیثیت سے بھیجا تھا اور حضرت علامہ سے درخواست کی تھی کہ آپ بعض اہم اسلامی مضامین پر لیکچر دیں۔ معلوم ہوا ہے کہ حضرت علامہ نے دعوت قبول فرما لی ہے، لیکن لیکچروں کی تاریخ کا ابھی تعین نہیں ہوا، اس لیے کہ یہ امر گول میز کانفرنس کے کام سے فرصت ملنے پر موقوف ہے۔

محمدؐ اقبال اور جرمنی

نامہ و پیام دل کا

حرفِ آغاز از مترجم

(یہ مقالہ اُس تقریر کا متن ہے جو جناب ہوبوہم صاحب[1] نے "لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز"[2] میں ۵ مئی ۱۹۸۲ء کو منعقد ہونے والے 'یوم اقبال' کے موقع پر فرمائی تھی۔ اس موضوع کی طرف میں نے مدیر "افکار" کے نام ایک خط میں اشارہ کیا تھا۔ (دیکھیے "افکار" کراچی برائے مارچ ۱۹۸۲ء)۔ اس یوم اقبال پر مجھے بھی تقریر کی دعوت دی گئی تھی، لیکن بدقسمتی سے میں پاکستان کے سفر کی وجہ سے اس تقریب میں شامل نہ ہوسکا۔ اس مضمون کے مصنف جناب ہوبوہم صاحب ایک جرمن نومسلم ہیں، جو الالوی سفارت خانہ لندن میں نائب اتاشی برائے تجارت ہیں۔ وہ کئی سال تک 'پاک جرمن فورم' واقع کراچی کے معتمدِ عمومی رہ چکے ہیں (وسط عشرۂ ۱۹۵۰ء سے وسط عشرہ ۱۹۶۰ء تک) وہ ۱۹۲۶ء میں جرمنی میں Braunschweig (برنزوک) کے مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ اور تقریباً ۱۵ سال کی عمر میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اُن کی مرحومہ بیوی پاکستانی تھیں جو علامہ اقبال کے دوست مولوی انشاء اللہ ایڈیٹر 'وطن' اخبار کی پوتی اور جناب شیخ عظیم اللہ کی صاحبزادی تھیں۔ جناب ہوبوہم کو اسلام اور علامہ اقبال کے ساتھ والہانہ عقیدت ہے۔ مجھے بھی ہوبوہم صاحب کے ساتھ شرف نیاز حاصل ہے۔ اور اس مقالے کے ترجمے کی اشاعت اُن کی اجازت کے ساتھ کی جارہی ہے۔ دُرانی)

یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ شاعر و حکیم محمد اقبال کے دل میں جرمنی کے ملک، اس کے مفکروں اور اس کے شاعروں کے لیے بڑے تحسین آمیز جذبات تھے۔ ایسی بے شمار مثالیں اُن کی نگارشات، ان کی شاعری، اُن کے خطوط، اور اُن کے ساتھ گفتگو کے ریکارڈ میں پائی جاتی ہیں جن سے صاف پتا چلتا ہے کہ جرمن حکماء و شعراء کی تصنیفات سے انھوں نے بہت اکتسابِ فیض کیا تھا۔

ان میں اوّلیت کا شرف گوئٹے کو حاصل ہے جس کی طرف وہ بار بار اشارہ کرتے ہیں، اور جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "نیست پیغمبر، ولے دارد کتاب" یعنی فاؤسٹ (Faust)۔ وہ گوئٹے کا غالب کے ساتھ بھی مقابلہ کرتے ہیں، جو انیسویں صدی عیسوی کا ایک عظیم شاعرِ فارسی و اردو ہے، اور مولانا جلال الدین رومی کے ساتھ بھی، جو ایک تابناک حکیمِ مشرق تھے۔ "پیام مشرق" کی ایک نظم میں اقبال، گوئٹے اور رومی کی جنت الفردوس میں ایک متخیلہ ملاقات کا نقشہ کھینچتے ہیں[۲] جہاں گوئٹے انھیں فاؤسٹ پڑھ کر سناتا ہے۔ پیرِ رومی غور سے سنتے ہیں، اور یہ کہہ کر گوئٹے کی تعریف کرتے ہیں کہ اُس نے سّرِ اعظم صحیح معنوں میں سمجھ لیا ہے۔

یوں گوئٹے اور رومی کو روبرو لا کر اقبال نے نہ صرف مشرق و مغرب کی دو عظیم ترین روحوں کو یکجا کیا ہے، بلکہ ایسے دو شخصوں کو بھی جنھوں نے اقبال کی حیاتِ فکر و شعر پر کسی بھی اور انسان کی نسبت زیادہ اثر ڈالا ہے۔

اور یہ بات ہمیں کس نے بتائی ہے؟ خود اقبال نے! چنانچہ پیامِ مشرق کے دیباچے میں (اور یہ وہ کتاب ہے جس میں اقبال کا ہنر غالباً اپنی عظیم ترین بلندیوں اور کمالِ فن کو چھو لیتا ہے)۔

> "پیام مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن حکیمِ حیات گوئٹے کا مغربی دیوان ہے۔ جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے: 'یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے ۔۔۔۔ اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

"پیام مشرق" اقبال کی طرف سے گوئٹے کے دیوانِ مشرق و مغرب (Westöstlicher Divan) کا جواب ہے۔ اور یاد رہے کہ یہ دو دیوان

---

1. Herr Muhammad Amanullah Herbert-Hobohm.
2. School of Oriental and African Studies ("SOAS"), London.

۱ و ۲۔ پیام مشرق میں "جلال و گوئٹے" کے عنوان سے اقبال کہتے ہیں:

> "نکتہ دانِ المنی را در ارم
> صحبتے افتاد با پیرِ عجم
> شاعرے، کو ہمچو آں عالی جناب
> نیست پیغمبر، ولے دارد کتاب
> خواند بر دانائے اسرارِ قدیم
> قصۂ پیمانِ ابلیس و حکیم
> گفت رومی، اے سخن را جاں نگار
> تو ملک صید استی و یزداں شکار
> فکرِ تو در کنجِ دل خلوت گزید
> ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید
> سوز و سازِ جاں بہ پیکر دیدہ
> در صدف تعمیرِ گوہر دیدہ
> ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست
> ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست
> "داند آں کو نیک بخت و محرم است
> زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است" (رومی)۔"

ہے جس کے صفحۂ اول پر گوئٹے نے خود اپنے ہاتھ سے عربی زبان اور رسم الخط میں یوں تحریر کیا ہے۔ ''الدیوان الشرقی للمولف الغربی''۔

اقبال کے دیباچہ پیام مشرق میں الالنوی ادبیات کی تاریخ کی ''تحریک مشرق'' کے بڑے دلچسپ حالات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس دیباچے میں ہمیں جرمن تمدن کے ساتھ اقبال کی وسیع واقفیت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اسی طرح اقبال کی فلسفیانہ تحریروں، مثلاً ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامی'' پر چھ خطبات سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ الالنوی فکر سے اقبال کو کس قدر آگاہی تھی، اور اس کے لیے اُن کے دل میں کس قدر گہرا احساس قدر و منزلت تھا۔ باوصف اس کے کہ انہیں بسا اوقات الالنوی مفکرین، مثلاً نطشے سے اختلاف رائے رہا تھا۔

علامہ کے صاحبزادے جناب جسٹس جاوید اقبال اپنے ایک مضمون ''اقبال اور نطشے'' میں لکھتے ہیں[1] کہ:

> ''اگرچہ اقبال نطشے کو بہت سراہتے تھے اور ان دونوں کے درمیان کئی اقدار مشترک بھی ہیں۔ تاہم ان کے درمیان بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یعنی ان کے جذبات محرکہ، اور زندگی کے بارے میں ان کے نظریے اور وجدان کی بنیاد — تصور یزداں''

اقبال کے ایک نہایت قریبی رفیق، سید نذیر نیازی، جنہوں نے اقبال سے تفصیلی گفتگوئیں کیں (جو وہ وقتاً فوقتاً قلمبند بھی کرتے رہتے تھے)، اُن کا ایک مضمون ''اقبال کے ساتھ گفتگوئیں'' بھی اقبال کی الالنوی تمدن اور تخیل میں گہری دلچسپی سے متعلق اطلاعات کا ایک مخزن ہے۔ ایک مرتبہ پھر گوئٹے ہی ان گفتگوؤں میں خاص طور سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''زندگی کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ غالباً ایسے افراد ہیں جو اس کی غایت منتہیٰ کا ادراک رکھتے ہیں۔ گوئٹے ایک ایسا انسان تھا، اور اقبال بھی۔ اور یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے ہماری توجہ گوئٹے کی طرف منعطف کی۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک بہت قابل ذکر واقعہ ہے کہ اقبال وہ واحد شخص تھے جنہوں نے انگریزی ادب اور تمدن کے اُن تمام تر اثرات کی مقاومت کی جو سیاسی بالا دستی کی وجہ سے ہمارے معاشرے پر چھائے ہوئے تھے۔ فی الواقعی ہم نے گوئٹے کو قبول کر لیا، بجائے شیکسپیئر کے۔ شیکسپیئر کی ہم سب قدر کرتے ہیں، لیکن گوئٹے ہم کو محبوب ہے۔ شیکسپیئر ایک منفرد ہنرمند ہے، جس کو ہم سب مانتے ہیں۔ لیکن گوئٹے ہمیں میں سے ایک ہے۔ اور اس نے ہمارے دلوں میں جگہ پا لی ہے''

اگر ہم اس نکتے کو ذہن میں رکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مرد کامل یا خلیفۃ اللہ یا مومن، اور اس کے کردار و عمل کی جھلک (اقبال کے تصور کے مطابق) ہمیں گوئٹے کی فکری تخلیق فاؤسٹ میں نظر آتی ہے، نہ کہ نطشے کے مرد برتر یا فوق البشر (Superman) میں۔

وہ ماخذ جہاں سے ہم اقبال کے جرمنی کے ساتھ روابط و تعلقات کا پتا چلا سکتے ہیں، اور اُن کی وہ نگارشات جن میں وہ الالنوی حکماء اور شعراء کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، متعدد اور متفرق ہیں۔

یہ امر میرے لیے باعث افتخار ہے کہ آج میں پہلی مرتبہ عامۃ الناس کو اقبال کے ایک ایسے مجموعۂ خطوط کے بارے میں اطلاع بہم پہنچا رہا ہوں جس میں میرے ملک جرمنی کے ساتھ اُن کے تعلقات، اور اس کے بارے میں اُن کے احساسات، پر بڑی صاف روشنی پڑتی ہے۔ اور یوں میں ان ماخذ میں اضافہ کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ یہ اقبال کے وہ خط اور پوسٹ کارڈ ہیں جو انہوں نے ہائیڈل برگ میں اپنی جرمن زبان کی استانی، مس ایما ویگیناسٹ (Miss Emma Wegenast) کے نام تحریر کیے تھے۔ یہ وہ مواد ہے جس کی فوٹو کاپیاں، اور بعض خطوط کے اصل مسودے، میرے قبضے میں ہیں۔

یہ وہ مجموعہ ہے جو ان خطوط کی مکتوب الیہا مس ویگیناسٹ نے اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے، یعنی ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں، پاکستان۔ جرمن فورم کو بطور تحفہ عطا کیا تھا۔ یہ تنظیم دونوں ممالک کے درمیان ثقافتی تعلقات کی ایک انجمن تھی، جس کے صدر اُس وقت جناب ممتاز حسن مرحوم تھے، اور جس کے معتمد عمومی ہونے کا شرف مجھے حاصل تھا۔ چونکہ پاکستان۔ جرمن فورم ایک ایسا ادارہ تھا جس کا مطمح نظر جب بھی اور اب بھی ان دو ملکوں کے ثقافتی روابط کو بڑھانا اور مضبوط کرنا ہے۔ اس لیے یہ تنظیم اس امر سے بخوبی آگاہ تھی کہ محمد اقبال ایک ایسی شخصیت ہیں جو جرمنی اور پاکستان کے مابین ثقافتی تعلقات کی سب سے اہم کڑی ہیں۔ چنانچہ یہ قدرتی بات ہے کہ جب جناب ممتاز حسن اور اس خاکسار کو موسم گرما ۱۹۵۹ء میں جرمنی جانے کی دعوت ملی تو ہم نے نہ صرف اُن شہروں اور یونیورسٹیوں، یعنی ہائیڈل برگ اور میونک، کی زیارت کرنے کی ٹھانی، جہاں اقبال ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں[1] ٹھہرے اور زیر تعلیم رہے تھے، بلکہ ہم نے اس بات کی سر توڑ کوشش کی

۱۔ دیکھیے کتاب Mohammed Iqbal, Poet and Philosopher (شائع کردہ Pakistan-German Forum, Karachi, 1960) میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا مضمون: Iqbal and Neitzsche۔ (نوٹ از مترجم)

۱۔ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ علامہ اقبال جرمنی صرف ۱۹۰۷ء میں گئے تھے۔ قریب ۲۰ جولائی تا ۵ نومبر ۱۹۰۷ء۔ ہاں پروفیسر صاحب نے مجھے ایک ملاقات میں یہ بتایا تھا کہ ۱۹۳۱ء کے آخر میں، جب علامہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کے موقعے پر مس ویگیناسٹ کو خط لکھا تھا (۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء) کہ وہ اُس سے ملاقات کے خواہشمند ہیں اور روم اور برلن جانے سے پہلے یا بعد میں اُس سے مل سکتے ہیں، تو انہوں نے ہائیڈل برگ میں اپنے لیے ایک ہوٹل بھی بک کرا لیا تھا۔ لیکن بالآخر وہ وہاں گئے نہیں۔ اور نہ مس ویگیناسٹ سے اُن کی ملاقات ہو سکی۔ یہ خط انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ اور پروفیسر صاحب کے بیان میں خط آئے ۲ جنوری ۱۹۸۲ء کے روز بنات خود پڑھا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے، اپنے زمانۂ طالب علمی کے بعد علامہ اقبال کبھی دوبارہ جرمنی نہ جا سکے۔ جس کا انہیں ضرور ملال رہا ہوگا۔ (دراقی)۔

کہ تمام ایسے اشخاص کا کھوج لگایا جائے جو اقبال سے اُن کے زمانۂ قیامِ جرمنی میں مل چکے ہوں ، اور جو اب تک بقیدِ حیات ہوں ۔

چنانچہ یہ اسی تلاش کا نتیجہ تھا کہ دوستوں اور واقف کاروں کی مدد سے ہم مس ایما ویگیناسٹ کا پتا لگانے اور اُن سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ۔ ہاں مس ویگیناسٹ کی طرف ہماری توجہ علامہ اقبال پر عطیہ فیضی کی کتاب کی وجہ سے مبذول ہوئی تھی ۔

اگرچہ مس ویگیناسٹ کے ساتھ ہماری رو برو ملاقات نہ ہو سکی ۔ تاہم جناب ممتاز حسن اور مس ویگیناسٹ کے درمیان کچھ خط و کتابت رو بہ عمل ہوئی ۔ اور یہ اسی خط و کتابت کا نتیجہ تھا کہ مس ویگیناسٹ نے اقبال کی طرف سے اپنے نام موصول ہونے والے خطوط فوراً کے حوالے کر دیئے ۔ اور ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ انھیں کسی ایسے تاریخی حفاظت خانے (archive) تک پہنچا دیا جائے جہاں علامہ کی زندگی اور ان کے کام پر تحقیقات کرنے والے دانشور اُن سے بہرہ یاب ہو سکیں ۔ جناب ممتاز حسن نے بکمال تلطف اس مجموعے کی ایک مکمل نقل میرے لیے تیار کروائی ، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان میں سے دو خطوں کا اصل مسودہ بھی مجھے عطا کر دیا ۔ لیکن چونکہ اس مجموعۂ خطوط کے حصول کے جلد بعد ہی میرا پاکستان سے باہر تبادلہ ہو گیا ۔ اس لیے مجھے اس بات کا علم نہیں کہ یہ اصل خطوط اب کہاں ہیں ۔

لیکن اس سے پیشتر کہ ہم ان خطوط کا جائزہ لیں ، اگر مجھے اجازت ہو تو میں جرمنی کے اپنے اس دورے کی طرف ذرا دیر کے لیے پھر لوٹوں ۔ چونکہ اس سے ہمیں ایک اور پھل بھی حاصل ہوا ، اور وہ یہ کہ ہم ایک جرمن ادارے 'Inter Nationes' (بین الاقوام) کو ، جو مختلف قوموں کے درمیان ثقافتی تعلقات کی نشوونما کے لیے ۱۹۵۲ء میں بون (Bonn) میں قائم ہوا تھا ، اس پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ اقبال کے میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی حاصل کرنے کے لیے داخل کردہ تحقیقی مقالے (thesis) کے اصل مسودے کا سراغ لگائے اور 'فورم' کی خاطر اس کی نقول تیار کروائے ۔ یہ تھیسس دستیاب ہو گیا ، اور انتہائی ڈاکٹر رشارڈ مونِگ (Dr. Richard Monnig) کی مدد سے ، جو انٹر نیشیونیز (Inter Nationes) کے سربراہ (Director) تھے اور جنھوں نے علامہ اقبال میں بہ نفس نفیس گہری دلچسپی لی تھی ، اس مقالے کی تقریباً تیس نقلیں فوٹومیکینیکل[1] (Photomechanical) ذریعے سے حاصل کر لی گئیں ۔

تھیسس کے اصل متن سے پہلے اس میں اقبال کے کوائف حیات (Lebenslauf) ، جو غالباً انھوں نے خود ہی مرتب کیے ہوں گے ، اُن کے دستخط[2] کے ساتھ درج ہیں ۔ ان کوائف میں وہ اپنی تاریخ ولادت ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (اور اس کے ساتھ قوسین میں ۱۸۷۶ء) بیان کرتے ہیں ۔ اس تطابق کا حساب کرنے میں انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ غالباً وہی ہے جو جرمنی اور دوسرے ممالک کے مستشرقین عموماً استعمال کیا کرتے تھے ۔ اس کا کلیہ یوں ہے ۔

ہجری سال میں سے اُس کا تینتیسواں (۱/۳۳) حصہ نکال دیجیے ، اور پھر اس میں ۶۲۲ کے عدد جمع کر دیجیے ۔ اس کا نتیجہ سال عیسوی ہوگا[1] ۔

یہ تحقیقی مقالہ اقبال کے نگرانِ تحقیق ، یا (جیسا کہ جرمنی میں انھیں کہا جاتا ہے) "ڈاکٹر باوا" (Doctor-father) یعنی پروفیسر ڈاکٹر فریڈرش ہومّل (Professor Dr. Friedrich Hommel) کی منظوری سے لڈوگ میکسیملین یونیورسٹی Ludwig Maximilian Universität کے شعبۂ فلسفہ ، سیکشن اول (و دوم) میں داخل کیا گیا ۔ یہ ۱۹۰۸ء میں لندن سے لوزاک اینڈ کمپنی[2] (Luzac & Co) کی طرف سے شائع کیا گیا ، اور ای ۔ جے ۔ برِل (E. J Brill) کے چھاپہ خانہ واقع لائیڈن (Leiden) ، ہالینڈ ، میں چھپا تھا ۔ میں یہاں اس بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب اقبال نے میونک سے ڈگری حاصل کی اُس زمانے میں یہ امر جرمن یونیورسٹیوں میں عام طور سے مروج ، بلکہ مستلزم تھا ، کہ پی ایچ ڈی تھیسس طبع شدہ شکل میں داخل کیا جائے ، اور نہ اس "افتتاحی مقالے" Inaugural dissertation (جیسا کہ جرمنی میں وہ کہلاتے ہیں) کی ایک مقرر شدہ (خاصی بڑی) تعداد بہم پہنچائی جائے تاکہ یہ ملک و بیرون ملک کے اہم کتب خانوں (libraries) اور سلسلہ ہائے مراکزِ تحقیق کے درمیان تقسیم کیا جا سکے ۔

لیکن اب میں پھر اُن خطوط کی طرف لوٹتا ہوں ۔ یہ دو پوسٹ کارڈوں کو ملا کر تعداد میں کل ۲۷ ہیں ۔ یہ خطوط دو بالکل جدا زمانوں کا احاطہ کرتے ہیں ۔ یعنی ۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۱۳ء میں پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک ، اور پھر ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک کے عرصے کا ۔ ان دو زمانوں کے درمیان کی طویل خاموشی صرف ایک مرتبہ ٹوٹی ہے ، اور ۱۹۱۹ء میں لکھے گئے ایک خط کے ذریعے ۔

اس بات کا خاصا امکان ہے کہ ایک بر اعظم سے دوسرے تک میں نے جو کئی ایک سفر کیے ، اُن کے درمیان میری چند فوٹو کاپیاں گم ہو گئی ہوں ۔ اور اصل مجموعہ میرے پاس محفوظ تعداد سے زیادہ ہو[3] ۔ مجھے کچھ ہلکی سی یاد یوں آتی ہے کہ کل ملا کر چالیس خطوط تھے اور اس کے علاوہ کچھ تصویریں بھی تھیں ۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ۔ جس شخص کے نام یہ سب خطوط تحریر کیے گئے تھے ، وہ مس ایما ویگیناسٹ ہیں ۔ یہ ہائیڈل برگ کی "شیرر منزل" (Pension Scherer) میں اقبال کی جرمن زبان کی ٹیوٹر تھیں ۔ اس قسم کے بڑے معزز مہمان خانے جو طالب علموں کے لیے مخصوص تھے اُس زمانے میں جرمنی کے

۱۔ عکسی نقل ۔

۲۔ دراصل ، نام نہ کہ دستخط ۔ (مترجم)

۱۔ یہ ایک اندازاً سا طریقۂ استخراج ہے ۔ اور اس سے عموماً ایک سال آگے پیچھے کا فرق پڑ جاتا ہے ۔ مثلاً ۶۲۲ + (۱۲۹۴/۳۳) − ۱۲۹۴ = ۱۸۷۷ = ۶۲۲ + ۳۹ − ۱۲۹۴ یعنی اگر یہ کلیہ استعمال کیا جاتا تو اقبال کو چاہیے تھا کہ وہ یا تو ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء لکھتے ، یا ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء لکھتے ۔ دیکھیے اس کتاب کے پہلے مضمون ۔ (مترجم)

۲۔ لوزاک اینڈ کمپنی کا کتب خانہ اب بھی لندن یونیورسٹی کے نزدیک برٹش میوزیم کے سامنے واقع ہے ۔ (مترجم)

۳۔ خوش قسمتی سے یہ بات غالباً صحیح نہیں ہے اور کم از کم ۱۹۶۶ء میں بھی ان خطوط کی تعداد ۲۷ ہی تھی ۔ تفصیلات کتاب کے دیباچے میں ملاحظہ کیجیے ۔ (عرفی ۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۵ء)

یونیورسٹی شہروں میں بہت مقبول تھے - جب کہ طلبہ کے لیے بلند و بالا ہوسٹلوں کا رواج ابھی نہ پڑا تھا - ۱

"شیرو منزل" - یا جیسا کہ اقبال ایک خط میں اس کو پکارتے ہیں ، "پالیڈل برگ اسکول" - بظاہر زیادہ تر غیر ملکی طلبہ کے لیے مخصوص مہمان خانہ تھا - اور یہ بات وہاں زبان سکھلانے کے اہتمام کی توجیہہ کرتی ہے - جب اقبال مس ویگے ناست سے ملے ہیں تو اس وقت موصوفہ کی عمر بیس اور تیس سال کے درمیان تھی — اور یہ بات ہمیں خود بیگم عطیہ فیضی کے بیان سے معلوم ہوتی ہے کہ مس ویگیناسٹ ایک بڑی خوش شکل ، مہذب اور باسلیقہ نوجوان خاتون تھیں -

اقبال ان کے بڑے گرویدہ تھے - اور اس بات میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں - لیکن خطوط سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ گرویدگی بالکل پاک اور معصوم تھی - میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اقبال کی نظروں میں مس ویگیناسٹ اُن تمام اشیاء کی نمائندگی کرتی تھیں جن کو وہ جرمنی میں محبوب اور قابل تعظیم سمجھتے تھے - اور جو انھیں جرمنی کے تمدن ، اس کے فکر ، اس کے ادب اور شاید اس کے تمام طرزِ معاشرت میں اس قدر پُرکشش معلوم ہوتی تھیں -

اپنی تمام خط و کتابت میں اقبال انھیں بڑے رسمی طرزِ تخاطب سے 'Mein liebes Fräulein Wegenast' [۱] یعنی ویگیناسٹ" کہہ کر پکارتے ہیں ، اور صرف ایک لفظ "میری عزیز مس "میری" اُن کے لیے اقبال کی گرویدگی کی طرف اشارہ کرتا ہے - لیکن اس پسندیدگی میں ادب بھی ملحوظ ہے - اور یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جرمن زبان میں لکھے گئے تمام خطوط جو اُس پہلے زمانے میں تحریر کیے گئے تھے جب اقبال کے دل میں مس ویگیناسٹ کی یادیں ابھی بڑی تازہ تھیں اور اُن کے بارے میں اقبال کے احساسات شدید ترین تھے - وہ بالالتزام انہیں پُر ادب لقب "Sie" یعنی "آپ" کہہ کر پکارتے ہیں - اور ایک مرتبہ بھی بے تکلف "Du" یعنی "تم" کا لفظ استعمال نہیں کرتے -

ان خطوط سے کسی سنسنی خیز بات کا انکشاف نہیں ہوتا - یہ خاصے معمولی سے خطوط ہیں ، جیسا کہ دو دوست ایک دوسرے کو لکھتے ہیں - ان میں کسی گہری فکر یا شاعری کا وجود نہیں ہے - لیکن اس کے باوصف یہ خطوط اقبال کے بارے میں چند ایسے سوالات کا جواب دیتے ہیں جو اب تک حل نہ ہوئے تھے - اور ان سے میرے ملک [جرمنی] کے بارے میں اقبال کے احساسات پر مزید روشنی پڑتی ہے -

سب سے پہلا سوال جس کا جواب ان خطوط سے ملتا ہے وہ ہے جو سید نذیر نیازی ، اقبال کے ساتھ اپنی گفتگوؤں سے متعلق ایک مضمون میں ، اٹھاتے ہیں[۲] - یعنی جب وہ یوں لکھتے ہیں کہ

"مجھے ہمیشہ اس بات کے متعلق اچنبھا رہا ہے کہ اقبال نے جرمن زبان کا کہاں تک مطالعہ کیا تھا - - - - میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ انھوں نے جرمن ادب کا اصل زبان میں کافی گہرا اور دقیق مطالعہ کیا تھا - اور وہ جرمن زبان پر بڑا عبور رکھتے ہوں گے - لیکن انھوں نے اپنی بات چیت میں کبھی کوئی جرمن لفظ استعمال نہیں کیا - حتیٰ کہ اس عرصے کے دوران بھی جب اُن کے بچے ایک جرمن گورنس (اتالیق) کے زیر اہتمام تھے ، جو ان کے گھر میں رہتی تھی -"

بہرحال ، اس سوال کا جواب ہمیں ان خطوط سے یقیناً مل جاتا ہے کیونکہ پہلی جنگ عظیم سے پیشتر لکھے گئے تمام خطوط (باستثنائے دو) جرمن زبان ہی میں ہیں - اور اگرچہ اقبال ان خطوط میں بار بار اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ جرمن زبان سے وہ بڑے ناواقف ہیں اور اس میں وہ اپنے خیالات کا حسب خاطر اظہار نہیں کر سکتے - بلکہ اپنی "Schlechte Deutsch" (ٹوٹی پھوٹی جرمن) کو مکتوب الیہا کے لیے گستاخی سمجھ کر اظہار معذرت بھی کرتے ہیں - تاہم میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اقبال ایسا کہنے میں ضرورت سے زیادہ انکسار برت رہے ہیں - مجھے تو اس بات پر تعجب ہے کہ وہ اس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کس خوبی کے ساتھ کر سکتے ہیں ، کیونکہ آخر اس زبان کی تعلیم انھوں نے ایک بہت ہی مختصر عرصے کے لیے پائی تھی - جی ہاں - اُن کو جرمن زبان ٹھیک ٹھاک آتی تھی! - جیسا کہ ان خطوط سے عیاں ہے - یہ اور بات ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ اس زبان میں ان کی مشق بتدریج زائل ہوتی گئی ہوگی - اور یہ فطرتی بات ہے -

اپنے وطن پہنچنے کے بعد اپنے پہلے تفصیلی خط (از لاہور ، مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۰۹ء) میں وہ اُس پُرجوش اور شاندار استقبال کا ، جرمن زبان میں ، بڑی روانی اور صفائی کے ساتھ پورا حال بیان کرتے ہیں جس کا اہتمام ان کی واپسی پر ان کے ہم وطنوں نے کیا تھا -

ایک اور گویا نعمت غیر مترقبہ کہیے ، جو ان خطوط سے ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ ایک ایسی اطلاع ہے جو اس سے پہلے ہمارے "حیطہ" علم میں نہ تھی - اور وہ ہیں اُن مکانوں کے پتے جو اقبال ۱۹۰۸ء میں ، اور بعد ازاں گول میز کانفرنسوں کے دوران ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں ، لندن میں ٹھہرے تھے[۲] - یعنی ۱۹۰۸ء میں Kensington کے علاقے میں ایلشم روڈ (49 Elsham Road Kensington) - پھر ۱۹۳۱ء میں 113 St. James Court, Buckingham Gate اور آخر میں ۱۹۳۲ء میں Queen Anne's Mansion St. James Park - اب کہ ان پتوں کا کھوج مل گیا ہے ، بلدیہ لندن کلاں کی عمارتی مجلس مشاورت Buildings Advisory Committee of the Greater London Council سے ہمیں یہ درخواست کرنی چاہیے کہ وہ ان میں سے ایک پتے

۱- اسے انگریزی میں یوں کہہ سکتے ہیں : 'My Dear Miss Wegenast' (نوٹ از مترجم) -

۲- دیکھیے سید نذیر نیازی کا مضمون (مترجمہ جناب ممتاز حسن) معنونہ 'Conversation with Iqbal' (ص ۱۰۰) - جو پاکستان جرمن فورم کراچی کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں شائع کردہ کتاب 'Mohammad Iqbal, Poet and Philosopher' میں شامل ہے - (نوٹ از مترجم)

۱- یہ جناب پرایوسم کا لطف ہے - میری بیوی نے ، جو جرمن نژاد ہیں ، اقبال کے ان خطوط کے اصل متن تک زبان کی ... یہی ہے - جو ایک فطری امر ہے - (نوٹ از مترجم - نومبر ۱۹۸۳ء) -

۲- دیکھیے میرا خط مطبوعہ "نگار" کراچی مارچ ۱۹۷۲ء -

(جاری)

پر ایک لیلے رنگ کی یادگاری تختی نصب کرے[1] ، تاکہ پاکستان کے میولوں میں سے ایک عظیم ترین (یا شاید سب سے عظیم) ہستی کی یاد اس شہر میں تازہ رہے ۔

اگرچہ یہ میری بڑی خواہش تھی ، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے آپ کی صحبت میں میں ان خطوط کے تفصیلی اقتباسات آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتا ۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھ پر یہ واجب ہے کہ کم از کم ایک ایسا پیراگراف میں آپ کو پڑھ کر سناؤں جو خاص طور پر پُر از جذبات ہے ۔

یہ خبر ملنے پر کہ مس ویگیناسٹ کے والد کا انتقال ہو گیا ہے، وہ یوں اظہارِ ماتم کرتے ہیں ۔

ڈیئر مس ویگیناسٹ

مجھے آپ کے والد ماجد کے انتقال کی پُرملال خبر پڑھ کر بے حد صدمہ ہوا ہے ۔ اور اگرچہ میرا یہ خط آپ کو اس حادثۂ فاجعہ کے رونما ہونے کے کئی روز بعد ملے گا ، تاہم لبِ وقت نہ فاصلے کا بُعد آپ کے اس صدمے میں آپ کے ساتھ میری ہمدردی کی گرمجوشی کو کم کر سکتا ہے ۔ اس اطلاع سے مجھے بڑا گہرا رنج ہوا ہے ۔ اور میری دعا ہے کہ خدائے تعالٰی اپنی خاص رحمتیں اس قابلِ تعظیم بزرگ پر برسائے ۔ اور آپ کو یہ صدمہ سہنے کی طاقت عطا فرمائے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ یہ وہ آیت مبارکہ ہے جو ہم کسی کی موت کی خبر سن کر پڑھتے ہیں ۔ اور یہی آیت میں نے آپ کا المناک خط پا کر بارہا اور بہ تکرار پڑھی ۔ لیکن ایسے حادثات ہر ایک کی زندگی میں رونپذیر ہوتے ہیں ۔ اور ان سے ہمیں اسی طور سے نبرد آزما ہونا چاہیے جیسے وہ لوگ ان پر غالب آئے جن کی زندگی ہمارے لیے باعث ہدایت ہے ۔ آپ کو یاد ہو گا کہ گوئٹے نے اپنی زندگی کے لیے لمحۂ آخریں میں کیا کہا ۔ ۔ ۔ "مزید روشنی"۔ موت ہمارے لیے ایسے باب وا کرتی ہے اور ہمیں ان منزلوں تک پہنچاتی ہے جہاں ہم دائمی حسن و صداقت کے روبرو ہوتے ہیں ۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب میں آپ کے ساتھ مل کر گوئٹے کا کلام پڑھا کرتا تھا ، اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ کو بھی وہ خوشیوں بھرے دن یاد ہوں گے جب ہم ایک دوسرے سے اس قدر قریب تھے ۔ یہاں تک کہ آج میں آپ کے صدمے میں خود کو روحانی طور سے شریک محسوس کرتا ہوں ۔ جب آپ کا جی چاہے تو مجھے ضرور خط لکھیے گا ۔ کاش کہ میں آج جرمنی میں ہوتا اور آپ کو اپنی ہمدردی ذاتی طور سے پیش کر سکتا ۔

خدا آپ کا نگہبان ہو ۔

ہمیشہ آپ کا

محمد اقبال[۴]"

"مجھے وہ زمانہ یاد ــ جب میں آپ کے ساتھ مل کر گوئٹے کا کلام پڑھا کرتا تھا اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ کو بھی وہ خوشیوں بھرے دن یاد ہوں گے ، جب ہم ایک دوسرے سے (گویا روحانی طور پر) اس قدر قریب تھے" تو سمجھیے کہ اصل بات یہی ہے :

یعنی فرالیلائین ویگیناسٹ ہی گوئٹے اور ہائنے اور کانٹ اور شوپنہاور ہیں ، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہائیڈل برگ اور دریائے نیکر اور جرمنی بھی ہیں ۔ یہی تھے وہ ایام بہجت ۔ اور یہی ہے ایما ویگیناسٹ کے نام اقبال کے خطوط کا بنیادی اور بار بار دہرایا جانے والا پیغام (Leitmotif) ۔ "میرا جسم یہاں ، اور میرے خیالات جرمنی میں ہیں"۔ "یہ بات میرے لیے ناممکن ہے کہ میں آپ کے اس خوبصورت ملک کو بھول جاؤں ، جہاں سے میں نے اتنا کچھ سیکھا ہے"۔ "ہائیڈل برگ میں میرا قیام اب سوائے ایک حسین خواب کے کچھ بھی نہیں ہے ۔ اے کاش کہ میں اسے دہرا سکتا!" "میں جرمنی کو بہت چاہتا ہوں ۔ اس نے میرے آدرشوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے ، اور میں وہاں اپنے قیام کو کبھی فراموش نہ کروں گا"۔ "میں تاعمر اُن ایام کو نہ بھول سکوں گا جب آپ مجھے گوئٹے کا فاؤسٹ پڑھاتی تھیں اور میری ہر طرح مدد کرتی تھیں وہ کیا ہی مسرت اندوز دن تھے ۔"

"بڑی آرزو ہے کہ میں آپ سے ہائیڈل برگ یا ہائیل برون (Heilbronn) میں دوبارہ مل سکوں ، تاکہ ہم دونوں پھر ایک ساتھ وہاں سے اس پیرِ طریقت گوئٹے کے مقدس مزار کی زیارت کو جا سکیں" ۔

"اگلے روز میں ہائنے کا مطالعہ کر رہا تھا ۔ وہ دن پھر میری نظروں میں گھوم گئے ، جب ہم ایک ساتھ اس کا کلام پڑھا کرتے تھے" ۔

اور ایک آخری اقتباس : "جرمنی میرے لیے گویا ایک دوسرا روحانی گھر تھا ۔ میں نے وہاں سے بہت کچھ سیکھا اور وہاں بہت کچھ سوچا ۔ گوئٹے کے وطن نے میری روح میں ایک دائمی جگہ پا لی ہے"۔ جی ہاں ، تو گویا فرالیلائین ویگیناسٹ ہی گوئٹے بھی ہیں اور ہائنے بھی ۔ اور کانٹ ، شوپنہاور ، ہائیڈل برگ ، نیکر ، جرمنی ، اور وہ بہجت انگیز دن بھی ۔ ۔ ۔ اور وہ مسرت بھرے دن ، اور جرمنی ، اور دریائے نیکر اور ہائیڈل برگ اور شوپنہاور اور کانٹ اور ہائنے اور گوئٹے ۔ یہ سب کے سب فرالیلائین ویگیناسٹ کی شخصیت میں مجسم ہو گئے تھے ، جیسا کہ اس خط و کتابت سے ظاہر ہوتا ہے ، جو نہ ذہنوں کی مفاہمت ہے ، نہ عقل کی ، بلکہ دلوں کے نغمہ و پیغام پر مشتمل ہے ۔

(مطبوعہ ماہنامہ "افکار" کراچی ، نومبر ۱۹۸۲ء)

۱۔ اس قسم کی ایک یادگاری تختی ۱۹۸۸ء میں علامہ کی اس قیام گاہ پر نصب کی جا چکی ہے ، جس کا کھوج راقم الحروف نے لگایا تھا یعنی 17 Portugal Place Cambridge ۔ قارئین کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ معروف مستشرق سر سیرل فلپس Sir Cyril Philips سابق وائس چانسلر لندن یونیورسٹی نے ، جو London School of Oriental and African Studies (SOAS) میں ۵ مئی ۱۹۸۲ء کو منعقد ہونے والے یوم اقبال کی صدارت کر رہے تھے ۔ تقریب کے دوران اس بات کا اعلان کیا کہ لندن یونیورسٹی کی طرف سے بلدیہ لندن GCL پر زور دیا جائے گا کہ لندن میں ان تین مقامات میں سے کم از کم ایک پر علامہ اقبال کی یادگاری کتبہ نصب کیا جائے ۔ یاد رہے کہ میں نے اپنے خط مطبوعہ افکار کراچی بابت مارچ ۱۹۸۲ء میں اس بات کی تجویز کی تھی ۔ اور لکھا تھا کہ ایسی تختی کے لیے سب سے بہتر جگہ غالباً Kesington والی اقامت گاہ ہوگی ۔ کہ وہاں وہ ۱۹۰۸ء کے دوران SOAS میں سر طامس آرنلڈ کے قائم مقام عربی لیکچرر کی حیثیت سے غالباً زیادہ عرصہ تک مقیم رہے ہوں گے ۔ اور یہ جگہ بھی مرکزی لندن میں واقع ہے ۔

(درتی)

اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط
بنام مس ویگے ناسٹ
(۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۳ء)

ماخذِ خطوط ـ جناب امان اللہ ہوبوہم ـ (سفارت خانہ الالیہ ـ لندن)

حرفِ آغاز

میں نے ان خطوط کے بارے میں ایک ابتدائی اطلاع پہلے پہل جناب صہبا لکھنوی، مدیر "افکار" کو جنوری ۱۹۸۲ء میں دی تھی، جو انھوں نے "افکار" (مارچ ۱۹۸۲ء، ص ۹۶ - ۹۵) میں ایک خط کے طور پر شائع کر دی تھی۔ اس کے بعد اسی سلسلے میں جناب محمد امان اللہ ہربرٹ ہوبوہم (Herr M. A. H. Hobohm) کی تقریر کا میرا کیا ہوا ترجمہ "محمد اقبال اور جرمنی ـ نامہ و پیام دل کا" کے عنوان سے "افکار" (نومبر ۱۹۸۲ء، ص ۲۳ - ۱۷) میں چھپ چکا ہے*۔ ان دو مضامین سے ان اہم خطوط کے پس منظر پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

جناب ہوبوہم نے محولہ بالا تقریر، School of Oriental and African Studies, London (SOAS) کے زیر اہتمام منعقدہ یومِ اقبال بروز ۵ مئی ۱۹۸۲ء کے موقعے پر کی تھی، مس ویگے ناسٹ کے نام اقبال کے خطوط کی اشاعت کا اہتمام متذکرہ ادارہ کر رہا ہے، لیکن شائقینِ اقبال کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیشِ نظر میں ان خطوط کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہوں۔

جناب امان اللہ ہوبوہم صاحب سے جون ۱۹۸۰ء میں یہ طے پایا تھا کہ وہ اور میں مل کر علامہ اقبال کے جرمنی کے قیام، اور بالخصوص مس ویگے ناسٹ کے ساتھ اُن کی طویل خط و کتابت کے پس منظر پر، ایک سیر حاصل مقالہ لکھ کر (مع ان تمام خطوط کے اصل مسوّدوں کے عکوس کے مفصّل کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ اس میں مکمل حوالوں اور تعلیقات و تصریحات کا اہتمام ہوگا، لیکن ہم دونوں کی گوناگوں مصروفیات کے سبب تاحال اس منصوبے پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ چنانچہ اولین مرحلے کے طور سے جناب ہوبوہم صاحب کی اجازت سے میں ان خطوط کا ترجمہ شائع کر رہا ہوں۔

ان غیر مطبوعہ خطوط کے پس منظر کی طرف یہاں صرف ایک دو مختصر اشارے کافی ہوں گے۔ جیسا کہ جناب ہوبوہم نے اپنے مضمون "نامہ و پیام دل کا" میں بیان کیا ہے، اس مجموعہ خطوط کا کھوج جناب ممتاز حسن مرحوم (جو پاکستان جرمن فورم کے صدر بھی تھے) اور جناب ہوبوہم نے (جو اس ادارے کے معتمد عمومی تھے) موسم گرما ۱۹۵۹ء کے دورۂ جرمنی کے دوران لگایا تھا۔ ان خطوط کی مکتوب الیہا، ہائیڈل برگ میں اقبال کے مختصر قیام (اواخر جولائی تا اوائل اکتوبر ۱۹۰۷ء) کے دوران اُن کی جرمن زبان کی اتالیق، مس ایما ویگے ناسٹ (Fraulein=Miss) Emma Wegenast) تھیں، جن کی طرف ان اصحاب کی توجہ بیگم عطیہ فیضی کی کتاب (Iqbal's letter to Attiya Begum) کے ذریعے مبذول ہوئی تھی۔

اگرچہ ۱۹۵۹ء کے اس دورۂ جرمنی کے دوران جناب ممتاز حسن اور جناب ہوبوہم مس ویگے ناسٹ سے ذاتی طور سے نہ مل سکے، تاہم اس دورے کے بعد جناب ممتاز حسن نے مس ویگے ناسٹ کے ساتھ خط و کتابت کی، جس کے نتیجے میں خاتون موصوفہ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل، یعنی ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں، اپنے نام اقبال کے سارے خطوط پاکستان جرمن فورم کے حوالے کر دیے اور ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ انھیں کسی ایسے تاریخی محافظ خانے (Archives) تک پہنچا دیا جائے، جہاں علامہ کی زندگی اور اُن کے کام پر تحقیقات کرنے والے افراد اُن سے بہرہ یاب ہوسکیں۔ لیکن تاحال ایسا نہیں ہوسکا، چنانچہ موجودہ ترجمے کی اشاعت مکتوب الیہا کی آخری خواہشات کی تکمیل کا مترادف سمجھی جا سکتی ہے۔

چنانچہ ہوبوہم نے اپنی تقریر میں (دیکھیے اس کتاب میں: محمد اقبال اور جرمنی" ص ۱۰۲ - ۸۵) بیان کیا ہے ممتاز حسن نے بکمال تلطف اس مجموعہ خطوط کی ایک مکمل فوٹو کاپی اُن کے لیے تیار کروائی تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ اُن میں سے دو خطوں کا اصل مسوّدہ بھی ہوبوہم صاحب کو عطا کر دیا تھا۔ جناب ہوبوہم کے پاس اس وقت جو خط موجود ہیں، وہ دو پوسٹ کارڈوں کو ملا کر تعداد میں کل ستالیس ہیں، بقول اُن کے عین ممکن ہے کہ پچھلے اٹھارہ بیس برسوں میں، ان کی نقلِ مکانی کے سبب جو کئی ایک سفر انہوں نے مختلف برِ اعظموں کے درمیان کیے تھے، اُن کے دوران اس مجموعے کی چند فوٹو کاپیاں گم ہو گئی ہوں۔ انہیں کچھ ہلکی سی یاد یوں آتی ہے کہ کُل ملا کر چالیس خطوط تھے[1]، اور اس کے علاوہ کچھ تصویریں بھی تھیں۔

ان خطوط کی موجودگی کی اطلاع مجھے پہلے پہل ۱۹۶۸ء میں اُس وقت ملی جب میرے ایک کزن کیپٹن (اب کرنل) اسد درانی نے، جو جرمنی میں اُن دنوں ایک اسٹاف کورس کر رہے تھے، برمنگھم میں ایک ملاقات کے دوران مجھے بتایا کہ جرمنی وہ ایک نو مسلم جناب ہربرٹ امان اللہ ہوبوہم صاحب سے کئی دفعہ مل چکے ہیں، جو اُس سے پہلے پاکستان جرمن فورم کے ساتھ وابستہ تھے، اور اب جرمنی میں Rothenburg ob der Tauber کے خوبصورت مقام پر گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں جرمن زبان کی تعلیم دے رہے تھے۔ جہاں میرے کزن بھی اُن کے ایک طالب علم تھے۔ جناب موصوف کی بیگم ایک پاکستانی خاتون تھیں (علامہ اقبال کے دوست مولوی انشا اللہ ایڈیٹر 'وطن' کی پوتی اور جناب شیخ عظیم اللہ کی صاحبزادی، جن کا ۱۹۸۵ء میں انتقال ہو گیا ہے)، تو جناب اسد درانی نے ۱۹۶۸ء میں مجھے بتایا کہ جناب ہوبوہم کے پاس

---

* یہ مضمون کتاب میں بھی شامل ہے۔ دیکھیے ص ۸۵-۱۰۲۔

۱۔ لیکن دیکھیے میرا نوٹ، ص ۹۰، اور دیباچہ کتاب (درانی - ۲۲ مارچ ۱۹۸۵ء)۔

علامہ اقبال کے چند خطوط موجود ہیں ، جو انہوں نے اپنی جرمن اُستانی کو لکھے تھے۔

پھر یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ ۱۹۷۷ء میں جب میں نے عطیہ بیگم کی کتاب ("اقبال" مترجمہ عبدالعزیز خالد) پڑھی ، اور اس میں مس ویگے ناسٹ کا مفصل ذکر پایا ، اور پھر انہی دنوں فقیر سید وحید الدین کی کتاب Iqbal in Pictures دیکھنے کا اتفاق ہوا ، جس میں مس ویگے ناسٹ کے نام اقبال کے ایک پوسٹ کارڈ (زیر نظر مجموعے کا خط نمبر ۳ ، مورخہ لندن ۱۶ نومبر ۱۹۰۷ء) کا عکس بھی شامل تھا ، تو میرے ذہن میں ان خطوط کی یاد تازہ ہوگئی۔

اس سلسلے کی آخری کڑی یہ ہے کہ کرسمس ۱۹۸۱ء کی تعطیلات میں کرنل اسد درانی جرمنی سے ہمارے یہاں آئے (وہ آج کل بون میں پاکستانی سفارت خانے میں ملٹری اتاشی ہیں) تو انہوں نے بتایا کہ ہوبوہم صاحب جرمن سفارت خانہ لندن میں نائب اتاشی برائے تجارت ہیں ، اور عنقریب اُن سے لندن میں ان کی ملاقات ہوگی۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے بھی ہوبوہم صاحب سے ملائیں۔ چنانچہ یہ ملاقات ۲ جنوری ۱۹۸۲ء کو جناب ہوبوہم کے دولت خانے پر ہوئی ، جہاں اُنہوں نے کرنل اور بیگم اسد درانی (یعنی میری ہمشیرہ رخشندہ درانی) کو اور مجھے چائے پر مدعو کیا تھا۔ اس ملاقات میں جناب ہوبوہم نے مجھے علامہ کے وہ خطوط دکھائے ، جن کا اصل مسوّدہ ان کے پاس محفوظ تھا۔ میں نے ان خطوط کی اہمیت اُن پر جتائی اور کہا کہ ان خطوط کی اشاعت بے حد ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مرورِ زمانہ سے تلف ہو جائیں۔ میں نے کہا کہ عطیہ فیضی بھی تیس پینتیس سال تک

اپنے نام اقبال کے خطوط کو پردۂ حجاب میں رکھے رہیں۔ لیکن بالآخر جب انہوں نے یہ خطوط ، اور ان کے ساتھ اپنی ڈائری سے پس منظر کے اقتباسات شائع کیے تو اس سے حیاتِ اقبال کے بعض ایسے اہم گوشے منظرِ عام پر آئے ، جو اس سے پیشتر پوشیدہ تھے۔ اسی طرح یہ بھی بہت ضروری ہے کہ مس ویگے ناسٹ کے نام اُن کے خطوط شائع کئے جائیں۔ (جناب ہوبوہم سے میری ملاقات کا مختصر حال "الکار" (مارچ ۱۹۸۲ء) میں میرے مذکورہ بالا خط میں شائع ہو چکا ہے)۔

مجھے خوشی ہے کہ جناب ہوبوہم نے میری پرزور درخواست کو قابلِ اعتنا سمجھا۔ اور اس ملاقات کے چار ماہ بعد ، مذکورہ بالا تقریر میں اقبال اور جرمنی کے تعلقات پر ("نغمہ و پیام دل کا" کے عنوان سے) روشنی ڈالی۔ وہ علامہ کے دو خطوط بھی (زیرِ نظر مجموعے کے خطوط نمبر ۲ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۷ء ، اور نمبر ۵ مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۰۷ء) 'دبستانِ شرق و افریقائی لندن' (SOAS) کی تقریب میں منظرِ عام پر لائے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے ، انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ان خطوط کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

اب چند باتیں خطوں کے ترجمے کے بارے میں — ان ستائیس خطوط میں پہلے سترہ خط جرمن زبان میں ہیں ، اور آخری دس انگریزی زبان میں۔ اقبال نے جرمن زبان صرف چار پانچ مہینے میں سیکھی تھی۔ چنانچہ یہ بہت مبتدیانہ تھی ، اور انہیں اس کا شدت سے احساس بھی تھا۔ وہ بار بار اپنے خطوں میں لکھتے ہیں (مثلاً دیکھیے خط نمبر ۱۶ ، ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "میرے خطوط آپ کو اس خوفناک جرمن زبان کی وجہ سے جو میں لکھتا ہوں ، کافی دل لگی کا سامان بہم پہنچاتے ہوں گے")۔ ان خطوط کے متن کی بڑے پیمانے پر لسانی تصحیح و تہذیب میری بیوی نے کی ہے ، جو جرمن نژاد ہیں۔ اس کے بعد جرمن زبان میں لکھے گئے تمام خطوں کا انگریزی میں ترجمہ میری بیٹی انجم افروز نے کیا ہے جو مجھ سے زیادہ جرمن زبان پر دسترس رکھتی ہیں۔ آخر میں ان خطوں کو اردو زبان کا جامہ میں نے پہنایا ہے۔ یہاں میں نے اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ اردو ترجمہ سہل ہو ، اور تقریباً اسی سطح کا ہو جس پر اقبال نے جرمن میں خطوط لکھے تھے۔ تاہم میں نے بالعموم ان کی زبان و بیان کی غلطیوں سے درگذر کیا ہے۔ کیونکہ اقبال کی جرمن زبان سے نسبتاً کم واقفیت پر معترض ہونا بالکل نامناسب ہے۔ ہاں میں نے حاشیے میں کہیں کہیں وضاحتی اشارات بھی دے دئیے ہیں۔

آخر میں ، میں جناب امان اللہ ہوبوہم کی دختر نیک اختر محترمہ شیریں ہوبوہم کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے علامہ کے دستی مسودوں کو بڑی دقتِ نظر کے ساتھ پڑھا ، اور اُن کو ٹائپ بھی کیا ہے۔ موصوفہ کو جرمن زبان پر کامل عبور حاصل ہے۔ وہ SOAS سے ایم ایس ۔ سی کر چکی ہیں ، اور اردو بھی جانتی ہیں۔ یہ ٹائپ شدہ مسودہ جناب ہوبوہم نے مجھے نومبر ۱۹۸۲ء میں عطا کیا تھا۔

میں قارئین اور اقبال کے خطوط کے درمیان مزید حائل نہیں ہونا چاہتا ، اور علامہ کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں :

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے ؟

راقم الحروف : سعید اختر درانی)

ترجمۂ خطوط

خط نمبر ۱

اقامت خانہ تھرنر
۴۱۔ شیلنگ سٹراسے
میونخ[2]۔ (جرمن سے ترجمہ)
۱۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء

عزیزۂ من فرائیلائین[3] ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ

۱۔ ان خطوط کا جرمن اور انگریزی متن ضمیمہ نمبر ۲ میں دیکھیے ، جہاں مس ہوبوہم کے ٹائپ شدہ مسودے کے عکس درج کیے گئے ہیں۔ سوائے خطوط نمبر ۴ اور ۵ ، جو میری بیوی نے ٹائپ کیے ہیں ، اور جن کے خطوطوں کے عکس جناب ہوبوہم صاحب نے مہیا کیے تھے۔ (درانی ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء)

۲۔ Pension) = Pension Thurner, Schelling Str. 41, M*nchen = منزل ، پرائیویٹ ہوٹل)۔

۳۔ Fräulein=Frl. Mein liebes Frl. Wegenast (فرائیلائین یعنی Miss = مس)۔

جرمن زبان سے میری محدود واقفیت ہمارے درمیان ایک دیوار کی طرح کھڑی ہے۔ ۴

اگر میرے خطوط مختصر ہوں، تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرے پاس لکھنے کو کچھ نہیں ہے، بلکہ یہ کہ میرا ذریعۂ اظہار ناقص ہے۔ مزید برآں میں نہیں چاہتا کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن سے آپ کی طبیعت خراب کروں۔ لیکن یہ رکاوٹ آپ کے لیے موجود نہیں، چنانچہ مجھے آپ سے مکمل اظہار کی امید ہے۔

میں نے اخبار میں ایک اشتہار دے دیا ہے کہ مجھے ایک اچھی استانی کی ضرورت ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ہائیڈل برگ کے قیام کے دوران میں نے جرمن لکھنے کی مشق نہ کی۔ یہ وہ پہلی تحریر ہے، جو میں اس زبان میں لکھ رہا ہوں۔

خزاں کی دھیمی اور نم آلود ہوا بڑی خوشگوار ہے۔ موسم بڑا خوبصورت ہے، لیکن افسوس کہ ہر حسین چیز کی طرح یہ بھی بے دوام[1] ہے۔

براہ کرم جلد خط[2] لکھیے۔

خدا حافظ

آپ کا دوست

ایس - ایم اقبال

۲

اقامت خانہ گھرلر[3]

۴۰ - شیلنگ سٹراسے

میونخ -

(جرمن سے)

۲۳ اکتوبر ۰۷ء

عزیزہ من فرائیلائن ویگے ناسٹ

یہ آپ کا بڑا کرم تھا کہ آپ نے (خط) لکھا، لیکن بہت مختصر۔ میں اُس وقت تک آپ کو نہیں لکھوں گا، جب تک آپ مجھے وہ خط نہیں بھیجتیں، جو آپ نے پھاڑ ڈالا ہے۔ یہ بڑی بے رحمی ہے۔ آپ ہائیڈل برگ میں تو ایسی نہیں تھیں۔ شاید ہائیل برون (Heilbronn) کی آب و ہوا نے آپ کو بے مہر بنا دیا ہے۔

میں زیادہ لکھنا چاہتا تھا، مگر ـ ـ ـ ـ وہ خط ـ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرا خط پھاڑ ڈالیں[4]۔

آپ کا بہت مخلص

ایس ـ ایم اقبال

نوٹ ـ لفافے پر یہ پتا لکھا ہے:

Frl. Emma Wegenast
Louisen Strasse
Heilbronn

ٹکٹ پر میونخ کی مہر ہے۔

۱- kurzweilig کوتاہ عمر، زود گزر، مستعجل۔

۲- اقبال ان خطوط میں عموماً یوں ہی تحریر کرتے ہیں۔ مثلاً: جلد ضرور لکھیے۔ میں نے اس کے ترجمے میں عموماً "خط" کا اضافہ کر دیا ہے۔

۳- اصل خط کے عکس کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۴۔

۴- جس سے غالباً مراد اقبال کی طرف لکھا ہوا خط ہے۔

۳

اقامت خانہ گھرلر

۴۰ - شیلنگ سٹراسے

میونخ

(جرمن سے)

۲۴ اکتوبر ۰۷ء

عزیزہ من مس[1] ویگے ناسٹ

میں آپ کے خط کے لیے شکر گزار ہوں۔ مجھے میونخ بڑا پسند آیا ہے۔ جناب رائنر[2] نے یہاں اپنی ایک جاننے والی کو لکھا تھا، اور انھوں نے میرے لیے ایک استانی ڈھونڈ لی ہے۔ اگرچہ اس مکان میں جرمن زبان بولنے کا کوئی موقع میسر نہیں آتا، تاہم میں اپنی دونوں استانیوں کے ساتھ کافی گفتگو کر لیتا ہوں۔ کل ہم لوگ ایک نمائش ہنر[3] دیکھنے کے لیے گئے۔ وہاں اتنی بہت خوبصورت تصویریں ہیں کہ انسان خود کو ایک دلربائے خواب میں محسوس کرتا ہے۔ ہم نے وہاں دو گھنٹے گزارے، اور میری استانی، جو آرٹ کی سمجھ رکھتی ہیں، میرے لیے ایسی باتوں کی وضاحت کرتی رہیں، جن سے میں اس سے پہلے بے خبر تھا۔

کل مجھے محترمہ پروفیسر صاحبہ کا خط موصول ہوا، انھیں جناب رائنر سے اطلاع ملی تھی کہ میں اس اقامت خانے سے خوش نہیں ہوں۔ میں نے انھیں لکھا ہے کہ جو شخص اقامت خانہ شیرر[4] میں رہ چکا ہو، اسے اور کوئی اقامت گاہ پسند نہیں آ سکتی۔

آج میں باہر نہیں نکل سکتا، موسم خوشگوار نہیں ہے۔ براہ کرم میری بھدی جرمن زبان کا بُرا مت مانیے، اور نہ اس کا جو میں نے اپنے پہلے میں لکھا تھا۔ امید ہے کہ آپ بالکل بخیریت ہوں گی۔ مجھ میں سوچنے اور صحیح زبان لکھنے کی شکیبائی[5] نہیں ہے۔

آپ کا دوست

ایس ایم اقبال

۱- اصل خط میں .Frl (Fräulien کا اختصار) ہے، یعنی مس Miss. یہ طرز تخاطب اقبال نے اپنے تقریباً خطوط میں ملحوظ رکھا ہے، چاہے وہ جرمن میں ہوں یا انگریزی میں۔ (دیکھیے ضمیمہ نمبر ۴)

۲- Herr Reiner۔

۳- Kunst Ausstellung=Art exhibition [شاید میونخ کی آرٹ گیلری Alte Pinakothek?]۔

۴- Pension Scherer جو ہائیڈل برگ میں واقع ہے۔ جہاں اقبال جرمن زبان سیکھنے کے لیے مقیم تھے۔

۵- Geduld=Patience حوصلہ، صبر، یارا۔

۴

(جرمن سے)

لندن

۱۹ نومبر ۰۷ء

عزیزۂ من ، مس ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا خط مل گیا ہے ۔ لیکن میں ابھی تک جم کر نہیں بیٹھ سکا ہوں ۔ پھر کر لکھوں گا ۔

دلی نیک تمنائیں

اقبال[۲]

۵

معرفت طامس کک اینڈ سن[۳]

(جرمن سے)

لڈگیٹ سرکس

لندن

۲ دسمبر ۰۷ء

عزیزۂ من ، فرالیلائین ایما

مجھے آپ کا خط موصول ہوگیا ہے ۔ وہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں اپنی جرمن زبان بھول گیا ہوں ۔ میں بہت مصروف تھا ۔ اور زیادہ نہ سیکھ سکا[۴]۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھتیں ؟ میرے لیے آپ کو لکھنا ، اور اپنے دل کی بات کہنا بہت آسان ہو جائے گا ۔

میرا خیال تھا کہ میں ہائیل برون Heilbronn کے رستے سفر کر سکوں گا[۵]۔ لیکن یہ ممکن نہ ہوا ۔ میرے لیے یہ قطعی لازم تھا کہ میں پانچ نومبر کو لندن میں ہوں ۔ پروفیسر آرنلڈ مصر گئے ہیں ، اور میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا ہوں ۔ میرے ذمے ہفتے میں دو لکچر ہیں ۔

میں زیادہ لکھ یا کہہ نہیں سکتا ۔ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ میری روح (؟) میں کیا ہے ۔ میری بہت بڑی خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ آپ سے بات کر سکوں اور آپ کو دیکھ سکوں ـــــ لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں ۔ جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو ، اس کے لیے ممکن نہیں کہ آپ کے بغیر وہ جی سکے ۔ براہِ کرم میں نے جو لکھا ہے اس کے لیے مجھے معاف فرمائیے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس قسم کے اظہارِ جذبات کو پسند نہیں کرتیں ۔

براہ کرم جلد لکھیے اور سب کچھ ۔ یہ اچھا نہیں ہے کہ کسی شخص کا کچھ بگاڑا[۱] (؟) جائے جو آپ کا کچھ نہیں بگاڑتا[۲] (؟)

آپ کا مخلص[۳]

ایس ایم اقبال[۱]

٦

(جرمن سے)

معرفت طامس کک اینڈ سن

لڈگیٹ سرکس

لندن ای سی[۴]

۲۰ جنوری ۰۸ء

عزیزۂ من مس ویگے ناسٹ

میں آپ کی تصاویر کے لیے ہزار گونہ شکریہ ادا کرتا ہوں ، جو آج شام مجھے موصول ہوئیں ۔ یہ آپ کی بڑی کرم فرمائی ہے ۔ دونو تصویریں بڑی خوبصورت ہیں ، اور وہ ہمیشہ میرے مطالعے کے کمرے میں میری میز پر رہیں گی ، لیکن یہ مت باور کیجئے کہ وہ صرف کاغذ ہی پر نقش ہیں ۔ بلکہ وہ میرے د ـــــ[۵] میں بھی جا پذیر ہیں ۔ اور تا دوام رہیں گی ۔

شاید میرے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ پاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ آپ میری زندگی میں ایک حقیقی قوت بن چکی ہیں ۔ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کروں گا ۔ اور ہمیشہ آپ کے لطف و کرم کو یاد رکھوں گا ۔

میں اپنی جرمن زبان بالکل بھول چکا ہوں ۔ آپ ہی کیوں انگریزی نہیں سیکھ لیتیں ؟ یوں ہم ایک دوسرے کی بات بہتر سمجھ سکیں گے ۔ براہ کرم جلد خط لکھیے ۔ جونہی میری فوٹوگراف بنتی ہے ، میں بھی آپ کو اپنی تصویر بھیج دوں گا ۔

خدا حافظ میری عزیزہ مس ایما[٦] ، اور ہمیشہ جانئیے ۔

آپ کا

ایس ۔ ایم اقبال

لفافے پر پس تحریر : میں دونوں تصویریں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں ۔

۱۔ angesiedelt=settled (یہ بامحاورہ زبان نہیں ہے ۔ غالباً اقبال نے کوئی لغت دیکھ کر ترجمہ کیا ہے) ۔

۲۔ اس پوسٹ کارڈ کا عکس فقیر سید وحید الدین کی کتاب Iqbal in Pictures میں موجود ہے ۔ اس کتاب میں پوسٹ کارڈ کی پشت کی تصویر بھی دکھائی گئی ہے اور وہاں پتہ یوں درج ہے : Frl. Emma Wegenast - 16, Louisa (کذا) Str. Heilbronn (Germany) یعنی Louisa نہ کہ Louisen (دیکھیے خط نمبر ۲ کا پتا ۔) اس پوسٹ کارڈ کا عکس ضمیمہ نمبر ۴ میں ملاحظہ کیجیے ۔

۳۔ c/o Messrs Thomas Cook and Son, Ludgate Circus London - 2nd Dec 07 ۔ اصل خطوطے کے عکس کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۴ ۔

۴۔ یہ لفظ صاف نہیں پڑھا جا سکتا ۔ lernen (سیکھنا) ہے ۔ یا lesen (پڑھنا) ۔ اصل کے عکس کے لیے ضمیمہ نمبر ۴ دیکھیے ۔

۵۔ یعنی سوانح سے ۔

۱۔ verderben یعنی بگاڑنا ۔ to spoil یا to ruin (اگر verbergen ہوتا تو اس کا مطلب to conceal یعنی چھپانا ہوتا) ۔

۲۔ verdirbt=spoils or ruins جبکہ verbirgt=conceals مترجم ۔

۳۔ یہ انگریزی میں لکھا ہے (Yours sincerely) ۔

۴۔ c/o Messrs Thomas Cook and Son, Ludgate Circus London E. C. 20th Jan. 08

۵۔ اقبال نے صرف ــــ ے تحریر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ حرف Herz (جرمن = دل) کا آخری حصہ ہے ۔

٦۔ Emma ۔

۷

معرفت طامس کک اینڈ سن (جرمن سے)

لڈگیٹ سرکس

لندن ای ۔ سی

۲۱ جنوری[1] ۰۸ء

میری عزیزہ مس ایما ،

کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں تغافل شعار ہوں ؟ یہ بالکل ناممکن ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جب آپ کا پہلا خط پہنچا تو میں بڑا بیمار تھا ، اور اس نے مجھے اور بھی بیمار کر ڈالا ۔ کیونکہ آپ نے لکھا تھا کہ آپ نے بڑے طوفانوں میں سے گزرنے کے بعد اپنی طمانیت قلب[2] دوبارہ حاصل کرلی ہے ۔ میں یہ سمجھا کہ آپ میرے ساتھ مزید خط و کتابت نہیں کرنا چاہتیں ، اور اس بات سے مجھے بڑا دکھ ہوا ۔ اب مجھے پھر آپ کا خط موصول ہوا ہے ، اور اس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے ۔ میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں ۔ اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوبصورت خیالوں سے معمور رہتا ہے !

ایک شرارے سے ایک شعلہ اُٹھتا ہے ۔ اور ایک شعلے سے ایک بڑا الاؤ روشن ہو جاتا ہے! لیکن آپ سرد مہر ہیں ، غفلت شعار ہیں ۔ آپ جو جی میں آئے کیجیے ۔ میں بالکل کچھ نہ کہوں گا ، اور ہمیشہ صابر و شاکر رہوں گا ۔

شاید جب میں ہندوستان کو روانہ ہوں گا ، تو آپ سے ملاقات کر سکوں گا ۔ میں اپنی جرمن تمام تر بھول چکا ہوں ۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں ؟

آپ کا

اقبال

۸

معرفت طامس کک اینڈ سن (جرمن سے)

لڈگیٹ سرکس

لندن ای ۔ سی

۲۶ فروری ۰۸ء

عزیزۂ من مس[3] ویگے ناسٹ

میں ہر چیز کے لیے معذرت خواہ ہوں ۔ مجھے اس قدر مصروفیت رہی کہ میں آپ کو خط نہیں لکھ پایا ہوں ۔ آپ ایسی فرشتہ خصلت ہیں کہ میں امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی ۔ آج شام بھی مجھے ایک لیکچر دینا ہے "تصوف" ۔ چند روز ہوئے مجھے محترمہ پروفیسر صاحبہ کا خط موصول ہوا ۔ ان کا ایک فرانسیسی طالب علم لندن میں تھا ، اور ہم دونوں نے مل کر محترمہ پروفیسر صاحبہ کو ایک خط لکھا ۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں ؟ مجھے آپ کے کانوں کو اپنی بھونڈی جرمن سے مزید توہین پہنچانے پر شرم آتی ہے ۔

بہرحال میں اس خط و کتابت کو جرمن زبان کے سبق لینے کا ایک بہانہ سمجھتا ہوں ۔ سو آپ مجھے اب تک درس دے رہی ہیں ۔

میں جولائی کے اوائل میں ہندوستان لوٹ رہا ہوں ۔ اور میری تمنا ہے کہ اپنے سفر سے پیشتر آپ سے ملنے کا موقع مجھے حاصل ہو سکے گا ۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ چند روز کے لیے ہائیڈل برگ آ سکوں ۔ لیکن اگر ممکن ہو تو کیا آپ پیرس میں مجھ سے مل سکتی ہیں ؟ آپ ہائیڈل برگ کب آئیں گی[1] ؟ جناب رائنر (Herr Reiner) کہاں ہیں ؟ وہ مجھے بالکل خط نہیں لکھتے ۔ میں دو مرتبہ انہیں لکھ چکا ہوں ۔ شاید وہ بے حد مصروف ہیں ۔ آپ تمام دن کیا کرتی ہیں ؟ کیا آپ مطالعہ کرتی ہیں ، یا سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں ؟

آپ کی تصویر میری میز پر رکھی ہے ، اور ہمیشہ مجھے ان سہانے وقتوں کی یاد دلاتی ہے ، جو میں نے آپ کے ساتھ گزارے تھے ۔

ایک تسبیحِ خیالاتِ خوش آیند کے ساتھ

آپ کا

ایس ایم اقبال

۹

معرفت طامس کک اینڈ کمپنی (جرمن سے)

لڈگیٹ سرکس

لندن ای ۔ سی

۳ جون ۰۸ء

عزیزۂ من مس ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا خط پہنچا ، اور میں فوراً جواب لکھ رہا ہوں ۔ شاید آپ کو میرا جواب موصول نہیں ہوا ہے ۔ آپ کے پوسٹ کارڈ کے لیے بے حد شکریہ ۔ ۔ ۔ ۔

براہِ کرم جلد لکھیے اور مجھے بتائیے کہ آپ کیا کر رہی اور سوچ رہی ہیں ؟ آپ میرے خط کا انتظار کیوں کرتی ہیں ؟ میں ہر روز آپ سے اطلاع پانے کی آرزو رکھتا ہوں ۔ مس فیضی[2] اپنی بہن اور برادرِ نسبتی کے ساتھ یہاں ہیں ، جو کہ ایک ہندوستانی نواب[3] ہیں ۔ میں چند روز ہوئے ان سے ملنے گیا تھا ۔ وہ بخیریت اور بڑی خوش و خرم ہیں ۔ شاید وہ جرمنی جائیں گی ۔

میں بہت مصروف ہوں — جلد انگلستان سے رخصت ہو رہا ہوں آغاز جولائی میں — مجھے معلوم نہیں کہ آیا میرا جرمنی کے رستے سفر کرنا ممکن ہو گا یا نہیں ۔ یہ میری بہت بڑی تمنا ہے کہ میں ہندوستان لوٹنے سے پہلے آپ سے ملاقات کر سکوں ۔ بے رحم نہ

۱۔ خط نمبر ۸ کے بعد موجودہ خط کی تاریخ کچھ صحیح نہیں لگتی ۔ یا ہو سکتا ہے وہ پہلی تاریخ غلط ہو ۔

۲۔ Frieden-Peace (شانتی ۔ امن و سکون)

۳۔ یہاں Prinzessin مکمل لکھا ہے ۔

۱۔ مس ویگے ناسٹ ان دنوں غالباً Heilbronn میں ہوں گی ۔ جو ہائیڈل برگ کے جنوب مشرق میں قریب تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔

۲۔ مس عطیہ فیضی ۔

۳۔ اقبال نے انہیں ہندوستانی شہزادہ لکھا ہے ۔ (مس فیضی اپنی بہن ڈاکٹر فیضی کے ساتھ اگست ۱۹۰۷ء کے اوائل میں اقبال سے ملنے ہائیڈل برگ جا چکی تھیں ۔ جہاں وہ مس ویگے ناسٹ سے متعارف ہوئی تھیں ۔ ("اقبال" از عطیہ بیگم ۔ مترجمہ عزیز خالد)

ہے—پلیز[١] جلد خط لکھیے اور تمام احوال بتائیے۔ میرا جسم یہاں ہے، میرے خیالات جرمنی میں ہیں۔ آج کل بہار کا موسم ہے۔ سورج مسکرا رہا ہے۔ لیکن میرا دل غمگین ہے۔ مجھے کچھ سطریں[٢] لکھیے۔ اور آپ کا خط میری بہار ہو گا۔ میرے دلِ غمگین میں آپ کے لیے بڑی خوبصورت سوچیں ہیں، اور یہ خاموشی سے ایک کے بعد ایک آپ کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔ یہ ہیں آپ کے لیے میری گستاخیاں۔

آپ کا

اقبال

١٠

معرفت طامس کک اینڈ سن

لڈ گیٹ سرکس

لندن ای-سی

١٠ جون ٠٨

(جرمن سے)

عزیزۂ من مس ویگے ناسٹ

میں آپ کو پہلے لکھ چکا ہوں، اور آپ کے خط کا منتظر ہوں۔ مع ہذا میں اپنی ایک تصویر ملفوف کر رہا ہوں۔ شاید میں ایک اور تصویر آپ کو بھیجوں گا۔

آپ کا

ایس - ایم - اقبال

پس تحریر۔ میں ٣ جولائی کو[٣] ہندوستان روانہ ہو رہا ہوں۔ اور وہاں سے خط لکھوں گا۔

١١

٤٩ - ایلشم روڈ

کینسنگٹن غرب

لندن[٤]

(جرمن سے)

٢٧ جون ٠٨

عزیزۂ من مس ایما

میں نے اپنی سی پوری کوشش کی ہے کہ جرمنی کے رستے سفر کر سکوں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ میں تین جولائی[٥] کو انگلستان سے روانہ ہوں گا۔ اور چند روز پیرس میں رکوں گا، جہاں مجھے کچھ کام ہے۔

براہ کرم فوراً لکھیے۔ میں ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے آپ کا خط پانے کا متمنی ہوں۔ میں اگلے سال یورپ واپس آنے اور آپ سے ملنے کی امید رکھتا ہوں[١]۔ مت بھولیے گا کہ اگرچہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کریں گے پھر بھی ہمارے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم رہے گا۔ میرے خیالات ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آپ کی طرف دوڑیں گے، اور اس بندھن کو مضبوط بنالیں گے۔ ہمیشہ مجھے لکھتی رہیے گا، اور یاد رکھیے گا کہ آپ کا ایک سچا دوست ہے، اگرچہ وہ فاصلۂ دراز پر ہے۔ جب دل ایک دوسرے کے قریب ہوں، تو فاصلہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔

براہ کرم فی الفور لکھیے۔

آپ کا

ایس - ایم - اقبال

پس تحریر۔ مجھے جناب شنفر[٢] کی بیماری کا سن کر بڑا افسوس ہوا ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ صحت کا خیال رکھیں۔

١٢

سیالکوٹ شہر[٣]

ہندوستان

(جرمن سے)

٣ ستمبر ٠٨

عزیزۂ من مس ویگے ناسٹ

میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ یہ بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ میں انگلستان سے رخصت ہونے سے پہلے آپ سے مل نہ سکا۔ براہ کرم جلد لکھیے کہ آپ ان دنوں کیا کر رہی ہیں۔ میں نے اپنے پیشے کا آغاز لاہور میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ ایک وکیل کے لیے اچھی جگہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہائیڈل برگ میں ہوں گی۔ براہ کرم جناب اور محترمہ پروفیسر صاحبان کو میرا سلام دیجیے گا۔ اور جب آپ لوگ ایک ساتھ ہوں، تو مجھے یاد کیجیے گا۔

یہاں بڑی بارش ہوئی ہے[٤]۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے، اور مزید کی توقع ہے۔

میں اپنی ساری جرمن زبان بھول گیا ہوں، لیکن مجھے صرف ایک لفظ یاد ہے --- ایما۔

آپ کا

ایس - ایم - اقبال

١- Bitte=Please میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔

٢- worter=Wörte=words الفاظ۔

٣- میرے اندازے میں اقبال جولائی کی آٹھ یا دس تاریخ کے لگ بھگ انگلستان سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ (یکم جولائی کو انہیں بار ایٹ لاء کی ڈگری ملی۔ ٣ جولائی کو انہوں نے جناب F.W. Thomas صاحب کے نام اپنی مطبوعہ تھیسس (ایران میں علمِ مابعد الطبیعیات کا ارتقاء) کا ایک نسخہ (لندن میں) معنون کیا۔ جواب میرے پاس ہے)۔ وہ ٢٧ جولائی کو لاہور پہنچے۔ اٹلی یا فرانس سے بمبئی تک کے جہاز کے سفر میں گیارہ سے تیرہ دن لگتے تھے۔ وہ بمبئی شاید ٢٤ یا ٢٥ جولائی کو پہنچ گئے ہوں گے۔

٤- 49, Elsham Rd. Kensington W., London.

١- اقبال نے مس ایمی کو بھی لاہور سے کئی خط لکھے (مثلاً ١٩٠٩ء اور ١٩١٠ء میں) کہ عنقریب میں یورپ کا سفر کروں گا اور آپ سے ملوں گا۔ لیکن مصروفیات (اور اپنے معروف تساہل) کی وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اقبال عمر بھر دوبارہ جرمنی نہ جا سکے (اس مجموعے کے خطوط نمبر ٢١ تا ٢٧ بھی دیکھیے)۔

٢- Herr Chanfer۔

٣- Sialkot City India, 3rd Sep 08

٤- geregnet (geregnet ? =has rained) - بارش ہوئی۔ برسا۔ لفظ سیاق و سباق کے ibid سے جو معنی ہے۔

۱۳

لاہور[1] (جرمن سے)
(ہندوستان)
۱۱ جنوری ۱۹۰۹ء

عزیزۂ من مس ایما

آپ کے پُر تلطف خط کے لیے بے حد شکریہ۔ یہ آپ کا بڑا کرم ہے کہ آپ نے مجھے لکھا، اور مجھے یاد رکھا، جب کہ میں جرمنی سے اس قدر دور ہوں۔ مجھے ہائیڈل برگ سے آپ کا کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ شاید آپ کا خط گم ہو گیا ہے۔ اور مجھے یہ جان کر بڑا افسوس ہوا ہے کہ میرا خط (بھی) راستے میں گم ہو گیا ہے۔

جب میں ہندوستان پہنچا، تو میرے ہم وطنوں نے مجھے بہت بڑا اعزاز بخشا۔ میرے لیے اسے لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ ملک کے ہر گوشے سے مجھے چالیس کے قریب نظمیں بھیجی گئیں، دوستوں اور دوسرے لوگوں کی طرف سے خوش آمدید کے طور سے۔ جب میں لاہور پہنچا تو لوگوں نے مجھے سونے کا ہار دیا، جو میرے سر پر پہنایا گیا۔ بمبئی سے لےکر لاہور اور سیالکوٹ تک ہر اسٹیشن پر ہزارہا لوگ جمع تھے۔ جہاں میں نے دیکھا کہ بہت سے لڑکے اور بڑے[2] رستے کے اسٹیشنوں پر[3] میری نظمیں گا رہے تھے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ جب میں گھر پہنچا تو میرے والدین بالکل باصحت تھے۔ میری بہنیں اور والدہ بڑی مسرور ہیں کہ اب میں اُن کے پاس ہوں۔

میں اب لاہور میں ہوں۔ اور یہاں ایڈووکیٹ کے طور سے کام کر رہا ہوں۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں کبھی آپ کے خوبصورت وطن کو بھول سکوں، جہاں میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اور ـــــ براہ کرم ہمیشہ مجھے لکھتی رہیے گا۔ شاید ہم دوبارہ جرمنی یا ہندوستان میں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ کچھ عرصے بعد جب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو میں یورپ میں اپنا گھر بناؤں گا۔ یہ میرا تصور[4] ہے۔ اور میری تمنا ہے کہ یہ سب پورا ہوگا[5]۔

جناب خاؤبال[6] کے انتقال کی خبر سن کر بڑا افسوس ہوا۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اُن کی صحت کے بارے میں اُن سے کئی بار تذکرہ کیا تھا۔

براہِ کرم اپنے اُس دوست کو مت بھولیے جو آپ کو ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہے[7] اور جو آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہائیڈل برگ میں میرا قیام مجھے ایک خوبصورت خواب سا لگتا ہے، اور میں اس خواب کو دہرانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ آپ خوب (بہتر؟) جانتی ہیں۔

دلی نیک خواہشات کے ساتھ
آپ کا
ایس۔ ایم۔ اقبال
بار۔ ایٹ۔ لاء
لاہور
(ہندوستان)

۱۴

لاہور جرمنی بالائے کل[1] (جرمن سے)
(ہندوستان)
۲۰ جولائی ۱۹۰۹ء

عزیزۂ من فرالیلائین[2] ایما

یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ نے مجھے لکھا ہے۔ مجھے آپ کا خط پا کر (ہمیشہ) بہت ہی مسرت ہوتی ہے۔ اور میں بے تابی سے اس وقت کا منتظر ہوں، جب میں دوبارہ آپ کے وطن میں آپ سے مل سکوں گا۔ براہ کرم مجھے ہمیشہ ہمیشہ لکھتی رہیے۔ مجھے جرمنی بہت پسند ہے — اس نے میرے آدرشوں[3] پر بہت اثر کیا ہے۔ اور میں جرمنی میں اپنا قیام کبھی فراموش نہ کروں گا۔ میں یہاں بالکل اکیلا رہتا ہوں، اور خود کو بڑا غمگین پاتا ہوں۔ ہماری تقدیر ہمارے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ایک ایسی عظیم قوت ہے جو ہماری زندگیوں کو منظم کرتی ہے۔ محترمہ پروفیسر صاحبہ، جناب پروفیسر صاحب، اور تمام خواتین و حضرات کو میں ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ آہ! وہ دن جب میں جرمنی میں تھا!

مس فیضی بمبئی میں ہیں۔ ان کی والدہ انتقال کر گئی ہیں، اور وہ بہت غمزدہ ہیں۔ اب وہ کچھ بہتر ہیں۔ بعض اوقات میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اور میرے دل میں یورپ، اور بالخصوص جرمنی کو دوبارہ دیکھنے کی بڑی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔ براہ کرم مجھے اپنے دل اور اپنی یادوں میں ایک چھوٹی سی جگہ دیجیے گا۔

آپ کا دوست
ایس۔ ایم۔ اقبال
بار۔ ایٹ۔ لاء

۱۵

لاہور (جرمن سے)
ہندوستان
۲۲ ستمبر ۱۹۱۰ء

عزیزۂ من مس ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا نوازش نامہ موصول ہو گیا ہے، جس کے لیے میں

۱۔ Lahore (India). 11th Jan. 09.
۲۔ Erwachsene = erwachsenen = بالغان۔
۳۔ aus der Bahnhof über dem weg یہ جملہ بامحاورہ نہیں ہے۔
۴۔ Ansicht = view مطمحِ نظر؟
۵۔ es alles gut sein würden یہ جملہ بامحاورہ نہیں ہے۔
۶۔ Herr Chaubal شاید یہ خط نمبر ۱۱ (مورخہ ۷ جون ۱۹۰۸ء) والے جناب Chaufer یا Chaufex ہی ہیں۔ اگرچہ ان دو جگہوں پر لکھائی میں کچھ مختلف ہے۔
۷۔ خط میں جرمن زبان کا یہ فقرہ خلافِ محاورہ ہے۔

۱۔ Deutschland über alles = Germany above all ("جرمنی سب سے اونچا" یا "جرمنی کا بول بالا")۔
۲۔ یہاں پورا لفظ Fräulein (= مس) لکھا ہے۔
۳۔ Idealen = Ideals (= Ideale)

آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آج ڈاک کا دن تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میں بہت مصروف ہوں۔

اگلے ہفتے میں آپ کو ایک طویل (تر) خط لکھوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ممکن ہوگا۔

یہ پوستین ایک لمبی بھیڑ کی ہے[7] یہ دراصل ایک اوورکوٹ کے کالر اور بازوؤں کے لیے ہے۔

دلی نیک تمناؤں کے ساتھ

محمد اقبال

بار ایٹ لاء

لاہور (ہندوستان)

۱۶

لاہور (جرمن سے)

۱۱ مئی ۱۹۱۱ء

مزیزہ من فرالیلائین[3] ویگے ناسٹ

آپ کا خوبصورت پوسٹ کارڈ مجھے مل گیا ہے۔ اور اس کے لیے میں آپ کو اپنے دلی تشکرات بھیجتا ہوں۔ میری بڑی تمنا ہے کہ جرمنی کو دوبارہ سفر کروں تاکہ آپ سے مل سکوں۔ اور (= مگر) میں نہیں جانتا کہ یہ کس دن ممکن ہو سکے گا۔ لیکن میرے خطوط آپ کو اس "ظالم"[4] جرمن زبان کی وجہ سے، جو میں لکھتا ہوں، کافی دل لگی کا سامان بہم پہنچاتے ہوں گے۔

وہ خوبصورت ٹائیاں[5] مجھے مل گئی تھیں۔ اور میں بے حد شرمندہ ہوں کہ میں اس قدر مصروف تھا کہ آپ کو لکھ نہ سکا، اور اپنا شکریہ نہ بھیج سکا۔

جب آدمی کوئی زبان نہیں لکھ سکتا، تو اس کا قلم[6] بہت دل شکستہ[7] ہوتا ہے۔ اور ایسے انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اپنے شکریے کا پورا اظہار کر سکے۔ میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے کہ اپنی جرمن صحیح کر سکوں۔ براہ کرم میری غلطیوں کو معاف فرمائیے، لیکن مہربانی کر کے ایک طویل خط لکھیے۔ مجھے امید ہے کہ محترمہ پروفیسر صاحبہ بخیریت ہوں گی۔

آپ کا دوست

محمد اقبال

۱- اگر اقبال اتنی باقاعدگی سے تقریباً ہفتہ وار مس ویگے ناسٹ کو خط لکھتے تھے۔ تو ظاہر ہے ان میں سے بہت سے محفوظ نہیں رہے۔

۲- غالباً اس خط کے ساتھ اقبال نے ایک پوستین تحفتاً بھیجی ہوگی۔

۳- یہاں پورا لفظ Fräulein (= مس) لکھا ہے۔

۴- terrible = schrecklich = خوفناک، بھیانک۔

۵- Cravaten [= Krawatte] = ties, scarves۔

۶- Feder [= Feder] قلم۔

۷- اقبال نے یہاں miserable لکھا ہے جو جرمن زبان کا لفظ نہیں ہے۔

۱۷

(جرمن سے)

آپ کے خط کے لیے بہت شکریہ۔ براہ کرم مجھے لکھیے کہ آپ کیسی ہیں؟ ان دنوں لاہور میں بے حد گرمی ہے۔ ہم ایک دوزخ میں رہ رہے ہیں۔ میں جرمنی کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔

اقبال

چہارم جولائی ۱۹۱۲ء

محترمہ پروفیسر صاحبہ کا کیا حال ہے؟ میرے خیال میں گھر بھرا ہوا ہوگا[1] یہ دلی کی جامع مسجد ہے[2]۔

۱۸

لاہور (انگریزی سے ترجمہ[3])

۳۰ جولائی ۱۳ء

ڈیر مس[4] ویگے ناسٹ

مجھے آپ کے والد صاحب کی وفات کی خبر سن کر بے انتہا صدمہ ہوا ہے۔ اور اگرچہ میرا خط اس افسوس ناک سانحے کے بہت دنوں بعد آپ تک پہنچے گا، تاہم اس اندوہناک نقصان میں آپ کے ساتھ مجھے جو ہمدردی ہے، اس کی شدت کو نہ وقت کم کر سکتا ہے، نہ فاصلہ۔ اس خبر سے مجھے حقیقتاً بے حد دکھ ہوا ہے، اور میں خدائے تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس بزرگ اور قابل احترام ہستی پر اپنے انعام و اکرام کی بارش کرے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون[5]۔ یہ وہ آیت مقدسہ ہے، جو ہم کسی کی وفات کی خبر سن کر پڑھتے ہیں۔ اور آپ کا غم اندوز خط پڑھ کر میں نے یہ آیت بار بار دہرائی۔ ایسے سانحات ہر شخص کی زندگی میں ضرور رونما ہوتے ہیں۔ اور یہ لازم ہے کہ ہم اپنے مصائب کا مقابلہ اسی پامردی سے کریں، جیسا کہ ان لوگوں نے کیا جن کی زندگیاں ہمارے لیے شمع ہدایت ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ گوئٹے نے اپنے لمحۂ موت میں کیا کہا تھا: "مزید روشنی"۔ موت مزید روشنی کی طرف ایک نئی راہ وا کرتی ہے، اور ہمیں ان مقامات تک لے جاتی ہے، جہاں ہم ابدی حسن و صداقت کے روبرو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہ وقت بخوبی یاد ہے،

۱- گھر سے غالباً اقبال کی مراد ہائیڈل برگ کے ہوسٹل Pension Scherer سے ہے (دیکھیے: خط نمبر ۳)۔

۲- اس خط پر اقبال کا پتا درج نہیں ہے۔ غالباً یہ تحریر ایک پوسٹ کارڈ پر ہے۔ جامع مسجد دہلی کا ایک ایسا ہی (غیر مطبوعہ مخطوطہ) پوسٹ کارڈ میرے پاس موجود ہے، جو اقبال نے ۱۹۰۹ء میں اپنے استاد پروفیسر طامس آرنلڈ کو لندن بھیجا تھا۔

۳- غالباً اپنی شدت جذبات کے اظہار کے لیے اقبال نے یہ خط انگریزی میں لکھا ہے۔ اور ایک دفعہ انگریزی شروع کی تو پھر بعد کے سارے خطوط اسی زبان میں تحریر کیے ہیں۔

۴- یہاں پہلی مرتبہ Miss لکھا ہے۔ (یعنی Dear Miss Wegenast)۔

۵- اقبال نے یہ آیت انگریزی ترجمے میں لکھی ہے:
"Verily we are for God and to God we return"

ب میں نے گوئٹے کی شاعری آپ کے ساتھ پڑھی - اور مجھے امید ہے
کہ آپ کو بھی وہ ایام خوش یاد ہوں گے ، جب ہم روحانی[1] طور سے
ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے - اور میں محسوس کرتا ہوں کہ
ہم اب بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں — یہاں تک کہ میں روحانی
لحاظ سے آپ کا شریک غم ہوں ۔

جب آپ کا خط لکھنے کو جی چاہے ، تو براہِ کرم مجھے
ضرور لکھیے - کاش کہ میں جرمنی میں ہوتا ، تا کہ اپنی ہمدردی ذاتی
طور سے آپ تک پہنچا سکتا -

فی امان اللہ[1]
ہمیشہ آپ کا[2]
محمد اقبال ایڈووکیٹ
لاہور

۱۹

لاہور (انگریزی سے)
، جون ۱۹۱۳ء

عزیزۂ من فرالیلالین[2] ویگے ناسٹ

کچھ عرصہ ہوا مجھے آپ کا خط ملا تھا - جسے پا کر مجھے
بے حد خوشی ہوئی تھی - بدقسمتی سے علالت کی وجہ سے میں اس
سے پہلے ، اس کے جواب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا - یہ بڑے افسوس
کی بات ہے کہ میں آپ کو آپ کی خوبصورت جرمن زبان میں نہیں
لکھ سکتا ہوں ، جو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں اب
بالکل بھول چکا ہوں - سوائے اس کے کہ میں اپنے جرمن احباب کے
خطوط پڑھ اور سمجھ سکتا ہوں - اگلے روز میں ہائنے[4] کا مطالعہ کر رہا
تھا ، اور مجھے وہ پُرمسرت دن یاد آ گئے جب ہائیڈل برگ میں محترمہ
پروفیسر صاحبہ کے یہاں ہم دونو اُس کو ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے -
وہ کیا اچھی بزرگ خاتون[5] تھیں ! امید ہے کہ وہ بخیریت ہوں گی -
اگر آپ کی اُن سے کبھی ملاقات ہو تو میرا سلام انھیں دیجیے گا -

مجھے یہ جاننے کا بڑا اشتیاق ہے کہ آپ ان دنوں کیا کر رہی
ہیں - اور آپ کے کیا ارادے ہیں (اگر ہیں تو) - ہوسکتا ہے کہ میں
اگلے سال یورپ آؤں - لیکن اس کا کچھ ٹھیک [پتہ] نہیں ہے - یہ
سب حالات پر منحصر ہے[6] - اگر میں واقعی یورپ آیا ، تو یقیناً اس
دیارِ قدیم جرمنی کا بھی پھر سفر کروں گا ، اور آپ سے دوبارہ
ہائیڈل برگ یا ہائل برون (Heilbronn) میں ملاقات کو آؤں گا ، جہاں
سے ہم دونوں ایک ساتھ اُس عظیم فن کار[7] گوئٹے کے مزارِ مقدس کی
زیارت کو جائیں گے -

اگرچہ مجھے آپ کے بھائی اور بہنوں کے ساتھ ملاقات کا کبھی
شرف حاصل نہ ہوا تھا ، پھر بھی بالضرور میرا سلام ان کو
دیجیے گا -

آپ کا مخلص
محمد اقبال

۲۰

لاہور (ہندوستان) (انگریزی سے)
۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء

عزیزۂ من فرالیلالین ویگے ناسٹ

آخر کار وہ ہولناک جنگ اب ختم ہو گئی ہے[1] - اور چار سال کی
طویل خاموشی کے بعد مجھے دوبارہ آپ کو خط لکھنے کا موقع حاصل
ہوا ہے - آپ کا ملک ایک عظیم آزمائش میں سے گزرا ہے - اور میں
امید کرتا ہوں کہ جلد ہی وہ اپنے اُن نقصانات کو پورا کر سکے گا
جو اس جنگ سے اُسے پہنچے ہیں - اس تمام عرصے میں میں آپ کی
اور آپ کے عزیزوں ، اور بالخصوص آپ کے بھائیوں[2] کی سلامتی
کے متعلق بہت تشویش مند رہا ہوں - براہِ کرم جلد از جلد مجھے
اپنے اور اپنے بھائیوں کے حالات کے بارے میں تفصیل سے لکھیے -
جرمن قوم کو واقعی بہت بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں -

میں یہ خط انگریزی میں لکھنے کے لیے بڑا معذرت خواہ ہوں ،
لیکن میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ آپ کو اس خط کا ترجمہ
کروانے کی زحمت اٹھانی پڑے ، بہ نسبت اس کے کہ میں اپنی
غلط سلط اور بھونڈی جرمن سے آپ کے کان دُکھاؤں -

براہِ کرم ہائیڈل برگ والی محترمہ پروفیسر صاحبہ کے بارے میں
بھی اطلاع دیجیے - کیا آپ کو جناب رائنر (Herr Reiner) صاحب کی
طرف سے بھی کوئی خبر وغیرہ ملتی رہی ہے ؟ وہ کہاں ہیں ، اور
کیا کر رہے ہیں ؟

آپ کا مخلص
محمد اقبال
بیرسٹر ایٹ لاء
لاہور

---

۱. May God be with you -
۲. Yours ever -
۳. اگرچہ یہ اور اس کے بعد کے سب خطوط انگریزی میں ہیں ، تاہم اقبال نے عموماً طرزِ تخاطب جرمن زبان ہی کا برقرار رکھا ہے - یعنی My dear Frl. Wegenast -
۴. انیسویں صدی کا جرمن شاعر -
۵. Good old Lady ! -
۶. اس خط کے چند مہینوں بعد ہی (یعنی آغاز اگست ۱۹۱۴ء میں) جنگِ عظیم چھڑ گئی - اور نہ صرف علامہ اقبال کے منصوبے پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکے - بلکہ ان کی خط و کتابت مس ویگے ناسٹ کے ساتھ پانچ سال کے لیے منقطع ہو گئی -
۷. Master = استاد ، مرشد ، صاحبِ ہنر -

۱- پہلی جنگِ عظیم نومبر ۱۹۱۸ء میں بند ہو گئی تھی - مگر انگلستان اور جرمنی میں صلح نامے پر دستخط ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو ہوئے تھے -
۲- یہاں Brothers (برادران) لکھا ہے - اگرچہ اس سے پہلے خط میں انہوں نے صیغہ واحد میں بھائی لکھا ہے -

۲۱

۱۱۳- اے ، سینٹ جیمز کورٹ (انگریزی سے)
بکنگھم گیٹ
ایس ڈبلیو ۱[1]
۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء[2]

عزیزہ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

یہ جناب مٹسروتھ (Herr Metzroth)[3] کی بڑی کرم فرمائی تھی کہ انہوں نے مجھے آپ کا حالیہ پتا بہم پہنچایا ، جو مجھے آج صحیح موصول ہوا ۔ اور یوں میں آپ کو موجودہ خط لکھنے کے قابل ہوا ہوں ۔ مجھے امید ہے کہ یہ خط آپ کو اُن پُر مسرت دنوں کی یاد دلائے گا ، جو ہم نے ہائیڈل برگ اسکول یعنی 'شیرر منزل' (Pension Scherer) میں ایک ساتھ بسر کیے تھے ۔

براہ کرم مجھے خط لکھیے ، اور ان سارے برسوں کے دوران اپنی مصروفیات اور حالات سے مطلع کیجیے۔ مجھے آپ کا جواب پا کر بہت مسرت ہوگی ۔ فی الحال ہمیں[4] کافی عرصہ لندن میں رکنا پڑے گا اور جب لندن کی گول میز کانفرنس ختم ہو جائے گی ، تو اس کے بعد میرا ارادہ برلن کے رستے روم جانے کا ہے ، جہاں مجھے کچھ روز ٹھہرنے اور پرانے چند دوستوں سے ملاقات کرنے کا موقع ملے گا۔ اتنے سالہا سال کے بعد آپ سے مل کر مجھے بے اندازہ خوشی ہوگی ۔ مجھے اطلاع دیجیے کہ کیا ابھی کچھ عرصہ آپ ہائیڈل برگ ہی میں قیام رکھیں گی ؟

آپ کے خط کا منتظر
محمد اقبال

۲۲

۱۱۳- اے ، سینٹ جیمز کورٹ[5] (انگریزی)
بکنگھم گیٹ ، ایس ڈبلیو ۱
۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

یہ آپ کا غایت درجہ تلطف تھا کہ آپ نے مجھے خط لکھا ۔

مجھے آپ کا خط آج صبح سویرے اس وقت ملا جب میں ابھی بستر ہی میں تھا ۔ میں نے اسے ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا ۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ میں اسے پا کر بہت خوش ہوا تھا ، اور کچھ اس لیے کہ میں اسے پوری طرح سمجھ سکوں ۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ باوجود اُن تمام آلام و مصائب کے جن سے آپ کو دوچار ہونا پڑا ہے ، آپ زندگی سے خندہ پیشانی کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہی ہیں ۔ میں ہائیڈل برگ کے وہ ایام کبھی فراموش نہ کر سکوں گا ، جب آپ نے مجھے گوئٹے کا "فاؤسٹ" پڑھایا ، اور دیگر کئی طرح سے میری مدد کی تھی ۔ وہ کیا ہی بہجت افزا دن تھے ! مجھے آپ کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنے وقت پر مختار نہیں ہیں ۔ چنانچہ میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ میں ہائیڈل برگ آؤں ، اور آپ سے اسی پرانے مقام پر ملاقات کروں ۔ مجھے اب تک دریائے نیکر یاد ہے ، جس کے کنارے پر ہم دونوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے ۔ لیکن فی الحال کوئی بات پختہ نہیں ہے ۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی میں آپ کو اطلاع دے سکوں گا کہ آیا میں روم جاتے ہوئے رستے میں جرمنی سے گزر سکتا ہوں یا نہیں ۔ مجھے روم سے ایک دعوت موصول ہوئی ہے اور میں بالآخر ہندوستان کی واپسی سے پہلے وہاں جانا چاہتا ہوں ۔

مجھے یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ میری یہ بڑی ہی آرزو ہے کہ میں پھر آپ سے ملوں اور اُن پُر مسرت دنوں کی یادیں تازہ کروں جو افسوس کہ اب ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں ۔

دریں اثنا ، مجھے تاکید سے خط لکھیے گا ۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

پس تحریر : اب میں پروفیسر نہیں ہوں ۔

۲۳

۱۱۳- اے ، سینٹ جیمز کورٹ (انگریزی سے)
بکنگھم گیٹ
این ڈبلیو (کذا)[1]
۱۹ نومبر ۱۹۳۱ء

مائی ڈیئر مس ویگے ناسٹ

یہ آپ کی بڑی کرم فرمائی تھی کہ آپ نے خط لکھا ، اور میں آپ سے ہائیڈل برگ میں ملنے کے لیے منتظر تھا ، لیکن مجھے بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دینی پڑتی ہے کہ میرے پروگرام میں بعض ایسے ضروری تغیرات یکایک نمودار ہو گئے ہیں کہ جن کے پیش نظر اب میرے لیے جرمنی کے رستے سفر کرنا ممکن نہیں رہا[2] ۔ میں سیدھا روم جا رہا ہوں ۔ جہاں جناب مارکونی[3] نے مجھے مدعو کیا ہے ۔ اور وہاں سے میں ، دسمبر کو منعقد ہونے والی مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت کرنے کے لیے یروشلم روانہ ہو رہا ہوں[4] ۔ اس امر سے مجھے بے اندازہ خوشی ہوتی کہ میں زندگی میں ایک مرتبہ پھر آپ سے مل سکتا اور پرانی صحبتوں کو پھر زندہ کر سکتا۔ لیکن یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ یہ بات ناممکن ہو گئی ہے ۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ میں شاید اگلے سال پھر یورپ آؤں ۔ اگر ایسا ہوا تو میں

۱۔ یعنی لندن ، جنوب مغرب ۱ ۔
۲۔ علامہ اقبال اُن دنوں دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں قیام پذیر تھے۔ جہاں وہ ۲۰ ستمبر کو پہنچے تھے ۔
۳۔ غالباً انہی صاحب کا نام عطیہ بیگم کی کتاب "اقبال" (مترجمہ عبدالعزیز خالد ص ۱۰) میں ملتا ہے ، جہاں اس کے ہجے Metzroth ہیں ۔
۴۔ یعنی گول میز کانفرنس کے مندوبین کو ۔
۵۔ 3 A, St. James's Court, Buckingham Gate, S W 1.

۱۔ N.W.I. یعنی شمال مغربی لندن ۱ ۔ یہ سہو قلم ہے ، S.W.I. ہونا چاہیے تھا ۔
۲۔ دوسری گول میز کانفرنس کے خاتمے سے چند روز پیشتر ہی علامہ ۲۱ نومبر ۱۹۳۱ء کو لندن سے ٹرین کے ذریعے برلن پیرس روم روانہ ہو گئے جہاں وہ ایک ہفتہ ٹھہرے ۔
۳۔ Signor Marconi ۔
۴۔ رستے میں علامہ قاہرہ میں رکے پھر یروشلم پہنچے ۔

امید کرتا ہوں کہ آپ سے ملنے کے لیے ہائیڈل برگ آنے کی پوری کوشش کروں گا۔ براہ کرم میرا صمیمِ قلب سے بھیجا ہوا سلام قبول کیجیے، اور یہ اپنی ان سہیلیوں کو بھی پہنچائیے جن سے آپ نے ہائیڈل برگ میں میرا تعارف کرایا تھا۔ گاہے بگاہے تاکید سے مجھے میرے لاہور ہندوستان کے پتے پر خط لکھا کیجیے۔ جیسا کہ فارسی کی ایک ضرب المثل ہے۔ 'خط نصف ملاقات ہے'۔

امید ہے کہ آپ ہر طرح سے بخیریت ہیں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

۲۴

ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاء[1]

لاہور[2] (انگریزی سے)

۱۵ جنوری ۱۹۳۳ء

عزیزۂ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

مجھے آپ کا خط کل موصول ہوا، اور میں نے اس کے مندرجات بڑی مسرت کے ساتھ پڑھے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں جرمنی نہ آسکا اور ان سہانے دنوں کی یادیں تازہ نہ کر سکا، جو میں نے آپ کی اور کچھ دیگر احباب کی معیت میں ہائیڈل برگ میں بسر کیے تھے۔ میرے یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ ان تمام برسوں میں میں نے آپ کو کبھی فراموش نہیں کیا، اور میرے دل میں ہمیشہ یہ تمنا زندہ رہی ہے کہ میں دوبارہ آپ سے ملوں گا، لیکن بختِ تیرہ کو جو منظور ہوا: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ان دنوں کی یاد، جب ہم گوئٹے کا "فاؤسٹ" ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے، ہمیشہ ایک غم انگیز مسرت[3] کے ساتھ میرے دل میں آتی رہتی ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو بتاؤں کہ ان تمام سالہا سال کے دوران میں کیا کرتا اور سوچتا رہا ہوں، تو سنیے: میں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور وہ تمام چیزیں جو میں نے بطور شاعری اور فلسفے کے لکھی ہیں، وہ میں نے شائع کر دی ہیں۔ تاہم، میرے ذہن نے ہمیشہ ایک کمی سی محسوس کی ہے، اور خود کو اپنے ان ہندی گرد و نواح میں تنہا سا پایا ہے۔ جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے، اس تنہائی کا احساس بھی فزوں تر ہوتا جاتا ہے۔ لیکن سوائے تسلیم و رضا کے ہمارے لیے اور کوئی چارۂ کار نہیں، اور میں نے بھی پوری تسکینِ دل کے ساتھ اپنی قسمت کو قبول کر لیا ہے۔

یہ بات باعثِ تاسف ہے کہ میں جرمن زبان کے ساتھ اپنا رابطہ قائم نہیں رکھ سکا ہوں۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے خطوط کو جرمن لغت کی مدد سے پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہوں، بجائے اس کے کہ کسی اور سے ان کا ترجمہ کرواؤں۔ اپنے خطوط کسی اور کو دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کا خط ختم کرنے میں خواہ تین دن لگیں، پھر بھی میں اپنے طور پر انہیں ایک لغت کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ کسی اور کو دکھاؤں۔ اور میں نے ہمیشہ یہی پیرایۂ عمل اختیار کیا ہے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ اپنی بہن کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ان کی تصویر دیکھی تھی، جو آپ نے مجھے دکھائی تھی۔ براہ کرام انہیں اور اپنے ان دوسرے دوستوں کو میرا سلام دیجیے، جن سے میں ضرور جرمنی ملا ہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں دوبارہ یورپ آؤں گا، اور اگر میں آیا تو میں بالالتزام آپ سے اور آپ کی ہمشیرہ سے ہائیڈل برگ ملنے آؤں گا۔

جرمنی میرے لیے ایک طرح سے دوسرا روحانی وطن تھا۔ میں نے اس ملک میں بہت کچھ سیکھا، اور بہت کچھ سوچا تھا۔ گوئٹے کے وطن نے میری روح کے اندر ایک دائمی گھر حاصل کر لیا ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گی۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

۲۵

(انگریزی سے)

۱۲ دسمبر ۱۹۳۲ء

کوئین اینز مینشنز[1]

لندن، ایس ڈبلیو ۱

عزیزۂ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

میں ایک مختصر عرصے کے لیے دوبارہ انگلستان میں ہوں[2]، اور یہ خط یہ دریافت کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں کہ کیا آپ تا حال ہائیڈل برگ شٹاؤبن سٹراسے نمبر ۵۴[3] ہی میں مقیم ہیں؟ امید ہے آپ ہر طرح سے بخیریت ہوں گی۔ از راہِ کرم جلدی خط کا جواب دیجیے گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

۲۶

(انگریزی سے)

۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء

کوئین اینز مینشنز

سینٹ جیمزز پارک

لندن ایس ڈبلیو ۱

عزیزۂ من فرائیلائین ویگے ناسٹ

آپ کے خط کے لیے شکریہ۔ میں لندن سے ۳۰ دسمبر کو روانہ

۱- خط کی پیشانی پر علامہ کا نام اور پتہ تحریر ہے۔
۲- علامہ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کو بمبئی پہنچے تھے، جہاں بیگم عطیہ فیضی نے ان کے اعزاز میں اپنی یہاں ("ایوان رفعت" میں) ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ مختصر قیام کے بعد وہ اسی شام ٹرین سے لاہور روانہ ہوگئے تھے، جہاں وہ ۳۰ دسمبر کی صبح کو پہنچے۔
۳- painful happiness

۱- Queen Anne's Mansions, St. James's Park London SWI.
۲- علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ وہ بمبئی سے جہاز پر وینس تک سفر کرنے کے بعد وینس سے ٹرین کے ذریعے پیرس روانہ ہوئے، اور پھر وہاں رکنے کے بعد کالے سے اوائل نومبر ۱۹۳۲ء میں لندن پہنچے۔ یہ کانفرنس ۱۷ نومبر کو شروع ہوئی تھی۔
۳- 54 Steuben Str.

پون ۶ - جیسے موجودہ پروگرام کے مطابق میں ہائیڈل برگ ۱۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو رات کے دس بج کر تیس منٹ پر (۲۲۔۱۰ شب) پہنچوں گا ، اور ہائز شریوف[1] ہوٹل میں ٹھہروں گا ۔

ہائیڈل برگ میں میرے قیام کا واحد مقصد آپ سے اتنے سال گزرنے کے بعد دوبارہ ملنا ہے ۔

میں آپ سے ملاقات کا بڑے اشتیاق کے ساتھ منتظر ہوں[2] ۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

۲۷

میلرڈ (انگریزی سے)

۳۱ جنوری ۱۹۳۳ء

میں جنوبی ہسپانیہ کے دورے کے بعد آج میلرڈ واپس پہنچا ہوں ۔ افسوس کہ میرے لیے اس مرتبہ ہائیڈل برگ آنا ناممکن ہو گا ۔ مجھے وہ سارے ٹکٹ منسوخ کرنے پڑے جو میں نے لندن میں خریدے تھے ۔ کیونکہ میرے لیے لازمی ہے کہ میں وینس سے دس فروری ۱۹۳۳ء کو روانہ ہونے والا جہاز کونٹے وردی[3] پکڑوں ۔ ہو سکتا ہے کہ میں اپریل میں پھر انگلستان آؤں ۔

آپ کا

محمد اقبال[4]

حرفِ آخر

گول میز کانفرنس کے خاتمے کے بعد علامہ اقبال دسمبر کے آخر میں ٹرین کے ذریعے لندن سے پیرس گئے ، جہاں وہ برگساں سے ملے ۔ اس کے بعد وہ سیدھے میلرڈ چلے گئے ۔ اور وہ نہ جانے ہائیڈل برگ کے راستے کیوں نہ گئے ۔ جو پیرس سے اتنا دور نہ تھا ۔ شاید کانفرنس کے کچھ اور مندوبین ، اُن کے ساتھ ہوں[5] ، جن کے ساتھ انہیں اپنا پروگرام منطبق کرنا پڑا ۔ میڈرڈ کے بعد (بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (سرگذشتِ اقبال ، ص ۴۱۹ - ۴۲۳) علامہ اقبال روم بھی گئے جہاں وہ مسولینی سے ملے ۔ لیکن خورشید صاحب کو مغالطہ ہوا ہے چونکہ علامہ ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کو یعنی دوسری گول میز کانفرنس کے خاتمے کے بعد) مسولینی سے مل چکے تھے دیکھیے ؛ "سفرنامہ اقبال" (از محمد حمزہ فاروقی - ص ۱۲۱ - ۱۲۶) - بہرحال علامہ اقبال وینس سے دس فروری ۱۹۳۳ء کو جہاز سے روانہ ہو کر ۲۲ فروری کے روز بمبئی ، اور پھر ۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو لاہور پہنچ گئے ۔ اس کے بعد وہ اپریل میں دوبارہ لندن نہ گئے (جہاں شاید گول میز کانفرنس کی کچھ اور کاروائیاں ہو رہی تھیں) - اور نہ اس کے بعد کبھی یورپ جا سکے ۔ انہیں ۱۹۳۴ء کے اواخر میں لارڈ لوتھین کی طرف سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں Rhodes Lectures دینے کی دعوت ملی تھی - ۱۹۳۵ء میں ان لیکچروں کا انعقاد بھی طے پا گیا تھا ، لیکن علامہ اقبال اپنی طویل بیماری کی وجہ سے انگلستان نہ جا سکے ، اور یہ لیکچر منسوخ کرنے پڑے - اس طرح علامہ کو باوجود اپنی تمام تر خواہش کے ، زندگی بھر دوبارہ جرمنی جانے اور مس ویگے ناسٹ سے ملنے کا موقع نہ مل سکا ۔ ❁

۱- Bayerischer Hof یعنی انگریزی کے مطابق Bavaria Court Hotel

۲- لیکن اگلا خط بھی دیکھیے - اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ۔

۳- Conte Verdi ۔

۴- Md. Iqbal ۔

۵- سید امجد علی علامہ کے ساتھ اسپین جانا چاہتے تھے ۔ لیکن ایک روایت کے مطابق ان کی ناک میں پھنسی نکل آئی اور وہ نہ جا سکے ۔ ہاں اس سفر ہسپانیہ میں ایک لیڈی سیکرٹری ضرور علامہ کے ہمراہ تھی - (دیکھیے اس کتاب میں میرا مضمون "ہسپانیہ میں علامہ کے [illegible]" - ص [illegible]) -

---

ایشیا کا ملک الشعراء اور
انگلستان میں سر محمد اقبال سے اظہارِ عقیدت

لندن ۔ ۹ نومبر ۔ گول میز کانفرنس کے متعدد مسلم مندوبین اور دوسرے حضرات نے ہز ہائی نس سر آغا خان کی صدارت میں علامہ سر محمد اقبال کے اعزاز میں ایک جلسہ خیر مقدم منعقد کیا ، جس میں اقبال لٹریری ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا ۔ سر عبدالقادر ، مسٹر اے آر نکلسن اور مسٹر عبداللہ یوسف علی نے علامہ ممدوح کو ان کے شاندار کارناموں پر خراجِ تحسین ادا کیا ۔

ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا ، جس میں ان کا مقصدِ شاعری اجمالاً بیان کیا گیا اور بتایا گیا کہ آپ نے فارسی زبان اس لیے اختیار کی ہے کہ آپ کا خیال تھا کہ آپ کے پیغام کے متعلق وہ لوگ مغالطہ میں پڑ جائیں گے جو اس کے سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے ، اس لیے آپ نے ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے ہندوستان میں بہت کم لوگ واقف ہیں ۔

مسز سروجنی نائیڈو کا خراجِ تحسین ۔

مسز سروجنی نائیڈو نے اپنے ایک شاعر بھائی کی تعظیم بجا لاتے ہوئے علامہ کو ایشیا کا ملک الشعرا قرار دیا ۔ مسز سروجنی نائیڈو نے کہا :

"میرے نزدیک علامہ اقبال اس متحدہ ہندوستان کا نشان ہیں جس پر دنیا کی امید اور امنِ عالم کا قیام ہے"۔

گول میز کانفرنس کے متعدد مندوبین اس جلسہ میں شریک ہوئے ، جن میں مسٹر گاندھی بھی شامل تھے ۔

انقلاب - جلد ۶ - نمبر ۱۳۲ - سہ شنبہ - ۱۰ نومبر ۱۹۳۱ء -

❁

انڈیا سوسائٹی کی وائس پریزیڈنٹ شپ

انگلستان میں " انڈیا سوسائٹی " ایک مشہور انجمن ہے ، جس کی سرپرستی میں ہندوستان کی قدیم و جدید ادبیات اور قدیم و جدید فنون لطیفہ کے متعلق مذاکرات ہوتے رہتے ہیں ۔ پچھلے دنوں اس انجمن کے زیرِ اہتمام مسٹر پلکھراج اللہ نے حضرت علامہ اقبال کی شاعری پر ایک مضمون پڑھا تھا ، جس کا ملخص "انقلاب" میں چھپ چکا ہے ۔ اس انجمن کے صدر سر فرانسس ینگ ہسبینڈ ہیں ۔ حال ہی میں سر فرانسس نے حضرت علامہ سے درخواست کی ہے کہ آپ انڈیا سوسائٹی کی وائس پریزیڈنٹ شپ قبول فرمائیں ۔ انگلستان کا سابق ملک الشعرا رابرٹ برجز بھی اس سوسائٹی کا وائس پریزیڈنٹ تھا ۔

انقلاب ، جلد ۹ - نمبر ۵۹ - جمعہ - ۷ اگست ۱۹۳۴ء -

۲۵۰

c/o Messrs Thomas Cook & Son
Ludgate Circus
London
2nd Dec. 07.

[illegible] liebes Frl. Emma,

Ich habe Ihre Brief bekommen. Es ist so traurig dass Ich meine [illegible] vergessen habe, Ich war sehr beschäftigt, und konnte nicht viel [illegible] –, warum lernen sie nicht English – es wird so leicht für [illegible] Ihnen zu schreiben & meinen herz zu sagen. Ich dachte dass Ich fähig werden [illegible] durch [illegible] zu reisen, aber es nicht möglich war. Es war absolut [illegible] wendig für mich in London zu sein am 5th Nov. [illegible] ist noch [illegible] gegangen und Ich bin ein Prof. [illegible] von Arabisch ernant. Ich habe zwei [illegible] lesungen in einen woche.

Ich kann nicht viel sagen oder schreiben – Sie können bilden [illegible] Ich in meinen Geist habe. Mein grosser wunsch ist noch einmal mit [illegible] zu [illegible] und sie zu [illegible] – aber Ich weis nicht was zu tun. Für [illegible] welcher hat Ihr Freundschaft gemacht, es ist nicht möglisch ohne [illegible] zu leben. Bitte vergeben Sie für was Ich geschreiben habe. Ich denke Sie [illegible] solche ausdrücken nicht gern.

Bitte schreiben Sie bald und [illegible]. Es ist nicht gut etwas zu [illegible] von einem person welcher verdirbt nicht von Ihnen.

Yours sincerely,

S.M. Iqbal

۲۵۱

c/o Messrs Thomas Cook & Son
Ludgate Circus
London E.C.
20th Jan. 08

[illegible]in liebes Frl. Wegenast,

[illegible] Danke tausendmal für die Photographien die Ich [illegible]ute Abend erhalten. Es ist so gut von Ihnen. Beide [illegible]nd schon und sie werden immer in meinem studie-zimmer [illegible]f meinem Tisch stehen. Aber glauben sie nicht dass [illegible]e nur auf dem papier sind; sie sind auch in meinem [illegible]s, und werden immer da bleiben.

[illegible]lleich ist es nicht möglisch für mich sie weider zu [illegible]hen --- aber Ich muss erkennen dass sie in meinem [illegible]ben eine wirkliche Kraft gewesen sind. Ich werde [illegible]e neimals f vergessen und mich immer von Ihrer [illegible]te erinnern.

[illegible] habe mein Deutsch ganz vergessen. Warum lernen sie [illegible]cht English? – wir werden einander besser verstehen. [illegible]tte schreiben sie bald ---. Als Ich photographiert [illegible] Ich werde auch meine [illegible] schicken. Adieu mein [illegible]ebes Frl. Emma, und glauben sie mich immer

Ihrer
S.M. Iqbal

(P.S. on envelope: Ich [illegible] beide [illegible] haben.)

۲۴۸

Pension Thurner
Schelling Str. 41 I
München
27th Oct. 07

Mein liebes Frl. Wegenast,

Ich danke Ihnen für den Brief. München gefällt mir sehr viel. Herr Reiner schrieb zu seiner Freundin hier, und Sie hat, für mich, eine Lehrerin besorget. Obgleich gibt es keine gelegenheiten Deutsch zu sprechen in dem Pension, Ich spreche viel mit den zwei Lehrerinen. Gestern gingen wir die Kunst Ausstellung zu besuchen. Es gibt so viele schöne Bilder verstellt in der Ausstellung dass man sich in dem Traumland fühlt. Zwie stunden waren wir da, und meine Lehrerin, die die Kunst versteht, erklärte mir manche sachen welche Ich nicht zuver wusste.

Gestern hatte Ich einen Brief von Frau Professor. Sie hörte von Herrn Reiner dass Ich mit dem Pension nicht zufrieden bin. Ich habe ihr geschrieben dass, wenn man einmal im Pension Scherer gewöhnt hat, es nicht möglisch ist mit einem anderen Pension zufrieden zu werden.

Heute kann Ich nicht ausgehen. Das Wetter ist nicht günstig. Bitte entschuldigen Sie mein schlechtes Deutsch und auch was Ich in meinem ersten Briefe geschrieben habe. Ich höffe dass sie ganz gesund sind. Ich habe nicht die Geduld zu denken and mein Deutsch richtig hier zu schreiben. Ihr Freund, S.M. Iqbal

۲۴۹

London
16th Nov. 07

Mein liebes Frl. Wegenast,
Ich habe Ihre Briefe bekommen. Aber ich bin noch nicht angesiedelt. Werde schreiben später.

Herzlichem Gruss
Iqbal

The original of this letter has been reproduced from 'IQBAL in Pictures' by Fakir Syed Wahued-ud-Din (Karachi, 1965). The address shown on the back of the post card should correctly have been: 16 Luisenstr., Heilbronn.

۲۵۲

c/o Messrs Thomas Cook & S
Ludgate Circus
London E.C.
21st. Jan 08

Mein liebes Frl. Emma,

Glauben sie dass Ich nachlessig bin? Es ist ganz unmoglich --- Ich war sehr Krank als Ihre letztere Brief kam und es machte mich noch mehr Krank; für si[e] sagten dass sie viele sturmen ubergegangen und Ihre Friede wider gewinnen hatten. I ch dachte dass sie wunschten nicht mit mir Brief zu wechseln und dass machte mich sehr bekummert. Nun habe Ich ein Brief von Ihnen und es mich sehr gefreut hat. Immer denk[e] ich von Ihnen und mein herz ist immer voll von schö[nen] Gedanken!

Ein Funke wachst ein Sausen und eine Flame eine grosse Brand! Aber sie sind unparteilich, gleichgultig --- Tun sie was sie wollen, Ich werde sagen nichts und sein immer Geduld.

Vielleicht werde Ich Sie besuchen als Ich nach Indie[n] gehe. Ich habe mein Deutsch ganz vergessen, warum lernen sie nicht English

Ihrer

Iqbal

۲۵۳

c/o Messrs Thomas Cook & Son
Ludgate Circus
London E.C.
20th Feb.08

Mein liebes Fraulein Wegenast,

Ich muss apologieren vor alles --- Ich hatte so viel zu tun dass Ich konnte nicht zu Ihnen schreiben. Ein guter Engel als Sie sind, Ich hoffe dass sie mich vergeben werden. Heute abend auch habe Ich eine Verlesun[g] zu geben --- 'Mysticismus'. Frau Prof. schrieb mir ein Brief vor einige tagen. Ein Franzosicher Schüler von Frau Prof. war in London, und wir zusammen schreiben ein Brief an Frau Prof. Warum lernen sie nicht English? Ich bin beschamt Ihre ohren zu beleidigen mit meinen schlechtes Deutsch --- obgleich benutze Ich die Gelegenheiten von diesen Briefwechselungen als Deutsche Stunden. So sie unterrichten mich immer noch.

Im Anfang Juli werde Ich nach Indien gehen, und hoffe dass es moglich sein wird Sie zu besuchen vor meinem Reise . Ich werde mich bestreben nach Heidelberg zu kommen fur einige Tagen. Aber wenn es nicht moglich ist konnen sie mich im Paris treffen? Wann werden sie nach Heidelberg kommen? Wo ist Herr Reiner? Er niemals schreibt mir ein Brief --- Ich habe zwei geschrieben. Vielleicht er ist sehr beschaftigt.

Was tun Sie alles tag? Lesen sie oder zubringen sie Ihre Zeit mit Freundinnen?

Ihre Photo ist auf meinem Tisch, und immer erinnert mir von dem gluckliche Zeit die Ich mit Ihnen zugebracht habe.

Mit einer Rosenkranz von gluckliche Gedanken. Ihr
[illegible] Iqbal

۲۵۴

c/o Messrs. Thomas Cook & Co.
Ludgate Circus
London E.C.
3rd June 08

Mein liebes Frl. Wegenast,

Ich hatte ein Brief von Ihnen und Ich schreibe eine antwort gleich. Vielleicht mein antwort haben sie nicht erhalten. Besten Danken fur Ihre post carte...

Bitte schreiben sie bald und sagen sie zu mir was sie tun und Denken. Warum warten sie auf meinen Brief. I wunsche jeden tag von Ihnen zu horen. Frl. Fyzee ist heir mit ihre Schwester und Schwager der ein Indian Furst ist. Ich ging vor einige tag um sie zu besuchen. Sie ist wohl und im besten Giest. Vielleicht werden sie nach Deutschland kommen.

Ich bin sehr beschaftigt --- werde England verlassen bald --- im anfang Juli. Ich weis nicht ob es moglisch sein wird durch Deutschland zu fahren. Es ist meine grosse wunsch Sie zu besuchen vor Ich nach Indien reise. Seien sie nicht grausam --- Bitte; Schreiben sie bald und alles. Mein Korper ist heir, mein Gedanken sind in Deutchland. Es ist Fruhling, die Sonne lachelt, mein herz, aber, ist traurig. Senden sie einige worter, und Ihre Brief wird meinen Fruhling sein. Ich habe sehr schone Gedanken fur sie in meinen traurigen Herzen, und Schweigsam gingen sie nach Ihnen ein nach ander. Diese sind meine Wunsche fur sie.

Ihr
Iqbal

۲۵۵

c/o Messrs Thomas Cook & Son
Ludgate Circus
London E.C.
10th June 08

Mein liebes Frl. Wegenast,

Ich habe schon geschrieben und warte auf Ihren Brief. Hiermit schliess Ich ein Photographie von mir. Vielleicht werde Ich eine andere Bild zu Ihnen schiken.

Ihre

S.M. Iqbal

P.S. Ich reise nach Indien am 2. Juli und werde von da schreiben.

۲۵۶

49, Elsham Rd.
Kensington W.
London
27th June 08

Mein liebes Frl. Emma,

Ich habe mein bestes gethan um durch Deutschland zu fahren --- aber es nicht muglich ist. Ich werde am 3rd July verlassen und einige Tage in Paris bleiben wo ich [illegible] zu tun habe.

Ich hatte es um meinem Kopf. Es gab viele tausende Menschen an der Bahnhöfen von allen stationen von Bombay zum Lahore und Sialkot wo Ich fand viele Kinder und erwachsenen meinen eignen Gedichten singend aus der Bahnhof über dem weg.

Es freut mich dass meinen Eltern waren ganz gesund als Ich nach heimaat kam. Meine Schwestern und Mutter sind nun ganz zufrieden mich heir zu haben.

Ich bin nun ins Lahore und arbeite als ein Advokat.

Es ist nicht möglich für mich immer zu vergessen Ihren schonen Land wo habe ich viel gelernt, und ________

Bitte Schreiben Sie immer zu mir ————————
Vielleicht wir treffen wieder ins Deutschland oder ins Indien. Nach etwas Ziet als ich ein wenig geld habe, will Ich meinen heim ins Europa machen. Das ist meinen Ansicht und Ich höffe dass es alles gut sein wurden.

۲۵۳

Es ist sehr traurig von Herrn Chaubals' Todt zu heren. Vielleicht Sie erinnern Sich dass Ich zu Ihn vielmal von seinen Gesundheit sagte.

Bitte vergessen Sie nicht den Freunden welchen Sie immer zu herzen hat und kann Sie niemals vergessen. Mein Aufenthalt ins Heidelberg erscheint zu mir wie ein schönen Traum und Ich wunsche es zu wiederholen. Ist es moglich? Sie kennen wohl.

Mit herzlichen Grüssen
Ihr
S.M. Iqbal
Bar - at - Law

۲۹.

Deutschland über alles

Lahore
(India)
20th July 09

Mein liebes Fraulein Emma,
Es ist so gut von Ihnen an mich zu schreiben. Es erfreut mich sehr viel ein Brief von Ihnen zu haben, und ich warte angstlich auf der Zeit Sie noch einmal ins Ihre Heimat zu besuchen. Bitte schreiben Sie an mich immer und immer. Deutschland habe ich sehr gern - er hat eine grosse Einfluss über meine Idealen gemacht, und ich werde neimals vergessen meinen Aufenthalt ins Deutschland. Ich lebe hier ganz allein und finde mich sehr traurig. Unsere Schicksal ist nicht in unseren eigenen Händen. Es gibt ein grosser Macht welcher unseren leben reguliert. Frau Professer, Herr Professer und alle Damen und Herren habe ich immer in meinem Herzen. O die Tag als ich im Deutschland war!

Fraulein Faizi ist in Bombay. Ihr Mutter ist tot und sie war sehr traurig. Sie ist ein wenig besser nun. Manchmal Ich fühle mich ganz allein und finde mich in einem grossen Sehnsucht nach Europa und Deutschland in speziel. Bitte geben Sie mir einen

Bitte schreiben sie bald; Ich wunsche ein Brief von Ihnen zu haben bevor Ich nach Indien reise. Nachte Jahr hoffe Ich nach Europa zuruck zu kommen und sie zu besuchen. Vergessen Sie nicht dass es gibt eine unsichtbare verbindung zwischen uns, obgleich viele Länder und meere uns trennen von einander. Mit ein magnetischer gewalt meine gedanken eilen nach Ihnen und diese verbindung festigen und stark machen. Schreiben sie mir immer, und erinnern sie sich dass sie ein treuer freund haben obgleich er entfernt is. Wenn die herzen bei einander sind, entfernung macht nicht.

Bitte schreiben sie gleich

Ihr
S.M. Iqbal

P.S. Es tut mir Leid von Herrn Chaubals' Krankheit horen. Ich sagte zu ihm dass es daher sorgvol sein muss.

۲۵۴

Sialkote City
India
3rd Sep. 08

Mein liebes Frl. Wegenast,

Ich habe here gekommen. Es ist sehr schade dass es nicht mögliech war sie zu besuchen vor Ich verliess England. Bitte schreiben sie bald was sie tun jets Ich habe entschieden meine Geschäft in Lahore zu beginnen. Es ist ein gutes plats für ein Advocat. Ich glaube dass Sie ins Heidelberg sind. Bitte geb Sie meine salutations zu Frau & Herr Professor, und denken Sie von mir when sie zusammen sind.

Es hat here sehr viel geregelt (geregnet?). Alles wasser, und wir hoffen mehr.

Ich habe meine Deutsche ganz fergessen, aber Ich erinnere mich nur ein Wort --- Emma.

Ihr
S.M. Iqbal

۲۵۱

Lahore
(India)
11th Jan. 09

Mein liebes Frl. Emma,

Fur Ihren Freundlichen Brief Danke Ich Ihnen vieles Es ist so gut von Ihnen zu schreiben und sich von mi zu erinnern wenn Ich so weit bin von Deutschland. Von Heidelberg habe Ich keine Briefe von Ihnen erhal ten. Vielleicht Ihren Brief ist verloren, und Ich fühle mich sehr traurig zu horen dass meinen Brief verloren gegangen ist.

Meine Landsleute gaben mir eine grosse Ehre als Ich ins Indien kam. Es ist nicht möglich für mich in worten zu erklaren. Vielleicht 40 Gedichte von all Seiten meinen Land zu mir geschickt wurden ... als grüsse von Freunde und andere Leute. Als ich ins Lahore kam sie gaben mir ein Garland von Gold, und

۲۹۳

Lahore
30th July'13

Dear Miss Wegenast,

I am exceedingly sorry to hear the sad news of your father's death; and though my letter must reach you a good many days after this sad event, yet neither time nor distance can make my sympathy with you in your bereavement any the less warm. The news has pained me very much indeed, and I pray that Almighty God may be pleased to shower his choicest blessings on the venerable old man, and to give you strength to endure your sorrow. 'Verily we are for God and to God we return'. This is the sacred text which we recite when we hear the news of death. And I recited this verse over and over again on reading your painful letter. Such events do happen in everybody's life, and we must meet our troubles like those who have left us their lives to imitate.

You remember what Goethe said in the moment of his death --- 'More light'. Death opens up the way to more light, and carries us to those regions where we stand face to face with eternal Beauty and Truth. I remember the time when I read Goethe's poems with you, an I hope you also remember those happy days when we were so near to each other spiritually speaking. And I feel we are still near to each other --- so much so that I spiritually share in your sorrow.

۲۹۵

Please write to me when you feel inclined to do so. I wish I had been in Germany to convey my sympathy to you personally.

May God be with you
Yours ever
Mohammad Iqbal
Advocate
Lahore

۲۹۶

Lahore
7th June 1914

My dear Frl. Wegenast,

I was most happy to receive your letter some time ago. Unfortunately I was not able to attend to it earlier owing to ill health., It is a pity that I cannot write to you in your beautiful German tongue which, I am sorry to say, I have forgotten except that I can read and understand the letters of my German friends. The other day I was reading Heine, and I thought of the happy days when we read the poet together at Frau Professor's in Heidelberg. Good old Lady! I suppose she is alright. Please remember me to her if you happen to see her.

kleinen Platz in Ihren Herzen und Erinnerung.

Ihre Freund
S. M. Iqbal
Bar-at-Law

۲۹۱

Lahore
India,
22nd Sep.

Mein liebes Frl. Wegenast,

Ich habe Ihren Freundlicher Brief erhalten, und da... sie dafür. Heute ist der Brief-Post Tag; aber, un... glücklicherweise bin Ich sehr beschäftigt.
Nachste Woche werde Ich schreiben Sie ein langen B...
Ich glaube werde es möglich sein.
Das Fell ist von einem Tibet Schaaf. Es ist eigen... zu Halsband (collar) und Armel der Überzieher (ove... coat).

Mit herzliche Grüsse
Muhammad Iqbal
Bar-at-Law
Lahore
(India)

۲۹۲

Lahore
11th May 1911

Mein liebes Fraulein Wegenast,

Ihre schone Postkarte habe ich erhalt und schicke meine herzliche grusse zu Ihnen. Ich wünsche sehr viel nach Deutschland zu reisen um Sie zu besuchen, und weis nicht an was tag were es möglich sein. Me... Briefen aber geben Ihnen viel Material zu lacheln f... das Schreckliche Deutsch das Ich schreibe.

Die schone Cravaten hatte Ich erhalten, und ich bin sehr beschämt das Ich war zu beschäftigt Ihnen zu schreiben und meine Danke zu schicken.
Wenn man einen Sprache nicht schreiben kann Seine Fader ist viel miserable und es ist nicht möglich für solch ein Mann seine herzliche Gedanken zu entfalten. Ich habe keine Zeit mein Deutsch zu corretieren. Bitte vergeben mit für meine Fehler. Aber bitte schreiben Sie eine lange briefe. Ich hofe Fr... Professor ist wohl.

Ihre Freund
Muhammad Iqbal

۲۹۴

Viele Danken für Ihre Karte. Bitte Schrieben Sie m... wie geht es Ihnen. Es ist sehr heiss ins Lahore in diese Tagen. Wir leben in einen Hellen. Deutschland Ich werde niemals fergessen.

Iqbal

Den 4th July 1912

Wie ist Frau Prof. Ich glaube dem hause ist voll. ... ist das grosse Haus in Bekkt.

you will continue to stay in Heidelberg.

Waiting for your letter

Yours sincerely

Muhammad Iqbal

۲٦۹

113 A, St. James's Court
Buckingham Gate, SW 1
20th Oct. 1931

My dear Frl. Wegenast,

It was extremely kind of you to write. I received your letter early in the morning today when I was still in bed. I read it more than once partly because I was so glad to receive it and partly because I wanted to understand it better. I am glad to learn that in spite of the misfortunes that you have had to face you are cheerfully getting on in life. I shall never forget the days at Heidelberg when you taught me Goethe's Faust and helped me in many ways. Those were happy days indeed! I find from your letter that you are not the master of your time. I shall therefore try my best to come to Heidelberg and visit you once more in that old place. I still remember the River Neckar on the bank of which we used to walk together. But nothing is yet certain. I think I shall be able to tell you in a short time whether it is possible for me to come to Germany while going to Rome. I have received an invitation from Rome and want to go there before I finally leave for India.

It is hardly necessary for me to say that I have a great longing to meet you and to revive the memory of those happy days which, alas! are gone for ever.

In the meantime please do write to me.

Yours sincerely,

Muhammad Iqbal

P.S. I am no longer a professor.

۲۷۰

111 A St. James's Court
Buckingham Gate
N.W.1
19th Nov. 1931

My dear Miss Wegenast,

It was extremely kind of you to write and I was looking forward to meeting you at Heidelberg. I am, however, extremely sorry to tell you that in view of sudden changes necessitated in my programme it is not now possible to pass through Germany. I am going direct to Rome where Signor Marconi invited me and from there I am proceeding to Jerusalem to attend the International Muslim Conference on the 7th of Dec.

It would have given me immense pleasure to meet you once more in life and to revive old associations, but, as ill luck would have it, this has become impossible. It is possible that I may come to Europe again next year. If so I hope to be able to make it a point to visit you at Heidelberg. Please accept my heartfelt greetings to yourself and to your lady friends to

I should like very much to know what you are doing now and what are your plans if any. I may come to Europe next year. But there is no knowing; all depends on circumstances. If I do come at all I shall certainly visit old Germany and see you once more at Heidelberg or Heilbronn whence we shall together make a pilgrimage to the sacred grave of the great master Goethe.

Although I never had the pleasure to meet your brother and sisters yet I should like you to remember me to them.

Yours sincerely

Mohammad Iqbal

۲٦۷

Lahore (India)
10th Oct. 1919

My dear Frl. Wegenast,

The terrible war is now over; and I have an opportunity to write to you after four long years. Your country has passed through a great ordeal; and I hope she will soon make up the losses caused by the war. During all this time I have been anxious about you and your relations especially about your brothers. Please write to me soon and let me know all about yourself and your brothers. The people of Germany was called upon to make great sacrifices indeed;

Please excuse me for writing this letter in English; for I would gladly put you to the trouble of getting it translated by somebody rather than shock your ear by my wrong and clumsy German.

Kindly also let me know of Frau Prof. at Heidelberg. Have you ever heard of Herr Reiner? Where is he & what is he doing?

Yours sincerely,

Muhammad Iqbal

Barrister - at- Law

Lahore

۲٦۸

111 A, St. James' Court
Buckingham Gate
S.W. 1
15th Oct 1931

My dear Frl. Wegenast,

It was very kind of Herr Metzroth to send me your present address, which I received this morning. I am thus enabled to write the present letter to you.

I hope this will remind you of the very happy days we spent together at the Heidelberg School --- I mean Pension Scherer.

Please write to me and let me know all that you have doing all these years. I shall be so pleased to hear from you. We shall have to stay in England for some time, and after the Round Table Conference in London is over I intend to go to Rome through [illegible] where I shall be able to stay for a few days and to meet some old friends. It will give me immense pleasure to meet you after so many years. Let me know whether

whom you introduced me at Heidelberg. So write so
now and then to my address at Lahore – India. As
Persian proverb says ---'A letter is half the visi

Hoping you are quite well

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

۲۵۱

Dr. Sir Muhammad Iqbal
Barrister-at-Law

Lahore
17th Jan. 19

My dear Frl. Wegenast,

I received your letter yesterday and read its conte
with great pleasure. I am extremely sorry that I
not able to come to Germany and renew the memory o
the happy days which I spent with you and other fri
in Heidelberg. It is hardly necessary for me to s
that during all the years I have never forgotten y
& have always ente rtained hopes of meeting you ag
But as ill luck would have it my cherished hopes e
in nothing. The memory of the days when we read to
ther Goethe's Faust always comes back to me with pa
ful happiness. You wish me to tell you what I have
been doing and thinking during all these years. W
I have written much and published all that I have
written in the way of poetry and philosophy. Yet m
mind has always lacked something and has nearly alw
found itself lonely in my Indian surroundings. The
sense of this loneliness increases as I advance in
years. But we cannot but accept our lot with resig
nation. And I have done so with perfect equanimity

It is a pity that I have not been able to keep in t
with my German; yet I always manage to read and und
stand your letters with the help of a German dictio
instead of getting them translated by somebody else
It is not good to show ones' letters to others. I
would finish your letter in three days time and try
to understand it alone with the help of a dictionar

۲۵۲

but would not show it to others. This is what I h
always done.

I am glad to learn that you are living with your
sister. I think I saw her photo once which you sh
me. Please remember me to her and to your other
friends whom I must have met in Germany. I hope t
come to Europe again & if I do so I shall certainl
make it a point to see you and your sister in Heid
berg. Germany was a kind of second home to my spi
I learnt much and thought much in that country. T
home of Goethe has found a permanent place in my s

Hoping you are well

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

۲۵۳

12th Dec. 1932
Queen Anne's Mansions
St. James's Park
London S.W.1

My dear Frl. Wegenast,

I am in England again for a short time and write this
to inquire whether you are still in Heidelberg ---
Staubep Str. 14 ? I hope you are quite well.
Please write to me soon.

Yours sincerely,
Muhammad Iqbal

The correct spelling of the street name
is Steuben Str. (Note by author).

۲۵۴

9th Dec. 193
Queen Anne's Mansions
St. James's Park
London S.W.1

My dear Frl. Wegenast,

Thanks for your letter. I am leaving London on Friday
30th Dec. According to my present programme I
reach Heidelberg on 18th Jan. 1933 at 10.23 P.M. and
stop at Bayerischen Hof. The only object of my stay
in Heidelberg is meeting you after so many years.
I am looking forward to meeting you with great pleasure.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

۲۵۵

Madrid 21st Jan. 1933

I returned to Madrid today after having been to the
south of Spain. Sorry it would be impossible to come
to Heidelberg this time. I had to cancel all the
tickets that I had purchased from London as I must
catch the boat (Conte Verdi) from Venice on the 10th
of Feb. 1933. I may be coming to England in April
again.

Yours
Md. Iqbal

Date. 1905-6	Rank	Name	Father's Christian Name	Native Place
October' 1	(Advanced Student)	Igbal,* Muhammad**	Nur Muhammad	Sialkot (India)
	Pensioner	(sd) Muhammad Iqbal	(in Iqbal's hand)	(in Iqbal's hand)

Address of Residence	School	County of School	Name of Head-Master of School	Date of Birth Month	Year	Tutor p. 171
17 Portugal Place Cambridge (Iqbal's hand)	Pb. University Govt. College (Iqbal's hand)	†Punjab (Iqbal's hand)	Mr. Robson (Iqbal's hand)	Muharram (Iqbal's hand)	1876	Mr. Sedgwick (Iqbal's hand)

*Spelt with a 'g'.

**The penultimate letter changed by Iqbal from 'e' to 'a' in the entry made by the clerk

†Ph. (?) crossed out by Iqbal.

۵۔ ٹرنٹی کالج کیمبرج کا رجسٹر داخلہ کا صفحہ نمبر ۱۷۵ جس پر اقبال کی تحریر کردہ تاریخ پیدائش ۱۸۷۶ء درج ہے۔ مضمون علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش* میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

۶۔ اسکاچ مشن کالج کے رجسٹر داخلہ بابت ۱۸۸۲ء تا ۱۹۱۳ء کا صفحہ نمبر ۱۴۱ ہے۔ اقبال ایڈیپ میں ضمیمہ نمبر ۲، صفحہ نمبر ۳۳۲ پر یہ دونوں عکس چھپ گئے ہیں۔

No. 69

Certificate from the Punjab University of having passed an examination [illegible]
Dated [illegible] 1900

Deposit £50
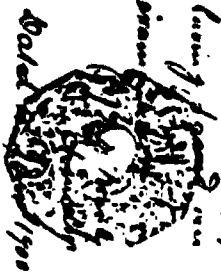
Lincoln's Inn. Shaikh Muhammad Iqbal of Trinity College, Cambridge, Aged 29 years, the Second Son of Shaikh Mir Muhammad of Sealkot, Punjab, India, Gentleman, was Admitted into the Society of this Inn on the Sixth day of November 1905 and hath thereupon paid to the use of the said Society the sum of Eight pounds twelve shillings and nine pence.

لنکنز اِن کے رجسٹر داخلہ کا عکس جس کے مطابق ۱۹۰۵ء میں علامہ کی عمر ۲۹ برس تھی

p. 66

Lincoln's Inn — Trinity Term 1908

No. 52

Proposed by Sir Frederick Pollock, Bart.

Published to the Bar by Cecil Henry Russell, Esq., Treasurer, on the 1st day of July, 1908, in the presence of The Rt : Hon : Sir Edward Fry, G.C.B. Thomas Halhed Fischer, Esq., K.C. John Westlake, Esq., K.C. Graham Hastings, Esq., K.C. Sir Edward Clarke, K.C.

and

The Rt : Hon : Lord Macnaughton, G.C.M.G.
Pursuant to an order of Council of 29th July 1908.

(sd.) S.M. Iqbal

(Treasury stamp for Fifty Pounds)

Lincoln's Inn. — Trinity Term 1908.

No. 51

Proposed by Cecil Henry Russell Esq. Treasurer.
Published to the Bar by Cecil Henry Russell, Esq. Treasurer, on the 1st day of July 1908, in the presence of The Rt Hon Sir Edward Fry, G.C.B. Thomas Halhed Fischer, Esq. K.C. John Westlake, Esq. K.C. Graham Hastings, Esq. K.C. Sir Edward Clarke, K.C.
and
The Rt Hon: Lord Macnaghten G.C.M.G.
Pursuant to an Order of Council of 29th July 1908

No. 52

Proposed by Sir Frederick Pollock, Bart.
Published to the Bar by Cecil Henry Russell, Esq. Treasurer, on the 1st day of July 1908 in the presence of The Rt. Hon. Sir Edward Fry, G.C.B. Thomas Halhed Fischer, Esq. K.C. John Westlake, Esq. K.C. Graham Hastings, Esq. K.C. Sir Edward Clarke, K.C.
and
The Rt. Hon: Lord Macnaghten G.C.M.G.
Pursuant to an Order of Council of 29th July 1908.

S.M. Iqbal

No. 53

Proposed by Cecil Henry Russell Esq. Treasurer
Published to the Bar by Cecil Henry Russell, Esq. Treasurer, on the 1st day

لنڈن کی لنکنز LINCOLN'S INN جہاں سے اقبال نے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ۱۹۰۸ء میں اسی درس گاہ کے رجسٹر داخلہ اور BAR BOOK کے جس میں اسناد وغیرہ کی تفصیل دی جاتی ہے کے دو صفحات کا عکس۔ کتاب "اقبال یورپ میں" کے ضمیمہ نمبر ۳، صفحہ نمبر ۲۳۳، ۲۳۴ پر یہ عکس دیئے گئے ہیں۔

لِلّٰہِ المَشرِقُ والمَغرِبُ

بخدمت پروفیسر براؤن تقدیم شد

نمبر ۱۰ مارچ ۲۳ء

پیامِ مشرق

(در جوابِ دیوانِ شاعرِ المانوی گوئٹے)

PAYA'M-I-MASHRIQ
by
Muhammad Iqbal
Lahore, 192

اقبال

سنہ ۱۹۲۴ء

تعداد یک ہزار

اشاعت دوم

اقبال کی تقدیم بنام پروفیسر براؤن

"پیامِ مشرق" کی اشاعت دوم ۱۹۲۴ء کے ایک نسخے پر اقبال کی تقدیم بنام پروفیسر ایڈورڈ، جی براؤن (۱۸۶۲ء - ۱۹۲۶ء) کے پیشانی پر ہے۔ ان کے دستخط ہیں اور یہ تحریر ہے "مصنف سے ڈاکٹر نکلسن کے توسط سے کتاب حاصل ہوئی" پروفیسر براؤن کی شہرہ آفاق کتاب تاریخ ادبیاتِ ایران "چار جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ "اقبال یورپ میں" صفحہ نمبر ۷۷، ۷۸، پر تفصیل دی گئی ہے۔ ضمیمہ نمبر ۳ میں صفحہ ۲۴۱ پر عکس دیا گیا ہے۔

Presented to
Prof. R. A. Reynolds Nicholson
M. Muhammad Iqbal.
Lahore
5th May 1930

خطباتِ مدراس بنام پروفیسر نکلسن

اقبال نے اپنی انگریزی کتاب "خطبات مدراس" SIX LECTURE اشاعت اول مطبوعہ ۱۹۳۰ء کا ایک نسخہ اپنے دستخط کے ساتھ پروفیسر نکلسن RENOLD ALLEYNE NICHOLSON ۱۹۴۵ء - ۱۸۹۵ء کو پیش کیا تھا۔ نکلسن نے اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

کتاب "اقبال یورپ میں" صفحہ نمبر ۷۸ تا ۷۹ تفصیلات دی گئی ہیں اور خطباتِ مدراس پر اقبال کی تقدیم کا عکس کتاب کے ضمیمہ نمبر ۳، صفحہ نمبر ۲۴۲ پر دیا گیا ہے۔

To my friend F. W. Thomas
S. M. Iqbal
3rd July 1908.

اقبال کی تقدیم بنام ایف ڈبلیو طامس

اقبال نے اپنے دوست ایف۔ ڈبلیو طامس کو یورپ میں شائع ہوئی اپنی پہلی کتاب "فلسفۂ عجم" پیش کی تھی۔ ایف ڈبلیو طامس ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۷ء اکسفورڈ یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر BODING PROFESSOR OF SANSKRIT تھے۔ اس سے قبل وہ ۲۴ سال تک انڈیا آفس لائبریری کے لائبریرین رہے تھے۔ سر طامس آرنلڈ ہندوستان سے واپسی پر ۱۹۰۴ء میں انڈیا آفس لائبریری کے نائب لائبریرین مقرر ہوئے تھے۔ اقبال سے فیڈرک طامس کا تعارف پروفیسر طامس آرنلڈ کے توسط سے ہوا تھا۔ مقرر ہوئے تھے۔ اقبال سے فیڈرک طامس کا تعارف پروفیسر طامس آرنلڈ کا تعارف پروفیسر طامس آرنلڈ ہی کے توسط سے ہوا تھا۔

"اقبال یورپ میں" کے صفحہ نمبر ۶ اور پھر صفحہ نمبر ۷۴ تا ۷۸ اس کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔ کتاب کے ضمیمہ نمبر ۳ صفحہ نمبر ۲۳۱ پر عکس دیا گیا ہے۔

Presented to Prof. Arnold
M. S. Iqbal
19th Sep. 1915
Lahore

تقدیم بنام طامس آرنلڈ

مثنوی اسرار خودی (طبع اول ۱۹۱۵ء) کا ایک نسخہ اقبال نے اپنے محترم استاد پروفیسر طامس آرنلڈ کو اپنے دستخط کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس کی تفصیل کتاب "اقبال یورپ میں" صفحہ نمبر ۔۔۔ پر درج ہے۔ کتاب کے ضمیمہ نمبر ۳ صفحہ نمبر ۲۴۰ پر عکس دیا گیا ہے۔

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL,
BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.

16th July 1930

My dear Lady Arnold,

[illegible]

Yours sincerely
Mohammad Iqbal

لاہور

۱۶ جولائی ۱۹۳۰ء

محترمہ لیڈی آرنلڈ،

میرے لیے یہ بیان کرنا ناممکن ہے کہ جب سر طامس آرنلڈ کی ناگہانی وفات کی خبر ہم تک ہندوستان میں پہنچی، تو ہم سب کو کس قدر دلدوز صدمہ ہوا ۔ آپ کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ سر طامس سے ان کے شاگردوں کو، اور ان تمام لوگوں کو جو ان سے واقف تھے، کس قدر محبت و عقیدت تھی ۔ مجھے معلوم ہے کہ صدمے کے الفاظ، آپ کو اور آپ کی صاحبزادی نینسی (Nancy) کو بہت کم تقویت پہنچا سکتے ہیں، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے غم میں نہ صرف انگلستان، بلکہ ہندوستان اور باقی دنیا کے ان تمام ممالک کے لوگ شریک ہیں، جہاں سر طامس کا نام بحیثیت ایک مستشرق کے معروف تھا ۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی وفات سے نہ صرف برطانوی دنیائے علم کو، بلکہ دنیائے اسلام کو بے حد نقصان پہنچا ہے، جس کے فکر و ادب کی خدمت میں انہوں نے تا دمِ آخر کمی نہ آنے دی ۔ میرے لیے یہ زیاں ایک ذاتی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ انہی کا اثر تھا، جس نے میری روح کی تربیت کی، اور اسے جادۂ علم پر گامزن کیا ۔ یہ صحیح ہے کہ دنیاوی نقطۂ نظر سے ان کی زندگی کا تابندہ شعلہ اب خاموش ہو چکا ہے، لیکن میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ وہ لوگ، جو سر طامس کی طرح، اپنی زندگی کو محبت اور خدمت کے لیے وقف کرتے ہیں، ان کے لیے موت "مزید روشنی" کے مصداق ہے ۔

میں تہہ دل سے دعا کرتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ ان کی شفیق روح کو جاوداں امن و عافیت بخشے، اور آپ کو اور نینسی کو یہ حوصلہ عطا کرے کہ ان کی ناگہانی موت کا صدمہ، آپ صبر کے ساتھ برداشت کر پائیں ۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

اقبال کا تعزیتی خط بنام بیگم آرنلڈ

پروفیسر طامس آرنلڈ کے انتقال پر اقبال نے بیگم آرنلڈ کو ایک تعزیتی خط لکھا تھا ۔ یہ خط ۔ آرنلڈ کے نواسے لارنس بارفیلڈ سے ڈاکٹر سعید اختر درانی کو دستیاب ہوا ۔ یہ خط البم میں محفوظ ہے جسے ان کی والدہ نینسی آرنلڈ نے اپنے والد کے انتقال پر مرتب کیا تھا جس میں انھوں نے تمام ان کا ہمدرد احباب کے تعزیتی خطوط اور پیغامات جمع کیے تھے جو بیگم آرنلڈ کو موصول ہوئے تھے۔

کتاب "اقبال یورپ میں" کے صفحہ نمبر ۲۲ تا ۲۴ اس کی تفصیلات دی گئی ہیں ۔ خط کا عکس صفحہ نمبر ۲۲ اور ۲۳ کے درمیان دیا گیا ہے اور متن صفحہ نمبر ۲۴ پر ہے۔

Post Card

The address to be written on this side
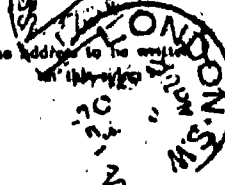
LONDON S.W.

M. A. Mirza & Sons, Delhi.

Here is a problem
of arithmetic for
you. Count the
men and women who are
praying in the
mosque of Delhi

Iqbal

Miss Nancy Arnold
28, Thornton Rd.
Wimbledon
London
(England)

9747

Last friday Prayer, juma Masjid, Delhi.
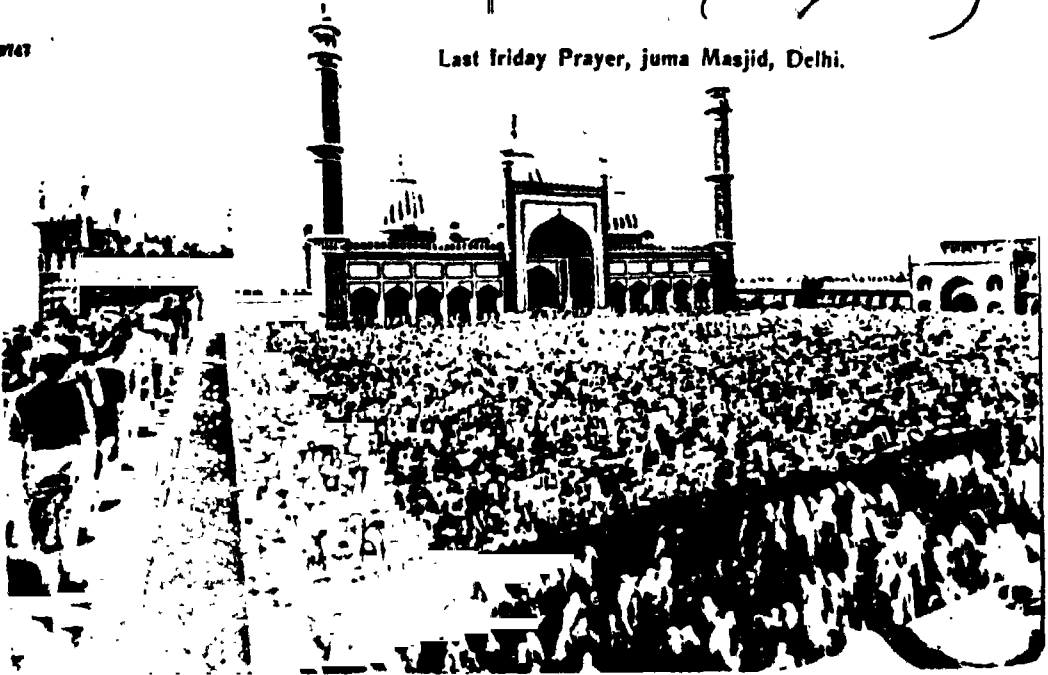
نینسی آرنلڈ کے نام پوسٹ کارڈ کی پشت پر طبع شدہ جامع مسجد دہلی میں
جمعہ الوداع کا منظر (ص ۵۹)

اقبالؒ بنام نینسی آرنلڈ

نینسی آرنلڈ ۱۸۹۷ء میں ہندستان میں پیدا ہوئیں۔ اقبال کے مشفق استاد سر طامس آرنلڈ کی صاحب زادی تھیں۔ یہ خط آرنلڈ کے نواسے پروفیسر بادفیلڈ نے اپنے خاندانی خطوط کے ذخیرے میں سے ڈاکٹر سعید درّانی کو دیا تھا۔ کتاب اقبال یورپ میں صفحہ نمبر ۵۸ تا ۵۹ اس خط کے بارے میں دیگر تفصیلات دی گئی ہیں۔ خط کا عکس کتاب کے ضمیمہ نمبر ۳ صفحہ نمبر ۲۲۵ پر دیا گیا ہے۔

Lahore

30th : Oct. 1923

My dear Sir,

Last night, at a meeting of the Punjab University Bd. of Studies in Persian, we prescribed your interesting little book on Persian Literature as a part of our B.A. Persian Course of Study. I had not seen the book before, but it suggested to me that my book—''Piyam-i-Mashraq''[1]—written in response to Grothe's[2] West-Oestlischen[3] Diwan—might be of some interest to you. It was published only a few months ago and a Second Ed.—revised and enlarged will be out in a short time. I therefore take the liberty of sending a copy of it to you and shd. like very much to know what you think of it.

Yours truly
Muhammad Iqbal Kt.
Barrister-at-Law
(Dean of Oriental Faculty
Punjab University,
Lahore).

اقبال بنام ریوبن لیوی

(ایک غیر مطبوعہ خط)

ڈاکٹر سعید اختر درانی نے کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں علامہ اقبال کی تصانیف کی تحقیق کے دوران علامہ کا تحریر کردہ ایک دستی خط دریافت کیا۔ اقبال نے یہ خط ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر ریوبن لیوی RUBEN LEVY کو لکھا تھا۔ یہ خط پیام مشرق کے اولین ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۲۳ء) کے اس نسخے کے اندر موجود تھا جو علامہ نے ڈاکٹر لیوی کو ارسال کیا تھا۔

کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں اس کتاب کا حوالہ نمبر:— MOH.675.D.3 ہے۔ اس کتاب میں جو لیبل چسپاں ہے اس پر تحریر ہے!

"کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کو وصیت کردہ از ریوبن لیوی ایم۔اے۔ڈی لٹ، فیلو کرائسٹ کالج۔ پروفیسر ایمیریٹس فارسی۔ وفات ۶ر ستمبر ۱۹۶۶ء" ڈاکٹر لیوی کی وفات کے بعد ان کا کتب خانہ کیمبرج لائبریری کو منتقل ہوا تھا۔"

پیام مشرق کے اس نسخے پر اقبال کی کوئی تحریر موجود نہیں۔ "اقبال یورپ میں" باب "انگلستان میں علامہ اقبال کی چند دستی تحریریں" کے صفحہ نمبر ۵۹ تا ۶۲ تفصیلات دی گئی ہیں۔ کتاب کے ضمیمہ نمبر ۲ میں صفحہ نمبر ۲۳۳ پر اس کا عکس دیا گیا ہے اور خط کا متن بھی۔

Lahore
30th Oct. 1923

My dear Sir

Last night, at a meeting of the Punjab University Bd. of Studies in Persian, we prescribed your interesting little book on Persian Literature as a part of our B.A. Persian Course of Study. I had not seen the book before, but it suggested to me that my book—"Piyam-i-Mashraq"—written in response to Goethe's West-Oestlichen Diwan—might be of some interest to you. It was published only a few months ago and a second Ed.—revised and enlarged will be out in a short time. I therefore take the liberty of sending a copy of it to you & shd. like very much to know what you think of it.

Yours truly
Muhammad Iqbal Kt.
Barrister-at-Law
(Dean of Oriental Faculty
Punjab University.
Lahore

DEDICATION

TO

Professor T. W. ARNOLD M. A.

My dear MR. ARNOLD,

This little book is the first-fruit of that literary and philosophical training which I have been receiving from you for the last ten years, and as an expression of gratitude I beg to dedicate it to your name. You have always judged me liberally; I hope you will judge these pages in the same spirit.

Your affectionate pupil

IQBAL.

انتساب

بنام پروفیسر ٹی - ڈبلیو - آرنلڈ ایم - اے

مشفقِ من جناب آرنلڈ صاحب

یہ چھوٹی سی کتاب اس ادبی اور فلسفیانہ تربیت کا میوۂ نخستین ہے، جو میں گذشتہ دس برس سے آپ سے پا رہا تھا - اور بطورِ اظہارِ تشکر، میں یہ کتاب آپ کے نام سے منسوب کرنے کی اجازت چاہتا ہوں - آپ نے ہمیشہ میری ناچیز کوششوں کو بکمال فراخ دلی سراہا ہے - مجھے امید ہے کہ ان صفحات کو بھی آپ اسی نظرِ شفقت سے دیکھیں گے -

آپ کا نیاز کیش شاگرد

اقبال

اقبال کی پہلی انگریزی کتاب کا انتساب

اپنے مشفق استاد پروفیسر طامس آرنلڈ (۱۸۶۴ء – ۱۹۳۰ء) کے نام اقبال نے اپنی کتاب "فلسفۂ عجم" (انگریزی) کا انتساب تحریر کیا تھا۔ کتاب DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA پہلی بار ۱۹۰۸ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی۔ "اقبال یورپ میں" کے صفحہ نمبر ۱۳۱ تا ۱۴۳ "اقبال کے استاد شفیق – سر طامس آرنلڈ" کے عنوان سے ایک دلچسپ باب شامل ہے۔

THE LODGE
PEMBROKE COLLEGE, CAMBRIDGE
TEL. 4722

7. 5. 48

Dear Arberry

Here is the book with some recent cuttings about Iqbal. We were real friends, in my Lahore days especially, and it was on my suggestion that he was decorated. I wanted a Persian title revived for him, but the precedent was feared + he was knighted. He had magnetism + stirred his hearers powerfully when declaiming his poems. Politically he was the inspirer of the Pakistan idea – always within the British Commonwealth – + I sh^d have said it was he who invented the name, but de Montmorency doubts this + attributes the word to Rahmat Ali here in Cambridge. As with the American tourists & the Archbishop of York "we shall never know"

Ever Yours
1.5 H. Butler

خطباتِ مدراس، تین نام - ایک خط

اقبال نے اپنی کتاب SIX LECTURE مطبوعہ ۱۹۳۰ء کی ایک جلد سر ہائیکو بٹلر (۱۸۷۲ء - ۱۹۵۲ء) کو پیش کی جو کہ غیر منقسم ہندوستان میں صوبہ جات سی پی کے گورنر تھے اور اپنے قیام لاہور کے زمانے سے اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے بعد انگلستان میں یوم اقبال منایا گیا تو سر ہائیکو بٹلر نے پہلی کتاب کالج کیمبرج کے عربی کے پروفیسر اے۔ جے۔ آربری کو پیش کی۔ ۱۹۶۹ء میں جب سر ہائیکو بٹلر کے صاحب زادے لارڈ بٹلر، جو کہ مسٹر میکملن کے زمانے میں آر۔ اے۔ بٹلر کی حیثیت سے وزیر خزانہ رہ چکے تھے، (ٹرنٹی کالج کے استادِ اعظم بن کر آئے تو پروفیسر آربری نے یہی کتاب انھیں پیش کر دی۔ کتاب کا یہ نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں حوالہ نمبر ADV.C.25.38. موجود ہے۔

اس نسخہ کی اہمیت اور بھی ہے کہ کتاب کے فلیپ میں ایک خط بھی منسلک ہے جو سر ہائیکو بٹلر نے پروفیسر آربری کے نام تحریر کیا تھا۔ یہ خط بھی ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ساری تفصیلات مزید حوالوں کے ساتھ کتاب "اقبال یورپ میں" باب "انگلستان میں علامہ اقبال کی چند دستی تحریریں" میں صفحہ نمبر ۶۲ تا ۶۶ پر دی گئی ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۳ میں کے صفحہ نمبر ۲۳۸ پر عکس، متن اور صفحہ نمبر ۲۳۹ پر دوسرا عکس دیا گیا ہے۔

[بدست اقبال ، سیاہ روشنائی میں]

Presented

to

His Excellency Sir Montagu Butler

Nagpur

(sd.) Mohammad Iqbal
Barrister-at-Law
Lahore
6th : May 1930

[بدست سر مانٹیگو بٹلر ، نیلی روشنائی میں]

and by him to his friend and colleague

Professor A.J. Arberry Li:t. D
5th May 1948

(sd.) Montagu Butler

[بدست پروفیسر آربری ، سیاہ روشنائی میں (بہ تحریر لرزاں)]

and by A.J.A. to Trinity College Library
to mark the Mastership of Lord Butler

(sd.) A.J. Arberry
30 April 1966

ٹرنٹی کالج کیمبرج کی لائبریری میں علامہ اقبال کی سر مانٹیگو بٹلر کو پیش کردہ کتاب "Six Lectures" کے صفحہ اول پر مندرج تقدیمات

Presented
to
His Excellency Sir Montagu Butler
Nagpur

and by him to his friend & colleague
Professor A.J. Arberry Litt. D.
5th May 1948

Mohammad Iqbal
Barrister-at-Law
Lahore
6th May 1930

Montagu Butler

and by A.J.A. to Trinity College Library
to mark the Mastership of Lord Butler
A.J. Arberry
30 April 1966

صوبجات متوسط کے گورنر سر مانٹیگو بٹلر کو پیش کردہ نسخہ "خطبات مدراس پر تقدیم کا عکس

LEBENSLAUF.

I was born on the 3rd of Dhū Qaʿd 1294 A. H. (1876 A. D.) at Sialkot—Punjab (India). My education began with the study of Arabic and Persian. A few years after I joined one of the local schools and began my University career, passing the first Public examination of the Punjab University in 1891. In 1893 I passed the Matriculation and joined the Scotch Mission College Sialkot where I studied for two years, passing the Intermediate Examination of the Punjab University in 1895. In 1897 and 1899 respectively I passed my B. A. and M. A. from the Lahore Government College. During the course of my University career I had the good fortune to win several gold and silver medals and scholarships. After my M. A. I was appointed Mc Leod Arabic Reader in the Punjab University Oriental College where I lectured on History and Political Economy for about 3 years. I was then appointed Asst. Professor of Philosophy in the Lahore Goverment college. In 1905 I got leave of absence for three years in order to complete my studies in Europe where I am at present residing.

S. M. IQBAL.

"فلسفۂ عجم" کے "نسخۂ ماربرگ" میں مندرج کوائفِ حیات (Lebenslauf) جو اقبال نے خود مہیا کئے تھے۔ یہاں دی گئی تاریخ ولادت پر بحث کتاب کے کئی مضامین میں آ چکی ہے۔

فلسفۂ عجم کے اصل مسوّدے کی دریافت

اقبال نے اپنا مقالہ "فلسفۂ عجم" بی اے کی ڈگری کے لیے ۷ مارچ ۱۹۰۷ء کو کیمبرج یونیورسٹی میں داخل کیا اور اسی سال ۱۳ جون کو یہ ڈگری انھیں حاصل ہو گئی تھی۔ یہی مقالہ نوک پلک سنوارنے کے بعد اکتوبر ۱۹۰۷ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے میونخ یونیورسٹی میں داخل کیا گیا۔ پی ایچ ڈی والا یہی مقالہ LUZAC & CO. نے ۱۹۰۸ء میں شائع کر دیا تھا۔ دونوں مقالوں کے VERSIONS میں کئی ایک اختلافات ہیں جن میں بعض تو لفظی یا سطحی سے ہیں۔ لیکن چند ایک اہم بھی ہیں۔ دونوں نسخوں کے عکس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کیمبرج والے DESSERTATION میں ابواب کی تعداد پانچ ہے جب کہ پی ایچ ڈی کے تھیسس والی کتاب (ماربرگ ایڈیشن) میں ۶ ابواب ہیں۔ کیمبرج والے مسودے کے باب سوم کے دو حصے کر کے اسے کتاب میں ابواب سوم چہارم کے طور پر شائع کیا گیا ہے یعنی مسودے کے باب سوم کے تیسرے جزو کو کتاب میں ایک علاحدہ باب چہارم بنا دیا گیا ہے۔ مسودے کے باب دوم کے جزو اول کو کتاب سے حذف کر دیا گیا ہے۔ مسودے اور کتاب کی فہرستِ مطالب میں اور متن کے عنوانات میں کئی ایک باہمی تضادات ملتے ہیں۔ ان اختلافات و تضادات کی تحقیق تفصیل کتاب "اقبال یورپ میں" کے صفحہ نمبر ۱۴۳ تا ۱۷۶ پر پھیلی ہوئی ہے۔

"ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء" ("فلسفۂ عجم") کے "نسخۂ برمنگھم" کا صفحۂ عنوان - یہاں اقبال کی اُس وقت تک کی تمام ڈگریاں درج ہیں -

THE

DEVELOPMENT OF METAPHYSICS

IN

PERSIA:

A CONTRIBUTION TO THE HISTORY OF MUSLIM PHILOSOPHY

BY

SHAIKH MUHAMMAD IQBAL

B. A. (Cantab) M. A. (Pb.) Ph. D. (Munich).

LONDON

LUZAC & CO. 46, GREAT RUSSELL STREET W. C.

1908

"ایران میں مابعدالطبیعیات کا ارتقاء" ("فلسفۂ عجم") کے "نسخۂ ماربرگ" کا صفحۂ عنوان . یہ لڈوگ میکسمیلین یونیورسٹی میونک کے شعبۂ فلسفہ قسمت اول (یا "دوم") میں (انگریزی زبان میں) پیش کیا گیا تھا

THE

DEVELOPMENT OF METAPHYSICS

IN

PERSIA

INAUGURAL-DISSERTATION

DER

PHILOSOPHISCHEN FAKULTÄT SEKT I (RESP II)

DER

Ludwig-Maxmilians-Universität, München.

BY

S. M. IQBAL M. A.

LONDON

LUZAC & CO. 46, GREAT RUSSELL STREET W. C.

1908

"فلسفۂ عجم" کے مسودۂ کیمبرج کا صفحۂ عنوان ۔ اقبال کے تحقیقی مقالے کا یہ مسودہ کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ اس مقالے کی ایک مکمل نقل مصنفِ کتاب نے نومبر ۱۹۸۳ء میں لاہور کی دوسری عالمی اقبال کانگریس کے دوران جناب ڈاکٹر جاوید اقبال کے توسط سے اقبال میوزیم لاہور کو پیش کر دی تھی ۔

Advanced Students Dissertation.

(65)

DEVELOPMENT OF METAPHYSICS

in

P E R S I A.

S. M. Iqbal.

اس کی پشت پر مندرج عبارت کا ترجمہ یوں ہے :
Approved at the proposal of Prof. Dr. Fr. Hommel
(جناب پروفیسر ڈاکٹر فریڈرش) ہومل کی تجویز پر منظور کیا گیا ۔ شاہی یونیورسٹی ماربرگ کے کتب خانے کی مہر ثبت کی ہے ۔

Genehmigt auf Antrag
des
Herrn Professor Dr. Fr. HOMMEL.

Printed by E. J. BRILL — LEIDEN (Holland)

"فلسفۂ عجم" کے "نسخۂ ماربرگ" کی فہرستِ مطالب

CONTENTS.

PART I.
Pre-Islamic Persian Philosophy.

PART II.
Greek Dualism.

"فلسفۂ عجم" کے "مسودۂ کیمبرج" کی فہرستِ مطالب

C O N T E N T S.

PART I.
Pre-Islamic Persian Philosophy.

PART II.
Greek Dualism.

the good food habit

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

قطعہ

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں جاتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

اقبالؒ

تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی جائزہ

اقبالیات کے بنیادی ماخذوں میں علامہ اقبال کے وہ شعری و نثری مجموعے جو ان کی حیات میں شائع ہوئے زیادہ مستند و معتبر قرار پاتے ہیں
وصًا وہ جو علامہ کی زندگی کی آخری اشاعتیں ہیں۔ ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بعد کی اشاعتوں کے تناظر میں ایک دوسرا اہم ترین کام ہے۔
شعری مجموعے کے ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کا تنقیدی و تشریحی جائزہ لینے کا کام ماضی میں ہو چکا ہے۔ محمد حمزہ فاروقی کی تحقیق کے مطابق؛

"جون ۱۹۲۷ء میں زبورِ عجم شائع ہوئی تھی۔ "انقلاب" نے ۱۷ جولائی ۱۹۲۷ء کو زبورِ عجم نمبر شائع کیا جس میں نہ صرف یہ کہ عملۂ ادارت نے اس تصنیف پر خود مضامین لکھے تھے بلکہ دیگر حضرات سے بھی اس پر مضمون لکھوائے تھے۔ ذیل میں اس شمارے کے موضوعات کی فہرست درج کی جاتی ہے:

۱۔ دستِ جہاں کشا طلب۔ [علامہ اقبال مدظلہ العالی]

۲۔ نالۂ شوریدہ۔ تضمین بر اشعار علامہ اقبال از ز۔ خ۔ ش صاحبہ مرحومہ یہ نظم "تہذیبِ نسواں" کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوئی تھی اور "انقلاب" نے دوبارہ شائع کیا تھا۔

۳۔ زبورِ عجم۔ ایک مذہب، ایک فلسفہ اور تنقیدِ فنونِ لطیفہ کا ایک بہترین اصول۔
اداریہ

زبوں در گفتم ز درون خانہ گفتم سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

"I WISH GOETHE HAD READ THIS BOOK"

[کاش گوئٹے اس کتاب کو پڑھتا]

۴۔ زبورِ عجم۔ پیامِ اقبال کے بعض تمہیدی خصائص۔ اقبال اور اس کے "خلیل" "کلیم"۔

۵۔ زبورِ عجم۔ کتاب کے مباحث کا مرقع۔ خدا و انسان یا عشق و دعوت"

[انقلاب۔ جلد ۲، نمبر ۱۱۔ یک شنبہ۔ ۱۷ جولائی ۱۹۲۷ء۔ زبورِ عجم نمبر]

[حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے۔ طبع اوّل مارچ ۱۹۸۸ء، ص: ۱۰۷۔۱۰۸]

اسی کوشش کی توسیع کے طور پر ماہنامہ شاعر (آگرہ) نے جولائی ۱۹۳۵ء میں علامہ سیماب اکبر آبادی کی نظموں کے مجموعے "کارِ امروز" مطبوعہ مارچ ۱۹۳۴ء پر مشتمل ایک "کارِ امروز نمبر" شائع کیا تھا جو ۱۳۸ صفحات کو محیط تھا۔ کسی شعری مجموعے پر اپنی نوعیت کا یہ ین کام تھا جس میں "کارِ امروز" کے ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کا تنقیدی، تحقیقی و توضیحی جائزہ لیا گیا تھا۔ اس نمبر میں علامہ تبصرہ آراء کے "کارِ امروز" کے موضوعات لفظیات و تراکیب اور فنی و عروضی تجزیے پیش کیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ الفاظ کی تعداد تک شمار کی گئی اور بتایا گیا کہ: "وہ الفاظ جو کارِ امروز" میں استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک لفظ خواہ وہ کتنی ہی بار آیا ہو صرف ایک ہی مرتبہ شمار کیا گیا ہے" اس طرح کل تعداد الفاظ: چار ہزار تین سو آٹھ [۴۳۰۸] کا اندراج کیا گیا ہے۔

مستقل تصانیف کو اس نہج سے دیکھنے اور جائزہ لینے کا سلسلہ بعد میں چل نکلا۔ اسی سلسلے کی ایک اہم ترین کتاب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا تحقیقی مقالہ "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" ہے جسے ۹ نومبر ۱۹۸۲ء کو اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور نے شائع کیا۔ ۴۸۰ صفحات پر محیط یہ نہایت ہی وقیع کتاب اپنے موضوع پر اقبال و سیماب کی کتابوں پر پیش کیے گئے خصوصی نمبروں کی روش پر ایک جدید اور سائنٹفک کام ہے اور اپنی نظیر آپ ہے۔

اقبال کے کلام نظم و نثر کی اولین اشاعتوں کے متعلق تحقیقی و توضیحی مطالعے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

سے کہ ایسی ہی عالمانہ تحقیق کا تعارف قارئینِ شاعر کے لیے پیش کیا جائے۔ میں نے تصانیفِ اقبال کے لیے کتابِ مذکور ہی سے استفادہ کیا ہے
کی تفصیل مناسب مقامات پر حوالوں کے ساتھ درج کی جائے گی۔

یہ کتاب ۵ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخر میں ضمیمے، کتابیات اور اشاریہ دیا گیا ہے۔ ہر ایک باب کو الف، ب، ج، د پر تقسیم کیا گیا۔
کتاب کے [illegible] کے متعلق رفیع الدین ہاشمی تحریر کرتے ہیں:

اوّل۔ جملہ شعری اور نثری مجموعوں کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں یعنی ہر مجموعے کا مختصر پس منظر
اس کی ترتیب و تیاری، کتابت و طباعت، طبع اول کی تاریخ اشاعت اور مابعد اشاعتوں کی تفصیل۔ مزید برآں
بعض منظومات اور نثر پاروں کی تاریخ تحریر بھی متعین کی گئی ہے۔ "اقبالیات" کے جائزوں میں اس نوعیت کی کوئی
مربوط تحقیقی کاوش موجود نہیں۔ اس مقالے میں بعض حقائق پہلی بار منظر عام پر آئے ہیں اور کئی امور جو غلطی ہائے
مضامین" کی حیثیت اختیار کر چکے تھے ان کی تصحیح ہو گئی ہے۔

دوم۔ متن کے تحقیقی مطالعے میں مختلف مجموعوں کی اوّلین اشاعتوں کے بعد دوسرے اور تیسرے ایڈیشنوں
میں کی جانے والی ترامیم، محذوفات، نیز ترتیبِ اشعار میں تقدیم و تاخیر کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

سوم۔ صحتِ متن پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے، ہر مجموعے کی اغلاطِ کتابت و املا کے ساتھ ساتھ ان تصرفات
کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے جو بعض مرتبین کے سہوِ نظر کے باعث اقبال کے شعری و نثری متن میں راہ پا گئے
ہیں۔ راقم کے نزدیک اقبال کے اصل متن سے سرِ مو انحراف بھی روا نہیں، کیوں کہ متن سے انحراف کے بعد کی جانے
والی تحقیق و تنقید: "تا ثریا کے رود دیوار کج" کا نقشہ پیش کرے گی۔

چہارم۔ اقبال کی بعض تحریروں کے بارے میں متعدد غلط فہمیاں مسلسل تکرار اور نقل در نقل کے سبب
"مسلمہ حقائق" کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں، مثلاً یہ کہ:

[الف] "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" خطبۂ علی گڑھ بہ عنوان:

"ISLAM AS A MORAL AND POLITICAL IDEAL"

حالاں کہ خطبۂ مذکورہ کا عنوان THE MUSLIM COMMUNITY ہے

[ب] جنابِ رسالت مآب ﷺ کا ادبی تبصرہ یا "رسول ﷺ، فنِ شعر کے مبصر کی حیثیت میں" ایک اردو مضمون
ہے جو علامہ اقبال سے درخواست کر کے لکھوایا گیا۔ حالانکہ اصل مضمون انگریزی میں تھا، عنوان تھا:

" OUR PROPHET'S CRITICISM OF CONTEMPORARY ARABIAN POETRY "

[ج] لندن کے مجلّے SOCIOLOGICAL REVIEW میں شائع شدہ مضمون کا عنوان
" ISLAM AND KHILAFAT " تھا، حالاں کہ مضمون کا عنوان تھا:

" POLITICAL THOUGHT IN ISLAM "

زیرِ نظر مقالے میں اس نوعیت کی متعدد غلط فہمیوں کی تصحیح کرتے ہوئے امکانی حد تک اقبال کی بیشتر
تحریروں کا صحیح سیاق و سباق واضح کیا گیا ہے۔

پنجم۔ اقبال کی متفرق تحریروں کی جستجو و تلاش اور جمع و ترتیب کے نتیجے میں اب تک لگ بھگ دو
درجن چھوٹے بڑے اردو اور انگریزی مجموعے مدوّن کیے جا چکے ہیں۔ اس کے باوجود اقبال کی متعدد مطبوعہ تحریریں
مرتبین کی نظروں سے اوجھل رہیں اور کسی مجموعے میں شامل نہ ہو سکیں۔ علاوہ ازیں بعض تحریریں تاحال پردۂ
اخفا میں تھیں۔ زیرِ نظر مقالے میں متعدد غیر مدوّن اور غیر مطبوعہ اشعار، خطوط اور متفرق تحریروں کی نشاندہی

کر دی گئی ہے۔ اس طرح یہ مطالعہ نظم و نثر اقبال کی تکمیل کی جانب مزید ایک قدم ہے۔
متروک کلام کے مجموعوں کو اس مطالعے میں شامل نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ اقبال نے اسے اپنے مستقل متن سے خارج کر دیا تھا۔ البتہ نثر کی صورت مختلف ہے، مستقل نثری تصانیف سے قطع نظر اقبال کی زندگی میں ان کے کسی مجموعے نثر کی ترتیب و اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ اب ہمارے لیے نثر اقبال کے کسی بھی حصے کو متروک قرار دینا ممکن نہیں چنانچہ نثری آثار جس قدر بھی دستیاب ہو سکے، بہ تمام و کمال، زیر بحث آئے ہیں۔
[حرف آغاز از کتاب مذکور، ص: ل/م، ن]

اس کتاب میں جو عکسی نقول شامل کی گئی ہیں وہ یوں ہیں:

۱۔ سر ورق بانگ درا، طبع اوّل۔
۲۔ سر ورق اسرار خودی، طبع دوم۔
۳۔ مکتوب بنام راغب احسن [متعّر]
۴۔ مکتوب بنام مولوی صالح محمد [متعّر]
۵۔ سر ورق علم الاقتصاد طبع اوّل
۶۔ فلسفۂ عجم کے دو نسخوں کے عکس۔
۷۔ سر ورق "اردو کورس" پانچویں جماعت کے لیے۔
۸۔ THE MUSLIM COMMUNITY پر اقبال کا تعارفی شذرہ۔

ان کے علاوہ جو ضمیمے شاملِ کتاب ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تصانیف اقبال کے کتابیاتی کوائف۔
۲۔ انگریزی اشارات بسلسلہ دیباچہ۔
۳۔ ایک نایاب مضمون THE MUSLIM COMMUNITY کا مکمل متن۔

کتابیات کے باب میں:
الف۔ کتاب مذکور کے ماخذات کی فہرست۔ ب۔ رسائل و اخبارات۔ ج۔ مسوّدات اور قلمی بیاضیں۔ د۔ غیر مطبوعہ خطوط اور یادداشتیں۔ اشاریہ کے تحت اشخاص، کتب اور اخبارات و مجلات کی فہرست دی گئی ہے۔
ایک بالکل نئے تحقیقی کام کے اعتبار سے "تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" اپنی خامیوں کو زیادہ نمایاں نہیں کرتی کہ دوسرے ایڈیشن میں ان خامیوں اور غلطیوں کی اصلاح کا بہر حال امکان ہے، حالاں کہ کتاب میں راہ پا جانے والی اغلاط کی تصحیح صفحہ نمبر ۵۰۴ پر موجود ہے اور کل غلطیاں ۴۲ ہیں لیکن مطالعے کے دوران ان اغلاط کے علاوہ بھی بہت سی غلطیاں موجود ہیں ان میں ادھورے جملے، حروف کا ٹنا، نمبر کی غلطی، حواشی کے نمبر شمار وغیرہ۔ بعض بنیادی کاموں میں قیاس و اضافے تو حاشیے میں دینے چاہیئے تھے، کتابیاتی کوائف میں مصنف کی طرف سے اضافے انتشار کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس کتاب کا مکمل تحقیقی و تنقیدی جائزہ اقبال نمبر۔۳ میں بنیادی کتابوں کے جائزے کے تحت لیا جائے گا۔

【۲】

شاعر کے اقبال نمبر میں تصانیف اقبال کا جو تحقیقی و توضیحی جائزہ و تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے اس کے لیے بنیادی ماخذ تو رفیع الدین ہاشمی کی کتاب "تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" ہی ہے تاہم میں نے اپنے جائزے میں جن امور کو اساس بنایا ہے اس کی صراحت ضروری ہے تاکہ مزید الجھاوے نہ پیدا ہوں۔
میں نے علامہ اقبال کی حیات میں شائع ہونے والے تمام ایڈیشنوں کو اہمیت دی ہے اور انتقال کے بعد کے اوّلین ایڈیشن کو نمایاں کیا۔ آخری حیاتی ایڈیشن اور پس مرگ اوّلین ایڈیشن، میرے نزدیک زیادہ اہم ہیں۔
چوں کہ اس باب میں علامہ اقبال کے نثری و شعری اوّلین حیاتی ایڈیشنوں کا جائزہ و تجزیہ ہی مقصود تھا لہٰذا اہمیت ایسی ہی کتابوں کو دی گئی ہے تاہم قارئین کی معلومات کے لیے جہاں تک ممکن ہو سکا مختلف طباعتوں کی تفصیل بھی دے دی گئی ہے۔ یہ مطالعہ پاکستان میں طبع

اقبال کے سرِ شعری مجموعوں تک محدود ہے۔ ہندوستان میں شائع ہوئے کلام اقبال کے مجموعے یا کلیاتِ اقبال اردو، فارسی پاکستانی کتابوں کے عکس ہی ہیں۔

خیال تھا کہ اقبال کے تمام حیاتی ایڈیشنوں کے ساتھ پس مرگ اوّلین ایڈیشنوں کے ایک ایک حرف کا جائزہ لیا جائے گا لیکن بعض نسخے مجھے فراہم نہیں ہو سکے لہٰذا کئی امور توجہ طلب رہ گئے ہیں ان کے لیے ڈاکٹر ہاشمی کی تحقیقی کاوش ہی سے تعرض کیا ہے۔

"کلیاتِ اقبال" ۔ اردو، فارسی ۔ مرتبہ جاوید اقبال فی الحال متنِ اقبال کا ایک اہم ماخذ ہے لہٰذا اس کا جائزہ بہ طورِ خاص لیا گیا ہے۔ اسی طرح "کلیاتِ اقبال" مرتبہ مولوی عبدالرزاق کو بہ طور اقبال کے ایک اہم ماخذ اور ان کی زندگی میں شائع ہونے والے اوّلین شعری مجموعے کے، جائزہ لیا گیا ہے۔ با ایں ہمہ "اقبال" از مولوی احمد دین مرتبہ مشفق خواجہ کو بھی جائزے کے لیے اہم سمجھا گیا کہ علامہ کی حیات میں شائع ہونے والی یہ اوّلین مبسوط تنقیدی کاوش ہے۔ "کلیاتِ اقبال" از عبدالرزاق اور "کتابِ اقبال" "باقیاتِ اقبال" کے دو اوّلین ماخذ ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کلامِ اقبال کے اوّلین نسخوں کے جائزے کے ساتھ بطور معلومات کلّیاتِ اردو، فارسی تک یا اس کے بعد انفرادی طور پر شائع ہونے والے نسخوں کا احوال مع مجموعی تعداد کے تحریر کر دیا گیا ہے جو پاکستانی اشاعتوں تک محدود ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی کتاب میں تمام شعری مجموعوں میں موجود اغلاط کی نشان دہی اور ان کی تصحیح نہایت ہی تحقیقی کاوش کے ساتھ کی ہے پھر بہت سی غلطیاں نشان دہی سے رہ گئی ہیں، چوں کہ یہ میرے موضوع سے متعلق نہیں ہیں لہٰذا ان سے صرفِ نظر کیا ہے تاہم قارئینِ شاعر کی دلچسپی کے لیے اتنا بتا دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اوّلین و آخری حیاتی ایڈیشنوں سے کلیات تک اغلاط کا ایک سفر جس سے کسی صحیح و معتبر متنِ اقبال کی ترتیب و تدوین ممکن نہیں ہو سکی۔ ہاشمی صاحب نے جن اغلاط کی نشان دہی اور اصلاحات کی ہیں ان میں ابھی کئی ایک تصحیح طلب ہیں۔

اقبال کے مکاتیب کے مجموعوں کا جائزہ مستقل تصانیف کے طور پر نہیں لیا جا رہا ہے لہٰذا صرف ضروری معلومات تک اس جائزے کو محدود رکھا ہے۔ اسی طرح نثری کتابوں اور باقیاتِ اقبال کی کتابوں کا معاملہ ہے۔ ان میں اگر اضافے کیے گئے ہیں تو ۱۹۸۸ء تک جو تازہ ترین تحقیقی معلومات فراہم ہو سکی ہیں انھیں شامل کر لیا گیا ہے۔

چوں کہ تصانیفِ اقبال کے تحقیقی جائزے کی طرف، کم از کم ہندوستان میں یہ پہلا قدم ہے، پھر بعض بنیادی ماخذ کی عدم موجودگی، اسی لیے کئی امور تشنہ اور کئی سوال مبہم معلوم ہوں گے پھر بھی کتابیاتی کو اُلف کو مکمل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

(۲)

اقبال کی مستقل تصانیف جو ان کی حیات میں شائع ہوئیں ان کے علاوہ بھی وہ کتابیں ہیں جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئیں ان میں بہ طورِ خاص علامہ کے وہ مکاتیب جو ان کی شخصیت اور شاعری بلکہ ان کی پوری نفسیات کی تفہیم کے لیے بنیادی ماخذ ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خطوط چاہے بہت زیادہ نجی اور شخصی ہوں یا احتیاط کے ساتھ لکھے گئے ہوں ان میں مکتوب نگار کا اصل عکس بین السطور میں بہر حال موجود رہتا ہے۔ میرے خیال میں تو علامہ کے خطوط ان تمام غلط فہمیوں اور مفروضات کا جواب فراہم کرتے ہیں جو عقیدت مندوں اور مخالفین نے پیدا کر لیے ہیں۔ تفہیم اقبال کے لیے مکاتیبِ اقبال سے زیادہ معتبر و مستند مواد کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، شاعری بھی نہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے مکاتیب کے بارے میں اپنے ایک ممدوح نیاز الدین خاں کو ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں لکھا:

"مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا کہ آپ میرے خطوط محفوظ رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، جب انھوں نے میرے بعض خطوط ایک کتاب میں شائع کرائے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی کیوں کہ خطوط ہمیشہ عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی۔ عدیم الفرصتی، تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں۔ مگر اشاعت ان کی نظرِ ثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیے۔

"اس کے علاوہ میں پرائیویٹ خطوط کے طرزِ بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپرواہ ہوں۔ امید ہے کہ، آپ میرے
خطوط کو اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ہوں گے"

[مکاتیبِ اقبال بنام نیاز الدین خاں، مطبوعہ ۱۹۵۴ء، ص: ۲۴]

اس خط کے اقتباس میں اقبال کے اپنے خطوط ہی نہیں بلکہ تمام ذاتی و نجی طور پر لکھے جانے والے خطوط کے متعلق کئی بنیادی امور در آئے ہیں تاہم بے حد ذاتی و نجی خطوط ہی کسی شخصیت کی تفہیم و تسہیل کے سب سے اہم معاون اور بنیادی ماخذ ہوتے ہیں۔ اقبال کے مکاتیب بھی اہم ترین بنیادی ماخذ ہی ہیں جن کا ذکر و احوال قارئینِ شاعر کے لیے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے یہاں یہ صراحت کر دینا ضروری ہے کہ مکاتیب اقبال کا تحقیقی احوال نامہ ہی یہاں تحریر کیا جا رہا ہے۔ مکاتیب کا ہر پہلو سے تجزیہ و جائزہ اقبال نمبر۔ ۲ میں لیا جائے گا۔ مکاتیب کی جمع و ترتیب اور پھر ان کی تدوین ایک الگ بحث طلب موضوع ہے۔ خطوط کے تمام ذخیرے سے علامہ اقبال کی شعری و فکری شخصیت کی تشکیل کی جائے گی۔

علامہ اقبال کے خطوط کی جمع و ترتیب کا کام ان کے انتقال کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اس نصف صدی میں خطوط کی دریافت و بازیافت کے سلسلوں میں اب تک ۱۴، ۱۵، مکاتیبِ اقبال کے مجموعے مرتب و مدوّن ہو چکے ہیں۔ اقبال کے مکاتیب کی تلاش و بازیافت کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مکاتیبِ اقبال کے مختلف مجموعے مختلف اقبالیوں کی ذاتی دلچسپیوں اور کاوشوں کا ثمر ہیں۔ یہ خطوط اقبال کی اجازت و نظرِ ثانی کے بغیر ہی شائع ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

اب تک دریافت شدہ خطوطِ اقبال میں قدیم ترین خط ۸، فروری ۱۸۹۹ء کا ہے جو انھوں نے اپنے استاد بھائی مولانا احسن مارہروی [پ: ۱۸۷۶ء ـ م: ۱۹۴۰ء] کو تحریر کیا تھا اور آخری خط ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو ممنون حسن خاں (بھوپال) کے نام تحریر کیا تھا۔ اس پہلے اور آخری خط کے درمیان مکاتیبِ اقبال کے مجموعوں میں خطوط کی تعداد ۱۳۷۵ بنتی ہے [رفیع الدین ہاشمی کی کتاب "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" مطبوعہ ۹، نومبر ۱۹۸۲ء کی تحقیق کے مطابق] ان کے علاوہ ۱۹۸۸ء تک آتے آتے اس ذخیرے میں کئی سو نو دریافت خطوط کا اضافہ بھی ہوا ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مکاتیبِ اقبال کے شائع شدہ مجموعوں کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

(۱) شاد اقبال

اس کتاب میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد [۱۸۶۴ء ـ ۱۹۴۰ء] کے نام اقبال کے ۴۹ خطوط شامل کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کو سید محی الدین قادری زور نے ۱۹۴۲ء میں حیدر آباد دکن سے شائع کیا۔ اقبال کے خطوط کے ساتھ شاد کے خطوط بنام اقبال بھی شامل کیے گئے ہیں جو تعداد میں ۵۲ ہیں، اس طرح خطوط کی تعداد ایک سو ایک بنتی ہے۔ "شاد اقبال" علامہ اقبال کے شعری مجموعوں کی مروّج سائز پر طبع کی گئی یعنی ۱۹½ × ۱۵½ س م، ۱۷ سطری۔ کتاب کو ۷ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ خطوط کو تاریخی ترتیب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ پہلا خط اقبال کا تو دوسرا خط شاد کا، یہی ترتیب رکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور نے ۳۰ صفحات کے مفصّل دیباچے میں شاد اور اقبال کی ملاقاتوں اور تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر دونوں کی تصاویر اور پھر دونوں کے مکتوب کا ایک ایک عکس دیا گیا ہے۔ اقبال کے خط کا یہ عکس نامکمل ہے۔ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۵۳ پر خط کا مکمل متن موجود ہے۔

اس کتاب کا طبع اوّل، سب رس کتاب گھر، حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ صفحات: ۳۰ + ۲۵۰۔ کتاب "اقبال شاد" کا دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ شاد کے نام اقبال کے مزید پچاس خطوط، اقبال اکاڈمی پاکستان کو دستیاب ہوئے تھے جنھیں مشہور ماہرِ اقبالیات محمد عبداللہ قریشی نے مفید حواشی و تعلیقات کے ساتھ مرتب کر کے "صحیفہ" کے اقبال نمبر (حصہ اوّل) مطبوعہ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں شائع کیے۔

۵۰ نو دریافت خطوط کے ساتھ "شاد اقبال" کا یہ مجموعہ محمد عبداللہ قریشی نے "اقبال بنام شاد" کے عنوان سے ۱۹۸۶ء میں

بزمِ اقبال لاہور سے شائع کیا۔ صفحات ۱۶ + ۴۰۸۔ قیمت پچاس روپے۔ محمد عبداللہ قریشی نے مقدمے میں مہاراجہ کشن پرشاد کے سوانحِ حیات، علامہ اقبال سے ملاقاتیں اور تعلقات کی تحقیقی تفصیل دی ہے۔ خطوطِ اقبال بنام شاد مع تعلیقات اور خطوطِ شاد بنام اقبال مع تعلیقات۔

مکاتیبِ اقبال کا یہ اوّلین مجموعہ ہے۔ شیخ عطاء اللہ نے شاد اقبال سے ۱۸ خطوط کا انتخاب کر کے اقبال نامہ [جلد دوم] شامل کیے۔

LETTERS OF IQBAL TO JINNAH ②

محمد علی جناح [پ : ۱۸۷۶ء – م : ۱۹۴۸ء] کے نام اقبال کے ۱۳ خطوط پر مشتمل یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ یہ خطوط محمد شریف طوسی کو جناح کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوئے تھے۔ انھوں نے خطوط کو ٹائپ کر کے زمانی ترتیب کے ساتھ مکرّر الیہ محمد علی جناح کو اشاعت کی اجازت کے لیے پیش کر دیے۔ جناح کی خواہش تھی کہ ان کے خطوط جو علامہ کے نام تھے دستیاب ہو جائیں۔ مجموعہ ہر اعتبار سے مکمل ہو جائے، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ جناح کے اپنے پیش لفظ کے ساتھ یہ مجموعہ شائع کر دیا گیا۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۳ ہزار کی تعداد میں طبع ہوا تھا۔ ۱۹۷۸ء تک اس کے ۷ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ٹائپ کے ۳۲ صفحات کی یہ کتاب اقبال کے خطوط کے دیگر مجموعوں کی بہ نسبت سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ عبدالرحمٰن سعید نے کیا تھا۔ انگریزی کے علاوہ اردو ترجمہ جسے ادارہ اشاعتِ اردو حیدر آباد دکن نے شائع کیا تھا، کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ تمام ایڈیشنوں کا متن یکساں ہے۔

یہ سارے خطوط شیخ عطاء اللہ نے ترجمہ کر کے "اقبال نامہ" دوم میں شامل کر لیے تھے۔ بشیر احمد ڈار نے ان ۱۳ خطوں کو اپنی کتاب LETTERS OF IQBAL میں مناسب حواشی و تعلیقات کے ساتھ شامل کیا ہے۔

متذکرہ ۱۳ خطوط کے علاوہ پروفیسر محمد جہانگیر عالم نے جناح کے نام اقبال کے دو مزید خطوط دریافت کیے جو : ۸ ردسمبر ۱۹۳۶ء اور ۳ اگست ۱۹۳۷ء کے تحریر کردہ ہیں۔ علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری برسوں میں آنکھوں کی بینائی کے کم ہو جانے کے سبب خط لکھنے اور دستخط کرنے سے معذور ہو گئے تھے چنانچہ بعض قریبی احباب، نذیر نیازی وغیرہ علامہ کی طرف سے خطوں کے جواب دیتے تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کے سکرٹری غلام رسول خان نے علامہ کی ہدایت پر محمد علی جناح کو خطوط لکھے تھے جن کی تعداد ۳ ہے ان میں سے ۱۷ رفروری اور ۷ رمارچ ۱۹۳۸ء کے دو کا ترجمہ اقبال کے آخری دو سال [طبع اول ۱۹۶۱ء، طبع دوم ۱۹۶۷ء] اس طرح علامہ کے جناح کے نام خطوط کی تعداد ۱۸ ہوئی۔ ایک خط پروفیسر صابر کلوروی نے دریافت کیا ہے۔ جناح کے نام اقبال کا یہ ۱۹ واں خط اقبال اکادمی پاکستان کے مجلّہ "اقبالیات" مطبوعہ جنوری تا ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اسی کے حوالے سے شاعر کے اقبال نمبر میں "نوادراتِ اقبال" کے باب میں اس خط کا عکس، متن اور ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

③ اقبال نامہ [جلد اوّل]

خطوطِ اقبال کا یہ اوّلین ضخیم مجموعہ ہے جس میں ۱۵ اشخاص کے نام اقبال کے ۲۶۷ خطوط کو مدوّن نگار شیخ عطاء اللہ نے نہایت ہی کے ساتھ شائع کیا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق خطوط کی کل تعداد ۲۴۶ ہے۔ انھوں نے یہ تعداد درج ذیل وجوہ کی بنا پر طے کی ہے۔

۱۔ ایسے انگریزی خطوط کے اردو تراجم جن کا اصل متن کسی انگریزی مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے [چوں کہ اردو ترجمہ اصل انگریزی متن کے مقابلے میں بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے اس لیے یہاں ایسے اردو تراجم کو گنتی سے خارج کر دیا گیا ہے۔ البتہ وہ اردو تراجم شمار میں شامل ہیں جن کے انگریزی متون کسی مجموعے میں نہیں ملتے]

۲۔ ایسے اردو خطوط جو یہاں نامکمل صورت میں ہیں مگر کسی اور مجموعہ خطوط میں ان کا صحیح اور مکمل متن شامل ہے۔

۳۔ شمار نمبر ۲۰۵ [ص: ۳۴۰] کو بھی گنتی میں شامل نہیں کیا گیا کہ یہ ایک نظم ہے۔

[تصانیفِ اقبال، ص: ۲۱۷]

"اقبال نامہ" پر تاریخ طباعت درج نہیں ہے، عام طور پر ۱۹۴۵ء ہی کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن بعد کی تحقیق جس میں بشیر احمد ڈار وغیرہ شامل ہیں، طبع اوّل کا صحیح سال ۱۹۴۴ء ہے۔

مجموعے میں اقبال کے ۱۱ خطوط کے عکس۔ حالی پر قطعہ اور اسد ملتانی کی نظم پر اصلاح کا عکس دیا گیا ہے۔ ۱۸ صفحات کا دیباچہ از مرتب۔ ۴ صفحات کا مقدمہ از حبیب الرحمٰن خاں شیروانی۔ انتساب، عرض ناشر وغیرہ دیے گئے ہیں۔ ص: ۳۲ + ۴۷۴ بنتی ہے۔ شیخ محمد اشرف، تاجرِ کتب کشمیری بازار لاہور نے یہ کتاب شائع کی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن تاحال شائع نہیں ہوا۔

"اقبال نامہ" (اوّل) اپنی تمام تر افادیت کے باوجود اپنے آپ میں بہت سی خامیاں بھی لیے ہوئے ہے جن کا تحقیقی جائزہ ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنی کتاب "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" میں ص: ۲۱۵ تا ۲۲۵ کے درمیان تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بعض امور پھر بھی تحقیق طلب رہ گئے ہیں۔

(۴) اقبال نامہ [حصہ دوم]

حصہ اوّل کے دیباچہ میں شیخ عطاء اللہ نے تحریر کیا تھا کہ:

"ابھی کافی اور اہم مواد خطوط کی صورت میں میرے پاس موجود ہے، تلاش و جستجو جاری ہے۔ مجھے توقع ہے کہ... میں جلد از جلد حصہ دوم کی اشاعت کے فرض سے سبک دوش ہو سکوں۔" [اقبال نامہ، ص۔ ظ]

چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ۴۸۲ صفحات پر مشتمل ایک اور ضخیم مجموعۂ مکاتیب اقبال شائع کر دیا۔ حصہ اوّل کے ۴۶۲ خطوط کے مقابلے میں حصہ دوم میں اصل خطوط کی تعداد ۱۱۲ ہے حالاں کہ اس میں بھی خطوط کی تعداد کا شمار ۱۸۷ تک کیا گیا ہے لیکن ۱۱۲ خطوط کی تعداد کا تعین اسی تحقیقہ اندراج کے طرز پر کیا گیا ہے جو اقبال نامہ حصہ اوّل میں مجموعی خطوط کی تعداد کے تعین کے لیے کیا گیا تھا۔ حصہ دوم کی ترتیب، اندازِ کتابت اور گٹ اپ وغیرہ کا معیار حصہ اوّل ہی کی طرح کا ہے۔

ابتدا میں مرتب کا دیباچہ ص: ۷ تا ص: ۸۲ کو محیط ہے۔ اس کے بعد صفحات کا شمار از سرِ نو ہوتا ہے۔ حصہ دوم کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کو اقبال کے نئے اور غیر مطبوعہ خطوط کچھ زیادہ تعداد میں فراہم نہیں ہو سکے چنانچہ اس میں کچھ مطبوعہ خطوط اور بہت سے انگریزی خطوط کے ترجمے بھی شامل کر لیے گئے پھر بھی نئے خطوط اور غیر مطبوعہ خطوط خاصی تعداد میں جمع کیے گئے۔

۳۹۸ + ۸۴ صفحات کی اس کتاب کو شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے شائع کیا۔ اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ اقبال نامہ دوم میں بھی اغلاطِ متن کی کمی نہیں۔ خطوط کے سنین، مکتوب الیہم کے ناموں کی غلطیاں، حذف و تحریفات وغیرہ۔ یہ مجموعہ بھی تحقیق طلب ہے۔ اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

(۵) مکاتیبِ اقبال [بنام نیاز الدین خاں]

اس مجموعے میں اقبال کے ۷۹ خطوط بنام خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ خان صاحب بستی دانش مندان [جالندھر] کے ایک خوش ذوق رئیس اور شاعر تھے۔ ٹائپ میں شائع ہوئے اس مجموعے پر کوئی تاریخ اشاعت درج نہیں مگر جسٹس ایس اے۔ رحمان کی "تصدیق: ۸ رجولائی ۱۹۵۴ء" سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہوگا۔

یہ خطوط نیاز الدین خاں کے صاحبزادوں خان افتخار الدین احمد اور خان نفیس الدین احمد نے اشاعت کے لیے بزمِ اقبال (لاہور) کے سپرد کیے تھے۔ کتاب میں اقبال کے دو خطوں [۱۳ر مارچ ۱۹۱۹ء، خط نمبر ۳ اور ۱۷ر نومبر ۱۹۱۷ء، خط نمبر ۱۲] کے عکس بھی دیے گئے ہیں۔ ۸ + ۵۵ صفحات کا یہ مجموعہ اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود بہت سے تحقیق طلب امور کی عدم وضاحت کے سبب کوئی ایک خا

ناچیے ہوئے ہے۔

"مکاتیب اقبال" کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) نے شائع کیا۔ اس میں مرزا محمد منور کے مقدمے، خان نیاز الدین خاں کے مختصر تعارف و تعلیقات، اور مکاتیب گرامی بنام نیاز الدین خاں نیاز کے اضافے کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا سب سے مفید اضافہ ادبا پر محمد نفیس احمد کے تعلیقات ہیں۔ موصوف نے یہ تعلیقات اپنی "بے بضاعتی" کے ساتھ پیش کئے ہیں۔

مکاتیب اقبال کے اس ایڈیشن کی ضخامت سو صفحات کو محیط ہے اور قیمت ۳۰ روپے ہے۔ دوسرے ایڈیشن سے پہلے ایڈیشن کے خطوط کے عکس نکال دیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اسمار الرجال کا اشاریہ دیا گیا ہے۔

IQBAL'S LETTERS TO ATTIYA BEGUM (۴)

عطیہ بیگم کے نام اقبال کے ۹ خطوط کا یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک آخری خط کے سوا تمام خطوط کے عکس شامل کیے گئے ہیں۔ ۹ خطوط میں پہلا خط کیمبرج سے ۱۹۰۷ء اور آخری خط ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کو تحریر کیا گیا۔ یہی زمانہ اقبال کے ذہنی انتشار اور ازدواجی زندگی کی الجھنوں کا تھا اور یہ خطوط اقبال کے جذباتی ہیجان کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ عطیہ بیگم کی یادداشتوں نے خطوط کے پس منظر اور پیش منظر کو اور بھی وقیع بنا دیا ہے۔ اس میں اقبال کی بعض نظموں کے ایسے عکس بھی شامل ہیں جن سے ان کی تاریخ تخلیق متعین ہوتی ہے۔ کتاب باریک ٹائپ میں طبع کی گئی ہے۔

کتاب کے سرورق پر "اقبال لیٹرز ٹو عطیہ بیگم" دیا گیا ہے لیکن اندرونی سرورق پر عنوان کو صرف "اقبال" تک محدود کیا گیا ہے۔ ابتداء میں آرٹ پیپر پر نواب حسن یار جنگ بہادر اور فیضی رحمین کی تصاویر شامل ہیں۔ واقعات کی مناسبت سے متن کے درمیان چھوٹے سائز میں یہ تصاویر دی گئی ہیں:

۱۔ کیمبرج میں سید علی بلگرامی کے یہاں پکنک ۲۔ فرا پروفیسر ہیرن ۳۔ فرائین شینے شال ۴۔ اقبال اور عطیہ محو گفتگو ۵۔ مسجد باغ فردوس ۶۔ عطیہ بیگم کشتی چلاتے ہوئے ۷۔ اقبال کشتی چلاتے ہوئے۔

اقبال کے یہ خطوط ان کے دیگر تمام موجود خطوط کے مقابلے میں تفصیلی زیادہ ہیں۔ طویل ترین خط جو کہ ۷ اپریل ۱۹۱۰ء کا تحریر کردہ ہے، ۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۰۹ء کے خط سے تین مختلف مقامات سے کچھ حصے حذف کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۶۹ء میں شمولہ خط کے عکس میں پہلے صفحے کے دو محذوف جملے شامل ہیں:

(1) I TOO WISH TO SEE YOU AND POUR OUT MY ENTIRE SELF BEFORE YOU.

(2) YOURS LETTERS TO ME HAVE ALWAYS KEPT IN A SAFE CHEST, NOBODY CAN SEE THEM.

دوسرا ایڈیشن لاہور سے آئینۂ ادب نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔ اس کا ٹائپ موٹا اور کاغذ دبیز ہے۔ کتاب کا متن طبع اول کے مطابق ہی ہے۔ فلیپ پر ایس اے رحمان کی عبارت [۸ اپریل ۱۹۶۹ء] درج ہے۔ پہلے ایڈیشن کے گرد پوش پر درج "اقبال لیٹرز ٹو عطیہ بیگم" خارج کر دیا گیا۔ کتاب سے تمام تصاویر نکال دی گئیں۔

اس کتاب کے درج ذیل ۳ اردو ترجمے بھی ہو چکے ہیں:

۱۔ ضیاء الدین احمد برنی نے اس کتاب کا ترجمہ کیا اور اقبال اکاڈمی پاکستان (کراچی) نے ۱۹۵۶ء میں اسے شائع کیا۔ اس میں اقبال کے قیام یورپ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء کی یادداشتیں عطیہ بیگم کی ڈائری کے متعلقہ اوراق، خطوط اقبال بنام عطیہ کے عکس۔ اقبال کی بعض نظموں کے عکس۔ مترجم کا ایک مضمون "ایک بھولی ہوئی صحبت"۔ اس اردو ترجمہ کے طبع اول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں عطیہ بیگم کا ایک غیر مطبوعہ خط ۹ مئی ۱۹۳۳ء کا عکس پہلی بار شامل کیا گیا مگر اس خط کا اردو ترجمہ کتاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کتاب کا

طبع دوم ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ صفحات ۱۶۴۔

۲۔ منظر عباس نقوی نے ۱۹۷۴ء میں اس کتاب کا ترجمہ "خطوطِ اقبال بنام عطیہ فیضی" کیا۔ اس مجموعے میں جہاں صرف خطوط شامل کئے گئے ہیں وہیں کتاب کی ترتیب میں پہلے ۹ صفحات کو محیط تعارف، پھر خطوط کا متن اور ہر خط کا مختصر پس منظر، خطوط کے متن کے بعد خطوط کے بعض امور کی تشریح اور آخر میں ۵ نظمیں دی گئی ہیں۔ ۲۴ اپریل ۱۹۰۷ء کے اصل خط کا عکس، بمبئی میں ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کا تحریر کیا ہوا عطیہ بیگم کے لیے آٹوگراف۔ انگریزی کے ایک طویل خط محررہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء سے آخری دو پیراگراف کا عکس، اقبال اور عطیہ بیگم کی ایک تصویر، اقبال کی تصویر اور اقبال کی دو نظمیں بخطِ اقبال۔ ۶۸ صفحات کی اس کتاب کو شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے شائع کیا۔ اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

۳۔ عبدالعزیز خالد نے کتاب "اقبال" کا اردو ترجمہ کیا اور آئینۂ ادب لاہور نے ۱۹۷۵ء میں اسے شائع کیا۔ صفحات ۱۴۲۔

(۷) مکتوباتِ اقبال [بنام نذیر نیازی]

یہ علامہ اقبال کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو سید نذیر نیازی کے نام وقتاً فوقتاً تحریر کیے گئے تھے۔ اس مجموعے کو مکتوب الیہ نے خود ہی ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ مکاتیب کی تعداد ۱۸۲ ہے۔ اس مجموعے کا پہلا خط نیازی صاحب کے والد سید عبدالغنی کے نام اور ۸ مارچ ۱۹۳۶ء کا خط سید نیازی کے دوست سلامت اللہ شاہ کے نام ہے۔ دو خط [ص: ۲۸، ۲۹ اور ۳۳۹] انگریزی میں ہیں۔ ابتداء میں دو خطوں کا عکس دیا گیا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق ۳ خطوں کے عکس اس سے قبل "امروز" کے "اقبال نمبر" ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۸ خطوط کے عکسی نقول "جنگ" (کراچی) کے اقبال ایڈیشن، اپریل ۱۹۷۴ء میں شائع کی گئی ہیں۔ دو خطوط اقبال نامہ [دوم، ص: ۳۰۹، ۳۱۲] میں بھی شامل ہیں۔ اقبال کے ایک خط محررہ ۱۱ جنوری ۱۹۳۱ء کے بارے میں نذیر نیازی نے بتایا ہے کہ یہ خط ضائع ہو گیا ہے [مکتوباتِ اقبال ص: ۸۴] لیکن ماہنامہ "فنون" (لاہور) کے "اقبال نمبر"، مطبوعہ دسمبر ۱۹۷۷ء، ص: ۵ پر یہ خط دیا گیا ہے۔ ضخامت ۱۶ + ۳۷۲، قیمت: ساڑھے پانچ روپے۔

اہم امور و معاملات اور توضیحی حواشی اور یادداشتوں کے ساتھ یہ مکاتیب پہلی بار ستمبر ۱۹۵۷ء، اقبال اکادمی پاکستان (کراچی) سے شائع ہوئے۔ ابتدائی ۱۶ صفحات [انتساب، فہرست، دو خطوط کے عکس] پر صفحات کے نمبر درج نہیں ہیں۔ پھر ۸ صفحات کی تمہید پر صفحات کا شمار "الف تا ح" کیا گیا ہے۔ کتاب کا متن [متونِ خطوط اور حواشی و تعلیقات] ۳۷۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کتاب کے آخر میں ۱۲ صفحات کو محیط اشاریہ دیا گیا ہے۔ خطوط کو زمانی ترتیب سے سجایا گیا ہے اور توضیحی اشارات کی مدد سے خطوط کے درمیان ایک ربط پیدا کر کے متفرق خطوط کو ایک اکائی بنا دیا ہے۔

اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) نے اکتوبر ۱۹۷۷ء میں طبع اول کا عکس لے کر اس مجموعے کو دوبارہ شائع کیا۔ ضخامت ۸ + ۳۷۲۔ قیمت: ۲۳ روپے۔

(۸) انوارِ اقبال

اقبال کی تقاریظ، خطوط، مضامین اور نادر کلام کا یہ مجموعہ بشیر احمد ڈار نے مرتب کر کے مارچ ۱۹۶۷ء میں کراچی سے شائع کیا۔ اس کا غالب حصہ اقبال کے خطوط پر مشتمل ہے۔

پہلے ۱۶ صفحات [سرورق، پیش لفظ، عرضِ حال اور مقدمات اور مندرجات کی فہرست] کے بعد متنِ اقبال کے آغاز سے از سرِ نو صفحات کا شمار کیا گیا جو ۳۱۶ صفحات کو محیط ہے۔ کتاب کے آخر میں ۲۶ صفحات کا اشاریہ دیا گیا ہے۔ کتاب نستعلیق میں ہے۔ مگر صفحہ ۳۰۳ تا آخر نسخ ٹائپ استعمال کیا گیا ہے۔ "انوارِ اقبال" میں شامل اصل خطوط کی تعداد ۱۷۵ ہے۔ ان میں کے زیادہ تر خطوط

سے قبل مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوچکے ہیں مگر کسی مجموعۂ مکاتیب میں شامل نہ تھے۔ بعض غیر مطبوعہ خطوط بھی اس میں شامل کیے گئے
ہیں۔ شیخ عطا محمد کے نام ایک خط اور اقبال کے دو خطوط کے عکس بھی دیے گئے ہیں۔ کتاب کو ان عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ تقاریظ اور
دیباچے، مضامین، خطوط، متفرق خطوط، روداد سفرِ مدراس، اور بزمِ آخر [تقاریظ، خطوط، مضامین، بیانات، اقبال کا ابتدائی کلام]۔ لیکن
فہرست مندرجات مکمل نہیں، مجموعے میں ۱۳ ایسے مکاتیب موجود ہیں جن کا ذکر فہرست میں نہیں۔

خطوط کی ترتیب و تدوین میں بہت سے نقائص موجود ہیں یعنی اصل خطوط اور متن میں فرق، صحیح تاریخوں کا تعین، غلط تاریخوں کا اندراج،
مکتوب الیہم کے ناموں میں فرق۔ اس مجموعے میں محمد دین فوق، غلام رسول مہر، رشید احمد صدیقی، میر خورشید احمد، تمکین کاظمی، منشی
سراج الدین اور مولانا محمد عرفان خاں کے بیشتر خطوط اس سے قبل "نقوش" کے مکاتیب نمبر مطبوعہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہو چکے ہیں لیکن "نقوش"
اور کتاب کے متن میں غیر معمولی فرق ہے۔

"انوارِ اقبال" میں مواد کے ماخذات اور حوالوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے مرتّب کتاب بشیر احمد ڈار سے اس
ضمن میں استفسار کیا تو انھوں نے ایک اقبالی مصنّف کے خوف سے ایسا کرنے سے گریز کیا۔ رفیع الدین ہاشمی نے "انوارِ اقبال" میں شامل
خطوط کے ماخذات کی تفصیلی نشان دہی اپنے جائزے میں کر دی ہے۔ [تصانیف اقبال، ص: ۲۴۸، ۲۴۹]

"انوارِ اقبال" کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں طبع اوّل کا عکس لے کر شائع کیا گیا اس طرح طبع اوّل کی تمام اغلاط طبع دوم میں موجود ہیں۔

اس مجموعے میں مکاتیب کے علاوہ اقبال کی دیگر نثری تحریریں بھی شامل ہیں، ان میں ۱۔ نبوّت، کے زیرِ عنوان دو تحریریں، اسرارِ
خودی، کے سلسلے کا ایک مضمون۔ علم ظاہر و علمِ باطن، مسلمانوں کا امتحان، ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ، حکمائے اسلام کے عمیق تر
مطالعے کی دعوت ۲۔ لاہور کے جلسۂ عام [۳۰ ستمبر ۱۹۱۹ء] میں اقبال کی ایک تحریر اور دو مختصر بیانات ۳۔ "سور اجیہ" کے
نمائندے سے ایک مصاحبہ ۴۔ مختلف مصنّفین کی کتابوں پر اقبال کی تقاریظ اور آرا ۵۔ اقبال مرتبہ روداد پنجاب پروونشل
ایجوکیشنل کانفرنس [۱ اپریل ۱۹۱۱ء] ۶۔ اقبال کی مرتبہ بعض درسی کتابوں کے دیباچے ۷۔ اقبال سے ایک ملاقات کی روداد از
عبد المجید سالک، اقبال کے مختصر حالات از محمد دین فوق ۸۔ اقبال کی جاری کردہ متفرق اسناد ۹۔ مدراس کے سفر میں اقبال کو پیش
کیے جانے والے بعض سپاس نامے اور ایک اشتہار۔

LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL (۹)

یہ کتاب مجموعی طور پر ایک مجموعۂ مکاتیب ہی ہے حالاں کہ اس میں اقبال کے متعلق تحریریں بھی شامل ہیں مگر ان کی تعداد خطوط کے مقابلے میں
کم ہے۔ کتاب میں شامل اقبال کے متعدد انگریزی خطوط کے تراجم "اقبال نامہ" میں شامل کر لیے گئے تھے، ایک دو انگریزی خط مختلف جرائد میں شائع
ہوئے، مگر کتاب میں شامل بیشتر انگریزی خطوط پہلی بار مدوّن صورت میں اس مجموعے کے ذریعہ سامنے آئے۔

ہر خط سے پہلے مکتوب الیہ کا مختصر تعارف اور خط کا پس منظر بیان کیا گیا ہے مگر یہ اہتمام سارے خطوں میں نہیں رکھا گیا۔ بعض جگہ پاورقی
حواشی بھی تحریر کیے گئے ہیں مگر تشنہ ہیں۔ متن میں کہیں کہیں قوسین میں توضیحات درج کی ہیں لیکن دیباچے یا حواشی میں اس کی وضاحت
نہیں کی گئی۔ مرتّب نے خطوط کے ماخذ کا نہ تو ذکر کیا اور نہ ہی حوالے دیے۔ دیباچے میں بعض اصحاب کے نام گنوائے ہیں جن سے خطوط دستیاب
ہوئے تھے لیکن ہر خط کا ماخذ، اصل، عکس یا نقل کا حوالہ ضروری تھا۔

ترتیب و تدوین کی ڈھیر ساری غلطیوں کے باوجود اقبال کے انگریزی خطوط کا یہ اوّلین مجموعہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ
انگریزی خطوط کا متن یکجا ہو سکا ہے۔

بشیر احمد ڈار کا مرتب کردہ یہ مجموعہ نومبر ۱۹۶۷ء میں اقبال اکادمی پاکستان (کراچی) سے شائع ہوا۔ ضخامت: ۱۲+۲۹۱ صفحات
قیمت: ۸ روپے۔

(۱۰) مکاتیبِ اقبال [بنام گرامی]

اقبال کے ۹۰ خطوط پر مشتمل یہ مجموعہ، مولانا شیخ غلام قادر گرامی [۱۸۵۶ء – ۱۹۲۷ء] اور اقبال کے باہمی ربط و تعلق کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ اقبال کے اصل خطوط شیخ سردار محمد کے توسط سے اقبال اکادمی پاکستان کو موصول ہوئے تھے۔ مشہور ماہرِ اقبالیات محمد عبداللہ قریشی نے ان خطوط کو ایک سیر حاصل مقدمے اور مفید حواشی و تعلیقات کے ساتھ مرتب و مدوّن کیا اور اقبال اکادمی پاکستان [کراچی] نے اپریل ۱۹۶۹ء میں اسے شائع کیا۔ سب سے پہلا خط ۱۱ر مارچ ۱۹۱۰ء کا تحریر کردہ ہے اور آخری خط ۳ر جنوری ۱۹۲۷ء کا یعنی مولانا گرامی کی وفات سے چند ماہ قبل [م: ۲۷ر مئی ۱۹۲۷ء]۔ ۷ خطوط پر کوئی تاریخ یا سنہ درج نہیں۔ محمد عبداللہ قریشی نے نفسِ مضمون اور دیگر سیاق و سباق سے خطوط کے قیاسی سالِ تحریر متعین کیے ہیں۔

ابتدائی ۱۶ صفحات میں، سرورق، فہرست، پیش لفظ از ممتاز حسن مرحوم [۶ر اگست ۱۹۰۷ء – ۲۸ر اکتوبر ۱۹۷۴ء] کے بعد صفحات کا شمار از سرِ نو کیا گیا ہے۔ ۷ صفحات میں مولانا غلام رسول مہر [۱۸۹۵ء – ۱۹۷۱ء] کا "تمہید و تعارف" اور پھر محمد عبداللہ قریشی کا مبسوط مقدمہ [ص: ۱۱ تا ۸۷] شامل ہے جس میں گرامی کی سوانح، ان کی شخصیت و شاعری، زیرِ نظر خطوط کے تناظر میں اقبال اور گرامی کے باہمی تعلقات کی تفصیل شامل ہے۔ خطوط تاریخی ترتیب کے ساتھ پروئے گئے ہیں۔ ہر خط کے خاتمے پر تعلیقات کے زیرِ عنوان اس خط سے متعلق توضیح طلب امور پر مختصر و طویل شذرات درج کیے گئے ہیں۔ ان شذرات میں مرتب نے گرامی کے جوابی خطوط بنام اقبال سے بھی مدد لی ہے۔

اس مجموعے میں شامل بعض خطوط اس سے قبل مختلف مجموعوں یا رسائل میں شائع ہو چکے ہیں جیسے "اقبال نامہ" حصہ اول اور "نقوش" (لاہور) خطوط نمبر اوّل وغیرہ میں۔ مرتب کے تحقیقی حواشی اور تعلیقات سے خطوط میں مذکور کئی شخصیات، کتب اور مسائل و امور پر روشنی پڑتی ہے۔

"مکاتیبِ اقبال" کی ضخامت ۱۴+۲۴۹ اور قیمت: ۱۲ روپے ہے۔

جون ۱۹۸۱ء میں اقبال اکادمی پاکستان [لاہور] نے یہ مجموعہ دوبارہ شائع کیا جو طبع اوّل کی عکسی اشاعت ہے۔ آخر میں "اضافہ طبع دوم" کے تحت گرامی کے نام ایک نئے خط اور بیگم گرامی کے نام ۷ خطوں [ماخوذ از "خطوطِ اقبال بنام بیگم گرامی" مرتبہ: حمید اللہ شاہ ہاشمی] کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ضخامت: ۱۴+۲۵۷ صفحات قیمت: ۲۰ روپے۔

(۱۱) خطوطِ اقبال

یہ مجموعہ مکاتیب، اقبال کے ایک سو گیارہ ایسے خطوط پر مشتمل ہے جو کسی مجموعۂ مکاتیب میں موجود نہیں، اگر موجود ہیں تو ان کا متن ناقص، ادھورا یا غلط ہے۔ کتاب میں اردو کے ۹۱، انگریزی کے ۱۹ اور عربی کا ایک خط شامل ہے۔ عربی اور انگریزی خطوط کا اصل متن مع ترجمہ دیا گیا ہے۔ مجموعے میں اقبال کے ۹ اردو اور انگریزی خطوط کی عکسی نقول بھی شامل ہیں۔ اقبال کے نام جامعہ ازہر کے مصطفےٰ المراغی کے جوابی خط کی عکسی نقل بھی شامل کی گئی ہے۔

"پیش لفظ" ڈاکٹر سید عبداللہ نے تحریر کیا ہے۔ عرضِ مرتب کے زیرِ عنوان مرتب نے صحتِ متن کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مختلف مثالوں کے ذریعہ وضاحتیں کی ہیں۔ "خطوطِ اقبال" کے آغاز میں مکاتیبِ اقبال کے مختلف مجموعوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ تمام مکتوب الیہم کے نام خطوط کی ترتیب تاریخ اور سنہ وار دی گئی ہے۔ ہر خط سے پہلے مکتوب الیہ کا مختصر تعارف اور خط کا مختصر پس منظر دیا گیا ہے۔ پاورقی تعلیقات میں متنِ خط کے اختلافات اور بعض شخصیات وغیرہ کے بارے میں تعارفی شذرات موجود ہیں۔ کتاب کا تیسرا حصہ [ضمیمے: ص ۲۹۲ تا ۳۰۸] متونِ مکاتیب سے متعلق بعض نثری و شعری تحریروں پر مشتمل ہے۔ چوتھے حصے بہ عنوان "ماخذ" میں ہر خط کے ذریعۂ حصول، قبل ازیں اس کی اشاعت اور بعض انگریزی خطوط کے ناقص ترجموں سے بحث کی گئی ہے۔ مجموعے کے آخر میں

کتابیات اور ایک مفصل اشاریہ بھی شامل ہے۔

مبسوط مقدمہ، کارآمد حواشی اور مفید تعلیقات نیز متن کی تصحیح اور خطوط کی بعض تاریخوں کی درستی اور دیگر بیش قیمت معلومات کے لحاظ سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا مرتب کردہ "خطوطِ اقبال" جدید سائنٹفک تحقیق کے معیارات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

۱۹۷۶ء میں مکتبہ خیابانِ ادب لاہور نے اس مجموعہ کو شائع کیا۔ ضخامت ۲۷۶ صفحات۔ قیمت: چالیس روپے۔ ۱۹۷۷ء میں اس کتاب کے عکس پر مبنی دوسرا ایڈیشن دہلی سے شائع ہوا جس پر "بار اوّل" درج ہے جو درست نہیں۔ بقول مرتب رفیع الدین ہاشمی "یہ اشاعت مرتب کی اجازت و اطلاع کے بغیر ہوئی"۔

خطوطِ اقبال [بنام بیگم گرامی] (۱۲)

بیگم مولانا عبدالقادر گرامی کے نام اقبال کے ۸ خطوط پر مشتمل یہ مختصر مجموعہ حمید اللہ شاہ ہاشمی نے مرتب کر کے جنوری ۱۹۷۸ء میں فیصل آباد سے شائع کیا تھا۔ مولانا گرامی کی وفات کے بعد بیگم گرامی ان کا کلام مرتب کر کے شائع کروانا چاہتی تھیں، اس سلسلے میں وہ اقبال سے مشورہ و اعانت کی طالب ہوئیں۔ اقبال کے یہ خطوط کلامِ گرامی کی ترتیب و تدوین اور کتابت و طباعت کے ضمن میں ہدایات پر مشتمل ہیں۔ یہ خطوط ۲ گرامی کے دستاویزات سے حاصل کر کے مرتب کیے گئے ہیں۔

مرتب نے مجموعے کے ابتدائی حصے میں مولانا گرامی اور اقبال کے باہمی روابط پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا گرامی کی یادداشتوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بیگم گرامی کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔ بعد ازاں خطوطِ اقبال کا متن اور آخر میں عکسی خطوط دیے گئے ہیں۔ مجموعے میں مولانا گرامی کے نام اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط بھی شامل ہے۔ محمد عبداللہ قریشی نے ان خطوط کو مکاتیبِ اقبال بنام گرامی کے طبع مطبوعہ ۱۹۸۱ء میں شامل کر لیا ہے۔

۷۶ صفحات کو محیط اس مجموعے کی قیمت ۶ روپے ہے۔

روحِ مکاتیبِ اقبال (۱۳)

محمد عبداللہ قریشی نے اقبال کے بیشتر دستیاب خطوط کے منتخب اقتباسات زمانی ترتیب سے مرتب کر کے "روحِ مکاتیبِ اقبال" کے عنوان سے شائع کیے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۶ء تک مکاتیبِ اقبال کے ۱۱ مجموعے شائع ہو چکے تھے، قریشی صاحب نے ان تمام مجموعوں کے خطوط کو کر کے اقبال ہی کے الفاظ میں تلخیص کر دیا۔ اس مجموعے کے ذریعہ بہت سے غیر مدوّن خطوط کی مکمل صورت نہ سہی مگر جزوی شکل میں بازیافت ہوتی ہے۔ اس طرح مکمل مطبوعہ خطوط کی تلاش و تحقیق میں مدد مل سکتی ہے۔ قریشی صاحب کی تحریر کے مطابق "اس مجموعے میں کم و بیش بارہ سو خطوں کا نچوڑ ہے"۔

یہ ضخیم کتاب ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) نے اقبال کے جشن صد سالہ تقریبات کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ کتاب کے آخر میں ایک مفید اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

LETTERS OF IQBAL (۱۴)

بشیر احمد ڈار نے نومبر ۱۹۶۷ء میں LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL کے نام سے جو مجموعہ مرتب کیا تھا، یہ مجموعہ اس کی توسیع و اضافہ شدہ صورت ہے۔ اس مجموعے میں مرتب نے بہت سے نئے خطوط شامل کیے ہیں اور متفرق تحریروں کو خارج کر دیا ہے۔ اب اس کتاب کی حیثیت بطور ایک مجموعۂ مکاتیب کی ہو گئی ہے۔ ایک سو تین خطوط پر مشتمل یہ مجموعہ نہایت ہی توجہ اور محنت کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں تین جزوی خطوط، ایک نامکمل خط اور ۲ مدد خواستیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ مجموعہ کو زیادہ جامع اور مفید بنانے کے

طوطِ اقبال کے دو لسانی ضخیم مجموعوں "خطوط بنام عطیہ فیضی" (انگریزی) اور "خطوط بنام جناح" (انگریزی) کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس طرح اقبال
کے تقریباً تمام ہی انگریزی خطوط اس مجموعے میں یکجا ہو گئے ہیں۔

کتاب کی ابتداء میں ان اشخاص کے نام خطوط رکھے گئے ہیں جنھیں اقبال نے ایک سے زائد خطوط لکھے۔ اس کے بعد مختلف اشخاص
کے نام متفرق خطوط۔ مکتوب الیہم کے تعارف اور خطوط کے توضیح طلب مقامات کے بارے میں مفصل حواشی و تعلیقات اور شذرات
تحریر کیے گئے ہیں۔ مکاتیب بنام عطیہ بیگم پر ایک مفصل مقدمہ اور چند ایک ضمیمے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ متفرق خطوط کی توضیحات و تعلیقات
بھی اور تشنہ ہیں۔ خطوط کے حصول و دستیاب کے ماخذ اور حوالے درج نہیں کیے گئے۔ متونِ خطوط میں کئی تصرفات کیے گئے ہیں جن کی صراحت نہیں کی گئی۔
متن کی تصحیح و تکمیل اور وضاحت کے لیے مرتب نے قوسین میں اضافے کیے ہیں لیکن اس کی بھی صراحت نہیں کی گئی۔ خطوط کے بعض حصے درج
ہونے سے رہ گئے۔

اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) نے ۱۹۷۸ء میں اس مجموعے کو ٹائپ میں شائع کیا۔ ضخامت: ۱۲ + ۲۷۰ صفحات۔ قیمت تیس روپے۔

⑮ اقبال نامے

"اقبال نامے" مرتبہ ڈاکٹر اخلاق اثر، اقبال کے بھوپال سے روابط پر ۷۱ خطوط کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ۶۲ خطوط اردو کے اور ۹ خطوط
انگریزی کے ترجمہ کر کے شامل کیے گئے ہیں۔ بیشتر خطوط "اقبال نامہ" سے ماخوذ ہیں لیکن اس مجموعے میں غیر مطبوعہ خطوط کے ذیل میں ایک
انگریزی مکتوب بنام شعیب قریشی محررہ ۱۱ر جون ۱۹۳۰ء اور سر راس مسعود (۱۸۸۹ء – ۱۹۳۷ء) کے نام ۱۳ر مئی ۱۹۳۵ء، ۳۰ مئی
۱۹۳۰ء اور ۳ر جون ۱۹۳۷ء کے غیر مطبوعہ خطوط کا متن۔ اور ۱۳ر مئی ۱۹۳۵ء (انگریزی)، ۳۰ر مئی ۱۹۳۵ء، ۱۵ر جون ۱۹۳۵ء، ۸ر جون اور ۱۰ر
جون ۱۹۳۷ء کے خطوط کا بقول مرتب معیاری، مکمل اور مستند متن پہلی بار اس مجموعے کے ذریعہ سامنے آیا۔ لیکن یہ خطوط اور دیگر خطوط کے
متن میں بہت سی ایسی خامیاں رہ گئی ہیں جن کی صراحت یا وضاحت ضروری تھی۔ تمام خطوط یا پھر نو دریافت خطوط کے عکس شامل کیے جاتے
تو اس مجموعے کی خوبی دوچند ہو جاتی۔

۱۰۷ صفحات کی اس کتاب میں ۷۵ صفحات میں خطوط کا متن اور باقی ۲۹ صفحات میں، نام، فہرست، انتساب، "اقبال اور شیش محل"،
(مطبوعہ ۱۹۷۷ء) پر تبصرے اور علامہ اقبال سے بھوپال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی خامی یہ ہے اس میں
حوالے اور ضروری حواشی و تعلیقات نہیں دیے گئے۔

یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں طارق پبلی کیشنز، صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال سے شائع ہوئی۔ قیمت ۲۵ر روپے۔

⑯ اقبال ــــــ جہانِ دیگر

مولانا راغب احسن (۲۲ر جنوری ۱۹۰۴ء، گیا – ۲۸ر نومبر ۱۹۷۵ء، کراچی) کے نام علامہ اقبال کے ۴۴ اردو انگریزی خطوط کو محمد
فرید الحق ایڈووکیٹ نے مرتب کر کے ۱۹۸۳ء میں کراچی سے شائع کیا۔ ۱۵۲ صفحات کی اس کتاب میں اندرونی سرورق اور اشاعتی تفصیلات،
انتساب، عرضِ ناشر، ترتیبِ مضامین اور خطوط کی فہرست دی گئی ہے۔ پیش لفظ از مرتب محمد فرید الحق، دیباچہ از محمد علی صدیقی اور تعارف از
رئیس امروہوی۔ اس کے بعد صفحہ نمبر ۲۷ سے صفحہ نمبر ۱۲۷ تک اردو انگریزی خطوط کے عکس اور ان کا متن دیا گیا ہے۔ کتاب میں اردو کے ۳۵
اور انگریزی کے ۹ خطوط دیے گئے ہیں۔ اردو کا پہلا خط ۲۵ر جولائی ۱۹۲۷ء کا تحریر کردہ ہے اور آخری خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔
انگریزی خطوں میں پہلا خط ۸ر اپریل ۱۹۳۳ء کا تحریر کردہ ہے اور آخری خط ۱۹ر ستمبر ۱۹۳۷ء کا ہے۔
کتاب کے آخر میں علامہ راغب احسن مرحوم کی شخصیت، کردار اور قومی خدمات پر سید منیر علی جعفری کی تلخیص دی گئی ہے اور "نیرنگ
خیال" (لاہور) کے "اقبال نمبر" مطبوعہ ۱۹۳۲ء سے راغب احسن کا مضمون "اقبال اکادمی" پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں بعض ترتیبی الجھاوے اور متن کے کئی امور وضاحت طلب ہیں، مستند حواشی اور تعلیقات کی کمی اس اہم کتاب کی سب سے بڑی خامی ہے۔ کتاب کے مشمولات کی چند خامیاں اور وضاحت طلب امور یہاں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ ۱۴ر دسمبر ۱۹۲۹ء کا ایک مختصر خط، انوری بیگم کے نام ہے۔ ۲۔ ۱۲ر جون (؟) اس خط پر سنہ درج نہیں ہے کا خط سید نذیر نیازی نے علامہ اقبال کی جانب سے راغب احسن کے نام تحریر کیا تھا۔ ۳۔ ۱۲ر فروری ۱۹۳۵ء مولانا شفیع کے نام ہے جو بھوپال سے علامہ اقبال نے تحریر کیا تھا، اس خط میں انگریزی حرف "R" سے مراد راغب احسن ہیں۔ ۴۔ ۱۹ر ستمبر ۱۹۳۷ء کے انگریزی خط پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں۔ ۵۔ ۸ر اپریل ۱۹۳۳ء کا خط راغب احسن کے لیے ایک سفارش نامہ ہے، اس خط پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں۔ متن کی ترتیب میں کچھ خامیاں یہ بھی ہیں: صفحہ ۸۲ کے اصل خط کا عکس صفحہ نمبر ۷۵ پر، صفحہ ۷۲ کے اصل خط کا عکس صفحہ نمبر ۷۵ پر دیا گیا ہے۔ ایک ٹیلی گرام کا عکس صفحہ ۱۲۸ اور متن صفحہ ۱۱۷ پر دیا گیا ہے۔

اقبال ــ جہانِ دیگر اس اعتبار سے ایک قابلِ قدر مکاتیب کا مجموعہ ہے کہ علامہ نے راغب احسن کے نام بعض کلیدی اہمیت کے خطوط تحریر کیے ہیں جن سے دونوں کے درمیان قربتوں کا احساس و اعتماد ابھرتا ہے نیز بعض وہ مسائل جو علامہ کے فکری ردّیوں میں سوال بن کر ابھرتے رہے ہیں ان کی صراحت مزید معلومات فراہم کرتی ہے۔

یہ کتاب گردیزی پبلشرز، ۳۲۶/۱، محلہ اسلام گنج لسبیلہ چوک نشتر روڈ، کراچی ۔ ۵ (پاکستان)، نے شائع کی۔ قیمت: ۱۶ روپے۔

(۴)

اقبال کی شاعری کے علاوہ ان کے ثانوی مگر اہم ترین تخلیقی لوازمے میں خطوط اور تین مختلف نثری تصانیف کا تحقیقی احوال مندرجہ بالا سطور اور آئندہ مستقل تصانیف کے ذیل میں آچکا ہے لیکن علامہ کے باقی نثری آثار مختلف النوع ہیں، ان میں متفرق مقالات، مضامین، خطبات، بیانات، تقاریر، دیباچے، تقاریظ، انٹرویوز، پیغامات، توصیفی اسناد، شذرات اور تنقیدی مباحث وغیرہ شامل ہیں، جنھیں متعدد اردو، انگریزی مجموعوں کی صورت میں مرتب و مدوّن کر کے شائع کیا گیا ہے، موجود معلوم نثری کتابوں کے ایڈیشنوں کے علاوہ علامہ اقبال کی کوئی نہ کوئی تحریر دستیاب ہوتی رہتی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

اقبال کا قدیم ترین دستیاب مضمون "بچوں کی تعلیم و تربیت" مطبوعہ ماہنامہ "مخزن" شمارہ جنوری ۱۹۰۲ء ہے اور انگریزی مضامین میں قدیم ترین دستیاب مضمون:

THE DOCTRINE OF ABSOLUTE UNITY AS EXPOUNDED BY ABDUL KARIM AL-JILANI.

یہ مضمون بمبئی کے ایک جریدے INDIAN ANTIQUARY کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا تھا بعد میں کسی قدر ترمیم کے بعد اقبال نے اسی مضمون کو اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں شامل کر لیا تھا۔ یہ مضمون علامہ کے اردو انگریزی مضامین کے ذخیرے میں قدیم ترین دستیاب مضمون ہے۔ اقبال نے اردو سے زیادہ انگریزی میں مقالے لکھے۔ متفرق نثر میں تقاریر، بیانات اور انٹرویوز وغیرہ سے قطع نظر کریں تب بھی چھوٹے بڑے مستقل تحریری مضامین کی تعداد ۲۱ بنتی ہے۔

مستقل نوعیت کے مضامین و مقالات کے علاوہ باقی نثری ذخیرے میں ہر نوع کی تحریریں شامل ہیں۔ کچھ اخباری انٹرویوز، بعض طویل خطوط میں علمی و ادبی مباحث جو موضوعی اہمیت کے اعتبار سے مضامین کے طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ مجلس قانون ساز میں ۹ تقاریر، اخباری بیانات، مختلف اجتماعات میں کی گئی تقاریر کے خلاصے جو پرانے اخبارات سے لیے گئے۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کے متروک دیباچے۔ دیگر مصنفین کی کتابوں پر تقاریظ اور شذرات وغیرہ۔

متفرق نثری مجموعے، ملفوظات کے مجموعے اور اقبال کی مرتب کردہ کورس کی کتابوں کا مختصر احوال درج کیا جا رہا ہے۔ اقبال کی نثری کاوشوں کا تفصیلی تحقیقی و تنقیدی جائزہ شاعر کے "اقبال نمبر ـ ۲" میں پیش کیا جائے گا۔

① مضامینِ اقبال

علامہ اقبال کے انتقال کے بعد ان کے نثری مضامین پر مشتمل پہلی کتاب جو ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی، اسے احمدیہ پریس
نصدق حسین تاج نے مدوّن و مرتب کیا۔ تاج صاحب نے اقبال کی حیات ہی میں DEVELOPMENT کا اردو ترجمہ "فلسفۂ عجم" از میر
ن الدین، [مطبوعہ ۱۹۳۶ء] شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے دو سال بعد انھوں نے اقبال کی بعض نظموں پر مشتمل کتابچے شائع کیے۔ ۱۔
اقبال "سفر حیدرآباد دکن ۱۹۱۰ء میں" مطبوعہ ۱۹۳۸ء۔ ۲۔ نظم سپاس جناب امیر اور دوسری نظمیں، مطبوعہ ۱۹۳۸ء۔ "مضامینِ
ل" [مطبوعہ ۱۳۶۲ھ] اقبال کے شعری مجموعوں کی تقطیع پر شائع کی گئی۔ اس کا دیباچہ غلام دستگیر رشید نے بعنوان "صبح مراد"
یر کیا تھا۔ یہ دس صفحات کو محیط ہے۔ ضخامت: ۱۴ + ۴ + ۲۰ صفحات۔ کوئی دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

"مضامینِ اقبال" میں اقبال کے کل ۱۴ نثر پارے شامل کیے گئے ہیں، ان میں سے ۶ مضامین انگریزی مضامین کا ترجمہ ہیں، باقی ۸ مضامین
دو کے ہیں۔ قدیم رسائل سے مرتب نے ۸ مضامین حاصل کیے تھے۔ مضامینِ اقبال یہ ہیں:

اردو "زبانِ اردو" [مخزن: ستمبر ۱۹۰۲ء] "اردو زبان پنجاب میں" [مخزن، اکتوبر ۱۹۰۲ء] "قومی زندگی" [مخزن، ستمبر ۱۹۰۴ء]
"دیباچہ مثنوی اسرارِ خودی"، "دیباچہ رموزِ بےخودی"، "دیباچہ پیامِ مشرق"۔

انگریزی "فلسفہ سخت کوشی" [اقبال بنام ڈاکٹر نکلسن، ایک طویل مکتوب مورخہ: ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء کا اردو ترجمہ از چراغ حسن
رت۔ یہی ترجمہ اقبال نامہ (اوّل) میں شامل ہے] "جناب رسالتِ مآب کا ادبی تبصرہ" [اصل مضمون پہلی بار لکھنؤ کے
ہ ۸ جولائی ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا، اس کا اردو ترجمہ ستارۂ صبح (لاہور) ۸ اگست ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا] "ملّتِ بیضا پر ایک
نی نظر"، "خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء" [ترجمہ: نذیر نیازی] "ختمِ نبوّت" [ترجمہ میر حسن الدین ۲۲ جنوری ۱۹۳۴ء] "جغرافیائی
دو اور مسلمان" [مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں] "دیباچہ مرقع چغتائی" [ترجمہ: غلام دستگیر رشید۔ انجمن ادبی کابل]۔

SPEECHES AND STATEMENTS OF IQBAL ②

لطیف احمد شیروانی نے "شاملو" کے قلمی نام سے ۱۹۴۴ء میں انگریزی تحریروں، تقاریر اور خطبات و بیانات جمع کر کے کتابی صورت میں
ن کیا اور مارچ ۱۹۴۵ء میں لاہور سے شائع کیا۔ طبع اوّل کی اشاعت کا سال کتاب پر درج نہیں، طبع دوم [۱۹۴۸ء] میں اشاعتِ اوّل
نہ درج ہے۔ کتاب کی ضخامت ۲۲۰ صفحات ہے۔

یہ مجموعہ تین حصوں میں منقسم ہے:

حصہ اوّل: ۲ طرح کی تقاریر پر مشتمل ہے [الف] دو صدارتی خطبے: الٰہ آباد ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء، لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء۔
[ب] مجلسِ قانون ساز پنجاب میں کی جانے والی ۸ تقاریر۔

حصہ دوم: بہ عنوان "اسلام اور قادیانیت کے تحت" کے تحت یہ تحریریں شامل ہیں۔ [الف] "قادیانی اور راسخ العقیدہ
مان" [ب] مذکورہ مضمون پر قادیانی اخبار "لائٹ" کے اعتراضات کا جواب [ج] مذکورہ مضمون پر روزنامہ "اسٹیٹسمین"
عتراضات کا جواب [د] قادیانیت کے سلسلے میں پنڈت نہرو کے سوالات کا جواب۔

حصہ سوم: تین طرح کے نثر پارے جمع کیے گئے ہیں [الف] کل ہند مسلم لیگ کے سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ کا خط اور سر فرانسس
ہز لینڈ کے نام ایک مکتوب کے بعض حصے [ب] مختلف سیاسی اور قومی مسائل کے بارے میں ۲۰ بیانات [ج] سالِ نو کا ریڈیائی
م [یکم جنوری ۱۹۳۸ء]۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ چند اضافوں کے سوا طبع دوم، طبع اوّل ہی کے مطابق ہے۔ اس میں کوئی حصہ

کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ کتاب کے حصہ دوم میں دو چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ۱۔ MR. TAGGART'S PHILOSOPHY
۲۔ SOME STUDY NOTES [اس کا موضوع حیات بعد الممات ہے]۔ حصہ سوم میں فارقوہرسن کے نام دو مکاتیب محررہ ۲۰ر جولائی ۱۹۳۲ء اور ۵ر ستمبر ۱۹۳۲ء کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ نامکمل مکاتیب ہیں۔

لطیف احمد خاں شیروانی نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا، اشاعتوں کی تفصیل یہ ہے: ۱۔ ۱۹۴۵ء ۲۔ ۱۹۴۷ء ۳۔ ایم ثناء اللہ خان لاہور ۱۹۵۵ء ۴۔ ۱۹۶۱ء۔

اس کتاب کی طبع سوم کی اشاعت ۱۹۷۷ء سے قبل طبع اول دوم کے مشمولات کو قدرے ترمیمات کے ساتھ کئی دیگر حضرات نے اپنی کتابوں میں شامل کر لیا تھا۔ اقبال صدی کے موقع پر مرتب نے اس مجموعے کو از سر نو ترتیب دیا اور کتاب کا نام بدل کر:

SPEECHES, WRITINGS AND STATEMENTS OF IQBAL.

رکھ دیا۔ طبع دوم کے مشمولات کی مکرر چھان پھٹک کی، بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ کیا اور حوالوں اور پاورقی حواشی کا اضافہ کیا۔

کتاب میں جو اضافے کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں: ۱۔ مجلس قانون ساز میں ۱۸ر جولائی ۱۹۲۷ء کی تقریر ۲۔ RELIGION AND PHILOSOPHY کے عنوان سے ایک حصہ: اس میں دو مضامین تو وہ ہیں جو طبع دوم میں بڑھائے گئے تھے مگر ۱۳ نئے طویل و مختصر مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں ۳۔ "اسلام اور قادیانیت" [جو اب کتاب کا تیسرا حصہ ہے] کے زیر عنوان دو نئی چیزوں کا اضافہ۔ [الف] پنڈت نہرو کے نام ایک خط [ب] وضاحتی بیان۔ ۴۔ حصہ دوم کی ایک تحریر: SOME STUDY NOTES کے پہلے پیراگراف کے آخر میں یہ جملہ بڑھایا گیا ہے:

I AM SURE THIS PASSAGE WILL INTEREST THE READERS OF THE MUSLIM REVIVAL.

حصہ چہارم میں دو نثرپاروں کا اضافہ ۱۔ گاندھی کے نام ایک خط ۲۔ بمبئی کرانیکل میں مطبوعہ انٹرویو۔

کتاب میں جو ترمیمات کی گئیں وہ یہ ہیں: ۱۔ طبع دوم کے حصہ دوم کے چوتھے مضمون [ص: ۱۱۱] کا عنوان بدل کر: IQBAL AND AHMEDISM کر دیا گیا ہے۔ ۲۔ طبع دوم میں MR. TAGGART'S PHILOSOPHY میں مذکور "گلشن راز جدید" کے فارسی اشعار کے متن کو طبع سوم سے نکال کر ان کا انگریزی ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ ۳۔ طبع دوم میں شامل ایک تحریر SOME STUDY NOTES کا عنوان بدل کر CORPOREAL RESURRECTION کر دیا۔ اس مضمون کے متن میں بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

STRAY REFLECTION (۳)

اقبال کی زندگی کے ایک نہایت اہم دور سے متعلق ان کے چند شذراتِ فکر ایک ڈائری میں محفوظ ہو گئے تھے جسے اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال نے مرتب کر کے جون ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔ چھوٹی تقطیع کی اس بیاض میں کل ۱۲۵ شذرات ہیں۔ اقبال نے پہلے اس بیاض کا نام STRAY THOUGHTS رکھا تھا، پھر STRAY REFLECTION کر دیا۔ آغاز ۲۷ر اپریل ۱۹۱۰ء کو ہوا اور تمام اندراجات اسی سال تحریر کیے گئے۔ مطبوعہ بیاض میں بعض صفحات کے عکس بھی دیے گئے ہیں۔ ضخامت: ۱۶۱ + ۴۹۔ غلام علی اینڈ سنز نے اس مجموعے کو ٹائپ میں شائع کیا۔

مقالاتِ اقبال (۴)

سید عبدالواحد معینی نے ۱۹۶۳ء میں اس مجموعے کو مدون و مرتب کیا اور شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے اس کتاب کو شائع کیا، ضخامت: ۱۲ + ۱۸ + ۲۴۷ + ۳ = ۲۸۰ صفحات۔ پیش لفظ از ڈاکٹر سید عبداللہ۔ اس مجموعے میں شامل نثرپاروں کی تعداد ۴۳ ہے۔ اس مجموعے میں تصدق حسین تاج کے مرتبہ "مضامین اقبال" کے [ختم نبوت اور مرقع چغتائی کے علاوہ] تمام مقالات شامل ہیں۔

مندرجہ ذیل تحریروں کا مزید اضافہ کیا گیا ہے :
"بچوں کی تعلیم و تربیت" [مخزن : جنوری ۱۹۰۲ء] "اقبال کے دو خطوط ایڈیٹر "وطن" کے نام" [مدیر انشاء اللہ خاں، محررہ : ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء، ۲۵ ستمبر ۱۹۰۵ء] "ملتِ اسلامیہ" [تقریر ۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، دہلی ۱۹۱۱ء ۔ انگریزی کا یہ مضمون لندن اور ہندوستان کے کئی انگریزی رسائل میں شائع ہو چکا ہے ۔ اس کا اردو ترجمہ چودھری محمد حسین نے کیا اور کتابچے کی صورت میں ظفر برادرس نے ۱۹۲۳ء میں لاہور سے شائع کیا۔ کتابچے میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اقبال نے یہ تقریر اپنے قیام لندن کے دوران ۱۹۰۸ء میں پان اسلامک سوسائٹی کے ایک جلسے میں کی تھی] ۔ "ایک دلچسپ مکالمہ" [تصوف کے موضوع پر ایک انٹرویو، طریقت، اگست ۱۹۱۷ء] ۔ "اسرارِ خودی اور تصوف" [وکیل ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء] ۔ "سِرِّ اسرارِ خودی، تصوفِ وجودیہ" [وکیل ۱۳ دسمبر ۱۹۱۲ء] ۔ "دیباچہ اسرارِ خودی"، اشاعتِ دوم ۔ "محفل میلاد النبی" ۔ "تقاریظ بر تصانیف محمد دین فوق" ۔ "اراکینِ انجمن حمایتِ اسلام کے نام" ۔ "اسلام اور علومِ جدیدیہ" [اختتامی تقریر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، دہلی ۱۹۱۱ء] ۔ "خطبہ عید الفطر، انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور" [۱۹۳۲ء]

THOUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL ⑤

سید عبدالواحد نے مئی ۱۹۶۴ء میں اس مجموعے کو مرتب کر کے شائع کیا ۔ یہ مجموعہ چار حصوں میں منقسم ہے : ۱ ۔ ۲۲ متفرق مقالات و مضامین اور صدارتی خطبات، شذراتِ فکر اور بعض کتابوں پر تقاریظ وغیرہ ۔ ۲ ۔ اسلام اور قادیانیت پر ۷ تحریریں ۔ ۳ ۔ مجلسِ قانون ساز پنجاب کی ۸ تقاریر ۔ ۴ ۔ سیاسی اور ملی مسائل کے بارے میں ۱۲ بیانات ۔

یہ مجموعہ شاملو کی کتاب SPEECHES [دوم : ۱۹۴۸ء] کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے ۔ شاملو کے مجموعے میں ۴۹ نگارشات شامل تھیں ۔ اس مجموعے میں شامل نگارشات کی تعداد ۵۰ ہے ۔ مرتب نے شاملو کے مجموعے سے ۱۸ بیانات خارج [۴۹ ـ ۱۸ = ۳۱] کر کے ۱۹ نئی تحریروں کا اضافہ [۳۱ + ۱۹ = ۵۰] کیا ۔ ضخامت : ۱۶ + ۳۸۲ صفحات ۔

اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا ۔

گفتارِ اقبال ⑥

محمد رفیق افضل نے جنوری ۱۹۶۹ء میں اقبال کے نثری افکار کو مرتب کر کے شائع کیا ۔ یہ مجموعہ اپنے ماقبل شائع ہونے والے اقبال کے نثری مجموعوں سے مختلف ہے کہ اس میں علامہ کے مقالات و مضامین کے بجائے ان کی تقاریر اور بعض بیانات کو مدوّن و مرتب کیا گیا ہے ۔

اس مجموعے کے مشمولات کو ۶ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱ ۔ مختلف علمی، تعلیمی یا ثقافتی اجتماعات اور سیاسی و انتخابی جلسوں میں کی جانے والی تقاریر ۔ ۲ ۔ اخبارات و رسائل سے انٹرویوز اور اخباری نمائندوں کے سوال و جواب ۔ ۳ ۔ اہم تاریخی و سیاسی مواقعوں پر جاری کیے جانے والے بیانات ۔ ان میں سے بعض بیان اقبال کے انفرادی اور بعض دیگر اکابر کے ساتھ مشترکہ دستخطوں کے ساتھ ۔ ۴ ۔ خطوط، جو بعض امور کی وضاحت کے لیے زمیندار یا انقلاب کے مدیران کو تحریر کیے گئے ۔ ۵ ۔ اقبال کے دورۂ جنوبی ہند [۱۹۲۸ء، ۱۹۲۹ء] اور دورۂ انگلستان و اٹلی [۱۹۳۱ء ـ ۱۹۳۲ء] کی تفصیلات پر مشتمل "انقلاب" میں مطبوعہ اخباری رپورٹیں اور مکتوبات نمائندہ خصوصی ۔ ۶ ۔ متفرقات، مثلاً : اقبال کی طرف سے جاری کردہ اپیلیں، پیغامات اور اقبال سے ملاقاتوں کی رودادیں ۔

اس طرح کل نثر پاروں کی تعداد ۱۱۷ بنتی ہے ۔ ہر نثر پارے کی ابتدا میں ایک تمہیدی نوٹ دیا گیا ہے ۔ متن کتاب صفحہ ۱ تا ۲۷۲ ۔ ابتدائی ۲۰ صفحات [سرورق، فہرست اور مقدمہ] اس کے علاوہ ہیں ۔ آخر میں ایک مفصل اشاریہ بھی دیا گیا ہے ۔ کتاب ٹائپ میں طبع کی گئی ہے ۔ ضخامت : ۲۰ + ۲۹۲ صفحات ۔ ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ لاہور نے شائع کیا ۔ قیمت : ۱۲ روپے ۔

SPEECHES AND STATEMENTS OF IQBAL ⑦

یہ کتاب شاملو کے مجموعے SPEECHES (دوم) کی مکرّر اشاعت ہے جسے مرتب : اے آر طارق نے اپنے دیباچے کے اضافے کے
اپنی مرتبہ COMPILED کتاب کی حیثیت سے اپریل ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ کتاب کے شمولات کی تعداد اور ان کی ترتیب SPEECHES
کی ہے۔ مرتب نے اپنے دیباچے میں اس کتاب کی مکرّر اشاعت کا جو جواز پیش کیا ہے، وہ یہ ہے - ۱۔ شاملو کے مجموعے کی طباعت
معیاری نہیں تھا۔ ۲۔ اس میں اردو اور فارسی اشعار کا ترجمہ نہیں دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق "مرتب کے دو
نہ صرف کمزور اور بھونڈے ہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی ہیں"۔ یہ کتاب ایک ادبی سرقہ ہے۔
ضخامت: ۱۹ + ۲۴۶ صفحات۔ اس کتاب کو شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کیا۔

MEMENTOS OF IQBAL ⑧

کتاب کے مرتب رحیم بخش شاہین نے اقبال کے متفرق نثر پاروں کے علاوہ مضامین، بیانات اور مکاتیب وغیرہ کو مدوّن کر
۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔ [کتاب پر اشاعت کا سنہ درج نہیں ہے۔ اس مجموعے کا سارا لوازمہ ISLAMIC EDUCATION
کے شمارہ جنوری فروری ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا] یہ مکمل طور پر نثر اقبال کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک تہائی حصہ اقبال کے بار
مختلف اہلِ قلم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ مجموعہ تین حصّوں میں منقسم ہے:

۱۔ حصہ اوّل: مضامین و بیانات: اس میں مختلف النوع تحریریں شامل ہیں۔ دو مضامین، چار تقاریر، دو ا
ایک پیغام تعزیت، ایک مشترکہ اپیل۔ بیشتر تحریریں لاہور کے انگریزی ہفت روزہ "لائٹ" کے پرانے شماروں سے اخذ کی گئی ہیں
کی اصل تقاریر اردو میں تھیں۔ ۴ میں سے ۲ تقاریر کا متن "گفتارِ اقبال" [ص: ۱۱۶، ۱۴۲] میں شامل ہے۔

۲۔ حصہ دوم۔ خطوط کے زیرِ عنوان ۸ خطوط کے ساتھ ڈاکٹر تاثیر کے لیے ایک توصیفی سند بھی شامل ہے۔ یہ تمام مکا
خطوطِ اقبال" [از ہاشمی: ۱۹۷۶ء] اور LETTERS OF IQBAL [مرتبہ: بی۔ اے۔ ڈار، ۱۹۷۸ء] میں شامل کر لیے گ

۳۔ حصہ سوم: ۱۱ متفرق نثر پاروں میں سے صرف دو نگارشات [ایک تحریر اور بیان] اقبال کی ہیں، بقیہ مض
اہلِ قلم کے ہیں جن میں اقبال کی شخصیت اور سوانح سے متعلق بعض پہلوؤں پر مفید روشنی پڑتی ہے۔

کل نثر پاروں کی تعداد ۲۱ ہے۔ مرتب نے ہر نثر پارے کے آغاز میں مختصر تعارفی نوٹ دیے ہیں جن میں سیاق و سباق کے
بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ ضخامت ۸ + ۱۳۰ صفحات۔ اس کتاب کو آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور نے شائع

اقبال کے نثری افکار ⑨

عبدالغفار شکیل نے اقبال کے بیشتر کمیاب و نایاب نثری مضامین ["مضامین اقبال" کے بعد] جو کسی مجموعے میں شامل نہ
مدوّن کر کے مارچ ۱۹۷۷ء میں شائع کر دیا۔ اس مجموعے کے مشمولات کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب نے اپنے دیباچے
ہے کہ مجموعے میں بیشتر مضامین نایاب و کمیاب ہیں اور یہ کہ اس سے قبل کسی اور مجموعے میں شامل نہیں، صریحاً غلط ہیں کیوں کہ صرف دو م
۱۔ اسلامی یونیورسٹی۔ ۲۔ علم الانساب۔ وہی ایسے مضامین ہیں جو اس سے قبل اقبال کے نثر پاروں پر مشتمل کتابوں میں شامل نہ
نثر پارے "مضامینِ اقبال"، "مقالاتِ اقبال" اور دیگر کتابوں میں شامل ہیں۔ مجموعے میں شامل نثر پاروں کی تعداد ۲۵ ہے جب کہ
تعداد ۳۲ بتائی ہے۔

یہ کتاب صحتِ متن کے اعتبار سے نہایت ہی ناقص ہے۔ دیباچہ مرتب نے تحریر کیا ہے اور پیش لفظ: خلیق انجم نے لکھا

ادھوری اور تحقیقی اعتبار سے کم تر ہیں۔ ۲۸۲ صفحات کی اس کتاب کو انجمن ترقی اردو ہند [دہلی] نے شائع کیا۔

(۱۰) DISCOURSES OF IQBAL

شاہد حسین رزاقی کا یہ مجموعہ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ مرتب نے دیباچہ میں اس کتاب کی اشاعت کے احوال کے تحت بتایا ہے کہ انھوں نے ۱۹۴۱ء سے مضامینِ اقبال جمع کرنے کا کام شروع کیا تھا جب وہ حیدر آباد دکن میں تھے۔ ۱۹۴۶ء میں اقبال کی اردو اور انگریزی تحریروں کا ایک ایک مجموعہ تیار ہو گیا تھا مگر ۱۹۴۷ء میں دکن سے پاکستان ہجرت کر جانے کے سبب مسوّدات ضائع ہو گئے۔ مصنّف نے ہمت نہ ہاری اور اقبال کی نثری تحریروں کے جمع کرنے کا کام جاری رکھا اور ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ایک مجموعہ پھر تیار ہو گیا لیکن ناشر کے تساہل اور عدم تعاون کے سبب کئی برس تک اس کتاب کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ کسی طرح مسودہ واپس کر کے اسے شائع کیا۔

زیر نظر مجموعے میں علامہ اقبال کی ۳۳ انگریزی تحریریں، تقاریر اور بیانات شامل ہیں لیکن صرف ایک مضمون : BASIC PHILOSOPHY OF ASRAR-I-KHUDI کے علاوہ یہ تمام تحریریں THOUGHT اور SPEECHES [شیروانی] ہیں، لیکن مرتب کے دیباچے سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ان دو اہم کتابوں سے واقف ہیں۔

کتاب میں محمد علی جناح کے ایک خط بنام مرتب محررہ : ۹ / اگست ۱۹۴۱ء کا عکس دیا گیا ہے۔ ۲۸۸ + ۲۰ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں شائع ہو جاتی تو ایک بڑا کارنامہ ہوتی لیکن ۱۹۷۹ء تک تقریباً اکثر انھیں کوششوں کے نتیجے کے طور پر شائع ہو چکی تھیں۔

"انوارِ اقبال" کا احوال مکاتیب کے مجموعوں کے باب میں آچکا ہے۔ ایک کتاب کو دو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا گیا کیوں کہ اس کتاب کا غالب مواد خطوط پر مشتمل ہے۔

[۵]

علامہ اقبال کی جملہ شعری و نثری تصانیف کے ساتھ ان کے فرمودات و ارشادات پر مشتمل مجموعوں کا احوال بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں ان کتابوں کا مختصر ذکر کیا جائے گا جو اقبال کے ملفوظات کی شکل میں ہیں اور سماعی متن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کے سماعی متن کا ایک اہم اور نمایاں حصہ ان گفتگوؤں پر مشتمل ہے جنھیں نسبتاً بے تکلفانہ ماحول میں اور بلا قید موضوع آزادانہ اظہارِ خیال کی ایک صورت کہا جا سکتا ہے۔ سماعی متن کی یہی نوعیت "ملفوظات" کی ہے۔

علامہ اقبال کی صحبتوں سے مستفید و فیض یاب ہونے والوں میں کئی طرح کے لوگ شامل تھے۔ اقبال کے بعض معاصرین اور بے تکلف دوستوں میں شیخ عبد القادر، مرزا جلال الدین اور غلام بھیک نیرنگ وغیرہ شامل تھے۔ بعض کو علامہ اقبال کے سفر و حضر میں ساتھ رہنے کا موقع ملا، ان میں چودھری محمد حسین، محمد عبد اللہ چغتائی، غلام رسول مہر اور سید امجد علی وغیرہ شامل تھے۔ کچھ اصحاب اقبال کے آخری برسوں میں ان کے بے حد قریب رہے، سید نذیر نیازی، خواجہ عبد الوحید، چودھری محمد حسین، میاں محمد شفیع وغیرہ لیکن ایسے نیاز مندوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی جو وقتاً فوقتاً اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ملفوظات سے مستفید ہوتے، ان میں میاں بشیر احمد، محمد حسین عرشی، عبد المجید سالک، حفیظ ہوشیار پوری، ایم اسلم، تاثیر، خواجہ عبد الحمید وغیرہم شامل تھے۔ یہ سب لوگ لاہور کے رہنے والے تھے لیکن شہر کے باہر ہندوستان یا بیرونِ ملک سے بھی لوگ آئے مگر اقبال کی ان گفتگوؤں کو تحریر کرنے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔ بہت کم ایسے نکلے جو کسی حد تک یہ کام انجام دے سکے اور ملفوظاتِ اقبال کا اچھا خاصا ذخیرہ تحریری صورت میں منضبط ہو کر محفوظ ہو گیا ہے۔ ملفوظاتِ اقبال کا یہ ذخیرہ اقبال کی شاعری اور نثری افکار کا تتمہ ہے۔ ملفوظات سے بعض منظومات اور تصانیف کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض اشعار و مضامین کا منشا تحریر متعین اور سیاق و سباق واضح ہوتا ہے، بعض اشعار و نکات کی تشریح اقبال کی زبانی ملتی ہے۔ ملفوظات میں اقبال کی سوانح کے لیے خام مواد موجود ہے۔ بہت سے دلچسپ واقعات، زندگی کے مختلف ادوار سے متعلق بعض حالات نئے پہلو، عادات و اطوار، تفصیلات و معمولات

صحت، علاج، معالجہ، ماضی کا ذکر اور مستقبل کے خواب و عزائم۔ یہ ملفوظات ایک طرح سے اقبال کی آٹوبایوگرافی کا دلچسپ اور قابلِ قدر لوازمہ رکھتے ہیں۔

① ملفوظات

یہ کتاب اقبال کے مسلسل روزنامچوں یا ملفوظات کے بجائے ۱۵ ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جن میں بعض ملفوظات کے ساتھ لکھنے والوں نے اپنے مشاہدات اور اقبال کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ یہ تمام مضامین لاہور کی ایک ادبی انجمن "حلقہ نقد و نظر" کی مختلف نشستوں میں پڑھے گئے۔ بعد میں حلقے کے سکریٹری محمود نظامی نے انھیں کتابی صورت میں مرتب کر کے شائع کیا۔

اس مجموعے کو زمانی اعتبار سے اولیت حاصل ہے حالاں کہ کتاب پر سنہ اشاعت درج نہیں۔ کتاب میں شامل مضامین نگار کے نام اور مضامین کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ کیفِ غم: سر عبدالقادر۔ ۲۔ اقبال کی یادیں: میاں بشیر احمد۔ ۳۔ علامہ اقبال کی صحبت میں: محمد حسین عرشی۔ ۴۔ میرا اقبال: مرزا جلال الدین۔ ۵۔ ایک فیضانی لمحے کی یاد: ڈاکٹر تاثیر۔ ۶۔ اقبال کے ہاں ایک شام: ڈاکٹر سعید اللہ۔ ۷۔ علامہ اقبال سے ایک ملاقات: پروفیسر حمید احمد خاں۔ ۸۔ عمرِ عزیز کے بہترین لمحے: حفیظ ہوشیار پوری۔ ۹۔ یادِ ایام: خواجہ عبدالوحید۔ ۱۰۔ چند ملاقاتیں: سید الطاف حسین۔ ۱۱۔ دو ملاقاتیں: عابد علی عابد۔ ۱۲۔ اقبال کے ہاں: خضر تمیمی۔ ۱۳: حضرتِ علامہ عبدالواحد۔ ۱۴۔ بزمِ اقبال: سعادت علی خاں۔ ۱۵۔ مئے شبانہ: عبدالرشید طارق۔

۴۳۲ صفحات کی اس کتاب کو لالہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا۔

اس کتاب کا طبع دوم ۱۹۴۹ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس پر بھی سنہ اشاعت درج نہیں لیکن دیباچے کی تاریخ تحریر ۲۸ راپریل ۱۹۴۹ء سے طبع دوم کے سنہ اشاعت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کا سائز تبدیل کر دیا گیا۔ کتاب کا نام تبدیل کر کے "ملفوظاتِ اقبال" کر دیا گیا۔ طبع دوم کے آغاز میں دیباچہ طبع ثانی [پروفیسر حمید احمد خاں] اور دو مضامین، حکیم مشرق [محمد حسن قریشی] اور "ابا جان" [جاوید اقبال] ۲۴۰ صفحات کی یہ کتاب اشاعت منزل، ہل روڈ لاہور سے شائع کی گئی۔

"ملفوظات اقبال" کے طبع سوم کو ۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ کتاب میں "اقبال اور عبدالحق" سے مختصر ملفوظات اور "روزگارِ فقیر" سے بعض مختصر ملفوظات مع حواشی شامل کیے گئے ہیں۔ حواشی اور تعلیقات کا اضافہ بھی مرتب کی طرف سے ہے۔ کتاب کی تدوین اس طرح کی گئی ہے: پہلے مکمل متن بعد ازاں مکمل حواشی درج کیے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ بہ عنوان "اضافۂ متن" میں متن کے ہر ٹکڑے کے بعد اس پر تعلیقات درج کیے گئے ہیں۔ طبع دوم میں جاوید اقبال کے مضمون "ابا جان" کو متنِ کتاب سے نکال کر "اضافۂ متن" میں شامل کر لیا۔ پورا مضمون مکمل و مربوط دینے کے بجائے اس کے بعض حصے الگ الگ ٹکڑوں میں دیے گئے ہیں اور ٹکڑے کے بعد اس پر تعلیقات درج کیے گئے ہیں۔ "ملفوظاتِ اقبال" کی پہلی دونوں اشاعتوں پر بہ طور مرتب محمود نظامی کا نام درج تھا طبع سوم سے یہ نام ہٹا دیا گیا، اس کا کوئی جواز بھی نہیں دیا گیا۔ کتاب کے آخر میں "کتابیات" اور ایک مفصل "اشاریہ" بھی دیا گیا ہے۔

ٹائپ کے ۸ + ۶۶۲ صفحات کی اس کتاب کو اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) نے شائع کیا۔

② اقبال علیہ الرحمہ کے چند جواہر ریزے

۵۶ صفحات کی اس مختصر کتاب کو پروفیسر خواجہ عبدالحمید نے اقبال سے اپنی ملاقاتوں کی یادداشت کے بہ طور ترتیب دے کر ۱۹۴۷ء میں لاہور سے شائع کیا۔

علامہ اقبال سے مصنف کی ملاقاتوں کا سلسلہ نومبر ۱۹۲۰ء سے دسمبر ۱۹۳۷ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ملفوظاتِ اقبال کے اس منتخب مجموعے کو مرتب نے ایک خاص معیار کے مطابق ترتیب دیا ہے کہ یہ کسی کے لیے بارِ خاطر نہ ہو۔

ملفوظات و واقعات کو ۲۸ پاروں [ٹکڑوں] میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر پارہ کسی ایک واقعے یا ایک نشست کی روداد پر مشتمل ہے۔ اس کی مستند حیثیت کے پیشِ نظر بعض سوانح نگاروں کے کچھ بیانات اس مجموعے سے ماخوذ ہیں۔ عبدالسلام ندوی کا مرتبہ سوانحی خاکہ [اقبال کامل، ص: ۱ تا ۴۲] اسی کتاب کی روایات پر مبنی ہے۔

اس کتاب کو اقبال اکادمی پاکستان [لاہور] نے شائع کیا۔

(۳) روزگارِ فقیر

فقیر سیّد وحیدالدّین کے گھرانے سے اقبال کے بے حد دیرینہ مراسم تھے۔ مرتب کتاب اپنے بچپن سے اقبال کی وفات تک ان سے برابر ملاقاتیں کرتے رہے تھے۔ انھیں ملاقاتوں کے تاثرات کو انھوں نے "روزگارِ فقیر" کی صورت میں پیش کر دیا۔ یہ مجموعہ معنوی اعتبار سے قدر و قیمت کا حامل ہے کیونکہ سوانحِ اقبال پر جو کچھ بھی لکھا گیا اسی کتاب کے استفادے اور حوالے سے لکھا گیا۔

اس مجموعے پر سالِ اشاعت درج نہیں مگر مرتب کے "پیش لفظ" اور فیض احمد فیض کے "تعارف" کی تاریخوں سے اس کا سالِ طباعت ۱۹۵۰ء کا تعیّن ہوتا ہے۔

یہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے "شرفِ حضور" [ص: ۳۳ تا ۱۰۳] میں مرتب نے اقبال سے اپنی نیازمندی کے آغاز، مختلف ملاقاتوں، خاندانی مراسم، علامہ سے اپنے والد کی ملاقاتوں اور متفرق گفتگوؤں کا ذکر مربوط و مسلسل انداز میں کیا ہے۔ "حرف زبشش شنیدہ ام من" کے تحت بعض واقعات اور ملفوظات کو متعدد ضمنی عنوانات کے تحت درج کیا ہے۔ اس سے قبل تعارف از فیض احمد فیض اور تبصرہ : صلاح الدین احمد دیے گئے ہیں۔

کتاب کی ضخامت : ۲۲ + ۱۳۹ صفحات۔ اسے ایک نہایت ہی معیاری اور دیدہ زیب مجموعہ تسلیم کیا گیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں "روزگارِ فقیر" کا نقشِ ثانی غیر معمولی اضافوں کے ساتھ مرتب فقیر الدین وحید نے اسے شائع کیا جو اضافے کیے گئے وہ یہ ہیں۔ ۱۔ اس کتاب پر مولانا صلاح الدین احمد کا ریڈیائی تبصرہ۔ ۲۔ شاعرِ مشرق کی زندگی کے اہم گوشوں سے متعلق بعض ایسے واقعات جنھیں مصنف نے طبع اوّل کے موقع پر سرسری سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ ۳۔ سیّد امجد علی اور یوسف سلیم چشتی کے روایت کردہ واقعات و ملفوظات۔ ۴۔ اقبال کے والدین، شیخ عطا محمد، شیخ اعجاز احمد، مولوی میر حسن اور جاوید اقبال کا مختصر تعارف۔ ۵۔ اقبال کی تاریخِ پیدائش پر بحث۔ ۶۔ حیاتِ اقبال کی اہم یادداشتیں۔ ۷۔ متعدد تصاویر کا اضافہ۔

کتاب کے دو حصّے ہیں : ۱۔ نقشِ اوّل [ص: ۲۷ تا ۱۴۷] کا متن طبع اوّل کے مطابق ہے۔ حواشی میں معمولی اضافے کیے گئے ہیں۔ ۲۔ نقشِ ثانی [ص: ۱۵۰ تا ۲۵۶] کئی اضافوں پر مشتمل ہے۔ "نقشِ ثانی" [طبع اول : اکتوبر ۱۹۶۳ء] ۲۵۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہی نسخہ اپنی غیر معمولی مقبولیت کے پیشِ نظر مزید پانچ بار طبع ہوا : نومبر ۱۹۶۳ء فروری ۱۹۶۴ء، مئی ۱۹۶۴ء، مارچ ۱۹۶۵ء و اپریل ۱۹۶۶ء۔

نومبر ۱۹۶۴ء میں "روزگارِ فقیر" کی جلد دوم شائع ہوئی۔ اس جلد میں بہت سے نئے واقعات و ملفوظات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بیشتر روایات ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی، ممتاز حسن اور شیخ اعجاز احمد کے حوالے سے بیان ہوئی ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصّے میں اقبال کا ایسا متروک کلام یکجا کیا گیا ہے جو باقیاتِ اقبال کے کسی مجموعے میں نہیں ملتا۔ تیسرا حصّہ اقبال اور ان سے متعلق ۴۰ تصاویر پر مشتمل ہے۔

جلدِ دوم میں متعدد دستاویزات اور اقبال کے بعض خطوط کے عکس دیے گئے ہیں۔ ۱۶۴ صفحات کی اس کتاب کے بعد میں کئی ایڈیشن طبع ہوئے۔ اگست ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۸ء، ۱۹۷۰ء۔

(۴) اقبال کے حضور

اقبال کی وفات کے بعد سید نذیر نیازی نے ایک روزنامچہ مرتب کیا تھا لیکن اس کی اشاعت جولائی ۱۹۷۱ء میں عمل میں آئی۔ بڑی تقطیع اور باریک ٹائپ میں یہ کتاب طبع ہوئی جس میں یکم جنوری سے ۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء تک کے اندراجات دیے گئے ہیں۔ مرتب کتاب کے مطابق یہ کتاب جزو اول ہے جو جاوید منزل میں پیش آمدہ واقعات، مناظر اور گفتگوؤں کا تحریری اسکرین پلے ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے مرتب سے کتاب کے باقی مواد سے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے بتایا: "اقبال کے حضور، (تین یا چار حصے) ۱۔ جاوید منزل میں۔ ۲۔ ۱۹۳۶ء۔ ۳۔ ۱۹۳۷ء۔ ۴۔ ۱۹۳۸ء۔ دوسرا حصہ کچھ مرتب کچھ غیر مرتب پڑا ہے ۔۔۔۔ میں خود ہی ان کی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہوں۔" مگر یہ باقی حصے اب تک شائع نہیں ہو سکے۔

۲۰ + ۴۸۷ صفحات کی اس کتاب کو اقبال اکادمی پاکستان (کراچی) نے شائع کیا۔

(۶)

اقبال نے حکیم احمد شجاع کے ساتھ کئی ایک درسی کتابیں بھی مرتب کیں۔ ان درسی کتابوں کا تعلق متنِ اقبال، اقبال کے ملفوظات یا افکار و اذکار سے نہیں ہے۔ ان کا مختصر احوال شاعر کے ایک نئے باب "مزید روشنی" میں ملاحظہ کیجیے۔

تصانیفِ اقبال کے اس جائزے کو ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی مکمل کتاب کی تلخیص تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس جائزے کی ترتیب، لوازمہ اور بہت سے امور و حوالوں میں ترمیم و اضافہ وغیرہ میں خاصہ فرق آگیا ہے اور یہ بے حد مختصر بھی ہے لیکن مجھے اس اعتراف میں ذرا تامل نہیں کہ اس جائزے کا بیشتر تحقیقی مواد "تصانیفِ اقبال" ہی سے لیا گیا ہے۔ اس جائزے میں اگر کوئی خوبی ہے تو اسے میں ڈاکٹر صاحب کی نذر کرتا ہوں۔ میں نے کتابِ مذکور کے بیشتر ماخذات کا مطالعہ کیا ہے، جائزہ لیا ہے، پھر بھی بہت سے تحقیقی مواد اور ماخذات میری دسترس سے پرے ہی رہے ایسی صورت میں ڈاکٹر صاحب کے حوالوں ہی پر انحصار کرنا پڑا ہے۔

اس جائزے کی ترتیب و تدوین میں بہت سی کتابوں کے علاوہ رفیع الدین ہاشمی کی ایک اور اہم کتاب کتابیاتِ اقبال (مطبوعہ ۱۹۷۷ء، اقبال اکادمی پاکستان) سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

تصانیفِ اقبال کے اوّلین نسخوں کے عکس

آئندہ صفحات میں تصانیفِ اقبال کے تحقیقی و توضیحی جائزے کے درمیان علامہ اقبال کے تمام اولین حیاتی ایڈیشنوں کے سرورق مع سنہ اشاعت دیے جا رہے ہیں۔ مثنوی اسرار و رموز (یکجا) اور مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مسافر، کے سرورق نہیں دیے جا سکے۔ اوّل الذکر کتاب مجھے بر وقت نہیں مل سکی۔ آخر الذکر مثنوی کے سرورق پر کتاب کا نام بہت دھندلا اور مٹا ہوا سا ہے اس کا عکس حاصل نہیں کیا جا سکا۔

ارمغانِ حجاز علامہ اقبال کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی تاہم اس کے سرورق کا عکس بھی شامل کر لیا گیا تاکہ تمام شعری مجموعوں کے سرورق کے عکوس یکجا ہو سکیں۔

تصانیفِ اقبال کے جائزے کی ترتیب کے مطابق شعری مجموعوں کے بیرونی اور اندرونی سرورق کے عکس دینے کا خیال تھا لیکن کئی نسخے فراہم نہیں ہو سکے۔

کلیاتِ اقبال (اردو، فارسی) مرتبہ جاوید اقبال کے سرورق شامل نہیں کیے جا رہے ہیں یہ دونوں کتابیں ہند و پاک میں ہر جگہ دستیاب ہیں۔

عِلم الاقتصاد

جس کا

معروف نام علم سیاست مدن ہے

مُصنّفہ

شیخ محمد اقبال ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج

لاہور

[illegible]

[illegible]

علم الاقتصاد طبع اوّل ۱۹۰۴ء

علم الاقتصاد

[جسکا معروف نام علم سیاست مدن ہے]

مصنفہ

شیخ محمد اقبال - ایم - اے - اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج - لاہور

۱۹۰۳

علم الاقتصاد کے طبع دوم پر ۱۹۰۳ء درج ہے

THE

DEVELOPMENT OF METAPHYSICS

IN

PERSIA

INAUGURAL-DISSERTATION

ZUR

PHILOSOPHISCHEN FAKULTÄT SEKT I
(RESP II)

DER

Ludwig-Maximilians-Universität, München.

BY

S. M. IQBAL, M. A.

LONDON
LUZAC & Co. 46, GREAT RUSSELL STREET W. C.
1908

ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء (انگریزی) ۱۹۰۸ء

تصانیفِ اقبال

علم الاقتصاد

۱

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اول	۱۹۰۴ء	درج نہیں	۲۰ × ½ ۱۳	۲۱ سطری	درج نہیں	۲+۲۱۶ صفحات

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
درج نہیں	خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور	شیخ محمد اقبال	درج نہیں	ایک روپیہ

۲

اقبال کی وفات کے بعد اوّلین اشاعت

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم	۱۹۶۱ء	درج نہیں	۲۲ × ۱۴	۲۶ سطری	ٹائپ	۶+۲۲۳ صفحات

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
درج نہیں	فیروز سنز لمیٹڈ لاہور	اقبال اکیڈمی پاکستان کراچی		

اقبال کی اولین اردو تصنیف علم الاقتصاد ان کی معلمانہ زندگی (۴ جنوری ۱۹۰۱ء تا [illegible] ۱۹۰۳ء) کے مشاغل کے دوران تحریر کی گئی۔ تعلیمی زندگی میں اقبال کی توجہ عربی، انگریزی اور فلسفے کی طرف رہی۔ اقتصادیات ان کے لیے ایک نیا مضمون تھا مگر تدریسی تقاضوں کے تحت انھوں نے اس نئے علم کا وسیع مطالعہ کیا۔ اس کتاب کی تالیف کے تین محرکات تھے: اقتصادیات کا مطالعہ ـ طامس آرنلڈ کی تحریک (کتاب

دیباچے میں اقبال نے اس کا اعتراف کیا ہے] اور تدریسی فرائض کی کارکردگی میں شمار ہوتا۔ اورینٹل کالج کی سالانہ رپورٹ [۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۲ء]
مذکور ہے کہ: "شیخ محمد اقبال پولیٹیکل اکانومی پر ایک نئی کتاب تیار کر رہے ہیں" اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ علم الاقتصاد کا آغاز ۱۹۰۱ء
نصف آخر یا اوائل ۱۹۰۲ء میں ہوا ہوگا۔ علم الاقتصاد کے طبع اول میں سالِ اشاعت کی صراحت نہیں کی گئی ہے اس وجہ سے اقبال کے سوانح
ردوں کے یہاں متضاد بیانات ملتے ہیں۔

منشی محمد دین فوق نے کتاب کے سالِ اشاعت کا تعین نہیں کیا، وہ لکھتے ہیں: "اسی زمانے میں سیاست مدن پر ایک کتاب بنام علم الاقتصاد
ی" [بحوالہ انوارِ اقبال؛ ص ۸۱]۔ عبدالمجید سالک نے بلاحوالہ محمد دین فوق کے بیان کو دہرادیا ہے: "اُس زمانے میں علامہ نے علم سیاست
ن پر ایک کتاب بنام علم الاقتصاد لکھی" [ذکر اقبال ص ۴۲]

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے ہاں سالِ اشاعت کا ذکر ہی نہیں ملتا۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" اور بشیر احمد
نے مجلہ "اقبال" جولائی تا ستمبر ۱۹۷۱ء میں ۱۹۰۱ء درج کیا ہے۔ عبدالغنی خواجہ نور الٰہی [ببلوگرافی آف اقبال] نذیر احمد [کلید اقبال] خواجہ
الوحید [ببلوگرافی آف اقبال] اور رفیع الدین ہاشمی [کتابیاتِ اقبال] نے ۱۹۰۳ء کو سالِ اشاعت بتایا ہے۔ مگر اس غلط فہمی کو
رنے میں ممتاز حسن کے دیباچے [علم الاقتصاد، طبع دوم ۱۹۶۱ء] کو بڑا دخل ہے جس کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے "اقبال کی علم الاقتصاد
۱۹ء میں شائع ہوئی تھی"۔ بعد ازاں اس طبع دوم کے سرورق کو IQBAL IN PICTURE میں طبع اول کے سرورق کے طور پر پیش
یا۔ علم الاقتصاد کے طبع اول کی کتابت نستعلیق کی تھی مگر طبع دوم کا یہ سرورق ٹائپ میں ہے اس پر نستعلیق میں ۱۹۰۳ء کی کتابت کروا کے شائع
یا۔ اس عکس نے متذکرہ بالا غلط فہمی کے لیے گویا تصدیق و توثیق مہیا کی۔ طبع اول کے اس عکس میں سال اشاعت درج نہیں ہے۔

طبع اول کے سرورق پر مصنف کے نام کے ساتھ اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور درج ہے۔ اورینٹل کالج سے ۳ جون ۱۹۰۳ء
خصت لے کر اقبال نے یہ منصب سنبھالا گویا کتاب اس تاریخ کے بعد ہی کسی وقت مکمل ہوئی۔ مخزن کے شمارہ اپریل ۱۹۰۴ء میں
الاقتصاد کا آخری حصہ بعنوان "آزادی" اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا: "کتاب زیرِ طبع ہے"۔ گویا کتاب ۱۹۰۴ء کے اوائل میں مکمل ہوئی اور
ت کے لیے دے دی گئی اور پھر "مخزن" کے دسمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں یہ اعلان شائع ہوا: "ہم ناظرین کو بڑی خوشی سے یہ اطلاع دیتے
ہ یہ قابلِ قدر کتاب جس کا ایک باب "مخزن" میں شائع ہو چکا ہے، چھپ کر تیار ہو گئی ہے"۔ "مخزن" میں گاہے گاہے یہ اعلان شائع ہوتا رہا
ی بار مئی ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

علم الاقتصاد کا پہلا ایڈیشن پیسہ اخبار کے خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں طبع ہوا۔ قلم درمیانہ ہے۔ حواشی نسبتاً باریک قلم سے ہیں۔ سرورق
س کی پشت کے صفحات نمبر شمار نہیں کیے گئے ہیں۔ پیش کش صفحہ نمبر ا پر ہے اور فہرست صفحہ نمبر ۲ پر۔ صفحہ نمبر ۳ خالی ہے۔ دیباچہ
نمبر ۴ تا ۷ اور متن کتاب صفحہ نمبر ۸ سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۲۱۹ پر ختم ہو جاتا ہے۔ کتابت دیدہ زیب ہے۔ بہت سے الفاظ قدیم
کے مطابق لکھے گئے ہیں۔

طبع اول کے ختم ہو جانے پر اقبال نے اپنے شعری مجموعوں کی بار بار اشاعت کی طرز پر علم الاقتصاد کا دوسرا ایڈیشن شائع نہیں
۔ یہ اقبال کی واحد تصنیف ہے جو انھوں نے خود طبع کروائی اور خود ہی فروخت کرتے تھے۔ ["اس کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے
مصنف سے مل سکتی ہے"۔ "مخزن": دسمبر ۱۹۰۴ء] بعد میں اپنی کتابوں کی خود نکاسی کا جھنجھٹ انھوں نے مول نہیں لیا۔ ممکن
ا اپنی اولین تصنیف کی فروخت کا تجربہ مانع رہا ہو۔

طبع اول کے ۵۷ سال بعد اقبال اکیڈمی پاکستان [کراچی] نے دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ اس پر سال اشاعت درج نہیں لیکن
حسن کے پیش لفظ کی تاریخ تحریر ۱۰ جون ۱۹۶۱ء سے کتاب کا سالِ اشاعت متعین کرنا مشکل نہیں۔

سرورق اور اس کی پشت کا صفحہ شمار میں نہیں لایا گیا۔ فہرست، صفحات الف، ب، ج پر درج ہے۔ صفحہ د خالی ہے۔ ممتاز حسن
یش لفظ صفحہ نمبر [۱] تا ۱۰۔ مقدمہ از انور اقبال قریشی، صفحہ نمبر ۱۱ تا ۱۹۔ پیش کش صفحہ نمبر ۲۱۔ دیباچہ از مصنف صفحہ ۲۳ تا ۲۹۔

اس کے بعد متن کتاب کا نمبر شمار از سر نو شروع ہوتا ہے۔ سرورق پر مرتب کا نام درج نہیں لیکن دیباچہ میں ممتاز حسن نے وضاحت کی ہے کہ "موجودہ نسخے کے متن کی تصحیح مجلّہ "اقبال ریویو" کے مدیر معاون جناب خورشید احمد کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے" [ص ۹] مرتب نے ترمیم و تصحیح کے سلسلے میں درج ذیل نوعیت کی تبدیلیاں یا اضافے کیے ہیں!

(۱) کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصے کے شروع میں ایک ایک ورق کا فلیپ بنا کر اس پر متعلقہ حصے کے عنوان متن ابواب کی تفصیل دی گئی ہے۔

(۲) معاشیات کی اردو اصطلاحات انگریزی مترادفات حاشیے میں دیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں "ان معاشی اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ جو اس کتاب میں استعمال ہوئی ہیں" کے زیر عنوان دس صفحات کا ایک ضمیمہ شامل ہے۔

(۳) مرتب نے بعض مترادفات، معاشیات کی خاص اصطلاحوں اور مسائل کے بارے میں حسب ضرورت تصریح کر دی ہے۔

(۴) کتابت کی اغلاط درست کر دی گئی ہیں، کہیں کوئی لفظ سہواً رہ گیا تھا تو لکھ دیا گیا اور حاشیے میں اس کی صراحت کر دی گئی۔

(۵) متن میں بیسیوں مقامات پر ترمیمات کی گئی ہیں لیکن حواشی میں یہ صراحت صرف چند مقامات پر دی گئی ہے۔ بہت سے تصرفات کے بارے میں یہ تحریر نہیں کیا گیا کہ یہ مصنف یا مرتب کی اصطلاحات ہیں۔

(۶) طبع اول میں کئی مقامات پر متعدد عبارات اور جملوں کو نمایاں کرنے کے لیے ان کے نیچے خط کھینچا گیا ہے۔ طبع دوم میں ان حصوں کو خط کشیدہ نہیں بنایا گیا اور نہ ہی اس کی کہیں وضاحت ملتی ہے۔

علم الاقتصاد کے ۱۹۷۷ء تک صرف تین ہی ایڈیشن شائع ہو سکے۔ طبع اول و دوم پر تعداد اشاعت کا اندراج نہیں۔ طبع سوم پر تعداد اشاعت ایک ہزار دس درج ہے۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ اسے اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) نے شائع کیا۔

اقبال کو اپنی اس تصنیف کے بارے میں خیال تھا کہ "علم الاقتصاد پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی"۔ [اقبال بنام شاد محررہ ۱۵ راپریل ۱۹۱۷ء] اس سے قبل انھوں نے پروفیسر صلاح الدین محمد الیاس برنی کو ۸ مارچ ۱۹۱۷ء کے مکتوب میں تحریر کیا کہ!

"کتاب المعیشت مل گئی تھی .... آپ کی تصنیف اردو زبان پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اردو زبان میں علم الاقتصاد پر یہ پہلی کتاب ہے، اور ہر پہلو سے کامل" [اقبال نامہ اول : ص ۹-۴۰۸]

اقبال کی اس تالیف سے قبل مشفق خواجہ کی تحقیق کے مطابق اردو میں کم از کم ۶ کتابیں اس موضوع پر شائع ہو چکی تھیں [تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے مشفق خواجہ کا مقالہ! "اقبال کا پہلا علمی کارنامہ: علم الاقتصاد" مشمولہ رسالہ "اردو" اقبال نمبر ۱۹۷۱ء] اس اعتبار سے اقبال کی "علم الاقتصاد" کو اردو میں معاشیات پر پہلی کتاب تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ آج اس کتاب کی اہمیت اقبال کی اوّلین تصنیف اور ان کی یادگار کے طور پر ہے نہ کہ معاشیات کی ایک کتاب کے طور پر۔ معاشی نظریات اور اصولوں میں اتنی زیادہ پیش رفت ہو چکی ہے کہ "علم الاقتصاد" کا علمی مرتبہ لائقِ اعتنا نہیں رہا۔

✿

THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع، س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	۱۹۰۸ء	درج نہیں	۱۸½ × ۱۲½	۲۵ سطری	ٹائپ	۱۹ + ۱۹۵ صفحات

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
درج نہیں	ای جے برل لائیڈن	لوزاک اینڈ کمپنی لندن	درج نہیں	درج نہیں

(۲)
اقبال کی وفات کے بعد اوّلین ایڈیشن

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع؛ س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم	۱۹۵۴ء	درج نہیں	۲۲ x ½ ۱۵	۳۸ سطری	ٹائپ	۱۲+۱۴۹+۸ صفحات

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
درج نہیں	کارواں پریس لاہور	بزم اقبال کلب روڈ لاہور	درج نہیں	درج نہیں

اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے علامہ اقبال ۲۵ ستمبر ۱۹۰۵ء کو کیمبرج پہنچے اور ۶ روز بعد یکم اکتوبر کو ٹرینٹی کالج میں ADVANCED STUDENT کے طور پر داخلہ لینے کے فوراً بعد اپنی تحقیق کا آغاز کر دیا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۰۵ء کے خط میں اقبال نے خواجہ حسن نظامی کے تصوّف سے متعلق بعض استفسارات کیے اور ساتھ ہی تصوّف کے موضوع پر قرآنی آیات کے حوالے تلاش کر کے بہت جلد مفصّل جواب لکھنے کی تاکید کی۔ یکم اور ۸ اکتوبر کے درمیان ایک خط اور لکھ چکے تھے۔ ان سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آغاز کار کے ساتھ موضوع کا تعین بھی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر میک ٹگرٹ اقبال کے نگرانِ تحقیق اور H. SIDQWICK ان کے ٹیوٹر تھے۔ اقبال اپنا یہ DISSERTATION بی اے کی ڈگری کے لیے تیار کر رہے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۷ مارچ ۱۹۰۷ء کو انھوں نے اپنا مقالہ بعنوان:

THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA

مکمل کر کے داخل کرا دیا جس پر کیمبرج یونیورسٹی نے ۷ مئی ۱۹۰۷ء کو انھیں ایک سند اور ۱۳ جون ۱۹۰۷ء کو بی اے کی ڈگری عطا کی۔ اسی اثنا میں بیرسٹری کا کورس بھی جاری تھا۔ اقبال نے پی ایچ ڈی کرنے کا بھی ارادہ کر لیا۔ کیمبرج میں ان دنوں پی ایچ ڈی نہیں ہوتی تھی۔ وہاں یہ سلسلہ ۱۹۲۱ء میں جاری ہوا۔ ڈاکٹریٹ کے لیے طلبہ عموماً جرمنی جایا کرتے تھے۔ اقبال ۷ یا ۱۸ جولائی ۱۹۰۷ء کو انگلستان سے روانہ ہو کر جرمنی چلے گئے۔

بی اے کے اپنے اسی مقالے میں مناسب ترمیمات کے بعد اسے پی ایچ ڈی کے لیے داخل کر دیا گیا۔ اس مقالے میں اقبال نے اپنے ایک پہلے مضمون

THE DOCTRINE OF ABSOLUTE UNITY AS EXPOUNDED BY ABDULKARIM AL-JILI

[مطبوعہ: INDIAN ANTIQUARY ستمبر ۱۹۰۰ء] کو ترمیم کے بعد اپنے مقالے میں شامل کر لیا۔

جرمنی میں قیام کے دوران اقبال نے جرمن زبان میں مناسب حد تک دسترس بہم پہنچائی اور تین ماہ میں جتنا ممکن ہو سکتا تھا انھوں نے اس زبان کو سیکھا۔ پی ایچ ڈی کے لیے زبانی امتحان جرمن زبان میں ہوا۔ میونخ یونیورسٹی نے ۴ نومبر ۱۹۰۷ء میں اقبال کو اسی مقالے پر پی ایچ ڈی کی

ڈگری تفویض کی۔

اقبال کا یہ تحقیقی مقالہ اقبال کے قیام انگلستان ہی کے زمانے میں لندن کی لوزاک اینڈ کمپنی نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ سالِ اشاعت ۱۹۰۸ء درج ہے۔ برمنگھم یونیورسٹی لائبریری میں موجود نسخے [حوالہ نمبر: (41523) SB 741] پر، جو اقبال نے اپنے دوست ایف ڈبلیو تھامس کو پیش کیا، اقبال کے دستخطوں کے ساتھ ۳ر جولائی ۱۹۰۸ء کی تاریخ درج ہے۔

اس کتاب کا انتساب اقبال نے اپنے استاد محترم پروفیسر طامس آرنلڈ کے نام کیا ہے۔ سرورق اور اس کی پشت کے صفحے کا شمار نہیں کیا گیا۔ انتساب غلط نامہ، فہرست اور تعارف از مصنف کل ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ان کا شمار رومن ہندسوں میں ہے۔ متنِ کتاب صفحہ ۱ سے ۱۹۵ تک محیط ہے۔ غلط نامہ، فہرست اور حواشی کا ٹائپ باریک ہے۔ حسنِ صوری کے اعتبار سے طبع اوّل کی طباعت معیاری ہے۔ متن کا ٹائپ روشن اور واضح ہے۔

پہلے ایڈیشن کی دو طباعتیں ملتی ہیں، طباعت "الف" کا تفصیلی ذکر مندرجہ بالا سطور میں آچکا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ طباعت "ب" کا سرورق طباعت "الف" کے سرورق سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس میں LEBENSLAOF کے زیرِ عنوان اقبال کے مختصر حالات شامل ہیں۔ ابتدائی ۸ صفحات کے اندراجات کی ترتیب طباعت "الف" کی ترتیب سے مختلف ہے۔ بقول منیر احمد شیخ: "آج سے پندرہ برس پہلے بون میں مقیم اقبال کے ایک جرمن عاشق اور ایک اعلیٰ سرکاری ملازم ڈاکٹر مونش نے جناب ممتاز حسن کی فرمائش پر ۱۹۶۸ء میں اس پہلے نسخے کے پچاس ری پرنٹ شائع کیے تھے جو پاکستان بھی بھیجے گئے" [احساس، اقبال نمبر جلد ۲، شمارہ ۱۱، ۱۲] رفیع الدین ہاشمی کو اس پرنٹ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر سعید اختر درانی نے ماربرگ یونیورسٹی (جرمنی) میں طباعت "ب" کے ایک نسخے کا سراغ لگایا اور پروفیسر آذبرانٹ کی مدد سے اس کے ایک سوری پرنٹ تیار کروائے [افکار کراچی، مارچ ۱۹۸۳ء، اقبال یورپ میں ۱۹۸۵ء، ص: ۱۴۴ تا ۱۴۶] ان میں کے تین نسخے اقبال میوزیم (لاہور)، اقبال اکادمی پاکستان (لاہور) اور گورنمنٹ کالج (لاہور) میں محفوظ ہیں۔

طباعت "الف" اور طباعت "ب" کے ابتدائی ۸ صفحات کی ترتیب اور اندراجات کے اختلافات یہ ہیں:

صفحہ	طباعت الف	طباعت ب
سرورق	دونوں طباعتوں کے سرورق کے عکس ملاحظہ کیجیے اور دونوں کا فرق دیکھ لیجیے	
سرورق کی پشت	پرنٹ لائن PRINTED BY: E.J. BRILLEIDEN (HOLAND)	×
[I]	پروفیسر آرنلڈ کے نام انتساب کی عبارت	اقبال کی مختصر خود نوشت بعنوان LEBENSLAUF
[II]	×	×
[III]	اغلاط نامہ	کتاب کا نام
[IV]	×	×
[V]	فہرست مضامین	سرورق طباعت ب
[VI]	×	پرنٹ لائن مطابق طباعت "الف" نیز یہ عبارت GENEHMIGT AUFANTRAG DES HERN PROFESSOR DR FR HOMMEL

باقی تمام صفحات کی ترتیب اور متن یکساں ہے اور ان کی طباعت میں ایک ہی پلیٹیں استعمال کی گئی ہیں چنانچہ طباعت "الف" کی تمام اغلاط طباعت "ب" میں بھی موجود ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک ہی سال (۱۹۰۸ء) میں کتاب دوبار کیوں شائع ہوئی؟ یہ تو تقریب قریب ناممکن ہے کہ چند ہی ماہ میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا ہو اور دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا ہو جبکہ اشاعت "الف" اور اشاعت "ب" پر ایسی کوئی صراحت بھی نہیں ہے۔ اگر کتاب ایک ہی بار شائع ہوئی تو پھر ابتدائی ۸ صفحات کے اندراجات میں فرق کیوں ہے؟ اس سلسلے میں بعض قرائن اور ڈاکٹر سعید اختر درانی کی تحقیق کے مطابق طباعت "ب" پہلے اور طباعت "الف" بعد میں شائع ہوئی۔ اس کے چند نسخے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے طبع کیے گئے۔ ڈاکٹر انصاری شمل کے مطابق ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے ان دنوں مقالہ طبع کرا کے پیش کیا جاتا تھا (روایت ڈاکٹر سعید اختر درانی: مکتوب بنام رفیع الدین ہاشمی: ۱۵ر مارچ ۱۹۸۰ء) اشاعت "ب" کے سرورق کی جرمن عبارت سے یہی تصدیق ہوتی ہے۔ سرورق پر مصنف کے نام کے ساتھ صرف M A درج ہے۔ پی ایچ ڈی کا ذکر نہیں ہے۔ اس وقت تک اغلاط کا علم بھی نہیں ہو سکا تھا اس لیے "ب" میں یہ اغلاط نامہ شامل نہیں کیا گیا۔ ڈگری مل جانے کے بعد انھیں پلیٹوں سے کتاب کے مزید نسخے شائع کیے گئے۔ اس نئی اشاعت سے ان عبارتوں کو حذف کر دیا گیا جو ڈگری مل جانے کے بعد غیر ضروری تھیں۔ طباعت "الف" پر نام کے ساتھ جو ڈگریاں دی گئی ہیں ان میں PHD. MUNICH کا اضافہ کیا گیا اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ طباعت "ب" اول اور طباعت "الف" دوم ہے۔ اس میں اغلاط نامہ بھی لگایا گیا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق "اغلاط نامہ" میں بھی غلطیاں موجود ہیں۔

اقبال کی زندگی میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا کیوں کہ انھوں نے اس کی اشاعت مکرر میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ اپنے احباب کو خطوط میں اس کتاب کے متعلق جو کچھ بھی لکھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں خود اس کتاب سے اطمینان نہیں تھا اور ان کے نزدیک اس کی علمی حیثیت و اہمیت ختم ہو گئی تھی۔ اقبال کی اس کاوش کے بعد کئی اہم اور گراں قدر کتابیں شائع ہو گئی تھیں۔ مگر اپنی اس کتاب سے اقبال کی عدم دلچسپی اور بے اعتنائی میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ فلسفے میں ان کی دلچسپی بہت کم رہ گئی تھی۔ یکم ستمبر ۱۹۲۲ء کو پیرزادہ ابراہیم کو اپنے مکتوب میں لکھا:

"میں ایک عرصے سے فلسفے کا مطالعہ چھوڑ بیٹھا ہوں" (انوار اقبال، ص ۲۴۴)

اقبال کی وفات کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن "بزم اقبال" (لاہور) نے ۱۹۵۴ء میں شائع کیا۔ اس پر سال طباعت درج نہیں لیکن بعد کی اشاعتوں میں FIRST EDITION 1 ' 54 درج ہے جس سے طبع دوم کا سال اشاعت متعین ہو جاتا ہے۔ کتاب کے ابتدائی ۱۴ صفحات (سرورق، پیش لفظ آر ایم شریف، انتساب، تعارف اور فہرست) کے بعد صفحات کا شمار از سر نو کیا گیا ہے۔ متن صفحہ ۱۴۹ پر ختم ہوتا ہے۔ ص ۱۵۰ خالی ہے۔ اشاریے کے ۸ صفحات الگ شمار کیے گئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اس ایڈیشن کی ترتیب اور مندرجات متن و حواشی طبع اول کے مطابق ہیں تاہم اس میں بعض ترمیمات و اضافے بھی کیے گئے ہیں۔

۱۔ طبع دوم کی تقطیع طبع اول سے مختلف۔ سطریں ۲۵ کے بجائے ۳۱ سطری۔ ۲۔ سرورق سے مصنف کے نام سے SHAIKH کا سابقہ اور تعلیمی اسناد کی تفصیل حذف کر دی گئی ہے۔ ۳۔ سرورق کی پشت پر انگریزی عبارت:

WITH THE KIND PERMISSION OF MESSERS LUZAC & COMPANY, LONDON.

کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ۴۔ پیش لفظ (تحریر: ایم ایم شریف) کا اضافہ۔ ۵۔ طبع اول میں پہلے فہرست اور اس کے بعد INTRODUCTION دیا گیا ہے، طبع دوم میں اس کے برعکس ہے۔ ــــ طبع اول میں ہر باب کے اختتام پر نئے باب کا آغاز ملتا ہے، طبع دوم میں ایک باب کے اختتام کے بعد ایک ورق کا اضافہ جس پر نئے باب کا عنوان درج ہے۔ ۶۔ طبع دوم میں ۸ صفحات پر مشتمل اسماء و اعلام اور موضوعات کا ایک مفید اشاریہ کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے۔

طبع سوم ۱۹۵۹ء اور طبع چہارم ۱۹۶۴ء بھی بزم اقبال کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ یہ دونوں ایڈیشن طبع دوم کے معیار کے مطابق ہیں۔
یہاں ایک سوال یہ بھی بنتا ہے کہ بی اے کا DERSSERTATION معمولی ترمیم و اضافے کے بعد پی ایچ ڈی کا تھیسس کیسے بن گیا؟
۱۹۰۸ء سے ۱۹۶۴ء تک اس کتاب کے چار ایڈیشن شائع ہوئے لیکن تعداد اشاعت کسی پر درج نہیں۔

بحقوق محفوظ

ان من الشعر لحکمة

مثنوی

اسرارِ خودی

از

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لاء

باہتمام حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی

در یونین سٹیم پریس لاہور طبع گردید

بار اول تعداد ۵۰۰

اسرارِ خودی طبع اول ستمبر ۱۹۱۵ء
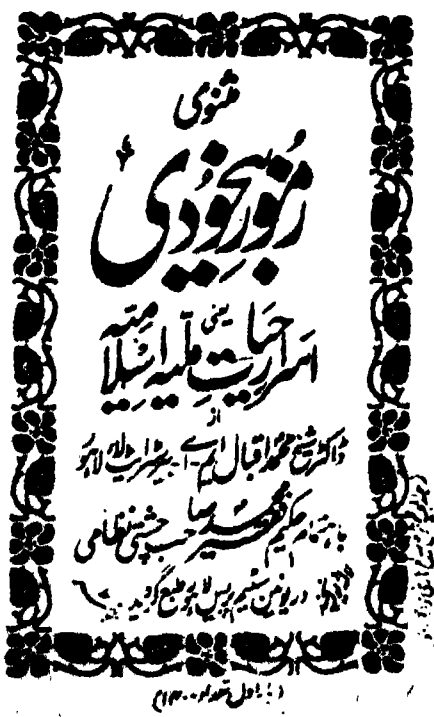
مثنوی

اسرارِ خودی

یعنی

حقایق حیاتِ فردیہ

از

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لاء لاہور

بفرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری گیٹ لاہور

[illegible] لاہور طبع شد

(تعداد یکہزار)

اسرارِ خودی طبع دوم جون ۱۹۱۸ء

مثنوی

رموزِ بیخودی

یعنی

اسرارِ حیاتِ ملیہ اسلامیہ

از

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لاء لاہور

باہتمام حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی

در یونین سٹیم پریس لاہور طبع گردید

(بار اول تعداد ۱۴۰۰)

رموزِ بیخودی، اپریل ۱۹۱۸ء

اسرارِ خودی

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	۱۲ ستمبر ۱۹۱۵ء	۵ سو	۱۵ × ۱۲	۶ سطری	منشی فضل الٰہی مرغوب رقم	۱۲+ ۱۵۵

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق محفوظ	یونین اسٹیم پریس لاہور	حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی	شیخ مبارک علی، تاجر کتب، اندرون لوہاری گیٹ، لاہور	درج نہیں

(۲)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم	۱۹۱۸ء	ایک ہزار	۱۶ × ۱۲	۸ سطری	نام درج نہیں	۱۳۴ صفحات

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق محفوظ	راجپوت اسٹیم پریس لاہور سردار کرم سنگھ پرنٹر	حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی	شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری گیٹ، لاہور	درج نہیں

مثنوی "اسرارِ خودی" کی تخلیق سے متعلق اولین حوالہ عطیہ فیضی کے نام ایک خط محررہ ۷ر جولائی ۱۹۱۱ء میں ملتا ہے۔ اقبال اس خط میں دیگر باتوں کے علاوہ تحریر کرتے ہیں کہ!

"والد صاحب نے حکم دیا ہے کہ ایک فارسی مثنوی بوعلی قلندر کے رنگ میں لکھوں اور باوجود اس کام کی دشواری کے میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل شروع کر دی ہے۔ ابتدائی اشعار یہ ہیں :-

نالہ را انداز نو ایجاد کن !   بزم را از ہائے و ہو آباد کن

آتش استی بزم عالم برفروز !   دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز

سینہ را سر منزلِ صد نالہ ساز   اشک خونیں را جگر پرکالہ ساز

پشت پا بر شورشِ دنیا بزن   موجۂ بیرون ایں دریا بزن

باقی اشعار ذہن میں محفوظ نہیں رہے لیکن امید ہے کہ کچہری سے واپس پر یاد آجائیں گے"

[خطوطِ اقبال بنام عطیہ فیضی۔ مترجم ڈاکٹر سید عباس نقوی مطبوعہ ۱۹۷۷ء صفحہ ۴۳]

مگر یہ معرکہ آرا مثنوی ۱۹۱۱ء میں مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ مولانا گرامی کو اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۴ء کو لکھتے ہیں: "گذشتہ سال ایک مثنوی فارسی میں لکھنی شروع کی تھی" گویا از سرِ نو ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں مثنوی کو مکمل کیا گیا۔

اسرارِ خودی کی اشاعت (۱۹۱۵ء) سے قبل اس کے کئی اشعار مختلف جرائد و مشاہیر کو تحریر کیے گئے مکاتیب میں مشتہر ہو چکے تھے۔ کتاب کے متن اور بکھرے ہوئے اشعار کے متن میں خاصا فرق ہے۔ اقبال نے طبع اول سے قبل نہ صرف یہ کہ مثنوی پر نظرِ ثانی کی بلکہ اپنے تمام اشعار میں اصلاح و ترمیمات بھی کیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تحریر کے مطابق "اسرارِ خودی" کے تین قلمی نسخوں اور مسودوں میں بار بار اور بکثرت ترمیمات ملتی ہیں۔ قلمی نسخے اور مسودے اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے!

۱ پہلا مسودہ نمبر ۱۹۸ - ۱۹۷۷ء - A/M - جس میں کافی کانٹ چھانٹ کی گئی ہے۔ اس میں بہت سے متروک اشعار اور ترمیم شدہ اشعار بھی موجود ہیں۔ "ڈیڈیکیشن" کے زیرِ عنوان صرف ۱۵ اشعار درج ہیں۔

۲ نمبر ۲۰۳ - ۱۹۷۷ء - A/M - یہ نسخہ کسی خوش نویس نے لکھا ہے۔ پھر اس میں اقبال نے ترمیم و اضافے کیے ہیں۔ متروک اشعار تو کم ہیں، مگر ترمیم شدہ اور اضافہ شدہ اشعار کی تعداد خاصی ہے۔ یہ طبع اول کی ابتدائی صورت معلوم ہوتی ہے۔

۳ تیسرے مسودے پر حوالہ نمبر درج نہیں ہے۔ کل ۱۰۶ صفحات ہیں۔ اس مسودے میں بھی خاصی کانٹ چھانٹ کی گئی ہے۔ ڈیڈیکیشن کے ساتھ یہ وضاحت درج ہے "بہ اجازت جناب ممدوح ...."

اسرارِ خودی میں افلاطون اور شیخ سعدی پر اقبال نے جو تنقید کی تھی اس پر بہت سے لوگ معترض ہوئے۔ اخبارات و رسائل میں بحثیں ہوئیں۔ اقبال نے بھی اپنے موقف کی وضاحت کے لیے متعدد مضامین تحریر کیے گئے۔ اقبال کی مثنوی کے رد میں کئی ایک مثنویاں لکھی گئیں۔

بعض مثنویاں یہ ہیں:

۱ رازِ بے خودی از خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد فضلی قریشی صدیقی نقش بندی آفاقی۔ ناشر: مفضل حسین مطبع بلالی دہلی۔ ۱۹۱۸ء۔ صفحات ۱۶+۱۱۲۔

۲ لسان الغیب از مولانا حکیم فیروز الدین احمد طغرائی امرتسری۔ ناشر: منشی مولا بخش کشتہ، امرتسر۔ صفحات ۳۱۔

۳ فارسی مثنوی از میاں ملک محمد قادری ٹھیکیدار، جہلم۔ بحوالہ صحیفہ، اقبال نمبر (اول) مطبوعہ ۱۹۷۳ء، ص ۲۴۳، ۲۴۵

۴ مثنوی سرّالاسرار از ڈاکٹر معین الدین جمیل۔ مطبوعہ ۱۹۶۲ء کراچی۔ صفحات: ۸۴+۹۴+ ۱۸۲۔

اسرارِ خودی کے طبع دوم سے بعض حصے حذف کر دیے گئے کچھ تو رفع شر اور کچھ اپنے والد ماجد کا دل رکھنے کے لیے۔
مثنوی کا اولین ایڈیشن ایک سال سے بھی کم وقت میں ختم ہو گیا کیوں کہ یہ صرف پانچ سو کی تعداد میں طبع ہوا تھا اور وہ بھی زیادہ تر احباب میں تقسیم ہو گیا لہٰذا فوراً ہی دوسرے ایڈیشن کے لیے کاغذ خرید لیا گیا۔ خان محمد نیاز الدین خاں کو اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۶ء میں تحریر کیا۔ "پہلے حصے کی دوسری ایڈیشن کا کاغذ کل خرید کیا" لیکن دوسرا ایڈیشن ۱۸ اپریل ۱۹۱۸ء تک تیاری کے مراحل میں تھا (بحوالہ مکتوب بنام سید سلیمان ندوی محررہ ۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء)

طبع دوم ۱۹۱۸ء کے نصف آخر میں منظرِ عام پر آیا۔ اس ایڈیشن میں کی جانے والی تبدیلیاں یہ ہیں:

محذوفات: سرورق: پیشانی پر مندرج آیاتِ قرآنی۔ ۱۲ صفحات کا دیباچہ۔ متن سے بطورِ خاص حافظ شیرازی کے بارے میں ۳۵ اشعار۔

اضافے: سرورق کی پیشانی پر "۷۸۶"۔ سرورق پر مثنوی اسرارِ خودی کے الفاظ کے بعد یعنی حقائق

حیاتِ نو پر"۔ طبع دوم کا نیا دیباچہ۔ مختلف عنوانات کے ذیل میں نئے اشعار کا اضافہ مع ایک
مکمل نئے باب بہ عنوان "در حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ" مع حواشی۔ آخری
صفحے پر کاپی رائٹ سے متعلق "اعلان" کے آخر میں، مصنف کے دستخط بہ حروفِ انگریزی
مع "بیرسٹرایٹ لاء لاہور"۔

طبع دوم۔ کے متن میں اقبال نے بہت سی ترمیمات کی گئی ہیں۔ بعض مقامات پر ترتیب اشعار و مصارع میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔
متن کی یہ تبدیلیاں بہت تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی "ایف تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" مطبوعہ ۱۹۸۲ء
کے صفحہ نمبر ۸۸ تا ۹۵ میں بیان کیا ہے۔

"معرکۂ اسرارِ خودی" محمد عبداللہ قریشی صاحب کا ایک دل چسپ تحقیقی مقالہ ہے جو مجلہ "اقبال" اکتوبر ۱۹۵۳ء اور اپریل ۱۹۵۴ء
میں شائع ہوا۔

اسرارِ خودی کا تیسرا ایڈیشن رموزِ بے خودی کے دوسرے ایڈیشن کے ساتھ ملا کر اسرار و رموز (یکجا) کی صورت میں شائع ہوا۔
اسرارِ خودی اقبال کی اولین شعری تصنیف ہے اس کے لیے اقبال نے شیخ عبدالقادر اور خواجہ حسن نظامی سے نام تجویز کرنے
کے لیے کہا تھا۔

❁

رموزِ بے خودی

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	اپریل ۱۹۱۸ء	۱۴ سو	۱۶ × ½ ۱۰	۸ سطری	عبدالمجید پروین رقم	۲+ ۷+ ۱۳۹

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق محفوظ	یونین اسٹیم پریس لاہور لالہ دیوان چند پرنٹر	حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی	شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور	درج نہیں

اسرارِ خودی کی تکمیل (۱۹۱۱ء تا اکتوبر نومبر ۱۹۱۴ء) سے اس کی اشاعت (ستمبر ۱۹۱۵ء) کے دوران ہی اقبال اس مثنوی کے دوسرے
حصے کی تخلیق کا خیال تھا، اس کے موضوعات و مضامین ان کے ذہن میں تھے۔ منشی سراج الدین کے نام اپنے ایک مکتوب محررہ ۴ر اکتوبر ۱۹۱۵ء
میں تحریر کرتے ہیں!

"...اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی (اسرارِ خودی) بہتر ہوتی، اس کا دوسرا
حصہ بھی ہوتا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا،
کم از کم مطالب کے اعتبار...."

"...میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقتِ اسلام کو بے نقاب کردوں جس کی اشاعت رسولؐ کے منہ سے ہوئی

صوفی لوگوں نے اسے تصوّف پر ایک حملہ تصوّر کیا ہے۔ اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشاءاللہ دوسرے
حصّے میں دکھاؤں گا کہ تصوّف کیا ہے اور کہاں سے آیا اور صحابہ کرام کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق
ہوتی ہے جس کا تصوّف حامی ہے۔۔۔۔" [اقبال نامہ [حصّہ اول] ص ۲۳، ۲۴]

اقبال کے ذہن میں رموزِ بے خودی کے مواد عکس موجود تھے اور تخلیقی صورت گری کے منتظر تھے اسی لیے اس حصّے کو انھوں نے اسرارِ خودی کا حصّہ دوم ہی کہا ہے۔ احباب کے خطوط میں اس کا ذکر موقع و محل کی مناسبت سے کیا ہے۔ اسرارِ خودی کی طرح رموزِ بے خودی کے لیے بھی مولانا گرامی کے مشورے طلب کرتے رہے۔ مولانا گرامی کے نام متعدد خطوط میں اس مثنوی کا ذکر ملتا ہے۔

رموزِ بے خودی کی تخلیق کا آغاز ۱۹۱۵ء کے آخری ایام یا ۱۹۱۶ء کے اوائل میں ہوا۔ اس کی تکمیل ۱۹۱۷ء کے آخری مہینوں میں ہوئی۔
قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مسوّدہ سنسر کے لیے ارسال کیا گیا۔ یہ مسوّدہ اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے۔ اس کے ہر صفحے پر سنسر کرنے والے آفیسر کے مختلف دستخط INITIALS موجود ہیں۔ آخری صفحہ پر مکمل دستخط مع تاریخ درج ہیں [عبدالعزیز: ۲۵-۱۲-۱۹۱۷ء] ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے ملاحظے کے مطابق :

"بظاہر یہی لگتا ہے کہ محکمہ سنسر نے کوئی شعر نہیں کاٹا، البتہ بعض اشعار، معلوم ہوتا ہے، بعد میں خود اقبال نے قلمزد کر دیے۔ اگر سنسر والے کوئی شعر کاٹتے تو احباب کے نام خطوط میں جہاں وہ مثنوی کی تحریر و تصنیف، تکمیل و اختتام اور کتابت و طباعت وغیرہ کے بارے میں تازہ ترین صورتِ حال کی اطلاع بہم پہنچا رہے تھے، اشعار کے قلمزد ہو جانے کا ذکر بھی کرتے۔۔۔" [تصانیفِ اقبال ص ۹]

دسمبر ۱۹۱۷ء میں مثنوی کتابت کے لیے دے دی گئی، تین ماہ لگے اور اپریل ۱۹۱۸ء کے پہلے عشرے میں کتاب شائع ہو گئی اور اپریل کے وسط میں احباب کو اس کے نسخے روانہ کیے گئے۔

رموزِ بے خودی کی اولین اشاعت کا اہتمام بھی حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی نے کیا۔ اسرارِ خودی کی اشاعت میں انھوں نے مالی تعاون دیا تھا اور کتابت و طباعت وغیرہ کی ذمّہ داری لی تھی۔

دیباچے کے ۱۴ سطری سطر کے دو صفحات پر صفحے نمبر کا شمار نہیں کیا گیا ہے۔ اگلے ۴ صفحات [پیشکش بہ حضور ملّتِ اسلامیہ] کو الف، ب، ج، د، سے شمار کیا گیا ہے۔ مثنوی صفحہ نمبر ایک سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۱۳۹ پر ختم ہوتی ہے۔ آخری صفحہ بالکل خالی ہے۔

رموزِ بے خودی کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال اس کا تیسرا حصّہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جسے انھوں نے ایک قسم کی منطق الطیر کہا۔ اس کا نام انھوں نے "حیاتِ مستقبلۂ اسلامیہ" تجویز کیا تھا مگر یہ موعودہ مثنوی نہ تو مسوّدے کی شکل میں اور نہ ہی کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ ممکن ہے کہ بعد کی مختلف نظموں میں وہ خیالات یا ان کے عکس سمٹ آئے ہوں۔

رموزِ بے خودی کا دوسرا ایڈیشن بہ طور اسرار و رموز [طبع اول] اسرارِ خودی کے تیسرے ایڈیشن کے ساتھ شائع ہوا۔

پیامِ مشرق

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	سطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	مئی ۱۹۲۳ء	ایک ہزار	۱۸ × ۱۳	۱۲ سطری	عبدالمجید پروین رقم	۲۰۰ + ۱۶

بانگِ درا، طبع دوم ستمبر ۱۹۲۶ء

پیامِ مشرق

(در جوابِ دیوانِ شاعرِ المانوی گوئٹے)

اقبال

پیامِ مشرق، مئی ۱۹۲۳ء

زبورِ عجم، جون ۱۹۲۷ء

بانگِ درا، طبع اوّل ستمبر ۱۹۲۴ء

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	مطبع کریمی لاہور باہتمام میر امیر بخش	درج نہیں	شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور	درج نہیں

(۲)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم	۱۹۲۴ء	ایک ہزار	۱۳ ½ × ۲۰	۱۲ سطری	عبد المجید پروین رقم	۱۴ + ۲۶۴ + ۲

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق ترجمہ محفوظ	کریمی پریس لاہور باہتمام قدرت اللہ	درج نہیں	شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہو	درج نہیں

(۳)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
سوم	۱۹۲۹ء	ایک ہزار	۱۵ ½ × ۲۰ ½	۱۲ سطری	عبد المجید پروین رقم	۱۴ + ۲۶۴ + ۲

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق ترجمہ محفوظ	مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	درج نہیں	شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور	درج نہیں

(۴)

اقبال کی وفات کے بعد اوّلین ایڈیشن

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
چہارم	۱۹۴۲ء	۲ ہزار	۱۴ ½ × ۲۰	۱۲ سطری	عبد المجید پروین رقم	۱۴ + ۲۶۴ + ۲

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق ترجمہ بحق جاوید اقبال محفوظ ہیں	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور باہتمام لالہ گوزند تامل کپور	جاوید اقبال جاوید منزل میورو ڈ لاہور	شیخ مبارک علی تاجر کتب، لوہاری دروازہ، لاہور	مجلد ۴½ روپے غیر مجلد ۳½ روپے

اردو شعری مجموعہ بانگِ درا [۱۹۲۴ء] کی اشاعت سے قبل فارسی کلام کے مجموعے اشاعت پذیر ہوئے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی
یل وطباعت ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۸ء کے درمیان فارسی میں شعرگوئی کا سلسلہ جاری رہا۔ گاہے بگاہے اقبال اردو میں بھی شعر کہتے رہے مگر
ب کے درمیان پیامِ مشرق کا لوازمہ تخلیقی تکمیل کے مراحل سے بھی گذرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء تک "پیامِ مشرق" نصف سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی
لیمان ندوی مرحوم کو اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو تحریر کرتے ہیں:

"...فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا تقریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی کچھ اردو میں۔ کلام کا بہت سا حصہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے..."

[اقبال نامہ، ص ۱۰۷/۱۰۸]

کلام کو پیامِ مشرق میں شامل نہ کرتے ہوئے اُسے ایک علاحدہ شعری مجموعے کے لیے مختص کر دیا اس طرح مجوزہ فارسی مجموعے کی ضخامت
نہائی بنتی تھی۔ اقبال چاہتے تھے کہ ان کے ذہن میں جو مزید چند ضروری نظموں کے عکس موجود ہیں وہ بھی تخلیق پا جائیں۔ مگر ان کے والد
کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے۔ ماہ فروری سے پیامِ مشرق کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا۔ مارچ اور اپریل کتابت
ت کے مراحل میں گذر گئے، اس مدت میں اقبال اپنے دوستوں کو پیامِ مشرق کے اشاعتی مراحل سے آگاہ کرتے رہے ان میں کشن پرشاد شاد
ولانا گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ پہلے متن کتاب صفحہ نمبر ۱ تا ۲۰۰ کتابت ہوئی۔ دیباچہ اور پیش کش کے صفحات الف تا ع بعد میں لکھے گئے۔
اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ایک قلمی بیاض میں، اقبال کی اپنی تحریر میں وہ ابتدائی نکات ملتے ہیں جس کی بنیاد پر انھوں نے پیامِ مشرق کا
ہ لکھا۔ یہ نکات انگریزی میں ہیں۔

پیامِ مشرق کا زیادہ تر تخلیقی لوازمہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۳ء کے درمیان میں تیار ہوا۔ اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ اقبال کی قلمی بیاضوں سے
اس کی تائید ہوتی ہے۔ ان بیاضوں میں پیامِ مشرق کی متعدد منظومات کے ساتھ ان کا زمانۂ تخلیق بھی درج ہے۔ بعض اشارات سے
لموں کے پس منظر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ صفحہ نمبر ۲۶۵ [کلیاتِ اقبال فارسی] کی نظم فلسفہ و سیاست کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع سے
م آں خورشید کورے دیدۂ ایں بے نمے" پر نشان بنا کر حاشیے میں انگریزی کا یہ جملہ تحریر کیا ہے:

" BRADLEY'S DEFINATION OF METAPHYSICS WHICH SUGGESTED THIS HALF VERSE."

پیامِ مشرق کے متن کا سطر ۱۲ سطری اور دیباچے [صفحہ الف تا ح = ۸ صفحات] کا ۲۱ سطری ہے۔ رباعیات [لالۂ طور] کا
۸ سطری [فی صفحہ ۲ رباعیات ہے] ہے۔

پیامِ مشرق کی اشاعت کے بعد کی تفصیل کے بارے میں اپنے ممدوح خان محمد نیاز الدین کو اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۶ر مارچ ۱۹۲۳ء
لکھتے ہیں:

"...کتاب کو شائع ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے اور شاید نصف سے زیادہ نکل بھی گئی ہے۔ ایک ہزار کاپی شائع ہوئی تھی۔"

[مکاتیبِ اقبال ص ۴۵]

ب کی غیر معمولی کامیابی کے بعد اقبال نے طبع دوم کی تیاریاں شروع کر دی تھیں جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ غالباً جرمنی میں طبع ہوگی
ہے یہ خیال علامہ اقبال کو اس لیے آیا ہو کہ اس زمانے میں ان کے اردو کلام کا مجموعہ طبع کا ایک [برلن] سے چھاپنے کی تجویز سامنے آئی تھی

[انوارِ اقبال صفحہ ۱۹۵ بحوالہ مکتوباتِ اقبال صفحہ ۔] پہلا ایڈیشن ۲ فروری ۱۹۲۴ء تک ختم ہو گیا لیکن طبع دوم جنوری ۱۹۲۴ء میں پریس جا چکا تھا [پہلا اردو مجموعہ "بانگِ درا" مرتب ہو چکا تھا] مارچ ۱۹۲۴ء تک دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکا تھا۔

طبع دوم میں اقبال نے ۴۸ صفحات کا اضافہ کیا۔ متعدد اشعار اور حواشی حذف کر دئے۔ طبع اول پر ہوئے تبصروں اور بعض احباب نے مشوروں کی روشنی میں کئی اشعار میں ترمیمات بھی کیں۔ طبع دوم میں دو صفحات کی فہرست مطالب شامل کی گئی لیکن دونوں صفحات کا شمار نہیں کیا گیا۔ "اشاعتِ دوم" عنوان کے تحت یہ چند سطریں درج کی گئیں!

"دوسری اشاعت میں متعدد نظموں، غزلوں اور رباعیات کا اضافہ ہے۔ بعض بعض جگہ لفظی ترمیم بھی ہے۔ کتاب کی ترتیب بہ حیثیتِ مجموعی وہی ہے جو پہلے تھی"۔ اقبال

۱۹۲۹ء کے ابتدائی مہینوں میں پیامِ مشرق کے تیسرے ایڈیشن کی کتابت شروع ہوئی۔ مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہتمم محمد مجیب کی درخواست پر اقبال نے طبع سوم کی اجازت دے دی۔ کتابت شدہ کاپیاں دہلی روانہ کر دی گئیں۔ جولائی ۱۹۲۹ء میں تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کی کتابت پروین رقم نے کی تھی جنھیں بطورِ اجرتِ کتابت مبلغ ایک سو تیس ۱۳۰ روپے ادا کیے گئے [صحیفہ، اقبال نمبر (اول) اکتوبر ۷۳ء صفحہ ۳۳] ۸۴۴ کتابیں دہلی سے لاہور ارسال کی گئیں۔

طبع سوم کی تقطیع، طبع دوم سے قدرے بڑی ہے۔ طبع سوم کے کاغذ میں واٹر مارک میں یہ الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں :

WORLD CREAM LAID 5316 NORWAY

علامہ اقبال کی وفات کے بعد پیامِ مشرق کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۴۲ء میں چودھری محمد حسین کی زیرِ نگرانی طبع ہوا۔ پروین رقم سے اس کی از سرِ نو کتابت کروائی گئی۔ اس ایڈیشن کے لیے طبع سوم ہی کو معیار بنایا گیا۔ طبع چہارم کی پلیٹیں محفوظ کر لی گئیں۔ ۱۹۷۰ء تک کے ایڈیشن انھیں محفوظ پلیٹوں سے طبع ہوتے رہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق ۱۹۷۱ء کے بعد کے ایڈیشنوں کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صفحات کی پلیٹیں ضائع ہو گئیں اس لیے ان حصوں کی دوبارہ کتابت کروا کے نئی پلیٹیں تیار کی گئیں۔

طبع چہاردہم ۱۹۷۵ء کلیاتِ فارسی کے لیے از سرِ نو کی گئی کتابت سے شائع ہوا۔ بعد کے ایڈیشن طبع چہاردہم کی محفوظ پلیٹوں سے شائع ہوئے۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۷۹ء تک ۱۶ ایڈیشن علاوہ کلیاتِ اقبال کے طبع ہوئے جن کی مجموعی تعداد ۳۲ ہزار نسخے بنتی ہے۔

اسرار و رموز (یکجا)

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل اسرار سوم رموز دوم	درج نہیں ۱۹۲۳ء کا احتمال ہے	درج نہیں	۱۸ ½ × ۱۳	۱۲ سطری	عبدالمجید پروین رقم	۱۹۹ صفحات

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	مطبع کریمی لاہور باہتمام میر امیر بخش	درج نہیں	شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لاہوری دروازہ لاہور	درج نہیں

(۲)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم اسرار چہارم رموز سوم	۱۹۲۸ء	درج نہیں	۱۹ x ۱۴	۱۲ سطری	محمد حسن چوکسی لاہور	۱۹۹

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	مقبول عام لاہور باہتمام منشی غلام احمد	درج نہیں	درج نہیں	درج نہیں

(۳)

اقبال کی وفات کے بعد اوّلین ایڈیشن

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
سوم اسرار پنجم رموز چہارم	۱۹۴۰ء	درج نہیں	۲۰ x ۱۶½	۱۲ سطری	عبدالمجید پروین رقم	۱۹۹ صفحات

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ بنام جاوید اقبال	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس باہتمام گوراندتا کپور	جاوید اقبال جاوید منزل میو روڈ لاہور	شیخ مبارک علی اندرون لوہاری دروازہ لاہور	درج نہیں

اسرار خودی کا طبع دوم اور رموز بے خودی کا طبع اوّل ختم ہو جانے کے بعد دونوں مثنویوں کی اشاعت کا مسئلہ جو پیش ہوا تو علامہ اقبال دونوں مثنویوں کی یکجا اشاعت کا فیصلہ کیا۔ اشاعت سے قبل دونوں مثنویوں پر نظرثانی کرتے ہوئے بعض اشعار میں ترمیمات کیں اور اشعار کا اضافہ کیا۔

اسرار و رموز [یکجا] پر سنہ اشاعت درج نہیں۔ لیکن پیامِ مشرق [طبع اوّل] اور اسرار و رموز کی پرنٹ لائن ایک ہی ہے۔ "در مطبع کریمی واقع لاہور باہتمام میر امیر بخش طبع گردید"۔ پیامِ مشرق [طبع اول] ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ جب کہ بانگِ درا [طبع اوّل] ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی اور پیامِ مشرق [طبع دوم] بھی۔ لیکن ان دونوں پر پرنٹ لائن مؤخر الذکر پرنٹ لائن سے مختلف ہے۔ لہٰذا قیاس ہے کہ اسرار و رموز [یکجا] ۱۹۲۳ء ہی میں طبع ہوئی ہوگی۔

صفحہ نمبر ۲ پر چند سطری مختصر سا دیباچہ دیا گیا ہے۔ یہ دیباچہ علامہ اقبال کے کسی نثری مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ "کلیاتِ اقبال" [فارسی] میں بھی نہیں۔ قارئینِ شاعر کے لیے یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

"اس ایڈیشن میں ناظرین کی سہولت کے لیے دونوں مثنویاں یعنی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی یکجا شائع کی جاتی ہیں۔ معمولی لفظی ترمیم کے علاوہ مطالب کی مزید تشریح کے لیے بعض جگہ اشعار کا بھی اضافہ ہے جن کی مجموعی تعداد سوا سو ہوگی۔ ایک دو جگہ نئے عنوان بھی قائم کیے گئے ہیں۔ مگر کتاب کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں۔"

محمد اقبال

اسرار و رموز [یکجا] میں متعدد اشعار حذف کر دیے گئے۔ کئی حصوں میں ترمیم کی گئی اور بعض اشعار کا اضافہ بھی ہوا۔ محذوفات میں سے یہ ہیں: اسرارِ خودی [طبع دوم] کے سرِ ورق پر مثنوی اسرارِ خودی کا توضیحی عنوان "حقائقِ حیاتِ فردیہ"۔ دیباچہ۔ پیش کش بہ حضور سر سید علی امام کے تمام اشعار۔ آغازِ مثنوی سے پہلے صفحے کی پیشانی پر لفظ "ھو"۔ صفحہ ۱۴۴ پر حقوقِ اشاعت سے متعلق اعلان۔ رموزِ بے خودی کے آخری صفحہ پر حقوقِ اشاعت سے متعلق اعلان۔

اسرار و رموز کا دوسرا ایڈیشن ۵ سال بعد شائع ہوا جو اسرارِ خودی، طبع چہارم اور رموزِ بے خودی طبع سوم پر مشتمل تھا۔ یہ قدرے بڑی تقطیع پر شائع ہوا۔ اشاعت کے وقت سنہ درج نہ ہو سکا لہٰذا نمبر لگانے والی مشین سے سرورق پر سالِ اشاعت ۱۹۲۸ء درج کیا گیا۔ طبع دوم کے جو نسخے کتب خانوں اور لائبریریوں میں دستیاب ہیں ان پر اسی طرح سنہ اشاعت درج کیا گیا۔

مختلف ابواب کے آغاز و اختتام اور اشعار و حواشی کی ترتیب وغیرہ میں سابقہ ایڈیشن کے متن ہی کا اتباع کیا گیا ہے۔ سرِ ورق کی عبارت حسبِ سابق ہے۔ صفحہ نمبر ۲ سے دیباچہ حذف کر کے بارِ اشاعت کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے!

اسرارِ خودی: اشاعتِ چہارم — رموزِ بے خودی: اشاعتِ سوم۔

اسرار و رموز کا تیسرا ایڈیشن علامہ اقبال کی وفات کے ۲ سال بعد، طبع دوم کے ۱۲ سال بعد ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ طبع اوّل و دوم کے سرِ ورق کی پیشانی پر تسمیہ کے علامتی اعداد "۷۸۶" درج تھے لیکن طبع سوم میں اُسے حذف کر دیا گیا۔ اس پر حقوقِ اشاعت سے متعلق پہلی بار یہ جملہ درج کیا گیا!

"جملہ حقوق مع حق ترجمہ بحق جاوید اقبال خلف الصدق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ محفوظ ہیں"۔ قلم قدرے جلی ہے۔ طبع دوم ۱۹۲۸ء کے متن ہی کو معیار بنایا گیا ہے۔

اسرار و رموز کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کی پلیٹوں کو محفوظ کر لیا گیا اور ۱۹۷۱ء اسرار و رموز انھیں پلیٹوں سے طبع ہوتی رہی۔ کلیاتِ اقبال [فارسی] کے لیے تمام شعری مجموعوں کی از سرِ نو کتابت خوش نویس محمود اللہ صدیقی سے کروائی گئی چنانچہ اسرار و رموز کے بعد کے ایڈیشن طبع یازدہم ۱۹۷۶ء اور طبع دوازدہم ۱۹۷۹ء اسی نئی کتابت شدہ پلیٹوں سے شائع کیے گئے۔

اسرار و رموز کی طبع سوم [۱۹۴۰ء] تک تعدادِ اشاعت درج نہیں۔ طبع چہارم سے طبع دوازدہم تک مثنوی کے ۲۱ ہزار نسخے شائع ہوئے

❁

بانگ درا

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	ستمبر ۱۹۲۴ء	۳ ہزار	½۱۸ × ½۱۳	۱۲ سطری (اشعار) ۱۹ سطری (نثر)	عبدالمجید	۳۳۶+۱۶ صفحات

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق و ترجمہ محفوظ	کریمی پریس نزد کوتوالی ندیم لاہور باہتمام قدرت اللہ پرنٹر	درج نہیں	ممتاز علی اینڈ سنز ریلوے روڈ لاہور	درج نہیں

(۲)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم	ستمبر ۱۹۲۶ء	۵ ہزار	۲۰ × ۱۶	۱۲ سطری	عبدالمجید	۳۳۶+۱۶ صفحات

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق و ترجمہ محفوظ	مقبول عام پریس لاہور زیر اہتمام ایم محمد اقبال مینیجر چھپی	درج نہیں	منشی طاہر دین	درج نہیں

(۳)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
سوم	مارچ ۱۹۳۰ء	۱۰ ہزار	½۱۹ × ½۱۵	۱۲ سطری	عبدالمجید پروین رقم کتابت سرورق غلام محمد کوچہ دین محمد لاہور	۳۳۶ + ۱۶

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق وترجمہ محفوظ	در مطبع کریمی لاہور باہتمام میر قدرت اللہ طبع شد	درج نہیں	شیخ مبارک علی تاجر کتب، اندرون لوہاری دروازہ لاہور	درج نہیں

(۴)
اقبال کی وفات کے بعد پہلا ایڈیشن

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
چہارم	جون ۱۹۳۹ء	۵ ہزار	۲۰ × ۱۵ ۱/۴	۱۲ سطری	عبدالمجید پروین رقم لوہاری منڈی لاہور	۳۳۶ + ۱۶

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق و ترجمہ جاوید اقبال خلف الصدق ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمہ محفوظ ہیں۔	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس ایبٹ روڈ لاہور، گورا اند تامل کپور منیجر کیبی	جاوید منزل میورروڈ لاہور سے جاوید اقبال نے شائع کی	شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور	مجلد ۴ ½ روپے غیر مجلد ۳ ½ روپے

اقبال کا کلام انجمن حمایت اسلام کے جلسوں اور "مخزن" وغیرہ جیسے ادبی رسائل کے ذریعہ برصغیر میں دور دور تک پھیل گیا تھا کہ عقیدت مندانِ اقبال اس کلام کو اپنی اپنی بیاضوں میں نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ ایسی ہی دو بیاضیں حال ہی میں دستیاب ہوئی ہیں [ان کا احوال "اکبری اقبال" پر میرے نوٹ میں ملاحظہ کیجئے] اقبال کے ایسے ہی چھپے شدہ کلام کی اشاعت کا بہت لوگوں کو خیال پیدا ہوا لیکن اس معاملے میں اقبال خاصے سخت واقع ہوئے تھے۔ اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ بقول اقبال "لوگ تجارتی اغراض کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ شعر غلط چھپا ہے یا صحیح" [انوارِ اقبال از بشیر محمد ڈار مطبوعہ مارچ ۱۹۶۷ء] دوسرے یہ کہ علامہ اقبال اپنے کلام کی مکرر اشاعت سے پہلے اس پر نظر ثانی ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی حیات میں شائع ہونے والے تمام شعری مجموعوں کے مکرر ایڈیشنوں سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اقبال کی گذر اوقات کا ایک اہم ذریعہ کتابوں کی رائلٹی بھی تھا۔

ترتیبِ اشعار کا خیال ۱۹۰۳ء ہی سے ان کے ذہن میں تھا۔ منشی سراج الدین کو اپنے مکتوب محررہ ۱۱ر مارچ ۱۹۰۳ء کو تحریر کرتے ہیں کہ: "ترتیب اشعار کی خود مجھے فکر ہو رہی ہے۔ مگر یہ خیال ہے کہ ابھی کلام کی مقدار تھوڑی ہے" [اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۲۱] لیکن اقبال کو جلد ولایت جانا پڑا۔ واپسی پر تدریس اور قانونی مشاغل نیز اپنی فارسی مثنوی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کی ترتیب میں مصروف رہے لہٰذا ایک مدت تک اردو کلام کی ترتیب و اشاعت کی طرف پیش رفت نہ ہو سکی لیکن اقبال کے احباب اور رشتہ داروں کا اصرار برابر جاری رہا۔ ۱۹۲۱ء میں اقبال سنجیدگی سے اپنے اردو کلام کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئے۔ مسودے کی تدوین میں چودھری محمد حسین نے بہت ہاتھ بٹایا۔ فروری ۱۹۲۲ء میں مسودہ کاتب کے حوالے کر دیا گیا۔ متن کلام کی کتابت جولائی تک مکمل ہو گئی مگر دیباچہ کی کتابت اور کتابت کی طباعت میں کئی ہفتے لگ گئے۔ اگست کے آخر یا ۳ر ستمبر

تک بانگِ درا کا اولین ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔

فقیر سید وحید الدین نے IQBAL IN PICTURE میں بانگ درا کا جو سرورق دیا ہے اسے اولین ایڈیشن تحریر کیا ہے جب کہ یہ سرورق دوسرے ایڈیشن کا ہے۔ اسی سرورق کو بعد میں مختلف جگہوں پر استعمال کرتے ہوئے اسے اولین ایڈیشن ہی قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی تالیف "تصانیف اقبال کا تنقیدی و توضیحی مطالعہ" میں اولین ایڈیشن کا سرورق دیا ہے۔ انھوں نے "اوراق گم گشتہ" [مرتبہ: رحیم بخش شاہین] کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ: "میاں نظام الدین کو پیش کردہ نسخے پر محمد اقبال ۳۔ ستمبر ۲۴ ۱۹ء" درج ہے۔

شاعر کے "اقبال نمبر" میں "بانگِ درا" کے اولین ایڈیشن کا عکس دیا جا رہا ہے جو "اوراق گم گشتہ" کی تحریر کی توثیق کرتا ہے۔ اس سرورق اور نسخے کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اقبال کے استاد مشفق سر طامس آرنلڈ کو اقبال کا پیش کردہ ہے اس پر اقبال کی تقدیم موجود ہے۔ یہ نسخہ کتب خانہ کالی داس گپتا رضا میں محفوظ ہے۔ اس کی دستیابی کی کہانی یہ ہے کہ مشہور ترقی پسند شاعر و ادیب اور ماہرِ اقبالیات سردار جعفری صاحب نے یہ کتاب لندن کی فٹ پاتھ سے خریدی تھی۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی کی تحقیق کے مطابق سر طامس آرنلڈ کے نواسے ڈاکٹر بار فیلڈ نے انھیں بتایا کہ "ان کے علم کی حد تک سر طامس کی جمع کی ہوئی کتابوں میں سے بیشتر فروخت کر دی گئی تھیں، غالباً آکسفورڈ کی مشہور دکان کتب جدید و قدیم BLACK WELLS کو" [اقبال یورپ میں صفحہ ۱۷۵]

میاں نظام الدین اور سر طامس آرنلڈ کو پیش کردہ دونوں ہی نسخوں پر "۳۔ ستمبر ۱۹۲۴ء" درج ہے۔

بانگِ درا کی تدوین کے موقع پر اقبال کے پاس اپنا کلام محفوظ و موجود نہیں تھا۔ یہ ان کے لیے خاصہ مشکل کام تھا۔ مطبوعہ کلام کے علاوہ بہت سا غیر مطبوعہ کلام ان کے احباب اور شائقین کے پاس موجود تھا چنانچہ احباب کی بیاضوں سے مدد لی گئی۔ بانگ درا کی بیشتر نظمیں غزلیں اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی تھیں۔ لہٰذا ابتدائی متن اور بانگِ درا کے متن کے موازنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے ترتیب کے وقت ترمیم و تنسیخ سے کام لیا تھا۔ کئی مصرعوں اور اشعار کو بہتر بنایا۔ متعدد بند خارج کیے اور بعض نئے بندوں کا اضافہ کیا۔ ۱۹۰۱ء سے قبل کی کوئی نظم یا غزل شامل نہیں کی۔ زیادہ تر ترمیم و اصلاح ۱۹۰۸ء تک کے کلام میں کی گئی۔ شکوہ مطبوعہ مرغوب ایجنسی [لاہور] کے نسخے کا متن اس نظم کے اولین متن سے مختلف ہے۔

اقبال کے انتقال کے بعد ان کے شعری مجموعوں کی اشاعت و طباعت چودھری محمد حسین کے زیر نگرانی ہونے لگی تھی۔ چوتھا ایڈیشن جون ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ طبع دوم کے متن کو اس چوتھے ایڈیشن کا معیار بنایا گیا اور کلیات اقبال [فروری ۱۹۷۳ء] کی اشاعت سے قبل تک تمام ایڈیشن طبع دوم کی محفوظ پلیٹوں ہی سے پرنٹ ہوئے۔

جون ۱۹۳۹ء سے دسمبر ۱۹۷۹ء تک ۳۳ ایڈیشن شائع ہوئے۔ ان کی مجموعی تعداد دو لاکھ چون ہزار ۲۵ نسخے ہوئی۔ علامہ اقبال کی حیات میں شائع ہونے والے تین ایڈیشن کی مجموعی تعداد ۱۸ ہزار بنتی ہے۔ اس طرح ۱۹۲۴ء سے ۱۹۷۹ء تک "بانگِ درا" کے دو لاکھ ۷۲ ہزار ۲۵ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ جعلی ایڈیشن اور ہندوستان میں شائع ہوئے ایڈیشنوں کا ان میں شمار نہیں ہے۔ ہندوستان میں "بانگِ درا" کے تمام معیاری ایڈیشن پاکستانی ایڈیشن ہی کا عکس ہیں۔

طبع چہارم سے طبع بست و نہم تک اشاعت و طباعت کے جملہ حقوق ڈاکٹر جاوید اقبال کے نام تھے۔ تیسویں ایڈیشن کی اشاعت سے یہ حقوق پسرانِ جاوید اقبال کے نام منتقل ہو گئے۔

"بانگِ درا" سے قبل مولوی احمد دین کی تصنیف "اقبال" [مطبوعہ ۱۹۲۴ء] اور "کلیاتِ اقبال" مرتبہ: مولوی عبدالرزاق راشد شائع ہو چکی تھیں۔ اول الذکر کو اقبال نے ناپسند کیا لہٰذا کتابیں ضائع کر دی گئیں۔ ۱۹۷۹ء میں مشفق خواجہ صاحب نے انجمن ترقی اردو پاکستان [کراچی] کے تحت اسے مرتب کر کے شائع کیا۔ موخر الذکر کو بھی اقبال نے سخت ناپسند کیا تھا اور مقدمے وغیرہ کی بابت غور کر رہے تھے لیکن سر اکبر حیدری نے معاملے کو سلجھاتے ہوئے اسے دکن تک محدود کر دیا تھا۔ اسی لیے "بانگِ درا" کی تینوں اولین اشاعتوں پر جملہ حقوق مع حق ترجمہ محفوظ تحریر ہے۔

زبورِ عجم

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع : س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اول	۱۹۲۷ء	۲ ہزار	۲۰ × ۱۶	۱۲ سطری	محمد صدیق لاہور	۲۶۴ صفحات

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	مقبول عام پریس لاہور باہتمام : ایم محمد اقبال	درج نہیں	شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور	۳ روپے

(۲)

اقبال کی وفات کے بعد اوّلین ایڈیشن

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع : س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم	اپریل ۱۹۴۴ء	ایک ہزار چار سو	½۲۰ × ۱۶	۱۲ سطری	محمد صدیق لاہور	۲۶۴ صفحات

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق ترجمہ بحق جاوید اقبال محفوظ ہیں	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور باہتمام لالہ گورانداتامل کپور	جاوید اقبال میورروڈ لاہور	شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور	درج نہیں

پیامِ مشرق کے طبع اوّل ۱۹۲۳ء کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال نے وہ تمام نظمیں جو ان کے ذہن میں تھیں اور طبع اوّل کی فوری ترتیب کے سبب تخلیق نہیں کی جا سکی تھیں انھیں طبع دوم کے مارچ ۱۹۲۴ء میں شامل کر لیا تھا لیکن فارسی شعرگوئی میں تخلیقی عمل جاری رہا اور کسی نئی کتاب کا مواد جمع ہوتا رہا۔ ۱۹۲۴ء میں اقبال ایک چھوٹی سی کتاب لکھ رہے تھے جس کا عنوان ان کے ذہن میں یہ تھا: SONOS OF A MODERN DAVID انھوں نے اپنے مکتوبات میں زبورِ جدید کا بھی ذکر کیا ہے یہی کتاب بعد میں زبورِ عجم کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کتاب کی تخلیق و ترتیب کا کام ۱۹۲۴ء میں شروع ہو گیا تھا لیکن اس کی تکمیل میں ڈھائی سال کی مدت صرف ہوئی۔ ۱۴ جنوری ۱۹۲۷ء کے زمیندار میں یہ خبر شائع ہوئی! "نہایت مسرت کے ساتھ قارئین کرام کو یہ مژدہ سنایا جاتا ہے کہ علامہ اقبال کی تازہ تصنیف زبورِ عجم بالکل مکمل ہو گئی ہے اور سنا جاتا ہے کہ دو چار روز میں اس کی کتابت شروع ہو جائے گی" مولانا گرامی کے نام ۱۳ جنوری ۱۹۲۷ء

کے مکتوب میں لکھتے ہیں: "میری کتاب زبورِ عجم ختم ہوگئی ہے، ایک دو روز تک کاتب کے ہاتھ میں جائے گی اور پندرہ دن کے اندر اندر شائع ہو جائے گی۔"
لیکن کتابت و طباعت میں کئی ماہ لگ گئے اور کتاب جون کے تیسرے ہفتے میں اشاعت پذیر ہوئی۔ طبع اول پر ماہ و سال طباعت درج نہیں ہے مگر ۲۱ جون ۱۹۲۷ء کے "انقلاب" میں منشی طاہر الدین کی طرف سے زبورِ عجم کا ایک اشتہار شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ تازہ تصنیف چھپ کر شائع ہو گئی ہے۔ زبورِ عجم کے بعد کی اشاعتوں میں بھی طبع اول جون ۱۹۲۷ء درج ہے۔ اقبال نے میاں نظام الدین کو جو نسخہ پیش کیا اس پر "محمد اقبال ۲۹ جون ۱۹۲۷ء" درج ہے۔ عموماً ایسا ہی ہوا ہے اور تحقیقی شواہد بھی موجود ہیں کہ علامہ اقبال اپنا ہر نیا شعری مجموعہ پریس سے آنے کے بعد دو، تین روز کی مدت ہی میں اپنے بعض خصوصی احباب کو اپنی تقدیم کے ساتھ ارسال کر دیا کرتے تھے۔

زبورِ عجم کی کتابت ایک نئے خوش نویس محمد صدیق (لاہور) سے کروائی گئی۔ یہ کتابت نسبتاً خفی ہے۔ کتاب کے ہر صفحے کا بارڈر بیل بوٹوں سے مزین ہے۔ طبع اول کا کاغذ قدرے دبیز ہے۔ کاغذ کے واٹر مارک میں SUPER FINE کے الفاظ واضح نظر آتے ہیں۔ پروین رقم کے بجائے محمد صدیق کی کتابت نے متن کا حوض کم کر دیا۔ فرق یہ ہے: پروین رقم کی کتابت کا حوض: ۱۷ × ۱۱ س م۔ محمد صدیق کی کتابت کا حوض ½۱۳ × ۹ س م اس طرح اقبال کی سابقہ کتابوں اور زبورِ عجم کے متن کے حوض میں فرق ہے۔

زبورِ عجم کا پہلا ایڈیشن چند برس میں ختم ہو گیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن اقبال کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ نذیر نیازی کے نام اپنے ایک مکتوب محررہ ۲ رمئی ۱۹۳۵ء میں تحریر کرتے ہیں:

"زبورِ عجم کی طباعت کا انتظام فوراً ہو سکتا ہے مگر میرا ارادہ ہے زبورِ عجم اب کے مع اردو ترجمہ شائع ہو۔"

لیکن طبع اول کے تقریباً ۱۷ سال بعد اپریل ۱۹۴۴ء میں چودھری محمد حسین کی نگرانی میں دوسرا ایڈیشن طبع ہوا۔ اس ایڈیشن کی کتابت پروین رقم نے کی۔ طبع دوم کا معیار طبع اول ہی ہے تاہم معمولی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ متن کے حوض کا سائز (جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں واضح کیا گیا ہے) بڑھ گیا۔ بعض جگہ ایک شعر طبع اول کے ایک صفحے پر ہے تو طبع دوم کے دوسرے صفحے پر آ گیا ہے۔

تیسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۴۵ء میں طبع ہوا جس پر غلطی سے ستمبر ۱۹۴۴ء درج ہو گیا۔ رفیع الدین ہاشمی صاحب کا استنباط ہے کہ: سالِ طباعت کے اندراج میں یہ غلطی قرین قیاس نہیں کہ اقبال کے کسی بھی مجموعے میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ دو ہزار کی تعداد کا ایک ایڈیشن وہ بھی فارسی شاعری کا اتنی جلد ختم ہو گیا ہو۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ واقعی ایسا ہوا تو یہ امر پیشِ نظر رہے کہ طبع سوم کے صفحات ۴۹ تا ۲۰۰ صفحات کی طباعت نئی پلیٹوں سے ہوئی جو از سرِ نو کتابت کے بعد تیار کی گئیں۔ ۱۵۲ صفحات کی کتابت، کاپیوں کی تصحیح، پھر طباعت بعد ازاں کتاب کی منظرِ عام پر آمد۔ ان سب مراحل کا ایک نہایت قلیل وقت میں طے ہونا قریب قریب ناممکن ہے۔ خیال ہے کہ زبورِ عجم کی طبع اول کے بارے میں جنوری ۱۹۲۷ء میں علامہ اقبال نے توقع ظاہر کی تھی کہ پندرہ روز کے بعد کتاب تیار ہو گی (مکاتیب اقبال بنام گرامی ص۲۴۱) مگر عملاً ۶، ۷ ماہ بعد جولائی میں کتاب شائع ہو سکی۔ اس لحاظ سے یہ امر یقینی ہے کہ تیسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۴۴ء میں نہیں ستمبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی از تصانیف اقبال ص۱۵۱)

طبع چہارم ستمبر ۱۹۴۸ء میں منظرِ عام پر آیا اس میں صفحہ نمبر ۴۹ سے صفحہ نمبر ۵۶ اور ۶۵ سے صفحہ نمبر ۲۰۰ تک کی طباعت طبع سوم کی پلیٹوں سے کی گئی مگر باقی صفحات نمبر ۱ تا ۴۸ اور ۵۷ تا صفحہ ۶۴ اور ۲۰۱ تا آخر کی از سرِ نو کتابت کرائی گئی۔ یہ کتابت واضح طور پر کسی اور خوش نویس کی ہے ــــــــ اس ایڈیشن میں بھی طبع سوم کا ماہ و سال طباعت ستمبر ۱۹۴۴ء لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ طبع سوم اور طبع چہارم میں طبع سوم کا سال طباعت غلط طور پر ستمبر ۱۹۴۴ء درج کیا جاتا رہا لیکن طبع پنجم کے وقت اس کی تصحیح کر کے ستمبر ۱۹۴۵ء بنا دیا گیا مگر اسے طبع چہارم قرار دیا گیا جو بدیہی طور پر غلط ہے (طبع چہارم پر ماہ و سال طباعت ستمبر ۱۹۴۸ء بالکل درست ہے) ستمبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت کو "چہارم" قرار دینے کے بعد یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ ستمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کو کس کھاتے میں ڈالا جائے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک اور اشاعت "پنجم" اختراع کی جسے طبع چہارم کے سالِ اشاعت سے جوڑ دیا گیا۔ اس تناقض کا ثبوت طبع دوم کا [illegible] ہے جس میں طبع دوم کے سامنے سالِ طباعت اور تعداد کتب لکھی گئی ہے۔

طبع پنجم مطبوعہ ۱۹۵۸ء کی کتابت و طباعت ہر اعتبار سے طبع چہارم ستمبر ۱۹۴۸ء کے مطابق ہے۔ طبع چہارم کی پلیٹیں محفوظ کر لی گئیں اور ۸ ویں ایڈیشن ستمبر ۱۹۷۰ء تک کی طباعت انھیں پلیٹوں سے ہوتی رہی۔ زبورِ عجم کا ۹ واں [اگست ۱۹۷۴ء] اور ۱۰ واں ایڈیشن [مئی ۱۹۷۸ء] کلیاتِ اقبال فارسی کے لیے ازسرِ نو کی گئی کتابت کی نئی پلیٹوں سے طبع کیا گیا۔

۱۹۲۷ء سے ۱۹۷۸ء تک زبورِ عجم کے دس ایڈیشن شائع ہوئے جن کی مجموعی تعداد ۲۴ ہزار چار سو نسخے بنتی ہے۔

SIX LECTURES ON THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	مئی ۱۹۳۰ء	درج نہیں	۲۰ × ۱۲	۳۰ سطری	ٹائپ	۸ + ۲۴۰ صفحات

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
درج نہیں	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور	درج نہیں	درج نہیں	درج نہیں

(۲)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم	مئی ۱۹۳۴ء	درج نہیں	۲۱ × ۱۳½	۳۶ سطری	ٹائپ	۱۹۲ صفحات

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
درج نہیں	سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس لاہور	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن	درج نہیں	درج نہیں
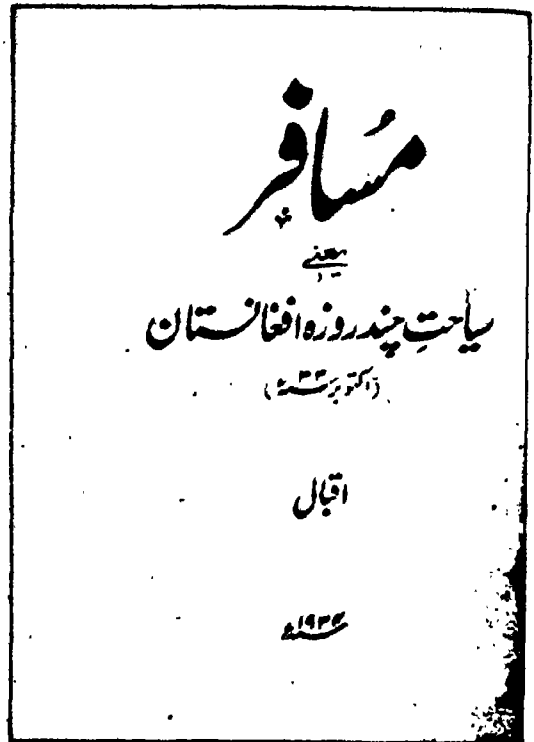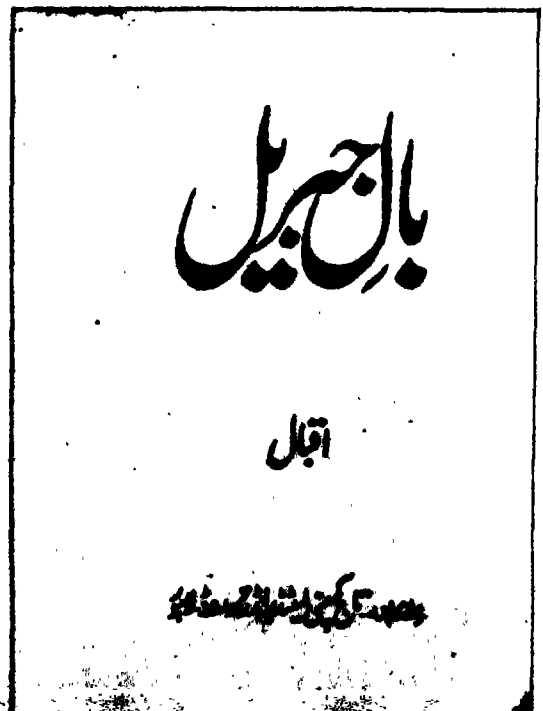
(۳)

اقبال کی وفات کے بعد اوّلین ایڈیشن

ضخامت	خوش نویس	مسطر	تقطیع: س م	تعداد	اشاعت	طبع
۸ + ۲۰۵ صفحات	ٹائپ	۲۷ سطری	۲۰ × ½ ۱۳	درج نہیں	مئی ۱۹۴۴ء	سوم

قیمت	ملنے کا پتہ	ناشر	مطبع	اعلان حقوقِ اشاعت
۱۰ روپے	شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور	جاوید اقبال	اشرف پریس لاہور	کاپی رائٹ

علامہ اقبال کا متجسس ذہن تلاش و جستجو میں ہمہ وقت مصروف رہا۔ ان کے مزاج میں جدت و تحقیق بے پناہ تھی بر طور خاص اسلامی فلسفہ وفکر، تصوف، فقہ کے مسائل سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ جو کچھ کتابوں میں تھا اس میں نئی باتوں اور نئے مسائل کا اپنے عصر کے تقاضوں کے مطابق حل و اضافہ چاہتے تھے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام اقبال کے ۷۰ مکاتیب ۔[یکم نومبر ۱۹۰۶ء تا ۷ اگست ۱۹۳۶ء] میں ایسے تمام مباحث موجود ہیں جو اقبال کے پسندیدہ تھے۔ انھیں میں سے اپنے ایک مکتوب محررہ ۲۷ اگست ۱۹۲۴ء میں امریکہ سے شائع ہوئی ـــــ ایک انگریزی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب میں فقہ کے ایک مسئلے کا ذکر و حوالہ دیا ہے اور استفسارات کیے ہیں۔ کتاب کا نام اردو میں "مسلمانوں کے نظریات متعلقہ مالیات" تحریر کیا ہے اور کتاب سے ایک حوالہ بیان کیا ہے۔ ۲۷ اگست کے خط میں بھی یہی بحث ہے اور انگریزی کتاب کا نام و نشان درج کیا ہے:

MOHAMMADAN THEORIES OF FINANCE, BY: NICHOLAS P. AGHANIDES

اس انگریزی کتاب میں ایک جگہ درج ہے کہ:

" AS REGARDS THE IJMA SOME HANIFITES AND THE MU 'TAZILITES HELD THAT THE IJMA CAN REPEAL THE KORAN AND THE SUNNAH ". (P:91).

علامہ اقبال کے الفاظ میں درج ہے کہ:

"اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماعِ امت نصِ قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ مثلاً مدتِ شیر خوارگی جو نصِ صریح کی رو سے دو سال ہے، کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ یہ حصص شرعی میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ بعض حنفاء اور معتزلیوں کے نزدیک اجماعِ امت یہ اختیار رکھتا ہے، مگر اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟"

[اقبال نامہ، اوّل، ص: ۱۳۱]

مرکی مصنف کا ایک فقہی مسئلہ علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا محرک کہا جا سکتا ہے انھوں نے اس موضوع پر سید سلیمان ندوی کے علاوہ کئی جید علماء سے استفسارات کیے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے انگریزی میں ایک خطبہ تحریر کیا۔ [illegible] جعفری کے نام ۱۳

اگست ۱۹۲۴ء کے ایک مکتوب میں اس خطبے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:
"میں ایک مفصّل مضمون انگریزی میں لکھ رہا ہوں:

"THE IDEA OF IJTIHAD IN THE LAW OF ISLAM" [اوراقِ گم گشتہ، ص: ۱۱۸]

یہ خطبہ کسی قدر ترمیم و نظرِ ثانی کے بعد حبیبیہ ہال [لاہور] میں سر عبدالقادر کی صدارت میں منعقدہ ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔ بعد میں مزید ترمیم و اضافوں کے بعد اسے الاجتہاد فی الاسلام: THE PRINCIPAL OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM کے عنوان سے خطباتِ ششم کے طور پر اپنی کتاب میں شامل کیا۔

مدراس کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا کی جانب سے اقبال کو اسلام پر لیکچرس دینے کی دعوت موصول ہوئی۔ انھوں نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے انگریزی میں ۶ خطبات تحریر کرنے کا ارادہ کر لیا۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کے ۴۲ ویں سالانہ جلسے، ۱۶ر اپریل ۱۹۲۷ء کو اقبال نے THE SPRIT OF MUSLIM CULTURE کے موضوع پر ایک تقریر کی، بعد ازاں اس کا اردو ملخص بھی پیش کیا۔ پانچواں خطبہ اس تقریر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپریل ۱۹۲۷ء سے خطبات کی تیاری شروع ہو چکی تھی تاہم ان خطبات کے محرکات و مواد کا سلسلہ ۱۹۲۴ء سے جاری ہو گیا تھا۔

مدراس میں ۶ خطبات پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن بہ مشکل تین خطبے تیار ہو سکے اور وہ بھی ۱۹۲۸ء کے نصف آخر میں یعنی ۵ر دسمبر ۱۹۲۸ء تک [اطلاع بنام غلام بھیک نیرنگ، اقبال نامہ، اول، ص: ۲۱۰] ۵ر جنوری ۱۹۲۹ء کو اقبال مدراس پہنچے اور ۵، ۶، ۷ر جنوری کو مدراس کے گوکھلے ہال میں اپنے ۳ خطبات پیش کیے۔

اقبال نے ۶ خطبات لکھنے کا ارادہ کیا تھا، تین خطبے لکھے جا چکے تھے، اپنی بے طرح مصروفیات کے باوجود باقی تین خطبات کی طرف بھی متوجہ رہے۔ اپنے ۴ر اگست ۱۹۲۹ء کے ایک مکتوب میں جمیل احمد خاں کو لکھا:

> " THE COURTS ARE CLOSED FOR SUMMER VACATION AND I AM WRITING DOWN MY REMAINING THREE LECTURES WHICH I HOPE TO FINISH BY THE END OF OCTOBER. " (LETTERS OF IQBAL. P: 119.)

اقبال کے خطباتِ مدراس کی شہرت ہوئی تو علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے خطبات دینے کی دعوت موصول ہوئی۔ باقی ماندہ ۳ خطبات کی تکمیل اب ناگزیر تھی۔ ۴ر نومبر ۱۹۲۹ء کو محمد جمیل خاں کے نام اپنے ایک مکتوب میں خطبات کے مکمل ہو جانے کی اطلاع دی۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۲۹ء کو علی گڑھ پہنچے اور ۱۹ر نومبر سے خطبات کا آغاز ہوا۔

اقبال اپنے ان ۶ خطبات کو کتابی شکل دینا چاہتے تھے اس کا اظہار انھوں نے احباب کے نام اپنے خطوں میں کیا۔ علی گڑھ سے واپس پر انھوں نے ان خطبات کو مرتب کر لیا تھا مگر کتابت و طباعت میں کئی ماہ صرف ہو گئے۔ نذیر نیازی کو ۴ر اپریل ۱۹۳۰ء کے خط میں اطلاع دی کہ "لیکچرس ۱۵ر اپریل تک چھپ جائیں گے۔" پھر ۲ر اپریل کے خط میں تحریر کیا "کتاب چھپ گئی ہے اس کی جلد بندی ۶ر مئی تک ختم ہو جائے گی" [متنِ خط میں ۲ر اپریل ہے جو درست نہیں، بحوالہ رفیع الدین ہاشمی] لیکن کتاب مئی کی ابتدا ہی میں تیار ہو کر آ گئی۔ پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن کو پیش کردہ نسخے پر ۵ر مئی ۱۹۳۱ء اور سر مائیکو بٹلر کو پیش کردہ نسخے پر ۶ر مئی ۱۹۳۱ء کی تاریخ درج ہے۔

کتاب کا اصل نام SIX LECTURES ہے، اس کے نیچے بطورِ وضاحت:

ON THE RECONSTRUCTION OF RELEGIOUS THOUGHT IN ISLAM

کے الفاظ نسبتاً خفی ٹائپ میں درج ہیں۔ ابتدائی ۸ صفحات [سرورق، فہرست، دیباچہ اور پہلے خطبے کا فلیپ] کے بعد پہلے خطبے کے متن سے صفحات کا شمار ہوتا ہے۔ ہر خطبے سے پہلے ایک ورق کا فلیپ لگایا گیا ہے۔ متن کا ٹائپ روشن اور واضح ہے جب کہ اقتباسات باریک ٹائپ میں ہیں۔ متن کا صفحہ ۳۰ سطری ہے۔ آغاز میں اغلاط نامہ لگایا گیا ہے جس میں ۱۲ اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے بقول رفیع الدین ہاشمی مگر اغلاط کی اصل تعداد اس سے زیادہ ہے۔ اقبال نے تمام خطبات میں آیاتِ قرآنی کے حوالے دیے ہیں لیکن اصل متن کی جگہ انگریزی ترجمہ درج کیا ہے۔ کئی مقامات پر

تراجم کے ساتھ آیات کا شمار نمبر غلط ہے۔

یہ خطبات انگریزی میں ہیں، ان کا ترجمہ سید نذیر نیازی نے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کے عنوان سے کیا جو ۱۹۵۸ء میں لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

علمی حلقوں میں ان انگریزی خطبات کو بے حد پسند کیا گیا۔ اگست ۱۹۳۲ء کے تیسرے ہفتے میں انگلستان کی ARISTOTELIAN SOCIETY کی جانب سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ لندن آکر سوسائٹی کے سامنے لکچر دیا جائے۔ اس دعوت نامے کو قبول کرتے ہوئے انھوں نے ستمبر ۱۹۳۲ء میں " IS RELEGION POSSIBLE " کے عنوان سے ایک اور خطبہ تحریر کیا۔ اختتام سال جب تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو مذکورہ سوسائٹی کے اجتماع میں یہ خطبہ پیش کیا۔ انگلستان کے علمی حلقوں میں اس خطبے کے خوش گوار اثرات مرتب ہوئے۔ اقبال کے ایک برطانوی مداح LORD LOTHIN کے ایما پر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے انگریزی خطبات کی مکرر اشاعت کا ارادہ کیا۔ اس میں ۶ خطبات کے علاوہ سوسائٹی کے لیے پڑھا گیا خطبہ بطور ۷ویں خطبے کے شامل کیا گیا۔

کتاب فروری میں شائع ہونا تھی [اطلاع بنام نذیر نیازی، مکتوب ۱۱ ستمبر ۱۹۳۳ء] لیکن کتاب مئی ۱۹۳۴ء میں انگلستان سے ہندستان پہنچی۔ گویا دوسرے ایڈیشن کی اشاعت مئی ۱۹۳۴ء میں عمل میں آئی۔

طبع دوم کے ابتدائی ۸ صفحات [سرورق کے دو ورق، دیباچہ اور فہرست] کے بعد متن کتاب سے صفحات کا شمار ہوتا ہے۔ ہر خطبہ نئے صفحے سے شروع ہوتا ہے مگر طبع اول کے برعکس ہر خطبے سے پیشتر بطور فلیپ نئے ورق کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ کاغذ دبیز ہے۔ متن کا ٹائپ طبع اول کے مقابلے میں باریک ہے لہٰذا مسطرہ ۳۰ سطری ہے۔ طبع اول کے حوض ½ ۱۴ × ¼ ۹ س م کے مقابلے میں طبع دوم کا حوض ½ ۱۶ × ¾ ۹ س م ہے اس لیے ۷ خطبوں کی سمائی ۱۸۸ صفحات میں ہو گئی ہے جب کہ طبع اول میں صرف ۶ خطبات ۲۹۴ صفحات کو محیط تھے۔

طبع دوم میں درج ذیل تبدیلیاں کی گئیں۔

[الف] کتاب کے عنوان سے SIX LECTURES ON کے الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں، اس طرح اب کتاب کا عنوان یوں ہو گیا ہے۔

THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM

[ب] مصنف کے نام سے BARRISTER-IN-LAW LAHORE کے الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔

[ج] کتاب کے آخر میں چار صفحات پر مشتمل اسماء موضوعات کے ایک اشاریے کا اضافہ کیا گیا ہے۔

[د] ٹائپ کی اغلاط درست ہو گئی ہیں۔ [ح] سب سے اہم تبدیلی متن کی وہ ترمیمات اور اضافے ہیں، جن کا ذکر اقبال نے اپنے متعدد خطوط میں کیا ہے، ایسی ترمیمات کی کل تعداد ۲۶ ہے۔

کتاب کا تیسرا ایڈیشن اقبال کی وفات کے بعد ۱۹۴۴ء میں لاہور سے شائع ہوا اسے شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور کے زیر اہتمام طبع کرایا گیا۔ بعد کے تمام ایڈیشن ۱۹۵۴ء، ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۸ء اور ۱۹۷۱ء وغیرہ بھی اسی ادارے کے زیر اہتمام طبع ہوئے۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۷۱ء تک اس کتاب کے ۸ ایڈیشن شائع ہوئے لیکن تعداد اشاعت کسی بھی ایڈیشن پر درج نہیں۔

انگریزی خطبات کے اردو، پنجابی، پشتو، ترکی، عربی، فارسی، فرانسیسی اور بنگالی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

❁

جاوید نامہ

①

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوشنویس	ضخامت
اوّل	فروری ۱۹۳۲ء	درج نہیں	۲۰ × ۱۶	۱۲ سطری	غلام محی الدین	۸+۲۴۶

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق محفوظ	کریمی پریس لاہور باہتمام میر قدرت اللہ	درج نہیں	شیخ طاہر الدین انارکلی، لاہور	۳ روپے

②

اقبال کی وفات کے بعد اوّلین ایڈیشن

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوشنویس	ضخامت
دوم	فروری ۱۹۴۷ء	درج نہیں	۲۰ × ۱۶	۱۲ سطری	پروین رقم	۸+۲۴۶

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق ترجمہ بحق جاوید اقبال محفوظ ہیں	کیمور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور۔ باہتمام لالہ گوردتا مل کپور	جاوید اقبال لاہور	شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور	مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے

علامہ اقبال ڈوانٹے کا میڈی کی طرز پر ایک اسلامی کامیڈی کی تخلیق کرنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ ان کے ذہن میں یہ خیال پہلے سے رہا ہو تاہم زبورِ عجم کی تکمیل کے بعد ہی یعنی ۱۹۲۷ء میں انھوں نے اپنے منصوبے کا آغاز کر دیا تھا۔ بعد میں یہ کتاب جاوید نامہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اقبال اس تصنیف کو "زندگی کا ماحصل" بنانا چاہتے تھے۔ جاوید نامہ کا ذکر کرتے ہوئے محمد جمیل کو اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

" I HOPE TO MAKE (IT) MY LIFE WORK " (LECTURES OF IQBAL) PAGE: 119.

سید نذیر نیازی کا بیان ہے کہ ۱۹۲۷ء کے موسم گرما میں جب وہ ڈاکٹر عابد حسین کی معیت میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ نے انھیں اپنی بیاض شعر سے چند قطعات سنائے جو آگے چل کر بے شک داخلِ جاوید نامہ کا جزو بنے (مکتوبات اقبال ص ۳۳)۔ جاوید نامہ کی تکمیل ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ کتابت کے مرحلے میں کئی ماہ گزر گئے۔ اقبال کو توقع تھی کہ کتاب اکتوبر تک شائع ہو جائے گی۔

فروری ۱۹۳۲ء کے اوائل میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ ابتدا میں علامہ اقبال جاوید نامہ کا ایک دلچسپ دیباچہ بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ پروفیسر شجاع کے نام اپنے ایک مکتوب محررہ ۲ رجنوری ۱۹۳۱ء میں جاوید نامہ کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

آخری نظم "جاوید نامہ" جس کے دو ہزار شعر ہوں گے ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ممکن ہے مارچ تک ختم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی ڈیوائن کامیڈی ہے اور مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ بہت دلچسپ ہوگا اور اس میں غالباً ہند و ایران بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لیے نئی باتیں ہوں گی۔" [اقبال نامہ (حصہ اوّل) ص ۲۱۶]

لیکن وہ مجوزہ "دلچسپ دیباچہ" تحریر نہیں کیا جا سکا اور زبورِ عجم کے دو شعر بہ طورِ دیباچہ دے دیے گئے:

خیال من بتماشائے آسمان بود است — بدوش ماہ و بآغوش کہکشاں بود است
گمان مبر کہ ہمیں خاکدان نشیمن ماست — کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

جاوید نامہ کی کتابت ایک نئے کاتب غلام محی الدین کی ہے۔ طبع اوّل کا کاغذ دبیز اور پائیدار ہے۔ آخر میں ۲ غلطیوں پر مشتمل ایک غلط نامہ، علاحدہ کاغذ پر درج کیا گیا ہے۔ بیرونی سرورق کے صفحات کا شمار بھی بہ طور "الف ب" کیا گیا ہے۔ صفحہ "ج" پر اندرونی سرورق ہے۔ فہرست مضامین صفحہ "ہ" سے شروع ہو کر صفحہ "ی" پر ختم ہوتی ہے۔ زبورِ عجم کے مندرجہ بالا دو شعر بہ طورِ دیباچہ صفحہ "ط" پر درج کیے گئے ہیں۔

جاوید نامہ کا دوسرا ایڈیشن چودھری محمد حسین کی زیرِ نگرانی ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس پر کاتب کا نام درج نہیں مگر طرزِ کتابت پروین رقم کا ہے۔ طبع اوّل کے متن ہی کو طبع دوم کا معیار بنایا گیا ہے۔ سب سے اہم ترین ترمیم یہ کی گئی کہ زبورِ عجم کے دو اشعار پر مشتمل دیباچہ حذف کر دیا گیا۔ طبع اول پر بیرونی سرورق کے دو صفحات کا شمار بہ طور "الف ب ..." کیا گیا تھا مگر طبع دوم میں انھیں شمار نہیں کیا گیا چنانچہ اب صفحہ "الف" پر اندرونی سرورق اور "ب ج" خالی ہیں۔ فہرست مضامین ہ، و، ز، ح، پر درج ہے۔ طبع اول کے ساتھ علاحدہ کاغذ پر جو غلط نامہ لگایا گیا تھا، طبع دوم میں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

طبع دوم کی پلیٹیں محفوظ کر لی گئیں اور بعد کے ایڈیشن انھیں محفوظ پلیٹوں سے طبع کیے گئے۔ طبع سوم اور بعد کے تمام ایڈیشنوں میں طبع دوم کی اغلاط موجود ہیں۔ طبع سوم میں فہرست مضامین کے صفحہ نمبر کی ترتیب بدل گئی ہے۔ طبع چہارم میں یہ ترتیب درست ہے لیکن اندرونی سرورق صفحہ "ج" پر چلا گیا ہے۔ صفحات الف اور ب خالی ہیں۔ طبع پنجم، ششم اور ہفتم میں بھی یہی صورت ہے۔

جاوید نامہ کا ۸واں [ستمبر ۱۹۷۴ء] اور نواں ایڈیشن [جون ۱۹۷۸ء] کلیاتِ اقبال [فارسی] کے لیے ازسرِ نو کی گئی کتابت سے طبع ہوا۔ کلیات والی کتابت سے محفوظ پلیٹوں سے طباعت کا سلسلہ جاری ہے۔

طبع اوّل، دوم پر تعدادِ اشاعت درج نہیں۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۷۸ء تک جاوید نامہ کے ۹ ایڈیشن شائع ہوئے۔ طبع اوّل اور طبع دوم تعدادِ اشاعت درج نہیں لہٰذا ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۸ء تک ۷ ایڈیشنوں کی مجموعی تعداد ۱۴ ہزار نسخے بنتی ہے۔

❁

مسافر

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	۱۹۳۴ء	۵ سو	۱۸½ × ۱۲	۱۲ سطری	عبد المجید پروین رقم	۵۹

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ، لاہور باہتمام بابو نظام الدین	سر محمد اقبال میکلوڈ روڈ لاہور	درج نہیں	درج نہیں

(۲)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوشنویس	ضخامت
دوم	۱۹۳۶ء	دو ہزار	۲۱ × ۱۷	۱۰ سطری	درج نہیں	۴۴ صفحات

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور زیر اہتمام لالہ گورانداتا کپور	کتاب خانہ طلوعِ اسلام لاہور	کتاب خانہ طلوعِ اسلام لاہور	درج نہیں

علامہ اقبال نے سید سلیمان ندوی مرحوم اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان کا سفر کیا تھا جو ۲۱ راکتوبر سے ۳ر نومبر ۱۹۳۳ء کو محیط
سفر سے واپسی پر علامہ نے مثنوی مسافر کی تخلیق کا آغاز کیا۔ کئی ماہ اس میں لگ گئے۔ اگست ۱۹۳۴ء میں کتابت کا مرحلہ طے ہوا۔ بال جبریل
مسافر کی اشاعت کے سلسلے میں مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بات چیت ہو رہی تھی۔ اقبال کا ارادہ تھا کہ مسافر ایک ہزار یا ۱۵ سو کی تعداد
شائع کی جائے اور دس نسخے خاص کاغذ پر طبع ہوں، مگر جامعہ والوں سے کوئی معاملہ طے نہ ہو سکا اس لیے مثنوی صرف ۵ سو کی تعداد میں دبیز
پیپر پر طبع کی گئی۔ سید نذیر نیازی کے مطابق مثنوی کی محدود تعداد احباب میں تقسیم کے لیے طبع کی گئی تھی۔ طبع اول کی تقطیع خلافِ معمول
مسافر کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۳۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ محمد جمیل کے نام ۶ر دسمبر ۱۹۳۴ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

MOSAFIR WAS PUBLISHED ABOUT A MONTH OR SO AGO. (LETTERS OF IQBAL.PAGE:124

فقیر سید وحید الدین نے IQBAL IN PICTURES میں مسافر کے پہلے ایڈیشن کے سرورق کا جو عکس دیا ہے وہ دراصل
ںی سرورق ہے نہ کہ بیرونی سرورق۔

دوسرا ایڈیشن تصانیف اقبال کی مروّجہ تقطیع کے مطابق یعنی ۲۱ × ۱۷ س م ہے اور ۱۹۳۶ء میں یہ ایڈیشن طبع ہوا مگر اس کا مسطر ۱۲
ئے ۱۰ سطری ہے۔ کتابت نسبتاً خفی ہے، طباعت کا اہتمام سید نذیر نیازی نے کتب خانہ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام کیا۔

مسافر کا طبع دوم ۱۹۳۶ء میں منظرِ عام پر آیا، یہی سال مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" کی اشاعت کا بھی ہے۔ ان دونوں مثنویوں
حدہ علاحدہ اشاعت اور فروخت کے بعد دونوں کو یکجا مجلد کر کے شائع کیا گیا اور سرورق پر یہ عنوان دیا گیا! "پس چہ باید کرد اے اقوامِ
مع مسافر" ان دونوں مثنویوں کی از سرِ نو کتابت کروائی گئی۔ دونوں کے صفحات کا شمار علاحدہ کیا گیا۔ دونوں مثنویاں بہ طور ایک کتاب
ع کر کے فروخت کی گئیں۔ مسافر کا طبع سوم دونوں مثنویوں کی یکجائی کے طبع اوّل کے طور پر تسلیم کیا گیا۔

دو ایڈیشن کی مجموعی تعداد دو ہزار ۵ سو نسخے بنتی ہے۔

بالِ جبریل

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع : س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	جنوری ۱۹۳۵ء	دس ہزار	۱۹½ × ۱۵	۱۲ سطری	عبدالمجید پروین رقم	۲۲۴ صفحات

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس ایبٹ روڈ لاہور	درج نہیں	تاج کمپنی لمیٹڈ برانڈرتھ روڈ لاہور	تین روپے

(۲)

اقبال کی وفات کے بعد اوّلین ایڈیشن

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم	مئی ۱۹۴۱ء	دو ہزار	۱۹½ × ۱۵	۱۲ سطری	عبدالمجید پروین رقم	۲۲۴ صفحات

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حقِ ترجمہ وغیرہ بحق جاوید اقبال محفوظ ہیں	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس ایبٹ روڈ لاہور	جاوید اقبال، جاوید منزل میو روڈ لاہور	شیخ مبارک علی تاجر کتب، دروازہ لوہاری لاہور	تین روپے

بانگ درا اور بالِ جبریل کی اشاعتوں کے درمیان چار شعری مجموعے (فارسی) شائع ہوئے: زبورِ عجم (۱۹۲۷ء) جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) مسافر (۱۹۳۴ء) مثنوی پس چہ باید کرد (۱۹۳۶ء)

بالِ جبریل کا پہلے نام نشانِ منزل تجویز ہوا۔ مسودے پر پہلے یہی نام درج ہوا، پھر اسے اقبال نے قلم زد کر کے بالِ جبریل لکھ دیا۔ اقبال کی زندگی میں بالِ جبریل کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہو سکا۔ ان کی وفات کے بعد مئی ۱۹۴۱ء میں چودھری محمد حسین کی نگرانی میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

دوسرے ایڈیشن کی پلیٹیں محفوظ کر لی گئی تھیں اور ۸ ویں ایڈیشن (جون ۱۹۵۱ء) تک بالِ جبریل انھیں ایڈیشنوں سے شائع ہوتی رہی۔

نویں ایڈیشن (نومبر: ۱۹۵۴ء) کتابت از سر نو کروائی گئی لیکن صفحات کی تعداد، عنوانات اور کتابتِ متن کے لیے دوسرا ایڈیشن ہی کو معیار بنایا گیا۔

اسی ایڈیشن کی پلیٹوں کو محفوظ کر کے ۱۸ ویں ایڈیشن (مطبوعہ: اپریل ۱۹۷۲ء) تک انھیں کو شائع کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۳ء میں بالِ جبریل کا ۱۹ واں

ضربِ کلیم

یعنی

اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اقبال

ضربِ کلیم جولائی ۱۹۳۶ء

مثنوی

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

اقبال

مثنوی پس چہ باید کرد
اے اقوامِ شرق"
اکتوبر ۱۹۳۶ء

ارمغانِ حجاز

اقبال

ارمغانِ حجاز، نومبر ۱۹۳۸ء

ایڈیشن کلیاتِ اقبال" (مطبوعہ ۱۹۷۳ء) کے متن کو معیار بنا کر طبع کیا گیا۔ تاحال کتاب انھیں پلیٹوں سے شائع ہو رہی ہے۔
کلیاتِ اقبال کے لیے بالِ جبریل کی کتابت از سرِ نو کی گئی تھی لہٰذا نہ صرف صفحات تبدیل ہو گئے بلکہ ترتیب میں بھی فرق آ گیا ہے۔ صفحات ۱۷۰ پر محیط ہوئے۔

بالِ جبریل، اقبال کا دوسرا اردو شعری مجموعہ ہے جو دس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۸ء تک ۲۳ ایڈیشن شائع ہوئے جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ ۱۷ ہزار بنتی ہے۔ ۱۹۷۸ء سے تاحال ہند و پاک میں مزید کئی معیاری ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

ضربِ کلیم

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوشنویس	ضخامت
اول	جولائی ۱۹۳۶ء	۵ ہزار	۲۰ × ۱/۲ ۱۵	۱۴ سطری	درج نہیں	۱۸۲ صفحات

اعلانِ حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس ایبٹ روڈ لاہور	ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب	کتاب خانہ طلوعِ اسلام لاہور	دو روپے

(۲)

اقبال کی وفات کے بعد اولین ایڈیشن

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوشنویس	ضخامت
دوم	جنوری ۱۹۴۱ء	دو ہزار نو سو پچاس	۲۰ × ۱۵	۱۲ سطری	عبد المجید پروین رقم	۱۸۲ + ۸

اعلانِ حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق مع حق ترجمہ وغیرہ بحق منیرہ بانو بیگم دختر علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم محفوظ ہیں	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس ایبٹ روڈ لاہور	گارڈین منیرہ بانو بیگم نے برائے منیرہ بانو بیگم، جاوید منزل میو روڈ لاہور سے شائع کی	شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون دروازہ لوہاری لاہور	درج نہیں

بالِ جبریل (طبع اول جنوری ۱۹۳۵ء) کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی اس قدر کلام جمع ہو گیا کہ علامہ اقبال نے "صورِ اسرافیل" کے عنوان سے تیسرے اردو شعری مجموعے کو ترتیب دینا شروع کر دیا لیکن ۱۹۳۶ء کے اوائل میں جب مجموعہ مرتب ہوا تو موضوع کی مناسبت سے اس کا نام ضربِ کلیم تجویز کیا۔
ضربِ کلیم کے طبع اول پر طباعت کا ماہ و سال درج نہیں ہے لیکن جولائی ۱۹۳۶ء میں کتاب کی اشاعت کی تصدیق سر راس مسعود کے نام ایک مکتوب محررہ ۲۹؍جون ۱۹۳۶ء سے ہوتی ہے۔ یکم اگست ۱۹۳۶ء کے ایک مکتوب میں سر راس مسعود کو "ضربِ کلیم" کے ۶ نسخوں کے ارسال کرنے کی بابت تحریر کیا تھا۔
طبع اول میں کتابت و طباعت کی خاصی غلطیوں کے سبب طبع دوم کی دوبارہ کتابت کروائی گئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن میں بھی خوش نویس کا نام درج نہیں لیکن طرزِ کتابت و قلم وغیرہ سے واضح ہوتا ہے کہ کتابت پروین رقم ہی کی ہے۔ صفحات کی تعداد اور منظومات کے آغاز و اختتام میں پہلے ایڈیشن ہی کا تتبع کیا گیا۔ اس ایڈیشن کی تیاری و طباعت چودھری محمد حسین کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ طبع دوم کی پلیٹوں کو محفوظ کر لیا گیا تھا اور ۱۶ ویں ایڈیشن تک طبع دوم کی محفوظ پلیٹوں کا استعمال ہوتا رہا۔ ۱۷واں ایڈیشن مطبوعہ اگست ۱۹۷۳ء کلیاتِ اقبال کی کتابت والے متن سے شائع ہوا اور یہی سلسلہ جاری ہے۔
۱۹۷۹ء تک ۲۰ ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۹ء تک نوے ہزار نو سو پچاس نسخے شائع ہوئے۔

✿

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

①

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع: س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	۱۹۳۶ء	دو ہزار	۲۱ × ۱۷	۱۰ سطری	درج نہیں	۷۱ صفحات

اعلانِ حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور باہتمام لالہ گوراندتا مل کپور	درج نہیں	کتاب خانہ طلوعِ اسلام لاہور	درج نہیں

اردو شعری مجموعہ ضربِ کلیم (طبع اوّل ۱۹۳۶ء) کی طباعت کے دوران علامہ اقبال علیل ہوئے۔ اسی دوران انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ یہی خواب مثنوی کی تخلیق کا محرک ہوا اور کل ۶۰ شعر فارسی میں کہے۔ سر راس مسعود کے نام اپنے ایک مکتوب محررہ ۲۹؍جون ۱۹۳۶ء میں اقبال تحریر کرتے ہیں:

۳؍اپریل کی شب کو، جب میں بھوپال میں تھا، میں نے تمہارے دادا رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا، مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضورِ رسالت مآب کی خدمت میں عرض کر، میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے، کل سات شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے۔ اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمدللہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی۔ مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا۔ بہرحال اس مثنوی کا نام

"۔۔۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ضربِ کلیم کی طباعت کے بعد اس کی کتابت شروع ہوگی۔"

[خطوطِ اقبال : ص ۲۶۲-۲۶۳]

مگر اس خط سے قبل پروفیسر محمد صلاح الدین الیاس برنی کو اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۳ر جون ۱۹۳۶ء میں اقبال نے اپنے مذکورہ خواب کا ذکر کیا۔

یہ مثنوی آخر اکتوبر ۱۹۳۶ء میں بڑی تقطیع ۲۱ × ۱۷ س م پر شائع ہوئی۔ مسطر ۱۰ سطری اور کتابت قدرے خفی ہے۔ کاتب کا نام درج نہیں مگر مسافر طبع دوم ۱۹۳۶ء اور اس کی کتابت ایک ہی خوش نویس نے کی کیوں کہ دونوں کا طرزِ کتابت بالکل یکساں ہے۔ اس نسخے کا کاغذ مضبوط اور پائیدار ہے۔

شہزادی عابدہ سلطانہ کو اقبال نے مثنوی کا جو نسخہ پیش کیا اس پر ۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کی تاریخ درج ہے۔ [اقبال اور بھوپال۔ از صہبا لکھنوی، ص ۲۴]

مثنوی کے طبع اوّل کی علاحدہ اشاعت اور غالباً کچھ نسخوں کی فروخت کے بعد اسے مسافر کے ساتھ یکجا کر کے مجلّد شائع کیا گیا اس طرح مسافر کا طبع سوم اور "پس چہ باید کرد ۔۔۔۔" کا طبع دوم دونوں مثنویوں کی یکجا اشاعت کے طبع اول میں سمو دیا گیا۔

مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مسافر

①

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع : س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل مسافر : دوم پس چہ باید : اوّل	۱۹۳۶ء	دو ہزار	۲۰ × ۱۶	۱۰ سطری	درج نہیں	۴۴ + ۱۷ صفحات

اعلان حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
کاپی رائٹ	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس ایبٹ روڈ لاہور	سید نذیر نیازی کتاب خانہ طلوعِ اسلام میکلوڈ روڈ لاہور	درج نہیں	درج نہیں

②

اقبال کی وفات کے بعد اوّلین ایڈیشن

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع : س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
دوم مسافر : سوم پس چہ : دوم	۱۹۴۴ء	۲ ہزار	۲۰ × ۱۶	۱۰ سطری	پروین رقم	۴۴ + ۱۷ صفحات

اعلان حقوق اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق محفوظ بہ حق منیرہ بانو بیگم مع حق ترجمہ	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس با اہتمام گورانداس کپور	منیرہ بانو بیگم	شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور	مجلد ۲/۱ ۲ روپے غیر مجلد ۲/۱ ۱ روپے

مسافر کا طبع اول نومبر ۱۹۳۴ء اور طبع دوم ۱۹۳۶ء کے ساتھ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق طبع اول ۱۹۳۶ء کے بعد اسی سال ان دونوں مثنویوں کو یکجا کر کے ایک کتاب کی صورت دی گئی "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر" اور اسے طبع اوّل قرار دیا گیا۔ اس میں مسافر کا طبع سوم اور پس چہ باید کرد کا طبع دوم شامل ہے۔ مؤخر الذکر کی اشاعت کی کوئی وضاحت نہیں کہ یہ کونسا ایڈیشن ہے جبکہ "مسافر" کی اشاعت اوّل ۱۹۳۴ء اور دوم ۱۹۳۶ء کا اندراج موجود ہے اس طرح "مسافر" کے طبع دوّم اور "پس چہ باید کرد" کی علاحدہ اشاعتوں کا کوئی شمار نہیں کیا گیا ہے۔

اقبال کے انتقال کے بعد ۱۹۴۴ء میں خوش نویس پروین رقم سے دونوں مثنویوں کی از سر نو کتابت کرائی گئی اور اس کی اشاعت کا اہتمام چودھری محمد حسین نے کیا۔ کتابت قدرے جلی ہے لیکن مسطر حسبِ سابق ۱۲ سطری ہے۔ مثنویوں کی ترتیب بدل دی گئی ہے پہلے "مسافر" اس کے بعد "پس چہ باید"۔ ۱۹۴۴ء کے اس ایڈیشن کو طبع دوم قرار دیا گیا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی اپنی کتاب "تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" کے ضمیمہ نمبر ا کے کتابیاتی کوائف میں تحریر کرتے ہیں:

"مسافر کے طبع دوم ۱۹۳۶ء اور پس چہ باید کرد ..... طبع اوّل ۱۹۳۶ء کو یکجا مجلد کر کے "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر" طبع اوّل قرار دیا گیا۔" [ضمیمہ ا ص ۲۲]

اور اپنے تحقیقی تجزیے میں استنباط کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"۱۹۴۴ء کے اس ایڈیشن کو طبع دوم قرار دیا گیا ہے درحقیقت یہ "مسافر" کا تیسرا اور "پس چہ باید کرد" کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ ۱۹۴۴ء کی اشاعت کو طبع دوم صرف اس صورت میں تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ دونوں مثنویوں کی ۱۹۳۶ء والی اشاعتوں کو پہلی یکجا اشاعت فرض کیا جائے ورنہ اصل میں تو زیرِ نظر ۱۹۴۴ء والے ایڈیشن سے دونوں مثنویوں کو یکجا کیا گیا اور یہ یکجا طبع اول ہے۔" [ایضاً ص ۱۴۴]

یہاں وضاحت طلب بات یہ ہے کہ "مسافر" طبع اوّل، دوّم اور "مثنوی پس چہ باید ...." طبع اول کو علاحدہ اشاعتیں تسلیم کیا جائے یا نہیں ؟ ۱۹۳۶ء میں "مسافر" طبع دوم اور مثنوی طبع اوّل کی علاحدہ اشاعتوں کو یکجا کر کے ایک سرورق کے ساتھ تقسیم کیا گیا اس لیے آخر الذکر پر طبع اوّل درج ہے اور مؤخر الذکر پہ طبع اول ۱۹۳۴ء درج ہے۔ مسافر طبع دوم دو ہزار اور مثنوی طبع اوّل دو ہزار کی وضاحتیں کتاب میں موجود ہیں۔ ۱۹۴۴ء کو طبع دوم قرار دینے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے کہ دونوں کتابوں کو یکجا کر کے فروخت کیا گیا تھا نہ کہ از سرِ نو کتابت و طباعت کے بعد یہ کام علامہ کے انتقال کے بعد ۱۹۴۴ء میں ہوا لہٰذا ۱۹۴۴ء والی اشاعت دونوں کتابوں کی یکجا صورت میں طبع اول ہی ہے یعنی مسافر طبع سوم۔ اور مثنوی طبع دوّم۔

۱۹۴۴ء والے اس ایڈیشن میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں کی گئی ہیں:

۱۔ سابقہ ترتیب کے برعکس اس ایڈیشن میں مثنوی مسافر پہلے ہے اور مثنوی پس چہ باید کرد بعد میں۔

۲۔ مسافر طبع اوّل اور طبع دوم کے سرورق کی عبارت "یعنی سیاحتِ چند روزہ افغانستان اکتوبر ۱۹۳۳ء" کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اب سرورق صرف "مثنوی مسافر" اقبال، کے الفاظ رہ گئے ہیں۔

۳۔ مسافر طبع دوم پر کتاب کے متعلق جو کوائف درج تھے انھیں حذف کر دیا گیا ہے۔

دونوں مثنویوں کی از سرِ نو کتابت و اشاعت کے موقع پر ان امور پر توجہ نہیں دی گئی کہ :

الف : مسافر کے آغاز میں فہرست عنوانات موجود نہیں۔ بہت سی تبدیلیوں اور ترمیمات میں ایک ایک فہرست کا اضافہ ضروری تھا جب کہ مثنوی پس چہ باید کرد میں فہرست عنوانات موجود ہے۔

ب : دونوں مثنویوں کے صفحات کا نمبر شمار علاحدہ علاحدہ درج کرنے کے بجائے نمبر شمار مسلسل ہونا چاہیے تھا۔

ج : مثنوی پس چہ باید کرد کی فہرست عنوانات کو شروع میں لے آنا چاہیے تھا۔

د : نئے ایڈیشن میں کی گئی تبدیلیوں اور ترمیمات کی وضاحت ضروری تھی۔

۱۹۴۴ء کے اس ایڈیشن کی پلیٹیں محفوظ کر لی گئی تھیں اور طبع ہفتم [۱۹۷۲ء] تک تمام ایڈیشن انھیں پلیٹوں سے طبع کیے جاتے رہے۔ طبع ششم [۱۹۶۶ء] سے دونوں مثنویوں کی ترتیب پھر بدل گئی ہے یعنی مثنوی پس چہ باید کرد پہلے اور مسافر بعد میں۔ طبع ہشتم [۱۹۷۷ء] خوش نویس محمود اللہ صدیقی کی کتابت سے تیار شدہ پلیٹوں کے ذریعہ طبع ہوا۔ کل صفحات ۸۴۔ تقطیع ۱۹ × ۱۵ س م، مسطر ۱۴ سطری۔ جملہ حقوق منیرہ بیگم اور صلاح الدین کے نام۔ اس کی پبلی شرز غلام علی۔ قیمت مجلد ۷ روپے اور غیر مجلد ۳ روپے۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۷۷ء تک تعداد اشاعت ۲۱ ہزار پانچ سو نسخے بنتی ہے۔

❀

ارمغانِ حجاز

[فارسی اردو کلام]

(۱)

طبع	اشاعت	تعداد	تقطیع : س م	مسطر	خوش نویس	ضخامت
اوّل	نومبر ۱۹۳۸ء	۵ ہزار	۳/۴ ۱۸ × ۱۵	۱۰ سطری	پروین رقم	۲۸۰ صفحات + ۸ ء

اعلانِ حقوقِ اشاعت	مطبع	ناشر	ملنے کا پتہ	قیمت
جملہ حقوق بحق جاوید اقبال محفوظ ہیں	کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور	جاوید اقبال لاہور	درج نہیں	درج نہیں

۱۹۳۶ء میں اقبال کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے ان میں سے ایک ضربِ کلیم[۱] ہے۔ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کا انتقال ہوا۔ انتقال سے قبل انھیں اپنے پسنہ دو سال کی شعری تخلیقات کو مرتب کر کے شائع کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد فارسی، اور اردو کے کلام کو مدوّن کر کے ارمغانِ حجاز کے نام سے شائع کیا گیا۔ یہ شعری مجموعہ چودھری محمد حسین کی زیرِ نگرانی طبع ہوا:

اقبال کو اتنی مہلت نہیں مل سکی کہ ارمغانِ حجاز کا مسودہ مرتب کرتے اور اس کتاب کو کسی کے نام معنون کرتے۔ انتساب کے سلسلے میں شیخ عطاء اللہ مرتب اقبال نامہ لکھتے ہیں کہ:

"... انھوں نے [اقبال نے] اپنی کتاب ارمغانِ حجاز بھی نواب صاحب [حمید اللہ خاں نواب بھوپال] ہی کی نذر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جس کی اطلاع انھوں نے سر راس مسعود کو دی تھی۔ سر راس مسعود، اقبال سے پہلے فوت ہوگئے اور

ارمغانِ حجاز اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اس طرح اقبال کی اس خواہش در عدہ کا جو اب ایک گوشہ وصیت کا حکم رکھتا ہے، کسی کو علم نہ ہوا۔۔۔۔"

[اقبال نامہ، طبع اوّل، ص غ]

یہ توضیح ہے کہ اقبال اپنا شعری مجموعہ کسی کے نام سے معنون کرتے لیکن جو کچھ شیخ عطاء اللہ نے تحریر کیا ہے وہ بغیر کسی تحقیقی حوالے کے درج کیا ہے اور اس کی شہادتیں بھی نہیں ملتیں لہٰذا اقبال سے منسوب کی ایسی خواہش کی تکمیل و تعمیل کا جواز ہی نہیں بنتا جو مصدقہ نہیں، حالانکہ ضربِ کلیم کا انتساب نواب بھوپال کے نام ہے۔ اقبال کے مکاتیب بنام سر راس مسعود میں (؟) ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں ہے۔

ارمغانِ حجاز میں فارسی اردو کلام شامل ہے۔ اس میں تقریباً دو تہائی حصہ فارسی کلام پر مشتمل ہے۔ فارسی حصہ صفحہ نمبر ا سے صفحہ نمبر ۲۱۰ کو محیط ہے۔ ابتدائی صفحات الف، ب، ج، د کے تحت دیے گئے ہیں، یہ فہرست مضامین کے صفحات ہیں۔ اردو نظمیں صفحہ نمبر ۲۱۱ سے ۲۸۰ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس شعری مجموعے کی کتابت خوش نویس پروین رقم کی ہے اور قدرے جلی ہے اور زیادہ احتیاط و اہتمام سے کی گئی ہے۔ صفحہ نمبر ۲۰۸ تک بعد کے ایڈیشن طبع اوّل کی پلیٹوں سے شائع کیے گئے لیکن صفحہ نمبر ۲۰۹ اور صفحہ نمبر ۲۱۰ اردو کی کاپی کا وہ حصہ تھے جن کی کتابت طبع دوم کے لیے از سرِ نو کروائی گئی۔

ارمغانِ حجاز اقبال کی وفات کے بعد چودھری محمد حسین نے طبع کروائی لہٰذا اس امر کا احتمال ہے کہ اقبال کا تمام اردو و فارسی غیر مطبوعہ و غیر مدون کلام ارمغانِ حجاز میں شامل کیا گیا یا کچھ کلام باقی رہ گیا۔ ضربِ کلیم کی بیاضں کے بعد والی بیاضوں سے اس کا موازنہ ضروری تھا۔ اقبال اپنے کلام پر ترمیم و اصلاح کرتے رہتے تھے اور جب کوئی شعری مجموعہ شائع ہوتا تو اس کا متن بیاضوں اور رسائل و جرائد میں شائع شدہ متن سے مختلف ہوتا۔ لہٰذا یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ ارمغانِ حجاز میں شامل کلام ابتدائی متن ہے یا پھر ترمیم شدہ متن ہے۔ ارمغانِ حجاز کے طبع اوّل میں اس طرح وضاحتیں ضروری تھیں۔

اردو کلام کے حصے میں صفحہ نمبر ۲۰۸ پر حسین احمد کے عنوان سے تین اشعار کا ایک فارسی قطعہ شامل کیا گیا ہے۔ جن کے بارے میں اقبال کے قریبی ساتھیوں [خواجہ عبدالوحید اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی] کا خیال ہے کہ علامہ اقبال اگر خود ارمغانِ حجاز مرتب کرتے تو یہ قطعہ شامل نہ کرتے جب کہ بعض دیگر اصحاب کی رائے اس کے برعکس ہے۔ غالباً چودھری محمد حسین وغیرہ کو بھی اس قطعے کی شمولیت پر تردد ہوا ہوگا لیکن پھر بعد میں اسے شامل کر لیا گیا اسی لیے یہ قطعہ فارسی کلام والے حصے میں شامل نہیں کیا جا سکا اور اردو والے حصے کے آخر میں شامل کر لیا گیا وہ قطعہ یہ ہے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

یہ قطعہ آج بھی اپنی ایک پرانی بحث کے ساتھ تازہ تر ہے۔ اس کے برعکس ایک فارسی قطعہ ارمغانِ حجاز میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ سید نذیر نیازی راوی ہیں کہ:

"۳ فروری ۱۹۳۸ء کو اقبال نے اپنی ایک تازہ رباعی کے پہلے دو مصرعے تبدیل کرا دیے۔"

نیازی لکھتے ہیں کہ: "یہ قطعہ یا رباعی ارمغانِ حجاز میں موجود ہے۔" رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق متذکرہ قطعہ یا رباعی یا دو مصرعے ارمغانِ حجاز میں نہیں ملتے۔ مذکورہ رباعی یہ ہے:

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را نداند نکتۂ دینِ عرب را!!
اگر قوم از وطن بودے محمد ندادے دعوتِ دیں بولہب را

[باقیاتِ اقبال طبع سوم ص ۴۰۴ ۔ مضامینِ اقبال ص ۱۸ ۔ ۱۹۹۶ء]

ارمغانِ حجاز طبع دوم اگست ۱۹۴۴ء کے موقع پر غالباً پہلے ایڈیشن کی تمام پلیٹیں محفوظ نہ رہ سکیں اس لیے بعض حصوں کی کتابت ازسرِنو کرائی گئی۔ فارسی حصہ صفحہ ۲۷۳ تا ۲۸۰ کی کتابت پہلے ہی ایڈیشن کے مطابق ہے۔ باقی اردو حصے کی کتابت نئی ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں کتابت کا سابقہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ بعد کے تمام ایڈیشن طبع دوم کی پلیٹوں ہی سے شائع کیے گئے ہیں البتہ آخری کاپی صفحہ ۲۷۳ تا ۲۸۰ کی جو پلیٹ پہلے ایڈیشن سے محفوظ چلی آرہی تھی وہ تیسرے ایڈیشن کے موقع پر ضائع ہو گئی، اس کی ازسرِنو کتابت کروائی گئی یوں طبع سوم نومبر ۱۹۴۶ء سے اردو حصے کی کتابت نئی ہو گئی۔ طبع اول میں ابتدائی ۸ صفحات کی پلیٹ شاید محفوظ نہیں رہی، طبع دوم اور بعد کے ایڈیشنوں میں اس کی ازسرِنو کتابت کا اہتمام نہیں کیا گیا یا پھر اسے بلا کسی جواز کے حذف کر دیا گیا اسی لیے متن اشعار "حضورِ حق" سے شروع ہوتے ہیں۔

طبع سوم کے متعلق رفیع الدین ہاشمی کا تحقیقی تجزیہ یہ ہے کہ:

"راقم کو ارمغانِ حجاز کا کوئی ایسا نسخہ نہیں ملا جس پر طبع سوم کی صراحت موجود ہو۔ البتہ ایک ایڈیشن ایسا دستیاب ہوا جس پر سالِ طباعت اور نہ مطبع کا اندراج ہے۔ میں نے اسے ہی تیسرا ایڈیشن تصور کیا ہے۔"

[تصانیفِ اقبال: ص ۳۹، حاشیہ ۱]

ارمغانِ حجاز کے طبع یازدہم ستمبر ۱۹۷۵ء کی کتابت خوش نویس محمود اللہ صدیقی سے کروائی گئی۔ مسطر ۱۴ سطری اور ضخامت ۶+۲۴۱ صفحات۔ جملہ حقوق منیب اقبال ولید اقبال کے نام محفوظ ہیں۔ پبلشرز غلام علی لاہور۔ قیمت مجلد ۱۲ روپے اور غیر مجلد ۹ روپے۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۷۸ء تک ۱۲ اشاعتوں کی مجموعی تعداد ۳۲ ہزار نسخے بنتی ہے۔

❁

کلیاتِ اقبال [اردو]

اقبال کے تینوں شعری مجموعوں کی یکجائی و تمام اردو کلام کی سمائی کے لیے کلیات کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کلیاتِ اقبال کے مرتب ڈاکٹر جاوید اقبال نے بہ طورِ "اعتذار" ازسرِنو کتابت کا جو جواز پیش کیا ہے وہ صحت طلب ہے۔ جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں کہ:

"کلامِ اقبال کے اب تک جتنے ایڈیشن شائع ہوئے، وہ سب انھیں پلیٹوں سے طبع ہوتے رہے جنھیں حضرت علامہ مرحوم نے خود اپنی نگرانی میں تیار کروایا تھا، اس لحاظ سے یہ پلیٹیں حضرت علامہ کے دوسرے تبرکات کی طرح عزت و حرمت کا مقام رکھتی ہیں اگرچہ کثرتِ استعمال کے باعث ان کی حالت ابتر ہو گئی ہے۔ انھیں ترک کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ ہر دفعہ انھیں سنگ سازی کے عارضے سے مزین کر کے کام کیا جاتا رہا لیکن اب ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ سنگ سازی بھی انھیں اس قابل نہیں بنا سکتی کہ مزید طباعت کے لیے استعمال کی جا سکیں اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ازسرِنو کتابت کروا کے نئی پلیٹیں تیار کی جائیں۔"

[کلیاتِ اقبال، ۱۹۷۳ء، ص ۵]

جن محفوظ پلیٹوں کو علامہ اقبال کا تبرک اور اس کی عزت و حرمت کے بارے میں جاوید اقبال صاحب نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کی حقیقت کا علم قارئینِ اقبال کو بہ خوبی ہے۔ تینوں شعری مجموعے کتابت و طباعت کے ماہ و سال کی جو تاریخ بتاتے ہیں وہ یہ ہیں:

بانگِ درا کے تین ایڈیشن [۱۹۲۴ء، ۱۹۲۶ء، ۱۹۳۰ء] علامہ کی حیات ہی میں شائع ہوئے۔ جون ۱۹۳۹ء طبع چہارم کی کتابت ازسرِنو کروائی گئی اور یہی پلیٹیں محفوظ رہیں۔ انھیں پلیٹوں سے بعد کے ایڈیشن طبع ہوئے۔ کلیات کی اولین اشاعت سے قبل بانگِ درا کا ۲۹واں ایڈیشن [نومبر ۱۹۷۲ء] طبع ہوا اور اس کا متن جون ۱۹۳۹ء یعنی طبع چہارم والی کتابت ہی کا ہے۔

بالِ جبریل کا صرف ایک ہی ایڈیشن [جنوری ۱۹۳۵ء] علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوا۔ طبع دوم [مئی ۱۹۴۱ء] کی ازسرِنو کتابت کروائی گئی۔ طبع دوم کی پلیٹیں ۸ویں ایڈیشن [جون ۱۹۵۱ء] تک استعمال ہوتی رہیں۔ نویں ایڈیشن [نومبر ۱۹۵۴ء] کی ایک بار پھر کتابت کروائی گئی۔ کلیات کی اولین اشاعت سے قبل بالِ جبریل کا ۱۸واں ایڈیشن [اپریل ۱۹۷۲ء] نومبر ۱۹۵۴ء کی پلیٹوں سے طبع ہوا۔

ضربِ کلیم کا بھی صرف ایک ایڈیشن (جولائی ۱۹۳۶ء) علامہ اقبال کی حیات میں طبع ہوا۔ دوسرے ایڈیشن (۱۹۴۱ء) کی از سرِ نو کتابت کروائی گئی اور انھیں پلیٹوں سے کلیات کی اولین اشاعت تک ضربِ کلیم کے ۱۴ ایڈیشن (نومبر ۱۹۷۲ء تک) طبع ہوئے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے جن متبرک پلیٹوں کا ذکر کیا ہے ان کی حقیقت تو ختم ہو جاتی ہے تاہم سوال ابھرتا ہے کہ علامہ کی حیات میں شائع ہونے والے مجموعوں کی پلیٹیں کہاں گئیں؟ ان کے انتقال کے بعد اولین ایڈیشن کی از سرِ نو کتابت کا جواز کیا ہے؟ کتابت و ترتیب میں تبدیلی مستند ماخذ کی موجودگی میں کہاں تک جائز ہے؟

جاوید اقبال صاحب بخوبی واقف ہوں گے کہ جدید پرنٹنگ ٹکنالوجی میں طبع شدہ لوازمے کو فوٹو پروسس کے ذریعہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ از سرِ نو کتابت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یہاں جواز تو یہ بنتا ہے کہ مستند ماخذ سے کلیات تک کے سفر میں شعری مجموعوں کی کئی بار کتابت و ترتیب کی تبدیلیوں سے ایک معیاری متن کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا کلیاتِ اقبال (اردو) ایک مستند متن کی حیثیت سے جدید سائنٹفک ترتیب و تدوین اور نئے املا کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے کلیات کی ترتیب و تدوین کے لیے جن امور پہ توجہ دی وہ درج ذیل ہیں:

جدید کتابت و طباعت کے اعلیٰ معیار کے مطابق کلیات کی تدوین۔

صحتِ کلام کے لیے اولین نسخوں سے مقابلہ تاکہ بار بار کی سنگ سازی سے طباعت کی غلطیوں کو دور کیا جا سکے۔

بعض اغلاط کے لیے علامہ مرحوم کے رفیقِ دیرینہ مولانا غلام رسول مہر سے رجوع کیا گیا۔

مولانا غلام رسول مہر نے اغلاط کی تصحیح سے کتابت کے مراحل تک جاوید اقبال صاحب کی رہنمائی کی۔

میرا خیال ہے کہ محض یہی کچھ کسی معیاری و مستند کلیات کے لیے کافی نہیں۔ بلاشبہ کلیاتِ اقبال (اردو) ایک معیاری ایڈیشن تسلیم کیا گیا ہے اور ہند و پاک میں اسی ایڈیشن کے متن کی طباعت کا سلسلہ جاری ہے تاہم کلیات کے متن کی صحت، ترتیب و تدوین اور املا کے بعض مسائل اب بھی توجہ طلب اور وضاحتوں کے متقاضی ہیں۔

کلیات کی تدوین و ترتیب کے لیے تبدیلیٔ ترتیب وغیرہ کی نشاندہی اور وضاحتیں ضروری تھیں۔ علامہ کی بیاضیں، آخری حیاتی ایڈیشن اور کلیات سے قبل شائع ہونے والے ایڈیشنوں کا موازنہ اور ان کے استخراجی نتائج کی تفصیل ناگزیر تھی۔

کلیات میں کی جانے والی معمولی سی تبدیلی کا اندراج بھی ضروری تھا۔

بہت سے نقائص اور ترتیب میں تبدیلی کا انتشار ختم ہو جاتا اگر آخری حیاتی ایڈیشنوں کو فوٹو پروسس کے ذریعہ من و عن شائع کیا جاتا۔ اغلاط کی نشان دہی اور ان کی تصحیح حاشیوں میں دے دی جاتی۔

از سرِ نو کتابت میں جدید املا کے وضع کردہ اصولوں اور کلیوں کو پوری صحت کے ساتھ برتنا چاہیے تھا جب کہ کلیات میں اس کا لحاظ کیے بغیر کتابت میں مفرد اور مرکب الفاظ کے املا میں یکسانیت نہیں برتی گئی۔ یا تو قدیم املا ہی کو من و عن رہنے دیا جاتا کہ کوئی انتشار ہی پیدا نہیں ہوتا یا پھر مکمل طور پہ جدید املا کے اصولوں کے مطابق کتابت کروائی جاتی۔ ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۳ء تک ہند و پاک میں جدید املا پہ کافی معیاری تحقیقی کام ہو چکا تھا۔

کلیاتِ اقبال میں سابقہ ایڈیشنوں میں راہ پا جانے والی اغلاط کی تصحیح تو ہوئی لیکن متن، املا اور کتابت کی کئی ایک غلطیاں کلیات میں بھی رہ گئی ہیں اور بعض پرانی اغلاط کی تصحیح نہیں ہو سکی ہے۔

کلیات میں شامل چاروں شعری مجموعوں کے ہر صفحے پہ کتاب کا نام درج کیا جانا چاہیے تھا جیسا کہ ہندوستان میں شائع ہوئے کلیاتِ اقبال (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) کے عکسی ایڈیشن میں یہ ایک خوب صورت اضافہ ہے۔

کلیاتِ اقبال میں شامل اشاریہ ۱۸ صفحات پہ مشتمل ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

"افسوس ہے کہ کلیات کا زیرِ مطالعہ اشاریہ کئی اعتبار سے بہت ناقص ہے اور اشاریے کی افادیت

معنویت کو پوری طرح ان سے قاصر ہے۔ اس کی بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں خاص رواداری، بے احتیاطی اور سرسری پن سے کام لیا گیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ صحت و استناد اور تحقیق و تدوین کے کم سے کم مطلوبہ معیار سے بھی فروتر ہے۔ بعض مقامات پر تو مرتب، تدبر و بصیرت کی معمولی صلاحیت سے بھی عاری نظر آتا ہے۔"
[تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ ص ۵۳، ۵۴]

کلیاتِ اقبال کے نئے ایڈیشن کے لیے ضروری ہے کہ

۱۔ اقبال کی بیاضوں، رسائل و جرائد، تمام حیاتی شعری مجموعوں اور مابعد شعری مجموعوں نیز باقیاتِ اقبال کے تمام مجموعوں کی مدد سے ایک معیاری متن زمانی ترتیب کے ساتھ مدون کیا جائے۔ ۲۔ صحتِ متن کے ساتھ صحتِ املا پر بھرپور توجہ دی جائے۔ ۳۔ ایک نہایت ہی مفید اور بامعنی اشاریہ ترتیب دیا جائے۔ ۴۔ ہر شعری مجموعے کا اس کی اولین اشاعت سے تاحال ایک مختصر تحقیقی تعارف دیا جائے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کے مرتب کردہ کلیاتِ اقبال (اردو) کا اولین ایڈیشن، فروری ۱۹۷۳ء میں غلام علی اینڈ سنز پبلی شرز (لاہور) نے شائع کیا۔ ضخامت ۱۰ + ۷۱۰ صفحات۔ اشاعتِ دوم: جنوری ۱۹۷۵ء، اشاعتِ سوم: جنوری ۱۹۷۷ء۔

❀

کلیاتِ اقبال [فارسی]

کلیاتِ اقبال (فارسی) کے آغاز میں بھی "اعتذار" کے زیرِ عنوان ڈاکٹر جاوید اقبال کا وہی دیباچہ شامل ہے جو کلیاتِ اقبال (اردو) میں شامل تھا۔ اعتذار کے تحت جاوید اقبال نے اقبال کے تمام شعری مجموعوں کی طباعت کے لیے جن محفوظ پلیٹوں کو متبرک کہا اور ان کی عزت و حرمت کے لیے لکھا ہے وہ قطعی مبالغہ آمیز اور غیر تحقیقی ہے۔ فارسی مجموعوں کا جائزہ لیں تو صورتِ حال کچھ مختلف نظر نہیں آتی۔

کلیاتِ اقبال فارسی کی اولین اشاعت سے قبل:

۱۔ اسرار و رموز کا دسواں ایڈیشن شائع ہوا جو اقبال کی وفات کے دس سال بعد طبع چہارم ۱۹۴۸ء میں ازسرِ نو کتابت کے ذریعہ شائع کیا گیا۔

۲۔ پیامِ مشرق کا ۱۳ واں ایڈیشن شائع ہوا جو اقبال کی وفات کے چار برس بعد طبع چہارم ۱۹۴۲ء کے لیے ازسرِ نو کتابت سے تیار شدہ پلیٹوں سے شائع کیا گیا۔

۳۔ زبورِ عجم کا ۸ واں ایڈیشن شائع ہوا جو اقبال کی وفات کے دس برس بعد طبع چہارم ۱۹۴۸ء کے لیے ازسرِ نو کی گئی کتابت کے ذریعہ تیار شدہ پلیٹوں سے شائع کیا گیا۔

۴۔ جاوید نامہ کا ۷ واں ایڈیشن شائع ہوا جو علامہ اقبال کی وفات کے ۹ برس بعد طبع دوم ۱۹۴۸ء کے لیے کی گئی کتابت اور پلیٹوں کے ذریعہ طبع ہوا۔

۵۔ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق مع مسافر" کا ۷ واں ایڈیشن شائع ہوا جو اقبال کی وفات کے ۶ برس بعد طبع دوم ۱۹۴۴ء کے لیے نئی کتابت سے تیار شدہ پلیٹوں سے طبع ہوا۔

۶۔ ارمغانِ حجاز کی کتابت و طباعت اقبال کی وفات کے بعد ہوئی۔

اس جائزے سے جاوید اقبال کی یہ بات غلط قرار پاتی ہے کہ "کلامِ اقبال کے اب تک جتنے ایڈیشن شائع ہوئے وہ سب کے سب انھیں پلیٹوں سے طبع ہوئے جنھیں حضرت علامہ مرحوم نے خود اپنی نگرانی میں تیار کروایا تھا" (کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۵)

کلیاتِ اقبال اردو کی ترتیب و تدوین میں جو خامیاں اور نقائص رہ گئے ہیں، فارسی کلیات کا حال بھی وہی ہے۔ تدوین کے تحقیقی ضابطوں اور سائنٹفک طریقہ کار کی کمی دونوں کلیات میں نظر آتی ہے۔ کتابت و طباعت اور گیٹ اپ وغیرہ کی خوبصورتی اپنی جگہ لیکن صحتِ متن اور اس کے اعلیٰ معیار کی اہمیت

بھی کسی طرح کم نہیں۔ اقبال کی شاعری کا اردو کلیات ہو یا فارسی، جمع و ترتیب کا کام بے حد دشوار اور دقت طلب ہے۔ یہاں بعض اہم امور کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

[الف] مختلف فارسی مجموعوں کے کل ۲۲۳۱ صفحات کے مقابلے میں سارا فارسی کلام ۸ + ۱۰۲۸ صفحات میں سما گیا ہے تاہم اس سے مختلف ایڈیشنوں کی یکسانیت و انفرادیت ختم ہو گئی۔ اب کسی نظم یا شعر کا حوالہ دیتے ہوئے ایڈیشن اور سالِ اشاعت کا ذکر ضروری ہو گیا ہے۔

[ب] الگ الگ مجموعوں کے آغاز میں نہ ان کے طبع اول اور نہ ہی بعد کے ایڈیشنوں کی تفصیل دی گئی ہے۔
اسرار و رموز، زبورِ عجم، مسافر اور ارمغانِ حجاز میں فہرستِ مضامین موجود نہیں، کلیات کے لیے از سرِ نو کتابت کے موقع پر فہرستِ مضامین کا اضافہ کچھ مشکل نہ تھا۔

[ج] مثنوی پس چہ باید کرد اور مسافر، یکجا صورت میں شائع ہوتی رہی تھیں لیکن دونوں مثنویوں کی اپنی علاحدہ انفرادی حیثیت بھی ہے لہٰذا دونوں مثنویوں کا نمبر شمار مسلسل نہیں ہونا چاہیئے تھا جیسا کہ کلیات میں ہے۔

[د] مسافر ۱۹۳۴ء اور پس چہ باید کرد ۔۔۔۔ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی، ترتیب زمانی کے پیش نظر کلیات میں تاریخی ترتیب ضروری تھی۔
اقبال کی وفات کے بعد ان کے جو شعری مجموعے شائع ہوئے ان میں ترتیب و تدوین کے بعض نقائص راہ پا گئے تھے اور کہیں بھی کسی بھی ایڈیشن میں ترمیم یا حذف و اضافوں کے متعلق کوئی حوالے نہیں دیے گئے تھے۔ مثلاً:

[۱] جاوید نامہ، طبع دوم [۱۹۴۷ء] میں طبع اوّل [۱۹۳۲ء] کے دو شعر بہ طور دیباچہ کو حذف کر دیا گیا تھا، کلیات میں اس غلطی کی اصلاح نہیں کی گئی۔

[۲] مسافر طبع اول [۱۹۳۴ء] کے سرورق پر موجود عبارت کو ۱۹۴۴ء کے ایڈیشن میں حذف کر دیا گیا تھا۔ کلیات میں اس عبارت کو شامل کر لینا چاہیئے تھا۔

کلیاتِ فارسی میں اغلاط کا تناسب کلیاتِ اردو کے مقابلے میں زیادہ ہے بلکہ کلیاتِ فارسی سے قبل اشاعت پذیر ہونے والے کسی بھی نسخے میں اغلاط کی وہ کثرت نظر نہیں آتی جس سے کلیات فارسی مملو ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق کے مطابق کلیاتِ فارسی میں سابقہ ایڈیشنوں میں موجود اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے ان کی تعداد ۴۶ ہے۔ تاہم املا اور کتابت کی بہت سی ایسی اغلاط کی صحت نہیں ہو سکی ہے جو قدیم نسخوں میں موجود تھیں علاوہ ازیں بعض اغلاط کی صورت بدل گئی ہے۔ ایسی غلطیوں کی تعداد ۷۰ ہے۔

کلیاتِ فارسی میں بہت سی نئی اغلاط رونما ہو گئی ہیں۔ مرزا ہادی علی بیگ وامق ترابی نے "کلیاتِ اقبال" میں کتابت کی غلطیاں [مطبوعہ: اردو ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۷۸ء] کے زیرِ عنوان بہت سی اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر محمد ریاض نے اپنے مکتوب بنام رفیع الدین ہاشمی [محررہ ۱۵ جولائی ۱۹۷۷ء] میں بھی بعض اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ ایسی تمام اغلاط کی مجموعی تعداد ۱۴۲ بنتی ہے اور یہ معمولی غلطیاں نہیں ہیں۔

املا کے انتشارات و تضادات، اعراب و توقیف نگاری کے سلسلے میں بے توجہی اور املا کی مجموعی بے ضابطگی اور عیوب کے اعتبار سے کلیاتِ فارسی، کلیاتِ اردو سے بہت آگے ہے۔ املا کے سلسلے میں کوئی اصول و ضابطہ وضع نہیں کیا گیا۔ صحتِ متن اور صحتِ املا یہ دونوں بے پناہ کاوش اور دیدہ ریزی کے متقاضی ہوتے ہیں ان کے بغیر کوئی کتاب یا شعری مجموعہ معیاری نہیں بن سکتا۔ کلاسیکی فارسی کے طرزِ املا کو برقرار رکھنے میں بھی آج ہند و پاک میں جو معیاری املا مروّج ہے اس کی پابندی ضروری ہے۔

کلیاتِ فارسی کے آخر میں ۲۸ صفحات کا ایک اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے یہ بھی کلیاتِ اردو ہی کی طرح غیر معیاری اور اغلاط سے پُر ہے۔ یہ اشاریہ ناقابلِ اصلاح ہے اس کی جگہ ایک نیا اشاریہ تیار کرنا زیادہ آسان ہے۔

ایران میں کلیاتِ اقبال فارسی شائع ہو چکا ہے [مرتبہ: احمد سروش، مطبوعہ تہران طبع اوّل ۱۹۶۳ء، طبع دوم ۱۹۶۷ء]
کلیاتِ اقبال فارسی، ایران کے مروّجہ فارسی املا کے مطابق شائع کیا گیا ہے۔ جدید ایرانی فارسی ادبیات میں لہجے کی تبدیلی نے املا میں بعض بنیادی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ قدیم کلاسیکی اور ہند و پاکستانی لہجے کے برعکس آج کل ایران میں حروف اور مجہول آوازوں میں امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ وہاں تو زمتہ

کی آواز بھی ختم ہو چکی ہے مگر ہندو پاک میں آوازوں کی تفریق اور اس کے نتیجہ میں اختلافِ نگارش اب بھی موجود ہے، ظاہر ہے کہ یہ اردو املا کے مسائل ہی سے جڑا ہوا ہے، بقول رشید حسن خاں:

"املا اور تلفظ، دونوں میں معروف مجہول اور غنہ آوازوں کا املا ملحوظ رکھا جائے گا، اور اگر کوئی شخص فارسی جدید کی تقلید میں، اس کے خلاف کرے گا تو یہ طریقہ اصولِ تدوین کے قطعاً خلاف ہوگا۔" [اردو املا، ص: ۵۹۵]

کلیاتِ اقبال فارسی میں قدیم کلاسیکی فارسی کے طرزِ املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

- کلیات کا عام طور پر مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی شاعر کے متداول اور غیر متداول دونوں ہی طرح کے کلام کو پوری چھان پھٹک کے ساتھ جمع کیا جائے اور یہ کسی بھی مدوّن نگار کی بہت بڑی ذمّہ داری ہے کہ وہ تمام دستیاب مدوّن کلام اور غیر مدوّن کلام کے ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ سے پورے تحقیقی شعور کے ساتھ گذرے۔ اقبال جیسے بلند اور عبقری شاعر کے لیے تو اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کا اردو فارسی کلام نہایت ہی اعلیٰ اور معیاری متن کے ساتھ شائع کیا جائے۔ اس کے لیے بہت ضروری بلکہ ناگزیر ہے کہ:

ہندو پاک کے ماہر اقبالیات کا ایک بورڈ تشکیل دیا جائے تاکہ صحیح متن ترتیب دیا جا سکے۔
علامہ اقبال کی بیاضوں اور ان کی زندگی میں شائع ہوئے ان کے شعری مجموعوں کا تقابلی جائزہ لیا جائے۔
وفات کے بعد کے ترمیم شدہ ایڈیشن اور کتب و رسائل میں شائع شدہ کلام کو بھی سامنے رکھا جائے
کلیات میں شامل تمام اردو فارسی شعری مجموعوں کی انفرادی حیثیت کو اس طرح برقرار رکھا جائے کہ ان کے سرورق، نمبر شمار، سرنامہ، فہرست اور تمام ایڈیشنوں کی صراحتیں مع دیگر توضیحات کے آجائیں۔
نہایت ہی معیاری، بامعنیٰ اور پُر از معلومات اشاریہ ترتیب دیا جائے۔
زبان و املا کے ماہرین سے کلامِ اقبال کی تدوین کے لیے معیاری املا کے اصول وضع کروائے جائیں اور پھر انھیں کی پابندی کی جائے۔

❁

کلّیاتِ اقبال

[مرتبہ: مولوی محمد عبدالرزّاق]

علامہ اقبال کا کلام انجمن حمایت اسلام کے جلسوں، اور رسالہ مخزن کے علاوہ بعض رسائل و جرائد کے ذریعہ چہار سمتوں میں خوشبو کی طرح پھیلا اور مقبول و معروف ہوا، اس کے نتیجے میں شائقینِ اقبال اور مداحینِ اقبال ان کا کلام جمع کرنے لگے۔ متعدد احباب و مداحین کو اس کلام کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا لیکن حقوق اشاعت کے معاملے میں اقبال خاصہ سخت نقطۂ نظر رکھتے تھے۔

۱۔ "اگر کوئی میرا کلام میری اجازت کے بغیر چھاپے تو اس پہ دعویٰ کر دیا جائے۔" [بنام محمد دین فوق، انوارِ اقبال: ص ۶۲]

۲۔ عبدالمجید سالک نے بلا اجازتِ اقبال کی نظم شائع کی تو انھیں قانونی نوٹس بھیج دیا۔ [یارانِ کہن، ص: ۳۲، ۳۳]

۳۔ شیخ اعجاز احمد [برادر زادۂ اقبال] کے دوست مشتاق احمد کو اردو کلام کا مجموعہ شائع کرنے کی اجازت نہیں ملی۔

[روزگارِ فقیر دوم، ص: ۲۱۸]

اردو کلام کا اولین مجموعہ بانگِ درا [۱۹۲۴ء] کی اشاعت کے لیے اقبال کے پاس اپنا کلام موجود نہیں تھا اور مقدار میں بھی کم تھا:

"ترتیب اشعار کی خود مجھے فکر ہو رہی ہے۔ مگر یہ خیال ہے کہ ابھی کلام کی مقدار تھوڑی ہے۔"

[بنام منشی سراج الدین، ۱۱ مارچ ۱۹۰۲ء، اقبال نامہ، اوّل، ص ۲۱]

"افسوس ہے کہ میرے پاس بہت سی نظمیں نہیں ہیں، اب مجموعہ مرتب کرنے کی کوشش میں ہوں کہ اشاعت کروں۔"

[بنام سید فصیح اللہ کاظمی، ۲۳ فروری ۱۹۱۷ء، خطوطِ اقبال، ص ۱۲۹]

کلیاتِ اقبال مرتب عبدالرزاق
مطبوعہ ۱۳۴۳ھ کے چند صفحات کا عکس

کلیاتِ اقبال

یعنی

ترجمانِ حقیقت سر ڈاکٹر محمد اقبال کے اردو کلام کا مجموعہ

جس کے ساتھ ان کی

(۱) زندگی کے حالات (۲) شاعری کی خصوصیات اور (۳) تصانیف کی تصریحات میں

دیباچہ (۱۳۶) صفحوں پر مشتمل ہے

مرتبہ

عالیجناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب ایچ۔ سی۔ ایس

اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل سلطنتِ آصفیہ

مطبوعہ

عماد پریس حیدر آباد دکن

حجم (۴۹۶) صفحے — سنہ ۱۳۴۳ ہجری

۷

۲۸۶

چکیدۂ کلکِ جواہر سلکِ علامہ عبداللہ العمادی رکن منصرم ناظر کتب مذہبی دار الترجمہ سرکارِ عالی

آج جب کہ ہماری شاعری گرفت و گیر کی نزاکت میں عیارانہ مشاقی پیدا کرنے کے لئے اس طرح گرگھونگرو کوئی سپاگل کا "بولے" پر زور دے رہی ہے اور جب چھم سے چلیں گرو میں چھکے سے انطالو کے فلسفہ کی عملی تعلیم دینے پر آمادہ ہے "سخن بھی کو دعوے ہے کہ واعظ کے مونہہ پہ مہر لگا دوں کباب کی" اور سخن سنج پہ مستزاد الاپ رہا ہے کہ "ڈاڑھی کو دیا اس کے لگا بڑ تھونا۔ اور بجنے لگی گت" اس وقت یہ عرض کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ ہماری یہی شاعری کبھی ملکی و قومی اغراض کے تابع تھی اور اسلام کی علم برداری کا کام اس نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ انتقام اہل بیت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کمیت سے ایک قصیدہ لکھاتا ہے جس کے اثر سے دمشق سے لیکر اندلس تک تلواریں چل جاتی ہیں، دولت بنی امیہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور عباسیوں کے لئے پیش قدمی کا راستہ صاف ہو جاتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

۱۔ اقبال کے مختصر حالات

نام اور وطن | شاعر عدیم المثال ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کا تعلق کشمیر جنت نظیر کے ایک معزز اور قدیم خاندان سے ہے وہ خود اپنے اصلی وطن کا ذکر کم سنی کے قطعات میں اس طرح کرتے ہیں۔

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور | یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر | بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے | اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد | جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مے دو آتشہ

غزلیات

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا | سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے | بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر | جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا | سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا | ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا
جنھوں نے میری زبان گویا کو کشتۂ شان صدا بنایا | مراد دل چھیڑ کر جو دیکھیں تو وہں سکوت مزار ہوگا
چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو | یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بہ گل ہیں | تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا
یہ رسم بزم فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبش نظر بھی | رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
شبنم ہے غیرت نمود کچھ بھی جو دم عا تیری زندگی کا | تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے | برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا

چنانچہ احباب کی بیاضوں سے مدد لی گئی اور بانگِ درا کی اشاعت عمل میں آئی جس کا خیال انھیں بہت پہلے سے تھا۔

انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں پڑھی جانے والی نظمیں کتابچے کی صورت میں شائع کر کے جلسے والے دن تقسیم ہوا کرتی تھیں، یہی نظمیں مخزن، زمیندار، وغیرہ رسائل میں شائع بھی ہوتی تھیں۔

شائقینِ اقبال کی ایسی ہی بیاضوں میں سے دو بیاضیں، عبدالصمد خان [حیدرآباد] کے کتب خانے سے ڈاکٹر گیان چند کو دستیاب ہوئیں لیکن ایسی ہی بیاضوں میں سے ایک بیاض اور اس کے راقم ممدوحِ اقبال مولوی محمد عبدالرزاق نے بہ عنوان کلیاتِ اقبال ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں بانگِ درا کی اشاعت سے قبل ہی مرتب کر کے شائع کروا دی۔ اس سے قبل مولوی احمد دین کی تصنیف اقبال چھپ کر آ گئی تھی جس میں اردو کلام کا معتدبہ حصہ شامل تھا۔ اقبال نے اسے پسند نہیں کیا چنانچہ مصنف نے کتاب ضائع کر دی۔ مولوی عبدالرزاق نے کلیاتِ اقبال شائع تو کیا لیکن اقبال کی اجازت کے بغیر۔ اس غیر قانونی اشاعت کے خلاف قانونی چارہ جوئی آسان نہ تھی کیوں کہ دکن میں برطانوی قانونِ تحفظ کی اشاعت لاگو نہ ہوتا تھا بالآخر سر اکبر حیدری کی کوششوں سے کتاب کی فروخت دکن تک محدود کر دی گئی۔ [انوار اقبال، ص: ۳۱، ۳۲۔ کلیاتِ اقبال کی سرگذشت از عبدالواحد معینی مشمولہ: نقوشِ اقبال، ص ۶۵/۸۴] یہی وجہ ہے کہ مذکورہ کلیات اقبال کا تصانیف اقبال میں شمار نہیں ہوتا تاہم ماخذِ اقبال کے بطور اور اقبال کی حیات میں کلیات کی اشاعت کے سبب اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بانگِ درا سے قبل کے ابتدائی متن کے لیے اقبال کی ذاتی بیاضوں کے علاوہ کتب و رسائل اور قلمی بیاضوں کی چھان پھٹک ضروری ہے۔ پھر یہ کہ باقیاتِ اقبال کی کتابوں میں فوری ماخذات کی نشان دہی بھی تصحیح طلب ہے۔

چونکہ مذکورہ کلیاتِ اقبال تقریباً نایاب ہے اس لیے قارئین شاعر کی دلچسپی کے لیے یہاں اس کتاب کا صرف تعارف پیش کیا جا رہا ہے، ممکن ہوا تو اقبال نمبر ۲ میں باقیات اقبال کے مکمل جائزے کے ساتھ اس کلیات کا عکس بھی شائع کیا جائے گا۔

سرورق کی دوسری پشت پر "سخن ہائے گفتنی" کے زیرِ عنوان کتاب کے متعلق چند ضروری امور بیان کیے گئے ہیں ان میں:
دیباچے کے مسودے میں اختصار و تصرف اور اقبال کی چند ترمیم شدہ نظموں کی شمولیت کے ذکر کے علاوہ یہ بتایا گیا ہے کہ کلیات میں شامل کلامِ اقبال رسالہ مخزن اور اخبار زمیندار سے لیا گیا ہے۔ نظموں اور شعروں کے انتخاب میں ہر سخن ور اور ہر سخن فہم کے مذاق کا خیال رکھا گیا ہے۔ رسم الخط کا خاص خیال رکھنے کی طرف اشارہ ہے لیکن مرتب کلیات کی دکن سے غیر حاضری اور علالت کے سبب ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ یہ سلسلہ تیسرے سرورق تک پھیلا ہوا ہے۔ چوتھے یعنی آخری سرورق پر کلیاتِ اقبال ہی کے متعلق اس کی تعریف اور غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔

صفحہ نمبر ۱ تا ۴ "صحت نامہ کلیات اقبال" دیا گیا ہے جس میں ۱۵۸ اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہاں سے صفحہ نمبر کا شمار ۱ تا ۵ فہرستِ کلیاتِ اقبال دی گئی ہے۔ صفحہ نمبر ۶ خالی ہے۔ صفحہ نمبر ۷ تا ۱۱ علامہ عبداللہ عمادی کی تقریظ دی گئی ہے۔ علامہ عمادی مرحوم نے اقبال کے دور کی انحطاط پذیر شاعری کا ذکر فارسی اور عربی کی اعلیٰ ترین شاعری کا احوال اور شعری مثالیں دی ہیں۔ عربی فارسی کی معیاری عظیم شاعری کی روش کا آغاز اردو میں اقبال کی شاعری سے ہوا۔ علامہ عمادی نے اقبال کی شاعری کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

صفحہ ۱۳ تا ۲۶ کے تحت "تقریب" کے زیرِ عنوان دکن سے شائع ہونے والے مذکورہ "کلیات اقبال" کے بارے میں چند صراحتیں کی گئی ہیں:

> "یہ مجموعہ تقریباً ایک برس سے زیرِ طبع تھا، اس اثنا میں بہت لوگ مشتاق تھے اور روز بروز تقاضہ کرتے تھے کہ یہ مطبع سے جلد نکل آئے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنی جگہ پیچ و تاب کھاتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ یہ کتاب حیدرآباد میں چھپے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرت کو اس پردے میں بھی اقبال کے حسنِ قبول کا ثبوت دینا منظور تھا۔"

اقبال کا کلام لوگ نہ صرف یہ کہ جمع کرتے تھے بلکہ اس کی اشاعت کے اپنے طور پر خواہاں تھے یا پھر اقبال سے اصرار کرتے تھے کہ وہ جلد از جلد اپنا اردو کلام شائع کروائیں۔ اقبال نے اپنے ایک طویل ترین انگریزی مکتوب بنام عطیہ فیضی، محررہ ۷ اپریل ۱۹۱۰ء میں تحریر کیا تھا:

> " I HAVE BEEN RECEIVING LETTERS FROM VARIOUS PARTS OF THE COUNTRY TOOBRING OUT MY POEMS IN BOOK FORM ".
>
> (LETTERS TO ATIYA. PAGE: 66.)

چنانچہ اقبال کے اردو کلام کے اولین یکجائی اشاعت کے لیے مداحین کا بےقرار ہونا، اصرار کرنا، اور کلیاتِ اقبال کا شدید انتظار اپنی جگہ بالکل درست ہے ۔ تقریب نگار نے ایک اور بات کی صراحت کی ہے:

”لوگوں کو عام طور پر شاید یہ بات معلوم نہ ہو کہ ہندستان کے ہر خطے میں چند اصحاب ایسے موجود ہیں جو یا تو حافظ اقبال ہیں یا نہایت شوق سے اقبال کا کلام جمع کرتے ہیں۔ میں بھی مدت سے ایک بیاض میں ان کی نظمیں جمع کر رہا تھا۔ اس بیاض کو لوگ مجھ سے مانگ مانگ کر لے جاتے تھے اور ان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر میں اس کے مستعار دینے میں کبھی تامل نہ کرتا تھا لیکن یہ اتفاق سے گم ہو گئی۔ عجب نہیں جو کسی نے ”در کعبہ بدزد اگر بیابی“ پر عمل کیا ہو۔ اس میں تقریباً دو سو نظموں کے علاوہ جن میں غزلیں بھی شامل تھیں اور بہت سا بکار آمد مواد تھا۔“

یہاں اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اقبال کا کلام ان کے مداح اپنی اپنی بیاضوں میں جمع کرتے تھے۔ مولوی عبدالرزاق کی گم شدہ بیاض یا تو ضائع ہو گئی یا کہیں کسی ذاتی کتب خانے میں موجود ہو گی۔ اس بیاض کی خصوصیات بتاتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں:

۱ ـــ کونسی نظم کس سنہ میں لکھی گئی، کب، کس موقع پر اور کہاں پڑھی گئی۔

۲ ـــ کونسی نظم ہندوستان سے گذر کر دنیا کے کس کس ملک میں پہنچی، وہاں اس کا ترجمہ کس زبان میں، اور کس رسالے یا اخبار میں شائع ہوا اور اس پر کس کس نے تنقید کی۔

۳ ـــ نظم لکھنے کے کون سے اسباب محرک ہوئے۔

۴ ـــ نظم کی بنیاد کلام مجید کی کس آیت یا فلسفے کے کس مسئلے پر ہے۔

۵ ـــ نظموں سے متعلق معتبر روایتیں کیا کیا ہیں۔

ان خصوصیات بیاض کی توضیح میں چند ایک مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ ایسی مثالوں میں ۱۹۱۲ء میں انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں مشہور نظم ”شمع و شاعر“ کے پڑھے جانے کا احوال ہے۔ توضیحات کی ایسی ۹ مثالوں میں نظمیں درج کی گئی ہیں۔

تقریب نگار نے کلیات اقبال کے ۶ ابواب کا تعین کیا ہے:

اوّل: دیباچہ جو ان ابواب پر منقسم ہے۔ [الف] اقبال کے مختصر حالات [اس پر نوٹ نمبر۱ اور حاشیے میں درج ہے ۔”اس کا کچھ حصہ کشمیری میگزین سے ماخوذ ہے“]۔ [ب] اقبال کی شاعری [اس پر نوٹ نمبر۲ کے تحت حاشیے میں تحریر کیا گیا ہے کہ: اس مضمون کے تحت تنقید پیش کی جاتی لیکن دیباچے میں اضافے کی گنجائش نہیں اس لیے تنقیدی مضمون علاحدہ شائع ہوگا جس میں اقبال کا موازنہ دنیا کے دوسرے شاعروں کے ساتھ کیا گیا ہے]۔ [ج] اقبال کی تصنیفات۔

دوّم: مے دو آتشہ۔ یعنی غزلیات جن میں مشرقی اور مغربی شاعری کا امتزاج نہایت نفیس ہے۔

سوّم: نکات ۔ یعنی ظرافت آمیز لیکن خرد آموز اشعار۔

چہارم: نقشِ قدرت۔ یعنی مناظر قدرت کی جیتی جاگتی تصویریں۔

پنجم: فانوسِ حیات۔ پانچویں اور چھٹے حصوں کی نظمیں، حقائق و معارف کا گنجینہ ہیں۔

ششم: شمع طور۔ ہر حصے کی ابتدا میں وہ نظمیں ہیں جو عام جذبات پر مبنی ہیں اور آخر میں وہ جن میں اقبال اسلامی لباس میں جلوہ گر ہیں۔

دیباچہ کا شمار نمبر۱ سے ہوتا ہے جو ۱۳۶ صفحات کو محیط ہے۔ یہ طویل دیباچہ اپنے آپ میں ایک مبسوط کتاب ہی ہے۔ غالباً اقبال پر اتنی تفصیل سے اس سے قبل کوئی مقالہ شائع نہیں ہوا تھا۔ دیباچہ میں شامل لوازمہ بعد میں مختلف کتابوں اور تنقیدی تحقیقی مضامین میں آچکا ہے تاہم اقبال کے متعلق ابتدائی تحریروں کے بطور اس کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا جانا ابھی باقی ہے۔

کلام اقبال کا باب کتاب کے آخر میں ہے اور صفحہ نمبر کا شمار ۱ سے ہوتا ہے اس طرح ۳۲۶ صفحات پر کلام محیط ہے۔

کلیات میں شامل اقبال کے کلام کا تحقیقی جائزہ بانگِ درا کی روشنی میں کیا جا چکا ہے اور باقیاتِ اقبال کی کتابوں میں منسوخ و متروک کلام جمع کر دیا گیا ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر گیان چند جین کی تالیف "ابتدائی کلامِ اقبال۔ بہ ترتیب ماہ و سال" میں نو دریافت بیاضوں کے حوالے سے کلیاتِ اقبال از عبدالرزاق کا جائزہ بھی لیا ہے تاہم اس کلیات کو چونکہ اوّلیت کا درجہ حاصل ہے لہٰذا اس کا مکمل تحقیقی و توضیحی جائزہ ابھی لیا جانا باقی ہے۔

بقول مصنف کلیات اقبال میں اقبال کے کم و بیش ۳ ہزار شعر شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کا حجم ۳۹۶ صفحات ہے اور ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی۔ قیمت درج نہیں ہے۔

اقبال

[از: مولوی احمد دین ——— مرتبہ: مشفق خواجہ]

علامہ اقبال کی حیات میں شائع ہونے والی اوّلین مبسوط کتاب "اقبال" ہے جو ۱۹۲۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی اور جس کے مؤلف مولوی احمد دین [پ: ۱۸۶۶ء - م: ۱۹۲۹ء] تھے۔ علامہ اقبال کے احباب میں قریب ترین اور سرفہرست۔ یہ وہی مولوی احمد دین ہیں جن کی ایک بے حد مقبول و معروف کتاب کا نام "سرگذشتِ الفاظ" [مطبوعہ ۱۹۲۳ء] ہے۔ کتاب اقبال سے قبل اقبال پر چند ایک مضامین اور ایک مختصر کتابچہ A VOICE FROM THE EAST. [مطبوعہ ۱۹۲۲ء، مرکنٹائل پریس، لاہور۔ ص: ۷۴۔ طبع دوم ۱۹۶۶ء اقبال اکادمی، پاکستان۔ کراچی] انگریزی میں شائع ہو چکی تھی لیکن کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جو اقبال کے ذہنی ارتقاء، نکتہ دفن اور شعری کارناموں کو پوری تفصیل کے ساتھ اجاگر کرپاتی۔ اس اعتبار سے یہ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے لیکن طبع اوّل کے ساتھ ایک تاریخی واقعہ پیش ہوا اور مصنف نے کتاب کے تمام نسخے نذرِ آتش کر دیئے۔ کیوں کہ علامہ اقبال نے اس کتاب کو ناپسند فرمایا تھا۔

کلیاتِ اقبال از مولوی عبدالرزاق کے ذکر میں اقبال کے اس رویّہ کی تفصیل دی جا چکی ہے۔ علامہ اقبال کو جب اس حادثہ کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے دلی افسوس کا اظہار کیا۔ بانگِ درا ۱۹۲۴ء میں طبع ہوئی۔ اس کی اشاعت کے بعد مولوی احمد دین نے ۱۹۲۶ء میں اپنی کتاب اقبال کو از سرِ نو لکھا اور شائع کیا۔ اردو دنیا میں یہی طبع دوّم زیادہ معروف ہے حالاں کہ "اقبال" کے سرورق پر طبع اوّل ہی تحریر کیا گیا ہے لیکن تلف شدہ طبع اوّل کے دو نسخے مشفق خواجہ صاحب کی تحقیق کے مطابق، مصنف کے گھرانے میں موجود ہیں۔

علامہ اقبال پر نایاب اس اوّلین کتاب کو مشہور محقق مشفق خواجہ نے ۱۹۷۹ء میں مرتب کر کے شائع کر دیا۔ مصنف مولوی احمد دین، کتاب "اقبال" اور اس میں درج تمام تحقیقی مواد ہی سے استفادہ کرتے ہوئے بعض ضروری امور بہ طورِ تعارفِ کتاب، مشفق خواجہ صاحب کے حوالے سے تحریر کیے جا رہے ہیں۔

کتاب "اقبال" کے بارے میں مشفق خواجہ تحریر کرتے ہیں:

> بہت دن ہوئے میں نے احمد دین کی مشہور تصنیف "سرگذشت الفاظ" پڑھی تھی۔ یہ کتاب مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں نے اس کے مصنف کی دوسری کتابوں کی تلاش شروع کی۔ اس طرح ان کی کئی کتابیں میری نظر سے گذریں۔ پھر مجھے احمد دین کے حالات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ تقریباً تین برس کی تلاش و تحقیق کے بعد میں نے ان کے حالاتِ زندگی اور علمی کاموں کے بارے میں ایک مقالہ لکھا جو "اقبال اکادمی" کے جریدے "اقبال ریویو" بابت جولائی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس مقالے کے لکھے جانے کے وقت مجھے کتاب اقبال کی طبع اوّل نہیں مل سکی تھی، اس لیے میں نے ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ مذکورہ مقالے کی اشاعت کے بعد مجھے اپنے برادر بزرگ خواجہ عبدالقدیر صاحب کی سعی و کوشش سے طبع اوّل کا ایک نہایت بوسیدہ اوراب

جملہ حقوق محفوظ

اِقبال

علامہ سر محمد اقبال کی زندگی ان کے مقصد شاعری
اور خیالات کے نشوونما، مضامین کلام اور طرز بیان

ایک نظر

از

مولوی احمد الدین بی اے ایڈووکیٹ۔ لاہور

مؤلف

"سرگزشت الفاظ"

سنہ ۱۹۲۶ء

بار اول (۱۰۰۰) — قیمت [illegible]

اقبال طبع دوم سرورق

اقبال، طبع دوم
مطبوعہ ۱۹۲۴ء
کا سرورق

کلامِ اقبال

انیسویں صدی عیسوی کا آخری عشرہ ختم ہونے کے قریب گزر رہا
تھا۔ شہر لاہور کے بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں ایک
مشاعرہ کی طرح ڈالی گئی۔ مجلس مشاعرہ حکیم امین الدین صاحب مرحوم
بیرسٹر کے مکان پر جو اسی خاندان حکیماں کے ایک نامور رکن
تھے جن کے نام پر بازار مشہور ہے منعقد ہوا کرتی تھی۔ یہ مجلس
اسی خاندان کے بزرگ حکیم شہاب الدین صاحب مرحوم نے
میرزا ارشد گورگانی و میر ناظر حسین ناظم مشاعرہ کی سعی رواں تھے
یہ دونوں بزرگ خود بھی شعر کہا کرتے تھے اور ان کے شاگردوں اور
نیاز مندوں کی ایک دوسرے کے مقابلہ میں طبع آزمائیاں مشاعرہ

اقبال طبع اوّل ۱۹۲۳ء کا پہلا صفحہ

برگ گل رنگیں ز مضمون من است
مصرع من قطرۂ خون من است
تا نپنداری سخن دیوانگیست
در کمال این جنون فرزانگیست
از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند
در دیار ہند خوارم کردہ اند
لالہ و گل از نوایم بے نصیب
طائرم در گلستان خود غریب
بسکہ گردون سفلہ و دوں پرور است
وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است

کتبہ: عبدالمجید [illegible]

اقبال طبع اول کا آخری صفحہ

رسیدہ نسخہ ملا۔ یہ نسخہ جناب خالد نیاز [مولوی احمد دین کے پوتے] سے مستعار لیا گیا تھا۔ میں نے اس کا عکس حاصل کر لیا۔ بدقسمتی سے اس نسخے میں متعدد اوراق کم تھے۔ یہ کمی بعد میں خواجہ اعجاز احمد [مولوی احمد دین کے بیٹے] کے نسخے سے پوری کی گئی۔" [دیباچہ کتاب مذکور، ص: ۱۹]

مولوی احمد دین کے بارے میں مشفق خواجہ تحریر کرتے ہیں:

"۔۔۔ آج احمد دین کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ ان کے مفصل حالات زندگی تو کیا مختصر حالات بھی عام طور پر معلوم نہیں ہیں۔ اردو ادب کی تاریخوں میں کہیں ان کا نام نظر نہیں آتا بعض مضامین اور ایک دو کتابوں میں ان کا ذکر اقبال کے ایک دوست کی حیثیت سے ضرور آیا ہے لیکن ان تحریروں سے احمد دین کے حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ محمد دین فوق نے تاریخ اقوامِ کشمیر میں ان کے بارے میں چند سطریں لکھی ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ ایک ادیب تھے بلکہ اس لیے کہ وہ کشمیری تھے۔ "نقوش" کے لاہور نمبر میں مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے فوق کے بیان کو دہرایا ہے، اپنی طرف سے ایک لفظ کا اضافہ نہیں کیا۔ ایسی صورت میں احمد دین کی داستانِ حیات کو تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ بکھرے ہوئے اشارات اور احمد دین کے بعض جاننے والوں کے بیانات کے سہارے ایک سوانحی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ خاکہ بھی بڑی حد تک ادھورا ہے جسے مکمل کرنے کے لیے مزید تحقیق اور چھان بین کی ضرورت ہے۔" [مقدمہ از کتاب مذکور، ص: ۲۳]

۱۹۷۹ء میں مشفق خواجہ نے کتاب اقبال کا تیسرا ایڈیشن مرتب کر کے شائع کیا اور مولوی احمد دین کے متعلق ۸۲ صفحات کو محیط ایک تفصیلی مطالعہ کتاب میں شامل کیا۔ خواجہ صاحب کی تحقیق کے مطابق مولوی احمد دین کی چھوٹی بڑی تصانیف کی مجموعی تعداد ۲۵ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر سوانح عمریاں ہیں لیکن انہوں نے تنقید، تاریخ، انشائیہ، ناول اور لسانیات کے باب میں اپنے فکر و فن کے نقوش چھوڑے ہیں۔

کتاب اقبال کے طبع اول و دوم کے متعلق مشفق خواجہ نے تحریر کیا ہے:

"طبع اول اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں اقبال کا بہت سا ایسا کلام موجود ہے جسے اقبال نے اپنے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں کیا نیز "بانگِ درا" میں شامل بعض نظموں کے ابتدائی متون اس میں ملتے ہیں۔ اقبال کے متروک کلام اور اصلاحوں پر جن لوگوں نے کام کیا ہے ان میں سے کسی کے پیشِ نظر "اقبال" طبع اول نہ تھی۔ اس کتاب سے متروک کلام اور اصلاحوں کے بارے میں بعض نئے اور مفید پہلو سامنے آتے ہیں۔ طبع اول میں بعض تنقیدی مباحث ایسے بھی ملتے ہیں جو اس کتاب کی طبع دوم میں شامل نہیں کیے گئے۔ ان وجوہ کی بنا پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ سلسلۂ اقبالیات کی اس گم شدہ کڑی کو ضرور منظر عام پر آنا چاہیئے۔

اب سوال یہ تھا کہ جس کتاب کو مصنف نے از سرِ نو لکھا ہو اس کے ابتدائی متن کو شائع کرنا اور نظر ثانی شدہ متن کو نظر انداز کرنا کہاں تک درست ہے۔ طبع اول اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے اگر دوبارہ شائع ہونے کی مستحق ہے تو طبع دوم بھی اس لائق ہے کہ اسے منظرِ عام پر لایا جائے۔ طبع اول کا خاصا بڑا حصہ طبع دوم میں شامل ہے اور طبع دوم میں متعدد نئے مباحث کا اضافہ کیا گیا ہے اس لیے دونوں طباعتوں کے متن سامنے نہ آئیں اس وقت تک یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ ان میں کیا فرق ہے۔ لیکن اس مقصد کے لیے دونوں طباعتوں کو شائع کرنا اس وجہ سے مناسب نہیں کہ دونوں میں مشترک مباحث خاصی تعداد میں ہیں۔ کافی غور و خوض کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کتاب کا ایک ایسا متن تیار کیا جائے جو دونوں طباعتوں کے مباحث پر مشتمل ہو لیکن ان میں مباحث کی تکرار نہ ہو۔ زیرِ نظر طباعت اسی خیال کی عملی تشکیل ہے۔ میں نے طبع

دوم کے متن کو اس کی اصلی صورت میں رکھا ہے اور طبع اوّل زاید عبارتوں کو اختلافِ نسخ کے تحت اکٹھا کر دیا۔"
طبع دوّم میں مصنّف نے جو تبدیلیاں کی تھیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ طبع اوّل میں ۶ ابواب، طبع دوّم میں صرف تین ابواب رہ گئے۔ طبع اوّل کے جو ۳ ابواب حذف کیے گئے ان میں غزلیات، اکبری رنگ اور مقصدیت شاعری شامل تھے۔ لیکن ان کے مباحث بقیہ ۳ ابواب میں تقسیم کر دیے گئے۔

۲۔ طبع اوّل میں اقبال کا کلام بکثرت جمع کیا گیا تھا۔ کہیں تبصرہ و تجزیہ کرتے ہوئے مثالوں کے طور پر اور کہیں بغیر کسی تبصرے کے۔ غزلیات اور اکبری رنگ کے حذف شدہ ابواب میں صرف کلام درج تھا، تجزیہ یا تبصرہ درج نہیں تھا۔ طبع دوم میں اس کے برعکس کیا گیا یعنی اقبال کے اشعار کم سے کم درج کیے گئے ہیں جہاں بات مکمل کرنے کے لیے اشعار کے حوالے ناگزیر تھے۔

۳۔ طبع اوّل کی تالیف کے وقت اقبال کا وہ سارا کلام جمع کیا گیا جو مصنّف کی دسترس میں تھا۔ طبع دوّم میں سوائے تین نظموں (نالۂ یتیم، ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید کو اور ابرِ گہربار یا فریادِ امّت) کے باقی سارا کلام "بانگِ درا" سے لیا گیا۔ طبع اوّل کا کوئی شعر "بانگِ درا" میں ترمیم شدہ صورت میں ملتا ہے تو "بانگِ درا" کے متن ہی کو ترجیح دی گئی۔

۴۔ طبع اول میں کلام کی زمانی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا، طبع دوّم میں "بانگِ درا" کی تاریخی ترتیب کے مطابق کلام اقبال کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

۵۔ طبع اوّل کے بعض مباحث طبع دوّم سے حذف کر دیے گئے اور متعدد نئے مباحث کا اضافہ کیا گیا۔

۶۔ مشترک مباحث کی عبارات میں بھی جا بجا ترمیم کی گئی۔

۷۔ طبع اوّل کی ضخامت ۲۳۴ صفحات۔ طبع دوم کی ضخامت ۲۸۴ صفحات۔ طبع اوّل کی کتابت جلی اور طبع دوّم کی کتابت خفی۔ یہ فرق صرف کتابت کا نہیں بلکہ طبع اوّل کے بیشتر اشعار اور بعض مباحث حذف کرنے کی وجہ سے بھی ہے۔

کتاب اقبال کے طبع سوم کے متن کی ترتیب و تدوین کے لیے مشفق خواجہ صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا اس کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

۱۔ اختلافِ نسخ کے تحت طبع اوّل کی وہ تمام عبارتیں درج کر دی گئی ہیں جو طبع دوم میں شامل نہیں کی گئیں۔ یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ کونسی عبارت کس مقام سے حذف کی گئی۔

۲۔ کلامِ اقبال کا صرف وہی حصہ اختلافِ نسخ کے تحت درج کیا گیا ہے جو "بانگِ درا" میں شامل نہیں اور اگر شامل ہے تو اس میں اصلاح و ترمیم کی گئی ہے۔ اس قسم کے اشعار کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اصلاحوں اور ترمیموں کی نوعیت کیا ہے۔ اس طرح اختلافِ نسخ کے تحت جہاں اقبال کے متروک کلام کا بہت بڑا حصہ مل جاتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ "بانگِ درا" تک اقبال نے اپنے کلام میں کیا کیا تبدیلیاں کیں۔

۳۔ کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کے سبب اختلافِ نسخ کے تحت بانگِ درا کا کلام کو شامل نہیں کیا گیا تاہم اختلافِ نسخ کے ذیل میں جن مقامات سے بانگِ درا میں درج کلام حذف کیا گیا وہاں بتا دیا گیا ہے کہ کون کون سے بند یا شعر حذف کیے جا رہے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر ربطِ کلام کے لیے بانگِ درا میں شامل اشعار کو درج کرنا ضروری سمجھا گیا ہے ایسے مقامات پر ان اشعار کے ابتدائی الفاظ درج کر دیے گئے ہیں۔ ناگزیر وجوہ کی بنا پر کہیں کہیں "بانگِ درا" کے حوالے سے مکمل اشعار بھی درج کر دیے گئے ہیں۔

۴۔ مصنّف نے طبع دوّم میں جو اضافے کیے ہیں، طبع سوّم میں ان کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

۵۔ مصنّف نے طبع دوّم میں خاصی اصلاح و ترمیم کی تھی۔ کہیں کوئی لفظ بدلا تو کہیں جملے کی ساخت تبدیل کی گئی اور

کہیں اپنے مفہوم کو نئے الفاظ میں بیان کیا۔ طبع سوم میں ان تمام ترمیمات کی نشان دہی کر دی گئی ہے تاکہ مصنف کا ابتدائی متن محفوظ ہو جائے۔

۶۔ طبع اوّل و دوّم کے بعض وضاحت طلب امور اور بغیر حوالوں کے اقتباسات کے حواشی الگ مقامات پر نہیں لکھے گئے بلکہ اختلافِ نسخ کے سلسلے ہی میں متعلقہ مقامات پر ضروری وضاحتیں درج کر دی گئی ہیں۔ اختلافِ نسخ کے متعلق حصّے کا عنوان "اختلافِ نسخ، تعلیقات و حواشی" رکھا گیا ہے۔

۷۔ دونوں طباعتوں میں کتابت کی اغلاط کو طبع سوّم میں درست کر دیا گیا ہے اور حاشیے میں غلطی کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ سہوِ کتابت سے چھوٹے ہوئے الفاظ کو قلابین میں درج کر دیا گیا ہے۔ مقالی اثرات کے تحت تذکیر و تانیث میں مروجہ اردو کی پیروی نہیں کی گئی تھی ایسے تمام مقامات کو طبع سوّم میں اصل کے مطابق رہنے دیا گیا ہے۔

کتاب "اقبال" کا طبع دوم ۱۹۲۶ء میں اسٹیم پریس لاہور سے اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اس کتاب کا پورا نام یوں ہے:
"اقبال۔ علامہ سر محمد اقبال، کی اردو منظومات، ان کے مقصدِ شاعری اور خیالات کے نشو و نما، مضامینِ کلام اور طرزِ بیاں پر ایک نظر"
یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے، کلامِ اقبال، مضامینِ کلام اور طرزِ بیان۔

پہلے حصے میں بتایا گیا ہے کہ اقبال کی ذہنی نشو و نما کن حالات میں ہوئی اور ان کی شاعری ان حالات کی آئینہ دار کس طرح ہے اور کیوں ہے۔ اقبال کی شاعری کو انھیں تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے جو "بانگِ درا" میں ملتے ہیں۔ ہر دور کی خاص خاص نظموں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد اقبال کے مختصر حالاتِ زندگی دیے گئے ہیں۔ رسالہ مخزن اور اس کے مدیر شیخ عبدالقادر کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی ان نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے جو اس رسالے میں شائع ہوئیں۔ اس سلسلے میں ۱۳ نظموں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ ہر نظم کے مختصر تعارف کے بعد وہ اشعار درج کیے گئے ہیں جو ان نظموں کے مرکزی خیالات کے حامل ہیں۔ بچوں پر لکھی گئی ۵ نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد دورِ اوّل کی ان نظموں کی تشریح و تفسیر کی گئی جن میں سیاسی اشارے ملتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے دور کی شاعری کا جائزہ بھی اس نہج پر لیا گیا ہے۔ آخر میں تینوں ادوار کا موازنہ کرتے ہوئے اپنا تجزیہ پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا باب "مضامین کلام" ہے، اس میں اقبال کے موضوعاتِ شاعری پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال نے کن کن مسائل پر غور و فکر کیا اور انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ یہ باب ۱۴ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ اقبال کے موضوعاتِ سخن سے بحث کرتے ہوئے احمد دین نے انھیں مستقبل کا شاعر کہا ہے اور تلمیذ الرحمٰن بتایا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی پر بھی بحث کی ہے اور خودی، خودداری اور خود افزائی کے عنوان قائم کیے ہیں۔ اقبال کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت "پیغامِ عمل" ہے اور یہی پیغام کلامِ اقبال کی روح ہے۔ اقبال کے نظامِ اخلاق پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کی سیاسی نظریات کو بھی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ تہذیبِ نو کی خامیوں کی طرف اقبال نے اپنے کلام میں جو اشارے کیے ہیں ان پر بھی مصنف نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اسی طرح اقبال کے متصوفانہ خیالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس حصے کے آخر میں وطنیت، عجمیت اور پان اسلام ازم کے بارے میں اقبال کے نظریات کی تشریح علاحدہ علاحدہ عنوانات کے تحت دی گئی ہے۔

کتاب کا تیسرا اور آخری حصہ "طرزِ بیان" ہے جو ۱۹ ذیلی عنوانات پر منقسم ہے۔ حسن و عشق کی زبان، خیال بندی، غالبیت، شوکتِ بیان، سوز و گداز، تشبیہات و استعارات، جوش، طرفگیِ بیان، موسیقیت، امید، ارضی مناظرِ قدرت سے استدلال، [یہاں ا، ب، ج، د، ہ، و، ز کے تحت ذیلی عنوانات دیے گئے ہیں] سماوی مشاہدات سے سبق، واقعہ نگاری تمسخرانہ لہجے میں، واقعہ نگاری متانت کے رنگ میں، مناظرِ قدرت کی تصویریں، جذبات کی تصویریں، جذبات کی تصویریں دوسرے رنگ میں۔ اردو اور اہلِ پنجاب، اقبال اور ابنائے وطن عنوانات کے ذریعہ اقبال کی شاعری کے محاسن بیان کیے گئے ہیں۔ بقول مشفق خواجہ "احمد دین کی یہ کتاب ایک اہم تنقیدی کارنامہ ہے۔ اردو میں عملی تنقید کی یہ پہلی کتاب ہے اس کی بنا پر احمد دین کا شمار اردو کے ممتاز نقادوں میں ہونا چاہیے۔"

کتاب اقبال کے تیسرے ایڈیشن کے متعلق بہت سی ضروری معلومات مندرجہ بالا سطور میں آگئی ہیں۔ مشہور محقق و ادیب مشفق خواجہ نے اس
ب کو مرتب کر کے اقبالیات کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ۵۲۷ صفحات کو محیط اس گراں قدر کتاب میں جمیل الدین عالی کا "حرفِ چند"۔
فحات پر مشتمل مرتب کا دیباچہ، ۸۲ صفحات کا مبسوط "مقدمہ" جس میں احمد دین کی شخصیت و فن کا تحقیقی احوال درج کیا گیا ہے۔ ۱۴۲ صفحا
قبال" (طبع دوم) کا مکمل متن ضروری حواشی کے ساتھ دیا گیا ہے [اصل کتاب کا عکس شامل ہو جاتا تو کتاب اور زیادہ خوب صورت ہو جاتی]
صفحات میں اختلاف نسخ، تعلیقات و حواشی، دئے گئے ہیں۔ کتاب کا یہ آخری باب باقیاتِ اقبال میں نہ صرف اضافہ ہے بلکہ بعض نئے تحقیق
ر پیش کرتا ہے۔ یہ ایک مستند اور معتبر کام ہے۔ علاوہ ازیں کتاب میں مصنف احمد دین کی تصویر، "اقبال" (طبع دوم)، مسودہ مصنف کے پہلے صفحے
بتدائی حصے کا عکس اور آخری صفحے کا عکس نیز "اقبال" (طبع دوم) کے پہلے اور آخری صفحے کا عکس بھی دیا گیا ہے۔
کتاب کا تیسرا ایڈیشن، انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی۔ ۱ نے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔ قیمت : چالیس روپے۔

* ہمارے مجموعہ کا نمبر سو ہے۔ سو نمبر کے حساب سے خوبی بھی سو فیصد اور بے مثال ہے۔ عطر مجموعہ ۱۰۰ کی بھینی بھینی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہو جاتا ہے اور روح کو تازگی بخشتا ہے۔
* عطر مجموعہ ۱۰۰ کی تیاری میں کوئی ضرر رساں اجزاء شامل نہیں ہیں بلکہ عطر مجموعہ دل و دماغ کو تقویت دینے والے بے شمار پھولوں کی روح سے بنایا گیا ہے۔
* لوگ عطر مجموعہ ۱۰۰ روزانہ اور ہر پُر مسرت اور متبرک موقع پر استعمال کرتے ہیں۔

عطر مجموعہ ۱۰۰ کے نام سے بے شمار دوسرے لوگوں نے عطر بنانا شروع کیا ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہیں، اور صرف

عطر مجموعہ ۱۰۰ ہی استعمال کریں

عطار محمد داؤد اینڈ برادرس

ایکسپورٹرس ○ امپورٹرس ○ اینڈ پرفیومرس

گورنمنٹ سے منظور شدہ ایکسپورٹ ہاؤس

آفس: ڈیولپمینٹ بنک بلڈنگ، پلٹن روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۱

ٹیلیگرام: 011-75480 AMDIN DHANUL OODH

فون: 266494 * 266585 * 268444

دکانیں

۱۴۳ - پاکمان منزل بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳ فون: ۸۶۳۵۸۴

۱۹۲ - محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳ فون: ۳۲۱۷۵۹

۲۱-۱۷ الینڈس ڈاؤن روڈ تلاپہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۹

باب ۸

قطعہ

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علیؑ خیبر شکن عشق

اقبالؒ

سید مظفر حسین برنی
ماسٹر پیڈ کمیشن، لوک نائک بھون، ۵ ویں منزل، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۳

اقبال کے پانچ غیر مطبوعہ خطوط

اقبال کے خطوط جن کی تعداد ۱۴۰۰ سے زائد ہے۔ ۱۷ مجموعوں میں اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ متعدد خطوط، مختلف کتب و رسائل میں منتشر پڑے ہیں۔ میں ان تمام خطوط اور چند غیر مطبوعہ خطوط کو جمع کر کے "کلیاتِ مکاتیبِ اقبال" مرتب و مدوّن کر رہا ہوں۔ جس کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام مکاتیب سنہ وار و تاریخ وار ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس نہج پر اردو کے کسی شاعر یا ادیب کے خطوط پر آج تک کام نہیں ہوا۔ البتہ انگریزی ادب میں یہ طریقہ عام طور پر رائج ہے۔ کلیات کو مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط حاصل ہو جائیں تاکہ یہ بھی اس میں شامل ہو جائیں اور منظرِ عام پر آئیں۔ لیکن یہ کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بہرکیف تلاش و جستجو میں وہی غیر معمولی لطف و مسرّت ہے جو کسی ناقابلِ تسخیر مہم کو سر کر کے حاصل ہوتی ہے۔ اگر ایک غیر مطبوعہ خط بھی دستیاب ہو جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا فراعینِ مصر کے کسی دفینے کا پتہ چل گیا ہو۔ وادیٔ علم و ادب میں سرگرداں متلاشیوں کے دل میں بھی وہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے جس نے مصر کے جواں مرگ فرعون Tutan-Khamen کا بے نظیر اور گراں قدر دفینہ دریافت کیا۔ بہرحال یہ ایک لمبی داستان ہے جس کا بیان کسی اور مناسب موقع کیلیے اٹھا رکھتا ہوں۔ فی الحال ان پانچ غیر مطبوعہ "مکاتیبِ اقبال" کا ذکر مقصود ہے جن کے عکس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پرانی فائلوں سے حاصل کیے گئے ہیں۔ میں جناب وائس چانسلر صاحب کا بالعموم اور لائبریرین صاحبان کا بالخصوص بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے نہایت محنت، لگن، کاوش و جستجو کے بعد پرانے فائلوں کے گراں بار ذخیرہ سے ان خطوط کو تلاش کیا اور ان کے عکس مجھے فراہم کیے۔

ان پانچ خطوط میں سے تین سر سید راس مسعود کے نام ہیں۔ جو ۱۹۳۳ء میں لکھے گئے۔ جب وہ وہاں وائس چانسلر تھے۔ ایک خط رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام ۱۹۳۴ء میں لکھا گیا اور ایک ضیاء الدین صاحب کے نام ۱۹۳۶ء میں تحریر ہوا۔ جب وہ غالباً وائس چانسلر تھے۔ یہ سب مکاتیب انگریزی میں ہیں۔ اصل خطوط کے عکس ان کا ٹائپ شدہ متن اور ترجمے ذیل میں درج ہیں۔

سر راس مسعود کے نام مکاتیب کا پس منظر یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ، شاہ افغانستان نے تعلیمی امور کے مشورے کے لیے اقبال، سر سید راس مسعود اور مولانا سید سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ اقبال اور سید راس مسعود ۲۲ راکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل پہنچے اور مولانا سلیمان ندوی ۲۶ راکتوبر کو۔ ۲ر نومبر کو واپسی ہوئی۔ ۷ر نومبر ۱۹۳۳ء کو یہ المناک خبر ملی کہ نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ اس سفر کا Anti-Climax رہا۔

سید راس مسعود کو یہ خطوط سفر کی تیاری کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں جن میں حصول پاسپورٹ وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس موضوع پر اقبال کے خطوط مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مورخہ ۸، ۱۱، ۱۳، ۱۴ر اور ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۳ء "اقبال نامہ" جلد اوّل میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن سید راس مسعود کے نام ان کے یہ خطوط پہلی بار منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ ان خطوط کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ علامہ کے سفرِ افغانستان کے سلسلے میں چند مزید تفصیلات قارئین کو ملتی ہیں۔

چوتھا خط مورخہ ۷ر دسمبر ۱۹۳۴ء رجسٹرار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ان کو کوئی اعزازی ڈگری دینا چاہتی تھی لیکن وہ اپنی علالت کی وجہ سے علی گڑھ کے سفر کے متحمل نہیں ہو سکے تھے۔ دریں حالات

انہوں نے یونیورسٹی کو تجویز کیا کہ یہ اعزازی ڈگری سالِ آئندہ دے دی جائے جب وہ اس مرض سے نجات حاصل کرلیں گے۔ لیکن یہ مرض بالآخر جاں لیوا ثابت ہوا۔ اس خط سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ ان کے دل میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی اعزازی ڈگری کی کس قدر وقعت تھی۔ چوں کہ وہ بیماری کے عالم میں بھی جاڑوں کے موسم میں سفر کی صعوبتیں صرف اس صورت میں برداشت کرنے کو تیار تھے جب یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کی رو سے ان کی موجودگی ناگزیر قرار پاتی۔ یہ امر بھی اہم ہے کہ اس تجویز کا ذکر اقبال کی شاید ہی کسی سوانح حیات میں ہو۔

پانچواں خط ڈاکٹر ضیاء الدین کے نام ہے جو ۲۱ مارچ ۱۹۳۶ء کو لکھا گیا۔ اس خط پر اقبال کے صرف دستخط ہیں اور لاہور و تاریخ بھی انہوں نے خود تحریر کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علالت کی وجہ سے وہ اتنا لمبا خط نہیں لکھ سکتے تھے ورنہ عام طور پر وہ ہر خط خواہ مختصر یا طویل، انگریزی میں ہو یا اردو میں خود لکھتے تھے اور صرف آخری ایام میں بیماری کے باعث ان کو خطوط دوسروں سے تحریر کرانا پڑے۔ اس خط کا موضوع اقبال کی علم نوازی اور مسلمانوں کی بہبودی کے جذبہ کا بھی آئینہ دار ہے۔

جناب عطاء اللہ صاحب نے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں معاشیات کے معلم تھے "پنجاب میں تحریک امداد باہمی" پر کتاب لکھی تھی جس کو لندن کا مشہور ناشر George Allen شائع کرنے پر آمادہ تھا۔ لیکن شاید کتاب کی اشاعت میں کسی قسم کے مالی خسارہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے اس نے مصنف سے کتاب کی اشاعت کے لیے ۱۰۰ پونڈ بطور عطیہ Subsidy طلب کیے۔ چنانچہ اقبال نے پنجاب میں مسلمانوں کی اقتصادی بہبودی کے پس منظر میں موضوع کی اہمیت کی وجہ سے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب سے یہ سفارش کی کہ یونیورسٹی یہ رقم عطاء اللہ صاحب کے لیے منظور کر دے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی موجب دلچسپی ہوگا کہ بعد میں ان ہی عطاء اللہ صاحب نے اقبال کے تقریباً ۴۰۰ خطوط مرتب کیے تھے اور "اقبال نامہ" کی دو جلدوں میں ۴۵-۱۹۴۴ء میں شائع کیے۔

ان پانچ غیر مطبوعہ خطوط کی دریافت سے "اقبالیات" میں یقیناً اضافہ ہوا ہے اور مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ یہ میری مجوزہ "کلیات مکاتب اقبال" کو مستند اور ہر لحاظ سے مکمل بنانے میں معاون ثابت ہوں گے۔ قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط کسی صاحب یا ادارہ کی تحویل میں ہوں تو مجھے براہِ کرم مطلع کریں تاکہ میں ان سے رابطہ قائم کرسکوں اور ان خطوط کو یا ان کے عکس حاصل کرسکوں۔

اقبال بنام سر راس مسعود

(۱)

Dear Masood,

Herewith I send the invitation received a moment ago from the Afghan Consulate. I have written to M. Suleiman Nadvi about the date etc. I should like to know which date will suit you. But this should be fixed after we have got the passport. I am writing to the Consul to make enquiries about the passport. I think we shall have to apply to the British authorities (D. Magistrate) for passport. A gentleman from the Consulate will accompany us. I will write again.

Yours,

Mohammad Iqbal

Dear Masood,

Herewith I send the invitation received a moment ago from the Afghan Consulate. I have written to M. Suleiman Nadvi about the date etc. I should like to know which date will suit you. But this should be fixed after we have got the passport. I am writing to the Consul to make enquiries about the passport. I think we shall have to apply to the British authorities (D. Magistrate) for passport. A gentleman from the Consulate will accompany us. I will write again.

Yours,

Mohammad Iqbal

ڈیر مسعود،

افغان قنصل سے جو دعوت نامہ ابھی ابھی ملا ہے وہ روانہ کر رہا ہوں۔ میں نے ایم سلیمان ندوی (صاحب) کو تاریخ وغیرہ کی بابت لکھا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے لیے کون سی تاریخ مناسب رہے گی لیکن پاسپورٹ مل جانے کے بعد ہی تاریخ کا تعین کیا جائے گا۔ میں قنصل کو پاسپورٹ کے بارے میں تحقیقات کے لیے لکھ رہا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں پاسپورٹ کے لیے برٹش حکام کو (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) درخواست دینا ہوگی۔ قنصل کا ایک نمائندہ ہمارے ہمراہ ہوگا۔ میں اس سلسلے میں پھر لکھوں گا۔

آپ کا

محمد اقبال

بنام سر راس مسعود

(۲)

Lahore
9th Oct., 1933

Dea Masood,

I am afraid your passport application will have to be referred to the Govt. of India. This will cause delay. However, please wire to me the moment you get the passport so that we may settle the date of departure. Your expenses will be borne b the Afghan Govt. and from Peshawar you will be a Royal guest. If you want to know any other details, please inquire from the Consul General, 3, Hailey Road, New Delhi.

Yours,

Mohammad Iqbal
Lahore

Lahore
9th Oct. 1933

Dear Masood,
I am afraid your Pass-port app. will have to be referred to the Govt. of India. This will cause delay. However please wire to me the moment you get the passport so that we may settle the date of departure. Your expenses will be borne by the Afghan Govt. & from Peshawar you will be a Royal guest. If you want to know any other details please inquire from the Consul General, 3 Hailey Rd. New Delhi.

Yours ever
Muhammad Iqbal
Lahore.

✿

لاہور،
۹ر اکتوبر ۱۹۳۳ء
ڈیر مسعود،

مجھے خوف ہے کہ آپ کی پاسپورٹ کی درخواست حکومت ہند کو بھیجی جائے گی۔ اس سے تاخیر ہوگی۔ تاہم جوں ہی آپ کو پاسپورٹ مل جائے براہِ کرم مجھے تار دیں تاکہ ہم روانگی کی تاریخ طے کر سکیں۔ آپ کے (تمام) اخراجات افغان سرکار برداشت کرے گی اور پشاور سے آپ شاہی مہمان ہوں گے۔
اگر آپ اس سلسلے میں کوئی اور تفصیلات جاننا چاہتے ہیں تو براہِ کرم قنصل جنرل Consul General ۳، ہیلی روڈ، نئی دہلی سے رابطہ قائم کریں۔

آپ کا
محمد اقبال
لاہور

(٣)

Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D.
Barrister-at-Law,
Lahore.

10th Oct 33

My dear Masood,

Thanks for your letter which reached me a moment ago. If I get my Passport before 19th I shall be glad to accompany you. I hope it will be possible. We have also to get passport for our servants. I shall of course try my best to get the Passport matter expedited. I have not yet heard from S. Sulaiman Nadvi who is also going with us. The best thing is to fix the date of departure from Peshawar when we have got our Passports. Please wire me the moment you get your Passport. I have also written to M. Sulaiman Nadvi to do the same thing.

Hoping you are well

Yours sincerely

Muhammad Iqbal

بنام سر راس مسعود

Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D., LLD.

10th October, 1933

Barrister-at-Law,
Lahore.

My dear Masood,

Thanks for your letter which reached me a moment ago. If I get my passport before 19th, I shall be glad to accompany you. I hope it will possible. We have also get passports for our servants. I shall of course try my best to get the passport matter expedited. I have not yet heard from Sd. Sulaiman Nadvi who is also going with us. The best thing is to fix date from Peshawar when we have got our passports. Please wire me the moment you get your passport. I have also written to M. Suleiman Nadvi to do the same thing.

Hoping you are well.

Yours sincerely,

Mohammad Iqbal

✿

۱۰ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال "کے ٹی"
ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی، ایل۔ایل۔ڈی،
بیرسٹر۔ایٹ۔لا
لاہور

ڈیئر مسعود،

آپ کے خط کا شکریہ۔ جو مجھے ابھی ملا۔ اگر میں ۱۹ر سے قبل پاسپورٹ حاصل کر لوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ آپ میرے ہمراہ چلیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ ممکن ہوگا۔ ہمیں اپنے ملازمین کیلئے بھی پاسپورٹ حاصل کرنا ہوں گے۔ میں ضرور پاسپورٹ کے معاملہ کو جلد از جلد حل کرانے کی کوشش کروں گا۔ ابھی تک سید سلیمان ندوی (صاحب) کا کوئی خط نہیں ملا ہے جو ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم پشاور سے روانگی کی تاریخ اس وقت طے کریں جب ہمیں پاسپورٹ مل جائے۔ براہِ کرم پاسپورٹ ملنے پر تار دیں۔ میں نے مولانا سلیمان ندوی (صاحب) کو بھی یہی لکھا ہے۔

امید ہے کہ آپ بصحت ہوں گے۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

(٣)

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

Lahore

Dated ________ 193

AH.
59-6
10-12-34.

7th Dec. 1934

Registrar Muslim University,
Aligarh.

Dear Sir,

I am in receipt of your letter & the telegram which preceded it. I very much appreciate the honour which the University Court have decided to confer upon me and request you to kindly convey my grateful thanks to them.

Perhaps you know that I have been ill on account of a bad throat trouble for the last 11 months. Some little improvement is now visible in my voice; and my fear is that exposure to cold may cause a relapse or arrest the progress. I should feel much obliged if you could kindly let me know immediately whether the University rules & regulations permit me to waive the degree next year when I hope I shall be completely free from my present trouble. I would take the risk of a Aligarh journey in winter only if the rules & regulations make my presence this year absolutely necessary.

Yours truly
Muhammad Iqbal

بنام رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

Lahore

Dated ______ 193

Dr Sir Mohammed Iqbal, Kt.
M.A., Ph.D., LLD.

Barrister-at-Law

.7th Dec., 1934

Registrar, Muslim University,
Aligarh.

Dear Sir,

I am in receipt of your letter and the telegram which preceded it. I very much appreciate the honour which the University Court have decided to confer upon me and request you to kindly convey my grateful thanks to them.

Perhaps you know that I have been ill on account of a bad throat trouble for the last 11 months. Some little improvement is now visible in my voice; and my fear is that exposure to cold may cause a relapse or arrest the progress. I shall feel much obliged if you could kindly let me know immediately whether the University rules and regulations permit me to receive the Degree next year when I hope I shall be completely free from my present trouble. I would take the risk of a Rly. journey in winter **only** if the rules and regulations make my presence this year absolutely necessary.

Yours truly

Mohammad Iqbal

ڈاکٹر سر محمد اقبال "کے ٹ" — لاہور
ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی، ایل ایل بی، — ۷، دسمبر ۱۹۳۴ء
بیرسٹر۔ایٹ۔لا،

رجسٹرار،
مسلم یونیورسٹی۔
علی گڑھ،

مجھے آپ کا خط ملا۔ اس سے قبل آپ کا تار موصول ہوا تھا۔ یونیورسٹی کورٹ نے مجھے جو اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے اس کا میں بے حد ممنون ہوں اور آپ سے استدعا ہے کہ آپ براہِ کرم میرا شکریہ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد تک پہنچا دیں۔

آپ کو شاید علم ہو گا کہ میں پچھلے ۱۱ ماہ سے گلے کی تکلیف میں مبتلا ہوں۔ اب میری آواز میں ذرا سا افاقہ نظر آ رہا ہے اور مجھے خوف ہے کہ ٹھنڈ لگ جانے سے میرا مرض عود نہ کر آئے یا مکمل افاقہ میں دیر لگ جائے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا اگر آپ مجھے براہِ کرم فوراً مطلع کریں کہ کیا یونیورسٹی کے قوانین و ضوابط اس بات کی اجازت دیں گے کہ یہ ڈگری مجھے اگلے سال دی جائے۔ جب مجھے امید ہے کہ میں مکمل طور پر موجودہ بیماری سے نجات پا لوں گا۔ میں ریل کا سفر کرنے کا خطرہ جاڑوں میں صرف اسی صورت میں ہی لے سکتا ہوں جب یونیورسٹی کے قوانین و ضوابط کے تحت میری موجودگی قطعاً ناگزیر ہو۔

مخلص

محمد اقبال

اقبال

Jawaid Mansil,
Mayo Road,
Lahore,

My dear Dr. Ziauddin,

I am addressing to you on a matte of supreme importance both to the country and to the community. I understand Mr. Ataullah of your Universit has completed a book ; The Cooperative Movement in the Punjab; which George Allen, the famous London publish after their expert's report on the manuscript, have agreed to bring out. The book has also been accepted by the All India Cooperative Institutes' Association for being issued under the Indian Cooperative Series.

In view of the scientific nature of the book the publishers, like the rest of their trade wish to ensure themselves against any possible financial loss and have hence asked the author to contribute £ 100/- by way of subsidy towards the publication of the book. This sum quite naturally is above the means of the author.

I cannot sufficiently impress upon you the importance of Mr. Ataullah's work and its intimate connection with the economic life of the Mussalmans of the Punjab. You know our community sadly lacks economists of any reputation and you will agree that

any amongst these who works needs every encouragement especially when he belongs to Aligarh and his work has already won recognition. Musalmans of the Punjab are deeply interested in the subject and I am perfectly confident that the publication of this book will bring honour both to the author and to your University. I would request you to provide Mr. Ataullah with £ 100/- from the University funds or through your personal influence and thus enable him to bring out his book without all avoidable delay. Mr. Ataullah undertakes to pay to the University all royalty money he receives till the amount thus given by the University is paid up.

I can assure you that in the interest of the community and the University money wso spent will be exceedingly well spent. May I hope you will give your immediate and serious consideration to this request and suggestion. I shall feel highly obliged if you intimate to me your decision in the matter.

Yours sincerely,

Muhammad Iqbal

dated Lahore
21st Apr. 1936

بنام ڈاکٹر ضیاء الدین

جاوید منزل
میو روڈ
لاہور

مائی ڈیئر ڈاکٹر ضیاء الدین

میں آپ کو یہ خط ایک ایسے مسئلے پر لکھ رہا ہوں جو ملک و ملت دونوں کے لیے نہایت اہم ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کے جناب عطاء اللہ نے "پنجاب میں تحریکِ امدادِ باہمی" پر ایک کتاب مکمل کی ہے جس کو لندن کا مشہور ناشر GEORGE ALLEN ماہرین کی رپورٹ کے بعد شائع کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ آل انڈیا کوآپریٹو انسٹی ٹیوٹ ایسوسی ایشن All India Cooperative Institutes Association نے بھی اس کتاب کو آل انڈیا کوآپریٹو سیریز کے تحت جاری کرنا قبول کر لیا ہے۔

کتاب کی سائنسی نوعیت کے پیشِ نظر ناشر جیسا کہ اس کاروبار کا دستور ہے ہر ممکن مالی نقصان سے بچنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس نے مصنف سے بطور عطیہ ۱۰۰ پونڈ کتاب کی اشاعت کے لیے طلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رقم مصنف کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

میں عطاء اللہ صاحب کی اس تصنیف کی اہمیت اور اس کے مسلمانان پنجاب کی معاشی زندگی سے تعلق پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہوں۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ ہماری ملت میں معاشیات کے ماہرین کی حد درجہ کمی ہے اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ ان میں سے اگر کوئی بھی نمایاں کام کرے تو اس کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی ضرورت ہے خصوصاً جب کہ اس کا تعلق علی گڑھ سے ہو۔ اور اس کے کام کو خراجِ تحسین مل چکا ہو۔ پنجاب کے مسلمان اس موضوع میں حد درجہ دلچسپی رکھتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت مصنف کے لیے اور آپ کی یونیورسٹی کے لیے عزت کا باعث ہوگی۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ عطاء اللہ صاحب کو اپنا ذاتی اثر استعمال کرتے ہوئے یونیورسٹی فنڈ میں سے ۱۰۰ پونڈ دلا دیں۔ تاکہ وہ اپنی کتاب کی اشاعت بغیر کسی تاخیر کے کرا سکیں۔ عطاء اللہ صاحب اس بات کا ذمہ لیتے ہیں کہ وہ اپنی رائلٹی کی تمام رقم جو ان کو ملے گی اس وقت تک یونیورسٹی کو دیتے رہیں گے جب تک یہ رقم ادا نہ ہو جائے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ روپیہ یونیورسٹی اور ملت کے حق میں خرچ ہوگا۔

کیا میں امید رکھوں گا کہ آپ میری اس درخواست و تجویز پر فوراً سنجیدگی سے غور فرمائیں گے؟ میں نہایت ممنون ہوں گا اگر آپ اس معاملہ میں اپنے فیصلے سے مجھے آگاہ کریں۔

لاہور
۲۱ مارچ ۱۹۳۶ء

مخلص
محمد اقبال
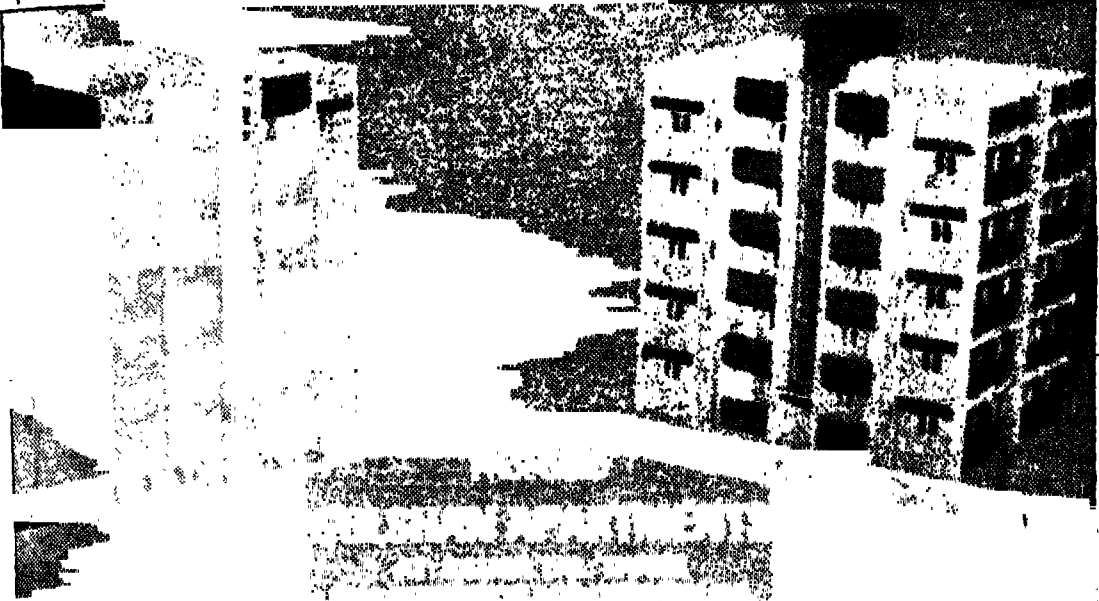
ایک روم کچن، دو روم کچن کے سیلف کنٹینڈ اونرشپ فلیٹس

کوسہ کے سب سے صحت بخش چہل پہل اور پُر رونق علاقہ میں واقع ● بہترین آر سی سی پلاننگ ملک کے مایہ ناز انجینئرس اور ماہرین کی زیر نگرانی مضبوط بنیادوں پر مستحکم تعمیر، تمام جدید ترین سہولتوں سے آراستہ ● فری ہولڈ لینڈ ● ہر لحاظ سے عمدہ ● بچوں کے کھیلنے کیلئے محفوظ کشادہ جگہ ہنگامی زندگی سے دور انتہائی پُرسکون ماحول اور پُر فضا مقام ● آلودگی سے پاک صحت افزا تازہ ہوا ● مدرسہ اور مسجد سے متصل ● اسکول کالج پارک اور سیفی ہال چند قدم کے فاصلہ پر ● روزمرہ کی خریداری کیلئے مارکیٹ اور آمد ورفت کیلئے ٹرانسپورٹ ہر وقت دستیاب اور دیگر ضروریات زندگی سے قریب ترین ● ہر فلیٹ کشادہ ہوادار اور روشن ● جدید منصوبہ بندی تعمیری استحکام اور تمام جدید ترین سہولتوں کے ساتھ۔

ناقابلِ یقین کم قیمت پر فلیٹ حاصل کرنے کا سنہری موقع ● خاص کر درمیانی طبقہ کے لوگوں کیلئے آسان قسطوں کی فراہمی ● اطراف کے زیر تکمیل تمام پروجیکٹوں سے کم دام میں، یوں سمجھئے قیمت اور معیار دونوں آپ کی خواہش کے عین مطابق۔

مزید تفصیلات اور بکنگ کے لیے رابطہ قائم کریں

سول سیلنگ ایجنٹ
واجد حسین اینڈ ایسوسی ایٹس
کچھی محلہ، عنبر ا پارٹمینٹ، پنویل ۲۰۶–۴۱۰ ضلع رائے گڑھ
فون : ۳۳۸۲

سائٹ پر رابطہ قائم کریں
شیر محمد (شیرو)
نزد سارنگ کالونی کوسہ
ممبرا

نوادراتِ اقبال

جمع و ترتیب

اکبر حیدری کشمیری

۸۳۸ ۔ رمضان گڑھ، سری نگر (کشمیر)

ہمارا دیس [ترانۂ ہندی] اور علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط

"ماہر اقبالیات" پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے متعدد بار اپنی تحریروں اور کتابوں میں "ہمارا دیس" (ترانۂ ہندی) کا عکس بخط اقبال شائع کیا ہے۔ صرف ایک کتاب "اقبال ۔ زندگی، شخصیت اور شاعری" میں اسے پانچ الگ الگ صفحوں میں بغیر کسی حوالے کے شائع کیا ہے ان کا اصرار ہے کہ "ہمارا دیس" (ترانۂ ہندی) کی تخلیق کا زمانہ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء ہے ۔ راقم حروف نے جب ان سے اس کا حوالہ دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ جب اپریل ۱۹۳۸ء میں اقبال کا انتقال ہوا تو یہ نظم بخطِ اقبال "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں شائع ہوئی تھی اور میرے پاس اس کا تراشا تھا جو میں نے شائع کیا۔ دراصل آزاد صاحب نے "ترانۂ ہندی" بخط اقبال کسی پاکستانی کتاب سے نقل کر کے " اقبال زندگی، شخصیت اور شاعری" مطبوعہ نومبر ۱۹۷۷ء میں بغیر کسی حوالے کے اس لیے شائع کیا کہ ہندوستان میں اس کی دریافت کا سہرا ان کے سر رہے ۔ اس موضوع کے بارے میں ہم نے فروری ۱۹۸۰ء میں قومی آواز لکھنؤ کے ذریعہ متوجہ کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۸۲ء میں نیا دور لکھنؤ کے نگم نمبر میں ہم نے پہلی بار یہ لکھا تھا کہ اقبال نے "ہمارا دیس" (ترانۂ ہندی) کی نظم منشی دیا نرائن نگم کو "زمانہ" کانپور میں چھاپنے کے لیے بھیجی تھی جو ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں نگم صاحب کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ۔

"ہمارا دیس" کی تاریخ تخلیق ایک معمہ سی نظر آتی ہے ۔ یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اقبال نے اسے سب سے پہلے غالباً جولائی ۱۹۰۴ء میں دیا نرائن نگم صاحب کو بغرض اشاعت بھیجا تھا ۔ زمانہ میں تیسرے شعر کا مصرعۂ اوّل اس طرح چھپا ہے ۔ ؎

پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا (کذا)

اقبال نے مصرع اسی طرح موزوں کیا تھا ۔ اس کے بعد انہوں نے اس پر نظر ثانی کر لی ۔ اور پھر اسے اپنے خط مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کے ساتھ نئی ترتیب سمیت ایڈیٹر زمانہ کے پاس بھیجا نگم صاحب نے پلیٹ جمائی تھی کہ اقبال کا خط پہنچا ۔ انہوں نے پلیٹ پر ہی اس کی امکانی ترمیم معکوس نویس سے کرائی اور اس مصرعہ کو

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

حاشیے میں لکھوایا ۔ یہ واقعہ نگم صاحب کے صاحبزادے منشی برج نرائن نگم نے مجھے تحریری طور پر لکھ کر بھیجا ہے ۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ والد صاحب دیا نرائن نگم کے اصرار پر علامہ اقبال نے قومی ترانہ لکھا جو کہ ستمبر ۱۹۰۴ء کے زمانہ میں پہلی بار "ہمارا دیس" کے عنوان سے طبع ہوا ۔ ایڈیٹر زمانہ نے اقبال کے خط اور ترمیم شدہ نظم کو فریم میں رکھا تھا ۔ خط کی دوسری طرف نظم ہے ۔ یہ وہی "ترانۂ ہندی" ہے جس کا عکس پاکستانی ادیبوں اور جگن ناتھ آزاد صاحب نے بغیر حوالے کے شائع کیا ہے ۔

راقم حروف کو ایڈیٹر زمانہ کے صاحبزادے جناب برج نرائن نگم (چکبست روڈ لکھنؤ) نے اقبال کے غیر مطبوعہ خط اور اشعار کا فوٹو اسٹیٹ عنایت کیا ۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے "ہمارا دیس" (ترانۂ ہندی) کی نظم یقیناً ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء سے قبل تخلیق کی تھی ۔ اس کا ثبوت ذیل کے مصرعے سے ملتا ہے :-

پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا

یہ بات قابل ذکر ہے کہ "ہمارا دیس" شرر لکھنوی کے پندرہ روزہ اخبار اتحاد لکھنؤ میں ۲۰ اگست ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں چھپی تھی ۔ اس کی اور زمانہ

کی نظم کی ترتیب میں فرق ہے۔

پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا

اتحاد میں نہیں ہے۔ علاوہ اس کے زمانہ کی نظم کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں "گھو" اتحاد کی نظم میں "سمجھیں" ہے۔

(۲) تیسرے شعر کے پہلے مصرعے کے بجائے اتحاد میں مصرع یوں ہے :۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

(۳) پانچویں شعر کے پہلے مصرعے میں "جس کے" کے بجائے "اس کی" ہے۔ مقطع میں پہلا مصرع اس طرح ہے :۔

اقبال اپنا کوئی محرم نہیں جہاں میں (اتحاد)

حسرت موہانی کے مشہور و معروف رسالہ "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ بابت نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۸ اور ۳۹ میں "تنقید مخزن" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون درج ہے اس میں لکھا گیا ہے :

" اکتوبر کا پرچہ (مخزن ۱۹۰۴ء) دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض درشت زبان اور ناواقف لوگوں سے
قطع نظر کرکے جو نکتہ چینی کا جواب سب و شتم سے دینا چاہتے ہیں اہل پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج
اور صحت زبان کے خواستگار ہیں وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور نکتہ چینوں کی نکتہ چینی سے فائدہ
اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر اقبال صاحب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا تھا ؎

اقبال اپنا کوئی محرم نہیں جہاں میں معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

(اشررکے) دلگداز نے اعتراض کیا کہ اس شعر کے آخر میں "ہمارا" کے بجائے "اپنا" چاہئے۔ اور اقبال نے اب اس کو بدل کر مخزن میں اس طرح چھپوایا ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

شیخ عبدالقادر نے اقبال کی یہ نظم "ہمارا دیس" کے عنوان سے مخزن لاہور جلد ۸ نمبر ۱ صفحہ ۴۹ بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء میں شائع کی تھی۔
اقبال نے خط اور نظم "ہمارا دیس" (ترانۂ ہندی) منشی دیا نرائن نگم کو ایبٹ آباد ضلع ہزارہ سے بھیجا تھا۔ ان دنوں اقبال گرمی کی تعطیلات میں اپنے بڑے بھائی شیخ محمد عطا کے پاس ایبٹ آباد گئے تھے۔ اس کی تائید و تصدیق اقبال کے خطوں اور دیگر تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ مخزن لاہور بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء (ص ۲۳ تا ص ۳۲) میں اقبال کا ایک مضمون "ہماری زندگی" کے عنوان سے چھپا ہے۔ یہ تحریر پیش نظر ہے۔ اس کی تمہید میں لکھا ہے کہ :۔

" ہمارے مکرم دوست شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے گرمیوں کی تعطیلوں میں اپنے برادر معظم شیخ محمد عطا
سب۔ ڈیوژن آفیسر ایبٹ آباد تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کے اصحاب نے باصرار شیخ سے ایک لکچر لکھوایا
اس لکچر کا خلاصہ ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں "

منشی دیا نرائن نگم کے نام اقبال کا خط ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔[1]

" از ایبٹ آباد ضلع ہزارہ

جناب من

میں کئی دنوں سے یہاں ہوں۔ لیکن افسوس کہ یہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گیا۔ اور اسی وجہ سے آپ کے خط کا جواب
نہ دے سکا۔ ابھی پورا افاقہ نہیں ہوا۔ اشعار ارسال خدمت کرتا ہوں۔

محمد اقبال

دوسرا صفحہ ملاحظہ ہو

معرفت عطا محمد سب ڈیویژنل آفیسر ملٹری ورکس۔ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء

---

[1] یہ متن گذشتہ صفحات میں عبداللطیف اعظمی کے مقالے "ترانۂ ہندی" میں شامل ہے۔ خط کا عکس یہاں دیا جا رہا ہے۔ [ادارہ]

اقبال بنام وحشت کلکتوی

مخدوم مکرم جناب وحشت

[illegible]

محمد اقبال

وحشت کلکتوی :۔ خان بہادر سیّد رضا علی وحشت کلکتوی ۱۸ ر نومبر ۱۸۸۱ء کو کلکتے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کلکتہ ہی میں پائی۔ ۱۹۱۰ء میں امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ کلکتہ کے شعبۂ فارسی میں چیف مولوی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ میں صدر شعبۂ فارسی و اردو مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۹۵۰ء تک لیڈی برابورن کالج کلکتہ میں اردو فارسی کے پروفیسر رہے۔ مئی ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آ گئے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو ڈھاکہ میں انتقال کیا۔

وحشت اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ جب ۱۹۱۰ء میں ان کا اوّلین مجموعۂ کلام دیوانِ وحشت شائع ہوا تو ہندوستان کے جن ادیبوں نے اس پر تبصرے کیے ان میں حالی، شبلی، شرر، حسرت، ظفر علی خان، وحید الدین سلیم، تنظم شوق قدوائی، محسن کاکوروی، اکبر الٰہ آبادی، شاد عظیم آبادی، ظہیر دہلوی، نظم طباطبائی اور اقبال وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کے خط کا عکس مجھے پروفیسر کلیم سہسرامی نے بنگلہ دیش سے بھیجا تھا۔

پہلی بار یہ خط اقبال عظیم کی کتاب مشرقی پاکستان میں اردو میں شائع ہوا [ادارہ]

بنام مولوی الف دین

✿

ولوی الف دین :- کیمپلور (یو پی) کے مشہور وکیل
ر صاحب تصنیف تھے۔ غالباً یہ وہی الف دین ہیں
نھوں نے ایک کتاب لکھی تھی۔ جب اسے اکبر الٰہ آبادی
ا خدمت میں پیش کیا تو اکبر نے بے ساختہ کہا ؎

الف دین نے خوب لکھی کتاب
کہ بے دین نے پائی ہے راہِ ثواب

لف دین نے اقبال سے کسی انگریز سے سفارش کے
یے لکھا تھا۔ اور اپنے اشعار بھی بھیجے تھے انہوں نے
ط میں یہ بھی لکھا تھا کہ رموزِ بے خودی (سالِ تصنیف
۱۹۱۸ء) کے چند اشعار ارسال کیے جائیں۔ اقبال
نے سفارش کرنے سے معذرت ظاہر کی۔ البتہ رموزِ
بے خودی کے اشعار اپنے قلم سے لکھ کر بھیجے۔ ان اشعا
ر مطبوعہ اشعار کی ترتیب میں فرق بھی ہے۔ اقبال
نے یہ اشعار ۹ جنوری ۱۹۱۷ء کو تحریر کیے تھے۔

رموزِ بے خودی کی یہ ۱۲ ویں نظم ہے :
در معنی این کہ چون ملتِ محمدیہ موسس بر توحید
رسالت است پس نہایت مکانی ندارد !
یہ نظم ۳۸ اشعار پر مشتمل ہے جب کہ اقبال نے
صرف ۱۲ اشعار ہی تحریر کرکے ارسال کیے تھے۔ کلیاتِ
اقبال (فارسی) مطبوعہ فروری ۱۹۷۳ء غلام علی
اینڈ سنز (لاہور) کے صفحہ نمبر ۱۱۲ تا ۱۱۵ پر یہ نظم
پھیلی ہوئی ہے۔ [ادارہ]

بنام اسلم جیراجپوری

اسلم جیراجپوری :۔ ۱ ربیع الاوّل ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) کو قصبۂ جیراجپور اعظم گڑھ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھوپال میں پائی۔ ۱۹۰۳ء میں "پیسہ اخبار" لاہور میں عربی کے مترجم ہوئے ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کالج میں عربی فارسی کے معلم مقرر ہوئے جامعہ ملیہ کی تاسیس پر مولانا محمد علی جوہر کے اصرار پر علی گڑھ سے چلے آئے اور جامعہ ملیہ میں تاریخ اسلام کے مدرس مقرر ہوئے ان کا زندۂ جاوید کارنامہ "تاریخ الامت" آٹھ جلدوں میں ہے جب اقبال نے ۱۹۱۵ء میں "اسرار خودی" شائع کی اور ان کے خلاف معرکہ آرائی ہونے لگی تو اسلم صاحب نے اقبال کے حق میں "اسرار خودی" پر سیر حاصل تبصرہ لکھا جسے ظفر الملک علوی نے اپنے رسالہ "الناظر" میں "مثنوی اسرار خودی" کے عنوان سے صفحہ ۹ تا صفحہ ۲۲ بابت مئی ۱۹۱۹ء نمبر ۱۱ جلد ۲۰ میں شائع کیا۔ خط میں اسی تبصرے سے متعلق ذکر کیا گیا ہے۔

❁

لاہور ۱۷ مارچ ۱۹ء

مخدومی السلام علیکم

آپ کا تبصرہ اسرار خودی پر رسالہ الناظر میں دیکھا ہے جس کے لیے آپ کا نہایت شکر گزار ہوں۔

"زیارت مرقد و دروی شد الرحال"

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح تھا۔ خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا۔ مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعرا میں سے ہیں۔ بہرحال میں نے وہ اشعار حذف کر دیے ہیں اور ان کی جگہ اسی لٹریری اصول کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں۔ [illegible]

[illegible]
[illegible]

اسد ملتانی :۔ ۱۹۰۲ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر کچھ مدت تک ملتان سے ہفت روزہ "الشمس" نکالا۔ بعد ازاں حکومتِ ہند کے سکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے اور پھر حکومت پاکستان کی وزارت ریاست و سرحدات میں اسسٹنٹ سکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ —— نومبر ۱۹۵۹ء میں راولپنڈی میں وفات پائی۔

اسد ملتانی کو شعر و سخن کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں لکھتے ہیں کہ بیس پچیس برس پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں ہر سال تقسیم انعامات کے موقع پر ایک انعام اردو میں بہترین نظم لکھنے والے طالب علم کو بھی ملا کرتا تھا۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۲۱ء میں فرسٹ ایر کے طالب علم تھے تو دوستوں کے اصرار پر انہوں نے ایک نظم "شبنم کا قطرہ" انعام کے لیے پیش کی جو انعامی مقابلہ کے لیے منتخب کی گئی اس کا فیصلہ اقبال نے کیا تھا۔ جلسے کے دن اسد ملتانی کو معلوم ہوا کہ اس پر اقبال نے تصحیح کی تھی۔ اسد ملتانی یہ بھی کہتے ہیں کہ :۔

" فن کے لحاظ سے اس اصلاح کی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ بھی لگایا جائے جہاں تک مجھے علم ہے کہ حضرت علامہ نے کبھی کسی نظم کی اصلاح اپنے قلم سے نہیں فرمائی۔ اگر یہ درست ہے تو پھر اس حیثیت سے یہ اصلاح یقیناً اہل ذوق کے لیے نوادرِ ادبیہ میں سے ہے اور میرے لیے بجا طور پر باعث فخر و مباہات ہے۔" (اقبال نامہ ص ۳۴۲)

شبنم کا قطرہ

منظرِ لالہ کا اک زینت فزا رنگیں ہوں میں ۔ نازنینانِ گل کے نازک کان کا گوہر ہوں میں
دیدۂ نرگس میں ہوں اک رشکِ فرحت خال ہوں ۔ روئے زیبائے سمن پر [illegible] خال ہوں
بو کہ میں ہوں آبِ عنب [illegible] بجام موتیا ۔ لب بہ [illegible] خضرِ سبزہ کے ہوں قطرۂ آبِ بقا
[illegible] کی صف میں گوہر نایاب ہوں ۔ [illegible] ہوں
[illegible] ہوں ۔ جیسے [illegible]

[illegible]

میں بنا ہوں چرخ کی [illegible]

[illegible] سینے میں

زندگی کا راز پوشیدہ [illegible] میری آوارگی کی داستاں

یہ کہاں تھا؟ کیسے؟ اور کس طرح پہنچا یہاں!

پہلے پہلے [illegible] آبِ سمندر میں بھرا ۔ تھا نہایت [illegible]
یاد ہیں لہریں جو سطحِ آب پر آوارہ تھیں ۔ [illegible] تھیں
یاد آرہی ہیں [illegible] ۔ جن کی [illegible] دل ناشاد یاں
[illegible] سطح پر پھر تماشا [illegible] آجاتا تھا میں
[illegible] جو سطحِ آب پر ۔ جا پڑی میری نگاہ خورشید عالم تاب پر

بنام غلام بھیک نیرنگ

مخدومی نیرنگ صاحب   لاہور [illegible]

آپ کا خط ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

[illegible]

[illegible] اور مجھے یقین ہو رہا ہے کہ اگر ان [illegible]

[illegible] باقی رہا [illegible] آپ [illegible]

[illegible] جان و آبرو [illegible]

[illegible] مسلمان [illegible]

دنیا کی کوئی قوت [illegible]

[illegible]

[illegible]

والسلام [illegible] نیرنگ

مخلص
محمد اقبال

غلام بھیک نیرنگ: سید غلام بھیک نیرنگ۔ انبالہ کے معروف قومی کارکن، ادیب اور شاعر۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ اقبال کے مخلص اور قدیم ترین دوستوں میں تھے۔ دونوں کا کلام پہلو بہ پہلو 'مخزن' میں چھپتا تھا۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک انبالے میں سرکاری وکیل رہے۔ انہوں نے اصلاحی، ملی، اسلامی اور تعلیمی انجمنوں میں ہمیشہ پُرجوش حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ ۱۹۵۲ء میں یہیں انتقال کیا۔ شاعری کے دو مجموعے "کلام نیرنگ" اور "غبار افق" ان کی یادگار ہیں۔ جب ستمبر ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ کے لیے سوار ہوئے اور دلی میں خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری دی تو نیرنگ ان کے ہمرکاب تھے۔ اور جب ۲۰ جولائی ۱۹۰۸ء کو یورپ سے واپس لاہور تشریف لائے تو نیرنگ نے ان کی آمد پر یہ ترانہ پڑھا۔ چند شعر یہ ہیں:

فصل بہار آئی پھر گلشن سخن میں
اک جشن ہو رہا ہے مرغان نغمہ زن میں
یورپ کی سیر کر کے اقبال واپس آئے
خوشیاں منائیں مل کر اہل وطن وطن میں
ہے آمد مسرت اقبال تیری آمد
خوشیاں ہیں اہل دل میں جذبے ہیں اہل فن میں
پھر تیرے دم سے ہوں گے تازہ سخن کے چرچے
پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

اقبال نامہ [حصہ اول] ص: ۲۰۶ — [ادارہ]

بنام مہجور کاشمیری

مہجور کاشمیری :۔ پیرزادہ غلام احمد مہجور (۱۸۸۵ء۔ ۱۹۵۲ء) کشمیری زبان کے مشہور و معروف شاعر تھے تحریک آزادی کشمیر میں انہوں نے اپنے کلام دو بیان سے نئی روح پھونک دی تقسیم ہند کے بعد یہاں کے صاحبان اقتدار سے اختلاف ہوگیا۔

مہجور پٹواری کے عہدے پر تھے جب اقبال اور ان کے درمیان مراسلت کی ابتدا ہوئی۔ ان کے کتب خانے میں نادر و نایاب مخطوطات تھے۔ وہ تذکرہ شعرائے فارسی کشمیر کا بھی مرتب کرنا چاہتے تھے۔

اقبال نے یہ خط مہجور کشمیری کے نام لکھا ہے۔ ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اسے بشیر احمد ڈار مرتب "انوار اقبال" کے حوالے سے اپنی کتاب "اقبال اور کشمیر" کے صفحہ ۲۰ میں فوق کا خط تسلیم کیا ہے اور پھر اسے صفحہ ۱ میں فوق ہی کے نام شائع کیا۔ اور اس طرح اسے فوق کے خط نمبر ۱ کے تحت جگہ دی ہے۔ ہم یہ قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے یہ خط فوق کے نام نہیں بلکہ مہجور کشمیری کے نام لکھا تھا۔ اقبال نامہ حصہ اول کے مرتب نے غلطی سے مہجور کا نام ظہور الدین لکھا ہے۔ جناب بشیر احمد ڈار کو اس خط کے بارے میں غلط فہمی یوں پیدا ہوگئی کہ فوق نے اس کا عکس "تاریخ اقوام کشمیر" جلد دوم صفحہ ۲۲۳ اور ۲۲۴ کے درمیان اقبال کے حالات زندگی کے تحت اقبال کی تصویر کی پشت پر شائع کیا۔ چونکہ خط کا عکس نام اور پتہ کی طرف نہیں چھپا بلکہ نفس مضمون کی طرف سے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو اصل مکتوب الیہ کے بارے میں فاش غلطی ہوگئی ہے۔

❁

لاہور ۱۳ اپریل سنہ ۲۲ء

مکرم بندہ۔ السلام علیکم

[illegible]

محمد اقبال

ملاحظہ ہو [illegible] مہجور کاشمیری اور اقبال (مطبوعہ [illegible] پاکستان) [illegible] ۱۹۵۳ء [illegible] [ادارہ]

بنام شاد حیدر آبادی

لاہور ۲۴ اکتوبر ۲۳ء

سرکار والا تبار تسلیم

والا نامہ موصول ہو گیا ہے۔ صاحبزادی کے انتقال کی خبر معلوم کر کے نہایت افسوس ہوا
اقبال شاد اس غم و الم میں شریک ہے۔ سرکار ہمت بلند، طبیعت بلند، اگر
حوصلہ کیوں بلند نہ ہو۔ عرفی نے کیا خوب کہا ہے

"غم اسی قدر گراں مایہ چہ لذت یابم
کہ باندازۂ آں صبر و ثباتم دادند"

خدا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ عزیز ذی الجاہ جو خبر سرکار والا نے
سنی ہے وہ صاحب ہمیں بھی بر سر تردد و بریشاں آئندہ سے ہے سرکار کو
کامیاب المرام دیکھوں۔ ذمہ داری ضرور ہے لیکن اس وقت کی حالت اس
امر کی مقتضی ہے کہ حیدرآباد کا مدار المہام شاد ہو اور مجھے یقین ہے
حضور نظام شاہ زمانے کے سیاسی ملک کو صحیح طور پر دیکھتے ہیں۔

مخلص محمد اقبال لاہور

شاد حیدر آبادی :- مہاراجہ کشن پرشاد شاد ۲۸ فروری ۱۸۶۴ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت اپنے نانا مہاراجہ نریندر پرشاد کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں نواب محبوب علی خاں نے آپ کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔ وزیر اعظم کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے ۱۹۱۳ء میں پنجاب، دہلی، بمبئی اور اجمیر کی سیر کی اور "سیر پنجاب" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ ۱۹۲۶ء میں ایک اور مرتبہ صدارت عظمیٰ کے لیے منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۷ء تک آپ حیدر آباد کے سیاہ و سفید کے مالک رہے اور آخر کار ۹ مئی ۱۹۴۰ء [صل] کو انتقال کیا۔ مہاراجہ نے کم و بیش ۸۰ کتابیں لکھ ڈالیں ان میں سے ۶۶ کتابوں کی فہرست محمد عبد اللہ قریشی صاحب نے "اقبال بنام شاد" میں درج کی ہے۔ شاد اقبال کے مخلص دوستوں میں تھے۔ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔ اس خط میں اقبال نے شاد کی صاحبزادی کے انتقال پر اظہار تعزیت کیا ہے۔ صاحبزادی کا انتقال ۱۹ صفر ۱۳۴۲ھ/ یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ہوا تھا۔ شاد نے اقبال کو لکھا تھا کہ :-

"یہ اٹھارہواں داغ شادِ ناشاد کے دل پر پڑا ہے جس میں بارہ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں اور یہ چھٹی لڑکی تھی۔"

صل انتقال کا سال ۱۹۴۰ء ہے۔ [ادارہ]

خط کا عکس اقبال بنام شاد مرتبہ: محی الدین قادری زور مطبوعہ ۱۹۴۲ء سے لیا گیا ہے۔ [ادارہ]

بنام وصل بلگرامی

✿

وصل بلگرامی : سید مقبول حسین نام وصل تخلص بلگرام کے رہنے والے تھے۔ جوش ملیح آبادی ان کے بارے میں یادوں کی برات میں لکھتے ہیں :۔

" انگریزوں کی طرح گورے ، بلند پیشانی ، متوسط القامت ، نورانی چہرے اور گھنی لال داڑھی کے فرشتہ صورت اور پیغمبر سیرت انسان تھے۔ میں نے ان کا سا آہنی عزم و شیر دل انسان آج تک نہیں دیکھا ہے۔ وہ جب کسی بات پر کمر باندھ لیتے تھے تو وہ تمام امور جو دنیا بھر کے لیے ناممکن ہیں۔ انہیں پل بھر میں بنا دیا کرتے تھے۔"

وصل بلگرامی نے ۱۹۲۵ء کے آخر میں اردو ادبی رسالہ "مرقع" کے نام سے چھاپنا چاہا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مختلف لوگوں ، ادیبوں اور شاعروں کو قلمی تعاون کے لیے لکھا۔ اقبال سے فرمائش کی تھی کہ وہ سرورق کے لیے کوئی اچھا شعر تجویز کریں۔ اقبال نے ۱۸ نومبر ۱۹۲۵ء کے خط میں لکھا تھا :۔

" ایک شعر حاضر ہے۔ معلوم نہیں سرورق کے لیے موزوں ہوگا یا نہیں ؎

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشہ دارد
تراشد سینۂ کہسار و پاک از خون پرویز است

راقم الحروف نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں مرقع کے متعدد ابتدائی پرچے جنوری ۱۹۲۶ء سے دیکھے ہیں۔ تمام پرچوں کے سرورق پر یہ شعر نظر آتا ہے ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

یہ شعر زبور عجم کے حصۂ دوم میں صفحہ ۱ پر موجود ہے۔ جنوری ۱۹۲۶ء کے مرقع میں وصل بلگرامی نے اقبال کے اس شعر کا عکس شائع کیا تھا۔ باقی تین شعر زبور عجم میں نہیں ملتے ہیں۔

بنام سجّاد حیدر یلدرم

فراز کار آفرین دانم کہ با این ذوق پیدائی
زما پوشیدہ دارد شیوہ ہائے کار سازی را

اگر این کار را از نفس دانی چہ نادانی
دمِ شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را !

سیّد سجّاد یلدرم

اُردو کے مشہور و معروف ادیب اور افسانہ نگار ۱۸۸۰ء میں نہٹور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی۔اے کے بعد بغداد کے برطانوی کونسل خانے میں ترکی ترجمان کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ بغداد سے واپسی پر راجہ صاحب محمود آباد کے سکریٹری رہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو یلدرم رجسٹرار مقرر ہوئے۔ چند سالوں کے بعد بحیثیت ریونیو کمشنر جزائر انڈمان چلے گئے۔ ملازمت کا آخری حصّہ غازی پور اور اٹاوہ میں گزرا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ بقول رفیع الدین ہاشمی (خطوطِ اقبال صفحہ ۱۵) ۱۱ر اپریل سنہ ۱۹۴۳ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ جلیل احمد سے مراد جلیل احمد قدوائی اُردو کے مشہور و معروف ادیب۔ اقبال نے یہ غزل جو زبورِ عجم (حصّۂ دوم) میں غزل نمبر ۳۷ کے تحت چھپی ہے سجاد یلدرم کو علی گڑھ میگزین جوبلی نمبر سنہ ۱۹۲۵ء کے لیے بھیجی تھی۔ چنانچہ میگزین کے صفحہ ۵۴ اور صفحہ ۵۵ کے درمیان اقبال کے خط کے ساتھ ہی چھپی ہے۔

اس خط کا متن اور عکس فضل حق قریشی نے صحیفہ "اقبال نمبر" حصّہ اوّل میں علی گڑھ میگزین کے حوالے سے شائع کیا۔ تیسری بار خط کا متن خطوطِ اقبال" مرتبہ رفیع الدین ہاشمی صفحہ ۱۵ء میں شائع ہوا۔ [ادارہ]

کلامِ اقبال بخطِ اقبال

[illegible]

محمد اقبال
لاہور

[illegible]

ـے خیال (لاہور)

ایک مشہور و معروف رسالہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر لاہور کے
ادیب اور صحافی حکیم محمد یوسف حسن تھے۔ حکیم صاحب پہلے شخص
مشہور رسالے حال تک کا ڈول ڈالا تھا۔ یہی وہ اولین صحافی تھے
ں نے ۱۹۳۲ء میں اقبال کی زندگی میں بہت ہی ضخیم "اقبال نمبر"
کیا تھا۔ اس رسالے میں اقبال کا کلام بھی گاہے گاہے چھپتا تھا۔
خیال" کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا تھا۔ محمد طفیل
ایڈیٹر نقوش لاہور نے ان کے انتقال سے قبل ۱۹۷۷ء میں اقبال نمبر
سرا ایڈیشن بہت سے اضافوں کے ساتھ نقوش لاہور اقبال نمبر کے
م سے شائع کیا۔

نیرنگ خیال بہت ہی عمدہ چھپتا تھا۔ چھپتے ہی ادبی حلقوں میں
ہوا۔ پہلے شمارے کا سرورق معروف مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے تیار
تھا۔ اس میں مشاہیر ادب کی تصویریں بھی چھپتی تھیں۔ راقم کی نظر
متعدد شمارے گزرے ہیں جن میں اقبال کی نایاب تصویریں چھپی ہیں۔
قبال اس رسالے کو پسند کرتے تھے چنانچہ ۱۰ اگست ۱۹۲۴ء کے خط
م صاحب کو لکھتے ہیں :-

رسالہ نیرنگ خیال جو حال ہی میں لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے۔
بہت ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مضامین میں پختگی اور متانت پائی جاتی
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں صحیح ادبی مذاق پیدا کرنے میں مفید
ثابت ہوگا۔ ایڈیٹر دونوں (حکیم محمد یوسف حسن اور ڈاکٹر تاثیر) نوجوان
ہیں اور لٹریچر کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں۔ جناب عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویر
"تحفۂ لیلیٰ" بہت خوبصورت ہے۔ دیکھ کر مسرت ہوئی۔ دیکھئے اب تحفۂ قیس
کب نکلتا ہے" ص۱

اقبال کا یہ خط ایڈیٹر نے "ا" کے تحت اگلے شمارہ میں شائع کیا تھا۔ یہ نظم
اپنے دستِ خاص سے لکھ کر ایڈیٹر کو بغرض اشاعت عنایت فرمائی تھی یہ نظم
م حصۂ دوم میں شامل ہے۔ ص۲

یہ خط پہلی بار نیرنگ خیال اگست ۱۹۲۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ دوسری
سی افضل قریشی نے "نیرنگ خیال" کے حوالے سے اس خط کا پتہ مضمون علامہ
سے متعلق غیر مدون تحریریں، مطبوعہ صحیفہ (لاہور) جنوری ۱۹۷۱ء میں
یا گیا۔ ص۲ [illegible]
ـ فارسی، مطبوعہ [illegible]

حالی پر قطعہ بخطِ اقبال

❁

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد
سید دگر او را نمے از اشکِ سحر داد

حالی ز نواہائے جگر سوز بیاسود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

محمد اقبال

۲۴ جولائی ۳۵ء

لاہور

۲۴ اور ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو پانی پت میں مولانا حالی کے صد سالہ یومِ ولادت کا جشن منایا گیا۔ اقبال بھی اس تقریب پر موجود تھے۔ انہوں نے حالی کی تعریف میں جو قطعہ تخلیق کیا تھا وہ تکلیف کی وجہ سے جلسے میں نہ پڑھ سکے کسی دوسرے شخص نے یہ قطعہ پڑھ کر سنایا تھا۔ تفصیلات کے لیے راقم الحروف کا مضمون خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر اقبال مطبوعہ نیا دور لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۸۳ء دیکھا جا سکتا ہے۔

قطعہ بخطِ اقبال، اقبال نامہ [حصہ اوّل] ص: ۳۴۰ سے لیا گیا ہے [ادارہ]

تقدیم اقبال بنام راجہ صاحب محمود آباد

بانگِ درا

(مجموعہ کلامِ اُردو مرتبہ مصنف)

اقبال

ضربِ کلیم

یعنی

اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اقبال

راجہ صاحب محمود آباد :۔ سنی ابن سنی راجہ محمد امیر احمد خاں ۲۴ ؍ نومبر کو محمود آباد ضلع سیتا پور (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ محمود آباد کا قصبہ تین سو برس ان کے اجداد نے آباد کیا تھا۔ ان کا خاندان پشت در پشت خطابات سے نوازا گیا۔ ان کے پردادا نواب علی خان تخلص سحر شاگرد ناسخ کو شاہانِ اودھ نے باقاعدہ "راجہ" کا خطاب عنایت کیا تھا۔ راجہ محمود آباد کو بچپن سے علمی ادبی ماحول ملا۔ ان کے والد مہاراجہ سر محمد علی خان دادا راجہ امیر حسن خاں بر الدولہ تخلص سحر اچھے شاعروں میں تھے اور سبھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ خود زیر نظر راجہ صاحب غزل میں تجرا اور مرثیہ میں محب تخلص کرتے تھے۔ ان سرکار سے بڑے بڑے شعرا وابستہ تھے ان میں عزیز لکھنوی، مرزا ثاقب لکھنوی اور ریاض خیر آبادی قابل ذکر ہیں۔ راجہ صاحب کا ایک نادر الوجود کتب خانہ موجود ہے۔ اس میں فارسی، عربی، اردو کے بیش بہا مخطوطات ہیں جن میں اکثر و بیشتر بہت ہی قدیم اور مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ کتب خانہ محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ میں ہے۔ راقم حروف نے پندرہ سال تک متواتر اس سے استفادہ کیا اور کئی کتابیں مرتب کیں۔ راجہ صاحب پاکستان کے شہری ہو گئے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں پاکستان کی طرف سے لندن میں ڈائرکٹر اسلامک کلچر سنٹر مقرر ہوئے تھے۔ ان میں ایک بڑا وصف یہ تھا کہ درویش منش تھے اور فقیری زندگی گزارتے تھے۔ —— ۱۴ ؍ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو لندن میں انتقال کیا۔ ان کی میت مشہد مقدس خراسان میں دفن کی گئی۔ راجہ صاحب جب بھی لاہور آتے تو اقبال سے ملاقات کیا کرتے تھے۔ انہی ملاقاتوں میں اقبال انہیں اپنی کتابیں اپنے دست خاص اور دستخط سے نذر کیا کرتے تھے۔ اب کتب خانہ میں "بانگِ درا" کا تیسرا اور "ضربِ کلیم" کا اوّلین ایڈیشن موجود ہے جن پر اقبال کے دستخط موجود ہیں۔

مکتوبِ اقبال بنامِ جناح

[نئی دریافت]

محمد علی جناح نے اقبال کے اپنے نام موصولہ خطوط کو مدوّن کر کے ۱۹۴۳ء میں ایک مجموعہ مکاتیب شائع کیا تھا جس میں ۱۳ خطوط شامل تھے۔ عبدالرحمٰن بیدنے ان خطوط کا اردو ترجمہ کیا۔ محمد جہانگیر عالم نے محمد علی جناح کے نام دو مزید خطوط [دسمبر ۱۹۳۶ء اور ۱۳۔ اگست ۱۹۳۷ء] دریافت کیے اور ںکتاب "اقبال کے خطوط جناح کے نام" مطبوعہ ۱۹۸۳ء میں اقبال کے تمام ۱۸ خطوط کو زمانی ترتیب سے شائع کیا۔ ان میں ۱۳ + ۲ خطوط میں ء آخر کے تین خطوط پنجاب مسلم لیگ کے سکریٹری غلام رسول خاں کے تحریر کردہ ہیں جو علامہ کی ہدایت پر تحریر کیے گئے تھے۔ اب تک علامہ کے اخطوط دریافت ہو چکے ہیں۔ پیشِ نظر خط، محمد علی جناح کے نام اقبال کا ۱۹واں خط ہے۔ اس خط کا تجزیہ کرتے ہوئے صابر کلوروی اپنے مقالہ مطبوعہ "اقبالیات" جنوری، مارچ ۱۹۸۸ء، اقبال اکاڈمی، پاکستان] میں لکھتے ہیں کہ :

- ○ پروفیسر محمد جہانگیر عالم کی مرتبہ "اقبال بنام جناح" کے زمانی ترتیب سے ۱۸ خطوط کا مطالعہ اس نہج سے کہ ان خطوط کے درمیان کہیں کوئی خلا، تو نہیں جو مزید ایک یا ایک سے زائد خطوط کی نشان دہی کر سکے۔
- ○ خطوط میں بعض اشارے ایسے موجود تھے جن سے دو مزید خطوط کا امکان روشن ہوتا ہے، ایک ۸، دسمبر ۱۹۳۶ء کا خط اور دوسرا ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کا خط ہے۔
- ○ اوّل الذکر خط میں جس خط کا اشارہ ہے وہ غلام رسول خاں نے علامہ اقبال کی ایماء پر لکھا تھا لیکن یہ خط دریافت ہو گیا ہے، اس پر اقبال کے نہیں بلکہ غلام رسول خاں کے دستخط ہیں لہٰذا اسے اقبال کا خط قرار نہیں دیا جا سکتا۔
- ○ اقبال کا یہ دوسرا نو دریافت خط ۱۰ مئی ۱۹۳۷ء کا ہے لیکن اس پر اقبال کے دستخط نہیں صرف سوادِ خط ہی میں اقبال کا نام تحریر کر دیا گیا ہے۔ اندازِ تحریر بھی اقبال کے مخصوص طرزِ تحریر سے قطعی مختلف ہے۔

بن مقالہ نگار نے اس خط کو علامہ اقبال کا خط تسلیم کرتے ہوئے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ یہ ہیں :

[۱] مذکرہ خط کی پیش گوئی دو سال قبل کر دی گئی تھی۔ [۲] یہ خط محمد علی جناح کے ذاتی کاغذات سے دستیاب ہوا ہے اور پنجاب میں اقبال نام کے کسی اور صاحب کی محمد علی جناح سے خط و کتابت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ [۳] اس خط کے مندرجات میں جو امور پیش کیے گئے ہیں وہ علامہ کے پسندیدہ ہیں۔ [۴] مکاتیبِ اقبال میں متعدد ایسے خطوط ہیں جو اقبال کے ہاتھ کے نہیں ہیں۔ علامہ اپنی شدید علالت کے سبب اپنے بعض قریبی احباب سے خطوں کے جواب لکھوایا کرتے تھے۔ [۵] ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے اوائل کے بعض خطوط علامہ کے تحریر کیے ہوئے نہیں ہیں۔ [۶] انگریزی کے تمام دستیاب خطوط کی عکسی نقول کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکرہ خط ڈاکٹر عبداللطیف کے نام علامہ کے لکھے گئے خط سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ یہ خط اب تک غیر مدوّن ہے اور عجائب خانہ لاہور میں محفوظ ہے۔ اس خط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف کا خط اقبال نہیں پڑھ سکے تھے بلکہ علامہ کے بچوں کے گورنس ڈورس احمد نے یہ خط پڑھ کر علامہ کو سنایا تھا۔ اس خط کا جواب اسی جرمن خاتون کے قلم سے لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف اور جناح کے نام اقبال کے دونوں خطوط کا زمانۂ تحریر اور سوادِ خط ایک ہی ہے۔

خط کا عکس، انگریزی متن اور اردو ترجمہ اقبالیات جنوری، مارچ ۱۹۸۸ء، اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور سے ماخوذ ہے۔

مکتوب اقبال بنام جناح

Lahore
10th May '37

My dear Mr Jinnah,

Thank you for your letter which reached me in due course. I am glad to tell you that the pro-League feeling is rapidly progressing in the Punjab and that the Punjab Moslems including the Unionists will give you their full support. I should like to know whether it would be possible for you to tour through N. India and to spend a few days in each province visiting important towns before the All-India Moslem League Session at Meerut. I think it is necessary to make suitable changes in the constitution of the League with a view to bring the League in closer touch with the masses which have so far taken no interest in the political activities of the upper-middle class of the Moslems. It is the complaint of the average Moslem that our leaders think in terms of offices only, and that the vacancies in the various Govt. departments generally go

to the relations or friends of the Unionists.
That is why the average Moslim takes little
interest in our political affairs. I personally
believe this complaint to be genuine and
hope that you will think out some suitable
changes in the constitution of the League
which will make the masses more hopeful
of the League & its activities. Please drop
a line in reply

Yours sincerely

Mohammed Iqbal

Lahore,
10th May, 37.

My dear Mr. Jinnah,

Thank you for your letter which reached me in due course. I am glad to tell you that the Pro-League feeling is rapidly progressing in the Punjab and that the Punjab Moslims including the Unionists will give you their full support. I should like to know whether it would be possible for you to tour through N. India and to spend a few days in each province visiting important towns before the All India Moslim League session at Meerut. I think it is necessary to make suitable changes in the constitution of the League with a view to bring the league in closer touch with the masses which have so far taken no interest in the political activities of the upper – middle class of the Moslims.

It is the complaint of the average moslim that our leaders think in terms of office only, and the vacancies in the varios Govt Departments generally go to the relations or friends of the Unionists, that is why the average moslim takes little interest in our political affairs. I personally believe this complaint to be genuine and hope that you will think out some suitable changes in the constitution of the league, which will make the masses more hopeful of the league & its activities.

Please drop a line in reply.

Yours sincerely,
Mohammed Iqbal.

مکتوبِ اقبال بنام جناح

(اردو ترجمہ)

لاہور

۱۰ مئی ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب!

آپ کے خط کا بہت شکریہ جو مجھے دریں اثنا موصول ہُوا۔ مجھے آپ کو یہ بتانے میں بہت خوشی محسوس ہوتی ہے کہ پنجاب میں لیگ کی نسبت ہمدردانہ جذبات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، اور یہ کہ یونینسٹوں سمیت پنجاب کے مسلمان آپ کی پس پشت پناہی کریں گے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہو گا کہ آپ شمالی ہند کا ایک دورہ کریں اور میرٹھ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سے پہلے، ہر صوبے میں، اہم شہروں میں جائیں۔ میرا خیال ہے کہ مسلم لیگ کے آئین میں مناسب تبدیلیاں کرنا ضروری ہیں تاکہ مسلم لیگ کو عوام الناس کے قریب تر لایا جائے جنہوں نے اب تک مسلمانوں کے بالائی متوسط طبقے کی سیاسی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ متوسط مسلمان طبقے کو شکایت ہے کہ ہمارے لیڈروں کو صرف اپنے عہدوں سے دلچسپی ہے، اور یہ کہ حکومت کے مختلف محکموں میں خالی اسامیاں یونینسٹوں کے رشتہ داروں یا دوستوں کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا متوسط طبقہ سیاسی معاملات میں کم دلچسپی لیتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کی شکایت بجا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لیگ کے دستور میں چند مناسب ترمیمات کے بارے میں ضرور غور کریں گے جس سے عوام الناس میں، لیگ اور اس کی سرگرمیوں کے ضمن میں، بہتر توقعات پیدا ہوں گی۔

براہِ کرم اپنے جواب سے سرفراز فرمائیں!

آپ کا مخلص

محمد اقبال

اقبال کا ایک نادر مکتوب

پروفیسر رحیم بخش شاہین کو اقبال کا یہ خط، ڈاکٹر وحید احمد (استا
شعبۂ تاریخ، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد) کے توسط سے حاصل
ہوا۔ پروفیسر موصوف نے انگریزی خط کا متن اور اردو ترجمہ مناسب
حواشی کے ساتھ اقبال ریویو (مطبوعہ جولائی ۱۹۸۴ء، لاہور) میں
شائع کیا۔ اسی خط کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے اپنی تحقیقی کتاب
"اقبال یورپ میں" (مطبوعہ: ۱۹۸۵ء) نئے حواشی کے ساتھ شائع کیا
اقبال ریویو سے یہی مقالہ "اقبال ۸۴ء" (مطبوعہ ۱۹۸۵ء، اقبا
اکادمی پاکستان، لاہور) میں شامل کیا گیا۔ اقبال کا ۸۷ سال پر
یہ خط مکاتیبِ اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ مس نینسی آرنل
سر طامس آرنلڈ کی صاحب زادی تھیں۔

اس خط کے حواشی پروفیسر رحیم بخش شاہین اور ڈاکٹر سعید
اختر درانی کے حاشیوں سے مرتب کیے گئے ہیں۔

LAHORE
11TH JAN.1911

MY DEAR NANCY,

LAST MONDAY EARLY IN THE MORNING WHEN I WAS MEDITATING OVER THE VANITIES OF LIFE MY SERVANT BROUGHT ME YOUR XMAS CARD. YOU CAN IMAGINE HOW GLAD I WAS TO RECEIVE IT, ESPECIALLY BECAUSE IT PUT ME IN MIND OF THE HAPPY DAYS THAT I HAD SPENT WITH MY GURU IN ENGLAND. I AM INDEED THANKFUL TO YOU FOR THIS NICE PRESENT.

I SUPPOSE YOU ARE GETTING ON WELL WITH YOUR LESSONS IN BOTANY.WHEN I COME NEXT TIME TO ENGLAND TO KISS THE FEET OF MY GURU, I HOPE YOU WILL EDUCATE ME IN THE NAMES OF ALL THE FLOWERS THAT GROW IN THE BEAUTIFUL VALLEYS OF ENGLAND. I STILL REMEMBER THE SWEET WILLIAMS, THE BLUE BELLS, THE LOVELY TULIPS; SO THAT YOU SEE THAT YOUR PUPIL HAS NOT (GOT) A BAD MEMORY.

YOU KNOW THAT MY GURU IS AT PRESENT VERY BUSY-LOOKING AFTER THE WELFARE OF YOUNGER HUMANITY - SO DO ACT A GOOD PROPHET BETWEEN HIS DIVINITY AND THE POOR MORTAL IQBAL WHO IS ANXIOUS TO KNOW ALL ABOUT HIM. I AM SURE HE WILL NOT RESTRICT HIS REVELATIONS TO YOU WHICH YOU WILL COMMUNICATE TO ME IN DUE COURSE.

I AM AFRAID I MUST CLOSE THIS LETTER NOW. THE LITTLE BLACK DAUGHTER OF MY SISE IS CRYING DOWNSTAIRS, AND HAS BEEN DISTURBING MY QUIET SINCE MORNING. SHE IS A PERFECT NUISANCE, BUT I HAVE TO TOLERATE HER, BECAUSE HER FATHER IS VERY DUTIFUL SERVANT.

PLEASE DO REMEMBER ME TO FATHER, MOTHER, AUNTEE AND MARCAS IF YOU EVER WRITE TO THEM.

YOUR AFFECTIONATELY

MD. IQBAL.

MISS NANCY ARNOLD,
24, LAUNCETON PLACE,
KENSINGTON GATE,
(ENGLAND) LONDON W

لاہور

۱۱۔ جنوری ۱۹۱۱ء

عزیزہ من نینسی[1]!

گزشتہ پیر کو صبح سویرے جب کہ میں زندگی کی چھوٹی رنگینیوں پر غور کر رہا تھا۔ میرا ملازم تمہارا کرسمس کارڈ لایا تم تصور کر سکتی ہو کہ میں اسے وصول کر کے کتنا مسرور تھا خصوصاً اس بنا پر کہ اس نے مجھے وہ خوش گوار دن یاد دلا دیے جو میں نے اپنے گروٹ[2] کے ساتھ انگلستان میں گزارے تھے۔ میں اس عمدہ تحفے کے لیے یقیناً تمہارا شکر گزار ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم نباتات پر اپنے اسباق سے اچھی طرح نباہ کر رہی ہو۔ جب میں اگلی مرتبہ اپنے گروٹ کی قدم بوسی کے لیے انگلستان آؤں گا تو مجھے امید ہے کہ تم مجھے ان تمام پھولوں کے نام سکھاؤ گی جو انگلستان کی حسین وادیوں میں اُگتے ہیں۔ مجھے ابھی تک سویٹ ولیمز[3]، بلو بیلز[4] اور لپ ٹیولپیز[5] کے نام یاد ہیں (یہ نام اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ تمہارے طالب علم کی یادداشت اتنی بُری نہیں ہے۔

تم جانتی ہو کہ میرے گروٹ[6] فی الحال نوجوان انسانیت کی بہبود کی دیکھ بھال میں بہت مصروف ہیں[7] لہٰذا ان کی الوہیت اور بچارے فانی اقبال کے درمیان ایک نیک پیغمبر کا کام کرو جوان کے بارے میں سب کچھ جاننے کا مشتاق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے تم سے نہیں چھپائیں گے جو تم مجھے سب مکمل بتا دو گی۔

مجھے افسوس ہے کہ مجھے اب یہ خط لکھنا بند کر دینا ہے کیونکہ نچلی منزل پر میرے سائیس کی ننھی کالی لڑکی رو رہی ہے اور اس نے میرا سکون غارت کر رکھا ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک تکلیف دہ وجود ہے لیکن مجھے اسے برداشت کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کا باپ ایک فرض شناس ملازم ہے۔

براہ کرم اپنے والد، والدہ، بچّی اور مرفش[8] سے میرا ذکر کرنا اگر تم اسے کبھی خط لکھو۔

تمہارا محب:

محمد اقبال

مس نینسی

۲۴ لانسٹن پیلس

کین سنگٹن گیٹ،

لندن ویسٹ، (انگلستان)

حواشی

(۱) اس وقت مس نینسی کی عمر تقریباً ۱۴ سال تھی۔ (۲) پروفیسر طامس آرنلڈ مراد ہیں۔ (۳) ایک سخت جان سدا بہار پھول دار پودا جو آسانی سے نشوونما پاتا ہے اور کئی برس تک تر و تازہ رہتا ہے۔ اس میں موسم بہار میں پھول کھلتے ہیں۔ جو سفید، گہرے گلابی، قرمزی اور سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ (۴) سوسن کی قسم کا ایک خوشبودار پھول جس کی شکل گھنٹی کی سی ہوتی ہے، اسے جرس پھول بھی کہا جاتا ہے۔ (۵) گل لالہ کی قسم ہے، سرخ رنگ کا پھول۔ (۶) اس زمانے میں پروفیسر آرنلڈ، انگلستان میں زیر تعلیم ہندوستانی طلبہ کی مدد کے مشیر تعلیم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ (۷) AUNTIE دراصل لفظ AUNT کی جانی پہچانی صورت اور AUNTY کی طرح سے اس کی تصغیر ہے۔ (۸) شاید اس سے مراد سر طامس کے دوست اور مشہور سیاح اور ماہر آثار قدیمہ SIR MARC AUREL STEIN. سے ہے۔

کلامِ اقبال کے دو قدیم مخطوطے

مشہور محقق گیان چند جین کو علامہ اقبال کے دو قدیم مخطوطے حیدر آباد کے ایک صاحبِ ذوق عبدالصمد خاں سے دستیاب ہوئے ان میں سے ایک محمد انور خاں [طالب علم، جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ ۱۹۲۴ء] کا مرتب کردہ قلمی کلامِ اقبال اور دوسرا مخطوطہ عماد الملک سید حسین بلگرامی کے ذخیرے سے عبدالصمد خاں نے خریدا تھا جو "بیاض" کے نام سے موسوم ہے۔ ان دونوں مخطوطات کا بڑا حصہ "بانگِ درا" کی اشاعت [۱۹۲۴ء] سے قبل کا ہے۔ ان دونوں مخطوطات میں اقبال کا منسوخ کلام بکثرت موجود ہے۔ ان میں "بانگِ درا" کی نظموں اور غزلوں کا قدیم متن ہے یعنی ایک طرف ان میں منسوخ اشعار شامل ہیں اور "بانگِ درا" کے متداول اشعار میں سے بعض کا قدیم متن دیا ہے۔ مرتبین نے یہ سارا کلام رسائل ہی سے جمع کیا ہے انھوں نے کہیں کہیں ماخذ کی نشاندہی بھی کی ہے، بیشتر صورتوں میں نہیں کی۔ عماد الملک نے رسائل کے شماروں کا حوالہ دینے پر زیادہ توجہ کی۔ ان مخطوطات میں "بانگِ درا" کے بعد کے کسی اردو مجموعے کی باستثنائے "ساقی نامہ" [بالِ جبریل] ایک بھی نظم یا غزل نقل نہیں کی۔

گیان چند جین نے اگست ۱۹۰۸ء تک کے اردو کلامِ اقبال کو تاریخی ترتیب سے مرتب کر کے شائع کیا ہے اور اس کی بنیاد متذکرہ دونوں مخطوطات پر رکھی ہے۔ کتاب کا نام ہے "ابتدائی کلامِ اقبال" بہ ترتیب مہ و سال۔ [مطبوعہ اردو ریسرچ سینٹر، حیدر آباد، ۱۹۸۸ء] کتاب میں تمام متداول و منسوخ کلام کو جمع کیا گیا ہے، ساتھ ہی مفید حواشی اور اختلافِ نسخ بھی دیا گیا ہے۔

یہاں جو عکس دیے جا رہے ہیں وہ محمد انور خاں کی بیاض "کلامِ اقبال" سے لیے گئے ہیں۔ یہ عکس گیان چند جین صاحب کے مقالے "کلامِ اقبال کے دو قدیم مخطوطے"، [مطبوعہ "اقبالیات" شمارہ جولائی، ستمبر ۱۹۸۰ء، اقبال اکادمی پاکستان] میں شامل ہیں۔ نظم "قطرہ اشک" "بانگِ درا" میں شامل نہیں یہ کس رسالے میں شائع ہوئی اس کا ماخذ بھی معلوم نہیں۔ اس کے متن میں ۳ غلطیاں ہیں جسے پروفیسر گیان چند نے اپنے متن میں درست کر دیا ہے وہ یہ ہیں: مہر جہاں فروز، اوڑھ کر، ہنگامہ ساز۔

دوسری نظم "عورت" ہے۔ اس نظم کا ماخذ بھی معلوم نہیں۔ یہ نظم ۱۹۰۵ء سے بہت پہلے کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ اقبال کی ایک نظم "محبت" [بانگِ درا] کو نظم "عورت" کا نقشِ ثانی کہا جا سکتا ہے۔ فنی اعتبار سے نظم "عورت" میں بہت سی خامیاں ہیں۔ "قطرۂ اشک" اور "عورت"، یہ دونوں نظمیں متذکرہ مخطوطے کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتیں۔

قطرۂ اشک

[illegible]

اقبال کا ایک نایاب خطبہ

علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں ایک خطبہ دیا تھا جس کا عنوان ہے :

THE MUSLIM COMMUNITY:
A SOCIOLOGICAL STUDY

اس خطبے کے بعض اقتباسات ، ایس ۔ اے ۔ واحد کی کتاب THOUGHTS اور شاملو کی SPEECHES میں شامل ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی اقبال کی مختلف نثری کتابوں میں موجود ہے لیکن اصل انگریزی متن نثر اقبال کے کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو یہ مکمل اور غیر مطبوعہ نایاب خطبہ اپنی تحقیق کے دوران اقبال میوزیم [لاہور] سے دستیاب ہوا تھا جسے انھوں نے تعارفی نوٹ کے ساتھ مجلہ تحقیق [جلد ۳، شمارہ ۱، اکتوبر ۱۹۸۰ء] میں شائع کیا۔ یہی مکمل متن ڈاکٹر ہاشمی کی تالیف "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" [مطبوعہ ۱۹۸۵ء] کے صفحہ نمبر ۴۴۹ تا ۴۶۸ پر دیا گیا ہے ۔ یہ عکس اسی کتاب مذکور سے لیا گیا ہے۔

اب یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اصل خطبہ معدوم ہو چکا ہے، خود اقبال کے پاس بھی اس کی نقل محفوظ نہ تھی لیکن بعد میں انھیں کہیں سے ایک نقل مہیا ہو گئی ، چنانچہ انھوں نے مضمون پر نظر ثانی کرتے ہوئے ابتدائی مسودے میں بعض ترمیمات کیں اور آغاز میں ایک وضاحتی شذرہ بھی تحریر کیا جو اس مضمون کے پس منظر پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ شذرہ اقبال کی اپنی تحریر میں ہے۔ تحریر کا عکس اور انگریزی متن یہاں پیش کیا جا رہا ہے ۔ اصل خطبے کا متن طویل ہونے کے سبب یہاں نہیں دیا جا سکا۔

خطبہ علی گڑھ کے مسودے پر علامہ اقبال کا وضاحتی

اقبال کی ایک نایاب درسی کتاب

منظور شدہ سررشتہ تعلیم پنجاب صوبہ جات متحدہ و مدراس

سلسلۂ ادبیہ

اُردُو کورس

پانچویں جماعت کے لیے

مؤلفہ

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا

سابق ممبر پنجاب لیجسلیٹو کونسل

و

حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو کونسل

۱۹۳۷ء

گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز پبلشرز انار کلی لاہور

نے

مہتہ جیشا پنجاب آرٹ پریس لاہور میں باو سپاہے لال کے اہتمام سے چھپا

ایڈیشن سوم — بار ششم — قیمت ۸ روپیہ

*

علامہ اقبال نے درس و تدریس سے متعلق ہوتے ہوئے مختلف جماعتوں کے لیے اردو اور فارسی کی متعدد کتابیں مرتب کیں۔ مڈل کی چاروں جماعتوں [اس زمانے میں اول تا چہارم جماعتیں پرائمری درجے میں اور پنجم تا ہشتم جماعتیں مڈل درجے میں شمار ہوتی تھیں] کے لیے اردو کورس اور میٹرک کے لیے فارسی کتاب "آئینۂ عجم"۔ اردو کورس کی چاروں کتابیں حکیم احمد شجاع کے اشتراک سے مرتب کیں۔

ششم، ہفتم اور ہشتم جماعتوں کے لیے اردو کورس کی تین کتابیں ۱۹۲۴ء میں مرتب کی گئیں۔ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی "اردو ادب کمیٹی" نے ۲۶ جنوری ۱۹۲۵ء میں ان کتابوں کی اشاعت کی منظوری دی لیکن کتابیں پہلے ہی طبع کرلی گئی تھیں۔ ان کتابوں کے سرورق پر "سلسلہ ادبیہ" درج ہے

"سلسلہ ادبیہ" کی مذکرہ بالا تین کتابوں کا حوالہ بعض کتابیات اور [مرتبہ: بشیر احمد ڈار، ۱۹۶۷ء، کراچی] میں موجود ہے لیکن ز "اُردو کورس پانچویں جماعت کے لیے" کا ذکر اقبال کے کسی تذکرے یا کتابیات میں نہیں ملتا۔ ماہرین اقبالیات اس کتاب سے لاعلم ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی تحقیقی کتاب "تصانیفِ اقبال میں پہلی بار اس کتاب کا تعارف پیش کیا ہے۔ کتاب کے سرورق کتاب مذکور سے یہاں دیا جارہا ہے۔

پانچویں جماعت کے لیے "اردو کورس" ۱۹۲۸ء میں مرتب کی کتاب بھی علامہ اقبال اور حکیم احمد شجاع کی مشترکہ تالیف ہے درسی کتاب کو بھی پنجاب صوبہ جات متحدہ اور مدراس کی ٹیکسٹ بک کمیٹیوں نے م سابقہ تین کتابوں ہی کی طرح اس درسی کتاب کا معیار و مزاج رکھا نثری مضامین اور کہانیاں نسبتاً مختصر ہیں۔ ۳۰ نثر پاروں کے مقا منظومات شامل ہیں۔ کتاب کا آغاز حمد بہ عنوان "خدا کی قدرت" ہوتا ہے۔ قلم کاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، سید احمد دہلوی، سر سید ا اسمٰعیل میرٹھی، نواب محسن الملک، حالی، رتن ناتھ سرشار، م محمد حسین آزاد، نظیر اکبر آبادی، حسن نظامی، پریم چند، اور اکبر آبادی کے ساتھ ساتھ نسبتاً نئے اور غیر معروف نام مثلاً: تلوک چ اعظم کریوی، حامد حسن میرٹھی، حمید عالم چشتی، افسر میرٹھی اور سہاروی شامل ہیں۔ متن کتاب ص ۲۳۹ پر ختم ہوتا ہے۔ کتاب میں ایک مفصل فرہنگ [ص: ۲۴۰ تا ۲۷۱] شامل ہے

"سلسلہ ادبیہ" کی اس کتاب کا ایک نمایاں اور انفرادی پہلو یہ کہ مؤلفین کی خواہش پر اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر سید ا شاداں بلگرامی نے اس نصاب کی زبان پر بہ حیثیت صحت و متع کی۔ یہ کتاب سلسلہ ادبیہ کی دوسری کتابوں کی طرح متعدد بار رہی۔ یہاں جو عکس دیا جارہا ہے وہ ۱۹۳۷ء کی اشاعت ہے

ظفر الاسلام ظفر
۳۶۔ ملرس روڈ، بنگلور ۔ ۵۶۰۰۴۶

علامہ اقبال کے خطوط بنام متولی محمد عبدالجمیل بنگلوری مرحوم

دنیائے اسلام کے مفکّرِ اعظم، شاعرِ مشرق، ترجمانِ حقیقت حضرت علامہ سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے وہ معاصرین جن کے علامہ ممدوح سے انتہائی قریبی ودوستانہ مراسم رہے اور جن کے درمیان نامہ وپیام کا سلسلہ ایک طویل مدت تک قائم رہا انھیں میں راقم الحروف کے والدین کے ماموں جناب متولی محمد عبدالجمیل بنگلوری مرحوم کا اسمِ گرامی ایک منفرد ونمایاں مقام کا حامل ہے۔ گو مرحوم کا نام آج بھی بنگلور کے ادبی وعلمی حلقوں میں نہایت ہی قدر ومنزلت سے لیا جاتا ہے مگر افسوس کہ بیرونِ بنگلور ان کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ جمیل صاحب ایم عبدالجمیل یا ایم اے جمیل کے نام سے بھی موسوم تھے شہر بنگلور کے ایک معزز اور متمول گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ جناب متولی محمد عبدالجمیل بن متولی محمد عبدالرؤف بن محمد سلیمان بن محمد معروف کی پیدائش ۱۲؍مئی ۱۸۹۷ء کو قدیم ریاستِ میسور کے دارالحکومت دارالسرور بنگلور میں ہوئی۔ آپ کے جدِ امجد حضرت محمد معروف رحمۃ اللہ علیہ بنگلور معسکر کی مشہور ومعروف مسجد جامع معروف عرف لال مسجد کے بانی تھے اور انھوں نے اپنے ذاتی خرچ سے ۱۸۴۸ء میں اس کی تعمیر فرمائی تھی۔ بانی مسجد کے انتقال کے بعد آپ کے والد بزرگوار محمد عبدالرؤف صاحب اس مسجد کے متولی بنے ان کی رحلت [مورخہ ۹؍دسمبر ۱۹۲۴ء] کے بعد جناب محمد عبدالجمیل اس کی مسندِ تولیت پہ جلوہ افروز ہوئے اور اپنی حیاتِ مستعار کے اختتام بتاریخ ۱۱؍اپریل ۱۹۴۳ء تک اس مسجد کے انتظام وانصرام کے فرائض کماحقہٗ بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

جمیل مرحوم ایک متحرک وفعال قومی، ملّی کارکن تھے۔ مسلمانوں کے بحران وانتشار سے وہ باخبر، اور معاشی واقتصادی بدحالی سے واقف تھے اس لیے ہر وہ اصلاحی تحریک جو مسلمانوں کی فلاح وبہبودی کی خاطر روبۂ عمل لائی جاتی اس میں وہ پیش پیش رہتے۔ آپ طالب العلمی کے زمانے سے کانگریس پارٹی سے وابستہ رہے اور میسور ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے ممبر رہے نیز خلافت کمیٹی کے بھی ممتاز ومتحرک ممبر رہے۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی کی مشترکہ تحریک ترکِ موالات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مدراس میں منعقدہ مورخہ ۱۶؍اور ۱۷؍اپریل ۱۹۲۰ء کی خلافت کانفرنس میں جو مولانا شوکت علی کی صدارت میں ہوئی آپ نے بنگلور خلافت کمیٹی کے مندوب کی حیثیت سے شرکت فرمائی اور مولانا شوکت علیؒ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں مصطفےٰ کمال پاشاہ اتاترک کی قیادت میں جب انگورہ میں جمہوریت قائم ہوگئی اور ترکی میں خلافت توڑ دی گئی تو گویا ہندوستان کی خلافت کمیٹی کی روح نکل گئی۔ ۱۹۲۸ء میں بلووں اور ہندو مہاسبھا کے رام راج کے منصوبوں سے خائف ہوکر خلافت کمیٹی کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس سے مل گئی۔ ۱۹۲۹ء میں حضرت علامہ اقبالؒ کے ایما پر جمیل مرحوم نے کانگریس کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ بعد میں آپ ضلع مسلم لیگ کونسل بنگلور کی مجلس عاملہ کے رکن اور سلطان شہیدؒ پرائمری مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ آپ ۲۱؍ستمبر ۱۹۱۹ء کو شہر بنگلور کی مشہور ومعروف مسلم لائبریری کی کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور وفات تک اس لائبریری کی مجلسِ منتظمہ کے ممتاز رکن رہے۔ آپ کی اور جناب محمد صالح بانی وسکریٹری مسلم لائبریری کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ حضرت علامہ اقبال نے اس لائبریری کی دعوت کو قبول فرمایا اور ۹؍جنوری ۱۹۲۹ء کے مبارک دن مسلم لائبریری بنگلور کی جانب سے علامہ اقبالؒ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنے کے لیے گلوب تھیٹر میں ایک شاندار جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔

محمد عبدالجمیل مرحوم کو زبان وبیان پہ کافی دسترس حاصل تھی اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی پر بھی آپ کو کافی عبور تھا۔ آپ کو اوائل عمر ہی سے تحصیل علم کا شوق رہا۔ اپنے خداداد حافظہ اور ذہانت کی بدولت اہلِ علم وفضل کے باوجود تمام عمر ایک طالب علم ہی کی طرح رہے فرصت

کے بیشتر لمحات اردو فارسی اور انگریزی کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کر دیا کرتے تھے۔ کتابوں کے مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ ہندوستان کے اس وقت کے تمام مشہور معروف نامی گرامی کتب فروشوں و مطبعوں سے فہرست کتب منگوایا کرتے اور ہر وہ نئی کتاب جو ان کے خاص موضوعات بالخصوص حضرت علامہ اقبال یا اسلامیات پر شائع ہوتی اس کو فوراً منگوالیا کرتے۔ کتابوں کے علاوہ اس وقت کے تقریباً تمام موقر اخبارات و رسائل کا بھی بے حد شوق و انہماک سے مطالعہ کیا کرتے۔ آپ کے کتب خانے میں آج بھی انگریزی، اردو، فارسی کے شہ پاروں کے علاوہ بڑی تعداد میں اخبارات و رسائل اور ان کے تراشوں کے ذخائر موجود ہیں جن کے بیشتر حصوں پر انہوں نے حاشیہ آرائی کی ہے اور ضروری نوٹ لکھے ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی علمی، ادبی و مذہبی قابلیت و صلاحیت، ذہنی خصوصیات و جامعیت، جمالیاتی ذوق و شوق، قلم کی توانائی اور قرآن، فقہ و احادیث سے عمیق دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے ان کے کئی مقالے بنگلور و بیرونِ بنگلور کے موقر اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

جمیل مرحوم کو علامہ اقبال سے اپنی طالب علمی ہی کے زمانے سے والہانہ عقیدت تھی ان کے کتب خانے میں حضرت علامہ ممدوح سے متعلق و نایاب کتابیں، تصنیفات مقالے، مثنویات وغیرہ موجود ہیں جن سے حضرت علامہ کے تعلق سے ان کی بے پایاں عقیدت و شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔ یوں تو سنہ ۱۹۲۰ء کے دہے سے محمد جمیل مرحوم اور علامہ اقبال کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا تاہم علامہ موصوف سے بالمشافہ ملنے اور نیاز حاصل کرنے کا شرف انھیں حضرت ممدوح کے دورۂ دکن کے وقت حاصل ہوا۔

۵ رجنوری ۱۹۲۹ء کی صبح جب علامہ اقبال اپنے دوستوں چودھری محمد حسین اور پروفیسر عبداللہ چغتائی کے ہمراہ اپنی گراں قدر تصنیف "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" پر لکچر دینے کے سلسلے میں مدراس تشریف لائے تو عاشقِ اقبال کس طرح اپنے محبوب کے دیدار و رفاقت کی سعادت سے محروم رہ جاتے چنانچہ محمد عبدالجمیل مرحوم اپنے عزیز ترین دوست ابوحامد عبدالرحیم کے ساتھ عبدالحمید حسن [جو حضرت علامہ کے دورۂ مدراس کے منتظم تھے] کی دعوت پر عازمِ مدراس ہوئے اور علامہ موصوف کا مدراس سینٹرل ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والے عقیدت مندانِ اقبال کی بھیڑ میں مرحوم بھی شامل تھے۔ حضرت علامہ کے مدراس کے تمام اجلاس بشمول انجمن ترقی اردو مدراس کے جلسہ منعقدہ ۶ رجنوری ۱۹۲۹ء میں شرکت کی۔ مدراس کے گوکھلے ہال میں حضرت علامہ کے ساتھ لی گئی تصویر میں آپ اپنے دوست ابوحامد عبدالرحیم کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ [یہ تصویر اور انجمن ترقی اردو مدراس کا سپاس نامہ اور مدراس کے دعوت ناموں کا عکس ہدیۂ قارئین "شاعر" ہے] مدراس کے تمام اجلاس میں شرکت کرنے اور حضرت علامہ سے نیاز حاصل کرنے کے بعد حضرت علامہ ہی کے ساتھ محمد عبدالجمیل مرحوم اور ابوحامد عبدالرحیم بذریعہ ٹرین ۹ رجنوری کی صبح بنگلور تشریف لائے۔

بنگلور میں مسلم لائبریری کی جانب سے گلوب آپرا ہاؤز، واقع بریگیڈ روڈ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا اور حضرت علامہ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس سپاس نامہ اور مسلم لائبریری کے اعلان کو بھی جمیل صاحب نے محفوظ رکھا تھا جن کے عکس قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ جلسہ کے بعد حضرت علامہ نے کتب خانۂ مسلم لائبریری کا معائنہ کیا اور اپنے تاثرات کو کتاب آراء میں تحریر فرمایا:

"جنوبی ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں میں اور خصوصاً بنگلور کے مسلمان نوجوانوں میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہو چکا ہے جس کو میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے فالِ نیک تصور کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور کی مسلم لائبریری نے اس احساس کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اراکین کتب خانے کو چاہیے کہ تاریخ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ فرمائیں۔"

[حضرت علامہ ممدوح کے ان تاثرات کا عکس مسلم لائبریری بنگلور کے شکریہ کے ساتھ قارئین کی نذر ہے]

بنگلور میں علامہ اقبال حاجی سر اسماعیل سیٹھ کے مہمان تھے۔ ان کے دولت کدہ پر حضرت علامہ کے ساتھ لی گئیں دو تصاویر میں جناب محمد عبدالجمیل اور جناب ابوحامد عبدالرحیم دیکھے جا سکتے ہیں۔

[یہ تصاویر بھی قارئین "شاعر" کی نذر ہیں]

اس طرح بنگلور سے حضرت علامہ کے میسور کوچ کرنے تک جمیل مرحوم علامہ موصوف کے ہم نشین و ہم رکاب رہے۔ علامہ کی لاہور واپسی کے بعد، عبدالجمیل مرحوم سے قریبی دوستانہ مراسلت قائم رہی۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ حضرت علامہ کی رحلت سے تقریباً دو سال قبل تک جاری رہا۔ آخری خط حضرت علامہ نے مورخہ ۶ر مارچ ۱۹۳۶ء کو بھوپال سے لکھا تھا جہاں وہ اپنے برقی علاج کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے اس کے بعد علالت کی وجہ سے بالراست نامہ و پیام کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ تاہم جمیل صاحب علامہ اقبال کے دوست پروفیسر عبداللہ چغتائی کو خط لکھ کر علامہ کی خیریت دریافت کر لیا کرتے۔ پروفیسر عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین سے جمیل مرحوم کی شناسائی اسی سفر میں ہوئی تھی۔

علامہ اقبال کے انتقال کے بعد جب پہلی مرتبہ ہفتہ وار اُخبار قوم معسکر" بنگلور کے زیرِ اہتمام ۱۷ر جون ۱۹۳۸ء میں "اقبال نمبر" شائع ہوا تو جناب محمد عبدالجمیل مرحوم نے نہ صرف "خطباتِ مدراس" پر ایک مقالہ "حضرت علامہ اقبالؒ کی انقلاب انگیز تصنیف "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ پر ایک طائرانہ نظر" کے عنوان سے تحریر کیا بلکہ اس اخبار کے "اقبال نمبر" کے لیے اپنی جانب سے ہر طرح کی امداد بھی فراہم کی جس کا اظہار اس اخبار کے اداریے میں ان الفاظ میں کیا گیا :

"اقبال نمبر کی اشاعت کے سلسلے میں ہم جناب محمد عبدالجمیل صاحب متولی مسجد معروف معسکر بنگلور کے مشکور ہیں کہ آپ نے ہمیں بہت سی مدد دی۔ آپ اقبال کے ایک قدیم عقیدت مند ہیں۔ تقریباً پندرہ سولہ سال سے آپ اقبال کے مداح اور شیدائی ہیں یا یوں کہیئے اقبالی ہیں۔ اقبال کا کوئی کلام یا کوئی مضمون ایسا نہیں جس کو آپ نے حرزِ جاں بنا کر نہ رکھا ہو۔ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، پر آپ کا مضمون اسی نمبر میں شامل ہے۔

بنگلور کے عقیدت مندانِ اقبال میں جناب ابو حامد عبدالرحیم کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ آپ کو اقبال کے کلام اور مضامین کے ساتھ گہرا شغف ہے اور یہ بھی تقریباً اسی زمانے سے اقبال کے شیدائی ہیں جس زمانے سے جناب محمد عبدالجمیل صاحب شیدائی بنے ہیں"

"اقبال کلب" : یہ علامہ اقبال کے لیے بے پناہ عقیدت ہی تھی کہ محمد عبدالجمیل صاحب نے بنگلور میں "اقبال کلب" قائم کیا جس کی اطلاع ہفتہ وار "اخبار قوم" بنگلور معسکر۔ کے مندرجہ بالا "اقبال نمبر" ہی کے اداریے میں اس طرح دی گئی ہے :

"ناظرین کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ جناب محمد عبدالجمیل صاحب نے بنگلور میں "اقبال کلب" قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے اور آپ نے بنگلور کے عقیدت مندانِ اقبال کو دعوت دی ہے کہ وہ اس کلب میں شریک ہوں۔ اقبال کلب کا مقصد یہ ہوگا کہ مہینہ دو مہینہ میں ایک مرتبہ کلب کے ممبر جمع ہوں اور اقبال کے تعلیمات کو سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش کریں۔ صرف وہی اصحاب جو اقبال کے ساتھ عقیدت رکھتے ہوں یا جنھیں ان کے کلام سے دلچسپی ہے اس کلب میں شریک ہوں اور تبادلۂ خیالات کا موقع حاصل کریں۔ مجوزہ اقبال کلب کے لیے کوئی فیس یا چندہ مقرر نہیں ہوگا صرف دلی شوق اور کلامِ اقبال سے دلچسپی کافی ہے۔ جو اصحاب اس طرح کی دلچسپی رکھتے ہوں وہ مدیرِ قوم کی معرفت اطلاع دیں۔"

چنانچہ جمیل صاحب کی کاوشوں سے "اقبال کلب" قائم ہوا اور عقیدت مندانِ اقبال، موصوف کی رہائش گاہ واقع نمبر ۱۔ بوچر اسٹریٹ (موجودہ نمبر ۷ لال مسجد اسٹریٹ "اے" سٹی بنگلور معسکر پر جمع ہوتے اور حضرت اقبال کے کلام اور تعلیمات پر بحث و مباحثہ کرتے۔ تقریباً دس سال تک یہ کلب تشنگانِ کلامِ اقبال کی تشنگی دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا رہا۔ جمیل صاحب کی رحلت کے بعد کوئی ایسی موزوں شخصیت نہیں تھی جو اس کلب کی قیادت کرتی اور اس کو آگے بڑھاتی لہٰذا مرحوم کے ساتھ ہی یہ کلب ختم ہو گیا۔

علامہ اقبال کی مرگِ ناگہاں کے بعد جمیل صاحب نے علامہ کے فرزند جاوید اور چودھری محمد حسین کو خطوط لکھے اور اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ حضرت علامہ کی مکمل سوانح حیات اور ان کے مختلف مضامین اور لیکچرز جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیے جائیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر شیخ عطاء اللہ (شعبۂ معاشیات علی گڑھ) مرتب "اقبال نامہ" نے کو علامہ اقبال کے سات خطوط جو ان کے نام (یعنی بنام محمد عبدالجمیل صاحب) انھیں موصول ہوئے تھے بھیجتے ہوئے اس کا اعادہ کیا۔ راقم الحروف کو ان خطوط کی نقلیں ملی ہیں جو جمیل مرحوم نے چودھری محمد حسین اور شیخ عطاء اللہ کو

بھیجی تھیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے نہ صرف محمد عبدالجمیل مرحوم کی حضرت علامہ سے گہری عقیدت و وابستگی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس سے خود جمیل صاحب کی شخصیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

متولی محمد عبدالجمیل بنام چودھری محمد حسین

بنگلور

۲۳ر فروری ۱۹۴۱ء

مخدومی جناب چودھری محمد حسین صاحب دامت الطافکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

خیریت مزاج گرامی! یاد ہوگا کہ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ جب آپ مدراس اور بنگلور تشریف فرما ہوئے تھے اسی وقت مجھے آپ سے نیاز حاصل کرنے اور ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس کے بعد سے میں حضرت علامہ سے نیاز ناموں میں آپ کی خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا۔ اس کے سوا آپ سے کبھی خط و کتابت کرنے کا موقع نہیں ہوا۔ ہاں کبھی کبھی آپ کے مضامین اخبارات میں پڑھ لیا کرتا تھا جس سے سیرابی ہو جاتی تھی۔ حضرت علامہ کے انتقال پر ملال کے بعد سے جہاں تک مجھے علم ہے آپ کے قلم سے علامہ ممدوح کے متعلق کوئی مضمون نظر سے نہیں گذرا۔ جانے کیا وجہ ہے؟ میری آنکھوں کو تو آپ کے سوا حضرت علامہ کے کارناموں پر سیر حاصل روشنی ڈالنے والا کوئی بندۂ خدا نظر نہیں آتا۔ سنا گیا ہے کہ آپ حضرت علامہ کی سوانح حیات لکھنے میں مصروف ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر یہ بات ہے تو خداوند کریم آپ کی محنت کو ٹھکانے لگائے اور اس کے شائع ہونے کی جلد نوبت آئے۔ وہ دن کیا ہی مبارک ہوگا جب کہ یہ کتاب شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔ علاوہ اس کے میں آپ سے استفسار کرنا چاہتا ہوں کہ کیا حضرت علامہ مرحوم و مغفور کے انگریزی و اردو مضامین اور لکچرز جو وقتاً فوقتاً رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں ان کی کتابی صورت میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ حضرت علامہ کو اس دار فانی سے رحلت فرمائے ہوئے تین سال گذر چکے ہیں لیکن افسوس کہ اس اہم کام کی طرف ابھی توجہ نہ ہوئی۔ جنوبی ہند کا مشہور و باہمت فرم جی۔ اے۔ نٹیسن آئے دن مشاہیر ہند کے مضامین و تقاریر کے مجموعوں کو کتابی صورت میں شائع کرتا رہتا ہے۔ کیا علامہ کے مضامین و تقاریر کو کتابی صورت میں جمع کرنے کا کام کوئی لاہوری فرم نہیں کر سکتا؟ اگر نہیں تو میرے ناقص خیال میں آپ سے موزوں مضامین و تقاریر کو اڈٹ کرنے کے لیے کوئی نہیں ہو سکتا۔ امید ہے کہ آپ اس خصوص کی طرف دھیان دیں گے۔ برائے مہربانی اس کی بابت آپ کا کیا ارادہ ہے اطلاع دے کر ممنونیت کا موقع دیں نیز حضرت علامہ کے کلام و کارناموں پر جو بہترین کتابیں آج تک شائع ہو چکی ہیں ان کی ایک فہرست بھی ارسال کیجیے نوازش ہوگی۔

والسلام

مخلص

محمد عبدالجمیل عفی عنہ

جمیل صاحب کو جب یہ اطلاع ملی کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کے پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے "اقبال نامہ" یعنی مجموعہ مکاتیب اقبال کا حصہ اول مرتب کیا ہے اور اس کا حصہ دوم بھی مرتب کر رہے ہیں تو مرحوم نے علامہ اقبال کے سات خطوط جو ان کے نام موصول ہوئے تھے، پروفیسر مذکور کو مورخہ ۴ر جنوری ۱۹۴۵ء کو بذریعہ رجسٹری پوسٹ ارسال کیے اور ساتھ ایک خط بھی منسلک کیا جس میں انھوں نے اپنا مختصر سا تعارف کروایا ہے۔ اس خط کی نقل قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

متولی محمد عبدالجمیل بنام پروفیسر شیخ عطاء اللہ

بنگلور

۴ر جنوری ۱۹۴۵ء

مخدوم مکرم جناب پروفیسر شیخ عطاء اللہ صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

مجھے ایک عرصہ دراز یعنی ۱۹۱۵ء سے حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور کلام سے ایک والہانہ محبت اور شیفتگی پیدا ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس وقت سے اب تک حضرت علامہ کے ہر لفظ کو جو مجھ تک خوش قسمتی سے پہنچا وہ محفوظ کرتا گیا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ میں ان کے کلام وغیرہ سے کسی قدر مستفیض نہ ہو سکا تھا۔ نہ معلوم یہ کون سی جاذبیت تھی جو ان کی طرف یوں مجھے کھینچے لیے جا رہی تھی۔ اس وقت سے میں دیوانہ وار ان کے ہر مضمون و شعر کو جو مجھ تک پہنچا جمع کرنا شروع کر دیا۔ اب میرے پاس ایک خاصی تعداد ان کی جمع ہے۔ چند سال پیشتر میں عزیزی جاوید سلمہٗ اور حضرت چودھری محمد حسین صاحب کو خطوط لکھے تھے کہ وہ کوشش فرما کر حضرت علامہ مرحوم و مغفور کے مضامین اور لکچرز جمع کر کے شائع کریں لیکن مجھے ایک گونہ مایوسی ہونے لگی جب کہ میں دیکھتا رہا کہ وہ اب تک اس جانب کوئی توجہ مبذول نہ فرمائی۔ خدا عزّ و جل کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ اس کام کے لیے آپ کو تفویض فرما لیا۔ خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں یہ دیکھا کہ آپ اس کام کو اپنے ہاتھوں پورا کرنے کی کچھ ذمہ داری لے لی ہے۔ خدا آپ کی کوششوں کو بار آور کرے۔

یوں تو حضرت علامہ مرحوم و مغفور سے مجھے غائبانہ نیاز حاصل تھا لیکن جب وہ مدراس اپنے لکچروں کے سلسلے میں تشریف فرما ہوئے تو مجھے ان سے بالمشافہ ملنے اور نیاز حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ بنگلور میں بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں جنھیں میں زندگی کے بہترین ایام تصور کرتا ہوں۔ یہ بھی شرف حاصل ہوا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک دو تصویریں بھی کھنچوائیں۔ کہنا یہ تھا کہ اس شرف سے ان کے ساتھ نامہ و پیام جاری رہا۔ یہ چند خطوط جو مجھے تلاش کے بعد ملے ہیں ان کو آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں تاکہ آپ مکاتیبِ اقبال کی دوسری جلد میں اگر آپ ان کو کار آمد سمجھتے ہوں تو ترجمہ کر کے شائع کر دیں یا اگر حضرت علامہ کے انگریزی خطوط میں شائع کرنے کا قصد ہو تو بجنسہٖ شائع کر دیں۔ گذارش خدمت ہے کہ آپ ان خطوط کو بعد نقل واپس کر دیں کیوں کہ ان کو میں تبرکاً اپنے پاس محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ مزید برآں حضرت علامہ کا وہ انگریزی مضمون STRAY THOUGHTS "اسلام اور تصوف" پر جو نیو ایرا NEW ERA مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا اس کی کاپی میرے پاس محفوظ ہے نیز STRAY THOUGHTS کے عنوان سے آپ کے انگریزی میں جو اقوال اسی پرچہ میں شائع ہوئے تھے اس کی ٹائپ کاپی بھی موجود ہے اگر ان دونوں مضامین کی ضرورت ہو تو اطلاع دیجیے روانہ کرتا ہوں۔ "اقبال نامہ" کا دوسرا حصہ کب شائع ہوگا اطلاع دیجیے

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

مخلص :

محمد عبد الجمیل عفی عنہٗ

مندرجہ بالا رجسٹرڈ خط بنام پروفیسر شیخ عطاء اللہ اور اس کے ساتھ ملفوف حضرت علامہ کے انگریزی میں تحریر کردہ خطوط بنام محمد عبد الجمیل کو پروفیسر موصوف نے ۹ جنوری ۱۹۴۵ء کو علی گڈھ میں وصول کیا اور دوسرے ہی دن انہوں نے جمیل صاحب کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

بشرف ملاحظہ مولوی محمد عبد الجمیل صاحب، متولی لال مسجد، بنگلور

۴، ذکاء اللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

مخدومی مولوی صاحب!

السّلام علیکم!

والا نامہ باعث افتخار ہوا۔ اور اقبال کے خطوط بھی موصول ہوئے۔ جزاک اللہ! انشاء اللہ ہفتہ بھر میں نقل کر کے امانت واپس کر دوں گا۔ اطمینان فرما دیں۔ آپ نے مجھے اور ملت کو بڑی دولت عطا فرمائی ہے۔ اقبال نامہ کا حصہ اول آپ نے

ملاحظہ فرمایا ہے یا نہیں ؟ ان خطوط کا ترجمہ حصہ دوم میں شائع ہوگا اور انگریزی نقل میرے پاس رہے گی ۔ اگر کافی تعداد میں انگریزی خطوط مہیا آگئے تو وہ علاحدہ بھی شائع کردوں گا ۔ آپ کے پاس جو سامان ہے مجھے مرحمت فرمادیں میں سب کو محفوظ کرنے کی کوشش انشاء اللہ کروں گا ۔ آپ کی عنایت اور توجہ کا شکریہ ۔ بنگلور میں ایک اور صاحب کے پاس بھی خط ہیں ان کا حوالہ ان خطوط میں موجود ہے ۔ ان کا نام ابا صاحب ہے ۔ میں نے خط لکھا ہوا ہے جواب نہیں آیا ۔ مکرر شکریہ !

مخلص :

عطاء اللہ

حضرت علامہ کے سات خطوط بنام متولی محمد عبدالجمیل مرحوم

"اقبال نامہ" حصہ دوم یعنی مجموعہ مکاتیبِ اقبال ، مرتب : شیخ عطاء اللہ ، شعبہ معاشیات مسلم کالج آف کامرس ، علی گڑھ ، ناشر : شیخ محمد اشرف ، تاجر کتب ، کشمیری بازار لاہور میں مولوی محمد جمیل بنگلوری کے نام سے صفحہ نمبر ۸۸ سے ۹۹ شائع ہوچکے ہیں ۔ یہ تمام خطوط جمیل صاحب نے اپنی رہائش گاہ واقع نمبر ا ۔ بوچہ اسٹریٹ [موجودہ نمبر ۲ ۔ لال مسجد اسٹریٹ "اے"] بنگلور معسکر کے پتہ پر وصول کیے ۔ پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے باوجود وعدہ کے وہ خطوط جمیل صاحب کو واپس نہیں کیے جس کا انہیں تاحیات افسوس رہا ۔ مگر اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ خطوط مرحوم کی حیات میں شائع نہ ہوسکے ۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم ۱۹۵۱ء میں منظر عام پر آیا جب کہ اس سے تقریباً دو سال قبل ہی جمیل صاحب کا انتقال ہوگیا ۔

راقم الحروف کو جمیل مرحوم کے کتب خانے وغیرہ کی کافی تلاش و جستجو کے بعد علامہ اقبال کے دو خط بنام محمد عبدالجمیل [یم ۔ اے ۔ جمیل] دستیاب ہوئے ہیں ۔ مورخہ ۲ / فروری ۱۹۲۱ء کو تحریر کیے گئے خط میں حضرت علامہ نے جمیل صاحب کو یہ اطلاع دی ہے کہ ان کی نظم اسرارِ خودی ، [فارسی] کا انگریزی ترجمہ کیمبرج کے ڈاکٹر نکلسن نے کیا ہے جسے میک ملن اینڈ کمپنی نے شائع کیا ہے اور یہ کتاب مسرز میک ملن اینڈ کمپنی کتب فروش و ناشر ، کلکتہ کے پتہ پر دستیاب ہوسکتی ہے ۔ اگر ان کی برانچ مدراس میں ہو تو وہ اس کتاب کو سپلائی کرسکتے ہیں ۔ ساتھ میں اس وقت اپنی تصویر کے نہ ہونے کا افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ انھیں یاد رکھیں گے جب دستیاب ہوگی ۔

یہ خط حضرت علامہ نے جمیل صاحب کو ان کے مدراس کے پتہ [واقع نمبر ۱۵ ۔ اسٹراہانس روڈ ، پرمبور بارکس ، مدراس] پر بھیجا تھا ۔ جمیل صاحب بنگلور سے ۱۹۱۹ء میں وزلیان مشن کالجیٹ ہائی اسکول سے SIXTH FORM کرنے کے بعد ۲۱-۱۹۲۰ء میں لیدر ٹکنالوجی [چمڑے کی دباغت] میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مدراس میں واقع GOVT. LEATHER TRADES INSTITUTE گورنمنٹ لیدر ٹریڈس انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا تھا اور اپنی ننھیال میں قیام کیے ہوئے تھے ۔

دوسرا خط بنگلور کے پتہ پر مورخہ ۷ / فروری ۱۹۲۶ء کو ارسال کیا گیا تھا اس میں علامہ اقبال نے جمیل صاحب کے خط کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اظہارِ افسوس کیا ہے کہ ان کے پاس اس وقت کوئی تصویر نہیں ہے اور جب تصویر کھنچوائیں گے تو انھیں بھیجنے میں خوشی ہوگی ۔

یہ دونوں خطوط انگریزی میں ہیں اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں ۔ "شاعر" کے "اقبال نمبر" کے لیے ان دونوں خطوط کا عکس بھیجتے ہوئے راقم کو بڑی خوشی ہے جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ خطوط اس زمانے کے ہیں جبکہ حضرت علامہ سے جمیل صاحب کا صرف غائبانہ تعارف ہی تھا ۔ جمیل صاحب کو حضرت علامہ سے بالمشافہ ملنے اور نیاز حاصل کرنے کا موقع علامہ کے دورۂ دکن کے وقت ملا اور علامہ موصوف کی واپسی کے بعد جمیل صاحب کے خطوط کے جواب میں جو خطوط لکھے ہیں وہ "اقبال نامہ" حصہ دوم میں شائع ہوچکے ہیں ۔ راقم الحروف ذیل میں ان خطوط کے "اقبال نامہ" کے مرتب و ناشر کے شکریہ کے ساتھ قارئینِ "شاعر" کی نذر کرتا ہے ۔ یہ خطوط حضرت علامہ نے جمیل صاحب کے خطوط کے جواب میں فوراً اور برجستہ تحریر کیے تھے ۔ جمیل صاحب نے جو خطوط لکھے تھے ان کی نقلیں راقم کے پاس محفوظ ہیں مگر بخوفِ طوالت ان کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے سے قاصر ہوں ۔

علامہ اقبال بنام محمد جمیل بنگلوری

(۱)

لاہور

۱۸ر فروری ۱۹۲۹ء

مائی ڈیر مسٹر جمیل !

ابھی ابھی آپ کا نوازش نامہ اور تصویری کارڈ موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ تک یہ اطلاع پہنچانا میرے لیے باعث مسرت ہے کہ میں آزمائش میں ثابت قدم نکلا اور اب باوجود مالی مشکلات کے ایران و ترکی کے سفر کی تیاری میں مصروف ہوں۔ خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ اس سفر کے لیے جو محض اسلام اور مسلمانوں کی بہتری و بلندی کے لیے اختیار کر رہا ہوں، زاد میسر آجائے گا۔ مجھے اس اطلاع سے بے حد مسرت ہوئی کہ میرا سفر میسور مسلم نوجوانوں میں تاریخی تحقیق کے شوق و ذوق کا باعث ہوا۔ سیٹھ آباد نے مجھے سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ سے متعلق ایک قلمی مسودہ جو ایک شخص کے پاس ہے جو ہمیں سلطان کے مقبرہ پر ملا تھا ارسال فرمانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوں گے۔ ان تک میرا اسلام شوق پہنچا دیں اور ان سے کہئیے کہ اسلام کی خدمت کے لیے ان کے ذوق و جوش نے میرے دل پر ایک ایسا اثر پیدا کیا ہے جو کبھی محو نہ ہوگا۔ میں دست بدعا ہوں کہ انھیں بنگلور کے حاجی سر اسماعیل کی سی عظمت و منزلت حاصل ہو۔

چودھری محمد حسین صاحب بخیریت ہیں اور تصاویر کی موجودہ قسط اور آئندہ اقساط ان کی دلچسپی اور مسرت کا باعث ہوں گی۔ چودھری صاحب کو بھی سلطان مرحوم کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور آج کل وہ سلطان پر ایک آرٹیکل مرتب کر رہے ہیں۔ وہ سفرنامہ مدراس بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس میں تمام تصاویر جو آپ ارسال فرمائیں گے کام آئیں گی۔ میں آپ کے دوست عمر ہالسٹس کے لکچر کی اشاعت میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ ان میں کوئی خاص نئی بات تو ہے نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں شاید عیسائی قارئین پر ان کا اثر ہو۔

اسلام کے ثقافتی اور فلسفیانہ پہلو پر ابھی کام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ جرمن زبان میں چند کتابیں ہیں جن کا حال ہی میں کلکتہ کے صلاح الدین خدابخش صاحب نے انگریزی میں ترجمہ کیا لیکن وہ کتابیں بھی کچھ یوں ہی سی ہیں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

[انگریزی سے ترجمہ]

مخلص :

محمد اقبال

(۲)

لاہور

۱۴ر مئی ۱۹۲۹ء

مائی ڈیر مسٹر جمیل !

عید کارڈ ملا۔ شکریہ ! آپ کی خیریت کی اطلاع باعث مسرت ہوئی میں بھی الحمد للہ بخیریت ہوں۔ میں ترکی اور مصر کے سفر کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔ جیسا آپ جانتے ہیں زری طلبہ و الامعاملہ ہے اور ہندوستان کے مسلمان اسرار اسلام کی راہ میں خرچ کرنے کی ضرورت و اہمیت سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ تاریخ اسلام میں یہ دور نہایت نازک ہے۔ اگر مناسب ذرائع و طریق اختیار کیے جائیں تو اسلام اقوام عالم کو اب بھی متاثر کر سکتا ہے۔ مجھ سے جو خدمت ممکن ہوئی بجا لاؤں گا۔ مسٹر حمید حسن اور حاجی سیٹھ جمال محمد صاحب کی خدمت میں میرا اسلام شوق عرض کر دیں۔

مخلص :

محمد اقبال

[انگریزی سے ترجمہ]

(۳)

لاہور
۴ر اگست ۲۹ء

مائی ڈیر مسٹر جمیل !

آپ کا نوازش نامہ محررہ بیس ماہِ حال ابھی ابھی موصول ہوا جس کے لیے نہایت ممنون ہوں۔ آج کل عدالتیں تعطیلات گرما کے سلسلہ میں بند ہیں اور میں اپنے آخری تین خطبات مرتب کر رہا ہوں جو امید ہے اواخر اکتوبر تک مکمل ہو جائیں گے۔ ابھی تک اسلامی ممالک کی سیاحت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ مالی مشکلات ہنوز سدِراہ ہیں۔ سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی جسے میں اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے آپ کو کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے اس کا ایک حصہ کچھ عرصہ ہوا مرتب کیا تھا لیکن پھر ضروری مشاغل کی بنا پر اس کو نامکمل چھوڑ دیا۔

سلطان شہیدؒ کے کسی روزنامچہ کا مجھے علم نہیں۔ لیکن اگر واقعی کوئی روزنامچہ موجود ہو تو اس کا ایک نسخہ نہایت شوق سے حاصل کروں گا۔ اگر آپ کے پاس موجود ہو تو کچھ دیر کے لیے مستعار مرحمت فرمائیے میں اس سے ضروری نوٹ لے کر واپس کر دوں گا۔

چودھری محمد حسین صاحب ہر شام یہاں تشریف لاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سردیوں میں سفرنامہ کی تالیف و ترتیب پوری گرمجوشی سے کر سکیں گے۔ مجھے اس اطلاع سے بے حد مسرت ہوئی کہ جنوبی ہندوستان میں یوم النبیؐ کی تقریب کے لیے ایک ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے لیے رسول کریمؐ کی ذاتِ اقدس ہی ہماری سب سے بڑی اور کارگر قوت ہو سکتی ہے۔ مستقبل قریب میں جو حالات پیدا ہونے والے ہیں اس کے پیشِ نظر مسلمانانِ ہند کی تنظیم اشد لازمی ہے۔ عبدالمجید صاحب قریشی بانیٔ تحریک سیرت آج تشریف لائے تھے میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح اس تحریک کو ہندوستان میں خدمتِ اسلام کے لیے مفید اور مؤثر بنایا جا سکتا ہے۔ ان تفاصیل پر صرف بالمشافہ گفتگو ہی ہو سکتی ہے۔ ان کا ضبطِ تحریر میں لے آنا مناسب نظر نہیں آتا۔ آپ کا مکتوب چودھری صاحب کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ امید ہے وہ سفرنامہ سے متعلق آپ کو مفصل اطلاع دیں گے۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص :

محمد اقبال [انگریزی سے ترجمہ]

(۴)

لاہور
۴ر نومبر ۲۹ء

مائی ڈیر مسٹر جمیل !

ہلالِ احمر فنڈ کے لیے دس روپیہ کے عطیہ کا شکریہ ! میں آپ کا عطیہ سکریٹری صاحب کے پاس بنک میں جمع کرانے کے لیے بھیج دوں گا۔ مجھے امید ہے احبابِ بنگلور جن سے میں نے اس سلسلے میں اعانت کی درخواست کی ہے فراخ دلی سے چندہ دیں گے۔ میں نے سیٹھ حاجی اسماعیل، ایڈیٹر السلام اور عبدالغفور صاحب کو تار دے دیا ہے۔ از راہِ کرم ہمارے اٹک پار کے بھائیوں کی طرف سے جو ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے وہ ان حضرات کو یاد دلائیے۔ افغانستان کا استقلال و استحکام مسلمانانِ ہندوستان اور وسطی ایشیاء کے لیے وجہِ جمعیت و تقویت ہے۔ بچہ سقہ اپنے گیارہ ساتھیوں سمیت قتل ہو چکا ہے اور نادر خان بادشاہ بتدریج استحکام حاصل کر رہے ہیں۔

میرے خطبات اب مکمل ہو چکے ہیں اور غالباً اسی ماہ علی گڑھ میں ان کو سنانے کے لیے جاؤں گا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے بھی اواخر جنوری ۱۹۳۰ء میں اس سلسلہ میں حاضری کی دعوت موصول ہوئی ہے۔ مدراس کی طرف سے بھی دعوت نامہ موصول ہوا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ حاضر نہ ہو سکوں گا۔

سلطان شہید کے روزنامچے کے لیے جو سلسلہ جنبانی آپ نے شروع کی ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اگر آپ ایک نسخہ بھجوا سکیں تو میرے لیے ایک بیش بہا ہوگا۔ اس روزنامچہ سے امید ہے کہ سلطان سے متعلق مجوزہ نظم میں مجھے سلطان شہیدؒ کی صحیح صحیح حالات پیش

کرنے میں بہت امداد ملے گی۔ازراہِ کرم مطلع فرمائیں کہ وہ مالکِ کتاب قیمت چاہتے ہیں تو کیا؟ میں بخوشی مناسب قیمت ادا کرنے تیار ہوں۔ اگر وہ آپ کو کتاب کی نقل لینے دیں تو خوش خط نقل لے لیجیے۔

چودھری صاحب بخیریت ہیں اور ہر شام تشریف لاتے ہیں۔

مخلص :

محمد اقبال [انگریزی سے ترجمہ]

(۵)

لاہور

۴ر مارچ ۳۳ء

مائی ڈیر جمیل !

آپ کے خوب صورت عید کارڈ کے لیے جو ابھی ابھی موصول ہوا سراپا سپاس ہوں۔ میری طرف سے بھی عید مبارک قبول فرمائیے۔ میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ہندوستان میں اور دوسرے اسلامی ممالک کے نوجوانوں کو اپنے لطف و کرم سے فیض یاب و شاد کام کرے اور اپنی رحمتِ بے پایاں سے ان کا دامن بھر دے۔

میرے خطبات زیرِ طباعت ہیں اور امید ہے دو ماہ تک شائع ہو جائیں گے۔ میں ناشر سے کہہ دوں گا کہ ان کے شائع ہوتے ہی ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھیج دے۔ لیکن اگر میں بھول جاؤں تو آخر اپریل تک مجھے بلا تکلف یاد دلا دیجئے۔ ۵

جہاں تک مجھے علم ہے گولڈزی کی کوئی انگریزی تصانیف نہیں ہیں۔ وہ ایک جرمن یہودی ہے اور انگریزی میں نہیں لکھتا۔ اس کی مشہور ترین کتب جرمن زبان میں ہیں اور ان میں کوئی خاص چیز مجھے تو نظر نہیں آئی۔ میں یورپین مستشرقین کا قائل نہیں کیوں کہ ان کی تصانیف سیاسی پراپگنڈا یا تبلیغی مقاصد کی تخلیق ہوتی ہیں۔

افغانستان میں دوبارہ امن قائم ہوتا جاتا ہے۔ ہندوستان میں معدودے چند افراد کو اس ملک کے انقلاب کے اسباب سے واقفیت ہے۔ میری رائے میں امیر امان اللہ کی واپسی کے کوئی امکانات نہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں افغان اسے نہیں چاہتے۔ اعلیٰ حضرت نادر خان ملک شاہِ راہِ ترقی پر ڈالنے کی بے حد کوشش فرما رہے ہیں۔ وہ افغانوں کے محبوب ہیں اور نیم پنجابی بھی۔ ان کی والدہ لاہور میں پیدا ہوئیں اور یہیں پرورش پائی۔

مخلص :

محمد اقبال [انگریزی سے ترجمہ

(۶)

لاہور

۱۷ر دسمبر ۳۴ء

ڈیر محمد جمیل !

نوازش نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کے لیے ممنون ہوں۔ گذشتہ گیارہ ماہ سے گلے کی تکلیف میں مبتلا ہوں۔ شاید علاج کے لیے دلی جانا پڑے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے میرے خطبات شائع کیے تھے۔ ایک خطبہ بعنوان "کیا مذہب ممکن ہے ؟" بھی شامل کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے آپ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کلکتہ یا بمبئی سے حاصل کر سکتے ہیں یا پھر براہِ راست لنڈن سے۔

میری اردو نظموں کا ایک مجموعہ جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوگا۔ ایک دو مہینے ہوئے ایک فارسی نظم "مسافر" شائع ہوئی تھی یہ میرے سال گذشتہ کی سیاحت افغانستان کا تذکرہ ہے۔

مخلص :

محمد اقبال [انگریزی سے ترجمہ

بھوپال

۷ مارچ ۱۹۳۶ء

ڈیر مسٹر جمیل !

نوازش نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کے لیے ممنون ہوں۔ میں بدستور بیمار ہوں۔ بھوپال میں برقی علاج ہو رہا ہے۔ بوجہ علالت مدراس لیکچرز فی الحال منسوخ کر دیے گئے ہیں۔ "بالِ جبریل" گذشتہ سال شائع ہوئی اور "ضربِ کلیم" امید ہے آئندہ اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ ان دونوں کتابوں کے لیے تاج کمپنی لاہور کو اور "اسلام اور احمدیت" کے لیے انجمن خدام الدین لاہور کو لکھیے۔

مخلص :

محمد اقبال   [انگریزی سے ترجمہ]

محمد عبدالجمیل صاحب کے ان خطوط کی نقول [جن کے مندرجہ بالا جواب حضرت علامہ نے دیے ہیں] کے علاوہ اور بھی کئی خطوط کی نقلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے جواب بھی حضرت علامہ نے دیے تھے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے جمیل صاحب کی کسی کتاب یا فائل سے حضرت علامہ کے کچھ اور خطوط ہاتھ لگ جائیں۔

حضرت علامہ اقبال کے علاوہ جمیل صاحب کی خط و کتابت پروفیسر مولوی عبداللہ چغتائی سے بھی تھی۔ جب کبھی حضرت علامہ مصروف یا علیل رہتے تو ان کے خطوط کے جواب پروفیسر عبداللہ چغتائی دیتے۔ پروفیسر موصوف نے اپنے خط مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۳۰ء کے ساتھ ایک کتابچہ روانہ کیا جسے علامہ اقبال نے دیا تھا۔ اس میں ان کی حالیہ کتابوں پر تنقیدی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے حاشیہ پر حضرت علامہ نے اپنی تحریر میں لکھا ہے :

"کچھ اور خطوط یورپ سے ہیں جنھیں میں اب تک شائع نہیں کروا سکا۔ بہت جلد ان کی اشاعت ہو گی۔" محمد اقبال لاہور

اس کا عکس بھی قارئینِ "شاعر" کی خدمت میں پیش ہے۔

حواشی

۱۔ جمیل صاحب کے اپنے خط مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۲۹ء کے ساتھ ایک تصویری کارڈ "سری رنگا پٹن کا آخری دور" کے عنوان سے ٹیپو سلطان شہیدؒ کے دورِ حکومت کی چند تصاویر ارسال کی تھیں۔

۲۔ ریاست میسور کے مسلمانوں کے قائد محسن الملک سیٹھ محمد آبا [ایم ایل سی، صدر آل میسور مسلم لیگ و صدر ادارہ ادبیات اردو میسور] حضرت علامہ اقبال کے سفرِ میسور میں شریک رہے۔ جمیل مرحوم نے حضرت علامہ کے اس خط کے ملنے کے بعد سیٹھ محمد آبا کو مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۲۹ء کو خط لکھا جس کے جواب میں سیٹھ محمد آبا نے لکھا کہ "وہ ہنوز قلمی مسودہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔"

میر محمود حسین لکچرر فارسی و شعبۂ تحقیق اردو میسور نے اپنی تصنیف "علامہ اقبال کی داستان دکن" [ناشر، حیدر آباد اردو اکاڈمی] کے صفحہ نمبر ۲۹ اور ۳۱ میں علامہ اقبال کے خطوط بنام جمیل صاحب کے حوالے سے لکھا ہے علامہ اقبال سلطان شہیدؒ کی ایک مستند قلمی تاریخ اور ان کی دستی تحریروں کے متلاشی تھے تاکہ "جاوید نامہ" لکھنے میں ان کی مدد لیتے۔ بنگلور، میسور اور سری رنگ پٹن میں آپ نے بار بار یہ خواہش ظاہر کی اور لاہور واپسی کے بعد بھی اس بارے میں یہاں کے شناساؤں سے سلسلۂ جنبانی کرتے رہے۔ چنانچہ علامہ کی تحریک و تشویق سے بنگلور میں آپ کے ایک پُرخلوص معتقد محمد جمیل صاحب جن سے آپ کی باقاعدہ خط و کتابت رہی اور جو خود صاحبِ علم اور بڑے علم دوست تھے اور میسور میں مشہور و معروف قومی قائد محمد آبا سیٹھ صاحب سے مخطوطات جمع کرنے لگے۔ سیٹھ صاحب نے میسور میں ان کی بڑی چندہ تحریک چلائی اور تھوڑی ہی مدت میں سینکڑوں قیمتی مخطوطات مسلم کلب میں جمع فرما دیے جو اس دور میں شہر میسور کے مسلمانوں کا ایک اہم ثقافتی مرکز تھا۔ یہ کلب ختم ہوا تو مخطوطات انجمن رفاہ المسلمین کے حوالے کر دیے گئے۔ مولانا عبدالحق مرحوم میسور تشریف لائے تو انھوں نے ان میں سے چند مخطوطات انتخاب کر لیے

جو شاید آج کل انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی مخطوطہ لائبریری میں موجود ہیں۔ پانچ سال قبل انہیں سے بہت سے اہم مخطوطات انتخاب کر کے ہم نے جامعہ میسور کے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ اردو فارسی و عربی میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ مخطوطات جمع کرنے کی اور بھی انفرادی کوششیں اسی زمانے سے شروع ہوئیں اور آج مختلف شوقین اصحاب کے ذاتی کتب خانوں میں قیمتی مخطوطات کے ذخیرے موجود ہیں۔"

[ماخوذ: علامہ اقبال کی داستان دکن]

۳ـ عمر ہالسٹس کے متعلق جمیل صاحب کی ڈائری سے جو معلومات بہم پہنچی ہیں وہ یوں ہیں:

ڈاکٹر ایچ۔ ہالسٹس DR. H. HOLST. MD. ڈینش ہومیوپیتھک ڈاکٹر تھے جن کا دواخانہ شہر بنگلور کے انفنٹری روڈ پر واقع تھا۔ ۱۹۲۲ء میں جمیل صاحب ان سے اپنا علاج کروانے کے سلسلے میں رجوع ہوئے اور کچھ ہی عرصہ میں دونوں بہترین دوست بن گئے۔ ڈاکٹر ہالسٹس ایک فاضل عیسائی تھے اور تمام مذاہب سے متعلق کافی واقفیت رکھتے تھے۔ جمیل صاحب نے انھیں اسلامیات پر کافی لٹریچر فراہم کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اسلام اور اس کی شاندار تاریخ سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ اسلام کی ثقافت و تہذیب کے کامل عالم بن گئے۔ جمیل صاحب نے کئی جگہوں پر ان کے اسلامی لکچرز کا انعقاد کیا جہاں ڈاکٹر ہالسٹس نے اپنے غیر جانب دارانہ اور غیر متعصبانہ خطبات سے سامعین کے دل موہ لیے۔ وہ عہد نامۂ قدیم، اناجیل و قرآن کریم کے مابین تعلقات اور مقابلہ و موازنہ اس ڈھنگ سے کرتے کہ سننے والے عش عش کرنے لگتے۔ ۱۹۲۴ء کے آواخر میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام عمر بن ہالسٹس رکھ لیا۔ ان کے لکچرز انگریزی و اردو اخبارات میں شائع ہو کر خواص و عام میں کافی مقبول ہوئے۔ کئی پادریوں اور عیسائی عالموں سے انہوں نے مناظرہ کیا۔ رفتہ رفتہ ان کے کئی متعصب و غیر تعلیم یافتہ مریضوں نے ان کی حق گوئی، اسلام کی طرف داری و حمایت کے باعث ان سے اپنا علاج کروانا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔ جمیل صاحب اور ان کے کچھ مسلم دوست مل کر انھیں ماہانہ ایک سو روپے وظیفہ دیتے رہے تاکہ وہ بنگلور ہی میں رہ کر اپنی تبلیغ جاری رکھیں۔ چونکہ یہ وظیفہ ان کے لیے ناکافی تھا اس لیے ماہانہ تین سو روپے وظیفہ دینے کے لیے اپیل کی گئی اور چندہ اکٹھا کیا جاتا رہا۔ ڈاکٹر عمر ہالسٹس بالآخر مایوس ہو کر ۲۲ر جنوری ۱۹۲۵ء کو واپس یورپ چلے گئے۔ وہاں پر ان کی تبلیغ کافی پھولی پھلی اور کئی عیسائی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ڈاکٹر عمر ہالسٹس اور جمیل صاحب کے درمیان کافی دنوں تک خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ انہوں نے جمیل صاحب کو اپنی ایک تصویر بھی بھیجی۔ جمیل صاحب نے حضرت علامہ سے اپنے خط مورخہ ۱۳ر فروری ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر عمر ہالسٹس کے لیکچر "عیسیٰؑ کی صلیب پر موت کی روایت" "HISTORICITY OF THE DEATH OF JESUS ON THE CROSS" اور ان کے دیگر لکچرز کی اشاعت کے متعلق حضرت علامہ سے ان کی رائے پوچھی تھی جس کا جواب علامہ نے اس خط میں دیا ہے۔

۴ـ جمیل صاحب کے خط کی جو نقل ملی ہے اس پر تاریخ ۲۰ر اگست ۱۹۲۹ء درج ہے اور علامہ اقبال نے اس کا جواب جو دیا ہے اس کی تاریخ انہوں نے ۴ر اگست لکھی ہے میرے خیال میں یہاں علامہ اقبال سے سہو ہوا اور انہوں نے بجائے ستمبر کے اگست لکھ دیا ہے کیوں کہ مئی کے اوائل میں عید الاضحیٰ تھی اس حساب سے عید میلاد النبی اگست کے اوائل میں ہوئی ہوگی۔ جمیل صاحب نے اپنے اس خط میں جنوبی ہندوستان اور بنگلور میں عید میلاد کی ولولہ انگیز و پُرجوش تقاریب کے متعلق لکھتے ہوئے حضرت علامہ سے پوچھا تھا کہ اس طرح کے جذباتی مظاہروں سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ انہوں نے حضرت علامہ کو اپنا مرشد مانتے ہوئے ان کی رائے پوچھی تھی۔

۵ـ جمیل صاحب نے اپنے خط مورخہ ۲۶ر اپریل ۱۹۳۰ء کو حضرت علامہ کی ہدایت کے مطابق ان کے خطبات کے ایک نسخہ کو بذریعہ وی پی پی ارسال کرنے کی گذارش کرتے ہوئے ان کے ایک معتقد کی حیثیت سے یہ استدعا کی تھی کہ اس نسخہ پر اپنے دستخط کے ساتھ کوئی شعر بھی لکھ کر بھیجیں۔ راقم کو جمیل صاحب کے کتب خانہ سے خطبات کا ایسا کوئی نسخہ اب تک نہیں ملا جس میں حضرت علامہ کے دستخط کے ساتھ ان کا کوئی شعر بھی ہو۔ ہو سکتا ہے کبھی اتفاق سے یہ کتاب ہاتھ لگ جائے۔ ❁

علامہ اقبال نے اپنی ایک یادگار تصویر [بانگِ درا" میں شائع ہوئی تھی] اپنے دستخط کے ساتھ محمد عبدالجمیل ننگلوری کو پیش کی۔

محمد عبدالجمیل [پ: ۳۱ رمئی ۱۸۹۷ء۔ م: ۱۱ اپریل ۱۹۴۸ء] کے انتقال سے دو سال قبل، ۱۹۴۶ء کی ایک تصویر۔

علامہ سر محمد اقبال دام اقبالہُ

کا

استقبال

بمقام سنٹرل اسٹیشن

یوم شنبہ ۷ بجے صبح ۵ جنوری ۱۹۲۹ء

انجمن ترقی اردو کا سپاسنامہ

اور

آپ کی تقریر "ہندوستان کی عالمگیر زبان" پر

مقام گوکھلے ہال۔ ارمینین اسٹریٹ

یوم یکشنبہ (اتوار) دس بجے صبح ۶ جنوری ۱۹۲۹ء

اُسی روز اسی مقام پر گیارہ بجے

انجمن حمایت اسلام اور یتیم خانہ

دو سالہ کا جلسہ

زیر صدارت

علامہ سر محمد اقبال مدظلہ

آپکی تقریر "اسلام اور یتامیٰ" پر

خادم اسلام عبدالحمید حسن

نوٹ:۔ مدراس میں نہ مشہور ہو کہ تقریر اردو میں ہوگی

یکم جنوری ۱۹۲۹ء مدراس

اسلامیہ پرنٹنگ ورکس ... مدراس

علامہ سر محمد اقبال مدظلہ

کا

ورود مسعود

جناب علامہ سر محمد اقبال مدظلہ بروز شنبہ (سنیچر) ۵ جنوری ۱۹۲۹ء کو بمبئی میل سے سات بجے صبح تشریف لاتے ہیں۔

جمیع مسلمانان مدراس سے درخواست ہے کہ سنٹرل اسٹیشن پر آپکے استقبال کیلئے کثیر تعداد میں تشریف لائیں اور گرمجوشی سے آپکا خیر مقدم کریں۔

علامہ سر محمد اقبال دام ظلہ

کی

اردو تقریریں

گوکھلے ہال واقع ارمینین اسٹریٹ جارج ٹون میں ٹھیک صبح دس بجے انجمن ترقی اردو مدراس کی طرف سے علامہ صاحب موصوف کی خدمت میں اردو سپاسنامہ پیش کیا جائیگا اور آپکی تقریر ہندوستان کی عالمگیر زبان پر ہوگی۔

گیارہ بجے اسی مقام پر انجمن حمایت اسلام و یتیم خانہ اسلامیہ کا دوسالہ جلسہ عام زیر صدارت علامہ ممدوح منعقد ہوگا اور آپکی تقریر "اسلام اور یتامیٰ" کے عنوان پر ہوگی۔ معرفی رہے کہ تقریریں اردو میں ہونگی۔ گوکھلے ہال کا بہترین حصہ انجمن ترقی اردو اور انجمن حمایت اسلام کے اراکین کیلئے مخصوص ہوگا۔ اور جو حضرات انجمن ہٰذا کے رکن بنکر چندہ ادا کرینگے وہ اس محفوظ مقام پر بیٹھ کر تقریریں سن سکینگے۔ انجمن حمایت اسلام کے اراکین کیلئے ٹکٹ "اعظم الاخبار" دفتر میں اور انجمن ترقی اردو کے ٹکٹ "اتحاد" اسٹریٹ جارج ٹون میں تقسیم کئے جائینگے۔ ہم پوری امید کرتے ہیں کہ مسلمانان مدراس کثیر تعداد میں گوکھلے ہال میں تشریف لاکر مستفید ہونگے۔

خادم اسلام عبدالحمید حسن

یکم جنوری ۱۹۲۹ء

مدراس میں علامہ اقبال کی آمد پر استقبال کا اعلان اور پروگرام کی تفصیل۔ ۵ اور ۶ جنوری کی صبح میں اردو میں تقاریر کا اعلان۔ یکم جنوری کا یہ اعلان عبدالحمید حسن کی جانب سے شائع ہوا

انجمن ترقی اردو شعبۂ مدراس

دعوتِ اقبال

دوشنبہ ۷ جنوری ۱۹۲۹ء — مقام انجمن حسن ؟ ای

اول طعام بعدہٗ کلام

نظامِ طعام		ترتیب کلام
شربت کیوڑا		بجام صحت
تلی ہوئی مچھلی	"ملک معظم"	صدر
تاج کباب	"سلاطین اسلام"	جناب سید ابو ظفر صاحب
سید الطعام (حلیم)	"معزز مہمان"	عبدالحمید حسن
سیخ کباب	"جواب"	علامہ سر محمد اقبال
مرغ پلاؤ	"انجمن ترقی اردو"	جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب لاہوری
حلوۂ گازر		
حَب کے لوز	"جواب انجمن"	جناب حکیم سید محمد دوم اشرف
زعفرانی پوریسی	"جواب فرداً"	جناب حکیم محمد صاحب
فواکہات		
برف		

MADRAS LECTURES ON ISLAM

Dr. Sir Mohammed Iqbal.

ON

"Muslim Theology & Modern Thought."

Dr. Sir Mohammad Iqbal, M. A., Ph. D., M. L. C., Bar-at-Law, Lahore, arrives at the Central Station, on Saturday the 5th instant, at 7-30 A. M., by the Bombay Mail. He will, as announced already, deliver three lectures in English on the above subject at the Gokhale Hall, Armenian Street, on the 5th, 6th and 8th inst, at 6-15 P. M. precisely. These lectures are meant mainly for University students, undergraduates, graduates and post-graduates and those, interested in the philosophical aspect of religion, are sure to derive immense profit and become acquainted with the history of religious thought in general and Muslim religious thought in particular. It is hoped that the Non-Muslim gentlemen will not miss these lectures. It is a patent fact that Sir Mohammad Iqbal is a most cultured and enlightened Muslim savant. Every seeker of knowledge and thought ought to be able to follow his lectures with advantage even though they have been written in the light of the history of Muslim Religious Thought.

A limited number of seats will be specially reserved for such students and members of the staff who apply in advance to the undersigned through their principals. They should be in their seats at least ten minutes before the commencement of each lecture.

3rd January 1929.
2, VANIAR STREET,
MADRAS

A. HAMEED HASAN,
Honorary Secretary.

The Mercantile Press, Madras.

۳ جنوری کا شائع کردہ ایک پمفلٹ انگریزی میں جاری کیا گیا جس میں علامہ اقبال کی آمد کا پروگرام اور دیگر تفصیلات دی گئی ہیں۔

۷ جنوری کو علامہ اقبال کے اعزاز میں منعقد کی گئی تقریب ضیافت کا دعوت نامہ۔

"MADRAS LECTURES ON ISLAM."

SIR MOHAMMAD IQBAL

ON

"MUSLIM THEOLOGY AND MODERN THOUGHT."

(IN ENGLISH)

THE CHAIRMAN AND MEMBERS OF THE COMMITTEE

request your presence

at the Gokhale Hall, Armenian Street,

at the Inaugural Meeting, under the presidentship of

The Hon'ble Dr. P. SUBBARAYAN

On Saturday, 5th January 1929, at 6-15 p.m.

and at the subsequent lectures mentioned on the reverse.

A. HAMEED HASAN,
Hony. Secretary.

The Mercantile Press, Madras.

"MUSLIM THEOLOGY AND MODERN THOUGHT."

FIRST LECTURE.

"Knowledge and Religious Experience."

Saturday the 5th January 1929 at 6-15 p. m.

SECOND LECTURE.

"The Philosophical Test of the Revelations of Religious Experience."

Sunday the 6th January 1929 at 6-15 p. m.

THIRD LECTURE.

"The Conception of God and the Meaning of Prayer."

Tuesday the 8th January 1929 at 6-15 p. m.

---

۵ جنوری ۱۹۲۹ء کو مدراس میں منعقد ہونے جلسے کا دعوت نامہ اور اس کی پشت پر تین خطبات کے پروگرام کی تفصیل۔

---

۵ جنوری ۱۹۲۹ء کو گوکھلے ہال میں لی گئی تصویر میں نشستوں پر (دائیں سے بائیں) عبدالحق (وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) عبدالعزیز (سفیر ترکی) علامہ اقبال۔ آرکاٹ کے نواب۔ جمال محمد (جن کی کاوشوں سے علامہ اقبال مدراس تشریف لے گئے تھے)۔ ایستادہ (پہلی صف میں) پروفیسر عبداللہ چغتائی عبدالحمید حسن سیٹھ (علامہ اقبال کے سفرِ مدراس میں منتظمِ اعلیٰ رہے۔ قیام و طعام، نشر و اشاعت اور علامہ کی تقاریر وغیرہ کا اہتمام کیا) چودھری محمد حسین وغیرہم۔ (آخری صف میں) ابو حامد عبدالرحیم اور محمد عبدالجمیل۔

تقریبِ ضیافت

علامہ محمد اقبال مدظلہ

جناب والا کی شرکتِ مجلس

اور تناولِ حضر

کا

منتظمی

عبدالحمید حسن

بخدمت محمد عبدالجمیل .... صاحب

۵ جنوری کی شب میں علامہ اقبال کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ دعوت نامہ محمد جمیل صاحب کے نام ہے۔

مسلم لائبریری معسکر بنگلور

۵ جنوری ۱۹۲۹ء

نمبر

مکرمی! السلام علیکم

ترجمان حقیقت علامہ سر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا چہار شنبہ کے دن مدراس سے بنگلور رونق افروز ہوں گے اور مسلم لائبریری و انجمن ترقی اردو معسکر بنگلور سے متعلق آپ کے پروگرام بتاریخ ۹ جنوری ۱۹۲۹ء حسب ذیل ہوگا۔

(۱) صبح کے ساڑھے نو بجے بمقام کنٹونمنٹ ریلوے اسٹیشن استقبال

(۲) صبح کے دس بجے بمقام محبوب آپرا ہوز (واقع بریگیڈ روڈ) مسلم لائبریری و انجمن ترقی اردو معسکر بنگلور کی طرف سے علامہ موصوف کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جائیگا (جناب امین الملک مرزا محمد اسمٰعیل صاحب نائب دیوان ریاست میسور اس جلسہ کی صدارت فرمائیں گے)

(۳) شام کے ۶ بجے بمقام گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج بنگلور سٹی علامہ موصوف کا انگریزی لکچر بعنوان "CONCEPTION OF GOD & MEANING OF PRAYER".

امید کہ جناب مذکورۂ بالا استقبال و جلسوں میں شامل ہونے کے علاوہ ان جلسوں کے انتظام میں پورا حصہ لیکر ان کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرینگے

خاکسار

محمد صالح سکریٹری

نوٹ: { محبوب آپرا ہوز کے جلسہ کو وقت پیشتر سے بہت آگے تشریف لائیں ورنہ ممکن ہے کہ جگہ نہ ملے }

مسلم لائبریری (بنگلور) نے ۵ جنوری ۱۹۲۹ء کو ایک دعوت نامہ جاری کیا تھا جس میں علامہ اقبال کا مدراس سے بنگلور ورود اور ۹ جنوری کے پورے پروگرام کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ دعوت نامہ سکریٹری محمد صالح کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔

Public Lecture.

Under the auspices of the Muslim Educational
[A]ssociation, the Muslim Library & the Majlis-e-Millia
Dr. Sir Mohammad Iqbal, M.A., Ph. D.,
BAR-AT-LAW,
will deliver a lecture on
[T]he Conception of God & *Meaning* of Prayer"
at the Government Intermediate College Hall,
BANGALORE CITY,
[ON] WEDNESDAY THE 9TH JANUARY '29 AT 6 P.M.
Mr. N. S. Subba Rao, M.A., BAR-AT-LAW,
Director of Public Instruction in Mysore,
has kindly consented to preside.
ALL ARE CORDIALLY INVITED TO ATTEND.

Mahmood Shariff,
Convener.

[...]onal Press, Bangalore.

۹ جنوری کی شام میں مختلف انجمنوں کی جانب سے منعقد ہونے والے جلسے کا دعوت نامہ جو کنوینر محمود شریف نے جاری کیا تھا۔

بخدمت جناب ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ایم۔اے۔ پی ایچ۔ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا

جنابِ عالی!

ہم ارکین مسلم لائبریری اور انجمن ترقی اردو بنگلور نہایت اخلاص و مسرت سے آپ کی اس تشریف آوری کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپکو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری اس خوشی و مسرت میں کل مسلمانانِ بنگلور شامل ہیں۔

آنجناب آج جس شہر میں تشریف فرما ہیں اُسکا دوسرا نام "دارالسرور" ہے جو ایک علمی حیثیت رکھتا ہے، یہ وہ شہر ہے جو علماء، ادباء اور شعراء کا مخزن رہا ہے۔ غدر دہلی کے بعد ہندوستان میں جو تین اُردو اخبار نکلے ان میں بنگلور کا ایک اخبار بھی شامل ہے، بنگلور ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ ہندوستان میں طبقۂ نسواں کا پہلا رسالہ "ترغیب" بھی اسی شہر سے نکلا۔ اور ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ یہاں ایک ہی وقت پر چھ اخبار اور متعدد رسائل نکلتے تھے گو آج ہم میں قحط الرجال ہے مگر اب بھی مسلمانانِ بنگلور میں حاملانِ علم و فن کی قدر شناسی کا جوہر موجود ہے۔

ہیئت پسندانہ شاعری کو دبستانِ گل و بلبل کے محدود دائرے سے نکال کر حقیقت کے میدان میں لانے کا سنگِ بنیاد گو آزاد و حالی نے رکھا تھا مگر اسکو میر و غالب کے طرزِ بیان میں پایۂ تکمیل کو پہنچانے کیلئے قدرت کا قرعۂ انتخاب آپ ہی پر پڑا۔ اردو نظم کی وسعت کے متعلق آزاد کی یہ امید کہ ہمارے نوجوان جو کشورِ علم میں مغربی اور مشرقی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں ان کی ہمت آبیاری کریگی، دونوں کناروں کا پانی لائیگی، اور قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دیگی حرف بحرف آپکی ذات سے پوری ہوئی اور شبلی نعمانی مرحوم کی اس پیشینگوئی کی آج تصدیق ہو رہی ہے کہ جب آزاد و حالی کی کرسیاں خالی ہونگی تو لوگ آپکو ڈھونڈینگے۔

یہ خیال کہ "فن برائے فن" کا مقصد انسانی زندگی و طاقت کے چھین لینے کے لئے ایک فریب ہے آپکی طبیعت کو کسی طرح اس امر پر قائل نہیں کر سکتا تھا کہ آپکی شاعری کی غرض و غایت صرف تفریحِ طبع ہو۔ آپنے اپنے کلامِ معجز بیان سے قوم کو ایک شاندار مستقبل کا پیغام دیا۔ اور حقیقی کامیابی و حیاتِ ابدی کے راز بتلاتے ہوئے ثابت کر دیا کہ "شاعری جزویست از پیغمبری"۔ مغرب نے گوئٹے کی زبان سے مشرق کو پیغام دیا تھا۔ اور آج مشرق کو آپ کی نامور ہستی پر ناز ہے اسکا ناز ہے کہ اس کی طرف سے آپ کی زبان نے مغرب کو پیغام دیا۔

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم آج ایک ایسی شخصیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو رومی، عرفی اور غالب کے خصوصیاتِ دل و دماغ کی حامل ہے اور جسنے شیلی کی شاعری، نطشے اور برگسن کے فلسفہ کو توحید و روحانیت سے درخشاں بنادیا۔

آپکو اس بیان سے خوشی حاصل ہوگی کہ مسلم لائبریری اپنی گذشتہ زندگی اور موجودہ روش میں ان اصولوں کی پابند رہی ہے جسمیں آپکے حسبِ خیال فرد ہو یا جماعت ہر دو کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ لائبریری اپنی گذشتہ سولہ سالہ زندگی میں مدوجزرِ زمانہ سے ناآشنا رہی ہے اسکی تاریخِ زندگی اس کے ارکین کے استقلال و بلند ہمتی کی شاہد ہے۔ خودداری ہمیشہ اسکا شیوہ رہا۔ آئین کی پابندی اُس کے لوازماتِ زندگی سے تھی، اور سب سے بڑھکر ارکین میں قومیت کا احساس اور حقیقی اس لائبریری کیساتھ مخلصانہ محبت اسکی زندگی کے لئے روحِ رواں ثابت ہوئے۔

جنابِ عالی! بنگلور بلکہ کل ریاست میسور کے مسلمانوں کی مادری زبان اُردو ہے جو ہندوستان بھر کی قومی زبان کہلائے جانے کی مستحق ہے اس وقت اردو میں وسعت و ترقی کی گنجائش کا کسی کو انکار نہ ہوگا۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے ہم مشکور رہنا چاہئے کہ ان کی کوشش پیہم سے زبانِ اُردو کا ذخیرہ دن بدن بڑھ رہا ہے شمالی ہند کے اکثر حصوں میں ہندو اور مسلم کی یہ مرغوب زبان رہی ہے، اُردو کے چاہنے والے اقبال و تیز رنگ کیساتھ مطالب و تصور کو کبھی بھول نہیں سکتے۔ لیکن افسوس ہے کہ چند دن سے اس ایک کڑی کو جو تمام اقوامِ ہند کو متحد رکھنے کی اہلیت رکھتی ہے، توڑنے کی کوشش کیجا رہی ہے کہیں "ہندی" کو "اردو" کا مترادف بتایا جا رہا ہے اور کہیں مسلمان اپنی مقامی زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ قومی حمیت اس امر کی متقاضی ہے کہ زبان کے اس اہم مسئلہ سے ہم غافل نہ رہیں۔

سے مسلمِ خوابیدہ اُٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو ؛ وہ چمک اُٹھا افق گرمِ تقاضا تو بھی ہو

اب ہم جناب والا کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ باوجود مختصر اوقات کے جنابنے ہمیں اس جلسہ کے انعقاد کا موقع دیا۔ اور التماس کرتے ہیں کہ جناب ہمارا یہ مختصر ہدیہ قبول فرما کر ہمیں افتخار بخشیں۔

خداوند بزرگ و برتر آپکو صحت و عافیت دائمی بخشے اور آپ کو قوم کی اصلاح و تعلیم کے لئے تادیر سلامت رکھے آمین

ہم ہیں آپکے مخلص
ارکین مسلم لائبریری و انجمن ترقی اردو بنگلور

مورخہ [illegible] جنوری [illegible]

مطبعہ قومی پریس بنگلور

ارکین مسلم لائبریری اور انجمن ترقی اردو بنگلور کی جانب سے پیش کیے گئے سپاس نامے کا عکس۔

ورجنوری کی ایک یادگار تصویر میں ⊂ بائیں سے دائیں ⊃ متولی محمد عبدالجمیل ، علامہ اقبال اور ابوحامد عبدالرحیم ۔

the minds of its common followers. **Sir Mahomed's attempt is to be welcomed, among other reasons, so far as it is likely** to clear any misunderstanding in the minds of the learned as to the true aims and ideals of Islam as a world force.

The 'HINDU,' Madras,
Sep. 21st, 1930.

There are other similar letters from which I have not yet been able to publish. They will soon be published.
Mohd Iqbal
Lahore

THE EDUCATIONAL PRINTING WORKS, LAHORE.

علامہ اقبال کی انگریزی کتاب خطبات مدراس پر موصول آراء کو ایک کتابچہ میں جمع کر کے شائع کیا گیا تھا۔ اس کتابچہ پر اقبال کی اپنی ایک یادگار تحریر موجود ہے۔ یہ کتابچہ محمد عبداللہ چغتائی نے ۱۹۳۲ء میں لاہور سے محمد عبدالجمیل مرحوم کو ارسال کیا تھا۔
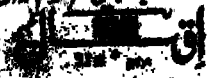
Message of

Dr. Sir. Md. Iqbal (Kt.) M. A., P. H D., Bar-at-law to the Young Men's Muslim Federation C. & M. Station, Bangalore. On the occasion of the presentation of an address of Welcome on his visit to Bangalore at the Bungalow of Khan Bahadur Fakhr-ut-tujjar Hajee Sir, Ismail Sait, (Kt.) "Essex Lodge." on 9th January 1929, at 1 p. m.

"Young *Muslims!*" Islam needs you to-day in the hour of her trial. The Nations of the world have already narrowed their vision. It is your duty to rise to the occasion and to raise the banner of Universal Brotherhood. Islam does not recognise race-distinction and Geographical Boundaries. It is above these limitations.

Let this message of Islam be carried again to the Warring Nations of the Modern World."

Bangalore,
9th January 1929.

(Sd.) Md. Iqbal.

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لا لاہور

[illegible]

محمد اقبال ۹ جنوری ۲۹ء
بنگلور

علامہ اقبال اور ان کے اہل و عیال

دستاویزی مجموعہ

جمع و ترتیب

اکبر علی خاں عرشی زادہ

علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی

علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی سے متعلق تمام تر لوازمہ کتب و رسائل میں بکھرا پڑا ہے، ان سب کی یکجائی کا تقریباً پہلی بار "شاعر" کے صفحات پر ممکن ہو سکی ہے۔ عرشی زادہ کا اکبر علی خاں کا صاحب نے تمام ممکنہ اور ضروری پہلوؤں کو جمع کرنے کی جو تحقیقی کاوش کی ہے وہ ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ ابھی اس میں اضافے ممکن ہیں۔ شاعر کے "اقبال نمبر" میں اس سارے مواد کی پیش کش کا سبب یہ ہے کہ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس ایک موضوع پر بیک وقت تمام ضروری مواد تاریخی ترتیب سے میسر آجائے اور کسی صحیح تناظر کو بننے میں آسانی ہو سکے۔ بکھری ہوئی چیزیں سوائے الجھاوؤں اور غیر ضروری مباحث کے اور کچھ نہیں دیتیں۔

علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کوئی نیا واقعہ نہیں، دنیا کی ہزاروں عظیم شخصیتیں اپنی ذاتی و نجی زندگی میں ناکام ہی رہیں۔ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے فن کاروں میں جمالیاتی ذوق بے حد نکھرا ستھرا ہوتا ہے۔ اور ان کی زندگی فطری جبلتوں کے جذب و استخراج کے متعدد واقعات سے مملو ہوتی ہے۔ کوئی فن کار ایسا نہیں جس کی جذباتی زندگی متزلزل نہ ہوئی ہو۔ علامہ اقبال کی شاعری زندگی کے انھیں تضادات کی آئینہ دار ہے جو انھوں نے بسر کی۔

علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کے متعلق لکھتے ہوئے علامہ ممدوح کے تمام عقیدت مندوں نے علامہ کو آفتاب اقبال کے معاملے میں حق بجانب قرار دیا ہے۔ آفتاب اقبال کی جو تصویر پیش کی جاتی رہی ہے اس سے تو یہی تاثر ابھرتا ہے کہ وہ ایک ناکام، معمولی اور قابلِ نفرت شخصیت کے مالک تھے۔ آفتاب اقبال نے اپنے حالات سے سخت ترین نبرد آزمائی کے بعد نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ ان کی اولاد نے بھی اچھی تعلیم پائی۔ سوال یہ ابھرتا ہے کہ علامہ اور ان کی عائلی زندگی کا تمام لوازمہ موجود و معلوم ہونے کے باوجود اصل سبب پردۂ اخفا میں کیوں رہا اور یک طرفہ تحریریں ہی سامنے آتی رہیں؟ علامہ جیسی عظیم شخصیت نے اپنے بڑے صاحب زادے کو عاق بھی نہیں کیا اور زندگی بھر کوئی تعلق بھی نہیں رکھا؟

عرشی زادہ کی تحقیقی کاوشیں اس موضوع پر کئی اعتبار سے اضافہ ہیں۔ اس میں علامہ اقبال کے شامل کئی خطوں کا متن مکاتیب کے مجموعوں میں ملتا ہے لیکن اصل خطوط کے عکس پہلی بار یہاں دیے جا رہے ہیں۔

اقبال کی جذباتی زندگی پر اثر انداز ہونے والی خواتین میں سے ایک عطیہ بیگم بھی ہیں۔ اقبال نے ان کے نام جو خطوط تحریر کیے تھے ان میں سے جہاں ایک خط محررہ ۹ر اپریل ۱۹۰۹ء اہم ہے وہیں، ۷ر اپریل ۱۹۰۹ء کا خط بھی اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ عطیہ فیضی کے نام اقبال کی کئی نظمیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ اقبال کی ذہنی ساخت اور اس کی تفہیم میں معاون ہو سکتا ہے، یہ نظمیں ہیں: "..... کی گود میں بلی دیکھ کر" "وصال" "سلیمیٰ" وغیرہ ایک نظم "پیش کش ہے ....." یہاں شامل کی گئی ہے۔

مس ویگے ناست کے نام اقبال کے تمام خطوط کا ان کے علاوہ بھی خطوط اور تمام خطوط کے عکس کی موجودگی کا علم ہو چکا ہے کہ شاعر کے گذشتہ صفحات میں دیے جا چکے ہیں اور تمام ہی خطوط اقبال اور ویگے ناست کے درمیان جذباتی تعلق کا روشن استعارہ ہیں تاہم ان کے خطوط محررہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۰۷ء، ۲۳ر اکتوبر، ۲۷ر اکتوبر، ۲ر دسمبر۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۰۸ء، ۲۱ر جنوری، ۲۶ر جنوری، ۲۶ر فروری، ۳ر جون، ۲۰ر جون،

۲۷ جون، ۳ ستمبر۔ ۱۱ جنوری ۱۹۰۹ء، ۲ جولائی ۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۰ء ۔ ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء اور ۴ جولائی ۱۹۱۳ء کے خطوط تفہیمِ اقبال کے لیے معاون ہو سکتے ہیں۔

آفتاب اقبال اور ان کے تایا شیخ عطا محمد [اقبال کے بڑے بھائی] کے درمیان ہوئی مراسلت اس پورے وقوعے کو ایک نیا تناظر دیتی ہے، واضح رہے کہ شیخ عطا محمد کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنی بے پناہ عقیدت مندی کا بارہا اظہار کیا ہے۔ علامہ موصوف کی شخصیت کی تشکیل میں شیخ عطا محمد نے ایک اہم اور بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ آفتاب اقبال اور عطا محمد کے مابین ہوئی مراسلت سے آفتاب اقبال کی ذہنی ساخت اور ان کی پوری نفسیات ابھر کر آتی ہے۔ اصل خطوط کے عکس پہلی بار یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

شیخ اعجاز احمد کی کتاب مظلوم اقبال پر تبصرہ کرتے ہوئے رفیع الدین ہاشمی تحریر کرتے ہیں:

> "مظلوم اقبال میں شامل ذخیرۂ مکاتیب کے مرتب نے متعدد خطوں سے کئی عبارات حذف کر دی ہیں بیشتر محذوف عبارات کا تعلق اقبال کی پہلی بیوی کے حوالے سے ان کی عائلی زندگی سے ہے۔ مرتب کے خیال میں اقبال کی عائلی زندگی کے المیے کے متعلق پبلک میں بحث و تمحیص مناسب معلوم نہیں ہوتی [ص: ۳۲۵] اقبال کی زندگی کا یہ پہلو کوئی سربستہ راز نہیں رہا۔ اقبال اور ان کی پہلی بیوی کے درمیان مزاجی و ذہنی اعتبار سے تفاوت اور بُعد اس درجے میں تھا کہ عائلی زندگی کی گاڑی نہ چل سکی۔ اقبالیات کے سوانحی ذخیرے میں اس پر کئی بحثیں ملتی ہیں بخصوص سے سید نذیر نیازی اور ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس مسئلے پر کھل کر لکھا ہے۔ اصل حقائق سامنے آجانے سے اقبال کے وقار میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ شیخ اعجاز احمد کی احتیاط پسندی کچھ زیادہ ہی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ محذوف حصوں کو نہ چھپاتے تو ہمیں یقین ہے کہ ان سے وہ حقیقی وجوہ سامنے آتیں جو اقبال اور ان کی پہلی بیوی [اور اس طرح ان کے بڑے بیٹے آفتاب] سے تعلقات کی کشیدگی اور اس کے نتیجے میں دوری کا سبب بنے"
>
> [اقبالیات ۱۹۸۵ء، اقبال اکاڈمی پاکستان]

ایک اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر وحید عشرت نے "مظلوم اقبال" میں شامل خطوط کے بارے میں اپنے ایک مکتوب محررہ: ۲۵ ستمبر ۱۹۸۸ء لاہور، بنام راقم الحروف تحریر کیا کہ:

> " پھر انھوں [شیخ اعجاز احمد] نے انتہائی بددیانتی سے ۱۰۳ خطوط میں کتر بیونت کی ہے، ہمارے ایک دوست نے یہ تمام خطوط اصل صورت میں حاصل کر لیے ہیں اور عن قریب ان کا یہ پول بھی کھل جائے گا جس کا مقصد اپنے بارے میں اقبال کے اصل تاثرات چھپانا تھا"

مندرجہ بالا اقتباسات کو تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جن محذوف عبارات کا ذکر یا "مظلوم اقبال" میں شامل مکاتیب میں جس کتر بیونت کا ذکر کیا گیا ہے وہ تمام اصل خطوط اور ان کے عکس یہاں دیے جا رہے ہیں اور مناسب حواشی کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اپنے افرادِ خاندان کے نام علامہ اقبال کے یہ خطوط زیرِ بحث موضوع کو مزید اجالتے ہیں۔

عرشی زادہ کے تمام لوازمے میں جہاں حوالوں کی کمی تھی وہاں مناسب حواشی کا ایزاد کر دیا گیا ہے۔ اس پورے لوازمے کے مطالعہ و تجزیے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ اقبال اور آفتاب دونوں ہی اپنے اپنے رویوں میں حق بجانب تھے۔ میرے خیال میں تو ہر اس شخص کو اپنی داخلی زندگی میں جھانک لینا چاہیے جو علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کے دونوں پہلوؤں پر لکھتے ہوئے یک طرفہ اور انتہا پسند ہو جاتا ہے۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ
قلعہ پھلواڑ - رام پور ۲۴۴۹۰۱

علامہ اقبال اور اُن کے اہل و عیال

علامہ اقبال کے چار نکاح ہوئے تھے جس کے نتیجے میں ان کی تین بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کا نام کریم بی بیؒ تھا۔ دوسری بیوی کا نام سردار بیگمؒ جن سے ایک شبہے کی بنیاد پر دوبار نکاح ہوا اور تیسری بیوی کا نام مختار بیگمؒ تھا۔ ان نکاحوں کے نتیجے میں انھیں مسلسل ازدواجی زندگی کی ناآسودگیوں سے سابقہ رہا۔ آئندہ اوراق میں علامہ کی زندگی کے اسی پہلو سے متعلق دستاویزی تحریریں پیش کی جارہی ہیں۔

میں نے ان کی جمع و ترتیب اور ان کے تجزیے اور تبصرے کا کام جہاں تک یاد آتا ہے ۱۹۸۰ء میں شروع کیا تھا۔ اور ایک کتاب "علامہ اقبال کی ازدواجی ناآسودگیاں" کے عنوان سے تیار کی تھی۔ مگر احساس ہوا کہ ابھی ایسا مسالہ موجود ہے جس تک میری رسائی نہیں ہوئی اور جس کے بغیر اس کتاب کی اشاعت نامناسب ہوگی۔ میں اس کی تلاش میں ہوں۔ اور اس تلاش میں کامیابی کے بعد ہی ان شاءاللہ کتاب کی اشاعت کا اہتمام کروں گا۔

کتاب کے تین ابواب تھے۔ چونکہ کتاب کی اشاعت میں تاخیر کا اندیشہ تھا اس لیے میں نے مناسب جانا کہ اب تک کی حاصل شدہ اہم تحقیق دستاویزات کو جو مذکورہ کتاب کا آخری باب بننے والی ہیں اہل علم تک پہنچا دیا جائے۔ سو وہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

یہ تحریریں جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے علامہ کی زندگی کے ایک خاص پہلو پر ایسی روشنی ڈالتی ہیں جو اب تک تاریکی میں تھا۔ ان کے حصول میں مرحوم آفتاب اقبالؒ (فرزند علامہ اقبال) جناب شیخ اعجاز احمد (برادرزادۂ اقبال) اور جناب مشفق خواجہ نے میری بڑی مدد فرمائی۔ ان میں علامہ اقبال کی اپنی تحریریں، ان کی پہلی بیوی اور اس کے بطن سے ان کی دو اولادوں معراج بانوؒ اور آفتاب احمد کی تحریریں اور علامہ کے برادر بزرگ شیخ عطا محمدؒ کے خطوط جو انھوں نے اپنے بھائی علامہ اقبال کے بڑے بیٹے آفتاب مرحوم کو لکھے سوانح اقبال کے سلسلے میں نہایت بیش قیمت دستاویزی مواد کی حیثیت کے مالک ہیں۔

میں نے ان پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ زوجۂ اول اور علامہ اقبال کے درمیان اختلاف کا آغاز اس تعلق خاطر سے ہوا جو علامہ کو امیر نامی لاہور کی ایک طوائف اور پھر اپنی جرمن استانی ایما ویگے ناسٹ اور تقریباً اسی زمانے میں کئی مقتدر ہستیوں کی محبوب ہستی عطیہ بیگمؒ سے رہا۔ اس تعلق کی ایک وجہ کریم بی بی کا کوئی نسوانی مرض بھی معلوم ہوتا ہے جس کے باعث علامہ اقبال تجرد جیسی زندگی گذارنے پر مجبور ہوئے ہوں گے اور جو انھیں بالآخر امیر کے دروازے تک لے گیا۔ کریم بی بی سے متعلق یہ اطلاع علامہ اقبال کی حقیقی خواہر نسبتی فاطمہ بیگم زوجہ خواجہ فیروزالدین نے بہم پہنچائی ہے۔

علامہ اقبال کا جو چہرہ آئندہ صفحات میں نظر آئے گا وہ کوئی ایسا چہرہ نہیں جسے ہماری دنیائے ادب میں یکہ و تنہا کہا جائے۔ اس کے مماثل کئی اور چہرے بھی نظر آئیں گے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ علامہ مرحوم مصلح بھی تھے اس کے لیے ان کے چہرے کی جلد پر اگر معمولی سے خراش بھی نظر آتی ہے تو ہمارا جذبۂ عقیدت و محبت اسے قبول کرنے میں نہایت درجہ تامل سے کام لیتا ہے۔ اقبال کی طرح اکبر الٰہ آبادیؒ بھی مصلح قوم تھے ان کے سوانح اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال اور اکبر الٰہ آبادی کی ازدواجی زندگی میں بڑی یکسانی ہے۔ اکبر نے بھی تین نکاح کیے وہ بھی اپنی پہلی بیوی سے شاکی رہے اور انھوں نے بھی اپنی ان اولادوں کے ساتھ عدم توجہ کا سلوک روا رکھا جو ان کی پہلی بیوی

کے بطن سے تھیں۔

اکبر ہوں یا علامہ اقبال ان کی سوانح کا یہ خاص پہلو دیکھ کر نہ برہم ہونے کی ضرورت ہے نہ افسردہ ہونے کی۔ اس لیے کہ نہ یہ فرشتہ تھے نہ پیغمبر جو معصوم ہوتے ہیں۔ اقبال ہماری آپ کی نسل آدم زاد تھے۔ برہمی اور افسردگی دو انتہا پسندانہ رویے ہیں۔ اعتدال کا راستہ یہ ہے کہ اکابر ادب کی زندگی کی لغزشوں اور حوادث کو ان کی بشریت کا ایک تقاضہ سمجھا جائے اور اس کا مطالعہ ان کی زندگی کے ایک اہم جز کی طرح کیا جائے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے مکاتیب اکبر حصہ دوم کے دیباچے میں کیا خوب لکھا ہے:

> "بڑے شخص کی غلطیاں اور کمزوریاں بھی بجائے خود قابلِ تحفظ ہوتی ہیں۔۔۔۔ مرحوم بہت سے کمالات اور فضائل کے جامع تھے جس خدائے رحمان و غفور نے "ان الحسنات یذہبن السیّآت" کا قانون مقرر کیا ہے یقین ہے کہ وہ ضرور ان کی بشری کمزوریوں سے چشم پوشی فرمائے گا"

مولانا دریابادی کے اس فیصلے کا اطلاق علامہ اقبال پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جیسا اکبر الٰہ آبادی پر۔ امید ہے کہ قارئین کرام انھیں معروضات کے تحت اور سامانِ عبرت کے بطور ان دستاویزات کا مطالعہ فرمائیں گے۔ واللعلم عند اللّٰہ۔ ❁

اکبر علی شیخ زادہ

---

① کریم بی بی [م: ۲۰ر نومبر ۱۹۴۶ء] ② سردار بیگم [نکاح اول ۱۹۱۰ء، نکاح دوم ۱۹۱۳ء۔ م: ۲۴ر مئی ۱۹۳۵ء] ③ مختار بیگم [نکاح: ۱۹۱۳ء۔ م: ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۴ء] ④ آفتاب اقبال [پ: ۱۸۹۸ء۔ م: ۱۹۷۹ء] ⑤ معراج بانو [پ: ۱۸۹۱ء۔ م: ۱۷ر اکتوبر ۱۹۱۵ء] ⑥ شیخ عطا محمد [پ: ۱۸۵۹ء۔ م: ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۰ء] ⑦ ایما ویگے ناسٹ [پ: ۲۶ اگست ۱۸۷۹ء۔ م: ۱۴ر اکتوبر ۱۹۶۴ء] ⑧ عطیہ بیگم [پ: یکم اگست ۱۸۷۷ء۔ م: ۴ر جنوری ۱۹۶۷ء] ⑨ اکبر الٰہ آبادی [پ: ۱۸۴۶ء۔ م: ۱۹۲۱ء]

بیگم امام بی بی [والدۂ اقبال]

شیخ نور محمد [اقبال کے والد]

کریم بی بی [اقبال کی پہلی بیوی]

سردار بیگم [اقبال کی دوسری بیوی]

معراج بیگم [کریم بی بی کے بطن سے]

جاوید اقبال [سردار بیگم کے بطن سے]

آفتاب اقبال [کریم بی بی کے بطن سے]

منیرہ بانو [سردار بیگم کے بطن سے]

شیخ عطا محمد [اقبال کے بڑے بھائی]

اعجاز احمد [برادر زادۂ اقبال]

ڈاکٹر شیخ عطا محمد [اقبال کے خسر]

عطیہ فیضی اور ان کی بہن زہرہ بیگم صاحب جنجیرہ
سفر یورپ ۱۹۰۸ء کی ایک تصویر

الف

نکاح نامہ اقبال و کریم بی بی

من کہ محمد اقبال ولد نور محمد المعروف شیخ نتھو قوم شیخ ساکن سیال کوٹ کا ہوں جو کہ اس وقت عقد نکاح من مقر ہمراہ مسماۃ کریم بی بی دختر شیخ عطا محمد صاحب ڈاکٹر رئیس گوجرات بمقابلہ مبلغ دو ہزار کہ نصف آں مبلغ الـــــ روپیہ ضرب ملکہ معظمہ قیصر ہند دام اقبالہا ہوتے ہیں نصف آں معجل و نصف آں موجل منعقد ہوا ہے۔

لہٰذا اس چند کلمہ بطریق نکاح نامہ کے یعنی کابین نامہ کے بالمشافہ گواہاں لکھ دیے کہ آئندہ کے واسطے

ساکن سیالکوٹ کا ہوں

مسکہ محمد اقبال ولد نور محمد المعروف شیخ نتھو قوم شیخ

دختر

جو کہ اسوقت عقد نکاح من مقر ہمراہ مسماۃ کریم بی بی

شیخ عطا محمد صاحب ڈاکٹر رئیس گوجرات بمقابلہ مہر مبلغ

الـــــ روپیہ ضرب ملکہ معظمہ

دو ہزار روپیہ کہ نصف آن مبلغ

نصف آن

قیصر ہند دام اقبالہا ہوتے ہیں نصف آن معجل و

موجل منعقد ہوا ہے۔ لہٰذا اس چند کلمہ بطریق نکاح

نامہ کے بالمشافہ گواہان لکھ دیے کہ آئندہ کے واسطے

سند ربع ـ مورخہ ۱۷ ماہ مئی ۱۸۹۳ء

العبد
محمد اقبال ولد شیخ نور محمد سیال کوٹ

گواہ شد
شیخ بوٹا ممبر کمیٹی ساکن گجرات
بقلم خود

گواہ شد
میر حسن بقلم خود
مولوی میر حسن ولد محمد شاہ سید ساکن سیالکوٹ

گواہ شد
حکیم کرم دین ولد عبدالغفار ساکن
وزیر آباد بقلم خود

مہر بقلم محمد الدین بمقام گوجرات تحریر یافت

گواہ شد
شیخ اللہ بخش ولد حاجی پیر بخش بنگلہ مسجد
بقلم خود

العبد
بقلم خود حافظ غلام احمد امام مسجد در بادشاہ دولہ صاحب

گواہ شد
حاجی محمد سعید ولد حاتم میر قوم کشمیری ساکن سیال کوٹ
نور محمد

علامہ اقبال کی پہلی شادی کا پس منظر

لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید کی زبانی

"۔۔۔۔ علامہ اقبال کی پہلی بیگم صاحبہ سے میری واقفیت تھی اور کئی برس تک میں مرحومہ سے ملتا رہا۔ کیوں کہ وہ اکثر جب لاہور آتی تھیں تو اپنی بہن کے ہاں میرے ماموں کے پاس ٹھہرتی تھیں۔ بلکہ ان کے بڑے صاحب زادے آفتاب اقبال بھی ان کے پاس رہتے تھے۔ اور میرا جب بھی کبھی سال میں ایک دوبار گجرات جانا ہوتا تھا تو میں انھیں کے پاس ٹھہرتا ان کے چھوٹے بھائی مرحوم کیپٹن غلام محمد صاحب کے صاحبزادے محمد مسعود میرے ہم عمر تھے اور خورشید انور، مسعود اور میں نے اپنا بچپن اور شروع جوانی اکٹھی گذاری۔ کیپٹن غلام محمد مرحوم مسلمان ہند میں ایک دو ان افسروں میں سے تھے جو جنگ عظیم اوّل کے دوران آئی ایم ایس میں لیے گئے مگر عمر نے وفا نہ کی اور جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ یہ علامہ اقبال کے واحد سالے تھے۔

ان کے والد خان بہادر شیخ عطا محمد گجرات کے رئیس ہونے علاوہ حکومت کے اعلیٰ افسر بھی تھے۔ اور آپ گذشتہ صدی کے اواخر میں جدہ میں وائس کونسل تھے۔ پھر سیالکوٹ میں سول سرجن رہے۔

سید نذیر نیازی جو علامہ اقبال کی زندگی پر مفصّل لکھ رہے ہیں مجھ سے اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ یہ شادی کس طرح ہوئی کہ اقبال کے سسر تو برسر اقتدار اعلیٰ تعلیم یافتہ افسر تھے اور اقبال کے والد ایک معمولی آدمی تھے۔ تو میں ان کو یہی جواب دیتا ہوں کہ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو خان بہادر مذہبی اور صوفی منش انسان تھے دوسرے اقبال کے والد بھی صوفی منش تھے اور اقبال کے استاد مولانا سید میر حسن سیالکوٹی تو عالم و فاضل تھے۔ جب خان بہادر صاحب کا تعین سیالکوٹ میں بطور سول سرجن ہوا تو ملاقات وہاں ہی ہوئی۔ چنانچہ علامہ کے استاد سے ان کی ملاقات بیشتر رہتی تھی۔ اور وہ اپنے شاگرد کی تعریف کیا کرتے تھے جو بات بھی درست تھی۔ علامہ کو خان بہادر صاحب نے پسند فرمایا اور بہ طور داماد چُن لیا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

باقی رہی بات علامہ اقبال کی بیوی کی تو وہ نہایت نیک سیرت اور خوش طبع عورت تھیں۔ بڑی ہنس مکھ۔ میں اکثر ان کو۔ نہیں بلکہ ہم تینوں۔ لیڈی اقبال کہا کرتے تھے۔ تو وہ ہنس دیا کرتی تھیں وہ بڑی نیک سیرت تھیں میں نے عمر بھر ان سے اقبال کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں سُنی بلکہ ہم تو اکثر ان سے علامہ ہی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ تعریف ہی کرتی تھیں۔

اب رہی یہ بات کہ ان دونوں میں علاحدگی کیوں اور کیسے ہوئی تو یہ علامہ کی جوانی کا وقت تھا اور وہ خود کہتے ہیں ؎

مدتے بالا رویاں ساختم۔۔۔

ایسے ماحول کے اندر ان کا علاحدہ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

[رسالہ: "فیض الاسلام"، "اقبال نمبر" راولپنڈی]

ازدواجی ناآسودگی کے بارے میں اقبال کا مکتوب عطیہ بیگم کے نام

۹۔اپریل ۱۹۰۹ء

..... میں نے علی گڑھ کی کرسی فلسفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور چند روز پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کی کرسی تاریخ کی پیشکش بھی مسترد کر دی میں کسی ملازمت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرا مقصد ہے اس ملک سے جس قدر جلد ممکن ہو بھاگ جانا وجہ آپ کو معلوم ہے۔
مجھے اپنے بھائی کا ایک طرح کا اخلاقی قرضہ ادا کرنا ہے جو عنان گیر ہے۔ میری زندگی انتہائی ویران و دلگیر ہے وہ مجھ پر میری بیوی منڈھ رہے ہیں میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انھیں میری شادی کے انصرام کا کوئی حق نہ تھا۔ بالخصوص جب کہ میں نے ایسے کسی حبالۂ عقد میں داخل ہونے سے دو ٹوک انکار کر دیا تھا۔ میں اس کا نان نفقہ برداشت کرنے کو آمادہ ہوں مگر اُسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کے لیے قطعی تیار نہیں۔

ایک انسان ہونے کے ناتے میرا بھی خوشی پر حق ہے۔ اگر سوسائٹی یا نیچر مجھے اس سے محروم کرتے ہیں تو میں دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہوں واحد علاج یہی ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرآباد کہہ دوں یا شراب میں پناہ ڈھونڈوں جو خودکشی کو آسان تر بنا دیتی ہے۔ یہ کتابوں کے مُردہ بنجر اوراق خوشی نہیں دے سکتے۔ میری روح میں اتنی آگ ہے کہ ان کے ساتھ تمام سماجی رسوم و رواج کو بھی جلا کر خاک کر دوں۔

آپ کہیں گی ایک رؤف و رحیم خدا نے یہ سب کچھ پیدا کیا۔ ہو سکتا ہے مگر اس زندگی کے حقائق ایک مختلف نتیجے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ عقلی طور پر ایک رحمان و رحیم خدا سے زیادہ ایک ابدی قادرِ مطلق شیطان پر ایمان لانا زیادہ آسان ہے مجھے ان کلمات کے لیے معاف کیجئے میں ہمدردی کا خواستگار نہیں میں تو صرف اپنی روح کو سبک بار کرنا چاہتا تھا۔ آپ میرے متعلق سب کچھ جانتی ہیں اور اسی لیے میں نے اپنے احساسات کو تو معرضِ تحریر میں لانے کی جرأت کی ہے یہ بربنائے اعتماد ہے ازراہِ کرم کسی اور کو نہ بتلائیے گا۔

..... دو تین ہفتے ہوئے مجھے آپ کی سہیلی دیگے ناست کا خط ملا۔ میں اس لڑکی کو پسند کرتا ہوں وہ کتنی اچھی اور سچی ہے۔

... آپ کا مخلص
اقبال

[خطوط بنام عطیہ فیضی ترجمہ از عبدالعزیز خالد مطبوعہ ۱۹۷۵ء]

پیش کش بہ عطیہ فیضی

۱۹۱۱ء میں علامہ اقبال اپنا پہلا اردو کلام کا مجموعہ شائع کرنا اور اسے عطیہ بیگم فیضی کے نام معنون کرنا چاہتے تھے کتاب کا انتساب منظوم ہونا تھا جس کے دو شعر (درج ذیل نظم کے شعر نمبر ۳ اور ۴) انھوں نے عطیہ بیگم کے نام اپنے ایک طویل مکتوب محررہ ۷ جولائی ۱۹۱۱ء میں تحریر کیے تھے۔ یہ خط عطیہ بیگم کی کتاب "اقبال" مطبوعہ فروری ۱۹۴۷ء کے صفحہ نمبر ۱۷، ۲۷، ۳۷، ۴۷ پر دیا گیا ہے۔ یہ پوری نظم اقبال کے برادر زادے شیخ اعجاز احمد کی بیاض سے یہاں دی جا رہی ہے۔ "روزگارِ فقیر" (جلد دوم) مطبوعہ ۱۹۶۴ء میں یہ نظم شامل کی گئی ہے۔

نغمۂ رنگیں سمجھ یا نالۂ پیہم سمجھ — اس نوا کو یا نوائے بربطِ عالم سمجھ

پیش کش ہے درد مندوں کی یہی بیچارا اشک — خواہ موتی خواہ صبحِ عشق کی شبنم سمجھ

خندہ ہے بہر طلسمِ غنچہ تمہیدِ شکست — تو تبسم سے مری کلیوں کو نامحرم سمجھ

درد کے پانی سے ہے سرسبزیِ کشتِ سخن — فطرتِ شاعر کے آئینے میں جوہر غم سمجھ

دل کو لیکن مانعِ خدمت نہیں افسردگی — اس نگیں کو تا ابد زندانیِ خاتم سمجھ

ہے ترے دم سے شرر آباد خاکستر مری
واسطے تیرے طبیعت ہے چمن پرور مری

گلستاں بن کر چمک اٹھا دلِ پُر خوں مرا — ہے سرود آموزِ بلبل نالۂ موزوں مرا

گردشِ پیہم مبارک ساغرِ خورشید کو — ہو گیا پابندِ مینا بادۂ گلگوں مرا

زخمۂ الفت سے ہے تارِ رگِ جاں نغمہ خیز — یعنی تیرے سحر سے پیدا ہوا افسوں مرا

میرے نظارے میں پیدا ہو گیا اندازِ نو — اور ہی میری زمیں ہے اور ہی گردوں مرا

ہے تری منت طلب میری بہارِ شاعری — تازہ تر ہے میرے دامن میں گلِ مضموں ترا

عشق لیکن دردِ محرومی سے پاتا ہے کمال — ہجرِ لیلیٰ سے ہوا آوارہ تر مجنوں مرا

ہے ترے نورِ خفی سے محفل افروزی مری
تیرے قدموں پر تصدق ہے جگر سوزی مری

روزنامچۂ عطیہ فیضی

میری اس ترتیب میں عطیہ فیضی کی ڈائری کے طویل اقتباسات کی بظاہر ضرورت نہیں تھی اور اس کے صرف مختصر حصے نقل کیے جا سکتے تھے لیکن میں نے سوچا ممکن ہے میرے زیرِ بحث موضوع کے علاوہ بھی اقبال پر کام کرنے والوں کو کچھ مفید مسالہ ان میں مل جائے اس لیے روزنامچے کا جتنا حصہ مرحوم ضیاء الدین احمد برنی نے شائع کر دیا تھا اس سب ہی کو شامل کرنا مناسب معلوم ہوا، امید ہے قارئین اس طوالت کو محسوس نہ فرمائیں گے اور اقبال کے بارے میں عطیہ بیگم کے تفصیلی بیانات سے لطف اندوز ہوں گے جن میں کئی جگہ مس ویگے ناست کا بھی ذکر آیا ہے۔ [عرشی زادہ]

لندن یکم اپریل ۱۹۰۷ء

آج مس بیک نے مجھے خاص طور سے یہ کہہ کر مدعو کیا کہ ایک پُرشکستہ پروفیسر جن کا نام اقبال ہے آپ سے ملنے کی غرض سے کیمبرج سے آ رہے ہیں۔ میں گئی اور اقبال تشریف لائے۔ میں نے انھیں بہت ہی فاضل شخص پایا۔ عربی فارسی سنسکرت [؟] سب بخوبی جانتے ہیں۔ بہت ہی ظریف اور باقول واقع ہوئے ہیں۔ اقبال نے فرمایا: "آپ اپنے سفرنامے کی وجہ سے ہندوستان میں اور یہاں بھی بہت مشہور ہو گئی ہیں۔ میں خاص کر آپ سے ملنے آیا ہوں اور مسز سید علی بلگرامی کی طرف سے دعوت نامہ بھی لایا ہوں کہ آپ کیمبرج آئیں اور ان کی مہمان بنیں اور آپ کا جواب بھی میں لے کر جاؤں گا۔" میں نے پوچھا، "آپ کس غرض سے لندن آئے ہیں؟" کہا کہ: "فلسفے کا مجھے زیادہ شوق ہے یورپ میں جو کچھ میسر ہے اسے حاصل کروں گا۔ جرمنی اور فرانس بھی جاؤں گا وہاں بہت کچھ ہے جو یہاں پر نہیں ہے۔" حافظ کے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حافظ کے حافظ تھے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "جب حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں اس وقت اس کی اسپرٹ مجھ میں آ جاتی ہے اور میں خود تھوڑی دیر کے لیے حافظ بن جاتا ہوں۔" مجھے بھی حافظ کا کلام یاد تھا اُسے سنا دیا۔ میں نے کہا کہ "سفرنامہ جو تہذیبِ نسواں میں نکل رہا ہے وہ میری ہمشیرہ زہرا بیگم صاحبہ کا ہے جو بہت قابل خاتون ہیں۔" انھوں نے فرمایا: "میں ایران میں رہ چکا ہوں [؟] ان کو لکھیے کہ بابا فغانی ضرور پڑھیں۔ وہ دیوان قدرے نایاب تو ہے مگر وہ اسے ڈھونڈ کر منگائیں اور پڑھیں ہندوستان میں ان کے اشعار کو کوئی نہیں جانتا کہ بابا فغانی کتنے شیریں شاعر ہیں۔"

لندن ۹ اپریل ۱۹۰۷ء

آج اقبال نے مجھے فراسکاٹی Frascati میں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانوں کی فہرست اور پھولوں کی سجاوٹ کو دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ ہر رنگ اور ہر قسم کے کھانے بے حد لطیف اور لذیذ تھے۔ یہ سب کھانے انھیں کی فرمائش سے تیار کیے گئے تھے۔ جب ان کی تعریف میں میں نے چند جملے کہے تو انھوں نے کہا: "میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں۔ ظاہری شخصیت ہر اس چیز کی قدر دان ہے جس کی قدر کرنی چاہیے اور جو کارآمد اور عملی ہے۔ دوسری اور باطنی شخصیت خواب دیکھنے والے فلاسفر اور صوفی کی سی ہے۔"

لندن ۔ ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء

آج اقبال کے لیے میں نے ایک ٹی پارٹی ترتیب دی جس میں مس سلوسٹر اور مس لیوی جیسی مشہور خواتین بھی شریک تھیں جنھوں نے علم مذاہب اور فلسفے کے امتحانات پاس کیے تھے۔ اور ایم سنیڈل اور ہیرشنہ روز جیسے وائلن اور پیانو کے ماہر بھی شریک تھے۔ اقبال کی ظرافت کا کیا پوچھنا۔ ہر ایک کی ہجو میں اشعار کہے اور ایک غزل لکھ کر مجھے اسی وقت دی۔ ان خواتین نے بھی خوب ہی عالمانہ اور ظریفانہ جواب دیے۔ وہ بھی علم کی مخزن تھیں۔ سوال و جواب اس قدر جلد ہوتے تھے کہ ان کا قلم بند کرنا دشوار نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ میں نے اقبال سے کہا کہ یہ سب باتیں لکھ دیں تو جواب دیا کہ "کیا فائدہ! مناسب موقع پر جو کچھ کہا گیا وہ سب نے سن لیا بس یہی کافی ہے۔ ان باتوں کو قلم بند کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔" ۹ بجے یہ عالمانہ مجلس ختم ہوئی اقبال بھی سب سے مل کر بے حد خوش ہوئے اور اس کا انھوں نے اظہار بھی کیا۔

لندن ۔ ۲۲ اپریل ۱۹۰۷ء

آج اقبال مجھے لینے کے لیے آئے۔ میں ان کے اور عبدالقادر صاحب کے ہمراہ کیمبرج گئی۔ ماشاء اللہ ان دونوں کی فصاحت اور بلاغت کا کیا کہنا! سارے راستے ظریفانہ اور عالمانہ باتیں ہوتی رہیں۔ [illegible] بجے

سید علی بلگرامی صاحب کے مکان پر پہنچے دن بھر وہاں مشاہیر آ[illegible] بہت لطف سے کٹ گیا۔ مگر اقبال کی سنجیدہ ظرافت اور شوخ[illegible] نہیں ہو سکتا۔ بظاہر قدرے خاموش اور سست مگر جہاں کچھ کہا بجلی کی تڑپ سے اس پر ایک نہ ایک فقرہ کس دیتے۔ طے کر لیا تھا کہ ان کا کلام لکھ لیا کروں گی مگر انھوں نے روک[illegible] کہہ کر کہ یہ باتیں وقتی ہوا کرتی ہیں۔ اسی دن میں لندن واپس آ[illegible] ہمیشہ یاد رہے گا۔

کیمبرج ۔ یکم جون ۱۹۰۷ء

آج ندی کے کنارے درخت کے سائے میں بہت بڑی یکجا[illegible] جمع ہوئی۔ پروفیسر آرنلڈ نے زندگی اور موت کے مسائل پر بحث [illegible] کہیں آخر میں اقبال نے ایک بات کہی جس کے بعد بحث ختم ہو گئی [illegible] نے فرمایا: "زندگی موت کی شروعات ہے اور موت زندگی کی" کہتے وقت ایک قسم کی تمسخرانہ مسکراہٹ ان کے چہرے سے نمایا[illegible]

لندن ۔ ۱۹ جون ۱۹۰۷ء

پروفیسر آرنلڈ نے مجھے اور اقبال کو رات کے کھانے پر [illegible] اثنائے گفتگو میں پروفیسر آرنلڈ نے کہا: "مجھے ابھی ابھی معلو[illegible] کو جرمنی کے ایک مقام میں نایاب مخطوطات دریافت ہوئے [illegible] ضرورت ہے کہ معلوم کیا جائے کہ وہ کیا ہیں! اقبال میں تم [illegible] بھیجنے کا خیال کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ تم ہی اس کام کے لیے [illegible] موزوں ہو۔" اقبال نے جواب دیا: "میں آپ کا شاگرد ہوں میرے استاد ہیں شاگرد اپنے استاد کے سامنے کیا کر سکتا[illegible]" پروفیسر آرنلڈ نے کہا کہ بعض اوقات شاگرد استاد سے بڑ[illegible] ہے اس کے علاوہ شاگرد کو اپنے استاد کا کہنا ماننا چاہیے۔ [illegible] نے جواب دیا: "آپ استاد کا علم شاگرد سے زیادہ ہوتا ہے اور [illegible] جو کچھ فیصلہ ہے تو آپ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم [illegible]" اقبال نہایت شگفتہ اور شوخ تھے اور ہمیشہ با موقع

سلہ زہرا بیگم کی تاریخ پیدائش [illegible] ستمبر [illegible] ہے انھوں نے ۸۲ سال کی عمر میں [illegible] ستمبر [illegible] کو وفات پائی۔

ں باغات میں پہنچے۔ وہاں کتابیں نکالیں اور کہا کہ: "اسپینوزا کو
آج آپ کو لیبنیز کا نقطۂ نظر سمجھایا جائے گا" پھر کہا کہ: "ہر سال
ں میں آپ کے پاس آکر رہوں گا اور علم النفس، تاریخ، اخلاقیات
اخلاق، شاعری اور مابعد الطبیعیات کے بارے میں جرمنوں نے
یں لکھیں وہ سب پڑھاؤں گا" جن کتابوں کے نام بتائے ان کے
یں کہا: "ان کا مطالعہ کرنا اور ان پر تنقید لکھنا تصوف کا مطالعہ
وری ہے"۔ اس طرح شام تک دو ڈھائی گھنٹے ہم باغ میں
ر سبق پڑھتے رہے۔

میونخ ۔ ۲۸ ر اگست ۱۹۰۷ء

ج بہت سویرے نکل گئے۔ اور قدیم و جدید قومی میوزیم، محلات
، پکچر گیلریاں، گیلری اسکول، شہنشاہ لڈوگ ثانی کی گیلری
لیز کو دیکھا۔ اقبال بظاہر سست دکھائی دیتے ہیں مگر جب ان
ن پر گئے تو انھیں اس قدر پُرجوش اور زندگی سے بھرپور پایا کہ
ت سے ان کو دیکھتی تھی اور ان کی باتیں سنتی تھی۔ البتہ انھیں
ں موسیقی میں دخل نہیں ہے مگر وہ اس کے قدر داں بہت ہیں۔
مسرت کی جو تصویر دہنڈ نے بنائی ہے اس کے سامنے کھڑے ہوکر
نے کہا کہ: "شہر میونخ ہی جزیرہ مسرت ہے جو خوبصورت تصویر
یا میں ڈوبا ہوا ہے" ظاہر ہے کہ اقبال کو میونخ زیادہ پسند ہے۔
بیر پروفیسر دین کے مکان پر گئے۔ ان کی بیٹی بہت قابل اور
یادہ حسین اقبال کی پروفیسر رہ چکی ہیں۔ اس نے اقبال کو جرمن
ر دقیق کتابیں پڑھائی ہیں۔ میں ان لوگوں سے بہت محظوظ ہوئی۔
ں مذاکرۂ علمی شروع ہوگیا فراؤلین ڈمس ٹ اقبال کا امتحان
دلچسپ طریقے سے لے رہی تھیں۔ اقبال جواب دیتے اور فراؤلین
یں کہ یوں نہیں یوں۔ میں حیرت کے عالم میں مستغرق تھی اور دل
ی تھی کہ کتنی قابل اور لائق نازنین ہے کہ اقبال جیسے شخص کو بھی
ے ان کے سوال جواب سے بہت زیادہ لطف آیا۔ اس کے بعد
نے پیانو بجایا کیا کہنا ہے ہر فن میں کامل و اکمل۔ سوال و جواب میں
ٹے لگ گئے۔ گفتگو دماغ و قلب کو بہت کچھ منور کرنے والی تھی۔
ے دیکھا کہ وہ اقبال کی اچھی طرح خبر لیتی ہیں اور اقبال ان کے سامنے
بے زبان اور منکسر المزاج بنے رہتے ہیں۔ فراؤلین نے کہا کہ: "اقبال
ہ مہینے میں جتنی جرمن زبان سیکھی ہے اتنی جلد کوئی حاصل نہیں
ا" اقبال نے جواب دیا کہ: "اگر یہ متمیز اور میٹھی چھری میری استاد
ی تو ناممکن تھا کہ میں کچھ سیکھتا"۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب
یں لکھی ہے جس کی وجہ سے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔

میونخ، ہائیڈل برگ ۔ ۲۹ ر اگست ۱۹۰۷ء

آج بہت سویرے اقبال کی رہنمائی میں ایک لمبی ڈرائیو کی۔
ر ودیش بہت خوبصورت ہے وہاں اس دوران میں ہمیں تاریخ
، ہے۔ لائبریری میں ٹھہر کر انھوں نے چند قدیم عربی قلمی نسخ
ئے اور کہا کہ: "مجھے یہاں عربی کا علم حاصل ہوا ہے" پھر اسٹیشن
، اور وہاں سے ہائیڈل برگ پہنچ گئے۔ وہ سب استقبال کے
رلوں کے ساتھ ہندوستانی وضع میں گزرے ہوئے تھے لائے تھے
دیکھتے چلے حالات پوچھتے رہے کہ اقبال نے کیا کیا دیکھا اور
سنایا کہیں کہیں تاریخ بہت زیادہ دلچسپ اور سبق آموز تھی

بھی بہت ہے۔ بینے شل نے کہا کہ: "آپ لوگوں کی خوش نصیبی ہے
جس سے ہم سب بھی بہت خوش ہیں" وہ میرے لیے گلاب لائی تھیں۔
یہ دیکھ کر اقبال نے کہا "گلاب کا پھول گلاب ہی دیتا ہے"۔ بڑے حاضر
جواب ہیں۔

ہائیڈل برگ ۔ ۳۰ ر اگست ۱۹۰۷ء

آج سب کشتیوں میں گئے۔ "بوٹ ریس" ہوئی اس میں اقبال کی کشتی
سب سے آخر میں آئی کیوں کہ وہ کتاب پڑھنے میں لگ گئے تھے۔ پتا نہ
ہوا جب ہم سب ان کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ وہ کتابوں میں مستغرق
ہیں۔ فراؤلین ویگے ناست نے کہا "آج کشتیوں کی ریس مقرر ہے چلنا ہوگا"
آخر سب مل کر انھیں گھسیٹ کر لے گئے اور پھر بہت خوشی سے شریک
رہے۔ شام کو باغ میں سوال جواب ہوئے۔ اس موقع پر اقبال بہت
ہی ذی ہوش اور ہوشیار طالب علم بنتے ہیں۔ بہت ہی لطف کا موقع
ہوتا ہے اور سب مشتاق رہتے اور شریک ہوتے۔ تین گھنٹوں میں دنیا
و مافیہا کو بھول جاتے۔

ہائیڈل برگ ۔ ۳۱ ر اگست ۱۹۰۷ء

آج آٹھ بجے ہم کوئی اسی پروفیسر اور طالب علم ٹرین میں ندی
کے کنارے نیکر وادی کا خوبصورت منظر دیکھتے ہوئے اس مشہور
شلوس نیکراشٹائن میں گئے جو بہت بلندی پر واقع ہے۔ اسے کسی بادشاہ
نے بنایا تھا۔ یہاں قسم قسم کے پھولوں کے درخت ہیں۔ اقبال نے کہا:
"سیب کھانے کے لیے پل صراط سے گزر کر جنت میں داخل ہوتے ہیں"۔
یہاں آنے کا منشا یہ ہے کہ ہر قسم کے پھلوں اور درختوں کی تصویریں بنائی
جائیں اور خوب اچھی طرح سے کھانا کھایا جائے۔ ان جلسوں میں اقبال
کو بھی شریک ہونا پڑتا ہے اور خوبی تو یہ ہے کہ وہ بہت خوش اسلوبی سے
شرکت کرتے ہیں۔ پھلوں نے جنگل نے تمام پہاڑی کو گھیر رکھا ہے۔
راستہ جوان درختوں میں سے گیا ہے وہ مخروطی شکل کا ہے اور ندی کا
پانی بھی ساتھ ساتھ بہتا چلا گیا ہے۔ نادر الوقوع اور انتظام بھی نہایت
اچھا ہے۔ اس طرح خوشی خوشی پھل پھول جمع کرتے ہوئے نیچے آئے۔
پہاڑی کے دامن میں ایک مشہور اوپن ایئر ہوٹل ہے جس کے کھانے بہت
لذیذ ہوتے ہیں۔ چوں کہ بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے خوب مزے لے لے
کر کھایا۔ اس کے بعد فلاورا اینڈ فروٹ ڈانس ہوا۔ سب کے ہاتھوں
میں پھولوں اور پھلوں کی ٹوکری تھی۔ یہ منظر بھی عجیب تھا۔ فراؤلین
ویگے ناست نے اقبال کے ساتھ کچھ تصویریں کھنچوائیں اور سب نے
خوب تالیاں بجائیں۔ یہاں بھی مقابلہ ہوا اور اقبال نے انعامات تقسیم
کیے ہر ایک بچوں کی طرح خوش و خرم تھا مگر تمام وقت درس
ہوتا جاتا۔

ہائیڈل برگ ۳۱ ۔ اگست ۱۹۰۷ء

آج ہم میڈم شیرر کی رہنمائی میں دو دن کے سیر سپاٹے کے لیے آئے
باغ گئے۔ یہاں ایک نیچرل ہسٹری میوزیم ہے اور ماسکو کا بھی عجائب خانہ
ہے۔ ہر قسم کے مسالے بھر کر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخ بھی درج تھی۔
اور یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ ان کی زندگی کیسے گزرتی ہے۔ واسکو کے برتنے
کے طریقے بھی کھیلوں کے ذریعے دکھائے گئے تھے۔ یہ بہت سادی گری
اور جبر کا کام ہے۔ اس میں اقبال نے بالکل کمال کر دیا۔ معلوم نہیں تھا
کہ ان چیزوں میں بھی ان کو دخل ہے۔ کس قدر دلچسپ طریقہ ہے

تعلیم دینے کا۔ یہ سب باتیں یہاں کی تعلیم میں شامل ہیں۔ یہی غالباً سبب
ہے کہ اقبال جرمنی اور جرمن لوگوں کے دل دادہ اور شیدا ہیں۔

ہائیڈل برگ ۔ ۳ ر ستمبر ۱۹۰۷ء

اقبال کی ظرافت اور حاضر جوابی بے مثل ہے۔ چوں کہ کوچ ہے
اس لیے ہم سب کھڑے کھڑے بات چیت کر رہے تھے فراؤلین ویگے
ناست، بینے شل اور کاڈینا میرے گرد پیش تھیں اور اقبال سامنے
کھڑے ٹکٹکی لگائے بت بنے دیکھ رہے تھے۔ اس پر فرا پروفیسر شیرر
نے کہا: "اقبال کیا دیکھ رہے ہو؟ تم مبہوت نظر آتے ہو" اقبال نے
برجستہ جواب دیا: "میں یکایک ہیئت داں کی صورت میں تبدیل ہوگیا ہوں
میں ستاروں کے اس جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں" رات کھانے پر ایک
لڑکی کو دیکھ کر بے ساختہ کہتے ہیں ؎

اس کے عارض پر سنہری بال ہیں
جو طلائی استرہ اس کے لیے

ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ تمام وقت اس قسم کے اشعار کہتے رہے۔
اقبال کس قدر ہمہ گیر اور ہر خوبی سے معمور ہیں۔

ہائیڈل برگ ۔ ۴ ر ستمبر ۱۹۰۷ء

آج صبح چھ گھنٹے پہلے سے مشہور معروف باغ میں گئے۔
ہر ایک نے کھانا الگ الگ تیار کیا تھا۔ سب ایک جگہ رکھا گیا۔ چکھایا
اور رجانچا گیا۔ نقائص اور خوبیاں ہر ایک کے متعلق بیان کی گئیں۔ اس
میں اقبال کا تیار کردہ کھانا بھی موجود تھا جو ہندوستانی طرز کا تھا۔ بہت
لطف رہا۔ خدا حافظ کہنے کی رسمیں ادا ہو رہی تھیں۔ جب جانے لگی تو سب
کے سب ایک صف میں کھڑے ہوگئے مجھے سامنے کھڑا کیا گیا اور میٹھے
کے ساتھ یہ گانا سنایا گیا۔ اقبال رہنمائی کرتے اور الفاظ ادا کرتے اور
پھر باقی لوگ انھیں گاتے۔ یہ گانا طیب نے انشا کیا ہے وہو ہٰذا:

آخر کار ہندوستان کے نہایت درخشاں ہیرے کو خدا حافظ
کہنے کا وقت آہی گیا۔
وہ نادرہ جو یہاں چمکتا تھا اور رقصاں رہتا تھا اور دور و
نزدیک کے مجموعوں کو روشن کرتا تھا۔
جو امن اور شانتی کے جھنڈے کی طرح خبر گیری کرتے ہوئے
ہر جگہ برہم مزاجوں کو سکون دیتا تھا۔
ہم ایک بڑی آہ سے آراستہ ہوکر آئے ہیں جو دور و نزدیک اور ہر
بلندی تک جاتی ہے۔
ہاں تم! جنھیں اس اشعار میں مخاطب کیا گیا ہے۔
ہماری بہتر دعائیں اور برکتیں اپنے ساتھ لیتی جاؤ۔
ہماری بہترین خواہشات تمھارے ساتھ رہیں گی میدانوں سمندروں
اور جھیلوں کو عبور کرتے وقت شان و شوکت اور کامیابی کے
ساتھ واپس لوٹو تمھارے دوست بہت بڑی تعداد میں منتظر رہیں گے۔
لہٰذا اس وقت تک کے لیے ہم کہتے ہیں۔
خدا حافظ، الوداع خدا کرے ہم پھر ملیں۔

ایک بھولی ہوئی صحبت

ضیاء الدین احمد برنی ۔ بی اے

یہ مضمون ۲۱/اپریل ۱۹۴۶ء کو اقبال ڈے کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ جو انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی کے ہال میں نواب حسن یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ حیدر آباد کی زیر صدارت منایا گیا تھا۔ اس جلسے کو محترمہ عطیہ بیگم نے ترتیب دیا تھا۔

❁

میں عطیہ بیگم کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے یہ موقع دیا کہ میں آپ کے سامنے علامہ اقبال کے متعلق ایک بھولی ہوئی صحبت کا حال بیان کروں۔ میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ گذشتہ تیس بتیس سال میں مجھے وقتاً فوقتاً علامہ موصوف کی خدمت میں حاضری دینے کا شرف حاصل رہا ہے۔ سب سے پہلے مجھے دہلی میں ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ان کی زبان فیض ترجمان سے نہ صرف ان کی روح پرور تقریر سننے کی سعادت نصیب ہوئی بلکہ وہ نظم بھی سنی جو انھوں نے اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائی تھی اور جس کی آواز سے میرے کان اب تک لذت گیر ہیں۔ وہ نظم یثرب کے متعلق تھی اور وہ آپ کو "بلادِ اسلامیہ" کے عنوان کے ماتحت "بانگِ درا" میں ملے گی۔ اس نظم میں انھوں نے درحقیقت ان احسانات کو گنوایا ہے جو اسلام کی بدولت دنیا کو نصیب ہوئے۔ اس کانفرنس میں خواجہ کمال الدین مرحوم اور ہز ہائی نس آغا خان جیسے اکابر قوم بھی موجود تھے۔

اس کے بعد لاہور اور بمبئی میں میری مرحوم سے ملاقاتیں رہیں مگر آج میں بمبئی کی صرف ایک صحبت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ گول میز کانفرنس کے لیے جاتے وقت علامہ موصوف نے بمبئی میں چند دن قیام فرمایا تھا اس موقع پر محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے ان کے اعزاز میں اپنے تاریخی مکان "ایوانِ رفعت" میں ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا تھا جس میں رؤسا و مہاراجگان کے علاوہ اسلامی ممالک کے قونصل اور مرزا علی اکبر خاں مرحوم جج ہائی کورٹ بمبئی، مولانا محمد عرفان مرحوم، ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی جیسے بہت سے فاضل حضرات بھی تشریف فرما تھے۔ اس وقت جب حاضرین سے ان کا تعارف کرایا جا رہا تھا تو میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ان سے نہایت عقیدت مندانہ احترام سے مل رہے تھے۔ حالانکہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے علامہ کا صرف نام ہی سنا تھا اور ان کے شاعرانہ کمالات سے مطلق واقف نہ تھے۔ مجمع نے علامہ موصوف سے درخواست کی کہ وہ بذریعہ تقریر اپنے ارشادات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں اور کوئی پیغام بھی عطا کریں۔ جواب میں علامہ نے انگریزی میں ایک مختصر سی تقریر کی اور فرمایا کہ بطور انعام کے میں صرف ایک شعر پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ وہ شعر یہ ہے :

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام   خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تو ایسی حسین و جمیل زندگی بسر کر کہ اگر تیری موت فی الحقیقت دائمی موت کی شکل اختیار بھی کر لے تو خدائے تعالیٰ کو شرم محسوس ہو کہ ہائے کیسی پر عظمت چیز فنا کے گھاٹ اتار دی گئی اور اسے ابدیت کیوں نہ بخشی گئی۔

جب علامہ یہ شعر پڑھ رہے تھے اس وقت سننے والوں میں جو اصحاب فارسی داں تھے وہ اس کے تخیل کی گہرائی سے بے حد متاثر نظر آتے تھے اور شعر کے ایک ایک لفظ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس شعر میں انسانی زندگی کی غیر معمولی عظمت کا جس طریقے سے اعتراف کیا گیا ہے وہ اقبال ہی کا حصہ تھا۔ "شرمسار گردد" کے الفاظ جن سے دربارِ الٰہی میں حضرت اقبال کی جسارت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے اس شعر کی خوبی میں خاصی لطافت پیدا کر دی ہے۔

جب علامہ تقریر ختم کر چکے تو دوست و احباب نے انھیں گھیر لیا اور اصرار کیا کہ اس شعر کا انگریزی ترجمہ بھی لکھ دیا جائے۔ چنانچہ مقتدر مہمان کی درخواست کو شرفِ پذیرائی بخشا اور ذیل کا ترجمہ لکھوایا۔ فرماتے ہیں :

Live so beautifully
That if death is the end of all
God himself may be put to shame
for having ended thy career.

اس کے بعد چائے نوشی ہوئی اور اقبال حاضرین سے خوش گپیاں فرماتے رہے۔ جب چائے نوشی کا سلسلہ ختم ہوگیا تو "ایوان رفعت" کے ہال میں رقص و سرود کا انتظام کیا گیا۔ رقص و سرود کے دوران میں علامہ اقبال نے فی البدیہہ تین اشعار قلم بند کرکے عطیہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کیے۔ وہ شعر یہ ہیں :

میترسم کہ تو می رانی زورق بسراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر

بر کشت و خیابان پیچ، بر کوہ و بیابان پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بسحاب اندر

ای مطرب دل آویزے از سوز خرد مطرب نیست!
ہنگامہ جہاں خورے نالہ برباب اندر

محمد اقبال در درگاہ عطیہ بیگم
بمبئی ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

یہ اشعار بھی بجائے خود ایک مستقل پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ دنیا پر چھا جائے اور سکڑی ہوئی زندگی بسر نہ کرے۔ آخری شعر میں غالباً اس موسیقی کی داد دی گئی ہے جس کا انتظام ۱۰ ستمبر کی سہ پہر کو ایوانِ رفعت میں کیا گیا تھا۔
یہ مخصوص صحبت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوگئی مگر آج بھی اس کی یادیں میرے دماغ میں جوں کی توں محفوظ ہیں۔ میں ان چند گھڑیوں کو جو ۱۹۳۱ء کی ایک سہانی شام کو ایوانِ رفعت میں ڈاکٹر اقبال کی معیت میں صرف ہوئیں اپنی زندگی کے بہترین اوقات میں شمار کرتا ہوں۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اقبال جو بات کرتے وہ یا تو پاکیزہ مذاق کا پہلو لیے ہوئے ہوتی تھی یا گہری فلسفیانہ ہوا کرتی تھی۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اقبال کی ساری زندگی ایسی ہی بذلہ سنجیوں پر مشتمل رہی۔ اگر ڈاکٹر جانسن کی طرح ہمارے ڈاکٹر اقبال کو بھی کوئی باسویل جیسا سوانح نگار مل جاتا جو سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہتا اور اس طرح کی ہزارہا صحبتوں کے واقعات کو قلم بند کرتا رہتا تو آج ہماری زبان کس قدر مالدار ہو جاتی۔ جیسا کہ خواجہ حالی نے اپنے استاد مرزا غالب کے متعلق لکھا ہے ؎

اس کی تھی بات بات میں ایک بات

بعینہٖ یہی کیفیت علامہ مرحوم کی تھی۔ وہ جب آنکھیں نیم وا کیے باتیں کیا کرتے تھے تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے حقیقتہً پھول جھڑ رہے ہیں۔ یہ بہت [illegible] خدمت ہوگی اگر اقبال کے بارے میں ایسے ہی تمام واقعات کو جمع کر لیا جائے جو اب تک عام نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ یاد رکھیے کہ اقبال کے [illegible] قومی سرمایہ ہیں اور ضرورت ہے کہ اس قومی سرمائے کو پوری طرح سے اور جلد سے جلد محفوظ کر لیا جائے۔

اقبال [illegible] از عطیہ بیگم۔ ترجمہ: ضیاء الدین احمد برنی۔ مطبوعہ: ۱۹۵۶ء، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی

اقبال کے امیر سے جذباتی تعلق کے بارے میں عبدالمجید سالک کا بیان

شورش کاشمیری کی زبان سے

"...... اس بازار میں پھرتے پھراتے مجھے ایک گھرانے میں جانا پڑا جس کی مالکن کبھی جوان تھی۔ ایک زمانے میں علامہ اقبال اس کی آواز سے خوش ہوتے تھے اُس کا نام امیر تھا۔ امیر کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اس وقت ستر پچھتر برس کے لپیٹے میں تھی۔ چہرے پر جھریوں کی چھتت سے معلوم ہوتا تھا کہ لٹے ہوئے عیش کی تصویر ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر کے ٹانکے ہلا کر سوال کیا کہ وہ مجھے اقبال کے بارے میں کیا بتا سکتی ہے۔ لیکن طرح دے گئی۔"

واپس آکر میں نے سالک صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ امیر کے نام سے ششدر رہ گئے۔ پوچھا: "ابھی تک زندہ ہے؟" عرض کیا: "جی ہاں" پھر ایک واقعہ سنایا کہ:

"ایک دن مولانا گرامی لاہور تشریف لائے تو مجھے دفتر سے اٹھا کر علامہ اقبال کے ہاں لے گئے۔ علامہ ان دنوں بازار حکیماں میں رہا کرتے تھے۔ علی بخش سے پتا چلا کہ علامہ بیمار ہیں دھسّہ لے کر لیٹے ہوئے تھے داڑھی بڑھی ہوئی، چہرہ اترا ہوا۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں گرامی دیکھتے ہی آب دیدہ ہو گئے۔ پوچھا خیریت ہے؟ معلوم ہوا کہ امیر کی ماں نے میل ملاقات بند کر دی ہے۔ پچھلے تین روز سے ملاقات نہیں ہوئی۔ گرامی کھلکھلا کر ہنس پڑے پنجابی میں کہا:

اَوچھڈیار توں وی غضبُ کرتا ایں او تینوں اپنی ھَنڈی کِسّ طرح دے ویت

[چھوڑیار تم بھی غضب کرتے ہو بھلا وہ تمھیں اپنی ہنڈی کس طرح دے دے]

علامہ بے حد غمگین تھے۔ گرامی نے علی بخش سے کہا۔ گاڑی تیار کرو مجھے ساتھ لیا اور اسی بازار کو روانہ ہو گئے۔ امیر کے مکان پر پہنچے دستک دی۔ امیر کی ماں نے گرامی کو دیکھا تو خوش دلی سے خیر مقدم کیا... آپ ادر یہاں "اَھْلاً وَسَھْلاً"

گرامی نے امیر کی ماں سے گلہ کیا کہ تو نے ہمارے شاعر کو ختم کرنے کی ٹھانی ہے۔ اس نے کہا:

"مولانا شاعروں کے پاس کیا ہے چار قافیے اور دو ردیفیں۔ کیا میں اپنی لڑکی ہاتھ سے دے کر فاقے مر جاؤں۔ آپ کا شاعر تو ہمارے ہاں نقب لگانے آتا ہے میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہوگا"

گرامی نے اجلی داڑھی کا واسطہ دیا اور دو گھنٹے کی شخصی ضمانت دے کر امیر کو ساتھ لے آئے میں علی بخش کے ساتھ، گرامی امیر کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں چلا آ رہا تھا۔ علامہ کے یہاں پہنچے تو گرامی نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

"اٹھو جی، آگئی امیر"

"سچ مچ!"

علامہ نے حیرت سے پوچھا۔ امیر سامنے کھڑی تھی دفعتہً ان کا چہرہ جگمگا اٹھا"

سالک صاحب نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا زندگی میں اس قسم کی آرزوئیں ناگزیر ہوتی ہیں انسان کو ان راستوں سے گذرنا ہی پڑتا ہے۔ فرمایا جس زمانے میں علامہ اقبال انارکلی میں رہا کرتے تھے ان دنوں لاہور دروازے اور پرانی انارکلی میں بھی کسبیوں کے مکان تھے ایک دن میں اور علامہ اقبال پرانی انارکلی سے گذر رہے تھے کہ اچانک ایک ٹکیائی کے دروازے پر رک گئے۔ ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی عورت مونڈھے پر بیٹھی حقہ سلگا رہی تھی۔ اندر گئے۔ حقہ کا کش لگایا اٹھنی یا روپیہ اس کے ہاتھ میں دے کر آ گئے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ "ڈاکٹر صاحب یہ کیا حرکت؟" فرمایا "سالک صاحب اس عورت پر نگاہ پڑی تو اس کی شکل دیکھ کر ہری اٹھی کہ اس کے پاس کون آتا ہوگا پھر مجھے اپنے الفاظ میں تجربہ محسوس ہوا میں نے خیال کیا کہ آخر اس کے پہلو میں بھی دل ہوگا۔ یہی احساس مجھے اس کے پاس لے گیا کہ اپنے نفس کو سزا دے سکوں اور اس کی دل جوئی کر دوں۔ یہ عورت صرف پیٹ کی مار کے باعث یہاں بیٹھی ہے ورنہ اس میں جسم کے عیش کی ادنیٰ سی علامت بھی نہیں"۔

سالک صاحب نے علامہ اقبال کے ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عمر کی آخری تہائی میں وہ ہر چیز سے دست بردار ہو گئے تھے۔ ان کے قلب کا یہ حال تھا کہ آیۂ واحد میں بے اختیار ہو کر رونے لگتے۔ حضورؐ کا نام آتے ہی ان کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ پہروں اشک بار رہتے۔

ایک دفعہ میں نے حدیث بیان کی کہ مسجد نبوی میں ایک بلی نے بچے دے رکھے تھے صحابہؓ نے بلی کو مار بھگانا چاہا۔ حضورؐ نے منع کیا۔ صحابہؓ نے عرض کی مسجد خراب کرتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

"اسے مارو نہیں یہ ماں ہو گئی ہے"

حدیث کا سننا تھا کہ علامہ بے اختیار ہو گئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سالک صاحب، کیا کہا؟ "مارو نہیں ماں ہو گئی ہے"۔ اللہ اللہ! امومت کا یہ شرف۔

سالک صاحب کا بیان تھا کہ حضرت علامہ کوئی پون گھنٹہ اس طرح روتے رہے میں پریشان ہو گیا۔ ان کی طبیعت بحال ہوئی تو مجھے بھی چین آیا ورنہ جب تک وہ اشکبار رہے میں ایسا رہا گویا مجھ سے کوئی شدید غلطی سرزد ہو گئی ہو"۔

["اس بازار میں"، از شورش کاشمیری]

راقم کی تحقیق کے مطابق امیر بیگم کا تعلق گو طوائفوں کے ایک گھرانے سے تھا لیکن وہ اور اس خاندان کی دیگر خواتین تائب ہو چکی تھیں۔ اس خاندان کی بعض خواتین اپنے حسن و جمال کے ساتھ اردو اور فارسی ادب سے گہرے شغف کے سبب مشہور تھیں۔ ان میں سے چند کی شادیاں لاہور کی معزز شخصیات سے ہوئیں جن کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ امیر بیگم اردو اور فارسی اساتذہ کے کلام سے شناسا ہونے کے علاوہ خود بھی شعر کہتی تھیں۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ اردو میں بات چیت کرتیں۔ اسی وجہ سے اقبال ان سے بے حد متاثر تھے۔

[جاوید اقبال، زندہ رود، جلد دوم، ص: ۱۷۵، ۱۷۶، مطبوعہ ۱۹۸۳ء، اشاعت دوم لاہور]

اقبال کا خط سیّد تقی شاہ کے نام

امیر سے تعلق خاطر کے سلسلے میں

از مقام مغل کوٹ[1]

ڈیر سیّد تقی[2] السلام علیکم

آج مقام مغل کوٹ میں پہنچے۔ گھوڑے کا سفر اور گھوڑے سے اکتائے تو اونٹ کا سفر۔ خدا کی پناہ۔ پہلے روز ۳۷ میل کا سفر گھوڑے پر کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی۔ لیکن جو تکلیف محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو وہ لذیذ ہو جاتی ہے۔

فورٹ سنڈی مین ابھی یہاں سے ۵۰ میل کے فاصلے پر ہے پرسوں پہنچیں گے بشرطیکہ کوئی بارش نہ ہوئی۔ آج مغل کوٹ پہنچتے ہی بھائی صاحب کے متعلق خبر ملی۔ ان کو رائل انجنیر کوئٹہ کے تار پر تار دینے کی وجہ سے حراست سے نکال دیا ہے۔ اس نے متواتر تاریں دیں کہ ایک معزز افسر کو بغیر منظوری شملہ کیوں حراست میں دیا گیا ہے۔ اسی متواتر تاروں کے دوران وہاں کے پولیٹیکل ایجنٹ کی تبدیلی بھی ہو گئی ہے۔ سنا ہے کہ اس مقدمے میں اس کی ہی شرارت تھی۔ خدا انجام بخیر کرے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ امید ہے کہ اس مقدمے کا نتیجہ بھائی صاحب کے حق میں اچھا ہوگا۔ معلوم ہوتا کوئٹہ کے حکام کو ان کی دیانت وغیرہ کا ثبوت کافی مل گیا ہے۔ ایجنٹ کوئٹہ کے فورٹ سنڈی مین کے ایجنٹ کی فوراً تبدیلی کر دی ہے۔ اس مقدمے کی ساری بنا عداوت پر ہے۔ مجھے سارے حالات ابھی معلوم نہیں ہو پائے تاہم جو کچھ معلوم ہوئے ان سے یہی اندازہ کر سکا کہ اس کی تہ میں عداوت محض ہے۔ باقی خیریت ہے۔

امیر[3] کہاں ہے؟ خدا کے لیے وہاں ضرور جایا کریں۔ مجھے بہت اضطراب ہے۔ خدا جانے اس میں کیا راز ہے۔ جتنا دور ہو رہا ہوں اتنا ہی اس سے قریب ہو رہا ہوں۔ والسلام

شیخ صاحب کی خدمت میں یہ تمام حالات عرض کر دیں۔

والسلام
آپ کا مخلص
محمد اقبال

۱۔ یہ خط مئی ۱۹۰۴ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس خط کا عکس ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء کے "امروز" میں شائع ہوا تھا۔ خط کی تاریخ کا تعین ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے کیا۔ ۲۔ سید محمد تقی شاہ [فرزند اکبر سید میر حسن] علامہ اقبال کے بچپن کے بے تکلف دوست تھے۔ خط کا متن "خطوط اقبال" مرتبہ رفیع الدین ہاشمی مطبوعہ ۱۹۷۶ء، ص: ۶۷، ۶۸ پر دیا گیا ہے۔ ۳۔ علامہ اقبال نے تقریباً اسی زمانے میں [۱۹۰۴ء] اپنی ایک نظم "سرگزشت آدم" کے مقطع میں اپنے اس تعلق خاطر کا اظہار بایں الفاظ کیا ہے: ؎

عجب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبال میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

یہ نظم "مخزن" [ستمبر ۱۹۰۴ء] میں غزل کے طور پر شائع ہوئی تھی، اس غزل کے چند اشعار حذف کر کے ایک مربوط نظم [۱۸ اشعار] کے طور پر "بانگ درا" میں شامل کیا۔ محولہ بالا مقطع بھی محذوف اشعار میں سے ایک ہے۔ باقیات اقبال کے مجموعوں میں "سرود رفتہ" مرتبہ غلام رسول مہر، مطبوعہ ۱۹۵۹ء وغیرہ میں شامل ہے۔

صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے نام

اقبال کے اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے سلسلے کے دو خط

(۱)

مخدوم و مکرم خان صاحب : السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ لاہور ہوتا ہوا مجھے یہاں ملا ـ میں ایک مصیبت میں مبتلا اس وقت لاہور سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر برٹش بلوچستان میں ہوں ـ آپ بھی خدا کی جناب میں دعا کریں کہ اس کا انجام اچھا ہو ـ آپ کا خط حفاظت سے صندوق میں بند کر دیا ہے ـ نظر ثانی کے آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاؤں گا ـ اگر میری نظم کے متعلق آپ اس قسم کے خط لکھ دیا کریں تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا ـ

آپ کا

اقبال

از فورٹ سنڈیمن برٹش بلوچستان ۲۵ مئی ۱۹۰۳ء

[اقبال نامہ (حصہ اول) مطبوعہ ۱۹۴۵ء ، ص : ۵]

ط

۱۹۰۲ میں شیخ عطا محمد کو ملٹری ورکس [فورٹ سنڈیمن بلوچستان] کے محکمے نے ان کے ایک ہم عصر کو جو ان سے سینیئر تھا ، نظر انداز کر کے شیخ عطا محمد کو سب ڈویژنل افسر مقرر کر دیا جس سے ان کی تنخواہ دوگنی ہو گئی ـ یہ بات اس سب اوورسیئر کو قدرتاً ناگوار گزری ـ شیخ عطا محمد کو اس حلقے میں سب ڈویژنل تعینات کیا گیا جس میں وہ اوورسیئر تعینات تھا ـ اس حلقے کا بڑا انجینئر جو ایک درشت کلام انگریز میجر تھا اس سب اوورسیئر کے اثر میں تھا۔ اس میجر اور عطا محمد کے درمیان ایک دن بدکلامی ہوئی ـ برہم میجر کو اس اوورسیئر نے پٹی پڑھاتے ہوئے اسٹور سے سامان خرد برد کرنے کا مقدمہ کھڑا کر دیا، دو ماہ قبل تک جو خود اس اسٹور کا انچارج تھا ـ اندیشہ تھا کہ سب اوورسیئر اور میجر گواہوں اور عدالت کو متاثر کرنے کی کوشش کریں گے لہٰذا عطا محمد کی طرف سے کوشش کی گئی کہ یا تو مقدمہ کسی دوسرے ضلع کی عدالت میں منتقل ہو جائے یا ان کے مخالف اوورسیئر اور میجر کا تبادلہ کر دیا جائے ـ بلوچستان ایجنسی والے ان دونوں باتوں کے لیے آمادہ نہ ہوئے ـ مجبوراً اقبال نے لارڈ کرزن کو ایک ذاتی خط لکھا ساتھ ہی ۲۴ شعر کی ایک طویل نظم "برگِ گل" [ایک درد مند دل کی عرض] تخلیق کی ـ یہ نظم خواجہ حسن نظامی کی وساطت سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر پڑھی گئی۔ سب سے پہلے یہ نظم ہفتہ وار "وطن" [لاہور] بابت ۲۹ جولائی ۱۹۰۳ء میں مناجات کے عنوان سے شائع ہوئی ـ "بانگِ درا" میں یہ نظم شامل نہیں کی گئی ـ پوری تحقیقات کے بعد عطا محمد باعزت بری کر دیے گئے تھے ـ

از شہر سیالکوٹ
۶ر اگست ۱۹۰۳ء

مخدوم مکرم جناب قبلہ خان صاحب ، السلام علیکم
آپ کا نوازش نامہ کل شام ملا ۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں
خدا کے فضل سے اس تشویش کا خاتمہ ہوا ۔ بڑے بھائی جان پر جو بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل افسر ملٹری ورکس تھے ، ان کے مخالفین نے ایک خوف ناک فوج داری مقدمہ بنا دیا تھا ۔ لیکن الحمد للہ کہ دشمنوں کے منہ میں خاک پڑی ۔ بھائی صاحب بری ہوئے ۔ اگرچہ روپیہ کثیر صرف ہوا تاہم شکر ہے ۔ ہماری مصیبت کا خاتمہ ہوا ۔ ہم باقی رہ گئے اور ہماری مصیبت دشمنوں کی تلاش میں پھر بلوچستان کی طرف عود کر گئی ۔ بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ ناانصافی کرنے پر آمادہ تھے مگر خدا لارڈ کرزن کا بھلا کرے کہ میرے کہنے پر معاملہ دگرگوں ہو گیا ۔ والسلام

آپ کا مخلص
محمد اقبال

[اقبالنامہ (حصہ اول) مرتبہ: شیخ عطاء اللہ مطبوعہ ۱۹۴۵ء ، ص: ۶]

از شہر سیالکوٹ ۔ ۱۹۰۳ء

مخدوم مکرم جناب قبلہ خان صاحب السلام علیکم

اقبال کی بڑی بیٹی معراج بیگم کا خط اپنی خالہ فاطمہ بیگم کے نام

از مالیر کوٹلہ
مورخہ ۱۳ جنوری [۱۹۱۲ء]

مکرمہ معظمہ جنابہ (کذا) خالہ صاحبہ من سلامت
بعد السلام علیکم کے واضح ہو یہاں پر بفضلِ خدا سب طرح خیریت ہے اور آپ کی خیر و عافیت جناب الٰہی
سے نیک چاہتی ہوں۔

صورتِ حال یہ ہے کہ آپ کا خط آیا ہوا تھا مگر بوجہ سستی کے جواب نہ دے سکی امید ہے کہ آپ معاف فرماویں گے (کذا) میری
سے آپ بے فکر رہیں۔ اب میں نے دوائی استعمال کرنی شروع کی ہے۔ امید ہے کہ فائدہ ہوگا۔ بخار تو خفیف سا ہر روز ہوتا ہے اور کھانسی بالکل
اور نانا صاحب نے دو دفعہ سوئی بازو پر لگائی ہے۔ اور اس طرح آٹھ دس دفعہ سوئی اور لگائیں گے تو پھر گلے کو بھی فائدہ ہو جائے گا۔
سب گلٹیاں اچھی ہو جائیں گی اور پھیپھڑوں کو بھی فائدہ ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ دوائی ایسی ہے جو سارے جسم میں بلکہ رگ رگ میں اپنا
کرتی ہے۔ آپ دعا کریں کہ یہ دوائی فائدہ مند ہو۔

اور واضح ہو کہ خالو جان کا خط آپ کے نام کا یہاں آیا ہوا ہے۔ شاید وہ یہ سمجھے ہوں گے کہ مالیر کوٹلہ گئی ہے۔ آج آپ کو بھیج دیا جا
اگلے اتوار اپنی تصویروں کا پیکٹ انھوں [نے] ماموں صاحب کے نام پر یہاں بھیجا تھا۔ وہ ماموں صاحب کو روانہ کر دیا ہے۔ اور
میں ایک تصویر آپ کی بھی امید ہے کہ مل گئی ہوگی۔

باقی واضح ہو جناب نانا صاحب اخیر فروری یا شروع مارچ کو لاہور جائیں گے۔ کیونکہ ان دنوں میں ماموں صاحب نے ولایت
اور گجرات سے پنشن لینے کے واسطے جائیں گے اور پھر آتی دفعہ خالہ حمیدہ کو اور خالہ نواب کو اور آپ کو اپنے ہمراہ لے آویں گے۔ خالہ نواب
راجن پور سے چند روز پہلے گجرات آجاوے گی۔

اس لیے میں آپ کو تکلیف دیتی ہوں یہ میرا پہلا کام ہے وہ یہ ہے کہ نانا صاحب جاویں گے تو دوسرے ہی دن واپس یہاں آجاویں۔
اس لیے آپ کو نہایت ادب عرض کرتی ہوں کہ ایک پیجامہ (کذا) کی کنا دیز جس کا نمونہ میں بھیجتی ہوں خرید کر رکھیں۔ اگر بڑے عرض کی ہو
گز، اگر چھوٹے کی ہو تو جتنی سلوار (کذا) کو لگتی ہے خرید کر رکھ چھوڑیں۔ اور پھر مجھے اطلاع دیں کہ کتنی قیمت ہے تو نانا صاحب کے ہاتھ
دوں گی۔ دس گیارہ روپیہ کی قیمت تک ہو جس وقت موقع ملے (ملے) ضرور پہلے ہی خرید رکھیں۔ اور تین گز ریشمی لیس رنگ فیروزی جو
کہ آپ نے خالہ حمیدہ کی لیس مجھے دی تھی۔ اسی قسم کی ہو مگر رنگ فیروزی ہو۔ جس وقت کوئی شہر جاوے جب کبھی ایسا موقع ہو ضرور
اور ایک دوپٹہ ہوائی ڈورے والا گاڑھی (کذا) رنگ موتیا یا سفید شہزادہ کے واسطے خرید رکھیں اور اس قسم کی لیس جیسی کہ آپ کی
ہوائی کو لگی ہوئی تھی ایک بنڈل شہزادے کے واسطے خرید رکھیں۔ اُن سب کی قیمت دی جاوے گی نانا صاحب کے ہاتھ ضرور بضرور بضرور
(کذا) بھیج دی جاوے گی۔ پھر آپ یہ سب خرید لیں گی تو پھر ہمیں اطلاع دیں اور سب کی الگ الگ قیمت لکھیں نہایت مہربانی ہوگی۔
میں نے یہ سب چیزیں ڈر ڈر کر لکھی ہیں کہ میری میم خالہ مجھے غصے ہی نہ ہونے لگ جاوے۔
امید ہے کہ آپ اپنی غم زدہ بھانجی کو خوش کریں گی۔

از سیالکوٹ
مورخہ ۱۴ فروری

مکرمہ معظمہ جنابہ خالہ صاحبہ سلامت

بعد السلام علیکم کے واضح ہو۔ یہاں پر بفضل خدا سب طرح
خیریت ہے۔ اور آپکی خیر و عافیت جناب الٰہی سے نیک
چاہتی ہوں۔ صورت حال یہ ہے کہ آپ کا خط آیا
ہوا تھا۔ مگر بوجہ سستی کے جواب نہ دے سکی۔ امید ہے
کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ میری طرف سے آپ بے فکر
رہیں۔ اب میں نے دوائی استعمال کرنی شروع کی
ہے۔ امید ہے کہ فائدہ ہوگا۔ بخار تو خفیف سا
ہر روز ہوتا ہے۔ اور کھانسی بالکل کم ہے۔ اور
نانا صاحب نے دو دفعہ سوئی بازو پر لگائی ہے۔
اور اسی طرح آٹھ دس دفعہ سوئی اور لگائینگے۔
تو پھر گلے کو بھی فائدہ ہو جائیگا۔ اور سب
گلٹیاں اچھی ہو جائینگی۔ اور پھیپھڑوں کو بھی
فائدہ ہو جائیگا۔ کیونکہ یہ دوائی ایسی ہے۔ جو سارے
جسم میں بلکہ رگ رگ میں اپنا اثر کرتی ہے۔ آپ
دعا کریں کہ یہ دوائی فائدہ مند ہو۔ اور واضح
ہو۔ خالو جان کا خط آپکے نام کا یہاں آیا ہوا ہے
شاید وہ بھیجے ہونگے کہ [illegible] لگ گئی ہے۔
آج آپکو بھیجدیا جائیگا۔ ساتھ ہی اپنی تصویروں کا
پیکٹ انہوں نے ماموں صاحب کے نام پر یہاں بھیجا
تھا۔ وہ ماموں صاحب کو روانہ کر دیا ہے۔ اور اسی
میں ایک تصویر آپکی تھی۔ امید ہے کہ مل گئی ہوگی
تو واضح ہو۔ جناب نانا صاحب آخر فروری یا
شروع مارچ کو ضرور لاہور جائینگے۔ کیونکہ ان
دنوں میں ماموں صاحب نے ولایت جانا ہوگا۔ اور
گجرات سے [illegible] کے واسطے جائینگے۔ اور [illegible]
دفعہ خالہ حمیدہ کو اور خالہ نواب کو۔ اور آپکو

اپنے ہمراہ لیتے آویں گے۔ خالہ نواب بھی رامپور سے
چند روز پہلے گجرات آجائیگی۔ اس لیئے میں آپکو
تکلیف دیتی ہوں۔ یہ میرا پہلا کام ہے۔ وہ یہ
ہے کہ نانا صاحب جاویں گے۔ تو دوسرے ہی دن واپس
یہاں آجاوینگے اس لیئے آپکو نہایت ادب سے
عرض کرتی ہوں کہ ایک [illegible]
جس کا نمونہ میں بھیجتی ہوں خرید کر رکھیں اگر
بڑے عرض کی ہو۔ تو پانچ گز۔ اگر چھوٹے عرض کی
ہو۔ تو جتنی سلوار کو لگتی ہے۔ خرید کر
بھیجدیں۔ اور پھر مجھے اطلاع دیں کہ کس قیمت
ہے تو نانا صاحب کے ہاتھ بھیجدونگی۔ [illegible]
لگیا [illegible] روپیہ کی قیمت تک ہو۔ جس وقت موقعہ
ملے ضرور پہلے ہی خرید رکھیں۔ اور تین گز
ریشمی لیس رنگ فیروزی جیسی کہ آپ نے
خالہ حمیدہ کی لیس مجھے دی تھی۔ اسی قسم کی ہو
مگر رنگ فیروزی ہو جس وقت کوئی شہر جاوے
جب کبھی ایسا موقعہ ہو۔ ضرور منگا رکھیں۔ اور
ایک دو پیسے ہوائی ڈوری سنہری والا رنگ موتیا۔ یا سفید
شہزادہ کے واسطے خرید رکھیں۔ اور اسی قسم کی لیس
جیسی کہ آپکے سفید ہوائی کو لگی ہوئی تھی ایک
سینڈل شہزادہ کے واسطے خرید رکھیں ان سب
چیزوں کی قیمت دیجائیگی نانا صاحب کے ہاتھ ضرور
ضرور بھیجدی جائیگی۔ پھر آپ یہ سب
خرید لینگے۔ تو پھر ہمیں اطلاع دیں۔ اور سب کی
الگ الگ قیمت لکھیں۔ نہایت مہربانی ہوگی
میں نے یہ چیزیں [illegible] کر لکھی ہیں۔ کہ میری
[illegible] خالہ جی غصے ہی نہ ہونے لگ جاویں۔ [illegible]
ہے کہ آپ اپنی عزیزہ بھانجی کو خوش کرینگی

اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی کا خط اپنے بہنوئی خواجہ فیروزالدین کے نام

۸۶ء

از میانوالی

برادر عزیز فیروزالدین خدا تمہاری عمر میں برکت دے

کل ہمارا (کذا) خط ملا تماری (کذا) خیریت پڑھ کر ازحد خوشی ہوئی جناب چچا صاحب کی خیریت پڑھ کر ازحد خوشی ہوئی۔ خدا آئندہ بھی اپنا رحم کرے۔ عزیز معراج کو اب کچھ آرام ہے۔ امید ہے کچھ دن تک زخم بالکل اچھا ہو جائے گا۔

آج گھر سے شہزادہ بیگم کا خط آیا ہے وہ لکھتے (کذا) ہیں کہ تم عید سے پہلے گھر آجاؤ۔ والدصاحب کا بھی یہی ارادہ ہے مگر ہمارا ارادہ والدصاحب کے ساتھ ہی جانے کا ہے کہ ہمارے جانے کے بعد والدصاحب کو کھانے وغیرہ کی تکلیف ہو گی۔ آگے جیسے والدصاحب کی مرضی۔

ہمارا سب کا دل تمہارے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ اس لیے مہربانی کر کے تم اپنی تصویر عزیز خورشید انور کو گود میں لے کر کھنچوا کر بھیجو۔ نہایت مہربانی ہو گی۔ تصویروں کی دو کاپیاں بھیجیں کیوں کہ ایک کاپی میں اپنے پاس رکھوں گی دوسری حمیدہ کے لیے۔ مہربانی کر کے تصویر ضرور بھیجیں۔ تاکید ہے۔ کیونکہ انور کی پیاری صورت دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔

تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ آفتاب کے ابا باہر بالکل نہیں نکلتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی چلہ مانا ہوا ہو گا۔ اب وہ اپنی مراد کو لے کر باہر نکلیں گے۔ خدا کرے کامیابی ہو۔

باقی خیریت ہے میری طرف سے اور معراج کی طرف سے اور حمیدہ کی طرف سے تم کو اور عزیزہ فاطمہ کو سلام پیار۔ والدصاحب کی طرف سے تم کو اور سب بچوں کو پیار اور سب بزرگوں کو آداب۔ خورشید انور کو گود میں لے کر خوب پیار کرنا۔

راقمہ تمہاری بہن

کریم بی بی

اقبال کی بڑی بیٹی معراج بیگم کا خط اپنے خالو خواجہ فیروزالدین کے نام

مکرم معظم جناب خالو جان تسلیم

میں اب بفضل خدا اچھی ہوں۔ مہربانی کر کے آپ جب خط لکھا کریں تو ابا جان کی کوئی بات خواہ اچھی ہو خواہ بری ہو بالکل نہ لکھا کریں۔ کیونکہ والدہ صاحبہ کی زبان پھر قابو میں نہیں رہتی جو کچھ آتا ہے گیت بنائے رکھتی ہے اور ان کو ہر وقت بد زبانی سے یاد کرتی ہے۔ فقط زیادہ آداب فقط

راقمہ

آپ کی خیر طلب

معراج

اقبال کا خط کشن پرشاد شاد کے نام

اپنے بڑے بیٹے آفتاب سے متعلّق

لاہور

۷ مارچ سنہ ۱۶ء

سرکار والا تبار تسلیم مع التعظیم

...... لڑکا [آفتاب] دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین و طبّاع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آج کل اسی فکر میں ہوں کہ اسے کہیں مرید کرا دوں یا اس کی شادی کر دوں کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
نازہا سازد بہم خیزد نیاز

اس کی تصویر بھی انشاءاللہ حاضر ہوگی۔ والسلام

مخلص قدیم

محمد اقبال

[شاد اقبال مرتبہ محی الدین قادری زور، مطبوعہ ۱۹۴۲ء]

اپنی بیوی اور بیٹے کے سلسلے میں علامہ اقبال کے خطوط

جو انھوں نے اپنے والد بھائی اور بھتیجے کو لکھے

بنام شیخ نور محمد

(۱)

لاہور

۹ جون ۱۹۱۸ء

قبلہ و کعبۂ من، السلام علیکم

آپ کا خط جو اعجاز کی چچی کے نام آیا ہے، میں نے دیکھا ہے اور اُس نے اُس خط کا مضمون بھی مجھے سنایا ہے جو اس نے آپ کی خدمت میں تحریر کیا تھا۔ یہ اُس کے دل کی وسعت اور فراخ حوصلگی کی دلیل ہے۔ مگر بات انصاف سے بعید ہے کہ میں اس کا زیور لے کر ایک ایسے لڑکے کی تعلیم پر صرف کروں جس سے نہ اسے کچھ توقع ہو سکتی ہے نہ مجھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا زیور اس خیال سے نہیں دیتی کہ کل کو اُسے اس کا معاوضہ ملے بلکہ وہ محض اس غرض سے دیتی ہے کہ مجھ پر کوئی شخص حرف گیری نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص مجھ پر حرف گیری کرے تو اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ وہ شخص مجھ سے ناخوش ہے۔ برخلاف اس کے ناانصافی میں خدا اور رسول کی ناخوشی ہے۔ جس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر ہے اور لوگوں کی حرف گیری آسانی سے برداشت کر سکتا ہوں خدا و رسول کی ناراضگی سے میرا دل کانپتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ گذشتہ دس سال کے عرصے میں بیس پچیس ہزار میرے ہاتھوں میں آیا ہے مگر یہ سب اپنے اپنے موقع پر مناسب طور پر خرچ ہوا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ تاہم اس وقت تک میں ایک عمدہ مکان کرائے پر نہیں لے سکا۔ نہ مکان کے لیے فرنیچر اور ساز و سامان خرید

سکا ہوں

لاہور ۹ جون ۱۹۱۸ء

نہ عمدہ گاڑی گھوڑا خرید سکا ہوں۔ یہ سب لوازمات اس پیشے کے ہیں۔ اب میں نے تہیہ کیا ہے کہ جس طرح ہو سکے یہ لوازمات بہم پہنچائے جائیں۔ اب حالات اس قسم کے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کا بہم پہونچانا لازم اور ضروری ہے۔ میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا کہ یہ ایک خداداد قوت ہے، جس میں میری محنت کو دخل نہیں۔ خلق اللہ کی خدمت میں اسے صرف ہونا چاہیے۔ مگر ضروریات سے مجبور ہو کر مجھے اس عہد کے خلاف کرنا پڑا۔

باقی رہے وہ لوگ جو مجھ سے للعہ چاہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ اسے احسان نہیں جانتے بلکہ قرض تصور کرتے ہیں۔ میں نے ۳۵ روپیہ ماہوار اس کمبخت لڑکے کو دیے تھے۔ اور کالج کے اور لڑکوں سے اخراجات کے متعلق دریافت کر کے یہ رقم مقرر کی تھی۔ مگر آج تک ہر شخص کے پاس یہی رونا رویا جاتا ہے کہ خرچ ناکافی ملتا ہے ان کو للعہ دینا نہ دینا برابر ہے۔ شیخ گلاب دین کو بھی اس نے خط لکھا تھا۔ مگر انھوں نے اسے یہ جواب دیا ہے کہ حالات مجھے معلوم ہیں اس واسطے میں ڈاکٹر صاحب سے اس بارے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ گذشتہ سالوں میں بھی وہ لوگ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئے۔ اگر آپ کے پاس ان کا بیان کروں تو آپ کو سخت تکلیف ہو گی۔ لہٰذا اس تکلیف دہ داستان کو نظر انداز کرتا ہوں

مگر باوجود ان تمام باتوں کے میں اسے ملف دیتا مگر اس وقت مشکلات کا سامنا ہے۔ جنگ کی وجہ سے آمدنیاں قلیل ہو گئی ہیں۔ اور یہ شکایت کچھ مجھی کو نہیں اوروں کو بھی ہے اور وہ پچاس روپیہ ماہوار اس طرح مانگتے ہیں جیسے میں مقروض ہوں اور وہ قرض خواہ۔

میں نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کہیں ملازمت کرلے اور کچھ کمانے کے قابل ہو جائے کہ بی اے کے امتحان کی اب وہ وقعت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ میں نے تجربے سے دیکھا ہے کہ جو لڑکے انٹرنس یا ایف اے پاس کر کے ملازمت کرتے ہیں وہ بی اے ایم اے کرنے والوں سے بہتر رہتے ہیں۔ مگر اس نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا اور کالج میں داخل ہونے کے لیے دہلی چلا گیا۔ پھر بھی مجھے کچھ اعتراض نہیں۔

آپ نے جو کچھ اُسے خط میں لکھا ہے بالکل ٹھیک ہے یہی بات میرے دل میں بھی تھی۔ اور یہ اس کے خط کا بہترین جواب ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی والدہ اپنے نقرئی و طلائی سرمایے اس کی تعلیم پر خرچ کرے۔ کم از کم اس کا وہ حصّہ خرچ کردے جو اس نے میرے ماں باپ سے لیا ہے۔ اپنے ماں باپ کا خرچ نہ کرے۔ اور اگر کچھ عرصے بعد میرے ہاتھ میں روپیہ آگیا تو میں اُسے یک مشت بارہ سو روپیہ دے دوں گا۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اپنی خیریت سے اطلاع دیں۔

محمد اقبال لاہور

[خط کا متن 'مظلوم اقبال' از اعجاز احمد، ص: ۲۴۰، ۲۴۱، مطبوعہ ۱۹۸۵ء کتاب میں شامل متن سے کئی حصّے حذف کیے گئے تھے]

لاہور

۱۲/ دسمبر ۱۹۱۸ء

قبلہ و کعبۂ ام السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ کل ایک کارڈ لکھ چکا ہوں امید کہ ملاحظۂ عالی سے گزرا ہوگا۔
مجھے تو دہلی سے کبھی کوئی خط نہیں آیا اور نہ کسی پروفیسر نے مجھے اس کی بابت لکھا ہے۔ نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ کم بخت دہلی سے ایبٹ آباد گیا یا نہ گیا۔ میں سنتا تھا کہ حافظ صاحب ملازمت چھوڑ کر گجرات چلے گئے ہیں اور اب گجرات میں ہیں۔ مگر یقیناً یہ خبر بھی معلوم نہیں۔
میرے خیال میں آپ اسے خط لکھیں اور تسلی دیدیں کہ بیماری سے گھبرانا نہ چاہیے اور نہ موت سے ڈرنا چاہیے۔ اور شاید یہ اس کے لیے بہتر ہو کہ اپنے علاج کے لیے چند روز کے لیے گجرات چلا جائے۔ اچھا ہو جائے تو پھر کالج میں چلا جائے۔ باقی رہا قصور اس کا یا اس کی والدہ کا

سو میرے نزدیک کسی کا نہیں۔ امرالٰہی ہر طرح ہو جاتا ہے قطع تعلق جو میں نے ان لوگوں سے کیا ہے
اس کا مقصد سزا نہیں ہے اور نہ میں ان سے کوئی انتقام لینا چاہتا ہوں۔ جتنا میرا حصہ موجودہ صورت کے پیدا کرنے میں ہے اس کا مطلب صرف
اس قدر ہے کہ عقلمند آدمی ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنک نہیں کھاتا۔ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو بچانے اور اسے محفوظ رکھنے کیلئے
مناسب تدبیر اختیار کرے خواہ اس تدبیر کو اختیار کرنے میں کسی اور کو تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔
اس کم بخت کو دوسرا موقع اپنی اصلاح کا مل گیا تھا۔ بھائی صاحب نے اس کا قصور معاف کر دیا اور اسی پہلے برتاؤ کا اس سے آغاز بھی کر دیا
تھا مگر کم بخت نے پھر وہی شیوہ اختیار کر لیا اور میں نے سنا ہے کہ ہمشیرہ کریم بی بی کو اس نے بہت دل آزار باتیں کہیں۔ کیا عجب کہ اس کی موجودہ
مصیبت اسی کی بد دعا کا نتیجہ ہو۔ میری رائے میں کریم بی بی سے اسے معافی مانگنی چاہیے اور خدا کے حضور میں توبہ کرنی چاہیے۔

باقی خیریت ہے

محمد اقبال لاہور

[مظلوم اقبال از اعجاز احمد۔ ص: ۲۲۴، ۲۲۵۔ کتاب میں شامل متن سے خط کے کئی حصے حذف کئے گئے ہیں۔]

بنام شیخ عطا محمد

(۳)

لاہور

۶ مارچ سنہ ء

برادر مکرم السلام علیکم

میں آج صبح الٰہ آباد واپس آگیا ہوں۔ امید کہ گھر میں ہر طرح خیریت ہوگی۔ آپ کا ۲۵ فروری کا لکھا ہوا خط مل گیا ہے۔
میرا خیال تھا کہ آفتاب کو آپ نے خط لکھا ہوگا۔ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ حافظ صاحب سے اس بارے میں خط و کتابت کی جاتی۔ اگر وہ چاہیں تو ان کی لڑکی کا حق مہر ادا کرنے کو تیار ہوں۔ اپنے ذمے ماہواری رقم رکھنی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ بہرحال اگر یہی خیال ہے کہ اس کو ماہواری تنخواہ دی جائے تو میں حاضر ہوں کہ اس کو تیس روپیہ مہینہ دے دیا کروں بشرطیکہ میرے ساتھ اور کوئی تعلق ان کا نہ رہے اور نہ وہ مجھ کو کبھی خط وغیرہ لکھے جس قدر عرصے وہ اپنے والدین کے ہاں رہی ہے

اُس کی تنخواہ کی وہ کسی طرح مستحق نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اور باوجود ہمارے روکنے کے وہ سیالکوٹ میں نہ رہی لیکن میں وہ رقم بھی دے دوں گا اگر مذکورۂ بالا شرط پر قائم رہیں۔

میرے خیال میں تو آپ حافظ صاحب کو اس بارے میں خط لکھیں تاکہ کوئی قابلِ عمل فیصلہ ہو جائے۔ اور آئندہ کے لیے اس قلش سے رہائی ہو۔ باقی شرعی قطع تعلق کا طریق اور اس کا علاج انشاء اللہ ہو جائے گا۔

مختصر طور پر میرا ارادہ یہ ہے۔

(۱) اگر وہ حق مہر لینا چاہے تو پھر شرعی طور پر قطع تعلق ہو جائے۔

(۲) اگر وہ ایسا کرنا پسند نہ کرے تو میں اسے تیس روپیہ ماہوار جب تک زندہ ہوں دے دیا کروں گا۔ جتنا عرصہ وہ اپنے والدین کے ہاں رہی ہے اس کے الاؤنس کی وہ مستحق نہ ہو گی کیونکہ وہ خود چلی گئی تھی۔

میرے خیال میں یہ معاملہ کسی تیسرے آدمی کی وساطت سے طے ہونا چاہیے والد مکرم کی خدمت میں آداب

والسلام

محمد اقبال

[مظلوم اقبال ص: ۲۸۸۔ مکمل خط سے صرف چار سطری متن دیا گیا ہے خط کے بیشتر حصے حذف کر دیے گئے۔]

(۴)

لاہور

۱۰ر اپریل ۱۹۳۱ء

برادرِ مکرم السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے الحمد للہ کہ خیریت ہے

اُس مردود نے مجھے تو خط لکھنے کی جرأت نہیں کی۔ نہ معلوم والد مکرم کو کیوں خط لکھا۔ ہم کو تو اس کے ولایت جانے کی بھی اطلاع نہیں۔ حافظ صاحب کو اطلاع ہوگی یا انھوں نے اس کو خرچ اخراجات کا یقین دلایا ہوگا۔ آج کل تو ولایت اسی کو جانا چاہیئے جس کے پاس بالکل فضول روپیہ ہو مس بک کا خط مجھے آیا تھا۔ میں نے اُسے جواب دے دیا ہے جو طریق اس نے اختیار کیا ہے یہ نیا نہیں بلکہ اُس کی پرانی چال ہے اور جو بیماری اسے ہے وہ بھی اس کی بداعمالی اور بے باکی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے متعلق زیادہ کیا لکھوں ؟

جموں کے مقدمے میں تاریخ ۱۸ مارچ ملی تھی مگر میں اس تاریخ پر نہ جا سکتا تھا۔ وسط اپریل کی تاریخ طلب کی جو نہ ملی۔ اس اثنا میں ایک مقدمہ شملہ کا مل گیا ایک ہفتہ وہاں رہنا ہوگا یہ مقدمہ وسط اپریل میں ہوگا۔ اسکے بعد ریاست کی طرف سے مجھے تار ملا کہ آپ کی خواہش کے مطابق وسط اپریل ہی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ اب مشکل ہے کہ شملہ کا مقدمہ قبول کرچکا ہوں۔ آج کشمیرے ملزموں کی طرف سے خط ملا ہے کہ ریاست سے استدعا کیجئے کہ مقدمہ سری نگر میں ہو۔ آنے جانے کا خرچ موکل ادا کردیں گے۔ بہرحال دیکھئے کس طرح ہو سکتا ہے۔

معاملہ معلومہ کے متعلق سلسلہ چل رہا ہے مگر چیف منسٹر صاحب جموں سے جا رہے ہیں۔ مہاراجہ اپنی ریاست میں بھی اصلاحات جاری کرنے والے ہیں جن کا اعلان عنقریب ہوگا۔ اگر چیف منسٹر کی جگہ سردار جوگندر سنگھ چلے گئے تو خوب ہوگا۔ معاملات پر بہت غور و فکر کرنے کے بعد بھی آخر انھیں تقدیر کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ انسانی علم و عقل ذرا سی بات میں اپنی کمزوری اور عجز کا معترف ہے۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کیجئے۔ مولوی گرامی صاحب آئے ہوئے ہیں وہ ان کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں۔

دنیا پھر بے چینی کے آثار پیدار ہیں خدا تعالیٰ رحم فرمائے اعجاز کی منگنی کے متعلق آپ نے کچھ نہیں لکھا۔ اس کے کپڑوں کے لیے روپیہ بھیج دوں گا

والسلام

محمد اقبال

[مظلوم اقبال ص: ۳۰۵، ۳۰۶۔ کتاب میں شامل خط کے متن سے ابتدائی دو پیراگراف حذف کیے گئے۔]

۵

لاہور

۱۳، جون سنہ ۲۲ء

برادر مکرم السلام علیکم

کل ایک خط خدمت شریف میں روانہ کر چکا ہوں

کچھ عرصہ ہوا آفتاب کی ماں نے مجھے خط لکھا تھا کہ پانچ سال کی تنخواہ مجھ کو پیشگی دے دی جائے۔ مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا آج اس کا خط کئی دنوں کے بعد آیا ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ اگر آپ مجھے پیشگی روپیہ نہیں دے سکتے تو میرا حق مہر دے دیا جائے۔ چونکہ اس کا شرعی حق ہے اس واسطے اس کی ادائیگی میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا

مہر کا کاغذ غالباً گھر میں ہوگا۔ ایک نقل اس کی ضرور وہاں ہوگی اور ایک حافظ صاحب کے پاس۔ پیشتر اس سے کہ میں ان کو اس خط کا جواب دوں میں کاغذ مہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس واسطے آپ مہربانی کرکے، کاغذات میں تلاش کرکے وہ کاغذ بذریعہ رجسٹری بحفاظت تمام میرے نام بھیج دیجئے

والد مکرم کو بھی یہ خط سنا دیجئے۔ باقی خیریت ہے

آج امتیاز بھی آگیا ہے

والسلام

محمد اقبال

مورخہ ۱۶ جون سنہ ۲۲ء

[مظلوم اقبال، ص: ۳۲۸۔ کتاب میں خط کے متن سے صرف دو سطریں دی گئی ہیں]

برادر مکرم السلام علیکم

(۶)

بنام شیخ اعجاز احمد [برادر زادہ]

لاہور

۱۵ر جون سنہ ۲۲ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے۔ امید ہے تمہاری صحت جلد اچھی ہو جائے گی۔ اور جو تکلیف تم کو پشاور آنے جانے میں ہوئی وہ بعد کی کامیابی سے نسیاً منسیاً ہو جائے گی۔ تلخ تجربات سے گھبرانا نہ چاہیے زندگی پر ان کا بھی Restraining influence ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے ان کی تلخی کا احساس ہوتا ہے اور روح کو ایذا پہنچتی ہے تاہم بعد میں ان کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے اور انسان اس بات کے لیے شکر گزار ہوتا ہے اس کو اس قسم کے تجربات ہوئے۔ جرمنی کے مشہور پیغمبری شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر جوانوں کے روحانی اضطراب و بے چینی کا مشاہدہ کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا۔

Art Still has truth
take refuge there

مورخہ ۱۵ جون ۲۲ء

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمہارا خط مل گیا ہے — امید ہے تمہاری صحت جلد اچھی ہو جائے گی
اور جو تکلیف تم کو پشاور جانے میں ہوئی ہے وہ بعد کی کامیابی سے
نسیاً منسیاً ہو جائے گی۔ تلخ تجربات سے گھبرانا نہ چاہیے۔ زندگی پر ان کا
بھی Restraining influence ہوتا ہے اگرچہ پہلے ان کی
تلخی کا احساس ہوتا ہے اور روح کو ایذا پہنچتی ہے تاہم بعد میں ان کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے
اور انسان اس بات کے لیے شکر گزار ہوتا ہے کہ اس کو اس قسم کے تجربات ہوئے
جرمنی کے مشہور پیغمبری شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر جوانوں کے روحانی اضطراب
و بے چینی کا مشاہدہ کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا
Art Still has truth
Take refuge there.

اس وقت اسلامی دنیا کی وہی حالت ہے جو نپولین کے وقت میں جرمنی کی تھی۔ اور میرا پیغام بھی مسلمان نوجوانوں کے نام وہی ہے جو اس نے دیا تھا۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے Art کی جگہ لفظ Relegion رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آرٹ میں اطمینان ضرور ہے مگر قوت نہیں ہے۔ مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں

بھائی صاحب سے کہہ دینا (یا ان کو یہ خط دکھا دینا) کہ ان کا خط میں نے میاں فضل حسین صاحب کے نام بھیج دیا ہے۔ جولائی میں خود بھی شملے جانے کا قصد ہے۔ ان سے مل کر بھی گفتگو ہوگی۔

نقل کاغذ مہر کے لیے میں نے گجرات لکھ دیا ہے مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ حق مہر طلب کریں گے۔ بلکہ یہ میری خواہش تھی کہ وہ ایسا کریں۔ اس واسطے میں نے اس کے پہلے خط کا جواب نہ دیا تھا جس میں اس نے دو ہزار روپے بطور قرض طلب کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر یہ روپیہ نہ دیا گیا تو وہ اپنا حق مہر طلب کرے گی۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کر دیں۔ حضرت قبلہ مولوی میر حسن صاحب سے کہہ دیں کہ میں نے ان کو کارڈ دربارہ کاغذات امتحانات ایم ایل او M.L.O لکھا تھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کارڈ ان تک نہیں پہنچا۔ یہاں مولوی محمد حسین صاحب ان کے پرچوں کا انتظار کرتے رہے۔ آخر میں نے ان سے کہا کہ وہ خود سیالکوٹ تشریف لے جائیں اور نمبروں کا مقابلہ کر لیں۔ امید ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب وہاں آئے ہوں گے اور پرچوں کے متعلق عام امور طے ہو گئے ہوں گے۔

والسلام

محمد اقبال [مظلوم اقبال ص: ۳۲۹، ۳۳۰ ۔ کتاب میں شامل خط کے متن سے کچھ حصے حذف کیے گئے

اقبال کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کا خط اپنے نانا ڈاکٹر شیخ عطا محمد کے نام

(۱)

21, Cromwell Road,
South Kensington,
London - S.W.7

مکرم و معظم جناب نانا جان   السلام علیکم

امید ہے کہ میرا پچھلے ہفتے کا خط آپ کو مل گیا ہوگا۔ کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے بند ہوگیا ہے۔ میرا امتحان اکتوبر کی ۲۳ تاریخ سے شروع ہوگا۔ میرا امتحان میں شریک ہونا اب ڈگری کے آنے پر منحصر ہے۔ اگر ڈگری یونیورسٹی والوں نے اس وقت تک بھیج دی تو مجھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل گی ورنہ نہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ ابھی تک ڈگری کیوں نہ بھیجی گئی؟ بنک میں روپیہ تو پہنچ گیا ہے مگر ابھی تک مس بک کی طرف کیوں روپیہ نہیں آیا؟ اگست کی ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے مندرجہ ذیل رقومات ادا کرنی ہوں گی۔

Pound 10-10-0
Pound 6-6-0
Pound 15-0-0

بہتر ہوگا اگر آپ مس بک والے ۴۵ پونڈ اس کو روانہ کردیں تاکہ اس میں سے فیسوں کی ادئیگی ہوجائے۔
ممکن ہے کہ کچھ مزید کتابیں بھی خریدنی پڑجائیں۔ کیونکہ آج تک میں لائبریری کی کتابوں کا استعمال کرتا رہا ہوں (؟) ایسی کتابیں ہیں جو میرے پاس ہونی چاہیں۔ آپ مس بک کو ۴۵ پونڈ روانہ کردیں اور بنک والوں کے بعد میں بھیج دیں۔
میں اس خط کے اندر ایک agreement بھیجتا ہوں اگر یہ کافی نہ ہو تو مہربانی فرماکر ایک لکھ کر باقایدہ (کذا) کاغذ پر میرے دستخط لیے بھجوادیں۔   والسلام

آپکا فرمانبردار

آفتاب احمد

[آفتاب مرحوم کا اصل نام "آفتاب احمد" ہی تھا لیکن انھوں نے راقم کو لکھا تھا کہ "۱۹۲۲ء میں دوران قیام انگلستان اپنے نام سے 'احمد' حذف کرکے 'اقبال' کا اضافہ کرلیا تھا"۔ بعد میں وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ [عرشی زادہ]]

اُردو ترجمہ

یہ بالکل نجی گھریلو معلامات ہیں۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ جس کسی کو براہ راست ہمارے خاندان سے تعلق نہیں اُسے یہ معلوم ہونا چاہیں۔
میں شکرگزار ہوں گا اگر آپ اپنے تمام خطوط خود تحریر فرمایا کریں۔ جس خط میں آپ نے قانونی دستاویز ارسال کرنے کے لیے کہا تھا وہ آپ کے قلم کی تحریر نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص میرے حالات کو جانے البتہ آپ کو اپنے خطوط میں تادیب کا پورا حق حاصل ہے۔ دوسرے لوگوں کو اس کے برخلاف یہ تاثر دیا جانا چاہیے کہ میں ٹھیک کام کررہا ہوں چاہے آپ نے سوچا ہو کہ میرا انگلستان میں رہن سہن کا انداز قابل اعتراض تھا اگرچہ بالیقین یہ بات غلط ہے۔
زیر بحث خط بھی آپ کو خود ہی لکھنا چاہئے تھا کیونکہ اب تک جب سے میں یہاں آیا ہوں مجھے لکھے گئے آپ کے خطوط میں یہ خط سب سے زیادہ سخت ہے۔

[اصل خط صفحہ نمبر ۵۵ پر دیکھئے]

آفتاب

P.S. These are strictly private domestic affairs & I don't think anybody who does not directly belong to the family ought to know them.

I shall be obliged if you will write all your letters yourself. The letter in which you asked me to send you legal document was not in your handwriting. I don't want anybody to know my business you have every right to remonstrate with me in your letters. Other people on the contrary ought to be given an impression that I am doing well even if you thought that my mode of living in England was objectionable although I am sure it is wrong. The letter in question should have been written by yourself because it was the strongest letter you ever wrote to me before ever since I came over here.

Aftab

(۲)

مکتوب آفتاب احمد (اقبال) بنام ڈاکٹر شیخ عطا محمد

۲۲ ۱۹ء

مکرم و معظم جناب نانا جان   السلام علیکم

سب سے بڑا جرم جو میں نے والد کے خلاف کیا ہے وہ یہ ہے کہ آج تک میں نے اپنی والدہ کا ساتھ دیا ہے اگر آپ اسکو طوطا چشمی سمجھتے ہیں تو میں طوطا چشم تھا۔ اور بڑے بھاری جرم کا مرتکب ہوا۔ میرا جہاں تک خیال ہے کہ والد صاحب کے ساتھ میری کشمکش کا باعث ہمیشہ میری والدہ ہوئی ورنہ میں نے ایسا کون سا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے مجھے گھر سے نکال دیا گیا۔ سیالکوٹ میں نانا جان نے ایک دفعہ صاف یہ کہہ دیا تھا کہ آفتاب کا جرم یہ ہے کہ اس نے مجرم کا ساتھ دیا ہے۔ مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ مجھے اس پاداش پر مجرم ٹھہرائیں گے کیونکہ جو کچھ میں نے کیا وہ میں نے والدہ کی طرف داری میں کیا۔

والد کو معلوم تھا کہ اس کا سلوک ایک نہ ایک دن رنگ لائے گا۔ وہ مجھ سے بھلائی کی توقع کس طرح رکھ سکتا تھا جب اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے میری والدہ اور میرے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کیا۔

مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ آپ بھی اس معاملے میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے اور الٹا مجھے مجرم ٹھہرائیں گے۔ میں نہیں سمجھا آپ نے خط میں اس قدر غصے کا اظہار کیوں کیا ہے۔ آپ سے تو میں صرف قرض حسنہ کا خواستگار ہوا تھا۔ اور میں نے آپ کو لکھا بھی تھا کہ میں اگریمنٹ بھیجنے کو تیار ہوں۔ رنج اس لیے نہیں ہوا تھا

مکرم و معظم جناب نانا جان۔ السلام علیکم

سب سے بڑا جرم جو میں نے والد کے خلاف کیا ہے وہ یہ ہے کہ آج تک میں نے اپنی والدہ کا ساتھ دیا ہے۔
اگر آپ اس کو طوطا چشمی سمجھتے ہیں تو واقعی میں طوطا چشم تھا اور بڑے بھاری جرم کا مرتکب
ہوا۔ میرا جہاں تک خیال ہے کہ والد کے ساتھ میری کشمکش کا باعث ہمیشہ میری والدہ ہوئی
ورنہ میں نے کون ایسا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے مجھے گھر سے نکال دیا گیا۔ سیالکوٹ میں نانا جان
نے ایک دفعہ صاف یہ کہہ دیا تھا کہ آفتاب کا جرم یہ ہے کہ اس نے مجرم کا ساتھ دیا ہے۔
مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ مجھے اس پاداش پر مجرم ٹھہرائیں گے کیونکہ جو کچھ میں نے کیا وہ میں نے
والدہ کی طرفداری میں کیا۔ والد کو معلوم تھا کہ اس کا سلوک ایک نہ ایک دن رنگ لائے
گا۔ وہ مجھ سے بھلائی کی توقع کس طرح رکھ سکتا تھا جب اس کو اچھی طرح سے معلوم
تھا کہ اس نے میری والدہ اور میرے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کیا۔ مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ آپ بھی
اس معاملے میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے اور الٹا مجھے مجرم ٹھہرائیں گے۔ میں نہیں سمجھا کہ آپ نے خط
میں اس قدر غصے کا اظہار کیوں کیا ہے۔ آپ سے تو میں صرف قرض حسنہ کا خواستگار ہوا
تھا اور میں نے آپ کو لکھا بھی تھا کہ میں اگریمنٹ بھیجنے کو تیار ہوں۔ مجھے رنج اسی لیے ہوا

کہ آپ مجھے روپیہ بطور قرض دے رہے ہیں میں نے آپ سے روپیہ بطور انعام یا گفٹ تو مانگا ہی نہیں تھا۔ مجھے حیرانی صرف اس بات پر ہوئی تھی کہ قانونی اگریمنٹ کی کوئی چنداں ضرورت نہ تھی۔

کیپٹن فاروقی نے مجھ سے کوئی اگریمنٹ نہیں لکھوایا بلکہ جب میں نے اُس کو اس بارے میں لکھا تو اس نے جواب دیا کہ تم پر اخلاقی فرض ہوگا کہ تم اس کو ادا کرو اگر میں قرضے کو ادا نہ کروں تو میں واقع black guard ہوں گا۔ مگر خیر یہ کوئی بات نہیں ہے میں آپ کو اگریمنٹ دینے کو تیار ہوں۔ مگر آپ لکھتے ہیں کہ میں روپیہ ادا نہ کرسکوں گا کیونکہ میں فضول خرچ ہوں۔ اب اس کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں۔ آپ خود ہی جتلائیے۔ اب جولائی کا مہینہ ختم ہونے کو آیا ہے اور میں نے کچھ فیس تو مس بک سے قرضہ لے کر ادا کی ہے اور کچھ اگست کے آخر تک کرنی اور ابھی تک مس بک کو کوئی روپیہ نہیں پہنچا۔

میری حالت جو آج کل ہے وہ خدا جانتا ہے۔ ایک منٹ بھی خوشی کا نصیب نہیں ہوتا۔ اگر آپ مجھے قرضہ دے سکتے ہیں تو خدا کے لیے روپیہ روانہ کر دیجیے اگر آپ نہیں دے سکتے تو مجھے بذریعہ تار اطلاع دیجیے تاکہ میں کوئی پیٹ پالنے کی صورت اختیار کروں ساری عمر تو والدہ کی طرف داری میں ذلتیں اٹھائیں آپ اس کی بھی قدر نہیں کرتے۔ اس طرف سے تو جواب مل ہی چکا ہے اگر آپ بھی وہی جواب دیتے

میں تو خیر جو خدا کو منظور ہوگا ہو

جائے گا۔

اگر میں بجائے والدہ کے والد کا ساتھ دیتا تو شاید مجھے اتنی مصیبتیں آج برداشت نہ کرنی پڑتیں۔ مگر یہ میری (کذا) ضمیر کے خلاف تھا اور اس لیے میں نے ایسا نہ کیا۔ اور اب آپ مجھے لکھتے ہیں :

"تمہارے والد کو معلوم تھا کہ تم بڑے طوطا چشم ہو اس لیے تم سے بھلائی کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی"

اچھا خیر ایسا ہی سہی۔ کیا آپ اس بنا پر مجھے قرضہ دینے سے ہچکچاتے ہیں۔ آپ کی سمجھ میں جس طرح آئے اسی طرح آپ کیجیے۔

میں پہلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ ہنس راج صرف چالاکی کر رہا ہے مجھے اس کو کچھ نہیں دینا۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی خط نہیں آیا۔
ہنس ایک خطرناک مذاق کر رہا ہے جس کا نتیجہ اسکے اپنے حق میں ہی اچھا نہ ہوگا۔

خاکسار

آفتاب احمد

اقبال کا وصیتی خط اپنی دوسری بیوی سردار بیگم کے نام

[والدہ جاوید و منیرا]

لاہور ۲۶ اگست ۳۱ء

والدۂ جاوید کو بعد سلام کے واضح ہو کہ چونکہ میں گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ولایت جانے والا ہوں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اس اسطے یہ تحریر لکھتا ہوں کہ صورت حال سے تم کو آگاہی رہے اگرچہ پہلے بھی تم کو کل حالات معلوم ہیں۔

(۱) عرصہ دو تین سال کا ہوا جب میں درد گردہ کی وجہ سے بیمار ہو گیا تھا اور زندگی کی امید منقطع ہو گئی تھی لیکن خدائے تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے صحت عطا کی۔ اس بیماری کے بعد میرے خیالات میں بڑا تغیر ہوا اور چند روزہ زندگی کی حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔ صحت یابی ے بعد میں نے مبلغ دس ہزار روپیہ جاوید کے نام ہبہ کر کے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں اس کے نام جمع کرا دیا اور چند ماہ ہوئے اس ہبہ میں پانچ ہزار ا اور اضافہ کر دیا یعنی پانچ ہزار روپیہ مزید ہبہ کر کے اس کے نام اسی بنک میں جمع کرا دیا۔ اس رقم کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ میں نے منیرا بیگم کے نام ہبہ رکے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں جمع کرا دیا۔ کل پندرہ ہزار روپیہ جاوید کے نام اور پانچ ہزار روپیہ منیرا بیگم کے نام بنک مذکور میں جمع ہے۔ جب تک میں زندہ دں میں ان کا گارڈین ہوں۔ میری زندگی کے بعد تم دونوں کی گارڈین ہو گی۔ بنک رسیدات تمہارے پاس ہیں۔

(۲) مندرجہ بالا رقوم کے علاوہ میں نے دس ہزار روپیہ تمہارے نام ہبہ کر دیا تھا۔ یہ روپیہ سنٹرل کو آپریٹو بنک لاہور میں میرے اور تمہارے نام ے جمع ہے۔ لیکن میرا نام محض اس واسطے درج کیا گیا تھا کہ اگر تمہارے لیے کوئی جائداد خرید کرنے کی ضرورت پڑے تو بنک سے اس کے نکالنے میں سانی ہو۔ حقیقت میں یہ روپیہ تمہارا ہے اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس دس ہزار کی رقم کے علاوہ مبلغ پندرہ سو روپیہ بھی اسی بنک میں میرے اور تمہارے نام سے جمع ہے روپیہ تمہارے بعض زیورات کی فروخت سے حاصل ہوا تھا یہ بھی تمہاری ملکیت ہے اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا نام اس رقم کے سلسلے میں محض مذکورہ بالا سہولت کی غرض سے درج کیا گیا تھا

(۳) مبلغ آٹھ ہزار روپیہ خالصتہ میرے نام سنٹرل بنک (کوآپریٹو) لاہور میں جمع ہے اس روپے میں سے کچھ روپیہ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا

(۴) مبلغ دو ہزار روپے کے قریب منشی طاہر دین کے پاس ہے کچھ اور روپیہ آنے والا ہے جس کو وہی وصول کریں گے اس روپے میں سے نکم ٹیکس ادا کرنا ہے اور بعض اور اخراجات جو میرے عدم موجودگی میں لاحق ہوں مثلاً کرایہ کوٹھی اور ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ۔ اس کے علاوہ گھر کے اخراجات۔ گھر کے اخراجات کے لیے کچھ روپیہ تمہارے پاس موجود ہے۔

(۵) جاوید نامہ میں نے چھپنے دے دیا ہے اور اس کے متعلق ضروری ہدایات منشی طاہر دین اور چودھری محمد حسین صاحب کو دے دی ہیں۔ بونکہ یہ کتاب جاوید کے نام پر لکھی گئی ہے اس واسطے وہی اس کا مالک ہے۔ اس کی تمام آمدنی اخراجات اشاعت و طباعت نکال کر اسی کی ملکیت ہے۔

(۶) میں نے تم سے زبانی کہا تھا کہ تمہارا حق مہر میں نے پندرہ ہزار روپیہ باندھ دیا ہے۔ وقت نکاح کوئی رقم مقرر نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب میں اپنی رضی سے تمہارا حق مہر مبلغ پندرہ ہزار روپیہ مقرر کرتا ہوں اور اس تحریر میں یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ تمہارا اطمینان ہو جائے۔ شرعاً یہ روپیہ مجھ پر قرض ہے اور تم اس رقم کو میری ہر قسم کی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ سے وصول کر سکتی ہو۔ شرع شریف کی رو سے تم کو مری ہر قسم کی جائداد پر قابض و متصرف رہنے کا حق ہے جب تک مذکورہ بالا رقم تم کو وصول نہ ہو جائے۔

(۷) باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ مری عدم موجودگی میں تم بچوں کی تربیت سے غافل نہ ہو گی۔ اور بحیثیت ان کی ماں ہونے کے جو فرائض تم پر عاید ہوتے ہیں ان کو ادا کرو گی۔

محمد اقبال بیرسٹر لاہور
۲۶ اگست ۳۱ء

علامہ اقبال کا وصیت نامہ

من کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا، لاہور کا ہوں۔ اس وقت بقائمی ہوش وحواس خمسہ خود اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ چونکہ میری ہر دو اولاد نابالغان ہیں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور من مقر کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی اس لیے میں وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کے بعد اگر میری اولاد مذکورہ نابالغ رہیں تو ان کی جائداد وذات کے ولی مندرجہ ذیل ہوں گے:

۱۔ خواجہ عبد الغنی ماموں حقیقی نابالغان

۲۔ شیخ اعجاز احمد، سب جج، برادر زادۂ من مقر

۳۔ چودھری محمد حسین ایم اے، سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ لاہور

۴۔ منشی طاہر دین، جو کئی سال سے میرے کلارک رہے ہیں اور ان کی شرافت اور دیانت پر مجھے پورا اعتماد ہے

اس وصیت کی رو سے میں ان جملہ حضرات کو نابالغان کی ذات وجائداد کا ولی مقرر کرتا ہوں۔ تمام امور متعلقہ ذات وجائداد نابالغان کا انتظام اولیا مذکور کثرت رائے سے کیا کریں گے۔ لیکن جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے گا تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرا کی ذات وجائداد کا ولی ہوگا۔ اور اس کی جائداد وذات کے متعلقہ انتظام خود بطور ولی کرے گا۔

اگر ان اولیا مقرر کردہ میں سے کوئی دستبردار ہو جائے یا فوت ہو جائے یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے ناقابل ہو جائے تو اس صورت میں باقی اولیا کو اختیار ہوگا کہ کثرت رائے سے اس کا جانشین مقرر کر لیں۔

اگر کسی معاملے میں اولیائے مذکورہ کی رائے مساوی ہو تو صدر انجمن حمایت اسلام لاہور کی رائے جس فریق کے ساتھ ہو اسی پر عمل کیا جائے اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

اس وقت جو ملکیت کی چیزیں ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

کتب فلسفہ ولٹریچر وغیرہ

ان میں سے چند کتب یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے معہ مسودات، مثنوی مولانا روم فارسی وانگریزی مرتبہ ڈاکٹر نکلسن، دیوان مرزا عبد القادر بیدل قلمی، مثنوی مرآت معنوی مولانا روم مطبوعہ حیدر آباد، اپنے پڑھنے کا قرآن شریف۔ باقی اور کاغذات ومسودات میں نے جاوید کو بطور یادگار دے دیے ہیں۔ باقی کتب مطبوعہ انگریزی وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں رکھ دی جائیں۔

باقی میرا اسباب

مثلاً دو قالین بڑے سرخ و دری وصوفہ وکرسیاں وبکس اور پہننے کے کپڑے ہیں۔ ان کی نسبت میری وصیت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد میرے پہننے کے تمام کپڑے غربا میں تقسیم کر دیے جائیں۔

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا، لاہور بقلم خود

۱۳/اکتوبر ۱۹۳۵ء

مکرر آنکہ:

اگر نابالغان کے فائدے کی خاطر یا جائداد کے انتظام یا کسی اور جائداد کی خرید وغیرہ کے لیے اولیا کو روپے کی ضرورت ہو تو وہ کثرت رائے سے بینک سے روپیہ نکالنے کے متعلق فیصلہ کریں

دیگر

میرے مذہبی اور دینی عقاید سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہ کا مقلد ہوں۔

بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں میرے ورثا کا اور اولیا مقرر کردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا پورا لحاظ کریں اور رشتے ناطے میں شرافت اور دین داری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں۔

محمد اقبال بیرسٹر
۱۳ ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

جاوید اور منیرہ کی ولایت کے متعلق علامہ کا وصیت نامہ

منکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاء، لاہور کا ہوں، اس وقت بقائمی ہوش و حواس خمسہ خود اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ قبل ازیں من مقر بذریعہ دستاویزات رجسٹری شدہ اپنی کل جائیداد منقولہ وغیرہ (از قسم حق تصنیف کتب تصنیف کردہ خود و حقوق رائلٹی وغیرہ) و جائیداد غیر منقولہ بحق پسر خود مسمی جاوید اقبال نابالغ ہبہ کرکے قبضہ دے چکا ہوں۔ اس جائیداد مذکورہ کے علاوہ گھر کا ساز و سامان از قسم ظروف سیمیں وغیرہ و قالین و دیگر سامان بھی فرزند مذکور کو دے چکا ہوں جو اس وقت سے اس کے تصرف و استعمال میں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس قریباً دو تین سال ہوئے اپنی حقیقی دختر مسمات منیرہ بیگم نابالغہ کو پانچ ہزار روپیہ ہبہ کرچکا ہوں جو اسی کے نام سے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں جمع ہے۔ اس روپے کے علاوہ زیور وغیرہ بھی جو اس کی والدہ مرحومہ نے اپنی زندگی میں ہی اس کے نام ہبہ کر دیا تھا۔ بنک مذکور میں ایک آہنی بکس میں بند کرکے جمع کرا دیا گیا ہے۔ میرا اس کل جائیداد مندکرہ الصدر اور نقد وغیرہ سے اب کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ چونکہ ہر دو اولاد مذکورہ بالا نابالغان ہیں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور من مقر کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی اس لئے میں وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کے بعد اگر میری اولاد مذکورہ نابالغ رہیں تو ان کی جائیداد و ذات کے ولی مندرجہ ذیل ہوں گے۔

(۱) خواجہ عبدالغنی ماموں حقیقی نابالغان (۲) شیخ اعجاز احمد صاحب سب جج برادر زادۂ من مقر (۳) چودھری محمد حسین ایم۔ اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ لاہور (۴) منشی طاہر الدین جو کئی سال سے میرے کلارک رہے ہیں اور ان کی شرافت و دیانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ اس وصیت کی رو سے میں ان جملہ حضرات کو نابالغان کی ذات و جائیداد کا ولی مقرر کرتا ہوں۔ تمام امور متعلقہ ذات و جائیداد نابالغان کا انتظام اولیاء مذکور کثرت رائے سے کیا کریں گے لیکن جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرہ کی ذات و جائیداد کا ولی ہوگا اور اس کی ذات و جائیداد کے متعلقہ انتظام خود بجا ولی کرے گا۔ اگر ان اولیا مقرر کردہ میں سے کوئی دست بردار ہو جائے یا فوت ہو جائے یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے ناقابل ہو جائے تو اس صورت میں باقی اولیاء کو اختیار ہوگا کہ کثرت رائے سے اس کا جانشین مقرر کرلیں۔ اگر کسی معاملہ میں اولیاء مذکورہ کی رائے مساوی ہو تو صدر انجمن حمایت اسلام لاہور کی رائے جس فریق کے ساتھ ہو اس پر عمل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

(۲) اس وقت ملکیت کی جو چیزیں ہیں مندرجہ ذیل ہیں (i) کتب فلسفہ و لٹریچر وغیرہ ان میں سے چند کتب یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے مع مسودات۔ مثنوی مولانا روم فارسی و انگریزی مرتبہ ڈاکٹر نکلسن۔ دیوان مرزا عبدالقادر بیدل قلمی۔ مثنوی مرزا مثنوی (مولانا روم مطبوعہ حیدرآباد) اپنے پڑھنے کا قرآن شریف۔ باقی اور مسودات اور کاغذات میں نے جاوید کو بطور یادگار دے دیے ہیں۔ باقی کتب مطبوعہ انگریزی وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج کی لائبریری میں رکھ دی جائیں (ii) میری آمدنی سے جو روپیہ بچے گا وہ وقتاً فوقتاً نابالغان مذکورہ کو ہبہ کرتا رہوں گا۔ اور ان کے نام سے بنک میں جمع ہوتا رہے گا۔ وہ سب روپیہ جو اس طرح ان کے نام سے بنک میں جمع ہوتا رہے گا۔ وہ سب روپیہ جو اس طرح ان کے نام بنک میں رکھا جائے گا انہی کی ملکیت ہوگا۔ یہ روپیہ ان کی تعلیم و تربیت و شادی وغیرہ کے لئے ہوگا۔ اس وقت جو روپیہ منیرہ کا بنک پنجاب نیشنل لاہور میں جمع ہے اس کا ذکر میں اوپر کرچکا ہوں۔ جاوید کا جو روپیہ ہے وہ کتابوں کی آمدنی کا ہے جن کے حقوق تصنیف اس کے نام ہبہ کر دیئے گئے ہیں۔ یہ روپیہ بھی قریباً پانچ ہزار پنجاب نیشنل بنک لاہور میں جمع ہے اور اس کی آمدنی کا حساب منشی طاہر الدین کے رجسٹر میں درج ہے اور آئندہ بھی درج ہوتا رہے گا (iii) باقی میرا اسباب دو قالین رنگ سرخ دھری و صوفہ و کرسیاں و بکس اور پہننے کے کپڑے ہیں۔ ان کی نسبت میری وصیت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد میرے پہننے کے تمام کپڑے غربا میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ جو کچھ میری ملکیت کی چیزیں ہیں وہ سب میرے روزمرہ کے استعمال کی ہیں اور ان کمروں میں ہیں جو میرے استعمال میں ہیں (یعنی کوٹھی واقع میو روڈ کے تین سامنے کے کمرے) اور جن کا کرایہ مبلغ پچاس روپیہ ماہوار میں جاوید کو ماہ بماہ ادا کرتا ہوں۔ لہٰذا یہ وصیت لکھ دی ہے کہ سند رہے اور وقت حاجت کام آئے۔

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا لاہور
بقلم خود ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء

کمترین آنکہ اگر نابالغان کے فائدے کی خاطر یا جائیداد کے انتظام یا کسی اور جائیداد کی خرید وغیرہ کے لئے اولیاء کو روپے کی ضرورت ہو تو وہ کثرت رائے سے بنک سے روپیہ نکالنے کے متعلق فیصلہ کریں اور کسی دو اولیاء کے دستخط سے روپیہ بنک سے نکال لیں (بقدر ضرورت) علیٰ ہذا القیاس کتب کی چھپائی و اشاعت و انتظام کے لئے بھی اگر روپے کی ضرورت ہو تو ایسا کیا جائے۔ دیگر میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہیہ معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہ کا مقلد ہوں۔ بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں میرے ورثا کا اور اولیاءِ مقرر کردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا پورا لحاظ کریں اور رشتہ ناطہ میں شرافت اور دینداری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں۔

محمد اقبال بیرسٹر ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء

"روزگار فقیر" مرتبہ: فقیر سید وحید الدین مطبوعہ ۱۹۵۰ء میں جو وصیت نامہ جاوید و منیرہ دیا گیا ہے اس میں شیخ اعجاز احمد کے پیش کردہ وصیت نامے کی خط کشیدہ سطریں درج نہیں۔ دونوں وصیت ناموں کے مطالعے سے فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اسی فرق کے سبب "مظلوم اقبال" سے "وصیت نامہ جاوید و منیرہ" یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔

علامہ اقبال بنام سر راس مسعود

لاہور
۱۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء

(۱)

کانفیڈنشل

ڈیر مسعود

کل خط لکھ چکا ہوں۔ آج اس تمام معاملے پر کامل غور و فکر کرنے کے بعد پھر لکھتا ہوں۔ آپ اس خط کو کانفیڈنشل تصور فرمائیں۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے بھوپال میں، آپ کے بیڈ روم میں گفتگو کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرا خیال معلوم کرنے کے بعد آپ نے شاید اس تجویز کو ڈراپ کر دیا ہوگا۔ اس کے بعد جس مسٹری کا آپ نے مجھ سے ذکر کیا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ بہرحال آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیوں کہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔ ان حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس رقم مزید کو قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے اور میں بے حد تذبذب کی حالت میں ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی ہز ہائی نس آغا خاں سے کیا خط و کتابت ہوئی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ میری اس تجویز کو ناشکری پر محمول نہ کیا جائے۔ بہرحال میں نے ہز ہائی نس آغا خاں کو شکریے کا خط لکھ دیا ہے۔ گو اس میں مندرجہ بالا خیالات کا اظہار مطلق نہیں کیا گیا اور اخلاقاً مجھ کو ایسا کرنے کی جرأت بھی نہ ہونی چاہیئے تھی۔ آپ جب اس معاملے پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے بہت پہلو ہیں۔ اور میں نے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر آپ کو یہ خط لکھا ہے۔

آپ مہربانی کر کے مجھ کو جلد اس امر کی اطلاع دیں کہ آیا آپ کو میرے ان خیالات سے اتفاق ہے یا نہیں۔ اگر اتفاق نہیں ہے اور اب اس تجویز کا ڈراپ کرنا قرین مصلحت نہیں ہے تو پھر میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ہز ہائی نس آغا خاں یہ پنشن جاوید کو عطا کر دیں اس وقت تک کہ اس کی تعلیم کا زمانہ ختم ہو جائے۔ یا جس وقت تک ہز ہائی نس مناسب تصور کریں۔ بعض پرائیویٹ وجوہ کی بنا پر جن کا کچھ نہ کچھ حال آپ کو معلوم بھی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی تعلیم کی طرف سے بکلی اطمینان ہو جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہز ہائی نس آغا خاں میری اس تجویز کی نسبت کیا خیال کریں گے۔

میں نے اپنی مشکلات کا حال آپ کو لکھ دیا ہے اب آپ جو تجویز چاہیں کریں اور مجھ کو اپنے خیالات سے مطلع کریں جہاں تک ممکن ہے جلد۔ آخری فیصلے تک اس بات کا پریس میں جانا مناسب نہیں ہے۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

محمد اقبال لاہور

[اقبال نامہ (حصہ دوم) مطبوعہ ۱۹۵۱ء ص: ۳۰۵]

سر راس مسعود بنام علامہ اقبال

(۲)

بھوپال

۱۴ر جون ۱۹۳۷ء

نہایت پیارے اقبال

.... اپنی وصیت[1] میں یہ ضرور لکھو کہ اگر gaurdians کو کسی معاملے میں جہاں تک منیرہ سلمہا اور جاوید سلمہٗ کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں۔ کیونکہ جب تک ان دونوں کی ماشاء اللہ بائیس برس کی عمر نہ ہو جائے میں ہر ممکن طریقے سے مدد دینے کے لیے تیار ہوں۔ بشرطیکہ میں خود زندہ رہا۔ یہ خود ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے یہ ضرور کرنا کہ میرے متعلق اس سلسلے میں جو الفاظ اپنے وصیت نامے میں درج کرو جو کہ رجسٹرار کے پاس محفوظ کر رہے ہو ان کی ایک نقل میرے پاس ضرور بھیج دینا۔ اگر خدانخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمھارے ان دونوں بچوں کے لیے ان کی تعلیم کے مسئلے میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیے۔

یہ ضرور صلاح دیتا ہوں کہ جہاں تک جائداد وغیرہ کا تعلق ہے اس کا انتظام اپنے سامنے ہی ایسا کر دو کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے ....

میں ہوں تمھارا چاہنے والا

راس مسعود

[اقبال نامہ حصہ اوّل مطبوعہ ۱۹۴۵ء ص ۳۸۸ - ۳۸۹]

---

[1] علامہ اقبال نے اپنے دونوں بچوں جاوید اور منیرہ کے لیے چار گارڈین مقرر کیے تھے۔ سر راس مسعود کے نام اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۰ر جون ۱۹۳۷ء میں اپنے ایک گارڈین کی جگہ راس مسعود کو مقرر کرنا چاہتے تھے۔ [۱۰ر جون کے خط کا قضیہ ایک طویل کہانی ہے اس کے متعلق شاعر کے اسی شمارے میں ڈاکٹر وحید عشرت کا مضمون : قصہ ایک خط کا .... ملاحظہ کیجیے] راس مسعود نے اپنی معذرت میں مندرجہ بالا خط لکھا تھا۔

ب

ریاست حیدرآباد سے علامہ اقبال اور اُن کے اہل و عیال کی مالی امداد

جنوری ۱۹۳۱ء میں جب آفتاب اقبال ابھی انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے حیدرآباد کا ایک وفد انگلستان گیا تھا جس میں حیدرآباد کے صدر اعظم سر اکبر حیدری بھی شریک تھے۔ اس موقعہ پر آفتاب اقبال نے اپنی مالی پریشانیوں کے سلسلے میں امداد چاہی تھی۔ اور اپنی لیاقت کے بارے میں وفد کو مندرجۂ ذیل معلومات فراہم کی تھیں۔

۱۔ آفتاب اقبال نے ۱۹۱۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے درجۂ اوّل میں میٹریکولیشن پاس کیا۔
۲۔ ۱۹۱۸ء سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے ایف اے درجۂ دوم میں پاس کیا۔
۳۔ ۱۹۲۰ء میں بی اے آنرز فلاسفی اور معاشیات کے ساتھ درجۂ اول میں پاس کیا۔
۴۔ ۱۹۲۴ء میں لندن یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔
۵۔ نومبر ۱۹۲۴ء سے جون ۱۹۲۶ء تک پنجاب میں آکر رہے۔
۶۔ ۱۹۲۴ء میں لنکنزان میں قانون کی تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔
۷۔ ۱۹۲۹ء میں بار ایٹ لا کیا۔
۸۔ لندن یونیورسٹی کے مدرسۂ علوم شرقیہ میں دو سال اردو کے استاد کی حیثیت سے ملازمت کی۔

لیکن عُسرت کے باعث پریکٹس شروع نہیں کر سکے۔ اور حیدرآبادی وفد سے امداد چاہی جس کے نتیجے میں وفد نے اپنی ایک نشست منعقدہ ۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء میں مندرجۂ ذیل ریزولیوشن پاس کر کے ان کی مالی امداد کی۔ [سہ ماہی اقبالیات لاہور بابت شمارہ جولائی ستمبر ۱۹۸۵ء ص : ۴۰]

RESOLUTION

10. It was resolved that an advance of $ 190/- should be made to Aftab Iqbal and that the matter should be laid before the council when the Delegation returned to Hyderabad.

اُردو ترجمہ ریزولیوشن

۱۰۔ یہ طے پایا کہ ۱۹۰ پاؤنڈ پیشگی آفتاب اقبال کو ادا کر دیے جائیں۔ اور وفد کی حیدرآباد واپسی پر اس معاملے کو کونسل کے سامنے رکھا جائے۔ [ایضاً ص : ۳۹]

صرف اتنا ہی نہیں سر اکبر حیدری نے حیدرآباد کے فخرالدین فخر یار جنگ کو اس سے پہلے ایک خط بھی آفتاب اقبال کی دستگیری کے سلسلے میں لکھا جس میں انھوں نے آفتاب اقبال کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات اور محسوسات کو بھی قلم بند کر دیا ہے :

سر اکبر حیدری بنام فخر یار جنگ

آفتاب اقبال کے بارے میں

Hyde Park Hotel,
Knights Bridge,
London SWI

1st January 1931

"I have seen Mr. Aftab Iqbal and he impressed me very favourably. He spoke exceedingly well at a gathering at which Col. Patterson the Political ADC is to the Secretary of State and several others were present. I should like you very much to kindly help him in the University with regard to examinership and translations I have written in similar terms to Fazl Mohammad Khan and I hope you two together will be able to do something to help this youngman who I think will be an asset to community later on".

AKBAR HYDARI

۱ر جنوری ۱۹۳۱ء

اردو ترجمہ

.... میں آفتاب اقبال سے ملا ہوں اور انھوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ وہ اس جلسے میں جہاں کرنل پیٹرسن سکریٹری آف اسٹیٹ کے پولیٹیکل اے ڈی سی اور کئی دوسرے حضرات تھے، بے حد عمدہ انداز سے بولے۔ میں آپ سے خاص طور پر چاہوں گا کہ از راہِ مہربانی یونیورسٹی میں ان کی ممتحن اور کارِ ترجمہ کے سلسلے میں ان کی مدد فرمائیں میں نے یہی کچھ فضل محمد خاں کو بھی تحریر کیا ہے۔ اور میں آپ سے امید کرتا ہوں کہ آپ دونوں مل کر اس نوجوان کی دستگیری کے سلسلے میں جو آگے چل کر ملت کے لیے ایک اساسہ ثابت ہوگا کچھ نہ کچھ کر سکیں گے۔ [ایضاً ص: ۴۰ - ۴۱]

اس کے علاوہ بھی سر اکبر حیدری اور علامہ اقبال نیز ان کے بیٹے آفتاب اقبال کے درمیان مالی امداد کے سلسلے میں مراسلت ہوتی رہی جو آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔ اسی ذیل میں سر محمد ظفر اللہ خاں اور پروفیسر مظفر الدین قریشی کی سفارشات و تجاویز بھی شامل کی جاتی ہیں۔

سر اکبر حیدری بنام علامہ اقبال

Hyderabad

Dated March 1931

"I venture to write to you upon a very delicate subject. Your son Aftab Iqbal appealed to me for help in London and I confess that I was very favourably impressed by him. His impecunious condition was the talk of the Muslim community there. If I was distressed on his account, I was still more distressed on account of slur of blame which people cast on one whom I have always regarded as a great man and a great muslim. I do not know the cause of your despleasure with your son, but I do implore you to consider whether it would not possible for you to give him countenance and help till he is able to maintain himself.

I ask you to believe that in making this representation I am animated only by the friendliest motives".

AKBAR HYDARI

اردو ترجمہ

حیدرآباد

۹ مارچ ۱۹۳۱ء

میں آپ کو ایک بہت نازک موضوع پر لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ آپ کے صاحب زادے آفتاب اقبال نے مجھ سے لندن میں مدد کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ میں ان سے بہت متاثر ہوا تھا ان کی مفلسانہ حالت وہاں مسلم فرقے کی صورت حال کی مظہر تھی۔ اگر میں ان کی وجہ سے افسردہ تھا تو میں کچھ زیادہ ہی افسردہ تھا بدنامی کے اس داغ کی وجہ سے جو لوگ اس شخص پر لگاتے ہیں جسے ہمیشہ میں نے ایک بڑا انسان اور عظیم مسلمان سمجھا ہے۔ مجھے آپ کی اپنے صاحب زادے سے خفگی کا سبب نہیں معلوم۔ مگر میں التماس کرتا ہوں کہ آپ اس امر پر غور فرمائیں کہ کیا یہ ممکن نہ ہوگا کہ آپ ان کو شفقت اور دستگیری سے نوازیں تاآں کہ وہ خود کفیل ہو جائیں۔

میں ملتمس ہوں کہ آپ باور فرمائیں کہ اس نمائندگی کی جرأت کرتے ہوئے میں نے بہترین دوستانہ مقاصد سے کام لیا ہے۔۔۔

اکبر حیدری

[ایضاً ص: ۱۴۱]

سر اکبر حیدری بنام علامہ اقبال

Hyderabad

May 1931

"It is not easy for me to answer your kind letter making me aware of how quite unwitingly, I have been responsible for causing you pain. Believe, had I been conversant with the unpleasant circumstances to which you refer, I should undoubtedly have ignored the appeal.

I am most grateful for your warning advice, and venture to express my sympathetic hope that further attempts so to exploit your great and honoured name will be effectively arrested.

Hoping that your health is better and that you are managing to get some real rest and peace.

AKBAR HYDARI

حیدرآباد

۹ مئی ۱۹۳۱ء

.... آپ کے مہربانی نامے کا جس کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ میں کس طرح انجانے میں آپ کے واسطے باعث تکلیف ہوا۔ جواب عرض کرنا میرے لیے سہل نہیں یاد فرمائیں کہ اگر میں ان ناخوش گوار حالات سے واقف ہوتا جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے تو بے شک و شبہ مجھے اُس اپیل کو نظر انداز کر دینا تھا۔

میں آپ کے متنبہانہ مشورے کے لیے شکر گذار ہوں اور پُر خلوص طور پر اظہارِ امید کرتا ہوں کہ آپ کے عظیم اور محترم نام کے استحصال کی مزید کوششیں ناکام بنا دی جائیں گی۔

میں توقع کرتا ہوں کہ اب آپ کی صحت بہتر ہے اور آپ اپنے حقیقی آرام اور سکون کی جانب متوجہ ہیں۔

اکبر حیدری

[ایضاً ص: ۴۷]

علامہ اقبال بنام سر اکبر حیدری

Private & Confidential

Lahore

2nd May 1931

My dear Sir Akbar,

Thanking you so much for your letter which I received a moment ago. The story is long and too painful to relate. I am sure if you had known all the facts you would have found it difficult to write to me on his behalf. Indeed I avoided meeting you at Delhi as I thought he might become the subject of our conversation which would report my peace of mind for time. I have already helped him beyond my capacity. In spite of the manner in which he has been behaving towards me and other members of our family. No father can read with patience the nasty letters which he has written to us. And which he is doing now is only part of the blackmailing scheme of which he has been availing himself for some time. However it is not possible for me now to help him. I am an old man with indifferent health with no hope from any side and with two small children to provide for. It I had been a rich man I might have done something even though he does not deserve anything.

I suppose you know nothing of my circumstances. Nature has given me certain things and withheld others I am perfectly contented and my lips have never known a word of complaint. Perhaps you are the first person to whom I have written which I have written not before. I hate parading my woes, for the world is on the whole unsympathetic and anybody has not got Sir Akbar's nature possessing a wide range of sympathy. I know you helped him partly because he favourably impressed you and partly because of my. Your generous nature could not have done otherwise. But I am sure you would have a far perfect act of kindness, both to myself and to him, if you could have given him a suitable job in the Osmania University.

Hoping you are well and with respects to Lady Hyderi of whom I was reading the other day in Mrs. Pyme's book "The Lawrence of India."

Yours sincerely,

Mohd. Iqbal

نجی اور رازدارانہ

اردو ترجمہ

لاہور

۲ مئی ۱۹۳۱ء

مائی ڈیئر سر اکبر

میں بے حد شکر گذار ہوں آپ کے گرامی نامے کا جو میں نے تھوڑی دیر پہلے موصول کیا ہے یہ کہانی طولانی اور اس کا بیان بہت اذیت ناک ہے مجھے یقین ہے کہ اگر آپ تمام حقائق سے واقف ہوتے تو مجھے اس کی طرف سے لکھتے ہوئے دشواری محسوس فرماتے۔ حقیقتہً میں نے دہلی میں آپ سے ملاقی ہونے سے گریز کیا۔ میں نے سوچا کہ وہ ہمارا موضوعِ گفتگو بن سکتا ہے جو میرے سکونِ دماغی کو وقتی طور پر درہم برہم کر دے گا۔ اس انداز کے باوجود جس سے اُس نے میرے اور ہمارے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ برتاؤ کیا ہے میں پہلے ہی اپنی سکت سے بڑھ کر اس کی مدد کر چکا ہوں۔ کوئی باپ سکون کے ساتھ ان پرشرارت خطوط کو نہیں پڑھ سکتا جو اس نے ہمیں لکھے ہیں۔ نیز جو کچھ وہ آج کل کر رہا ہے وہ بلیک میلنگ کا ایک حصہ ہے جس کے ذریعے وہ کچھ عرصے سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ بہرحال میرے لیے اب اس کی مدد کرنا ممکن نہیں۔ میں ایک معمّر آدمی ہوں جس کی صحت خراب ہے اور جسے کسی طرف سے کوئی امید نہیں اور جس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جن کے لیے اسے ضروریات فراہم کرنا ہیں۔ اگر میں دولت مند شخص ہوتا تو میں کچھ اور بھی کر سکتا چاہے وہ اس کا مستحق نہ بھی ہوتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ میرے حالات کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں رکھتے۔ فطرت نے مجھے کچھ خاص چیزیں دی ہیں جب کہ کچھ سے مجھے محروم رکھا ہے۔ میں مکمل طور پر قانع ہوں اور میرے لب کبھی حرفِ شکایت سے آشنا نہیں ہوئے۔ شاید آپ وہ پہلے شخص ہیں جن کو میں نے وہ کچھ لکھا جو اس سے قبل کبھی نہیں لکھا تھا۔ میں اپنے دکھوں کی نمائش سے نفرت کرتا ہوں اس لیے کہ دنیا مجموعی طور پر غیر ہمدردانہ ہے اور ہر کوئی سر اکبر کی سی فطرت نہیں رکھتا جو بہت وسیع ہمدردانہ جذبات کا مالک ہے میں جانتا ہوں کہ کچھ تو آپ نے اس کی مدد اس لیے کی کہ اس نے آپ کو بہت متاثر کیا اور کچھ میری خاطر سے۔ آپ کی فیاض طبیعت اس کے سوا نہیں کر سکتی تھی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ نے بہت کرم کیا ہوتا مجھ پر بھی اور اس پر بھی اگر اسے عثمانیہ یونیورسٹی میں کوئی موزوں ملازمت دلا دی ہوتی۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ لیڈی حیدری کو آداب۔ ان کے بارے میں چند روز ہوئے مسز ہائیم کی کتاب "دی لارنس آف انڈیا" میں پڑھ رہا تھا۔ [ایضاً ص: ۴۱-۴۲]

آپ کا مخلص

محمد اقبال

علامہ اقبال بنام سر اکبر حیدری

آفتاب اقبال کے بارے میں 14th Mah 1931

My Dear Sir Akbar,

"Thank you so much for your kind letter which I received a moment ago. This youngman has already spent about 70000/- on himself. Out of this sum he borrowed according to his own statement Rs.500000/- from England. I gave Rs.10000/- to his mother and she spent all this on him besides the amount which she and her father gave the boy.

Only a month or two before his arrival I was persuaded to give him Rs.1000/- and a few days after his arrival in India I received the first letter of one of his many creditors in England. With all this he is writing blackmailing letters every now and then. I wanted to send you a copy of his last letter to me. But I did not do so mainly because I thought you would cease to sympathise with him. The following persian verse applies to my present state of mind.

آں جگر گوشہ ہماں شد کہ من اوّل گفتم
کہ چو شوید لبش از شیر جگر خوارہ شود

Yours sincerely,
Mohammad Iqbal

P.S.: I wish you had halted at Bhopal while going to Simla.

۱۴ مئی ۱۹۳۱ء

مائی ڈیر سر اکبر

آپ کے مہربانی نامے کا بہت بہت شکریہ جو مجھے تھوڑی دیر قبل ملا۔ یہ نوجوان اب تک ستّر ہزار روپے اپنے اوپر خرچ کر چکا ہے۔ اس میں سے خود اپنے بقول اس نے پچاس ہزار روپے انگلستان میں قرض لیے تھے میں نے اس کی ماں کو دس ہزار روپے دیے تھے جو اس نے سب کے سب اس پر خرچ کر دیے اور یہ رقم بھی اس کے علاوہ ہے جو اس نے اور اس کے باپ نے اس لڑکے کو دیے۔

اس کی انگلستان سے واپسی کے صرف ایک یا دو ماہ قبل ہی مجھے ایک ہزار روپے دینے پر مجبور کیا گیا۔ اور اس کی ہندوستان آمد کے چند روز بعد ہی مجھے اس کے انگلستانی قرض خواہوں میں سے ایک کا پہلا خط ملا۔ اس کے باوجود وہ اکثر و بیشتر بلیک میلنگ پر مبنی خطوط بھیجتا رہتا ہے میں اس کے تازہ ترین خط کی نقل آپ کو ارسال کرنا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہیں کرتا بالخصوص اس واسطے کہ میں نے سوچا اس کے بعد آپ اس کے ساتھ ہمدردی کی ترک فرمادیں گے۔ فارسی کا مندرجۂ ذیل شعر میری موجودہ کیفیتِ ذہنی کے مطابق ہے:

آں جگر گوشہ ہماں شد کہ من اوّل گفتم
کہ چو شوید لبش از شیر جگر خوارہ شود

[ایضاً ص : ۴۳-۴۴]

آپ کا مخلص
محمد اقبال

پس نوشت

میں چاہتا تھا کہ آپ شملہ جاتے ہوئے بھوپال میں قیام کرتے چلتے۔

آفتاب اقبال بنام سر اکبر حیدری

علامہ اقبال کی مالی امداد کے سلسلے میں

26 Firozpur Road,
LAHORE.

10.1.1937.

"My father is in comparative poverty and is quite unable to help me in any way .... After all my father has done something for the advancement of muslim community in India. In fact everybody thinks here that Hyderabad State should be generous enough to keep the poet alive by making him a monthly allowance of a reasonable sum of money in his old age. His health is failing and one doubts whether he has many years to live.

Nawab Sahib, would you like a future biographer of my father to say that poet Iqbal and his children lived in poverty while Hydari was at the hight of his power and influence in Hyderabad state ....

AFTAB IQBAL

اُردو ترجمہ

۲۶۔ فیروز پور روڈ
لاہور
۱۰ر جنوری ۱۹۳۷ء

..... میرے والد نسبتاً مفلسی کی حالت میں ہیں۔ اور کسی بھی طرح میری دستگیری نہیں کر سکتے ... لیکن بہر طور انھوں نے ملت اسلامیۂ ہند کی بہبود کے لیے کچھ نہ کچھ کیا ہے۔

فی الحقیقت یہاں ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ حیدر آباد اسٹیٹ کو اس شاعر کے زندہ رکھنے کی غرض سے کافی وسیع القلبی کے ساتھ ایک مناسب ماہانہ وظیفے کی رقم مقرر کرتے ہوئے اس پیرانہ سالی میں اس کے قوت لایموت کا نظم کرنا چاہیئے۔ ان کی صحت جواب دے رہی ہے اور اس میں شک ہے کہ وہ کچھ زیادہ برسوں تک حیات رہ سکیں گے۔

نواب صاحب، کیا آپ میرے والد کے آئندہ سوانح نگار کو یہ کہنے کا موقع دیں گے کہ شاعر اقبال اور ان کے عیال ایسی حالت میں غربت سے دوچار رہے جب حیدری ریاست حیدر آباد میں اپنے اختیارات اور اثرات کی بلندی پر فائز تھے۔

آفتاب اقبال

[ایضاً ص: ۳۳-۳۴]

سر اکبر حیدری کے ذاتی نائب کا خط آفتاب اقبال کے نام

26th Jan. 1937

"With reference to your letter of the 10th instant to the Right Hon'ble Sir Akbar Hydari, I am desired to inform you that he is most anxious that Sir Mohd. Iqbal's signel services to the nation should be recognised by a suitable allowance in his present state of health and he will take the earliest possible opportunity of having the matter placed before His Exalted highness Government for consideration.

علامہ اقبال بنام سر اکبر حیدری

Private & confidential

Lahore

2nd Feb. 1937

My dear Sir Akbar,

I am enclosing herewith a letter which I received last night by post. Since this was the only enclosure in the envelope which I received I can not say who has sent it to me. It appears from its contents however, that Aftab wrote to you some letter to which the enclosed letter is a reply. I suppose you know that the writer of this letter is a perfect stranger to me and has been so for many years. It is impossible for me to describe how he has behaved in all these years. However, the sole object of the letter I am writing to you is to put you on your guard against this youngman who has been a constant source of pain to me. I cannot conceive of him writing to you or to other friends of mine without having some sort of mischief in his mind. Taking advantage of your good nature he is trying to give you the impression of some sort of a reconcilliation between me and him. Such a thing is simply impossible and his only object in writing to you is, I believe to get some money out of you. As you know he did so before and fully exploited your generous nature. I do hope you will not encourage him to write letters to you any more.

I hope you are in the enjoyment of the best of health.

Please do remember me to lady Hydari".

Yours sincerely

Mohammad Iqbal

اُردو ترجمہ

بحوالۂ مکتوب گرامی مورخہ ۱ ار ماہ حال موسومۂ عالی مرتبت سر اکبر حیدری مجھے آپ کو یہ اطلاع دینے کی ہدایت کی گئی ہے کہ صاحب موصوف سر محمد اقبال کی نمایاں خدماتِ ملیہ کا اعتراف ایک مناسب وظیفے کی صورت میں ان کی موجودہ صحت کی حالت کے پیشِ نظر کرنے کے بے حد خواہاں ہیں اور اوّلین ممکنہ صورت میں اس معاملہ کو حضور نظام کی حکومت کے سامنے غور کے لیے پیش فرمائیں گے۔ [ایضاً ص: ۳۵-۳۴]

اُردو ترجمہ

نجی اور رازدارانہ

لاہور

۲ر فروری ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر سر اکبر

میں اس کے ساتھ ایک خط ملفوف کر رہا ہوں جو بذریعہ ڈاک گذشتہ شب مجھے موصول ہوا ہے۔ چوں کہ اس لفافے میں جو مجھے ملا یہی ایک ملفوف تھا اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ اسے کس نے مجھے ارسال کیا ہے؟ لیکن اس کے مندرجات سے اتنا تو بہر حال معلوم ہو جاتا ہے کہ آفتاب نے آپ کو کوئی خط لکھا تھا جس کا یہ جواب ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس امر سے واقف ہیں کہ اس خط کا لکھنے والا [آفتاب] کئی سال سے میرے واسطے اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے میرے لیے اس رویے کا بیان کرنا جو گذشتہ برسوں میں اس نے میرے ساتھ روا رکھا ناممکن ہے۔

بہر حال موجودہ عریضے کا جو میں آپ کو تحریر کر رہا ہوں تنہا مقصد اس نوجوان کے سلسلے میں آپ کو متنبہ کر دینا ہے جو میرے لیے مستقل اذیت کا باعث رہا ہے۔ میں اس کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ بغیر کسی شرارت کو اپنے دماغ میں رکھے ہوئے آپ کو یا میرے دیگر احباب کو خط لکھ سکتا ہے۔ آپ کی شریفانہ طبیعت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ آپ کو یہ تاثر دینے کی سعی کر رہا ہے کہ میرے اور اس کے درمیان مصالحت ہو گئی ہے۔ اس قسم کی کوئی صورت خارج از امکان ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا یہ خط لکھنا آپ سے کچھ رقم اینٹھنے کی غرض سے ہے۔ جیسا کہ آپ واقف ہیں یہ حرکت اس نے پہلے بھی کی ہے اور پورے طور پر آپ کی مہربان طبیعت سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس امر میں اس کی اور ہمت افزائی نہیں فرمائیں کہ وہ آپ کو مزید خط لکھے۔

مجھے امید ہے کہ آپ بہترین صحت سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔

از راہِ کرم لیڈی حیدری سے بھی میرا تذکرہ فرما دیں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

[ایضاً ص: ۴۵]

سر محمد ظفر اللہ خاں بنام سر اکبر حیدری

آفتاب اقبال کی امداد کے سلسلے میں

The Street
Simla

9.5.1938.

I believe you have already been approached in the matter of rendering some help to Dr. Aftab Iqbal, M.A.Ph.D., Bar-at-Law eldest son of the Late Dr. Sir Muhammad Iqbal. Dr. Aftab Iqbal is a young man of great talent and promise but to my certain knowledge he is passing through a period of great distress and you will be helping in a very deserving case if you can do anything for him. I do hope it will be possible for you to render substantial help to Aftab Iqbal."

ZAFARULLAH KHAN

اُردو ترجمہ

شملہ

۹ مئی ۱۹۳۸ء

...میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم ڈاکٹر سر محمد اقبال کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر آفتاب اقبال ایم اے پی ایچ ڈی کے لیے کچھ امداد کرنے کے بارے میں پہلے ہی آپ کو متوجہ کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب اقبال بڑی صلاحیتوں کے مالک نوجوان ہیں جن سے بہت توقعات وابستہ ہیں۔ لیکن میری یقینی معلومات کی حد تک آج کل وہ بڑی ناامیدی کے اوقات سے گذر رہے ہیں۔ اگر آپ ان کی مدد کریں گے تو گویا آپ بڑے مستحق معاملے میں مدد کریں گے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کے لیے آفتاب اقبال کی کافی مدد کرنا ممکن ہو سکے گا...

ظفر اللہ خاں

[ایضاً ص: ۴۸]

ورثائے اقبال کی مالی دستگیری کی تجویزیں

ڈاکٹر مظفرالدین قریشی [صدر شعبہ کیمیا عثمانیہ یونیورسٹی] بنام سر اکبر حیدری

28th June 1938.

"Owing to some unfortunate circumstances which are too painful to be mentioned Sir Mohammad Iqbal had completely severed his relations with the widow and Mr. Aftab Iqbal long ago. He was paying the widow a maintenance allowance of Rs.30/- per mensem, Javid Iqbal and Munira Banu are the two minors in whom Sir Mohammad Iqbal was mainly interested and for whose future lives and careers he was a bit worried. Their mother the second wife of Sir Mohammed Iqbal, died some 4 years back. Considering the invaluable contribution of Sir Mohammad Iqbal to the world thought and oriental literature and in view of the great personal sacrifice he had to make in carrying out his creative work. Some provision for the dependents of Sir Mohammed Iqbal particularly for the minors, Javid Iqbal and Munira, will be highly appreciated by all.

I submit the following proposals for your kind and favourable consideration.

1. Javid Iqbal be granted an allowance of B.G. Rs.125/- per mensem till the completion of his education.
2. Munira Banu be granted an allowance of B.G. Rs.75/- per mensem till the completion of her education or till she gets married.
3. The widow, the mother of Mr. Aftab Iqbal, be granted a life pension of B.G. Rs.50/- per mensem.

DR. MUZAFFARUDDIN QURESHI

۲۸ جون ۱۹۳۸ء

کچھ بدبختانہ حالات کے باعث جن کا بیان بہت تکلیف دہ ہے سر محمد اقبال نے اپنی بیوہ اور بیٹے جناب آفتاب اقبال سے عرصہ ہوا مکمل قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ بیوہ کو ۳۰ روپے ماہانہ بطورِ نفقہ ادا کیا کرتے تھے۔

جاوید اقبال اور منیرا بانو دونوں نابالغ ہیں جن میں سر محمد اقبال خاص طور سے دلچسپی رکھتے تھے اور جن کی آئندہ زندگی اور کیریر کی طرف سے کچھ متفکر تھے۔ ان بچوں کی ماں یعنی سر محمد اقبال کی دوسری بیوی تقریباً ۴ سال قبل وفات پا چکی ہیں۔

عالمی فکر اور مشرقی ادبیات کے سلسلے میں سر محمد اقبال کی بیش قیمت خدمات کے پیشِ نظر نیز اس ذاتی ایثار کے باعث جو انھوں نے اپنے تخلیقی کام کی انجام دہی میں کیا، سر محمد اقبال کے پس ماندگان کے لیے خاص طور پر بچوں یعنی جاوید اقبال اور منیرا کے لیے کچھ امداد، ہر شخص کی نظر میں بے حد پسندیدہ ہوگی۔

میں مندرجہ ذیل تجاویز آپ کی ہمدردانہ اور موافقانہ توجہ کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ جاوید اقبال کو تا ختم تعلیم ماہانہ ۱۲۵ روپے کلدار کا وظیفہ عنایت کیا جائے۔

۲۔ منیرا بانو کو تا ختم تعلیم یا تا کتخدائی ۷۵ روپے عطا ہو۔

۳۔ آفتاب اقبال کی والدہ کو تا حیات ۵۰ روپے کلدار ماہانہ مرحمت فرمایا جائے۔

مظفرالدین قریشی

[ایضاً ص: ۳۷]

ورثائے اقبال کے بارے میں
مظفرالدین قریشی کی مزید وضاحت

28th June 1938.

1. Javid Iqbal aged about 14 years studying in 9th Class.

2. Munira Begum aged about 9 years studying in School.

Note: The first wife of the late Sir Mohdammad Iqbal aged 56 years is still alive. She has been living with her father since a long time. The son of the late Sir Mohd. Iqbal from this wife, Mr. Aftab Iqbal M.A. (London), Bar at Law aged about 36 is practising as a lawyer in Lahore. The mother of Javid Iqbal and Munira Begum died about 4 years ago.

اُردو ترجمہ

مورخہ ۲۸ر جون ۱۹۳۸ء

۱۔ جاوید اقبال عمر تخمیناً ۱۴ سال نویں کلاس میں پڑھ رہا ہے۔
۲۔ منیرا بیگم عمر تخمیناً ۹ سال اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ پتا : جاوید منزل میورروڈ لاہور

نوٹ : مرحوم محمد اقبال کی پہلی بیوی جن کی عمر ۵۶ سال ہے ابھی حیات ہیں۔ وہ طویل عرصے سے اپنے والد کے ساتھ قیام پذیر رہی ہیں۔ ان بیوی کے بطن سے سر محمد اقبال کے بیٹے مسٹر آفتاب اقبال ایم اے [لندن] بارایٹ لا جن کی عمر تخمیناً ۳۶ سال ہے ایک مقنن کی حیثیت سے لاہور میں پریکٹس کرتے ہیں۔
جاوید اقبال اور منیرا بیگم کی والدہ کا چار سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ پتا : ۹۴ ٹمپل روڈ لاہور۔

ان کوششوں کے نتیجے میں حضور نظام نے ۱۵ر رمضان ۱۳۵۷ھ س کو مندرجہ ذیل فرمان جاری کیا۔
"ڈاکٹر اقبال کی قومی خدمات کے لحاظ سے ان کی بیوہ کے نام پچاس روپے ماہوار تا حیات اور کم سن لڑکے کے نام پچاس روپے ماہانہ تا ختم تعلیم اور لڑکی کے نام پچاس روپے تا کتخدائی جاری کیا جائے۔
مرحوم کا تعلق ہماری ریاست سے نہ ہونے کے باوجود ان کے پس ماندگان پر احسان کیا جاتا ہے تو ان کے فرزند کلاں کو یک مشت رقم دینا چہ معنیٰ دارد وہ بھی ایسے شخص کو جو قانونی پریکٹس سے اپنی روزی کما رہا ہو لہٰذا اس کی ضرورت نہیں۔" [ایضاً ص : ۳۶]

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آفتاب اقبال کے پیشۂ وکالت کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں بھی حضور نظام سے یک مشت رقم کی سفارش کی گئی تھی فرمان کا آخری حصّہ اسی کے جواب میں ہے۔
حیدر آباد سے متعلق معلومات حیدر آباد آرکائوز کے فائلوں میں محفوظ ہیں۔ جو یہاں سید شکیل احمد صاحب کی توجّہ اور ان کے لیے اظہار تشکر کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔

علّامہ اقبال کی پہلی بیوی کی دستخطی رسید
حیدر آبادی وظیفے کے سلسلے میں

POST CARD

IMPERIAL BANK OF INDIA

HYDERABAD (DECCAN)

Please return this card duly signed

ACKNOWLEDGMENT

I beg to acknowledge receipt of your letter No. 13932 *dated* 13 . 6 . 42 *with contents as stated therein.*

19

بتعلم خود کریم بی بی

C.O.B. 171.

ج

علامہ اقبال سے متعلق دارالافتا دیو بند کا فتویٰ

مسئلہ پیش کردہ شیخ عطا محمد سیالکوٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک شخص کی دو منکوحہ بیویاں تھیں۔ پہلی کا ایک لڑکا تھا جسے وہ ساتھ لے جا کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی تھی۔ اور شخص مذکور اس کو ۱۰/۳۰ ماہوار گزارے کے واسطے اور ۲۰/۰ ماہوار لڑکے کی تعلیم کے واسطے دیتا رہا۔ لڑکا تعلیم پا کر اپنی والدہ کی ذاتی جائداد پر یورپ میں تعلیم پا کر بیرسٹر ہوا۔

دوسری بیوی فوت ہو گئی۔ دو بچے نابالغ چھوڑ گئی تھی جن میں سے ایک اس وقت ۱۳ اور دوسرا ... سال عمر کے ہیں شخص مذکور فوت ہو گیا ہے۔ مرنے سے چند روز اوّل اپنی ذاتی جائداد دوسری بیوی کے ہر دو بچوں کے نام ہبہ کر گیا ہے۔ پہلی بیوی اپنا نصف حق مہر خاوند سے اس کی زندگی میں وصول کر چکی تھی۔ اب وہ ۱۵ بقایا مہر ایک ہزار اور گزارہ مقررہ یعنی ۰/۳۰ ماہوار طلب کرتی ہے۔ لیکن شخص مذکور کی ذاتی جائداد کچھ بھی نہیں۔ جو تھی اس کو وہ نابالغوں کے نام ہبہ کر گیا ہے اگر ہبہ ناجائز قرار دیا جاوے تو بمشکل بقایا مہر ادائی ہو سکتا ہے۔ لیکن گزارہ دینے کے واسطے شخص مذکور کی کوئی ایسی جائداد نہیں جس میں سے گذارہ دیا جاوے دوسرے فوت شدہ بیوی کا مہر ادائی نہیں ہوا۔ اس کے وارث بھی مہر طلب کرتے ہیں۔

براہ مہربانی اس مقدمے کا

فیصلہ از روئے شریعت فرما کر مطلع فرما دیں۔

شخص مذکور اپنی زندگی میں ۲۵ سال تک گزارہ دیتا رہا۔ اب وہ مر چکا ہے۔ ذاتی جائداد کوئی ایسی نہیں چھوڑی جس کی آمدنی سے بیوہ کو گزارہ دیا جائے کیا ہبہ شدہ جائداد میں سے پہلی کا نصف بقایا اور دوسری کا سالم مہر شریعت کی رُو سے جائز ہوگا؟ اور بیوہ از روئے شریعت گزارہ لینے کی حقدار ہے؟ فریقین حنفی مذہب کے پیرو ہیں۔

شیخ عطا محمد محلہ وہاب شہر سیالکوٹ

16 / ۳۸

الجواب

ظاہر یہ ہے کہ شخص مذکور نے مرض الموت اور مشترک جائداد کا ہبہ دونوں لڑکوں کے نام کیا ہے۔ لہٰذا ہبہ صحیح نہیں ہوا اور جائداد موہوبہ ملک واہب سے خارج نہیں ہوئی اور بعد موت واہب کے اوّل اس جائداد سے دونوں بیویوں کا دین مہر ادا کرنا واجب ہے۔ اگر وہ جائداد دونوں کے دین مہر کو کافی نہ ہو تو حصہ رسد روپے کی نسبت سے دونوں کو دیا جائے گا اور زوجہ بیوہ کا بعد وفات شوہر گزارہ اور نفقہ طلب کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ دین مہر کا مطالبہ صحیح ہے۔ فقط

واللہ تعالیٰ اعلم

مسعود احمد عفا اللہ عنہ
نائب مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۸ رجمادی الاوّل ۱۳۵۷ھ

الجواب صحیح
کفایت اللہ گنگوہی غفرلہ مفتی
دارالعلوم دیوبند

مہر
دارالافتا

آفتاب اقبال کے نام ان کے چچا عطا محمد کے خطوط

(۱)

سیالکوٹ شہر

10-6-38

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہ

بعد دعا کے واضح ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے اس روز زیادتی ہوئی اور تمہاری برخورداری نے بعد میں مجھے خود نادم کیا۔ غم اور رنج کی حالت میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے تمہاری والدہ کے مہر کے واسطے میں نے محمد حسین کو لکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی جائداد قالین وغیرہ مرنے سے چند روز اول بچوں کے نام ہبہ کیے۔ لیکن اپنی بیوہ کے حق مہر خواہ غلطی سے خواہ دیدہ دانستہ ادائی کرنے کو کچھ نہ لکھا۔ شرعاً ہبہ کرنے سے اوّل بیوہ کا قرض ادائی ہونا چاہیئے تھا۔ ایسے انسان سے جس کو پبلک مجدد اور علامہ اور ترجمان حقیقت کا خطاب دیتی ہے ایسی غلطی کا ہونا اُس کی شہرت کے واسطے شرعی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ضرور ادا ہونا چاہیئے۔ ورنہ مرحوم قرضہ ادا نہ کرنے کے عذاب سے بری نہ ہو سکے گا۔ اور اس عذاب کو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہ کرے گا تا وقتیکہ قرض خواہ معاف نہ کر دے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ لوگ نواب صاحب کے وظیفے کے انتظار میں ہیں۔ نواب صاحب ریاست سے باہر ہے دو ماہ بعد آوے گا۔ ان کو وظیفے کی امید ہے۔ اگر وظیفہ بدستور قائم رہا تو تمہاری والدہ کو بھی سوائے اس کے وہ اپنی ساس کو جس قدر دیتے تھے سب کو حصہ ملے گا اور نوکر چاکر بدستور کوٹھی میں اسی طرح رہیں گے ——

سیالکوٹ شہر
10.6.38

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہ

بعد دعا کے واضح ہو - مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے اوس روز زیادتی ہوئی اور تب سے برخوردار نے بھی
بڑا مجھ خود نادم کیا - غم اور رنج کی حالت میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے - تمہاری والدہ کے مہر کے
واسطے میں نے محمد حسین کو لکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی جائداد قالین وغیرہ مرنے سے چند روز اول
بچوں کے نام ہبہ کر دی تھی لیکن اپنی بیوی کے حق مہر خواہ غلطی سے خواہ دیدہ دانستہ ادائی کرنے کو کچھ نہ لکھا
شرعاً ہبہ کرنے سے اول بیوہ کا قرض ادائی ہونا چاہیے تھا - ایسے انسان سے جس کو پبلک مجدد علامہ
ترجمان حقیقت کا خطاب دیتی ہے ایسی غلطی کا ہونا اوس کی شہرت کے واسطے شرعی اعتراض وارد
ہوتا ہے - لہذا وہ ضرور ادا ہونا چاہیے ورنہ مرحوم قرضہ ادا نہ کرنے کے عذاب سے بری نہ ہو سکے گا.
اور اس عذاب کو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہ کرے گا تا وقتیکہ قرض خواہ معاف نہ کرے - مجھے معلوم ہوا ہے
کہ وہ لوگ نواب صاحب کے وظیفہ کے انتظار میں ہیں - نواب صاحب ریاست سے باہر ہے دو ماہ بعد
آوے گا - ان کو وظیفہ کی امید ہے - اگر وظیفہ بدستور قائم رہا تو تمہاری والدہ کو بھی علاوہ
اس کے اپنی ساس کو جس قدر دیتے تھے سب کو حصہ ملیگا اور نوکر چاکر بدستور کوٹھی میں اسی طرح رہیں گے

جیسے کہ ان کی زندگی میں تھے۔ بلکہ اقبال مرنے سے اوّل اپنی خواہش اسی طرح ظاہر کر گیا ہے۔ نواب صاحب کے آنے پر معلوم ہوگا۔ مجھے تم پر اور تمہاری والدہ پر بڑا رحم آتا ہے لیکن مجھ میں اب اس قدر وسعت نہیں کہ تمہاری یا تمہاری والدہ کی امداد کرسکوں۔ مرحوم نے جو وصیت یعنی ہبہ جائداد خود کے واسطے کی ہیں وہاں موجود نہ تھا۔ ورنہ میں ضرور یہ غلطی اس کو یاد دلاتا۔ اور وہ اس پر غور فکر [کر] تے۔ یہ ان کے حاشیہ نشینوں کا بھی قصور ہے خاص کر منشی طاہر دین جس کو سب حالات معلوم تھے۔ لہٰذا چند روز صبر کرنا چاہیے۔ اگر تم چاہو تو بیوہ کی طرف سے نواب صاحب کو ایک یادداشت بھیج دو تاکہ اگر وہ وظیفہ دیویں تو اس کا حق محفوظ رہے۔ برخوردار نصیب کی بات ہے کہ باوجود کذا اس قدر علم کے تم اس وقت تنگ حالت میں ہو۔ خدا سے معافی چاہو۔ تمہاری محنت ضائع نہ ہوگی۔ آخر کبھی خوش حالی کا زمانہ آجاوے گا۔ تنگی کے بعد فراخی اور فراخی کے بعد تنگی۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح دنوں کو پھیرتا رہتا ہے۔ صبر سے کام لو، نیک چلن رہو خدا تمہاری مشکل آسان کر دے گا۔ وظیفہ ملنے کے بعد اگر تم کو جواب کرا دیویں یا وظیفہ نہ ملے تو تمہارا اختیار ہوگا کہ پبلک کے روبرو اس مسئلے کو رکھو یا نہ رکھو یہ ایک ایسی غلطی ہے جو ایک عالم دین سے نہ ہونی چاہیے تھی۔

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

(۲)

سیال کوٹ شہر
13.6.38

مغربیت کے خیال اور
طرز بود و باش و خورد و نوش
رفتہ رفتہ بدل دو۔ آرام پاؤ گے

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہو [کذا]

بعد دعا کے واضح ہو۔ تمہارا خط مندرجہ معلوم ہوا۔ اچھا کیا کہ اپنی والدہ کی طرف سے نواب صاحب کو عریضہ بھیج دیا۔ اوّل تو مجھے امید نہیں کہ نواب صاحب وظیفہ جاری رکھیں گے۔ اگر جاری رہا تو تمہاری والدہ کا ذکر خاص طور پر اس میں کیا جاوے گا۔ برادر مرحوم کو جاوید کے عنوان بھی کچھ اچھے نظر نہ آتے تھے۔ وہ اس سے ناخوش ہی سدھارے۔ اس کی والدہ کا انتقال پردہ پوش رہا۔ مجھ سے بارہا کہا کہ ہمارا خاندانی اتفاق اور محبت باہمیں [کذا] میرے اور آپ کے بعد ختم ہو جاوے گا کیونکہ مجھے اپنی اولاد پر بھروسہ نہیں ہے کہ میرے بعد خاندانی روایات یہ قایم رکھے گا۔ اور میں خود بھی اس کی عادت اور اطوار سے ایسا ہی محسوس کیا کرتا تھا۔ مجھے امید ہے کہ یہ لڑکا باپ کے نام کو زیادہ بلند کرے گا۔ کیا اس میم کو جواب دے دیا گیا ہے جو میرزا شیخ طاہر دین کے گھر چلی گئی ہے۔ میں اس پر بضد تھا کہ میرزا میم کے پاس نہ رکھی جاوے اور مجھ سے وعدہ تھا کہ دو ماہ تک وظیفے کا حال معلوم ہونے پر تمام انتظام بدل دیا جاوے گا۔ لیکن فی الحال قایم رکھنا ضروری ہے۔ اعجاز احمد کو میں نے مشورہ دیا ہے کہ وہ ٹرسٹی شپ سے استیفا [کذا] دے دے۔

13.6.38

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہ

بعد دعا کے واضح ہو۔ تمہارا خط مندرجہ معلوم ہوا۔ اچھا کیا کہ اپنی والدہ کی طرف
سے نواب صاحب کو عریضہ بھیج دیا۔ اول مجھے امید نہیں کہ نواب صاحب وظیفہ جاری رکھینگے اگر جاری رہا تو
تمہاری والدہ کا ذکر خاص طور پر اس میں کیا جاویگا۔ برادر مرحوم کو جاوید کے عنوان بھی کچھ اچھا
نظر نہ آتے تھے۔ وہ اس سے ناخوش ہی سدھارے۔ اور اسکی والدہ کا انتقال پردہ پوش رہا
مجھے بار بار کہا کہ ہمارا خاندانی اتفاق اور محبت باہمی میرے اور آپکے بعد ختم ہو جاویگا کیونکہ
مجھے اپنی اولاد پر بھروسہ نہیں ہے کہ میرے بعد خاندانی روایات یہ قایم رکھیگا۔ اور میں خود بھی
اسکی عادات اور اطوار سے ایسا ہی محسوس کیا کرتا تھا۔ مجھے امید ہے کہ یہ لڑکا باپکے
نام کو زیادہ بلند کریگا۔ کیا اس میم کو جواب دیدیا گیا ہے جو میرزا شیخ طاہر دین
کے گھر چلی گئی ہے۔ میں اس پر بضد تھا کہ میرزا میم کے پاس نہ رکھی جاوے۔ اور مجھ سے وعدہ تھا
کہ دو ماہ تک وظیفہ کا حال معلوم ہونے پر تمام انتظام بدل دیا جاویگا لیکن فی الحال قایم
رکھنا ضروری ہے۔ اعجاز احمد کو میں نے مشورہ دیا ہے کہ وہ ٹرسٹی شپ سے استعفیٰ دیدے

اقبال

اس ٹرسٹ کا نتیجہ آخرِ کار آ نکلے گا۔ جاوید کے ماموں مرحوم بھی ٹرسٹ میں تھا۔ اس کے مرنے پر ڈاکٹر اقبال نے میاں امیر الدین کو مقرر کر لینے کو بشرط ضرورت کہا ہوا تھا۔ اس کو مقرر کر لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے الفاظ کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے میں نے جاوید اور منیرا کے متعلق خیال کرنا چھوڑ دیا ہے۔ البتہ کسی قدر خیال ہے منیرا کا ہے۔ ابھی بچہ ہے۔ حوش [کذا] آنے پر اُسے خود بخود اپنے تلاش کرنے پڑیں گے۔ برادرِ مرحوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم ہی نہ دیا گیا تھا کہ اولاد کی پرورش اور نگہداشت کیسے اور کس طریق پر ہونی چاہیے تھی۔ تم نے اگر کچھ ترقی کی تو اپنے زور اور اپنی والدہ کی زر سے۔ اور جاوید نے آج تک جس قدر تعلیم حاصل کی وہ ٹیوٹر کے زور سے جس کو چالیس اور پچاس ماہوار ملتے تھے جو کم امید ہے کہ جاوید تعلیم میں ترقی کرے وہ بغیر ٹیوٹروں کے جماعت میں چل ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے کاروبار میں ترقی دیوے۔ اور تم اپنی والدہ کی خدمت کا حق ادا کر سکو۔ میری صحت بہت بگڑ گئی تھی لیکن اب کسی قدر بہتر صورت نظر آتی ہے۔ اگست اور ستمبر پہاڑ (بٹوٹ) کشمیر کے راستے میں ہے جانے کا ارادہ ہے۔ پچھلے سال میں کشمیر گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر ایک ماہ وہاں ٹھہرا تھا۔ کشمیر سے بھی بہتر آب و ہوا وہاں کی تھی۔ البتہ نظارہ اور ڈل جھیل وغیرہ کا نظارہ نہ تھا۔ اگر برادرِ مرحوم زندہ رہتے تو اب کے سال بٹوٹ جانے کا ارادہ ہو چکا تھا۔ اپنی والدہ کو تسلی دیا کرو۔ وہ آزردہ نہ رہے خدا سبب پیدا کر دے گا۔ تمہارے کام میں ترقی ہو گی۔

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

(۳)

برخوردار سلطان عمر ہو (کذا)

یہاں کے ایک قانون داں کا خیال ہے کہ جب تک قرضہ ادا نہ کیا جاوے ہبہ ناجائز ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے واسطے میعاد دعویٰ ۶ سال ہے۔ تم بھی قانون داں ہو کیا یہ درست ہے۔ قرضہ ادا نہ کرنا اور اپنی جائداد ہبہ کر دینا ہبہ کو فرد ناجائز قرار دیتا ہوگا۔ عقل بھی اس کو تسلیم کرتی ہے۔ تمہارے باپ کی دو تین ہزار کی جائداد ہے جس کو انھوں نے مرنے سے تین چار روز قبل ہبہ کر دیا تھا۔ بیوہ کا مہر اور اس کا گزارہ تا زیست شرعی نحتہ (کذا) سے خاوند کے ذمے قرض ہوتا ہے جس کا اقرار بوقت نکاح وہ کرتا ہے البتہ طلاق کی صورت میں وہ اس قرض سے آزاد ہوجاتا ہے لیکن مہر پھر بھی اسے دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح وصیت میں نقص بتلاتے ہیں۔ جاوید شاید یہاں آوے گا تو اس کو یہ سب بتلاؤں گا کہ وہ باپ کی عزت اور شہرت کی حفاظت کرے ورنہ بدنامی سارے خاندان کی ہوگی۔ اس طریق سے تمہارا مطلب حل ہو جاوے گا۔ تو تم بھی اور کچھ نہ کرو۔ تمہارا بھی تو وہ باپ تھا۔ تمہاری بھی اس میں بدنامی ہوگی۔ جہاں تک ممکن ہو اس خیال کو ترک کرنا چاہئے۔ میں سفر نہیں کر سکتا افسوس ہے۔

۱۱ 7/38

لاہور نمبر ۶ لکشمی بلڈنگ
شیخ آفتاب اقبال بیرسٹر ایٹ لا

POST CARD
ADDRESS ONLY
Lahore

(۴)

سیالکوٹ
8-7-38

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہ

بعد دعا کے واضح ہو تمہارا خط ملا۔ مندرجہ معلوم ہو کر افسوس ہوا اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا جاوے کیا تمہاری والدہ کے واسطے نواب صاحب کے وظیفہ 250 میں سے وہ لوگ تم کو 115/0 روپیہ ماہوار دینے کا اقرار کرتے ہیں یا بلکل (کذا) جواب دیتے ہیں۔ اگر 115/0 دیتے ہیں تو تم 130/0 کا مطالبہ کرو اگر وہ لوگ نہ دیویں تو پھر عدالت تک جانا مناسب ہے۔ اوّل 130/0 کا مطالبہ کرو انکار پر جس طرح تم مناسب جانو ویسا کرو۔ ان لوگوں کو ڈاکٹر صاحب کی آبرو و عزت سے میرے خیال میں کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ اگر کسی کو موت کا خطرہ پیش ہو جاوے تو وہ تپ قبول کرنے پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے اطلاع تک نہیں دی کہ وظیفہ مقرر ہو گیا ہے محض اس واسطے کہ میں تمہاری والدہ کے واسطے

سیالکوٹ
8.7.38

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہ

بعد دعا کے واضح ہو۔ تمہارا خط ملا۔ مندرجہ معلوم ہو کر افسوس ہوا
اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا جاوے
کیا تمہاری والدہ کے واسطے نواب صاحب کے وظیفہ 250 میں سے وہ
لوگ تم کو 115/0 روپیہ ماہوار دینے کا اقرار کرتے ہیں یا بلکل جواب دیتے
ہیں۔ اگر 115/0 دیتے ہیں تو تم 130/0 کا مطالبہ کرو۔ اگر وہ لوگ نہ
دیویں تو پھر عدالت تک جانا مناسب ہے۔ اول 130/0 کا مطالبہ کرو
وانکار پر جس طرح تم مناسب جانو ویسا کرو۔ ان لوگوں کو ڈاکٹر صاحب
کی آبرو و عزت سے میرے خیال میں کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ تنگ آمد بجنگ
آمد۔ اگر کسی کو موت کا خطرہ پیش آ جاوے تو وہ تپ قبول کرنے
پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔ ان لوگوں نے مجھ کو اطلاع تک نہیں دی
کہ وظیفہ مقرر ہو گیا ہے محض اس لئے کہ میں تمہاری والدہ کی مجبوری کے

ان کو مجبور نہ کروں۔ ایسی حالت میں برخوردار تمہارا قانونی حق یا تمہاری والدہ کے جس قدر حقوق ہوں ان کے واسطے چارہ جوئی کرو نواب صاحب نے سب کے واسطے غالباً وظیفہ دیا ہے۔ نہ صرف لڑکی اور لڑکے کے واسطے۔ اگر صرف لڑکی اور لڑکے کے واسطے ہے تو ۳۰/۱ جیسے کہ مرحوم کی زندگی میں تھا اگر دے دیں تو لے لو ورنہ اپنے حق پر لڑنا گناہ نہیں ہوگا۔ ٹرسٹیوں کی حالت یوں سمجھنی چاہئے کہ تیلی کا تیل جلے مسیلی (کذا) کی .... پہلے اُن کو بھلا اس میں توقف کیوں ہے گرہ (کذا) سے دینا نہیں۔ تج (کذا) مرینڈی اندر ڈبے مورکھ جانے مجھ سے ڈرے۔ اگر تم اور تمہاری والدہ سیدھے سیدھے ہو گئے تو آخر فیصلے کے واسطے کمیشن مقرر ہوگا۔ اپنی والدہ کے جملہ حقوق کا مطالبہ اوّل کرو اس کے بعد اپنا کرنا۔ میری طبیعت اب اچھی نہیں رہتی۔ دن تھوڑے معلوم ہوتے ہیں۔ گرمی زیادہ ہو رہی ہے۔

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

میں انکو اس بارے میں کچھ نہ لکھوں گا۔ جب تم ان سے مطالبہ کروگے تو وہ ضرور مجھ کو لکھیں گے۔ اس وقت مجھے موقع ملے گا کہ ان کی خبر لوں اعجاز کو اس کی اطلاع دے دینا۔

(۵)

برخوردار شیخ اقبال طالعمرہ

بعد دعا کے واضح ہو قبل اس کے ایک خط تمہارے خط کے جواب میں لکھا تھا ملا ہوگا۔ اگر ٹرسٹی 115/= روپیہ تمہاری والدہ کو دیں تو لینے سے انکار کرکے 130/= روپیہ کا مطالبہ کرنا چاہئے اگر تمہاری والدہ کا گذارہ نواب صاحب کے وظیفے کی بنیاد پر ہوتا تو 115/= واجب تھا۔ لیکن تمہاری والدہ کا گذارہ 130/= بیس سال سے ڈاکٹر مرحوم نے مقرر کر رکھا تھا اس وقت نواب صاحب کا وظیفہ نہ تھا۔ جب کہ بیس سال سے 130/= ان کی زندگی میں مقرر تھے تو مرنے کے بعد 115/= کیوں ہوں 130/= روپئے کے واسطے تم کو ضرور تقاضا کرنا چاہئے۔ وہ بیوہ کا حق ہے۔ علاوہ اس کے ڈاکٹر مرحوم نے اپنی وصیت میں اس کی کمی وغیرہ کا ذکر تک نہیں کیا اس بارے میں اور مہر کے متعلق اگر ٹرسٹی دینے سے انکار کریں اور معاملہ عدالت تک پونچے (کذا) تو میں تمہاری والدہ کی امداد پر ہوں گا۔ میری رائے میں 130/= بدستور تا زندگی اور بقایا مہر تمہاری والدہ کا حق ہے۔ اپنا حق وصول کرنا ہر طرح سے جائز ہے اس میں کوئی گناہ یا بدنامی نہیں۔ بلکہ بدنامی نہ دینے والوں کی ہوگی۔ ملامت کا نشانہ وہی لوگ ہوں گے۔ بیوہ کے ساتھ

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طالعمرہ

بعد دعا کے واضح ہو۔ قبل اسکے ایک خط تمہارے خط کے جواب میں لکھا تھا ملا ہوگا
اگر ٹرسٹی 115/= روپیہ تمہاری والدہ کو دیں تو لینے سے انکار کرکے 130/= کا
مطالبہ کرنا چاہیے – اگر تمہاری والدہ کا گذارہ نواب صاحب کے وظیفہ کی بنیاد پر
ہوتا تو 115/= واجب تھا – لیکن تمہاری والدہ کا گذارہ 130/= بیس سال سے ڈاکٹر مرحوم
نے مقرر کر رکھا تھا اس وقت نواب صاحب کا وظیفہ نہ تھا – جبکہ ۲۰ سال سے 130/=
انکی زندگی میں مقرر تھے تو مرنے کے بعد 115/= کیوں ہوں – 130/= روپیہ کیواسطے تم کو
ضرور تقاضا کرنا چاہیے وہ بیوہ کا حق ہے علاوہ اسکے ڈاکٹر مرحوم نے اپنی وصیت
میں اسکی کمی وغیرہ کا ذکر تک نہیں کیا – اس بارہ میں اور مہر کے متعلق اگر ٹرسٹی
دینے سے انکار کریں اور معاملہ عدالت تک پہنچے تو میں تمہاری والدہ کی امداد پر
ہونگا – میری رائے میں 130/= بدستور تا زندگی اور بقایا مہر تمہاری والدہ کا حق ہے
اپنا حق وصول کرنا ہر طرح سے جائز ہے اسمیں کوئی گناہ یا بدنامی نہیں بلکہ بدنامی
نہ دینے والوں کی ہوگی۔ ملامت کا نشانہ وہی لوگ ہونگے – بیوہ کے ساتھ

ہمدردی عام ہوگی۔ لہٰذا تم نے ناحق نواب صاحب کے وظیفے کا انتظار کرکے وقت ضایع کیا۔ وکیں کی معرفت اوّل گذارہ ۱۵۰/ کا مطالبہ کرو اس کے بعد جو صورت ہوگی ویسے کرتا۔ میرا خیال ہے کہ باہم فیصلہ ہوجاویگا۔ مہر کے واسطے بعد میں دیکھا جاویگا۔ میں بذاتِ خود برادر مرحوم کی شہرت کو بدنام کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اگر مجھ میں وسعت ہوتی تو ایسی حالت میں ۱۵۰/ ماہوار اور مہر میں اپنی گرہ سے ادائی کرکے مرحوم کی شہرت کو توبچا[تا]۔ مجھے اس کارروائی سے ضرور دکھ ہوگا مگر بیوہ سے بھی اس وقت ہمدردی ہے۔ مرحوم کی زندگی میں جو کچھ میرا خیال تھا اس کو چھوڑ کر اس وقت کی حالت کا خیال کرتے ہوئے ایک انسان کو بیوہ سے ہمدردی ہونی چاہیے۔ لہٰذا ڈاکٹر مرحوم کی شہرت کو بدنام کرنے کی خاطر نہیں بلکہ محض اپنا حق لینے کی خاطر مجبوراً تم کو ایسا کرنا پڑا۔ اگر تم کو مرحوم کی وصیت میں کچھ قانونی نقص معلوم ہوئے ہیں تو بعد مشورہ چند ایک وکلا کے جو تم چاہو کرو۔ لیکن اوّل نقل وصیت اور ہبہ نامہ رجسٹرار سے لے کر دیکھ لو۔ کوٹھی کے متعلق بھی ایسی ہی قسم کی کارروائیاں تھیں جس سے تم محروم رہو۔ جاوید کی والدہ کے روپے سے جو اس کا بنک میں جمع تھا کوٹھی تعمیر ہوئی تھی 24 ہزار کی زمین اور 20 ہزار کی تعمیر کل 46 ہزار فرنیچر وغیرہ ملا کر 50، 55 ہزار تھا۔

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

$10\frac{7}{38}$

٦

سیالکوٹ شہر
29.7.38

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طالع ہو

بعد دعا کے واضح ہو۔ تم خود بھی قانون دان ہو اور دوسرے وکلاء سے بھی دریافت کر کے معلوم کرو کہ جاوید کی والدہ کے مرض الموت کی حالت میں اپنی جائیداد کوٹھی و زیور مالیتی قریباً پچاس ہزار اپنے لڑکے جاوید کے نام ہبہ یا وصیت کر دی تھی۔ از روئے قانون وہ ساری جائیداد ہبہ یا وصیت کر سکتی تھی یا اسے 1/3 ہبہ کرنے کا حق تھا۔ شرع محمدی تو 1/3 ہبہ یا وصیت کی اجازت دیتی ہے۔ لہٰذا اگر قانون انگریزی شریعت کے مطابق 1/3 حصہ جائیداد کی اجازت دیتا ہے تو اس صورت میں 2/3 کا مالک ڈاکٹر اقبال ٹھہرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس جائیداد کو کسی کے نام نہ ہبہ کیا اور نہ وصیت میں اس کا ذکر ہے۔ اس بنا پر تم اور تمہاری والدہ اس جائیداد سے اپنے کل حقوق لے سکتے ہو۔ اگر قانون بھی 2/3 ڈاکٹر مرحوم کا حق تسلیم کرتا ہے تو تم کو اول مہر لینے کا انتظام کرنا ہوگا۔ خاص طور سے یا بذریعہ عدالت دعویٰ کر کے اور اس دعوے کو بذریعہ مفلسی چلایا جاوے ورنہ میں تم کو کورٹ فیس کا انتظام کر دوں گا۔ فیصلہ ہونے پر دوسرا حق ۱/۸ کا جو از روئے شرع تمہاری والدہ کا 2/3 کے حصے میں ہے دعویٰ کرنا اور اس کے بعد تم اپنے ترکے کا دعویٰ کر سکتے ہو۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے خود بھی جو ہبہ کرنے سے

29.7.38

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طالع ہو

بعد دعا کے واضح ہو۔ تم خود بھی قانون دان ہو اور دوسرے وکلاء سے بھی دریافت کر کے
معلوم کرو کہ جاوید کی والدہ نے مرض الموت کی حالت میں اپنی جائیداد کوٹھی و زیور مالیتی
قریباً پچاس ہزار اپنے لڑکے جاوید کے نام ہبہ یا وصیت کر دی تھی۔ از روئے قانون
وہ ساری جائیداد ہبہ یا وصیت کر سکتی تھی یا اسے 1/3 ہبہ کرنے کا حق تھا۔
شرع محمدی تو 1/3 ہبہ یا وصیت کی اجازت دیتی ہے۔ لہٰذا اگر قانون انگریزی
شریعت کے مطابق 1/3 حصہ جائیداد کی اجازت دیتا ہے تو اس صورت میں 2/3 کا
مالک ڈاکٹر اقبال ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس جائیداد کو کسی کے نام نہ ہبہ کیا
اور نہ وصیت میں اس کا ذکر ہے۔ اس بنا پر تم اور تمہاری والدہ اس جائیداد سے اپنے
کل حقوق لے سکتے ہو۔ اگر قانون بھی 2/3 ڈاکٹر مرحوم کا حق تسلیم کرتا ہے تو تم کو اول
مہر لینے کا انتظام کرنا ہوگا۔ خاص طور سے یا بذریعہ عدالت دعویٰ کر کے اور اس دعوے کو
بذریعہ مفلسی چلایا جاوے ورنہ میں تم کو کورٹ فیس کا انتظام کر دوں گا۔ فیصلہ ہونے
پر دوسرا حق ۱/۸ کا جو از روئے شرع تمہاری والدہ کا 2/3 کے حصہ میں ہے دعویٰ کرنا
اور اس کے بعد تم اپنے ترکہ کا دعویٰ کر سکتے ہو۔ ڈاکٹر مرحوم نے خود بھی جو ہبہ کرنے

و چار روز اول کیا ہے وہ بھی ناجائز ٹھہرتا ہے۔ اوّل تو بلا ادائے قرضہ مہر اور دویم وہ بھی ⅓ سے زائد کا ہبہ نہ کرسکتے تھے۔ یہ جائداد اس قدر ہے کہ اس
ں سے مہر ادا ہوسکے۔ ہبہ کی نقل لینے کے بعد میں بتلاؤں گا کہ انھوں نے کون کون سی چیزیں قیمتی جو ان کی ملکیت تھیں ہبہ نامہ میں درج نہیں ہوئیں
گر تمہارا مطلب حسب مراد قانون سے نکل آیا یعنی سالم جائداد کا ہبہ ناجائز ٹھہرا تو پھر تم ڈاکٹر مرحوم کی کل کتابوں کا حق تصنیف کی تقسیم کا دعویٰ کرسکوگے۔ مرحوم نے
م تمھارے حق سے علانیہ عاق نہیں کیا لہٰذا تم اپنے اور والدہ کے حق کے واسطے قانونی نکتہ دریافت کرو۔ شریعت کا فتوہ کذا تمھاری والدہ اور تمھارے
ق میں ہے۔ میرے پاس علمار دین کے فتوہ (کذا) آگئے ہیں اور میں نے تم کو ہبہ ناموں کی نقول حاصل کرنے کے واسطے اسی بنا پر لکھا تھا۔ لہٰذا نقل لے کر بھیج دو
ور خود قانون انگریزی کا فتوہ (کذا) معلوم کرو میں بھی یہاں کے وکلا سے دریافت کروں گا بلکہ اگر کوئی فیصلہ چیف کورٹ کا بھی مل گیا تو اچھا ہوگا۔ آخر ڈاکٹر
رحوم اور ان کا منشی قانون داں تھے انھوں نے ایسا جو کیا ہے اس میں کوئی وجہ ضرور ہوگی جس کا پتہ نقل لینے کے بعد ملے گا۔ اگر قانون تمھارے حق میں ہے تو
کسی پر ظاہر نہ کرنا خاموشی اختیار کرنا۔

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

29/7/38

دو چار روز اول کیا ہے وہ بھی ناجائز ٹھہرتا ہے۔ اول تو بلا ادائے قرضہ مہر اور
دوم وہ بھی ⅓ سے زائد کا ہبہ نہ کرسکتے تھے۔ یہ جائداد اس قدر ہے کہ اس سے
مہر ادا ہو سکے۔ ہبہ کی نقل لینے کے بعد میں بتلاؤں گا کہ انہوں نے کون کون سی چیزیں قیمتی جو
ان کی ملکیت تھیں ہبہ نامہ میں درج نہیں کیں۔ اگر تمہارا مطلب حسب مراد قانون سے
نکل آیا یعنی سالم جائداد کا ہبہ ناجائز ٹھہرا تو پھر تم ڈاکٹر مرحوم کی کل کتابوں کا حق
تصنیف کی تقسیم کا دعویٰ کر سکو گے۔ مرحوم نے تم کو تمہارے حق سے علانیہ عاق نہیں کیا
لہٰذا تم اپنے اور والدہ کے حق کے واسطے قانونی نکتہ دریافت کرو۔ شریعت کا فتوہ تمہاری
والدہ اور تمہارے حق میں ہے۔ میرے پاس علماء دین کے فتوے آگئے ہیں اور میں نے تم کو ہبہ ناموں کی
نقول حاصل کرنے کے واسطے اسی بنا پر لکھا تھا۔ لہٰذا نقل لے کر بھیج دو۔ اور خود قانون انگریزی کا
فتوہ معلوم کرو۔ میں بھی یہاں کے وکلا سے دریافت کروں گا۔ بلکہ اگر کوئی فیصلہ چیف کورٹ
کا بھی مل گیا تو اچھا ہوگا۔ آخر ڈاکٹر مرحوم اور ان کا منشی قانون داں تھے انہوں نے ایسا
جو کیا ہے اس میں کوئی وجہ ضرور ہوگی جس کا پتہ نقل لینے کے بعد ملے گا۔ اگر قانون تمہارے
حق میں ہے تو کسی پر ظاہر نہ کرنا خاموشی اختیار کرنا۔

شیخ عطا محمد

29/7/38

سیالکوٹ شہر
31 .7. 38

برخوردار طالع ہو

تمہارا خط ملا۔ مندرجہ معلوم ہوا۔ تم چونکہ قانون داں ہو غلام رسول کی باتیں سن کر نا امید ہو گئے، تم اس ہبہ نامے کی نقل حاصل کرو جو جاوید کی والدہ نے مرنے سے ایک روز اوّل اپنے بچوں کے نام کیا تھا۔ اس پر میری بھی گواہی ہے۔ علاوہ اس کے ڈاکٹر صاحب نے مرنے سے تین چار روز اوّل اپنی ذاتی جائداد، چند ایک قالین، مالیتی سولہ ہزار روپیہ اور فلاسفی کی قیمتی کتابیں وغیرہ وغیرہ معلوم نہیں اور کیا کچھ ہبہ کیا گیا تھا۔ میرے روبرو عرضی نویس نے لکھا یا لکھا ہوا کاپی کیا۔ اور میاں امیر الدین نے اسی جگہ رجسٹری کیا تھا۔ جاوید کی والدہ نے مرنے سے ایک روز اوّل جو ہبہ نامہ کیا تھا وہ بھی میاں امیر الدین نے گھر پر آکر دریافت کر کے دستخط کرا کر رجسٹری کیا تھا۔ کیا وہ اس کا مہر تھا جو اس نے بچوں کے نام ہبہ کیا تھا اگر تم نقل ہر دو ہبہ ناموں کی لیتے تو تم کو معلوم ہوتا۔ جاوید کی والدہ کا سولہ یا سترہ ہزار روپیہ بنک میں اس کے نام پر جمع تھا جس سے کوٹھی کی زمین خریدی گئی تھی۔ اور تعمیر کے واسطے جو روپیہ خرچ ہوا تھا وہ البتہ جاوید کے روپے سے بنک سے لیا گیا کوٹھی کے مسالے

عطا محمد
31-7-38

برخوردار طالع ہو

تمہارا خط ملا - مندرجہ معلوم ہوا - تم چونکہ قانون داں ہو غلام رسول کی باتیں سن کر نا امید ہو گئے
تم اس ہبہ نامہ کی نقل حاصل کرو جو جاوید کی والدہ نے مرنے سے ایک روز اول اپنے بچوں کے
نام کیا تھا - اس پر میری بھی گواہی ہے - علاوہ اسکے ڈاکٹر صاحب نے مرنے سے تین چار روز اول
اپنی ذاتی جائداد چند ایک قالین مالیتی سولہ ہزار روپیہ اور فلاسفی کی قیمتی کتابیں وغیرہ وغیرہ معلوم نہیں
کیا کچھ ہبہ کیا گیا تھا - میرے روبرو عرضی نویس نے لکھا یا لکھا ہوا کاپی کیا اور میاں امیر الدین نے
اسی جگہ رجسٹری کیا تھا - جاوید کی والدہ نے مرنے سے ایک روز اول جو ہبہ نامہ کیا تھا
وہ بھی میاں امیر الدین نے گھر پر آکر دریافت کر کے دستخط کرا کر رجسٹری کیا تھا - کیا وہ
اس کا مہر تھا جو اس نے بچوں کے نام ہبہ کیا تھا - اگر تم نقل ہر دو ہبہ ناموں کی
لیتے تو تم کو معلوم ہوتا - جاوید کی والدہ کا سولہ یا سترہ ہزار روپیہ بنک میں
اس کے نام پر جمع تھا جس سے کوٹھی کی زمین خریدی گئی تھی اور تعمیر کے واسطے
جو روپیہ خرچ ہوا تھا وہ البتہ جاوید کے روپیہ سے بنک سے لیا گیا کوٹھی کے مسالہ

تعمیر کی رسید تیا بھی جاوید کے نام سے لی گئی (کذا) بنک سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جاوید کی والدہ کا روپیہ اسکے نام سے کس قدر جمع تھا. روپیہ تو جاوید کی والدہ کے نام جمع تھا. زمین خریدنے کے بعد داخل خارج جاوید کے نام ہوا تھا. تمھارے پتے افسوس ہے کچھ نہیں اس واسطے نا امید ہو اور تم کو قانونی کارروائیاں اس وقت مضبوط (کذا) نظر آتی ہیں. مقدمے کے واسطے روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور مغز رکھنے والے وکلا بھی خریدے جاتے ہیں لیکن تم خالی ہاتھ ہو اللہ تم پر رحم کرے. اگر تمھارا حق مار کر تمھارے باپ نے دوسروں کو دے دیا ہے تو یقین رکھو کہ ان کے پاس بھی نہیں رہے گا. ہبہ نامہ جو ڈاکٹر صاحب نے مرنے سے دو چار (روز) اوّل کیا تھا اس کی مالیت اس قدر ہے کہ تمھاری والدہ کا مہر اُس میں سے ادا ئی ہو سکے. لہٰذا تم اگر اس نامے کی نقل لے کر مجھے بھیج دیتے تو میں ان کو بتلا سکتا کہ اس جائیداد سے اوّل مہر ادائی کرو. شرعی مسئلہ ہے اگر تم کچھ بھی کرنا نہیں چاہتے اپنا عرضی دعویٰ اللہ کے پاس دائر کرتے ہو تو تمھاری مرضی صبر کرو. وہ کسی اور طرح تم کو دے گا. یہ جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے کیا محض تمھارا حق زایل (کذا) کرنے کو کیا ــــ یہ سب اسلام کے خلاف کیا گیا. شریعت کو چھوڑ کر قانون فرنگ میں پناہ لینا سچے مسلمان کا کام نہیں دو چار دس ہزار کی خاطر اپنے ایمان میں رخنہ ڈالنا درست نہ تھا. اسلامی عمل داری میں وہ ایسا نہ کر سکتے تھے اسی کفرستان میں یہ جائز ہوا. تمام عمر کا اندوختہ تھوڑی بات کے واسطے ڈبو دیا. آخر شیطان بھی بڑا چالاک (ہے) وہ ایسے آدمیوں کی تلاش میں رہتا ہے اپنی تصنیف میں وہ خود شیطان کے ذکر میں کہتے ہیں کہ وہ ایمان دار کی تلاش میں رہا کرتا ہے.

شیخ عطا محمد سیال کوٹ

غالباً حیدر آباد سے مرنے سے دو روز اوّل ۵ ہزار کا چیک حیدری صاحب نے بھیجا تھا جو ایک شعر کے ساتھ واپس کر دیا تھا کہ ریاست کی ذکات (کذا) وہ نہیں لیتے یہ شعر کا مطلب تھا. اور لوگ بھی بھیک بھیج رہے تھے. اُس نے اپنی زندگی میں تو گداگری نہ کی لیکن تو سچ پوچھو (کذا) بے پیر ہے ہیں میری خط کتابت ان سے مہر کے باعث بند ہے.

(۹)

28.8.38

برخوردار طالع مند

بعد دعا کے واضح ہو کہ تمہارا پہلا خط بھی ملا تھا اور آج دوسرا بھی مل گیا ہے۔ مندرجہ معلوم ہو کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ دیکھا تم نے یہ ٹرسٹی اپنے فائدے کے واسطے اقبال کے بچوں کے نام سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ حالانکہ اقبال نے کافی جائداد اور نقد روپیہ چالیس ہزار بچوں کے واسطے چھوڑا ہے۔ مزید اس پر کتابوں کا حق تصنیف جس کی انکم چار سو روپیہ ماہوار سے کم نہیں ہو سکتی۔ اس پر بھی اور حرص کرتے ہیں۔ یہ محض اپنے فائدے کے واسطے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ تم سر اکبر حیدری اور دیگر وزرا سے سب حال مفصل کہہ دو کہ اقبال نے بچوں کے واسطے روپیہ کافی چھوڑا ہے اور کوٹھی بھی معہ زمین ساٹھ ہزار کی چھوڑی ہے اگر محروم رکھا ہے تو مجھے اور بیوہ کو اس وقت تم کو گفتگو کا اچھا موقع ملا ہے۔ ان کو وظیفہ نہ ملنے پر تمہاری والدہ کو یقیناً (کذا) اچھا وظیفہ مل جاوے گا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ان لوگوں کی امداد کیا کرتے ہیں جن کو دوسرے بے پر چھوڑ جاتے ہیں۔ مجھے اس روز بڑی خوشی ہوگی جس روز میں سنوں گا کہ تمہارے واسطے سلسلۂ ملازمت حیدرآباد میں ہو گیا ہے اور تمہاری والدہ کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا ہے۔ تمہارے پہلے خط کا جواب میں نے لکھ دیا تھا امید کہ ملا ہوگا۔ مہربانی کر کے ایسے ڈبل کاغذ اور لفافے کا استعمال نہ کیا کرو تم ہی ایک آنہ کا ٹکٹ لگاتے ہیں (کذا) اور مجھے مزید ار زاید دینا پڑتا ہے۔ وزن خط کا ایک تولے سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر کاغذ اور لفافہ

29.8.38

برخوردار طالع مند - بعد دعا کے واضح ہو - تمہارا پہلا خط بھی ملا تھا اور
آج دوسرا بھی مل گیا ہے - مندرجہ معلوم ہو کر مجھے بڑی خوشی ہوئی - دیکھا تم نے یہ ٹرسٹی اپنے فائدے
کے واسطے اقبال کے بچوں کے نام سے بھیک مانگ رہے ہیں حالانکہ اقبال نے کافی جائداد اور
نقد روپیہ چالیس ہزار بچوں کے واسطے چھوڑا ہے - مزید اس پر کتابوں کا حق تصنیف جس کی انکم چار
سو روپیہ ماہوار سے کم نہیں ہو سکتی - اس پر بھی اور حرص کرتے ہیں یہ محض اپنے فائدے کے واسطے
ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں - تم سر اکبر حیدری اور دیگر وزرا سے سب حال مفصل کہہ دو کہ اقبال
نے بچوں کے واسطے روپیہ کافی چھوڑا ہے اور کوٹھی بھی معہ زمین ساٹھ ہزار کی چھوڑی ہے
اگر محروم رکھا ہے تو مجھے اور بیوہ کو - اس وقت تم کو گفتگو کا اچھا موقع ملا ہے - ان کو وظیفہ
نہ ملنے پر تمہاری والدہ کو یقیناً اچھا وظیفہ مل جاوے گا - اللہ تعالیٰ اسی طرح ان لوگوں کی امداد
کیا کرتے ہیں جن کو دوسرے بے پر چھوڑ جاتے ہیں - مجھے اس روز بڑی خوشی ہوگی جس روز میں سنوں گا
کہ تمہارے واسطے سلسلہ ملازمت حیدرآباد میں ہو گیا ہے اور تمہاری والدہ کا وظیفہ بھی مقرر
ہو گیا ہے - تمہارے پہلے خط کا جواب میں نے لکھ دیا تھا امید کہ ملا ہوگا - مہربانی کر کے ایسے
ڈبل کاغذ اور لفافہ کا استعمال نہ کیا کرو تم بھی ایک آنہ کا ٹکٹ لگاتے ہیں اور مجھ کو مزید
زائد دینا پڑتا ہے وزن خط کا ایک تولہ سے زیادہ ہو جاتا ہے - اگر کاغذ اور لفافہ

مہمان خانے سے مفت ملتے ہیں تاہم ٹکٹ اور جرمانہ بھی دینا پڑتا ہے۔ ٹرسٹیوں نے نواب بھوپال کی وعدہ خلافی کا ذکر کرتے ہوئے سر اکبر حیدری کو اکسایا ہے کہ اس محکمے میں آ کر وہ وظیفہ مقرر کردیں گے مگر سرمذکور بڑا جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو خوب سمجھتے ہیں وہ کسی کے چکمے میں نہیں آسکتے۔ کوشش کرو کہ ٹرسٹی ناکام رہیں۔ یہ ٹرسٹی اقبال کی خودی کو سستے دام فروخت کر رہے ہیں۔ جو کچھ اقبال نے چھوڑا ہے وہ بچوں کے واسطے کافی سے زیادہ ہے۔ البتہ خاص طاہر دین جو خزانچی ہے اس کے واسطے گنجائش کم ہے۔ میرا خیال ہے یہ اسی کے مشورے سے بھیک مانگا گیا ہے خدا اس کو غارت کرے۔ اقبال کی خودی جس کا وعظ تمام عمر وہ کرتا رہا بدنام کر رہے ہیں۔ تمہارا حیدرآباد جانا انشاء اللہ مفید ثابت ہوگا۔ میں اور تمہاری تائی تمہاری کامیابی کے واسطے اللہ تعالیٰ سے ہر روز دعا کرتے ہیں۔ وزراء سے ملاقات کے موقع پر ایسی دل پذیر گفتگو کرو کہ ان کے دل میں گھر کر جائے۔ لیڈی حیدری سے اپنی والدہ کی عمر اور جس قدر ترکہ اس کے باپ سے اسے ملا تھا معہ تمام زیورات سب اس نے تمہاری تعلیم کے واسطے خرچ کر دیا اور اب وہ بالکل نادار ہے۔ خاوند مرحوم نے بھی اس کا حق اُسے نہ دیا اور میرا تا حال روزگار کی صورت نہیں جو میں اس کی امداد کروں۔ اس قسم کی گفتگو کرو عورتوں کے دل بڑے نرم ہوتے ہیں تمہاری والدہ سے ضرور اس کو ہمدردی ہو جاوے گی۔ باقی گھر میں خدا کے فضل سے سب خیریت ہے۔ خط ضرور لکھا کرو۔ کامیابی کی تار دے کر مجھے خوشی کا موقع دینا۔

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

پہلے صدراعظم راجہ صاحب سر کشن پرشاد جو شاعر ہیں اور اب ریٹائرڈ ہیں اقبال کے بڑے دوست ہیں ان سے بھی ملاقات کرنا اگر ضرورت جانو تو

(۹)

سیالکوٹ شہر
3-9-38

برخوردار طال العمرہ (کذا)

بعد دعا کے واضح ہو خط پہنچا (کذا) حال معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ تم کو جلد صحت دیوے۔ میرے خیال میں ٹیریا بخار ہوگا جو زیادہ سے زیادہ تین چار یا ایک ہفتے تک اتر جاوے گا۔ ان دنوں کھانے میں زیادہ پرہیز چاہیے۔ میں نے اعجاز کو وہ انگریزی لفظ نقل کر دیے ہیں۔ واقعی یہ الفاظ ہتک آمیز ضرور ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اعجاز اپنا اختلافی نوٹ سر اکبر حیدری صاحب کو لکھے گا یا نہیں۔ میں نے تو اُسے مشورہ دیا ہے کہ تم وظیفہ ملنے کی حمایت کرو مگر ان الفاظ کو ناپسند کرنے کا اختلافی نوٹ بھیج دو۔ کیا تم یہ کام خود نہیں کر سکتے تھے۔ جب سر اکبر حیدری نے وہ الفاظ تم کو دکھلائے تھے تم وظیفے کی حمایت کرتے ہوئے اُن الفاظ سے اپنے باپ کی عزت کا خیال رکھ کر اس کے خلاف کہتے کہ بچے ایسی گری ہوئی حالت میں نہیں ہیں جیسی کہ ظاہر کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ جاوید زیر تعلیم ہے اور لڑکی ہوئی ہے کچھ عرصے کے واسطے ان کو سرپرستی کی ضرورت ضرور ہے لیکن جو الفاظ درخواست میں لکھے گئے ہیں میں اس میں اپنے مرحوم باپ کی بے عزتی محسوس کرتا ہوں۔ میرے خیال میں سر اکبر حیدری نے وہ درخواست تم کو محض اس واسطے دکھلائی ہوگی کہ تم اس پر اختلاف کرو۔ اب بھی موقع ہے تو اپنے باپ کی عزت کی حفاظت کرو ورنہ بچوں کے وظیفے کی حمایت کرو۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تمہاری والدہ کا وظیفہ اُن کے وظیفے سے پہلے منظور ہو جاوے تو بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ غالباً درخواست تم نے کسی نیک خیال سے کینسل کی ہوگی۔ ۔ سر

برخوردار طال عمرہ۔

سیالکوٹ شہر
3.9.38

بعد دعا کے واضح ہو۔ خط پہنچا حال معلوم ہوا۔ اللہ تم کو جلد صحت دیوے۔ میرے خیال میں تیرا
بخار ہوگا جو زیادہ سے زیادہ تین چار یا ایک ہفتہ تک اتر جائیگا۔ ان دنوں کھانے میں زیادہ پرہیز چاہیے
میں نے اعجاز کو وہ انگریزی لفظ نقل کر دیے ہیں۔ واقعی یہ الفاظ ہتک آمیز ضرور ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا
کہ اعجاز اپنا اختلافی نوٹ سر اکبر حیدری صاحب کو لکھے گا یا نہیں۔ میں نے تو اسے مشورہ دیا ہے کہ تم
وظیفہ ملنے کی حمایت کرو مگر ان الفاظ کو ناپسند کر کے اپنا اختلافی نوٹ بھیج دو۔ کیا تم یہ کام خود
نہیں کر سکتے تھے۔ جب سر اکبر حیدری نے وہ الفاظ تم کو دکھلائے تھے تم وظیفہ کی حمایت کرتے ہوئے ان
الفاظ سے اپنے باپ کی عزت کا خیال رکھ کر اس کے خلاف کہتے کہ بچے ایسی گری ہوئی حالت میں نہیں ہیں
جیسے ظاہر کی گئی ہے لیکن چونکہ جاوید زیر تعلیم ہے اور لڑکی ہوئی ہے کچھ عرصہ کے واسطے ان کو
سرپرستی کی ضرورت ضرور ہے۔ لیکن جو الفاظ درخواست میں لکھے گئے ہیں میں اس میں اپنے مرحوم باپ
کی بے عزتی محسوس کرتا ہوں۔ میرے خیال میں سر اکبر حیدری نے وہ درخواست تم کو محض اس واسطے دکھلائی
ہوگی کہ تم اس پر اختلاف کرو۔ اب بھی موقع ہے تو اپنے باپ کی عزت کی حفاظت کرو اور
بچوں کے وظیفہ کی حمایت کرو۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تمہاری والدہ کا وظیفہ ان کے وظیفہ سے
پہلے منظور ہو جاوے تو بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ غالباً درخواست تم نے کسی نیک خیال سے کینسل کی ہوگی۔

وزرا سے تو تمھاری ملاقاتیں ہو چکیں اب نظام اور ولیہد (کذا یعنی ولی عہد) اور ان کی بیگم صاحبہ سے ملاقات کے بعد اپنے واسطے فی الحال پریکٹس (کذا) کی اجازت لے کر کام شروع کر دو۔ میرے خیال میں ملازمت کا انتظام کچھ وقت ضرور لے گا لیکن اس عرصے میں غافل نہ ہونا۔ وزرا سے اور سر اکبر حیدری وغیرہ سے ملتے ملاتے رہنا اور اپنی لیاقت خداداد کا مظاہرہ کرتے رہنا۔ اپنی والدہ کے واسطے وظیفے کا بھی خیال رکھنا۔ اگر تمھارے واسطے کوئی معقول انتظام ملازمت ہو جاوے تو ایسی صورت میں وظیفہ غیر ضروری ہوگا۔ باقی سب طرح خیریت ہے۔ لاہور سے طاہر دین کا خط آیا تھا کہ میم ایک ماہ کے واسطے جا رہی ہے اپنے عزیزوں میں سے کوئی بھیج دو۔ مجھے یہ سب جھوٹ معلوم ہوا۔ وظیفہ نہ ملنے کی صورت میں میم کو غالباً جواب دے دیا ہوگا۔ جواب میں نے لکھ دیا ہے کہ یہاں سے کوئی نہیں آسکتا البتہ منیرا کو یہاں بھیج دو تو بسر و چشم وہ ہمارے پاس رہے گی۔ اگر ٹرسٹیوں کا خیال وہی ہے جو پہلے تھا اور وہ منیرا کو سیالکوٹ ہمارے پاس بھیجنا تو درکنار ان کے دلوں میں ہماری طرف سے نفرت ڈالی جاتی تھی تو اس صورت میں ہم کو کوئی شکایت بھی نہیں۔ اعجاز کی والدہ کو آرام ہے صرف چار روز بیمار رہی تمھارے حق میں ہر نماز میں دعا کرتی ہے یقیناً (کذا) تم کامیاب ہوگے انشاء اللہ تعالیٰ

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

3/9/38

سیال کوٹ شہر

3.10.38

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طالعمرہ‌ہو (کذا)

بعد دعا کے واضح ہو تمھارا خط ملا۔ مندرجہ معلوم ہوکر خوشی ہوئی۔ قبل اس کے ایک خط اور کارڈ بھی لکھا تھا پونچا (کذا) ہوگا۔ درد گردہ کے حملے سے جس قدر کمزوری ہو گئی تھی طبیعت رفتہ رفتہ اس کمی کو پورا کر رہی ہے اب مجھے کوئی شکایت نہیں۔ خدا کے فضل سے صحت اچھی ہے اور گھر میں بھی خیریت ہے۔ میرا دل تم کو دیکھنے کو بہت چاہتا ہے مجھے تم میں اقبال کی تصویر نظر آتی ہے۔ حیدرآباد سے جب تم کو حسب مرضی کامیابی ہو جاوے تو تم یہاں میرے پاس چند روز کے واسطے آکر پھر جہاں کہیں جانے کا ارادہ ہو جانا۔ تمھارے اس خط نے میری امیدوں میں اضافہ کر دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم حیدرآباد سے خوش واپس ہوگے۔ والدہ کی طرف سے تم کو اطمینان ہوگیا ہے اب تمھارا اپنا معاملہ باقی ہے وہ بھی انشاء اللہ تمھاری حسب مرضی ظہور میں آجاوے گا۔ درد گردہ کا حملہ بہت سخت تھا اور میں زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس وقت میرے دل میں حسرت تھی کہ نہ تم اور نہ اعجاز کوئی بھی میرے پاس نہ تھا سوائے امتیاز کے اس نے بیماری میں میری خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ اور مہلت دے دی ہے۔ تاکہ جوانی دیوانی کے عالم میں جو گناہ مجھ سے سرزد ہو چکے ہیں میں اس عرصے میں اس کمی کی تلافی کر لوں۔ یہ محض خدا کے فضل سے ہوا ہے ورنہ امید کم تھی۔ دواؤں کا پارسل

سیالکوٹ شہر

3.10.38

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طالعمرہ

بعد دعا کے واضح ہو۔ تمہارا خط ملا۔ مندرجہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی۔ قبل اسکے
ایک خط اور کارڈ بھی لکھا تھا پہونچا ہوگا۔ درد گردہ کے حملہ سے جس قدر کمزوری ہو گئی تھی
طبیعت رفتہ رفتہ اس کمی کو پورا کر رہی ہے۔ اب کوئی شکایت نہیں خدا کے فضل سے
صحت اچھی ہے اور گھر میں بھی خیریت ہے۔ میرا دل تم کو دیکھنے کو بہت چاہتا ہے مجھے تم میں
اقبال کی تصویر نظر آتی ہے۔ حیدرآباد سے جب تم کو حسب مرضی کامیابی ہو جاوے تو تم یہاں
میرے پاس چند روز کے واسطے آکر پھر جہاں کہیں جانے کا ارادہ ہو جانا۔ تمہارے اس خط نے
میری امیدوں میں اضافہ کر دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم حیدرآباد سے خوش واپس ہوگے
والدہ کی طرف سے تم کو اطمینان ہو گیا ہے۔ اب تمہارا اپنا معاملہ باقی ہے وہ بھی ان شاء اللہ
تمہاری حسب مرضی ظہور میں آجاویگا۔ درد گردہ کا حملہ سخت تھا اور میں زندگی
سے مایوس ہو چکا تھا اس وقت میرے دل میں حسرت تھی کہ نہ تم اور نہ اعجاز کوئی بھی میرے پاس
نہ تھا سوائے امتیاز کے اس نے بیماری میں میری خدمت کی اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ اور مہلت دی ہے
تاکہ جوانی دیوانی کے عالم میں جو گناہ مجھ سے سرزد ہو چکے ہیں میں اس عرصہ میں اس کمی کی
تلافی کر لوں۔ یہ محض خدا کے فضل سے ہوا ہے۔ ورنہ امید کم تھی۔ دواؤں کا پارسل

اعجاز نے خود وصول کر لیا تھا۔ وہ ۳۰ ستمبر کو دہلی سے بذریعہ کار سوار ہو کر یکم کو سیالکوٹ ۱۲ بجے پونچ (کذا) کر ۲ بجے اُسی روز کشمیر چلا گیا تھا۔ ۱۰ اکتوبر کو دہلی پونچے (کذا) گا۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ دہلی کی آب و ہوا اس کو اچھی موافق آگئی ہے۔ امتیاز فی الحال میرے پاس رہے گا اس کو باہر روزی کی تلاش میں جانے کے واسطے میں نے روک لیا ہے۔ حیدرآباد میں جس وقت تم کو کوئی خوش خبری ملے فورنًا (کذا) مجھے اطلاع دینا میں بے صبری سے اس کا انتظار کروں گا۔ واقعی تمہاری طرف سے خوش خبریاں اس وقت میری صحت پر اچھا اثر کریں گی۔ میری زندگی کی آسودگی اب تمہاری آسودگی اور خوش زندگی پر منحصر ہے۔ اس قدر فائدہ مجھے بہتر سے بہتر غذا سے نہیں پہونچ (کذا) سکتا جس قدر تمہارے خوش گزران سے۔ خدا جانے (کذا) چاہا تو میں تمہاری خانہ آبادی دیکھ کر اس دنیا سے رخصت ہوں گا۔ خدا نے مجھے مہلت دے دی ہے۔ اس میں بھی راز مضمر ہے۔ اپنی اولاد کی طرف سے تو میں فارغ ہو چکا تھا۔ صرف تمہاری اس خوشی میں شامل ہونا باقی تھا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری روزی کا اطمینان حسب خواہش کر دے تو یہ کام جلد سرانجام ہوگا۔ اور یہ میری کامیاب زندگی کی دلیل ہوگی۔

شیخ عطا محمد

بازار چوڑی گراں

3 10/38

اعجاز نے خود معلوم کر لیا تھا - وہ ۳۰ ستمبر کو دہلے سے بذریعہ موٹر سوار ہو کر یکم
کو سیالکوٹ ۱۲ بجے دوپہر پہونچکر ۲ بجے اوسی روز کشمیر چلا گیا تھا - ۱۰ اکتوبر
کو دہلی پہونچیگا - اوسے دیکھکر مجھے بڑی خوشی ہوئی اوسکی صحت بہت اچھی تھی دہلی کی
آب و ہوا اوسکو اچھی موافق آگئی ہے - امتیاز فی الحال میرے پاس رہیگا اوسکو باہر
روزی کی تلاش میں جانے کیواسطے میں نے روک لیا ہے - حیدرآباد میں جسوقت تمکو کوئی
خوشخبری ملے فوراً مجھے اطلاع دینا - میں بے صبری سے اوسکا انتظار کرونگا - واقعی
تمہاری طرف سے خوشخبریاں اسوقت میری صحت پر اچھا اثر کرینگی میری زندگی کی آسودگی
اب تمہاری آسودگی اور خوش زندگی پر منحصر ہے - اسقدر فائدہ مجھے بہتر سے بہتر غذا سے
نہیں پہونچ سکتا جسقدر تمہارے خوش گذران سے - خدا نے چاہا تو میں تمہاری خانہ آبادی
دیکھکر اس دنیا سے رخصت ہونگا - خدا نے مجھے مہلت دیدی ہے اسمیں بھی راز مضمر ہے
اپنی اولاد کیطرف سے تو میں فارغ ہوچکا تھا - صرف تمہاری اس خوشی میں شامل ہونا
باقی تھا - اللہ تعالےٰ تمہاری روزی کا اطمینان حسب خواہش کردے تو یہ کام جلد سرانجام ہوگا
اور یہ میری کامیاب زندگی کی دلیل ہوگی -

عطا محمد شیخ
بازار چوڑیگراں

3 10/38

(۱۱)

.برخوردار شیخ آفتاب اقبال طالعمر ہو (کذا)

بعد دعا واضح ہو۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے گھر میں سب طرح سے خیریت ہے اور میری صحت بھی آج کل اچھی ہے۔ تمہارا خط ملا۔ مندرجہ معلوم ہوا۔ یہ راز تو ابھی پردۂ اخفا میں ہے کہ ریاست کی طرف سے تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ آیا تم کو ریاست کے محکمۂ تعلیم میں کوئی پوسٹ دی جائے گی؟ یا تم کو یک مشت رقم دے کر رخصت کر دیا جاوے گا۔ اس راز کے ظاہر ہونے پر جیسی کچھ صورت ہوگی سوچا جاوے گا۔ کہ تم کو آئندہ کیا کرنا ہوگا۔
اور کس جگہ اپنا کار بار (کذا) اور ہیڈ کوارٹر رکھنا ہوگا۔ اور یہ بات اگر وظیفہ ملا تو اُس کے مقدور پر منحصر ہوگی۔ بیرسٹری کے واسطے علاوہ کھانے اور رہائش کے پوزیشن بھی اونچی رکھنی پڑتی ہے علاوہ اس کے کتابیں وغیرہ ایک منشی بھی تنخواہ دار رکھنا پڑتا ہے اس پر بھی کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد کام چلتا ہے۔ میرے خیال [سے] اگرچہ تم مجرد ہو ایسی حالت میں بھی تمہارے کھانے اور رہائش کا ماہوار خرچ اگر کفایت سے رہو تو دہلی یا کراچی (کذا) جیسے مقام میں دو ڈھائی سے کم نہ ہوگا قانونی کتابوں کی خرید کے واسطے بھی معقول رقم ہونی چاہیے۔ زمانے کی حالت پر نظر کرتے ہوئے جنگ و جدل قریب آرہا ہے۔ اگرچہ اس وقت انگریزی حکمت عملی سے وقت ٹل گیا ہے لیکن جنگ ضرور ہوگی۔ اور خطرناک ہوگی۔ اس التوا سے ہر ایک پاور پورے طور پر مسلح ہو کر نکلے گی۔ اگر یہ حال ہوا تو مقدمہ

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طالعمرہ

بعد دعا واضح ہو۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے گھر میں سب طرح سے خیریت ہے اور میری صحت بھی
آجکل اچھی ہے۔ تمہارا خط ملا مندرجہ معلوم ہوا۔ یہ راز تو ابھی پردہ اخفا میں ہے
کہ ریاست کی طرف سے تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ آیا تم کو ریاست کے محکمہ تعلیم میں کوئی پوسٹ
دیجاوے گی یا تم کو یک مشت رقم یا وظیفہ دیکر رخصت کر دیا جاویگا۔ اس راز کے ظاہر
ہونے پر جیسی کچھ صورت ہوگی سوچا جاویگا کہ تم کو آئندہ کیا کرنا ہوگا اور کس جگہ اپنا
کار بار اور ہیڈ کوارٹر رکھنا ہوگا۔ اور یہ بات اگر وظیفہ ملا تو اوسکی مقدار پر منحصر ہوگی
بیرسٹری کیواسطے علاوہ کھانے اور رہائش کے پوزیشن بھی اونچی رکھنی پڑتی ہے علاوہ اسکے کتابیں
وغیرہ ایک منشی بھی تنخواہ دار رکھنا پڑتا ہے۔ اس پر بھی کچھ عرصہ کام کرنیکے بعد کام چلتا ہے۔ میرے
خیال اگرچہ تم مجرد ہو ایسی حالت میں بھی تمہارے کھانے اور رہائش کا ماہوار خرچ اگر کفایت سے
رہو تو دہلی یا کراچی جیسے مقام میں دو ڈھائی سو سے کم نہ ہوگا۔ قانونی کتابوں کی خرید کیواسطے بھی
معقول رقم ہونی چاہیے۔ زمانہ کی حالت پر نظر کرتے ہوئے جنگ و جدل قریب آرہا ہے اگرچہ
اسوقت انگریزی حکمت عملی سے وقت ٹل گیا ہے لیکن جنگ ضرور ہوگی اور خطرناک ہوگی
اس التوا سے ہر ایک پاور پورے طور سے مسلح ہو کر نکلے گی۔ اگر یہ حال ہوا تو مقدمہ

بازی بھی رک جاوے گی۔ لہذا قانونی پیشہ کا خیال امن کی صورت میں مفید ہوتا ہے۔ کم سے کم اگر یورپ میں جنگ چھڑ گئی تو میرے خیال میں چونکہ یہ جنگ ہوائی ہوگی ختم بھی جلد ہوگی مگر سلسلہ ایسا درہم برہم ہو جاوے گا کہ اس کو اصلی حالت پر لانے کے واسطے بھی وقت درکار ہوگا اگر جنگ ہوئی تو زیادہ سے زیادہ دو سال کے اندر ہوگی۔ لہذا تم کو دو سال تک بیرسٹری کے خیال کو پوسٹ پونڈ رکھنا ہوگا۔ مجھے ہندستان کی صورت حالات بھی اچھی نظر نہیں آتی۔ انگریز نے اپنے فائدے کے واسطے ہندو اور مسلم میں جو نفاق کا بیج بویا تھا اس کا نتیجہ انگریز کے حق میں اب خراب ہوگا۔ بہرحال اس وقت تمھاری آئندہ زندگی کے واسطے کچھ کہا نہیں جاتا۔ تاوقتیکہ ریاست کی طرف سے جو سلوک تم سے ہونے والا ہے وہ ظاہر نہ ہو۔ میں نے جو خواب دیکھا ہوا ہے اس سے تو میرے خیال سے تمہارے ساتھ ریاست کا سلوک اس قسم کا ہوگا جس کی توقع نہ تھی۔ گویا آفتاب ہمیشہ مشرق سے نکلتا ہے لیکن اگر مغرب سے نکلے تو یہ بات کس قدر عجیب ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے تمہارے خط کا انتظار رہتا ہے۔ قبل اس کے بھی ایک خط لکھا تھا جو تم کو اپنا خط ڈاک میں ڈالنے کے بعد ملا ہوگا۔ میں خدا سے تمہاری بہتری اور خوش حالی کے واسطے اکثر دعا کرتا ہوں۔

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

بازار چوڑی گراں

اقبال منزل

سیالکوٹ شہر
13.3.39

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہ (کذا)

بعد دعا واضح ہو۔ تمہارا خط مع جملہ حالات مفصل معلوم ہوئے۔ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت کرے اور تمہاری تنگی کے دن فراخی سے بدل جاویں اب مجھ سوائے کمزوری کے اور کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں غالباً دو ماہ بیمار رہا۔ حالت نازک ہو گئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل کر دیا۔ تمہارے حالات معلوم ہو کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ شاید ابھی کچھ گردش باقی ہو گی۔ صبر کیے جاؤ صبر کا اجر اچھا ملے گا۔ مرزا جلال الدین کے ذریعے اُن سے گفتگو جاری رکھو تا وقتیکہ وہ صاف جواب نہ دیویں۔ ذرہ (کذا) نرمی سے کام لے کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہیے۔ اگر اس پر بھی کام نہ نکلا تو پھر آخیری علاج دعویٰ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کوئی سبیل دعوے کے اخراجات کے واسطے بھی پیدا کر دے گا۔ دعوے کے واسطے میعاد کافی باقی ہے میں نے تو عرصے سے ان لوگوں سے خط و کتابت چھوڑ رکھی ہے۔ مجھے جاوید کے عنوان اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ جن بچوں کے سر پر کسی ایسے بزرگ کا سایہ نہ ہو جس کا رعب اُن پر ہو وہ بچے ہمیشہ آوارہ ہو جایا کرتے ہیں۔ میں تو شاید اس وقت زندہ نہ ہوں گا مگر تم دیکھو گے کہ میرا قیافہ کس قدر درست نکلا۔ تم کو جب فراغت ہو تو

سیالکوٹ
13-3-39

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہ

"بعد دعا واضح ہو - تمہارا خط مع جملہ حالات مفصل معلوم ہوئے - اللہ تعالیٰ تم پر رحمت کرے اور تمہاری تنگی کے
دن فراخی سے بدل جاویں - اب مجھ کو سوائے کمزوری کے اور کوئی شکایت نہیں ہے - میں غالباً دو ماہ بیمار رہا
حالت نازک ہو گئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل کر دیا - تمہارے حالات معلوم ہو کر مجھے بڑا افسوس ہوا شاید ابھی کچھ گردش
باقی ہو گی صبر کیے جاؤ صبر کا اجر اچھا ملے گا - مرزا جلال الدین کے ذریعہ ان سے گفتگو جاری رکھو تا وقتیکہ وہ
صاف جواب نہ دیویں - ذرہ نرمی سے کام لیکر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہیے - اگر اس پر بھی کام نہ نکلا تو پھر
آخیری علاج دعویٰ ہو سکتا ہے - اللہ تعالیٰ کوئی سبیل دعویٰ کے اخراجات کے واسطے بھی پیدا کر دیگا - دعویٰ کے واسطے
میعاد کافی باقی ہے - میں نے تو عرصہ سے ان لوگوں سے خط و کتابت چھوڑ رکھی ہے - مجھے جاوید کے عنوان اچھے معلوم
نہیں ہوتے جن بچوں کے سر پر کسی ایسے بزرگ کا سایہ نہ ہو جس کا رعب ان پر ہو وہ بچے ہمیشہ آوارہ ہو جایا کرتے ہیں
میں تو شاید اس وقت زندہ نہ ہوں گا مگر تم دیکھو گے کہ میرا قیافہ کس قدر درست نکلا - تم کو جب فراغت ہو تو

ایک دو یوم کے واسطے میرے پاس
آجانا۔ مہاراجہ گوالیار کے پرایویٹ اسٹاف میں بھی کوئی ایسی پوسٹ نہ تھی جس سے فی الحال تمہارا گزارہ ہو جاتا۔ میرے خیال میں تم نے مہاراجہ صاحب سے اس قسم کی گفتگو نہ کی ہوگی۔ اگر کرتے تو وہ اپنے پرایویٹ میں تم کو رکھ لیتے۔ راجوں مہاراجوں سے خوشامد برامد (کذا) سے کام نکلا کرتا ہے اور وزیر اعظم کو بھی ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔ خوشامد سے بڑے بڑے مقصد حل ہو جاتے ہیں۔ وقت کا خیال رکھ کر جو صورت ہو اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ میرا ارادہ اگست ستمبر بٹوٹ پہاڑ پر جانے کا ہے۔ اگر سفر کی ہمت ہوئی تو۔ لاری کا سفر کسی قدر تکلیف دہ ہو جاتا ہے کمزور آدمی برداشت نہیں کرسکتا۔

اپنی خیریت اور حالات سے اطلاع دیا کرو۔ میں تمہارے واسطے دعا کرتا ہوں۔ اور اپنی تھوڑی سی زندگی میں تم کو خوش حال دیکھ کر اگر دنیا چھوڑوں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ گھر میں خدا کے فضل سے سب طرح خیریت ہے اور سب تمہارے واسطے دعا کرتے ہیں۔

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

(۱۴)

سیال کوٹ

4.5.39

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہ (کذا)

بعد دعا واضح ہو تمھارا خط پونچا (کذا) حال معلوم ہوا۔ تمھاری والدہ کا حق بقایا مہر لینے کا ہے۔ میرے خیال میں تمھارے والد نے جو ڈھائی ہزار نقد اپنے کفن دفن کے واسطے علیحدہ منشی طاہر دین کو دیا تھا ان میں ایک ہزار بقایا مہر کا بھی شامل تھا۔ گو انھوں نے طاہر دین کو اس کے واسطے خلاصہ طور پہ ہدایت نہ کی ہو۔ لیکن یہ بھی دیکھنا ہے کہ کفن دفن میں ڈھائی ہزار خرچ ہوا تھا یا کوئی خاص ہدایت خرچ کی تھی۔ تمھارے والد کی نیت نصف مہر دینے کی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے طاہر دین کی زبانی دریافت بھی کرایا تھا کہ بقایا مہر بھی لے لو لیکن تمھاری والدہ نے لینے سے انکار کیا تھا۔ جب کہ ان کی نیت اس قدر نیک تھی کہ وہ بقایا نصف بھی دینے کو تیار تھے تو یہ ناممکن ہے کہ ڈھائی ہزار میں بقایا مہر شامل نہ تھا۔ افسوس یہی کہ تمھاری والدہ عدالت کے ذریعے بقایا مہر وصول کرنے سے مجبور ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ چاہے تو بخش بھی سکتی ہے۔ اگر تم سب بقایا مہر دینے سے حجت کرتے ہیں تو اس کا گناہ ان کے آگے آوے گا۔ قدرت ان سے بدلے لے گی کہ انھوں نے ایک حق دار کا حق ادائی کرنے میں تغلب کیا۔ اعجاز کو تو پورا پورا یقین تھا کہ اگر تم بذریعہ عدالت چارہ جوئی کرو تو ڈگری ضرور مل جاوے گی۔ خیر اب جب کہ تم نے اس خیال سے کنارہ کشی کر کے اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا ہے تو انتظار کرنا چاہیے وہ خود انصاف کرے گا۔ تم کو اس کا بدلہ کسی طرح مل جائے گا۔ یہ ایک شریفانہ خیال ہے اور میں اس کو پسند کر کے تمھاری تعریف کروں گا کہ تم نے باپ کی عزت اور حرمت کی۔

محمد شفیع

4.5.39

برخوردار شیخ آفتاب اقبال مکرم

[illegible]

نگاہ میں رکھا۔ جاوید فیل ہو گیا ہے دسویں میں داخل نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وہ علم سے کورا ہی رہے گا اس کو شوق نہیں ہے۔ اس کے خیالات ابھی سے بدل رہے ہیں۔ طالب علم کو غربت کا خیال علم کا شوق دلا کر اوپر لے جاتا ہے۔ دولت والے کا لڑکا یا جس کا باپ اولاد کے واسطے کافی سرمایہ چھوڑ جاوے وہ کبھی اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے وہ تو بدنام کنندۂ نکو نامے چند کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ تم خدا پر توکل رکھا کرو خدا تمھارے واسطے کوئی صورت نیک پیدا کر دے گا۔ مصائب کا حوصلے سے مقابلہ کرنے والا آخر کامیاب ہوا کرتا ہے۔ میری صحت آج کل بہت اچھی ہے اور اعجاز کی والدہ کی صحت بھی خدا کے فضل سے اچھی ہے۔ تمھاری طرف اس کا بڑا خیال رہتا ہے وہ تمھارے واسطے ہر نماز کے بعد دعا کرتی ہے (امتیاز کو فریدہ کے خط آتے ہیں اس کو /17 یومیہ اجرت ملتی ہے ایک سال بعد /20 روزانہ ملا کریں گے۔ یہ بھی بہت اچھا اُس کے واسطے ہو گیا ہے۔ واقعی گرمی شروع ہو گئی ہے۔ ممکن ہوا تو میں جولائی میں مقام بوٹ تین ماہ کے واسطے چلا جاؤں گا۔ لاہور آنے کا بہت دفعہ ارادہ ہوا۔ لیکن میرا دل نہیں چاہتا کس کے پاس جاؤں جس سے مجھے پیار تھا وہ اب وہاں نہیں۔ کبھی فرصت ملے تو آ کر مل جانا میرا بڑا دل چاہتا ہے۔ اللہ تم کو وافر رزق دیوے آمین

شیخ عطا محمد سیالکوٹ

تمھارے باپ کا شعر ہے انسانی زندگی کے واسطے: پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست

گفتا مے کہ تلخ تر است او نکو تر است

ترجمہ یہ ہے کہ میں نے کسی نیک آدمی سے زندگی کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا پرانی شراب اگرچہ کڑوی ہوتی ہے لیکن اچھی ہوتی ہے جدوجہد کی زندگی کا نام زندگی ہے ورنہ موت ہے۔

سیال کوٹ

9-5-39

آفتاب اقبال طال عمرہ (کذا)

بعد دعا واضح ہو۔ قبل اس کے ایک خط لکھا تھا پونچا (کذا) ہوگا۔ آج اعجاز کا خط مجھے ملا۔ وہ لکھتا ہے کہ ٹرسٹی ایک ہزار مہر اس شرط پر دیتے ہیں کہ آیندہ کوئی مقدمہ بازی جائداد کے متعلق نہ ہو۔ تم خود قانون داں ہو۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے تم کو تمہارا حق نہ دینے کے واسطے قانونی کارروائی گو بہت کی ہوگی ہے اگر اس میں کچھ نقص ہے تو یہ لوگ تمہاری ناداری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور تم سے دست برداری مانگتے ہیں۔ گویا اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ تم کیا ہمیشہ نادار رہوگے؟ اگر تم کو حق پونچتا (کذا) ہے تو جب تمہارے پاس روپیہ ہوگا بذریعہ عدالت لوگے۔ لیکن میری رائے میں تو "سارا جاتا دیکھیے آدھا دیجے بانٹ" فیصلہ کرلو۔ صاف ان سے کہہ دو کہ قانوناً میرا حق ہے۔ اگرچہ اس وقت میرے پاس دعوے کی ہمت نہیں ہے لیکن جب مجھے خدا دے گا دعویٰ کرکے لوں گا۔ اس وقت آپ میری ناداری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مجھے میری والدہ کا مہر نہ دیویں۔ خدا سب کا داتا ہے اگر میرا حق قانون کے یا شریعت کی رو سے ہے اللہ تعالیٰ خود مجھ کو دلانے کا انتظام کر دے گا۔ البتہ اگر از رو سے قانون تم کو سوائے مہر اور کچھ نہیں پونچتا (کذا) یا مقدمہ بازی سے یقیناً (کذا) خطرہ ہے

بسیالکوٹ
9-5-39

برخوردار شیخ آفتاب اقبال طال عمرہ

بعد دعا واضح ہو — قبل اسکے ایک خط لکھ چکا ہوں پہنچا ہوگا — آج اعجاز کا خط ملا ہے وہ لکھتا
کہ ٹرسٹی ایک ہزار مہر اس شرط پر دیتے ہیں کہ آیندہ کوئی مقدمہ بازی جائیداد کے متعلق نہ ہو — تم خود
قانون داں ہو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے تم کو تمہارا حق نہ دینے کے واسطے قانونی کارروائی گو بہت کی ہوگی
اگر اس میں کچھ نقص ہے تو یہ لوگ تمہاری ناداری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں — اور
تم سے دست برداری مانگتے ہیں — گویا اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں — تم کیا ہمیشہ نادار رہوگے
اگر تم کو حق پہنچتا ہے تو جب تمہارے پاس روپیہ ہوگا بذریعہ عدالت لوگے — لیکن میری رائے میں تو
سارا جاتا دیکھیے آدھا دیجے بانٹ — فیصلہ کرلو — صاف ان سے کہہ دو کہ قانوناً میرا حق ہے
اگرچہ اس وقت میرے پاس دعوے کی ہمت نہیں ہے لیکن جب مجھے خدا دیگا دعویٰ کرکے لونگا — اس وقت
آپ میری ناداری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مجھے میری والدہ کا مہر نہ دیویں — خدا سب کا داتا ہے
اگر میرا حق قانون کے یا شریعت کے رو سے ہے تو اللہ تعالیٰ خود مجھکو دلوانے کا انتظام کر دیگا —
البتہ اگر از روئے قانون تمکو سوائے مہر اور کچھ نہیں پہنچتا یا مقدمہ بازی سے یقیناً خطرہ ہے

تو ایسی صورت میں جو ملے وہ لے لو۔ اور انصاف خدا پر چھوڑ دو۔ یقین ہے کہ مقدمہ بازی سے تم کامیاب ہو گے پیش ہوئی تھی۔ اگر تم کو یقین ہے کہ مقدمہ بازی سے تم کامیاب ہو گے تو خاموش رہو۔ جب تمھارے پاس روپیہ ہوگا دعویٰ کر دینا البتہ اگر امید کم ہے تو بے فائدہ روپیہ کا کر ضائع نہ کرو مقدمہ بازی اچھی نہیں نامعلوم فیصلہ کیا ہو مہر کا معاملہ تو یقینی ہے اس کی ڈگری فوراً (کذا) مل سکتی ہے۔ آئندہ تم بھی عقل رکھتے اور قانون داں بھی ہو جس طرح مناسب جانو کرو۔ جب فرصت ملے تو دو چار روز کے واسطے آکر مل جاؤ میرا دل تم کو ملنے چاہتا ہے۔

شیخ عطا محمد سیال کوٹ

مکرر آنکہ تمھارا منشا کیا ہے؟ روپیہ پیدا کر کے مقدمہ لڑنے کا ہے یا نہیں۔ تمھارے خط سے جو تم نے مجھے لکھا تھا مجھے تعجب ہوا تھا کہ تم مہر کی رقم کا فیصلہ بھی خدا پر چھوڑتے ہو۔ یہ تو تمھاری ماں کا حق ہے۔ اگر مقدمہ لڑنا ہے تو فی الحال خاموشی بہتر ہے۔ تم ہمیشہ نادار نہ رہو گے۔ آخر خدا تم کو دے گا اور بہت دے گا اس وقت حوصلے سے مقدمہ لڑ لینا۔

(۱۵)

بٹوٹ

25.6.39

برخوردار طالعمرہو (کذا)

بعد دعا واضح ہو: کل ایک خط معہ دو خطوں کے روانہ کیا تھا پونچا (کذا) ہوگا جو خط چوہدری (کذا) خوشی محمد صاحب کا بنام نواب مظفر خاں صاحب ہے وہ اول جعفری صاحب کو جو لاہور میں قزل باش فیملی کے وزیر کرتا دھرتا ہیں مل کر دکھلانا اور ان سے کہہ دینا کہ چوہدری (کذا) صاحب کی ہدایت تھی کہ یہ خط اوّل آپ کو دکھلا کر بعد میں نواب مظفر خاں صاحب کو دوں۔ اگر وہ لاہور میں ہوں یا لاہور سے باہر ہوں ان کے نام ڈاک میں پوسٹ کر دوں۔ یہ سب کچھ اس واسطے ہے کہ نواب مظفر خاں صاحب اور نواب نثار علی خاں صاحب قزل باش کا باہم گہرہ (کذا) دوستانہ ہے اور نواب نثار علی قزل باش انجمن اسلامیہ کے پورانے (کذا) سرپرست ہیں۔ انجمن کو ان کا کہنا قبول کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہر دو نواب تمہارے حق میں ہوگئے اور ملک صاحب نے بھی امداد کی تو فیصلہ تمہارے حق میں یقینی ہوگا۔ تھوڑی تکلیف اٹھا کر جعفری صاحب کا پتہ معلوم کرکے اوّل اُسے مل کر خط دکھلا دو اور بعد ازاں چوہدری (کذا) صاحب کا خط نواب مظفر خاں صاحب کے نام پوسٹ کر دو

بٹوٹ

25-6-39

برخوردار طالعمرہ

بعد دعا واضح ہو - کل ایک خط معہ دو خطوں کے روانہ کیا تھا پونچا ہوگا - جو خط

چوہدری خوشی محمد صاحب کا بنام نواب مظفر خانصاحب ہے وہ اول جعفری صاحب کو جو لاہور میں

قزل باش فیملی کے وزیر کرتا دھرتا ہیں ملکر دکھلانا اور ان سے کہدینا کہ چوہدری صاحب کی

ہدایت تھی کہ یہ خط اول آپکو دکھلاکر بعد میں نواب مظفر خانصاحب کو دوں اگر وہ لاہور میں

ہوں یا لاہور سے باہر ہوں ان کے نام ڈاک میں پوسٹ کردوں - یہ سب کچھ اس واسطے

ہے کہ نواب مظفر خاں اور نواب نثار علی خانصاحب قزلباش کا باہم گہرہ دوستانہ ہے اور نواب

نثار علی قزلباش انجمن اسلامیہ کے پورانے سرپرست ہیں انجمن کو ان کا کہنا قبول

کرنا پڑتا ہے اگر ہردو نواب تمہارے حق میں ہوگئے اور ملک صاحب نے بھی امداد کی تو فیصلہ

تمہارے حق میں یقینی ہوگا - تہوڑی تکلیف اٹھاکر جعفری صاحب کا پتہ معلوم کرکے اول انسے

ملکر خط دکھلادو اور بعد ازاں چوہدری صاحب کا خط نواب مظفر خانصاحب کے نام پوسٹ کردو

خواہ وہ لاہور میں ہوں یا لاہور سے باہر۔ جس جگہ ہوں ان کا ایڈرس معلوم کرلو۔ البتہ اگر تم پرسنلی اُن سے ملاقات کرنا چاہو تو اگر وہ لاہور میں ہوں خود جاکر خط ان کو دے دو۔ جس طرح تم پسند کرو ویسے کرو۔ میرا خیال ہے کہ نواب مظفر خاں صاحب شملہ ہوں گے یا کسی اور سرد جگہ پر گئے ہوں گے۔ قدرتی طور پر ایسا اتفاق ہوگیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ قدرت تمہارے حق میں ہے سامان اچھا پیدا ہوگیا ہے۔ اس سے بہتر اور کوئی نہیں تھا۔ آئندہ خدا کے اختیار میں ہے۔ انسانی کوشش یہاں تک کافی ہے۔ اس میں توقف اور سستی نہ ہونی چاہیے ایسا نہ ہو کہ تم سے اوّل وہ کسی دوسرے سے وعدہ کر چکے ہوں لہٰذا تم کو اس میں جلدی سے کام لے کر جس طرح میں نے لکھا ہے کرو اور اطمینان سے انتظار کرو۔ معلوم نہیں کالج کمیٹی کب ہوگی اور جنرل کمیٹی میں پروپوزل کب تک جاوے گا۔ باقی خیریت ہے۔

شیخ عطا محمد از بوٹ

جس انجمن کی خدمت برادر مرحوم نے جوانی کے عالم سے لیکر تا بمرگ کی ہو اس انجمن کو لازم ہے کہ مرحوم کی خدمات کو یاد رکھنے کے لیے ان کی اولاد میں سے آفتاب اقبال ان کے بڑے اور لایق لڑکے کو کالج میں جگہ دے کر اُن کے نام (اقبال) کو ہمیشہ زندہ رکھے تاکہ آئندہ نسلوں کے دلوں میں بھی مرحوم اقبال زندہ رہے۔ میں دو چار دیگر ممبروں کو بھی خط لکھوں گا۔

شیخ عطا محمد

خواہ وہ لاہور میں ہوں یا لاہور سے باہر جس جگہ ہوں ان کا ایڈریس معلوم کرلو۔ البتہ اگر تم پرسنلی ان سے ملاقات کرنا چاہو تو اگر وہ لاہور میں ہوں خود جاکر خط ان کو دیدو۔ جس طرح تم پسند کرو ویسے کرو۔ میرا خیال ہے کہ نواب مظفر خان صاحب شملہ ہوں گے یا کسی اور سرد جگہ پر گئے ہوں گے۔ قدرتی طور پر ایسا اتفاق ہو گیا ہے مجھ کو امید ہے کہ قدرت تمہارے حق میں سامان اچھا پیدا ہو گیا ہے اس سے بہتر اور کوئی نہیں تھا آئندہ خدا کے اختیار میں ہے انسانی کوشش یہاں تک کافی ہے۔ اس میں توقف اور سستی نہ ہونی چاہیے ایسا نہ ہو کہ تم سے اول کسی دوسرے سے وعدہ کر چکے ہوں لہذا تم کو اس میں جلدی سے کام لیکر جس طرح میں نے لکھا ہے کرو اور اطمینان سے انتظار کرو۔ معلوم نہیں کالج کمیٹی کب ہوگی اور جنرل کمیٹی میں پروپوزل کب تک جاویگا۔ باقی خیریت ہے۔

شیخ عطا محمد از بوٹ

جس انجمن کی خدمت برادر مرحوم نے جوانی کے عالم سے لیکر تا بمرگ کی ہو اس انجمن کو لازم ہے کہ مرحوم کی خدمات کو یاد رکھنے کے لئے ان کی اولاد میں سے آفتاب اقبال ان کے بڑے اور لایق لڑکے کو کالج میں جگہ دیکر ان کے نام (اقبال) کو ہمیشہ زندہ رکھیں تاکہ آئندہ نسلوں کے دلوں میں مرحوم اقبال زندہ رہے۔ میں دو چار دیگر ممبروں کو بھی خط لکھوں گا۔

عطا محمد

سید محمد امین حسینی [مفتی فلسطین] بنام فرزند متوفی آفتاب اقبال

بسم الله الرحمن الرحيم

حضرة السيد الفاضل المحترم آفتاب اقبال حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته . اما بعد فقد بلغني وانا مقيم في جونيه — بيروت (لبنان) وبعيد عن فلسطين ، النبأ العظيم ، والمصاب الكبير الذي فجعت به الباكستان وجميع الشعوب الاسلامية بالدهشة والالم في مشارق الارض ومغاربها ، الا وهو وفاة والدكم العظيم الاخ العزيز الحميم السيد محمد اقبال رحمه الله وطيب ثراه وجعل الجنة مثواه . فكان لذلك النبأ الاليم الوقع الشديد في نفسي وآلمني اشد الالم نظراً للصداقة الوثيقة التي كانت تربط بين المرحوم والدكم العظيم وبيني منذ انعقاد المؤتمر الاسلامي العام ببيت المقدس ، ذلك المؤتمر الخطير الذي كان الفقيد الغالي وكيلاً له وعضواً ممثلاً للهند في لجنته التنفيذية ، وعاملاً من اكبر عوامل نجاحه ، كما كان رحمه الله احد اركان النهضة الاسلامية الحديثة بالهند وشاعرها الاكبر الذي يحق لنا ان نفاخر به امم الارض شرقاً وغرباً .

واني باسمي وباسم اللجنة التنفيذية للمؤتمر الاسلامي العام اقدم لحضرتكم وللاسرة الفقيد الكريم خالص التعزية بهذا المصاب الكبير الذي يشارككم فيه اخوانكم من مسلمي فلسطين والعالم الاسلامي كله واسأل الله سبحانه وتعالى ان يتغمد الفقيد الكريم برحمته ورضوانه ويغدق على قبره شآبيب غفرانه ويجعل مثواه الجنة التي وعدها الله عباده المتقين وان يعوضكم والعالم الاسلامي عن فقده خير عوض ، ويلهمكم الصبر الجميل في هذا الخطب الجليل . ولا حول ولا قوة الا بالله العلي العظيم . وانا لله وانا اليه راجعون . والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته .

جونيه – بيروت [illegible] ربيع الاول ١٣٥٧

محمد امين الحسيني

مفتي القدس ورئيس اللجنة التنفيذية للمؤتمر الاسلامي العام

د

اردو ترجمانی مکتوب تعزیت بر وفات علامہ اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت جناب فاضل محترم آقا اقبال حفظہ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بعد ازاں

میں یہاں فلسطین سے دور جونیہ، بیروت (لبنان) میں مقیم ہوں کہ مجھے اس حادثۂ عظیم اور مصیبتِ کبریٰ کی اطلاع ہوئی جو افق تا افق چھا گئی اور جس نے شرقاً و غرباً تمام مسلمانوں کے دلوں کو رنج والم میں غرق کر دیا۔ ہاں یہ آپ کے والد بزرگوار اور میرے عزیز و مخلص جناب محمد اقبال رحمۃ اللہ کی خبرِ وفات ہے۔ اللہ ان کی خاک کو پاکیزہ کرے اور جنت کو ان کا مقام قرار دے۔ چنانچہ دوستی کے اس مضبوط رشتے کی بنا پر جو بیت المقدس کی مؤتمر اسلامی عام کے انعقاد کے ذریعہ آپ کے والد بزرگوار کو اور مجھے ایک ساتھ باندھے ہوئے تھا میرا دل سخت متاثر ہوا اور مجھے اس سے شدید اذیت ہوئی۔

اس عظیم مؤتمر (کانفرنس) کے مرحوم ایک اہم عہدے دار یعنی نائب صدر، اس میں ہندستان کے نمائندے اور اس کی مجلسِ عاملہ کے رکن اور اس کی کامیابی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب تھے بالکل ایسے ہی جیسے کہ مرحوم ہندوستان کی اسلامی نشأۃ ثانیہ کے ارکان میں سے ایک رکن اور اس کے ایک عظیم شاعر تھے۔ وہ بجا طور پر اس کے مستحق ہیں کہ اردن کی قومیتیں اور ملتیں ان پر فخر کریں۔

میں اپنی جانب سے اور اسلامی مؤتمر عام کی مجلسِ عاملہ کی جانب سے آپ کی خدمت میں اور محترم مرحوم کے خاندان کی خدمت میں اس مصیبتِ عظمیٰ پر جس میں آپ کے بھائی مسلمانانِ فلسطین اور سارا عالم اسلام برابر کا شریک ہے پر خلوص تعزیت پیش کرتا ہوں۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ محترم مرحوم کو اپنی رضا ورحمت سے ڈھانپ، ان کی قبر کو بارانِ مغفرت میں چھپالے اور اس جنت کو ان کا مقام بنا دے جس کا اس نے اپنے متقی بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے۔ اور آپ کو اور سارے عالم اسلام کو اس زیاں کا نعم البدل عنایت کرے اور اس حادثۂ عظیم پر آپ کو صبرِ جمیل ارزانی فرمائے۔

ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم   وانا للہ وانا الیہ راجعون

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جونیہ بیروت ۳ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ

دستخط: محمد امین حسینی

مفتی قدس وصدر مجلس عاملہ مؤتمر اسلامی عام

شیخ عبدالقادر بنام آفتاب اقبال

C/o India Office
Whitehall, S.W.1
London
5-5-38

Dear Aftab Iqbal,

The sad news of the death of your father came as a personal shock to me, as we were such old & intimate friends. I have been receiving letters from some people sympathising with me in this national loss. I was asked by the B.B.C. to give a short broadcast about him for countries overseas & I did so on the 28th inst. We are now going to have a meeting in his memory on the 14th instant. I have been thinking of writing to you these days to express my sympathy with you. Pray accept my deep condolence. In spite of the regrettable estrangement that existed between the deceased & yourself, I know what admiration you, as his intellectual heir, had for his poetical genius & this sad event must have been felt by you profoundly. I see from the Lahore papers that

2

tributes were paid to him from all classes & communities & that his funeral was followed by thousands of grief-stricken friends & admirers. When I was in Lahore & people were celebrating the Iqbal Day, nobody had any idea that he would leave us so soon. His is an irreparable loss. May his soul rest in peace & may the bereaved family be given strength to bear this bereavement.

With kind regards,

Yours sincerely
Abdul Qadir

C/o India Office
White Hall, S.W.-1
London
5.5.38

Dear Aftab Iqbal,

The sad news of the death of your father came as a persona shock to me, as we were such old and intimate friends. I have been receiving letters from some people sympathizing with me in this national loss. I was asked by the B.B.C. to give a short broadcast about him for countries overseas. I did so on the 28th inst. We are now going to have a meeting in his memory on the 14th instant. I have been thinking of writing to you these days to express my sympathy with you. Pray accept my deep condolence. Inspite of the regrettable estrangement that existed between the deceased & yourself, I know what admiration you, as his intellectual heir, had for his poetical genius and this sad event must have been felt by you profoundly.

I see from the Lahore papers that tributes were paid to him from all classes and communities & that his funeral was followed by thousands of grief-stricken friends and admirers. When I was in Lahore and people were celebrating the Iqbal Day, nobody had any idea that he would leave us so soon. It is an irreparable loss. May his soul rest in peace & may the bereaved family be given strength to bear this bereavement.

With kind regards,

Yours sincerely,

Abdul Qadir

انگریزی مکتوب کا اُردو ترجمہ

بتوسط انڈیا آفس
وہائٹ ہال۔ ایس ڈبلیو۔۱
لندن

۵/۵/ ۱۹۳۸ء

عزیزہ آفتاب اقبال

تمہارے والد کے انتقال کی خبر ایک ذاتی صدمے کے طور پر مجھے ملی۔ اس لیے کہ ہم دونوں پرانے اور گہرے دوست تھے۔ مجھے مختلف لوگوں کی جانب سے تعزیتی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ جن میں مجھ سے اس قومی نقصان پر اظہارِ ہمدردی کیا گیا ہے۔ بی بی سی والوں نے بھی سمندر پار کے ممالک کے لیے مرحوم کے بارے میں ایک براڈکاسٹ کی خواہش کی تھی۔ جو مقررہ ۲۸ر تاریخ کو نشر ہوئی۔ اب ہم لوگ ان کی یاد میں اسی ۱۴ کو ایک جلسہ منعقد کر رہے ہیں۔ میں اس دوران تمھیں تعزیتی خط لکھنے کے بارے میں سوچتا رہا تاکہ اپنی ہمدردیاں تم تک پہنچا سکوں۔ ملتمس ہوں کہ میرے دلی جذبات تعزیت قبول کرو۔ اس تمام دوری کے باوجود جو تمھارے اور مرحوم کے درمیان تھی، میں واقف ہوں کہ ان کے ذہنی وارث کی حیثیت سے تم ان کی شاعرانہ عظمت کے کیسے قدر دان ہو اور اس اندوہناک واقعے کو تم نے کتنی گہرائی کے ساتھ محسوس کیا ہوگا۔

مجھے لاہور کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ تمام طبقوں اور ملتوں کی جانب سے ان کو گلہائے عقیدت پیش کیے گئے اور ہزاروں غم زدہ دوستوں اور عقیدت مندوں نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔

(گزشتہ دنوں) جب میں لاہور میں تھا اور لوگ یوم اقبال منا رہے تھے تو کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلد ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو آسودگی بخشے اور غم کے مارے پس ماندگان کو اس حادثے کے برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔

پُرمحبت احترام کے ساتھ
تمہارا مخلص
عبدالقادر

آفتاب اقبال سے عرشی زادہ کا تحریری انٹرویو

۲۳ اپریل ۱۹۷۸ء کو جوابات تحریر کیے گئے

عرشی : اگر آپ کے پاس آپ کی والدہ کی جوانی کی کوئی تصویر ہو تو عنایت فرمائیں۔

آفتاب : افسوس ہے کہ میرے پاس والدۂ مرحومہ کی جوانی کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ کچھ تصویریں تھیں جو سیالکوٹ میں رہ گئیں۔ اتنے سالوں کے بعد ان کا ملنا ناممکن ہے۔

عرشی : آپ کی ہمشیرہ کی تاریخ ہائے پیدائش و وفات کیا ہیں ؟

آفتاب : میری بڑی ہمشیرہ معراج بیگم کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۵ء ہے۔

عرشی : آپ کی والدہ آپ کے والد سے کتنے سال بڑی تھیں ؟

آفتاب : یہ بات غلط ہے کہ میری والدہ صاحبہ عمر میں علامہ صاحب یعنی میرے ابا جان سے بڑی تھیں۔ بلکہ ایک سال چھوٹی تھیں۔

عرشی : آپ کے والد کی پہلی شادی کی تاریخ کیا ہے ؟

آفتاب : علامہ مرحوم کی پہلی شادی کی تاریخ ۴ مئی ۱۸۹۳ء ہے۔ نکاح نامے کی ایک نقل فوٹو سٹیٹ کاپی ارسال کر رہا ہوں۔ اس پر مولوی میر حسن [جو علامہ صاحب کے استاد تھے اور جنھیں علامہ صاحب نے شمس العلماء کا خطاب دلوایا تھا] کے دستخط بھی ہیں۔

عرشی : آپ کی اپنی تاریخِ ولادت کیا ہے ؟

آفتاب : میری صحیح تاریخ ولادت ۲۳ جون ۱۸۹۳ء ہے لیکن میرے سرٹیفکیٹ پر غلطی سے ۱۸۹۹ء درج ہے۔

عرشی : آپ کی والدہ نے کب سے آپ کے تعلیمی اخراجات برداشت کیے۔

آفتاب : میری والدہ صاحبہ نے ایف اے سے میری تعلیم کے اخراجات برداشت کرنا شروع کیے تھے پھر ایم اے پاس کرنے کے بعد مجھے انگلینڈ بھیجا جہاں والدہ صاحبہ اور نانا جان مرحوم میری تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے رہے۔

عرشی : آپ کی والدہ اور والد کے درمیان اختلاف کیوں ہوا

آفتاب : میرے علم میں اختلاف کی وجہ دوسری شادیاں تھیں۔ آپ سمجھ دار ہیں اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آفتاب : آپ نے اپنے دوسرے خط میں میری والدہ مرحومہ اور والد مرحوم کے تعلقات پر روشنی ڈالنے کو لکھا ہے تو اس کا جواب یہ ہے :

ڈاکٹر صاحب کی شادی میری والدہ سے ۱۸۹۳ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے لے کر ان کے انگلینڈ جانے تک یعنی ۱۹۰۵ء تک تعلقات بالکل ٹھیک تھے۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد انھوں نے لاہور میں لا کی پریکٹس شروع کی۔ چوں کہ پریکٹس کی ابھی ابتدا تھی اور ان کی مالی حالت اس وقت کچھ اچھی نہ تھی اس لیے میری والدہ صاحبہ کبھی اپنے والدین کے پاس اور کبھی سیالکوٹ سسرال میں قیام کرتی تھیں۔ علامہ صاحب اکثر سیالکوٹ آتے رہتے تھے۔ اور ہمارے ساتھ کچھ دن گذارتے تھے۔ یہ آنے جانے کا سلسلہ ۱۹۱۴ء تک جاری رہا پھر ان کی دو اور شادیاں یکے بعد دیگرے ہوئیں۔ ان شادیوں کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ اس وجہ سے آپس کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ یہ ایک قدرتی بات تھی آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اور گھر میں بد مزگیوں کا آغاز ہوا۔ یعنی جاوید کی والدہ مرحومہ نے میری والدۂ مرحومہ کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ میں نے ہمیشہ اپنی والدۂ مرحومہ کا ساتھ دیا اس لیے ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ بھی ناراض ہو گئے۔ یہاں ایک قابلِ ذکر بات یہ

ہے کہ [illegible] اور تیسری شادی کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے
میری والدہ مرحومہ سے دوسری شادی کرنے کی اجازت مانگی
تھی۔ اور یہ لکھا تھا کہ :

"اُن کی حق تلفی قطعاً نہیں ہوگی۔ بلکہ دوسری بیویاں
ان کا احترام کریں گی۔ اور امورِ خانہ داری میں ان
کے مشوروں پر عمل کریں گی۔"

مندرجہ ذیل جملے اُس خط میں یہ بھی تھے :

"گھر کی اصل مالکہ تم ہوگی۔ میں تمہاری بہت
عزت کرتا ہوں سب سے بڑھ کر یہ کہ تم معراج
اور آفتاب کی والدہ ہو۔"

اُن کی تیسری شادی کے بعد تینوں بیویاں ان کے انار کلی
والے مکان میں کچھ عرصے اکٹھی رہیں۔ میری والدہ صاحبہ
وہاں خوش نہیں تھیں۔ میری عمر اس وقت ۱۲ یا ۱۳ سال تھی۔
میں بھی کچھ عرصے کے لیے وہاں تھا۔ چوں کہ میری والدہ بہت
خوددار خاتون تھیں دوسری بیویوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں
کرتی تھیں۔ اس لیے ۱۹۱۷ء میں نانی جان آکر ان کو اپنے ساتھ
ریاست مالیر کوٹلہ لے گئیں جہاں میرے نانا جان خان بہادر
حاجی حافظ ڈاکٹر شیخ عطا محمد صاحب گورنمنٹ کی ملازمت سے
ریٹائر ہونے کے بعد چیف میڈیکل آفیسر تھے۔

موصوف ۳۰ سال تک گورنمنٹ کی ملازمت پر میاں
والی میں سول سرجن تھے۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ
مالیر کوٹلہ چلے گئے تھے۔ یہاں سے ریٹائر ہونے پر وہ اپنے
آبائی وطن گجرات [پنجاب] چلے گئے تھے۔

رشی : آپ کی والدہ یا آپ کے نام اگر علامہ مرحوم کے خطوط
ہوں تو ان کے عکس عنایت فرمائیں۔

آفتاب : میرے پاس اس وقت والد مرحوم کا کوئی خط نہیں ہے۔
ان کے چند خطوط میرے اور میری والدہ صاحبہ کے نام آئے
تھے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ وہ ضائع ہو چکے ہیں۔ اتنے
سالوں کے بعد ان کا مہیا کیا جانا مشکل ہے۔ اس وقت یہ خیال
بھی نہ تھا کہ ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

رشی : آپ کے ذہن میں جو اہم واقعات آپ کے والد کے
تعلق سے محفوظ ہوں ان سے مطلع فرمائیں۔

آفتاب : ان کی زندگی کے واقعات بے شمار ہیں۔ تاہم میں چند
ایک بیان کروں گا :

میں آپ کو ایک بات بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ شاید
یہ بات آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ وہ لوگ جنھیں علامہ
صاحب کا دوست سمجھا جاتا تھا ان کی بڑھتی ہوئی شہرت کی
وجہ سے ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ گویا حسد کارفرما تھا۔
مثلاً سر عبدالقادر نے انگریز حکام بالا کے پاس ان کو بدنام
کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ برٹش گورنمنٹ ان کو کسی اعلیٰ عہدے
پر فائز نہ کر دے۔

ایک دن لارڈ ارون Irwin نے ڈاکٹر صاحب
کو بلایا اور ان کو صوبۂ سرحد کا گورنر بنانے کا خیال ظاہر کیا۔
لیکن جب سر عبدالقادر اور میاں فضل حسین کو معلوم ہوا
تو اس وقت ان دونوں نے ڈاکٹر صاحب کو بدنام کرنے کی
کوشش کی اور یہ کہا کہ اقبال محض ایک شاعر ہے اور اس
قابل نہیں کہ اُسے اس قسم کی پوسٹ دی جائے۔ اس کے
علاوہ یہ بھی کہا کہ اس کی تین بیویاں ہیں اور بیٹے کے ساتھ
تعلقات کشیدہ ہیں۔ اس بات کا وائسرائے لارڈ ارون پر
بہت برا اثر پڑا کیوں کہ یورپ کی اقوام کثرتِ ازدواج
polegemy کے سخت خلاف ہوتی ہیں چنانچہ
ڈاکٹر صاحب کو اس عہدے پر مامور نہ کیا گیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ ایک دن سر عبدالقادر نے خود
مجھے بتایا کہ :

"آپ کے والد نے میرے ساتھ ایک دفعہ
بول چال بند کر دی تھی تو میں نے ان سے [ڈاکٹر
صاحب سے] دریافت کیا۔ کیا آپ مجھ سے ناراض
ہیں؟ میرے ساتھ بات نہیں کرتے اور بار روم
میں میری طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ تو اس کے
جواب میں انھوں نے فرمایا : "اگر سچ پوچھتے ہو
تو یہ درست ہے۔ کہ میں تمہارے ساتھ گفتگو
نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے کہ تم نے اور میاں فضل
حسین نے انگریز حکام بالا کے پاس میرے
خلاف باتیں کی ہیں۔ اور مجھے نقصان پہنچانے

کی کوشش کی ہے ۔" اس پر میں نے کہا کہ "یہ بات
تو غلط ہے کہ میں آپ کو بدنام کرتا ہوں لیکن اگر
آپ کا خیال ہے کہ میں نے ایسی کوئی حرکت کی ہے
تو آئیں ہم معاف کریں اور بھول جائیں
let us forgive and forget
اس پر ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کہا کہ "میں تمھیں
معاف forgive تو کر سکتا ہوں لیکن فراموش
FORGET نہیں کر سکتا ۔ کیوں کہ اس کے لیے
طویل عرصہ درکار ہوتا ہے ۔"

اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب مرحوم کے آخری پندرہ ۔۔۔۔
سالوں میں دونوں کے تعلقات ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئے
تھے ۔ سر عبدالقادر صاحب کی فطرت کچھ اس قسم کی تھی کہ ڈاکٹر
صاحب کی درگذری forgiveness کے بعد بھی وہ
زبانی تو ان کی تعریف کرتے تھے لیکن درپردہ ان کو نقصان
پہنچانے کی کوشش کرتے تھے ۔

دوسرا واقعہ ۔۔۔ ایک واقعہ وائسرائے کی کیبینٹ
cabinet میں ایک جگہ خالی ہوئی اور گورنمنٹ اسے
ایک قابل اور پٹھانوں میں مقبول آدمی سے پُر کرنا چاہتی تھی۔
سر فضل حسین نے سر ظفر اللہ خاں کو متعین کروا دیا تھا ۔ حالانکہ
استحقاق کے سلسلے میں ان کا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کوئی مقابلہ
ہی نہیں ہو سکتا تھا ۔ جب ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا علم ہوا
تو انھوں نے ہنس کر کہا :

"یہ اسامی تو مسلمان کی تھی ظفر اللہ کو کیسے
مل گئی ؟"

آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ پنجاب میں انگریزوں نے سر فضل
حسین کے زیرِ صدارت ایک پولیٹیکل پارٹی بنوائی تھی جس کا
نام یونینسٹ پارٹی unionist party تھا اس
پارٹی کے ممبران بڑے بڑے زمین دار [ہندو، مسلم اور سکھ]
تھے منصوبہ یہ تھا کہ دیہاتیوں اور شہریوں میں ایک قسم کی خلیج
پیدا کی جائے ۔ میاں فضل حسین اگر خود شہری تھے تاہم نہ جانے
انھوں نے اس پارٹی کا صدر بننا کیوں قبول کر لیا ۔ ؟
اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی تھی کہ وہ برٹش گورنمنٹ
اور بڑے بڑے زمین داروں کی خوشنودی حاصل کرنا
چاہتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی لڑکیاں زمین داروں کو
دیں ۔ ایک کی شادی ملتان میں کسی زمین دار سے ہوئی اور
دوسری کی فیروز خاں نون کے چھوٹے بھائی کے ساتھ ہوئی
سر فضل حسین کہا کرتے تھے کہ ہم مسلم لیگ کو پنجاب کے
اندر نہیں گھسنے دیں گے بہت سے لوگوں نے یہ بھی کہتے سُنا کہ :

"میں مسٹر جناح جیسے تین لیڈروں کو اپنی جیب
میں ڈال سکتا ہوں ۔"

میرے والد مرحوم نے اس پارٹی کی سخت مخالفت کی اور
آخری دم تک مخالفت کرتے رہے ۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ
مسلمانوں میں پہلے ہی بہت تفرقہ division ہے
اور یہ پارٹی ایک اور تفرقہ پیدا کرنا چاہتی ہے یعنی دیہاتیوں اور
شہریوں میں نفاق ڈالنا اس پارٹی کا منشا ہے ۔

چوں کہ پنجاب کے عوام الناس سب ڈاکٹر صاحب کے گرویدہ
تھے اس لیے یونینسٹ پارٹی چاہتی تھی کہ یا تو اقبال انگریزوں
کی پالیسی کے ساتھ اتفاق کریں اور یونینسٹ پارٹی میں شامل
ہو جائیں یا اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو اقبال کو اور اس کی مسلم
لیگ کو ختم کر دیا جائے ۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی آخری عمر کی پندرہ یا بیس سالہ
شاعری کو اس وقت کی سیاستِ پنجاب سے گہری واقفیت
نہ ہو ۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار اسی زمانے میں لکھے گئے
تھے :

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جواں مرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی ادھر جا
ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا بنگاہِ قلندر سے گزر جا
میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو، تو اتر جا
توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا
مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ اس وقت میاں فضل حسین، سر عبدالعلا، سر سکندر حیات، عمر حیات، اور خضر حیات کا زمانہ تھا۔ اور یہ سب انگریزوں کے پٹھو تھے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے صرف تین حامی تھے ڈاکٹر صاحب مرحوم ملک برکت علی اور شیخ دین محمد۔

یونینسٹ پارٹی نے جب شیخ دین محمد کو ہائی کورٹ کی ججی کا چکمہ دے کر اپنی طرف کھینچ لیا تو صرف دو آدمی پنجاب مسلم لیگ میں باقی رہ گئے جو آخری دم تک یونینسٹ پارٹی سے برسر پیکار رہے۔ ان دونوں کی وجہ سے بالخصوص ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے مسلم لیگ پنجاب میں کامیاب ہوئی۔

جس وقت شیخ دین محمد کو مسلم لیگ سے توڑ لیا گیا اس کے دوسرے ہی دن دین محمد ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے تاکہ وہ بھانپ سکیں آیا ڈاکٹر صاحب کو معاملہ کا علم ہوا ہے کہ نہیں۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کو اپنے پختہ سلسلۂ سراغ رسانی کے باعث اطلاع مل چکی تھی کہ دین محمد نے مسلم لیگ کو دھوکہ دے کر ہائی کورٹ کے جج کا عہدہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کے ملازم علی بخش نے دین محمد کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی۔ اس پر انھوں نے اونچی آواز میں کہا:

"اس غدار کو میرے گھر سے نکال دو میں اس سے ملنا نہیں چاہتا کیوں کہ اس نے قوم کے ساتھ غداری کی ہے۔"

اس قسم کا سلوک نواب مظفر خاں کے ساتھ بھی کیا گیا تھا۔ جنھوں نے مسجد شہید گنج کے معاملے میں در پردہ سکھوں کا ساتھ دیا تھا۔ جب مسلمان ہائی کورٹ کی اپیل میں ہار گئے تو محض ظاہرداری کے لیے وہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا وفد لے کر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر گئے۔ تاکہ پریوی کونسل previ council میں اپیل کرنے کے بارے میں ان کے ساتھ مشورہ کیا جائے۔

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں اس قسم کے واقعات بے شمار ہیں ان میں سے ایک واقعہ ایسا ہے جو میں آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ یہ واقعہ آج تک کسی اخبار، رسالے یا مسلم لیگ کی روداد میں شائع نہیں ہوا۔ اس کا تعلق جناح صاحب اور علامہ اقبال کی ملاقات سے ہے۔ جو غالباً ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء میں جناح صاحب کے لنڈن سے واپس آنے پر لاہور میں ہوئی تھی۔ اتفاق سے میں بھی اس دن وہاں موجود تھا۔

دوپہر کا وقت تھا ڈاکٹر صاحب کے ملازم علی بخش نے آکر کہا: "جناب آپ کو جناح صاحب ملنے آئے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے حسب معمول حقہ پی رہے تھے۔ اور یہ اطلاع پا کر خاموش رہے کوئی جواب نہیں دیا اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ وہ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ جناح صاحب ان سے ملنے کس غرض کے ماتحت آئے ہیں؟۔ کیوں کہ وہ [جناح صاحب] تقسیم ہند کے خلاف تھے اور ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا رنج تھا کہ جناح صاحب پاکستان بننے کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں؟"۔

جب الٰہ آباد میں ۱۹۳۰ء میں انھوں [ڈاکٹر صاحب] نے خطبۂ صدارت پڑھا جس میں پاکستان کا تخیل پیش کیا گیا تھا اور اس کا متن انگلینڈ کے اخبار "ٹائمز" اور "ٹیلی گراف" میں چھپا تھا اس وقت میں بھی لنڈن ہی میں تھا۔ میں نے وہ حصہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اتفاق سے ایک دن کسی پارٹی میں جناح صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کو وہ تراشہ دکھایا۔ جناح صاحب نے اُسے پڑھ کر طنز آمیز لہجے میں کہا:

"nonsense یہ تو ایک شاعر کا محض شاعرانہ تصور ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔"

یہ جملے میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھ کر بھیج دیے تھے۔

خیر جب جناح صاحب کو انتظار کرتے ہوئے تقریباً بیس منٹ گذر گئے تو علی بخش نے دوبارہ ڈاکٹر صاحب کو آکر بتایا کہ جناح صاحب انتظار کر رہے ہیں ان کے ساتھ ایک خاتون بھی ہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فوراً جناح صاحب کو اندر بلایا۔ اور وہ اپنی بہن مس فاطمہ جناح کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ تقریباً پندرہ منٹوں کے لیے بالکل خاموشی طاری رہی۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دو بڑے آدمیوں کے دل آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

اس وقفۂ خاموشی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جناح صاحب سے دریافت کیا:

”آج آپ کیسے تشریف لائے ہیں“
ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی۔ بہتر ہوگا اگر میں اس
مکالمے کو انھیں کے الفاظ میں بیان کروں :

نبال:

"Mr Jinnah what brings you her
today ?"

نا ح :

"Well, Sir Mohammed Iqbal
after thinking a good deal abou
the problem of division c
India, I must fully agree wit
you that the creation of a Musli
State Carved out of India, a
you demanded in your Presiden
tial address at Allahabad i
1930, is the only solution nc
only of the political problem c
the Indian Muslims, but also c
India as a whole".

اس پر ڈاکٹر صاحب نے ذرا سختی سے کہا :

بال:

"I have been telling you thi
for the last seven year, hav
you realised it now ?"

اس پر پھر تقریبًا دس منٹوں کے لیے خاموش رہی جس کے بعد
ڈاکٹر صاحب نے کہا :

بال :

"How I can help you in th
matter ?"

ح:

"I have come to you to reque
you for helping me in consolic
ating the Muslim League
the Punjab."

اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا
کر کہا :

ل:

"I shall be delighted to do s
but I must tell you that I wa
the Muslim League to be
Muslim Organisation, not of t

Zamindars and Capitalist. The
only thing I can give you in
this province is the poor mas-
sess."

جناح :

"This is preciecly what I want."

اس گفتگو کے بعد اقبال اور جناح ایک پلیٹ فارم پر آگئے اور
دونوں میں مفاہمت ہوگئی۔

اس ضمن میں آپ کو بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جناح
صاحب کی اس ملاقات سے پہلے ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جناح
صاحب کو [جب وہ لنڈن میں تھے] ایک خط لکھا تھا جس
میں انھوں نے کہا :

”میں چاہتا ہوں کہ آپ واپس آکر مسلم لیگ
کی لیڈری اپنے ہاتھ میں لے لیں کیوں کہ آپ واحد
شخصیت ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ بات چیت
کر سکتے ہیں“

مگر میرا خیال ہے کہ جناح صاحب نے اس خط کا کوئی جواب
نہیں دیا تھا۔

انھیں دنوں جب جناح صاحب لنڈن میں پریکٹس کر رہے
تھے ان کی ملاقات مسٹر چرچل [وزیر اعظم برطانیہ] سے
ہوئی تھی اور چرچل نے جناح صاحب سے کہا تھا :

"Mr Jinnah, why are you wasting
your time here ? Why don't
you go to India ? Go and make
up with the poet (Iqbal) and
work for the creation of Pakistan,
because we want Pakistan.

آپ کو معلوم ہوگا کہ مسٹر چرچل بھی پہلے ہندوستان کی تقسیم
کے خلاف تھے۔ جب جناح صاحب کو یہ بات پہلی بار معلوم
ہوئی کہ انگلستان کی کنزرویٹو پارٹی پاکستان بننے کے حق میں
ہوگئی ہے تو انھوں نے ہندوستان واپس آنے کا قصد کیا تاکہ
وہ مسلم لیگ کی لیڈری اپنے ہاتھ میں لے لیں جیسا کہ اقبال
چاہتے تھے۔

ان کے آنے کے بعد اقبال اور جناح کے مابین جو خط
وکتابت ہوئی وہ چھپ چکی ہے۔ اور غالبًا آپ نے دیکھا

سبھی ہو گا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اقبال نے ہر قدم پر مسٹر جناح کی رہنمائی کی ہے اور حال ہی میں میں نے ان کے سکریٹری مطلوب حسین صاحب کے متعلق ایک مضمون پڑھا جس میں لکھا ہوا تھا کہ ان کو ایک مرتبہ جناح صاحب نے کہا تھا:

"Matloob, we have now done all that Iqbal wanted us to do".

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر اقبال نہ ہوتے تو کم از کم پنجاب میں مسٹر جناح کو کتنی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

اقبال اور جناح کی اس میٹنگ کے دوران [جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے] میں ان دو بڑی ہستیوں کا جائزہ لے کر بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک طرف اقبال تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کے مطالعے میں صرف کی اردو فارسی اور عربی کے جید عالم ٹھہرے مسلمانوں اور عالم اسلام کے مسائل کا نہایت غور سے مطالعہ کیا۔ جنھوں نے مشرقی اور مغربی دونوں علوم میں کمال حاصل کیا اور دوسری طرف ان کے سامنے ایک قابل اور بہت بڑے پارلیمنٹرین (Parliamentarian)۔ اور سیاست داں تھے تاہم مسٹر جناح اردو عربی و فارسی سے نا واقف تھے بلکہ اردو صحیح بول بھی نہیں سکتے تھے۔

علامہ اقبال کی چھوٹی سالی فاطمہ بیگم زوجہ خواجہ فیروز الدین سے
عرشی زادہ کا تحریری انٹرویو

١۔ والدۂ آفتاب کریم بی بی کچھ کم بائیس سال علامہ اقبال کے ساتھ رہیں۔

٢۔ کریم بی بی علامہ کی ہم عمر تھیں۔

٣۔ دوسری تیسری شادی کے بعد پہلی بیگم تقریباً پانچ برس تک دونوں سوتوں کے ساتھ رہیں۔

٤۔ کریم بی بی کے تیسرے بچے کی پیدائش پر ایک اندرونی بیماری ہو گئی تھی اسی وجہ سے علامہ نے دوسری شادی کی۔

٥۔ علامہ کی دوسری بیگم [مختار بیگم] معمولی شکل کی تھیں لیکن والدۂ جاوید اقبال بہت خوبصورت تھیں۔

٦۔ علامہ نے جب دوسری شادی کی تو آفتاب اقبال آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے گویا پہلی شادی کے ١٥-١٦ سال بعد دوسری شادی کی۔

٧۔ علامہ اقبال کی پہلی شادی جس روز ہوئی اسی روز ان کے میٹرک میں پاس ہونے کا تار آیا تھا۔

٨۔ علامہ اقبال کی دوسری بیوی بالکل ان پڑھ تھیں والدۂ جاوید تھوڑی بہت حرف شناس تھیں۔

تصحیح

نہ "ب"، کے صفحہ نمبر ۵۷۶ پر دیے گئے ریزولیشن اور اردو ترجمہ کے بعد درج ذیل مواد شامل کر لیا جائے جس کے ذریعہ قرضِ حسنہ معاف کیا گیا ہے۔
طرح "ب"، کے آخر میں آفتاب اقبال کے نام ایک دعوت نامہ کا عکس شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ [ادارہ]

ریزولیوشن نمبر ۱ کے بارے میں اجلاس باب حکومت [حیدر آباد]
منعقدہ ۱۶ امرداد ۱۳۴۰ ف کا فیصلہ

آفتاب اقبال صاحب کے خاندانی اعزاز کے لحاظ سے اراکین حیدر آباد نے اپنے زیر نگیں رقم سے ایک سو نوے پونڈ بطور قرضِ حسنہ جو صاحب موف کو اس غرض سے دیا کہ یہ ایک معزز خاندان کا ہندوستانی طالب علم بحالت عسرت انگلستان میں پریشان حال نہ رہے، اس کی پابجائی کرائی جائے جب جب ریزولیوشن فقرہ [۱۰] منظورہ اجلاس بیست و ہشتم ڈیلی گیٹس منعقدہ ۷ جنوری ۱۹۳۱ء بمقام لندن کونسل میں پیش ہونے پر یہ اتفاق پایا کہ آفتاب اقبال صاحب کی مالی مشکلات کے مدنظر قرض حسنہ معاف کیا جا کر عطیہ متصور کیا جائے۔

شرح دستخط مہاراجہ کشن پرشاد صدر اعظم

✻

request the pleasure of
company
12th Oct 1938
Short coat Black or white
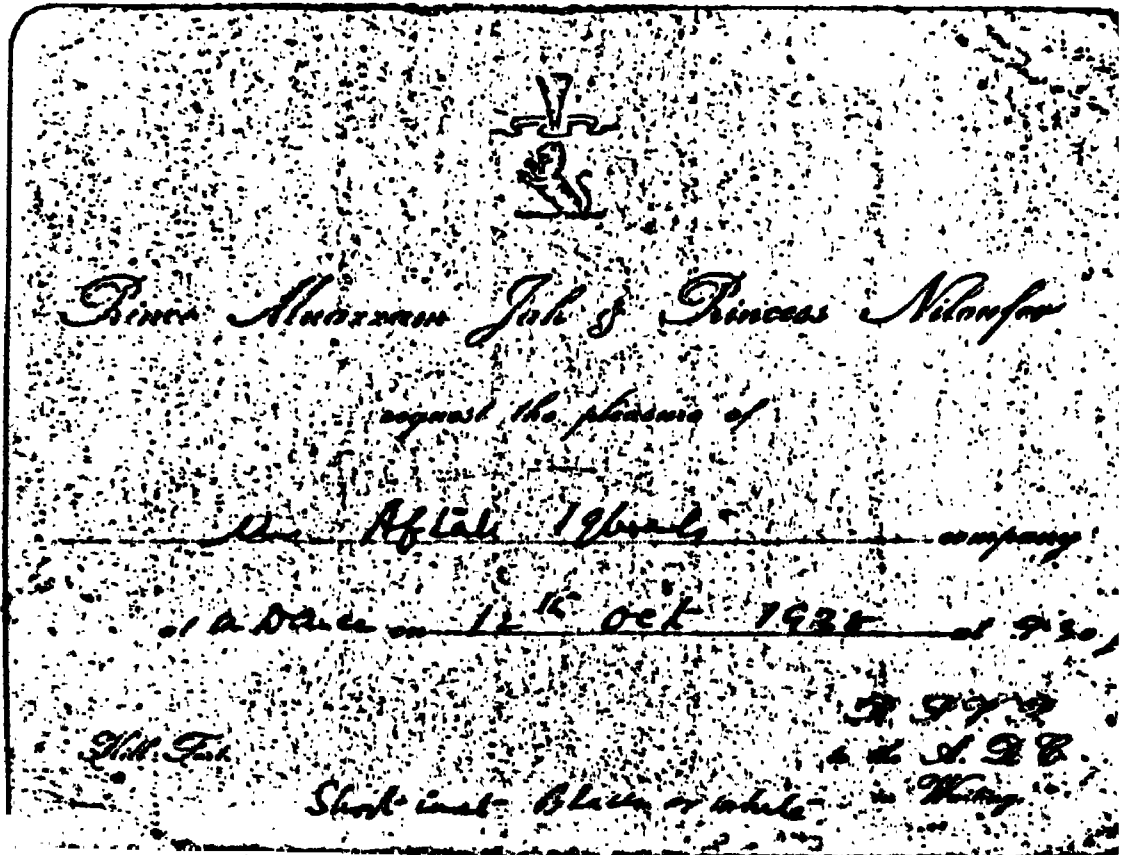
آفتاب اقبال کے سفرِ حیدر آباد [اکتوبر ۱۹۳۸ء] کے زمانے کا ایک دعوت نامہ رقص من جانب شہزادہ معظم جاہ اور شہزادی نیلوفر

اقبال

اقبال نمبر — ایک مجاہدہ

شکر اس خدا کا جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان ہے اور حمد و ثنا اسی کی جس نے ہم فقیروں سے ایک نہایت ہی اہم اور عظیم کام "اقبال نمبر" کی صورت میں مکمل کروایا۔

"اقبال نمبر" اپنی ابتدا سے تکمیل تک ایک ایسی کہانی ہے جو سانس سانس الجھنوں اور قدم قدم مجاہدوں سے پُر ہے۔ آج جب کہ ڈیڑھ سال سے زائد کی تگ و دو اور شب و روز کی جہدِ مسلسل کا خاتمہ ہوا ہے اور "اقبال نمبر" آپ کے ہاتھوں میں ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم نے کوئی بہت گہرا، گھٹا ہوا اور پیچیدہ سا خواب دیکھا ہو۔ "اقبال نمبر" ایک خواب ہی تو ہے۔

ہم طے نہیں کر پا رہے ہیں کہ اپنی بات کہاں سے شروع کریں۔ واقعات بے شمار ہیں، ان میں سے بیشتر شدید، تکلیف دہ اور صبر آزما بھی ہیں لیکن "اقبال نمبر" کے شائع ہو جانے کی بے پناہ مسرت ان تکالیف پر غالب آگئی ہے پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو یہ ضرور بتائیں کہ ڈیڑھ سال میں ہم پر کیا گذری۔

"اقبال نمبر" ہمارے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ ہم تو ایک ضخیم خاص نمبر کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اس کے لیے وسائل کی تلاش میں تھے کہ اچانک ڈیڑھ دو سو صفحات کو محیط ایک "اقبال ایڈیشن" شائع کرنے کا پروگرام بن گیا تاکہ دوسرے خاص نمبر کی اشاعت کو تقویت مل سکے لیکن جب کام کرنے بیٹھے تو معلوم ہوا کہ کم از کم ہندوستان میں اقبال پر تازہ ترین کوئی بڑا تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہو سکا ہے۔ شاعر نے ہمیشہ ہی معیاری نمبر دیے ہیں اور یہی معیار و مزاج ہمیں اپنے بزرگوں سے ملا ہے۔ ہم اپنی عادتوں سے مجبور "اقبال نمبر" میں لگ گئے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو ہمارے پاس وسائل ہیں اللہ اور نہ ہی کام کرنے والے۔ عام شماروں کا متاثر ہونا لازمی تھا، اسے ہم اپنی غلطیوں میں شمار کرتے ہیں، عام شماروں کی عدم اشاعت سے نہ صرف یہ کہ کاروبار پر اثر پڑا بلکہ ہمارے لیے مشکلیں بھی پیدا ہوئیں۔ کام آگے بڑھتا گیا، اقبال نمبر کا حجم بھی بڑھتا گیا۔ مواد کی فراہمی، کاغذ، کتابت و طباعت کی پریشانیاں، وسائل کی کمی اور قدم قدم امتحان، الجھنیں اور تذبذب، کچھ بہتر کام کر گذرنے کی شدید خواہش۔

شاید ہمارے یہاں یہ روایت نہیں کہ کسی بڑے کام کو فراخدلی کے ساتھ سراہا جائے، مبارکبادیں دی جائیں، حوصلہ دیا جائے، وسائل مہیا کیے جائیں لیکن صوبوں، جماعتوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ذہنوں سے ہماری توقعات فضول ہی تھیں۔ "اقبال نمبر" کی ابتدا و تکمیل میں کسی ادارے، جماعت یا اکاڈمیوں سے کوئی تعاون نہیں ملا [ایک آدھ اشتہار کے سوا] یہاں تک کہ اقبال کے نام پر قائم اداروں اور اکاڈمیوں نے خطوں کے جواب تک نہیں دیے۔ ایک مسئلہ تو یہ بھی تھا کہ نہرو اور آزاد صدی تقریبات اور ماحول میں شاعر کا "اقبال نمبر" بے وقت کی راگنی کے مترادف تھا کیوں کہ ہمارے یہاں بیشتر کام سرکاری اعانتوں یا سرکاری طرف سے کیے گئے اعلانات سے وابستہ مفادات کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اقبال شاعر کے "اقبال نمبر" سے اردو شعر و ادب کے "بڑوں" کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

شاعر کے "اقبال نمبر" کی صورت و روح وہی ہے جس کے بارے میں ہم نے اپنے قارئین کو گاہے گاہے عام شماروں کے ذریعہ بتایا تھا لیکن اب "اقبال نمبر" کی خوب سیرتی میں بے پناہ اضافہ ہی ہوا ہے۔ شاعر کا "اقبال نمبر" اپنی ترتیب و تہذیب میں اس سے قبل اقبال پر شائع ہوئی کتابوں اور رسائل کے اقبال نمبروں سے متاثر نہیں ہے۔ ان سب کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ اقبال نمبر اپنے خد و خال میں قطعی منفرد ہے کیوں کہ یہ کوئی مادی یا میکانیکی سلسلہ نہیں ہے۔ یہ وہ تخلیقی روپ ہے جس کا روایت سے ذہنی اور روحانی ربط ہے۔ ہمارا سارا علم اور تمام تجربے ہماری روح کا وہ ذخیرہ ہیں جسے ہماری عقل نے پوری توتوں کے ساتھ "اقبال نمبر" میں ابھارنے کی سعی کی ہے تاکہ کوئی عظیم فن پارہ منظرِ عام پر آسکے۔ شاید ایسا ہوا ہو؟

"اقبال نمبر" ہندوستان کے قارئین اقبال کے لیے ہے لیکن یہ نمبر پاکستان کے لیے بھی ہے، پوری اردو دنیا کے لیے ہے کہ بہ یک وقت اتنا کچھ یکجا ان کو مطالعے کے لیے ملے گا۔

"کرشن چندر نمبر" اور "غالب نمبر" کے بعد کسی عظیم اور آفاقی شخصیت پر اتنا ضخیم اور معیاری نمبر "شاعر" نے پیش کیا ہے۔ کسی بڑی شخصیت کو

اس کی اپنی انفرادیت کے ساتھ ہی پیش کیا جانا چاہیئے اور یہی کچھ ہم نے کیا ہے۔

نئی نسل کے ذہن میں اقبال کی وہی بنی بنائی تصویر ہے جو انھوں نے اپنی درسی کتابوں سے اپنے ذہنوں میں بنائی ہے۔ ان کے ذہنوں میں محفوظ اُس تصویر کو کسی نئی تصویر میں بدلنے کی جراًت یا صلاحیت کو بزرگ ماہرینِ اقبالیات نے کبھی بھی پسند نہیں کیا چنانچہ ایک عظیم شاعر میر اور غالب کی طرح نئی نسل کی شعری شخصیت کا حصّہ نہیں بن سکا۔ "اقبال نمبر" کی ترتیب کے دوران نئے قلم کاروں سے اقبال پر گفتگو کا موقع ملا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ تعریفی و توصیفی مقالوں اور کتابوں سے آگے ان نئے ذہنوں کو کچھ بھی نیا نہیں ملا ہے۔

"اقبال نمبر" بہ طور ایک طالب علم کی تحقیقی کاوش کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اقبال پر قدیم ترین اور تازہ ترین موجود و معلوم بکھرے ہوئے مواد اور اس میں نئے اضافوں کو ہم نے اپنے طور پر دیکھا اور ترتیب دیا ہے۔ یہ دراصل ایک کوشش ہے اقبال کو از سرِ نو پڑھنے، سمجھنے اور دیکھنے کی۔ اس میں کسی ترتیبی سوچ کو دخل نہیں ہے۔ یہ کوئی منصوبہ بند کام بھی نہیں ہے۔ اس کی بے ترتیبی ہی اس کا حسن ہے۔ ایک صدی کے اختتام اور ایک نئی صدی کی آمد آمد پر ہمیں اپنے ادب، اپنی شاعری اور اپنے عظیم فن کاروں کو نئے تناظرات میں نئی تفہیم اور نئی معنویت کے ساتھ آگے لے جانا ہے۔

"اقبال نمبر" جیسا کچھ بھی ہے ہماری اپنی کاوشوں کا ثمر ہے، اس میں خامیاں بھی ہوں گی اور ہم سے ہوئے تسامحات بھی، ہمیں زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ آپ اس نمبر کا مطالعہ کشادہ ذہنی کے ساتھ کیجیئے اور ہمارے کام کو بہ نظرِ اصلاح دیکھیئے تاکہ اقبال پر مزید بہتر کام کرنے کا حوصلہ ہو سکے۔ ہم اپنے دیگر عظیم اکابرینِ ادب کو بھی اسی طرح دیکھ سکیں۔ شاعر کو بہتر ماحول اور زیادہ وسائل میسر آئیں تو یہ طے ہے کہ "اقبال نمبر" سے بھی زیادہ ضخیم اور عظیم نمبر شائع ہو سکیں گے۔

"اقبال نمبر" کو دو حصّوں میں منقسم کر دیا گیا ہے ورنہ تو آٹھ سو، نو سو صفحات کے لیے مزید وقت درکار ہوتا۔ ہمیں اس امر کا بھی احساس ہے کہ اس نمبر کا ایک اہم ترین باب "اقبال اور عصری اردو شاعری" حصّہ اوّل میں شامل نہیں کیا جا سکا، مگر یہ گراں قدر باب مزید اضافوں کے ساتھ حصّہ دوّم میں شامل رہے گا۔ "اقبال نمبر" کی تکمیل کے دوران ہم بہت سی افواہوں سے بھی گذرے ہیں۔

شاعر بند ہو گیا ہے !

"اقبال نمبر" نے شاعر والوں کو دیوالیہ کر دیا ہے !

"اقبال نمبر" کے بعد کسی اور شمارے کی جراًت نہیں کر سکیں گے !

اقبال کی شخصیت کو کم کرنے کے لیے "اقبال نمبر" شائع کیا جا رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ایک صدی کو محیط ہماری مستحکم ادبی روایت کی روح ساٹھ سالہ شاعر سے وابستہ تیسری نسل کے حوصلوں اور اعتماد کو یہ افواہیں متزلزل نہ کر سکیں کیونکہ ہمارا جہاد نئے راستوں کی تلاش اور نئی منزلوں کا جہاد ہے ہم وہ مسافر ہیں جو ایک ایسے کارواں کے ساتھ چل رہے ہیں جس میں شامل مسافروں کے قدم تلے صرف زمین اور سر پر آسمان ہے لیکن آتی جاتی سانسوں میں شامل روح کو یہ تڑپ بھی ہے کہ گزرتے ہوئے ہر پل اور ہر لمحے کو زندگی کرنے کے صاف اور روشن امکانات دیتے جائیں تاکہ ہمارے بعد آنے والوں کو دشت و صحرا کے بجائے ندیاں اور سمندر ملیں، سبز و شاداب گلشن ملیں، تازہ و صاف ہوا میسر آ سکے۔ جن لوگوں کی نیتیں صاف ہوتی ہیں وہ افواہوں پر کان نہیں دھرتے۔

یوں تو ہم ان تمام لوگوں کے احسان مند ہیں جنھوں نے براہِ راست یا کسی نہ کسی ذریعے سے اقبال نمبر کو مکمل کرنے میں ہمیں اپنا تعاون دیا لیکن کچھ کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کا ذکر اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ "اقبال نمبر" ان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔

اقبال نمبر کی ترتیب و تہذیب کے لیے جناب عبدالقوی دسنوی [بھوپال] اور جناب کالی داس گپتا رضا [بمبئی] کی حوصلہ افزائیاں اس ایک بڑے کام کو آگے بڑھانے میں بہت زیادہ معاون ہوئی ہیں۔ نایاب و کمیاب کتابوں کے حصول کے لیے ان دو حضرات نے جو رہنمائی کی وہ ہمارے لیے انعام سے کم نہیں۔ ہر طرح کے استفسارات کا مشفقانہ جواب اور ہمارے کام پر اعتماد ایک ایسے تعلق کا اعلامیہ ہے جو فی زمانہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ رضا صاحب نے "اقبال نمبر" کو ہر زاویے سے معتبر و مستند دستاویز بنانے کے لیے ہماری کوششوں کو کبھی بھی پل کمزور نہیں ہونے دیا۔ سنجیدہ

علمی وادبی اور تحقیقی کاموں کے لیے ان حضرات کا دم غنیمت ہے۔

"اقبال نمبر" کے مندرجات کے متعلق یہاں وضاحتوں اور صراحتوں کی ضرورت تو نہیں ہے تاہم نمبر کے ایک اہم ترین باب "علامہ اقبال کے اہل وعیال" کے متعلق چند باتیں تحریر کرنا ضروری ہیں۔ جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ نے بلاشبہ ایک نہایت ہی متانت مند موضوع پہ کام کیا ہے اور "شاعر" نے اس کام کو اپنے طور پر نذرِ قارئین کیا ہے۔ یہ ایک مکمل کتاب ہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس باب سے متعلق کیا سوال بنتے ہیں۔ ہم عرشی زادہ صاحب کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے بے حد قیمتی دستاویزات شاعر کو دیں۔ اسی طرح جناب سید مظفر حسین برنی، جناب سلیم تمنائی اور جناب ظفر الاسلام ظفر بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط شاعر کو عطا کیے۔

"اقبال نمبر" کے لیے وسائل کی فراہمی اور دیگر امور میں ہر ممکنہ اعانت کے لیے ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب علی ایم شمسی [چیئرمین کوکن مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ بمبئی] نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ نمبر کو ہر زاویے سے کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے کبھی بھی ہمیں بے حوصلہ نہیں ہونے دیا۔ اسی طرح جناب اندر پرتاپ نیر اور جناب ساحر لیشوی [نیر دلی] بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان دو حضرات نے بھی "اقبال نمبر" کی تکمیل کے لیے ہمارے ہاتھ مضبوط کیے۔

اقبال اکاڈمی پاکستان، ڈاکٹر وحید عشرت اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے بھی ہم بے حد ممنون ہیں کہ پاکستان سے کتابوں کو ارسال کرنے اور دیگر اہم مواد کی فراہمی میں ان لوگوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور علامہ اقبال پہ ایک معیاری تحقیقی کام کی پذیرائی کی۔

"اقبال نمبر" کی خوب صورتی میں بمبئی کے مشہور پریس ملٹی پرنٹس کے منیجر مسٹر ہالوے کو بڑا دخل ہے۔ وہ اردو نہیں جانتے لیکن اردو شاعری، اقبال اور شاعر سے ان کو بے حد لگاؤ ہے۔ نمبر کی نفاست و نظافت انھیں کی دلچسپیوں کا مظہر ہے۔ ہم ملٹی پرنٹس کے منیجر اور پورے اسٹاف کے شکر گذار ہیں۔

ہم پھر خواب دیکھ رہے ہیں، میرؔ، غالبؔ، داغؔ، سیمابؔ اور اعجازؔ صدیقی نمبر کے لیے۔ غزل، افسانہ، نظم، ناول، تنقید پر ضخیم اشاعتوں کے خواب لیکن ہم ایسے ہی دست لوگوں کے پاس سوائے خوابوں کے اور ہے بھی کیا۔

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود [صائبؔ]

افتخار امام * ناظر نعمان صدیقی

بیانِ ملکیت اور دیگر تفصیلات شاعر بمبئی
(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

مقامِ اشاعت بمبئی

پرنٹر و پبلشر	ناظر نعمان صدیقی	وقفۂ اشاعت	ماہنامہ
پتا	دیناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ، فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴	قومیت	ہندوستانی
ایڈیٹر	افتخار امام صدیقی	ملکیت	ناظر نعمان صدیقی
پتا	دیناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴	قومیت	ہندوستانی

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط۔ ناظر نعمان صدیقی ۲۸ فروری ۱۹۸۸ء

ماخذاتِ اقبال نمبر

شاعر کے "اقبال نمبر" کی ترتیب و تدوین کے دوران خاصی بڑی تعداد میں کتب و رسائل اور مقالات وغیرہ کا مطالعہ عمل میں آیا، ان کے حوالے پورے اقبال نمبر میں یہاں وہاں موجود ہیں لیکن تسامحات کا احتمال بھی ہے اس لیے ماخذات کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جا رہی ہے ۔ اس فہرست میں علامہ اقبال کی تصانیف کی تفصیل شامل نہیں کی گئی ہے کہ "توقیتِ اقبال" اور "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی جائزہ" میں ان کا مفصّل احوال دیا گیا ہے ۔ مضامین و مقالات کے حوالے بھی حذف کر دیے گئے ہیں کہ ان کی بڑی تعداد طوالت کا سبب بنتی ۔ ماخذات کی اشاریہ سازی میں کسی مروّجہ اصول کو نا برتنے کے باوجود ترتیب میں ایک سلیقہ رکھا گیا ہے ۔ ثانوی اور مستعار حوالوں کو بھی یہاں شامل نہیں کیا جا رہا ہے ۔ بعض اہم مکاتیبِ اقبال کے مجموعوں اور اقبال پر کتابوں کا حوالہ یہاں شامل ہونے سے رہ گیا ہے ان کی تفصیل مکمل اشاریۂ کتب اقبال نمبر حصہ دوم میں دی جا رہی ہے ۔

آفاق احمد [مرتب]
- اقبال : آئینہ خانے میں
  ۱۹۷۹ء
  مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی بھوپال

احمد ندیم قاسمی
- علامہ محمد اقبال
  ۱۹۷۷ء
  مجلس ترقی ادب ، لاہور

اخلاق اثر
- اقبال نامے
  ۱۹۸۸ء
  طارق پبلی کیشنز، صادق منزل، چوکی امام باڑہ بھوپال

اسلوب احمد انصاری
- نقشِ اقبال
  جنوری ۱۹۷۹ء
  مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

افتخار احمد صدیقی
- شذراتِ فکرِ اقبال [ترجمہ]
  ۱۹۷۳ء
  مجلس ترقی ادب لاہور

افسر سیمابی احمد نگری
- خاورستان
  اگست ۱۹۵۱ء
  نگار پریس لکھنؤ

اکبر حسین قریشی [ڈاکٹر]
- مطالعۂ تلمیحات و اشاراتِ اقبال
  ۱۹۸۶ء
  اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

امجد اسلام امجد [مرتب]
- اقبال کی یاد میں
  ۱۹۷۷ء
  پنجاب آرٹ کونسل ، لاہور

انور سدید
- اقبال کے کلاسیکی نقوش
  ۱۹۷۷ء ، طبع دوم ۱۹۸۷ء
  اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

بشیر احمد ڈار
- انوارِ اقبال
  مارچ ۱۹۶۷ء
  ۱۹۷۷ء ، طبع دوم
  اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

جاوید اقبال
- زندہ رود
  جلد اول ۱۹۷۹ء
  جلد دوم ۱۹۸۱ء
  جلد سوم ۱۹۸۴ء
  شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ لاہور

کلیاتِ اقبال [اردو]
- صدی ایڈیشن ۱۹۷۵ء
  ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
- کلیاتِ اقبال [فارسی]
  فروری ۱۹۷۳ء
  شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
  ادبی مارکیٹ ، چوک انارکلی لاہور

جگن ناتھ آزاد
- اقبال اور اس کا عہد
  ۱۹۶۰ء
  ادارہ انیسِ اردو الٰہ آباد
- اقبال اور مغربی مفکرین
  ۱۹۷۵ء
  مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، نئی دہلی

○ مرقعِ اقبال
اکتوبر ۱۹۷۷ء
پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس دہلی

حق نواز

○ اقبال اور لذّتِ پیکار
نومبر ۱۹۸۴ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

خالد نظیر صوفی

○ اقبال درونِ خانہ
۱۹۷۱ء
بزمِ اقبال لاہور

خان محمد نیاز الدین

○ مکاتیبِ اقبال
۱۹۵۴ء
بزمِ اقبال، کلب روڈ لاہور

خلیفہ عبدالحکیم

○ فکرِ اقبال
۱۹۵۷ء
بزمِ اقبال، لاہور

خواجہ حسن نظامی

○ اکبری اقبال
۱۹۱۸ء
مرغوب ایجنسی لاہور

رحیم بخش شاہین

○ اوراقِ گم گشتہ
۱۹۷۵ء
اسلامک پبلی کیشنز لیمیٹڈ لاہور

رضیہ فرحت بانو

○ خطباتِ اقبال
۱۹۴۶ء
حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

رفیع الدین ہاشمی

○ خطوطِ اقبال
۱۹۷۶ء
مکتبہ خیابان لاہور

○ کتابیاتِ اقبال
۱۹۷۷ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

○ تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ
نومبر ۱۹۸۲ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

○ ۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب
۱۹۸۶ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

○ ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب
۱۹۸۸ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

سعید اختر درّانی

○ اقبال یورپ میں
۱۹۸۵ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

سلیم اختر

○ اقبال شناسی کے زاویے
منتخب مقالاتِ مجلّہ اقبال
۱۹۷۴ء، ۱۹۸۴ء
بزمِ اقبال لاہور

○ اقبال ایک شاعر
۱۹۷۷ء
نقشِ اوّل کتاب گھر، لاہور

○ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ
۱۹۷۷ء
مکتبۂ عالیہ، لاہور

○ اقبال: ممدوحِ عالم
نومبر ۱۹۷۸ء
بزمِ اقبال، ۲- کلب روڈ لاہور

سلیم تمنائی

○ ظریف اقبال
۱۹۸۴ء
انجمن ترقی اردو ہند شاخ میسور دودھ
پیرسکان، عیدگاہ، میسور

سید سلیمان ندوی

○ سیرِ افغانستان
۱۹۴۵ء
نفیس اکاڈمی، حیدرآباد دکن

سید محمد سبطین
سید قمر رضی [مرتبین]

○ اقبال [مجلہ]
سالِ اشاعت ۱۹۷۷ء
سالِ طباعت ۱۹۸۱ء
انجمن سادات امروہہ پاکستان
ایس۔ ٹی ۸ بلاک ۱۳، فیڈرل بی ایریا کراچی

سید نذیر نیازی [مرتب]

○ مکتوباتِ اقبال بنام نذیر نیازی
۱۹۵۷ء
اقبال اکاڈمی پاکستان کراچی

○ دانائے راز
۱۹۷۹ء، ۱۹۸۸ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

شیخ اعجاز احمد

○ مظلوم اقبال
۱۹۸۵ء
بی۔ ۲۳، داؤد پوتہ روڈ کراچی۔ ۴

شیخ عطاء اللہ

○ اقبال نامہ [اوّل]
مجموعۂ مکاتیبِ اقبال
۱۹۴۵ء
شیخ محمد اشرف تاجر کتب، کشمیری بازار لاہور

○ اقبال نامہ [دوم]
مجموعہ مکاتیبِ اقبال
۱۹۵۱ء
شیخ محمد اشرف تاجر کتب، کشمیری بازار لاہور

صابر کلوروی

○ اشاریۂ مکاتیبِ اقبال
جنوری ۱۹۸۴ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

اقبال کے ہم نشیں
اکتوبر ۱۹۸۵ء
مکتبہ خلیل، گلستان اسٹریٹ ۲۵ اسلام گنج
ابراہیم روڈ لاہور

صدیق شبلی
محمد ریاض [مرتبین]

○ کشف الابیات اقبال
فارسی کلام کا اشاریہ
دسمبر ۱۹۷۷ء
مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد
پاکستان

ضیاء الدین احمد برنی [مترجم]

○ اقبال
عطیہ بیگم کی انگریزی کتاب کا ترجمہ
۱۹۵۶ء
اقبال اکاڈمی پاکستان کراچی

طاہر تونسوی [مرتب]
○ حیاتِ اقبال
۱۹۷۷ء
مکتبہ عالیہ، لاہور

ظ انصاری
○ اقبال کی تلاش
۱۹۷۸ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

عبدالغفار شکیل [مرتب]
○ نوادرِ اقبال
۱۹۶۲ء
سرسید بک ڈپو، علی گڑھ

عبدالقوی دسنوی
○ ہندوستان میں اقبالیات
اقبال ریویو، شمارہ ۲، جلد ۱۷، جولائی ۱۹۷۶ء
اقبال اکادمی پاکستان لاہور

○ اقبالیات کی تلاش
۱۹۸۴ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

عبداللطیف اعظمی
○ اقبال ــــ دانائے راز
جولائی ۱۹۷۸ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

عبدالمجید سالک
○ ذکرِ اقبال
۱۹۵۵ء
بزمِ اقبال لاہور

عبدالواحد معینی [مرتب]
○ باقیاتِ اقبال
۱۹۵۲ء
مجلسِ اقبال کراچی

علی سردار جعفری
○ اقبال شناسی
دسمبر ۱۹۷۶ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

غلام دستگیر رشید [مرتب]
○ آثارِ اقبال
۱۹۴۴ء
ادارہ اشاعتِ اردو حیدرآباد دکن

غلام رسول مہر
صادق علی دلاوری [مرتبین]
○ سرودِ رفتہ
۱۹۵۹ء

کتاب منزل لاہور

غلام مصطفےٰ خان [ڈاکٹر]
○ اقبال اور قرآن
طبع اول: ۱۹۷۷ء
طبع دوم: ۱۹۸۸ء
اقبال اکادمی پاکستان لاہور

فروغ احمد
○ تفہیمِ اقبال
۱۹۸۵ء
اردو اکادمی سندھ کراچی

فقیر سید وحید الدین
○ روزگارِ فقیر [اوّل]
۱۹۵۰ء
سید برادرز لاہور
دوم: ۱۹۶۴ء

قمر رئیس ڈاکٹر [مرتب]
○ اقبال کا شعور و فن: عصری تناظر میں
مئی ۱۹۷۹ء
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

گیان چند [ڈاکٹر]
○ ابتدائی کلامِ اقبال
بہ ترتیبِ مہ و سال
۱۹۸۸ء
اردو ریسرچ سینٹر
۵۹۱-۸-۵، چاند گھاٹ ہائی اسکول لین،
عابد روڈ، حیدرآباد

ماسٹر اختر
○ ریاستِ بھوپال اور اقبال
حقیقت کے آئینے میں
اگست ۱۹۸۷ء
نیا کتاب گھر، ۷، کربلا بھوپال

محی الدین قادری زور [مرتب]
○ شادِ اقبال
۱۹۴۲ء
سب رس کتاب گھر، حیدرآباد دکن

محمد امین زبیری
○ خدوخالِ اقبال
۱۹۸۶ء
بی۔ ۱۳۲، بلاک ۱۰، گلشنِ اقبال کراچی

محمد انور حارث
○ رختِ سفر
جنوری ۱۹۵۲ء
تاج کمپنی لاہور

محمد بشیر الحق دسنوی عظیم آبادی
○ اصلاحاتِ اقبال
۱۹۵۰ء
مکتبہ دین و دانش، بانکی پور پٹنہ

○ تبرکاتِ اقبال
۱۹۵۹ء
کوہِ نور پریس دہلی

محمد حمزہ فاروقی
○ حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے
مارچ ۱۹۸۸ء
ادارہ تحقیقاتِ پاکستان
دانش گاہ پنجاب لاہور

محمد حنیف شاہد [مرتب]
○ اقبال کی کہانی، اقبال کی زبانی
نومبر ۱۹۷۷ء
مکتبہ حفیظ ۸۹۶ بی، این سمن آباد لاہور

محمد رفیق افضل [مرتب]
○ گفتارِ اقبال
۱۹۶۹ء
ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہ پنجاب
لاہور

محمد صدیق شبلی [ڈاکٹر]
○ اشاریہ کلامِ اقبال اردو
۱۹۷۷ء
کتاب مرکز، فیصل آباد

محمد طاہر فاروقی
○ سیرتِ اقبال
۱۹۳۹ء
قومی کتب خانہ، لاہور

محمد عبدالرزاق
○ کلیاتِ اقبال
۱۳۴۳ھ
عماد پریس حیدرآباد دکن

محمد عبداللہ قریشی [مرتب]
○ مکاتیبِ اقبال بنام گرامی
۱۹۶۹ء
اقبال اکادمی پاکستان کراچی

محمد فرید الحق
○ اقبال ــ جہانِ دیگر
۸ جولائی ۱۹۸۳ء
گردیزی پبلشرز
۳۲۶/۱، محلہ اسلام گنج، بسیلہ چوک لشتر روڈ،
کراچی

محمد یونس حسرت
○ کلیاتِ اقبال
۱۹۸۶ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

مولوی احمد دین
○ اقبال
مرتبہ : مشفق خواجہ
۱۹۷۹ء
انجمن ترقی اردو پاکستان لاہور

ممتاز حسن
○ اقبال اور عبدالحق
نومبر ۱۹۷۶ء
اعتقاد پبلشنگ ہاؤس
گلی کوتانہ سوئیوالان نئی دہلی

وحید عشرت [ڈاکٹر]
○ اقبال ۱۹۸۴ء
۱۹۸۴ء میں علامہ پر چھپنے والے مضامین کا انتخاب
۱۹۸۶ء
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

وحید قریشی [ڈاکٹر]
○ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ
۱۹۷۳ء
مکتبہ ادب جدید ، لاہور

یوسف حسین خاں
○ روحِ اقبال
۱۹۴۲ء
ادارہ اشاعتِ اردو ، حیدرآباد دکن

رسائل کے اقبال نمبر

آجکل [ماہنامہ]
○ اقبال نمبر
نومبر ۱۹۷۷ء
مدیر : شہباز حسین
پبلی کیشنز ڈویژن ، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

اقبالیات [سہ ماہی]
○ جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء
مدیر : پروفیسر محمد منور
اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور

اقبالیات [سہ ماہی]
○ اقبال نمبر
جنوری ، مارچ ۱۹۸۸ء
مدیر : پروفیسر محمد منور
اقبال اکاڈمی پاکستان ۔ لاہور

پیغامِ حق [ماہنامہ]
○ اقبال نمبر
جنوری ، فروری مارچ ۱۹۴۶ء
مدیر : سید محمد شاہ
ظفر منزل ، تاج پورہ ، لاہور

شگوفہ [ماہنامہ]
○ اکبری اقبال نمبر
مرتبہ : مصطفیٰ کمال
۱۹۸۶ء
زندہ دلانِ حیدرآباد ، بیچلرز کوارٹرس معظم جاہی مارکیٹ ، حیدرآباد

ہما [ماہنامہ]
○ اقبال نمبر
اکتوبر ۱۹۷۶ء
مدیر : عبدالوحید صدیقی
جے ۔ ۱۷ ، جنگپورہ ایکسٹینشن نئی دہلی

صحیفہ [سہ ماہی]
○ اقبال نمبر — حصّہ دوم
نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء
جنوری فروری ۱۹۷۸ء
مجلس ترقی ادب ، ۲ ۔ کلب روڈ لاہور

ماہِ نو [ماہنامہ]
○ اقبال نمبر
اپریل ۱۹۷۰ء
مدیر : فضل قدیر
ادارہ : مطبوعاتِ پاکستان کراچی

نقوش [ماہنامہ]
○ اقبال نمبر : ستمبر ۱۹۷۷ء
○ اقبال نمبر : دسمبر ۱۹۷۷ء
مدیر : محمد طفیل
ادارہ فروغِ اردو لاہور

نیرنگِ خیال [ماہنامہ]
○ اقبال نمبر
ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء
مدیر : صدرالدین حسن
حکیم محمد یوسف
دفتر نیرنگِ خیال ، لاہور

نیرنگِ خیال [ماہنامہ]
○ سالنامہ جنوری ۱۹۴۲ء
مدیر : حکیم محمد یوسف حسن

انگریزی کتب

A. Waheed
A Biblography of Iqbal
1965
Iqbal Academy of Pakistan,
Lahore

S. Sinha
Iqbal
The Post and his Message
1947
Ram Narain Lal, Allahabad

ses Malik
Iqbal
Poet Philosopher of Pakistan
1971
Columbia University Press
New York and London

r, B. A.
Letters and Writings of Iqbal
1967
Iqbal Academy Pakistan,
Karachi

is Ahmad
Iqbal : As I Knew Him
1985
Iqbal Academy Pakistan,
Lahore

dul Ghani
aja Noor Elahi
Biblography of Iqbal
Bazm-E-Iqbal, Lahore

iya Begum
Iqbal
1947
Victory Printing Press,
Bombay-7.

آپ بالکل مایوس نہ ہوں !
جی ہاں ! اگر آپ کو CIDCO سڈکو اسٹیل مارکیٹ کلمبولی میں کسی وجہ سے جگہ دستیاب نہ ہو سکی
تو آپ بالکل مایوس نہ ہوں ۔
ہم
آپ کو سڈکو کلمبولی اسٹیل مارکیٹ سے
صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر
اوپن ویئر ہاؤس اور انڈسٹریل این اے پلاٹ فراہم کرتے ہیں
کثیر المقاصد صنعتی و تجارتی پلاٹوں پر
مشتمل
کلمبولی اسٹیل مارکیٹ
کے وسیع عریض، پروجیکٹ کے قریب ہر قسم کے کاروبار کے لیے نہایت موزوں ہیں مثلاً :
ٹمبر مارکیٹ ○ ہول سیل مارکیٹ ○ چھوٹی صنعتیں ○ گارمینٹ فیکٹری ○ گودام
ویئر ہاؤس ○ پٹرول پمپ ○ کولڈ اسٹوریج ○ ڈیری فارم ○ پولیٹری فارم وغیرہ وغیرہ
سہولتیں :۔ ہر پلاٹ مین روڈ سے ملا ہوا (پخ) پانی، گیس، بجلی (الیکٹرک)، اور سیوریج کی سہولتوں کے ساتھ
شہر کے ہر علاقے کے لیے ہر طرح کی ٹرانسپورٹ کی سہولت ہمہ وقت دستیاب ۔
قیمت حیرت انگیز طور پر کم اور زمین کے صاف ستھرے لین دین کا وعدہ
ایسا نہ ہو کہ یہ سنہری موقع آپ کے ہاتھ سے نکل جائے اور آپ کو پچھتاوا ہو
مزید تفصیلات کے لیے رابطہ قائم کیجیے
ہمارا اعتماد آپ کو مطمئن کر دے گا
واجد حسین اینڈ ایسوسی ایٹس
کچھی محلہ، عنبر اپارٹمنٹ، پنویل ۔ ۴۱۰۲۰۶ ضلع رائے گڈھ ۔ فون نمبر ۳۳۸۲
بمبئی میں رابطہ قائم کریں
صغیر انصاری
کوالیٹی گیکس، پائپ روڈ، مسجد کے پیچھے کرلا، بمبئی ۔ ۴۰۰۰۷۰
فون : ۵۱۲۱۷۱۷ ○ ۵۱۳۵۱۱۷
شفیق صدیقی
مائیکرو ڈیوایس۔ سی ایس ٹی روڈ کرلا، بمبئی ۴۰۰۰۷۰
فون : ۵۱۲۴۱۵۲ ○ ۵۱۲۷۰۷۳

اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں !
باقی وہ رہ جائے گا جو قائم اپنی راہ پہ ہے
اور پکا اپنی ہٹ کا ہے۔
(اقبال)

اقبال نمبر حصہ اوّل کے بعد
شاعر کی فخریہ پیش کش

[حصہ دوم]

چند عنوانات

مزید روشنی

اقبال سے متعلق تحقیق اقتباسات، شذرات تجزیے، اشارے اور حوالے وغیرہ

کتابیاتِ اقبال

۱۹۸۸ء تک اقبالیات [کتب و رسائل] کا مکمل اشاریہ

تبصرے

اقبال پر شائع ہوئی اہم نئی کتابوں اور رسائل کے اقبال نمبروں پر تبصرے

مذاکرے

اقبال اور عصری اردو شاعری کے موضوع پر نئے پرانے قلم کاروں کے فکر انگیز رشحات۔ اسی موضوع پر کئی طویل گراں قدر مقالے، بحثیں۔
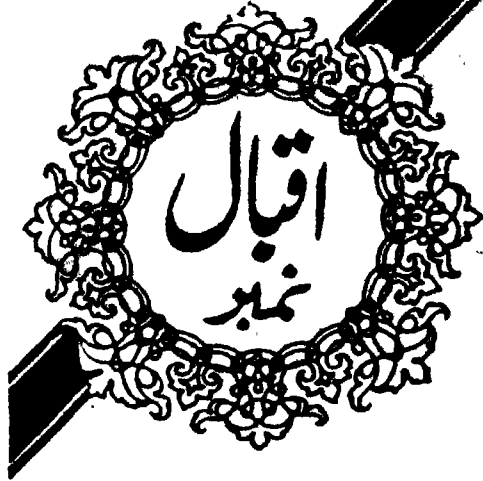
ایک مکمل کتاب

اقبال پر ایک نایاب مکمل کتاب [عکس]

نوادراتِ اقبال

اقبال کے نودریافت خطوط کے متن اور عکس، تحریروں کے عکس، کئی اہم دستاویزات اور تصاویر وغیرہ

ساتھ ہی

اقبال نمبر حصہ اوّل پر موصولہ بحث طلب خطوط، انٹرویوز، پرانی تحریروں کا انتخاب، قلم کاروں کی تصاویر، اقبال البم۔

اقبال نمبر حصہ دوم کی یہ ایک ناتمام جھلک ہے، صفحات، قیمت، تاریخ اشاعت اور دیگر تفصیلات

شاعر ۰

کے آئندہ شماروں میں ملاحظہ کیجیے

اسی میں دیکھ منصب کمال
جو تجھ کو زینتِ دامن کوئی آئینہ

اقبال نمبر

Regd. No. MH-B.Y.W. 28 Price: Rs. 50

THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

59 Years of Publication ❋ (Publishing Date: 27-28) ❋ Issue No. 1 to 6 1988. ❋ Telephone No. 359904.

IQBAL NUMBER 1988

Registered with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 14482/57.

پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر نعمان صدیقی نے ملٹی پرنٹ ۴۴۔۲۲۲، بلاسس روڈ بمبئی ۸ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا۔